اے حمید
ٹاپ سیکرٹ مشن
1
شیوسینا کے دہشت گرد

شیوسینا کے دہشت گرد

(1)

ٹاپ سیکرٹ مشن

اے حمید

میں آپ کو جو لرزہ خیز داستان سنانے والا ہوں وہ کوئی فرضی قصہ کہانی نہیں ہے بلکہ جذبہ اسلام سے سرشار ایک محب وطن پاکستانی مجاہد کی سچی آپ بیتی ہے۔ یہ کوئی آسمان سے اترا ہوا مجاہد نہیں ہے۔ یہ میری اور آپ کی طرح کا پاکستان سے محبت کرنے والا اور پاکستان کی خاطر اپنی جان قربان کر دینے والا ایک مسلمان پاکستانی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ میری طرح ڈش انٹینا پر پاکستان کے دشمن ملک بھارت کی فلمیں نہیں دیکھتا۔ ان فلموں کے فحش گانے نہیں سنتا اور پاکستان کی اسلامی ثقافت کے جسم میں زہر گھولنے والے بھارتی عریاں ڈانس نہیں دیکھتا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اس محب وطن مجاہد نے اپنے دشمن بھارت کو پہچان لیا ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ بھارت کی ہندو سرکار اور بھارت کے ہندوؤں نے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور وہ پاکستان کے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی تخریبی کارروائیوں میں لگا ہوا ہے۔ یہ محب وطن مجاہد پاکستان کی قدر و قیمت سے آگاہ ہے۔ اسے معلوم ہے کہ پاکستان بنانے کے لئے اس کے آبا و اجداد اور اس کی ماؤں بہنوں بیٹیوں اور بچوں تک نے اپنی گردنیں کٹوا دی تھیں۔ لاکھوں مسلمان عورتیں اغوا ہو گئی تھیں جن کا آج تک کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کون ہیں۔ کس حال میں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا مر کھپ گئی ہیں۔ سن سنتالیس کے ہولناک فسادات کا یہ بڑا دردناک باب ہے۔ میں اس باب کو یہاں نہیں کھولنا چاہتا۔ جیسے جیسے یہ قومی اور اسلامی جذبے میں ڈوبی ہوئی سرگزشت آگے بڑھتی جائیگی آپ کو ایک ایک کر کے ساری باتیں'

سارے حقائق معلوم ہوتے چلے جائیں گے۔

جس محب وطن پاکستانی نوجوان کی یہ داستان ہے میں آپ کو اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ اس نے مجھے اپنا نام بتانے سے منع کر دیا ہے۔ اس نے مجھے بھی صرف اپنا نام ہی بتایا ہے اپنا پتہ بھی نہیں بتایا۔ اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اس مجاہد نے کہا تھا کہ ہمارا دشمن بھارت' وطن عزیز کی سلامتی اور استحکام اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنے کے لئے دہشت گردی اور تخریب کاریوں میں مصروف ہے اور میں دشمن کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لئے میدان جنگ میں اترا ہوا ہوں۔ دشمن مجھے ہلاک کرنے کے لئے بھی گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اس مجاہد نے مجھے یہ بھی تاکید کی ہے کہ میں اس کا اصلی نام نہ لکھوں۔ کوئی فرضی نام لکھ دوں۔ اس نے کہا تھا۔

"مجھے اپنی سرگزشت چھپوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں یہ واقعات اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ تم ان واقعات کو اخبار میں پاکستان میں چھاپ کر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں تک پہنچا دو تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جس بھارت دیش کی انڈین فلمیں وہ وی سی آر پر یا ڈش انٹینا پر دیکھتے ہیں وہ ان کا دشمن نمبر ایک ہے۔ وہ ان کے ماں باپ بھائی بہنوں کا قاتل ہے۔ وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ وہ اسلام کا دشمن ہے۔ وہ اوپر سے ہمیں امن اور بھائی چارے کی دعوت دیتا ہے لیکن اپنی بغل میں اس نے ایسا زہریلا خنجر چھپایا ہوا ہے جس سے وہ پاکستان کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔"

میں اس سے زیادہ تمہید نہیں باندھنا چاہتا۔ میں بڑی جلدی اس داستان کا آغاز کرنا چاہتا ہوں جو مجھے اس پاکستانی مجاہد نے سنائی ہے اور جس کا ایک ایک لفظ' ایک ایک واقعہ اسلام کی محبت' پاکستان سے محبت اور اپنی عزت و آبرو پر جان قربان کر دینے کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں اس پاکستانی مجاہد کا کوئی فرضی نام رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے دماغ میں اس وقت ایک ہی نام آ رہا ہے اور وہ

نام ہے حیدر علی۔ حیدر علی صاحب سے میری ملاقات کیسے ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک عجیب اتفاق سے ملاقات ہوگئی اور میں نے اس مجاہد کے سینے میں چھپے ہوئے اسلام کی حرمت اور وطن عزیز سے محبت کے جذبے کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اسی شہر لاہور ہی میں ایک جگہ ہماری دو چار ملاقاتیں ہوئیں اور ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ میں نے حیدر علی سے کہا کہ میں آپ کی ایمان افروز داستان کو قلمبند کرنا چاہتا ہوں۔ حیدر علی نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ ہاں اگر میری داستان پاکستان کی نئی نسل کے ایک نوجوان کے دل میں بھی اپنے دشمن کو پہچاننے اپنی سرحدوں کو پہچاننے اور اپنے فرض کو پہچاننے کا شعور پیدا کردے تو میں اسی وقت تمہیں اپنی سرگزشت سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔"

میں نے اسے کہا۔

"حیدر علی صاحب! پاکستان کی نوجوان نسل کو پاکستان کے اور اپنے دین اسلام سے بڑی گہری محبت ہے۔ اسے اپنے دشمن کی پہچان ہے وہ اپنے فرض کو پہچانتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان نوجوانوں کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی آپ بیتی بڑھ کر ہماری نوجوان پاکستانی نسل کو وہ روشنی ضرور نظر آجائے گی جو انہیں وطن کی سلامتی اور استحکام کی منزل تک پہنچا دے گی۔"

اس پر حیدر علی صاحب کا چہرہ مسرت سے سرخ ہوگیا۔ میرے بازو کو اپنے مضبوط پنجے میں جکڑ کر مجھے تھوڑا سا ہلایا اور کہا۔

"خدا کی قسم تم نے میری روح کو خوش کر دیا۔ ابھی کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی داستان سنانی شروع کرتا ہوں۔"

ہم نے ایک مقام اور وقت طے کر لیا۔ ہماری نشستیں جمنی شروع

ہوگئیں۔ ہم دو مہینے تک روزانہ تین تین چار چار گھنٹے بیٹھے رہتے۔ حیدر علی بڑی روانی اور پوری تفصیل کے ساتھ اپنی آپ بیتی سناتا چلا گیا اور میں اسے اردو شارٹ ہینڈ میں لکھتا چلا گیا۔ یوں دو مہینے گذر گئے۔ دوسرے مہینے کے آخری روز حیدر علی صاحب نے کہا۔

"یہاں داستان ختم نہیں ہوتی۔ یہ دشمن کے خلاف جہاد کے صرف ایک مورچے کی داستان ہے۔ دشمن پاکستان کے خلاف سازشوں اور تخریبی کارروائیں میں لگا ہوا ہے۔ میں ان سازشوں اور تخریبی کارروائیوں کو ناکام بنانے کے لئے واپس میدان جنگ میں جا رہا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی ملیں گے۔ اگر مر گیا تو مرا کہا سنا معاف کر چھوڑنا۔"

اس سے اگلے روز میں حیدر علی صاحب کے کوارٹر میں گیا تو تالا پڑا ہوا تھا۔ کوارٹر کے مالک نے بتایا کہ شاہ جی کوارٹر خالی کر گئے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کچھ معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں۔"

"کچھ معلوم نہیں۔"

کوارٹر کے مالک نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس واقعہ کو ایک برس گذر چکا ہے۔ حیدر علی صاحب سے پھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ جو کوارٹر کا انہوں نے سرسری طور پر مجھے پتہ بتایا تھا وہاں وہ ایک ہفتہ پہلے آ کر رہنے لگے تھے۔ وہ کسی جگہ چند روز سے زیادہ قیام نہیں کرتے تھے۔

میں یہ داستان لکھ کر اور پاکستان کی نئی نسل تک پہنچا کر حیدر علی صاحب سے کیا گیا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ یہ داستان میں نے شارٹ ہینڈ کی کئی کاپیوں پر نوٹس کی شکل میں لکھی تھی۔ میں نے کہانی اور واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے حیدر علی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ بولتے جائیں۔ اس خیال نے اپنے سلسلہ کلام کو نہ توڑیں کہ پہلے میں لکھ لوں تو پھر وہ آگے بات شروع کریں۔ چنانچہ جب

ہماری نشست لگتی تھی تو وہ بولتے جاتے تھے اور میں واقعات کی ضروری جزوئیات کو کاپی پر اردو شارٹ ہینڈ کی لکیروں میں نوٹ کرتا جاتا تھا۔ اس طرح دو مہینوں میں جا کر اسی داستان کا پہلا مرحلہ ختم ہوا۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ حیدر علی صاحب پاکستان کے دشمنوں' تخریب کاروں' دہشت گردوں اور بھارتی حکومت پاکستان میں تخریب کاری کے لئے اپنے جو تربیت یافتہ دہشت گرد بھیجتی ہے ان کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ ان کا سراغ لگا کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس سے پہلے کہ وہ پاکستان کی سلامتی کو کوئی نقصان پہنچائیں انہیں نیست و نابود کر رہے ہیں اس لئے لرزہ خیز واقعات کا سلسلہ جاری ہے اور میں ان سے مل کر ان کے جہاد کے واقعات قلم بند کرتا رہوں گا۔ مگر کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب حیدر علی صاحب کے ملاقات نہ ہو سکی تو میں نے ان کی ایمان افروز سرگزشت پاکستان کی موجود نسل تک پہنچانے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ جذبہ حب الوطنی اور شوق شہادت کی آئینہ دار اس سرگزشت کو میں پاکستان کی نئی نسل کے حوالے کر رہا ہوں۔ تاکہ اسے پڑھ کر وہ دوست اور دشمن کا فرق جان سکیں۔ انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے وطن عزیز پاکستان کا دوست کون ہے اور دشمن کون ہے اور ہمیں دشمن کے ناپاک عزائم کو کس طرح خاک میں ملانا ہے۔ اور اپنے وطن کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے۔

پہلے مرا خیال تھا کہ میں محب الوطن مجاہد حیدر علی کی یہ داستان اپنی زبانی بیان کروں گا۔ مگر اب میں نے اپنا خیال بدل لیا ہے اور میں اسے حیدر علی صاحب کی زبانی ہی بیان کروں گا۔ میں اپنی طرف سے اس میں ایک لفظ بھی شامل نہیں کروں گا۔ جو کچھ انہوں نے بتایا تھا اور جیسے جیسے وہ واقعات مجھے بتاتے جاتے تھے میں اسی طرح ان کی زبان سے بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ تاکہ کسی مقام پر بھی حقائق کے مجروح ہونے کا خطرہ نہ ہوا اور واقعات کا تسلسل اور تاثر ہی قائم رہے۔ اب میں حیدر علی صاحب کی زبان سے ان کی سرگزشت کا آغاز کرتا ہوں۔

میرا نام ---------- ہے۔ [یہاں انہوں نے مجھے اپنا اصلی نام بتایا تھا جو

میں نہیں لکھ رہا اور اس کی جگہ ان کا فرضی نام حیدر علی رکھ لیا ہے۔) میرا
پیدائش پاکستان بننے کے بائیس تئیس سال بعد لاہور میں ہوئی۔ میں اپنے ماں باپ
کی اکیلی اولاد تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو میرے باپ نے مجھے بتایا کہ پاکستان کے لئے
مسلمانوں نے کتنی بڑی قربانیاں دی ہیں اور یہ کہ پاکستان ہمارے اور ہماری آنیوالی
نسلوں کے لئے کسقدر قیمتی ہے۔ میرے والد صاحب کے ماں باپ اور بہن بھائیوں
کو سن سنتالیس میں جب پاکستان بن رہا تھا تو ہندو سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ سوائے
میرے والد صاحب کے ان کے خاندان کا کوئی آدمی زندہ نہیں بچا تھا۔ انہوں نے
مجھے تحریک پاکستان کے پورے پس منظر سے آگاہ کیا اور بتایا کہ پاکستان تاریخ کی ایک
اٹل حقیقت ہے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ پاکستان کا قیام اسی روز عمل میں آگیا تھا جب
محمد بن قاسم نے سرزمین سندھ میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔

میں ابھی فسٹ ایئر میں ہی تھا کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس
کے چند روز بعد میری والدہ صاحبہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میں
نے ایک دفتر میں ملازمت کر لی اور پرائیویٹ طور پر ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔
ماریشس آئی لینڈ میں مرے والد صاحب کے ایک گہرے دوست کشمیری شالوں کا
کاروبار کرتے تھے۔ وہ ایک بار لاہور آئے اور مجھے یہ کہہ کر اپنے ساتھ موریشس
لے گئے کہ تم وہاں میرے پاس آ جاؤ۔ وہاں بڑے کالج ہیں۔ آگے جتنا جی چاہے
پڑھتے رہنا۔ موریشس میں بھارتی صنعت کار اور تاجر بڑے کاروبار کرتے ہیں۔ میں
وہاں ایک کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کالج میں انگریزی کے علاوہ ہندی اور کسی حد
تک سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔ چنانچہ میں دو سال میں ہندی لکھنا پڑھنا اور بولنا
سیکھ گیا۔ سنسکرت زبان سے پوری واقفیت تو نہ ہو سکی۔ اتنا ہو گیا کہ اگر کوئی
سنسکرت بول رہا ہو تو میں مطلب نکال لیتا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

ان زبانوں کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ آگے چل کر ان زبانوں خاص
طور پر ہندی زبان پر عبور حاصل ہو جانے کی وجہ سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا اور پاکستان

دشمن برہمن کی پاکستان کے خلاف سازشوں کو بے نقاب کرنے میں مجھے بڑی مدد ملی۔ ماریشس ہی میں میں نے ایک بنگالی مسلمان خاتون سے شادی کر لی اور مشرقی پاکستان میں آگیا۔ ڈھاکے میں میں نے نوادرات کا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔ بنگالی بیوی ہونے کی وجہ سے مجھے بنگلہ زبان بولنی پڑھنی اور لکھنی بھی آگئی۔

ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ یہ اللہ کی مرضی تھی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اللہ نے اولاد کی نعمت دینی ہوگی تو زیب النساء سے ہی دے گا میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ زیب النساء میری بنگالی بیوی کا نام تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی۔ ہم نے ڈھاکہ کی میرپور کی آبادی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا اور صبرو شکر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی جلسے جلوس نکلنے لگے۔ سیاست کی مجھے کوئی زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ اپنے دین اسلام اور وطن پاکستان سے والہانہ محبت تھی اور اس کی سلامتی اور استحکام کو سب پر مقدم سمجھتا تھا۔ میری بیوی زیب النساء بھی پاکستان سے محبت کرتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

"بنگال میں ہندو شروع ہی سے یہاں کے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا ہے۔ اگر مشرقی پاکستان نہ بنتا تو مغربی بنگال کا امیر ہندو یہاں کے سارے کاروبار پر قبضہ کر لیتا اور بنگالی مسلمانوں کو کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی۔"

ڈھاکہ میں رہتے ہوئے میں نے یہ دیکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کی معیشت اور درس گاہوں پر بھی ہندو بنگالیوں کا قبضہ تھا۔ مسلمان سکولوں میں ہندو بنگالی استاد تھے جو مسلمان بچوں کو گیتا اور رام کرشن کی داستانیں پڑھاتے تھے اور انہیں اپنے دین اسلام سے دور رکھنے کی درپردہ کوششیں کرتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن مسلمان لیڈروں کو اس بات کا احساس تھا چنانچہ ان کی وجہ سے ہندو دب کر رہتے تھے۔ کھل کر اسلام دشمنی کی بات نہیں کرتے تھے مگر انہیں بھارت کی ہندو حکومت کی پوری مدد حاصل تھی اور وہ اندر ہی اندر مشرقی پاکستان کی جڑیں کھوکھلی

کرنے کی ناپاک کوششوں میں برابر لگے ہوئے تھے۔ سادہ دل اور محب وطن بنگا
مسلمان ہندو بنئیے کے ان ہتھکنڈوں سے بے خبر تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں بھارت
کا تربیت یافتہ ایک ایسا لیڈر نمودار ہوگیا جس نے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں غیر
بنگالی مسلمانوں کے خلاف زہر بھرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ بہت جلد سامنے آ
اور سارے مشرقی پاکستان میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ یہ ہنگامے فسادات کی شکل
اختیار کر گئے۔

میرپور کی آبادی بہاری' پنجابی اور پٹھان مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ یہاں
بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا مگر شہر کے دوسرے علاقوں میں بھارتی پراپیگنڈے او
غداروں کے ورغلائے ہوئے سادہ لوح بنگالی پنجابیوں بہاریوں اور پٹھانوں پر قاتلا
حملے کر رہے تھے۔ ان میں بھارت کے بھیجے ہوئے ہندو بنگالی اور مکتی باہنی کے ہند
بھی شامل تھے۔ مکتی باہنی بھارت کی کمانڈو فورس کے تربیت یافتہ فوجی تھے۔ یہ سفی
کپڑوں میں باڈر کراس کر کے ہزاروں کی تعداد میں مشرقی پاکستان میں داخل ہو گ
تھے۔ جگہ جگہ بم پھینکنے اور آگ لگنے کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔

میں نے زیب النساء کو لاہور اپنے چچا کے پاس بھیج دیا۔ یہ میں نے بڑ
عقلمندی کی تھی۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ ستم
1971ء میں فوج نے مشرقی پاکستان کو مکتی باہنی سے صاف کر دیا۔ حالات بہت
ہوگئے۔ لاہور سے میری بیوی کا خط آیا کہ میں لاہور آجاؤں۔ میں نے اسے لکھا
یہاں حالات نارمل ہوگئے ہیں۔ کچھ روز میں تمہیں بھی ڈھاکہ بلوا لوں گا۔ می
زیب النساء کو ڈھاکہ بلوانے کا پروگرام طے کر چکا تھا کہ بھارت نے مشرقی پاکستان
حملہ کر دیا۔ اس بار مکتی باہنی کے ساتھ ساتھ بھارتی فوج کی کمانڈو فورس بھی مشر
پاکستان میں داخل ہوگئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں
سب جانتے ہیں کہ کس طرح غداروں کے ٹولے کی سازش سے مشرقی پاکستان بنگ
دیش بن گیا۔ میں بھی دوسرے پنجابیوں' بہاریوں اور پٹھان مسلمانوں کے سا

وہاں پھنس کر رہ گیا۔ وہاں مجھ پر کیا گذری اور میں جان بچا کر کسی طرح دلدلوں سانپوں اور دشمنوں سے بھرے ہوئے جنگلوں اور دریاؤں ندی نالوں کو عبور کرتا نیپال اور وہاں سے کراچی پہنچا۔ یہ ایک الگ عبرت ناک داستان ہے۔ جو اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔ اس ہولناک سفر کی داستان پھر کبھی سناؤں گا۔

جنگ بندی ہوگئی تھی۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ پاکستان میں حالات نارمل ہو رہے تھے۔ میں ابھی تک اپنی بیوی زیب النساء کے ساتھ چچا کے گھر میں ہی تھا۔ مجھے نوادرات کے کاروبار کا تجربہ تھا۔ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ میں لاہور میں اپنی کوئی دکان یا شو روم کھول سکتا۔ میں نے پھیری لگا کر نوادرات کی فروخت کا کام شروع کردیا۔ ان نوادرات میں سندھ کی اجرکیں' بلوچستان کی ٹوپیاں' صوبہ سرحد کا خوش نما مٹی کے برتن' پنجاب کی پھلکاریاں اور ڈیکوریشن پیس ہوتے تھے۔ میں یہ چیزیں شہر کے فیشن ایبل علاقے لے جاکر فروخت کرتا تھا۔ میرا کاروبار چل نکلا اور میں نے لاہور کے ایک محلے میں چھوٹی سی دکان کرائے پر لے کر اس کو شو روم میں تبدیل کر دیا۔ میں اور میری بیوی زیب النساء قناعت پسند تھے۔ ہمارے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ ہم نے ایک علیحدہ مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ ہماری ضرورتوں کے مطابق آمدنی ہو رہی تھی۔ ہم بڑے مطمئن تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ بھارت نے اپنے دہشت گرد پاکستان میں بھیجنے شروع کر دیئے۔ پبلک جگہوں پر بموں کے دھماکے ہونے لگے۔ دہشت گرد کلاشنکوفیں پستولیں اور گنیں لے کر گھروں میں داخل ہوتے اور بے گناہ لوگوں کی تڑپتی خون آلود لاشیں چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ ہمارا دشمن آپس میں لڑا کر ملک میں خانہ جنگی اور انتشار کی فضا پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مختلف دینی فرقوں کے لیڈروں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر اس قسم کی وارداتیں شروع ہو گئیں کہ تخریب کار سکوٹروں پر سوار شہر کے بارونق بازار میں نمودار ہوتے ایک دم فائرنگ کر کے بے گناہ شہریوں کو ہلاک کر کے فرار ہو جاتے۔ بم مسجدوں میں نماز پڑھتے نمازیوں پر پھینکے جاتے۔ خدا کی عبادت میں مشغول نمازی

خون میں لت پت تڑپتے رہ جاتے۔ سینما گھروں کے باہر بس کے اڈوں اور شاپنگ سینٹروں میں بم کے دھماکے ہوتے اور بے گناہ شہری موت کی نیند سو جاتے۔ شہروا میں جگہ جگہ پولیس تعینات کر دی گئی تھی مگر اس کے باوجود دہشت گردوں کی وارداتیں کم نہیں ہوئی تھیں۔ پولیس کئی دہشت گردوں کو پکڑتی اور موقع پر بھی ہلاک کر دیتی مگر مرنے والوں کی جگہ دوسرے تخریب کار آجاتے۔ پولیس کی خفیہ رپورٹ کے مطابق یہ تخریب کار بھارت کے باڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہوتے تھے۔ بھارت میں ان لوگوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دینے کے لئے خفیہ ٹریننگ کیمپ قائم تھے۔ یہ ہندو ہوتے تھے اور پاکستان میں مسلمان بن کر غیر قانونی طور پر باڈر کراس کر کے داخل ہوتے تھے۔ یہاں ان کے خفیہ اڈے بنے ہوئے تھے جن کا پولیس سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ یہ ہندو تخریب کار پاکستان میں بعض جرائم پیشہ افراد کو روپے پیسے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیے تھے۔ پولیس کسی تخریب کار کو موقع واردات پر اگر قابو کر لیتی تھی تو وہ ہر قسم تشدد برداشت کر لیتا مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ اس کا تعلق بھارت کی کسی پاکستان دشمن تنظیم سے ہے۔ وہ مر جاتا تھا مگر زبان نہیں کھولتا تھا۔ اس کے باوجود پولیس نے تخریب کاروں کے ایک دو اڈوں پر چھاپہ بھی مارا مگر وہ عین وقت پر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے مخبروں نے انہیں پہلے ہی خبر کر دی تھی۔

ہمارا دشمن پاکستان کو ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی ناپاک سازشوں سے وہ پاکستان میں سیاسی اور معاشی انتشار کی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی منافرت بھی پھیلا رہا تھا اور بھائی کو بھائی سے لڑوا رہا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر میں اور میری بیوی زیب النساء کبھی کبھی تو بہت دل برداشتہ ہو جاتے۔ جس ملک کو ہم نے اتنی بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اس کو نقصان پہنچے۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہم مجبور تھے۔ کبھی کبھی تو میرا خون کھول اٹھتا اور جی چاہتا کہ ان دہشت گردوں اور بھارتی تخریب کاروں کا اپنے طور پر سراغ لگاؤں اور پھر ایک

ایک کر کے ان سب کو گولیاں مار کر ہلاک کر ڈالوں۔ مگر میں اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ بس نماز پڑھ کر خدا کے حضور دعا کرتا کہ اے رب العزت یہ ملک پاکستان تیرے نام پر شہید ہونے والوں کی نشانی ہے۔ یہ تیرے دین اسلام کا قلعہ ہے تو اس کی حفاظت فرما اور ہمارے دشمنوں کو نیست و نابود کردے۔ لیکن دشمن صرف دعا مانگنے سے نیست و نابود نہیں ہو جایا کرتے۔ اس کے لئے باقاعدہ جنگی منصوبہ بندی کے ساتھ میدان جنگ میں اتر کر جان کی پروا کئے بغیر لڑنا پڑتی ہے۔ میں پاکستان کی سلامتی کے لئے اور اسلام کی سربلندی کی خاطر لڑنے مرنے کو بھی تیار تھا مگر مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میدان جنگ کیا ہے اور مجھے کس مقام پر دشمن سے لڑنا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دشمن سامنے نہیں آتا تھا۔ چھپ چھپ کر حملے کر رہا تھا۔

آخر دشمن پاکستان کو نیست و نابود کرنے کا مجھے موقع مل گیا۔ مگر اس کے لئے مجھے بہت بڑی قربانی دینی پڑی۔ مجھے اپنی زندگی کی واحد ساتھی اور بے انتہا محبت کرنے والی بیوی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہونا پڑا۔ اس المناک سانحے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک روز میں صبح کے وقت میں اپنے شو روم جانے لگا تو میری بیوی زیب النساء نے کہا۔

"مجھے باجی کوثر کے ہاں چھوڑتے جائیں۔ اس نے مجھے بلا بھیجا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میرا سکوٹر خراب ہے۔ میں خود رکشے پر جا رہا ہوں۔ باجی کوثر کا گھر شہر کے دوسرے کنارے پر ہے۔"

میری بیوی نے کہا۔

"باجی کوثر کے ہاں تیرہ نمبر ویگن بالکل سیدھی جاتی ہے۔ مجھے آپ ویگن میں بٹھا دیجئے۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ آجاؤ میرے ساتھ۔"

زیب النساء نے چادر اوڑھی اور میرے ساتھ گھر سے نکل پڑی۔
نوکرانی گھر پر کام کاج میں مصروف تھی۔ میری بیوی نے اسے تاکید کرتے
ہوئے کہا۔
"میں ایک گھنٹے تک آجاؤں گی تم کہیں مت جانا۔"
ہم ویگن سٹاپ پر آ گئے۔ تیرہ نمبر ویگن سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔
اگلی سیٹ پر عورت بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر بھی تین عورتیں سوار تھیں۔ میں نے
زیب النساء سے کہا۔
"دوسری بس میں چلی جانا۔"
مگر کنڈکٹر نے پچھلی سیٹ کی عورتوں کو ذرا ادھر ادھر کھسکا کر زیب النساء
کے لئے جگہ بنا دی۔ یہ سارا اہتمام اس کی موت کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ
اس کا آخری وقت آ گیا تھا۔ میری بیوی ویگن کی پچھلی لمبی سیٹ پر تین عورتوں کے
درمیان بیٹھ گئی۔ کنڈکٹر نے بس کی باڈی پر ہاتھ مار کر کہا۔
"چلو جی"
ویگن شالامار کی طرف چل پڑی۔ میں اپنے شو روم پر جانے کے لئے کسی
خالی رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ سڑک کے درختوں
اور بجلی کے تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے شور مچاتے اڑ گئے۔ زمین اپنی جگہ سے
ہل گئی۔ میں نیچے گر پڑا۔ پیچھے دیکھا تو میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی، جس
ویگن میں میں نے اپنی بیوی کو ابھی دس سیکنڈ پہلے سوار کرایا تھا اس کے پرخچے اڑ
چکے تھے۔ ہر طرف دھنواں ہی دھنواں اور شعلے اٹھ رہے تھے۔ چیخوں کی آوازیں
بلند ہو رہی تھیں۔ میں پاگلوں کی طرح جلتی ہوئی ویگن کی طرف بھاگا۔ لوگوں نے
مجھے پکڑ لیا۔ ویگن کے مسافروں کی لاشوں کے ٹکڑے ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔
ویگن دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ آگ کے شعلے اسقدر تیز اور بلند تھے کہ کسی کو اس
کی طرف جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر کھڑے پھٹی پھٹی

نگاہوں سے ویگن کے شعلوں کو تک رہے تھے۔ میں چیخ چیخ کر زیب النساء کو پکار رہا
تھا۔ میں ہر ایک سے کہہ رہا تھا۔

"ویگن میں میری بیوی ہے۔ خدا کے لئے مجھے اسے بچا لینے دو۔"

میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ مگر لوگوں نے مجھے بازوؤں اور
کمر سے اتنی زور سے پکڑ رکھا تھا کہ میں ویگن کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھ
سکتا تھا۔ شعلے اتنے زبردست تھے کہ اگر میں ویگن کے قریب بھی جاتا تو جل کر مر
جاتا۔ میں روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں کیا ہوا۔
جب مجھے ہوش آیا تو میں میں لاہور کے میو ہسپتال کے جنرل وارڈ میں بستر پر پڑا تھا۔
میرے بائیں ہاتھ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ پتہ چلا کہ میں جلتی ہوئی ویگن کے قریب چلا
گیا تھا اور آگ سے میرا ماس جھلس گیا تھا۔

ویگن میں پچیس سواریاں تھیں جن میں سے صرف دو سواریاں شدید
زخمی حالت میں ہسپتال میں پڑی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔ یہ دونوں
مرد تھے۔ ویگن میں پانچ عورتیں سوار تھیں جن میں ایک میری بیوی زیب النساء
بھی تھی وہ ساری کی ساری جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ کسی دہشت گرد نے ویگن کی
پچھلی سیٹ کے نیچے طاقتور بم تھیلے میں چھپا کر رکھ دیا تھا۔ جو ویگن کے چلنے کے دس
سیکنڈ بعد دھماکے سے پھٹ گیا اور ویگن کے پرخچے اڑ گئے۔ میرے پاس میرے چچا
چچی بیٹھے تھے۔ یہ ساری باتیں انہوں نے مجھے بتائیں اور میری بیوی کی المناک
موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرنے لگے۔

میری آنکھوں کے سامنے میری بیوی کا چہرہ تھا اور میرے ہونٹوں پر جیسے
خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ میں سب کا منہ تکتا تھا اور کسی سے کوئی بات نہیں کرتا
تھا۔ تین چار دن تک میری یہی حالت رہی۔ چوتھے دن میں نے اپنے چچا سے کہا۔

"انکل! میں گھر جانا چاہتا ہوں۔"

وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ میں اس گھر میں نہیں جانا چاہتا تھا جہاں میری

بیوی میرے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے اپنے شو روم پر جانا شروع کر دیا تھا مگر میرا دل اپنی بیوی کے غم سے بوجھل تھا۔ میں واپس اپنے گھر آگیا تھا۔ اس گھر کی ہر شے مجھے میری پیاری بیوی کی یاد دلا رہی تھی۔ میری بیوی دوسری بے گناہ عورتوں اور مردوں کے ساتھ دشمن کے دہشت گردوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ کاروبار میں اب مزاجی بالکل نہیں لگتا تھا۔ بس جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے دکان کے شو روم میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ ہر وقت ذہن میں یہی سوچتا رہتا کہ کسی طرح وہ دہشت گرد میرے ہاتھ آجائے جس نے ویگن میں بم رکھا تھا تو میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔

دہشت گردی کے واقعات کچھ زیادہ ہی ہونے لگے تھے۔ پولیس ہر جگہ تعینات تھی۔ سیکورٹی کے انتظامات بھی بہت سخت کر دئے گئے تھے۔ ایک دن شہر کے ایک سینما ہال کے سکوٹر سٹینڈ پر بم پھٹا جس سے تین شہری شہید اور دس پندرہ زخمی ہوگئے۔ اس کی خبر اخبار میں چھپی تو اس خبر سے مجھے معلوم ہوا کہ پولیس نے ایک دہشت گرد کو پکڑ لیا ہے جو زخمی حالت میں ہسپتال میں پڑا پولیس کی حراست میں ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہی وہ دہشت گرد ہے جس نے ویگن میں دھماکہ کر کے میری بیوی کو ہلاک کیا ہے۔ میں نے اسی وقت اس دہشت گرد کو جان سے مار دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس دہشت گرد سے اپنی بیوی اور دوسرے معصوم بے گناہ پاکستانی شہریوں کی ہلاکت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ میں اسی روز دوپہر کے بعد شو روم سے اٹھ کر سیدھا اس ہسپتال میں پہنچ گیا' جہاں دہشت گرد زخمی حالت میں زیر علاج تھا۔ ہسپتال کے ایک ملازم سے پوچھا کہ جس دہشت گرد کو پولیس نے اپنی داست میں لے رکھا ہے وہ کس وارڈ میں ہے۔ اس نے بتایا کہ دوسری منزل پر کمرہ نمبر گیارہ میں چلے جاؤ۔ ہسپتال کی دوسری منزل میں پرائیویٹ مریضوں کے کمرے تھے۔ ایک کمرے کے باہر دو پولیس کانسٹیبل رائفلیں کندھوں پر لٹکائے کھڑے تھے۔

ایک سویلین کپڑوں والا آدمی سٹول پر بیٹھا تھا۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی لگتا تھا۔ میں ان لوگوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرا پروگرام کچھ اور تھا۔ مجھے یہ شک تھا کہ پولیس اس دہشت گرد کا بیان لے گی جب وہ صحت یاب ہو جائے گا تو عدالت میں اس کا چالان پیش کر کے اس کا ریمانڈ لے لے گی۔ اس پر مقدمہ چلے گا اور اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ دہشت گرد کو چھ سات سال کی سزا ہو جائے گی۔ وہ میری بیوی زیب النساء کا قاتل تھا۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اسے کیفر کردار تک پہنچا کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی بیوی اور بم کے دھماکے میں شہید ہونے والے دوسرے بے گناہ پاکستانیوں کے خون کا بدلہ بھی لینا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں پولیس کے سامنے چلا گیا اور بعد میں پولیس کو کمرے کے اندر دہشت گرد مرا ہوا ملا تو قدرتی طور پر پولیس کو مجھ پر شک پڑ جائے گا اور وہ مجھے تلاش کر کے گرفتار کرے گی۔ میں گرفتاری سے بھی بچنا چاہتا تھا۔

میں اس کے ساتھ والے وارڈ کے ورانڈے میں آگیا۔ یہاں سے کمرہ نمبر گیارہ کی پچھلی کھڑکی صاف نظر آرہی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ لوہے کا بڑا پائپ اور چھت تک چلا گیا تھا۔ یہ پائپ چھت پر سے بارش کا پانی نیچے لے جانے کے لئے لگایا گیا تھا۔ نیچے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ میں نے سوچا کہ میں رات کے اندھیرے میں اسی پائپ کے ذریعے میں کھڑکی میں سے کمرے کے اندر جا سکتا ہوں۔ کھڑکی اس وقت بھی کھلی تھی اور چونکہ گرمیوں کا موسم تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ کھڑکی رات کو بھی کھلی ہوگی۔

میں اس قسم کی سنگین واردات کے لئے بالکل اناڑی تھا۔ میں اسی طرح کبھی کسی مکان کی کھڑکی پر نہیں چڑھا تھا۔ اور پھر میں ایک آدمی کو قتل کرنے جا رہا تھا۔ پروگرام تو میں نے بنا لیا مگر دل میں سخت خوف بھی محسوس ہونے لگا۔ اگر موقع پر پکڑا گیا اور میں نے دہشت گرد کو قتل بھی کر دیا تو مجھ پر مقدمہ چلے گا اور عمر قید تو ضرور ہو جائے گی۔ قتل ثابت ہو جائے گا۔ میں بچ نہیں سکوں گا۔ اگر اپنی بیوی

کے قاتل دہشت گرد کو قتل کرنے میں ناکام رہا اور پکڑا گیا تو بھی مجھ پر مقدمہ چل سکتا ہے اور میں قید سے نہیں بچ سکوں گا۔ میں قید سے نہیں گھبراتا تھا۔ صرف اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر میں اپنی بیوی کے قاتل کو قتل کرنے میں ناکام رہا اور پکڑا گیا تو میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میری بیوی کا قاتل بچ جائے گا اور مجھے چھ سات سال کی سزا ہو جائے گی۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ چنانچہ میں نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں کھڑکی کے راستے دہشت گرد کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پر چاقو کے پے در پے وار کرنے شروع کردوں گا اور وہاں چاہے کیسی ہی صورت حال پیدا ہو جائے میں دہشت گرد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ خود تو زخمی حالت میں پڑا ہوگا اور جان بچانے کے لئے مزاحمت نہ کر سکے گا۔ کمرے میں پولیس کا کوئی سپاہی یقینی طور پر نہیں ہوگا۔ صرف نرس وغیرہ ہوگی۔ وہ بھی ڈر کر بھاگ جائے گی۔

اب صرف یہ سوچنا باقی رہ گیا تھا کہ کیا میں ایک زندہ آدمی پر قاتلانہ حملہ کر سکوں گا۔؟ کیا میں اس کے سینے میں چاقو گھونپ سکوں گا؟ یہ کام موقع واردات پر مشتعل ہو کر تو میں کر سکتا تھا لیکن باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے کسی کو قتل کرتے ہوئے میرا حوصلہ جواب دے سکتا تھا۔ تاہم میں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اس واردات کے لئے تیار کر لیا کہ یہ دہشت گرد میری بیوی کا قاتل ہے۔ اس نے نہ جانے اس سے پہلے بموں کے دھماکے کر کے کتنے معصوم لوگوں کا خون کیا ہوگا۔ یہ پاکستان کا دشمن ہے۔ یہ ہمارے دشمن ملک بھارت کا بھیجا ہوا تخریب کار ایجنٹ ہے۔ اس کو ختم کرنا میرا فرض ہے۔

شام کے وقت میں شو روم بند کر کے گھر آگیا۔ نوکرانی میرے واسطے کھانا وغیرہ پکا کر چلی جاتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ بازار سے نیا اور تیز چاقو خرید کر لانا چاہیے۔ پھر اس خیال سے یہ ارادہ ملتوی کر دیا کہ کسی کو شک نہ پڑ جائے۔ حالانکہ لوگ چاقو وغیرہ خریدتے ہی رہتے تھے۔ لیکن چونکہ میں اس چاقو سے ایک آدمی کو

قتل کرنے والا تھا اس لئے قدرتی طور پر میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔
گھر کے باورچی خانے میں ایک چھری پڑی تھی جس سے نوکرانی سبزی وغیرہ کاٹتی
تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ یہ چھری نہ زیادہ بڑی تھی نہ چھوٹی تھی۔ اس کا پھل
بھی بڑا مضبوط اور تیز تھا۔ میں اسے اپنی قمیض کے اندر آسانی سے چھپا سکتا تھا۔
میں نے دہشت گرد کو قتل کرنے کے لئے اس آلہ قتل کا انتخاب کر لیا۔ اب میں
چاہتا تھا کہ دن کے وقت ایک بار پھر ہسپتال جا کر جائے واردات کا مشاہدے کروں
اور یہ دیکھوں کہ نیچے سے جو لوہے کا پائپ اوپر چھت تک جاتا ہے کیا میں آسانی
سے اس پر چڑھ کر کھڑکی تک پہنچ سکوں گا۔

گرمیوں کا موسم ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ اس روز کچھ زیادہ ہی گرمی تھی۔
میں شوروم سے اٹھ کر ہسپتال آگیا۔ پرائیویٹ کمروں والے عقبی باغیچے میں آکر
گھاس پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے میں اپنے کسی مریض کی عیادت کے لئے آیا ہوا
ہوں۔ میں نے دیوار پر نگاہ ڈالی۔ یہ دیکھ کر میں ٹھٹھک سا گیا کہ دوسری منزل
والے پرائیویٹ کمرہ نمبر گیارہ کی کھڑکی بند تھی اور اس کے بالکل اوپر اے سی کا
پچھلا حصہ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کمرے میں اے سی چل رہا ہے جو
رات کو بھی چل رہا ہو گا اور کھڑکی بند ہو گی اور اندر ممکن ہے چٹخنی بھی لگی ہوئی
ہو۔ اسی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے کامیابی کا امکان ایک فی صد تھا۔ اگر کھڑکی کو
چٹخنی نہ بھی لگی ہوئی ہو تو بھی مجھے کھڑکی کو اندر کی طرف دھکیل کر کھولنا پڑے گا اور
کچھ معلوم نہیں کہ اندر بھی پولیس موجود ہو۔ کیونکہ مریض کوئی عام قاتل نہیں تھا
بلکہ ایک دہشت گرد تھا جس سے پولیس کو تخریب کاروں کی ملک دشمن سرگرمیوں
کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہونے کی توقع تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے تو
میں سر ذرا سا اوپر اٹھا کر دیکھ سکتا تھا کہ کمرے میں کون کون ہے لیکن بند کھڑکی
میرے لئے سنگین حالات بھی پیدا کر سکتی تھی۔ میں نے رات کے وقت کھڑکی میں
سے کمرے میں داخل ہونے کا منصوبہ ترک کر دیا اور کوئی دوسرا منصوبہ سوچنے لگا۔

ہسپتال کے دو ایک ملازموں سے باتوں ہی باتوں میں میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ دہشت گرد کو فرار ہوتے وقت پولیس کی تین گولیاں لگی تھیں اور اس کی حالت نازک ہے اور کمرے میں سوائے ڈاکٹروں' نرس اور پولیس افسروں کے اور کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس آدمی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہسپتال کا ایک ملازم دن میں دو ایک بار کمرے کی صفائی کرنے جاتا ہے' میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس آدمی نے مجھے یہ بالکل نہ بتایا کہ ڈاکٹروں اور نرس کے علاوہ ہسپتال کا جو بھنگی اور صفائی کرنے والا یا چادریں لے جانے والا ملازم کمرے میں جاتا ہے پولیس نے اس کا شناختی کارڈ بنوا دیا ہوا ہے جس پر اس کی تصویر لگی ہوئی ہے اور کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہسپتال کے ملازم کو اپنا شناختی کارڈ دکھانا پڑتا ہے' میں بھنگی بن کر کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہاں سے میں فرش پونچھنے والا لمبا جھاڑو حاصل کرتا۔ دوسرے میری شکل صورت بھی بھنگیوں والی نہیں تھی۔ سوچ سوچ کر آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں رات کے وقت دو چار سفید چادریں یا دوائی کی شیشیاں لے کر ہسپتال کے ملازموں والا لمبا کرتہ اور سر پر کپڑے کی ٹوپی پہن کر کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے سپاہیوں سے کہوں گا کہ میں اندر چادریں رکھنے یا دوائی کی شیشیاں رکھنے جا رہا ہوں۔ ایک تو میرا لباس ہسپتال کے ملازموں جیسا ہو گا۔ پھر میرے ہاتھ میں سفید چادریں یا دوائی کی شیشیاں بھی ہوں گی۔ پولیس مجھے کمرے میں جانے کی اجازت دے دے گی۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پولیس مجھے شناختی کارڈ دکھانے کے لئے کہے گی۔

میں نے دو تین دن ہسپتال کے مختلف وارڈوں میں گھوم پھر کر اچھی طرح سے معلوم کر لیا کہ ہسپتال کے عام ملازم کس قسم کا کرتہ پاجامہ اور ٹوپی پہنتے ہیں اور دوائیاں وغیرہ عام طور پر یہ ملازم اور نرسیں تام چینی کے چھوٹے سے ٹرے میں رکھ کر لے جاتی ہیں۔ میں نے بازار سے تام چینی کا ایک ٹرے اور دوائیوں کی تین

چار سستی سی شیشیاں خرید کر ان میں رنگ دار پانی بھر دیا۔ ایک کھلی آستینوں والا کرتہ' پاجامہ اور ویسی ہی ٹوپی بنوا لی جیسی ہسپتال کے ملازم پہنتے تھے۔ میں نے ان کپڑوں کو تھوڑا تھوڑا میلا کر دیا تھا کہ یہ نہ معلوم ہو کہ ابھی ابھی درزی کی دکان سے لایا تھا۔ واردات کے لئے میں نے رات کے دس بجے سے گیارہ بجے کے درمیان کا وقت منتخب کیا۔ میں کپڑے اور تام چینی کا ٹرے اور دوائی کی شیشیاں ایک لفافے میں ڈال کر رات کے پونے دس بجے ہسپتال میں آگیا اور جس وارڈ کی دوسری منزل پر میری بیوی کے قاتل دہشت گرد کا کمرہ تھا اس کے عقبی باغیچے میں آکر بیٹھ گیا۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں اندھیرا تھا۔ چھری کو میں نے گھر ہی میں پتھر کی سل پر گھسا کر خوب تیز کر لیا تھا اور اسے ایک لفافے میں ڈال کر لے آیا تھا۔ اس رات میں نے پتلون کی بجائے عام شلوار قمیض اور پاؤں میں چپل پہنی ہوئی تھی۔ دوسرے لفافے میں تام چینی کا چھوٹا ٹرے اور دوائی کی شیشیاں تھیں۔

میں نے وقت ضائع کئے بغیر وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا کرتا اتار کر ہسپتال کے ملازموں والا کرتہ لفافے میں سے نکال کر پہنا۔ پھر شلوار اتار کر پاجامہ پہنا۔ پاؤں میں چپل وہی رہنے دی۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی پہن لی۔ اپنا کرتہ اور شلوار لفافے میں ڈال کر وہیں ایک طرف جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ تام چینی کے ٹرے میں دوائی کی شیشیاں رکھ لیں۔ چھری کو لفافے میں سے نکال کر اپنے پاجامے کے نیفے میں اڑس لیا۔ اور باغیچے میں سے نکل کر وراندے میں بڑے آرام سے چلتا اس زینے کی طرف بڑھا جو دوسری منزل والے پرائیویٹ کمروں کی طرف جاتا تھا۔ میں نے پہلے کبھی اس قسم کی اداکاری نہیں کی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ میں اچھی اداکاری کر رہا تھا۔ دوائیوں والا ٹرے ہاتھ میں لئے میں بڑی بے فکری سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ دوسری منزل کا برآمدہ خالی پڑا تھا۔ دھیمی سی روشنی تھی۔ میرا رخ کمرہ نمبر گیارہ کی رات تھا۔ میں نے دور سے دیکھ لیا کہ کمرے کے باہر پولیس کا ایک سپاہی سٹول پر بیٹھا ہوا ہے۔ رائفل اس نے اپنے ساتھ لگائی

ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس سپاہی کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔
اس کے باوجود میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں قتل کی واردات کرنے جا رہا تھا
اگرچہ مجھے ایک دشمن پاکستان اور اپنی بیوی کے قاتل کو قتل کرنا تھا پھر بھی یہ ایک
قتل تھا اور اس سے پہلے آدمی تو دور کی بات میں نے کبھی کسی چوہے کو بھی نہیں
مارا تھا۔ بس ایک جذبہ مجھے لئے جا رہا تھا کہ جس آدمی کو میں قتل کرنے جا رہا ہوں
وہ میری بیوی کا قاتل ہے۔ وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ وہ میرے ملک کا دشمن ہے او
اس نے اس سے پہلے اپنی تخریبی کارروائیوں سے نہ جانے کتنے بے گناہ پاکستانیوں
ہلاک کیا ہے۔
میں دروازے کی طرف بڑھا تو سپاہی سٹول پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا بات ہے؟"
میں نے کہا۔
"جناب اندر مریض کے لئے دوائیاں لے جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب ۔
کہا ہے کہ رات کے راؤنڈ سے پہلے یہ دوائیاں اندر رکھ دوں۔"
اس نے کہا۔
"شناختی کارڈ دکھاؤ۔"
ایک بار تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کمرے میں
داخل ہونے سے پہلے مجھے شناختی کارڈ دکھانا پڑے گا۔ میں نے یونہی جیبوں میں ادھ
ادھر ہاتھ ڈالنے لگا۔ پھر کہا۔
"جناب میرا شناختی کارڈ تو دوسرے کرتے کی جیب میں رہ گیا ہے۔"
سپاہی نے مجھے بازو سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور میری تلا
لینے لگا۔ چھری میں نے پاجامے کے نیفے میں اڑسی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا سا پیچ
ہٹتے ہوئے کہا۔
"جناب ہم ہسپتال کے پرانے ملازم ہیں۔ آپ میری تلاشی کس لئے ۔

رہے ہیں۔"

اس دوران سپاہی کا ہاتھ میری چھری پر پڑ چکا تھا۔ اس نے میرا کرتہ اوپر اٹھا کر چھری نکال لی اور مجھے وہیں گردن سے دبوچا اور دوسرے سپاہیوں کو آواز دی۔ اندر کمرے میں سے دو سپاہی جلدی سے باہر آ گئے۔

"کیا بات ہے حوالدار؟"

"اس سے چھری برآمد ہوئی ہے ملک جی۔ یہ کسی کو قتل کرنے آیا تھا۔"

انہوں نے مجھے اسی وقت قابو کر لیا۔ میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ جو سپاہی کمرے سے باہر آئے تھے اور جنہوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ وہ بھی بار بار مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ تو بالکل وہی ہے۔"

پہلے سپاہی نے کہا۔

"مہاندرا وہی ہے۔ اصل تو اندر پڑا ہے۔"

ایک نرس بھی کمرے سے آ گئی۔ دوسرے کمرے سے دو ڈاکٹر بھی نکل کر آ گئے۔ بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ میں ہسپتال کا ملازم نہیں ہوں۔ ہسپتال کے ملازم کا بھیس بدل کر وہاں آیا ہوں۔

پولیس کے ایک سپاہی نے جس کو باہر والے سپاہی نے ملک جی کہہ کر مخاطب کیا تھا میری گردن پر زور سے مکا مارا اور گالی دے کر کہا۔

"تمہیں کس نے بھیجا ہے اوئے۔"

میں جذبات میں آ کر چیخ پڑا۔

"مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں پاکستان کے دشمن کو' اپنی بیوی کے قاتل کو قتل کرنے آیا ہوں۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے اندر جانے دو۔"

میں پاگلوں کی طرح بولے جا رہا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میری گردن میں کپڑا ڈال کر اسے مروڑ کر رسے کی طرح بنا دیا اور مجھے کھینچتے ہوئے نیچے

لے آئے۔ نیچے پولیس کی گاڑی ایک طرف درختوں میں کھڑی تھی۔ ملک صاحب نے آواز دے کر کہا۔

"میرزمان' گاڑی ادھر لاؤ اوئے اسے تھانے لے جانا ہے۔"

پولیس وین کا ڈرائیور پہلے ہی اپنی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے سگریٹ پھینک کر گاڑی سٹارٹ کی اور تیزی سے گھما کر ہمارے پاس لے آیا۔ مجھے گاڑی میں دھکیلتے ہوئے ایک سپاہی نے ملک صاحب سے کہا۔

"ملک جی! یہ دہشت گردوں کا ساتھی لگتا ہے جو اسے اس لئے قتل کرنے آیا ہے کہ وہ اپنے بیان میں دوسرے ساتھیوں کا نام نہ بتادے۔"

پولیس مجھے علاقے کے تھانے میں لے آئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ میں ساری رات مچھروں اور زمین پر بچھے ہوئے کمبلوں کے کھٹملوں سے لڑتا رہا اور ایک پل کے لئے نہ سویا۔ صبح ایک سفید کپڑوں والا نوجوان آدمی حوالات میں آ گیا۔ وہ بھی مجھے گھور گھور کر دیکھے جا رہا تھا اور منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ میں حیران بھی ہوا کہ آخر یہ لوگ مجھے اس طرح گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں اور اس سپاہی نے اپنے ساتھی سے کیوں کہا تھا کہ یہ تو بالکل وہی ہے جس کے جواب میں دوسرے نے کہا تھا۔

"مہاندرا [شباہت] وہی ہے۔ اصل تو اندر پڑا ہے۔"

یہ ایک معمہ سا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سفید کپڑوں والا نوجوان پولیس افسر تھا اور سی آئی اے کا آدمی لگتا تھا۔ مجھے دو تین سیکنڈ گھور کے دیکھنے کے بعد وہ آدمی اٹھ کر حوالات سے باہر نکل گیا اور باہر کھڑے کانسٹیبل سے کہا۔

"اسے اوپر میرے آفس میں پہنچا دو۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں سخت دل برداشتہ تھا۔ میرا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ میں اپنی بیوی کے قاتل اور پاکستان کے دشمن دہشت گرد کو ہلاک بھی نہ

کر سکا تھا اور خود بھی پھنس گیا تھا۔ اب خدا جانے مجھے کتنی سزا ہو۔ سفید کپڑوں والے پولیس آفیسر کے جانے کے بعد کانسٹیبل حوالات کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس دوران اس نے کسی دوسرے سپاہی کو آواز دے کر بلا لیا تھا۔ دوسرا سپاہی ہتھکڑی لے کر آگیا۔ مجھے ہتھکڑی لگائی گئی اور تھانے کی عمارت کی دوسری منزل میں ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرے آفس تھا جہاں وہی سفید کپڑوں والا نوجوان بڑی سی میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کسی کو فون پر کہہ رہا تھا۔

"آپ اسی وقت آجائیں۔"

نوجوان سپاہی مجھے لے کر کھڑے تھے۔ فون بند کرکے پولیس آفیسر نے سپاہیوں سے کہا۔

"تم لوگ جاؤ اور اسے ہتھکڑی کیوں ڈالی ہے۔ اتار دو ہتھکڑی۔"

میری ہتھکڑی اتار دی گئی۔ پولیس آفیسر نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میرے ساتھ اچانک اتنا اچھا سلوک پولیس نے کیوں شروع کر دیا ہے؟ یہ راز میری عقل سمجھ سے باہر تھا۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اوپر پولیس کا ٹارچر سیل ہوگا اور مجھے چھترول کیا جائے گا۔ رولر پھیرا جائے گا اور خدا جانے پولیس کس کس طرح کا اذیت ناک تشدد کرے گی اور مجھ سے پوچھا جائے گا کہ دہشت گرد کو ہسپتال میں قتل کرنے کے لئے کس نے بھیجا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی کہاں کہاں پر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ جن کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اور پولیس مار مار کر مجھے ادھورا کر دے گی لیکن یہاں آکر میری ہتھکڑی بھی اتروا دی گئی اور مجھے بیٹھنے کے لئے کرسی بھی پیش کر دی گئی۔

یہ سویلین کپڑوں والا نوجوان پولیس آفیسر میرے سامنے بیٹھا مجھ کو دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میز کی دراز میں سے فائل نکال کر سامنے رکھ لی۔ اسے کھولا اور اس میں رکھی ہوئی ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک دو سیکنڈ تصویر کو

دیکھتا۔ پھر مجھے دیکھنے لگتا۔ اتنے میں ایک دراز قد پولیس آفیسر جس نے وردی پہنی ہوئی تھی، کمرے میں داخل ہوا اور اندر داخل ہوتے ہی وہ بھی کھڑے ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ سویلین کپڑوں والے نوجوان پولیس آفیسر نے وردی پوش پولیس آفیسر سے پوچھا۔

"بھٹی صاحب! کیوں، کیا خیال ہے؟۔"

بھٹی صاحب میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا۔

"شاہ صاحب! بالکل وہی حلیہ ہے۔ اس کو چھپادو۔ اس کو نکالو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صرف اس کی ناک پیچھے سے ذرا سی اوپر اٹھی ہوئی ہے اور بال گھنگھریالے نہیں ہیں۔ باقی ہو بہو وہی ہے۔"

سویلین لباس والے پولیس آفیسر نے جس کو بھٹی صاحب نے شاہ صاحب کہا تھا کہا۔

"یہ معمولی فرق ہے۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

شاہ صاحب نے فائل بند کر دی۔ کمرے میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی کیونکہ اے سی چل رہا تھا۔ شاہ صاحب اب میری طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ میں زیر علاج دہشت فرد کو کس لئے قتل کرنے آیا تھا۔ میں نے صاف صاف جو حقیقت تھی ان کو بتا دی اور کہا۔

"میں صرف اپنی بیوی اور پاکستان سے محبت کی خاطر اس دہشت گرد کو قتل کرنے آیا تھا۔ مجھے شک تھا کہ پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ یہ دشمن ملک و ملت ایک نہ ایک دن رہا ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے خود ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا تاکہ اس کی عبرت ناک موت سے اس کے دوسرے ساتھیوں کو پتہ چل جائے کہ پاکستان میں ایسے محب وطن لوگ بھی موجود ہیں جو پاکستان کے خلاف سازشیں کرنے والے دہشت گردوں کو از خود نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ آپ چاہے یقین کریں یا نہ کریں لیکن جو حقیقت ہے وہ میں نے بیان کر دی ہے۔"

دونوں پولیس افسر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں اور ان کے ذہنوں میں کوئی اور ہی منصوبہ ہے۔ تب میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ میری شکل کا موازنہ فائل میں رکھی ہوئی کس مجرم کی تصویر سے کر رہے تھے اور وہ کون شخص ہے جس کی شکل کی میری شکل سے مماثلت ہے۔

شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے وردی پوش پولیس آفیسر بھٹی سے کہا۔

"کیا خیال ہے چلا جائے ہیڈ کوارٹر؟"

"ضرور بٹ صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جا کر وہاں مجھ پر تشدد کریں گے۔ وہاں ٹارچر کرنے اور اذیت دینے کے تازہ اور جدید آلات ہوں گے۔ دفتر کے باہر آتے ہی مجھے پھر ہتھکڑی لگا دی گئی۔ تھانے کے احاطے میں ایک پولیس وین کھڑی تھی۔ مجھے وین میں بٹھا دیا گیا۔ وردی پوش تھانیدار بھٹی صاحب اور دو پولیس کانسٹیبل میرے ساتھ بیٹھ گئے اور پولیس وین پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑی۔ پولیس وین لاہور شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گذرتی ہوئی ایک ایسے علاقے میں آ گئی جہاں میں بھی شاید میں کبھی آیا تھا۔ بالکل گمنام سا غیر آباد علاقہ تھا۔ بس اس سے زیادہ میں آپ کو اس علاقے کے بارے میں بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ یہ میرے ملک کی نیشنل سیکورٹی کا معاملہ ہے اور دشمن ملک بھارت پاکستان کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں لگا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دشمن ملک کے ایجنٹوں کو اس علاقے کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوں۔

اس گمنام علاقے میں ایک عمارت تھی۔ عمارت میں ایک کمرہ تھا۔ کمرے میں ایک صحت مند جسم والا گورا چٹا آدمی پتلون اور بش شرٹ میں ملبوس کرسی پر

بیٹھا تھا۔ میز پر سامنے کچھ فائلیں پڑی تھیں۔ کمرے میں اے سی نہیں لگا ہوا تھا مگر چھت اونچی ہونے کی وجہ سے کمرے کی فضا میں ٹھنڈک تھی۔ یہ بٹ صاحب تھے جن کے بارے میں بھٹی صاحب نے کہا تھا کہ ہیڈ کوارٹر میں چلنا چاہیئے۔ بٹ صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں جان بوجھ کو بٹ صاحب کا بھی نام نہیں لکھ رہا۔ وہ بٹ صاحب بھی نہیں تھے۔ انہیں کچھ اور حساب کرکے پکارا جاتا تھا لیکن میں یہ ساری شناخت نیشنل پوائنٹ آف ویو کی وجہ سے یہاں ظاہر نہیں کر رہا۔ کیونکہ میرا آپکو یہ آپ بیتی سنانے کا اصل مقصد پاکستان کے ان محب وطن بہادر پولیس آفیسروں کے نام پتے ظاہر کرنا نہیں ہے بلکہ پاکستان کی نئی نسل اور پرانی نسل پر اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ ہمارا دشمن ملک بھارت پاکستان کی سلامتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے بدنام زمانہ تنظیم را کے تعاون سے کیسی کیسی ہلاکت خیز کارروائیوں میں مصروف ہے اور ہم زی ٹی وی پر اس ملک کے نیم عریاں فحش ڈانس دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا دشمن تو یہی چاہتا ہے کہ ہماری نئی اور پرانی نسل اس کی فلم ایکٹرسوں اور ڈانسروں کے فحش ڈانس دیکھتی رہیں اور وہ اندر ہی اندر پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرتا چلا جائے۔

یہاں بھی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میری ہتھکڑی اتار دی گئی تھی۔ باہر دو تنو مند جوان سویلین لباس میں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی جیبوں میں پستول ہیں اور وہ کمانڈو ٹائپ کے گارڈز ہیں۔ جو سیکورٹی کی ڈیوٹی پر ہیں۔ بٹ صاحب نے میرے لئے ٹھنڈا مشروب منگوایا۔ میں نے ہمت کرکے ان سے بھی پوچھ لیا کہ آخر میری یہ خاطرداری کس لئے کی جا رہی ہے۔ کیا وہ ٹھنڈا مشروب پلا کر مجھ پر تشدد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بٹ صاحب مسکرائے۔ کہنے لگے۔

"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت پڑی تو آپ کو خود ہی معلوم

ہو جائے گا۔"

شاہ صاحب دفتر سے چلتے وقت وہ فائل اپنے ساتھ ہی لیتے آئے تھے جس میں وہ پراسرار تصویر یا فوٹو تھا جس کی دیکھ کر وہ بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یعنی جس کی فوٹو اس سے میری شکل کا موازنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بٹ کے آگے فائل کھول کر رکھ دی۔ وہ خود بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ بٹ صاحب نے فائل میں سے فوٹو اٹھائی اور اسے غور سے دیکھنے لگے۔ یہ بڑے سائز کی کلر کارڈ فوٹو تھی۔ دور سے میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا تھا۔ ایک آدمی میرے لئے اور بٹ صاحب اور بھٹی صاحب کے لئے ٹھنڈے مشروب کے گلاس لے کر آگیا۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ خاموشی سے ٹھنڈا مشروب پینے لگا جس نے میرے جسم میں تھوڑی سی توانائی بحال کر دی۔ پولیس آفیسر بٹ صاحب نے فوٹو فائل میں رکھ کر فائل بند کر دی اور مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگے کہ میں کہاں پیدا ہوا؟ میرے ماں باپ کہاں ہیں۔ بچے کتنے ہیں اور میں لاہور میں کیا کام کرتا ہوں۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنی زندگی کے بارے حالات بتا دیئے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں نے ماریشس آئی لینڈ کے جس کالج میں بی اے کیا تھا وہاں میں نے ہندی اور تھوڑی بہت سنسکرت زبان بھی پڑھی تھی تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ بٹ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم ہندی زبان لکھ لیتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں لکھ بھی لیتا ہوں اور پڑھ بھی لیتا ہوں۔ کوئی سنسکرت بول رہا ہو تو میں اس کا مفہوم ضرور سمجھ جاتا ہوں لیکن میں سنسکرت لکھ پڑھ اور بول نہیں سکتا۔"

بٹ صاحب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

بٹ صاحب مسکرائے اور بولے۔

"وقت آنے پر آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ بھٹی صاحب انہیں لے جا کر ناشتہ کرائیے۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

"انشاء اللہ!"

بھٹی صاحب اور شاہ صاحب مجھے لے کر بٹ صاحب کے کمرے سے باہر گئے۔ اس بار مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔ ویگن میں بیٹھنے کے بعد صرف میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ سپاہی میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگا تو میں نے کہا۔

"میں کوئی دشمن کا جاسوس یا تخریب کار نہیں ہوں۔ آپ میری آنکھوں پر پٹی کس لئے باندھ رہے ہیں۔"

سویلین کپڑوں والے پولیس آفیسر شاہ صاحب بولے۔

"کوئی وجہ تو ہو گی جس کے لئے ہم پٹی باندھ رہے ہیں۔ تم اعتراض نہ کرو۔"

آنکھوں پر پٹی بندھنے کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی لاہور کی کن سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی کس طرف جا رہی ہے۔ گاڑی کبھی ایک سڑک پر چلتی۔ کبھی موڑ کاٹ کر دوسری سڑک پر اور وہاں سے تیسری سڑک پر آ جاتی۔ کافی دیر تک یہ سفر جاری رہا۔ پھر ایسا لگا جیسے گاڑی کچی سڑک پر چل رہی ہے۔ باہر دوسری گاڑیوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ یہ بڑا خاموش سا علاقہ تھا۔ ایک جگہ ریل گاڑی کے ڈیزل انجن کے ہارن کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز کافی دور سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ صرف پولیس وین کے انجن اور ٹائروں کے کچی سڑک پر چلنے کی آواز ہی آ رہی تھی۔

ویگن ایک طرف گھومی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد رک گئی۔ مجھے ایک سپاہی نے سہارا دے کر ویگن سے نیچے اتارا۔ بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"اسے اوپر لے جا کر ناشتہ کراؤ۔"

میں نابیناؤں کی طرح سپاہی کا بازو پکڑے اس کے ساتھ ساتھ قدم قدم چل رہا تھا۔ میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کالے رنگ کے کپڑے کی تھی اور اس طرح باندھی گئی تھی کہ میں کوشش کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک جگہ سیڑھیاں چڑھ کر ہم دوسری منزل پر آ گئے۔ جب مجھے ایک کمرے میں لا کر چارپائی پر بٹھایا گیا۔ تب میری آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ میں نے آنکھوں کو ہاتھوں سے ملنے کے بعد دیکھا کہ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوں۔ یہ کمرہ پولیس کا کوئی ٹارچر سیل یا حوالات نہیں لگتا تھا۔ چھت کے ساتھ لگا پنکھا چل رہا تھا۔ کونے میں چارپائی پر بستر لگا تھا۔ دیوار کے ساتھ میز کرسی لگی تھی۔ دونوں سپاہی مجھے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ دورازے کو وہ باہر سے لاک کر گئے تھے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولنی چاہی مگر کھڑکی کو بھی اندر سے لاک لگا ہوا تھا۔ چھت کے ساتھ آمنے سامنے دو روشندان تھے جن میں سے دن کی روشنی اور تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرے کے کونے میں بھی ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے اس کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھل گیا۔ یہ مختصر سا باتھ روم تھا۔ وہاں ٹوتھ پیسٹ پلاسٹک کے کیس میں بند نیا ٹوتھ برش، صابن اور نیا تولیہ سب سامان موجود تھا۔ میں نے غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ معمہ کیا ہے؟

یہ معمہ مجھ سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے آرام دہ کمرے، مہیا کر کے، مجھے ناشتہ کرا کر، کوکا کولا پلا کر مجھ سے برادرانہ سلوک بھی ہو رہا تھا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھ سے ایسا سلوک بھی ہو رہا تھا۔ جیسے میں کوئی بھارتی جاسوس ہوں۔ فائل میں لگی ہوئی کسی کی فوٹو کے ساتھ میری شکل کا جو موازنہ کیا جا رہا تھا وہ بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔ جہاں میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا۔ وہاں بھی مجھے

اس طرح رکھا گیا تھا جیسے میں پولیس کی حراست میں ہوں۔ دروازہ کھلا اور پولیس آفیسر بٹ صاحب کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا شلوار قمیض والا آدمی اندر داخل ہوا۔ بٹ صاحب نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ سلطان صاحب ہیں۔ ہمارے کولیگ ہیں۔"

سلطان صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور یہ دونوں آدمی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان چھوٹی سی میز تھی۔ بٹ صاحب اپنے ساتھ ایک سبز رنگ کی فائل لائے تھے۔ انہوں نے فائل میز پر رکھ دی۔ میں نے ان سے کہا۔

"بٹ صاحب! بہتر ہوگا کہ مجھے کھل کر بتا دیں کہ آپ لوگ مجھے غنڈہ بدمعاش سمجھ رہے ہیں یا بھارتی جاسوس؟ آپ نے مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے وہ ایک ہی بار پوچھ لیں۔ میرے ساتھ جھوٹ موٹ کا برادرانہ سلوک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات میں ایک بار پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میں بھارتی جاسوس ہوں اور نہ میرا تعلق دہشت گردوں کے کسی گروہ سے ہے۔ میں ہسپتال میں پڑے دہشت گرد کو قتل کرنے ضرور آیا تھا مگر یہ محض اپنی بیوی کی موت کا بدلہ لینے کے لئے کر رہا تھا۔ میرا اس دہشت گرد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے ابھی تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

دونوں پولیس آفیسر بڑے غور سے میری باتیں سنتے رہے۔ جب میں نے بات ختم کی تو سلطان صاحب نے بٹ صاحب کی طرف دیکھا۔ بٹ صاحب کے سامنے سبز فائل رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے فائل کھولی اور اس میں سے بڑے سائز کی کلر فوٹو نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور کہا۔

"اس فوٹو کو غور سے دیکھا۔"

میں نے فوٹو پر نظریں ڈالیں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلی نظر میں یہ فوٹو مجھے اپنا لگا۔ ہو بہو میری شکل تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرے بال سیدھے تھے اور

جس کی فوٹو تھی اس کے بال گھنگریالے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی ناک اوپر سے ذرا اونچی تھی۔ جس شخص کی فوٹو تھا وہ ہسپتال کے پلنگ پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سر کے نیچے ہسپتال کے بیڈ کا سرہانہ تھا اور فوٹو کلوز اپ میں اتاری گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"کبھی لگتا ہے یہ میری فوٹو ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ کسی ایسے آدمی کی فوٹو ہے جس کی شکل حیران کن حد تک مجھ سے ملتی ہے۔ یہ کون شخص ہے؟"

بٹ صاحب اور سلطان صاحب زیر لب مسکرا رہے تھے۔ سلطان صاحب نے کہا۔

"یہ اسی دہشت گرد کی فوٹو ہے جس نے ویگن میں بم کا دھماکہ کر کے تمہاری بیوی کو ہلاک کیا ہے اور جو ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے اور جس کو تم قتل کرنے آئے تھے۔"

مجھے اپنی اور اپنی بیوی کے قاتل دہشت گرد کی شکل کی مماثلت پر سخت حیرانی ہو رہی تھی۔ میں نے جیسے اپنے آپ میں کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی شکل دوسرے آدمی سے اتنی ملتی جلتی ہو۔ ایسا صرف جڑواں بھائی بہنوں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ شخص میرا جڑواں بھائی بھی نہیں ہے۔ پھر اس کی شکل مجھ سے اتنی ملتی جلتی کیوں ہے؟"

بٹ صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"یہ خدا کی قدرت ہے۔"

میں نے بٹ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ خدا کی قدرت کا کرشمہ ہی ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس آدمی کا فوٹو آپ لوگ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟"

سلطان صاحب بولے۔

"اس کا جواب تمہیں بعد میں مل جائے گا۔ اس وقت میں یہ بتانا چاہتا ہوں

کہ اس شخص کا نام دھرم چند ہے۔ اس کا تعلق بھارتی دہشت گردوں کے اس گرو
سے ہے جس کو بھارتی حکومت پاکستان دشمن تنظیم "را" نے تخریب کاری کی
ٹریننگ دے کر پاکستان میں بے گناہ شہریوں کو اندھا دھند قتل کرنے، مسجدوں، بس
کے اڈوں اور دوسری پبلک جگھوں پر بموں کے دھماکے کرنے، مختلف مذہبی فرقوں
کے رہنماؤں اور اہل کاروں کو ہلاک کر کے مسلمانوں میں دینی انتشار پھیلانے اور
بڑے پیمانے پر تباہی مچانے کے لئے بھیجا ہے۔ جس ویگن کی تباہی میں تمہاری بیوی
ہلاک ہوئی ہے اس میں بم اسی شخص نے یا اس کے ساتھیوں نے رکھا تھا۔ موقع
واردات پر ہم نے اس گروہ کے دہشت گردوں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر دو
دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور یہ دہشت گرد دھرم چند پولیس کی
گولیاں لگنے سے زخمی ہو کر گر پڑا۔"

یہاں سلطان صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بٹ صاحب نے سلسلہ
کلام جاری رکھا اور کہنے لگے۔

"اگر کل رات تم اس دہشت گرد کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر ہسپتال میں
نہ آتے اور اگر آ کر اسے قتل کر کے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو یقین
کرو ہم بھارتی تخریب کاروں کو نہ صرف گرفتار کرنے بلکہ ان کی خفیہ تنظیم کا سراغ
لگانے اور اسے تباہ کرنے کے ایک یقینی منصوبے سے محروم ہو جاتے۔"

میں نے بٹ صاحب سے کہا۔

"آپ نے معاملے کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ میں صرف اس سوال کا
جواب چاہتا ہوں کہ مجھے یہ تصویر کس لئے دکھائی گئی ہے اور پولیس نے مجھے یہاں
بے جا حراست میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے میں ہسپتال میں ایک بھارتی
دہشت گرد کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر آیا تھا اور آپ کی پولیس نے مجھے پکڑ لیا
اور مجھ سے آلۂ قتل بھی برآمد ہو گیا لیکن میں پاکستان کا شہری ہوں مجھے عدالت میں
پیش کیا جائے اور اپنا وکیل کرنے کی اجازت دی جائے۔"

میں ابھی تک اس سنسنی خیز منصوبے سے بے خبر تھا جسے یہ لوگ پورے کا
پورا تیار کر چکے تھے اور جس کا مرکزی کردار مجھے ادا کرنا تھا۔ یہ منصوبہ اسقدر
خطرناک تھا کہ اس پر عمل کرتے ہوئے قدم قدم پر میری جان کو خطرہ تھا اور اسی
لرزہ خیز منصوبے کو میری اس داستان کی بنیاد بننا تھا۔ جو میں پاکستان کی نئی اور پرانی
نسل کو سنانا چاہتا ہوں۔ جب میں نے اپنا چالان عدالت میں پیش کرنے اور اپنا وکیل
کرنے کی بات کی تو سلطان صاحب نے بڑے پرسکون انداز میں میری طرف دیکھا
اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے بڑے برادرانہ لہجے میں کہا۔
"حیدر علی! تم سمجھ لو کہ تم پر جو فرد جرم عائد ہونی تھی پولیس نے تمہیں
اس سے بری کر دیا ہے۔ تمہارے خلاف کوئی مقدمہ بھی درج نہیں ہوا۔ تم بالکل
ویسے ہی ہو جیسے تم ہسپتال میں داخل ہوتے وقت پولیس کے پکڑے جانے سے پہلے
تھے۔"
میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے آپ لوگوں نے پولیس کی حراست میں کیوں
رکھا ہوا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے گھر چلا جاؤں۔"
بٹ صاحب نے میز پر کہنیاں ٹکا دیں اور میری طرف تھوڑا سا جھکتے ہوئے
کہا۔
"بے شک تم جس وقت چاہو اپنے گھر جا سکتے ہو لیکن پیارے بھائی! اس
بات کو ضرور یاد رکھنا کہ اگر تم اپنے گھر واپس چلے گئے تو پاکستان کے سر پر دہشت
گردی کی تلوار لٹکتی رہے گی اور آئندہ پاکستان میں جو بے گناہ لوگ دہشت گردوں
کے ہاتھوں بموں کے دھماکوں اور کلاشنکوفوں کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے انہیں تم
بچا سکتے تھے مگر تم نے نہیں بچایا۔"
میں نے حیرانی اور تعجب سے پوچھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں انہیں کیسے بچا سکتا ہوں؟ انہیں بچانا تو

پولیس کا کام ہے۔"

سلطان صاحب کہنے لگے۔

"پولیس تو پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر رہی ہے لیکن
پولیس دہشت گردی کے زہریلے درخت کی شاخیں ہی کاٹ سکتی ہے اس درخت
تنا پولیس کی پہنچ سے باہر ہے۔ تم اگر چاہو تو تمہاری مدد سے ہم دہشت گردی کا
صرف تنا کاٹ سکتے ہیں بلکہ اس کو جڑ سے اکھاڑ کر اس تخریب کاری کا ہمیشہ کے لے
خاتمہ کر سکتے ہیں۔"

"میں آپ کی مدد کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک عام سا شہری ہوں۔"

بٹ صاحب بولے۔

"یہ تمہیں ہم بتا دیں گے کہ تم ہماری کیسے مدد کر سکتے ہو۔ یہ پولیس کی مد
کا ہی سوال نہیں ہے بلکہ وطن عزیز کی سلامتی اور استحکام کو بچانے کا بھی سوال
ہے۔ ان دہشت گردوں کے ہاتھوں صرف تمہاری بیوی ہی ہلاک نہیں ہوئی کئی
دوسرے بے گناہ بچے بوڑھے جوان مرد اور عورتیں ہلاک ہو چکی ہیں اور آئے دن
ان دہشت گردوں کی تخریب کاری کا نشانہ بن رہی ہیں۔ کیا تم دہشت گردوں کے
ہاتھوں ہلاک ہونے والے دوسرے بھائی بہنوں کا غم اسی طرح محسوس کر سکتے ہو
جس طرح تم نے اپنی بیوی کی موت کا غم محسوس کیا ہے؟ کیا تم دوسرے پاکستانی
بھائی بہنوں کے قتل کا بدلہ کے لئے اسی طرح چھری جیب میں ڈال کر تخریب کاروں
کو قتل کرنے جا سکتے ہو، جس طرح دھرم چند کو قتل کرنے کے ارادے سے چھری
نیفے میں چھپا کر ہسپتال میں داخل ہوئے تھے؟ ہمیں تمہارا صرف ہاں یا نہ میں جواب
چاہیئے۔ اگر تم نے ہاں کر دی تو ہم ابھی تمہیں وہ سارا منصوبہ بیان کر دیں جو ہم
نے تمہیں دیکھنے کے بعد تیار کیا ہے۔ اگر تم نے کہا کہ تم ایسا نہیں کر سکتے تو ہم یہیں
سے تمہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر واپس تمہارے گھر بھیج دیں گے اور یقین کرو کہ
اس کے بعد پولیس تم سے کسی قسم کا کوئی سروکار کوئی تعلق نہیں رکھے گی اور

پولیس کے روزنامچے میں اگر تمہارا نام لکھا بھی گیاہے تو اسے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے گا اور تم ایک آزاد پاکستانی کی طرح اپنی مرضی اور آزادی سے زندگی بسر کر سکو گے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ پاکستان کی سلامتی کی خاطر میں ایک بار تو کیا ہزار بار اپنی جان قربان کر سکتا تھا اور میں بھی دوسرے محب وطن پاکستانیوں کی طرح بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ملک میں تخریب کاری اور دہشت گردی کے واقعات سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کمزور ہو رہا ہے بلکہ دوسرے ممالک میں اس کی ساکھ بھی گرتی جا رہی ہے اور کوئی دوسرا ملک پاکستان میں سرمایہ کاری کے لئے تیار نہیں ہو رہا اور اس وجہ سے پاکستان کی معیشت پر منفی اثر پڑ رہا ہے۔ اب اگر میری وجہ سے ملک میں بقول پولیس آفیسر سلطان صاحب اور بٹ صاحب کے دہشت گردی کا خاتمہ ہو سکتا تھا تو میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔

میں نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا۔

"میں پاکستان کی سلامتی اور استحکام کی خاطر اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔ میری طرف سے ہاں سمجھئے اور مجھے بتایئے کہ آپ کا منصوبہ کیا ہے اور مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

پولیس آفیسر بٹ صاحب اور سلطان صاحب کے چہرے مسرت سے کھل گئے۔ بٹ صاحب نے بھارتی دہشت گرد دھرم چند کی فوٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب اس فوٹو کو ایک بار پھر دیکھو۔"

فوٹو میرے سامنے میز پر پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ اس انڈین دہشت گرد کی شکل مجھ سے بے حد ملتی ہے۔ صرف بالوں اور ناک کی ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی ہڈی کا ہی فرق ہے۔اس کا ماتھا' کان' آنکھیں 'گردن میرے ماتھے 'کان اور آنکھوں جیسا ہے۔"

میں فوٹو سے نگاہیں اٹھا کر بٹ صاحب کی طرف دیکھا۔

"لیکن آپ کا منصوبہ کیا ہے اور مجھے وطن پاکستان کی سلامتی کی خاطر کیا کرنا ہوگا۔"

بٹ صاحب کہنے لگے۔

"تمہیں اس آدمی کی جگہ بھارتی دہشت گرد دھرم چند بن کر باڈر کراس کر کے انڈیا جانا ہوگا۔ ان دہشت گردوں کے ہیڈ کواٹر اور تربیتی مرکز میں جانا ہوگا اور وہاں رہ کر یہ راز معلوم کرنا ہوگا کہ پاکستان میں ان دہشت گردوں کے ٹھکانے کہاں کہاں پر ہیں اور تمہارے لئے یہ کام بڑا آسان ہوگا۔ کیونکہ تم کوئی بھیس بدل کر نہیں جاؤ گے۔ تم ان لوگوں کی تنظیم کے ایک رکن دہشت گرد دھرم چند کے روپ میں جاؤ گے۔ وہ لوگ تم سے کچھ بھی نہیں چھپائیں گے کیونکہ وہ تمہیں اپنا ہی آدمی سمجھیں گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میری ناک اس بھارتی دہشت گرد دھرم چند کی ناک سے مختلف ہے۔ وہ لوگ صاف پہچان جائیں گے کہ میں دھرم چند نہیں ہوں۔"

سلطان صاحب بولے۔

"اس کا حل بھی ہم نے سوچ رکھا ہے۔ یہ جدید ترین سائنسی ٹیکنولوجی کا زمانہ ہے۔ تمہاری ناک کی جو ذرا سی ہڈی اوپر کو ابھری ہوئی ہے اس کی پلاسٹک سرجری ہوگی۔ یہ بڑا معمولی سا آپریشن ہوگا اور تمہاری ناک ہوبہو دھرم چند کی ناک جیسی بنا دی جائے گی۔ تمہارے بال بھی مشین کے ذریعے مستقل گھنگریالے بنا دیئے جائیں گے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ تمہارا رنگ روپ اور قد کاٹھ بھی بالکل دھرم چند جیسا ہے اور ہمیں یہ معلوم کر کے بھی بے حد خوش ہوئی تھی کہ تم ہندی زبان بھی لکھ پڑھ اور بول سکتے ہو۔ اپنے آپ کو بھارت کا مستقل ہندو شہری ثابت کرنے کے لئے تمہارا ہندی زبان بولنا لکھنا اور پڑھ سکنا بڑا ضروری تھا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ دھرم چند بھارت کے کس شہر میں رہتا ہے اور وہاں اس کی پاکستان دشمن تنظیم کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔ دوسرے مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ دھرم چند نامی دہشت گرد جس کا روپ بدل کر میں انڈیا کا باڈر کراس کروں گا اس کے ماتا پتا کون ہیں' بھائی بہن کتنے ہیں۔ شادی شدہ ہے تو اس کی پتنی کا نام کیا ہے۔ اس کی شکل و صورت کیا ہے۔ یہ کس جگہ ملازمت کرتا ہے۔ اس کے دوست احباب کون کون ہیں۔ یہ ساری باتین مجھے کہاں سے معلوم ہوں گی؟"

بٹ صاحب نے اس کے جواب میں کہا۔

"دہشت گرد دھرم چند کو ہمارے ایک کانسٹیبل کی فائر کی ہوئی تین گولیاں لگی تھیں۔ دو گولیاں اس کے پیٹ میں سے نکل گئی تھیں۔ ایک گولی پھیپھڑوں میں بائیں جانب لگی تھی جو شانے کی ہڈی سے ٹکرا کر وہیں پھنس گئی تھی۔ اس گولی کو آپریشن کے بعد نکال دیا گیا ہے مگر پیٹ میں لگی ہوئی گولیوں کے زخم بڑے مہلک معلوم ہو رہے ہیں۔ یہ شخص اسی وقت سے ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ اگر اسے ہوش آگیا تو اس سے پوچھ گچھ کر کے معلوم کر لیں گے کہ وہ بھارت کے کس شہر سے آیا تھا اور وہاں اس کا گھر اور ماں باپ وغیر کہاں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے آگے جھوٹ بولے اور ہمیں اپنے بارے میں غلط باتیں بتائے۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

سلطان صاحب نے کہا۔

"ہم نے ہسپتال میں اس کے کپڑوں کی تلاشی لی تھی۔ اس کی جیبوں میں سے پچاس ساٹھ روپے کی پاکستانی کرنسی نکلی۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ نکلا جس میں سے تین سگریٹ غائب تھے۔ ایک ماچس تھی۔ پلازا سینما کا ایک آدھا کٹا ہوا ٹکٹ تھا

جس سے معلوم ہوا کہ اس نے رات کا شو دیکھا تھا۔ ہمیں ابھی تک یقین تھا کہ یہ شخص مسلمان ہے اور بھارتی تخریب کاروں کے ایجنٹوں نے روپے کا لالچ دے کر اس کے ذریعے انتہائی طاقتور بم تھیلے میں ڈال کر ویگن کی پچھلی سیٹ کے نیچے رکھوا دیا ہوگا لیکن اتفاق سے جب ہم اس کی شلوار کے نیفے کو ٹٹول رہے تھے تو ہمیں ایک جگہ سے نیفہ ابھرا ہوا نظر آیا۔ سلطان صاحب نے کہا کہ ضرور اس شخص نے نیفے میں ہزار روپے کا نوٹ مروڑی بنا کر چھپایا ہوگا۔ میں نے نیفے کو کاٹا تو اندر سے ہزار روپے کے نوٹ کی بجائے تہہ کیا ہوا کاغذ کا ایک پرزہ نکلا۔ ہم نے اسے کھولا تو اس پر ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اپنے ایک ہندی زبان کے ماہر سے وہ رقعہ پڑھایا تو معلوم ہوا کہ یہ دہشت گرد ہندو ہے اور اس کا نام دھرم چند ہے۔ اس کے فوراً بعد ہم نے اس کا انڈرویئر اتار کر دیکھا تو اس کے ختنے نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہندو تھا۔"

"اس رقعہ میں کیا لکھا ہوا تھا؟"

بٹ صاحب نے فائل میں سے کاغذ کا ایک مڑا تڑا پرزہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"تم خود پڑھ لو۔ تم تو ہندی لکھ پڑھ سکتے ہو بلکہ ہمیں بھی پڑھ کر سناؤ۔"

شاید وہ میرا امتحان لینا چاہتے تھے۔ میں نے رقعے کو ہاتھ میں اٹھایا۔ ہندی زبان میں اس میں لکھا تھا۔

"دھرم چند اپنی شیوسینا کا ممبر ہے۔ یہ میرا خط لا رہا ہے۔ خط لائے تو اس کو پاکستانی کرنسی میں ایک ہزار روپے دے دینا۔ یاد رکھو' اس کا نام دھرم چند ہے۔ وشواس نہ آئے تو اس کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کے پاس اپنی شوسینا کا سواستیکا کا نشان دیکھ لینا۔"

جب میں نے ہندی میں لکھا ہوا رقعہ صاف صاف پڑھ کر سنا دیا تو سلطان صاحب اور بٹ صاحب دونوں مسکرائے۔ سلطان صاحب نے کہا۔

"ہمارے آدمی نے بھی بالکل یہی ترجمہ کرکے بتایا تھا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں نے اس شخص کی کمر پر سواستیکا کا نشان دیکھا تھا؟"

بٹ صاحب بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم خط میں لکھا ہوا سن کر بھی ایسا نہ کرتے۔ ہم نے اسی وقت اسکی کمر کو دیکھا۔ وہاں بالکل درمیان میں ریڑھ کی ہڈی کے پاس سواستیکا کا چھوٹا سا نشان گدا ہوا تھا۔ یہ جرمنی کی نازی پارٹی کا نشان تھا اور اب بھارت کی انتہا پسند ہندو جماعت شیوسینا کا بھی یہی نشان ہے۔"

سلطان صاحب کہنے لگے۔

"ہم دھرم چند کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ جس شخص کے نام ہندی میں یہ رقعہ لکھا گیا ہے وہ پاکستان میں کہاں رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"اگر دھرم چند کو ہوش نہ آیا اور وہ بے ہوشی میں ہی مر گیا تو پھر یہ کیسے معلوم ہو گا کہ بھارت میں اسے واپس کس جگہ جانا تھا اور بھارت میں جہاں ان دہشت گردوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے وہ جگہ کہاں پر ہے اور اس شخص دھرم چند کے ماتا پتا بہن بھائی پتنی کہاں رہتی ہے؟"

سلطان صاحب نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"پیارے بھائی' یہ تو پھر سب کچھ تمہیں بھارت میں داخل ہونے کے بعد خود ہی معلوم کرنا پڑے گا۔"

میں نے فورا" کہا۔

"اگر دھرم چند ہسپتال میں مر گیا تو اخباروں میں یہ خبر چھپ جائے گی کہ جس دہشت گرد کو پولیس نے زخمی حالت میں پکڑا تھا وہ مر گیا ہے۔ اس کے

ساتھیوں کو بھی اس خبر سے اس کی موت کا علم ہو جائے گا اور وہ بھارت میں اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کر دیں گے کہ دھرم چند مرگیا ہے۔ اس کے بعد جب میں دھرم چند کے روپ مین ان کے درمیان جاؤں گا تو میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

بٹ صاحب بولے۔

"ہم خفیہ پولیس والے اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلتے رہے۔ ہم نے اس کے بارے میں بھی سوچ رکھا ہے کہ ہمیں ایسی صورت حال میں کیا کرنا ہو گا۔ اگر فرض کر لیا کہ دھرم چند ہسپتال میں مرجاتا ہے تو ہم سرکاری طور پر اس کی موت کی خبر کو باہر نہیں نکلنے دیں گے اور اخبار والوں اور ہسپتال کے متعلقہ ڈاکٹروں سے کہہ دیں گے کہ ملکی سلامتی کے پیش نظر دھرم چند کی موت کی خبر کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ یہ کام کس طریقے سے کرنا ہے ہم جانتے ہیں۔ ہم دھرم چند کی لاش گم کر دیں گے اور اخباروں میں یہ خبر چھپوا دیں گے کہ جو دہشت گرد دھرم چند پولیس مقابلے میں زخمی ہوگیا تھا اور ہسپتال میں پولیس کی حراست میں تھا وہ ہسپتال سے فرار ہوگیا ہے اور پولیس سرگرمی سے اس کی تلاش میں ہے بلکہ ہم دھرم چند کی فوٹو کے ساتھ اخباروں میں اشتہار بھی چھپوا دیں گے کہ یہ بھارتی دہشت گرد پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا ہے جو کوئی اس کو پکڑ کر لائے گا یا اس کی نشان دہی کرے گا اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یہ اشتہار اور خبر پاکستان میں بھی اور انڈیا میں بھی دھرم چند کے ساتھیوں تک پہنچ جائے گی اور انہیں یقین ہو گا کہ ایک نہ ایک دن دھرم چند ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ چنانچہ جب تم باڈر کراس کرکے انڈیا میں شیو سینا کے ہیڈ کوارٹر پہنچو گے تو تم ہی بیان دو کہ تم زخمی نہیں ہوئے تھے۔ پولیس نے زخمی ہونے کی غلط خبر مشہور کر دی تھی۔ پولیس تمہیں پکڑ کر پوچھ گچھ کے لئے لے گئی تھی جہاں تم پر تشدد کیا گیا مگر تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"

یہ منصوبہ بیان کرنے کی حد تک بالکل صحیح تھا مگر عملی طور پر یہ ایک گورکھ

دھندا تھا اور بڑا الجھا ہوا تھا اور اگر میں باڈر کراس کر کے بھارت پہنچ جاتا ہوں تو میرا راز فاش ہو جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ دھرم چند کس صوبے کا رہنے والا ہے۔ اس کی قد کاٹھ اور رنگ بتا رہی تھی کہ وہ بھارتی پنجاب کا باشندہ ہوگا۔

میں نے دونوں پولیس آفیسران سے آخر میں پوچھا۔

"اب جبکہ میں نے آپ کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں صرف اور صرف ملکی سلامتی کی خاطر یہ خطرناک ترین آپریشن کے لئے تیار ہوں تو براہ مہربانی مجھے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔"

بٹ صاحب بولے۔

"پیارے بھائی، تمہیں گھر جانے کی اجازت ہے مگر تمہیں دو ایک باتوں کی بڑی سختی سے پابندی کرنی ہوگی اور یہ سوچ کر اس پابندی کو اختیار کرنا ہوگا کہ تمہارے ملک و قوم کی سلامتی اور عزت آبرو کا معاملہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم کسی کو اس خفیہ منصوبے کی بھنک تک نہیں پڑنے دو گے۔ دوسرے یہ کہ جس جگہ تم اس وقت بیٹھے ہو اور جہاں تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا اس جگہ کے بارے میں بھی کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔ اسکے علاوہ ہم تمہارے ناک کی پلاسٹک سرجری کا انتظام بھی کر رہے ہیں۔ پلاسٹک سرجری کے دوران اور پلاسٹک سرجری کے بعد ایک خفیہ مقام پر رہنا ہوگا جہاں سوائے اس کے کہ تم ہمارے علاوہ کسی سے مل نہیں سکو گے تمہیں وہاں زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہوں گی۔ یہ ایک ایسی پابندی ہوگی جو خود ساختہ ہوگی اور جسے تم اپنے وطن پاکستان کی سلامتی اور پاکستان دشمن بھارتی دہشت گردوں کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کرنے کی خاطر خود اپنے اوپر عائد کرو گے۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کر رہے۔ یہ معاملہ ہم نے تمہاری اپنی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر تم اپنے وطن اور اپنے وطن میں بسنے والے کروڑوں فرزندان توحید کی سلامتی کے پیش نظر اس جہاد میں حصہ لینے کے لئے تیار ہو تو یہ

ہماری اور ہمارے ملک کی خوش قسمتی ہوگی۔"

وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ مجھے یقینی طور پر ایک کڑی آزمائش میں ڈالا جا رہا تھا لیکن میں پیچھے ہٹنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بہن نہ بھائی۔ ایک زندگی کی ساتھی محبت کرنے والی بیوی زیب النساء تھی۔ دہشت گردوں نے اسے بھی زندہ نہ چھوڑا - میں نے بٹ صاحب اور سلطان صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں اپنے وطن پاکستان اور پاکستان میں بسنے والے اپنے بھائی بہنوں کی سلامتی کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

سلطان صاحب اور بٹ صاحب نے اٹھ کر مجھے باری باری گلے لگایا۔ سلطان صاحب کہنے لگے۔

"بھارت کا بارڈر کراس کرانے سے پہلے تمہیں تھوڑی بہت کمانڈو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔ اس ٹریننگ میں ہر قسم کا اسلحہ چلانے کی ٹریننگ ہو گی۔ کچھ ورزشوں اور سو میٹر کی دوڑ سے تمہارے جسم کو تکلیفوں اور مشقتوں کا عادی بنایا جائے گا۔ خفیہ کوڈ سمجھایا جائے گا۔ سگنلز بھیجنے اور وصول کرنے کا مختصر سا کورس پڑھایا جائے گا تاکہ تم دشمن ملک سے ہمیں ضروری اشاروں کی زبان میں بھیج سکو۔"

میں نے انہیں کہا کہ میں نے اپنا آپ' اپنی زندگی' اپنا مستقبل اپنے ملک کے حوالے کر دیا ہے۔اب میرا ہر قدم پاکستان کی سلامتی' ترقی اور ملک سے بدامنی اور دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کی طرف اٹھے گا۔ بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے بیک زبان کہا کہ ملک وملت کو آپ ایسے محب وطن سرفروش جانبازوں کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں آدمی پولیس کے حساس ادارے کے خود بڑے جانباز قسم کے افسر تھے اور پاکستان سے دہشت گردی کے خاتمے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ اگرچہ میرا مشن بے حد خطرناک تھا لیکن یہ مشن ملک کی سلامتی کے لئے

حد مفید اور ضروری تھا۔ میں ان سے مشورہ کرنے کے بعد ایک دو دن کے لئے
وہاں سے آگیا۔ میں نے اپنے شو روم پر ایک پڑھا لکھا نوجوان ملازم رکھا ہوا تھا۔
اسے کہا کہ میں کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ یہ تین چار مہینوں کا
دورہ ہوگا۔ اگر مجھے اس سے زیادہ دیر لگ گئی تو پریشان نہ ہونا۔ اس نوجوان کا نام
عبدالرشید تھا۔ میری طرح اس کا بھی آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ
اس دوران میرا مکان خالی ہوگا۔ وہ میرے مکان پر رہنا شروع کر دے۔ چچا پہلے ہی
مجھ سے ناراض تھا اور میری ان کی بول چال کسی وجہ سے بند تھی۔ انہیں بتانے کی
ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اٹیچی کیس میں کچھ کپڑے اور ضروری چیزیں
رکھیں اور اس ویران سی کوٹھی میں آگیا جہاں سلطان صاحب اور بٹ صاحب نے
مجھے ایک کمرہ دے رکھا تھا۔

اسی رات وہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر اس خفیہ مقام پر لے گئے
جہاں مجھے اپنے مشن پر روانہ ہونے سے پہلے تک قیام کرنا تھا۔ یہ جگہ شہر سے باہر
تھی۔ میں نہیں بتاؤں گا کہ یہ کس مقام پر تھی۔ وہاں میرے لئے ایک بارک نما کمرہ
تیار کروا دیا گیا تھا۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی اور آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔
کھیت بھی نہیں تھے۔ بنجر سا میدان چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہاں میرے لئے
انتہائی سادگی کی شکل میں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔ باورچی خانہ کچھ فاصلے پر
تھا۔ وہاں اور کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ باورچی ہی صبح شام کھانا وغیرہ پکاتا اور مجھے
کمرے میں دے جاتا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا اور بہت کم بات کرتا تھا۔ یہاں آئے مجھے
تین دن گذر گئے تو بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے آکر بتایا کہ مجھے آج رات
کی فلائیٹ سے کراچی جانا ہوگا جہاں میرے ناک کی پلاسٹک سرجری ہوگی۔ مجھے کیا
اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں خود چاہتا تھا کہ پلاسٹک سرجری کے بعد میری شکل ہو بہو
بھارتی دہشت گرد دھرم چند کی شکل ایسی ہو جائے تاکہ میں اس کا روپ بدل کر
دشمن کے گھر میں جا کر اس کے پاکستان دشمن منصوبوں کو خاک میں ملا سکوں۔ مجھے

اس بات کا احساس تھا کہ میں دشمن کے مورچوں میں جارہا ہوں اور میرے زندہ واپس آنے کی بہت کم امید ہے لیکن مجھے موت کا بالکل خوف نہیں تھا۔ ملک و ملت کی خاطر جان دینا ایک سعادت ہے۔

کراچی میں کئی روز تک میرے ناک کی پلاسٹک سرجری کا عمل جاری رہا۔ یہ کام بھی خفیہ طور پر ہو رہا تھا۔ جب سرجری کا مرحلہ طے ہوگیا تو مجھے آئینہ دکھایا گیا۔ میرے ناک کے اوپر کی جانب جو ہڈی اوپر کو ابھری ہوئی تھی وہ اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میرے بالوں کو جدید ٹیکنیکی آلات کی مدد سے گھنگھریالے بنا دیا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ بال کم از کم ایک سال تک ایسے ہی رہیں گے۔ اس کے بعد ان کا گھنگھریالہ پن ختم ہونا شروع ہو جائے گا۔ تب میں دھرم چند کی حیثیت سے اگر بالوں کو منڈوا بھی دوں گا تو کسی کو شک نہیں پڑے گا۔ اب جو مجھے بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے کراچی کے ہوٹل کے کمرے میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے' دہشت گرد دھرم چند کا فوٹو دکھایا تو میں خود حیران رہ گیا۔ میری اور دھرم چند کی شکلوں میں ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔ اب یہ معلوم کرنا بڑا ضروری تھا کہ بھارتی دہشت گرد دھرم چند کون سے صوبے کا رہنے والا ہے اور پنجابی بولتا ہے یا کوئی دوسری زبان بولتا ہے۔ ہسپتال میں ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔

جس خفیہ مقام پر میں نے اپنا ڈیرا جمایا تھا' وہاں میری کمانڈو ٹریننگ شروع ہو گئی۔ ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے کی مشقیں ہونے لگیں۔ ہر قسم کا چھوٹا بڑا اسلحہ چلانے کی تربیت دی جانے لگی۔ ساتھ ساتھ جسمانی ورزش صبح و شام کرائی جاتی۔ میدان میں دوڑایا جاتا۔ پہلے میں میدان کا آدھا چکر لگانے کے بعد ہی تھک کر بیٹھ جاتا تھا اور میرا سانس پھول جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ میرا سانس پکا ہوگیا اور میں میدان کے دو دو تین تین چکر لگانے لگا۔ اس دوران بٹ صاحب اور سلطان صاحب سے روزانہ ملاقات ہوتی۔ وہ عام طور پر شام کے وقت آتے۔ ایک روز آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہسپتال میں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا

بھارتی دہشت گرد دھرم چند کو ہوش آگیا ہے۔ سلطان صاحب نے کہا۔

"ابھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اسے ہوش ہی آیا ہے۔ امید ہے کل شام تک وہ بات کرنی شروع کر دے گا اور ہمیں یہ پتہ چل جائے گا کہ وہ بھارتی پنجاب کا رہنے والا ہے یا کسی دوسرے صوبے سے اس کا تعلق ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔

"اس کا ہوش میں آ جانا ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم اس سے یہ بھی معلوم کر سکیں گے کہ بھارت میں اس کے ماتا پتا اور بیوی بچے کس شہر میں رہتے ہیں اور شیو سینا اور راشٹریہ سیوک سنگ کے دہشت گردی کے ٹریننگ سنٹر کہاں کہاں ہیں۔ ان معلومات کے بعد تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"اس کا زندہ رہنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

سلطان صاحب بولے۔

"ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں لیکن ہم دھرم چند کو مارنا بھی نہیں چاہتے آج نہیں تو کل ہمیں اس سے بڑی مفید معلومات مل سکتی ہیں۔ باقی زندہ بچ جانے کی صورت میں ہم اسے راتوں رات ہسپتال سے نکال کر ایک خفیہ جگہ پر پنہچا دیں گے اور اخباروں میں اس کے فرار کی خبر چھپوا دیں گے۔ یہ خبر دھرم چند کے ساتھی دہشت گردوں اور پاکستان میں بھارتی سفارت خانے کی وساطت سے بھارت میں شیو سینا کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ جائے گی اور جب تم وہاں جاؤ گے تو تم بھی یہی ظاہر کرو گے کہ تم پاکستان کی جیل سے فرار ہو کر آئے ہو اور کسی کو تم پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑے گا کیونکہ تم ہر اعتبار سے دھرم چند کے ہم شکل ہو گے۔"

میں نے کسی قدر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس بات کا یقین کرا دیا جانا چاہئے کہ میرے بھارت پہنچنے کے بعد دھرم چند فرار ہو کر وہاں نہیں آجائے گا۔"

بٹ صاحب اور سلطان صاحب مسکرانے لگے۔ بٹ صاحب نے کہا۔

پیارے بھائی ! اطمینان رکھو۔ جب تک تم بھارت میں رہو گے اور جب تک تمہارا مشن مکمل نہیں ہو جاتا دھرم چند کو ہم نے جس تہہ خانے میں بند کیا ہوا ہو گا وہ اسی جگہ رہے گا۔ اس کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میری کمانڈو ٹریننگ ایک ماہ تک جاری رہی۔ میں پہلے والا عام قسم کا آدمی نہ رہا۔ میں پورا کمانڈو بن گیا۔ مجھے ایک تالاب میں پھر دریا میں تیرنے کی بڑی سخت مشقیں بھی کرائی گئیں۔ مجھے ایک ایسا جوان بنا دیا گیا جو سخت جانی میں چٹان سے زیادہ مضبوط تھا اور دشمن کے ملک میں دشمن کے ہر حربے کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس اثناء میں اصلی بھارتی دھرم چند کافی صحت یاب ہو گیا تھا اور پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ میں اس پوچھ گچھ کے نتائج کا انتظار کر رہا تھا۔

ایک شام بٹ صاحب اور سلطان صاحب میرے پاس آئے۔ یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ دھرم چند پنجابی ہے مگر یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ بھارتی پنجاب کے کس شہر کا رہنے والا ہے۔ اس شام بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے آکر مجھے بتایا کہ دھرم چند بڑا پکا دہشت گرد ہے۔ وہ زبان نہیں کھولتا۔

"لیکن انٹیروگیشن کے ایک سائنسی فارمولے پر عمل کرنے کے بعد ہمیں صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ دہشت گر دھرم چند ہرچووال قصبے کا رہنے والا ہے۔ یہ قصبہ بھارت کے ضلع گورداسپور میں بٹالہ گورداسپور ریلوے لائن پر قادیاں کے سٹیشن سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

سلطان صاحب نے بٹ صاحب کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دوسری جو اہم بات دھرم چند کی زبانی معلوم ہوئی ہے یا ہو سکی ہے وہ یہ ہے کہ شیوسینا کے یہ پاکستان دشمن دہشت گرد اپنے کسی ہیڈ کوائر سے دہشت گردی کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد بٹالہ کے شیوا مندر میں آکر اکٹھے ہوتے ہیں اور وہاں سے انہیں کسی طریقے سے تخریب کاری کے لئے پاکستان میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بارڈر کراس کرنے کے بعد سب سے پہلے بٹالہ کے شیوا مندر میں جاکر دوسرے بھارتی دہشت گردوں سے رابطہ پیدا کرنا ہوگا جو کسی نہ کسی بھیس میں وہاں پر موجود ہوں گے اور اگر تم ان کا سراغ نہ لگا سکے تو وہ خود تمہارے پاس آجائیں گے کیونکہ تم ہو بہو دھرم چند لگتے ہوں اور وہ تمہیں دھرم چند ہی سمجھیں گے۔

ہرچووال قصبے میں دھرم چند کے گھر والوں کے بارے میں ضروری معلومات تمہیں بڑی عقل مندی اور محتاط رہ کر خود ہی معلوم کرنی ہوں گی تاکہ اگر تم جب بھی دھرم چند کے گھر میں جاؤ تو تمہیں پتہ ہونا چاہئے کہ اس کی پتنی ہے یا نہیں اس کے ماتا پتا زندہ ہیں یا نہیں۔ اس کے کتنے بھائی بہن اور رشتے دار ہیں۔

ہم نے دھرم چند سے اس کے گھر بار والوں کے بارے میں معلومات

حاصل کرنے کی بے حد کوشش کی ہے مگر وہ ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ اس پر تشدد کرتے ہیں تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ بڑا تجربہ کار اور تربیت یافتہ بھارتی دہشت گرد ہے۔ صرف جہاں وہ رہتا ہے اس قصبے ہرچووال اور بٹالہ میں جہاں شیوسین اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے دہشت گرد آکر جمع ہوتے ہیں اس مندر کا نام بڑی مشکل سے اور بڑے جتن کرنے کے بعد معلوم ہو سکا ہے۔"

میں خود پورا ٹرینڈ ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ جتنی معلومات آپ نے دھرم چند سے حاصل کی ہیں میرے لئے اتنی ہی بہت ہیں۔ باقی سارے حالات میں انشاللہ وہاں پہنچ کر معلوم کر لوں گا۔"

سلطان صاحب کہنے لگے۔

"مجھے یقین ہے حیدر علی کہ تم اس آزمائش پر پورے اترو گے اور پاکستان دشمن کی دہشت گردی اور تخریب کاریوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔"

"انشاللہ!"

بٹ صاحب اور سلطان صاحب واپس جانے لگے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ کل سے مجھے خفیہ کوڈ اور سگنلز کی ٹریننگ دی جائے گی۔

"یہ چھوٹا سا کورس ہوگا۔ تم پڑھے لکھے ذہین جوان ہو۔ بڑی جلدی سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔"

یہ ایسی ٹریننگ تھی جس میں زیادہ تر بعض چیزوں کو یاد رکھنے کی ضرورت تھی۔ یہ کورس بھی میں نے کامیابی سے پاس کر لیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت بٹ صاحب اور سلطان صاحب آئے۔ سلطان صاحب نے آتے ہی اپنے بریف کیس میں سے اردو کا ایک اخبار نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ ایک خبر پر لال پنسل سے نشان لگا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔

"حیدر علی! یہ خبر پڑھو۔"

اخبار کے دوسرے صفحے پر بڑی سرخی کے ساتھ خبر چھپی ہوئی تھی کہ
بھارت کا دہشت گرد دھرم چند جسے پولیس عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جا
رہی تھی ضلع کچہری کے باہر سے پولیس کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب
ہو گیا ہے۔ پولیس نے شہر کی ناکہ بندی کر لی ہے اور دوسرے شہروں کی پولیس کو
بھی ملزم کو پکڑنے کے لئے الرٹ کر دیا ہے۔ میں نے خبر پڑھنے کے بعد بٹ صاحب
سے کہا۔

"دھرم چند اس وقت کہاں ہے؟"

سلطان صاحب بولے۔

"ہم نے اسے ایک ایسے خفیہ مقام پر چھپا دیا ہے جہاں سے ہندوؤں کے
سارے دیوتا بھی آ جائیں تو دھرم چند کا سراغ نہیں لگا سکیں گے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔

"کل کے اخباروں میں دھرم چند کو گرفتار کرنے والے یا اس کا سراغ
لگانے والے کو پچاس ہزار روپے انعام کے اعلان کا اشتہار بھی چھپ جائے گا۔"

سلطاب صاحب بولے۔

"اشتہار میں دھرم چند دہشت گرد کی تصویر بھی دی جائے گی۔ ویسے یہ خبر
آج شام تک بھارتی سفارت خانے کے ذریعے بھارت کے پریس کو مل جائے گی اور
کل بھارت کے اخباروں میں بھی چھپ جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اپنا مشن شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"ہم تمہیں یہی کہنے آئے تھے کہ اب تم تیاری پکڑ لو۔"

میں نے بٹ صاحب کو جواب دیا۔ "بٹ صاحب! میں تو خود
میدان جہاد میں اترنے کو بے تاب ہوں۔ مجھے یہ کہئے کہ یہاں سے نکلنا کب
ہے؟"

سلطان صاحب بولے۔

"بارڈر کراس کرنے کے لئے کل آدھی رات کے بعد رات کے تین بجے کا ٹائم طے ہوا ہے۔ ہم کل شام کو یہاں آ جائیں گے۔ بس تم تیار رہنا۔"

"آپ مجھے ہر وقت تیار پائیں گے۔ میں پاکستان کے دشمنوں پر کاری وار کرنے کے واسطے بے چین ہوں۔"

اس کے بعد بٹ صاحب نے جیب سے ایک چھوٹا سا نقشہ نکالا۔ یہ بھارتی پنجاب کا نقشہ تھا۔ وہ مجھے سمجھانے لگے کہ بٹالہ کا سٹیشن امرتسر شہر سے پینتالیس چھیالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں قادیاں کا سٹیشن آتا ہے۔ قادیاں سے تین میل کے فاصلے پر مغرب کی سمت دھرم چند کا گاؤں ہرچووال ہے مگر مجھے ابھی سیدھا بٹالہ جانا ہوگا۔ انہوں نے کہا۔

"بٹالے میں ست کرتاریہ گوردوارے کے پیچھے ایک بازار ہے۔ شیوا کا مندر اسی بازار میں ہے۔ اس مندر کو شیو جی کا مندر بھی کہتے ہیں اور پاروتی جی کا مندر بھی کہتے ہیں مگر یہ شیو مندر کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ تمہیں سیدھا اس مندر میں پہنچنا ہے۔ اول تو وہاں پر موجود بھارتی دہشت گرد تمہیں پہچان کر خود تمہارے پاس آ جائیں گے۔ دوسری صورت میں تمہیں خود انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ اس کام کے لئے نہایت عقلندی' ہوشیاری' احتیاط اور قیافہ شناسی سے کام لینا ہوگا۔ جس خفیہ کوڈ کی زبان میں تم ہمیں اشد ضرورت کے وقت کوئی پیغام دو گے وہ تمہیں زبانی یاد کرا دیا گیا ہے اور سگنل کے اشارے بھی سمجھا دیئے گئے ہیں۔"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

"مجھے یہ سب کچھ اچھی طرح سے زبانی یاد ہوگیا ہے لیکن کیا اس کے لئے مجھے کوئی ٹرانسمیٹر یا وائرلیس سیٹ ساتھ لے جانا پڑے گا؟"

سلطان صاحب کہنے لگے۔

"ہم تمہیں امرتسر میں ایک آدمی کا پتہ دیں گے۔ اس کا حلیہ اور اصلی نام

اور جس نام سے وہ امرتسر میں رہ رہا ہے وہ بھی بتا دیں گے۔ ہم تمہارے جانے کے بعد اسے بھی تمہارے بارے میں بتا دیں گے اور تمہارا حلیہ وغیرہ بھی اسے بتا دیں گے۔ تم نے اگر بھارتی پنجاب میں رہتے ہوئے ہمیں کوئی ضروری پیغام بھجوانا ہو تو تم امرتسر میں اس اپنے آدمی سے جا کر ملو گے۔ اس کے پاس وائرلیس سیٹ موجود ہے جہاں سے تم ہمیں خفیہ کوڈ میں پیغام دے سکو گے۔ بغیر کسی ضرورت کے تم اس آدمی کے پاس ہرگز نہیں جاؤ گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا یہ ہمارا جاسوس ہے؟"

بٹ صاحب کہنے لگے۔

"آج کی دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں دوسرے ملک کے جاسوس موجود نہ ہوں۔ پاکستان میں بھی بھارت کے ایسے جاسوس ضرور موجود ہوں گے۔ یہ لوگ دوسرے ملک کے سیاسی معاشی حالات، فوجوں کی نقل و حرکت کے بارے میں اپنے ملک کو باخبر رکھتے ہیں۔ ہر ملک کی خفیہ پولیس ان جاسوسوں کے پیچھے لگی رہتی ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں بین الاقوامی قانون کے مطابق ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور سات آٹھ سال کے لئے انہیں جیل میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن جہاں دو ملکوں کی آپس میں زبردست دشمنی ہو تو وہاں جب یہ جاسوس پکڑے جاتے ہیں تو ان پر غیر انسانی تشدد کیا جاتا ہے اور وحشیانہ اذیتیں دی جاتی ہیں اور عام طور پر اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ اس لئے تمہیں بھارت میں بے حد محتاط رہنا پڑے گا۔ تمہارے پکڑے جانے کی صورت میں ہم یہاں بیٹھ کر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

اس کے بعد بٹ صاحب نے اپنے اس آدمی کا اصلی نام بھی بتایا اور وہ نام بھی بتایا جس نام سے وہ امرتسر میں بھارتی شہری کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ میں دونوں نام ملکی سلامتی کے پیش نظر آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ یہ جانباز لوگ ایسا

زندگیاں خطرات میں ڈال کر اپنے ملک کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بٹ صاحب نے مجھے اس آدمی کا حلیہ بھی بتایا اور وہ پاس ورڈ بھی بتایا جس کو بولنے سے ہمیں ایک دوسرے کو اپنا تعارف کرانا تھا۔ یہ پاس ورڈ ایک مکالمے کی شکل میں تھا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ ہمارا دشمن اسے پڑھ لے گا اور ہمارے مجاہد جاسوس کے پکڑے جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ پاس ورڈ اچھی طرح سے یاد کر لیا۔

بٹ صاحب اور سلطان صاحب دوسرے روز رات کا اندھیرا ہوتے ہی آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ اگلا دن میں نے بعض کوڈ الفاظ کو زبانی یاد کرنے میں گذار دیا۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ بارشیں خوب ہوئی تھیں مگر اب برسات کا زور ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ اگست کے مہینے کے آخری دن تھے۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی بٹ صاحب اور سلطان صاحب اپنی چھوٹی سی پرانی جیپ میں سوار ہو کر آ گئے۔ وہ میرے لئے کھدر کا ایک پرانا کرتہ اور پاجامہ اور چپل اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ پاجامہ تنگ موری کا تھا جیسا کہ بھارت کے ہندو پہنا کرتے ہیں۔ مجھے بھارتی کرنسی میں پچاس ساٹھ روپے بھی دئے گئے۔ ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ رات دس بجے تک بٹ صاحب اور سلطان صاحب مجھے بعض ضروری باتیں اچھی طرح سمجھاتے اور ذہن نشین کراتے رہے۔ پھر سلطان صاحب نے کہا۔

"حیدر علی! تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ ہم تمہیں وقت پر جگا دیں گے۔ تمہارے لئے دو تین گھنٹے کی نیند لینا ضروری ہے۔"

میں دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ چھت کے ساتھ پنکھا چل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ موت کے جس مشن پر میں جا رہا ہوں کیا وہاں سے زندہ واپس آ سکوں گا؟ یہ میں محض تقاضائے بشری کے تحت سوچنے لگا تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اس قسم کے کمزور خیالوں کو اپنے ذہن سے نکال کر پھینک دیا۔ کیونکہ اسی قسم کی باتیں سوچنے والا کمانڈو دشمن سے لڑ نہیں سکتا۔ مجھے اپنی پیاری اور محبت کرنے

ہوی زیب النساء کا خیال آگیا۔ اس کی شکل میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ پھر
لمر یاد آگیا جب اس ویگن کے پرخچے اڑ گئے تھے اور آگ کے شعلوں میں بدل
تھی جس میں میری بیوی سوار تھی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے ان معصوم
توں' بچوں اور بے گناہ پاکستانی شہریوں کا خیال آنے لگا جو بھارت کے دہشت
وں کے ہاتھوں پاکستان میں شہید ہو گئے تھے۔

میں بھارت کے دہشت گردوں سے اپنی بیوی اور اپنے شہید پاکستانی بھائی
ں کابدلہ لینے کے لئے بے چین ہو گیا۔ میں بستر پر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کی
ں نے بجھا دی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر بستر پر بیٹھا اندر ہی اندر
ی جذبے سے کھولتا رہا۔ پھر لیٹ گیا اور اپنے اوپر نیند طاری کرنے کی کوشش
ے لگا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

جس وقت بٹ صاحب نے مجھے جگایا اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔
نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ جو ہندوانہ کپڑے وہ میرے لئے لائے تھے وہ کپڑے
۔ مجھے ایک بار پھر خفیہ کوڈ کے الفاظ کی مشق کرائی گئی کیونکہ یہ کوڈ میں لکھ کر
پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے اسے یاد کرنا تھا۔ جب سب تیاری مکمل ہو گئی تو
رے سے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ آسمان پر ایک بھی ستارہ
تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں بٹ
ب اور سلطان صاحب کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ بٹ صاحب جیپ خود چلا
تھے۔ جیپ کچے راستے پر چل پڑی۔ یہ کچی سڑک بنجر میدان میں سے ہوتی
ایک پکی سڑک پر آ جاتی تھی۔ اس سڑک پر جیپ کوئی دس پندرہ منٹ تک
کے بعد ایک بار پھر ایک کچے راستے پر پڑ گئی۔ اندھیرے میں کہیں کہیں درختوں
ہیولے نظر آ رہے تھے نہ میں نے ان سے پوچھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں
ہوں نے کچھ بتایا۔ ہم تینوں خاموش بیٹھے تھے اور جیپ کچے میدان میں تیزی
جا رہی تھی۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہماری جیپ ایک جگہ درختوں کے نیچے جا کر رک گئی۔ بٹ صاحب اور میں جیپ میں بیٹھے رہے۔ سلطان صاحب بولے۔

"اپنا آدمی یہیں کہیں ہو گا۔"

پھر وہ جیپ سے اترے اور درختوں کی طرف چلے گئے۔ جدھر کافی اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ جیپ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ آدمی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ لباس سے وہ کوئی دیہاتی لگتا تھا۔ یہ آدمی جیپ سے چند قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ سلطان صاحب اکیلے ہماری طرف آئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"دوست! ہم تمہیں خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔ یہ آدمی تمہیں اپنی حفاظت میں بارڈر کراس کروا کر بھارت میں پہنچا دے گا۔"

سلطان صاحب اور بٹ صاحب باری باری مجھ سے گلے ملے۔ بٹ صاحب نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ساری قوم اس وقت سو رہی ہے۔ سوائے ہم دونوں کے اور کسی کو معلوم نہیں کہ تم اس عزم کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہے ہو کہ قوم سکھ کی نیند سو سکے۔ تمہاری یہ قربانی قوم کی نظروں سے اوجھل رہے گی مگر خدا کے دربار میں تمہیں اس کا بڑا اجر ملے گا۔"

میں نے اپنے جذبات کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"خدا پاکستان کی حفاظت کرے"

اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بٹ صاحب جیپ کے پاس ہی کھڑے رہے۔ سلطان صاحب مجھے لے کر اس دیہاتی کے پاس آ گئے' جو اندھیرے میں خاموش کھڑا تھا اور جس نے مجھے بارڈر کراس کرانا تھا۔ سلطان صاحب نے اس آدمی کا نام لے کر کہا۔

"جاؤ ہوشیار ہو کر جانا۔"

اس دیہاتی نے صرف اتنا جواب دیا۔

"اللہ مالک ہے۔"

اور مجھے اپنے ساتھ لے کر کھیتوں میں ایک طرف چل پڑا۔ یہ کھیت کہیں ہیں تھے۔ زمین زیادہ تر بنجر تھی۔ صرف ایک پتلی سی پگ ڈنڈی تھی جس پر ہم چلے جا رہے تھے۔ میرا گائیڈ آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان پر بادل جھکے ہوئے ہیں اور کسی بھی وقت بوندا باندی شروع ہو سکتی ہے۔ مجھے سلطان صاحب نے جیپ میں ہی ہدایت کر دی تھی کہ میں اپنے گائیڈ سے بغیر اشد ضرورت کے کوئی بات نہ کروں۔ یہ دیہاتی گائیڈ بھی بڑی خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن اس اندھیرے میں کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کے دھندلے خاکے سے نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور بنجر میدان آگیا۔ یہاں زمین بالکل چٹیل تھی۔ دور دور درختوں کے سیاہ خاکے ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ پھر کھال آگیا ہم اس کے پل پر سے گزر گئے۔ یہ سیم کا نالہ معلوم ہوتا تھا۔ اندھیرے میں مجھے اس کے پانی کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ میرا گائیڈ اب میرے ساتھ چلنے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ آگے چلا گیا۔ تھوڑی دور تک وہ مجھے نظر آتا رہا پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں رات کے اندھیرے میں زمین پر بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی بند ہو گئی تھی۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ ایک منٹ کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ میرے گائیڈ نے مجھ سے کہا۔

"یہ تمہیں آگے لے جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے دوسرے آدمی کے حوالے کر دیا اور جدھر سے مجھے لے کر آیا تھا ادھر کو چل دیا۔ نئے گائیڈ نے مجھے پنجابی میں آہستہ سے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

میرے اندازے کے مطابق ہم کوئی میل ڈیڑھ میل چلے ہوں گے۔ سارا علاقہ سنسان اور غیر آباد تھا۔ پھر اونچے نیچے ٹبے شروع ہو گئے۔ ان ٹبوں درمیان اونچے اونچے سرکنڈوں کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ہم کہا کہاں سے گزرے؟ یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ٹبوں اور سرکنڈو کے بیچ سے گزرتے گزرتے ایک نہر کے پاس آ گئے۔ گائیڈ مجھے لے کر نہر کنارے کنارے چلنے لگا۔ ایک جگہ سے ہم نہر کا پل پار کر کے دوسری طرف کھیتو میں آئے تو کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ گائیڈ نے مجھے کندھے سے پکڑ اپنے ساتھ نیچے بٹھا لیا۔ گاڑی کے انجن کی آواز ہمارے قریب سے ہو کر گزر گئی ہم اونچی فصل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب گاڑی جو شاید کوئی جیپ تھی دور نکل گئی گائیڈ نے کہا۔

"آ جاؤ۔"

ہم کھیتوں میں چلنے لگے۔ مجھے دور کچھ روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ کھیت ختم ہو گئے تو میرے گائیڈ نے رکتے ہوئے کہا۔

"تم اس وقت بھارت میں ہو۔ یہ سامنے سکھوں کے قصبے اٹاری ک روشنیاں ہیں۔ آگے تمہیں پکی سڑک ملے گی۔ وہ سڑک تمہیں امرتسر پہنچا دے گی جب تک دن کی روشنی نہ ہو جائے تم پکی سڑک پر نہ آنا۔ کھیتوں کھیت چلتے جانا دن نکل آئے تو بے شک سڑک پر آ جانا۔ تمہیں کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔ ادھ بڑے کارخانے ہیں۔ ان کارخانوں میں کام کرنے والوں کو لے کر امرتسر سے بسیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ کوئی تم سے پوچھے تو کہہ دینا بھلہ صاحب کے کارخانے سے رات کی ڈیوٹی دے کر آ رہا ہوں۔ بھلہ صاحب کے کارخانے میں بجلی کا سامان تیار ہوتا ہے۔ اب جاؤ۔"

وہ مجھ سے جدا ہو گیا میں آگے چل پڑا۔ میں اس سے پہلے زائرین کی ایک

جماعت کے ساتھ لاہور سے دلی گیا تھا۔ امرتسر کے سٹیشن سے ہمیں باہر جانے کی
اجازت نہیں تھی۔ میں نے امرتسر کا سٹیشن دیکھا ہوا تھا۔ یہ سارا علاقہ میرے لئے
اجنبی علاقہ تھا۔ کالے کالے درختوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی۔ ان
درختوں کے درمیاں پکی سڑک تھی۔ سڑک کو میں نے قریب سے دیکھا اور گائیڈ کی
ہدایت کے مطابق اس سے ہٹ کر کھیتوں کھیت سڑک کے بالکل متوازی چلنے گا۔
اس وقت آسمان پر صبح کی دھندلی سی سپیدی بادلوں کے پیچھے سے ظاہر ہونے لگی
تھی۔ میرے پاس کوئی گھڑی وغیرہ نہیں تھی۔

میں چلتے چلتے کچھ تھک بھی گیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا کہ دن کی روشنی
ہو جائے تو سڑک پر آ جاؤں اور کسی بس وغیرہ میں سوار ہونے کی کوشش کروں۔
اٹاری کے قصبے کی روشنیاں جو یقیناً" وہاں کسی کارخانے کی روشنیاں تھیں اب
تھوڑی پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں بھارتی ہندو دھرم چند کے روپ میں دشمن ملک
بھارت میں داخل ہوا تھا۔ اس قسم کے ایڈونچر اور جاسوسی کے مشن کا مجھے کوئی
تجربہ نہیں تھا۔ مجھے ہر طرح سے بریف کر دیا گیا تھا اور میں خود اعتمادی کے ساتھ
ہندی زبان میں بھی بات کر سکتا تھا لیکن میری ایک کمزوری بھی تھی جس کا میرے
پاس کوئی علاج نہیں تھا اور جو میرا راز فاش کر سکتی تھی۔ یہ کمزوری اپنے وطن
پاکستان میں میری سب سے بڑی طاقت اور شناخت تھی مگر دشمن ہندو ملک میں یہی
میری سب سے بڑی کمزوری اور میری مجبوری تھی۔ یہ کمزوری یہ تھی کہ میرے
ختنے ہو چکے تھے۔ یہ کمزوری مجھے دشمن کے آگے بے نقاب کر کے میری اصلیت
ظاہر کر سکتی تھی۔ دوسری بات جس کا مجھے اس وقت اچانک خیال آگیا تھا' یہ تھی کہ
بھارتی دہشت گرد دھرم چند کی کمر پر شیو سینا اور راشٹریہ سیوک سنگ کا سواستیکا کا
نشان گدا ہوا تھا۔ میں اگرچہ بھارتی دہشت گرد دھرم چند کا بھیس بدل کر اپنے مشن
کی تکمیل کے لئے بھارت میں داخل ہو چکا تھا مگر میری کمر پر سواستیکا کا وہ نشان گدا
ہوا نہیں تھا جو اصلی دھرم چند کی کمر پر تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس کا خیال سلطان

صاحب اور بٹ صاحب کو بھی نہیں آیا تھا ورنہ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ میری کمر پر سواستیکا کا نشان گودا یا بنایا جا سکتا تھا۔ مجھے ان دونوں کمزوریوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھ کر قدم اٹھانا اور منصوبہ بندی کرنی تھی۔ صبح کی روشنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کھیت اور دور سڑک کے درخت صاف نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک جانب ایک سکھ کھیتوں میں ہل چلاتا بھی نظر آیا۔ میں چپکے سے اٹھا اور پکی سڑک سڑک پر آکر امرتسر کی طرف رخ کر کے چلنے لگا۔

سڑک پر بائیں جانب میں نے تین چار آدمیوں اور ایک عورت کو کھڑے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بس سٹاپ ہے۔ میں بھی ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آدمیوں میں دو سکھ تھے۔ یہ دیہاتی مزدور ٹائپ کے لوگ تھے۔ میں نے کسی سے نہ پوچھا کہ یہاں سے کونسے نمبر کی بس امرتسر کو جاتی ہے۔ کیونکہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں امرتسر کا ہی رہنے والا ہوں اور روزانہ رات کی ڈیوٹی پر بھلہ صاحب کے کارخانے آتا جاتا ہوں۔

پیچھے سے ایک بس آکر رکی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ بس امرتسر کی طرف چل پڑی۔ بس میں پہلے سے کچھ مزدور بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ مزدور کارخانے میں رات کی ڈیوٹی دے کر آ رہے ہیں۔ میں بس کی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ سر لگائے بیٹھا تھا۔ بس راستے میں رکتی آخر امرتسر کے ریلوے سٹیشن کے سامنے والے بس سٹاپ پر آکر رک گئی۔ اس وقت تک دن کافی نکل آیا تھا بالکل برسات کا سماں بنا ہوا تھا۔ صرف بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بادل بڑے گہرے تھے۔ میں بس سٹاپ سے سیدھا ریلوے سٹیشن کی عمارت میں آگیا۔ یہاں ایک سکھ قلی سے پوچھا کہ بٹالے کو گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ آٹھ بجکر چالیس منٹ پر جموں توی ایکسپریس چلے گی۔ اس میں بیٹھ جانا۔ میں نے اس سے ٹائم پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ابھی جموں توی ایکسپریس چلنے میں پورا ایک گھنٹہ باقی ہے۔ اس سکھ قلی نے یہ بھی بتایا کہ فلاں کھڑکی پر ٹکٹ ملے گا۔ میں کھڑکی کے پاس آگیا۔ اوپر

زرد رنگ کی تختی لگی تھی جس پر ہندی اور گورمکھی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ گورمکھی مجھے پڑھنی نہیں آتی تھی۔ ہندی میں پڑھ سکتا تھا۔ وہاں امرتسر سے گورداسپور اور جموں تک کے سٹیشنوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے پیچھے ایک ہندو بابو جس کے ماتھے پر سرخ تلک لگا ہوا تھا بیٹھا رجسٹر پر کچھ اندراج کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ہندی ملی پنجابی میں کہا۔

"ماراج! وٹالے کا ایک ٹکٹ مل جائے گا تھرڈ کلاس کا۔"

ہندو بابو نے میری طرف دیکھے بغیر دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھا اور ایک خانے میں سے زرد رنگ کا ٹکٹ نکال کر اسے چھوٹی سی مشین میں ڈال کر اس پر تاریخ کا نشان ڈالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ اتنے پیسے نکالو۔ میں نے ٹکٹ کے پیسے نکال کر دے دیئے اور ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم والے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر ایک سکھ ٹکٹ چیکر میلی سی ٹھنڈی وردی پہنے لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسی نے میرا ٹکٹ چیک کیا اور میں پلیٹ فارم پر آگیا۔

پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سکھ بھی تھے۔ ہندو بھی تھے۔ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے مجھے جو کرتہ پاجامہ لا کر دیا تھا اور جسے میں نے پہن رکھا تھا۔ وہ نیا نہیں تھا۔ پہلے سے ہی بہت پرانا اور خستہ حال سا تھا۔ تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ میں نے خدا جانے کس کس راستے سے جھاڑیوں اور ٹبوں سے گذر کر بارڈر کراس کیا ہے۔ چائے کی کینٹین قریب ہی تھی۔ کاؤنٹر پر دو سکھ اور ایک ہندو کھڑے چائے کے ساتھ بند کھا رہے تھے۔ میں بھی ان کے قریب کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا اور بند مکھن اور چائے کے لئے کہا۔ ایک سکھ نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر چائے پینے میں مشغول ہو گیا۔ میں وہاں جو زبان بول رہا تھا وہ پنجابی ضرور تھی مگر ایسی پنجابی نہیں تھی جو ہم اور آپ لاہور میں بولتے ہیں۔ میں جو پنجابی بولتا تھا اس میں ہندی کے الفاظ زیادہ تھے۔ ہندی زبان پر مجھے پورا عبور

تھا۔ موریشس کے کالج میں دو سال میں نے انگریزی کے ساتھ ہندی بھی پڑھی تھی اور ہندی دیو مالا اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں وید اور پران اور گیتا رامائن سے بھی مجھے پوری واقفیت تھی۔ میں بنگلہ زبان بھی بول اور لکھ پڑھ لیتا تھا۔ یہ زبان مجھے میری بیوی زیب النساء نے سکھا دی تھی۔ کینٹین کے کاؤنٹر پر میں نے اچھی طرح سے ناشتہ کیا اور سگریٹ لگا کر واپس بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ پینے کی مجھے عادت نہیں تھی۔ بس کھانا کھانے اور ناشتہ کرنے کے بعد ایک آدھ سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔

جموں توی ایکسپریس پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ یہ گاڑی امرتسر سے تیار ہو کر چلتی تھی۔ مسافروں نے ڈبوں پر دھاوا بول دیا۔ میں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اپنے وقت پر چل پڑی۔ بٹالہ کا فاصلہ میری اطلاع کے مطابق امرتسر سے چھیالیس سنتالیس میل تھا۔ ٹرین اگرچہ ایکسپریس تھی مگر بٹالے تک وہ ہر سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے رکتی رہی۔ میں بٹالے کے سٹیشن پر اتر گیا۔ ریل گاڑی میں سے مجھے بٹالہ شہر کی پرانی فصیل اور پرانے پرانے سے مکان نظر آ گئے تھے۔ یہ خستہ حال سا شہر یا بڑا قصبہ تھا۔ سٹیشن کے باہر دو تین سائیکل رکشا اور زیادہ یکہ نما تانگے کھڑے تھے۔ میں نے ایک سائیکل لیا اور رکشے والے سکھ سے کہا کہ مجھے ست کرتاریہ گوردوارے لے چلو۔ سائیکل رکشا بٹالے کے تنگ بازاروں میں داخل ہو گیا۔ ان بازاروں میں کافی بھیڑ تھی۔ ریڑھے اور یکے بھی آ جا رہے تھے اور ہندو سکھ موٹر سائیکل اور بھی اندر جانے یا باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تین چار بازاروں میں سے گزرنے کے بعد رکشا ایک گوروارے کے سامنے جا کر رک گیا۔ یقیناً" یہی ست کرتاریہ گوردوارہ تھا۔ میں نے رکشے والے سکھ کو پیسے دیئے اور آگے چلنے لگا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ گوردوارے کے پیچھے ایک بازار ہے۔ شیو کا مندر اسی بازار میں ہے۔ مجھے شیو مندر ہی جانا تھا۔ آگے جا کر بازار کی ایک شاخ گوردوارے کے پیچھے چلی گئی تھی۔ میں اس بازار میں چل پڑا۔ یہاں باردانے' گھی چاول اور وڑیاں پاپڑوں کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف مندر کی

ارت پر نظر پڑی۔ اس کے مخروطی مینار پر زعفرانی رنگ کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ پوجا
نے والی عورتیں اور مرد مندر میں جا رہی تھیں۔ دروازے پر پھول اور بتاشے
والے کی دکان تھی۔ مندر کی ڈیوڑھی کے دونوں جانب پتھر کے دو بیلوں کے
بنے ہوئے تھے۔ ایک جانب ایک گائے کھڑی تھی' جس کو ایک ہندو عورت
میں ڈونا لئے گائے کو حلوہ پوڑی کھلا رہی تھی۔ قریب ہی ایک دکان کے باہر
کا بہت بڑا ڈلا پڑا تھا جس کو ایک بیل بڑے مزے سے چاٹ رہا تھا۔ سانپ'
ول اور ڈمرو کی طرح بیل بھی شو دیوتا کا خاص نشان ہے۔ شیو دیوتا کے اپنے
کا نام نندی تھا۔ ہندو دیو مالا میں ایسا ہی لکھا ہے۔

مندر کی ڈیوڑھی میں تین چار ٹل لٹک رہے تھے۔ پوجا کرنے والی عورتیں
ر مرد ڈیوڑھی میں آتے جاتے وقت ہاتھ سے ٹل کو ضرور بجاتے تھے۔ میں نے
ہاتھ اونچا کر کے ایک ٹل کو بجایا اور ڈیوڑھی میں سے گذر کر مندر کے صحن
آ گیا۔ مندر کے صحن میں جگہ جگہ جٹادھاری نیم عریاں سادھو بدن پر راکھ ملے
پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اپنا اپنا ترشول انہوں نے پاس ہی زمین میں گاڑ رکھا
۔ ہندو عورتیں اور مرد ان سادھوؤں کی برفی پیڑے اور حلوہ پوڑی سے خاطر
ضع کر رہے تھے۔ صحن میں بھی دو تین بیل بڑے مزے سے بیٹھے پوجا کرنے
لوں کے پیش کئے ہوئے لڈو پیڑے کھا رہے تھے۔ اسی قسم کے مناظر میں ماریشس
لینڈ کے ہندو مندروں میں دیکھ چکا تھا۔ صحن کے وسط میں ایک اونچے تھڑے پر
در کی گول عمارت تھی۔ لوگ سیڑھیاں چڑھ کر عمارت کے اندر جا کر شیو دیوتا پر
ول اور پیسے چڑھا رہے تھے۔ اندر سے گھنٹیوں کے بجنے کی آواز تھوڑی
بعد آ جاتی تھی۔

میں صحن میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ میں بھارتی دہشت گرد دھرم چند کے
پ میں تھا اور اس انتظار میں تھا کہ یہاں پر موجود میرا کوئی دہشت گرد ساتھی
پہچان کر اپنے آپ میرے پاس آ جائے گا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شیو سینا کے دہشت

گرد اپنے ٹریننگ کیمپ سے دہشت گردی کی ٹریننگ لینے کے بعد اس مندر میں آکر اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر یہاں سے اپنی تخریب کاری کے لئے پاکستان میں سمگل کئے جاتے ہیں۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ میری شکل صورت اور بھارتی دہشت گرد دھرم چند کی شکل و صورت میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔ ناک کی ہڈی کا جو تھوڑا سا فرق تھا اسے پلاسٹک سرجری سے ختم کر دیا گیا تھا۔ میرے بالوں کو بھی دھرم چند کے بالوں کی طرح گھنگھریالے بنا دیا گیا۔ میں نے دھرم چند کی آواز نہیں سنی تھی - بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے انٹیروگیشن کے دوران سن رکھی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میری آواز اور دھرم چند کی آواز میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ دھرم چند کی آواز میری آواز سے ذرا بھاری تھی۔ اس کا حل میں نے یہ ڈھونڈا تھا کہ میں نے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تھوڑا سا کھانس لیتا تھا اور آواز کو بھاری بنا کر ایسے بولتا تھا جیسے میرا گلا پڑ گیا ہو۔ ریلوے سٹیشن پر بھی میں نے سکھ قلی اور کنٹین والے سے اسی طرح آواز کو بھاری بنا کر بات کی تھی۔

اب صرف پردہ اٹھنے کا انتظار تھا۔ میں نے اپنی طرف سے دھرم چند کی اداکاری کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ پوجا کرنے جو لوگ آ رہے تھے اور واپس جا رہے تھے اور جو چند ایک آدمی مندر کے صحن میں ادھر ادھر چل پھر کر صحن میں بنے ہوئے بیل کے بتوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ میں انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک کوئی آدمی مجھے پہچان کر میری طرف نہیں آیا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی ضلع کچہری سے میری فرار کی خبر بھارت میں شیو سینا والوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ میں نندی بیل کے چبوترے کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا چہرہ اٹھا رکھا تھا تاکہ دور سے اگر دھرم چند کا دہشت گرد ساتھی مجھے دیکھے تو فوراً" میری طرف آ جائے۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ سوچنے لگا کہیں شیو سینا کے دہشت گردوں نے اکٹھے ہونے کا یہ اڈہ تو تبدیل نہیں کر لیا۔ مندر کی ڈیوڑھی میں چھ سات سادھوؤں کا جلوس نمودار ہوا۔ ان کی جٹائیں لٹک رہی تھیں۔ جسم پر

راکھ ملی ہوئی تھی۔ کمر کے ساتھ صرف ایک لنگوٹی ہی بندھی تھی۔ ہاتھوں میں ترشول تھے اور وہ جے شیو شنکر کے جیکارے بول رہے تھے۔ وہ ایک ٹانگ پر ڈانس کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے کچھ ہندو عورتیں اور مرد ہاتھ باندھے جھوم جھوم کر شیو شنکر جے شیو شنگر گاتے چلے آ رہے تھے۔ یہ جلوس میرے قریب سے ہوتا ہوا مندر کی گول عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

میں سادھوؤں کے اس جلوس کو مندر کے دروازے کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ایک لمبے قد کا دبلا پتلا سانولا نوجوان جس نے نائیلون کی بش شرٹ اور میلی سی خاکی پتلون پہن رکھی تھی اور جس کے ماتھے پر شیو دیوتا کا تلک لگا ہوا تھا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا اس نے ہاتھ سے میرے کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔

"دھرمو! مجھے پتہ تھا تم ضرور واپس پہنچ جاؤ گے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ شیو سینا کے دہشت گردوں میں سے ایک دہشت گرد ہے۔

میں نے اٹھتے ہوئے ذرا سا کھانس کر کہا۔

"بڑی مشکل سے بارڈر کراس کیا ہے یار۔"

میں یہ معلوم کرنے کو بے چین تھا کہ اس شخص کا نام کیا ہے۔ اس کے بے تکلف انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ دھرم چند اس کا ساتھی ہی نہیں بے تکلف دوست تھا۔ جب میں بولا تو وہ کہنے لگا۔

"تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔"

میں نے کچھ اور زیادہ کھانس کر کہا۔

"بس یار پاکستانی پولیس نے بہت مارا پیٹا ہے۔ کوکا کولا میں کچھ ڈال کر مجھے پلایا تھا۔ بھگوان جانے اس میں کیا چیز تھی میں بے سدھ سا ہو گیا۔ بس اسی وقت سے گلا خراب ہے۔"

وہ مجھے پوجا کرنے والوں کے ہجوم میں سے نکال کر مندر کے پیچھے ا
کوٹھڑی میں لے آیا جہاں فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ وہاں اور کوئی نہیں تھ
اس نے چھت کا پنکھا چلا دیا اور میرے سامنے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف
سے دیکھنے لگا۔ میں دل میں کچھ ڈر گیا۔ کہیں اسے پتہ تو نہیں چل گیا کہ میں ا
دھرم چند نہیں ہوں۔ میں نے پوچھا۔

"کیوں یار! اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ کیا تمہیں وشواش نہیں
ہو رہا؟"

وہ بولا۔

"یہ تمہارے ناک پر زخم کا نشان کیسا ہے؟"

ناک پر پلاسٹک سرجری کے زخم کا نشان تھا۔ جو ٹھیک تو ہو گیا تھا مگر نشان
صاف نظر آتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایک پاکستانی ایس پی نے ناک پر ڈنڈا مارا تھا۔ وہ تو مجھے راکھشش لگتا
تھا۔"

کوٹھری کی کھڑکی کھلی تھی جس میں سے دن کی کافی روشنی اندر آ رہی
تھی۔ میں نے پوچھا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟"

اس نے تعجب سے کہا۔

"باقی لوگ کون؟ تم چاروں کے چاروں تو پاکستان گئے تھے۔ تم بتاؤ کہ
گوندا، موتی رام اور ست پرکاش کو بھی پاکستانی پولیس نے پکڑ لیا تھا یا وہ واردات
کے بعد فرار ہو گئے تھے؟"

اس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ تین اور بھارتی دہشت گرد
سمگل ہو کر پاکستان گئے تھے جن میں سے ایک کا نام گوندا تھا۔ دوسرے کا نام مورتی
رام اور تیسرے دہشت گرد کا نام ست پرکاش تھا۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"بس کی سیٹ کے نیچے میں نے بم رکھ دیا تھا۔ ست پرکاش اور گوندا وہاں سے نکل گئے تھے مگر میں اور موتی رام کچھ دور کھڑے رہے تاکہ بم کا دھماکہ ہو' تو جائیں۔ دھماکہ ہوا' بس اڑ گئی۔ بس کی ساری پاکستانی سواریوں کے ٹکڑے اڑ گئے۔ ہم وہاں سے دوڑے ہی تھے کہ پولیس کے ایک سپاہی نے مجھے دبوچ لیا۔ گوندا فرار ہوگیا تھا۔ میں پولیس کے قابو آگیا۔ بس بھگوان نے جنم میں تم سے دوبارا ملن لکھا تھا کہ پولیس کی قید سے فرار ہو کر آگیا ہوں۔ گوندا' موتی رام اور ست پرکاش ابھی پاکستان میں ہی ہوں گے۔"

باتوں ہی باتوں میں میں نے بڑی ہوشیاری سے معلوم کرلیا کہ اس نوجوان کا نام جو دھرم چند کا دوست دہشت گرد تھا۔ جے دیو تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے پاکستانی پولیس کو اپنے ساتھی اگروادیوں [دہشت گردوں) کے بارے میں تو نہیں بتایا کہ وہ پاکستان میں کس جگہ پر ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"جے دیو! یار تم مجھے اتنا کچا سمجھتے ہو؟ پولیس نے مجھے بہت مارا تھا اور بجلی کے جھٹکے بھی دیئے تھے۔ میں تو ہسپتال بھی کئی روز پولیس کی نگرانی میں پڑا رہا مگر میں نے اپنے ساتھی اگروادیوں کا پتہ کیا بتانا تھا میں نے ان کا نام تک نہیں لیا۔"

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ جے دیو میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے بات ختم کی تو وہ بولا۔

"یار دھرم چند تم پہلے سے بہت بدلے بدلے لگتے ہو۔ تمہاری نیچے کا ایک دانت بھی آدھا ٹوٹا ہوا ہے۔ تمہاری آواز بھی بدلی ہوئی ہے۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جے دیو بھایا! جس دن تم پاکستانی پولیس کے قابو میں آ جاؤ گے اور تمہیں پاکستانی پولیس کی تھرڈ ڈگری کا چھترول کرے گی۔ تمہیں بجلی لگائے گی اور تمہارے منہ پر ڈنڈے مارے گی تب میں تم سے پوچھوں گا کہ تم اتنے بدلے بدلے کیوں لگتے

ہو؟ میرا دانت ایک خفیہ پولیس کے کانسٹیبل نے میرے منہ پر مکا مار کر توڑ د
تھا۔"

پھر میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔
"بھگوان! پاکستانی پولیس کے ٹارچر سے بچائے۔ میں تو یہی کہوں گا بھا
کہ اگر پکڑے جاؤ تو کچھ کھا کر اپنی مرتیو کر لینا پرنتو پاکستانی پولیس کے قبضے میں ;
جانا۔"

اس نے پوچھا۔
"ہرچووال اپنی پتنی بلا جی سے ملنے گئے ہو کہ نہیں۔"
مجھے معلوم ہو گیا کہ دھرم چند کی پتنی کا نام بلا ہے۔ اب میں یہ معلوم کر
چاہتا تھا کہ دھرم چند کا کوئی بچہ ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا۔
"میں رات کو بارڈر کراس کر کے صبح اٹاری پہنچا تھا۔ وہاں سے سیدھ
یہاں شیو جی کے مندر میں آ گیا ہوں کہ اپنی سینا کا کوئی آدمی ہو تو اس کو رپورٹ
کروں کہ شام کو پتنی کو ملنے گاؤں جاؤں گا۔"

یہ ہندو نوجوان اگروادی جے ایو [دہشت گرد) شیو سینا کی پنجاب شاخ کا
ممبر تھا اور دھرم چند سے اس کی دوستی کچھ سات مہینے پہلے ہوئی تھی مگر بڑی جلدی
دھرم چند کا بے تکلف دوست بن گیا تھا۔ جے ایو بٹالے کا ہی رہنے والا تھا۔ ماں
باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ یہ غلط سوسائٹی میں پڑ گیا۔ شراب اور جوئے کا رسیا بن
گیا۔ پیسوں کی خاطر اسے شیو سینا کی پنجاب شاخ نے پاکستان میں دہشت گردی
کرنے کے لئے اپنی سینا میں بھرتی کر لیا۔ جب یہ پاکستان میں تخریبی کارروائیاں
کرنے جاتا تھا تو اسے ہر واردات کے دو ہزار روپے ملتے تھے۔ جے دیو اب تک
پاکستان کے پنجاب کے مختلف شہروں میں بموں کے کئی دھماکے کر چکا تھا۔ آج کل
اس کی ڈیوٹی اس کام پر لگی تھی کہ جب دہشت گردوں کی پارٹی پاکستان جائے تو یہ
ان کی واپسی کا بٹالے کے شیو مندر میں رہ کر انتظار کرے اور ان کی وارداتوں کا

را پورا حساب لکھتا جائے تاکہ شیو سینا کے ہیڈ کوارٹر سے ان کو وارداتوں کا
اوضہ مل سکے۔ مجھے اب جے دیو سے یہ معلوم کرنا تھا کہ دھرم چند کے یعنی میرے
باقی تین دہشت گرد ساتھی گوندا' ست پرکاش اور موتی رام پاکستان میں رہ گئے
ں ان کا پاکستان میں خفیہ ٹھکانہ کس جگہ پر ہے اور انہیں پاکستان میں کن لوگوں
نے پناہ دے رکھی ہے۔ جے دیو کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ آدمی اتنا
ریک اور چالاک نہیں ہے۔ شرابی نوجوان ہے اور محض کچھ پیسوں کے لالچ میں
ور کچھ ایڈونچر کے خیال سے شیو سینا کے اگروادیوں میں شامل ہو گیا ہے۔ دوسری
بات جو جے دیو سے باتیں کرتے ہوئے میں نے معلوم کی وہ یہ تھی کہ یہ دہشت گرد
پاکستان کے شہروں میں بموں کے دھماکے کرنے کے علاوہ اسلحہ لے کر کسی کوٹھی میں
گھس جاتے تھے اور وہاں کے رہنے والوں کو فائرنگ کرتے ہلاک کرنے کے بعد
وہاں سے نقدی اور زیور وغیرہ بھی لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اس نقدی اور زیورات
میں سے بھی انہیں کچھ حصہ ملتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر دہشت گردوں کے عجیب و
غریب راز افشا ہو رہے تھے۔ جے دیو کی سادگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے
بڑی آسانی کے ساتھ اس کے شیو سینا کی پاکستان میں دہشت گردی کی بہت سی
معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اب میں یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا کہ یہ بھارتی
دہشت گرد کس روپ میں پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں ظاہر ہے کسی نہ
کسی جگہ ضرور قیام کرتے ہوں گے جہاں وہ دیسی ساخت کے دھماکہ خیز بموں اور
دوسرے خود کار اسلحہ کا بندوبست کرتے ہوں گے۔ میں نے گفتگو کا رخ بدلتے
ہوئے جے دیو سے کہا۔

"مجھے پورا وشواش ہے کہ ست، پرکاش گوندا اور موتی رام خفیہ ٹھکانے
پر پہنچ گئے ہوں گے"

جے دیو بولا۔

"اگر پہنچے نہ ہوتے تو پاکستان کے اخباروں میں جس طرح تمہاری گرفتاری

اور تمہارے فرار کی خبر چھپی ہے اسی طرح ان کی گرفتاری کی بھی خبر پھیل گئی ہوتی اور پاکستان میں ہمارے بھارتی روتا واس [بھارتی سفیر) کے کرمچاریوں کے ذریعے ہمارے سینا پتی [کمانڈر] کو اس کی اطلاع مل جاتی جیسی کہ تمہارے فرار کی ہمیں اطلاع پہنچ گئی تھی۔ مگر تم لوگوں سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے۔"

"وہ کیا" میں نے پوچھا۔

جے دیو کہنے لگا۔

"تمہیں پتہ ہی ہے کہ جب تم چاروں پاکستان بھیجے جانے والے تھے تو میں نے سینا پتی پرشاد جی سے کہا تھا کہ ان کا خفیہ ٹھکانہ اسلام آباد میں بھارتی سفارت خانے کے آس پاس کسی ہوٹل میں ہونا چاہئے۔ لیکن سینا پتی پرشاد جی نہ مانے اور انہوں نے تمہارے سامنے کہا تھا کہ نہیں۔ اسلام آباد لاہور سے بہت دور ہے۔ وارداتیں لاہور میں ہوں گی۔ اس لئے خفیہ ٹھکانہ بھی لاہور میں ہی ہونا چاہئے چنانچہ اس کے بعد تم لوگوں کے لئے بھاری سفارت خانے کے ایک آدمی کے ذریعے شاہدرہ کے ریلوے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر کرائے پر لے لیا گیا جہاں تم لوگ جا کر ٹھہرے تھے۔ فرار ہونے کے بعد تم اپنے کوارٹروں کی طرف نہیں گئے تھے۔؟"

میں نے کہا۔

"میرے پیچھے تو پاکستانی پولیس لگی ہوئی تھی۔ میں تو سیدھا بارڈر کی طرف بھاگا تھا۔ جان پر کھیل کر دریا پار کیا اور بھگوان جانے پاکستانی بارڈر فورس کی گولیوں سے کیسے بچ کر بھارت پہنچا۔"

مجھے دھرم چند کے باقی تینوں دہشت گردوں کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تھا۔ ان کا خفیہ ٹھکانہ شاہدرہ کے ریلوے کواٹروں کے کسی کواٹر میں تھا اور وہ ضرور ابھی تک اسی جگہ مسلمان بن کر رہ رہے ہوں گے۔ کیونکہ ایک تو وہاں انہوں نے اپنی ٹریننگ کے مطابق بڑا اثر رسوخ پیدا کر لیا ہوگا اور دوسرے دہشت گردوں کے لئے

دوسرے ملک میں اتنی جلدی کوئی محفوظ ٹھکانہ تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لاہور کے بس سٹینڈ پر دھماکے اور میرے پکڑے جانے کے بعد وہ یقیناً" واپس شاہدرہ کے کواٹر میں آ گئے ہوں گے اور اب جبکہ انہیں اخبار کے ذریعے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا ہوں تو وہ ہر حالت میں کواٹر میں رہ کر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھ پر اب فرض عائد ہوتا تھا کہ میں ایک منٹ ضائع کئے بغیر جتنی جلدی ہو سکے امرتسر جاکر اپنے آدمی سے ملاقات کروں اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے بٹ صاحب اور ملک صاحب کو یہ اطلاع پہنچاؤں کہ دھرم چند کے تین ساتھی دہشت گرد شاہدرہ کے ریلوے کواٹروں میں سے ایک کواٹر کرائے پر لے کر رہ رہے ہیں وہاں چھاپہ مار کر انہیں پکڑ لیا جائے۔

جے دیو کوٹھڑی میں ہی باہر سے چائے کے دو گلاس لے آیا۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ میری زیادہ باتیں استفسار کے رنگ میں ہی ہوتی تھیں تاکہ جے دیو سے شیو سینا کے دہشت گردوں کی تنظیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکوں۔ وہ چونکہ مجھے اپنی جماعت کا ممبر بلکہ ایکسٹو دہشت گرد سمجھ رہا تھا۔ اس لئے ہر بات کھل کر کر رہا تھا۔ اس کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں جو دہشت گرد پاکستان سمگل ہونے کے لئے آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ناموں کے ایک دوسرے کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے۔ انہیں پارٹی کی طرف سے ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا جاتا تھا۔ جے دیو کی دھرم چند سے اس لئے دوستی ہو گئی تھی کہ ایک تو وہ قریب قریب کے قصبوں کے رہنے والے تھے - دوسرے وہ پاکستان میں ایک ساتھ دہشت گردی کی کئی وارداتیں کر چکے تھے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شیو سینا پارٹی کا کرتا دھرتا تو بال ٹھاکرے ہے جو بمبئی میں بیٹھا ہے مگر دہشت گردی کا انچارج اس کا دست راست ایک مرہٹہ بالا جی ہے جس نے پنجاب کی شیو سینا شاخ کے پرشاد جی کو دہشت گردی کے منصوبوں کا انچارج بنایا ہوا ہے مگر پرشاد جی بالا جی کی منظوری کے

بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔

دہشت گردی کی ساری ہدایات اوپر سے بال ٹھاکرے اور پھر بالا جی کی وساطت سے پنجاب کی شاخ کے انچارج پرشاد جی کو آتی ہیں۔

میں نے نادانی میں جے دیو سے کہہ دیا۔

"میری گرفتاری کے بعد ست پرکاش، گوندا اور موتی رام نے پاکستان میں کچھ بھی نہیں کیا ہوگا۔ یہ ہماری شیو سینا کو ایک طرح کا نقصان ہی ہوا ہے۔"

جے دیو ہنس کر کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ یہ جو پاکستان کے شہروں میں تمہارے بعد دھماکے ہوئے ہیں۔ اگروادی موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر بازاروں میں لوگوں کو گولیوں سے بھونتے رہے ہیں اور یہ جو ہتھوڑا گروپ کی خبریں اخباروں میں چھپتی رہی ہیں اور پاکستان کی مسجدوں میں بم پھٹتے رہے ہیں۔ یہ تمہارے خیال میں کون کرتا رہا ہے؟ ان وارداتوں میں کچھ وارداتیں گوندا، ست پرکاش اور موتی رام کی ہیں اور باقی ہمارے دوسرے اگروادیوں [دہشت گردوں] کے کام ہیں جو لاہور کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے ہمیں کافی وقت ہو گیا۔ میں امرتسر اپنے مجاہد جاسوس کے پاس جانے کو بے چین تھا مگر جے دیو سے بے شمار معلومات بھی حاصل کرنی تھیں اور اس وقت مجھے باتیں پوچھنے کا بڑا اچھا موقع مل گیا تھے۔ جے دیو بولا۔

"میں مندر سے پرشاد لے کر آتا ہوں۔ ڈھابے میں جا کر کون کھائے۔ یہیں سب کچھ مل جائے گا۔"

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں دو بڑے ڈونے تھے جن میں حلوہ پوری مٹھائیاں اور کچوریاں تھیں۔ ہندو ان چیزوں کو کھانا سمجھ کر کھاتے ہیں۔ جب ہم حلوہ پوری وغیرہ کھا پی چکے تو جے دیو نے اپنی خاکی پتلون کی جیب سے

چھوٹی سے پاکٹ بک نکالی اور اسے کھول کر پنسل سے اس میں کچھ لکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لاہور کے بس سٹینڈ پر بم دھماکے کے تمہارے دو ہزار روپے میرے پاس اسی دن سے پڑے ہیں۔ یہ تم لے لو۔"

اس نے دوسری جیب میں سے بٹوہ نکالا۔ بٹوے پر ربڑ کا گیٹس چڑھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دو ہزار روپے ادا کر دیئے اور ہنستے ہوئے کہا۔

"دھرم چند! بھاپے نہ تم شراب پیتے ہو نہ میری طرح جوا کھیلتے ہو۔ کیا فائدہ ہے ان روپوں کا؟ بس اپنی پتنی کو جا کر دے دو گے۔ ٹھیک ہے بھاپے۔ تم اچھا کرتے ہو۔ دکھ سکھ میں پتنی ہی کام آتی ہے۔ تمہارے کونسے ماتا پتا ہیں۔ لے دے کر ایک دھرم پتنی ہے جس کو تم اس کی ماتا کے پاس چھوڑ کر یہ کشٹ بھوگ رہے ہو۔"

جے دیو نے مجھے دھرم چند کی پتنی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے ان معلومات کی بہت سخت ضرورت تھی۔ اب میں دھرم چند کے گھر ہرچووال بڑے اطمینان سے دھرم چند کے روپ میں جا سکتا تھا مگر سب سے پہلے میں امرتسر میں اپنے خفیہ آدمی سے مل کر پاکستان میں بٹ صاحب اور سلطان صاحب کو شاہدرہ کوارٹر میں مقیم بھارتی دہشت گردوں کے بارے میں خفیہ پیغام بھجنا چاہتا تھا۔ جے دیو بٹوہ بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"دھرمے بھاپے! اب تم یہاں سے سیدھا ہرچووال اپنی دھرم پتنی کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔ واپس یہیں شیو مندر میں آ جانا۔ میں شام کے سمے یہاں ضرور ہوتا ہوں۔ تم واپس آؤ گے تو آگے کیا کرنا ہے اس کا کاریکرم تمہیں بتا دوں گا۔"

میں دو ہزار روپے کے نوٹ جو سو سو اور دس دس کے بھارتی کرنسی میں تھے۔ رومال میں باندھ کر پاجامے کو ازار بند کے ساتھ باندھ کر رکھ لئے تھے۔ صرف دس دس روپے کے دس پندرہ نوٹ ہی اپنی جیب میں رکھے تھے۔

جے دیو اس کے بعد چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں سیدھا ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ امرتسر جانے والی گاڑی ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آئے گی۔ میں لاری اڈے سے ایک بس میں سوار ہو کر امرتسر پہنچ گیا۔ بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے مجھے اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ اپنا خفیہ مجاہد کہاں اور کس بھیس میں ملے گا۔ میں اسی جگہ پہنچ گیا۔ خفیہ مجاہد ایک سنیاسی کے بھیس میں اپنی کوٹھڑی کے باہر بیٹھا تھا۔ اس کی عقیدت مند کچھ ہندو سکھ عورتیں اور مرد سامنے بڑے ادب سے ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔ خفیہ جاسوس ایک عورت کو پڑیا پکڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"شیو جی مہاراج ہمالیہ میں جہاں براجمان ہیں یہ اسی پہاڑی میں اگنے والی جڑی بوٹی کا ست ہے۔ اس کو پانی میں گھول کر دن میں تین بار پینا۔ پھر اس کا چمتکار دیکھنا۔ جاؤ۔ جاؤ۔"

میں بھی بظاہر بڑی عقیدت کے ساتھ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا مگر میں نے اپنے ہاتھ نہیں باندھے تھے۔ اپنے خفیہ مجاہد نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ میں معنی خیز انداز میں ذرا سا مسکرا دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی مختلف قسم کا عقیدت مند ہے۔ اس نے معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے سوائے میرے سب شردھالووں یعنی عقیدت مندوں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ سب اس کے پاؤں کو چھونے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد خفیہ مجاہد نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"تم کیسے آئے ہو بچہ۔ تمہیں کیا روگ ہے؟"

میں نے خفیہ کوڈ کا جملہ بول دیا۔ خفیہ جاسوس نے بھی اس کے جواب میں ایک خفیہ جملہ بولا۔ میں نے اس کا جواب خفیہ کوڈ کے جملے سے دیا تو سنیاسی بابا یعنی ہمارے خفیہ جاسوس نے آہستہ سے کہا۔

"شام کو اندھیرا ہونے کے بعد آنا۔"

میں نے کہا۔

"بڑا ضروری پیغام پاکستان میں ابھی پہنچانا ہے۔"
جب میں نے اسے ساری بات بتائی تو اس نے اردگرد نگاہ ڈالی اور بولا۔
"سامنے سڑک کے پار شمشان بھومی ہے۔ شمشان بھومی سمجھتے ہو؟"
میں نے کہا۔
"ہاں، جہاں ہندو لوگ اپنے مردے جلاتے ہیں۔"
"ہاں، شمشان بھومی کے ٹائیلوں والی دیوار کے پاس ایک کچی کوٹھڑی بنی ہوئی ہے۔ میں رات کو وہیں سوتا ہوں۔"
اس نے اپنی گیردے رنگ کی چادر کے پلو سے چابی کھول کر مجھے دی اور کہا۔
"یہ میری کوٹھڑی کی چابی ہے۔ تالا کھول کر اندر بیٹھ جاؤ اور میرا انتظار کرو جاؤ۔"
میں چابی لے کر سڑک پار کرکے شمشان بھومی میں آیا۔ ایک طرف ٹائیلوں کے درختوں کے نیچے شکستہ دیوار تھی۔ دیوار کی دوسری جانب ایک کوٹھڑی نظر آئی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور کوٹھڑی میں داخل ہوگیا۔ کوٹھڑی میں برسات کی سیلن اور حبس تھا۔ مٹی کے تین چار مٹکے اور ٹین کا ایک صندوق پڑا تھا۔ زمین پر میلی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں چٹائی پر بیٹھ کر اپنے خفیہ مجاہد کا انتظار کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص نے ریڈیو ٹرانسمیٹر یہاں کس جگہ چھپا کر رکھا ہوگا۔ تھوڑی دیر میں وہ آگیا۔ اسنے آتے ہی کوٹھڑی کا دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی لگا دی اور ایک موم بتی جلا دی۔ موم بتی کی روشنی میں اس نے کونے میں سے صندوق کو ایک طرف ہٹایا۔ اس کے نیچے بوریا بچھا ہوا تھا۔ بوریئے کو ہٹایا تو نیچے لکڑی کا تختہ نکل آیا۔ لکڑی کے تختے کو اٹھا کر اس نے ایک طرف رکھا اور نیچے گڑھے میں سے ایک چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر سائز کا ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور کہا۔

"تمہیں کوڈ تو معلوم ہی ہوگا۔"

میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کا ایریل اونچا کر کے کہا۔

"معلوم ہے۔"

ٹرانسمیٹر اون کرنے کے بعد میں نے مخصوص فریکوئنسی ملا کر سگنل دیا۔ بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ تم رات اور دن میں جس وقت بھی کوئی پیغام بھیجنا چاہو بھیج دینا۔ ہمارا آدمی تمہارا پیغام وصول کرنے کے لئے موجود ہوگا۔ دوسری طرف سے بھی مخصوص سگنل جواب میں آیا تو میں نے کوڈ الفاظ میں کہا۔

"میرا خاص پیغام نوٹ کیا جائے۔ یہ ایمرجنسی ہے۔"

دوسری طرف سے کوڈ الفاظ میں جواب آیا۔

"پیغام لکھواؤ۔"

میں نے پیغام دیا کہ شاہدرہ کے ریلوے کوارٹرز میں ایک کوارٹر دھرم چند کے ساتھ آئے ہوئے تین دہشت گردوں نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ ان کے نام گوندا' موتی رام اور ست پرکاش ہیں۔ تینوں ہندو ہیں اور مسلمان بن کر کوارٹر میں رہ رہے ہیں۔ وہ لاہور کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی دہشت گردی کی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ انہیں فوراً پکڑ لیا جائے۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا ہوں۔ دوسری طرف سے کوڈ میں جواب آیا۔

"تمہارا پیغام مل گیا ہے۔ کاروائی ابھی شروع ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"راجر"۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"راجر"۔

اس کا مطلب تھا کہ فی الحال ریڈیو ٹرانسمیٹر پر دیا جانے والا دوسرا کوئی پیغام

نہیں ہے۔ میں نے ٹرانسمیٹر بند کر کے ایریل نیچے کیا اور اپنے خفیہ آدمی سے کہا۔
"میں واپس جاتا ہوں اس ایمرجنسی پیغام کا پہنچانا بہت ضروری تھا۔"
ہمارا خفیہ آدمی سنیاسی کے بھیس میں چٹائی پر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ جب میں ٹرانسمیٹر بند کر چکا تو اس نے مجھ سے لے کر اسی طرح گڑھے میں رکھ کر لکڑی کا تختہ اوپر کر دیا۔ پھر اس نے اوپر بوریا ڈال کر صندوق رکھ دیا اور کہنے لگا۔
"میں تمہیں اس کوٹھڑی کی ایک فالتو چابی دیئے دیتا ہوں۔ اگر کبھی تمہیں کوئی ایمرجنسی پیغام پہنچانا ہو اور میں تمہیں وہاں نہ ملوں تو تم خود یہاں آکر جو پیغام پہنچانا ہو پہنچا دینا۔ اب تم پہلے باہر نکل جاؤ۔ میں تمہارے جانے کے دس منٹ بعد یہاں سے نکلوں گا۔ ذرا ٹھہرو مجھے باہر کا جائزہ لے لینے دو۔"
اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر ایک نگاہ ڈالی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔
"سب ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"
نہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کب سے خطرناک حالات میں بیٹھا یہ ڈیوٹی دے رہا ہے اور نہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا نام کیا ہے اور میں دشمن ملک میں کس مشن پر آیا ہوا ہوں۔ مجھے جو ٹریننگ دی گئی تھی اس میں خاص طور پر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ دشمن ملک میں اگر اپنے کسی ساتھی سے ملاقات ہو جائے تو پھر ایک دوسرے سے سوائے مطلب کے کوئی فالتو بات نہیں کریں گے۔ میں کوٹھڑی سے نکل کر شمشان بھومی کے صحن میں سے گزرتا ہوا سڑک پر آگیا۔
مجھے بڑی تسلی ہو گئی تھی کہ میں نے انتہائی ضروری پیغام پاکستان پہنچا دیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ پاکستانی پولیس اپنی اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ ان تینوں بھارتی دہشت گردوں کو بڑی جلدی گرفتار کر لے گی اور میرا وطن عزیز ان بھارتی دہشت گردوں کی تخریب کاری سے محفوظ ہو جائے گا۔
میں وہاں سے سیدھا امرتسر ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک چائے کی دکان

میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ ہندوؤں کی دکان تھی۔ کل رات سے آسمان ابر آلود تھا مگر بارش بالکل نہیں ہوئی تھی۔ صبح کچھ حبس تھا اس کے بعد ہوا چلنے لگی تھی۔ اب میرے سامنے ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔ مجھے ایک بہت نازک امتحان میں سے گذر تھا یعنی مجھے نقلی دھرم چند کے روپ میں اصلی دھرم چند کی بیوی کے پاس جانا تھا۔ اگرچہ میرا حلیہ اصلی دھرم چند جیسا ہی تھا۔ اس کا ثبوت مجھے جے دیو سے ملنے کے بعد مل گیا تھا۔ وہ صرف میری آواز پر تھوڑا سا چونکا تھا باقی میرا رنگ روپ نقش اور قد کاٹھ بالکل اصلی دھرم چند جیسا تھا۔ اس کے باوجود بیوی کو اپنے خاوند کی بعض ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ اگر میری کوئی ایسی خامی ظاہر ہو گی تو دھرم چند کی بیوی کے سامنے میرا راز کسی حد تک فاش ہو سکتا تھا۔ اسے شک پڑ سکتا تھا کہ میں اس کا اصلی خاوند دھرم چند نہیں ہوں۔ اس کا میں نے یہی حل سوچا تھا کہ میں دھرم چند کی بیوی کے زیادہ قریب نہیں جاؤں گا اور خاوند بیوی کے جو تنہائی کے خاص لمحات ہوتے ہیں ان لمحات سے بھی گریز کروں گا۔ باقی جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ میں دھرم چند کی بیوی بملا کے پاس نہ جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ اگر کسی طرح جے دیو کو معلوم ہو گیا کہ میں بٹالے میں آنے کے بعد بھی اپنی بیوی سے ملنے نہیں گیا تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہتر یہی تھا کہ میں ایک بار دھرم چند کے گھر ہرچووال جا کر اسی کی بیوی سے ملاقات کر آؤں۔ اس کی والدہ سے بھی ایک بار مل لوں تاکہ بعد میں کسی قسم کے شبہات پیدا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ احتیاط کے طور پر میں نے دھرم چند کی پتنی کے پاس رات کے وقت اندھیرا ہو جانے کے بعد جانے کا فیصلہ کیا۔ اندھیرے میں میری وہ کمزوریاں بھی دھرم چند کی پتنی کی نگاہوں سے چھپ سکتی تھیں جو دن کی روشنی میں ظاہر ہو کر مجھے کسی پریشانی میں مبتلا کر سکتی تھیں۔ یہ ساری باتیں میں نے ہندو کی چائے کی دکان میں چائے پیتے ہوئے اپنے دل میں طے کر لیں۔ اب مجھے

شام ہونے تک وقت گذارنا تھا۔ امرتسر شہر سے میں واقف نہیں تھا۔ پاکستان کے بعد میں زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ دلی جاتے ہوئے امرتسر سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے رکا ضرور تھا۔ شہر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ امرتسر میں ایک کمپنی باغ ہے جو بہت بڑا باغ ہے۔ اس کے علاوہ امرتسر میں سکھوں کے مقدس مقام دربار صاحب یعنی گولڈن ٹمپل کی بھی بڑی شہرت سنی تھی۔ سوچا کمپنی باغ کی بجائے کیوں نہ گولڈن ٹمپل کی یاترا کی جائے۔ چائے پینے کے بعد میں نے ایک سائیکل رکشا لیا اور اسے گولڈن ٹمپل چلنے کو کہا۔ میری جیب میں ساٹھ ستر روپے تھے۔ ازار بند کے ساتھ سو سو کے انیس نوٹ رومال میں لپٹے بندھے ہوئے تھے۔ اگرچہ مجھے اپنے بچاؤ کے لئے ہر قسم کا اسلحہ چلانے کی تربیت دی گئی تھی مگر میرے پاس پنسل بنانے والا چاقو تک نہیں تھا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران میں نے جوڈو کراٹے کے ہاتھ چلانے ضرور سیکھ لئے تھے۔ سائیکل رکشا امرتسر کے بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ رکشا ڈرائیور بوڑھا سکھ تھا۔ میں اس سے بالکل نہیں پوچھ رہا تھا کہ ہم کس بازار میں سے گزر رہے ہیں یا فلاں جگہ کا نام کیا ہے کیونکہ میں اس پر اپنا اجنبی ہونا ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سکھ رکشے والا مجھے ہندو سمجھ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ میں گولڈن ٹمپل کی یاترا کو نہیں جا رہا بلکہ وہاں کسی بازار میں میری کوئی دکان ہوگی یا میں وہاں کسی دکاندار کے پاس کاروباری سلسلے میں جا رہا ہوں گا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

امرتسر کا ایک بازار تو بڑا صاف ستھرا اور کھلا کھلا سا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امرتسر کا مشہور ہال بازار تھا۔ اس کے بعد رکشا بڑے تنگ تنگ اور پھنسے ہوئے بازاروں میں داخل ہوگیا۔ مکان ایک دوسرے کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ ان تنگ بازاروں میں لوگوں کا رش بھی بہت تھا۔ کئی جگہوں پر کوئی بیل یا گائے عین سڑک کے درمیان آکر بیٹھ گئی تھی اور کوئی اسے ڈنڈا مار کر ہٹانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ہندو لوگ گائے کو گئو ماتا کہتے ہیں۔ گائے کو ہندو دھرم میں بڑا مقدس مقام حاصل ہے۔ میں پاکستانی کی نئی نسل کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان میں کس قدر بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ دوسرے اختلافات کو چھوڑ دیں۔ صرف یہی ایک فرق لے لیں کہ جس گائے کو ہندو اپنی ماتا اور دیوی کا درجہ دیتے ہیں ہم مسلمان اسے ذبح کرکے کھا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے شہروں میں آئے دن ہندو مسلم فساد ہوتے رہتے ہیں۔

بڑے گوشت کی مسلمان بوچڑوں کی دکانوں کو ہندو آگ لگا دیتے ہیں اور انہیں قتل بھی کر ڈالتے ہیں۔ آگے چل کر میں پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں کو ہندو اور مسلمانوں کے مذہب ایک دوسرے کسقدر الگ الگ ہیں۔ بانی پاکستان حضرت قائد اعظم نے بالکل درست فرمایا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کا کلچر' ان کے رہن سہن اور ان کے مذہب الگ الگ ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے ایک ایسے خطہ زمین کا حاصل کرنا ضروری ہوگیا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور جہاں ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہب کی تعلیمات کیمطابق زندگی

بسر کر سکیں۔ اسی خطے کا نام پاکستان رکھا گیا تھا اور پھر ساری دنیا نے دیکھا کہ برصغیر کے مسلمان قائداعظم کی جرات مندانہ قیادت میں اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے اور بے مثال قربانیاں دے کر انہوں نے آخر پاکستان حاصل کر لیا۔

سائیکل رکشا امرتسر کے گولڈن ٹمپل کے بہت کشادہ چبوترے کے سامنے آ کر رک گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا چوبچہ تھا جس میں سے پانی باہر گر رہا تھا۔ دربار صاحب کے اندر جانے سے پہلے لوگ یہاں سے اپنے پاؤں دھو رہے تھے۔ میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ سکھوں کے سروں پر تو بڑی بڑی پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہندو لوگ گولڈن ٹمپل کے بڑے دروازے کی طرف جانے سے پہلے سر پر رومال باندھ لیتے تھے یا ٹوپی رکھ لیتے تھے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ چوبچے کے پانی میں سے پاؤں دھوئے۔ میرے پاس ایک ہی رومال تھا جس میں نوٹ باندھ کر میں نے ازار بند کے ساتھ اڑے ہوئے تھے۔ وہاں قریب ہی ایک سکھ سر پر رکھنے کے لئے کپڑے کی ہندوانہ ٹوپیاں لئے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کرائے پر ایک ٹوپی لیکر سر پر رکھ لی اور گیٹ میں سے گذر کر گولڈن ٹمپل میں داخل ہوگیا۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ ایک بہت بڑا تالاب تھا جس کے درمیان میں گولڈن ٹمپل کی سنہری گنبد والی عمارت بنی ہوئی تھی۔ ایک لمبا راستہ تالاب کے اوپر بنا ہوا تھا جو گولڈن ٹمپل کی عمارت تک جاتا تھا۔ عمارت کے اندر گوربانی کا شبد کیرتن ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر عمارت کے اندر ایک رات بیٹھا شبد کیرتن سنتا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے واپس آگیا۔ سوچا اب امرتسر کا کمپنی باغ بھی دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ وہاں سے رکشا پکڑا اور کمپنی باغ پہنچ گیا۔ یہ باغ واقعی بڑا خوبصورت اور کشادہ تھا۔ درمیان میں پرانی بارہ دریاں بنی ہوئی تھیں جن کی دونوں جانب تالابوں میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ کمپنی باغ کی سیر کرتے کرتے دن گذر گیا۔

جب سورج غروب ہوگیا تو میں ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اس وقت کوئی گاڑی بٹالے کی طرف نہیں جاتی تھی۔ میں ایک بس میں سوار ہوگیا۔ یہ

بس بٹالے سے ہوتی ہوئی ہرچووال اور آگے گورداسپور جا رہی تھی۔ گھنٹے سوا گھنٹے کا سفر تھا۔ ہرچووال پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ شیو مندر میں جے دیو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میں نے بڑی چالاکی سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ دھرم چند کا مکان گاؤں میں کس جگہ پر ہے۔ اس قسم کی چالاکیاں مجھے سکھا دی گئی تھیں۔ بس نے مجھے بٹالے سے گورداسپور جانے والی سڑک پر ہرچووال گاؤں کے سامنے اتار دیا۔ گاؤں کی کوئی کوئی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی گاؤں تک جاتی تھی۔ میں پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

ہرچووال گاؤں کوئی اتنا بڑا گاؤں نہیں تھا۔ مجھے دھرم چند کے مکان کی جو نشانیاں معلوم ہوئی تھیں میں ان کی مدد سے ایک مکان کے سامنے ہو کر رک گیا۔ مکان کے باہر بڑ کا بہت بڑا درخت اگا ہوا تھا جس کے نیچے دو گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے مندر میں سے کسی وقت گھنٹیوں کی آواز آ جاتی تھی۔ کچا راستہ مکان کے آگے سے گزرتا تھا۔ چار پانچ فٹ اونچی کچی دیوار تھی جس میں لکڑی کا پرانا دروازہ بند تھا۔ دیوار کے اوپر سے مکان کا صحن نظر آ رہا تھا جہاں ایک عورت چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ ایک اور عورت تھی جو صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر کھیس بچھا رہی تھی۔ پیچھے ساتھ ساتھ دو کوٹھڑیاں تھیں جن کے باہر ستون کے ساتھ لٹکی ہوئی تار کے ساتھ لگا بجلی کا بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں میں نے غور سے دیکھا۔ روٹیاں پکانے والی عورت بوڑھی تھی جبکہ چارپائیوں پر جو عورت کھیس بچھا رہی تھی وہ بھاری بدن کی جوان عورت لگتی تھی۔ اس نے سفید ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ اگر یہ بھارتی دہشت گرد دھرم چند کا ہی مکان تھا تو یقیناً" یہ جوان عورت اس کی بیوی تھی جس کا نام بملا تھا۔ میں سر دیوار کے ذرا اوپر کئے اندر دیکھ رہا تھا۔ گاؤں میں ہر طرف خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی مندر کی گھنٹی یا کسی گائے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔

دروازے کے سامنے آ کر میں نے کنڈی کھٹکھٹائی تو یقین کریں اس وقت

میرا دل ایسے زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے پہلی بار آپریشن کے لئے آپریشن روم میں جاتے وقت مریض کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل کو قابو میں کیا۔ دو تین لمبے لمبے سانس لیئے۔ میرے دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی۔ اندر سے کسی عورت نے آواز دی۔ کون ہے؟

میں نے کہا۔

"میں ہوں بھابھو دھرم چند۔"

مجھے یہ بات بہت پہلے سے معلوم تھی کہ دیہاتی ہندو عام طور پر اپنی ماتاؤں کو بھابھو کہہ کر بلاتے ہیں جبکہ سکھ لوگ اپنی ماتاؤں کو جھائی جی کہتے ہیں۔

مجھے کسی کے دوڑتے ہوئے قدم دروازے کی طرف آتے ہوئے سنائی دیئے۔ پھر ایک دم دروازہ کھل گیا۔ مجھ پر صحن میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی پڑی۔ میرے سامنے بھاری بدن والی جوان عورت کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"بھابھو! دھرمو آگیا ہے۔"

میں نے اندر داخل ہوتے ہی جوان عورت کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ حرکت میں اداکاری کے جوش میں کر بیٹھا تھا کیونکہ میں نے آج تک دھرم چند کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا اور یہ کوئی اور عورت بھی ہو سکتی تھی لیکن میری خوش قسمتی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ دھرم چند کی پتنی بملا ہی تھی۔ جو عورت روٹیاں پکا رہی تھی اور جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ میری ساس ہے روٹی چولہے پر ہی چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے مجھے گلے لگایا اور میرا منہ سر چومنے لگی۔ بملا جلدی سے اندر سے پھولدار غلاف والا تکیہ لائی اور چارپائی پر رکھ دیا۔ میں چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ بملا میری چپل اتارنے لگی۔ میں نے تھوڑا سا کھانس کر کہا۔

"نہیں نہیں بملا۔ رہنے دو۔"

بملا کی ماں نے میری طرف دیکھ کر تشویش سے کہا۔

"میں واری جاؤں دھرمے پتر! تیری آواز کیوں خراب ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"بھابھو! پاکستانی پولیس والوں نے جیل میں کچھ پلا دیا تھا۔ جب سے گلا خراب ہو گیا ہے۔"

"بالی پتر! جلدی سے دھرموں کے لئے لسی لے آ۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ بلا کو گھر میں اگر بھابھو بالی کہہ کر پکارتی ہے تو مجھے بھی اسے بالی ہی کہنا چاہئے تھا مگر میں نے اسے بلا کہہ کر مخاطب کیا تھا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں آگے سے محتاط ہو گیا۔ میں نے بلا سے کہا۔

"نہیں نہیں بالی! میں لسی نہیں پیوں گا میرے لئے چائے بنا دے۔"

"ہائے ہائے دھرمو پتر! گرمی ہے چائے گرمی خشکی کرے گی۔ اچھا میں تیرے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ بالی پتر! تو اپنے آدمی کے پاس بیٹھ۔"

بلا میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور میرے پاؤں دبانے لگی۔ میں نے پاؤں کھینچ لئے۔

"نہیں نہیں بالی رہنے دو۔"

اس کی ماں کچھ فاصلے پر چولہے کے پاس بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔ بلا نے آہستہ سے کہا۔

"دھرم جی! تم نے مجھے پہلے بلا کہا۔ پھر بالی کہا۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ تم مجھے ہمیشہ بالو کہا کرتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"کیا بتاؤں بالو! پاکستان میں پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ بہت مارا پیٹا انہوں نے سرت ہی بھلا دی ہے۔"

بلا کہنے لگی۔

"جے دیو جی نے جب آ کر بتایا کہ دھرم چند کو پاکستان میں پولیس نے پکڑ

لیا تو میں ساری رات روتی رہی۔ صبح صبح شیو جی کے مندر میں جا کر آرتی اتاری پر ارتھنا کی کہ میرا آدمی خیر خیریت سے گھر آ جائے۔ میں پانچ روپے کا لوبان جلاؤں گی۔"

میں نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر بملا کو دیئے اور کہا۔

"لے تو بیس روپے کا لوبان جلانا شیو جی کے مندر میں۔"

بملا مجھے کھجوری پنکھے سے ہوا دینے لگی۔ کہنے لگی۔

"بجلی والا پنکھا کئی روز سے خراب ہے تم یہاں ہوتے تو اسے ٹھیک کرا لاتے۔"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو میں تمہیں نیا پنکھا لا دوں گا۔"

بملا کی ماں چائے کا گلاس بنا کر لے آئی کہنے لگی۔

"پتر دھرمے! تو یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ ہمیں زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی تھوڑی بہت جو زمین ہے اسی کو سنبھال کر اپنے باپو کی طرح واہی بیجی کر۔ بھگوان نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ ایک اولاد کی کسر ہے۔ بھگوان وہ بھی دے دے گا۔"

بملا نے پنکھا جھلتے جھلتے شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے کہا۔

"بھابھو! دو چار پھیرے اور لگا لینے دو۔ پھر یہ کام چھوڑ کا واہی بیجی شروع کر دوں گا۔"

بملا کی ماں بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ پوچھنے لگی کہ میں پاکستان کی جیل سے کیسے بھاگا اور کب بھارت پہنچا۔ میں نے الٹ پلٹ کہانی گھڑ کر سنا دی۔ معلوم ہوا کہ دھرم چند نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا ہوا تھا کہ وہ پاکستان دہشت گردی کرنے جاتا ہے اور اس کے عوض سے یہاں انڈیا میں کچھ رقم مل جاتی ہے۔ بملا کی

ماں کہنے لگی۔

"تمہارے آنے کی ہمیں جے دیو جی نے بھی خبر نہیں دی۔"

میں نے کہا۔

"بھابھو! میں دوپہر کو آیا تھا۔ جے دیو مجھ سے ملا تھا مگر ہم دونوں شام تک ضروری کاموں میں پھنسے رہے۔ تمہیں معلوم نہیں جب ہمارا کوئی آدمی پاکستانی میں پکڑا جاتا ہے اور پھر وہاں سے بھاگ کر آ جاتا ہے تو اس سے پاکستان کی پولیس کے بارے میں بہت کچھ پوچھا جاتا ہے۔"

ہم وہیں صحن میں چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دیہات کی ان سادہ لوح عورتوں کو پاکستان کی جیلوں اور پولیس کے تشدد کے بارے میں یونہی قصے کہانیاں سناتا رہا۔ بھابھو کہنے لگی۔

"اچھا اب تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو' میں تمہارے لئے روٹی لاتی ہوں۔ ساگ آلو کی ترکاری بنائی ہے۔"

میرے منہ سے نکل گیا۔

"مجھے یہ سبزی بہت پسند ہے بھابھو۔"

بھابھو نے حیران ہو کر بلا کر طرف دیکھا۔ بلا کہنے لگی۔

"دھرمو جی تم کو تو ساگ آلو کی سبزی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں بالو۔ پاکستان کی جیل میں سارا دماغ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

بھابھو کہنے لگی۔

"کوئی بات نہیں پتر! کچھ دن یہاں رہ کر گھر کا مکھن کھاؤ گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے چارپائی پر صحن میں ہی کھانا کھایا۔ بڑی بڑی چار روٹیاں تھیں اور ایک چھنا ساگ آلو کی ترکاری سے بھرا ہوا تھا جس کے اوپر گائے کے مکھن کا پیڑا

ہستہ آہستہ پگھل رہا تھا۔ یہ سب کچھ صحن کے ستون کے ساتھ جلتے بلب کی روشنی
ں مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر بلب کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھا تھا۔
س طرح سے میرا چہرہ روشنی میں نہیں تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوائے میری
از کے مجھ میں اور اصلی دھرم چند میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہا تھا۔ کھانا کھانے
ہ بعد جب میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا تو بھابھو اور بملا کماری میرا منہ
ہ لگیں۔ بھابھو نے کہا۔

"پتر! تم نے تمباکو بھی پینا شروع کر دیا ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ اصلی دھرم چند سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بھابھو! جیل میں سگریٹ لگ گئے تھے۔"

"نہ پتر یہ بری عادت ہے۔"

بھابھو برتن وغیرہ سمیٹنے میں لگ گئی۔ بملا میرے پاس بیٹھی مجھ سے باتیں
کرتی رہی اور پنکھا جھلتی رہی۔ وہ بار بار دہرا رہی تھی کہ پاکستان میں میں نے
ہ دن لگا دیئے۔ کیا بالو کی یاد نہیں آئی۔ میں اس کی اس گردان سے تنگ آگیا
ہ دوسرے مجھے اس کے کپڑوں سے گھی کی بو بھی آ رہی تھی۔ شاید اس نے اپنے
کے بالوں میں گھی لگایا ہوا تھا۔ اتنے میں بارش کی بوندیں گرنے لگی۔ بھابھو نے
۔

"کڑے تو کھیس اندر لے چل میں چارپائیاں سنبھال لوں گی۔ تم دونوں
نے والی کوٹھڑی میں سو جانا۔ میں دوسرے کوٹھے میں پڑ جاؤں گی۔"

بملا کماری کھیس اور تکیہ اٹھا کر کوٹھڑی کی طرف دوڑ پڑی۔ کیونکہ بارش
وندیں زیادہ تیزی سے گرنے لگی تھی۔ میں بھی کوٹھڑی میں آگیا۔ اندر اندھیرا
بملا نے بٹن دبا کر بجلی کا بلب روشن کر دیا۔ چھوٹا سا بلب تھا۔ زیادہ روشنی نہیں
۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ زیادہ روشنی نہ ہو۔ اندر میلے سے ایک بڑے بڑے
ن پائیوں والا پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر کھیس وغیرہ پڑے تھے۔ بملا نے جلدی

جلدی سے پلنگ پر سے فالتو کپڑے اٹھا کر کونے والے لکڑی کے صندوق پر ڈال دیئے اور میرے لیٹنے کے لئے سرہانے لگا دیئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر کچھ شرماتے کچھ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ابھی آتی ہوں۔"

وہ باہر نکل گئی۔ میں پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اب میں جس امتحان میں پڑنے والا ہوں کیا اس میں کامیاب ہو سکوں گا۔ باہر سے بارش کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بلا کوئی آدھ گھنٹے کے بعد کوٹھڑی میں واپس آئی۔ اس کے بال اور ساڑھی بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ بالوں کو نچوڑتے ہوئے بولی۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے بھابھو بوڑھی ہو گئی ہے۔ سارا کام مجھ ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ صبح جانوروں کے لئے چارہ بھی کاٹنا ہوگا۔ تم تھے تو میرا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ صبح میں چارہ کاٹ دوں گا۔"

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر سوچنے لگا کیا میں جانوروں کے لئے اتنا زیادہ چارہ ٹوکے کی مشین میں کاٹ سکوں گا۔ بلا نے میرے سامنے ہی گیلی ساڑھی اتار کر ایک طرف ڈال دی اور دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی دوسری ساڑھی اتار کر پہننے لگی۔ میں نے شرم کے مارے منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس نے مجھے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہنس کر کہنے لگی۔

"مجھ سے کیوں شرم کرتے ہو بھلا؟"

میں نے کہا۔

"بس اتنے دن تم سے دور رہا ہوں اب اسکی عادت نہیں رہی۔"

وہ ساڑھی اپنے جسم پر لپیٹتی ہوئی بولی۔

"عادت پھر پڑ جائے گی۔"

اور وہ دوڑ کر پلنگ پر چڑھ کر میرے ساتھ لگ کر لیٹ گئی۔ میں ذرا پرے کھسک گیا۔ اس کے جسم میں سے دیسی گھی کی بو برابر آرہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہائے میں مرگئی دھرم جی! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

اور وہ میرے جسم کو آہستہ آہستہ بڑے پیار سے سہلانے لگی۔ اس نے تو یسا کرنا ہی تھا۔ وہ دھرم چند کی پتنی تھی۔ بیوی تھی۔ دھرم چند اس کا خاوند تھا اور ہاں بیوی اس طرح پیار کیا ہی کرتے ہیں اور وہ مجھے اپنا خاوند دھرم چند ہی سمجھ ہی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ میں اس کا خاوند نہیں ہوں بلکہ اصلی دھرم چند کی لہ نقلی دھرم چند ہوں۔ وہ بے چاری تو پتی ورتا پن نبھا رہی تھی۔ اس کا خاوند تنے دنوں کے بعد مصیبتیں جھیل کر گھر واپس آیا تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ سکھ ہانا چاہتی تھی۔

پہلے تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ ایک ہندو کی بیوی ہے اور یہ وہ ہندو ، جنہوں نے سکھوں کیساتھ مل کر سن سنتالیس کے فسادات میں مسلمانوں کی رتوں کو اغوا کیا تھا۔ اپنے باپ کی زبانی سنی ہوئی سن سنتالیس کے فسادات میں رقی پنجاب اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو سکھوں کے ظلم و ستم ساری باتیں یاد آگئیں۔ پھر خیال آیا کہ اس میں اس سادہ دل پتی ورتا دیہاتی رت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے اس کے اعتماد کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ ے بھی یہ بات مردانگی کے خلاف ہے۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا اور بملا کا ہاتھ کر کہا۔

"بالو! مجھے تھوڑا پانی پلاؤ۔ میرے سینے میں درد شروع ہوگیا ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"ہائے میں مرگئی۔ درد کیوں ہونے لگا دھرم جی۔"

میں نے کہا۔

"قید میں ان لوگوں نے میری چھاتی پر لوہے کے رولر پھیرے تھے۔ کسی

کسی وقت درد ہونے لگتا ہے۔"

وہ جلدی سے میرے لئے پانی کا گلاس لے آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹ
نے پانی کے دو گھونٹ پئے اور کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں درد ٹھیک ہو جائے گا۔ تم لیٹ جاؤ۔"

"نہیں نہیں میں گھی گرم کر کے لاتی ہوں۔ مالش کرنے سے درد چلا جا
گا۔"

پہلے ہی گھی کی بو سے میرا ناک میں دم آیا ہوا تھا۔ میں نے اسے رو
دیا۔

"نہیں بالو۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بس آج کی رات آرام کروں گ
صبح بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

وہ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی اور بھگوان سے میری صحت کی پرارتھنا کر
لگی۔ پھر کہنے لگی۔

"تم سو جاؤ۔ میں تمہارے سینے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ پھیرنے سے درد زیادہ ہوگا۔ تم آر
کرو۔ کل رات کو باقی باتیں کریں گے۔ تم بتی بجھا دو۔"

اس نے اٹھ کر بتی بجھا دی اور میرے پہلو میں آ کر میرے سینے پر اپنا
رکھ کر لیٹ گئی۔ کوٹھری میں اندھیرا ہو گیا۔ کھلی کھڑکی میں سے بارش کی آواز
ساتھ بارش میں بھیگی ہوئی ہوا بھی آ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں
سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی
لیکن جس حالت میں میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اس حالت میں سو جانا بڑے دل گرد
کام ہے لیکن میں نے اپنے از خود رفتہ نفس کے منہ زور گھوڑوں کی باگیں
مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں اور انہیں ایک لمحے کے لئے ادھر ادھر نہیں ہونے

رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ خدا کے حضور دعا بھی مانگ رہا تھا کہ اللہ مجھے اس آزمائش میں سرخ رو کرنا۔ اگر تیری مدد شامل حال ہوگی تو میں اس امتحان میں کامیاب ہو سکوں گا۔ ورنہ مارا جاؤں گا۔

جو لوگ دل و جان کے ساتھ نیک نیت رہ کر کوشش کرتے ہیں خدا ان کی ضرور مدد کرتا ہے۔ یہ اللہ میاں نے اپنی مقدس کتاب قرآن میں وعدہ کیا ہوا ہے۔ چنانچہ خدا نے میری مدد کی اور مجھے نیند آ گئی۔ میں سو گیا اور ایسا سویا کہ جب اٹھا تو بارش رک چکی تھی اور کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا- میں دن کی روشنی میں ان عورتوں کے سامنے آنے سے گھبرا رہا تھا۔ کیا معلوم انہیں میری شکل میں کوئی ایسی بات نظر آ جائے جس سے انہیں معلوم ہو جائے کہ میں اصلی دھرم چند نہیں ہوں لیکن میں زیادہ دیر تک کوٹھڑی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک تو اندر گرمی ہونے لگی تھی۔ دوسرے باہر بارش بھی رکی ہوئی تھی۔ بلا اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ دودھ پی لو۔ گوکا ہے۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی کہ رات تو پوری طرح سوئے رہے۔ اب درد تو نہیں ہو تا ناں؟"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سینے کو ہاتھ سے دبانے کے بعد کہا۔

"نہیں بالو اب درد نہیں ہو رہا۔"

میں نے گرم دودھ اس سے لے کر دو تین گھونٹ پیئے۔ وہ کہنے لگی۔

"بھابھو کو میں نے تمہاری درد کا نہیں بتایا۔ وہ پریشان ہو جاتی۔ تم بھی نہ بتانا۔ دودھ پی کی باہر آ جانا۔ میں جانوروں کے لئے چارہ کاٹنے لگی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بالو۔ میرا خیال ہے مجھے لیٹے رہنا چاہئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

وہ جاتے جاتے ایک دم رک گئی۔ پلٹ کر میری طرف بڑی اداس نظروں سے دیکھا۔

"اتنی جلدی چلے جاؤ گے؟ اتنے دنوں بعد آئے ہوئے' کچھ روز تو میرے پاس رہو۔"

میں نے کہا۔

"تم نہیں جانتیں بالو۔ پیچھے بڑا ضروری کام ہے۔ میرا پہنچنا ضروری ہے۔ فکر نہ کرو کل شام کو پھر آ جاؤں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے ساڑھی کا پلو جسم کے ساتھ لپیٹی باہر نکل گئی۔ باہر سے مجھے روٹیاں پکانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ دن کی روشنی میں ان لوگوں کے سامنے نہ ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ اگر ان عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی مجھ پر ذرا سا شک پڑ گیا تو ہو سکتا ہے وہ جے دیو سے اس کا ذکر کرے اور جے دیو کا مجھ پر شک پڑ جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور جس منصوبے کو لے کر میں بھارت میں داخل ہوا تھا وہ خاک میں مل سکتا تھا۔ جب میں کوٹھڑی سے باہر نہ نکلا تو بلا کی ماں اندر آ گئی۔

"کیا بات ہے پتر! باہر نہیں آؤ گے؟ میں نے تمہارے لئے چائے پراٹھا بنایا ہے۔ باہر آ کر کھالو۔"

میں نے کہا۔

"بھابھو میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس نے دو مہینے راتوں کو جگایا ہے۔"

"دھی رانی کہہ رہی تھی کہ تم آج ہی واپس چلے جاؤ گے یہ کیا بات ہوئی بھلا۔"

میں نے کہا۔

"بھابھو بس مجبوری ہے۔ میں کل نہیں تو پرسوں پھر آ جاؤں گا اور پورا

ہفتہ یہاں رہوں گا۔"

میں اس گھر میں ایک چھوڑ تین راتوں کے لئے رک سکتا تھا مگر میں اپنے آپ کو دوسری بار آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ آخر میں کوئی سلطان صلاح الدین ایوبی نہیں تھا۔ عام کمزوریوں والا آدمی تھا۔ ایک رات تو اللہ میاں نے مجھے امانت میں خیانت کرنے سے بچا لیا تھا۔ دوسری بار مجھے اپنے آپ سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے اندر کوٹھڑی ہی میں ناشتہ کیا اور واپس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بملا نے کھڑے میں پانی ڈال کر خود میرا منہ دھلایا۔ کہنے گی۔

"تمہارے سر کے درمیان کے بال بھی اڑنے لگے ہیں۔ پہلے تو تمہارے بال بڑے گھنے ہوا کرتے تھے۔"

میں نے کہا۔

"تمہیں کیا پتہ پاکستانی قید میں مجھ پر کیسے کیسے ظلم ہوئے ہیں۔ بس بھگوان نے زندہ رکھا۔ یہی بہت ہے۔ پانی ڈالو۔"

منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے کھدر کی چادر سے منہ پونچھا۔ بملا کوٹھڑی میں سے چھوٹا سا آئینہ اور کنگھی لے آئی۔ آئینہ اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر میرے سامنے کر دیا۔ میں نے بالوں میں کنگھی پھیری۔ میں نے آئینے میں اپنی شکل غور سے دیکھی۔ ناک کی اوپر کو اٹھی ہوئی ہڈی پلاسٹک سرجری کے بعد غائب ہو چکی تھی۔ میرا چہرہ تھوڑا سا بدل گیا تھا مگر بھارتی دہشت گرد کے چہرے سے ہو بہو مل گیا ہو تھا۔ میرے گھنگریالے بالوں نے بھی حیدر علی والے میرے پہلے چہرے میں کافی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ بملا کہنے لگی۔

"بٹالے جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"پہلے تو بٹالے ہی جاؤں گا۔ جے دیو وہیں پر ہے۔ اس کے بعد کہیں جانا پڑ

گیا تو بے دیو کے ہاتھ تمہیں پیغام بھجوا دوں گا۔ اگر کہیں نہ گیا تو کل نہیں ا
پر سوں پھر تمہارے پاس آؤں گا۔"

جب میں جانے لگا تو بلا کی ماں اندر سے ایک پیتل کی گڑوی لے آئی جس
پر ڈھکن لگا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ تھوڑا سا دیسی گھی ہے۔ اسے ساتھ لیتے جاؤ۔"

گھی کا نام سنتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"نہیں نہیں ماتا جی۔ اس کی ضرورت نہیں ہے' بالکل ضرورت نہیں
ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں ان سادہ لوح دیہاتی عورتوں سے رخصت ہو کر بٹالے
جانے والی سڑک پر آگیا تھا اور بٹالے کی طرف جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا۔

بٹالے پہنچنے کے بعد میں سیدھا شیو مندر آگیا اور اپنے ساتھی دہشت گرد جے دیو کو تلاش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے وہ کہیں نظر نہ آیا۔ کوٹھڑی کی ایک فالتو چابی میرے پاس تھی۔ میں کچھ دیر کوٹھڑی میں لیٹ کر آرام کرتا رہا۔ میرا ذہن بار بار بھارتی دہشت گردوں گووندا' ست پرکاش اور موتی رام کی طرف جاتا جن کے پاکستان میں خفیہ ٹھکانے کی رپورٹ میں نے ملک صاحب اور بٹ صاحب کو پہنچا دی تھی۔ پولیس نے وہاں چھاپہ ضرور مارا ہو گا۔ میں یہ خبر سننے کے لیے بیتاب تھا کہ یہ تینوں دہشت گرد پاکستان میں پکڑ لیے گئے ہیں۔ بھارتی اخباروں میں تو ان کی گرفتاری کی خبر شاید نہ چھپتی مگر شیو سینا کے دہشت گردوں کی پنجاب شاخ کے انچارج پرشاد جی کو اور اس کے ذریعے میرے ساتھی جے دیو کو اس گرفتاری کا علم سب سے پہلے ہو جانا تھا۔ پاکستان میں روپوش دوسرے بھارتی دہشت گردوں نے وائرلیس پر انہیں خبر کر دینی تھی کہ لاہور پولیس نے گووندا' ست پرکاش اور موتی رام کو پکڑ لیا ہے۔

میں دوپہر تک کوٹھڑی میں پڑا رہا۔

دوپہر کے وقت باہر نکل کر ایک ہندو کے ویشنو ڈھابے سے دال چپاتی کھائی اور واپس شیو مندر میں آکر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ رات کو بارش ہوئی تھی مگر اب بادل چھٹ گئے تھے اور بڑی تیز دھوپ نکل آئی تھی جس کی وجہ سے فضا میں گرمی اور حبس ہو رہا تھا۔ دوپہر کو بھی جے دیو نہ آیا۔ شام ہو گئی۔ میں مندر میں ہی ادھر ادھر پھرتا رہا۔ رات کو ڈھابے میں ہی کھانا کھایا اور کوٹھڑی کے

باہر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مندر میں پوجا پاٹھ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں پھر شبھ کیرتن کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک تبدیلی میں نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ بٹالے یا امرتسر میں صبح سے لے کر رات تک مسجد سے بلند ہوتی اذان کی آواز کبھی سنائی نہیں دی تھی۔ امرتسر میں پھر بھی مسجد خیرالدین' مسجد جان محمد اور بوڑ والی مسجد باقی تھی۔ مسجد خیرالدین میں تو سکھ شرنارتھی رہ رہے تھے مگر مسجد جان محمد اور بوڑ والی مسجدیں مسلمان کشمیری محنت کش کی تحویل میں تھیں اور وہ دبی آواز میں اذان بھی دے دیا کرتا تھا۔ نماز پڑھنے والا وہاں سوائے ان تھوڑے بہت کشمیری مزدوروں کے اور کوئی نہیں تھا۔ بٹالے میں تو مجھے کسی جگہ کوئی مسجد دکھائی نہیں دی تھی۔

جے دیو رات کے دس بجے کے قریب آیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں اس وقت کوٹھڑی کے اندر پنکھا چلا کر چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔ آتے ہی بولا۔

"رام چند بڑی بری خبر ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"بھاپے کیا ہو گیا ہے؟"

جے دیو میرے پاس ہی بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"لاہور میں گوونداؔ' ست پرکاش اور موتی رام پکڑے گئے ہیں۔"

میرا دل خوشی سے اچھل پڑا مگر میں نے اپنی خوشی کو بڑی مشکل سے چھپایا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے مجھے خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا ہے' کہا۔

"ہے رام! یہ کیسے ہو گیا۔ وہ تو بڑی محفوظ جگہ پر چھپے ہوئے تھے۔"

جے دیو بولا۔

"جگہ محفوظ نہیں تھی۔ یہی تو ان سے غلطی ہو گئی۔ سی آئی ڈی پیچھے لگی ہو گی۔ کسی نے مخبری کر دی اور پکڑے گئے۔"

"کیا خبر سچی ہے جے دیو؟"

"اپنے آدمی نے حیدر آباد سے خفیہ کوڈ سگنل پر بتایا ہے۔ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ تو ہمارا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ پولیس ہمارے آدمیوں پر بڑا سخت تشدد کرے گی۔ کہیں وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا نام پتہ تو نہیں بتادیں گے۔"

جے دیو نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"ہم آدمیوں کو بڑی سخت ٹریننگ دے کر بھیجتے ہیں۔ تمہیں تو خود معلوم ہے لیکن پرشاد جی نے سندھ میں اپنے آدمیوں کو روپوش ہونے کا آرڈر دے دیا ہے۔"

میں نے یہ جاننے کے لیے کہ بھارتی دہشت گرد روپوش ہو کر کہاں جاتے ہیں' اس سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب ہمارے آدمی پاکستان میں کوئی واردات نہیں کریں گے؟"

وہ بولا۔

"دھرم چند تم تو ایسے باتیں کرتے ہو جیسے تم بالکل نئے ہمارے گروپ میں آئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ روپوش ہونے کے بعد ہم کچھ روز اپنی کارروائیاں بند کر دیتے ہیں اس کے بعد پھر شروع کر دیتے ہیں۔"

اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بھارتی دہشت گرد روپوش ہو کر کہاں گئے ہیں۔ میں نے کہا۔

"پاکستان میں اب بڑی سختی ہو گئی ہے۔ ہمارے آدمی جہاں بھی روپوش ہوں' پاکستانی پولیس انہیں پکڑ لے گی۔"

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں جے دیو آدمی بیوقوف تھا۔ دو چار چالاکی کی باتوں سے میں نے اسے اپنے جال میں الجھا لیا۔ اس نے گرمی سردی میں آکر مجھے وہ ٹھکانہ بتا دیا جہاں باقی کے بھارتی دہشت گرد چھپ گئے تھے۔ یہ جگہ سندھ

اور پنجاب کے درمیان ویران پہاڑیوں میں ایک پرانے کھنڈر کے قریب جنگل میں واقع تھی۔ میں نے جے دیو سے پوچھا۔

"اب ہمارا کیا پروگرام ہو گا؟"

وہ بولا۔

"پروگرام کیا ہونا ہے۔ شیو سینا کی پنجاب شاخ کے پرشاد جی کو اوپر سے جو آرڈر آئے گا وہی کریں گے۔ شاید کچھ وقت کے لیے اپنے روپوش دہشت گرد ہی دوبارہ وارداتیں شروع کر دیں یا شاید بمبئی سے نئے آدمی ٹریننگ کے بعد بھیجے جائیں۔"

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ شیو سینا کے ان دہشت گردوں کا مرکز بمبئی میں تھا۔ ان کا اصل کرتا دھرتا شیو سینا کا انتہا پسند اسلام دشمن بال ٹھاکرے تھا مگر وہ پردے کے پیچھے رہتا تھا اور اس نے اپنے ایک مرہٹہ ساتھی بالا جی کو آگے کر رکھا تھا۔ پاکستان میں انڈیا کی پاکستان دشمن خفیہ تنظیم راء کے ناپاک تخریبی منصوبے بال ٹھاکرے تک پہنچتے تھے۔ بال ٹھاکرے آگے بالا جی کو احکام صادر کرتا تھا اور بالا جی پنجاب میں شیو سینا کی جماعت کے لیڈر پرشاد جی کو آرڈر دیتا تھا جو بھارتی دہشت گردوں کی خاصی تعداد امرتسر سے سمگل کر کے پاکستان پہنچا دیتا تھا۔

میں نے جے دیو سے کہا۔

"میرے بارے میں اب کیا حکم ہے۔ میں بٹالے میں کب تک پڑا رہوں گا؟"

جے دیو بولا۔

"جب تک اوپر سے کوئی آرڈر نہیں آتا تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔"

پھر ہنس کر کہنے لگا۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ تمہیں الاؤنس بھی ملتا رہے گا اور تم چاہو تو ہرچووال اپنی پتنی کے پاس بھی رہ سکتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ گھر گئے تھے - وہاں کیسے

گزری؟"

میں نے بھی شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس ------ جیسے گزرنی چاہیے تھی گزر گئی۔"

جے دیو کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر کہنے لگا۔

"مجھے امرتسر پرشاد جی کے ٹھکانے پر ان سے ضروی باتیں کرنے جانا ہے۔ کل واپس آؤں گا۔"

جو بھارتی دہشت گرد سندھ اور پنجاب کے درمیان جنگل میں چھپ گئے تھے' میں ان کی خبر پاکستان میں پہنچانے کے لیے بیقرار تھا۔ میں نے کہا۔

"یار جے دیو! سوچتا ہوں میں بھی امرتسر کے چترا سینما میں کوئی فلم دیکھوں۔"

اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہاں آخری شو کا ابھی وقت ہے میرے ساتھ ہی چلو۔ تم چترا سینما کی طرف چلے جانا۔ میں پرشاد جی کے ہاں چلا جاؤں گا لیکن رات کو بٹالے واپس کیسے آؤ گے؟"

"شاید آخری لاری مل جائے۔"

وہ بولا۔

"یار تم ساری باتیں بھول گئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے پاکستانی پولیس نے تمہاری بہت چھترول کی ہے۔ بھاپے تمہیں یاد نہیں رات کے ڈیڑھ بجے ایک پارسل ٹرین امرتسر سے گورداسپور کی طرف چلتی ہے۔ ہم کئی بار اس پر سفر کر چکے ہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں یاد آگیا ہے۔ ٹھیک ہے میں اسی ٹرین کے ذریعے واپس بٹالے آ جاؤں گا۔"

"تو پھر چلو۔ وقت ضائع نہ کرو۔"

ہم مندر سے نکل کر لاری اڈے پر آئے۔ بٹالے سے امرتسر اور امرتسر سے بٹالے لاریاں رات دس گیارہ بجے تک چلا کرتی تھیں۔ ہم نے ایک لاری پکڑی اور امرتسر پہنچ گئے۔ چترا سینما لاریوں کے اڈے کے قریب ہی انجمن پارک والے نالے کے پل کے ساتھ ہی تھا۔ جے دیو جلیانوالے باغ کی طرف چل دیا کیونکہ شیو سینا کی پنجاب شاخ کے صدر پرشاد جی کا دفتر وہیں تھا اور میں چترا سینما کی طرف روانہ ہو گیا۔ فلم مجھے کہاں دیکھنی تھی۔ میں تھوڑی دور جا کر اس سڑک پر ہو گیا جو اپنے مجاہد جاسوس کے ٹھکانے کی طرف جاتی تھی۔ اس وقت اپنا جاسوس ساتھی کوٹھڑی کے باہر اکیلا ہی سنیاسی کے بھیس میں بیٹھا ناریل کی چلم کے دم لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے چلم ایک طرف اینٹ کے ساتھ رکھ دی اور بولا۔

"کوئی خاص خبر ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں بڑا ضروری پیغام پاکستان پولیس کو پہنچانا ہے۔"

اس نے ایک نظر دائیں بائیں ڈالی اور بولا۔

"اندر چلے جاؤ۔"

میں کوٹھڑی میں گھس گیا۔ مجھے معلوم تھا اس نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کس جگہ چھپایا ہوا۔ وہاں سے میں نے چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکال کر اسے اون کیا۔ ٹرانسمیٹر میں سے ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا۔ میں نے فریکوئنسی ملائی اور مخصوص سگنل دینے شروع کر دیئے۔ دوسری طرف سے بھی سگنل کے اشارے ملنے لگے۔ میں نے کوڈ الفاظ میں کہا۔

"ایک ضروری پیغام ہے نوٹ کرو۔"

"ضروری پیغام لکھوایا جائے۔"

میں نے کہا۔

"بھارتی دہشت گرد گوونداؔ، ست پرکاش اور موتی رام کی گرفتاری کے بعد اس کے باقی بھارتی دہشت گرد ساتھی سندھ اور پنجاب کے درمیان جنگل میں جہاں ایک کھنڈر بھی ہے، چھپ گئے ہیں۔ اس کی نشانی نوٹ کرو۔ یہاں ویران ٹیلے ہیں۔ ٹیلوں کے قریب جنگل کا ٹکڑا ہے۔ بھارتی دہشت گرد اسی جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ کیا پورا پیغام نوٹ کر لیا گیا ہے؟"

"یس! پورا پیغام نوٹ کر لیا گیا ہے۔"

"راجر!"

"اوکے راجر۔"

میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ اسے لکڑی کے ڈبے میں بند کر کے زمین کے اندر گڑھے میں چھپایا اور کوٹھڑی سے باہر آ کر اپنے جاسوس سے کہا۔

"پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔"

اس نے مجھ سے بالکل نہ پوچھا کہ پیغام کیا تھا۔ کہنے لگا۔

"رات یہیں ٹھہرو گے یا واپس جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"واپس جاؤں گا۔"

اپنے جاسوس نے جو سنیاسی بابا کے بھیس میں تھا، چلم اٹھائی اور اس کے دم لگانے لگا۔ میں خاموشی سے چترا سینما کی طرف ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو دوسرا شو شروع ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے۔ ٹکٹ والی کھڑکی کھل تھی۔ میں نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور سینما ہال میں جا کر بیٹھ گیا۔ انٹرول تک فلم دیکھی - فلم مجھے اچھی نہ لگی۔ میں واپس سینما ہال میں جانے کی بجائے لاریوں کے اڈے پر آیا اور یہاں سے بٹالہ جانے والی لاری پکڑی اور بٹالے آ گیا۔

شیو مندر کے کرم چاری میری شکل سے واقف ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں جے دیو کا دوست ہوں اور شیو مندر میں جو اس کی کوٹھڑی ہے، میں بطور

مہمان ٹھہرا ہوا ہوں۔ کوٹھڑی کے اندر پنکھا چلا میں لیٹ گیا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ میں نے انتہائی ضروری پیغام لاہور پہنچا دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہماری پولیس پارٹی ابھی سندھ اور پنجاب کے درمیانی جنگل کی طرف نکل گئی ہو گئی اور جنگل کو گھیرے میں لے کر بھارتی دہشت گردوں کو دبوچ لے گی۔

جے دیو رات کو نہ آیا۔ صبح جب میں مندر کے دروازے کے سامنے والی دکان پر چائے اور بند مکھن کا ناشتہ کر رہا تھا تو آ گیا۔ اس نے دور سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب آ کر بولا۔

"رات والی فلم کیسی تھی؟"

میں نے کہا۔

"بڑی مزے دار تھی۔ گانے بڑے اچھے تھے۔ آؤ چائے پیو۔"

وہ بولا۔

"میں لسی پی کر آ رہا ہوں۔ ارے تم بھی لسی پیا کرو اور رات تم اپنی پتنی کے پاس نہیں گئے؟"

میں نے کہا۔

"یار جے دیو! میری پتنی بیمار ہے۔"

پھر میں نے اسے آنکھ ماری۔ وہ سمجھ گیا کہ میری پتنی کو عورتوں والی خاص بیماری ہے۔ ہنس کر بولا۔

"بھاپے یہ تو پھر مجبوری ہے۔"

وہ میرے پاس لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"پرشاد جی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

اس نے گردو پیش نگاہ ڈال کر مجھے آنکھ ماری۔ ہم سے تھوڑے فاصلے پر ایک سکھ کرسی پر بیٹھا شیشے کے گلاس میں چائے پی رہا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔

چائے پی کر ہم مندر والی کوٹھڑی میں آ گئے۔ جے دیو کہنے لگا۔

"پرشاد جی نے کہا ہے کہ ابھی کچھ دیر ہمیں خاموش رہنا ہو گا۔ ہفتے دس دن کے بعد اپنے وہی آدمی جو سندھ میں روپوش ہیں دوبارہ کاروائیاں شروع کر دیں گے۔ پرشاد جی کا کہنا ہے کہ دہشت گردوں کی تازہ پارٹی بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں میرے پاس ہی رہو گے۔ ویسے کل شام کو تمہیں پرشاد جی نے اپنے آفس میں بلایا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

وہ بولا۔

"میرا خیال ہے کوئی خاص بات ہی ہے۔ پرشاد جی نے کہا تھا کہ کل شام دھرم چند کو لے کر میرے پاس آنا۔ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔"

میں رات کو چٹائی پر لیٹا سوچتا رہا کہ اس انتہا پسند پاکستان دشمن ہندو نے مجھ سے کیا پوچھنا ہو گا۔ بہر حال اس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ تو دھرم چند سے اس سے پہلے بھی مل چکا تھا مگر میں نقلی دھرم چند کے روپ میں اس سے پہلی بار مل رہا تھا۔

دوسرے روز شام کو جے دیو نے مجھے ساتھ لیا اور ہم لاری میں بیٹھ کر امرتسر آ گئے۔ جلیانوالہ باغ میرا خیال تھا کہ کوئی باغ ہو گا۔ شیو سینا کی پنجاب شاخ کا ہیڈ آفس یہیں پر تھا مگر یہ شہر کا گنجان محلہ تھا۔ جے دیو نے مجھے بتایا کہ جلیانوالہ باغ مکانوں کے درمیان سے گزرنے والے ایک راستے سے آگے میدان کی شکل میں ہے۔

'پہلے تو یہ ویران میدان ہوا کرتا تھا۔ اب میونسپل کمیٹی نے یہاں گھاس کے پلاٹ بنا کر پھولوں کی کیاریاں بنا دی ہیں۔ یہ بڑی اتہاسک [تاریخی] جگہ ہے۔"

میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں اس باغ سے واقف ہوں' کہا۔

"ہاں ہاں بھاپے مجھے معلوم ہے۔ میں تو بٹالے سے اکثر یہاں آجایا کرتا

تھا۔"

شیو سینا کا ہیڈ آفس وہیں ایک تنگ گلی میں تھا۔ چھوٹا سا آفس تھا۔ کمرے میں ایک طرف گاندھی' نہرو کی اور سامنے کی جانب بال ٹھاکرے کی بڑی تصویر لگی تھی۔ اس نے چشمہ لگایا ہوا تھا۔ زعفرانی چادر کاندھے پر ڈالی ہوئی تھی اور گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار تھے۔ میں بال ٹھاکرے کی شکل و صورت سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے دست راست بالا جی کو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ دفتر میں ایک کانگرسی ٹوپی والا کھدر پوش نوجوان بیٹھا رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ دو تین ہندو دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر ہاتھوں میں درخواستیں لیے بیٹھے تھے۔ باہر ہندی میں لکھا ہوا شیو سینا کا بورڈ لگا تھا۔ اندر بھی جگہ جگہ ہندی زبان کے پوسٹر لگے تھے اردو کا ایک لفظ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کانگرسی ٹوپی والے آفس سیکریٹری نے جے دیو سے نمسکار کہہ کر ہاتھ ملایا۔ اس نے کہا۔

"شریمان پرشاد جی نے ہمیں بلایا تھا۔"

آفس سیکریٹری نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ دھرم چند لگتا ہے۔"

جے دیو ہنس کر بولا۔

"لگتا نہیں یہ دھرم چند ہی ہے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر آفس سیکریٹری کو پرنام کیا۔ اس نے جے دیو سے کہا۔

"تم لوگ اندر چل کر بیٹھو میں پرشاد جی کو اطلاع کرتا ہوں۔"

ہم دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں دیوار کے ساتھ پرانی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کارنش پر شیوا جی مرہٹہ کا پیتل کا بت پڑا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور گھوڑے کی دونوں اگلی ٹانگیں اٹھی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ کمرے کا سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بدن والا ادھیڑ عمر آدمی جس کا سر گنجا تھا' زعفرانی رنگ کے کرتے پاجامے میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سگرٹوں کا پیکٹ اور چاندی کا لائیٹر تھا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولا۔

"کہو دھرم چند پاکستانی پولیس نے زیادہ ٹھکائی تو نہیں کی؟ تم بڑے بہادر ہو کہ بھاگ کر آ گئے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"بس مہاراج بھگوان کی کرپا سے بھاگنے میں سپھل ہو گیا۔"

یہ شیو سینا کی پنجاب شاخ کا صدر پرشاد جی تھا۔ وہ میری طرف مسلسل تکتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"دھرم چند تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو تمہاری آواز بھاری تھی۔ اب تھوڑی باریک کیوں ہو گئی ہے؟"

میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ پاکستانی جیل میں جب مجھ پر تشدد کیا جاتا تھا تو ایک روز مجھے کوئی چیز پانی میں گھول کر پلا دی گئی تھی جس سے میں دو دن نیم بے ہوشی کی حالت میں رہا اور اسی بے ہوشی کی حالت میں مجھ سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ اس دوائی کے اثر سے میرا گلا خراب ہو گیا اور آواز پر بھی اس کا برا اثر پڑا۔

پرشاد جی نے کہا۔

"تم نے پاکستانی پولیس کو کچھ بتایا تو نہیں؟"

میں نے کہا۔

"مہاراج رام رام کریں۔ آخر ہمیں ٹریننگ کس لیے دی جاتی ہے۔ پولیس نے مجھ کو ہر طرح سے اذیت دی۔ مجھے الٹا لٹکا کر دھونی دی گئی۔ بجلی لگائی گئی پرنتو مہاراج میں نے بھی زبان نہیں کھولی۔"

"شاباش۔"

”یہ کہہ کر پرشاد جی نے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہنے لگے۔“

”تمہارے فرار ہونے کے بعد پاکستانی پولیس نے چھاپہ مار کر اپنے آدمیوں گووندا ' ست پرکاش اور موتی رام کو پکڑ لیا۔ یاد کرو کہیں تم نے بے ہوشی کی حالت میں پولیس کو ان کا شاہدرے والا خفیہ ٹھکانہ تو نہی بتا دیا تھا۔“

میں فوراً“ بڑے اعتماد سے کہا۔

”مہاراج! بھلا میں ایسی بات دشمن کو بتا سکتا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی میں بار بار ایک ہی جملہ بولتا تھا کہ میں اگروادی نہیں ہوں۔ میں پاکستان میں مندروں کی یاترا کرنے آیا تھا کہ سینما ہاؤس کے باہر بم پھٹ گیا۔ میں بھاگا تو پولیس نے مجھے اگروادی سمجھ کر پکڑ لیا۔“

پرشاد جی نے جے دیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ ساری غلطی ست پرکاش اور گووندا کی ہے۔ انہوں نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ انہیں چاہئے تھا کہ لاہور شہر سے باہر کسی گاؤں میں چلے جاتے۔ وہ مسلمان بن کر کہیں بھی کسی گاؤں میں رہ سکتے تھے۔“

کچھ دیر اس قسم کی باتیں کرنے کے بعد پرشاد جی مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

”دھرم چند! تم ہمارے بڑے تجربہ کار اگروادی ہو۔ اس بار پاکستان میں پارٹی بھیجنے سے پہلے بمبئی سے بال ٹھاکرے کے حکم سے بالاجی نے مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ پارٹی میں دھرم چند کو ضرور ساتھ بھیجا جائے۔“

پرشاد جی کی زبانی معلوم ہوا کہ دھرم چند بڑا خطرناک دہشت گرد تھا اور وہ اس سے پہلے پاکستان میں کئی ہلاکت خیز تخریبی کاروائیاں کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔

”مہاراج! یہ ان کی بڑی کرپا ہے۔ ہم تو آپ کی طرح دیش سیوک ہیں۔ بھارت ماتا کی خاطر جان بھی حاضر ہے۔“

پرشاد جی نے ایک بار پھر میری طرف گھور کر دیکھا اور بولے۔

"تمہاری آواز کافی بدل گئی ہے۔ دھرم چند تم کسی ڈاکٹر کو گلا دکھاؤ۔ وہ تمہاری آواز ٹھیک کر دے گا۔"

میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ میں نے بھی یہی سوچا ہوا ہے۔"

اندر مجھے کچھ تشویش ضرور ہوئی تھی کہ یہ شخص انتہائی زیرک اور چالاک ہے کہیں اس کو شک نہ ہو جائے کہ میں اصلی دھرم چند نہیں ہوں مگر میرے ناک کی پلاسٹک سرجری اتنی کامیابی سے کی گئی تھی کہ شکل تو میری دھرم چند سے ملتی ہی تھی' ناک کی ابھری ہوئی ہڈی کی جو کسر رہ گئی تھی اسے پلاسٹک سرجری نے پورا کر دیا تھا۔ مجھے پورا اعتماد تھا کہ جب تک ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہو جاتا کہ میری کمر پر ریڑھ کی ہڈی کے قریب سواستیکا کا نشان نہیں ہے اور میرے ختنے ہوئے ہوئے ہیں ان لوگوں کو کبھی پتہ نہیں چل سکتا کہ میں اصلی دھرم چند نہیں ہوں۔ چنانچہ میں بڑے اعتماد سے بول رہا تھا۔ ہمارے لیے سوڈا واٹر کی بوتلیں آ گئیں۔ پرشاد جی مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"دھرم چند! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے پاس تجربہ کار ٹرینڈ اگروادیوں [دہشت گردوں) کی کس قدر کمی ہے۔ ویسے تو ہماری شیو سینا کا ہر ممبر جانے کو تیار ہو جاتا ہے پرنتو ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ تم دونوں کو معلوم ہے کہ اس کے لیے ہمیں کتنی ٹریننگ دینی پڑتی ہے۔ صرف بموں کے دھماکے کرنے اور کلاشنکوفوں کے برسٹ فائر کر کے لوگوں کو مارنے کی ٹریننگ ہی نہیں دینی ہوتی بلکہ مختلف اذیتیں دے کر یہ ٹریننگ بھی دینی ہوتی ہے کہ پکڑے جانے کی صورت میں پولیس ٹارچر کرے تو یہ اپنی زبان بند رکھیں۔ اس کے لیے ہمیں بڑا سخت چناؤ کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اردو زبان سکھانی پڑتی ہے۔ انہیں مسلمانوں والے سارے طریقے سکھانے پڑتے ہیں۔ اسی واسطے جب ہمارا کوئی آدمی پاکستان میں پکڑا جاتا ہے یا مارا

جاتا ہے تو ہمارا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے تین آدمی پاکستانی پولیس نے پکڑ لیے ہیں۔ تین روپوش ہیں۔ بمبئی سے بالاجی نے مجھے آرڈر دیا ہے کہ ہم چند آدمیوں کی ایک پارٹی تیار کریں اور انہیں ٹریننگ دی جائے اور دو ہفتوں کے بعد انہیں سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے یاتریوں کے بھیس میں پاکستان پہنچا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بالا جی نے بال ٹھاکرے جی کے حکم پر تمہیں بمبئی بلایا ہے۔ بالا جی کو تم پر بڑا وشواش ہے۔ بس تم کل رات کو فرنٹیر میل میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں کوئی تیاری تو نہیں کرنی؟"

میں نے فوراً کہا۔

"مہاراج تیاری کیا کرنی ہے۔ اپنے گھر میں کہہ آیا ہوں کہ ابھی ہفتہ دس دن میں نہیں آؤں گا۔ میں بٹالے واپس بھی نہیں جاؤں گا۔ آج رات امرتسر میں ہی ٹھہروں گا اور صبح فرنٹیر میل میں سوار ہو جاؤں گا۔"

مجھے شیو سینا کے گڑھ میں جانے کا موقع مل رہا تھا۔ میرا اصل ٹارگٹ وہی تھا۔ میں شیو سینا کے اس پاکستان دشمن گڑھ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ پرشاد جی نے مجھے سو روپیہ دیا اور کہا۔

"بمبئی تک کے لیے یہ کافی ہوں گے۔ باقی ضرورت پڑی تو بالا جی کے آفس سے تمہیں پیسے مل جائیں گے۔ تم آج رات ہمارے آفس کی چھت پر ہی سو جانا۔"

پھر اس نے جے دیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم بے شک واپس بٹالے چلے جاؤ اور ہمارے اگلے آرڈر کا انتظار کرو۔"

جے دیو بولا۔

"جو حکم مہاراج!"

رات کا کھانا میں نے اور جے دیو نے بازار کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ جے

دیو کہنے لگا۔

"تم نے بمبئی میں بالا جی کا دفتر دیکھا ہوا ہے ناں؟"

میں نے خاک دیکھا ہوا تھا۔ میں تو پہلی بار بمبئی جا رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔

"ہاں دیکھا ہوا ہے۔ بالا جی سے بھی مل چکا ہوں۔"

مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ دھرم چند بمبئی جا کر بالا جی اور بال ٹھاکرے بھی بھی ملاقات کرتا رہتا تھا۔ جے دیو بولا۔

"تمہیں آخری بار بمبئی گئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ وہ علاقہ اب کافی بدل گیا ہے۔ وہاں تین چار نئی بلڈنگیں کھڑی ہو گئی ہیں۔ میں تمہیں پھر سے سمجھائے دیتا ہوں۔"

جے دیو مجھے سمجھانے لگا۔ میں نے بڑے طریقے سے اس سے بازار کا نام ' علاقے کا نام بھی پوچھ لیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہاں بالا جی اور بال ٹھاکرے کے نام سے بچہ بچہ واقف تھا۔ اس کے بعد جے دیو بٹالے واپس جانے کے لیے مجھ سے رخصت ہو گیا۔ رات میں نے شیو سینا کے آفس کی چھت پر سو کر گزار دی۔ صبح مجھے نوکر نے آ کر جگا دیا۔ دفتر کے غسل خانے میں میں نے غسل کیا۔ وہیں ناشتہ آ گیا۔ فرنٹیر میل امرتسر سے تیار ہو کر اس زمانے میں نو بج کر چالیس منٹ پہ بمبئی کی طرف روانہ ہوتی تھی۔ پرشاد جی نو بجے اپنے گھر سے نکل کر دفتر آ کر مجھ سے ملے اور کہا۔

"بالا جی کو میرا پرنام کہنا اور کہنا کہ ہم ان کے آرڈر پر ہی چلیں گے۔ ان کے پاس میرا خاص ٹیلی فون نمبر ہے۔ اگر کوئی خاص بات کہنی ہوئی تو بالا جی اس نمبر پر مجھ سے بات کر لیں گے۔ تم واپسی پر سیدھے میرے پاس آنا۔ سمجھ گئے ہو ناں۔"

"جی ہاں شریمان جی - میں سمجھ گیا ہوں - آپ نے جیسا کہا ہے میں ویسے

ہی کروں گا۔"

پرشاد جی نے کہا۔

"ٹھیک ہے - اب جلدی سے اسٹیشن پر پہنچو۔ رام داس تمہارے رکشا لے آیا ہے۔"

میں نے پرشاد جی کو پرنام کیا اور آفس سے نکل کر بازار میں آگیا۔ با
میں دفتر کا چپڑاسی سائیکل رکشے کے پاس کھڑا تھا۔ میں رکشے مین بیٹھ گیا اور ر
امرتسر کے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

اسٹیشن سے فرنٹیر میل میں سوار ہوا اور بمبئی کی طرف روانہ ہو گیا۔
بمبئی پہلی بار جا رہا تھا۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ راستے میں انڈیا کے کئی بڑے شہر آئے
زبانیں بدلتی رہیں۔ لباس بدلتے رہے۔ آخر بمبئی کا اسٹیشن بھی آگیا۔ معلوم ہوا
بمبئی کے دو بڑے اسٹیشن ہیں جو ٹرمینل ہیں۔ یعنی وہاں سے آگے گاڑی نہیں
جاتی۔ ایک اسٹیشن کا نام بوری بندر تھا اور دوسرے کا نام بمبئے سنٹرل تھا۔ فرنٹیر
میل بمبئے سنٹرل کے اسٹیشن پر جا کر رکی تھی۔ شیو سینا کے ہیڈ آفس کا ایڈریس میں
نے جے دیو سے باتوں باتوں میں معلوم کر لیا تھا ورنہ وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ مجھے
ایڈریس پہلے سے معلوم ہے۔ تجربہ کار تربیت یافتہ اور سینئیر بھارتی دہشت گرد
دھرم چند کئی بار بمبئی جا چکا تھا اور میں دھرم چند کے روپ میں تھا۔

وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک خوش خبری سننے کو ملی۔ یہ میرے لیے خوش خبری
اور شیو سینا کے لیڈر بالا جی اور بال ٹھاکرے کے لیے بری خبر تھی۔ خوش خبری یہ
تھی کہ پاکستانی پولیس نے میری اطلاع پر سندھ اور پنجاب کے درمیانی جنگل میں
چھاپہ مار کر تینوں بھارتی دہشت گردوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس خوش خبری کا
انکشاف مجھ پر اس وقت ہوا جب میں شیو سینا کے ہیڈ آفس کے سیکریٹری لال جی
سے ملا۔ لال جی بھی مرہٹہ تھا اور اس کے ملنے کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ
دھرم چند سے کافی بے تکلف ہے۔ میں نے اسے نمسکار کیا تو وہ بولا۔

"دھرم چند! تم تو ہمیشہ مجھے جے ہند کہہ کر ملا کرتے ہو آج نمسکار کس خوشی میں کیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس خوشی میں کہ میں پاکستانی جیل توڑ کر بھارت پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

اس شخص کا لال چند نام میں نے دفتر کے چپڑاسی سے بڑی چالاکی سے معلوم کرلیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور رازداری سے بولا۔

"ایک بری خبر بھی ہے۔"

اس کی زبانی مجھے یہ خوش خبری ملی کہ پاکستان میں ان کے روپوش دہشت گرد بھی پولیس نے پکڑ لیے ہیں۔

"ست پرکاش، گوونداا اور موتی رام تو پہلے ہی پکڑ لیے گئے تھے اب یہ بھی پکڑے گئے ہیں۔"

میں نے بناوٹی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ پاکستان میں ہماری طاقت اب نہ ہونے کے برابر ہے۔"

لال چند کہنے لگا۔

"اس بارے میں بالاجی نے تم سے کوئی خاص مشورہ کرنا ہے۔ میں نے انہیں فون پر تمہارے آنے کی خبر کر دی ہے۔ وہ ٹریننگ کیمپ سے چل پڑے ہیں۔"

میں بمبئی دن کے پہلے ٹائم پہنچا تھا۔ وہاں موسم خوشگوار تھا۔ گرمی اور حبس نہیں تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں دفتر کے باہر ایک چھوٹی سی گاڑی آکر رکی۔ چپڑاسی نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر سے ایک گہرے سانولے رنگ کا اکہرے بدن کا آدمی

باہر نکلا۔ اس نے گیروے رنگ کے کھدر کا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں پونا کی چپل تھی۔ گلے میں زعفرانی پٹکا ڈالا ہوا تھا۔ ماتھے پر سرخ رنگ کا گول تلک تھا۔ میں بھی لال چند کے ساتھ اس کے سواگت کو بڑھا۔ یہ بالا جی تھا۔ اس نے کاندھے پر زعفرانی پٹکا درست کرتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

"دھرم چند کب آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی تھوڑی دیر پہلے پہنچا ہوں۔"

"تمہاری آواز کیوں بدل گئی ہے؟"

"پاکستانی پولیس نے کچھ پلا دیا تھا۔ اسی دن سے گلا خراب ہے۔ آواز بھی خراب ہو گئی ہے۔"

"میرے ساتھ اوپر آ جاؤ۔ لال چند! تم نیچے آفس میں ہی رہنا۔ میرا کوئی فون آئے تو کہہ دینا میں کام کر رہا ہوں۔ ٹھاکرے جی کا فون آئے تو مجھے اوپر دے دینا۔ آؤ دھرم چند۔"

بالاجی مجھے اوپر والے کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ بڑا سجا ہوا تھا۔ قیمتی چیزیں تھیں صوفوں پر زعفرانی رنگ کی گدیاں تھیں۔ دیوار پر گاندھی اور نہرو کی فریم کی ہوئی تصویروں کے درمیان بال ٹھاکرے کی تصویر لگی تھی۔ کونے میں شیوا جی مرہٹہ کا گھوڑے والا بت یہاں بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر بازو پھیلا کر بیٹھ گیا۔ کھدر پوش نوکر گاڑی میں سے بالا جی کا سگاروں والا ڈبہ لے کر آ گیا۔ اس نے سگار سلگایا اور بولا۔

"شاید لال چند نے تمہیں یہ بری خبر بتا دی ہو گی کہ ہمارے تین اور آدمی پاکستان میں پکڑے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہاں جی! مجھے تو بڑی حیرانی ہوئی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تھوڑے دنوں

کے اندر اندر ہمارے چھ آدمی پاکستانی پولیس کے قبضے میں آ گئے ہیں۔"

بالا جی کی تلوار مارکہ مونچھیں بھی تھیں۔ سر کے بال خضاب سے سیاہ کیے گئے تھے اور گھنے تھے۔ کہنے لگا۔

"یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ٹھاکرے جی سخت غصے میں تھے۔ کہنے لگے ایسا کیوں ہوا ہے۔ میں نے کہا سر۔ میں نے دھرم چند کو پنجاب سے بلوایا ہے۔ اس سے پوچھ کر بتاؤں گا کہ پاکستان میں ہمارے آدمیوں کے پیچھے کہاں کہاں خفیہ آدمی لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"بالا جی! جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے پاکستانی پولیس ہماری اگرواد کی کاروائیوں کے بعد پہلے سے زیادہ خبردار ہو گئی ہوئی ہے۔ خود میں بھی اسی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے کئی جگہ بموں کے دھماکے کیے تھے مگر صاف بچ کر نکل جاتا تھا۔ اس روز ہم میں سے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ پولیس پہلے سے اردگرد کے علاقے میں موجود تھی۔ اب پاکستان میں سیکورٹی بڑی سخت کر دی گئی ہے اور سنیما ہاؤسز' ریلوے سٹیشنوں' مسجدوں' بس کے اڈوں اور سکولوں کے باہر سفید کپڑوں میں مسلح پولیس چوبیس گھنٹے موجود ہوتی ہے۔"

بالا جی نے کہا۔

"لیکن ہمارے دوسرے آدمی تو اپنے خفیہ ٹھکانوں پر پکڑے گئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی نے مخبری کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مخبر کون ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا اپنا کوئی آدمی پولیس نے خرید لیا ہو۔"

بالا جی بڑا ذہین آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن میں اس لیے مطمئن تھا کہ اسے مجھ پر اس قسم کا شک کبھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں اس کا سینئر اور تجربہ کار دہشت گرد ساتھی تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج جی! میرے خیال میں اپنا کوئی آدمی ایسی غداری نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟"

بالا جی نے میری طرف پوری آنکھیں کھول کر تکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم ان لوگوں کو ٹریننگ دے کر بھیجتے ہیں۔ ان کی دیش بھگتی کو بھی پوری طرح چیک کر لیتے ہیں۔ ہم انہیں ہر واردات کے عوض چار چار بلکہ چھ چھ ہزار روپے تک یہاں بھارت میں ان کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے ہیں لیکن یہ لوگ لالچ میں آسکتے ہیں۔ زیادہ روپے لے کر غداری بھی کر سکتے ہیں۔ اپن تو کھلی کھلی بات کریں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"سر! میرا دل نہیں مانتا۔ آج تک ہمارے بھیجے ہوئے کسی آدمی نے غداری نہیں کی۔"

"تو پھر ایک ہی ہفتے کے اندر اندر ہمارے چھ آدمی کیسے پکڑ لیے گئے؟"

میں نے جواب میں کہا۔

"بالا جی! پاکستانی پولیس نے اپنے خفیہ آدمیوں کو جگہ جگہ چھوڑ رکھا ہے۔ کچھ ہمارے آدمیوں نے بھی احتیاط نہیں کی۔ ست پرکاش، گووندا اور موتی رام کو لاہور کی قریبی بستی میں کوارٹر کرائے پر لے کر نہیں رہنا چاہئے تھا۔ انہیں میرے حساب سے وہاں سے آگے کسی گاؤں میں خفیہ ٹھکانہ بنانا چاہیے تھا۔"

بالا جی نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تو ان کے ساتھ ہی تھے۔ تم نے انہیں شاہدرے میں کوارٹر لینے سے منع کیوں نہیں کیا؟"

"سر- یہ سب کچھ انہوں نے میری گرفتاری کے بعد کیا ہے۔ پہلے تو ہم شہر سے دور گاؤں میں ہی مزدوروں کے بھیس میں رہ رہے تھے۔"

"ہوں!"

بالا جی نے سگار کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"بہرحال اب پروگرام یہ بنا ہے کہ ٹریننگ سینٹر میں اس وقت جن تین
ہندوؤں اور ایک عورت کو ٹریننگ دی جا رہی ہے تم ان کو ساتھ لے کر پاکستان میں
داخل ہو گے۔ بال ٹھاکرے جی نے دو کام تمہارے سپرد کیے ہیں۔ ایک کام تو یہ ہے
کہ تم اپنی نگرانی میں لاہور شہر میں بموں کے دھماکے کراؤ گے۔ تمہاری دوسری
ڈیوٹی یہ لگائی گئی ہے کہ ہمارے جو چھ آدمی پاکستانی پولیس نے پکڑ رکھے ہیں تم ان کا
سراغ لگا کر انہیں وہاں سے فرار ہونے اور بارڈر کراس کرانے میں مدد دو گے۔ یہ
کام تم ہی کر سکتے ہو۔ بال ٹھاکرے جی کو بھی اور مجھے بھی تم پر پورا بھروسہ ہے۔"
میں نے کہا۔
"میں شیو سینا کا سپاہی ہوں۔ اپنی ڈیوٹی پوری طرح نبھاؤں گا چاہے میری
جان ہی چلی جائے۔"
بالا جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"نہیں نہیں۔ دھرم چند! تمہاری جان نہیں جانی چاہیے۔ تمہیں جیوت رہ
کر یہ سارے کام کرنے ہیں۔ تمہارے ایسا آدمی ہماری سینا کو دوبارہ ملنا مشکل
ہے۔"
اسی دوران نوکر چائے اور مٹھائیوں کی تھالی رکھ کر چلا گیا تھا۔ میں نے
ایک گلاس میں چائے ڈال کر بالا جی کو دی۔ دوسری پیالی میں اپنے لیے چائے ڈالی
اور برفی کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چائے پینے لگا۔ بالا جی نے کہا۔
"دھرم چند تم تو ہمیشہ چائے کے ساتھ لڈو کھایا کرتے تھے۔ برفی تو تمہیں
چائے کے ساتھ کبھی پسند نہیں تھی۔ یہ کیا بات ہے؟"
میں نے کہا۔
"سر! پاکستان میں رہ کر چائے کے ساتھ برفی کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔
اس دفعہ وہاں زیادہ دیر رہنا پڑا تھا۔ پاکستانی پولیس نے شروع شروع میں مجھ سے
بڑی ہمدردی کا سلوک کیا تھا۔ وہ محبت پیار سے مجھ سے میرے ساتھیوں کا اتا پتہ

معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس دوران ہی مجھے چائے کے ساتھ برفی بھی دی جا
تھی۔"

بالا جی نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔"

میں نے یونہی اپنی بناوٹی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ٹھاکرے جی کے درشن نہیں ہوں گے؟"

بالا جی نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ
اور کہا۔

"دھرم چند! ٹھاکرے جی بہت مصروف آدمی ہیں اور آج کل تو وہ اپنے
چھ آدمیوں کے پاکستان میں پکڑے جانے سے پریشان بھی ہیں اسی لیے انہوں نے
تمہیں تیار کرنے کے لیے میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ ایسی کوئی بات بھی نہیں۔ ابھی
ٹریننگ کیمپ میں چل کر ان آدمیوں کی کارکردگی دیکھو۔ کچھ دن تو تمہیں بمبئی میں
لگ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے اس دوران ٹھاکرے جی تمہیں بلا لیں۔"

میں نے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی سر!۔"

بالا جی کہنے لگے۔

"اس بار ہم تمہارے ساتھ ایک خوبصورت عورت کو بھی ٹرینڈ کر کے بھیج
رہے ہیں۔ اپنے آدمیوں کا سراغ لگانے اور انہیں پاکستانی پولیس کے قبضے سے
آزاد کرانے میں یہ عورت تمہارے کام آ سکتی ہے۔ بڑی خوبصورت کنیا ہے۔ شیلا
دھر اس کا نام ہے۔ اونچی سوسائٹی کی پڑھی لکھی عورت ہے۔ تمہاری طرح پنجابی
ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانیں فر فر بول لیتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"سر! یہ عورت اس خطرناک مشن پر جانے کے لیے تیار کیسے ہو گئی ہے؟"

بالا جی نے کہا۔

"بھائی پہلی بات تو یہ ہے کہ شیلا دھر بڑی دیش بھگتنی ہے۔ بھارت ماتا کے لیے ہر قسم کا بلیدان دے سکتی ہے۔ دوسرے ہماری شیو سینا کی بڑی جوشیلی کرم چاری ہے۔ مسلمانوں اور پاکستان سے نفرت کرتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس مشن پر جانے کے لیے ہم اسے کافی روپے دے رہے ہیں۔ شراب سگریٹ بھی بے دھڑک پی لیتی ہے اور وقت پڑے پر سب کچھ کر لیتی ہے۔ تم اس سے مل کر ضرور خوش ہو گے۔"

میں نے دل میں کہا کہ یہ عورت تو پاکستان سے واپس نہیں آئے گی۔ اوپر سے کہا۔

"میں ضرور ملوں گا بالا جی۔"

"دوپہر کو کھانا کھا کر ٹریننگ سینٹر کی طرف چل پڑیں گے۔ تم اب نیچے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

میں بالا جی کو پرنام کر کے نیچے آ گیا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ نیچے میرا یعنی دھرم چند کا کمرہ کہاں پر ہے۔ میں نیچے شیو سینا کے آفس میں آ کر لال چند آفس سیکرٹری کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"سارا معاملہ طے ہو گیا کیا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل طے ہو گیا ہے۔"

نہ اس نے پوچھا کہ اگلا منصوبہ کیا بنایا گیا ہے اور نہ میں نے اسے کچھ بتایا۔ یہ مجھے علم ہو چکا تھا کہ یہاں ہر منصوبے کو خفیہ رکھا جاتا ہے اور اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی جاتی۔ تیسرے پہر شیو سینا کے مرہٹہ لیڈر بالا جی نے مجھے ساتھ لیا اور ہم اس مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں بھارتی دہشت گردوں کو ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یہ جگہ بمبئی کے جنوب میں ٹیلوں کے درمیان میں واقع تھی۔

میں نے راستے میں بالا جی سے یہ پوچھنے کی بالکل غلطی نہ کی کہ ٹریننگ سینٹر کس جگہ پر ہے یا کتنی دور ہے کیونکہ اصلی دھرم چند اس ٹریننگ سینٹر میں آتا جاتا رہا تھا اور خود دھرم چند نے بھی اسی ٹریننگ سینٹر میں دہشت گردی کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ یہ ٹیلوں کے درمیان درختوں کو صاف کر کے ایک بہت بڑا احاطہ بنایا گیا تھا جس کے گرداگرد پتھروں کی اونچی دیوار تھی۔ ایک طرف لمبی بارک تھی جس کے ساتھ دو تین کمرے بھی تھے۔ یہاں دو پرانے دہشت گرد مرہٹے انسٹرکٹر تھے اور نئے رنگروٹوں کو دہشت گردی کے لیے ٹرینڈ کرتے تھے۔ دونوں مرہٹے باڈی بلڈر لگتے تھے۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر ملے۔ ظاہر ہے وہ اصلی دھرم چند کو جانتے تھے اور مجھے بھی دھرم چند سمجھ کر ہی مل رہے تھے۔ مجھے ان کے نام نہیں معلوم تھے۔ میں نے شروع میں بڑی احتیاط کے ساتھ ان سے رسمی گفتگو کی اور اپنے خاص طریقے سے ان کے نام معلوم کر لیے۔ جن تین آدمیوں کو دہشت گردی کی ٹریننگ دی جا رہی تھی وہ تینوں پنجابی تھے اور امرتسر کے رہنے والے ہندو تھے جو بستہ الف کے بدمعاش رہ چکے تھے۔ تینوں جوان تھے اگرچہ جسم دبلے تھے۔ میرا ان سے بھی تعارف کرایا گیا۔ ان کے نام بتانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔ آگے چل کر جب ہم لوگ مسلمان بن کر پاکستان میں داخل ہونے لگیں گے تو ان ہندو دہشت گردوں کے نام بتا دوں گا۔

میری آنکھیں خوبصورت فیشن ایبل اور اونچی سوسائٹی میں گھومنے والی زیر تربیت شیلا دھر کو ڈھونڈھ رہی تھیں مگر وہ وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ بالا جی مجھے لے کر بارک کے ساتھ بنے ہوئے ڈھلانی چھت والے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں بید کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا جس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ بالا جی نے مرہٹہ انسٹرکٹر سے کہا۔

"شیلا کو بلاؤ۔"

وہ پردہ اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ایک مناسب قد کی

بڑی آنکھوں والی گوری چٹی حسین دوشیزہ بھی اس کے ساتھ تھی جس نے
ھی پہن رکھی تھی۔ کٹے ہوئے سیاہ بال گردن پر بالکل سیدھے گرے ہوئے
۔ اس کی آنکھیں خواب آلود تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ سو رہی تھی۔ بالا جی نے
سٹرکٹر کو اشارے سے باہر بھیج دیا اور شیلا دھر سے کہا۔

"شیلا جی! اس سے ملو۔ یہ ہے ہمارا سب سے سینئر اور دلیر ممبر دھرم چند۔
ں اپنے مشن پر اسی کے ساتھ پاکستان جانا ہوگا۔"

شیلا نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا۔ میں بھی ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ شیلا
ے ساتھ بید کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے لباس میں سے کسی پرفیوم کی بڑی
ں خوشبو آ رہی تھی۔

شیلا میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی اور بیٹھنے کے بعد اس نے فوراً مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور میرے ہاتھ کو ذرا سا دبایا بھی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ویسی ہی ہے جیسی بالا جی نے بتایا تھا۔ اسے ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔ ان لوگوں کو دوسرے ملک میں جاسوسی کرنے اور ایک خاص مشن پر بھیجنے کے لیے ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی۔ شیلا نے اپنے ماتھے پر ہندو عورتوں کی طرح تلک یا بندی نہیں لگائی ہوئی تھی۔ جو تین ہندو جرائم پیشہ جوان وہاں ٹریننگ حاصل کر رہے تھے انہوں نے بھی ماتھوں پر ہندوؤں والا تلک وغیرہ نہیں لگایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں چونکہ انہیں مسلمانوں والے طور طریقے سکھائے جاتے تھے اس لیے انہیں ماتھوں پر تلک لگانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ بالا جی نے ہمیں ہمارے مشن کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے اس مشن کا نام ٹارگٹ لاہور ہو گا۔ تم پانچ لوگ گنگا نگر کے بارڈر سے سرحد پار کر کے پاکستان میں سمگل کیے جاؤ گے۔ تم سب کے مسلمانوں والے نام رکھے جائیں گے۔ ایک دوسرے کے یہ نام تمہیں زبانی یاد کرائے جائیں گے۔ پاکستان میں داخل ہونے کے بعد تم ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جاؤ گے اور اپنے اپنے طریقے سے ریل اور بس کے ذریعے سفر کر کے اسلام آباد میں بھارت کے سفارت خانے میں پہنچو گے۔ وہاں تمہاری تصویریں پہلے سے پہنچ چکی ہوں گی۔ وہاں پر پرکاش کھنہ کے نام کا ایک بھارتی افسر تمہیں ملے گا۔ پاکستان میں وہ تمہارا رابطہ افسر ہو گا۔ تمہیں مشکل پڑنے پر اسی سے رابطہ قائم کرنا ہو گا۔ وہاں

سے تم اپنے مشن پر لاہور آ جاؤ گے۔ لاہور میں تمہارے خفیہ ٹھکانے کا بندوبست
بھی بھارتی سفارت خانے کا افسر پرکاش کھنہ ہی کرے گا۔"

بالا جی نے اب مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"لاہور آ کر تم ان تینوں اگرواديوں [دہشت گردوں) کی راہ نمائی کرو
گے۔ اسلحہ وغیرہ تمہارے خفیہ ٹھکانے پر پرکاش کھنہ ہی پہنچائے گا۔ ان تینوں کو ان
کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچانے کے بعد تم دھرم چند منصوبہ بندی کرو گے کہ شہر میں
کس روز کہاں پر بم کا دھماکہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تم اور شیلا ان لوگوں سے
الگ ہو کر پرکاش کھنہ کی راہ نمائی میں امریکہ سے آئے پاکستانی میاں بیوی کی
حیثیت سے پہلے کسی اچھے سے ہوٹل میں قیام کرو گے پھر کوئی عالی شان فلیٹ لے کر
رہنے لگو گے جہاں تم اونچی سوسائٹی کے لوگوں کی دعوتیں کر کے ان سے دوستیاں
بڑھاؤ گے اور تمہاری خاص توجہ پولیس کے محکمے کے ایسے افسروں کی طرف ہو گی جو
عیش و عشرت کے دل دادہ ہوں۔ یوں ان لوگوں کو اپنے شیشے میں اتار کر شیلا ان
سے یہ راز معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہمارے گرفتار شدہ بھارتی دہشت
گردوں کو پولیس نے کس جگہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ تم لوگ خود کرو
گے کہ تمہیں اپنے انڈین دہشت گردوں کو وہاں سے کس طرح فرار کرانا ہو گا۔
میرا خیال ہے دھرم چند اور شیلا تم دونوں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہو گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور شیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گئی ہوں شریمان جی۔"

بالا جی نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار شریمان جی نہیں مجھے حضور کہو۔ تم کو اس قسم کے سارے لفظ بھلا
دینے ہوں گے۔ پھر سے فقرہ بولو۔"

شیلا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"میں سمجھ گئی ہوں حضور۔"

"ٹھیک ہے۔"

شام کو میں اور بالا جی بمبئی واپس آ گئے۔ رات کو کھانا کھانے سے پہلے جی نے بیئر کی بوتلیں منگوا لیں۔ ایک گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے کہا۔

"سر! آج پینے کو دل نہیں مانتا۔ طبیعت خراب سی ہے۔"

بالا جی نے بیر میرے گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"دھرم چند تم تو بیئر بڑے شوق سے پیتے ہو۔ یاد ہے پچھلی دفعہ تم بیمار تھے مگر پھر بھی بیئر کی دو بوتلیں چڑھا گئے تھے اور پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے بال ٹھاکرے جی شام کو بیئر ضرور پیتے ہیں۔ یہ تو سارے بھارت کے لوگ جا۔ ہیں۔ بال ٹھاکرے جی خود بھی کئی بار اخبار والوں کو کہہ چکے ہیں کہ میں شام تھوڑی سی بیئر ضرور پیتا ہوں۔ چلو اٹھاؤ گلاس!"

جب میں موریشس میں تھا تو وہاں کبھی کبھی بیئر پی لیا کرتا تھا مگر اس بعد میں نے اس قسم کی علتوں سے توبہ کر لی تھی لیکن یہاں میری مجبوری تھی۔ میں نے بالا جی کے گلاس کے ساتھ گلاس ٹکرا کر اس کا ایک گھونٹ پیا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔ بالا جی آدھا گلاس غٹا غٹ پی گیا اور سگار سلگا کر اس کے دو تین کش لگا کر کہنے لگا۔

"کہو۔ شیلا کیسی لڑکی ہے۔ پسند آئی؟"

میں نے کہا۔

"اس مشن کے لیے بڑی سوٹ کرتی ہے مگر مجھے بڑبولی لگتی ہے۔"

بالا جی نے جواب میں کہا۔

"یہ تمہیں صرف ایسی لگتی ہے اصل میں وہ ایسی نہیں ہے۔ پورا دریا پی کر ہونٹ خشک رکھنے والی عورت ہے۔ تمہیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ یہ پاکستان میں تمہاری بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہے گی۔ تم بھی اسے اپنی پتنی ہی سمجھنا۔ جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ اگر جھجکتے رہے تو تم پاکستان میں میاں بیوی کی صحیح

اداکاری نہیں کر سکو گے۔ تم میرے پوائنٹ کو سمجھ گئے ہو ناں دھرم چند۔"

"جی ہاں جی ہاں سر! بالکل سمجھ گیا ہوں۔"

بالا جی نے خوش ہو کر کہا۔

"دھرم چند تمہارا بولنے کا انداز بالکل مسلمانوں والا ہو گیا ہے۔ پہلے تو تم ہندی کے بڑے الفاظ بولا کرتے تھے۔ اب بڑی اصلی اردو بولنے لگے ہو۔"

میں نے فوراً" جواب دیا۔

"سر! ایک تو یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم بہتر سے بہتر اردو بولیں اور دوسری بات یہ ہے اس دفعہ کافی دنوں تک پاکستان میں پولیس کا مہمان رہا ہوں۔ وہاں رہ کر اردو بولنے کی مزید عادت پڑ گئی ہے۔"

"یہ ہمارے مشن کے لیے بڑی اچھی بات ہے۔ اسلام آباد میں تمہیں اور شیلا کو بڑا محتاط ہو کر رہنا ہو گا۔ تمہاری کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ تم دونوں مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہو۔ ہر اتوار کو سمگلر ٹائپ کے نئے نئے امیر بنے ہوئے لوگوں کی اپنے فلیٹ پر دعوتیں کرنا اور جن لوگوں کا پولیس کے ساتھ میل جول ہو ان کو ضرور بلانا۔ ان سے اپنے دہشت گردوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کہ انہیں کس جیل میں رکھا گیا ہے اور پھر انہیں وہاں سے فرار کرانے کی کوشش کرنا۔ روپے پیسے کی فکر نہ کرنا۔ روپیہ پیسہ تمہیں بھارتی سفارت خانے سے پرکاش کھنہ کے ذریعے ملتا رہے گا۔"

بالا جی دوسرے روز خود تو ٹریننگ سنٹر نہ گیا لیکن مجھے اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ وہاں بھجوا دیا تاکہ میں دہشت گردوں کو دی جانے والی ٹریننگ کی نگرانی بھی کروں اور شیلا دھر کے ساتھ مزید دوستی اور بے تکلفی پیدا کروں۔ شیلا کے ساتھ بے تکلف ہونے میں کسی قسم کی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو وہ پہلے ہی بہت کھل کھیلی ہوئی عورت تھی دوسرے اسے معلوم تھا کہ ہم ایک بڑے اہم مشن پر اکٹھے اور میاں بیوی کی حیثیت سے جا رہے ہیں چنانچہ

دوسری ملاقات پر ہی وہ مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگی۔

"دھرم چند جی! تم وسکی شوق سے پیتے ہو یا وائین؟ میں تو وائین شوق سے پیتی ہوں۔"

میں نے کہہ دیا کہ میں صرف کبھی کبھی دعوتوں میں تھوڑی سی بیئر پی لیتا ہوں۔ یہ بھی اس لیے کہنا پڑا کہ مجھے معلوم تھا کہ آگے چل کر دعوتوں میں تھوڑی بہت بیئر ضرور پینی پڑا کرے گی۔

اس روز دن میں تھوڑی دیر کے لیے بارش بھی ہوئی۔ بارش کے دوران ہم بارک کے برآمدے میں بیٹھ کر گوا کی بلیک کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میری پتنی کا نام بملا ہے۔ بڑی سیدھی سادی دیہاتی عورت ہے۔ میں زیادہ تر باہر ہی رہتا ہوں کیونکہ میرے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔ شیلا کہنے لگی۔

"میں نے شادی نہیں کی۔ میں شادی کو پسند نہیں کرتی۔ میں فری سیکس کی قائل ہوں لیکن اپنی پسند کا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

"کیا تم کبھی پاکستان گئی ہو؟"

شیلا نے بڑی تجسّس آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پاکستان صرف ایک بار گئی تھی۔ وہ بھی صرف کراچی سے ہو کر واپس آگئی تھی۔ لاہور نہیں جا سکی۔ میرے پتا جی اور ماتا جی لاہور کے شرنارتھی تھے اور امرتسر آکر آباد ہو گئے تھے۔ وہ لوگ لاہور کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ ماتا جی تو اپنے لاہور والے مکان کو یاد کر کے رویا بھی کرتی تھیں۔ تم نے تو لاہور ضرور دیکھا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"میں کئی بار لاہور میں دھماکے کرنے جا چکا ہوں۔ اس بار تمہارے ساتھ لاہور کی تھوڑی بہت سیر ضرور کروں گا مگر ہمیں بڑا محتاط رہنا ہو گا کیونکہ لاہور میں

یہ پولیس الرٹ ہو چکی ہے۔"
بارش کوئی آدھے گھنٹے بعد رک گئی۔ علاقہ پہاڑی تھا۔ وہاں پانی کہیں بھی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ اس ٹریننگ سینٹر میں دس روز تک ٹریننگ کورس جاری رہا۔ اس کے بعد ہم بمبئی آ گئے۔ تینوں بھارتی دہشت گردوں کو شیو سینا کے ہیڈ آفس میں ٹھہرایا گیا اور میں اور شیلا بالا جی کی کوٹھی کے گیسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ یہاں ہمیں الگ الگ کمرہ دیا گیا۔ بالا جی نے کہا۔

"ابھی تم میاں بیوی نہیں ہو اس لیے یہاں بمبئی میں الگ الگ کمروں میں رہو گے۔ پاکستان جانے کے بعد تم میاں بیوی بن جاؤ گے وہاں بے شک ایک ہی کمرے میں رہنا۔"

اس دوران میرے اور شیلا کے درمیان مزید بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شیلا پڑھی لکھی خاتون تھی اور بڑی شگفتہ باتیں کرتی تھی اور اسے دنیا کی سیاست اور انگریزی لٹریچر سے بھی کافی واقفیت تھی۔ بمبئی کا میٹرو سینما بمبئی کی مشہور عمارت گیٹ وے آف انڈیا کے بالکل سامنے سڑک کے پار واقع ہے۔ ایک روز میں اور شیلا وہاں دوپہر کا شو دیکھنے چلے گئے۔ کوئی انگریزی فلم تھی۔ فلم کے دوران شیلا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے پیار کرتی رہی۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے نہ کھینچا۔ شیلا نے بیوی کی اداکاری کرنی شروع کر دی تھی۔ شاید وہ اس کی ریہرسل کر رہی تھی۔ ٹریننگ سینٹر سے واپس آنے کے بعد ہم تین دن بمبئی میں رہے۔ اس کے بعد ایک رات خاموشی سے ہماری پارٹی الگ الگ ہو کر بوری بندر کے سٹیشن سے ایک ٹرین میں سوار ہوئی اور ہمیں راجستھان کے شہر جودھ پور پہنچا دیا گیا۔ جودھ پور میں ایک رات قیام کرنے کے بعد ہم جیسلمیر آ گئے۔ یہاں سے ہمارا صحرا میں اونٹوں پر سفر شروع ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کہاں کہاں سے گزرے۔ بس چاروں طرف ریتلا میدان یا ریت کے ٹیلے ہی تھے۔ ہمارا گائیڈ اونٹنی پر بیٹھا آگے آگے چل رہا تھا۔ سارا دن ہم صحرا میں سفر کرتے رہے۔ دوسری

رات بھی ہم ایک بجے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور سفر شروع ہو گیا۔

ایک مقام پر ہمیں سمگلروں کی ایک پارٹی کے حوالے کر دیا گیا جس نے اپ
حفاظت میں ہمیں بارڈر کراس کرا کے پاکستان میں داخل کر دیا۔ ابھی تک ارد گر
صحرا ہی تھا۔ ہمارا گائیڈ جو بھارت کے بارڈر تک ہمارے ساتھ آیا تھا واپس جا چ
تھا۔ پاکستان میں داخل ہونے کے بعد ایک ہندو پجاری ہمارا گائیڈ بن گیا۔ اس ۔
ہمیں رات کو ایک مندر میں ٹھہرایا۔ یہاں میں نے بالا جی کی ہدایت کے مطابق
تینوں دہشت گردوں کے مسلمانوں والے نام رکھے اپنا نام زمان شاہ رکھا اور شیلا
نام جمیلہ شاہ رکھا اور تینوں کو پاکستانی کرنسی میں کچھ رقم دے کر کہا کہ وہ صبح ہو۔
سے پہلے پہلے الگ الگ ہو کر وہاں سے نکل جائیں اور اپنے اپنے طور پر اسلام آ
کے بھارتی سفارت خانے پہنچ جائیں۔

"میں تم لوگوں کو بھارتی سفارت خانے میں پرکاش کھنہ کے پاس ملوا
گا۔"

تینوں بھارتی دہشت گرد دن نکلنے سے پہلے ہی نکل گئے۔ بھارتی سفار
خانے کے سفارت کار پرکاش کھنہ نے ان دہشت گردوں کے لیے لاہور کے ا
گرد کسی خفیہ ٹھکانے کا بندوبست کرنا تھا اور انہیں لاہور اور لاہور کے قریبی شہرو
میں بموں کے دھماکوں اور دوسری تخریبی کاروائیوں کے لیے اسلحہ وغیرہ سپلائی ک
تھا۔ میرا سب سے پہلا کام اور فرض یہ تھا کہ میں ان لوگوں کو لاہور یا لاہور ۔
آس پاس کسی بھی جگہ ایک بھی دھماکہ نہ کرنے دوں اور کچھ وقت گزارنے کے ب
انہیں ایسے طریقے سے پاکستانی پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا دوں کہ پیچھے بالا جی ا
بال ٹھاکرے کو کم از کم مجھ پر بالکل شک نہ پڑے۔ یہ بڑی دور اندیشی اور ہوشیار
کا کام تھا لیکن مجھے یہ کام ہر حالت میں کرنا تھا۔ میں ان بھارتی دہشت گردوں
ہرگز اتنی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے کسی پاکستانی کو برسٹ
کر یا بم کا دھماکہ کر کے ہلاک کر سکیں۔ اس سلسلے میں مجھے لاہور پہنچنے کے بعد س

سے پہلے ملک صاحب اور بٹ صاحب سے رابطہ پیدا کرنا تھا اسی روز دوپہر ڈھلنے کے بعد میں اور شیلا بھی اپنے مندر پجاری گائیڈ کے ساتھ خدا جانے کہاں کہاں ویران علاقوں سے ہوتے ہوئے آخر کار سکھر پہنچ گئے۔ سکھر ٹرین پکڑی اور لاہور آ گئے۔ میں لاہور میں بٹ صاحب اور ملک صاحب سے رابطہ پیدا کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اسلام آباد بھارتی سفارت کار سے ملنے کی بھی جلدی تھی۔ بمبئی میں میرے پاس کوئی ایسی ریڈیو ٹرانسمیٹر کی سہولت نہیں تھی کہ میں بٹ صاحب اور ملک صاحب کو بتا سکتا کہ میں ایک ہندو لڑکی شیلا کے ساتھ پاکستان آ رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اسلام آباد پہنچ کر پہلے بھارتی افسر پرکاش کھنہ سے مل لوں اس کے بعد بٹ صاحب اور ملک صاحب سے ٹیلیفون پر بات ہو جائے گی۔

بھارت کے سفارت کار پرکاش کھنہ کو ہم پانچوں کی تصویریں بھی مل گئی تھیں اور اسے ہمارے مشن کے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ میں اور شیلا مسلمان میاں بیوی کے روپ میں یہ بہانہ بنا کر بھارتی سفارت خانے گئے کہ ہمارے کچھ رشتے دار جبل پور میں رہتے ہیں ہمیں جبل پور کا ویزا لگوانا ہے۔ وہاں بڑی جلدی پرکاش کھنہ نے ہمیں پہچان لیا اور میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سب کی نظریں بچا کر تہہ کیا ہوا ایک کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ بھارتی سفارت کار پرکاش کھنہ کی تصویر بھی ہمیں بمبئی میں ہی دکھا دی گئی تھی۔ میں نے اور شیلا نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں اب وہاں سے چلا جاؤں۔

ہم اسلام آباد کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں میاں بیوی کی حیثیت سے مسٹر زمان شاہ اور مسز جمیلہ زمان کے نام سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمیں امریکہ کے شہر واشنگٹن کا ایک ایڈریس دے دیا گیا تھا۔ ہم نے ہوٹل میں اپنا وہی ایڈریس لکھوایا اور ہوٹل کے مینجر کو بتایا کہ ہم واشنگٹن میں رہتے ہیں اور ایک عرصے بعد اپنے وطن پاکستان میں آئے ہیں اور اب ارادہ اسی جگہ کاروبار کر کے رہنے کا ہے۔ لاہور میں ہمارے دور کے ایک رشتے دار ہیں مگر ہم اسلام آباد میں

رہ کر اپنا کوئی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ باتیں وہاں کرنی بڑی ضروری تھیں۔ ابھی تک ہمارے پاس امریکی پاسپورٹ وغیرہ نہیں تھے۔ ہوٹل والوں کو پاسپورٹ دکھانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بھارتی سفارت خانے سے ہم واپس اپنے ہوٹل آ گئے۔ کمرے میں آتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا اور پرکاش کھنہ کا دیا ہوا رقعہ کھول کر پڑھا۔ شیلا نے بھی اسے پڑھا۔ پرکاش کھنہ نے رات کے دس بجے مجھے راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبرپانچ پر بلایا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ پلیٹ فارم نمبرپانچ کے آخری سرے پر لوہے کی ایک ٹینکی پڑی ہوئی ہے۔ میں اس ٹینکی کے پیچھے بینچ پر جا کر بیٹھ جاؤں۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ رات کے پونے دس بجے تو میں پنڈی کے سٹیشن پر آکر پلیٹ فارم نمبرپانچ پر ٹینکی کے پیچھے بنچ پر بیٹھ کر پرکاش کھنہ کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ایک طرف سے نمودار ہوا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیا۔ کہنے لگا۔

"اس میں تمہارا اور شیلا دھر کا جعلی امریکی پاسپورٹ ہے مگر یہ بالکل اصلی ہی سمجھو۔ تم دونوں امریکی شہریت رکھتے ہو اور امریکہ میں بیس برس سے مقیم ہو۔ پاسپورٹ پر تمہارا نام زمان شاہ لکھا ہے اور شیلا کے پاسپورٹ پر جمیلہ شاہ کا نام ہے۔ یہاں تم زمان شاہ اور شیلا جمیلہ شاہ کے نام سے رہو گے۔ لفافے میں بیس ہزار کے کرنسی نوٹ بھی ہیں۔ تم اسلام آباد شہر سے باہر کسی غیر معروف جگہ پر فلیٹ کرائے پر لو گے اور وہاں ایک کمرے میں ایکسپورٹ امپورٹ کا بورڈ لگا دو گے۔ تم ظاہر کرو گے کہ تم نے یہاں پاکستان کے تولیے اور دیگر کاٹن کی اشیا امریکہ ایکسپورٹ کرنے کا کاروبار شروع کیا ہے۔ باقی تمہیں کیا کرنا ہے اس بارے میں تمہیں بالاجی نے سمجھا دیا ہو گا۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پڑے تو میرا ایک خفیہ ٹیلی فون نمبر ہے وہ میں تمہیں لکھے دیتا ہوں۔"

پرکاش کھنہ نے مجھے اپنا خفیہ ٹیلی فون نمبر لکھ کر دے دیا۔ جسے میں نے

سنبھال کر رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد میں بھی واپس اسلام آباد آ گیا۔ ہوٹل میں آ کر میں نے شیلا کو دونوں پاسپورٹ اور بیس ہزار روپے کی رقم دکھائی اور جو کچھ پرکاش کھنہ نے مجھے سمجھایا تھا اسے بھی سمجھایا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے شہر سے دور تین کمروں کی ایک چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے لی۔ باہر ایکسپورٹ امپورٹ کا بورڈ بھی لگا دیا اور مختصر سا دفتر بھی بنا لیا۔ مجھے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتا دیے گئے تھے جو ناجائز طریقوں سے دولت کما کر امیر بن گئے تھے اور پارٹیوں وغیرہ میں جانا بہت پسند کرتے تھے۔ میرے لیے یہاں اب اور طرح کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نقلی مسلمان نہیں تھا بلکہ پیدائشی مسلمان تھا اور پاکستانی تھا۔ اگرچہ لاہور کے سوا پاکستان کے کسی بھی دوسرے شہر میں میرا جاننے والا کوئی نہیں تھا لیکن لاہور سے اگر اس محلے کا کوئی آدمی اسلام آباد آ کر مجھے دیکھ لے تو جس محلے میں میری نوادرات کی دکان تھی تو وہ مجھے پہچان سکتا تھا۔ خواہ میری ناک کی ہڈی اب ابھری ہوئی نہیں تھی پھر بھی میری شکل وہی تھی جو دھرم چند بننے سے پہلے تھی۔ یہ تو ایک اتفاق تھا کہ میری شکل بھارتی دہشت گرد دھرم چند کی شکل سے حیران کن مماثلت رکھتی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں لاہور میں اپنی نوادرات کی دکان پر ایک آدمی کو چھوڑ گیا تھا اگر اس نے مجھے یہاں شاندار کوٹھی میں رہتے دیکھ لیا تو مجھے فوراً پہچان لے گا اور عین ممکن تھا کہ میرا راز فاش ہو جائے۔ صرف اس بات کی تسلی تھی کہ بھارتی سفارت خانے کے پاس جاسوسی اور خفیہ پولیس کا ایسا انتظام نہیں تھا کہ میرے پیچھے کوئی ہندو جاسوس لگ جائے اور پرکاش کھنہ کو خبر کر دے کہ یہ دھرم چند نقلی آدمی ہے اور اصل میں یہ پاکستانی ہی ہے اور اس کا نام حیدر علی ہے۔ اس کے باوجود مجھے لاہور کے کسی جاننے والے سے اسلام آباد اچانک ملاقات ہو جانے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ اس کا حل میں نے یہی سوچا کہ بٹ صاحب اور ملک صاحب سے رابطہ تو مجھے

پیدا کرنا ہی ہے میں انہیں کہوں گا کہ وہ میری نوادرات والی دکان کے سامان کو اونے پونے بیچ کر اسے ختم کردے اور وہاں جو آدمی میں بٹھا آیا ہوں اسے فارغ کر دیں۔ اس سلسلے میں میں بٹ صاحب کو ایک تحریر بھی دے سکتا تھا کہ میں انہیں اختیار دیتا ہوں کہ یہ میری دکان کے سامان کو فروخت کر سکتے ہیں۔

مجھے اسلام آباد میں رہتے ہوئے دس پندرہ دن گزر گئے تو میں نے بھارتی سفارت خانے پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں ان کے منصوبے پر کامیابی سے عمل کر رہا ہوں' میں نے نودو لتیے قسم کے چند ایک ان پڑھ اور غیر معروف مگر کافی دولت مند لوگوں کی اپنے گھر پر دعوتیں شروع کر دیں۔ ایک دن میں نے پرکاش کھنہ کو خفیہ نمبر پر فون کیا اور اسے ایک خاص جگہ پر بلایا۔ وہ آگیا تو میں نے جھوٹ بولتے ہوئے اسے کہا۔

"مجھے اپنے سندھ میں پکڑے جانے والے دہشت گردوں کا تھوڑا سا سراغ ملا ہے۔ ست پرکاش 'گووندا اور موتی رام کے بارے میں ابھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

پرکاش کھنہ نے کہا۔

"اپنے سندھ میں پکڑے جانے والے اگروادی پاکستانی پولیس نے کہاں قید میں رکھے ہوئے ہیں؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"کل رات کی پارٹی میں ایک سمگلر کہہ رہا تھا کہ بھارت کے دہشت گرد پنجاب میں ہی کسی جگہ بند ہیں۔ اب میں اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ مجھے دو ایک دن لگ جائیں گے۔ مجھے پوری آشا ہے کہ میں اپنے آدمیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"اوکے۔ میں چار دن بعد تم سے فون پر رابطہ کروں گا۔ کوڈ الفاظ میں ہی بات کروں گا۔ تمہیں ہمارا کوڈ تو معلوم ہی ہے۔"

"بالکل معلوم ہے۔"

اس کے بعد پرکاش کھنہ چلا گیا۔

میں نے شیلا کو بھی ساری بات بتا دی کہ میں اپنے آدمیوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ شیلا عرف جمیلہ نے کہا۔

"میری فکر نہ کرنا۔ میں پیچھے سارا کاروبار سنبھال سکتی ہوں۔"

اور اس نے مجھے آنکھ ماری۔ اس نیم طوائف ہندو عورت میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ پیچھے اکیلی بڑے آرام سے رہ سکتی تھی اور پھر مجھے اس کی عزت وغیرہ کی فکر بھی نہیں تھی۔ اپنی عزت ناموس وغیرہ تو وہ بھارت میں ہی لٹوا چکی تھی۔ میں نے ٹیلی فون آفس سے خفیہ نمبر پر بٹ صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ دوسری طرف سے ان کے ملازم نے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا۔

"بٹ صاحب سے کہو کہ حیدر علی بات کرنا چاہتا ہے۔"

دس پندرہ سیکنڈ کے بعد ہی بٹ صاحب کی پرجوش آواز سنائی دی۔

"حیدر علی! کیا تم بول رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں سر! میں ہی بول رہا ہوں۔ میں تین بجے کی ریل کار سے لاہور آ رہا ہوں۔ رات دس بجے آپ کے آفس میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں آفس میں موجود ہوں گا۔ اور کوئی۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ تین بجے والی ریل کار کا انتخاب میں نے اس لیے کیا تھا کہ میں جب لاہور پہنچوں تو رات کا اندھیرا ہو گیا ہو۔ میں نے ریل کار کی سیٹ ریزرو کروالی ہوئی تھی۔ پنڈی سے اس میں سوار ہوا اور رات کو نو ساڑھے نو بجے لاہور پہنچ گیا۔ سٹیشن سے ٹیکسی لے کر اور بٹ صاحب کے دفتر سے ایک چوک پہلے ٹیکسی چھوڑ دی اور اندھیرے میں پرانے درختوں سے گھرے ہوئے کچے راستے سے گزرتا بٹ صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے

تھے۔ ملک صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ دونوں مجھ سے گلے لگ کر ملے۔ :
صاحب نے کہا۔

"تمہاری دونوں اطلاعات بڑی بروقت اور صحیح تھیں۔ ہم نے شاہد
والے کواٹروں میں چھاپہ مار کر ست پرکاش وغیرہ تینوں بھارتی دہشت گردوں کو
لیا اور تمہاری دوسری اطلاع پر سندھ اور پنجاب کے درمیانی جنگل کو گھیرے :
لے کر وہاں چھپے ہوئے تینوں بھارتی دہشت گردوں کو بھی حراست میں لے لیا۔
نے ان لوگوں کو گرفتار کروا کر کئی بے گناہ پاکستانیوں کو ان لوگوں کے دھماکوں :
ہلاک ہونے سے بچا لیا ہے۔"

میں نے ان سے اصلی دھرم چند کے بارے میں پوچھا تو ملک صاحب
بولے۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا ہے مگر ہم نے
اسے ایک ایسی خفیہ جگہ پر بند کیا ہوا ہے کہ جہاں سے وہ قیامت تک باہر نہیں نکل
سکتا۔"

اس کے بعد میں نے بٹ صاحب اور ملک صاحب کو اپنی ساری کہانی سنا
دی اور اب میں اور شیلا جس مشن کو لے کر پاکستان آئے تھے وہ بھی بیان کر دیا۔
بٹ صاحب نے پھر کہا۔

"تمہارے ساتھ جو تین بھارتی دہشت گرد آئے ہیں وہ اس وقت کہاں
ہیں؟"

میں نے کہا۔

"وہ اسلام آباد کے قریب ہی ایک ویران جگہ پر موجود ہیں۔ ان کی آپ
لوگ اس لیے بھی فکر نہ کریں کہ وہ میری اجازت سے ہی کسی جگہ بم کا دھماکہ یا
فائرنگ کریں گے۔ انہیں اسلحہ بھارتی سفارت خانے کا ایک آدمی پرکاش کھنہ سپلائی
کرے گا لیکن میں ان کے لاہور روانہ ہونے سے پہلے ان کا ٹارگٹ آپ کو بتا دوں

گا اور ان کی تصویریں بھی آپ کو بھجوا دوں گا تاکہ آپ انہیں پہچان سکیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ اتنی جلدی ان کو گرفتار کرلیں۔ اس طرح پیچھے شیوسینا کے صدر بالا جی اور بال ٹھاکرے کو مجھ پر شک ہو سکتا ہے کہ شاید میں پاکستانی پولیس کے ساتھ مل گیا ہوں۔ یہ بات تو ان کے گمان میں بھی نہیں آ سکتی کہ میں اصلی دھرم چند نہیں ہوں لیکن انہیں یہ ضرور شبہ پڑ سکتا ہے کہ میں پیسوں کے لالچ میں پاکستانی پولیس کے ساتھ مل گیا ہوں اور اپنے آدمیوں کو پکڑوا دیا ہے۔"

ملک صاحب کہنے لگے۔

"لیکن ان دہشت گردوں کے دھماکوں اور فائرنگ سے تو معصوم لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"اس کا انتظام بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ پہلی بار جہاں ان لوگوں نے لاہور میں واردات کرنی ہو گی میں آپ کو بتا دوں گا۔ آپ پہلے ہی کسی طریقے سے لوگوں کو وہاں نہ آنے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دھماکہ ضرور ہو مگر جانی نقصان نہ ہو تاکہ بھارتی سفارت خانے کو مجھ پر شک پڑنے کا اندیشہ نہ رہے۔ دوسری بار میں انہیں گرفتار کروا دوں گا۔"

اس کے علاوہ میں نے بٹ صاحب اور ملک صاحب کو یہ بھی بتایا کہ بھارت کے مشہور شہر بمبئ میں ایک جگہ ان دہشت گردوں کو پوری ٹریننگ دی جاتی ہے۔

"میں شیوسینا کے بمبئ شاخ کے صدر بالا جی سے بھی مل چکا ہوں۔ بال ٹھاکرے سے ابھی میری ملاقات نہیں ہوئی۔ وہاں رہ کر میری یہی کوشش بلکہ مشن ہو گا کہ میں ان کے تربیتی سنٹروں کو اڑا دوں اور جو لوگ ٹریننگ حاصل کر کے پاکستان میں تباہی پھیلانے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں ان کو بھارت میں ہی ختم کرتا رہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ شیوسینا کو اپنی پڑ جائے گی اور پاکستان میں، ان کے تخریب

کاری کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے کیونکہ وہ کسی اناڑی آدمی کو دہشت گردی کے لیے پاکستان میں نہیں بھیج سکتے۔ اس کے لیے زبردست ٹریننگ ضروری ہے اور ٹریننگ سنٹروں پر ہی دھماکے ہونے لگیں گے اور تربیت یافتہ بھارتی دہشت گرد بھارت میں ہی ہلاک ہونا شروع ہو جائیں گے تو اس شر سے پاکستان محفوظ ہو جائے گا۔"

بٹ صاحب کہنے لگے۔

"یہ پاکستان کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔"

میں نے انہیں کہا۔

"میں آپ کو ٹیلی فون پر خفیہ الفاظ میں اطلاع دوں گا کہ بھارتی دہشت گرد پہلا بم دھماکہ کس جگہ کرنے والے ہیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ بم کے دھماکے سے پہلے وہاں کوئی شہری اردگرد موجود نہ ہو۔"

ملک صاحب نے کہا۔

"اس کا ہم انتظام کر لیں گے۔ اگر یہ دھماکہ تمہاری منصوبہ بندی کے مطابق بہت ضروری ہے تو ہم اس کے لیے پہلے سے تیاری کر لیں گے۔"

میں نے جواب دیا۔

"میری منصوبہ بندی بڑی اہم ہے۔ میں دہشت گردی کی اصل جڑ کو کاٹ دینا چاہتا ہوں جہاں سے یہ دہشت گرد ٹریننگ لے کر آتے ہیں اس جگہ کو اڑا دینا چاہتا ہوں اور بھارتی دہشت گردوں کو پاکستان کی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی جہنم رسید کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ تمہیں بھی ہوشیار ہو کر رہنا ہو گا۔ ہماری خفیہ پولیس دوسرے ملکوں کے سفارت کاروں اور خاص طور پر بھارت کے سفارتی عملے کے آدمیوں کی نقل و حرکت کو اپنی نگاہ میں رکھتی ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرانی نہیں ہونی چاہیے کہ تمہارے اسلام آباد آ کر بھارتی سفارت کار پر کاش کھنہ سے پہلی

قات کے ساتھ ہی ہمیں خفیہ پولیس نے اطلاع کر دی تھی کہ ایک اجنبی جوڑا
لام آباد میں آیا ہے جس کے مرد سے پرکاش کھنہ کی خفیہ ملاقات ہوئی ہے۔"
میں اپنی خفیہ پولیس کی کارکردگی پر بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا۔
"بس اگر مناسب سمجھیں تو اپنی خفیہ پولیس کے اسلام آباد والے آدمیوں
و میرے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے اچانک کسی جگہ
راست میں لے لیں۔ اس سے مجھے تو کوئی نقصان نہیں ہو گا لیکن میرا وقت ضرور
ائع ہو گا۔"
بٹ صاحب نے میری اس بات کو بڑی توجہ سے سنا اور کچھ سوچ کر کہا۔
"اس بارے میں ہم جہاں تک مناسب ہوا ضرور کریں گے۔"
اس کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ میری لاہور والی دکان کے سامان کو وہ
ونے پونے بکوا دیں۔ میں نے انہیں اختیار نامہ بھی لکھ کر دے دیا اور یہ ظاہر کیا
کہ میں موریشس میں ہی آباد ہو گیا ہوں اور اپنی دکان کا سامان فروخت کرنے کا
امل دستاویز ہذا کو اختیار دیتا ہوں۔ اگرچہ اس میں بڑی پیچیدگیاں ہوا کرتی ہیں مگر
ملکی مفاد کا معاملہ تھا۔ ملک صاحب نے کہا۔
"تم بے فکر ہو جاؤ۔ یہ کام ہو جائے گا اور تمہاری دکان کے ملازم کو بھی
رخصت کر دیا جائے گا۔"
وہ رات میں نے وہیں بسر کی۔ منہ اندھیرے پہلی ریل کار میں سوار ہو کر
اپس اسلام آباد آ گیا۔ شیلا عرف جمیلہ مجھے دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔
"تم نے تو کہا تھا کہ مجھے دو تین دن لاہور لگ جائیں گے مگر تم ایک ہی
رات میں واپس آ گئے۔"
میں نے کہا۔
"کام جلدی ہو گیا تھا۔ میں نے ایک جگہ چن لی ہے جہاں اپنے آدمی بم
دھماکہ کریں گے۔"

اسی روز شام کو میں نے پرکاش کھنہ سے رابطہ پیدا کر کے اسے ملاقات
وقت اور جگہ بتائی۔ یہ ملاقات شہر سے دور ایک غیر آباد پہاڑی علاقے میں ہوئی
میں نے پرکاش کھنہ سے کہا۔
"میں لاہور میں بم سپاٹ دیکھ آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے تینوا
آدمیوں میں سے صرف ایک آدمی کو بم دے کر لاہور بھیجیں۔ آپ اسے ضرور
اسلحہ وغیرہ سپلائی کرنے کا انتظام کریں۔"
پرکاش کھنہ نے پوچھا۔
"لاہور میں کس جگہ یہ بم دھماکہ کیا جائے گا؟"
میں نے جان بوجھ کر ایسی جگہ سوچی تھی جہاں لوگ زیادہ نہ ہوں۔ میر
نے کہا۔
"یہ دھماکہ کرشن نگر سے چھاؤنی جانے والی بس میں کیا جائے گا۔ ہمار
آدمی ریگل والے بس سٹاپ سے بس میں بم رکھ کر فرار ہو جائے گا۔ بم میں ٹائ
ڈیوائس ہو گی۔ یہ ریموٹ کنٹرول والا بم نہیں ہو گا۔ ہم ٹائم ڈیوائس کا بٹن اوں
کرنے کے دس منٹ بعد پھٹے گا۔ اس وقت یہ بس لاہور چھاؤنی کی حدود میں داخل
ہو چکی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار چھاؤنی میں دھماکہ ہو۔"
پرکاش کھنہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔
"یہ بالکل مناسب رہے گا۔ ابھی تک ہمارے کسی آدمی نے لاہور چھاؤنی
میں دھماکہ نہیں کیا۔"
میں نے کہا۔
"آپ اپنے آدمی کو آج صبح ہی بم اور اس کو اپنی حفاظت کے لیے پستول
دے کر لاہور روانہ کر دیں۔ وہ رات کسی ہوٹل یا سرائے میں یا کسی اور محفوظ جگہ
پر گزارے گا اور صبح جب لوگ دفتروں وغیرہ کو جاتے ہیں اور بسوں میں رش ہوتا
ہے وہ ریگل چوک سے بس میں سوار ہو کر بم کا تھیلا سیٹ کے نیچے رکھ کر بس کے

ے سے پہلے ہی ضروری کام کا بہانہ بنا کر اتر جائے گا۔ ہمارے آدمیوں کو لاہور کی
کوں کے بارے میں پوری معلومات ہیں - اس کی آپ فکر نہ کریں۔"
پرکاش کھنہ بولا۔
"میں ایک گھنٹے میں اس آدمی کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ یہ تینوں
ی شہر سے باہر ایک ویران جگہ پر چھپے ہوئے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان تینوں کو جانتا ہوں اور میں نے اپنی
انی میں انہیں بمبئی کے ٹریننگ سینٹر میں ٹریننگ دلوائی ہے۔ بس آپ اسے صبح
پنڈی سے لاہور روانہ کر دیں اور یہ دھماکہ کل کرشن نگر سے چھاؤنی کی طرف
نے والی پہلی بس میں کیا جائے گا۔"
ساری بات طے ہو گئی۔ پرکاش کھنہ واپس چلا گیا۔ اگلے دن صبح آٹھ بجے
نے لاہور بٹ صاحب کو ان کے خفیہ نمبر پر فون کیا اور انہیں بم دھماکے کی
ری منصوبہ بندی بیان کرتے ہوئے کہا۔
"ہمیں ایک خالی بس کی قربانی دینی پڑے گی تاکہ ہمارے دشمنوں کو مجھ پر
ں قسم کا کوئی شک نہ پڑے۔ بھارتی دہشت گرد بم لے کر لاہور روانہ ہو چکا
۔ آپ کو اس کا حلیہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ کل
کے وقت کرشن نگر سے چھاؤنی کی جانب جو بس بھی روانہ ہو کر ریگل پہنچے آپ
ل چوک سے چلنے کے فوراً بعد اس بس کو رکوا کر مسافروں سے خالی کروا دیں
بس کو کسی خالی جگہ پر لے جا کر کھڑی کر دیں۔ اس بس میں ریگل چوک میں
ے اور چلنے کے دس منٹ بعد دھماکہ ہو گا۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے ان دس منٹوں
کرنا ہو گا۔ دہشت گرد کو کرشن نگر سے چلنے والی پہلی بس کا ٹارگٹ دیا گیا لیکن
یٹ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اس وقت تک کرشن نگر سے ریگل پہنچنے والی ہر بس کو
گل پر خالی کروا لیں گے اور اسے کسی خالی جگہ پر لگا دیں گے۔ دھماکہ خالی بس

میں ہو گا۔ بس ضرور تباہ ہو جائے گی لیکن کوئی جانی نقصان نہیں ہو گا۔ میں پیچھے یہ وضاحت بھجوا دوں گا کہ پاکستان کی خفیہ پولیس کو شک پڑ گیا تھا کہ بس میں کسی نے بم رکھ دیا ہے اس کے بعد میں ایسا منصوبہ بناؤں گا کہ تخریبی کاروائی سے پہلے ہی یہ تینوں بھارتی دہشت گرد آپ کے قبضے میں ہوں گے۔"

بٹ صاحب بولے۔

"اوکے۔ ہم آپ کی ایک ایک ہدایت پر عمل کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں کل اپنی کوٹھی والے دفتر میں ہی رہوں گا۔ آپ دھماکے کے بعد مجھے فون پر بتا دیجئے گا۔"

"انشاء اللہ" بٹ صاحب نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

اس کے اگلے روز میں اپنی کوٹھی کے دفتر میں ہی رہا۔ شیلا یعنی میری بیو[ی] جمیلہ شاہ رات بھر کی پارٹی کی جاگی ہوئی تھی۔ وہ بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ مي[ں] صرف بھارتی شیوسینا کے ہیڈ آفس اور بھارتی سفارت خانے کے لوگوں کو اپ[نی] کارکردگی دکھانے کے لیے ہر روز گھر پر پارٹی کی محفل سجا لیتا تھا ورنہ مجھے کسی [...] بھارتی دہشت گردوں کے بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاکستان کی جس جیل میں بند ہیں انہیں وہیں ختم کر دیا جائے گا۔ شیلا اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے میں پارٹی کے دوران کسی نہ کسی مہمان کو لے کونے میں بیٹھ جاتا اور اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا۔ شیلا مہما[ن] عورتوں کی خبر گیری میں لگی ہوتی۔ میری طرف کسی وقت نگاہ اٹھا کر دیکھتی تو میں ظاہر کرتا جیسے جس آدمی سے میں باتیں کر رہا ہوں اس سے بھارتی دہشت گردو[ں] کے بارے میں ہی پوچھ رہا ہوں کہ وہ پاکستان کی کس جیل میں ہیں۔ حالانکہ میں ا[س] آدمی کے ساتھ اسلام آباد کے موسم یا فلم ایکٹرسوں کے بارے میں باتیں کر رہا ہ[وتا]

تھا۔ پارٹی ختم ہوتی تو رات کو بیڈ روم میں آ کر شیلا مجھ سے ضرور پوچھتی۔

"دھرم چند جی! اپنے آدمیوں کے بارے میں کوئی سراغ ملا؟"

میں اسے کہتا۔

"شیلا جی! یہ لوگ بڑے دیش بھگت لگتے ہیں۔ پاکستان کے خلاف کوئی بات سننے یا کوئی راز بتانے کو تیار نہیں ہوتے لیکن ابھی مجھے ایسا کوئی آدمی نہیں ملا جس کو پوری طرح معلوم ہو کہ اپنے انڈین اگروادی ست پرکاش ،گووندا اور دوسرے ساتھی پاکستان میں کہاں رکھے گئے ہیں۔"

اسی دوران میں پرکاش کھنہ کی وساطت سے بمبئی سے بالا جی نے بھی مجھ سے رابطہ قائم کیا اور مجھ سے اپنے مشن کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بھی یہی کہا کہ میں کام میں بڑی جانفشانی سے لگا ہوا ہوں۔ جیسے ہی مجھے اپنے آدمیوں کا ذرا سا سراغ ملا میں انہیں وہاں سے نکلوا کر بارڈر کراس کروا دوں گا۔ بالا جی کو میں نے یہ بھی بتایا کہ میں بم دھماکے شروع کروا رہا ہوں۔

ابھی تک کسی کو یہ شائبہ تک نہیں ہوا تھا کہ میں اصلی دھرم چند نہیں ہوں بلکہ اس کا ہم شکل ایک محب وطن پاکستانی ہوں اور دھرم چند بن کر ان کے پاکستان دشمن منصوبوں کو خاک میں ملانے کا جتن کر رہا ہوں۔

دن کے گیارہ بجے مجھے لاہور سے بٹ صاحب کا ٹیلی فون آ گیا۔ یہ فون میں نے اپنے دفتر کے نیچے تہہ خانے میں چھپایا ہوا تھا۔ اس کی گھنٹی بجی تو میں نے رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوڈ الفاظ میں بٹ صاحب نے اپنی شناخت بتائی۔ میں نے بھی کوڈ الفاظ میں کہا کہ تہہ خانے میں جا کر بات کروں گا۔ بٹ صاحب یا ملک صاحب سے ٹیلی فون پر عام اردو یا پنجابی زبان میں بم دھماکوں کے متعلق باتیں کرنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ یہ باتیں پاکستان کی سلامتی اور استحکام کی باتیں تھیں۔ خطرہ اگر تھا تو صرف یہ کہ کہیں شیلا دھر جو میری نقلی مسلمان بیوی بن کر میرے ساتھ رہ رہی تھی ہماری باتیں نہ سن لے۔ اس کا میں نے یہ انتظام کر رکھا

تھا کہ تہہ خانے والا ٹیلی فون بالکل الگ تھا۔ اس پر اگر کوئی بات کر رہا ہو تو گھر کے دوسرے فون پر اس کی باتیں نہیں سنی جا سکتی تھیں۔ شیلا ویسے بھی اس وقت بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ میں نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔

یہاں بٹ صاحب نے دوبارہ فون کیا اور مجھے جو کچھ بتایا وہ یہ تھا کہ صبح ہی سے پولیس کو خبردار کر دیا گیا تھا۔ سفید کپڑوں میں پولیس کی پوری گارد ریگل سینما والے بس سٹاپ کے اردگرد تعینات کر دی گئی تھی۔ صبح کے وقت جو پہلی بس کرشن نگر سے چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئی' اس میں بھی سفید کپڑوں میں پولیس کے تین آدمی سوار ہو گئے۔ وہ مسافروں کی نقل و حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کسی مسافر کے پاس کوئی تھیلا نہیں تھا۔ ریگل بس سٹاپ پر بس کھڑی ہوئی تو اس وقت بھی کوئی مسافر تھیلا وغیرہ سیٹ کے نیچے رکھ کر نہ اترا۔ اسکے باوجود ریگل بس سٹاپ پر ایک خفیہ پولیس والے نے سانپ سانپ کا شور مچا دیا۔ سارے مسافر گھبرا کر بس میں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے کود گئے اور بس سے دور بھاگ گئے۔ اس وقت بقول بٹ صاحب کے وہ ملک صاحب کے ساتھ ایک طرف درختوں کے پاس کھڑے تھے۔ بس کو پروگرام کے مطابق ایک خالی جگہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا گیا اور ڈرائیور بھی بھاگ گیا۔ دس منٹ گزر گئے۔ مزید دس منٹ گزر گئے۔ کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ خفیہ پولیس والوں نے اگرچہ دیکھ لیا تھا کہ بس کی کسی سیٹ کے نیچے کوئی تھیلا وغیرہ نہیں ہے مگر بٹ صاحب نے کہا کہ بس بیس منٹ الگ جگہ پر خالی کھڑی رہے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ بھارتی دہشت گرد اس بس میں سوار نہیں ہوا تھا۔ وہ دوسری بس پر کرشن نگر سے سوار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پٹ سن کا تھیلا تھا جس میں ڈالے ہوئے پرانے کپڑے باہر سے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ بم ان کپڑوں میں چھپایا گیا تھا۔ خفیہ پولیس والے بھی اس بس میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ ایک مسافر کے ہاتھ میں تھیلا ہے۔ انہوں نے جنرل پوسٹ آفس کے بس سٹاپ پر نیچے اتر کے آگے بٹ صاحب کو موبائیل پر اطلاع کر دی کہ ایک مسافر

کے پاس تھیلا ہے شاید اسی میں بم ہے۔ بٹ صاحب نے کہا کہ مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اس مسافر کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اسے ریگل تک آنے دو۔ ریگل چوک میں پہلے سے سفید کپڑوں میں پولیس کی گارد سواریوں کی شکل میں موجود تھی۔ جیسے ہی بس ریگل کے سٹاپ پر رکی بھارتی دہشت گرد نے تھیلے کے اندر ہاتھ ڈال کر بم کے ٹائم ڈیوائس کا ہک اوپر کر دیا۔ تھیلے کو اس نے اپنے پاؤں کے پاس رکھا ہوا تھا۔ دو تین سواریاں نیچے اتریں تو دہشت گرد نے تھیلے کو پاؤں سے سیٹ کے نیچے کیا اور خود بھی نیچے اتر کر تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔

بٹ صاحب اور ملک صاحب اور خفیہ پولیس کے اہلکاروں نے اس آدمی کو مشکوک حالت میں جاتے دیکھا مگر انہیں اس آدمی کو پکڑنے کے آڈر نہیں تھے۔ یہ آدمی ایک طرح سے وہ چھوٹی مچھلی تھی جس کو بنسی کے منہ پر لگا کر پاکستان کی پولیس نے باقی بڑی بڑی مچھلیوں کو پکڑنا تھا۔ اس مسافر کے اترتے ہی خفیہ پولیس والوں نے ایک بار پھر سانپ سانپ کا شور مچا دیا۔ مسافروں میں وہیں بھگدڑ مچ گئی۔ دیکھتے دیکھتے تین منٹ کے اندر اندر بس خالی ہو گئی۔ ہدایات کے مطابق پولیس کے اپنے ڈرائیور نے بس کو وہاں سے چلا کر بڑی تیزی کے ساتھ ایک ویران سی جگہ پر درختوں کے نیچے کھڑی کر دیا۔ ٹھیک سات منٹ کے بعد بس میں زوردار دھماکہ ہوا اور بس کو آگ لگ گئی۔ وہاں شور مچ گیا اور سواریاں جو دور کھڑی یہ سوچ رہی تھیں کہ بس میں جو سانپ آگیا ہوا ہے اسے بھگا دیا یا مار دیا گیا ہو گا اور بس واپس سٹاپ پر آ جائے گی۔ بس کے دھماکے اور آگ کو دیکھ کر وہ اور دور بھاگ گئیں۔

بٹ صاحب نے فون پر مجھے کہا۔

"یہ ہماری سول سروس کی زندگی کا پہلا ایسا موقع ہے کہ مجرم ہمارے سامنے موجود تھا مگر ہم اسے کسی مصلحت کی وجہ سے پکڑ نہیں سکتے تھے۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"فکر نہ کریں یہ مجرم میری قید میں ہی ہیں۔ بہت جلد یہ خود ہی نہیں بلکہ

اپنے باقی تین دہشت گردوں کے ساتھ آپ کی گرفت میں آ جائے گا۔"

میں نے اس کے بعد بٹ صاحب سے کہا کہ وہ میری آئندہ ہدایات کا انتظار کریں۔ میں ان سے جلد رابطہ قائم کروں گا۔ دھماکے کی خبر ایک گھنٹے اندر اندر بھارتی سفارت خانے میں پہنچ گئی تھی۔ پرکاش کھنہ نے مجھ سے فون پر خفیہ الفاظ میں کہا کہ میں آپ کے کے کاٹن کی تیار کردہ چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں پرکاش کھنہ کی آواز کو پہچانتا تھا۔ میں نے کہا۔

"آپ کسی بھی وقت دفتری اوقات میں ہمارے دفتر تشریف لے آئیے۔"

پرکاش کھنہ نے کہا۔

"میں تین بجے آ سکتا ہوں۔"

تین بجے کا مطلب تھا کہ وہ رات کے دس بجے مجھے پہلے سے طے شدہ جگہ پر مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ میں دس بجے وہاں پہنچ گیا۔ وقت یوں طے کیا جاتا تھا کہ وہ جو وقت بتاتا یا میں جو وقت بتاتا اس میں ہم سات گھنٹے جمع کر لیتے تھے۔ پرکاش نے تین بجے کا وقت بتایا تھا میں نے اس میں سات کا ہندسہ جمع کر دیا اور حاصل دس آیا۔ چنانچہ ٹھیک دس بجے ہماری طے شدہ جگہ پر ملاقات ہوئی۔ پرکاش کہنے لگا۔

"لاہور میں بم دھماکہ ضرور ہوا ہے مگر کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔ معلوم ہوا ہے کہ پولیس نے بس پہلے ہی خالی کرا لی تھی اور اسے ایک طرف لگا دیا گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تمہارے خیال میں؟"

میں نے سوچنے کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ پولیس کو شک پڑ گیا ہو گا کہ بس میں کسی مسافر نے بم رکھ دیا ہے۔"

"ایسی صورت میں پولیس کو بس کی تلاشی لے کر کچھ نہ ملنے کے بعد مسافروں کو دوبارہ بس میں بٹھا دینا چاہیے تھا۔ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ پولیس نے بس کو ایک خالی جگہ پر اس وقت تک کھڑی رکھا جب تک بم نہیں چل گیا۔ اس کی وجہ

کیا ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ تو ہمیں کیسری لال ہی بتا سکتا ہے کیونکہ وہ بم رکھنے کے بعد موقع واردات سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔"

پرکاش کھنہ نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

"کیسری لال لاہور سے واپس آگیا ہو گا۔ چلو ان کے ٹھکانے پر چل کر اس سے معلوم کرتے ہیں۔"

کیسری لال ان تین بھارتی دہشت گردوں میں سے ایک کا نام تھا جن کو میں بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ پرکاش کھنہ اپنی چھوٹی سی پرانی جیپ میں بیٹھ کر آیا تھا۔ ہم جیپ میں بیٹھے اور اسلام آباد شہر کے باہر ویران پہاڑیوں میں اس مقام پر آ گئے جہاں دہشت گردوں کو ہم نے چھپایا ہوا تھا۔ کیسری لال لاہور سے واپس آ گیا تھا۔ ہم نے اس سے ساری بات پوچھی تو اس نے کہا۔

"ایسا ہوا کہ جیسے ہی میں بس کی سیٹ کے نیچے بم والا تھیلا رکھ کر نیچے اترا کسی نے شور مچا دیا کہ بس میں کالا سانپ گھس آیا ہے۔ یہ سن کر مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی اور سارے مسافر چھلانگیں لگا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بس کو بھی ایک طرف لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہاں دھماکہ ہو گیا۔ کیونکہ میں نے اترنے سے پہلے بم کے ٹائم ڈیوائیس کا ہک اوپر اٹھا دیا تھا۔"

پرکاش کھنہ ہنس کر بولا۔

"تو اصل بات یہ تھی۔ میں بھی یہ سن کر حیران ہوا تھا کہ بس میں سے سواریاں کیوں اتر گئی تھیں۔"

میں نے فوراً" پرکاش کھنہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔

"سانپ کا سن کر تو سواریوں نے ادھر ادھر چھلانگیں لگانی ہی تھیں۔"

پھر میں نے دہشت گرد کیسری لال سے پوچھا۔

"تم کو کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے تمہیں یہ احساس تو نہیں ہوا تھا کہ تم کسی کی نگاہ میں آ گئے ہو؟"

کیسری لال بڑا تربیت یافتہ دہشت گرد تھا۔ کہنے لگا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہاں تو لوگ سانپ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ میں نے خود سانپ کو دیکھا تھا۔ اس نے پھن اٹھا رکھا تھا۔ کوئی کہتا کسی سپیرے کی ٹوکری سے نکل آیا ہو گا۔"

سارے شک شبے دور ہو گئے۔

دہشت گردی کی دوسری واردات کے لئے لاہور کی ایک شیعہ مسجد کو منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ پاکستان میں شیعہ اور سنی کے درمیان مذہبی منافرت کو ہوا دینا تھی۔ کیونکہ اگر شیعوں کی مسجد میں بم دھماکہ ہوتا اور شیعہ بھائی شہید ہوتے تو سب یہی سمجھیں گے کہ یہ دھماکہ سُنیوں نے کرایا ہے۔ میں اس واردات کے حق میں نہیں تھا مگر پرکاش کھنے نے کہا۔

"بمبئی شیوسینا کے ہیڈ آفس سے آرڈر موصول ہوا ہے کہ لاہور کی کسی شیعہ مسجد میں نمازیوں پر فائرنگ بھی کی جائے اور بم بھی پھینکا جائے۔"

اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ مجبوراً مجھے دو بھارتی دہشت گردوں کو اس واردات کے لئے تیار کرنا پڑا۔ کیسری لال ایک بم دھماکہ لاہور میں کر آیا تھا۔ دوسری واردات کے واسطے ہم نے باقی اور دہشت گردوں کی ڈیوٹی لگائی۔ ان میں سے ایک کا نام پوپٹ لال اور دوسرے کا گردھاری تھا۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں مسجد میں دھماکہ نہیں ہونے دوں گا اور نمازیوں پر فائرنگ بھی نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن مجھے گردھاری اور پوپٹ لال کو بم اور اسلحہ دے کر لاہور بھجوانا ہی پڑا۔ جب وہ بس میں سوار ہو کر پنڈی سے لاہور کی طرف روانہ ہو گئے تو میں نے لاہور بٹ صاحب کو فوراً فون پر اطلاع کر دی کہ اس حلیے کے دو بھارتی دہشت گرد اس نمبر کی بس میں پنڈی سے لاہور آ رہے ہیں۔ آپ کی مرضی ہے۔ چاہے انہیں پکڑ لیں یا انہیں وہیں گولیاں مار کر ہلاک کر دیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے اور بم بھی ایک لفافے میں ہے۔ بٹ صاحب نے کہا۔

"فکر نہیں کرو حیدر علی! تم سمجھو کہ یہ بھارتی دہشت گرد جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے بٹ صاحب کو بتا دیا تھا کہ یہ دونوں دہشت گرد صبح کی نماز کے وقت لاہور کی ایک شیعہ مسجد میں نمازیوں پر فائرنگ کرنے اور بم دھماکہ کرنے آ رہے ہیں اور انہیں کسی بھی حالت میں بھی نہ چھوڑا جائے۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل گئے تو نہ جانے کتنے ہی نمازی شہید ہو جائیں گے۔

ٹیلی فون پر یہ پیغام دینے کے بعد میرا ضمیر مطمئن ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ گردھاری اور پوپٹ لال بادامی باغ کے اڈے پر ہی پکڑ لئے جائیں گے۔ دونوں بھارتی دہشت گرد صبح کے وقت پنڈی سے بس میں سوار ہو کر لاہور روانہ ہوئے تھے۔ لاہور میں بھارتی سفارت خانے کا ایک آدمی موجود تھا جس نے ان دہشت گردوں کی نگرانی کرنی تھی اور دوسرے دن صبح کی نماز کے وقت انہوں نے کسی مسجد میں جو دھماکہ اور فائرنگ کرنی تھی۔ اس کی پوری رپورٹ پرکاش کھنہ کو سفارت خانے کے ذریعے بھجوانی تھی۔ اس رات ہمارے گھر میں کوئی پارٹی نہیں تھی۔ شیلا کہنے لگی۔

"ڈارلنگ چلو آج کوئی فلم دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"وی سی آر پر کوئی بھی فلم لگا لو۔"

وہ بولی۔

"نہیں، فلم سینما ہال میں بیٹھ کر دیکھیں گے اور انگریزی فلم دیکھیں گے اور کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔"

شام کو ہم دونوں تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھے اور اسلام آباد کے ایک ریستوران میں آ گئے۔ یہاں پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ ایک آدمی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ اس آدمی کو میں نے پہلے اس وقت دیکھا جب میں اور شیلا اپنی کوٹھی

سے نکلے تھے۔ یہ آدمی کچھ فاصلے پر اپنی کار کا بونٹ کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ دبلے جسم کا آدمی تھا۔ اس نے بش شرٹ اور نسواری پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کی گاڑی بھی پرانے ماڈل کی تھی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ جب ہماری گاڑی سڑک پر چڑھنے کے بعد اس کے قریب سے گزری تو اس وقت میں نے اس کی شکل بھی دیکھ لی تھی۔ عام شکل صورت کا نوجوان تھا۔

جب میں ریستوران کی پارکنگ میں اپنی گاڑی پارک کرکے واپس ریستوران کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دوبارہ اس آدمی کو دیکھا۔ وہ بھی اپنی کار پارک کر رہا تھا۔ میں نے اسے اتفاق سمجھ کر شیلا کے ساتھ ریستوران کے اوپن ائیر لان میں آ کر بیٹھ گیا اور کھانے کا آڈر دے دیا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہی آدمی ہم سے کچھ دور ایک خالی میز پر بیٹھا سگریٹ پیتے ہوئے ہماری جانب دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک بات بالکل صاف ظاہر تھی کہ یہ پاکستانی خفیہ پولیس کا آدمی نہیں ہو سکتا کیونکہ پاکستانی خفیہ پولیس کو میرے بارے میں بٹ صاحب اور ملک صاحب نے سرسری طور پر بتا دیا ہوا تھا کہ میں بھی ان ہی کا آدمی ہوں۔ میں سوچتے سوچتے جس قدرتی نتیجے پر پہنچا وہ یہ تھا کہ لازمی طور پر بھارتی سفارت خانے کا جاسوس ہے جسے ہماری نگرانی پر رکھا گیا ہے۔

یہ بات مجھے بٹالے میں جے دیو نے بتا دی تھی کہ ہمارا جو آدمی کسی سیکرٹ مشن پر پاکستان بھیجا جاتا ہے۔ بھارت کا سفارت خانہ اس آدمی کی برابر نگرانی کرتا ہے اور اس کی رپورٹ مرتب کرکے ہفتے میں دوبار سفارت خانے کے ذریعے نئی دلی انڈین حکومت کے سیکرٹریٹ کی را برانچ کے چیف کو پہنچا دی جاتی ہے۔

پہلے میں اپنے طور طریقوں کچھ لاپروا سا ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں اپنے ملک میں تھا۔ دوسرے میں ہندو بن کر نہیں بلکہ مسلمان بن کر وہاں رہ رہا تھا جو کہ حقیقت میں میرا اصلی روپ تھا۔ لیکن ابھی مرا مشن مکمل نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنے

مشن کی تکمیل کے لئے ابھی واپس ہندوستان بھی جانا تھا اور وہاں دھرم چند بن کر وہاں دہشت گردوں کے ٹریننگ سنٹروں اور پاکستان آنے والے دہشت گردوں کو ختم کرنا تھا اور اس کے لئے مجھے بڑی سوجھ بوجھ عقل مندی اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس بھارتی سفارت کار جاسوس کو تعاقب میں دیکھ کر میں محتاط ہوگیا۔ یہ جاسوس بھارتی جاسوسوں کے یا دہشت گردوں کے پیچھے صرف یہ دیکھنے کے لئے لگائے جاتے تھے کہ کہیں یہ پیسوں کے لالچ میں آکر دوسرے ملک کی پولیس کے ساتھ مل کر ڈبل ایجنٹ کا کردار تو ادا نہیں کر رہے۔ اس لحاظ سے میں بے فکر تھا کیونکہ میں نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہوا تھا کہ کوئی پولیس یا خفیہ پولیس کا آدمی مجھ سے نہ ملے۔ اس بات کی بٹ صاحب اور ملک صاحب نے بھی مجھے خاص طور پر تاکید کر رکھی تھی کہ میں کسی پولیس افسر کو اپنے ہاں کسی دعوت پر نہ بلاؤں اور نہ کسی ایسے افسر سے دوستی پیدا کروں۔

اگر مجھے کوئی خطرہ تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ کہیں لاہور کا میرا کوئی جاننے والا اچانک سامنے آکر مجھے پہچان نہ لے اور حیدر علی کہکر یہ نہ کہے کہ تم اتنی دیر کہاں غائب رہے۔ تمہاری دکان بھی سنا ہے کہ تم نے بیچ دی ہے۔ یہ باتیں اگر شیلا نے بھی سن لیں تو میرے حق میں زہر قاتل ثابت ہو سکتی تھیں اور بھارت میں میرے سیکریٹ مشن کا سارا پروگرام خاک میں ملا سکتی تھیں اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بھارتی سفارت کاروں کو میری اصلیت کا پتہ چل بھی جائے مگر وہ اسے مجھ پر ظاہر نہ کریں اور مجھے یہی تاثر دیں وہ مجھے دھرم چند ہی سمجھ رہے ہیں لیکن مجھے کسی بہانے سے بھارت واپس بلالیں اور بھارت کی سر پر قدم رکھتے ہی مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ ایک تو میں اپنے گھر پر جو دعوتیں دیتا تھا اس میں لاہور کے کسی آدمی کو نہیں بلاتا تھا۔ دوسرے پبلک جگہوں پر میں کبھی پیدل نہیں جاتا تھا اور شاپنگ سنٹروں میں بھی شیلا کے ساتھ جانے سے گریز کرتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ بھارتی جاسوس جو میرے پیچھے لگا دیا گیا تھا اس وقت تک میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا جب تک

کہ اس کو یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ میں دھرم چند نہیں ہوں بلکہ اس کا ہمشکل ہوں اور اس کا روپ دھار کر یہ سارا کھیل کھیل رہا ہوں اور دوسرے یہ کہ وہ مجھے کسی پولیس والے یا خفیہ پولیس والے سے بات چیت کرتے نہیں دیکھ لیتا اور یہ دونوں باتیں ناممکن تھیں۔ شیلا جو میرے ساتھ میری نقلی مسلمان بیوی کی حیثیت سے رہ رہی تھی مجھے سر سے پاؤں تک دھرم چند ہی سمجھتی تھی۔ میں نے اس بات کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ وہ کبھی میرے پورے جسم کو نہ دیکھ سکے۔ دوسروں کی نظروں میں ہم میاں بیوی تھے مگر میں رات کو الگ کمرے میں اندر سے کنڈی بلکہ تالا لگا کر سوتا تھا۔ شیلا نے کئی بار رات کو مجھے ڈبل بیڈ روم میں لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے بھرپور مدافعت کی اور اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میں یہ حرکت کبھی نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں کوئی بڑے بلند کردار کا مالک تھا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ شیلا کے ساتھ ڈبل بیڈ روم میں جانے کے بعد میرے اپنے منصوبے پر پانی پھر سکتا تھا۔ وہ تو مجھے نقلی مسلمان سمجھ رہی تھی۔ پھر اس پہ یہ راز فاش ہو جاتا کہ میں حقیقی طور پر بھی مسلمان ہوں اور دھرم چند نہیں ہوں۔ آپ خود سوچیں یہ میں کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

ہم نے ریستوران میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد فلم دیکھنے چل دیئے۔ فلم کے دوران میں سینما ہال میں ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھتا رہا مگر سفارت خانے کا جاسوس مجھے گیلری میں کہیں نظر نہ آیا۔ گیلری میں رش نہیں تھا۔ بمشکل بیس تیس آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں وہ بھارتی جاسوس نہیں تھا۔ ہم فلم دیکھ کر باہر نکلے تو میں نے خاص طور پر دیکھا کہ اس آدمی کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔ شیلا سے میں نے اس آدمی کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔

دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت بھارتی دہشت گرد پوپٹ لال اور گردھاری نے ایک مسجد میں بم کا دھماکہ کرنا تھا۔ منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی۔ شیلا کا کمرہ بند تھا۔ میں نیچے تہ خانے میں چلا آیا۔ مجھے یقین تھا کہ لاہور سے

بٹ صاحب یا ملک صاحب کا ٹیلی فون ضرور آئے گا۔ ابھی میں تہہ خانہ میں آ کر ٹیلی فون کی تپائی کے پاس صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف سے بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے سارے واقعے کی جو تفصیل بتائی اس کا مختصر خلاصہ یہ تھا کہ میری اطلاع پر پولیس کی پوری مسلح گارد نے لاہور راولپنڈی بس سٹینڈ کو گھیرے میں لے لیا۔ وجہ یہ بتائی کہ چونکہ پچھلے دنوں شہر میں مختلف جگہوں پر بم کے دھماکے ہوئے ہیں اس لئے لاہور میں داخل ہونے والی ہر بس کی تلاشی لی جاتی ہے۔ بٹ صاحب نے فون پر بتایا کہ ہم نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ بس میں سے کوئی مکھی بھی اڑ کر پولیس کے گھیرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ چنانچہ سب سافروں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور ان کی تلاشی شروع ہو گئی۔ بھارتی دہشت گرد نے یہ چالاکی کی تھی کہ بس سے نکلتے وقت بم والا تھیلا اپنے پستول کے ساتھ بس کی سیٹ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ بٹ صاحب کہتے ہیں کہ میرے بتائے ہوئے حلیے سے انہوں نے دونوں دہشت گردوں کو پہچان لیا تھا اور ان پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔

تلاشی کے دوران کسی کے پاس کوئی بم پستول وغیرہ نہ نکلا۔ بٹ صاحب کہتے ہیں کہ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ دونوں دہشت گردوں نے بم کا تھیلا بس میں ہی چھوڑ دیا ہو گا اور وہ اس کی ملکیت سے انکاری ہو جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا جب پولیس نے مسافروں کے سامان کی تلاشی لی تو بس کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے ایک تھیلا برآمد ہوا جس میں انتہائی طاقتور دیسی ساخت کا بم اور ایک بھرا ہوا پستول بھی تھا۔ پولیس نے پوچھا کہ یہ تھیلا کس کا ہے۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ یہ تھیلا میرا ہے۔ دونوں دہشت گرد بھی خاموش رہے۔ پولیس نے اپنے ایک آدمی کو منصوبے کے مطابق مسافروں میں شامل کر دیا تھا۔ اس آدمی نے کہا۔

"جناب یہ تھیلا ان دو آدمیوں کا ہے میں نے خود ان میں سے ایک کو بس میں سے باہر نکلتے وقت تھیلا سیٹ کے نیچے رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

بٹ صاحب نے پولیس انسپکٹر کو اشارہ کیا کہ ان دونوں آدمیوں کو ہتھکڑی لگا دی جائے۔ گردھاری اور پوپٹ لال نے جب دیکھا کہ اب وہ بچ نہیں سکتے تو انہوں نے ٹریننگ کے قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ حرکت کی کہ ایک طرف دوڑ پڑے۔ بٹ صاحب کا کہنا تھا کہ ان دہشت گردوں نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ پولیس انہیں بھاگتا دیکھ کر ان کے پیچھے دوڑی۔ پولیس نے ہوائی فائرنگ کی۔ یہ محض دکھانے کے لئے تھی۔ چونکہ دونوں بھارتی دہشت گردوں کو پہچان لیا گیا تھا اور ایکدم بھاگ اٹھنے سے انہوں نے خود اپنے دہشت گرد ہونے کی تصدیق کر دی تھی چنانچہ کچھ دور تک ان کا تعاقب کرنے کے بعد دونوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ لاش کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ہندو تھے۔ ان کے ختنے نہیں ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ خبر بھارتی سفارت خانے بھی پہنچ گئی۔ پرکاش کھنہ نے مجھے فون پر کہا کہ میں فلاں جگہ آ رہا ہوں۔ ضروری بات کرنی ہے۔ اس سے پہلے مجھے بٹ صاحب کی زبانی فون پر سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ خفیہ جگہ پر میری اور پرکاش کھنہ کی ملاقات ہوئی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"آپ لوگوں نے ان کو یہی ٹریننگ دی تھی کہ پولیس آئے تو ان کے آگے آگے دوڑنا شروع کر دو اور پولیس پر فائرنگ بھی کرو۔"

بھارتی سفارت خانے کو یہ خبر بھی پہنچی تھی کہ جب پولیس نے ہوائی فائر کیا تو گردھاری اور پوپٹ لال نے بھی جواب میں پولیس پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس بار الزام مجھ پر نہیں بمبئی کے انسٹرکٹروں پر آیا تھا۔ جنہوں نے دہشت گردوں کو ٹریننگ دی تھی۔ میں نے بظاہر حیران سا ہو کر پوچھا۔

"بات کیا ہوئی ہے کھنہ جی؟ کھول کر بتائیں۔"

وہ ماتھے پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔

"ماراج بات کیا ہوئی تھی۔ بادامی باغ کے اڈے پر پولیس نے مسافروں کو اتار کر تلاشی لینی شروع کر دی۔ پولیس تو دو تین دنوں سے ہر بس کی تلاشی لے رہی ہے۔ گردھاری اور پوپٹ کو چاہئے تھا کہ بم بس میں رکھا تھا تو اپنے پستول بھی وہیں پھینک دیتے مگر انہوں نے پستول اپنے پاس ہی رکھے۔ جب پولیس تلاشی لینے لگی تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس نے تعاقب کرتے ہوئے ہوائی فائرنگ کی تو انہوں نے بھی جواب میں فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس نے دونوں کو اڑ دیا۔ یہ کام پولیس نے کرنا ہی تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ انجان بن جاتے یا پھر پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے۔ ہم انہیں چھڑانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر انہوں نے تو ہمارے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ ان کی لاشوں کا کیا ہوا؟"

پرکاش کھنہ بولا۔

"پولیس نے دونوں لاشوں کو ننگا کر کے اخبار نویسوں کو دکھایا اور بس میں سے بم کا تھیلا بھی برآمد کر لیا اور ان کے پستول بھی برآمد کر لئے۔ شام کے اخباروں میں خبر چھپ جائے گی کہ بھارت کے دو ہندو دہشت گرد بس میں بم رکھتے ہوئے پکڑے گئے مگر وہ پولیس کی حراست سے فرار ہو گئے۔ پولیس نے ان کا پیچھا کیا۔ بھارتیوں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی اور پولیس مقابلے میں دونوں بھارتی دہشت گرد مارے گئے۔ تم بھی بمبئی والوں کو فوراً پیغام بھجواؤ اور میں بھی دلی کر خبردار کرتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کے اناڑی دہشت گرد بھیج کر بھارت کو دوسرے ممالک کے سامنے ذلیل نہ کیا جائے۔"

شیلا یہ خبر سن کر پریشان ہوئی تھی۔ میں نے اسی روز رات کو پرکاش کھنہ کے تعاون سے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بمبئی بالا جی سے بات کی۔ انہیں اس حادثے کی

اطلاع دی اور کہا کہ ٹریننگ سنٹر کے انسٹرکٹروں کو فوراً بدل کر ان کی جگہ دوسرے لوگ لانے جائیں اور دہشت گردوں کے انتخاب میں بے حد احتیاط اور سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے۔

بالا جی نے کہا۔

"دھرم چند! ان لوگوں کو تمہاری منظوری بھی حاصل تھی۔ تمہیں بھی آگے سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم تو یہاں مناسب تبدیلیاں کریں گے ہی۔"

شام کے اخباروں میں گردھاری لال اور روپٹ لال کے پولیس مقابلے میں مارے جانے کی خبر چھپ گئی۔ ساتھ میں ان کی لاشوں کی تصویریں بھی تھیں۔ دوسرے روز کے اخباروں میں بھی یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی اور دو تین اخباروں نے ایڈیٹوریل نوٹ بھی لکھے کہ بھارت پاکستان میں اپنے دہشت گرد بھیج کر پاکستان میں انتشار اور منافرت کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس کی جسقدر مذمت کی جائے کم ہے۔ میں بڑا خوش تھا کہ جو کام مجھے کرنا تھا وہ دونوں دہشت گردوں نے پولیس مقابلے میں خود ہی انجام دے دیا ہے۔

دو دن بعد بھارتی سفارت کار پرکاش کھنہ کے ذریعے مجھے بالا جی کا آڈر ملا کہ میں فوراً بمبئی پہنچوں تاکہ میری نگرانی میں نئے دہشت گردوں کا انتخاب کر کے انہیں پاکستان بھیجا جائے۔ پرکاش کھنہ کہنے لگا۔

"ست پرکاش، گوندا اور موتی رام اگروادیوں کے فرار کے بارے میں تم نے اب تک جو معلومات اکٹھی کی ہیں۔ ان کی پروگریس رپورٹ بھی تیار کر کے ساتھ لے جانا۔ بالا جی نے یہ بھی مانگی ہے۔"

پروگریس رپورٹ کیا تیار کرنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بمبئی جا کر مجھے اس سلسلے میں بالا جی سے کیا کچھ کہنا ہوگا۔ میں نے شیلا کو بتا دیا کہ مجھے بالا جی نے بمبئی بلایا ہے۔ تم پیچھے خیال رکھنا اور سب کو یہی کہنا کہ میں کاروبار کے سلسلے میں دبئی گیا

ہوا ہوں۔ میں نے دبئی کا ویزا لگوایا اور دوسرے روز رات کی فلائیٹ سے دوبئی روانہ ہوگیا۔ دوبئی پہنچ کر میں سیدھا وہاں کے بھارتی سفارت خانے گیا۔ انہیں میرے بارے میں پرکاش کھنہ نے پہلے ہی سے بتا دیا ہوا تھا۔ اسی وقت میرا ویزا لگا گیا کیونکہ وہاں میں اسلام آباد کے مسلمان تاجر زمان شاہ کے نام سے گیا تھا۔

ایک رات میں نے دبئی میں آرام کیا۔ اگلے روز عرب امارت کی فلائٹ پکڑی اور بمبئی پہنچ گیا۔ ائیرپورٹ سے سیدھا شیوسینا کے ہیڈ آفس آگیا۔ بالا جی اپنے کمرے میں مجھے ملے۔ گردھاری اور پوپٹ لال کی ہلاکت پر وہ سخت برہم تھے۔ کچھ میرے انتخاب کی مذمت کی۔ کچھ گالیاں ٹریننگ دینے والوں کو دیں۔ کہنے لگے۔

"ان لوگوں کی موت سے صرف ہماری شیوسینا کو ہی دھچکا نہیں لگا بلکہ بھارت دیش کی بھی بدنامی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج! ہم تو ٹریننگ دیتے ہوئے یہ بات ہر بار دہراتے ہیں کہ اگر کبھی پولیس کا آمنا سامنا ہو جائے اور پولیس تمہیں پہچان لے تو ہرگز ہرگز بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ اس طرح پولیس کو تمہیں گولی مارنے کا بہانہ مل جائے گا۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دینا اور مکر جانا کہ تم دہشت گرد ہو۔ اس کے بعد کم از کم ہمارا آدمی زندہ تو بچ جائے گا اور فرار کی کوشش بھی کر سکے گا۔"

بالا جی نے سگار ایش ٹرے میں رگڑ رگڑ کر بجھاتے ہوئے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

"جو کچھ ہوا اب اس کی بات نہ کرو مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے جو تین آدمی پاکستان پولیس کی حراست میں ہیں اور جن پر ظاہر ہے سخت ٹارچر کیا جا رہا ہوگا انکو فرار کروانے میں تم نے اور شیلا دھرنے کیا پروگریس کی ہے۔"

میں نے فوراً" جواب دیا۔

"میں نے اپنے خفیہ ذریعوں سے دو تین باتیں معلوم کرلیں ہے۔ مجھے یہ سراغ مل گیا ہے کہ ست پرکاش، گووندا اور موتی رام کو ساہیوال جیل سے نکال کر روہتاس قلعے کے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا گیا ہے۔"

یہ میں نے یونہی اپنی طرف سے گھڑ کر کہہ دیا تھا۔ بالا جی نے پوچھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ یہ بڑا پرانا قلعہ ہے اور اس قلعے میں ایک خفیہ سیل ہے جہاں خطرناک اور خاص طور پر بھارت کے جاسوسوں کو پکڑنے کے بعد رکھا جاتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ بالا جی نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آدمیوں کو وہاں سے نکالنے کے لئے کوئی جتن کیا ہے یا نہیں؟"

میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کوئی جتن نہ کرتا۔ آخر وہ میرے دہشت گرد ہندو بھائی ہیں اور بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔"

بالا جی نے مجھے ایک بار پھر ٹوک دیا اور کہا۔

"بھاشن دینے کی ضرورت نہیں دھرم چند! یہ بتاؤ کہ تم انہیں قلعے سے فرار کراؤ گے۔"

میں نے بڑے سکون کے ساتھ اپنے حواس کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بالا جی! آپ ہمارے بڑے ستیہ دھاری لیڈر ہیں۔ ہم آپ کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر ہی کامیاب ہوتے ہیں لیکن پاکستان میں اب ایسا واتاورم بن گیا ہے کہ خفیہ پولیس دہشت گردوں کی تلاش میں ہر جگہ موجود رہتی ہیں۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط ہو کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اور شیلا نے

اپنے پیدا کئے ہوئے اثر و رسوخ سے نہ صرف یہ سراغ لگا لیا ہے کہ ہمارے آدمی قلعہ روہتاس میں بند ہیں بلکہ ایک ایسے آدمی سے کامیاب رابطہ بھی پیدا کر لیا ہے جو دس ہزار روپے لے کر ہمارے آدمیوں کو قلعے میں سے فرار کرانے میں ہماری مدد کرے گا۔"

بالا جی نے خوش ہو کر کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں جلدی پاکستان چلے جانا چاہئے تاکہ گووندا' ست پرکاش اور موتی رام کو قید سے چھڑا کر پاکستان میں کسی خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دو۔ روپوں کی تم فکر نہ کرو۔ جتنی رقم کی ضرورت ہو گی بھارتی روتا داس [سفارت خانے) کا پرکاش کھنے تمہیں دے دے گا۔"

وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں نے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ میں نے کچھ زیادہ ہی جھوٹ بول دیا ہے۔ مجھے تھوڑا تھوڑا کر کے جھوٹ بولنا چاہئے تھا۔ کیونکہ میرا ارادہ بمبئی میں رہ کر یہاں کے ٹریننگ سنٹر اور زیر تربیت بھارتی دہشت گردوں کو ایک ہی واردات میں دھماکے سے اڑا دینے کا تھا۔ اس کے لئے میرا بمبئی میں قیام ضروری تھا لیکن شیو سینا کا لیڈر بالا جی میری جھوٹی کارروائی کا حال سن کر مجھے فوری طور پر پاکستان واپس بھیج رہا تھا۔ اس کے آگے انکار کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

"سر! میں چاہتا تھا کہ بمبئی میں رہ کر اپنی نگرانی میں کچھ آدمیوں کو ٹریننگ کر کے پاکستان ساتھ لے جاؤں۔"

بالا جی نے کہا۔

"میں نے پنجاب سینٹر سے دو آدمیوں کو بلا رکھا ہے وہ کل تک بمبئی پہنچ جائیں گے۔ تم ان کو چیک کر لینا۔ وہ پاکستان میں پہلے بھی کئی وارداتیں کر چکے ہیں۔ انہیں اپنے ساتھ ہی پاکستان لیتے جانا۔ باقی ہم نے یہاں کے دونوں انسٹرکٹر بدل دیئے ہیں اور نئے آدمیوں کو ٹریننگ دینے پر رکھ لیا ہے۔"

شام کو بالا جی مجھے اپنے ساتھ دہشت گردی کے تربیتی میں لیتا گیا اور وہاں
نئے انسٹرکٹر ملازم رکھے تھے ان سے ملایا۔ یہ دونوں مدراسی تھے فرفر انگریزی
لتے تھے۔ جوڈو کراٹے کے ماہر تھے اور بنگلور کے مسلم کش فسادات میں کئی
سانوں کو شہید کر چکے تھے۔ اب مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میرا
گرام تبدیل کر دیا گیا تھا اور دہشت گرد میرے گلے میں ڈال کر مجھے واپس
ستان روانہ کیا جا رہا تھا۔ میں نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ان بھارتی دہشت
ردوں کو تو جاتے ہی ٹھکانے لگا دوں گا بلکہ سوچنے لگا کہ اگر راستے میں ہی موقع ملا
ان کو ختم کر دوں گا اور ظاہر یہ کروں گا کہ باڈر پر فائرنگ ہونے لگی تھی دونوں
رے گئے۔ اگرچہ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور اس میں مجھ پر شک پڑنے کا اندیشہ
ا بہرحال یہ بات طے تھی کہ میں دو تین دن سے زیادہ بمبئی میں نہیں ٹھہر سکوں گا
ر بھارت میں شیو سینا اور راشٹریہ سیک سنگ کے پاکستان دشمن دہشت گردی کے
ربیتی کیمپوں کو تباہ کرنے کا کام کچھ دیر کے لیے ملتوی کرنا پڑے گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔

دوسرے روز پنجاب سے دو تربیت یافتہ دہشت گرد بمبئی شیو سینا کے ہیڈ
آفس پہنچ گئے۔ دونوں کا تعلق شیو سینا کی پنجاب شاخ سے تھا۔ دونوں جرائم پیشہ
ہندو تھے اور کئی بار جیل کاٹ چکے تھے۔ دونوں پنجابی تھے اور انہیں دیہاتی
مسلمانوں کے طور طریقوں کی بڑی سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ دونوں نے مجھ سے
ملتے ہی مجھے بے دھڑک اسلام علیکم کہہ دیا۔ اس کا اچانک مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ
میرے منہ سے بھی بے اختیار وعلیکم اسلام نکل گیا۔ بالا جی نے میری طرف دیکھا
اور کہا۔

"تم تو پکے مسلمان لگتے ہو دھرم چند کہیں پاکستان میں رہ کر تم نے اسلام
قبول تو نہیں کر لیا۔"

میں نے کہا۔ "مہاراج! پاکستان میں مسلمان بن کر رہا ہوں یہ اسی کا اثر

ہے۔"

بالا جی نے کہا۔

"یہ دونوں بڑے گرو ہیں۔ ایک ایک خون بھی کر چکے ہیں۔ پنجاب پولیہ
کی مار کھا کھا کر ان کے بدن پتھر بن چکے ہیں۔ ہم نے خاص طور پر انہیں بھرتی
ہے۔ خود بم بنا لیتے ہیں۔ پستول کا نشانہ ایسا ہے کہ اڑتے کوے کو فائر کر کے گرا ا
ہیں۔"

اس دوران دونوں دہشت گرد خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔
شکل ہی سے قاتل لگتے تھے۔ بالا جی کہہ رہا تھا۔

"ان کے دل بھارتی جیلوں میں رہ رہ کر پتھر ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں ک
جانی دشمن ہیں۔ میرٹھ میں جو ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے ان میں میرٹھ ک
راشٹریہ سیوک سنگ والوں نے خاص طور پر میرٹھ انہیں بلوایا تھا۔ ان کا بیان ہ
کہ ایک ہفتے کے فسادات میں اکیلے ان دونوں نے پچاس مسلمانوں کو قتل کیا تھا ا
ایک ہزار سے زیادہ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگائی تھی۔ مسلمانوں کی پند
لڑکیوں کو اغوا کر کے کلکتے لے کر فروخت کر دیا تھا۔"

بالا جی نے ہنس کر دونوں شیطان صفت بھارتی دہشت گردوں کی طرف
دیکھا۔ دونوں دہشت گرد بھی ہنس رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رام را
اور دوسرے کا نام کانتی تھا۔ انہیں اردو لکھنا پڑھنا آتا تھا اور انہیں پانچ وقت ک
نماز پڑھنی بھی سکھا دی گئی تھی۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ مسلمانوں کے ا
قاتلوں کو تو میں کسی صورت زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بالا جی کی طرف دیکھ رہا
اور اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ کانتی اور رام راج کا کریا کرم کر چھوڑو۔ یہ ا
پاکستان سے واپس نہیں آئیں گے۔ واپس آئیں تو ان کی بد روحیں ہی بھارت
واپس آئیں گی۔ اوپر سے میں نے کہا۔

"مہاراج! ہمیں ایسے ہی دلیر بہادروں کی ضرورت ہے۔"

بالا جی نے کہا۔
"بس صبح تم تینوں بمبئی سے امرتسر کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔"
میں نے تعجب سے کہا۔
"سر کیا اس بار ہم راجستھان سے باڈر کراس نہیں کریں گے۔"
بالا جی سگار سلگاتے ہوئے بولے۔
"نہیں۔ راجستھان کے باڈر پر آج کل پاکستانی حروں کے دستے گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ وہاں سے باڈر کراس کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ تم لوگ امرتسر سے اٹاری جاؤ گے اور وہاں سے سمجھوتہ ایکسپریس میں ہندو یاتریوں کے ساتھ پاکستان داخل ہو جاؤ گے۔"
میں نے کہا۔
"لیکن مہاراج جی! یاتریوں کے پاس تو پاسپورٹ ہوتے ہیں۔ ان کو عارضی ویزے ملے ہوتے ہیں۔ بارڈر پر ان کے نام اور پتے وغیرہ درج ہوتے ہیں اور واپسی پر بھی ان کی پڑتال کی جاتی ہے کہ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔"
بالا جی نے کہا۔
"تمہیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ ہمارا آدمی امرتسر سے تمہارے ساتھ ہو جائے گا اور تمہیں خود سمجھوتہ ایکسپریس میں سوار کرائے گا۔ اس کے بعد تم پاکستان پہنچ کر کانتی اور رام راج کے ساتھ غائب ہو جاؤ گے۔ بس!"
میں نے دل میں کہا کہ میں تو غائب نہیں ہوں گا لیکن ان دونوں پاکستان کے دشمنوں کو ایسا غائب کروں گا کہ ان کا نام و نشان ہی نہیں ملے گا۔ اوپر سے میں نے کہا۔
"یہ بھی اچھی تجویز ہے۔ ایسا ہی کریں گے۔"
اس کے بعد میں نے کانتی اور رام راج سے مخاطب ہو کر کہا۔
"تم لوگوں کو پاکستان میں واردات کرنے سے پہلے جو ہدایتیں دی جائیں

گی تم ان پر پورا پورا عمل کرو گے۔ اپنی طرف سے کوئی غیر ذمے داری کی حرکت نہیں کرو گے۔"

دونوں منہ سے کچھ نہ بولے صرف اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا تم دونوں گونگے ہو؟"

تب دونوں مسکرائے اور بیک زبان ہو کر بولے۔

"نہیں مہاراج - سن رہے ہیں۔"

بالا جی بھی ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔

"یہ بڑے پکے جرائم پیشہ ہیں۔ باتیں کم کرتے ہیں جو کام کرنا ہوتا ہے خاموشی سے کرتے ہیں۔ انہیں تم کہو فلاں آدمی کو قتل کرنا ہے' یہ ابھی جائیں گے اور اسے قتل کر کے خاموشی سے واپس آ جائیں گے۔"

میں نے دل میں کہا۔

"خدا نے چاہا تو میں بھی انہیں بڑی خاموشی سے جہنم میں پہنچا دوں گا۔"

اس بار مجھے دونوں بھارتی دہشت گردوں کانتی اور رام راج کو لے کر سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے ہندو سکھ یاتریوں کے قافلے کے ساتھ پاکستان میں داخل ہونا تھا۔ ہم تینوں کو انڈین پاسپورٹ بنوا کر دے دیئے گئے۔ ان پر پاکستانی سفارت خانے کے جعلی ویزے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ ویزے پاکستان کے تین شہروں لاہور' سکھر اور خیرپور کے تھے۔ دونوں دہشت گردوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ پاکستان میں داخل ہوتے ہی وہ یاتریوں کے ساتھ جس جگہ ٹھہرایا جائے وہاں ہی جا کر ٹھہریں اور ادھر ادھر بالکل نہ ہوں۔ وہاں سے پاکستان میں بھارت سفارت خانے کے ایک جاسوس نے ان دونوں دہشت گردوں کو اپنی تحویل میں لے کر اسلام آباد لے جانا تھا اور مجھے ان سے الگ ہو کر اپنے طور پر مسلمان زمان شاہ کے نام سے اسلام آباد پہنچنا تھا۔

بمبئی سے ہم امرتسر جنتا ایکسپریس میں بیٹھ کر آئے۔ وہاں سے سمجھوتہ ایکسپریس میں سوار ہو گئے۔ ٹرین میں پہلے ہی سے کافی ہندو سکھ یاتری سوار تھے۔ یہ لوگ پاکستان میں گوردواروں اور مندروں اور تیرتھ استھانوں کی یاترا کرنے جا رہے تھے۔ ان کی باقاعدہ ایک تعداد مقرر تھی اور باڈر پر رجسٹروں میں ان کے ناموں کا اندراج بھی ہوا پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ غائب ہو گئے ان کے بارے میں کچھ پتہ کیوں نہیں لگ سکا۔ لاہور سٹیشن پر ہم لوگ چیکنگ کے بعد باہر نکلے تو بھارتی سفارت خانے کا آدمی مل گیا۔ اس نے وہیں سے کانتی اور رام راج کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں وہاں ان سے الگ ہو گیا اور بس پکڑ کر اسلام آباد پہنچ گیا۔ اسی رات پرکاش کھنہ نے مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے اسے کانتی اور رام راج دونوں دہشت گردوں کے بارے میں بالا جی کی ہدایات اور دوسری تفصیل سے آگاہ کیا۔ پرکاش کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے دھرم چند جی! تم اپنے مشن کی طرف توجہ دو۔ ان دہشت گردوں کو میں کام پر لگا دوں گا اور ان سے لاہور اور دوسرے شہروں میں اپنی مرضی کی جگہوں پر دھماکے اور فائرنگ کراؤں گا۔"

پرکاش کھنہ کے اس فیصلے سے مجھے تشویش ضرور ہوئی کیونکہ مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ یہ لوگ پاکستانیوں کا خون بہاتے پھریں۔ میں نے دل میں طے کر لیا تھا کہ کسی مجبوری کے تحت بھی انہیں اتنی اجازت نہیں دوں گا کہ یہ پاکستانیوں کے خون سے ہولی کھیلیں اور دہشت گردی کریں۔ مگر اسی وقت میں نے پرکاش کھنہ کی ہاں میں ہاں ملانا ہی مناسب سمجھا۔ مجھے جو مشن دیا گیا تھا وہ پولیس کی حراست میں تینوں بھارتی دہشت گردوں کو فرار کرانا تھا۔ یہ دہشت گرد ست پرکاش موتی رام اور گووندا تھے۔

میں نے آدھی رات کے بعد خفیہ ٹیلی فون کال کے ذریعے بٹ صاحب کو اپنے بمبئی کے سفر کی پوری تفصیلات بتا دی تھیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ

دو نئے دہشت گرد سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کے جواب میں بٹ صاحب نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے۔ ہمارے آدمیوں نے تمہارے ساتھ آنے والے ان دونوں بھارتی دہشت گردوں کو دیکھ لیا تھا مگر مصلحت کی بنا پر انہیں کچھ نہیں کہا گیا۔ ہم بھارتی سفارت خانے کے آدمی کو بھی دیکھ لیا تھا۔"

میں نے انہیں جواب دیا۔

"یہ دونوں بڑے خطرناک جرائم پیشہ دہشت گرد ہیں اور پہلی ہی کئی خون کر چکے ہیں۔ میں ان کی واردات کے پروگرام سے آپ کو چوبیس گھنٹے پہلے مطلع کر دوں گا۔ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔ مجھے کسی مصلحت سے کام نہیں لینا۔ آپ بے شک عین موقع پر ان دونوں کو گرفتار کر لیں یا گولی سے اڑا دیں۔ میں شیو سینا والوں سے خود ہی نمٹ لوں گا۔"

بٹ صاحب نے کہا۔

"تم ایک دن کے لئے لاہور نہیں آ سکتے۔ تم سے ایک ملاقات ضرور ہونی چاہئے۔"

میں نے دو دن بعد لاہور آ کر ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ یہ دو دن میں نے اور شیلا نے کافی مصروفیت کے ساتھ گذارے۔ رات کو پارٹی ہوتی اور دن کے وقت بھارے سفارت کار پرکاش کھنہ ہمارے پاس آ کر ہمیں یہی کہتا رہتا کہ ست پرکاش گووندا وغیرہ کو جیسے بھی ہو پولیس کی قید سے فرار کرانے کا بندوبست کیا جائے۔ مجھے لاہور جانے کا بہانہ مل گیا۔ میں نے پرکاش سے کہا۔

"مجھے خبر ملی ہے کہ ہماری تینوں آدمیوں کو لاہور قلعے میں لایا جا رہا ہے۔ میں اس خبر کی تصدیق کے لئے لاہور جا رہا ہوں۔"

وہ بولا۔

"ضرور جاؤ۔ مگر اس بار پوری رپورٹ لے کر آنا تاکہ ہم اپنے آدمیوں

بھگا سکیں۔"

میں نے اسے دو ٹوک جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر پرکاش کھنہ! پاکستانی پولیس کوئی زنانہ پولیس نہیں ہے کہ ہم آسانی
ے اپنے خطرناک آدمیوں کو بھگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے لئے بڑی
ت سے سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کرنی ہوگی اور اس قسم کے معاملات کو میں تم
ے بہتر سمجھتا ہوں۔"

میں نے جان بوجھ کر اس بھارتی سفارت کار کو دبایا تھا۔ میں اسے اپنی جگہ
رکھنا چاہتا تھا۔ وہ صرف ہماری مدد اور تعاون کے لئے تھا۔ وہ ہمیں حکم دینے کی
زیشن میں نہیں تھا۔ خفیہ پولیس کو معلوم تھا کہ بھارتی سفارت کار مجھ سے چھپ
پ کر ملاقاتیں کرتا ہے لیکن چونکہ یہ ملاقاتیں پاکستان کے مفاد میں تھیں اور اس
ے پاکستان کی خفیہ سروس کو بھارت کے ناپاک عزائم سے آگاہی ملتی رہتی تھی اور
سری وجہ یہ تھی کہ میں خود ان ملاقاتوں میں شامل تھا اس لئے پولیس اس پر ہاتھ
ں ڈالتی تھی ورنہ اسے کب کا ناپسندیدہ شخص قرار دے کر پاکستان سے نکال دیا گیا
تا۔

مجھے دوسرے دن صبح کی فلائیٹ سے لاہور جانا تھا۔ رات کو بھی ایک
وٹی سی پارٹی تھی۔ یہ پارٹیاں میں محض بھارتی سفارت خانے والوں اور ان کے
سط سے بمبئی میں شیو سینا کے لیڈر بالا جی کو یہ ظاہر کرنے کے لئے دیتا تھا کہ میں
پنے کام میں لگا ہوا ہوں۔ دوسرے تیسرے میں انہیں یہ رپورٹ بھی بھجوا دیتا تھا
ہ مجھے آہستہ آہستہ اپنے آدمیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔
ں لاہور پہنچ گیا۔ بٹ صاحب کو میں نے وقت بتا دیا ہوا تھا۔ وہ اپنے آفس میں میرا
نتظار کر رہے تھے۔ ملک صاحب ان دنوں دوبئی گئے ہوئے تھے۔ بٹ صاحب کو
ں نے اپنے بمبئی کے قیام اور بالا جی سے ملاقات اور ان کے پاکستان کے خلاف
اک عزائم کی پوری تفصیل زبانی بھی سنا دی۔

سب سے پہلے میں ان سے اپنے ہم شکل یعنی اصلی دھرم چند کے متعلق پوچھا کہ وہ قید خانے میں ہی ہے نا۔ بٹ صاحب ہنس کر کہنے لگے۔

"حیدر علی! اصلی دھرم چند کی تم فکر نہ کرو۔ وہ اس وقت تک خفیہ جگہ تہہ خانے میں بند کا بند رہے گا جب تک تمہارا مشن مکمل نہیں ہو جاتا۔ خواہ تمہیں دس برس ہی کیوں نہ لگ جائیں۔"

میں نے کہا۔

"مجھے اس لئے بھی اس کی فکر رہتی ہے کہ اگر کہیں وہ فرار ہو کر بھارت پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو مجھ پر جو مصیبت نازل ہونی ہوگی وہ تو ہوگی ہی لیکن ہمارا سلامتی پاکستان کا مشن ادھورا رہ جائے گا۔"

بٹ صاحب نے فوراً" جواب دیا۔

"فکر نہ کرو۔ وہ باہر نہیں نکلے گا۔ اگر کبھی ہم نے محسوس کیا کہ ایسا ضروری ہے تو اسے ختم بھی کر دیں گے کیونکہ اس سے ہم نے جو کچھ پوچھنا تھا اور اس نے جو کچھ بتانا تھا بتا دیا ہے۔ اب ہم نے اسے صرف تمہاری خاطر بند کیا ہوا ہے۔"

اس کے بعد بٹ صاحب نے ان دہشت گردوں کے بارے میں پوچھا جن کو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے کہا۔

"آپ کی خفیہ پولیس والوں نے ان کو لاہور سٹیشن پر سمجھوتہ ایکسپریس سے اترتے وقت دیکھ بھی لیا ہوگا۔ ان میں سے ایک کا نام کانتی ہے اور دوسرے کا نام رام راج ہے لیکن کسٹم والوں کے رجسٹر پر انہوں نے اپنے دوسرے ہندوانہ نام لکھوائے ہیں۔ یہ دونوں ایک طرح سے غائب ہو گئے ہیں اور یاتریوں کے ساتھ واپس انڈیا نہیں جائیں گے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔

"یہ ہمیں معلوم ہے۔ ہمارے ایک سیکرٹ سروس کے آدمی نے ان کی

تصویریں بھی اتار لی تھیں جو ہمارے سیکرٹ آفس میں موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں ان کو اتنی اجازت دینی پڑے گی کہ یہ ایک دو جگہوں پر بم کے دھماکے اور فائرنگ کر دیں؟"

میں نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ ہم جان بوجھ کر اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہا سکتے۔ ان دونوں کا چارج بھارتی سفارت کار پرکاش کھنہ نے لے لیا ہے۔ وہی ان سے لاہور اور کسی دوسرے شہر میں دھماکے اور فائرنگ کرائے گا لیکن میں پہلے آپ کو بتا دوں گا کہ یہ لوگ کس جگہ واردات کرنے والے ہیں۔ آپ کی پولیس کو سفید کپڑوں میں پہلے سے وہاں موجود ہونا چاہئے تاکہ جیسے ہی وہ موقع واردات پر نمودار ہوں ان کو یا تو گرفتار کر لیا جائے یا گولیاں مار کر اڑا دیا جائے۔ کیا آپ کی پولیس انہیں پہچان لے گی؟"

بٹ صاحب کہنے لگے۔

"ہم وہاں وہ آدمی ساتھ رکھیں گے جنہوں نے ان دونوں بھارتی دہشت گردوں کی لاہور سٹیشن پر تصویریں اتاری تھیں۔ ویسے باقی کے سپاہیوں کو بھی ان کی تصویریں دکھا دی جائیں گی لیکن ہمیں وقت سے تھوڑا سا پہلے یہ ضرور معلوم ہو جانا چاہئے کہ یہ لوگ کس جگہ واردات کرنے والے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ میں آپ کو چھ گھنٹے پہلے بتا دوں گا۔ اس کی فکر نہ کریں۔ اب مسئلہ باقی رہ جاتا ہے ست پرکاش، گووندا اور موتی رام دہشت گردوں کا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ ڈراما کیا جائے۔ ایسا کھیل کھیلا جائے کہ میں انہیں رات کے وقت جیل سے بھگا لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں اور شہر کی کسی خالی جگہ پر آ کر پولیس ہمیں گھیرے میں لے کر فائر کھول دے اور یوں ان تینوں کو ہلاک کر دیا جائے اور ظاہر یہ ہو کہ یہ تینوں فرار ہو رہے تھے کہ پولیس کی گولیوں کا شکار ہو

گیئے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔

"ایسا انتظام ہو سکتا ہے۔ تم ہمیں بتا دو کہ کس رات ان لوگوں کو جیل سے نکالنا ہے۔ ہم اس رات تمہیں اور تمہارے آدمی کو جیل میں داخل ہونے کا موقع دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ یہ سارا منصوبہ سوچ کر میں اگلے ہفتے آپ کو بتا دوں گا۔ پھر اس ڈرامے کو شروع کرنے کی تاریخ اور وقت طے کرلیں گے۔"

یہ ساری باتیں کرنے کے بعد میں بٹ صاحب کے آفس سے نکل کر سیدھا لاہور ایئر پورٹ پر واپس آگیا۔ واپس اسلام آباد جانے والی جس فلائیٹ پر میری سیٹ ریزو تھی اس میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ یہ وقت میں نے ایئر پورٹ کے کیفٹیں کے کونے میں چائے وغیرہ پیتے ہوئے گذار دیا۔ فلائیٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو میں نیچے لاؤنج میں آگیا۔ ٹھیک وقت پر جہاز لاہور سے ٹیک آف کرگیا۔ اسلام آباد ایئر پورٹ کے باہر شیلا گاڑی لے کر آئی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسی فلائیٹ سے میری واپسی ہوگی۔ میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ شیلا نے راستے میں مجھ سے تینوں بھارتی دہشت گردوں کے بارے میں پوچھا کہ ان کے فرار کی کوئی صورت نکلی ہے یا نہیں؟ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"سارا انتظام ہوگیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر مسکرانے لگی۔

رات کو ہمارے ہاں کوئی پارٹی نہیں تھی۔ میں نے بھارتی سفارت کار پرکاش کھنہ کو اپنے ہاں بلایا۔ وہ آدھی رات کے بعد عام مزدوروں کے بھیس میں ہماری کوٹھی پہنچ گیا۔ میں نے اسے ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر سنا ڈالی کو میں نے

لا صرف میں یہی معلوم ہی نہیں کیا کہ ست پرکاش گووندا اور موتی رام کہاں قید
ہیں بلکہ ان کے فرار کا پورا پورا بندوبست بھی کر کے آیا ہوں۔
پرکاش کھنہ خوش ہوا۔ کہنے لگا۔
"یہ تینوں پولیس نے کہاں پر قید میں رکھے ہوئے ہیں؟"
میں نے کہا۔
"اس وقت یہ تینوں لاہور شہر سے باہر ایک پرانی کوٹھی کے تہہ خانے میں
بند ہیں۔ انہیں پندرہ روز کے بعد لاہور قلعے میں منتقل کر دیا جائے گا۔ لاہور قلعے
سے انہیں نکالنا تقریباً" ناممکن ہے۔ چنانچہ میں نے دو آدمیوں کو روپوں کا لالچ دے
کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ یہ دونوں آدمی اس پرانی کوٹھی میں کام کرتے ہیں۔ ایک
باورچی ہے دوسرا مالی ہے۔ دونوں رات کو اسی کوٹھی کے کوارٹر میں سوتے ہیں۔
وہاں پولیس کی مسلح گارد ضرور موجود ہوتی ہے مگر رات کو صرف چار سپاہی پہرے پر
ہوتے ہیں۔ دو سپاہی کوٹھے کے ارد گرد گشت لگا کر پہرہ دیتے ہیں اور دو سپاہی اس
تہہ خانے کے بند دروازے پر ڈیوٹی پر ہوتے ہیں جہاں ہمارے آدمی بند ہیں۔"
"یہ مالی اور باورچی مسلمان ہیں؟"
پرکاش کھنہ نے پوچھا۔
میں نے کہا۔
"ظاہر ہے وہ مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں مگر میں نے انہیں روپوں کا لالچ
دے کر راضی کر لیا ہے۔"
پرکاش کھنہ کہنے لگا۔
"یہ فرار کا آپریشن جلدی شروع ہو جانا چاہئے۔"
میں نے کہا۔
"لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کانتی اور رام راج دو تین جگہوں پر
دہشت گردی کی وارداتیں کر ڈالیں تاکہ پولیس اس طرف متوجہ ہو جائے۔"

پرکاش نے کہا۔

"یہ کام پرسوں ہی ہو جائے گا۔ کانتی اور رام راج تو بالکل تیار بیٹھے ہیں۔"

"اس بار تمہارا پروگرام کیا ہوگا؟"

یہ سوال بڑا اہم تھا۔ پرکاش کھنہ کہنے لگا۔

"میں چونکہ اس بارے میں سارے کام کو خود کروا رہا ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ بیک وقت دونوں وارداتیں اکٹھی ہوں۔ میرا پروگرام لاہور کی بادشاہی مسجد میں جمعے کی نماز کے وقت بم دھماکہ کرانے اور اندھا دھند فائرنگ کرانے کا ہے۔"

میں نے کہا۔

"وہاں ان لوگوں کے پکڑے جانے کا خطرہ موجود ہوگا۔"

پرکاش کھنہ بولا۔

"یہ واردات اس وقت کی جائے گی جب مسلمان نماز پڑھ رہے ہوں گے۔"

میں نے پیش بندی کے طور پر کہا۔

"دیکھ لینا' کچھ ہو گیا تو تم ذمے دار ہو گے۔"

پرکاش کھنہ کو اپنی ہوشیاری اور تجربے کاری پر بڑا گھمنڈ تھا' کہنے لگا۔

"تم دیکھ لینا۔ ایسا کامیاب اٹیک ہوگا کہ کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو نمازی خاک و خون میں تڑپ رہے ہوں گے اور اپنے آدمی بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ جگہ بھی میرے ذہن میں ہے جہاں چھپ کر یہ لوگ بم پھینکیں گے اور کلاشنکوف سے اندھا دھند فائرنگ کریں گے۔"

معلوم ہوا کہ اس بار پرکاش کھنہ دہشت گردوں کو ایک ایسا طاقتور بم دے رہا تھا جو پندرہ سولہ دستی بموں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور پھینکنے سے پہلے جس کا

ایک پن کھینچنے کی ضرورت تھی۔ پھینکنے کے پانچ سیکنڈ بعد اس نے قیامت خیز دھماکہ کے ساتھ پھٹ کر وہاں تباہی پھیلا دینی تھی۔ میں نے کہا۔

"ان دونوں کی نگرانی کون کرے گا؟ کیونکہ اس بار تم انچارج ہو۔ میں وہاں پر نہیں ہوں گا۔"

پرکاش کھنہ بولا۔

"میں خود ان کی نگرانی کر رہا ہوں گا۔ تم دیکھ لو گے کہ اس واردات کے بعد سارے پاکستان میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ جائے گی اور حکومت کے تمام ترقیاتی منصوبے رک جائیں گے۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ہر وقت دہشت اور سراسیمگی کی فضا قائم رہے اور پاکستان کے ترقیاتی کام رک جائیں۔"

میں نے دل میں کہا۔

"یہ تو پھر نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے اس بار تم بھی ان دہشت گردوں کے ساتھ رگڑے جاؤ۔"

لیکن میں ابھی پرکاش کھنہ کو مروانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے دوسرے تین بھارتی دہشت گردوں کے فرار کے ڈرامے میں میرے عینی گواہ کا کردار انجام دینا تھا۔ تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ میں نے تینوں آدمیوں کو فرار کروا دیا تھا لیکن عین وقت پر کسی وجہ سے پولیس کی گارد ہوشیار ہو گئی اور اس نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ گولیاں چلنے لگیں اور تینوں آدمی مارے گئے۔

اس آپریشن سے پہلے بادشاہی مسجد والے آپریشن کا وقت اور دن طے ہو لیا اور پرکاش کھنہ نے جمعرات کی رات کو ہی دونوں بھارتی دہشت گردوں کو ہور روانہ کر دیا۔ خود صبح کی فلائیٹ سے لاہور پہنچا۔ میں نے اسی رات اور خفیہ لیس کے سپیشل آفیسر بٹ صاحب کو فون پر خبر کر دی کہ بھارتی سفارت کار دونوں رتی دہشت گردوں کو لے کر یہاں سے چل پڑا ہے۔ جمعے کی نماز کے وقت دونوں

دہشت گردوں نے جس جگہ پر پہنچ کر بم پھینکنا اور فائرنگ کرنی تھی میں نے وہ جگہ بھی بٹ صاحب کو بتا دی اور کہا کہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ بھارتی سفارت کار پرکاش کھنہ کو نہ تو گولی لگے اور نہ ہی گرفتار کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بعد دوسرے آپریشن میں میں نے اسے فرار کے ناکام ڈرامے کا عینی گواہ بنانا ہے۔

بٹ صاحب نے کہا۔

"فکر نہ کرو حیدر علی! تم نے جیسا کہا ہے ویسے ہی ہوگا۔ دونوں بھارتی دہشت گرد زندہ نہیں بچیں گے اور بھارتی سفارت کار کو ہم نکل جانے دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"تینوں بھارتیوں کی شناخت اچھی طرح سے ہونی چاہئے۔"

بٹ صاحب نے جواب دیا۔

"ہم نے ان کی تصویریں بڑی کر کے اپنے آدمیوں کو دکھا دی ہوئی ہیں جمعے کے دن ایک بار پھر دکھا دیں گے اور آپریشن کے بعد تمہیں فون پر پوری رپورٹ دوں گا۔"

اس کے بعد ہم نے فون بند کر دئے۔

میں فون اپنے دفتر کے تہہ خانے میں جا کر کیا کرتا تھا اور اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ اس وقت شیلا آس پاس نہ ہو۔ وہ دن گزر گیا۔ جمعے کی صبح پرکاش کھنہ پہلی فلائیٹ پر لاہور روانہ ہو گیا۔ میں اس روز دفتر میں ہی رہا۔ کہیں باہر نہ گیا۔ ویسے بھی جمعے کی چھٹی تھی۔ دفتر بند تھا۔ میں اندر کام کا بہانہ بنا کر گیا تھا۔ شیلا اپنی ایک سہیلی کے ہاں چلی گئی تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا وہیں کھانا تھا۔ مسلمان بیگم کے روپ میں اس نے اسلام آباد میں کئی ایک گھرانوں میں واقفیت پیدا کرلی ہوئی تھی۔

میری نگاہیں بار بار دیوار پر لگے کلاک کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جمعے نماز کا وقت جیسے جیسے قریب آ رہا تھا میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو رہا تھا۔

دعائیں مانگتا کہ پولیس بھارتی دہشت گردوں کو شناخت کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس کو خبر ہی نہ ہو اور دہشت گرد معصوم نمازیوں پر بم پھینکنے اور فائرنگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگرچہ ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے بٹ صاحب کو مسجد کے مشرق کی جانب دیوار کے اوپر وہ جگہ بتا دی تھی جہاں دہشت گردوں نے چھپ کر واردات کا ارتکاب کرنا تھا۔ میں نے ریڈیو پر لاہور کا سٹیشن لگایا لیکن جمعے کی نماز کی وجہ سے ریڈیو پروگرام نہیں ہو رہے تھے۔ شاید ڈیڑھ گھنٹے کا نماز جمعہ کا وقفہ ہوتا تھا۔

میں نیچے تہہ خانے میں اپنے خفیہ ٹیلی فون کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے حساب سے جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ پھر یہ وقت بھی گزر گیا۔ میں نے لاہور ریڈیو لگایا۔ وہاں خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ خبروں میں بتایا گیا کہ آج جمعہ کی نماز کے بعد کچھ دہشت گردوں نے مسجد میں بم پھینکنے کی کوشش کی جسے پولیس نے ناکام بنا دیا اور دہشت گردوں کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا۔ معلوم ہوا ہے کہ دونوں دہشت گردوں کا تعلق بھارت سے ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن دہشت گردوں کے زندہ بچ جانے کا مجھے سخت افسوس تھا۔ انہیں زندہ نہیں بچنا چاہئے تھا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جلدی سے رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"آپریشن کامیاب رہا۔"

میں نے فوراً" کہا۔

"لیکن ریڈیو نے خبر دی ہے کہ دہشت گردوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ انہیں ہلاک کیوں نہیں کیا گیا۔"

بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"ریڈیو پر ابھی مصلحتاً" یہ خبر نہیں دی گئی ویسے ہم نے دونوں بھارتی دہشت گردوں کو ہلاک کر دیا ہے اور ان کی لاشیں اس وقت ہسپتال میں پوسٹ

مارٹم کے لئے پڑی ہیں۔ بھارتی سفارت کار کو تمہارے کہنے کے مطابق ہم نے کچھ نہیں کہا اور اسے نکل جانے دیا ہے۔"

میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"یہ میرے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ اب اگلے آپریشن کی تیاری ابھی سے شروع ہو جانی چاہئے۔ اس سلسلے میں میں پرسوں ساری بات طے کر دوں گا۔"

میں نے رسیور رکھ دیا۔

بھارتی دہشت گردوں کی ہلاکت کی خبر نے میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دشمن اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا اور بے گناہ نمازیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ شیلا کو دہشت گردی کے اس آپریشن کی خبر تھی۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ بھارت کے دو دہشت گرد لاہور میں موقع پر پکڑے گئے ہیں تو وہ پریشان ہو کر میرے پاس آئی اور کہا۔

"دھرم چند جی! یہ سب کیسے ہو گیا۔"

میں نے کہا۔

"پرکاش کھنہ سے پوچھنا کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہی اس آپریشن کا انچارج تھا۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ ناتجربہ کار آدمی ہے ہمارا نقصان کروائے گا۔ اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔"

پرکاش کھنہ اسلام آباد واپس آیا تو سخت نادم اور پریشان تھا۔ اپنے آدمیوں کی موت اور آپریشن کی ناکامی کا وہی ذمے دار تھا۔ ہماری چال کامیاب رہی تھی۔ سانپ بھی مر گیا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ بھارتی دفتر خارجہ نے بیک وقت دو بھارتی دہشت گردوں کی موت کا سختی سے نوٹس لیا۔ پرکاش کھنہ کی نہ صرف جواب طلبی ہوئی بلکہ پرکاش کھنہ مجھے کہنے لگا۔

"دھرم چند! میری پرسنل فائیل پر یہ جو بدنامی کا داغ پڑ گیا ہے اب یہ اسی

صورت میں صاف ہو سکتا ہے کہ میں جتنی جلدی ہو سکے ست پرکاش' موتی رام اور گووندا کو پاکستانی پولیس کے قبضے سے کامیابی کے ساتھ فرار کروا دوں۔"

وہ ایک بار پھر ہمارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس رہا تھا۔ میں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ تمہارا ریکارڈ اس طرح صاف ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے تینوں زیر حراست آدمیوں کو فرار کروا کر باڈر پار پہنچا دیں۔ یہی ایک کارنامہ اب تمہاری بدنامی کے داغ کو دھو سکتا ہے۔"

پرکاش کھنہ بڑی عاجزی سے بولا۔

"دھرم چند! تم میرے دھرمی بھائی ہو میری مدد کرو۔"

میں نے کہا۔

"سارا منصوبہ تیار ہے۔ جس جگہ ہمارے آدمیوں کو قید میں رکھا گیا ہے وہاں کے باورچی اور مالی کو میں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ میری طرف سے کل رات کو ہی آپریشن شروع کر دیتے ہیں۔"

پرکاش کھنہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھگوان تجھے خوش رکھے۔ میں تیار ہوں۔"

رات کو میں نے لاہور بٹ صاحب کو ٹیلی فون پر یہ خفیہ پیغام پہنچا دیا کہ کل رات کو فرار کا ڈرامہ رچایا جائے گا۔ پرکاش کھنہ کافی حد تک مطمئن ہو کر گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ آپریشن اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والا ہے۔

ہم دونوں اس روز شام کی فلائیٹ سے لاہور پہنچ گئے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم شہر کے شمالی علاقے کے ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے۔ میں نے پرکاش کھنہ سے کہا۔

"تم ہوٹل میں ہی ٹھہرو۔ میں مالی اور باورچی سے جا کر ملاقات کرتا ہوں تاکہ رات کے بارہ بجے کے بعد وہ ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں کو نشہ آور چائے پلا دیں

اور اس کے بعد تہہ خانے کا تالا کھول دیں۔"

پرکاش کہنے لگا۔

"یہ باورچی اور مالی اس کام کے لئے کیسے تیار ہو گئے۔ کیا انہیں معلو
نہیں کہ قیدیوں کے فرار کے بعد جب سپاہیوں کو ہوش آ جائے گا تو ان کا راز فاش
ہو جائے گا کہ انہوں نے ہی سپاہیوں کو چائے میں بے ہوشی کی دوائی پلائی تھی۔

میں نے کہا۔

"اس کا علاج بھی انہوں نے سوچ رکھا ہے۔ دونوں باورچی اور مالی خو
بھی بے ہوشی والی چائے پی کر بے ہوش ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان پر کوئی شک نہیں
کرے گا۔ یہی سوچا جائے گا کہ چائے میں کوئی کیڑا مکوڑا گر گیا تھا جس کی وجہ سے
چائے کا اثر زہریلا ہو گیا اور سپاہیوں کے ساتھ مالی اور باورچی بھی بے ہوش ہ
گئے۔"

پرکاش کھنہ کو یہ بات بہت پسند آئی اور وہ مطمئن ہو گیا۔ میں اسے ہوٹل
میں چھوڑ کر سیدھا بٹ صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں ساری صورت حال سے آگا
کیا۔ بٹ صاحب بولے۔

"سب معاملہ ٹھیک ہے۔ جس وقت تم لوگ تہہ خانے والی پرانی کوٹھ
کے احاطے میں داخل ہو گے تو تہہ خانے والے دروازے کے باہر ڈیوٹی پر موجو
دونوں سپاہی بے ہوش پڑے ہوں گے۔ یعنی بے ہوشی کی اداکاری کر رہے ہو
گے۔ باورچی دروازہ کھول کر ایک رات کھڑا ہو گا۔ اس کے بعد تم لوگ تہہ خا
میں جاؤ گے اور تینوں دہشت گردوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑو گے۔
تمہارے نکلنے کے دس سیکنڈ بعد خطرے کا الارم چیخ اٹھے گا۔ یہ اس بات کی علامت
ہو گا کہ پولیس کی جو مسلح گارد کوارٹر میں تھی اس کو کسی طرح سے قیدیوں کے فرا
کا علم ہو گیا ہے۔ مسلح پولیس تمہارا پیچھا کرے گی اور تعاقب کے دوران تم دونو
کو چھوڑ کر باقی تینوں دہشت گردوں کو نشانہ بنا کر فائرنگ کر کے ہلاک کر دے گی۔

اس کے بعد تم دونوں کو وہاں سے نکل جانے دیا جائے گا۔"

سکیم بڑی مناسب تھی۔ اس کے سوا کوئی دوسری سکیم قابل عمل بھی نہیں تھی۔ میں نے واپس ہوٹل میں آکر پرکاش کھنہ کو واردات کی پوری تفصیل سمجھا دی اور کہا۔

"مالی اور باورچی کو میں نے بے ہوشی کی دوائی پہلے سے لا کر دے دی ہوئی ہے۔ اس دوائی کا اثر ایک گھنٹے تک رہے گا۔ اتنی دیر میں ہم ست پرکاش گوونداا اور موتی رام کو لے کر بارڈر کی حدود سے نکل چکے ہوں گے۔"

واردات کے بعد لاہور شہر سے نکلنے کے لئے بھارتی سفارت خانے کے اس آدمی نے جو لاہور میں جاسوسی پر مامور تھا ایک جیپ تیار کر رکھی تھی جس کی ٹینکی فل کرا دی گئی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر یہ جیپ جائے واردات سے اتنے فاصلے پر رکھوائی تھی کہ پولیس کو تعاقب کے بعد دہشت گردوں کو ہلاک کرنے کا موقع اور ٹائم مل سکے۔ پروگرام یہ تھا کہ یہ جیپ ہمیں شہر سے دور بارڈر کی جانب ایک ویران بھٹے میں لے جائے گی جہاں تینوں دہشت گردوں کو چھپا دیا جائے گا۔ میں اور پرکاش کھنہ بھی وہیں چھپ جائیں گے۔ اور موقع پا کر تینوں دہشت گردوں کو باڈر پار کرا دیا جائے گا۔ ہم رات کے بارہ بجے تک ہوٹل میں ہی بیٹھے رہے۔ بھارتی سفارت خانے کا جاسوس جیپ لے کر پہنچ گیا تھا اور ہوٹل سے کچھ دور جیپ میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

رات بارہ بج کر پندرہ منٹ پر ہم ہوٹل سے نکل کر جیپ تک آئے۔ جیپ میں بیٹھے اور جائے واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈرامے کا سٹیج بالکل تیار تھا۔ پروگرام کے مطابق بٹ صاحب اور ملک صاحب پرانی کوٹھی کے کوارٹر میں مسلح گارد کے پاس تیار بیٹھے تھے۔ پولیس کی نفری چھ سپاہیوں پر مشتمل تھی جن کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں جن کے چیمبروں میں میگزین چڑھا دیئے گئے تھے۔ مجھے پکڑے جانے کا اندیشہ بالکل ہی نہیں تھا میں تو محض اداکاری کر رہا تھا۔ جیپ ہم نے

قید خانے والی پرانی کوٹھی سے کوئی ایک فرلانگ پیچھے سیم نالے کے پل کی دوسری طرف کھڑی کی تھی۔ بھارتی جاسوس ڈرائیور جیپ میں ہی بیٹھ گیا تھا اور اسے ہم نے ہدایت کر دی تھی کہ جب ہمیں دور سے دوڑ کر آتے ہوئے دیکھے تو فوراً" جیپ سٹارٹ کر دے۔

میں اور پرکاش کھنہ اندھیرے میں کچے راستے پر سے قدم اٹھاتے ہوئے پرانی کوٹھی کی عقبی دیوار کے پاس آ گئے۔ حالانکہ میں اسے کوئی ۔کے گیٹ کی طرف سے بھی اندر لے جا سکتا تھا مگر نقلی ڈرامے کو اصلی روپ دینے کے خیال سے میں پچھلی دیوار کی طرف آ گیا اور پرکاش کھنہ سے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہمیں دیوار کود کر دوسری طرف جانا ہو گا۔"

یہ پرانی دیوار بمشکل پانچ فٹ اونچی تھی۔ ہم بڑی آسانی سے اس پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ میں نے پرکاش کو بازو سے پکڑ کر وہیں بٹھا لیا اور آہستہ سے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے دیکھ لینے دو' سب کام ٹھیک طرح سے ہوا ہے۔"

کچھ فاصلے پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ یہ بلب تہہ خانے والے دروازے کے اوپر لگا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اور پرکاش کھنہ کو بھی دکھایا۔ تہہ خانے کے باہر دو سپاہی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ یہ سپاہی بھی بے ہوش ہو جانے کی اداکاری کر رہے تھے اور انہیں اس وقت تک بے ہوش ہی رہنا تھا جب تک کہ ہم تینوں دہشت گردوں کو تہہ خانے سے نکال کر وہاں سے فرار نہیں ہو جاتے۔ میں نے پرکاش کھنہ سے کہا۔

"آ جاؤ' میدان صاف ہے۔ دونوں ڈیوٹی گارڈ بے ہوش پڑے ہیں۔"

میں آگے آگے اور پرکاش کھنہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم جھک کر دبے پاؤں چلتے ہوئے بے ہوش سپاہیوں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں ہوش میں ہیں مگر وہ بڑے تجربہ کار اداکاروں کی طرح اس پوزیشن میں بے

ہوش پڑے تھے کہ جیسے چائے پینے کے بعد چکرا کر گر پڑے ہوں۔ چائے کی دو پیالیاں اور پلیٹیں بھی ان کے قریب ہی گری ہوئی تھیں۔

پرکاش کھنہ نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

"دھرم چند! انہیں ہوش تو نہیں آئے گا۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"انہیں دو گھنٹوں سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ بے فکر رہو۔ آگے بڑھو دروازہ کھلا ہے۔"

تہہ خانے کا دروازہ اپنی سکیم کے مطابق کھلا ہوا تھا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر تہہ خانے میں آگئے۔ تینوں دہشت گرد یعنی ست پرکاش' موتی رام اور گووندا ٹاٹ پر سو رہے تھے۔ تہہ خانے کی بتی جل رہی تھی۔ میں نے انہیں جگایا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے کہا۔

تینوں دہشت گرد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم انہیں لے کر تہہ خانے سے باہر نکلے تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر یونہی اداکاری کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا اور کہا۔

"آ جاؤ۔"

سکیم کے مطابق ہم پچھلی دیوار پھاند کر دوسری طرف کودے۔ میں نے دوسری طرف کودنے کے بعد کہا۔

"بھاگو۔"

جیسے ہی ہم نے دوڑنا شروع کیا۔ رات کی خاموشی میں الارم کی آواز گونجنے لگی۔ پرکاش کھنہ نے گھبرا کر کہا۔

"پولیس کو پتہ چل گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جہاں جیپ کھڑی ہے اس طرف چلو۔"

میں نے جان بوجھ کر تینوں دہشت گردوں کے درمیاں دوڑتے دوڑتے تھوڑا فاصلہ ڈال دیا۔ ابھی ہم کوٹھی کے احاطے سے پچاس ساٹھ قدموں کے فاصلے پر ہوں گے کہ پیچھے فائرنگ کے دھماکے ہوئے۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہم دوڑتے جارہے تھے۔ مجھے یہی فکر تھی کہ اس بھاگ دوڑ میں اپنی پولیس کا کہیں نشانہ نہ چوک جائے لیکن پولیس نے بھی کمال کر دکھایا۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے ٹھیک ٹھیک نشانوں پر گولیاں چلائیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ پولیس کے سپاہی ہماری دائیں جانب پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ جیسے ہی ہم ان کے قریب سے بھاگتے ہوئے گذرے انہوں نے پہلے ہوائی فائر کئے پھر قیدیوں کے لباس والے تینوں دہشت گردوں کو نشانے میں لے کر فائر کھول دیا۔

یہ کام تین سپاہیوں نے کیا۔ ہر سپاہی نے ایک ایک دہشت گرد کو نشانہ بنایا۔ تین فائروں کے دھماکے ہوئے اور میں نے دیکھا کہ آگے آگے دوڑتے ہوئے تینوں دہشت گرد ست پرکاش، گوونداا ور موتی رام اچھلے اور منہ کے بل گر پڑے۔ پرکاش کھنہ تو گھبراہٹ میں بھاگتا ہی چلا گیا۔ صرف میں بے فکر ہو کر سیم نالے کی طرف بھاگ رہا تھا جہاں اپنا آدمی جیپ لئے موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ فائرنگ کے دھماکوں کو سن کر وہ بھی بھاگ گیا ہو گا لیکن وہ موجود تھا اور اس نے جیپ کا انجن سٹارٹ کر دیا تھا۔ میں اور کھنہ دوڑ کر جیپ میں سوار ہو گئے اور جیپ فوراً ایک طرف کو تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ ہم پر فائر نہیں آئے گا مگر پرکاش کھنہ جیپ میں لیٹا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جیپ کچی سڑک پر سے نکل کر پکی سڑک پر آئی تو پرکاش کھنہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"دھرم چند! یہ کیا ہوگیا ہے۔ بہت برا ہوا۔ اپنے تینوں آدمی سورگباش ہو گئے ہوں گے۔"

میں نے بھی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔ میں نے انہیں اچھل اچھل کر گرتے دیکھا ہے - ہے

بھگوان۔"

"یہ سب کیسے ہوگیا؟ سپاہی تو بے ہوش پڑے تھے۔"

میں نے کہا۔

"یہ سپیشل گارڈ کے سپاہی ہوں گے۔ جن میں سے کوئی سپاہی اتفاق سے بارک سے باہر آگیا اور اس نے ہمیں قیدیوں سمیت بھاگتے دیکھ کر الارم بجا دیا اور سپیشل گارڈ کے سپاہیوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا اور فائر کھول دیا۔ ہماری قسمت اچھی تھی جو بچ گئے۔ گولیاں تو میرے قریب سے گذر رہی تھیں۔"

میں نے ایک بڑی گہری بناوٹی آہ بھری اور اپنا سر پکڑ کر کہا۔

"اپنے تینوں ساتھیوں کے اس طرح مرنے کا دکھ میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔"

پرکاش کھنہ بھی چہرہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ تو پہلے ہی بھارتی وزارت خارجہ کے عتاب کی زد میں تھا۔ رہی سہی کسر اس واردات نے پوری کر دی۔ چنانچہ جب اس سانحے کی رپورٹ دلی را کے ہیڈ آفس میں پہنچی تو پرکاش کھنہ کو اسی وقت اسلام آباد کے بھارتی سفارت خانے سے واپس بلا لیا گیا۔ مجھے بالا جی کا خفیہ پیغام ملا کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً" بمبئی آکر رپورٹ کرو۔ میں نے شیلا سے کہا۔

"مجھے بالا جی نے بمبئی بلایا ہے۔ یہاں سب کو یہی کہنا کہ میں کاروباری سلسلے میں لندن گیا ہوں۔"

میں نے بٹ صاحب اور ملک صاحب دونوں کو اپنے بمبئی جانے کی خبر کر دی اور انہیں ایک بار پھر تاکید کی کہ اصلی دھرم چند کی کڑی نگرانی کی جائے۔ اگر وہ فرار ہونے میں یا کسی صورت بھارتی سفارت خانے کو یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوگیا کہ میں زندہ ہوں اور فلاں جگہ قید پڑا ہوں تو نہ صرف یہ کہ میری جان خطرے مں ہوگی بلکہ ہمارا مشن ادھورا رہ جائے گا۔

میں اسلام آباد سے سیدھا شارجہ گیا۔ وہاں سے انڈین پاسپورٹ پر دھرم

چند کے نام سے بمبئی پرواز کر گیا۔ بمبئی میں شیو سینا کے ہیڈ آفس والے اپنے کمرے میں بالا جی میرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر برس پڑا۔

"تم لوگ حرام کی کمائی کھا رہے ہو۔ تم نہ اچھے دیش بھگت ہو نہ اچھے ورکر ہو۔ تم لوگوں نے پاکستان میں شیو سینا کو نقصان پہنچانے اور بھارت کو بدنام کرنے کے سوا ابھی تک کوئی کام نہیں کیا۔ پرکاش کھنہ تم سے بھی زیادہ احمق ثابت ہوا ہے۔ اسے تو حکومت نے بال ٹھاکرے کے کہنے پر کھڈے لائن لگا دیا ہے۔ تم ہمارے تجربہ کار آدمی ہو۔ تمہارے ہوتے ہوئے پاکستان میں ہمارے آدمی مرتے چلے جائیں یہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تو بالا جی نے مجھے جھاڑ کر خاموش کر دیا اور کہا۔

"یہ بیان ٹھاکرے جی کے آگے دینا۔ آج رات تمہاری ٹھاکرے جی کے سامنے پیشی ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ چلو آج دشمن اسلام ٹھاکرے کو بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ میں نے ابھی تک شیو سینا کے دفتروں اور کبھی کبھار اخبار میں اس کی تصویریں ہی دیکھی تھیں۔ اس کے بارے میں سن بہت کچھ رکھا تھا۔ مثلاً اس کا یہ بیان بھی پڑھا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بھارت کے سارے مسلمانوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگر کوئی مسلمان اس کے پاس شکایت لے کر جاتا کہ محلے کے ہندو مجھے تنگ کر رہے ہیں اور مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں تو بال ٹھاکرے اسے صاف کہہ دیتا تھا۔

"تم لوگوں نے پاکستان کے نعرے کس لئے لگائے تھے۔ جاؤ' تمہارا پاکستان بن گیا ہے۔ پاکستان بھاگ جاؤ۔ یہاں کیا لینے بیٹھے ہو۔ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔"

اور وہ غریب اور ہندوؤں کے ہاتھوں ستائے ہوئے مسلمانوں کو دھتکار کر

باہر نکال دیتا تھا۔ یہ شخص مسلمانوں کا جانی دشمن اور کٹر فرقہ پرست ہندو تھا اور شیوا جی مرہٹے کو اپنا ہیرو اور گورو مانتا تھا۔ وہ شیو سینا جماعت کا لیڈر تھا۔ وہ خود کو اقتدار کی سیاست سے دور رکھے ہوئے تھا مگر اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی مہاراشٹر کا وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتا تھا - صوبے میں اصل میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ سے لے کر صوبائی اسمبلی کے تمام ممبران اس کے آگے ماتھے ٹیکنے کو فخر کی بات سمجھتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کر سکے۔ اس کا ایک ہی بیٹا ٹھاکرے جونیئر تھا۔ جو صوبائی وزیر تھا اور ناجائز ذرائع سے کروڑوں کی دولت جمع کر چکا تھا اور جمع کر رہا تھا۔ اس کی کوٹھی کے خفیہ تہہ خانے میں ہر رات شراب و رقص کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ جہاں بمبئی کی نامور ایکٹرسیں چھپ کر آتی اور راتیں بسر کرتی تھیں۔ یہ ساری باتیں مجھے شیو سینا ہیڈ آفس کے ایک کلرک نے بتائی تھیں اور یہ باتیں مہاراشٹر کے بچے بچے کو معلوم تھیں مگر کوئی کسی کے آگے زبان نہیں کھولتا تھا۔ کیونکہ بال ٹھاکرے کے باڈی گارڈ اور اس کی سینا کے خاص گروپ کے آدمی بال ٹھاکرے کے اشارے پر کسی کو بھی قتل کر دیتے تھے اور ان کے خلاف مقدمہ درج کرتے ہوئے مہاراشٹر کی پولیس بھی ڈرتی تھی۔ ایک طرح سے بال کرشن ٹھاکرے مہاراشٹر صوبے کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

بمبئی میں اس روز موسم ابر آلودہ تھا اور ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی۔
بالا جی اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجھے بال ٹھاکرے کے بنگلے پر لے گیا۔ چھوٹا سا بڑا عالی شان بنگلہ تھا۔ گیٹ پر پولیس کا پہرہ موجود تھا۔ برآمدے میں بال ٹھاکرے کے مسلح باڈی گارڈ کھڑے تھے۔ اندر جانے سے پہلے میری تلاشی لی گئی۔ میں نے دیکھا کہ برآمدے کے سامنے باغیچے میں شیوا جی مرہٹہ کا گھڑے والا بت لگا ہوا تھا۔ بتیاں خوب روشن تھیں۔ ایک راہ داری میں سے گزر کر ہم ایک کمرے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں ایک مسلح باڈی گارڈ ہاتھ میں سٹین گن لئے کھڑا تھا۔ اس نے بالا جی کو سلام کیا مگر مجھے وہیں روک لیا اور چھوٹے سے واکی ٹاکی پر باہر کے آدمیوں سے میرے بارے میں مرہٹی زبان میں کچھ پوچھا۔ باہر والوں نے سب ٹھیک ہے کا اشارہ دیا تو اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔
بالا جی مجھ سے پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ یہ میرے دشمن دین اور مسلمانوں سے شدید ترین نفرت کرنے والے متعصب ترین مرہٹے بال ٹھاکرے سے پہلی ملاقات تھی۔ کمرے میں صوفے لگے تھے۔ دیوار پر صرف شیوا جی مرہٹے کی قد آدم تصویر لگی تھی۔ باوردی مرہٹے ملازم نے بالا جی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور مرہٹی زبان میں دو تین باتیں کیں اور پھر دوسرے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اندر چلا گیا۔ بالا جی نے مجھے کہا۔
"بال ٹھاکرے جی بڑے مصروف لیڈر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا ہوا تھا مگر پھر بھی ان کی اجازت کے بغیر ہم ان کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

تھوڑی دیر بعد نوکر نے واپس آکر کہا۔

"گورودیو نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

بالا جی نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں صوفے پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور
سرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ دوسرا کمرہ بھارت کے وزیر اعظم کا
رہ لگتا تھا۔ گولڈن باڈر والے بھاری زعفرانی رنگ کے صوفے دیوار کے ساتھ
تھ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں گلٹ کے فریم والی شیشے کی لمبی سی ٹیبل تھی۔
ں پر چینی کے گلدان میں پلاسٹک کے کنول کے پھول سجے ہوئے تھے۔ فرش قیمتی
لین سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیواروں پر مخمل کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ اے سی چل
ہا تھا۔ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ کارنس پر کالی ماتا کے بت کے آگے پیتل کی تھالی میں لوبان
ک رہا تھا۔ کونے میں ایک بہت عالی شان اکیلی سیٹ والا صوفہ رکھا تھا۔ جس کے
گے چھوٹی سی شیشے کی میز لگی ہوئی تھی۔ صوفے کے پہلو میں بھی شیوا جی مرہٹہ کا
ہوڑے والا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ بال ٹھاکرے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ بالا جی نے
ھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بڑے صوفے کے سامنے ایک طرف ہو کر صوفے پر
ھ گئے۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ کسی کسی وقت باہر سڑک سے بس یا گاڑی
ے گذرنے کی ہلکی آواز آ جاتی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک دراز قد کا
ہرے بدن اور گہری سانولی رنگت والا آدمی زعفرانی کلر کے سلک کے کرتے
جامے میں ملبوس کندھوں پر ڈالی ہوئی زعفرانی کلر کی ریشمی چادر سنبھالتا ہوا کمرے
ں داخل ہوا۔ ہم ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ بھارت کا فرعون' مسلمانوں کا دشمن' صوبہ مہاراشٹر کے سیاہ و سفید کا
لک اور انتہا پسند ہندو جماعت شیو سینا کا سربراہ بال ٹھاکرے تھا۔ اس کے گلے میں
سرخ سفید اور سبز موتیوں کی تین چار مالائیں تھیں۔ پاؤں میں کولہا پوری چپل
ھی۔ عمر درمیانی تھی۔ سر کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر سب سے
نمایاں اس کی آنکھیں تھیں جن میں مقناطیسی کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس نے

ہمارے نمسکار کا جواب ہاتھ جوڑ کر بالکل نہ دیا۔ بس ہاتھ سے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی شیوا جی مرہٹہ کے مجسمے کے قریب والے اکیلے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے چمکیلے سیاہ بال گردن تک آئے ہوئے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے بالوں کی ایک لٹ کو مروڑ رہا تھا اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بالا جی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"گورو دیو! یہ دھرم چند ہے۔ شیو سینا کا بڑا پرانا اور تجربہ کار کرم چاری ہے۔"

بال ٹھاکرے میری طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ گردن ہلا رہا تھا۔ جب بالا جی تعارف کرا چکا تو بال ٹھاکرے نے مجھ سے پوچھا۔

"کتنے پاکستانی مسلمانوں کو مار چکے ہو؟"

اسکی آواز بھاری اور رعب دار تھی۔ آواز میں بھرپور اعتماد تھا۔ میں نے کہا۔

"گورو دیو! اتنے مسلمان مارے ہیں کہ ان کی گنتی ٹھیک سے یاد نہیں۔"

اس نے دوسرا سوال کیا۔

"لیکن یہ جو پاکستان میں ہمارے آدمی مارے گئے ہیں ان کا کون حساب دے گا؟"

میں کچھ گھبرا سا گیا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"گورو دیو! یہ لوگ ناتجربہ کار تھے۔ صرف اپنی بیوقوفی کی وجہ کے مارے گئے یا پھر بھاگتے ہوئے پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔"

"تم نے انہیں سمجھایا نہیں تھا کہ ایسی حماقت نہیں کرنی؟"

بال ٹھاکرے نے ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔

"گورو دیو! ہم اپنے آدمیوں کو بہت کچھ سمجھا کر بھیجتے ہیں اور دور رہ کر

ن کی نگرانی بھی کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی آدمی حماقت کر بیٹھتا ہے۔"
یہاں میرے موقف کو آگے بڑھاتے ہوئے بالا جی نے کہا۔
"سینا پتی جی! آئندہ سے ہم نے ٹریننگ بڑی سخت کر دی ہے۔ انسٹرکٹر بھی بدل دیئے ہیں۔ اب ایسے آدمی ٹرینڈ ہو کر پاکستان دھماکے کرنے جائیں گے کہ جن کے پکڑے جانے یا مارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔"
بال ٹھاکرے صوفے میں دھنسا دونوں لمبے بازو صوفے کے بازوؤں پر رکھے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک ملازم ہاتھ میں ٹرے لئے دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا طشت تھا۔ طشت میں بیئر کی ایک بوتل' بلور کا ایک گلاس' چاندی کا ایک سگریٹ کیس اور سرخ رنگ کا لائٹر رکھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے آرام سے بال ٹھاکرے کے بازو والی میز پر طشت رکھ دیا۔ بڑا آرم سے بیئر کی بوتل کھول کر گلاس کو ٹیڑھا کر کے اس میں اس طرح بیئر ڈالی کہ جھاگ زیادہ نہ بنے۔ گلاس کو سفید رومال سے صاف کر کے ٹرے میں رکھا اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ بالا جی کہہ رہا تھا۔
"ہم پاکستان میں اپنے آدمی بھی زیادہ بھیجیں گے۔"
بال ٹھاکرے نے بیئر کا ایک گھونٹ پی کر چاندی کے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔
"مجھے ست پرکاش' گوونداا اور موتی رام کے ہلاک ہونے کا بہت افسوس ہے۔ وہ ہماری سینا کے بڑے قیمتی آدمی تھے۔"
میں نے دبی زبان میں کہا۔
"گورو دیو! وہ تو عین وقت پر پولیس کو پتہ چل گیا ورنہ ہم تو انہیں قید سے فرار کرا چکے تھے۔"
بال ٹھاکرے نے بالا جی سے مخاطب ہو کر کہا۔
"پرکاش کمنہ کسی کام کا آدمی ثابت نہیں ہوا۔"

بالا جی نے کہا۔

"اسے دلی گورنمنٹ نے واپس بلا لیا ہے۔"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"انہوں نے میرے کہنے پر اسے واپس بلایا ہے۔ ہمیں ایسے آدمی چاہئیں جو پاکستان میں رہ کر بہترین کارکروگی کا مظاہرہ کریں اور وہاں مسلمانوں کو ہلاک کرنے اور دہشت پھیلانے میں ہمارے آدمیوں کی مدد کریں۔ یہ پرکاش کھنہ تو بیکار آدمی تھا۔"

بال ٹھاکرے ساتھ ساتھ بیئر کے گھونٹ بھی پیتا جاتا تھا۔ بالا جی کی زبانی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بال ٹھاکرے شام کو بیئر ضرور پیتا ہے۔

بالا جی نے کہا۔

"اب ہمارا پروگرام پاکستان کے صوبہ سندھ میں بم کے دھماکے اور فائرنگ سے لوگوں کو ہلاک کرنے کا ہے۔ ہم پہلے اردو بولنے والوں کو اور پھر پنجابیوں اور پٹھانوں کو نشانہ بنائیں گے تاکہ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف ہو جائیں۔"

بال ٹھاکرے نے بیئر کا گلاس ختم کر کے دوسرا گلاس بناتے ہوئے بالا جی سے کہا۔

"بالا جی! یہ کام تو تم ضرور کرو مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

بالا جی خاموش ہو گیا۔ وہ بال ٹھاکرے کی طرف دیکھنے لگا۔

میں بھی خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کا قاتل کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے دماغ میں مسلمانوں کے قتل عام کی کوئی نئی سکیم آئی ہو گی۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ بال ٹھاکرے نے بیئر کے دو گھونٹ پی کر گلاس رکھ دیا۔ سگریٹ کیس میں سے نیا سگریٹ نکال کر سلگایا اور بالا جی کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔

"بالا جی! تم نے اس بات پر کبھی غور کیا ہے کہ صوبہ گجرات کے ہیرے

تراشنے اور ڈائینگ پروسیس کے کاروبار پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ میں نے پورے فیکٹ اینڈ فگرز تیار کروائے ہیں۔ ان کے مطابق یہ کام سوراشٹر کے تین لاکھ مسلمان کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد اڑیسہ، آندھیرا پردیش اور اتر پردیش کے مسلمانوں کی ہے۔ جو سورت میں آ کر آباد ہو گئے ہوئے ہیں۔"

بالا جی نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے گورو دیو! مگر اس کا اپائے کیا ہو سکتا ہے۔"

بال ٹھاکرے نے گھٹنوں پر زعفرانی چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"اپائے ایک ہی ہے۔ جس پر شیوا جی مرہٹہ نے عمل کیا تھا یعنی مسلمانوں کو مہاراشٹر سے نکال دو یا انہیں کاٹ کر پھینک دو۔ ان کے مکانوں کو آگ لگا دو۔ ان کی عورتوں کو اٹھا کر لے جاؤ۔ اس کے بعد وہی ہو گا جو ہم چاہتے ہیں۔ ہیرے تراشنے اور ڈائینگ پروسیس پر کے کاروبار پر ہندوؤں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

بال ٹھاکرے کی یہ باتیں سن کر میرا خون کھولنے لگا۔ یہ شخص اس سے پہلے بھی صوبہ گجرات اور بھاگل پور وغیرہ میں ہندو مسلم فساد کروا چکا تھا۔ جہاں ہندوؤں نے پولیس کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے گھروں کے گھر جلا دیئے تھے اور مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اب یہ نمرود سورت کے مسلمانوں پر بجلی بن کر گرنے والا تھا۔ سورت کے ان امن پسند مسلمانوں کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ سال ہا سال سے ہیرے تراشنے کا اپنا آبائی کام کر رہے تھے اور کپڑوں کی رنگائی میں انہوں نے اپنے بعض فارمولوں کی وجہ سے سارے بھارت میں منفرد مقام بنایا ہوا تھا۔ یہ مسلمان شب و روز محنت سے کام کرتے تھے اور بھارت کی حکومت کو باقاعدہ ٹیکس ادا کرتے تھے اور بھارت کے شہر میں تھے مگر بال ٹھاکرے کو ان کی خوش حالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کہنے لگا۔

"میں نے سورت کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ڈیسائی کو بلا کر اس سے پوری بات کر لی ہے - وہ ہماری مدد کرے گا۔ تم اور دھرم چند سورت جا کر راشٹریہ سیوک سنگھ

کے منوسوانی سے ملو۔ باقی تمہیں جو کچھ کرنا ہے وہ خود تمہیں بتائے گا۔ یہ کام بہت ضروری ہے اور میں تم دونوں کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔"

میں نے بڑے ادب سے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"لیکن گورو دیو! اسلام آباد میں شیلا دھر میری بیوی کے بھیس میں موجود ہے۔ وہاں تمام لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ میں کاروبار کے سلسلے ملک سے باہر گیا ہوا ہوں اور جلدی واپس آ جاؤں گا۔ یہاں مجھے دیر بھی لگ سکتی ہے۔"

بال ٹھاکرے نے میری طرف اپنی ہیرے والی انگوٹھی کی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دھرم چند: ہم احمق نہیں ہیں۔ ہمیں سب حالات کا علم ہے۔ ہم اپنا ایک آدمی اسلام آباد تمہارے گھر بھجوا رہے ہیں جو شیلا دھر کا بھائی بن کر وہاں جائے گا اور لوگوں کو بتائے گا کہ یورپ میں تمہاری کاروباری مصروفیات بڑھ گئی ہیں اور تمہیں مہینہ ڈیڑھ مہینہ لگ جائے گا۔"

پھر اس نے بالا جی سے مرہٹی زبان میں کچھ باتیں کیں اور آخر میں اردو زبان میں کہا۔

"تم دھرم چند کو لے کر سورت کے وشرام نگر میں منوسوانی سے ملو۔ وہ تمہیں سارا پروگرام بتا دے گا۔ مجھ سے کسی مشورے کی ضرورت ہوئی تو تمہارے پاس میرا خاص ٹیلی فون نمبر موجود ہے۔"

بال ٹھاکرے نے انگلی سے ہمیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ بال ٹھاکرے کو نمسکار کیا اور کمرے سے باہر آ گئے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے بالا جی سے پوچھا۔

"یہ منوسوانی سے میرا خیال ہے کہ میں پہلے نہیں ملا۔"

میں نے بلف چال چلی تھی۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ اصلی دھرم چند پہلے اسے مل چکا ہے یا نہیں۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میری بلف چال کامیاب

ں۔ اصلی دھرم چند سے سورت کے منو وسوانی کی پہلے آمنے سامنے ملاقات کبھی
ں ہوئی تھی۔ بالا جی نے گاڑی سٹارٹ کر کے اسے کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکالتے
ئے کہا۔

"تم اس سے نہیں ملے۔ بڑا بوڑھا ہے۔ سوراشٹر اور مہاراشٹر میں وہی
و مسلم فساد کراتا ہے اور اب تک بھگوان جھوٹ نہ بلوائے تو وہ دو ڈھائی سو
لمانوں کو قتل اور ہزاروں مسلمان لڑکیوں کی بے حرمتی کر چکا ہے۔"

میرا اندر ہی اندر خون کھول اٹھا۔ میں نے دل میں کہا۔

"اس دوزخی کو تو میں ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اوپر سے میں نے بالا جی سے کہا۔

"پھر تو بڑے کام کا آدمی ہے۔"

"تم ملو گے تو خوش ہو جاؤ گے دھرم چند۔"

بالا جی نے کہا اور اس کے چہرے پر بڑی سنگدلانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ
گ سورت میں ہندو مسلم فسادات کروا کر باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق
ہاں کے مسلمانوں کا قتل عام کرنے والے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ
ں اپنے ان مسلمان بھائیوں کو بچانے کے لئے کیا کروں۔ ایک دو کی بات ہوتی تو
ں انہیں بچا بھی سکتا تھا لیکن سورت میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان آباد تھے۔
ن سب کو میں کیسے اس قیامت سے بچا سکتا تھا۔

سورت بھارت کے صوبہ گجرات کا ایک مشہور تاریخی شہر ہے۔ یہ بمبئی
سے کوئی تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر سمندر کے کنارے آباد ہے۔ اس کی آبادی اس
زمانے میں بائیس لاکھ کے قریب تھی۔ جس میں قریباً" چار لاکھ مسلمان تھے اور یہ
مسلمان کپڑے، پارچاجات کی رنگائی' کیلنڈرنگ اور ہیرے تراشنے کا کاروبار کرتے
تھے۔ بالا جی کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ صوبہ گجرات کے دوسرے شہروں کی
طرف سورت میں بھی بی جے پی' شیو سینا وشو ہندو پرشد اور راشٹریہ سیوک سنگ

جیسی مسلمان کٹر ہندو فاشسٹ پارٹیوں کا راج تھا اور ہندو فسادی کارسیوا کی آ
بڑے منظم طریقے سے سورت کے مسلمان محلوں پر حملہ کر کے انہیں اپنے انت
نشانہ بناتے رہتے تھے اور اس سے پہلے شہر کی دو تین مسجدوں کو آگ لگا کرا
کے دھماکوں سے شہید کر چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں سورت
مسلمانوں پر نازل ہونے والے آگ اور خون کے طوفان کو کیسے روکوں اور
کس مسلمان کو اس قیامت سے پہلے کی خبر کروں۔

بھارت کے نمرود بال ٹھاکرے کی ہدایات کے مطابق میں اور با
دوسرے روز صبح صبح ٹرین میں سوار ہوئے اور سورت کی طرف روانہ ہو گئے۔
اس شہر میں پہلی بار جا رہا تھا لیکن دھرم چند کے روپ میں مجھے یہ ظاہر کرنا تھا ک
پہلے بھی اس شہر میں کئی بار آتا جاتا رہا ہوں۔ جس شخص سے ہمیں سورت میں
ملنا تھا یعنی منو وسوانی وہ سورت کی شیو سینا پارٹی کا سکریٹری جنرل تھا۔ کالا ر
گھنگریالے حبشیوں جیسے کالے بال۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں' ورزشی بدن۔ عمر
سال کے قریب تھی اور اس کی نسواری آنکھوں سے سنگ دلی اور بے رحمی ٹ
تھی۔ ماتھے پر اس نے شیو دیوتا کے تین زعفرانی نشان بنائے ہوئے تھے۔ وہ ا
دفتر میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اسے ہمارے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ بالا جی
گلے لگ کر ملا اور میری طرف اشارہ کرے مرہٹی زبان میں اس سے کچھ پوچھا۔
پوچھا ہو گا کہ یہ کون ہے۔ بالا جی نے اردو زبان میں بتایا کہ یہ ہمارا بڑا دلیر کار
دھرم چند ہے اور پاکستان دہشت گردی کی کئی کاروائیاں کر چکا ہے۔ منو وسوانی
میرے ساتھ بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ہمارے لئے چائے کے گلاس منگوا۔
چائے کے دوران پارٹی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ ہمیں ساتھ وا۔
چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔

اس کمرے میں بھی دیوار پر شیوا جی مرہٹہ کی وہ مشہور تصویر لگی تھی ج
میں شیوا جی کے ہاتھ میں تلوار تھی اور کمر کے ساتھ ڈھال بندھی ہوئی تھی۔ یہا

سورت میں ہندو مسلم فساد کروانے کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔

منو وسوانی کہنے لگا۔

"سورت میں ہیرے تراشنے اور کپڑے کی منڈی پر ملیچھ مسلمانوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ کروڑوں کا بزنس کر رہے ہیں۔ ہندوؤں کو وہ اس میدان میں آگے نہیں بڑھنے دے رہے۔ ہمیں ایسے مسلمانوں کو چن چن کر قتل کرنا ہے جو ہیرے تراشنے کے ماہر ہیں اور جن کے کپڑے کا کروڑوں کا بزنس ہے۔ ہم نے ان سب کی فہرستیں تیار کر لی ہوئی ہیں۔ ان کے مکانوں اور گوداموں اور کارخانوں پر بھی سواستیکا کے خفیہ نشان لگا دیئے گئے ہیں لیکن سب سے پہلے ہمیں فساد کا کوئی بہانہ چاہئے۔ اس کا بھی حل ہم نے سوچ رکھا ہے۔ فسادات کی شروعات وشرام نگر محلے سے ہوگی جہاں ہیرے تراشنے والے مسلمان کاریگروں کے دو سو گھر ہیں۔ وشرام نگر کالونی' مارا جیونگر اور تروینی نگر کالونی میں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ اس آبادی کے ساتھ ہی ویڈ روڈ پر ہندوؤں کا ایک جین مندر ہے۔ ہم رات کو اس مندر میں گائے کاٹ کر پھینک دیں گے اور مشہور کر دیں گے کہ یہ حرکت مسلمانوں کی ہے۔ بس اس کے بعد ہمیں کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

بالا جی نے پوچھا۔

"منو جی! یہ کام کس دن شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

منو وسوانی بولا۔

"بال ٹھاکرے جی کے حکم کے مطابق تو ہم نے کئی روز سے ساری تیاریاں مکمل کر رکھی ہیں۔ راشٹریہ سیوک سنگ اور اپنی شیو سینا کے آدمیوں کو چھرے چاقو اور اسلحہ دے دیا گیا ہے۔ وہ تو ہمارے اشارے کا انتظار کر رہے ہیں اور میں تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔"

اسی وقت طے ہوگیا کہ آج ہی رات کو ویڈر روڑ والے جین مندر میں کٹی ہوئی گائے پھینکی جائے گی۔ منو وسوانی نے ہمیں ساتھ لیا اور وشرام نگر کی مسلمان

آبادی میں سے گذرتے ہوئے ہمیں بازار کے نکڑ پر جہاں ویڈر روڑ کی ہندو آبادی شروع ہوتی تھی۔ ایک مسلمان قصائی کی دکان دکھائی جس کے اندر کٹی ہوئی تین گائیاں لٹک رہی تھیں۔ بھارت کے قانون کے مطابق ان کٹی ہوئی گائیوں کو ململ کی باریک چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔

وسوانی نے کہا۔

"تم دونوں رات بارہ بجے یہاں آؤ گے۔ محلے میں رات کو ایک ہندو گورکھا چل پھر کر چوکیداری کرتا ہے۔ اس سے ساری بات کر لی جائے گی۔ تم دکان کا تالا توڑ کر کٹی ہوئی ایک گائے کے دو ٹکڑے کرکے انہیں دکان سے نکال کر لے جاؤ گے اور جین مندر کی عقبی دیوار میں سے دونوں ٹکڑے مندر کے صحن میں پھینک دو گے۔ ہندو چوکیدار اس کام میں تمہاری مدد کرے گا۔"

چنانچہ رات کے بارہ بجے میں اور بالا جی اپنی قیام گاہ سے نکل پڑے۔ وشرام نگر کے اس خاص محلے میں گئے۔ وہاں ہندو چوکیدار ہمارا پہلے سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں ساتھ لیا اور قصائی کی دکان پر آکر خود پہرے پر کھڑا ہوگیا۔ ہم ہتھوڑی اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ ہم نے ہتھوڑی سے دکان کا تالا توڑ دیا۔ دکان میں جاکر کٹی ہوئی گائے کو نیچے اتارا اور چھرے سے اس کے دو ٹکڑے کرکے انہیں کاندھوں پر اٹھا لیا۔ محلہ سنسان تھا۔ سب لوگ گہری سو رہے تھے۔ محلے میں رات کو پہرہ دینے والا چوکیدار ہمارے ساتھ تھا۔ ہم جین مندر کے پیچھے آ گئے۔ یہاں ایک جگہ اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس کے اوپر چڑھ کر ہم نے گائے کے ٹکڑے مندر کے صحن میں پھینکے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

دوسرے دن علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہندو مندر کے لاوڈ سپیکر سے چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔

"گئو ماتا کے پجاریو! ملیچھ مسلمانوں نے ہمارے مندر میں ہماری گئو ماتا کاٹ کر پھینک دی ہے۔ اٹھو اور ان ملیچھوں کو اس کی مزا چکھا دو۔"

وشرام نگر کے مسلمانوں میں دہشت پھیل گئی۔ مسلمانوں نے دکانیں بند کر لیں۔ گھروں کے دروازے اندر سے بند کر لئے۔ علاقے کے تھانے میں مسلمانوں کے فون آنے شروع ہو گئے کہ مسلمانوں کی جان و مال خطرے میں ہے۔ ہماری حفاظت کی جائے مگر تھانے کا ہندو انچارج ساتھ ملا ہوا تھا۔ وہ خود ہندو تھا اور گئو ماتا کی توہین سے سخت مشتعل تھا۔ وہ الٹا مسلمانوں کو گالیاں دیتا کہ تم نے پہل کی ہے اور ہماری گئو ماتا کو کاٹ کر مندر میں پھینکا ہے۔ اب شور کیوں مچا رہے ہو۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

علاقے میں پہلے سے تیار منصوبے کے مطابق شیو سینا اور راشٹریہ سیوک سنگ اور بی جے پی کے ہندو غنڈے مسلمانوں کی آبادی میں گھس آئے اور دکانیں توڑ کر انہیں نذر آتش کرنے لگے۔ جو مسلمان سامنے آتا اسے بے دریغ قتل کر دیا جاتا۔

میں اور بالا جی شیو سینا کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ منو وسوانی کو فون پر برابر اطلاعات مل رہی تھیں کہ مسلمانوں کے اتنے گھروں اور دکانوں اور گوداموں کو لوٹ کر نذر آتش کر دیا ہے۔ اتنے مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ منو وسوانی ہمیں یہ ساری اطلاعات سناتا جا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس وقت مجرم محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ یہ فساد شروع کروانے اور مسلمانوں پر قیامت نازل کرانے میں میرا بھی ہاتھ تھا مگر میں بے بس تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہندو اس واقعے کے بعد مسلمانوں کا اس بے دردی سے خون بہائیں گے۔ جب سینکڑوں مسلمانوں کو کاٹ ڈالا گیا۔ مسلمانوں کی دکانوں اور گوداموں کو جلا کر کوئلہ بنا دیا گیا اور ہیرے تراشنے والے مسلمان کاریگروں کو چن چن کر قتل کر دیا گیا تو پولیس بھی آگئی اور وشرام نگر اور ویڈر روڈ پر کرفیو لگا دیا گیا۔

شیو سینا' آر ایس ایس اور بی جے پی کے درندہ صفت ہندوؤں نے اسی رات کی صبح کو ایک ٹرین کو سورت کے ریلوے سٹیشن کے باہر روک لیا۔ یہ ٹرین

بھساول سے سورت آ رہی تھی۔ اس خونی واقعے کی رپورٹ ہمیں راشٹریہ سویک سنگ کے ایک کارکن نے آ کر دی۔ اس ٹرین کو سورت سٹیشن سے پہلے ڈندولی کی بستی کے قریب ریلوے لائن پر بڑے بڑے کٹے ہوئے درخت ڈال کر روکا گیا۔ ہندو غنڈے سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ وہ بندوقوں' چھروں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ہندو غنڈے ٹرین کے ڈبوں میں گھس گئے۔ شناخت کرکے تقریباً" ڈیڑھ سو مسلمانوں کو ننگا کرکے شہید کر دیا گیا۔ ان میں مسلمان عورتیں اور ان کے بچے بھی شامل تھے۔ وہیں جوان مسلمان لڑکیوں کی بے حرمتی کرکے ان کے پیٹ پھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ میں نے یہ رپورٹ سنی تو میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جی یہی چاہتا کہ ان تمام ہندو قاتلوں کو بم مار کر اسی جگہ ہلاک کر دوں مگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن میں نے چند ایک ہندو غنڈوں کو منو وسوانی سمیت اپنی نگاہوں میں رکھ لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا اور انہیں اس طرح اذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اتاروں گا۔

وشرام نگر کے قتل عام کے فوراً" بعد منو وسوانی نے اپنی ہندو شیو سینا کے غنڈوں کو وجے نگر پر حملے کا حکم دیا۔ وجے نگر سورت کی ایک بڑی کالونی ہے' جہاں مسلمانوں کے تین سو گھر تھے اور ایک بڑی عالی شان مسجد تھی۔ جس کا نام دربار مدینہ تھا۔ مسلمانوں کے مکانوں میں کہیں کہیں دو چار دکانیں اور مکان ہندوؤں کے بھی تھے۔ ان مکانوں پر سواستیکا کے خاص نشان بنا دئے گئے تھے تاکہ ہندو غنڈوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مکان ہندوؤں کے ہیں۔ حملے سے ایک روز پہلے بالا جی نے منو وسوانی کی ہدایت پر مجھے ساتھ لیا اور ہم وجے نگر کے بزرگ مسلمانوں کے پاس گئے۔ ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس حملے کے خلاف مسلمانوں کو بچانے کی جتنی کوشش کر سکتا تھا اور جتنی تیاری کر سکتا تھا میں کرکے وہاں گیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ حملے سے پہلے وجے نگر کے مسلمانوں کے پاس جو تھوڑا بہت اسلحہ اور بندوقیں وغیرہ ہیں۔ وہ ان سے لے لی جائیں تاکہ ہندوؤں

ملے کے وقت وہ جوابی فائر نہ کر سکیں۔ میں نے ایک کاغذ پر اردو اور ہندی میں
ی تحریر لکھ کر اپنی جیب میں اس کاغذ کو تہہ کر کے چھپا کر رکھ لیا تھا۔ مجھے
تھا کہ اگر گجرات کے مسلمان اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے تو ہندی ضرور لکھ پڑھ
یں کیونکہ ہندی انڈیا کے سکولوں میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی

وجے نگر میں رانی تلاؤ کے قریب ہی میمن جماعت خانہ ہے اس کے ساتھ
ے مکان وجے نگر کا ایک بااثر بزرگ مسلمان غفار احمد رہتا تھا جو کپڑے کا
ر کرتا تھا۔ ہم غفار احمد کو جا کر ملے۔ ہمارے ساتھ مندر کا ایک پجاری بھی تھا
سینا کا کارکن تھا اور مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ بالا جی نے غفار احمد کو راز
تے ہوئے کہا۔

"غفار بھائی! آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ شہر میں فساد کی صورت حال
گئی ہے اور تناؤ بڑھ رہا ہے۔ سورت کی پولیس نے گھر گھر تلاشی کا پروگرام
۔ جس گھر سے ہتھیار برآمد ہوئے اس گھر کے تمام آدمیوں کو پولیس پکڑ کر
ئے گی۔ ہم ہندوؤں نے بھی اپنے ہتھیار تھانے میں جمع کرا دیئے ہیں۔ آپ
پنے ہتھیار ایک جگہ اکٹھے کر لیں اور ہمارے حوالے کر دیں ہم تھانے میں جا کر
دیں گے۔ اس کے بعد ہم اور آپ دونوں اطمینان سے رہیں گے۔ نہ کوئی
ہمیں تنگ کرے گا اور نہ آپ پر کوئی ہندو حملہ کرے گا۔ ہم اس بات کی
ضمانت دیتے ہیں اور آپ پولیس کی کارروائی سے بھی بچ جائیں گے۔"
جو ہندو پجاری ہمارے ساتھ گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو خفیہ پولیس کا
اہر کیا تھا۔ غفار احمد سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ وہ بالا جی کی باتوں میں آ گیا اور

"بھائی جی ہمارے صرف چند ایک مسلمانوں کے پاس کچھ ہتھیار ہیں وہ ہم
ے حوالے کئے دیتے ہیں لیکن آپ کو یہ یقین دلانا ہو گا کہ وجے نگر کے

مسلمانوں پر کوئی ہندو حملہ نہیں کرے گا۔"

بالا جی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں بھگوان شیو کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کے گھروں کی طرف کو
آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

غفار احمد مطمئن ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم جن سو پچاس گھروں میں بندوقیں ہیں
لے کر آپ کے حوالے کرتے ہیں۔"

میں نے جو پرچہ ہندی اور اردو زبانوں میں لکھ کر اپنی جیب میں چھپایا ہو
تھا۔ وہ میں نے نکال کر اپنی مٹھی میں دبا لیا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ موقع ملتے ہ
غفار احمد کے ہاتھ میں دے دوں۔ یہ رقعہ مجھے اسی وقت اسے دینا تھا کیونکہ ہتھیا
ہندوؤں کے حوالے کرنے کے بعد اس رقعے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اس
رقعے میں لکھا تھا۔

"اپنے ہتھیار ہندوؤں کے حوالے مت کرنا۔ ان لوگوں نے وجے نگر کے
مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔"

بس صرف یہ دو جملے ہندی اور اردو میں لکھے ہوئے تھے مگر مجھے موقع ہ
نہیں مل رہا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ میرے چھپ کر رقعہ پکڑاتے ہی غفار احمد کھول
کر پڑھنا نہ شروع کر دے لیکن یہ خطرہ مجھے مول لینا ہی تھا۔ غفار احمد نے دو تین
مدبر قسم کے مسلمانوں کو ساتھ لیا اور مسلمانوں کے گھروں سے اسلحہ جمع کرنے کے
لئے چل پڑے جیسے ہی غفار احمد میرے قریب سے گذرا۔ میں نے رقعہ اس کے
ہاتھ میں تھما دیا۔ اس وقت بالا جی اور ہندو پجاری ذرا آگے ہو گئے تھے۔ غفار اح
نے رقعہ ملتے ہی چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے
خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں بالا جی نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"دھرم چند جی! تم آگے آؤ ناں پیچھے کیوں رہ گئے ہو؟"

میں جلدی سے قدم بڑھا کر اس کے پاس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ غفار احمد کو میں نے جس پر اسرار طریقے سے رقعہ دیا وہ سمجھ گیا ہوگا کہ رقعے میں کوئی خفیہ بات لکھی ہوئی ہے اور وہ اسے کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے ادھر ادھر ہو کر ضرور پڑھ لے گا مگر یہ سورتی میمن مسلمان غفار احمد کچھ زیادہ ہی سیدھا سادا مسلمان تھا۔ اس نے میرے سامنے رقعہ اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور گھروں میں سے اسلحہ جمع کروانا شروع کر دیا۔ میں بے چین ہو گیا۔ بالا جی اور ہندو پجاری غفار احمد کے بالکل دائیں بائیں کھڑے تھے۔ مجھے غفار احمد کے قریب جانے کا بالکل موقع نہیں مل رہا تھا۔ مسلمانوں کے گھروں سے بندوقیں وغیرہ نکال کر بالا جی کے حوالے کی جا رہی تھیں۔ میں سخت پریشان تھا کہ غفار احمد کو کسی طرح بتاؤں کہ خدا کے لئے رقعہ جیب سے نکال کر پڑھو یا پھر اس کے قریب جا کر اس کے کان میں یہ بات ڈال دوں کہ ہندوؤں کو اپنے ہتھیار نہ دو۔ یہ تم پر قیامت ڈھانے والے ہیں مگر بالا جی اور ہندو پجاری تو غفار احمد کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ مجھے غفار احمد کے قریب جانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

یہاں تک کہ وجے نگر کی کالونی میں مسلمانوں کے جن پچاس ساٹھ گھروں میں پرانی قسم کی بندوقیں تھیں وہ سب کی سب ہندوؤں کے حوالے کر دی گئیں۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب اگر غفار احمد میرا رقعہ پڑھ بھی لیتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بالا جی نے کچھ بندوقیں مجھے دے دیں باقی ہندو پجاری نے اور خود بالا جی نے اٹھالیں اور مسلمانوں کی آبادی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ وہاں آتے ہی بالا جی نے مجھ سے کہا۔

"دھرم چند! میدان خالی ہے۔ دشمن کو نہتہ کر دیا ہے۔ اب گن گن کر ان سے بدلے لیں گے۔ جے شیو جی بھگوان کی۔"

ہندو پجاری دانت پیستے ہوئے بولا۔

"مہاراج! ان مسلوں کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ انہیں سوراشٹر میں کہیں

سر چھپانے کو ٹھکانہ نہیں ملے گا۔"

بالا جی نے ہتھیار اپنی گاڑی میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ان کے محمود غزنوی نے ہماری ہندوؤں کو جس طرح تہس نہس کیا تھا اور ہماری سومنات جی کی مورتیوں کو جس طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا ہم ان سب کا ان سے بدلہ لیں گے۔"

میں ان کے ساتھ بوجھل دل لئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ غفار احمد نے ہمارے جانے اور سارے ہتھیار ہمیں دے دینے کے بعد میرا رقعہ ضرور واسکٹ کی جیب سے نکال کر پڑھ لیا ہوگا۔ وہ یہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں نے مسلمانوں کی حیثیت سے انہیں ہندوؤں کی سازش سے آگاہ کیا تھا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں اگرچہ ہندو ہوں مگر مجھے مسلمانوں سے ہمدردی ہے اور محض ہمدردی کی بنا پر انہیں خبردار کیا ہے کہ اپنے ہتھیار واپس نہ کرو مگر اب اس رقعے کے پڑھنے یا نہ پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تیر کمان سے سے نکل چکا تھا جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ وجے نگر کالونی کے مسلمان ہندوؤں کے فریب میں آچکے تھے۔ وہ نہتے کر دیئے گئے تھے۔ اب ان کا خدا ہی حافظ تھا۔

دوسرے ہی دن کوئی دس بجے کے قریب کوئی دو ڈھائی ہزار ہندو غنڈے وجے نگر میں داخل ہو گئے۔ ہندو پولیس افسروں کو خبردار کر دیا گیا تھا۔ ان کو بال ٹھاکرے کی طرف سے خفیہ پیغام بھی مل چکا تھا کہ اگر کسی نے مسلمان کو بچانے کی یا کسی ہندو کو پکڑنے کی کوشش کی تو اسے نہ صرف نوکری سے جواب مل جائے گا بلکہ اس کا بوریا بستر گول کر کے اسے گجرات کے صوبے سے باہر نکال دیا جائے گا۔ جو چند ایک پولیس کے سپاہی اس علاقے میں روز کی ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ اس روز وہ بھی غائب ہو گئے۔ مسلمانوں کے قتل اور غارت گری کے واسطے میدان صاف تھا۔ میں اور بالا جی اپنے آفس میں ہی ٹیلی فون کے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں ایک ایک پل کی خبر وہیں ملنے والی تھی۔ ہمیں جو خبریں ملیں وہ یہ تھیں کہ دو ہزار ہندوؤں کے

مسلح جلوس نے وجے نگر میں داخل ہوتے ہی مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کر دیا۔ مکانوں کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ جو سامنے آیا اس کا کاٹ دیا گیا۔ مسلمانوں کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ مسلمان عورتوں کی اجتماعی بے حرمتی کی گئی۔ عورتوں کے سینے ننگے کر کے چھری سے ان پر رام رام لکھا گیا۔ انہیں عریاں کر کے سڑکوں پر دوڑایا گیا۔ معصوم بچوں کو سلاخوں میں پرو کر آگ کے الاؤ پر بھونا گیا۔ تین دن تک سورت کے مسلمان محلوں میں مسلمانوں کا قتل عام جاری رہا۔ مسجدوں کو آتش گیر مادے سے شہید کر دیا گیا۔ شاہ پیر' اونا نگر' وشرام نگر' تری لوک نگر اور ویڈر روڈ کے علاقوں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ معصوم بچیوں کی بے حرمتی کر کے انہیں قتل کر دیا گیا۔ پولیس کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔

یہ ساری رپورٹیں پوری تفصیل کے ساتھ شیو سینا کے نمرود بال ٹھاکرے اور اس کے دست راست بالاجی کو پوری تفصیل کے ساتھ ملتی رہیں۔ دونوں بڑے خوش تھے۔ میرا خون کھول رہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ اگرچہ میں نے چند ایک ہندو غنڈوں کے نام لکھ رکھے تھے اور مجھے ان کی شکلیں بھی معلوم تھیں اور یہ بھی معلوم تھی کہ وہ سورت میں کہاں رہتے ہیں اور میں نے ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کرنے کا منصوبہ بھی طے کر کیا تھا مگر میں کس کس سے سورت کے بے گناہ مسلمانوں کے خون کا بدلہ لیتا؟ بالاجی نے میرے ساتھ تین دن کے لرزہ خیز مسلم کش فسادات کے بعد ان علاقوں کا دورہ کیا۔ مسلمانوں کے مکان جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ جلے ہوئے ملبے میں مسلمانوں کی کوئلہ بنی لاشوں کے ڈھانچے صاف نظر آ رہے تھے۔ ویڈر روڈ کے کونے پر پولیس نے دنیا کو دکھانے کے لئے بچے کھچے مسلمانوں کا ایک سکول میں عارضی کیمپ قائم کر دیا تھا۔ اس کیمپ میں زخمی عورتیں اور بچے بھی تھے۔ کسی لڑکی کا ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ کسی کا بازو غائب تھا۔ کسی کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ اس کیمپ میں ہیرے تراشنے والے مسلمان بوڑھے کاریگر غفار احمد کی جوان بیٹی یاسمین بانو چٹائی پر چادر اوپر کئے مردہ لاش کی طرح پڑی تھی۔ اس

کا باپ اور بوڑھی ماں اس کے پاس سر جھکائے بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ بوڑھے باپ نے بتایا کہ شام کے وقت جب دوسرے محلے میں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا تھا اور ان کے گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھی تو اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر رام پورے کسی محلے میں جانے کی کوشش کی لیکن ہندو غنڈوں نے انہیں راستے میں ہی گھیر لیا۔ یاسمین کی ماں پر پیٹرول چھڑک کر اسے زندہ جلا دیا۔ بڑے بیٹے نے مزاحمت کی تو اس پر تیزاب پھینک دیا۔ پھر تلواروں سے اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے۔ یاسمین کو اس کے بوڑھے باپ کے سامنے عریاں کر کے اس کی آبرو ریزی کی گئی۔ اس کے بعد یاسمین بانو پر پیٹرول چھڑک کر اسے آگ لگانے لگے تھے کہ اتنے میں کچھ ہندو غنڈے دو اور مسلمان لڑکیوں کو پکڑ کر لے آئے جو عریاں حالت میں تھیں۔ ہندو غنڈے ان لڑکیوں کی طرف بھاگے تو یاسمین بانو کو اس کا باپ وہاں سے نکال کر لے گیا۔

محلہ وجے نگر کی آٹھ سالہ مسلمان بچی مہ جبیں نے بتایا کہ ہم اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ ہندو غنڈے اندر گھس آئے۔ میری ماں ان کے پیروں میں گر پڑی۔ ہمارا باپ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ خدا کا واسطہ دیا۔ گھر کا سارا سامان لے جانے کو کہا مگر ہندو غنڈوں نے ایک نہ سنی۔ میرے ماں باپ کو گھسیٹ کر باہر لے گئے اور میری آنکھوں کے سامنے انہیں ذبح کر کے تڑپتا چھوڑ دیا۔ میں روتی ہوئی ایک طرف کو بھاگ گئی اور اس کیمپ میں پہنچ گئی۔ وجے نگر کی ہی ایک خاتون عائشہ بی بی نے بتایا کہ غنڈے ان کے گھر کا دروازہ توڑ کر اندر آ گئے۔ میرے لڑکے کے سینے پر برچھی مار کر اسے شہید کر دیا۔ میری جوان بیٹوں کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ انہیں کہا کہ رام بولو۔ جب میری بیٹیوں نے ایسا نہیں کیا میری آنکھوں کے سامنے میری چاروں جوان بیٹیوں کی آبرو ریزی کی اور انہیں تلواروں اور برچھیوں سے کاٹ ڈالا۔

دربار مدینہ مسجد کے امام قطب الدین آسامی تھے۔ ہندو غنڈے مسجد میں

آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے امام مسجد کو چھت کے پنکھے سے الٹا لٹکا دیا اور ان سے کہا کہ جے رام جی کی بولو۔ امام مسجد ہر بار اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے۔ ہندو غنڈوں نے امام صاحب کو نیچے اتارا اور تلواروں کے وار سے ان کے کئی ٹکڑے کر دیئے۔ ان کی بیوی کو درندگی کا نشانہ بنایا جس نے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔ وجے نگر میں دو سو مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ کیمپ میں موجود ایک شخص مہندی خان نے بتایا کہ غنڈے اس کے گھر میں گھس آئے ور میری بیوی کو تلوار مار کر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ غنڈوں نے ترشول اس کے سینے میں گاڑ دیا۔ اس کے بعد میرے معصوم بچوں کو تلواروں سے کاٹنے لگے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے ایک غنڈے سے تلوار چھینی اور دو ہندو غنڈوں کے پیٹ پھاڑ دیئے۔ تیسرے کی گردن کاٹ ڈالی۔ ہندو غنڈے بھاگ نکلے۔ میں اپنے زندہ بچ جانے والے معصوم بچے اکبر کو لے کر وہاں سے بھاگا۔ قطار گام روڈ پر عید گاہ کے قریب رہنے والی زاہدہ بانو نے بتایا کہ اس کے باپ بھائی اور بہن کو غنڈوں نے اس کے سامنے آگ میں پھینک دیا۔ اس کے والد' بہن کلثوم اور بھائی محمد حسین کو پہلے شہید کیا گیا۔ قطار گام مسجد محلہ میں مسلمانوں کے پچاس گھر تھے۔ ان سب کو لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا۔ وشرام نگر میں ابراہیم ماسٹر اپنے گھر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ غنڈوں کا ٹولہ اندر گھس آیا۔ انہیں پکڑ کر باندھ دیا گیا۔ ان کے بھائی کی بیس سالہ لڑکی کو کھینچ کر باہر لے گئے اور اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اسے ننگا کر لیا۔ اس نے مزاحمت کی تو تلوار سے اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا۔ پھر دوسرا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ ابراہیم ماسٹر کی بہو کی اجتماعی بے حرمتی کی گئی۔

ادنا نگر میں مسلمانوں کی بڑی بڑی انڈسٹریز تھیں۔ یہاں ڈائینگ پروسس کے کارخانے تھے۔ ہندو غنڈوں نے انہیں نذر آتش کر دیا اور تقریباً" آٹھ لاکھ میٹر سلک کا کپڑا جلا دیا گیا۔ چوٹا بازار میں احمد بھائی کی ساڑھیوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ اسے لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ پریذیڈنٹ شوز کے شو روم کے مالک

صدرالدین بھائی چند ماہ پہلے احمد آباد سے اپنا پورا کاروبار سمیٹ کر سورت آگئے تھے۔ کیونکہ احمد آباد میں بار بار ہونے والے مسلم کش فسادات نے انہیں تباہ کر دیا تھا۔ صدرالدین بھائی کے شوروم میں کروڑوں کا لیدر اور سلک کا سامان پڑا تھا۔ اس شو روم کو ہندو تین دن تک لوٹتے رہے۔ جب شو روم خالی ہوگیا تو اسے آگ لگا دی گئی۔ اس طرح پولیس نگر کے نسیم خان کی دونوں فیکٹریاں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ علی خاں کی پانچ ٹیکسٹائل ملز اور تین منزلہ عمارت کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ ایور گرین سوسائیٹی سورت میں مسلمانوں کے ڈیڑھ سو خاندان آباد تھے۔ ان میں سورت کے سیل ٹیکس کمشنر بشیر بھائی بھی رہتے تھے۔ یہاں غنڈوں نے بشیر بھائی کے بیٹے اور ایک مسلم فاریسٹ آفیسر کے لڑکے کو ذبح کرنے کے بعد پچاس مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ ادنا پانی روڈ پر علی کیمپ میں ایک شخص نے ہمیں بتایا کہ پورے سورت شہر میں مسلمانوں کی تقریباً" دو سو فیکٹریاں تھیں۔ ان سب کو جلا دیا گیا۔ اس دوران سورت میونسپل کارپوریشن میں ہیلتھ کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سہائے نے، جو آر ایس ایس کا نائب صدر بھی تھا، ہندو غنڈوں کی راہنمائی کی۔

مکار منو وسوانی اور بالا جی مسلمانوں کے ہمدرد بن کر ان کی لرزہ خیز داستان سنتے رہے اور ان سب کو کہا کہ تم لوگ بالکل فکر نہ کرو۔ ہم کسی غنڈے کو نہیں چھوڑیں گے۔ ایک ایک کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرکے ان کو قانون کے مطابق پوری پوری سزا دلائیں گے۔ کیمپ کے مظلوم مسلمان یہ سن کر آنسو بہاتے رہے۔ میں ان دلخراش واقعات کو سینے پر پتھر رکھ کر سنتا رہا۔ بالا جی اور منو وسوانی مسلمانوں کی منافقانہ اشک شوئی کرتے رہے۔ اندر سے وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔ جب ہم تینوں مسلمانوں کے کیمپ سے باہر آئے تو ان دونوں درندہ صفت متعصب ہندو مراٹھوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ منو وسوانی نے کہا۔

"کیوں بالا جی! دیکھا ہمارے آدمیوں نے کس طرح مسلمانوں کو چن چن کر ختم کیا ہے۔"

بالا جی نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"دھرم چند! تم اگروادی یہ کام نہیں کر سکتے جو تم نے یہاں کر دکھایا ہے۔ تم تو چوری چھپے پاکستان جاتے ہو اور بم دھماکہ کر کے زیادہ سے زیادہ ایک ٹائم میں دس یا گیارہ مسلمانوں کو ختم کرتے ہو گے مگر ہم نے سینکڑوں مسلمانوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ ان کی ساری انڈسٹریز تباہ کر دی ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔

"بالا جی! میں بھی مسلمان کا بچہ نہیں اگر ان بے گناہ مسلمانوں کے خون کا تم سے بدلہ نہ لوں۔"

اوپر سے کہا۔

"ہاں بالا جی! یہ بات تو ہے۔ آپ اس معاملے میں ہم سے نمبر لے گئے ہیں۔"

رات کو ہم نے اس دورے کی مکمل رپورٹ بال ٹھاکرے کو جا کر دی۔ بالا جی نے کیمپ میں پناہ گزیں تباہ حال مسلمانوں سے ظلم و ستم کے جو لرزہ خیز واقعات سنے تھے وہ سارے کے سارے اسے سنا دیئے۔ بال ٹھاکرے اس وقت اپنے زعفرانی سلک کے کھلے پاجامے کرتے میں ملبوس بیئر پی رہا تھا۔ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"منو وسوانی نے میرا جی خوش کر دیا ہے۔ بالا جی! میں چاہتا ہوں کہ بھارت کے سارے مسلمانوں کو اسی طرح ایک ایک کر کے قتل کر ڈالوں۔"

پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

"دھرم چند! ابھی کچھ وقت تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔ ہمارا پروگرام مہاراشٹر اور سوراشٹر کے بعد دلی اور لکھنؤ کی مسجدوں میں بھی بم کے دھماکے کرنے کا ہے۔ تم اس کام میں ہمارے لئے بڑے فائدہ مند ثابت ہو گے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔

"سیناپتی جی! میں آپ کی سیوا کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔"

بال ٹھاکرے نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ میری سیوا نہیں ہے دھرم چند! یہ بھارت ماتا کی سیوا ہے۔ رام راج کی سیوا ہے۔ وہ دن ضرور آئے گا جب بھارت دیش سے سارے مسلمانوں کا ناش کر دیا جائے گا۔ جو بچ جائیں گے انہیں ہندو بنا دیا جائے گا۔ پھر بھارت پر ہندو راج ہو گا اور بال ٹھاکرے کا سپنا پورا ہو جائے گا۔"

بالا جی بولا۔

"کیوں نہیں سیناپتی جی۔ کیوں نہیں۔ ہم نے شیو سنیا کس لئے بنائی ہے؟ اسی لئے بنائی ہے کہ بھارت میں پھر سے ہندو راج قائم کیا جائے اور تمام ملیچھ مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔"

ان ہندو لیڈروں کے یہ ناپاک عزائم دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ پاکستان کا قیام کس قدر ضروری تھا اور قائد اعظم نے پاکستان قائم کر کے مسلمانان برصغیر پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو مسلمانوں کو اپنے دین اسلام کے مطابق عزت آبرو سے زندگی بسر کرنے کے واسطے برصغیر ہندوستان میں کہیں کوئی جائے امن نہ ملتی۔ اس وقت مجھے اپنے آباؤ اجداد کی بے مثال قربانیوں کا خیال آیا کہ انہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے دے کر قائد اعظم کی بے لوث قیادت میں پاکستان بنایا اور یہ بھی شدت سے احساس ہوا کہ ہم مسلمانوں کے لئے پاکستان کس قدر قیمتی اور ضروری ہے۔

سورت میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد بال ٹھاکرے نے بلا جی کو ایک گائیڈ لائین دی۔ یہ گائیڈ لائن احمد آباد میں ایک بار پھر مسلمانوں کا قتل عام اور وہاں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑکانے کی تھی۔ بالا جی اور وسوانی نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھایا اور احمد آباد میں مسلمانوں کو چن چن کر قتل کرنے اور ان کی

عورتوں کو اغوا کرنے پر غور شروع کر دیا۔ اس وقت میں نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا
ان دونوں کو احمد آباد میں مسلمانوں کا قتل عام نہیں کرنے دوں گا۔ ساتھ ہی ساتھ
میرے دل میں ان ہندو غنڈوں کے خلاف انتقام کی آگ بھی بھڑک رہی تھی جنہوں
نے سورت میں مسلمانوں کو بے دریغ شہید کیا تھا اور مسلمان خواتین اور معصوم
بچیوں کی اجتماعی بے حرمتی کر کے انہیں ہلاک کر ڈالا تھا۔ ان ہندو قاتلوں کو جہنم میں
پہنچانا ضروری تھا۔ یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے مجھے سورت کے جانباز
ٹیم کے مسلمان کارکن کی ضرورت تھی۔ سورت میں مسلم لیگ کا ایک چھوٹا سا دفتر
شہر کے شمالی محلے تھا۔ جس پر ہندوؤں کا کئی بار حملہ ہو چکا تھا مگر وہاں کے مسلمانوں
نے ہر بار ہندو غنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اس کے باوجود سورت میں مسلم لیگ
مسلمانوں کی ایک کمزور جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مسلم لیگ کا صدر ایک مراٹھا
مسلمان ابراہیم خان تھا جس کی ہندو غنڈوں کے خلاف دلیری کے بڑے واقعے مشہور
تھے۔ یہ آدمی میرے کام آ سکتا تھا۔ میں ابراہیم خان سے رابطہ پیدا کرنے کے
بارے میں غور کرنے لگا۔

ابراہیم خان نے مجھے اور میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے میں ہندو
بن کر یعنی دھرم چند کی حیثیت سے اسے نہیں مل سکتا تھا۔ مجھے اپنی اصلی حیثیت
یعنی مسلمان کی شکل میں ہی اس سے ملنا تھا اور ہندو قاتلوں سے انتقام لینے کی بات
کرنی تھی۔ خطرہ اس بات کا تھا کہ ابراہیم خان چونکہ مجھے جانتا نہیں اس لئے اسے تو
تھوڑے پس و پیش کے بعد یقین آ جائے گا کہ میں مسلمان ہی ہوں لیکن اگر وہاں
کوئی ایسا مسلمان موجود ہوا جس نے مجھے سورت کے شیوسینا کے آفس میں بالا جی یا
گوسوانی کے ساتھ دیکھا ہو تو وہ تو مجھے دھرم چند ہی سمجھیں گے اور میرا سارا
انتقامی مشن ادھورا رہ جائے گا لیکن میرا ابراہیم خان سے ملنا بہرحال ضروری تھی۔

میں نے شیو سینا کے دفتر ہی سے کسی طریقے سے ابراہیم خان صدر سورت
مسلم لیگ کا ٹیلی فون نمبر معلوم کر لیا اور وقت ضائع کئے بغیر شہر کے پوسٹ آفس

میں ٹیلی فون بوتھ سے اسے فون کر دیا۔ تھوڑی دیر گھنٹی بجتی رہی۔ پھر دوسری طرف سے کسی نے فون اٹھایا اور گجراتی زبان میں کہا۔

"میں ابراہیم خان ہوں۔ کہو"

گجراتی زبان بڑی آسان زبان ہے۔ چونکہ صوبہ گجرات پر مسلمانوں کی سلطنت ایک عرصہ تک قائم رہی تھی اور رضیہ سلطانہ ہی اس صوبے کی حکمران تھی۔ اس لئے گجراتی زبان میں فارسی اور عربی کے ایسے الفاظ بہت شامل ہو گئے ہیں جو اردو میں بھی ہیں۔ کوئی آدمی گجراتی بول رہا ہو تو کم از کم اتنا ضرور آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ کس موضوع پر بات کر رہا ہے۔

میں نے اردو میں کہا۔

"ابراہیم خان! میں یوسف بھائی بول رہا ہوں۔ میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں تمہیں کہاں مل سکتا ہوں؟"

ابراہیم خان نے بھی گجراتی اردو میں کہا۔

"بھائی تم کون ہو۔ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ابراہیم بھائی! یہ سب کچھ میں تمہیں مل کر ہی بتاؤں گا۔"

ابراہیم خان نے جواب دیا۔

"شام کے وقت میرے دفتر آ جانا۔ میں دفتر میں ہی ملوں گا۔"

مجھے علم تھا کہ دفتر ایک سیاسی پارٹی کا ہے۔ وہاں شام کے وقت دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی ایسا آدمی بھی موجود ہو جس نے مجھے ویڈر روڈ والے مسلمانوں کے کیمپ میں بلاجی اور منو سوانی کے ساتھ دیکھا ہو۔ میں نے کہا۔

"ابراہیم خان! مجھے تم سے تنہائی میں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مجھے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔"

ایک دو سیکنڈ کی خاموشی چھائی رہی۔ ضرور ابراہیم خان یہی سوچ رہا ہوگا کہ وہ مجھ سے تنہائی میں ملاقات کرے یا نہ کرے کیونکہ صورت میں حالات سخت کشیدہ تھے۔ دو تین دن پہلے وہاں مسلمانوں کا بے دردی سے خون بہایا گیا تھا اور ابراہیم خان مسلمانوں کی سیاسی جماعت کا صدر تھا۔ وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ کہیں یہ شوسینا کی کوئی سازش نہ ہو۔

اس نے کہا۔

"تم نے ہمارا دفتر دیکھا ہوا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں نے دفتر دیکھا ہے۔ ابراہیم خان بولا۔

"دفتر کے پیچھے ایک گلی ہے۔ گلی میں ایک مکان ہے جس کے دروازے پر سبز رنگ کیا ہوا ہے۔ تم وہاں آ جانا' دروازہ کھلا ہوگا۔"

بالا جی اور منو سوانی احمد آباد میں مسلم کش فسادات کی آگ بھڑکانے کی سازش کے سلسلے میں بال ٹھاکرے کی ہدایت پر احمد آباد گئے ہوئے تھے۔ میں شیوسنا کے دفتر میں اکیلا تھا۔ جب سورج غروب ہوا تو میں ورگام روڑ پر آگیا۔ ایک جانب جہاں مسلمانوں کے آخری چند ایک گھر تھے۔ وہاں مسلم لیگ کا دفتر ایک گلی میں تھا۔ گلی کے پیچھے ایک اور گلی تھی۔ اس عقبی گلی میں ایک مکان کے لوہے کے دروازے پر سبز رنگ کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے اندر کو دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر ابراہیم خان کا نام لے کر اسے آواز دی۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن میں ایک جانب ایک آدمی مونڈھے پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اخبار اس نے آگے رکھا ہوا تھا۔ اس کا لباس گجرات کاٹھیا واڑ کے مسلمانوں والا تھا۔ سر پر گول مسلمانوں والی سفید جالی دار ٹوپی تھی۔ چھوٹی کالی داڑھی تھی۔ پاجامہ کرتا کھدر کا تھا۔ وہاں کے ہندو اور مسلمانوں کے پہناوے میں بھی بڑا فرق تھا۔ ہندو ہمیشہ تنگ موری والا پاجامہ پہنتے تھے جبکہ مسلمانوں کے پاجامے کی موری چوڑی ہوتی تھی۔

اس نے دروازے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"تم نے ہی مجھے فون کیا تھا؟"
میں نے کہا۔
"ہاں ابراہیم بھائی! میں نے ہی فون کیا تھا۔"
اس نے بیڑی صحن میں پھینکی اور مونڈھے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"آ جاؤ۔"
میں نے جاتے ہی السلام علیکم کہا۔ اس سے ہاتھ ملایا اور سامنے والے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ ابراہیم خان بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"میرا نام حیدر علی ہے......"
نام کے سوا میں نے ابراہیم خان کو اپنے بارے میں بالکل نہ بتایا کہ میں پاکستان سے ایک مشن لے کر ہندوستان میں آیا ہوں اور یہ مشن پاکستان کی سلامتی اور بھارت میں پاکستان دشمن ہندو جماعتوں کے پاکستان میں تخریب کاری کے منصوبوں کو ناکام بنانا اور انہیں تباہ کرنا ہے۔ نام میں نے اسے اپنی صحیح بتا دیا تھا۔ میں نے اسے یہی کہا کہ میں انبالے کا رہنے والا مسلمان ہوں۔ کاروباری سلسلے میں چند ماہ سے سورت میں مقیم ہوں۔ یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں نے جس وحشیانہ درندگی کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے واقعات میں نے ویڈر روڑ والے مسلمان پناہ گزینوں کے کیمپ میں سنے ہیں اور میں ان ہندو غنڈوں سے اپنے مسلمان بھائی بہنوں کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہوں جنہوں نے انہیں قتل کیا اور ان کے گھروں کو آگ لگائی ہے۔
ابراہیم مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ کہنے لگا۔
"اس کام کے لئے تم نے مجھے کیوں چنا ہے۔ کیا میں ہی سارے ہندوستان میں ایک دلیر آدمی رہ گیا ہوں۔"
اس کی بات بھی معقول تھی۔ میں نے کہا۔

"بھائی تمہارے پاس میں اس لئے آیا ہوں کہ تم مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کے صدر ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم سورت کے رہنے والے ہو۔ تم یہاں کے ہندوؤں کو بھی جانتے ہوا اور مسلمانوں کو بھی جانتے ہو۔ جبکہ میں یہاں اجنبی ہوں۔ تم مسلمانوں کے قاتل ہندوؤں کو تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔"

ابراہیم خان مجھے ہاتھ نہیں پکڑا رہا تھا۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ اسے کیسے یقین آتا کہ میں مسلمانوں کا ہمدرد ہوں اور مسلمان بھی ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"بھائی مجھے کیا معلوم کہ وہ کون ہندو تھے۔ ہزاروں غنڈوں نے حملہ کیا تھا۔ کیا خبر کس نے کس کو قتل کیا؟"

میں ابراہیم خان کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرے مجھے اس کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس کی مدد کے بغیر میں مسلمانوں کے قاتل ہندوؤں تک نہیں پہنچ سکتا اور یہ کہ میں نے مسلمانوں پر ہندو غنڈوں کے ظلم وستم کے جو واقعات سنے ہیں۔ انہوں نے میرے اندر جوالا مکھی کی آگ بھڑکا دی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں درندہ صفت ہندو غنڈوں سے اپنے بھائی بہنوں کے خون کا جب تک حساب نہیں چکا لوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میری باتوں کا ابراہیم خان پر کچھ کچھ اثر ہونے لگا تھا کہ مکان میں ایک آدمی داخل ہوا جو سلام کرکے ہمارے قریب آگیا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور غصے بھری آواز میں کہا۔

"تم تو وہی ہندو ہو جو اس روز کیمپ میں بالا جی اور وسوانی کے ساتھ مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے آئے تھے۔ تمہارا نام دھرم چند ہے۔"

مجھ پر گویا بجلی سی گری۔ اس آدمی نے میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ یہ سن کر ابراہیم خان سنبھل کر بیٹھ گیا اور میری طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

"میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ اتنی ہمدردی کیسے

پیدا ہوگئی۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بھی شیو سینا کی ایک سازش کے تحت یہاں آیا ہے۔"

اس نے نئے آنے والے آدمی سے کہا۔

"ستار بھائی ! اپنے آدمیوں کو بلاؤ۔ میں اسے یہاں قابو کئے رکھتا ہوں۔ یہ شیو سینا کا جاسوس یہاں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"ابراہیم بھائی! میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ یقین کرو۔ میں مسلمان ہوں۔"

ستار بھائی بولا۔

"اگر مسلمان ہو تو اس روز کیمپ میں بالا جی اور شیو سینا کے وسوانی کے ساتھ کس لئے آئے تھے۔"

میں کچھ کہنے لگا تو ان دونوں نے مجھے دبوچ لیا۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھے۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑا لیا لیکن باہر بھاگنے کی بجائے اپنی جگہ پر موجود رہا اور کہا۔

"میں آپ کو صرف ایک ہی طریقے سے اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلا سکتا ہوں۔"

اور میں نے پاجامہ اتار دیا۔ میرے ختنے دیکھ کر دونوں کسی حد تک ٹھنڈے پڑ گئے۔ ستار بھائی کہنے لگا۔

"اگر تم ہندو نہیں، مسلمان ہو تو پھر شیو سینا کے جاسوس ہو اور یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو۔"

میں نے ستار بھائی سے کہا۔

"خدا کے لئے تم یہاں بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ میرا ایک راز تم پر کھل گیا ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں مسلمان ہوں۔ اس کی ذرا سی بھنک بھی بالا

ی اور رسوائی کو پڑ گئی تو نہ صرف یہ کہ میری جان خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ
ن ہزاروں بھارتی مسلمانوں کی جانیں بچانے کی میں کوشش کر رہا ہوں وہ بھی نہیں
چ سکیں گی۔ یہاں بیٹھ جاؤ اور تم دونوں میری بات کو غور سے سنو۔"

میں نے انہیں بالکل نہیں بتایا کہ میں پاکستانی ہوں اور پاکستان سے مسلمانوں اور پاکستان کی سلامتی کے مشن کو لے کر بھارت میں داخل ہوا ہوں۔ میں یہ انہیں بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں انبالے کا مسلمان ہوں۔ احمد آباد بھاگل پور اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں انتہا پسند ہندو جماعتوں کے اشارے پر ہندو غنڈے مسلمانوں کا جو آئے دن خون بہاتے رہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں ہندو بن کر ان مسلم دشمن ہندو جماعتوں میں گھس جاؤں گا اور ان کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں کو صرف بے نقاب ہی نہیں کروں گا بلکہ ہر وقت مسلمانوں کو ان سازشوں سے آگاہ کر کے اپنے مسلمان بہن بھائیوں کی جانیں بچاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنا نام دھرم چند رکھا اور ہندو بن کر پنجاب سے شیوسینا کی جماعت میں بھرتی ہو گیا اور اپنی ہوشیاری کی وجہ سے جماعت کا اہم رکن بن گیا اور مری رسائی بالا جی اور بال ٹھاکرے تک ہو گئی۔ میں نے ابراہیم خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ابراہیم بھائی! مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہئے۔ آپ صرف میری اتنی مدد کریں کہ مجھے ان ہندو غنڈوں اور قاتلوں کے نام اور حلئے بتا دیں جنہوں نے سورت کے مسلم محلوں میں مسلمانوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں کو ننگا کر کے ان کی بے حرمتی کی' انہیں سڑکوں پر ننگا دوڑایا اور پھر انہیں قتل کر دیا۔ بس اس کے سوائے مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ یہ بھی میں آپ سے اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ میں اس شہر کا رہنے والا نہیں ہوں اور ان قاتلوں کو تلاش نہیں کر سکتا۔ آپ ان کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ یہ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ اگر میں پکڑا گیا تو میری زبان پر آپ لوگوں کا نام نہیں آئے گا۔ میں بھی آپ سے ایک

وعدہ لینا چاہوں گا کہ میرے مسلمان ہونے کا راز آپ کے سوا یہاں اور کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ اگر بالا جی اور بال ٹھاکرے کو اس حقیقت کا پتہ چل گیا کہ میں ان کی شیوسینا کا اہم رکن دھرم چند نہیں ہوں بلکہ اپنے مسلمان بھائی بہنوں کے لئے اپنی جان قربان کر دینے والا سچا مسلمان ہوں تو وہ مجھے اسی وقت قتل کر ڈالیں گے۔"

ابراہیم خان میری طرف بہت حد تک ہمدردانہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے مگر ستار بھائی کو ابھی تک شاید مجھ پر کچھ شک تھا۔ اس نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مسلمان ہو کر بھی شیوسینا کے ساتھ مل گئے ہو۔ تم نیشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان ہو اور شوسینا کی طرف سے تمہیں ہماری جاسوسی کے لئے بھیجا گیا ہو۔"

میں نے ہلکی سی طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ستار بھائی! اگر میں شیوسینا کا مسلمان جاسوس ہوتا تو تمہارے پاس آ کر تم سے مسلمانوں کے ہندو قاتلوں کے حلیئے اور پتے نہ پوچھتا۔ بلکہ تم سے یہ پوچھتا کہ سورت کے جو مسلمان تاجر لوگ اور ہیروں کے سوداگر روپوش ہو گئے ہیں وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں تاکہ شیوسینا کے دہشت گرد ہندو غنڈے انہیں بھی ٹھکانے لگا دیں۔"

اس دلیل نے ستار بھائی کو بھی قائل کر لیا۔ اب وہ دونوں میرے بہت حد تک قائل ہو گئے تھے اور میرے بارے میں ان کے شک شبے بہت حد تک دور ہو گئے تھے۔ پھر بھی بات کرنے میں ان کا رویہ بے حد محتاط تھا۔ وہ کھل کر بات نہیں کر رہے تھے۔ ابراہیم بھائی نہ کہا۔

"بھائی ہم نے ان ہندو غنڈوں کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا جنہوں نے مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی ہے۔ البتہ ہم تمہیں ایک آدمی سے ملا دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے ان ہندوؤں کا پتہ ہے جنہوں نے مہندی خان اور غفار احمد کی

بیٹیوں یاسمین بانو اور گل بہار کو اجتماعی بے حرمتی کے بعد سڑک پر ننگا دوڑا کر قتل کر ڈالا تھا۔"

میں سمجھ گیا کہ ابراہیم خان اور ستار بھائی سب کچھ جانتے ہوئے بھی خود نہیں بتانا چاہتے۔ مجھے تو ان ہندو درندوں کے نام پتے اور حلئے درکار تھے' چاہے وہ کوئی بھی بتا دیتا۔ میں نے کہا۔

"میں یہی چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس آدمی سے ملا دیں۔ یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔"

ابراہیم نے ستار بھائی کی طرف دیکھا۔ ستار بھائی نے اسے کہا۔

"میں کل اُسے اس آدمی کے پاس لے جا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کل یہاں آ جاؤں گا۔ مجھے وقت بتا دیں۔"

ستار بھائی نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں بھائی! تمہیں لیگ کے دفتر یا اس جگہ آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی - تم ایسا کرنا کہ سورت کے اشوک سینما ہاؤس کے باہر آ جانا۔ میں تمہیں وہیں اس آدمی سے ملا دوں گا۔ تم ایسا کرنا کل سہ پہر چار بجے وہاں آ جانا۔"

میں نے اٹھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا اور دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھ سے وعدہ کریں کہ میرے مسلمان ہونے کا راز آپ کے سوا اور کسی تک نہیں پہنچے گا۔"

دونوں نے مجھ سے باری باری ایک بار پھر ہاتھ ملایا اور یقین دلایا کہ وہ میرے مسلمان ہونے کی بات کسی سے نہیں کریں گے۔ میں جاتے جاتے رک گیا۔ مجھے ایک اہم بات کا خیال آگیا جو ان کو بتانی بہت ضروری تھی۔ میں نے ابراہیم خان سے کہا۔

"ابراہیم بھائی! ایک اور ضروری بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ یہ شیو سینا کا

ایک خطرناک راز ہے جو میں آپ کو پہلے سے بتا کر باخبر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

پھر میں نے انہیں بتایا کہ شیوسینا سورت کے بعد اب احمد آباد میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا منصوبہ تیار کر رہی ہے اور اس سلسلے میں بالا جی اور وسوانی بال ٹھاکرے کا اشیرواد لے کر احمد آباد پہنچ چکے ہیں۔ آپ لوگ جس طرح بھی ہو اور جہاں تک ہو سکے احمد آباد کے مسلمانوں کو خبردار کر دیں کہ شیوسینا اور راشٹریہ سیوک سنگ کے غنڈے ان کے قتل عام کا ناپاک منصوبہ تیار چکے ہیں۔ ابراہیم اور ستار بھائی کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے اور کبھی مجھے تکتے۔ میں نے کہا۔

"یہ ایک ایسا راز ہے جو یہاں سورت میں سوائے میرے' بالا جی' وسوانی اور بال ٹھاکرے کے اور کسی کو معلوم نہیں ہے۔ مجھے بھی اسی واسطے معلوم ہے کہ ہندو بن کر ان کے درمیان رہ رہا ہوں۔ اگر مجھے آپ کے ہاں مسلمانوں کے ہندو قاتلوں کا سراغ معلوم کرنے کے لئے نہ آنا ہوتا تو شاید میں بھی ان کے ساتھ ہی احمد آباد چلا گیا ہوتا۔"

ابراہیم خان کہنے لگا۔

"تمہارا شکریہ کہ تم نے ہمیں پیشگی خبردار کر دیا۔ ہم سے جہاں تک ہو سکا احمد آباد کے مسلمانوں کو خبردار کر دیں گے لیکن جہاں ہندو راج ہو اور پولیس بھی ہندو کی ہو اور فوج بھی ہندو کی ہو وہاں تو مسلمانوں کا بس اللہ ہی حافظ ہو سکتا ہے۔"

ستار بھائی جوش میں آگیا۔ کہنے لگا۔

"ابراہیم بھائی۔ اب ہمیں بھی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طاقت سے اٹھ کھڑے ہونا چاہئے۔ ہم کب تک اپنے بچوں کو ہندو غنڈوں سے کٹواتے رہیں گے ....."

میں نے ان سے اجازت لی اور واپس چل پڑا۔

ستار بھائی کی دونوں باتیں صحیح تھیں۔ انہیں پوری طاقت کے ساتھ ہندو

غنڈوں کے خلاف محاذ بنانے کی ضرورت تھی مگر ان کی دو مجبوریاں تھیں۔ پہلی مجبوری یہ تھی کہ بھارت میں ہندوؤں کی حکومت تھی جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ جن کو مسلمانوں کا چلنا پھرنا' عبادت کرنا' کھانا پینا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور پولیس بھی ہندو کی تھی اور فوج بھی ہندو کی تھی۔ ملٹری اور سول کے تمام اونچے عہدوں پر ہندو فائز تھے۔ مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے عہدوں تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔ دوسری کمزوری بھارت کے مسلمانوں کی یہ تھی کہ ان کا کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جو ان کے حقوق کے واسطے ہندو حکومت کے آگے ڈٹ کر لڑ سکتا۔ دلی میں جو مسلمان کے لیڈر تھے ان میں سے دو ایک کو چھوڑ کر باقی سب کانگریس کے پروردہ تھے اور ہندو حکومت کے اشاروں پر چلتے تھے۔ انہیں صرف ہندو اور کانگریسی حکومت کی خوشنودی منظور تھی۔ انہوں نے اپنے عالی شان بنگلے بنوا رکھے تھے۔ جہاں ان کے بچوں کے لئے سوئمنگ پول تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندو غنڈے جب چاہیں جس شہر میں چاہیں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیتے تھے۔ غریب مسلمان گاجر مولیوں کی طرح کاٹ دیئے جاتے تھے۔ ان کی بچیوں کی آبرو ریزی کی جاتی تھی۔ ان کے مکانوں دکانوں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا تھا اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔

لیکن میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ سورت میں جن جن ہندو غنڈوں نے مسلمانوں بچیوں کی آبرو ریزی کی ہے اور انہیں سڑکوں پر ننگا دوڑا کر قتل کیا ہے اور انکی عزتیں برباد کی ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے بھوپت ڈاکو ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ اگلے روز سہ پہر کے وقت میں اشوک سینما میں پہنچ گیا۔ ستار بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ وہ مجھے وہاں سے ایک قریبی بازار میں لے گئے۔ اس بازار میں ایک تنگ گلی تھی۔ گلی میں نالوں پراندوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ دکان پر ایک دبلا سا ادھیڑ عمر آدمی جس کی شرعی ڈاڑھی تھی سر پر گجراتی مسلمانوں والی ٹوپی پہنے بیٹھا ایک پراندے میں

گوٹے کے تار جوڑ رہا تھا۔ ستار بھائی نے میرے بارے میں اسے بتا دیا ہوا تھا۔ اس آدمی کا نام معلوم نہیں کیا تھا ستار نے حاجی بھائی کہہ کر اس کا مجھ سے تعارف کرایا۔

حاجی صاحب نے کام چھوڑ دیا اور ہمیں دکان کے اوپر والے چوبارے میں
لے گئے۔ ستار نے میرے آنے کا مقصد انہیں بیان کر دیا ہوا تھا۔ حاجی بھائی کہنے
لگے۔

"شیو سینا کے جن ہندوؤں نے غفار احمد کے مکان پر حملہ کیا تھا اور اس کی
یاسمین بانو کی بے حرمتی کی تھی۔ ان میں ایک ہندو غنڈہ بھاسکر راؤ تھا۔ ایک
دا تھا اور تیسرا پاٹیکر تھا۔ ان تینوں نے یاسمین بانو کے کپڑے پھاڑے تھے۔ اس
ساتھ زیادتی کی تھی اور اسے باپ کے سامنے بے آبرو کیا تھا۔ مہندی خان کی
کو جس نے بے آبرو کرنے کے بعد قتل کیا تھا اس کا نام کالیا تھا۔ ان چاروں کا تو
معلوم ہے۔ باقیوں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میں نے پوچھا۔

"حاجی بھائی! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ چاروں کہاں رہتے ہیں؟"

حاجی بھائی سوچنے لگے' پھر کہا۔

"ہیں تو وہ مراٹھے مگر سورت میں رہتے ہیں۔ اب پتہ نہیں باہر نہ چلے گئے
ں۔ اس کا پتہ کرکے ہی میں بتا سکوں گا۔ آپ ایسا کرو کہ پرسوں میری دکان پر آ
یں ان چاروں غنڈوں کے بارے میں معلومات حاصل کر رکھوں گا۔"

میں اور ستار بھائی واپس آ گئے۔

ستار بھائی کو میں نے مسلم لیگ کے دفتر والے بازار کی نکڑ پر چھوڑ دیا اور
شیو سینا کے آفس میں آگیا۔ بالا جی اور منو وسوانی احمد آباد گئے ہوئے تھے۔ میں

اوپر والے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ چاروں ہندو غنڈوں اور مسلمانوں کے قاتلوں کو کیسے ٹھکانے لگاؤں گا۔ مجھے تھوڑی بہت نیم فوجی یا کمانڈو کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ میں ہر قسم کا اسلحہ بھی چلا لیتا تھا۔ اسلحہ یعنی آٹو میٹک پستول وغیرہ مجھے شیو سینا کے اسلحہ ڈپو سے مل سکتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے یہ معلوم ہو جانا چاہئے تھا کہ مسلمانوں کے یہ قاتل اور بے گناہ معصوم مسلمان بچیوں کی عزتیں برباد کرنے والے یہ غنڈے کن کن جگہوں پر ہیں۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا کہ مجھے ان کو کیسے ٹھکانے لگانا ہے۔ دوپہر تک میں آفس کے اوپر والے کمرے میں ہی لیٹا رہا۔ دوپہر کا کھانا میں نے بازار کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ کوئی چار پانچ بج رہے تھے کہ آفس سیکریٹری کو بال ٹھاکرے کے سکریٹری کا فون آیا کہ دھرم چند کہاں ہے۔ آفس سیکریٹری نے مجھے اوپر سے بلا لیا۔ میں نے فون پر سیکریٹری سے بات کی تو وہ کہنے لگا۔

"دھرم چند! سینا پتی جی نے تمہیں اسی وقت بلایا ہے۔"

میں حیران ہوا کہ بال ٹھاکرے بمبئی سے سورت کیسے آ گیا۔ پتہ چلا کہ ایک خاص اور اہم میٹنگ کے سلسلے میں ٹھاکرے جی کو آنا پڑا ہے اور وہ اس وقت کیٹ باڑی کے علاقے میں ایک دیوی دتہ کے بنگلے پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک آدمی مجھے دیوی دتہ کے بنگلے پر لے گیا۔ یہاں بھی سخت پہرہ تھا۔ میری تلاشی لے گئی۔ وہ لوگ میرے صورت شناسا تھے۔ پھر بھی انہوں نے پوری طرح میری تلاشی لی۔ ایک باڈی گارڈ خود مجھے بال ٹھاکرے کے کمرے میں لے گیا۔

بال ٹھاکرے ماتھے پر شیو دیوتا کا سرخ تلک لگائے زعفران کے سلکی کرتہ پاجامے میں ملبوس کندھوں پر زعفرانی رنگ کی ریشمی چادر ڈالے اسی آن بان سے صوفے میں بیٹھا تھا۔ تپائی پر اس کا چاندی کا سگریٹ کیس اور لائیٹر پڑا تھا۔ ایک سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ میں نے اندر آنے کے بعد ہاتھ باندھ کر بادل نخواستہ تھوڑا سا جھک کر اسے پرنام کیا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے

بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ میں سامنے والے صوفے کے کونے میں ذرا آگے ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک دو سیکنڈ خاموشی سے اپنی مقناطیسی آنکھوں سے میری طرف گھورنے کے بعد کہا۔

"بالاجی اور وسوانی کب گئے تھے احمد آباد؟"

میں نے کہا۔

"کل گئے تھے مہاراج۔"

ہلکی سی "ہوں" کہہ کر بال ٹھاکرے اطمینان سے سگریٹ پینے لگا۔ یہ آدمی اس قدر پراسرار تھا کہ اس کے چہرے کو دیکھ کر آدمی بالکل اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے اور وہ کیا سوچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی سے سگریٹ پینے کے بعد بال ٹھاکرے نے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کی راکھ بلور کے ایش ٹرے میں آہستہ سے جھاڑتے ہوئے بولا۔

"دھرم چند! میں نے تمہارے بارے میں پوری معلومات حاصل کی ہیں۔"

وہ چپ ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میرا بھید کھل گیا ہے۔ اب میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اصلی دھرم چند نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور دھرم چند کا ہم شکل ہونے کی وجہ سے اس کا روپ دھار کر انڈیا میں جاسوسی کرنے آیا ہوں۔ میں نے اپنے چہرے سے دل کی پریشانی کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا لیکن اندر سے میں ہل گیا تھا۔

بال ٹھاکرے کی عادت میں نے نوٹ کی تھی کہ ویسے بھی وہ کم گفتار اور خاموش طبع تھا لیکن جب اسے کسی خاص موضوع پر بات کرنی ہوتی تھی تو وہ ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر بولتا تھا۔ دو چار سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا اور بولا۔

"تمہارا سارا ریکارڈ میں نے چیک کیا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم بھروسے کے آدمی ہو۔"

میری جان میں جان آ گئی۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ بال ٹھاکرے کہہ رہا تھا۔

"شیو سینا کی پنجاب شاخ میں اس وقت تم سے زیادہ دلیر اور تجربے کار اور کوئی آدمی مجھے دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے عاجزی سے کہا۔

"سیناپتی جی! یہ آپ کی کرپا ہی سے ہے۔"

وہ بولا۔

"نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ تمہارا ریکارڈ بتاتا ہے کہ تم نے ہمارے آدمیوں کو کس عقل مندی اور سوچی سمجھی عمدہ سکیم کے ساتھ لاہور پولیس کی قید سے فرار کروانے کا آپریشن تیار کیا تھا۔ یہ تو پرکاش کھنہ کی بیوقوفی سے معاملہ الٹ پڑ گیا۔ وہ نہایت احمق شخص تھا۔ میں نے اسے سفارت خانہ سے نکلوا کر دلی آفس میں لگا دیا ہے۔"

اتنے میں ایک نوکر ٹرے لے کر آ گیا جس میں بیر کی بوتل اور بلور کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ نوکر بیر گلاس میں ڈالنے لگا تو بال ٹھاکرے نے انگلی کے اشارے سے اسے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ جب نوکر چلا گیا تو میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سیناپتی جی! میں بیر کا گلاس بنا دوں؟"

بال ٹھاکرے نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا۔ میں نے بڑے اہتمام کے ساتھ بیر گلاس میں ڈالی۔ پھر پلیٹ میں سے برف کی ڈلیاں چمچ کے ساتھ اٹھا کر گلاس میں ڈالیں اور ٹشو پیپر سے گلاس صاف کر کے ٹرے میں رکھ دیا اور واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

بال ٹھاکرے نے گلاس اٹھایا۔ بیئر کے دو گھونٹ پیئے۔ گلاس ٹرے میں رکھا۔ ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹ صاف کئے۔ ایش ٹرے میں سلگتا ہوا سگریٹ اٹھا کر اس کا ہلکا سا کش لیا اور بولا۔

"احمد آباد والے آپریشن کو تو بالا جی اور منو وسوانی سنبھال لیں گے۔ یہاں
ورت میں ان لوگوں نے بالکل پروگرام کے مطابق مسلمانوں کو ختم کیا ہے۔ اس
م کا کام یہ لوگ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے کر لیتے ہیں لیکن جو کام میں تمہیں
نپنے والا ہوں وہ کام صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ بالا جی یا منو وسوانی نہیں کر سکتے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ شخص مجھ کوئی نیا مشن دینے والا ہے۔ میں بالکل خاموش
ہا اور بال ٹھاکرے کی طرف عاجزانہ اور خوشامدانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ بڑا نازک' بڑا سیکرٹ اور خاص مشن ہے۔ اس مشن کی پوری تفصیل
م بمبئی آؤ گے تو تمہیں بتاؤں گا۔ ابھی میں تمہیں صرف اتنی تاکید کروں گا کہ اس
رے میں اپنی زبان بند رکھنا اور بالا جی اور منو وسوانی کو بھی کچھ نہ بتانا۔"

میں نے کہا۔

"سینا پتی جی! آپ جو حکم کریں گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

بال ٹھاکرے کو یہ لوگ مہاراج بھی کہتے تھے۔ ٹھاکر صاحب بھی کہتے تھے
اور سینا پتی بھی کہتے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بال ٹھاکرے اپنے آپ کو سینا پتی
کہلوانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ جب کوئی اسے سینا پتی کہتا ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔
بال ٹھاکرے بیر کے گھونٹ چڑھا رہا تھا۔ گلاس اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔

کہنے لگا۔

"یہاں سورت کے بنگلے میں تمہارے اور میرے درمیان جو باتیں ہوئی
ں اور اس کے بعد بمبئی میں تمہارے اور میرے درمیان جو باتیں ہوں گی وہ راز
ں رہیں گی اور کسی کو ان کے بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج جی! ایسا ہی ہو گا۔ آپ اس معاملے میں بے فکر رہیں۔ دھرم
ہند راز کو ہضم کرنا جانتا ہے۔"

"یہ مجھے معلوم ہے۔"

اس نے سر ہلاتے اور بیر کے گلاس کو ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا سگریٹ بجھ گیا تھا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا اور چاندی کے سگریٹ کیس میں سے نیا سگریٹ نکال کر لائیٹر اٹھانے لگا تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لائٹر اٹھا کر جلایا اور کہا۔

"مہاراج! میں آپ کا سیوک یہاں کس لئے بیٹھا ہوں۔ مجھے بھی سیوا کا موقع دیجئے۔"

بال ٹھاکرے کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا کہنے لگا۔

"تمہاری یہ باتیں موقع شناسی اور ذہانت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس مشن پر میں تمہیں بھیجنے والا ہوں۔ اس مشن کے لئے ان دو چیزوں کی بڑی ضرورت ہوگی۔"

اس نے میرے جلائے ہوئے لائیٹر کے شعلے سے اپنا سگریٹ سلگایااور صوفے پر پیچھے ہو کر ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"جب تک بالا جی اور منو وسوانی احمد آباد سے واپس نہیں آ جاتے۔ تم یہاں سورت میں ہی رہو گے۔ میں آج رات کی فلائیٹ سے واپس بمبئی جا رہا ہوں۔ میں یہاں ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں آیا تھا اور مجھے تم سے بھی یہ باتیں کرنی تھیں۔ دوپہر کو مجھے احمد آباد سے بالا جی کا فون آیا تھا۔ انہیں وہاں ہفتہ دس دن لگ جائیں گے ہو سکتا ہے وہ اس سے پہلے کام ختم کر کے آ جائیں۔ تم ان کے ساتھ ہی بمبئی واپس آجانا۔ جب تم بمبئی پہنچ جاؤ گے تو میں خود تمہیں اپنے پاس بلاؤں گا اور تمہیں اس خطرناک اور اہم ترین مشن کی پوری تفصیل بتا دوں گا جس مشن پر میں تمہیں روانہ کرنے والا ہوں۔ میں تمہیں ایک بار پھر تاکید کرنا چاہوں گا کہ میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں۔ اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔"

میں نے فوراً" کہا۔

"سینا پتی جی! آپ یقین کریں۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے دل کے کنوئیں میں جاکر اس کی تہہ میں بیٹھ گیا ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں دنیا کا کوئی انسان جھانک کر نہیں دیکھ سکتا۔"

بال ٹھاکرے مسکرایا۔ میں نے شاید پہلی بار اسے اس طرح ذرا کھل کر مسکراتے دیکھا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس کی نسواری سنگ دل بے رحم آنکھیں مزید سکڑ گئیں۔ کہنے لگا۔

"تم باتیں بھی خوب کر لیتے ہو۔ بھارت ماتا کو تمہارے ایسے سپوتوں کی ضرورت ہے۔ اب تم جاؤ' تمہاری میری ملاقات اب بمبئی میں ہو گی۔"

میں نے اٹھ کر بڑے ادب سے بال ٹھاکرے کے گھٹنوں کو چھوا۔ ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور الٹے پاؤں دروازے سے باہر نکل گیا۔ یہ سب کچھ میں نے اسی لئے کیا تھا کہ بال ٹھاکرے نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے وہ اس قسم کی خوشامد سے مزید پختہ ہو جائے اور میں شیو سینا کی ان تمام خفیہ سازشوں سے باخبر ہو جاؤں جو بھارت کے مسلمانوں اور خاص طور پر پاکستان کے خلاف تیار کی جا رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ جس مشن پر بال ٹھاکرے مجھے بھیجنے والا ہے وہ بھی پاکستان کے خلاف ہی ہوگا اور اس مشن کو ناکام بنانا اب میرا کام بلکہ فرض بن گیا تھا۔

رات کی فلائیٹ سے بال ٹھاکرے بمبئی واپس چلا گیا۔ یہ مجھے شیو سینا کے آفس سے معلوم ہوگیا۔ آفس سیکریٹری کی نگاہوں میں میرا مقام بہت بلند ہو گیا تھا کیونکہ ٹھاکرے جی نے سورت میں آنے کے بعد مجھے اپنے پاس بلا کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مجھ سے میٹنگ کی تھی۔ اس نے مجھ سے سرسری طور پر پوچھا کہ ٹھاکرے جی سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بس اپنی پارٹی کے بارے میں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد آفس سیکریٹری نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ بال ٹھاکرے جی جب بھی کسی کو خاص طور پر بلاتے ہیں تو وہاں جو باتیں ہوتی ہیں۔ انہیں سختی سے راز میں رکھا جاتا ہے۔

اس کے اگلے دن میرا حاجی بھائی سے ملنے کا پروگرام تھا۔ میں ٹھیک وقت پر ان کی نالوں پراندوں کی دکان پر پہنچ گیا۔ ستار بھائی وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ مصلحت اندیشی سے کام لے رہے تھے۔ اس لئے کہ انہیں اسی ملک میں رہنا تھا۔ حاجی بھائی دکان پر کام میں لگے ہوئے تھے۔ ایک شاگرد پیشہ لڑکا بھی اس وقت وہاں بیٹھا تلے کے تار الگ الگ کر رہا تھا۔ حاجی بھائی مجھے چوبارے میں لے گئے۔

جب ہم دونوں سے بیٹھ گئے تو حاجی بھائی نے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ بھاسکر' کالیا' شیوا اور پاٹیکر یہ چاروں اس وقت سورت میں نہیں ہیں۔"

میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

"پھر وہ کہاں ہیں؟"

حاجی بھائی بولے۔

"بتاتا ہوں بھائی' تم ذرا صبر تو کرو۔"

میں چپ ہو کر بیٹھا رہا۔ حاجی بھائی کہنے لگے۔

"شیوا' بھاسکر اور پاٹیکر جنہوں نے غفار احمد کی بیٹی یاسمین بانو کی اجتماعی آبروریزی کی تھی اور اس کے دو بھائیوں کو قتل کیا تھا۔ ان تینوں کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ انہیں شیوسینا اور راشٹریہ سیوک سنگ والوں نے ہی اس واسطے ادھر ادھر کر دیا ہے کہ شہر کے مسلمانوں کی نظروں میں نہ آجائیں کیونکہ مسلمان وکیلوں نے مل کر اس قتل عام کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا ہے۔"

"کچھ معلوم ہوا کہ یہ تینوں کہاں ہوں گے؟"

میں نے اپنی بے تابی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بظاہر بڑے سکون کے ساتھ پوچھا۔ حاجی بھائی بولے۔

"شیوا' بھاسکر اور پاٹیکر کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ جالندھر شہر کے باہر ایک مندر ہے۔ جس کو بوڑ والا مندر کہتے ہیں۔ یہ تینوں قاتل اسی مندر میں

بڑے پجاری کے مہمان بن کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"میں انہیں کیسے پہچان سکوں گا؟"

حاجی بھائی بولے۔

"میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ میں تمہیں ان تینوں کی تصویریں دکھاتا ہوں۔"

اس کے بعد حاجی بھائی نے اٹھ کر الماری میں سے ایک رجسٹر نکالا۔ رجسٹر میں سے خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکال کر کھولا۔ اس میں تین پاسپورٹ سائز کے بلیک اینڈ وائٹ فوٹو تھے۔ تینوں فوٹو میری طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"یہ ان تینوں کی تصویریں ہیں۔ ان کے نیچے ان کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔"

میں فوٹو دیکھنے لگا۔ یہاں آپ کو ان کے حلیئے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال میں نے شیوا، پاٹیکر اور بھاسکر کی شکلوں کو اچھی طرح سے اپنے ذہن میں نقش کر لیا اور تصویر واپس دینے لگا تو حاجی بھائی بولے۔

"مجھے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ان کو اپنے پاس ہی رکھو۔ وقت پر تمہیں کام آئیں گی۔ ہو سکتا ہے ان کی شکلیں تم کو یاد نہ رہیں۔"

میں نے تینوں پاسپورٹ سائز کے فوٹو لفافے میں ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لئے اور حاجی صاحب سے مسلمانوں کے چوتھے قاتل اور دشمن اسلام کے بارے میں پوچھا۔

"جس نے مہندی خان کی بیٹی کو بے آبرو کر کے شہید کیا تھا اور جس کا نام آپ نے کالیا بتایا تھا یہ کہاں ہو گا۔"

حاجی صاحب کہنے لگے۔

"اس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔ اس کا گھر تھانر قصبے میں ہے۔ تھانر قصبہ گجرات اور مہاراشٹر کی سرحد پر ہے۔ بھساول سے

کامٹی کی طرف جو ریل گاڑی جاتی ہے۔ یہ قصبہ اسی لائن پر آتا ہے۔ قصبے کے قریب دریائی ٹاپی بہتا ہے۔ سیٹھ ہری داس اس قصبے کا بہت بڑا جاگیردار ہے۔ وہ بہت بڑے مکان میں رہتا ہے۔ کالیا ایک طرح سے اس کا باڈی گارڈ ہے۔ وہ قصبے کا بدمعاش ہے۔ لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کا قصبے میں دریا کنارے اپنا ڈیرہ ہے۔ جہاں وہ دیسی شراب بنا کر بیچتا ہے۔ جاگیردار ہری داس کا باڈی گارڈ اور بدمعاش ہونے کی وجہ سے پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔ میرا خیال ہے تمہارے واسطے اتنی معلومات کافی ہوں گی۔"

"بالکل کافی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"مجھے یہ بھی بتا دیں کہ سورت سے کونسی گاڑی کامٹی بھساول کی طرف جاتی ہے۔"

حاجی بھائی بیڑی پیتے ہوئے بولے۔

"یہ تو تمہیں سٹیشن پر جا کر معلوم ہو گا۔"

میں نے حاجی بھائی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں چاہوں گا کہ جو باتیں آپ کے اور میرے درمیان اس وقت ہوئی ہیں ان کا سوائے ستار بھائی اور ابراہیم بھائی کے اور کسی شخص کو علم نہ ہو۔"

حاجی بھائی ۔ نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے خوشی ہے کہ کم از کم ایک مرد تو ایسا نکلا جو ان کافر درندوں سے مسلمانوں کے خون کا حساب چکانے جا رہا ہے۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔"

میں نے حاجی بھائی کے گھر سے نکل کر سورت میں شیو سینا کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسی رات کو احمد آباد سے بالاجی کا دوبارا فون آ گیا۔ اس نے دفتر کے سیکریٹری سے میرے متعلق پوچھا کہ دھرم چند آفس میں ہے؟ سیکریٹری نے

کہا۔

"ہاں ہے۔ میں فون اسے دیتا ہوں۔"

اس نے ریسیور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بالا جی کا احمد آباد سے فون ہے۔"

میں نے ریسیور لے کر کہا۔

"ہیلو بالا جی! رام رام۔ میں دھرم چند بول رہا ہوں۔"

بالا جی نے کہا۔

"دھرم چند! ہمیں یہاں دیر لگ جائے گی تم واپس بمبئی مت جانا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے واپس سورت آکر تمہیں کوئی ڈیوٹی دینی پڑے۔"

میں نے کہا۔

"میں سورت میں ہی رہوں گا۔ بالا جی آپ نچنت رہیں۔ ویسے آپ کو کتنے دن اور لگیں گے احمد آباد میں؟"

بالا جی نے کہا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں کے خاص خاص ہندو لیڈروں سے مل کر سارا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ احمد آباد کے کپڑے کے مسلمان تاجر اور دوسرے امیر مسلمانوں کی لسٹیں بنا رہے ہیں تاکہ سب سے پہلے انہیں نشانہ بنایا جائے۔"

مجھے یقین تھا کہ ابراہیم بھائی اور ستار بھائی نے شیوسینا کے ان ناپاک منصوبوں کے بارے میں احمد آباد کے سرکردہ مسلمانوں اور وہاں کے مسلم لیگی رضا کاروں اور نوجوان مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہوگا اور یہ لوگ اپنے ناپاک عزائم میں کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے۔

میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے بالا جی! ان لوگوں کا پورا پورا بندوبست کر کے آئیں تاکہ اس بار احمد آباد میں ایک بھی مسلمان نہ بچنے پائے۔"

بالا جی کی آواز آئی۔

"ایسا ہی ہوگا۔ جے شیو شنکر کی۔"

میں نے جواب میں کہا۔

"جے شیو شنکر کی۔"

اور فون بند ہوگیا۔ میں نے فون بند کرنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں او
اپنے دل میں کہا۔

"یا میرے مولا! احمد آباد کے مسلمانوں کی حفاظت فرمانا۔"

آفس سیکریٹری بولا۔

"مہاراج آنکھیں کیوں بند کر لیں؟"

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دو تین بار انہیں جھپکایا اور کہا۔

"کچھ پڑ گیا ہے آنکھوں میں۔"

اور جیب سے رومال نکال کر یونہی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ بالا جی اور منو
وسوانی کو احمد آباد میں ایک ہفتہ تو ضرور لگ جانا تھا۔ اس دوران مجھے مہندی خان
کے بیٹے کے قاتل اور اس کی بیٹی کی بے حرمتی کرنے والے کالیا کو ٹھکانے لگانا تھا۔
اتنا مجھے معلوم تھا کہ کامتی بھساول وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اب مسئلہ کوئی
پستول وغیرہ حاصل کرنے کا تھا۔ میں نے اس کا حل سوچ لیا۔ رات کا کھانا کھانے
کے بعد میں آفس میں آیا۔ آفس سیکریٹری بھی ہندو گجراتی تھا۔ وہ دفتر میں ہی رات
کو سوتا تھا۔ میں نے اس کو کہا۔

"یار آج فلم کا آخری شو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کونسی فلم دیکھو گے؟"

میں نے ایک فلم کا نام لیا جو ان دنوں ریلوے سٹیشن کے ساتھ والے سینما
ہاؤس میں خوب چل رہی تھی۔ مراٹھا سیکریٹری بولا۔

"کوئی ہتھیار ضرور ساتھ رکھ لینا۔"

جو بات میں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس نے خود ہی کہہ ڈالی تھی۔ میں نے کہا۔
”یہ تم نے ٹھیک کہا مگر میرا پستول تو بمبئی میں ہے۔ یہاں آفس میں کوئی اسلحہ وغیرہ ہوگا؟“
آفس سیکریٹری چارپائی پر سے اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔
”ایک پستول اور ایک ریوالور الماری میں پڑا ہے۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ اگرچہ اس کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔“
اس نے مجھے ایک پرانا ریوالور نکال کر دکھایا۔ وہ خالی تھا۔ اس نے مجھے گولیاں بھی دے دیں۔ میں نے دیوالور میں بارہ کی بارہ گولیاں بھر لیں اور جیب میں رکھ لیا اور کہا۔
”یہ ریوالور تو مجھے ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہئے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم مسلمانوں کے محلوں میں بھی جاتے رہتے ہیں۔“
وہ بولا۔
”تم بیشک اسے اپنے پاس ہی رکھو۔“
میں سینما ہاؤس کی طرف چل دیا مگر سب سے پہلے ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ ایک گاڑی دن کے دس بجے بھساول سے ہوتی ہوئی کامٹی کی طرف جاتی ہے۔ مجھے یہی گاڑی پکڑنی تھی۔ سٹیشن سے نکل کر میں ٹکٹ لے کر سینما ہاؤس میں بیٹھ گیا۔ رات بارہ بجے فلم دیکھ کر واپس آیا۔ آفس سیکریٹری سو چکا تھا۔ میں بھی اپنے کمرے میں جاکر چارپائی پر لیٹ گیا۔
مجھے دوسرے روز دس بجے کی گاڑی پکڑنی تھی۔ میں نے سورت سے تین چار دن باہر رہنے کا بہانہ سوچ لیا۔ اگلے روز میں ناشتے کی غرض سے اکیلا ہی دوسرے چوک والے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر میں نے مراٹھا آفس سیکریٹری کو بتایا کہ ہوٹل میں مجھے میرا ماموں مل گیا ہے جو بڑودہ میں کاروبار کرتا ہے۔ میں دو تین دن کے لئے اس کے ساتھ بڑودہ اپنی ممانی اور ان کے بچوں

سے ملنے جارہا ہوں۔ ابھی یہاں بالا جی اور منو وسوانی کو بھی نہیں آنا۔ میں تین چار دنوں میں بلکہ اس سے پہلے ہی سورت واپس آ جاؤں گا۔ آفس سیکریٹری کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کہنے لگا۔

”ٹھیک ہے دھرم چند جی! آپ بے شک چلے جائیں۔“

میں نے کہا۔

”میں ریوالور ساتھ ہی لئے جا رہا ہوں کیونکہ کچھ معلوم نہیں کہ میرے جاتے جاتے احمد آباد بڑودہ میں ہندو مسلم فساد شروع ہو جائے۔“

وہ بولا۔

”ضرور ساتھ لے جاؤ مگر خیال رکھنا اس کا لائسنس نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”مہاراشٹر سوراشٹر میں بال ٹھاکرے جی کا راج ہے۔ کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں کہ شیوسینا والوں سے اسلحہ کا لائسنس مانگے۔“

آفس سیکریٹری نے ہنس کر کہا۔

”یہ تو دھرم چند جی تم نے سولہ آنے ٹھیک کہا۔“

میری جیب میں سو ڈیڑھ سو روپے موجود تھے۔ یہ کافی رقم تھی۔ مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ریوالور کو میں نے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے پاجامے کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔ سٹیشن پر آ کر میں نے دس بجے والی گاڑی پکڑی اور کامٹی کی طرف چل پڑا۔

رات کو بھساول کا سٹیشن آیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تھانر نام کا قصبہ جس میں کالیا ہندو بدمعاش اور مسلمانوں کا قاتل رہتا تھا۔ بھساول سے کامٹی جاتے ہوئے راستے میں آتا ہے۔ اس لائن پر میں نے پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ تھانر قصبے کا سٹیشن بھی چھوٹا تھا۔ رات کے وقت میں اس کا لکھا ہوا ہندی میں نام پڑھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس مسافر سے پوچھا کہ تھانر قصبہ رات کو کس وقت آئے گا؟ اس کی

زبانی معلوم ہوا کہ یہ قصبہ بھساول سے چلنے کے ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد آتا ہے اور ٹرین وہاں تھوڑی دیر ہی رکتی ہے۔ میں خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔ ٹرین بھساول سے روانہ ہو گئی۔ مجھے نیند آنا شروع ہو گئی۔ سونا میرے لئے خطرناک تھا۔ تھانز کا قصبہ نکل جاتا تو میرا بڑا وقت ضائع ہو جاتا اور وقت میرے لئے قیمتی تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ تین دن سورت سے باہر رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بالا جی اور منو وسوانی کسی بھی روز کسی بھی وقت احمد آباد سے سورت واپس آ سکتے تھے۔ راستے میں کوئی چھوٹا شہر آیا۔ گاڑی وہاں رکی تو میں نے چائے کا مٹی کا گلاس لے لیا۔ چائے گرم تھی۔ میں ساری چائے پی گیا۔ چائے نے میری نیند اڑا دی۔ جنگلاتی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں کوئی دریا بھی آ جاتا تھا۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ڈبے کی کھلی کھڑکی سے باہر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی درخت شاں کی آواز کے ساتھ نکل جاتا۔ ٹرین پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

میں نے وقت کا حساب رکھا ہوا تھا۔ میری کلائی کی گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ کوئی پونے تین بجے میری ساتھی مسافر نے مجھے بتایا کہ تیاری پکڑ لو بھیا تمہارا قصبہ تھانز اب آنے والا ہے۔ قصبے تھانز سے پہلے پہلے ٹرین ایک دریا کے پل پر سے گذری۔ اس کے بعد اس کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ پھر ایک سٹیشن پر رک گئی۔ یہ تھانز کا سٹیشن تھا۔ میں ٹرین سے اتر پڑا۔ صرف ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ اور مسافر بھی اترے۔ میں ٹکٹ دکھا کر سٹیشن کی ڈیوڑھی کے باہر آ کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے کہاں جانا چاہئے۔ کیا کرنا چاہئے۔

میرا ٹارگٹ اس قصبے کا کلال خانہ یعنی شراب کا ڈیرہ تھا۔ جو کالیا چلاتا تھا۔ اس کی تصویر میں اپنے ساتھ جیب میں لے کر آیا تھا۔ بجلی کی روشنی میں میں نے کالیا کی فوٹو کو ایک بار پھر غور سے دیکھ لیا تاکہ شکل پہچاننے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ابھی رات کا اندھیرا

چھایا ہوا تھا۔ سٹیشن سے کچھ دور قصبے کی دھندلی دھندلی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔
میں سٹیشن کی ڈیوڑھی میں آکر ایک بینچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ سگریٹ میں ایسے
ہی موقعوں پر پیا کرتا تھا۔ رومال میں لپٹا ہوا ریوالور جو بھرا ہوا تھا۔ میرے پیٹ کے
ساتھ لگا ہوا تھا اور مجھے اپنے مشن کا احساس دلا رہا تھا۔ ٹرین آگے کامٹی کی طرف
روانہ ہوگئی تھی۔ پلیٹ فارم خالی ہوگیا۔ ڈیوڑھی میں بھی سوائے میرے اور کوئی
نہیں تھا۔ ٹکٹ چیکر بھی کہیں غائب ہوگیا تھا۔ سٹیشن پر خاموشی چھا گئی تھی۔ قصبے کی
جانب سے کسی کتے کے بھونکنے کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ میں بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا۔
میں نے سوچا کہ صبح ہونے تک مجھے تھوڑی سی نیند کر لینا چاہئے۔ چنانچہ میں بنچ پر
اس طرح لیٹ گیا کہ پاجامے میں پھنسائے ہوئے ریوالور پر میرے دونوں ہاتھ تھے۔
ٹرین کے سفر میں میں بالکل نہیں سویا تھا۔ بڑی جلدی نیند آگئی۔ آنکھ اس
وقت کھلی جب ڈیوڑھی میں مسافر سامان اٹھائے پلیٹ فارم کی طرف جا رہے تھے۔
دن نکل آیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے پیٹ پر ایک جانب ہاتھ
رکھا۔ ریوالور موجود تھا۔ سٹیشن کے سامنے تین چار کھوکھا نما دکانیں کھل گئی
تھیں۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ٹھنڈی خوشگوار
ہوا چل رہی تھی۔ میں ایک چائے کی دکان پر آگیا۔ یہاں میں نے ناشتہ کیا۔ چائے
پی اور باہر آکر قصبے کی طرف جانے والے ایک یکے میں بیٹھ گیا۔ یکہ کھیتوں میں
سے گذر رہا تھا۔ ہرے بھرے کھیت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک
ٹیلے کے دامن میں قصبے کے ڈھلواں چھتوں والے مکان نظر آرہے تھے۔
مجھے کالیا کے کلال خانے میں جانا تھا۔ اس بارے میں یکے والا مجھے بالکل
صحیح معلومات دے سکتا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے قصبے کے بارے میں
کہا کہ یہاں تو سنا ہے پولیس کا بڑا انتظام ہے چوری چکاری وغیرہ بالکل نہیں ہوتی۔
یکے والا بولا۔
"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں جی۔ تھانے میں کیا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔

"لوگ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس گاؤں میں غیر قانونی شراب وغیرہ بالکل نہیں تیار ہوتی۔"

یکے والا ہنس پڑا۔ اس نے بتایا کہ تھانز میں کالیا کا شراب جوئے کا اڈا ہے۔ وہاں دیسی شراب بھی بکتی ہے' جوا بھی ہوتا ہے۔ اسے جاگیر دار کا آشیر باد حاصل ہے۔ پولیس نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اس کی زبانی مجھے پتہ چل گیا کہ کالیا کا شراب خانہ تاپی دریا کے کنارے پر بڑ کے درختوں کے درمیان بنا ہوا ہے۔

تھانز قصبے کے یکوں کے اڈے پر میں یکے سے اتر گیا اور دریا کی طرف چلنے لگا۔ یہاں دریا دو پہاڑی ٹیلوں کے درمیان میں سے گذر کر آتا تھا اور اس کا پاٹ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ املی ناریل اور تاڑ کے بہت درخت تھے۔ ایک جانب مجھے بڑ کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ میں اس طرف چل پڑا۔

یہاں ایک جھونپڑا تھا' جس کے باہر کچھ مزدور اور کسان ٹائپ کے لوگ زمین پر آمنے سامنے بیٹھے دیسی شراب پی رہے تھے۔ یہ دیسی شراب تاڑی تھی۔ یہ لوگ مٹی کے آبخوروں میں سفید رنگ کی تاڑی پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ پتوں پر رکھے ہوئے نمکین چنے بھی کھاتے جا رہے تھے اور بڑی تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ جھونپڑی کے اندر دروازے کے پاس لکڑی کے تخت پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ٹین کے ڈرم میں تاڑی بھری ہوئی تھی۔ ڈرم کو ٹونٹی لگی تھی۔ وہ اس میں سے آبخوروں میں تاڑی ڈال کر دیتا تھا۔

میں نے بھی ایک روپیہ دے کر تاڑی کا گلاس لیا اور وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں اپنے ٹارگٹ کالیا بدمعاش کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک کمزور سا بوڑھا آدمی تاڑی کا آبخورہ سامنے رکھے بیٹھا آہستہ آہستہ سر ہلا رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ میں نے اس

سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ آدمی بھی مجھ سے بے ربط سی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آج سیٹھ کالیا نظر نہیں آ رہا۔ کیا وہ کامٹی گیا ہوا ہے؟"

بوڑھا بولا۔

"آ جائے گا' ابھی آ جائے گا۔ نہیں تو رات کو تو ضرور آ جائے گا۔ رات کو مال سمیٹنا ہوتا ہے۔ ان پر لکشمی دیوی بڑی مہربان ہے۔ ایک روپیہ گلاس کا لیتے ہیں۔ تاڑی میں پانی ملا کر دیتے ہیں۔ نشہ ہی نہیں ہوتا۔"

میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ مجھے یہاں رات کو آنا چاہئے۔ تاڑی مجھے بالکل نہیں پینی تھی۔ میں نے تاڑی کا مٹی کا گلاس ہاتھ میں پکڑا اور ذرا دور ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ اسی طرح بیٹھنے کے بعد میں سب کی نظریں بچا کر گلاس میں سے تاڑی زمین پر انڈیلی۔ گلاس وہیں رہنے دیا اور اٹھ کر وہاں سے قصبے کی طرف چل پڑا۔

قصبے میں ایک بڑا مندر تھا۔ یہ شیوانتی دیوی کا مندر تھا۔ سارا دن میں نے اسی مندر میں گذار دیا۔ دوپہر کو قصبے میں ایک ویشنو ڈھابے میں جا کر کھانا کھایا اور واپس مندر میں آ کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ ریوالور کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ لگا کر دیکھ لیتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کالیا رات کو شراب خانے میں ضرور آئے گا۔ کیونکہ اس وقت اسے سارے دن کی کمائی کا حساب دیکھنا ہوتا تھا لیکن میں شام ہوتے ہی شراب خانے کی طرف چل پڑا۔ میں کالیا کو اندھیرا ہونے سے پہلے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہتا تھا۔

ایک منصوبہ میں نے ذہن میں سوچ لیا تھا۔ منصوبہ کوئی اتنا پراسرار اور پیچیدہ نہیں تھا۔ مجھے کالیا کو شراب خانے سے کچھ دور دریا کی طرف لے جانا تھا۔ اس کے بعد اس کا کام تمام کر دینا تھا اور پھر وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ سورج غرب ہو چکا تھا۔ شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جب میں کالیا کے شراب خانے میں

آیا۔ میں ایک طرف ہو کر دوسرے شرابیوں کے پاس بیٹھ گیا اور سگریٹ پیتے ہوئے سر کو کبھی کبھی یوں ہلانے لگتا جیسے میں نشے میں ہوں۔ ابھی تک مجھے شراب خانے والے جھونپڑے کے اندر اور باہر کالیا بدمعاش کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ رات ہو گئی تو جھونپڑے کے اندر اور باہر مٹی کے تیل کی دو لالٹینیں روشن کر دی گئیں۔ کافی انتظار کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ قصبے کی طرف سے آنے والی کچی سڑک پر ایک موٹر سائیکل سوار چلا آ رہا ہے۔ موٹر سائیکل کی بتی روشن تھی۔ موٹر سائیکل شراب خانے کی ایک طرف آ کر رکی۔ بتی بجھی اور ایک درمیانے جسم کا آدمی جس نے کھدر کا کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں چمڑے کا پرانا تھیلا اٹھائے موٹر سائیکل سے اتر کر شراب خانے کی جھونپڑی کی طرف آیا۔ اسے آتا دیکھ کر جھونپڑی سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کا بیگ لے لیا۔ جب یہ آدمی لالٹین کی روشنی میں آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ کالیا ہی تھا۔ بالکل وہ شکل تھی جس شکل کی فوٹو میرے پاس موجود تھی۔

وہ جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ تخت کے پاس کھڑے ہو کر اس نے شراب کے ڈرم کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ جو آدمی گدی پر بیٹھا تھا۔ اس سے دو تین باتیں کیں اور جھونپڑی کے باہر لوہے کی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ مسلمانوں کے اس قاتل کو میں نے پہچان لیا تھا۔ اب مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اسے دریا کی طرف لے جانا تھا۔ میں نے کافی غور کیا۔ اسے دریا کی طرف اکیلے لے جانا مجھے مشکل نظر آنے لگا۔ کیونکہ دو آدمی اس کے دائیں بائیں زمین پر چوکس ہو کر بیٹھے تھے۔ یہ کالیا کے باڈی گارڈ لگتے تھے۔ میں درخت کے پیچھے گھاس پر ایک خالی آبخورہ سامنے رکھا بیٹھا رہا اور شرابی ہونے کی اداکاری کرتا رہا تاکہ اگر کوئی دور سے دیکھے تو یہی سمجھے کہ شرابی گاہک ہے۔

میرا دماغ ایک اور منصوبے پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ کالیا موٹر سائیکل پر

سوار ہو کر قصبے سے آیا تھا۔ اسے واپس بھی جانا تھا اور شاید اسی موٹر سائیکل پر واپس جائے۔ قصبہ وہاں سے دور تھا اور کچی سڑک پر اندھیرا تھا۔ میں اگر اس کچے راستے میں کسی جگہ چھپ کر کالیا کی واپسی کا انتظار کروں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اگر فرض کر لیا کہ کالیا رات کو موٹر سائیکل پر قصبے میں واپس نہیں جاتا اور شراب خانے میں سو جاتا ہے۔ پھر میں دوسری رات کا انتظار کر سکتا تھا لیکن اسے باتوں میں لگا کر یا کوئی چکر دے کر دریا کی طرف لے جانا اتنا آسان کام نہیں تھا جبکہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے دو باڈی گارڈ دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی سکیم پر دو تین بار غور کیا۔ آخر میرے دماغ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

میں خاموشی سے اٹھا اور قصبے کی طرف جانے والی سڑک پر آکر شرابیوں کی طرح ڈولتے ہوئے روانہ ہو گیا۔ جب اندھیرے میں آگیا تو صحیح طریقے سے چلنے لگا۔ اس کچے راستے کے دونوں جانب کھیت تھے جن میں اونچی فصل اگی ہوئی تھی۔ یہ فصل میرے لئے بڑے عمدہ چھپاؤ کا کام دے سکتی تھی۔ قصبے اور شراب خانے کے آدھے راستے میں آکر میں سڑک سے ہٹ کر ایک کھیت کی مینڈھ پر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے شراب خانے کی لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ریوالور نکال کر اندھیرے میں اسے غور سے دیکھے۔ یہ پہلے سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مجھے دھوکا نہیں دے گا۔

میں اسے ایک فائر کر کے چیک نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ وہاں اتنے زور کے دھماکے کی آواز سن کر کالیا کے لوگ ضرور اس طرف آ جاتے۔ مجھے ہر حالت میں کھیت میں بیٹھ کر اپنے شکار کا انتظار کرنا تھا۔ خواہ وہ رات کے ایک بجے آئے خواہ دو بجے آئے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ نہ آئے اور رات کو شراب کے ڈیرے پر سو جائے۔ آسمان پر بادل تھے۔ کیونکہ ایک بھی تارا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قصبے کی طرف سے

سی کسی وقت ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تو ٹھ کر کچی سڑک کے کنارے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے بیزار ہوگیا۔ واپس کھیت کنارے ینڈھ پر بیٹھ گیا۔ احتیاط کے طور پر سگریٹ بھی نہیں سلگاتا تھا کہ ماچس کی روشنی یکھ کر کوئی اس طرف نہ آجائے۔ کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو آنکھوں کے قریب لا کر غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ گھڑی ایسی تھی کہ جس کی سوئیاں چمکتی نہیں ھیں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔

ہوا ذرا تھمی تو مچھروں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مچھروں سے بچنے کے لئے دوبارا اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اچانک دور سے موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی دبی دبی آواز آئی۔ میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ آواز کالیا کے موٹر سائیکل ہی کی و سکتی تھی۔ وہ قصبے کی طرف واپس آ رہا تھا۔ میں تیار ہوگیا۔ ریوالور میں نے میض کے اندر اس طرح چھپالیا کہ وقت آنے پر ہاتھ ذرا نیچے لے جاکر بڑی آسانی سے نکال سکتا تھا۔ اس کی میں نے تین چار بار ریہرسل بھی کر لی۔ اب دور سے مجھے موٹر سائیکل کی لائیٹ کی روشنی نظر آنے لگی۔ انجن کی پھٹ پھٹ بھی قریب آ رہی تھی۔ مجھے اس بات کی بھی تصدیق کرنی تھی کہ موٹر سائیکل پر کالیا ہی سوار ہے س کا کوئی باڈی گارڈ سوار نہیں ہے۔ موٹر سائیکل کچی سڑک پر چلی آ رہی تھی۔ یں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی روشنی کو قریب سے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔

جب روشنی کافی قریب آ گئی تو میں کھیتوں میں سے نکل کر سڑک کے درمیان میں آ کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور اونچی آواز میں دہائی دینے لگا۔

"کالیا بھائی! مجھے بچا لو۔ کامٹی کے بدمعاش میری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کالیا بھائی! رام کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے بچالو....."

مجھ پر موٹر سائیکل کی پوری روشنی پڑ رہی تھی۔ موٹر سائیکل میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں نے اس روشنی میں دیکھا کہ موٹر سائیکل پر کالیا ہی سوار تھا۔ اس نے انجن بند کر دیا اور پوچھا۔

"کیوں بے' کیوں شور مچا رہا ہے؟"

میں نے کہا۔

"کالیا بھائی! کامٹی کے بدمعاش میری کنیا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میری عزت بچالو کالیا بھائی۔ میں تمہیں بھگوان کا واسطہ دیتا ہوں۔"

کالیا نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"ابے کیوں چیخ رہا ہے۔ کس طرف گئے ہیں وہ بدمعاش؟"

میں نے روتے ہوئے کہا بلکہ رونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سٹیشن کی طرف گئے ہیں کالیا بھائی۔"

اس نے مجھے جھڑک کر کہا۔

"چل میرے پیچھے بیٹھ۔ دیکھتا ہوں یہ کامٹی کے بدمعاش کون ہیں سالے ..... بیٹھ جا پیچھے۔"

"رام تمہارا بھلا کرے۔ رام تمہارا بھلا کرے۔"

یہ کہتا ہوا میں موٹر سائیکل کے پیچھے آ گیا۔ پیچھے آتے ہی میں نے کرتے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور اس کی نالی کالیا کی کھوپڑی کے ساتھ لگا کر فائر کر دیا۔ میں قربان جاؤں اپنے پرانے ریوالور کے۔ اس نے مجھے بالکل دھوکا نہ دیا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور کالیا موٹر سائیکل پر سے ایک طرف گر پڑا۔ موٹر سائیکل کا انجن سٹارٹ تھا۔ اس کی بتی جل رہی تھی۔ موٹر سائیکل ایک طرف کو لڑھک گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ اس پر سوار ہوا اور گیئر لگا کر پوری رفتار سے اسے گاؤں کی طرف دوڑانے لگا۔ قصبے کے قریب آ کر میں نے اس کی بتی بجھا دی اور اس کا رخ ریلوے سٹیشن کی طرف کر دیا۔ ریلوے سٹیشن پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی ٹرین وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے موٹر سائیکل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پیچھے کو جاتی پگ ڈنڈی پر ڈال دی۔ میں بھساول کی جانب جتنی دور نکل سکتا تھا نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے ٹارگٹ مار لیا تھا

اور اس قاتل کی کھوپڑی اڑا دی تھی جس نے بے گناہ مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا تھا اور معصوم مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی تھی۔ اب مجھے وہاں سے فرار ہونا تھا۔ کیونکہ ریوالور کے دھماکے کی آواز کالیا کے شراب کے اڈے تک ضرور گئی ہوگی اور کالیا کے باڈی گارڈ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ ریوالور یا پستول کا فائر تھا۔ وہ ضرور اس طرف کو دوڑ پڑے ہوں گے جس طرف سے فائر کی آواز آئی تھی۔ سڑک پر کالیا کی لاش پڑی تھی جو انہیں ضرور نظر آ جاتی۔ موٹر سائیکل غائب ہونے سے انہیں صاف معلوم ہو جاتا کہ قاتل ان کے سرغنہ کو قتل کر کے اسی کے موٹر سائیکل پر فرار ہو گیا ہے۔ یہ سارا ویران علاقہ تھا۔ کوئی بڑا شہر قریب نہیں تھا۔ مجھے اس موٹر سائیکل کی آواز سے بھی نجات حاصل کرنی تھی اور اس کے ذریعے میں واردات کی جگہ سے زیادہ دور بھی نکل جانا چاہتا تھا۔

موٹر سائیکل کچے راستے پر اچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار گڑھوں کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ ریلوے لائن کے ساتھ نیچے جھاڑیوں میں کوئی سڑک تو ہوتی نہیں۔ پیدل چلنے والوں کی وجہ سے ایک پگ ڈنڈی بن گئی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں موٹر سائیکل کو مضبوطی سے سنبھالے اسے جا رہا تھا۔ اندھیرے میں چیزیں صاف نظر بھی نہیں آ رہی تھیں۔ کچھ دور چلنے کے بعد موٹر سائیکل کے سامنے اچانک ایک دیوار آ گئی۔ میں نے بریک لگا دی۔ انجن کو بند کر دیا۔ اتر کر دیکھا کہ آگے یہ پتھر کی ایک دیوار تھی جس کی دوسری جانب بہت بڑی ندی بہہ رہی تھی۔ اس کے اوپر ریلوے لائن کا پل بنا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکل سے موٹر سائیکل کو چڑھائی پر دھکیل کر ریلوے لائن پر لے آیا۔ سوچا لائن کے ساتھ پل کا پیدل راستہ ہوگا۔ اس پر موٹر سائیکل نکال کر لے جاؤں گا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ پیدل چلنے کے لئے راستہ ضرور نظر آیا مگر یہ راستہ ایسا تھا کہ پٹڑی کے سلیپروں میں سے نیچے بہتی ہوئی ندی کا پانی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ارادہ بدل لیا۔ موٹر سائیکل کو ذرا آگے لے جا کر ندی میں لڑھکا دیا۔ موٹر سائیکل ندی میں گری اور پھر نظروں سے

اوجھل ہو گئی۔ میں پٹڑی کے ساتھ ساتھ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتا ہوا چلنے لگا۔ ایک تو رات کا اندھیرا' دوسرے لائن کے سلیپروں کے نیچے سے ندی کا زور شور سے بہتا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ ذرا سا پاؤں غلط پڑنے پر میں ندی میں گر سکتا تھا۔ خدا کے بھروسے چل رہا تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پل کافی بڑا تھا۔ یہ ندی بھی کسی دریا کی طرح لگتی تھی۔ پل کے درمیان میں جا کر مجھے چکر سا آگیا۔ وہیں بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں اور خدا کو یاد کرنے لگا۔

وہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا۔ کالیا کے غنڈے میری تلاش میں اس طرف آ سکتے تھے۔ دس پندرہ سیکنڈ کے بعد اللہ کا نام لے کر اٹھا اور پٹڑی کے سلیپروں پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا چل پڑا۔ خدا خدا کر کے پل ختم ہوگیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پیچھے مڑ کر تھانز قصبے پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قصبے کی اکا دکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ لگتا تھا کسی کو کالیا کے قتل کی ابھی تک خبر نہیں ہوئی۔ ریل کی پٹڑی زمین سے اونچی تھی۔ میں نیچے اتر آیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ چلتے چلتے میرے اوپر پانی کی بوندیں گریں۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ بوندیں میرے چہرے پر بھی پڑیں بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں چلتا رہا۔ چاہتا تھا کہ کوئی سٹیشن آئے اور گاڑی مل جائے تو اس میں بیٹھ کر اس علاقے سے نکل جاؤں یا پھر بھساول کو جاتی کوئی بڑی سڑک مل جائے جہاں کسی ٹرک وغیرہ کو رکوا کر اس میں بیٹھنے کی کوشش کروں۔ آدھی رات کو لاریاں تو نہیں چلتی تھیں۔ ٹرانسپورٹ کے ٹرک وغیرہ ہی چلتے تھے مگر نہ کوئی سٹیشن آ رہا تھا نہ کسی جانب کوئی سڑک کا نشان مل رہا تھا۔

بوندا باندی آہستہ آہستہ بارش کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ ریوالور میں نے دوبارا پاجامے کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا جس کی نالی میرے پیٹ سے لگ رہی تھی اور تیز چلنے میں دقت پیش آ رہی تھی مگر میں نے اپنی رفتار کم نہ کی۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد مجھے دور سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔ کوئی ریلوے سٹیشن

قریب آ رہا تھا۔ میں بڑا خوش ہوا اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ زیادہ تیز رفتاری سے چلنے لگا۔ سگنل کی بتی قریب آتی گئی۔ اس وقت بارش باقاعدہ ہونے لگی تھی۔ میرے سر کے بال اور کپڑے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ میں ریل کی پٹڑی پر چڑھ گیا۔ میں ریلوے لائن کے سلیپروں پر نہیں بلکہ اس کے ساتھ جو پتلی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی اس پر چل رہا تھا۔ بارش خاموشی سے ہو رہی تھی۔ نہ بجلی چمک رہی تھی نہ بادل گرج رہے تھے۔ سگنل کا کھمبا میری بائیں جانب سے پیچھے گذر گیا۔

سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ میں ریلوے لائن کی طرف سے پلیٹ فارم پر آگیا۔ ہندی میں پلیٹ فارم کے سرے پر لگے ہوئے بورڈ پر سٹیشن کا نام لکھا تھا۔ جو اندھیرے میں مجھ سے پوری طرح پڑھا نہیں گیا تھا۔ صرف چمپالی ہی پڑھا گیا۔ اس کے آگے بھی ایک لفظ تھا۔ شاید نگر یا ناگر تھا۔ پلیٹ فارم آدھی رات کے اندھیرے اور بارش میں خالی پڑا تھا۔ میں دوڑ کر پلیٹ فارم کے گیٹ سے گذر کر ڈیوڑھی میں آگیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ پلیٹ فارم کے وسط میں گیٹ کے آگے آدھی چھت پڑی ہوئی تھی۔ یہاں دو خالی بنچ پڑے تھے۔ ایک بنچ پر ایک آدمی اکڑوں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ یہاں اوپر بجلی کا بلب روشن تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی بھساول جانے والی گاڑی کس وقت آئے گی؟"

وہ کوئی ریلوے کا ہی آدمی تھا۔ کہنے لگا۔

"کامٹی سے ایک گاڑی تھوڑی دیر میں پہنچے والی ہے۔ ٹکٹ لے آؤ۔"

میں نے کہا۔

"ٹکٹ والی کھڑکی تو بند ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

اس نے بے نیازی سے کہا۔

"ابھی آ جائے گا بابو۔"

میں نے سوچا کہ بغیر ٹکٹ ہی ٹرین میں بیٹھ جاؤں گا۔ راستے میں ٹکٹ چیکر آیا تو جرمانہ ادا کر دوں گا۔ اتنے میں مجھے سٹیشن کی ڈیوڑھی کی طرف سے کھڑکی کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ٹکٹ بابو نے کھڑکی کھول کر بتی جلا دی تھی۔ میں تیز تیز چلتا گیا اور ٹکٹ بابو سے کہا۔

"سورت کا ایک ٹکٹ دے دیں۔"

وہ بولا۔

"یہ گاڑی صرف بھساول تک جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"چلو بھساول کا ہی ٹکٹ دے دیں۔"

تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر میں نے جیب میں رکھا اور پلیٹ فارم پر آ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب تھوڑی دیر بعد ہی تھانر قصبے کی جانب سے جدھر میں کالیا غنڈے کا خون کرکے آ رہا تھا ٹرین کے انجن کی سیٹی کی آواز آئی۔ بینچ پر جو آدمی بیٹھا ہوا تھا اس نے نیند بھری آواز میں کہا۔

"بابو جلدی سے ٹرین میں چڑھ جانا۔ یہاں ٹرین دو تین منٹ ہی ٹھہرتی ہے۔"

اس علاقے میں کوئلے سے چلنے والے انجن بھی چلتے تھے۔ شاید اس لئے بھارت کے اس علاقے میں کوئلہ بہت نکلتا تھا۔ دور سے انجن کی روشنی قریب آ رہی تھی۔ پھر چھک چھک کرتی ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ میں پلیٹ فارم پر گیٹ کے اوپر جلتے بلب کی روشنی میں کھڑا تھا اور مجھ پر خوب روشنی پڑ رہی تھی۔ میرے اوپر پلیٹ فارم کی چھت تھی جس پر بارش کی بوندیں شور مچا رہی تھیں۔ ٹرین کے ڈبوں میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ ڈبے ایک ایک کرکے آہستہ آہستہ گذرتے گئے۔ پھر ٹرین رک گئی۔ میں ایک ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اندر سے چار پانچ آدمی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔ میں روشنی میں

کھڑا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک آدمی نے چلا کر کہا۔

"یہی ہے وہ آدمی۔"

میں بوکھلا سا گیا۔ میں نے اس آدمی کو دیکھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہ آدمی تھا جو کالیا کے شراب کے اڈے پر جھونپڑے میں تخت پر شراب کے ڈرم کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اسی سے ایک روپیہ دے کر شراب کا آبخورہ لیا تھا۔

وہ آدمی دوسری بار چلایا۔

"اسی نے کالیا کو قتل کیا ہے۔ پکڑو اسے۔"

بس پھر کیا تھا۔ جیسے وہ لوگ ڈبے کے دروازے میں سے چھلانگیں لگا کر پلیٹ فارم پر آئے میں نے بھساول کی طرف منہ کیا اور پلیٹ فارم پر اندھا دھند دوڑ پڑا۔ کالیا کے آدمی بھی اندھا دھند میرے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ ان کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم اس طرف سے جاؤ۔ بنسی ! تم ریلوے لائن پر ہو جاؤ۔ جانے نہ دینا اس کو۔ پلیٹ فارم کی چھت پیچھے رہ گئی۔ میں بارش اور اندھیرے میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ پھر پلیٹ فارم بھی ختم ہو گیا۔ آگے پلیٹ فارم کی ڈھلان تھی۔ اس سے آگے ریلوے لائن شروع ہو گئی۔ میں نہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا نہ دائیں بائیں دیکھنے کی فرصت تھی۔ بس ناک کی سیدھ میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیچھے غنڈوں کے بھاگنے اور شور مچانے کی آوازیں برابر میں تعاقب کر رہی تھیں۔ بلکہ اب قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ میرا ریوالور اس بھاگ دوڑ میں میرے پاجامے میں سے کھسک کر نیچے گر گیا تھا۔ میرے پاس اسے اٹھانے کے لئے بھی وقت نہیں تھا۔ میں اندھا دھند بھاگتا جا رہا تھا کہ پیچھے پستول کا دھماکہ ہوا۔ مجھ پر پستول کا فائر کیا گیا تھا مگر اندھیرے میں نشانہ چوک گیا تھا۔ پھر اوپر تلے دو تین فائروں کے دھماکے ہوئے۔ میں گھبرا گیا۔ کوئی بھی گولی مجھے لگ سکتی تھی۔ میں دوڑتا ہوا ریلوے لائن کی دوسری طرف آ گیا۔ اچانک سامنے کسی ریلوے پل کا بہت اونچا اور

بہت بڑا ڈھانچہ اندھیرے میں نمودار ہو کر میرے سامنے آگیا۔ یہ ریلوے پل تھا۔
پیچھے سے پستول کے دو فائر آئے۔ گولیاں پل کے گارڈوں سے ٹکرائیں۔
میں پل پر چڑھ گیا۔ یہ پل ایک آہنی سرنگ کی طرح کا تھا۔ پل کے ساتھ ایک طرف
پیدل چلنے کے لئے راستہ بنا ہوا تھا۔ میں اس پر دوڑ رہا تھا۔ اب غنڈے بھی پل پر
چڑھ آئے تھے اور مجھ پر فائر کر رہے تھے۔ ایک گولی میرے کان کے بالکل قریب
سے ہو کر گذر گئی۔ میں خوش قسمت تھا کہ بچ گیا۔ دوڑتے دوڑتے مجھے بائیں جانب
پل پر ایک بالکونی نظر آئی۔ یہ بالکونی اس لئے بنائی گئی تھی کہ اگر کوئی آدمی پیدل
چل رہا ہو اور گاڑی آ جائے تو وہ وہاں پناہ لے سکے۔ میں بالکونی کی طرف بڑھا۔
میں نے دریا میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ پیچھے سے مجھ پر فائر برابر آ رہا
تھا۔ ایک گولی بالکونی کی آہنی ریلنگ سے ٹکرائی۔ دوسری گولی کو مجھ پر آنا تھا۔ میں
نے گھبرا کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

دریا میں گرتے ہی لہروں نے مجھے اپنے اندر سمیٹ لیا۔
میں چونکہ پل کی بلندی سے گرا تھا اس لئے میں دریا کی تہہ تک اترتا چلا گیا۔ میں نے سانس روک لیا تھا۔ میں دریا کے اندر ہی اندر پانی کے بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ میں ہاتھ پاؤں بھی چلا رہا تھا تاکہ قاتلوں سے جتنی جلدی جس قدر دور ہو سکے نکل جاؤں۔ یہ دریا مجھے کہاں لے جائے گا اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا لیکن جان بچانی بھی ضروری تھی۔ جب میرا سانس ختم ہو گیا تو میں تیزی سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے پانی کی سطح پر آ گیا۔ سر باہر نکال کر گہرا سانس لیا اور اندھیری رات میں جس طرف دریا کا بہاؤ تھا اسی طرف تیرنے لگا۔ پستول کی گولیوں کی آوازیں کچھ دور تک میرا پیچھا کرتی رہیں لیکن چونکہ غنڈوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا' اس لئے میں ان کی گولیوں سے محفوظ رہا۔
میں بڑا اچھا تیراک ہوں۔ تیرنے کی میں نے باقاعدہ ٹریننگ لے رکھی تھی۔ میں سمندر میں دور دور تک تیر چکا تھا۔ دریا میں تیرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ ویسے بھی اگر آدمی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے تو دریا میں تیرنا آسان ہوتا ہے۔ دریا کا بہاؤ آدمی کو تیرنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ سمندر اور تالاب کے ساکن پانی میں تیرنے کے لئے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے دریا کے کنارے رات کے اندھیرے میں دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اتنا میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دریا کا رخ بھساول کی طرف نہیں ہے اور مجھے بھساول کی طرف جانا تھا۔ جہاں سے دوسری ٹرین پکڑ کر مجھے سورت پہنچنا تھا۔ میں نے تیرتے تیرتے اپنا رخ دریا کی

دائیں جانب کرلیا تاکہ دریا میں زیادہ آگے نہ نکل جاؤں۔ اس کے باوجود پانی کا بہاؤ مجھے تیزی سے آگے لئے جا رہا تھا۔ کوئی آدھے پونے گھنٹے کی جد و جہد کے بعد میں دریا کے دائی جانب والے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ بڑے دریاؤں کے کناروں پر بے شمار سرکنڈے اور جھاڑیاں ہوتی ہیں اور بعض کناروں پر بڑی خطرناک دلدل بھی ہوتی ہے۔ یہ دلدل آدمی کو اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہاں دلدل نہیں تھی صرف کیچڑ تھا جس میں سے گذر کر میں کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ میں نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کرنسی نوٹ بھیگ گئے تھے۔ میرا پستول تو دوڑتے ہوئے راستے میں ہی گر گیا تھا۔ گیلے نوٹوں کو میں نے احتیاط سے تہہ کرکے ویسے ہی جیب میں رکھ لیا۔ جب ذرا سانس ٹھیک ہوا تو میں اٹھ کر مشرق کی طرف چل پڑا۔ یہاں اندھیرے میں کھیت نظر آ رہے تھے۔

میں ان کے درمیان چلنے لگا۔ یہ خطرہ اپنی جگہ پر موجود تھا کہ کالیا کے ساتھی غنڈے مجھے قتل کرنے کے لئے اسی طرف گئے تھے۔ یہ پل کا دائیں جانب والا علاقہ تھا جس طرف میں دوڑ رہا تھا اور میں نے دوڑتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی مگر میں پل سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ جتنی تیزی سے دریا کا تیز رفتار پانی مجھے آگے لے آیا تھا۔ کالیا کے غنڈے اتنی تیزی سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ مجھے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ میں ان لوگوں کی پہنچ سے دور رہ کر راتوں رات کسی ایسی سڑک پر پہنچ جاؤں جہاں سے مجھے بھساول جانے والا کوئی ٹرک وغیرہ مل جائے۔ کھیت ختم ہو گئے۔ چھوٹا سا اونچا نیچا میدان آگیا۔ یہاں کہیں کہیں درخت کھڑے تھے۔ ایک جانب دور دو تین بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ شاید وہاں کوئی گاؤں تھا یا شاید وہاں کوئی سڑک تھی جس کی بتیاں دور سے ٹمٹماتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کا کیا بجا تھا۔ یہ ویران علاقہ تھا۔ جنگل نہیں تھا مگر غیر آباد علاقہ تھا اور درخت جھاڑیاں بہت تھیں۔ ایسی جگہوں پر رات کو سانپ اور گیدڑ حملہ کر سکتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ راستے میں نہ

کہیں گیدڑ ملے اور نہ کسی سانپ نے حملہ کیا۔ آخر میں ان ٹمٹماتی روشنیوں تک پہنچ گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی پکی سڑک تھی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھمبوں پر بلب جل رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شہر نہیں تو کوئی بڑا قصبہ ضرور قریب ہوگا۔ میں سڑک کے کنارے کنارے مشرق کی سمت رخ کئے چلنے لگا۔ چلتے رہنے سے میرے کپڑے اپنے آپ سوکھ گئے تھے۔ میرے جسم میں بھرپور جوانی کا خون گردش کر رہا تھا۔ اس لئے تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن میں یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا کہ یہ سڑک آگے جس شہر یا قصبے میں جاتی ہے کیا وہاں کوئی ریلوے سٹیشن ہے۔ سڑک کی ایک جانب ٹیلے تھے۔ دوسری جانب کبھی کھیت آ جاتے کبھی میدان شروع ہو جاتا اور کبھی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں آ جاتیں۔ آخر میں ایک چھوٹے سے شہر کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں ان روشنیوں سے بچتا ہوا شہر کی دوسری طرف نکل گیا۔ سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ سارا شہر سو رہا تھا۔ اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا۔ میں کسی ایسے اڈے کی تلاش میں تھا۔ جہاں سے رات کے وقت ٹرک وغیرہ چلتے ہوں۔ گشت کرتی پولیس اور چوکیداروں کا خیال بھی تھا کہ وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں کون ہوں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے ان کو بتانے کے لئے ایک کہانی دماغ میں سوچ لی تھی۔ آکر ایک جگہ مجھے ٹرک کے انجن کے گھوں گھوں گھرر گھر کی آواز سنائی دی۔ میں اس طرف بڑھا۔

سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ ڈرائیور اندر بیٹھا تھا۔ دوسرا آدمی بونٹ اوپر اٹھائے انجن کو ٹھیک کر رہا تھا۔ میں ایک طرف چھپ کر اندھیرے میں کھڑا ہوگیا۔ سوچنے لگا کہ ان لوگوں سے جا کر بات کروں یا ٹرک کے چلنے کا انتظار کروں۔ ٹرک میں کوئی سامان لدا ہوا تھا۔ پیچھے جگہ خالی نظر آ رہی تھی۔ یہی فیصلہ کیا کہ جب ٹرک چلنے لگے گا تو دوڑ کر پیچھے سوار ہو جاؤں گا۔ ڈرائیور سے کیا فرضی کہانی بیان کروں۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے آدمی نے جو کلینر معلوم ہوتا تھا بونٹ کو

زور سے بند کر کے اس پر ہاتھ مارا اور اونچی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے گورو' چلو۔"

کلینر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹرک چل پڑا۔ میں اندھیرے میں سے نکل کر ٹرک کی طرف دوڑا اور چلتے ٹرک میں سوار ہو گیا۔ ایک گھنٹہ ٹرک سڑک پر چلتا رہا۔ پہلے سڑک چھوٹی تھی پھر چوڑی ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد ٹرک کسی بڑے شہر کے مضافات میں داخل ہوگیا۔ معلوم نہیں یہ کونسا شہر تھا۔ بہرحال بھوساول نہیں تھا کیونکہ بھوساول وہاں سے کافی فاصلے پر واقع تھا۔ ٹرک اپنے اڈے کیطرف گھومتے ہوئے آہستہ ہو گیا۔ میں چھلانگ لگا کر سڑک پر اتر گیا۔ ایک ٹرک پیچھے سے آکر تیزی سے میرے قریب سے نکل گیا۔ یہ کوئی چھوٹا شہر تھا۔ ہر طرف روشنی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ نیون سائین کے بورڈ بھی چمک رہے تھے۔ جن کی عبارتیں ہندی میں لکھی تھیں۔ ایک نیون سائن کوکا کولا کا بھی تھا۔ میں خالی سڑک پر بند مارکیٹوں کے قریب سے گذرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک طرف سے ایک آدمی نکل کر سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ چوکیدار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اسے فرضی کہانی سنا دی اور کہا کہ اب سٹیشن کی طرف جا رہا ہوں تاکہ بھوساول جانے والی گاڑی پکڑ سکوں۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"سٹیشن اس طرف ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔ پیدل پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس طرف چلنے لگا۔ سٹیشن چھوٹا مگر خوب جگمگا رہا تھا۔ افسوس کہ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ میں نے بھوساول کا ٹکٹ لے لیا۔ گاڑی منہ اندھیرے چار بجے آتی تھی۔ ٹکٹ مجھے مل گیا کیونکہ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ گاڑی کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں پلیٹ فارم پر بڑا محتاط ہو کر آیا۔ اس خیال سے کہ کہیں کوئی کے غنڈے یہاں موجود نہ ہوں مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔

مسافر بنچوں پر اور کچھ زمین پر سو رہے تھے۔ میں ایک بنچ کے پیچھے زمین پر بیٹھ گیا۔
ایک گھنٹہ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گذار دیا۔ ٹھیک چار بجے دور سے ریل گاڑی کی
آواز آئی۔ یہ ٹرین کامٹی سے آ رہی تھی۔ ٹرین آ کر رکی۔ میں بنچ پر پیچھے ہی بیٹھا
رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ٹرین سے کون کون اترتا ہے۔ ٹرین کے سارے ڈبوں میں
مسافر سو رہے تھے۔ صرف ایک آدمی سر پر گٹھڑی رکھے اترا۔ پلیٹ فارم پر جو
مسافر سو رہے تھے وہ اٹھ بیٹھے تھے اور ٹرین میں سوار ہو رہے تھے۔ میں بھی ایک
ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ بھوساول پہنچی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ بھوساول
سے میں نے سورت جانے والی گاڑی پکڑی اور دن کے گیارہ بجے سورت پہنچ گیا۔
رکشا لے کر شیو سینا کے دفتر میں پہنچا تو آفس سیکریٹری میری نے طرف کسی
قدر حیرانی سے دیکھا اور پوچھا۔
"دھرم چند! تم اتنی جلدی آ گئے بڑودہ سے؟"
میں نے کہا۔
"کیا بتاؤں بھیا! بروڈہ پہنچا تو پتہ چلا کہ میری بہن کے بھیا شہر چھوڑ کر بمبئی
جا چکے ہیں۔ میں کیا کرتا، وہاں کوئی میرا جاننے والا نہیں تھا۔ بس دوسری گاڑی پکڑ
کر واپس چل پڑا۔ تم سناؤ بمبئی سے بالا جی اور سینا پتی ٹھاکرے جی کا کوئی فون تو
نہیں آیا؟"
اس نے کہا۔
"نہیں مگر بالا جی تو سورت میں ہی ہیں۔"
میں بھول گیا تھا کہ شیو سینا کے بمبئی مہاراشٹر کے انچارج مراٹھا بالا جی کو تو
میں سورت میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔
"ارے بھیا! بس بھول گیا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ بھوجن پانی کر کے آرام
کروں گا اوپر کمرے میں۔ سینا پتی بال ٹھاکرے جی کا فون آئے تو مجھے جگا دینا۔"
میں نے بازار کے ایک وشینو ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا اور شیو سینا کے

سورت والے اپنے آفس میں دوسری منزل والے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

مجھے بے حد اطمینان ہو رہا تھا کہ میں نے سورت میں مسلمانوں کے قاتل اور مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کرنے والے کالیا بدمعاش کو ہلاک کر دیا تھا۔ اب مجھے سورت میں مسلمانوں کو قتل کرنے اور مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کرنے والے باقی تین مجرموں یعنی بھاسکر، شیوا اور پاٹیکر کو ٹھکانے لگانا تھا۔ حاجی بھائی کی زبانی مجھے ان تینوں کا پتہ معلوم ہو چکا تھا۔ یہ تینوں جالندھر کے بوڑ والے مندر میں پجاری کے مہمان بن کر رہ رہے تھے۔ چونکہ سورت میں فسادات میں ان تینوں نے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کیا تھا اور مسلمان دبی زبان سے ہی سہی مگر اخباروں میں برابر شور مچا رہے تھے کہ مسلمانوں کے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے۔ مسلمانوں کا خون بہانے والے پولیس افسروں کو پکڑا جائے۔ چنانچہ شیو سینا نے کالیا کے علاوہ ان تینوں کو بھی سورت سے باہر بھیج دیا تھا کہ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو واپس آ جانا۔ میرا اصل ٹارگٹ مسلمانوں کے یہ تینوں قاتل تھے۔ جو اس وقت جالندھر کے ایک مندر میں روپوش تھے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ میں سورت سے نکل کر اتنی دور جالندھر کیسے جاؤں۔ ظاہر ہے میں کالیا کی طرح ان تینوں کو ایک دن میں ختم نہیں کر سکتا تھا۔ کالیا ایک ہی آدمی تھا۔ اسے میں نے آسانی سے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ تین آدمی تھے ان کو ہلاک کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ میں سورت سے اتنے دن غیر حاضر نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسری یہ مجبوری تھی کہ بمبئی سے کسی بھی وقت شیو سینا کے فرعون بال ٹھاکرے کا بلاوا آ سکتا تھا۔

بال ٹھاکرے مجھے کسی انتہائی خفیہ مشن پر بھیجنے والا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھی کہ یہ خفیہ مشن کس نوعیت کا ہے۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ دوسرے دن بمبئی سے بال ٹھاکرے کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے فوراً" بمبئی بلایا تھا۔ میں نے ایک گھنٹے بعد سورت سے گاڑی پکڑی اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ بال ٹھاکرے میرا

انتظار کر رہا تھا۔ میں شام کے وقت اس کی بمبئی والی کوٹھی میں پہنچا۔ یہ بال ٹھاکرے کے بئر پینے کا وقت بھی تھا۔ میں نے جھک کر پرنام کیا اور جیسا کہ سب لوگ اس کے آگے ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے میں بھی بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق میرے آنے پر کسی قسم کی خوشی یا جذبات کا اظہار نہ کیا۔ صرف اشارے سے کہا کہ صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ میں قالین پر سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے زعفرانی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا لمبا زعفرانی سلکی کرتہ اس کے گھٹنوں سے نیچے تک آیا ہوا تھا۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں بھی تھیں اور کالے سیاہ رنکھوں کی تین لمبی مالائیں بھی تھیں۔ ہندوؤں میں یہ جوگ اور سادھنا کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ بئر کا گلاس اس کے قریب ہی شیشے کی تپائی پر پڑا تھا۔ انگلیوں میں زمرد اور مرجان کے نگینوں والی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں قیمتی سگار سلگ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے وہ مجھے گھور کر تکتا رہا۔ پھر اس نے بیئر کا گلاس منہ سے لگا کر دو تین گھونٹ پیئے۔ ریشمی رومال سے اپنے کالے کالے ہونٹ صاف کئے۔ سگار کا ہلکا سا کش لگایا اور سر کو تھوڑا تھوڑا دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہلاتے ہوئے بولا۔

"دھرم چند! بھارت ماتا کے دشمن بہت ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا دشمن مسلمان ہے۔ یہ دشمن ہمارے بھارت دیش میں بھی گھس کر بیٹھا ہوا ہے اور پاکستان کی شکل میں بھی موجود ہے۔ ہماری سرکار ہمارے دشمنوں سے امن شانتی کی بات کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں ان مسلمانوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دینا چاہئے۔ بھارت میں جتنے مسلمان ہیں ان سب کو زہر دے کر مار ڈالنا چاہئے اور پاکستان پر ایک ہی دن میں دس بارہ ایٹم بم مار کر اس دشمن ملک کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہئے۔"

اس کے چہرے پر نفرت کے اثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے سگار پر زور

سے انگلی مار کر ایش ٹرے میں اس کی راکھ جھاڑی اور کندھے پر پڑی ہوئی سلک کی
چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہماری شیوسینا اور راشٹریہ سیوک سنگ تو اس کام میں لگی ہوئی ہے۔
دیکھو لو ہم نے بابری مسجد کو ڈھا دیا ہے۔ اب وہاں رام مندر بنائیں گے۔ اسی
طرح ہم بھارت میں مسلمانوں کی جتنی بھی مسجدیں ہیں ان سب کو ایک ایک کر کے
ڈھا دیں گے لیکن پاکستان پر ایٹم بم چلانا بہت ضروری ہے۔ یہ ملیچھ قوم صرف ایٹم بم
سے ہی ختم کی جا سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"سینا پتی جی! آپ بھارت ماتا کے مایہ ناز سپوت ہیں۔ بھارت دیش میں
[illegible]اج بنانے کے لئے ہمیں آپ ایسے یودھا سپوت کی ضرورت ہے۔ آپ ہمارے
لئے شیوا جی مرہٹے سے کم نہیں ہیں۔"

بال ٹھاکرے جذباتی ہوگیا۔ وہ مرہٹی زبان میں بولنے لگا۔ پھر ہندوستانی
زبان پر آگیا۔ بیئر کا گلاس تپائی پر رکھ دیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔

"شیوا جی میرے ہیرو ہیں۔ وہ ہم سب ہندوؤں کے ہیرو ہیں۔ یہ گاندھی
تو اس کے آگے بکری ہے۔ اس کی وجہ سے بھارت ماتا کے ٹکڑے ہوئے ہیں۔ آج
شیوا جی زندہ ہوتا تو کبھی پاکستان نہ بنتا۔"

میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم پاکستان
میں بیٹھے ان لوگوں کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور یہ ہمیں تباہ کرنے کے
منصوبے تیار کر رہے ہیں۔ ہم ان کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ان کی ایکٹرسوں کے ڈانس
دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کے گانے گھروں میں اور کاروں میں لگا کر سنتے ہیں
اور یہ ہم پر ایٹم بم گرانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

بیئر کا گلاس ختم کرنے کے بعد بال ٹھاکرے اپنے اصل موضوع کی طرف
گیا۔ حسب عادت ایک نظر مجھے گھور کر آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ سگار کی راکھ جھاڑ

اور بولا۔

"دھرم چند! تم نے ان ملیچھ مسلمانوں کا کریا کرم کرنے میں میری بڑی مدد کی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے تم پر بڑا بھروسہ ہے۔ میں تمہیں جس خفیہ مشن پر روانہ کر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں میرے کسی ساتھی کو ذرا سا بھی علم نہیں ہے اور انہیں اس خفیہ مشن کے بارے میں بتایا بھی نہیں جائے گا۔ تم بھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لاؤ گے۔"

میں نے سر ذرا سا جھکاتے ہوئے کہا۔

"سیناپتی جی! میری طرف سے اطمینان رکھئے میں مر جاؤں گا مگر یہ راز نہیں بتاؤں گا۔"

بال ٹھاکرے نے چھت کی طرف دیکھ کر گہرا سانس بھرا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"مجھے تم سے یہی امید ہے۔ تم صرف ہوشیار اور انٹیلی جینٹ ہی نہیں بلکہ بہادر بھی ہو۔ ورنہ تمہاری جگہ یہ بالا جی یا منوسوانی ہوتا تو پاکستان کی قید سے کبھی فرار ہو کر یہاں نہ پہنچ سکتا۔ اب میری بات غور سے سنو۔ بھارت میں چاہے کمیونسٹوں کی سرکار بن جائے چاہے بھارتیہ جنتا پارٹی کی اور چاہے کانگریس کی سرکار ہو۔ ان سب کا آپس میں چاہے لاکھ لڑائی جھگڑا ہو لیکن ایک بات ہر سرکار میں ساجھی ہوتی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ پاکستان ہر حالت میں ختم کرنا ہے اور بھارت ماتا کے ٹوٹے ہوئے بازو کو پھر سے جوڑنا ہے۔ یہی ایک بات ہے جو مجھے بھی حوصلہ دیتی ہے اور میں نے کبھی کسی سرکار کے خلاف بغاوت نہیں کی۔ اوپر سے ہماری ہر سرکار پاکستان کے ساتھ شانتی امن اور ڈیموکریسی کی بات کرتی ہے مگر اندر سے ہماری ہر سرکار کی پالیسی یہی رہی ہے کہ پاکستان کو ہر حالت میں ختم کر کے اسے پھر سے بھارت کے ساتھ ایک کرنا ہے۔ چنانچہ ہماری آج کی سرکار نے بھی اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے تباہ کن دور مار میزائیلوں کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ یہ

میزائیل بھارت کے کسی بھی سرحدی شہر سے فائر کر کے پاکستان کے شہروں پر گرا کر انہیں تباہ کیا جا سکے گا۔ ان میزائیلوں کی مار پانچ سو سے ساڑھے پانچ سو میل تک ہو گی۔"

بال ٹھاکرے اپنے سنگل سیٹ والے صوفے پر ذرا سا آگے کو جھک کر مجھ سے بات کر رہا تھا۔ ان تباہ کن دور مار میزائیلوں کے منصوبے کا سن کر صرف میرے کان ہی نہیں بلکہ میرے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کا جانی دشمن اور بھارت کا فرعون نمبرون بال ٹھاکرے غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ اسے بھارتی حکومت کی ہر خفیہ اور پاکستان دشمن پالیسی کا سب سے پہلے علم ہو جاتا تھا۔ مہاراشٹر بھارت کے دو بہت بڑے اور بڑے اہم صوبے تھے اور بال ٹھاکرے کی شیو سینا کا دونوں صوبوں پر پورا قبضہ تھا۔ اس اعتبار سے بھی کوئی بھارتی سرکار بال ٹھاکرے کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھارت کی لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بھی بال ٹھاکرے کی پارٹی اور اس کی ہمدرد راشٹریہ سیوک سنگ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے اپنے نمائندے موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ بھارت کی ہر سرکار کی پاکستان کو ختم کرنے کی پالیسی اور بال ٹھاکرے کی پاکستان دشمنی میں مکمل اشتراک تھا۔ چنانچہ بھارت کی ہر سرکار بال ٹھاکرے کے مشورے سے پاکستان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی تھی۔ اگر مشورے میں شامل نہ بھی کرے تو بال ٹھاکرے کو خبر ضرور کر دی جاتی تھی کہ پاکستان کو ختم کرنے کے سلسلے میں یہ قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ بھارتی حکومت اور محکمہ دفاع دور مار میزائیلوں کے جس منصوبے کو عملی شکل دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں بال ٹھاکرے کو خبر کر دی گئی تھی۔ میں نے اسی لمحے دل میں طے کر لیا کہ ان دور مار میزائیلوں کی پوری رپورٹ حاصل کر کے امرتسر میں مقیم اپنے آدمی کے ذریعے پاکستان میں ملک صاحب اور بٹ صاحب کو پہنچا دی جائے گی۔ میں نے اس منصوبے کا مزید سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے بال ٹھاکرے سے پوچھا۔ جب بال ٹھاکرے بات کر رہا ہوتا تھا تو کسی کو

س کے بیچ میں بولنے کی جرات نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت بال ٹھاکرے بات ختم
کر چکا تھا اور بیئر کے دوسرے گلاس کے گھونٹ بھر رہا تھا۔
میں نے کہا۔
"سینا پتی جی! یہ شبھ خبر سنا کر آپ نے میرے دل کو خوش کر دیا ہے۔
صرف کشمیر ہی نہیں پاکستان بھی بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔"
یہ بات بال ٹھاکرے کو بڑی اچھی لگی۔ بیئر کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے وہ
میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔
"دھرم چند! تم نہ وہ بات کہہ دی ہے جو بھارت کی ہر سرکار کہتے ہوئے
ڈرتی ہے۔ اندر سے مانتی ہے اور اندر سے اس پالیسی پر عمل کرتی ہے لیکن زبان
سے کسی کو نہیں کہتی۔ میں شروع ہی سے یہ کہتا آ رہا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ
پاکستان بھارت کا اٹوٹ انگ ہے - بھارت ماتا کا یہ بازو زبردستی اس کے جسم سے
الگ کیا گیا ہے۔ ہمیں اسے پھر سے بھارت ماتا کے جسم کے ساتھ جوڑنا ہے۔ تم نے
یہ بات کہہ کر میرا دل جیت لیا ہے دھرم چند۔"
اور اس نے اپنے چاندی کے سگریٹ کیس میں سے سگار نکال کر مجھے پیش
کرتے ہوئے کہا۔
"میں جانتا ہوں تم کبھی کبھی سگریٹ پیتے ہو لو یہ سگار پیئو۔ یہ میں تمہیں
اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔"
میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بال ٹھاکرے کا اعتماد حاصل ہو رہا تھا اور
بھارت سرکار کے مزید پاکستان دشمن منصوبوں کا علم حاصل ہونے والا تھا۔ میں نے
سگار لے کر بال ٹھاکرے کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے خود چاندی کا لائٹر جلا کر میرا سگار
سلگایا اور کہنے لگا۔
"ان میزائیلوں کا نام پرتھوی میزائیل تجویز ہوا ہے۔"
میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"سر! کیا یہ میزائیل تیار ہونا شروع ہو گئے ہیں؟"
بال ٹھاکرے نے لائیٹر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"تیار ہونا شروع نہیں ہوئے بلکہ تیار ہو چکے ہیں اور انہیں بڑی راز داری کے ساتھ لانچنگ پوائنٹ پر پہنچا بھی دیا گیا ہے۔"
میں نے دل میں کہا۔
"فکر نہ کرو۔ خدا نے چاہا تو وہ لانچنگ پوائنٹ ہی ان میزائیلوں کا قبرستان بنے گا۔"

اوپر سے کہا۔
"یہ لانچنگ پوائنٹ ضرور فیروز پور ضلع میں کسی جگہ پر ہوگا۔"
بال ٹھاکرے نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں' اس کے لئے جالندھر کے قریب ایک علاقے کو چنا گیا ہے۔ یہ علاقہ کس جگہ پر واقع ہے۔ وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ اس کی خبر یا بھارت سرکار کی سیکریٹ ایجنسیوں کو ہے یا مجھے ہے۔ مجھے سرکاری طور پر بتایا گیا ہے۔"
میرا خیال تھا کہ اگر یہ لانچنگ پوائنٹ ضلع فیروز پور میں کسی مقام پر ہوگا تو مجھے وہاں سے جالندھر جا کر بھاسکر' شیوا اور پاٹیکر کو قتل کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اب جب معلوم ہوا کہ یہ مقام جالندھر ضلع میں ہی ہے تو میں دل میں خوش ہوگیا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنے کی جلدی تھی کہ یہ بھارتی فرعون مجھے جس خفیہ مشن پر بھیج رہا ہے وہ کیا ہے۔ بال ٹھاکرے کہنے لگا۔
"پرتھوی میزائیلوں کی پہلی کھیپ لانچنگ پوائنٹ کے خفیہ مقام پر پہنچا دی گئی ہے۔ اس کا لانچنگ پیڈ زمین کے اندر بنایا گیا ہے۔ یہ زمین کے اندر ایک بہت بڑے تہہ خانے میں کنوئیں کی شکل میں ہے۔ یہ سب کچھ ایک ویران ٹیلے کے اندر تیار کیا گیا ہے اور لانچنگ پیڈ کے کنوئیں کا منہ ٹیلے کے اوپر کھلتا ہے۔ جہاں سے یہ میزائیل فائر ہونے کے بعد پاکستان کے جنوبی شہروں لاہور' سیالکوٹ' ملتان اور

گوجرانولہ کو اپنا نشانہ بنائیں گے۔ یہ نیوکلیر میزائیل نہیں ہیں لیکن ان کا طاقت اتنی زیادہ ہے اور یہ اس قدر تباہ کن ہیں کہ پاکستان کے جس شہر پر گریں گے اسے تباہ کرکے کھنڈر بنا دیں گے۔ وہاں کوئی انسان زندہ نہیں بچے گا۔ کوئی عمارت سلامت نہیں رہے گی۔"

میں نے میزائیلوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج! یہ تو بڑی زبردست پرسنتا کی بات آپ نے بتائی ہے لیکن صرف ایک میزائیل جس میں نیوکلیر پاور نہ ہو لاہور ایسے بڑے شہر کو کیسے تباہ کر سکتا ہے؟"

بال ٹھاکرے کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ چہرے پر خباثت نمایاں ہو گئی۔ کہنے لگا۔

"دھرم چند! بھارت سائنس میں پاکستان سے بہت آگے ہے۔ ان پرتھوی میزائیلوں میں اعصابی گیس کی بھی ایک خاص مقدار شامل کی گئی ہے۔ جہاں اس میزائیل کے دھماکے کا اثر نہ پہنچ سکے گا وہاں یہ اعصابی گیس پہنچ کر ایک سکینڈ میں انسان کو موت کی نیند سلا دے گی۔"

یہ سن کی ایک دفعہ تو میرا دل بھی بیٹھنے لگا۔ پاکستان کے ان دشمنوں نے تو خاکم بدہن پاکستان کو نیست و نابود کرنے کا ناپاک منصوبہ تیار کر' ا تھا۔ اب یہ میرا فرض بن گیا تھا کہ ان میزائیلوں کو ایک ایک کرکے تباہ کرنا ہے۔ خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اوپر سے میں نے بال ٹھاکرے کی طرف دیکھ کر خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

"سینا پتی جی! میں سمجھتا ہوں کہ یہ میزائیل پاکستان پر جتنی جلدی ہو سکے گرا دینے چاہئیں۔ تاکہ بھارت ماتا کا ٹوٹا ہوا بازو پھر سے جڑے جائے اور بھارت پھر سے اکھنڈ بھارت ہو جائے۔"

بال ٹھاکرے نے سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ وقت آنے پر اور مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ اس کے لئے بنگلہ دیش کی طرح زمین ہموار کی جائے گی لیکن اس وقت جو بات مجھے اور ہمارے محکمہ دفاع کی خفیہ ایجنسیوں کو پریشان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ دشمنوں کو کسی طرح ہمارے ان میزائیلوں کے منصوبے اور اس کے لانچنگ پوائنٹ والے علاقے کی خبر ہو گئی ہے اور پاکستان کی خفیہ سروس کے دو جاسوس ضلع جالندھر کے میزائلوں والے ٹیلے کے آس پاس چکر لگاتے پکڑے بھی گئے ہیں۔ وہ اس وقت جالندھر چھاونی کی جیل میں بند ہیں اور ان سے ان کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ تمہیں میری سفارش پر بھارت کی محکمہ دفاع کی سیکرٹ سروس کی طرف سے خاص طور پر اس مشن پر بھیجا جا رہا ہے کہ تم اس علاقے میں گھوم پھر کر یہ معلوم کرو کہ پاکستان کا اگر کوئی اور جاسوس وہاں پر ہے تو وہ کس جگہ پر ہے کیا وہ اکیلا ہے یا اس کے ساتھ دوسرے آدمی بھی ہیں۔ تم کو چونکہ ہندی کی گیتا اور ویدوں کے سنسکرت کے اشلوک زبانی یاد ہیں اور تم اردو بھی پاکستانی لہجے میں بول لیتے ہو۔ کیونکہ تمہیں اپنی جاسوسی کے زمانے میں پاکستان میں دیر تک رہنے کا موقع ملا ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ تم مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کی آیات بھی زبانی بول لیتے ہو اس لئے اس کام کے لئے خاص طور پر تمہیں چنا گیا ہے۔ تم ہندو سکھوں کے ماحول میں جوگی سنیاسی بن کر اور ضلع جالندھر کے مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں کے ماحول میں صوفی بزرگ بن کر ان میں گھل مل سکتے ہو۔ ظاہر ہے یہ پاکستانی جاسوس مسلمان ہوں گے۔ جو دو جاسوس پکڑے گئے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ اگرچہ انہوں نے پاکستانی ہونے کا اعتراف نہیں کیا اس وجہ سے ان لوگوں کا مالیر کوٹلہ کے کسی نہ کسی مسلمان ضرور رابطہ ہو گا۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ مالیر کوٹلہ میں ہندو مسلم فساد بالکل نہیں ہوا تھا اور وہاں کے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان نہیں گئے تھے۔ وہ اسی طرح وہاں رہ رہے ہیں۔ تمہیں ان مسلمانوں کے درمیان ایک

سلمان فقیر درویش بن کر جانا ہو گا اور پاکستانی جاسوسوں کا سراغ لگانا ہو گا۔ تاکہ اس کے پیشتر کہ وہ جاسوس پرتھوی میزائیل کے خفیہ لانچنگ پوائینٹ کے بارے میں پاکستان کی خفیہ سروس کو پوری معلومات پہنچائیں انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے۔ کیوں دھرم چند۔"

میں نے اسے اپنے خیالات سے چونک کر کہا۔

"جی مہاراج! بالکل سمجھ گیا ہوں۔"

بال ٹھاکرے بولا۔

"اپنے اپنے وقت پر تمہارے ذمے دو کام لگائے جائیں گے۔ تمہارا پہلا خفیہ مشن مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں میں جا کر پاکستانی جاسوسوں کا پتہ لگانا ہو گا۔ اس دوران جو دو جاسوس پکڑے گئے ہیں تمہاری سول اور ملٹری سیکرٹ سروس ان سے پوچھ گچھ جاری رکھے گی۔ اگر ان سے ہمیں مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو تمہاری دوسری ڈیوٹی اور دوسرا مشن یہ ہو گا کہ تمہیں ایک پاکستانی مسلمان جاسوس کی حیثیت سے جو پکڑا گیا ہے۔ جیل میں پہلے سے بند پاکستانی جاسوسوں کے ساتھ قید کر دیا جائے گا۔ محض دکھانے کے لئے تم پر تھوڑا بہت ٹارچر بھی کیا جائے گا۔ یوں تم ان کے ساتھ گھل مل کر ان پر یہ ثابت کرو گے تو تم بھی پاکستانی سیکرٹ سروس کے آدمی ہو اور تمہیں بھی ایک خاص مشن پر اس علاقے میں بھیجا گیا تھا اور تم پکڑے گئے ہو۔ پھر تم ان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو گے کہ بھارت میں ان کے دوسرے پاکستانی جاسوس ساتھی کہاں کہاں پر ہیں۔ یہ دونوں کام تمہیں اپنے اپنے وقت پر کرنے ہوں گے۔ مگر سب سے پہلے تمہیں صوفی درویش بن کر مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں میں جانا ہو گا۔ کیا تم اس مشن کے لئے اور بھارت ماتا کی سیوا کرنے کے لئے تیار ہو۔؟"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سیناپتی جی! میں بھارت ماتا کی سیوا اور بھارت کی اکھنڈتا کے لئے اپنی

جان بلیدان دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ آپ حکم کریں کہ مجھے اس مشن پر کب روانہ ہونا ہوگا۔"

بال ٹھاکرے چہرے پر ایک ایسی مکروہ ہنسی نمودار ہوئی جس میں پاکستان کی دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے اس حقیقت کا ایک بار پھر احساس ہوا کہ ہندو کے لیڈر اور ہندو کی حکومت واقعی پاکستان کی دشمن نمبر ایک ہے۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کو پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتی بلکہ اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتی ہے۔ آپ خود مجھے بتائیں بلکہ میں یہ سوال بھارت کے دانشور ہندو سکھوں سے بھی پوچھتا ہوں کہ اگر ان کے دلوں میں پاکستان کے خلاف کوئی نفرت نہیں ہے۔ اگر وہ پاکستان کو ترقی کرتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ان چند ایک دانشوروں کی ذاتی رائے پاکستان کو ان کی سرکار کے بنائے ہوئے پرتھی میزائیلوں سے نہیں بچا سکتی۔ ان چند ایک انسان دوست ہندو سکھ دانشوروں کو کون پوچھتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک مقام پر آکر وہ بھی بھارت کی پاکستان دشمن اور اس کے پاکستان کے خلاف جارحانہ عزائم کی حمایت کرنے لگیں۔ جیسا کہ 65ء کی جنگ میں ہوا تھا بھارت کے رواداری پسند اور آزاد خیال دانشور بھی پاکستان کے خلاف ریڈیو اور دوردرشن پر تقریریں کرنے لگے تھے۔ یہ تو ایک آزاد اور خودمختار ملک کی سلامتی اور اس میں بسنے والی آزاد قوم کی سالمیت اور اس کی بقا کا معاملہ ہے۔ کوئی بھی آزاد ملک یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ دوسرا ملک اس پر چڑھائی کر دے اس کے شہروں کو میزائیلوں سے تباہ کرنا شروع کر دے اور اس کے عوام رواداری بھائی چارے اور بین الاقوامی انسانیت کے گیت گاتے رہیں۔ یہ تو قوموں کی عزت آبرو غیرت اور زندگی اور موت کا مقام ہوتا ہے اور آبرو مند زندہ قومیں تو اپنی آزادی اور اپنے وطن کی بقا اور سلامتی کے لئے جان کی بازی لگا دیتی ہیں۔ پھر تو تخت یا تختے والی بات ہوتی ہے یا ہم نہیں یا دشمن نہیں ----!

بال ٹھاکرے کہہ رہا تھا۔

"ہرچووال میں تمہاری گھروالی کو ہر مہینے تمہاری تنخواہ میں سے تین ہزار
وپے ملتے رہیں گے۔ تمہارے اس مشن کے لئے تنخواہ سات ہزار روپے ماہوار
طے ہوئی ہے۔ تین ہزار تمہاری بیوی کو پہنچا دیئے جائیں گے۔ چار ہزار روپے
ہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیئے جائیں گے۔ تمہیں ایک خفیہ کوڈ نمبر دیا جائے گا۔
ہ نمبر دکھا کر تم بھارت کے کسی بھی شہر میں کسی بھی پولیس سٹیشن سے مدد حاصل کر
لو گے۔ جس بینک میں جا کر یہ کوڈ نمبر دکھاؤ گے تم دس سے بیس ہزار روپے تک
ری طور پر حاصل کر سکو گے۔ بھارت کے کسی بھی محکمے کے انڈین سول افسر کو یہ
بر دکھا کر تم اس کے ہر طرح کی شہری اور سرکاری سہولتیں حاصل کر سکو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"سر! کیا یہ کوڈ نمبر کسی کارڈ کی شکل میں ہو گا۔"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا کوئی کارڈ نہیں ہو گا۔ یہ خفیہ کوڈ نمبر تمہیں زبانی یاد کرنا
گا۔ اس نمبر کا اثر طلسمی ہو گا۔ یہ نمبر مصیبت کے وقت تمہارے کام آئے گا۔ یہ
ر خود مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔"

"یہ مجھے کون دے گا مہاراج؟" میں نے سوال کیا۔

بال ٹھاکرے بولا۔ "یہ نمبر تمہیں دلی میں ڈیفنس انٹیلی جنس کا محکمہ دے
۔ ڈیفنس انٹیلی جنس کا دفتر بھارت کے کیبنٹ سیکریٹریٹ میں ہے اور یہ محکمہ براہ
است بھارت کے پردھان منتری کے ماتحت ہے۔ سارے بھارت معاملات طے ہو
چکے ہیں۔ تمہاری پاسپورٹ سائز تصویریں ڈیفنس انٹیلی جنس کے آفس میں پہنچ چکی
ں۔ تم اس کے انچارج مسٹر سریندر کوہلی سے جا کر براہ راست ملاقات کرو گے۔
مارے مشن کے بارے میں وہی تمہیں گائیڈ کرے گا۔"

بال ٹھاکرے بیئر گلاس میں [illegible] لینے کے لئے رکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"سر! مجھے اس مشن کے لئے کب روانہ ہونا ہو گا۔"

بال ٹھاکرے نے اپنی موٹی شیشوں والی عینک ناک پر جماتے ہوئے کہا۔
"تم آج صبح جنتا ایکسپریس کے ذریعے دلی روانہ ہو جاؤ گے۔ دلی سٹیشن پر تمہیں گنگا کھاڈیکر نام کا ایک آدمی ملے گا۔ وہ تمہیں پہچان لے گا اور تمہیں کیبنیٹ سیکرٹریٹ لے جائے گا۔ تمہارے پاس دوسرا کرتہ پاجامہ ہے۔"
میں نے کہا۔
"جی ہاں۔ آج ہی لانڈری سے دھلا کر لایا تھا۔"
"وہ پہن لینا۔ ساتھ کچھ اور چیز لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو گی وہ تمہیں وہاں مل جائے گی۔ اب تم جا کر آرام کرو۔ صبح ٹھیک وقت پر ریلوے سٹیشن پہنچ جانا۔"
اس کے بعد بال ٹھاکرے نے اپنی جیب سے بٹوہ نکال کر مجھے دو سو روپے دیئے اور کہا۔
"یہ تمہارے دلی تک کے سفر کے لئے کافی ہوں گے باقی تمہیں دلی پہنچنے کے بعد ضرورت کی ہر شے مل جائے گی۔ بھگوان تمہاری رکشا کرے اب جاؤ۔"
میں نے اٹھ کر وہاں کے رواج کے مطابق بال ٹھاکرے کے پاؤں چھو کر آنکھوں سے لگائے اور پرنام کر کے الٹے پاؤں کمرے سے نکلنے لگا تو بال ٹھاکرے نے کہا۔
"یہ ساری باتیں جو میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہیں ٹاپ سیکرٹ باتیں ہیں۔ ان کو راز میں رکھنا تمہاری ڈیوٹی ہے۔ ان کا کسی سے ذکر تک نہ کرنا۔"
میں نے کہا۔
"جو حکم مہاراج! ایسا ہی ہو گا۔"
میں کمرے سے نکل گیا۔
میرا قیام بمبئی میں شیو سینا کے دفتر میں ہی ہوتا تھا۔ وہیں ایک کمرے میں

رات کو سوتا تھا۔ کمرے میں آکر میں چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ مجھے ایک انتہائی نازک اور انتہائی خفیہ مشن دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اصولی طور پر ڈیفنس انٹیلی جنیس کا کوئی نہ کوئی جاسوس میری نگرانی پر بھی مامور کیا جائے گا جو میری نقل و حرکت کی نگرانی کرے گا۔ ایسا عام طور پر ہوتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس مشن کے لئے میرے پیچھے کوئی جاسوس نہ لگایا جائے۔ کیونکہ میرا مشن بھارت کے اندر ہی تھا۔ کسی دوسرے ملک میں نہیں تھا۔ اگر کسی دوسرے ملک میں ہوتا تو بھارت کے سفارت خانے کا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور میری نگرانی کرتا۔ بہرحال میں ہر قسم کے حالات کے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ میں نے دو فیصلے دل میں کر لئے تھے۔ پہلا فیصلہ یہ تھا کہ مجھے ان دور مار میزائیلوں کی تنصیب اور لانچنگ پوائنٹ کے بارے میں پاکستان کی خفیہ ایجنسی کو معلومات مہیا کرنی تھیں اور دوسرا فیصلہ یہ کیا تھا کہ پاکستان کے خلاف استعمال ہونے والے ان میزائیلوں کو ان کے خفیہ ڈمپ میں ہی تباہ کرنا تھا مگر تباہ اس طرح کرنا تھا کہ کوئی حادثہ معلوم ہو یا پھر وہاں کے کسی ملازم کی غفلت سے ایسا ہو۔ مجھ پر کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ اس کے علاوہ میرا اپنا ایک مشن بھی تھا۔ یہ مشن جالندھر کے بوڑ والے مندر میں روپوش سورت کے مسلمانوں کے قاتلوں بھاسکر، پاٹیکر اور شیوا کو ٹھکانے لگا کر سورت کے مسلمانوں کے خون اور مسلمان خواتین کی بے حرمتی کا بدلہ چکانا تھا۔

میں یہ ساری باتیں لاہور میں ملک صاحب اور بٹ صاحب کو خفیہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے پہنچانے کے لئے بھی بے تاب تھا مگر میرے پاس کوئی ٹرانسمیٹر نہیں تھا۔ اس کے لئے مجھے امرتسر اپنے آدمی کے پاس جانا پڑتا تھا اور اس کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ ملک صاحب اور بٹ صاحب کا خفیہ کوڈ اور فریکو ئنسی مجھے معلوم تھی۔ میں نے یہ سوچا کہ بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کے مرکز میں جا رہا ہوں۔ وہاں جب بھی کسی جگہ موقع ملا اور کوئی ٹرانسمیٹر ہاتھ آگیا تو میں یہ ساری خفیہ باتیں ملک صاحب یا بٹ صاحب کو پہنچا دوں گا۔ اسی قسم کی باتوں پر غور کرتے ہوئے رات

گذر گئی۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ اگر مجھے آفس کا ایک ملازم آ کر نہ جگاتا تو شاید میں سویا رہتا اور گاڑی نکل جاتی۔ دفتر کی طرف سے کسی نے اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ جنتا ایکسپریس بمبئی کے دوسرے بڑے سٹیشن بوری بندر سے نو بج کر چالیس منٹ پر چلتی تھی۔ مجھے سات بجے جگا دیا گیا۔

میں اٹھ کر نہایا۔ شیو کی لانڈری سے آیا ہوا کھدر کا صاف ستھرا کرتہ پاجامہ پہنا۔ گلے میں کانگریسی ورکروں والا کھدر کا تھیلا لٹکایا۔ تھیلے میں میرا ٹوتھ برش' شیو کا سامان اور کاپی پنسل تھی۔ سو سو کے دونوں نوٹ جو بال ٹھاکرے نے مجھے دیئے تھے میں نے کرتے کی جیب میں رکھ لئے۔ آفس سے نکل کر بمبئی کی ایک دو منزلہ بس میں بیٹھا اور بوری بندر پہنچ گیا۔ بمبئی کی صبح مجھے شروع ہی سے بڑی اچھی لگتی تھی۔ بھارت کا یہ شہر اپنے موسم اور کھانے پینے کی وجہ سے دوسرے شہروں سے مختلف ہے۔ یہاں کی فضا بھی بھارت کے دوسرے شہروں سے مختلف ہے۔ یہاں اینگلو انڈین اور پارسی کافی تعداد میں آباد ہیں اور بمبئی کے گجراتی اور مرہٹہ کلچر کے ساتھ ساتھ پارسیوں اور اینگلو انڈینوں کا کلچر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ بوری بندر کا سٹیشن جن لوگوں نے دیکھا ہوا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ بڑا شاندار سٹیشن ہے اور یہاں سے بھارت کے مختلف شہروں کو گاڑیاں جاتی ہیں۔ جنتا ایکسپریس وہیں سے تیار ہوتی تھی۔ نو بجے خالی ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر لگ گئی۔ اس میں کوئی فسٹ سیکنڈ اور تھرڈ کلاس نہیں تھی۔ سارے ڈبوں کی کرسی نما سیٹیں ایک جیسی تھیں۔ صرف برتھوں کی بکنگ ہوتی تھی۔ یہ بکنگ تین تین چار چار دن کی ایڈوانس ہوتی تھی۔ میری بکنگ نہ ہو سکی تھی۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں سیٹ پر ہی سو جانے کا عادی تھا۔ نو بجکر پچاس منٹ پر ٹرین چل پڑی۔

دلی تک کا سفر کافی طویل سفر تھا۔ راستے میں کئی مشہور شہر' جنگل اور دریا آئے۔ سارا دن پھر ساری رات ٹرین کا سفر جاری رہا۔ دوسرے دن شام کے وقت ٹرین دلی پہنچ گئی۔ دلی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اتر کر میں ایک ایسی جگہ پر جا کر کھڑا

ہوگیا جہاں سے مجھے دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ مسافر ٹرین سے اتر کر اپنے اپنے سامان کے ساتھ گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک درمیانی عمر کا دبلا سا آدمی جس نے قمیض پتلون پہنی ہوئی تھی میری طرف آیا۔ کہنے لگا۔

"کیا آپ کا نام دھرم چند ہے؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں' کیا آپ گنگا کھاڈیکر ہیں؟"

"جی ہاں' میرے ساتھ آ جائیں۔"

سٹیشن کے باہر ایک سرکاری سٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ آگے ڈرائیور بیٹھا تھا۔ کھاڈیکر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سٹیشن ویگن چل پڑی۔ کھاڈیکر نے کہا۔

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔"

دلی کے ہندو بھی بڑی صاف اردو بولتے تھے' وہ کہنے لگا۔

"آپ نے برتھ بک نہیں کرائی۔ میں نے اس لئے پوچھ لیا۔"

میں نے کہا۔

"برتھ کی بکنگ نہیں ہو سکی تھی۔ ویسے مجھے سیٹ پر بھی نیند آ جایا کرتی ہے اور میں آرام سے سو جاتا ہوں۔"

کھاڈیکر ہنس کر بولا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا' میں نے کہا۔

"جی نہیں شکریہ' اس وقت سگریٹ پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

سٹیشن ویگن دلی کی بارونق اور روشن روشن سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی شہر سے باہر نکل آئی تھی۔ پھر بڑا فیشن ایبل اور شاندار بنگلوں والا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ علاقہ بھی گذر گیا۔ اس کے بعد گاڑی ایک بہت بڑی گراؤنڈ کے قریب سے گزری۔ اس کے آخر میں ایک طرف ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ جس میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ سٹیشن ویگن اس کے احاطے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ احاطہ بھی خالی پڑا تھا۔ کھاڈیکر نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"یہاں آپ کے لئے ایک کمرہ بالکل تیار کر دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔"

عمارت کی پہلی منزل کے کونے پر ایک کمرہ تھا۔ کھاڈیکر نے چابی لگا کر اسے کھولا۔ اندر سے سیلن کی عجیب سی بو آئی فرش پر پرانا قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف بیڈ لگا تھا۔ سامنے تین آرام دہ کرسیاں اور درمیاں میں گول ٹیبل پڑی تھی۔ کھاڈیکر نے غسل خانے کی بتی جلاتے ہوئے کہا۔

"یہاں آپ کو چوبیں گھنٹے پانی ملے گا۔ اگر آپ نے کھانا نہیں کھایا تو مجھے بتا دیجئے۔ میں نوکر کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ آپ کے لئے کھانا لے آئے گا۔"

میں نے تھیلا بیڈ پر رکھا اور بیٹھ گیا۔

"جی ہاں' کھانے کا کہہ دیجئے مگر میں ویشنو ہوں۔ سبزی ترکاری کھاؤں گا۔"

کھاڈیکر ہنس پڑا۔

"مہاراج! میں بھی ویشنو ہوں۔ فکر نہ کریں۔ آپ کو دال بھاجی اور سبزی یہاں بالکل تازہ ملے گی۔ اب آپ آرام کریں۔ میں صبح نو بجے آؤں گا۔ پھر آپ کو میرے ساتھ کیبنیٹ سیکرٹریٹ چلنا ہو گا۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ"

کھاڈیکر چلا گیا۔

"دوسرے روزہ وہ دن کے ساڑھے آٹھ بجے مجھے لینے آ گیا۔ میں ناشتہ وغیرہ کر کے تیار ہو چکا تھا۔ وہاں سے ہم دلی سیکرٹریٹ گئے۔ کیبنٹ سیکرٹریٹ کے دفاتر بھی وہیں ایک الگ ونگ میں تھے۔ کھاڈیکر میرے ساتھ تھا۔ کیبنٹ سیکرٹیریٹ براہ راست بھارت کے پردھان منتری کے ماتحت تھا۔ اس کی عمارت کے اوپر بھی بھارت کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ڈیفنس انٹیلی جنس کا ونگ الگ تھا۔ جگہ جگہ باوردی گارڈز ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ ڈیفنس انٹیلی جنس کے ویٹنگ روم میں بیٹھا کر کھاڈیکر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا کہنے لگا۔

"دھرم چند جی! آئیے۔ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ڈیفنس انٹیلی جنس کا چیف سریندر کوہلی اپنے شاندار کمرے میں بہت بڑی میز کے سامنے کرسی پر نیم دراز کسی فائیل پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ہم کمرے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ سریندر کوہلی ادھیڑ عمر کا آئی سی ایس آفسر تھا۔ چہرے پر سول سروس کے تجربے کی پختگی تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا تھا۔ بالوں میں سفیدی آ چکی تھی۔ اس نے فائیل ایک طرف رکھتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں ذہانت کے ساتھ ساتھ مکاری اور عیاری جھلک رہی تھی۔ مسکرائے بغیر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تم دھرم چند ہو؟"

مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہ لگا لیکن مجھے ان لوگوں سے بہت سے خفیہ راز حاصل کرنے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں مہاراج! میرا نام ہی دھرم چند ہے۔"

سریندر کوہلی نے کھاڈیکر کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا۔ سریندر کوہلی کہنے لگا۔

"ٹھاکرے جی نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تم

بہت دیش بھگت ہو۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج! اپنی تو ساری عمر دیش بھگتی میں گذری ہے۔ دیش کی سیو
کرتے گذری ہے۔ ہم تو ایسے موقع کی تلاش میں ہیں کہ کب بھارت ماتا کو ہمار
جان کی ضرورت پڑے اور ہم اس پر اپنی جان بھی بلیدان کر دیں۔"

ڈیفنس انٹیلی جینس کا چیف بڑا خوش ہوا مگر اس خوشی کے تاثرات کو اس
نے اپنے چہرے پر نہ آنے دیا۔ بس گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔ کہنے لگا۔

"ہم بال ٹھاکرے جی کے حکم پر یقین کر کے تم پر بھروسہ کر رہے ہیں۔
ایک بات ٹھاکرے جی نے بھی تمہیں بتا دی ہوگی اور میں بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ
تمہارا مشن خفیہ بھی ہے اور خطرناک بھی ہے۔ اسی میں سب سے ضروری بات اس
مشن کی راز داری ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں سر! ساری زندگی بڑی راز داری سے بھارت
ماتا کی سیوا کی ہے۔ پاکستان والوں نے پکڑ لیا تھا تو وہاں بھی اپنی زبان بند رکھی۔ کیسا
کیسا ٹارچر نہیں کیا انہوں نے مگر کیا مجال کہ میں نے بھارت کی سیکرٹ سروس کا
ایک بھی راز بتایا ہو۔"

"تمہاری فائل میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے میں نے تمہاری فائل کو بڑے غور
سے سٹڈی کیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھا اور بولا۔

"دھرم چند جی! میرے ساتھ آؤ۔"

اس کے کمرے میں ایک دروازہ تھا جس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ پردہ ہٹا کر اس
نے دروازہ کھولا۔ ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہ اس کا ریٹائرنگ روم تھا۔
یہاں بھی دیوار پر گاندھی، نہرو اور اندرا گاندھی کی تصویریں لگی تھیں۔ ایک

آرام دہ کرسی اور صوفہ سیٹ سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے صوفے پر
بیٹھ گیا۔ میری فائل وہ دراز میں سے نکال کر ساتھ لیتا آیا تھا اور اسے کھول کر غور
سے پڑھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔
میں اسے کبھی نہ بتاتا کہ پاکستان خفیہ سروسز کا ہیڈ کوارٹر فلاں جگہ پر ہے۔
میں نے کہا۔
"مہاراج! یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو بم لگا کر بھاگ رہا تھا کہ دھماکے کے
فوراً" بعد پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ مجھے گولی لگی تھی۔ ایک ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال
میں پڑا رہا۔ ہسپتال سے فارغ ہوا تو فرار ہونے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ ایک روز
پیشی بھگتنے ضلع کچہری جا رہا تھا کہ فرار ہو گیا۔"
چیف بولا۔
"تم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا ہے ورنہ ہمارے اکثر آدمی پاکستان میں
پکڑے جاتے ہیں تو بس وہیں قید میں پڑے رہتے ہیں۔"
اس نے میری فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ اٹھ کر لوہے کی
الماری میں سے سرخ رنگ کی ایک اور فائل نکالی اور میرے سامنے والے صوفے
پر بیٹھ گیا۔ فائل میرے آگے میز پر رکھ کر کھولی۔ ایک خاص صفحہ نکال کر مجھے
دکھایا۔ کہنے لگا۔
"یہ صفحہ یا پردھان منتری نے دیکھا ہے یا میں نے دیکھا ہے۔ تیسرے
آدمی تم ہو جسے یہ صفحہ دکھایا جا رہا ہے۔"
میں نے دیکھا کہ یہ نیلے رنگ کا تہہ کیا ہوا کاغذ تھا جو فائل میں لگا ہوا تھا۔
چیف سریندر کوہلی نے اسے کھول دیا۔ اس پر سفید رنگ کی آڑھی ترچھی لکیریں بنی
ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ ایسے ہندسے لکھے ہوئے تھے جیسے جمع تفریق کے سوال حل کئے
گئے ہوں۔ کہنے لگا۔
"یہ جالندھر سے پندرہ میل دور امرتسر کی جانب اس غیر آباد ویران ٹیلے کا

نقشہ ہے جس کے اندر ہمارے نئے دور مار پر تھوی میزائل لگائے جائیں گے۔"

نقشے میں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا مگر ظاہر میں یہی کر رہا تھا کہ میں نقشے کی ایک ایک لائن ایک ایک زاویے کو پوری طرح سمجھ رہا ہوں۔ وہاں مجھے اپنی فرضی مہارت دکھانی ضروری تھی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اصل جگہ کا نام کیا ہے اور یہ کس گاؤں کے قریب ہے۔ میں نے چیف سے پوچھا۔

"سر! اس جگہ کے آس پاس کوئی گاؤں بھی ہے؟"

چیف نے نقشہ تہہ کر کے فائل کو بند کیا اور بولا۔

"اس ٹیلے کے دائیں جانب تین میل کے فاصلے پر جوگی وال ایک قصبہ ہے۔ یہ سکھ زمینداروں کا قصبہ ہے۔ ان سے ہمیں خبردار رہنا ہے۔ ان لوگوں نے ایک بار خالصتان کے کچھ سکھوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ جس کے بعد قصبے کے تین چار بڑے زمیندار گرفتار بھی کر لئے تھے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ خالصتان کے سکھ پاکستان کے حامی ہیں اور وہ ہمارے میزائیلوں کے اڈے کے خلاف جاسوسی کر سکتے ہیں۔ فوجی پوائنٹ آف ویو سے ہمارے لئے یہی جگہ سب سے مناسب تھی۔ ورنہ ہم کسی دوسری جگہ میزائیل فکس کر لیتے۔"

میں نے کہا۔

"اگر اس قصبے میں کوئی خاص بات نظر آئی تو میں آپ کو فوراً خبر کر دوں گا۔ میں اس قصبے کو بھی اپنی نظر میں رکھوں گا۔"

چیف نے فوراً کہا۔

"بس ہم یہی چاہتے ہیں۔ تمہیں مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں میں گھل مل کر پاکستانی جاسوسوں کی نشاندہی کے علاوہ سکھوں کے اس قصبے جوگی وال کی بھی نگرانی کرنی ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ دونوں کام بڑی خوش اسلوبی سے کرو گے۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ میری ڈیوٹی ہی نہیں بلکہ ایک دیش بھگت اور بھارت ماتا کے سپوت کی حیثیت سے میرا کرتوے بھی ہے۔"

چیف نے اس کے بعد فائل لوہے کی الماری میں لاک کر کے رکھ دی۔ اس کے دوسرے دراز کا تالا کھولا۔ اس میں سے کالے رنگ کی ایک نوٹ بک نکالی اور میرے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اب میں تمہیں بھارت سرکار اور اپنے پردھان منتری کی طرف سے وہ خفیہ نمبر دیتا ہوں جس کو ضرورت پڑ جانے پر ظاہر کرنے سے تمہاری مشکل حل ہو جائے گی۔ یہ نمبر دکھا کر تم کسی سرکاری ادارے، کسی پولیس سٹیشن، کسی سرکاری یا غیر سرکاری بینک سے مدد حاصل کر سکو گے۔"

انڈین ڈیفنس انٹیلی جنس کے چیف نے ایک کاغذ پر کاپی میں سے وہ طلسمی نمبر اتار کر مجھے دے دیا۔ یہ نمبر L-211 / T تھا۔ میں نے آپ کو یہ نمبر اس لئے ظاہر کر دیا ہے اور آپ کو بتا رہا ہوں کہ اب یہ نمبر بیکار ہے۔ ہر دو سال کے بعد وہاں محکمے کی طرف سے پرانا نمبر بدل دیا جاتا تھا۔

چیف سریندر کوہلی نے کہا۔

"تمہیں یہ نمبر زبانی یاد کرنا ہو گا۔ زبانی یاد کرنے کے بعد تم اس کاغذ کو پھاڑ کر اسے آگ لگا دو گے۔"

اس کے بعد چیف نے مجھے اپنا خفیہ اور خاص ٹیلی فون نمبر دیا اور کہا۔

"اس نمبر کو بھی تمہیں زبانی یاد کرنا ہو گا۔ اس نمبر پر مجھے تم موجود پاؤ گے۔ اگر فرض کر لیا کہ میں نہیں ہوں گا تو تم اس نمبر پر میرے لئے پیغام ریکارڈ کرا دو گے۔ تمہارا پیغام مجھے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کے بعد مل جائے گا۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ اس خفیہ نمبر سے الگ نہیں رہتا۔ اس مشن کے دوران تمہارا صرف مجھ سے رابطہ قائم رہے گا۔ صرف میں تمہیں کوئی خاص آڈر دے سکوں گا یا تمہاری ڈیوٹی میں تبدیلی کروا سکوں گا۔ ہماری سیکریٹ سروس کا کوئی آدمی تمہیں کسی قسم کا کوئی آڈر نہیں دے سکے گا۔ تم سے کسی قسم کی باز پرس بھی نہیں کر سکے گا۔"

اس نے مجھے اپنا خفیہ نمبر بھی لکھ کر دیا اور کہا۔

"اس ٹیلی فون نمبر کو بھی اچھی طرح یاد کرنے کے بعد ضائع کر دینا۔ کیونکہ یہ ہماری ڈیفنس ایجنسی کا بڑا اہم اور سیکریٹ نمبر ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ جیسا کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ بے فکر رہیں۔ یہ بتائیں کہ مجھے اپنے خفیہ مشن پر کس وقت روانہ ہونا ہوگا۔"

چیف کچھ سوچ کر بولا۔

"کیا تم پہلے کبھی مالیر کوٹلہ گئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں پہلے اس شہر میں کبھی نہیں گیا۔ بس جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

چیف میری طرف ذرا سا جھکتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ مسلمانوں کی ریاست کا شہر ہے۔ مغلوں کے زمانے میں اس ریاست کے مسلمان حاکم نے گورو گوبند سنگھ جی کے بچوں کے حق میں آواز بلند کی تھی جو مغلوں کی قید میں تھے۔ اس دن سے گورو گوبند سنگھ جی نے اعلان کر دیا تھا کہ سکھ مالیر کوٹلہ کی ہمیشہ حفاظت کریں گے اور یہاں کے مسلمانوں کی ہر مشکل وقت میں مدد کریں گے۔ چنانچہ جب پاکستان بنا اور پنجاب میں فسادات شروع ہوئے تو مشرقی پنجاب کے ہر شہر ہر گاؤں میں سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا مگر ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں کی پوری حفاظت کی۔ یہاں کے مسلمان مالیر کوٹلہ میں ہی رہے اور یہاں سے بھاگ کر پاکستان نہ گئے۔ مالیر کوٹلہ میں سکھ ہندو بھی رہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ امن چین سے کاروبار کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جن دو پاکستانی جاسوسوں کو ہم نے پکڑا ہے ان کے ساتھی یا تو مالیر کوٹلہ میں کسی جگہ مسلمانوں کی پناہ میں ہیں اور یا اگر کسی دوسری جگہ روپوش ہیں تو مالیر کوٹلہ میں ضرور آتے جاتے ہوں گے۔ وہاں سے تمہیں ان جاسوسوں کا سراغ مل سکے گا۔ اگر

تم ان کا سراغ نہ لگا سکے تو اس کے بعد تمہارے مشن کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا اور تمہیں پاکستانی جاسوس ظاہر کرکے جالندھر کے جیل خانے میں قید میں ڈال دیا جائے گا۔ تمہیں پاکستانی جاسوسوں میں سے کسی ایک جاسوس کی کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا۔ تم اپنی مہارت اور چالاکی سے اپنے آپ کو پاکستانی جاسوس ظاہر کرکے اس جاسوس سے ضروری معلومات حاصل کرو گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں سر! بالکل سمجھ رہا ہوں۔"

"ویری گڈ۔"

انڈین ڈیفنس انٹیلی جنس چیف سریندر کوہلی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"مائی ڈیئر دھرم چند! یہاں سے تم ہمارے خاص آدمی کھاڈیکر کے ساتھ ایک خفیہ مقام پر جاؤ گے۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی پاروتی سے تمہارا تعارف کروایا جائے گا۔ پاروتی ہماری سیکریٹ ایجنسی کی بڑی تجربہ کار اور ماہر جاسوس ہے۔ مالیر کوٹلے والے مشن میں وہ تمہاری مریدنی بن کر تمہارے ساتھ رہے گی۔ خوبصورت مریدنی کی وجہ سے لوگ تمہاری طرف جلدی متوجہ ہو جائیں گے اور تمہاری راہ زیادہ آسان ہو جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم چیف سریندر کوہلی کے پہلے والے بڑے آفس میں آ گئے۔ اس نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور کہا۔

"کھاڈیکر کو اندر بھیج دو۔"

معلوم ہوا کہ گنگا کھاڈیکر جو مجھے دلی کے ریلوے سٹیشن سے اپنے ساتھ یہاں سیکریٹریٹ لایا تھا۔ دوسرے کمرے میں اسی وقت سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ فوراً آ گیا۔ چیف کوہلی نے اسے کہا۔

"کھاڈیکر اب تم دھرم چند جی کو پاروتی سے ملانے لے جاؤ۔"

پھر میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

"تم اگر چاہو تو آج دوپہر کے بعد ہی اپنے مشن کو شروع کر سکتے ہو۔ تم اگر چاہو تو شام کو بھی اپنے مشن کا آغاز کر سکتے ہو۔ بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ یہ مشن جلدی سے شروع ہو جائے۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

میں نے چیف سریندر کوہلی کو پرنام کیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"وش یو گڈ لک۔"

گنگا کھاڈیکر اور میں وہاں سے نکل کر کیبنٹ سیکریٹریٹ کے کشادہ برآمدے میں آئے تو کھاڈیکر کہنے لگا۔

"ہم نے پاروتی کو بریف کر دیا ہے۔ اسے تمہاری تصویر بھی دکھا دی گئی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کو تمہارے ساتھ تمہاری مسلمان مریدنی بن کر مالیرہ کوٹلہ کی ریاست میں داخل ہونا ہو گا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اپنی طرف سے یہ لوگ مجھے پوری طرح اپنے سیکریٹ مشن میں پھنسا رہے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ میں اصلی دھرم چند نہیں ہوں بلکہ ایک محب وطن پاکستانی مسلمان ہوں جو پاکستان کی سلامتی کی خاطر ان دشمنوں کے پاکستان کے خلاف جارحانہ عزائم کو ملیامیٹ کرنے وہاں آیا ہے اور میں خود ان کے مشن میں اپنے آپ کو الجھا کر ان کے پاکستان دشمن راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک مسئلہ جو بہت ضروری تھا ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے کسی نے ابھی تک ٹرانسمیٹر یا وائرلیس پر خفیہ کوڈ کے ذریعے پیغام رسانی کی بات نہیں کی تھی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میرے لئے پاکستان اپنے دوستوں کو انڈین میزائیل کے لانچنگ پوائنٹ کے بارے میں اطلاع پہنچانی آسان ہو جاتی۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ پاکستان کی حکومت بھارت کے جارحانہ عزائم اور ان کی فوجی تیاریوں سے غافل نہیں ہے اور ان میزائیلوں کی رپورٹ پاکستان کے محکمہ دفاع کو پہنچ چکی ہو گی۔ اس کے باوجود میں اپنا فرض ادا کرنا ضروری سمجھتا تھا اور اس مشن کی پوری تفصیل اپنی حکومت

تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ ابھی تو میرے مشن کا آغاز ہی ہوا ہے۔ آگے چل کر مجھے ٹرانسمیٹر کی سہولت بھی ضرور حاصل ہو جائے گی۔

محکمہ ڈیفنس انٹیلی جنس کی سٹاف کار دلی کے فیشن ایبل علاقے سے گذر رہی تھی۔ دلی شہر بہت پھیلا ہوا تھا مگر سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم بہت ہوتا تھا۔ جگہ جگہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے جدید ڈیزائن کے مندر نظر آتے تھے۔ مسجد کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ خدا جانے دلی کے کن کن علاقوں سے گذرتی ہوئی ہماری سٹاف کار ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئی۔ جہاں ایک بہت بڑے میدان کے قریب دو تین پرانے کواٹر نما مکان کھڑے تھے۔ ان مکانوں کے باہر کوئی آدمی عورت یا بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف سنسان ماحول تھا۔ سٹاف کار ایک مکان کے آگے ہمیں اتار کر دور نیم کے درختوں کے نیچے جا کر کھڑی ہو گئی۔ گنگا کھاڈیکر کہنے لگا۔

"پاروتی ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔ پیچھے کی طرف سے آ جاؤ۔"

کواٹر نما مکان کے پیچھے بھی ویرانی برس رہی تھی۔ برآمدے میں بانس کی دو کرسیاں پڑی تھیں جن پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اس طرف بھی ایک دروازہ تھا۔ کھاڈیکر نے دروازے پر آہستہ سے تین بار دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔

"کم ان پلیز۔"

کھاڈیکر نے مجھے اشارہ کیا اور ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔ باہر جتنی ویرانی تھی کمرہ اندر سے اتنا ہی آباد لگتا تھا۔ بڑا قیمتی صوفہ سیٹ بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر پردے لٹک رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ صاف ستھرا بیڈ لگا تھا۔ کارنس پر اس زمانے کے بھارتی وزیر اعظم کی تصویر کے آگے گیندے کے تازہ ہار رکھے ہوئے تھے۔ ٹیبل پر گلدان میں موسمی پھول سجے ہوئے تھے۔ گورے رنگ کی لمبے بالوں والی درمیانے قد کی لڑکی نے جو انگریزی کتاب پڑھ رہی تھی اٹھ کر ہمارا

استقبال کیا۔ اس کا جسم متناسب تھا۔ اس نے فیروزی رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کو ربن سے باندھ رکھا تھا۔ یہ لڑکی واقعی بڑی خوبصورت تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ہونٹ آلوچوں کی طرف تھے۔ کھاڈیکر نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں شریمان دھرم چند جی اور یہ ہیں مس پاروتی جی۔"

پاروتی نے بازو آگے بڑھا کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی' کہنے لگی۔

"او کے' جہاں چاہے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے کافی لاتی ہوں۔"

کھاڈیکر نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے پاروتی جی۔"

پاروتی دوسرے کمرے میں جاتی ہوئی بولی۔

"کافی پہلے سے تیار ہے۔ مجھے تیار نہیں کرنی پڑے گی۔"

ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ سامنے والی دیوار پر ہندوؤں کے دیوتا ہنومان کی تصویر والا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ کھاڈیکر نے کہا۔

"پاروتی ہنومان جی کی پجارن ہے۔ دوسرے کمرے میں اس نے چھوٹا سا مندر استھان بنا رکھا ہے جہاں ہنومان جی کی مورتی کے آگے یہ روز اس کی پوجا کرتی ہے۔"

ہندو دیومالا سے میں پوری طرح باخبر تھا۔ ہندوؤں میں ہنومان طاقت اور شہ زوری کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ پاروتی کو بھی مردوں میں طاقت وری اور شہ زوری پسند تھی۔ اتنے میں پاروتی کافی اور ساتھ بسکٹ لے کر آگئی۔ کافی پیتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھا تو شریمان دھرم چند جی مجھے آپ کی مسلمان مریدنی کا پارٹ ادا کرنا ہوگا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"پاروتی جی! صرف پارٹ ادا نہیں کرنا ہوگا بلکہ اصلی مریدنی بن کر میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"نو پرابلم' ایسا ہی ہوگا۔"

کھاڈیکر ہماری طرف دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا اور بسکٹ کھا رہا تھا۔ میں نے پاروتی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ابھی سے ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جانا چاہئے۔ میں آپ کی جگہ تم کہہ کر تمہیں بلاؤں گا۔ تم مائنڈ تو نہیں کرو گی؟"

پاروتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں دھرم چند جی! بالکل نہیں۔"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا تم مسلمانوں کے مذہب' خاص طور پر ان کے مشہور بزرگوں اور درویشوں کے بارے میں جانتی ہو؟"

پاروتی نے مجھے کئی صوفی مسلمان بزرگوں کے نام اور ان کے عقائد اور مختصر حالات زندگی اور ایک عربی کی دعا کے چند جملے بھی سنا دیئے۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ بھارت کی خفیہ سروسز کے لوگ کس قدر کیل کانٹے سے لیس ہو کر پاکستان کے خلاف کام کر رہے ہیں۔

میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بس اب میں مطمئن ہوگیا ہوں۔ تم میری بڑی اچھی مریدنی بنو گی اور بھگوان نے چاہا تو ہم پاکستانی جاسوسوں کا سراغ لگانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

پاروتی نے میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ

نکال کر سلگایا اور بولی۔

"دھرم چند جی! اب ذرا تم بھی اپنا امتحان دو۔ میں بھی جانوں کہ تم ہندو ہو کر مسلمانوں کی مائیتھالوجی سے کتنے واقف ہو۔"

اس کو معلوم نہیں تھا کہ میں تو اصل مسلمان تھا۔ میں نے اسے فوراً سورۃ فاتحہ پڑھ کر سنا دی۔ کھاڈیکر بولا۔

"دھرم چند نے تو پہلے پرچے میں ہی سارا امتحان پاس کر لیا۔ اتنی لمبی عربی تو تم بھی نہیں بول سکتیں پاروتی جی۔"

پاروتی مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"واقعی دھرم چند جی! تم نے تو ثابت کر دیا کہ تم بڑے اچھے مسلمان درویش بن سکتے ہو۔ کیا خیال ہے ڈاڑھی لگاؤ گے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔

"نقلی ڈاڑھی کا خطرہ ہی رہے گا۔ وہ کسی بھی وقت ہمارا راز فاش کر سکتی ہے۔ اسی طرح اسی شکل میں رہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ ویسے بھی آج کل کے درویش صوفی ماڈرن ہو گئے ہیں۔ بس سر پر سبز رنگ کی ٹوپی پہن لوں گا۔ سبز چغہ ہو گا۔ گلے منکوں کی مالائیں ہوں گی۔ ماتھے پر محراب بنا لوں گا۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے معلوم ہے نقلی صوفی لوگ کس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔"

اس خوبصورت ہندو لڑکی پاروتی کے ساتھ وہاں بڑی بے تکلفی کا ماحول بن گیا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے۔ گنگا کھاڈیکر جو اس مشن میں ہمیں گائیڈ کر رہا تھا کہنے لگا۔

"اب تم لوگ آپس میں طے کر لو کہ یہاں سے نقلی صوفی اور صوفی کی مریدنی بن کر کسی وقت اپنے مشن پر روانہ ہونا ہے۔"

پاروتی کے ایک کمرے میں ہی بھیس بدلتے اور بہروپ بھرنے کا سارا ساز و سامان موجود تھا۔ یہ ساز و سامان سرکار کی خفیہ سروس کی جانب سے وہاں رکھا گیا

تھا۔ پاروتی نے ٹیلی ویژن لگا دیا۔ ٹیلی ویژن یعنی بھارت کے دور درشن پر ہندی میں خبروں کا بلٹن نشر ہو رہا تھا۔ اس وقت تک ابھی ڈش انٹینا کا رواج نہیں ہوا تھا۔ پاروتی نے ٹی وی کا سوئچ اوف کیا اور صوفے پر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی کہنے لگی۔

"یہ تو دھرم چند جی ہی بتائیں گے۔"

پاروتی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ پیچھے نہ کھینچا۔ میں اس پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں بھی پرانا تجربہ کار آدمی ہوں اور اس قسم کی باتوں سے گھبرایا نہیں کرتا۔

پاروتی نے اپنی ساڑھی اور بلاؤز پر کوئی ایسا پرفیوم لگا رکھا تھا جس کی خوشبو بڑی خواب انگیز تھی۔ میں نے کہا۔

"میری طرف سے آج شام کو ہی اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

کھاڈیکر بولا۔

"سوا سات بجے شام ایک گاڑی پنجاب کو جاتی ہے۔ ہم انبالہ پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔ تم لوگ کچھ دیر کے لئے انبالے ٹھہرو گے۔ وہاں سے پٹیالہ سے ہوتے ہوئے مالیر کوٹلے میں داخل ہو جاؤ گے۔"

پاروتی ایم اے [نفسیات] تھی۔ اس نے کھاڈیکر سے کہا۔

"اپنی انبالہ کی خفیہ پولیس کو بتا دینا کہ وہ زنانہ پولیس کی دو تین عورتیں پہلے سے مالیر کوٹلہ شہر میں بھیج کر ہمارے بارے میں مشہور کر دے کہ دلی سے ایک بڑے مہاتما اور پہنچے ہوئے صوفی صاحب یہاں بزرگوں کی درگاہوں کی زیارت کو آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کراماتوں کے جھوٹے سچے قصے مشہور کر دیں۔ اس طرح وہاں کمزور اعتقاد والے لوگوں میں پہلے سے ہماری دھاک بیٹھ جائے

گی۔"

کھاڈیکر کہنے لگا۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم تیاری شروع کر دو۔ میں چلتا ہوں۔ اب سٹیشن پر ملاقات ہوگی۔ تم لوگ ٹھیک ساڑھے چھ بجے سٹیشن پر پہنچ جانا۔

کھاڈیکر چلا گیا تو پاروتی نے بڑی بے باکی سے میری گردن میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"صوفی صاحب میں تو آپ کے عشق میں دیوانی ہو گئی ہوں۔"

اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کہا۔

"آ جاؤ' دوسرے کمرے میں آ جاؤ۔ میں خود تمہیں نقلی درویش بناتی ہوں۔"

میں بھی پاروتی پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں ان باتوں سے بالکل نہیں گھبراتا۔ میں نے کہا۔

"چلو دوسرے کمرے میں چلو۔"

دوسرا کمرہ چھوٹا سا تھا۔ اس میں بتی جل رہی تھی۔ اندر دو صندوق تھے۔ ایک بڑی الماری تھی۔ الماری میں فلم کے میک اپ روم کی طرح ہر قسم کا لباس لٹکا ہوا تھا۔ ان میں جوگیوں والا لباس بھی تھا۔ نقلی ڈاڑھیاں اور لمبے بالوں کی وگیں بھی دیوار سے لٹک رہی تھیں۔ زنانہ اور مردانہ دونوں قسم کے کپڑے موجود تھے۔ فقیروں والا لباس بھی تھا۔ شاندار کپڑے بھی تھے۔ فوج اور پولیس کی وردیاں بھی تھیں۔ وکیلوں کے کوٹ اور سخت کالر بھی تھے۔ پاروتی نے ایک جگہ پر صوفی درویشوں والا لباس اتار کر مجھے دکھایا۔

"یہ کیسا رہے گا؟"

یہ سرخ لباس تھا جو عام طور پر ملنگ لوگ پہنا کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"کوئی سادہ سا لباس ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کو یقین آ جائے کہ ہم اصلی

صوفی درویش ہیں۔ باقی زیادہ اثر میں اپنی باتوں سے ان پر ڈالوں گا۔
پاروتی کہنے لگی۔
"لیکن دھرم چند جی ہمیں ان لوگوں کو کوئی نہ کوئی چمتکار یعنی کرامت بھی ضرور دکھانی ہوگی۔ چاہے ایک بار ہی سہی اس سے ہم پر ان کا اعتقاد پکا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔
"وہاں جا کر یہ بھی سوچ لیں گے۔ ابھی تم کوئی سادہ سا لباس نکالو۔"
پاروتی نے ہلکے سبز رنگ کا ایک لمبا کرتا نکال کر مجھے دکھایا کہنے لگی۔
"یہاں تو اس وقت سب سے سادہ کرتا یہی ہے۔ اس کے نیچے تم سبز لنگی پہن لینا۔"
میں نے کہا۔
"سبز نہیں' سفید دھوتی ٹھیک رہے گی۔"
اس نے الماری کے نیچے سے سفید کھدر کی لنگی نکال کر دکھائی۔ میں نے کہا۔
"یہ ٹھیک رہے گی۔"
کہنے لگی۔
"اب اپنے کپڑے اتار کر یہ لباس پہن لو۔"
پاروتی شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔
"پیر جی! میں آپ کی مریدنی ہوں اور نقلی پیر اپنی مریدنیوں سے اپنا بدن نہیں چھپایا کرتے۔ میں یہیں رہوں گی۔ میرے سامنے کپڑے بدلو۔"
میں بھی ڈھیٹ بن گیا۔ میں نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔"
اور میں نے اس کے سامنے کپڑے اتار کر سبز لمبا کرتہ پہنا' پھر دھوتی

پہنی - گلے میں منکوں کی مالائیں ڈالیں۔ ہاتھ میں تسبیح پکڑ لی اور پاؤں میں دیسی جوتی پہن کر پاروتی سے پوچھا۔

"میں اب کیسا لگتا ہوں۔"

وہ میری ٹھوڑی کو انگلی سے چھو کر بولی۔

"میری جان نقلی پیر جی۔ تم تو بالکل اصلی لگتے ہو۔ اب میں بھی بھیس بدل کر دکھاتی ہوں۔"

اور اس سے پہلے کہ میں دوسرے کمرے میں جاؤں پاروتی نے میرے سامنے پہلے اپنی ساڑھی اتاری۔ پھر پیٹی کوٹ اور بلاوز بھی اتار کر پرے پھینک دیا۔ میں نے شرم کے مارے منہ دوسرے طرف کر لیا۔ پاروتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صوفی جی! مریدنی سے کس بات کی شرم۔ یہ شرم یہیں اتار دو۔ آگے جا کر آسانی رہے گی۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو پاروتی نے ہلکے سبز رنگ کا لمبا چولا نما کرتہ پہن لیا تھا اور اب نیچے اسی رنگ کی شلوار پہن رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ لباس ٹھیک رہے گا نا دھرم چند جی۔ میرا خیال ہے مسلمان مریدنیاں اسی قسم کے کپڑے پہنتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک رہے گا۔"

پاروتی نے بالوں کا ربن کھول کر بالوں کو جھٹکا تو وہ اس کے شانوں پر بکھر گئے۔ اس نے گلے میں سبز منکوں کی مالائیں پہن لیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم تیار ہو گئے اور دوسرے کمرے میں آ کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر باری باری اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگے۔ میں نقلی صوفی درویش تھا اور پاروتی نقلی مریدنی تھی مگر ہم دونوں اصلی لگ رہے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا کہ تم لوگوں میں زیادہ باتیں نہیں کرو گی۔ صرف

کبھی کبھی ہو حق کا نعرہ لگاؤ گی اور کسی کسی وقت بات کرو گی۔"
پارورتی بولی۔
"صوفی جی، تم جیسے کہو گے میں ویسے ہی کروں گی۔"
اس کے بعد ہم نے صوفیوں والے کپڑے پہنے ہی رکھے۔ دوپہر کا کھانا پاروتی نے انہیں کپڑوں میں تیار کیا۔ ہم نے کھانا کھایا اور کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ہم اس دوران ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ یہ بات ایک اعتبار سے اچھی تھی۔ پاروتی کا تعلق بھی بھارت کی سی آئی ڈی سے تھا۔ اگرچہ ڈیپوٹیشن پر اس کی خدمات کچھ عرصہ سے انڈیا کی ڈیفنس انٹیلی جنس نے حاصل کر رکھی تھی۔ مجھے اسی سے پاکستان کے بارے میں بھارت کے جارحانہ خفیہ عزائم کی بڑی سیکرٹ معلومات حاصل ہو سکتی تھی۔ جب دن ڈھل گیا اور شام چھ بج گئے تو پاروتی نے کسی کو فون کیا کہنے لگی۔
"یہاں سے ہم بند گاڑی میں سٹیشن تک جائیں گے۔"
میں نے بالکل نہ پوچھا کہ اس نے کہاں فون کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں ایک چھوٹی مائیکرو ویگن آگئی جو چاروں طرف سے بند تھی اور اندر ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی دلی کے ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ گاڑی سٹیشن کے پیچھے ایک جگہ رکی۔ وہاں کھاڈیکر پہلے سے موجود تھا۔ وہ گاڑی کے اندر ہی آگیا اور کہنے لگا۔
"انبالے کی سیکرٹ پولیس کو فون پر بریف کر دیا گیا ہے۔ وہ لوگ خفیہ پولیس کا ایک آدمی ریلوے سٹیشن بھیج کر تمہیں خاص جگہ لے جائیں گے۔ اوکے، گڈ بائی۔ میں چلتا ہوں۔ یہ تمہارے لئے انبالے تک کے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ ہیں۔"
ٹکٹ مجھے دے کر کھاڈیکر گاڑی سے نکل گیا۔
میں اور پاروتی اس کے جانے کے ایک منٹ بعد نقلی درویشوں والی شان

سے گاڑی سے باہر نکلے اور سٹیشن کی طرف چلے۔ میں سبز لباس میں بالکل اصلی پیر لگ رہا تھا۔ پاروتی میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور اپنے لباس اور چال ڈھال سے میری جانثار مریدنی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ لوگوں نے ہماری طرف گھور کر دیکھا پھر منہ دوسری طرف کر لئے۔ وہاں اس قسم کے صوفی درویش اور ان کی مریدنیاں عام دیکھنے میں آتی تھیں۔ کھاڈیکر نے یہ بڑی عقلمندی کی تھی کہ ہمارے لئے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ خریدے تھے ورنہ تھرڈ کلاس میں لوگ ہماری آؤ بھگت شروع کر دیتے اور ہمارے لئے آرام کرنا ناممکن ہو جاتا۔ ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ ہم سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ ان میں سکھ اور ہندو فیملیاں بھی تھیں۔ ایک ہندو عورت نے جس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا اٹھ کر میرے قدموں کو جھک کر چھوا اور ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور ہاتھ میں تسبیح تھی۔ میں نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اس ہندو عورت کے سر پر رکھا اور اپنے دل سے دعا کی۔

"بیٹی! تمہیں مجھ میں جو شکتی اوتار نظر آ رہا ہے وہی تمہارے من کی مراد پوری کرے گا۔"

ہندو عورت بڑی خوش ہو کر میرے قدموں کو چھو کر واپس اپنے بال بچوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ پاروتی میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو۔"

تھوڑی دیر بعد ٹرین آ گئی۔ ہم باہر نکل آئے۔ ٹرین میں کافی رش تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں صرف دو سواریاں بیٹھی تھیں۔ ایک سکھ نوجوان تھا اور ساتھ اس کی نوجوان بیوی تھی۔ ہم اس ڈبے میں سوار ہو گئے۔ سکھ نے ہاتھ باندھ کر ہمیں سلام کیا۔

"بابا جی سلام!"

اس کی سکھ بیوی نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھوئے اور میری مریدنی پاروتی کے بھی پاؤں چھوئے۔ میں نے ان دونوں کو دعا دی اور آنکھیں بند کرکے تسبیح پھیرنے لگا۔

ہم لوگ انبالہ پہنچ گئے۔ انبالے سٹیشن پر خفیہ پولیس کی ایک آدمی ہمیں لینے کے لئے آیا تھا۔ اس نے ہمیں پولیس سٹیشن کی بجائے شہر کے باہر ایک خالی مکان میں پہنچا دیا۔ وہاں مشرقی پنجاب کی خفیہ پولیس کا انچارج مسٹر ورما پہلے سے موجود تھا۔ اسے دلی کی ڈیفنس سیکرٹ ایجنسی نے ہمارے مشن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"آپ مالیرکوٹلہ کی مشہور خانقاہ شاہ جی کے مزار پر جائیں گے۔ ہماری خفیہ سروس کی دو عورتوں نے آپ کے بارے میں پہلے ہی سے مزار کے لوگوں کو بہت کچھ بتایا ہوا ہے کہ آپ بڑے پہنچے ہوئے صوفی صاحب ہیں۔ ہمارے دو آدمی مالیر کوٹلہ تک آپ کے ساتھ جائیں گے۔ میں آپ کو اپنا خفیہ ٹیلی فون نمبر دیئے دیتا ہوں۔ اگر کوئی ضرورت پڑے تو مجھے فون کر دیں۔ آپ کو ہر قسم کی مدد پہنچ جائے گی۔"

ان لوگوں نے مالیرکوٹلہ کے مزار کے اردگرد کے ماحول میں مجھے صوفی صاحب کے نام سے مشہور کیا ہوا تھا۔ ہم ایک رات انبالے اور دوسرے روز پٹیالہ سے ہوتے ہوئے مالیرکوٹلہ پہنچ گئے۔ خفیہ پولیس کے جو دو آدمی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ واپس چلے گئے۔ سٹیشن سے اترتے ہی میں اور پاروتی نقلی پیر اور نقلی مریدنی کے بھیس میں ایک تانگے میں سوار ہو گئے اور کوچوان سے کہا۔

"بھائی ہمیں شاہ جی کے مزار پر پہنچا دو۔"

مزار پر ہماری شہرت پہلے ہی پہنچی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں آئے ہمیں مزار کے متولیوں اور عقیدت مندوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مزار کے اندر ہی ایک کوٹھڑی میں ہماری رہائش وغیرہ کا بڑا مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ موسم اتنا گرم نہیں

تھا۔ رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی شاہ جی کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور دل میں کہا۔

"شاہ جی! میرا قصور معاف کر دیجئے گا۔ میں نقلی پیر بن کر آپ کے مزار پر آیا ہوں لیکن آپ کو معلوم ہو گا کہ میرا مشن اسلام کی سربلندی اور پاکستان کی سلامتی کا مشن ہے اور میں دشمن کے ملک میں ان کے پاکستان دشمن عزائم کو خاک میں ملانے آیا ہوں۔"

شام کے وقت عقیدت مندوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ کچھ سکھ اور ہندو مرد و عورتیں بھی تھیں۔ ہر کوئی اپنی جائز ضرورتیں بیان کرتا اور مجھ سے دعا کا طالب ہوتا میں نے ہر ایک کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اللہ اپنا کرم کرے گا۔ تمہاری مشکل حل ہو جائے گی۔ میری نقلی مریدنی پاروتی بھی بڑی عمدہ اداکاری کر رہی تھی۔ عورتیں اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ ایک ہفتے میں ہی ان عورتوں نے ہمارے بارے میں کئی جھوٹی سچی کہانیاں مشہور کر دیں کہ صوفی صاحب کی دعا سے میرے خاوند کی بیماری دور ہو گئی ہے۔ صوفی صاحب کی دعا سے میری بیٹی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔

دس پندرہ دنوں میں ہی مالیر کوٹلہ میں ہماری جھوٹی کرامتوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس میں ضعیف الاعتقاد عقیدت مندوں کی مبالغہ آرائیوں کا زیادہ دخل تھا۔ مرید کی یہ ذہنیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مرشد کو خواہ وہ جھوٹا پیر ہی کیوں نہ ہو' بڑھا چڑھا کر اور سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کئی فرضی کرامتیں بھی اس کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔

مزار شریف کا بوڑھا اور عبادت گذار متولی جس کو سب لوگ نور بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ ہمارا بڑا عقیدت مند ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ مشرقی پنجاب کی خفیہ پولیس کے پاس کافی فنڈ تھا۔ خفیہ پولیس کا ایک ہندو اہل کار مسلمان عقیدت مند کے بھیس میں میرے پاس آ کر ہر تیسرے چوتھے روز مطلوبہ

رقم دے جاتا تھا۔ میں لوگوں کے نذرانے اپنے پاس نہیں رکھتا تھا بلکہ مزار شریف کے متولی نور بابا کو دے دیتا تھا۔ ہمیں وہاں ٹھہرے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا۔ اس دوران میں نے اور پاروتی یعنی میری مریدنی نے اپنا مشن برابر جاری رکھا تھا۔ آخر ایک روز مجھے ایک مشتبہ مسلمان کا سراغ مل گیا۔ یہ سراغ مجھے مزار کے متولی نور بابا کی باتوں سے ملا۔ میں رات کو نور بابا کی کوٹھڑی میں جا کر اس کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہم تصوف اور اسلام کی باتیں کرتے۔ میں نے نور بابا کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ پاکستان کا زبردست حامی ہے اور بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں پر جو بھارتی فوج ظلم و ستم ڈھا رہی ہے اس سے نور بابا کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں نے بھی دبی زبان میں پاکستان کی حمایت اور سورت میں ہندو و مسلم فسادات میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا۔ اس پر بھارتی حکومت اور بھارت کی انتہا پسند اسلام دشمن ہندو جماعتوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ ایک دن موقع پا کر میں نے نور بابا سے کہا۔

"بابا جی! ہم بھارت کی متعصب ہندو حکومت کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتے۔ ہندوؤں کو اپنی ہندو فوج کی حمایت حاصل ہے۔ بھارت کی پولیس بھی ہندو ہے۔ فوج بھی ہندو ہے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو یہی کر سکتے ہیں کہ بھارت کے مسلمان اپنے حقوق منوانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے مسلمان نمائندوں کو چن کر اسمبلیوں میں بھیجیں۔"

نور بابا نے کہا۔

"ہم نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے صوفی صاحب۔ ہم اپنے مسلمان نمائندے چن کر لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بھیجتے ہیں۔اور وہ وہاں جا کر کانگریس اور بی جے پی کے ہاتھوں کھیلنے لگ جاتے ہیں اور مسلمانوں کو بھلا دیتے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ نور بابا آگے سے یہی جواب دے گا۔ میں نے کہا۔

"پھر تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم ایسے سرفروش مجاہد تیار کریں جو

بھارت سرکار کے اسلام دشمن منصوبوں کو خاک میں ملاتے رہیں۔ جس طرح مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہد بھارتی قابض فوجوں کو گھات لگا کر ہلاک کر رہے ہیں۔"

نور بابا نے کہا۔

"ہم اکیلے کچھ بھی نہیں کر سکتے صوفی جی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ بھارت کی خفیہ پولیس کے آدمی ہر وقت مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں موجود رہتے ہیں اور سرکار کو پل پل کی خبریں پہنچاتے رہتے ہیں۔"

میں نے ترپ کا پتہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"ایسی صورت میں ہم صرف ایک کام کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ پاکستان سے جو جاسوس یا کمانڈو بھارت' پاکستان کے خلاف جنگی عزائم کو ملیا میٹ کرنے آتے ہیں۔ ان کی ہر طرح سے مدد کریں اور انہیں پورا پورا تحفظ فراہم کریں۔"

نور بابا بولے۔

"پہلی بات تو یہ ہے بلکہ افسوس کی بات ہے کہ پاکستان سے ایسا کوئی جاسوس یا کمانڈو بھارت میں نہیں آتا۔ جو کمانڈو یا جاسوس آتے ہیں وہ جموں کشمیر کے مسلمان مجاہد ہوتے ہیں۔ جو اسلام کی خاطر اور وطن کی آزادی کی اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ باقی ان میں سے کوئی یہاں آ جاتا ہے.تو ہم ان کی پوری پوری مدد کرتے ہیں۔"

"جزاک اللہ!"

میں بے اختیار پکار اٹھا۔

"ایک مسلمان بلکہ سچے مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں یہی کرنا چاہئے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے یہاں دو پاکستانی یا کشمیری جاسوس یا کمانڈو پکڑے گئے ہیں جو اس وقت جالندھر کی کسی جیل میں بند ہیں۔ کیا ان سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی یہاں؟"

نور بابا نے بتایا کہ اصل میں وہ چار کشمیری کمانڈو تھے جو کشمیر میں قابض فوجیوں کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود لے جانے والی ایک ٹرین کو اڑانے آئے تھے۔

"یہ چاروں یہاں میرے پاس آئے تھے - میں نے انہیں خبردار کیا تھا کہ مزار کے اردگرد چوبیس گھنٹے خفیہ پولیس کے آدمی موجود رہتے ہیں۔ اس لئے وہ احتیاط سے کام لیں لیکن انہوں نے میری بات کی زیادہ پروانہ کی اور دو پکڑے گئے اور باقی دو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"

نور بابا کی زبانی یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس کے پاس کشمیری مجاہد بھیس بدل کر آتے رہتے ہیں۔ ان کا ٹارگٹ وہ فوجی کانوائے اور اسلحہ کے ڈپو ہوتے ہیں جہاں سے کشمیر میں قابض بھارتی فوج کو ایمونیشن سپلائی ہوتا ہے۔ میری پوزیشن بڑی نازک ہو گئی تھی۔ میں ایک طرح سے چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ مجھے نور بابا سے یہ راز بھی چھپا کر رکھنا تھا کہ میں مسلمان ہوں لیکن بھارتی مسلمان نہیں بلکہ پاکستانی مسلمان ہوں اور میں بھی ایک خاص مشن پر بھارت میں آیا ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ کشمیری کمانڈوز کے بارے میں نور بابا مجھے جو معلومات فراہم کر رہا تھا ان معلومات کو مجھے اپنی مریدنی پاروتی سے بھی چھپا کر رکھنا تھا۔ کیونکہ اگر میرے علاوہ پاروتی کو بھی یہ علم ہو جاتا ہے کہ کشمیری جاسوس یا کمانڈو مالیر کوٹلہ جالندھر میں فلاں جگہ پر روپوش ہیں تو وہ تو فوراً" پولیس کو خبردار کر دے گی اور پولیس انہیں چھاپہ مار کر پکڑ لے گی۔ اس کے علاوہ میرا ایک کام یہ بھی تھا کہ نور بابا کی وساطت سے جموں کشمیر کے کمانڈوز سے خفیہ ملاقات کر کے ان کے مشن میں ان کی مدد کروں اور اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھوں کہ مزار کے اردگرد یا مالیر کوٹلہ میں خفیہ پولیس کے جو آدمی متعین ہیں ان کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میں کشمیری کمانڈوز سے ملا ہوں۔

یہ ساری باتیں میرے پیش نظر تھیں۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ نور بابا اور میرے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں یا ہو رہی تھیں ان

کے متعلق میری مریدنی پاروتی کو بالکل علم نہ ہو۔ میں نے نور بابا سے کہا۔
"آپ شاہ جی کے مزار شریف پر بیٹھ کر اسلام کی صحیح معنوں میں خدمت کر رہے ہیں۔"
نور بابا نے کہا۔
"پاکستان، کشمیر کی آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لئے میری جان بھی چلی جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔"
میں نے نور بابا کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔
"آپ کی یہ باتیں تو میرے دل میں قیمتی راز بن کر سمجھ لیں کہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی ہیں لیکن میں چاہوں گا کہ ان باتوں کا ذکر آپ میری مریدنی تاج بی بی سے ہرگز ہرگز نہ کریں۔ کیونکہ وہ عورت ذات ہے عورت کے دل میں کوئی بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی زبان سے یہ باتیں نکل کر ہمارے دشمنوں تک پہنچ جائیں اور ہم لوگ بھی پکڑ لئے جائیں۔"
نور بابا بولا۔
"آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی مریدنی سے کشمیری کمانڈوز کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔"
میں نے تب نور بابا کو کریدتے ہوئے پوچھا کہ جو دو کشمیری کمانڈوز روپوش ہو گئے تھے وہ اس وقت کہاں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان سے ملاقات کر کے انہیں اعتماد میں لینا چاہتا تھا اور انہیں دلی اور فیروز پور میں بھارتی فوج کے ان خفیہ ایمونیشن ذخیروں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا جن کا علم مجھے دلی میں ڈیفنس سیکرٹ ایجنسی کے سریندر کوہلی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ کشمیری کمانڈوز وہاں جا کر اسلحہ کے ان ذخیروں کو اڑا دیں۔ کیونکہ میری اطلاع کے مطابق ان ہی اسلحہ کے ذخیروں سے کشمیر میں بھارتی فوجوں کو گولہ بارود سپلائی ہوتا تھا۔ نور بابا کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"اس بات کو ایک مہینہ گذر گیا ہے۔ معلوم نہیں کشمیری کمانڈوز کہاں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ واپس جموں چلے گئے ہوں لیکن ان کے دو ساتھی جالندھر جیل میں ہیں اور ان پر بھارتی پولیس بڑا تشدد کر رہی ہو گی۔ وہ لوگ اپنے ساتھیوں کو فرار کرانے ضرور آئیں گے۔ آپ بھی یہیں پر ہیں۔ میں بھی یہیں پر ہوں۔ اگر وہ آئے تو میں آپ سے ان کی ملاقات ضرور کراؤں گا۔"

میں نے ایک بار پھر نور بابا کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میری مریدنی کو ان کے آنے کا ہرگز ہرگز علم نہیں ہونا چاہئے۔"

نور بابا نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ آپ نے ایک بار کہہ دیا ہے تو بے فکر رہیں۔ آپ کی مریدنی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

اس گفتگو کے بعد میں نور بابا کی کوٹھڑی سے نکل کر اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ پاروتی مریدنی کے بھیس میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"ڈیم اٹ! تم اتنی دیر بابا کی کوٹھڑی میں کیا کر رہے تھے؟"

میں نے اسے ہلکا سا ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"خبردار جو پھر یہاں انگریزی کا ایک لفظ بھی بولا۔ کسی نے سن لیا تو ہمارا سارا مشن تباہ ہو جائے گا۔"

میں اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"میں نور بابا کو کرید رہا تھا کہ یہاں کشمیری مسلمان بھی مزار پر حاضری دینے آتے ہوں گے۔ میرا مطلب اس سے پاکستانی یا کشمیری جاسوسوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ بابا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہاں پاکستانی جاسوس آتے ہیں مگر نور بابا کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف نہیں کر رہا۔ ایک دو ملاقاتوں میں میں اس کو رام کر لوں گا۔"

پاروتی بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کامیابی کی امید رکھنی چاہئے۔"
میں نے کہا۔
"کیوں نہیں۔ میں نے نور بابا پر یہ اثر پوری طرح ڈال دیا ہے کہ میں پاکستان کا زبردست حامی ہوں اور بھارت سرکار یہاں مسلمانوں پر جو ظلم کر رہی ہے اس کے سخت خلاف ہوں۔ دو چار ملاقاتیں اور کروں گا رتو نور بابا مجھے روپوش پاکستانی جاسوسوں کا ٹھکانہ بتا دے گا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو ان لوگوں کے ٹھکانے کا علم ہے مگر ابھی یہ بات ہمیں اپنی خفیہ پولیس کر نہیں بتانی چاہئے۔"
"کیوں؟"
پاروتی نے پوچھا۔
میں نے کہا۔
"پولیس والوں کی الٹی کھوپڑی ہوتی ہے۔ جلدی میں آکر اور اپنے نمبر بنانے کے لئے اگر انہوں نے نور بابا کو پکڑ کر اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی اور اپنے طور پر اس سے پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو نور بابا مر جائے گا مگر ان کے ٹھکانے کا پتہ نہیں بتائے گا۔ یوں یہ شکار ہمارے ہاتھ سے بھی نکل جائے گا۔"
پاروتی کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ کہنے لگی۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم یہ بات پولیس سے چھپا کر رکھیں گے کہ نور بابا کو پاکستانی جاسوسوں کے ٹھکانے کا پتہ ہے۔"
میں پاکستانی یا کشمیری کمانڈوز اور بھارتی پولیس کے درمیان دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔
دوسرے دن مزار پر ہی ایک عقیدت مند کے بھیس میں انبالہ کی خفیہ پولیس کا آدمی مجھ سے رپورٹ لینے آگیا۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ ہمارا مشن

آگے بڑھ رہا ہے۔ ابھی تک کسی نے ہمارے آگے اعتراف نہیں کیا کہ اس نے کشمیری یا پاکستانی جاسوسوں کو مزار پر آتے دیکھا ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ چند روز بعد ہم ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

خفیہ پولیس کا آدمی اپنی ڈائری میں یہ باتیں نوٹ کر کے چلا گیا۔ ہماری کارکردگی کی یہ رپورٹ انبالہ کی سیکرٹ سروس کو اور اس کے ذریعے اوپر دلی سیکریٹریٹ میں ڈیفنس سیکرٹ ایجنسی کے چیف سریندر کوہلی اور وہاں سے بمبئی میں شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے تک پہنچا دی گئی۔

اس بات کو دو دن گذرے تھے میری نقلی مریدنی پاروتی مزار کے عقب میں چبوترے والی قبروں کے پاس عقیدت مند عورتوں کے جمگھٹے میں بیٹھی ان کو کاغذ پر الٹے سیدھے نمبر لکھ کر انہیں تعویذ دے رہی تھی۔ میں اپنی کوٹھڑی میں آ کر چارپائی پر لیٹا ہی تھا کہ ایک مرید نے آکر بڑے ادب سے کہا۔

"صوفی جی! نور بابا آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

میں بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوا چارپائی سے اٹھا اور نور بابا کی کوٹھڑی میں آ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ نور بابا قالین پر بیٹھے تھے۔ سامنے چائے کی چینک دو پیالیاں اور ایک طشتری میں کچھ مٹھائی رکھی تھی۔ میں السلام علیکم کہہ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا نور بابا نے کہا۔

"صوفی جی! میں نے چائے منگوائی تھی۔ سوچا آپ کے ساتھ چائے پی جائے۔"

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"بابا جی! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ نور بابا نے مجھے کوئی خاص بات بتانے کے لئے بلایا ہے۔ سیدھا آدمی تھا۔ دل کی بات اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے چائے بنائی۔ ہم چائے پینے لگے۔ نور بابا نے میری طرف ذرا قریب ہو کر کہا۔

"دونوں روپوش کشمیری کمانڈو رات کو آئے تھے۔"

میں نے چونک کر خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔

"ماشا اللہ ' ماشا اللہ! کیا ان غازی جانبازوں کا میں دیدار نہیں کر سکتا؟ میں نے دلی سے لے کر گجرات کاٹھیاواڑ تک سارے علاقوں کی سیر کی ہے۔ میرے علم میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں بھارتی فوج کا بہت بڑا اسلحہ کا ڈپو ہے۔ میں اسے وہ جگہ بتانا چاہتا ہوں تاکہ وہ اس ڈپو کو اڑانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ وہاں سے مقبوضہ کشمیر میں انڈین فوجوں کے لئے گولہ بارود سپلائی ہوتا ہے۔"

نور بابا خوش ہو گیا' کہنے لگا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ وہ آج رات میرے پاس آ رہے ہیں۔ تم بھی میری کوٹھڑی میں آ جانا۔ میں تمہاری ملاقات کرا دوں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"رات کو کس وقت آ رہے ہیں ہمارے سرفروش؟"

نور بابا بولا۔

"صبح کی اذان سے ایک گھنٹہ پہلے آئیں گے۔ تم تین بجے آ جانا۔ میری کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہو گا۔"

میں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"یہاں خفیہ پولیس کو تو ان کی خبر نہیں ہو جائے گی؟"

نور بابا کہنے لگا۔

"مجھے خفیہ پولیس والوں کے چہروں کی شناخت ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ رات کو بارہ بجے تک ڈیوٹی دیتے ہیں۔ اس کے بعد چلے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں رات کے تین بجے آ جاؤں گا لیکن میں ایک بار پھر آپ کو تاکید کروں گا کہ اس خفیہ ملاقات کی خبر میری مریدنی کو نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی تو ہمارے سرفروش موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔"

نور بابا نے کہا۔

"آپ نہ بتا دینا۔ میں تو اپنی زبان بند رکھوں گا۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ پاروتی ابھی تک عقیدت مند عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ آئی' کہنے لگی۔

"یہ عورتیں تو بالکل جاہل ہیں۔ کیا اوٹ پٹانگ باتیں مجھ سے پوچھتی ہیں۔ ہمیں کتنی دیر یہ کشٹ بھگتنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"تم خفیہ پولیس اور وہ بھی سنٹرل سیکرٹ پولیس کی ذمے دار افسر ہو۔ تمہیں اپنی ڈیوٹی سے بیزار نہیں ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے ہمیں اپنے ٹارگٹ تک پہنچے میں ابھی مہینہ دو مہینے اور لگ جائیں۔"

پاروتی نے اپنے گلے سے مالائیں اتارتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ!"

میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"تم نے پھر انگریزی بولی۔"

وہ ہنس پڑی۔

"آئی ایم سوری۔"

اور اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"میرے پیر جی! کبھی مجھ سے محبت بھی کر لیا کرو۔"

میں نے اس کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کوئی آ جائے گا۔"

میں نے پنکھا اون کر دیا۔ کوٹھڑی میں کچھ گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔ پاروتی کو میرے ساتھ والی کوٹھڑی دی گئی تھی۔ وہ رات کو وہیں سوتی تھی۔ کہنے

لگی۔

"میری کوٹھڑی کا پنکھا خراب ہو گیا ہے۔ نور بابا سے کہہ کر وہاں نیا پنکھا لگوا دو۔"

میں نے کہا۔

"میں ان سے بات کروں گا۔"

پاروتی کچھ دیر میری کوٹھڑی میں بیٹھنے کے بعد اس طرف چلی گئی جدھر عورتوں کا لنگر تھا۔ رات کو ہم مزار کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر اپنے عقیدت مندوں کے مسائل سنتے اور انہیں ان کے حل بتاتے رہے۔ رات کے نو بجے ہم نے وہیں لنگر کا کھانا منگوا کر کھایا۔ اس کے بعد وہاں قوالی شروع ہو گئی۔ ہم دونوں وہیں بیٹھے قوالی سنتے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہو حق کے نعرے لگاتے رہے۔ قوالی رات بارہ بجے تک ہوتی رہی۔ اس کے بعد پاروتی یہ کہہ کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی کہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں ایک بجے تک وہیں دو چار عقیدت مندوں کے درمیان بیٹھا انہیں اپنے محدود علم کے مطابق مسئلے مسائل بیان کرتا رہا۔ اس کے بعد اپنی کوٹھڑی میں آ کر رات کے تین بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ کلائی کی گھڑی میرے پاس تھی۔ نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ کشمیری کمانڈوز سے ملنے کو بے چین تھا۔ آ کر جب میری گھڑی نے رات کے پورے تین بجائے تو میں نے کوٹھڑی کی بتی بجھادی اور دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ مزار کے ماحول پر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

سب ملنگ سو چکے تھے۔ میں دبے پاؤں کوٹھڑی سے باہر نکلا اور نور بابا کی کوٹھڑی کی طرف چلا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازے کے قریب آیا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ سامنے نور بابا کھڑے تھے۔ وہ کہنے لگے۔

"خاموشی سے اندر آ جاؤ۔ میں تمہیں آتا دیکھ رہا تھا۔"

کوٹھڑی میں آ کر میں نے دیکھا کہ کوٹھڑی کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ صرف کونے میں الٹی رکھی پیالی پر ایک موم بتی جل رہی تھی جس کی روشنی کونے تک ہی

محدود تھی۔ کونے میں چارپائی کے پیچھے دو آدمی منہ سر کھیس میں چھپائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی عقاب ایسی چمکیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ نور بابا نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی اور ان دونوں آدمیوں کے قریب بیٹھ کر کہا۔

"یہ صوفی جی ہیں۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ انہیں آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔"

میں نے قریب جاتے ہوئے دونوں کشمیری کمانڈوز کو سلام کیا اور ان سے ہاتھ ملانے ہی لگا تھا کہ ان میں سے ایک نے لپک کر میری گردن دبوچ لی اور غصے میں کہا۔

"صاف صاف بتاؤ تم کون ہو؟ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے۔"

نور بابا پریشان ہو گیا کہنے لگا۔

"علی شاہ! یہ تو تمہارے ہمدرد ہیں۔ بڑے سچے مسلمان ہیں۔ کشمیر کی آزادی کے واسطے جان قربان کرنے کو بھی تیار ہیں۔"

مگر علی شاہ کمانڈو نے میری گردن نہ چھوڑی۔ دوسرے کشمیری کمانڈو نے میرا بازو پکڑ کر مروڑنا شروع کر دیا۔

"بولو تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے۔"

پھر اس نے نور بابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نور بابا! تم نے بڑی غلطی کی کہ اس آدمی کو ہمارے بارے میں بتا دیا۔ یہ آدمی ہمیں خفیہ پولیس کا آدمی لگتا ہے۔ یہ ہمیں گرفتار کروانے کے لئے یہاں آیا ہے۔"

تب میں نے کہا۔

"دوستو! اگر میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوتا تو تم دونوں اب تک گرفتار ہو چکے ہوتے۔ مجھے تو کل کا پتہ ہے کہ تم یہاں آ رہے ہو۔ میں نے خفیہ پولیس کو خبر

کیوں نہیں کی۔ صرف اس لئے کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔ تمہارا ہمدرد ہوں۔"

علی شاہ اور دوسرے کمانڈو نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر وہ مجھے برابر مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے انہیں یقین دلانا تھا کہ میں ان کا خیر خواہ ہوں۔ ان کا مجھ پر شک کی نگاہ ڈالنی قدرتی بات تھی۔ میری موجودگی کی وجہ سے وہ نور بابا سے بھی اپنے مشن کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ اس کی بات کا جواب ہوں ہاں میں دیتے رہے۔ میں نے نور بابا سے کہا۔

"بابا جی! مجھے تھوڑی مہلت دو کہ میں ان مجاہدوں سے ان کے مطلب کی ایک دو باتیں کر سکوں۔"

نور بابا اٹھ کر چلے گئے کہ جو بات کرنی ہے جلدی کرنا۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ انہیں صبح کی اذان سے پہلے یہاں سے نکل جانا ہے۔ جب نور بابا چلا گیا تو میں نے علی شاہ سے کہا۔

"مجھ پر شک نہ کرو۔ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔"

میں نے انہیں اصل بات تو نہ بتائی کہ میں حقیقت میں پاکستانی ہوں اور دھرم چند کے بھیس میں بھارت کی خفیہ سروس میں گھس کر ان کے پاکستان دشمن منصوبوں کو تباہ کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے خود میرے پھنس جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے علی شاہ کو دلی اور رانچی کے دو بھارتی ایمونیشن ذخیروں کے بارے میں بتایا جہاں سے آدھی رات کو ہفتے میں تین بار مقبوضہ کشمیر کے بھارتی فوجیوں کو اسلحہ سپلائی ہوتا تھا۔ علی شاہ نے اپنے ساتھی کمانڈو کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھی کشمیری کمانڈو کا نام نور بابا نے مجھے امداد علی بتایا تھا۔ امداد علی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ان ذخیروں کا ہمیں پہلے سے علم ہے۔ ضرورت پڑی تو ہم اسے خود ہی تباہ کر دیں گے۔ ہمیں تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔"

مجھے انبالہ کی خفیہ پولیس کے ایک آدمی سے کچھ روز پہلے معلوم ہوا تھا کہ
بالہ چھاؤنی میں گورا قبرستان کے عقب میں ایک زمین دوز بہت بڑا فوجی ایمونیشن
مپ ہے جہاں بھارت کے اسلحہ ساز شہر کرکی اور جبل پور سے گولہ بارود اور
موٹے بڑے ہتھیاروں کی بھاری کھیپ تیار ہو کر آتی ہے اور وہاں جمع کی جاتی
ہے۔ اس کے بعد یہاں سے ہفتے میں دو بار رات کے اندھیرے میں غیر فوجی ٹرکوں
بں یہ اسلحہ لاد کر جموں اور جموں سے کشمیر پر قابض بھارتی فوجیوں کو پہنچایا جاتا
ہے۔ جب میں نے ان کشمیری سرفروشوں کو انبالہ چھاؤنی کے اس بہت بڑے اور
خفیہ ایمونیشن ذخیرے کے بارے میں بتایا تو علی شاہ بولا۔

"ہمیں اس فوجی ڈمپ کا بھی علم ہے مگر وہاں سیکورٹی بہت سخت ہے۔ کوئی
چڑیا بھی اڑ کر اندر نہیں جا سکتی۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہیں کاغذ پر ایک تعویذ لکھ کر دیتا ہوں۔ وہ کاغذ تم وہاں کسی بھی
سیکورٹی چیف یا فوجی افسر کو دکھاؤ گے تو وہ نہ صرف اٹھ کر تمہیں سلام کرے گا بلکہ
تمہیں اندر جانے کی بڑی خوشی سے اجازت بھی دے دے گا۔"

علی شاہ مسکرایا کہنے لگا۔

"صوفی صاحب! یہ فوجی آپریشن ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کا اور تصوف کا کھیل
نہیں ہے۔ ان میں جان کی بازی لگا کر ہی آدمی کامیاب ہوتا ہے یا وہیں شہید ہو جاتا
ہے۔"

انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں انہیں کونسا نمبر کاغذ پر لکھ کر تعویذ کے طور پر
دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم اس قسم کے مجاہدانہ کمانڈو آپریشن کرتے ہی رہتے ہو۔ انبالے چھاؤنی
والا آپریشن بھی کر کے دیکھ لو۔ تمہیں میرے لکھے ہوئے تعویذ کا اثر معلوم ہو جائے
گا۔"

امداد علی اور علی شاہ نے ایک دوسرے کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ علی شاہ نے کہا۔

"اچھا صوفی صاحب! آپ ہمیں تعویذ لکھ کر دے دیں۔ اگر ہم نے انبالہ چھاؤنی کے ملٹری ایمونیشن ڈمپ پر حملے کا پروگرام بنایا تو آپ کے تعویذ کو بھی آزما کر دیکھ لیں گے۔"

میں نے نور بابا کی لکڑی کی صندوقچی میں سے کاغذ اور پنسل نکالی۔ کاغذ کا ایک چھوٹا چوکور ٹکڑا کاٹا اور اس پر وہ طلسمی نمبر لکھ دیا جو مجھے ڈیفنس سیکرٹ ایجنسی کے چیف سریندر کوہلی نے لکھ کر دیا تھا اور مجھے زبانی بھی یاد کرا دیا تھا اور جس نمبر کو دیکھ کر بھارت کا وزیراعظم بھی مجھے اپنے پرائم منسٹر ہاؤس میں آنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ یہ نمبر T / L-211 تھا۔ میں نے علی شاہ سے کہا۔

"اس نمبر والے تعویذ کو استعمال کرنے کے بعد ضائع کر دینا اور اس نمبر کو بھی بھول جانا کیونکہ یہ تعویذ صرف ایک بار ہی تمہارے کام آئے گا دوسری بار اسے استعمال کرنے کی کوشش کرو گے تو پکڑے جاؤ گے۔"

علی شاہ اور امداد علی کاغذ پر لکھے ہوئے میرے نمبر کو غور سے دیکھنے لگے۔ امداد علی بولا۔

"یہ کس قسم کا تعویذ ہے۔ اس پر خدا رسولؐ کا نام بھی نہیں لکھا ہوا۔"

میں نے کہا۔

"یہاں ان مقدس ناموں کو لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کام تم اس سے لینا چاہتے ہو اس کے لئے یہ خالی نمبر ہی کافی ہے لیکن تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ کو حاضر ناظر سمجھ کر مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

علی شاہ نے پوچھا۔

"کونسا وعدہ؟"

میں نے کہا۔

"یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ اس خفیہ تعویذ کا راز تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ یہاں تک کہ نور بابا سے بھی اس کا ذکر نہیں کرو گے۔ اگر تم نے کسی کو یہ راز بتا دیا تو نہ صرف یہ کہ اس تعویذ کا اثر ختم ہو جائے گا بلکہ تمہارے پکڑے جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

علی شاہ اور امداد علی دونوں کشمیری سرفروشوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے تعویذ کو ضرور آزمائیں گے اور اس کا کسی کے آگے ذکر بھی نہیں کریں گے۔ میں نے انہیں کہا۔

"تمہیں انبالے چھاؤنی والے فوجی ڈپو کو تباہ کرنے کے لئے وہاں کسی انڈین رجمنٹ کے کیپٹن اور میجر کی وردی پہن کر جانا ہوا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد تعویذ کا اثر دوگنا ہو جائے گا۔"

علی شاہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے صوفی جی! ہم ایسا ہی کریں گے۔"

اتنے میں نور بابا کوٹھڑی میں آگیا کہنے لگا۔

"اذان ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم دونوں کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ باقی تم لوگوں نے مجھ سے جو بات کہی ہے میں اس بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم دو چار روز میں آکر پتہ کر جانا۔"

علی شاہ نے کہا۔

"ہم ایک ہفتے بعد آ جائیں گے۔"

اس کے بعد دونوں کشمیری سرفروش چلے گئے۔ جب کوٹھڑی میں اور نور بابا اکیلے رہ گئے تو میں نے نور بابا سے پوچھا کہ انہوں نے اسے کس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے کہا تھا۔ نور بابا نے کہا۔

"ان کے دو ساتھی جو جالندھر میں جیل میں ہیں۔ ان پر پولیس شدید قسم

کے ٹارچر کر رہی ہے۔ یہ صرف اتنا معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جیل میں دونوں مجاہدوں کو کس کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے۔ الگ الگ رکھا جاتا ہے یا دونوں کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ انہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

نور بابا نے مجھ سے پوچھا کہ میں ان سے کیا باتیں کرتا رہا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"بابا جی! آپ تو جانتے ہیں کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ میں نے انہیں ایک وظیفہ بتایا ہے کہ اس کو کمانڈو آپریشن شروع کرنے سے پہلے پانچ بار پڑھ لیا کرو۔ انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔"

اتنے میں مزار سے ملحقہ مسجد میں سے اذان کی آواز آنے لگی۔ میں نے نور بابا سے کہا۔

"میں چلتا ہوں۔ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔"

میں واپس اپنی کوٹھڑی میں آکر سوچنے لگا کہ وہ خفیہ نمبر جو مجھے خاص طور پر دیا گیا تھا اور جس کا اثر طلسم سے بھی زیادہ ہوتا ہے اس کا راز کھل جائے گا اور انبالہ چھاؤنی کے فوجی ایمونیشن ڈپو کی تباہی کے بعد اگر ڈپو کے گیٹ پر موجود وہ سیکورٹی آفیسر زندہ بچ گیا تو وہ ضرور بتا دے گا کہ دو انڈین فوجی افسر آئے تھے۔ انہوں نے مجھے سنٹرل ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کا سیکرٹ سروس کا وہ نمبر دکھایا تھا جس کو دیکھ کر پردھان منتری ہاؤس کے بھی دروازے کھول دیئے جاتے ہیں تو مجھ سے ضرور پوچھا جائے گا کہ یہ نمبران کے پاس کہاں سے آگیا؟ ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ یہ خفیہ نمبر ضروری نہیں کہ اتنے بڑے ملک میں صرف مجھے ہی دیا گیا ہو۔ یہ ملٹری خفیہ انٹیلی جنس کے کسی بھی ذمے دار فوجی افسر کو دیا جا سکتا ہے اور اس طرح بھارتی سیکرٹ سروس کے دوسرے چند ایک افسروں کے پاس بھی ضرور ہو گا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کشمیری کمانڈوز نے وہاں سے یہ نمبر حاصل کر لیا ہو گا۔

اب میں آپ کو انبالہ چھاؤنی والے ایمونیشن ڈپو کی بے پناہ اور زبردست تباہی کی سچی کہانی سناتا ہوں جو مجھے کشمیری کمانڈو علی شاہ نے دوسری ملاقات پر سنائی۔

ایسا ہوا کہ مجھ سے الگ ہونے کے بعد علی شاہ اور امداد علی نے میرے دیئے ہوئے تعویذ پر غور شروع کر دیا۔ علی شاہ کہنے لگا۔

"انبالہ چھاؤنی والا گولہ بارود کا ذخیرہ زبردست اہمیت رکھتا ہے اور وہاں سے بھارتی فوج کو کشمیر میں ایک مدت سے دھڑا دھڑ اسلحہ مل رہا ہے جو کشمیری مسلمانوں اور حریت پسندوں کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔ ہمیں آج نہیں تو کل اس ذخیرے کو تباہ کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی دینی ہی ہے تو کیوں نہ سب سے پہلے اس ٹارگٹ پر حملہ کیا جائے۔ اس دوران نور بابا ہمارے قیدی مجاہدوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لے گا۔"

امداد علی نے علی شاہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ دونوں مشرقی پنجاب میں کسی جگہ موجود اپنے خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں چلے گئے۔ وہاں ان کے دو اور ساتھی بھی تھے۔ انہوں نے انبالہ چھاؤنی والے فوجی ایمونیشن ڈپو کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں اور ایک روز کسی انڈین رجمنٹ کے کیپٹن اور میجر کی وردیاں پہن کر انبالہ چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس میرا دیا ہوا سیکرٹ نمبر بھی تھا۔ جسے وہ تعویذ سمجھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی وردیوں کے اندر خفیہ جیبوں میں بال پوائنٹ کی شکل میں چھ ایسے ٹائم بم بھی تھے جو انہوں نے ایمونیشن ڈمپ کے اندر جا کر لگانے تھے۔ دونوں کشمیری کمانڈو بڑے تجربہ کار اور انگریزی پڑھے لکھے خوش شکل جوان تھے۔

انبالے چھاؤنی کے سٹیشن پر وہ پورے فوجی لباس میں اترے تو لوگوں نے انہیں دیکھا اور خوش ہو کر دو ایک نے ان سے ہاتھ بھی ملایا اور بھارت ماتا کی جے کے نعرے بھی لگائے۔ دونوں کے پاس ایک ایف [illegible] س تھا جن میں کچھ فوجی

دستاویزات کی چرائی ہوئی نقلیں تھیں۔ انہوں نے چھاؤنی کی سٹیشن سے ٹیکسی لی اور اسے گورا قبرستان کی طرف چلنے کو کہا۔ دونوں کشمیری سرفروش ملٹری انٹیلی جنس کی معائینہ ٹیم کی فوجی افسروں سے وہاں جا رہے تھے۔ ان کے پاس ٹو ٹیفائیڈ باقائدہ کاغذات نہیں تھے۔ اپنی اپنی ملٹری پاس بکس انہوں نے اپنے خاص آدمیوں کی مدد سے ضرور بنوالی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ایمونیشن ڈپو کی سیکورٹی کو اپنی پر اعتماد بارعب باتوں سے قائل کرلیں گے اور فوجی ڈپو میں داخل ہو جائیں گے۔ میرے خفیہ نمبر والے تعویذ کے بارے میں انہیں زیادہ یقین نہیں تھا۔ گورا قبرستان کی دیوار کے پاس جاکر انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ سامنے وہ ٹیلہ تھا جس کے اندر فوجی گولہ بارود اور فوجی ساز و سامان کا بہت بھاری ذخیرہ تھا۔ ٹیلے کے گرد خار دار تار لگی ہوئی تھی۔ گیٹ پر دو سنتری سٹین گنیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے ایک انڈین کیپٹن اور میجر کو دیکھا تو زوردار سلیوٹ کیا۔ علی شاہ آگے بڑھا تو فوجی سنتری نے اسے روک دیا اور کہا۔

"سر! سپیشل آئی ڈی دکھا دیں۔"

یہ سپیشل آئی ڈی دونوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

علی شاہ نے کہا۔

"ہم سپیشل انسپکشن ٹیم کے افسر ہیں اور ڈمپ کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔"

سنتری نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر مگر سپیشل آئی ڈی کے بغیر کسی فوجی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

علی شاہ نے بتایا کہ وہ میرا تعویذ والا سیکرٹ نمبر دکھاتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ کہیں کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔ امداد علی نے بڑے رعب کے ساتھ کہا۔

"جوان! تم ہم کو نہیں روک سکتے۔ ہم ملٹری انٹیلی جنس کے آفیسر ہیں۔"

سنتری نے دوسرے سنتری سے کہا۔

"حوالدار! کرنل صاحب کو فون کرو۔ اگر وہ اجازت دیتے ہیں تو ہم صاحب کو اندر جانے دے گا۔"

دوسرا سنتری دوڑ کر کیبن میں گھس گیا اور ٹیلی فون کی ہتھی گھما کر ہیلو ہیلو کرنے لگا۔ امداد علی کہتا ہے کہ ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم پھنس گئے ہیں۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز اور حیرت انگیز واقعات "شیو سینا لے دہشت گرد" کی اگلی کتاب نمبر2 ملاحظہ فرمائیں۔

اے حمید
کشمیر کے غازی
موسیٰ کے دہشت گرد
2
Pakistanipoint
Waqar
Azeem

شیو سینا کے دہشت گرد

2

کشمیر کے غازی

اے حمید

بھارت میں ایک محب وطن پاکستانی کی لرزہ خیز اور سنسنی خیز داستان

کشمیر کے غازی

اے حمید

مکتبہ القریش ○ سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

ناشر ☜ عبدالحفیظ قریشی
باہتمام ☜ محمد علی قریشی
مطبع ☜ نیر اسد پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ ☜ خرم آرٹس لاہور
سن اشاعت ☜ 1997
تعداد ☜ 1100
قیمت ☜ =/ [illegible] روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

انتساب

ان گمنام شہیدوں کے نام
جو دشمن کے عقوبت خانوں میں جان تو دے دیتے ہیں مگر-----
وطن کے خلاف زبان نہیں کھولتے

بھارتی سنتری دوڑتا ہوا کیبن سے نکل کر آگیا۔

لینے لگا۔

"سر! کرنل صاحب آ رہے ہیں۔"

علی شاہ نے مجھے اپنے کمانڈو آپریشن کی روداد سناتے ہوئے بتایا کہ ہمارے ہولسٹر خالی تھے مگر بند تھے۔ پستول ہم نے اپنی پتلون کی جیبوں میں رکھے ہوئے تھے جو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے ساتھی کمانڈو امداد علی کی طرف ایک نظر دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اگر بھارتی کرنل ہماری باتوں سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے سپیشل آئی ڈی دیکھنے پر اصرار کیا تو پھر ہم پستولیں نکال کر اندھا دھند فائرنگ کر کے بھارتی کرنل اور دونوں سنتریوں کو وہیں ڈھیر کر دیں گے اور وہاں سے فرار ہو جائیں گے کیونکہ اس کے سوا ان کے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ انڈین فوج کی قید میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ سامنے ایک بیرک بنی ہوئی تھی وہاں سے ایک فوجی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگیا۔ اس کے چہرے پر بڑی رعونت تھی۔ وہ فل فوجی کرنل کی وردی میں تھا اور سگار اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کشمیری کمانڈو کو اوپر سے نیچے تک دیکھا دونوں انڈین فوج کی ایک رجمنٹ کے میجر اور کیپٹن کی وردیوں میں تھے۔ دونوں نے کرنل کو سلیوٹ کیا جس کا جواب کرنل نے محض ہاتھ اوپر لے جا کر دیا پھر بولا۔

"ویل! آپ لوگ کونسی انسپکشن ٹیم سے آئے ہیں۔ ہمیں آپ کے بارے

میں کوئی انفریشن نہیں ملی۔"

علی شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"سر! ہم ملٹری انٹیلی جینس کی انسپکشن ٹیم کے آفیسرز ہیں۔ ہم اپنے ایمونیشن ڈپوز کا اچانک معائینہ کرتے ہیں۔"

بھارتی کرنل نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"لیکن آپ لوگوں کے پاس سپیشل آئی ڈی کارڈ ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر تو ہم صرف چیف آف آرمی سٹاف کو اندر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی انڈین فوجی چاہے وہ کسی رینک کا ہو اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

علی شاہ نے بتایا کہ اس وقت میں نے آپ کے تعویذ والے نمبر یا نمبر والے تعویذ کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور جیب سے وہ کاغذ کا ٹکڑا نکال کر کرنل کو دیا جس پر آپ نے T / L -211 لکھا ہوا تھا۔ علی شاہ کہنے لگا۔

"صوفی جی! آپ کے تعویذ نے تو وہاں بہت بڑا معجزہ کر دکھایا۔ جیسے ہی کرنل نے کاغذ پر لکھا ہوا نمبر پڑھا۔ وہ اپنی ساری رعونت بھول گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہم اس سے چھوٹے رینک کے آفیسرز ہیں۔ اس نے نمبر پڑھتے ہی ایڑیاں جوڑ کر زور سے ہمیں سلیوٹ کیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ سر! آجائیں پلیز!۔"

علی شاہ اور امداد علی تو حیران رہ گئے۔ علی شاہ نے کرنل سے خفیہ نمبر والا کاغذ کا ٹکڑا واپس لے کر جیب میں رکھ لیا اور کرنل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بھارتی کرنل اب بڑے خوشامدانہ لہجے میں ان سے باتیں کرنے لگا تھا اور کہہ رہا تھا کہ سر! ہم نے یہاں سیکورٹی کا زبردست انتظام کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے یہاں کبھی کوئی تخریب کاری کا واقعہ نہیں ہوا۔ علی شاہ نے بتایا کہ اب ان کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا انہوں نے ٹارگٹ مار لیا ہے۔

علی شاہ نے کرنل سے کہا۔

"ہم سب سے پہلے ایمونیشن ڈپو کی انسپکشن کرنا چاہتے ہیں۔"

کرنل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ ضرور دلی سے آئے ہوں گے۔ سفر کی تھکاوٹ ہوگی۔ آفیسرز میس میں چل کر کچھ ٹھنڈا پیجیے۔ بعد میں انسپکشن بھی ہو جائے گی۔"

علی شاہ نے معذرت کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"سر! ہم سب سے پہلے اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایمونیشن ڈپو کی طرف لے چلیں۔"

کرنل کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ آیئے اس طرف آ جایئے۔"

ایمونیشن ڈپو ٹیلے کے نیچے تھا۔ اس کا دروازہ دوسری جانب تھا۔ گیٹ لوہے کا تھا جس کے باہر دو مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ تین فوجی افسروں کو آتا دیکھ کر دونوں بھارتی سنتریوں نے زور سے ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کیے اور اٹن شن ہو کر کھڑے ہوگئے۔ بھارتی کرنل نے انہیں آرڈر کیا۔

"دروازہ کھول دو۔"

اسی وقت دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ ایمونیشن ڈپو کے اندر جانے لگے تو بھارتی کرنل بھی ان کے ساتھ ہی دروازے کی طرف بڑھا۔ علی شاہ نے کرنل سے کہا۔

"سوری سر! ہمیں کسی بھی آفیسر کو ساتھ لے کر انسپکشن کرنے کے آرڈر نہیں ہیں۔"

کرنل نے مزید کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"میں آفیسرز میس میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آفیسرز میس سامنے والی رک کے ساتھ ہی ہے۔ او کے۔ سی یو۔"

بھارتی کرنل سر ہلاتا ہوا واپس چل دیا۔ علی شاہ اور امداد علی کمانڈوز اسلحہ کے بہت بڑی ذخیرہ میں داخل ہوگئے۔ اندر بے پناہ فوجی اسلحہ' چھوٹے بڑے ہتھیار' گولہ بارود' راکٹ اور چھوٹی بڑی توپوں کے گولے پڑے تھے۔ انہوں نے اتنا بڑا فوجی اسلحے کا ذخیرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ علی شاہ نے امداد علی سے کہا۔

"اس طرف چلو۔"

ڈپو میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ اندر ایک اور تہہ خانہ تھا۔ ٹیلے کے پہلوؤں کو کھود کر وہاں مزید تہہ خانے بنائے ہوئے تھے جہاں اسلحہ ڈمپ بھرا ہوا تھا۔ ایک جگہ انہیں پٹرول کے بڑے بڑے کنٹینرز رکھے ہوئے نظر آئے۔ علی شاہ نے کہا۔

"ایک ٹارگٹ تو یہ ہوگا۔ جلدی سے دو ٹائم بم فکس کر دو۔"

کشمیری سرفروش امداد علی نے قمیض کے اندر سے دو بال پوائینٹ کی شکل والے بم نکال کر پٹرول کنٹینروں کے ساتھ چپکا دیے اور اس کے بٹن بھی دبا دیے۔ ان کے پھٹنے کا دورانیہ ایک گھنٹہ رکھا گیا تھا۔ علی شاہ نے ایک طرف میڈیم فیلڈ گنوں کے گولے دیوار کے ساتھ گول دائرے کی شکل میں رکھے ہوئے دیکھے تو اس نے دو بم نکال کر ایک گولے کے ساتھ چپکا دیے اور بٹن اون کر دیا۔ اسی کے ساتھ ہی ٹائم ڈیوائس نے چلنا شروع کر دیا۔ پورے ایک گھنٹے بعد ان بموں نے بلاسٹ ہو کر وہاں قیامت خیز تباہی مچانی تھی۔ ان کے پاس مزید صرف دو ٹائم بم رہ گئے تھے۔ وہ اسلحہ سے بھری ہوئی لمبی لمبی میزوں کے درمیان یوں گھومتے رہے جیسے معائینہ کر رہے ہوں۔ اس بات کا انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی اطمینان کر لیا تھا کہ ڈمپ کے اندر کسی دیوار یا چھت پر یا کسی کونے میں کوئی ایسا ریموٹ کنٹرول ٹی وی کیمرہ نہیں لگا ہوا تھا جو ان کی حرکات و سکنات کی فلم لے کر پیچھے کنٹرول روم یا مانیٹر روم میں پہنچا رہا ہو۔

جب انہوں نے سارے بم لگا دیے تو تھوڑی دیر مزید وہاں چلتے پھرتے رہے تاکہ کچھ وقت معائینے میں ضرور لگ جائے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ ایمونیشن ڈپو سے باہر آ گئے امداد علی نے کہا۔

"آفیسرز میس جانے کی ضرورت نہیں ہے' یہیں سے واپس چلے جاتے ہیں ۔"

علی شاہ نے کہا۔

"اس طرح کرنل کو شک پڑ سکتا ہے۔ اگر اسے شک پڑ گیا تو وہ ڈپو میں جا کر مائیکرو ڈی ٹیکٹر سے بموں کا پتہ چلا سکتا ہے۔ ابھی دھماکے ہونے میں آدھا پونا گھنٹہ پڑا ہے ہم کرنل کے پاس دس بارہ منٹ بیٹھ کر واپس چلے جائیں گے اس طرح اسے بھی شک نہیں پڑے گا۔"

وہ ایمونیشن ڈپو سے باہر آئے تو بھارتی سنتریوں نے سلیوٹ کیا اور ڈپو کا آہنی دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ دونوں سرفروش کمانڈو فوجیوں کی طرح تیز تیز چلتے ہوئے آفیسرز میس میں آ گئے۔ وہاں کرنل نے شراب وغیرہ کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک فوجی کیپٹن بھی وہاں آ گیا تھا۔ کرنل نے آگے بڑھ کر امداد علی اور علی شاہ کا خیر مقدم کیا اور کہا۔

"سر! آپ کے لیے ہر قسم کی ڈرنکس موجود ہیں۔ میں نے لنچ کے لیے مرغیاں بھی کٹوا دی ہیں۔"

علی شاہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کرنل صاحب! ہم ڈرنکس نہیں لیں گے۔ اس وقت ہم ڈیوٹی پر ہیں اور ڈیوٹی کے دوران ہم کچھ نہیں پیا کرتے۔"

بھارتی کرنل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر! آپ کو ہمیں بھی خدمت کا موقع دینا چاہیے۔"

امداد علی نے کہا۔

"ہم رات کو ڈیوٹی سے آف ہونے کے بعد آئیں گے پھر آپ کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا بہت ضرور پئیں گے۔"

کرنل نے کیپٹن سے ان کا تعارف کرایا جس کا نام ورما تھا اس نے پوچھا۔

"سر! انسپکشن کیسی رہی؟ ہم نے ہر قسم کی سیکورٹی کا پورا انتظام کیا ہوا ہے۔"

علی شاہ نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں سیکورٹی کا یہاں پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ ہم نے رپورٹ میں یہی لکھا ہے۔"

یہ سن کر کرنل اور بھارتی کیپٹن دونوں بہت خوش ہوئے۔ کرنل نے کہا۔

"سر! پھر رات کو ڈنر ہمارے ساتھ ہوگا۔ ہم آپ کو گاڑی بھیج دیں گے آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

کیپٹن نے کہا۔

"کینٹ کے آفیسرز میس میں ٹھہرے ہوں گے۔"

امداد علی نے کہا۔

"نہیں ہمیں ان جگہوں پر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہمارا قیام امپریل ہوٹل میں ہے اور ہم ایک بجے کی ٹرین سے واپس ہیڈ کوارٹر چلے جائیں گے۔ آپ کی دعوت کا شکریہ۔"

علی امداد اور علی شاہ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ایمونیشن ڈپو میں دھماکے ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر آفیسرز میس (Mess) سے باہر نکلے تو باہر سٹاف کار موجود تھی۔ کرنل نے کہا۔

"یہ آپ کو امپیریل ہوٹل پہنچا دے گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی ہوگی۔"

"بالکل نہیں کرنل صاحب! بالکل نہیں۔

علی شاہ نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ دھماکے ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ سٹاف کار میں بیٹھ گئے اور سٹاف کار انبالہ چھاؤنی کے امپیریل ہوٹل کی طرف چل پڑی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے امپیریل ہوٹل تک جاتے جاتے ایمونیشن ڈپو میں دھماکے شروع ہو سکتے تھے چنانچہ ٹاف کار جب ایک سینما ہاؤس کے قریب پہنچی تو علی شاہ نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں روکو۔"

وہ سٹاف کار سے اتر گئے۔

"گاڑی واپس لے جاؤ۔ ہمیں یہاں ایک ضروری کام ہے۔"

ڈرائیور جاٹ رجمنٹ کا حوالدار تھا۔ اس نے اتر کر سلیوٹ کیا اور بولا۔

"یس سر!"

وہ گاڑی لے کر واپس چلا گیا۔ علی شاہ اور امداد علی نے وہاں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے جی ٹی روڈ پر بڑی نہر کے پل کی طرف چلنے کو کہا۔ یہاں سے ان کے خفیہ ہائیڈ آؤٹ کو ٹاہلیوں کے ذخیرے میں سے راستہ جاتا تھا۔ نہر کے پل پر آ کر انہوں نے ٹیکسی والے کو بھی رخصت کر دیا اور خود ٹاہلیوں کے ذخیرے میں داخل ہو گئے۔ ان کے حساب سے بموں کے پھٹنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئے علی شاہ گھڑی کو تک رہا تھا۔

"فیوز ٹھیک لگے تھے ناں؟"

اس نے امداد علی سے پوچھا۔ امداد علی نے کہا۔

"فیوز بالکل اوکے تھے۔"

ابھی یہ جملہ ان کی زبان سے ادا ہوا ہی تھا کہ ایک بھیانک دھماکے کی آواز آئی اور زمین ایسے ہلی جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ زہ خیز دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علی شاہ اور امداد علی نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ ان کے چہرے ٹارگٹ مار دینے کی خوشی میں چمک رہے تھے۔ اس

کے ساتھ ہی انہوں نے درختوں میں ایک طرف کو تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔
وہیں ایک جگہ ان کی خفیہ کمین گاہ تھی جہاں ان کے تین کشمیری مجاہد زمین کے
نیچے تہہ خانے میں بیٹھے دھماکوں کی آواز سن رہے تھے۔ جہاں علی شاہ اور امداد
علی کو دیکھ کر انہوں نے اللہ اکبر' آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ علی
شاہ جب مجھے اپنے کامیاب کمانڈو آپریشن کی داستان سنا چکا تو کہنے لگا۔
"صوفی جی! یقین کریں اگر آپ کا تعویذ ہمارے پاس نہ ہوتا تو شاید ہم
اپنے ٹارگٹ میں کامیاب نہ ہوتے بلکہ اسی بات کا امکان تھا کہ ہم پکڑ لیے
جاتے۔ اب ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ آپ صرف پہنچے ہوئے بزرگ ہی نہیں ہیں
بلکہ کشمیری مجاہدین کی تحریک آزادی کے سچے خیر خواہ ہیں۔"
میں نے ان سے انڈین ڈیفنس ایجنسی کا سیکرٹ نمبر والا کاغذ واپس لے لیا
اور کہا۔
"اب اس تعویذ کو بھول جاؤ کیونکہ یہ صرف ایک بار ہی کام آ سکتا تھا۔
دوبارہ استعمال کرو گے تو پھنس جاؤ گے۔"
میں نے کاغذ لے کر اسے ضائع کر دیا۔
جس روز انبالہ چھاؤنی والے ملٹری ایمونیشن ڈپو میں دھماکہ ہوا اور اس
کے پرخچے اڑ گئے اس روز میں اور پاروتی مالیر کوٹلہ میں ہی ایک دوسرے مزار
پر حاضری دینے گئے ہوئے تھے۔ وہاں ہم نے اخبار میں انبالہ چھاؤنی کے فوجی ڈپو
کی خوفناک تباہی کی خبر پڑھی تو پاروتی پریشان ہوگئی کہنے لگی۔
"رام چند! یہ کیسے ہوگیا؟ ہم یہاں پاکستانی کمانڈو کا سراغ لگاتے رہ گئے اور
ادھر انبالے میں انہوں نے چھاؤنی کو تباہ کر دیا۔"
میں اندر سے بے حد خوش تھا اوپر سے میں نے بھی پریشانی اور تشویش کا
اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"یہ بہت بری بات ہوئی ہے لیکن یہ کام انبالہ کی سول اور ملٹری انٹیلی

جنیس کی ڈیوٹی تھی کہ وہ پاکستانی کمانڈوز کے بارے میں ہوشیار رہتے وہ کیا سوئے ہوئے تھے؟ ہمیں اسی وقت انبالے جانا ہوگا۔"

دن کے دس بجے تھے۔ ہم نے نور بابا سے کہا کہ ہم اپنے مرشد صاحب کی درگاہ پر حاضری دینے انبالے جا رہے ہیں۔ کل واپس آ جائیں گے۔ ہم نے اسی وقت لاری پکڑی اور انبالے روانہ ہو گئے۔ ہمیں انبالے کی خفیہ پولیس کے دفتر کا پتہ تھا۔ ہم ایک غیر آباد راستے سے ہوتے ہوئے دفتر میں آئے تو سی آئی ڈی انسپکٹر ورما نے ہمیں پہچان لیا اور ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ میں جاتے ہی اس پر برس پڑا۔

"آپ لوگ یہاں کیا کرتے ہیں؟ انبالے میں پاکستانی تخریب کاروں نے پوری چھاؤنی تباہ کر دی ہے۔ ہماری انڈین فوج کے کتنے ہی اعلیٰ افسر مارے گئے ہیں اور آپ یہاں مزے سے بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔"

سی آئی ڈی انسپکٹر کو معلوم تھا کہ ہمیں ڈیفنس آف انڈیا کی خفیہ ایجنسی نے یہاں ایک خاص مشن پر بھیجا ہوا ہے۔ وہ گھبرا گیا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا جواز پیش کرنے لگا۔ پاروتی نے انگریزی بولنی شروع کر دی۔

"مسٹر ورما یہ ذمہ داری تم پر عائد ہوتی تھی کہ اپنے علاقے میں پاکستانی جاسوسوں کا سراغ لگاتے اور انہیں گرفتار کرتے۔"

انسپکٹر ورما نے بے بسی سے کہا۔

"میڈم! یہ پاکستانی کمانڈوز نہیں تھے یہ کشمیری حریت پسند مجاہد تھے۔"

"کوئی بھی ہوں" میں نے غصے میں کہا "انہوں نے ہمارے ملٹری ایمونیشن ڈپو کو اڑا دیا ہے ہمارے کتنے ہی فوجی افسر ہلاک کر دیے ہیں۔ تم لوگ یہاں بیٹھے مفت کی تنخواہیں وصول کر رہے ہو۔"

میری دھمکیوں سے انسپکٹر ورما کے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے اسی وقت خفیہ لائین پر دلی ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف سریندر کوہلی کو فون کیا۔ چیف بھی

انبالے چھاؤنی کی تباہی سے سخت پریشان تھا میں نے اسے کہا۔

"سر! ہم لوگ مالیر کوٹلہ میں اپنے مشن پر لگے ہوئے تھے اور ہم نے دو پاکستانی جاسوسوں کا سراغ بھی لگا لیا تھا کہ یہ واردات ہوگئی۔ سر! اب آپ ہمیں آرڈر کریں کہ ہم مالیر کوٹلہ میں ہی رہیں یا انبالے میں رہ کر ایمونیشن ڈپو اڑانے والوں کا سراغ لگائیں؟"

سریندر کوہلی نے کہا۔

"نہیں دھرم چند! تم اور پاروتی مالیر کوٹلہ میں ہی اپنا کام کرتے ہو۔ انبالے کی تباہی کی ذمے داری یہاں کی سول اور ملٹری انٹیلی جینس کی تھی۔ یہ لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہے ہیں۔ انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے ان لوگوں کی ٹرانسفروں کے آرڈر کر دیے ہیں۔ تم اس کا ذکر ان سے نہ کرنا مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا مشن کہاں تک پہنچا ہے۔"

میں نے کہا۔

"سر! ایک عقیدت مند کو میں نے ٹٹولا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کے گھر پاکستانی کمانڈر کبھی کبھی پناہ لینے آ جاتے ہیں۔"

چیف کی آواز آئی۔

"اس آدمی کو فوراً گرفتار کرا دو۔ پولیس اس سے خود ہی پوچھ گچھ کر لے گی۔"

میں نے فوراً کہا۔

"سر! ہمیں یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح سے تو پاکستانی جاسوس یہاں سے روپوش ہو جائیں گے ہمیں موقع دیجئے کہ ہم اس آدمی کو اپنی اعتماد میں لے کر اس سے پاکستانی یا کشمیری کمانڈوز کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ چلائیں اس کے بعد ہم وہاں اچانک چھاپہ مار کر سب کو پکڑ سکتے ہیں۔"

چیف نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم اپنا کام کرتے رہو مگر زیادہ دیر نہ لگاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور ان کمانڈوز نے تخریب کاریاں شروع کر دی ہیں۔ کانگریسی سرکار بہت پریشان ہے۔ اس سے نہ صرف ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہماری بدنامی ہو رہی ہے بلکہ ہماری فوجوں کا مورال بھی ڈاؤن ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں آج سے اپنے کام کی رفتار تیز کر رہا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

چیف سریندر کوہلی کی آواز آئی۔

"میں یہ ساری رپورٹ لکھ کر ڈیفنس منسٹری کی سیکرٹ سروس کے منتری کو بھیج دوں گا اور اس کی ایک کاپی شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کو بھی بھجوا دی جائے گی تاکہ وہ تمہاری اور ہماری کارکردگی سے باخبر رہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ اچھا کر رہے ہیں اوکے۔ سر! پھر ملاقات ہوگی۔"

فون بند ہوگیا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر ورما نے یہ ساری باتیں سنی تھیں وہ اور زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

"مسٹر ورما! تمہیں آئندہ سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ فی الحال تمہارے خلاف کسی قسم کے ریمارکس میں اپنی رپورٹ میں نہیں لکھوں گا۔"

انسپکٹر ورما کی جان میں جان آئی کہنے لگا۔

"سر! ہم نے انبالہ چھاؤنی اور انبالہ شہر کے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے اور شہر سے باہر جانے والے ہر آدمی سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔"

پاروتی اب تک ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی کہنے لگی۔

"تم سے کسی کامیابی کی امید نہیں ہے۔ تمہارا ڈیپارٹمنٹ مفت خوروں کا ڈیپارٹمنٹ بن چکا ہے پھر بھی اپنی کوششیں جاری رکھو۔ شاید ہاتھی کے پاؤں کے نیچے اپنے آپ بٹیرا آ جائے۔"

مجھے پاروتی کے بیٹرے والے جملے سے ہنسی آ گئی۔ لیکن میں نے اپنی ہنسی کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم ایک رات انبالے کے خفیہ پولیس کے ریسٹ ہاؤس میں رہے۔ میں خود وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ ہمیں یہی رپورٹ ملی تھی کہ فوجی ڈپو میں دھماکہ اسقدر خوفناک اور بھیانک تھا کہ آس پاس کی ساری فوجی بیرکیں اڑ گئی تھیں اور یقینی بات تھی کہ وہ دونوں فوجی سنتری بھارتی کرنل اور بھارتی کیپٹن بھی ساتھ ہی اڑ گئے ہوں گے۔ اس کے باوجود میں انبالے میں زیادہ دیر ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں خفیہ پولیس کے ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ہمیں مالیر کوٹلہ میں رکھا ہوا تھا۔

ہم دوسرے روز مالیر کوٹلہ واپس آ گئے۔

اب میرے سامنے دو مشن تھے۔ پہلا مشن تو یہ تھا کہ میں کسی طرح جھوٹا چھاپہ ڈلوا کر اوپر والوں پر یہ ثابت کر سکوں کہ ہم بڑی کامیابی اور ذمے داری سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ ظاہر تھا کہ اس چھاپے میں کوئی بھی کشمیری مجاہد یا کمانڈو پکڑا نہیں جانا تھا۔ چھاپہ اس وقت ڈلوانا تھا جب وہاں سے مجاہد نکل چکے ہوں۔ اسی طرح سے میں اپنی کارکردگی بھی ظاہر کر سکتا تھا۔ بال ٹھاکرے اور ڈیفنس انٹیلی جینس چیف پر اپنا اعتماد بھی برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے میں نے ایک منصوبہ دماغ میں سوچ لیا تھا۔ دوسرا مشن میرا اپنا مشن تھا۔ یعنی مجھے سورت کے مسلمانوں کے قاتل بھاسکر، شیوا اور پاٹیکر کو قتل کرنا تھا جو جالندھر کے بوڑ والے مندر میں رہ رہے تھے۔ میں نے خفیہ پولیس کے ایک اہل کار سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس نام کے تین ہندو مرہٹے جالندھر کے بوڑھ والے مندر میں بڑے مزے سے رہ رہے ہیں اور شیو سینا کے پیسوں سے حلوہ پوری اڑا رہے ہیں۔

لیکن سب سے پہلے مجھے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر کے بال ٹھاکرے اور انڈین ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف اور محکمہ دفاع کے سیکرٹ سروس کے ونگ پر اپنا اعتماد بحال کرنا تھا۔ میں نے اس بارے میں پاروتی سے کوئی بات نہیں کی اس سے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس چھاپے کے لیے مجھے ایک ڈرامہ رچانا تھا اور اس کو نور بابا اور کشمیری کمانڈو سے بھی پوشیدہ رکھنا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں درحقیقت چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا اور ہر

وقت خدا سے یہی دعا مانگتا تھا کہ یا اللہ کہیں کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے کیونکہ اس سے پہلے میں نے ایسی لڑائی کبھی نہیں لڑی تھی۔ یعنی آپ میری اس وقت کی پوزیشن پر ذرا غور کریں میں دھرم چند کا ہم شکل بن کر بھارت میں آیا ہوا تھا۔ بھارت کی سیکرٹ سروس والوں کے ایما پر میں مسلمان کا روپ دھار کر صوفی بزرگ کی شکل میں مالیر کوٹلے میں وارد ہوا تھا تاکہ پاکستانی جاسوس اگر وہاں آتے ہوں تو ان کا سراغ لگاؤں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے نور بابا اور کشمیری مجاہدوں پر یہ ظاہر بھی نہیں کرنا تھا کہ میں حقیقت میں مسلمان ہی ہوں اور پاکستانی ہوں اور دھرم چند کا ہم شکل بن کر یہاں دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے آیا ہوا ہوں۔

انڈین ڈیفنس انٹیلی جینس اور شیوسینا کے بال ٹھاکرے پر اپنی اعلیٰ کارکردگی ظاہر کرنا بہت ضروری تھا۔ لیکن یہ تنی ہوئی رسی پر چلنے والی بات تھی۔ یعنی پولیس کو چھاپہ بھی ڈالنا تھا اور کسی کشمیری مجاہد کو گرفتار بھی نہیں کروانا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ کشمیری مجاہدوں پر یہ ظاہر بھی نہیں کرنا تھا کہ میں کوئی ڈرامہ رچا رہا ہوں۔ انہیں تو یہی معلوم تھا کہ میں بھارتی مسلمان ہوں۔ صوفی ٹائپ کا درویش ہوں اور اسلام کا شیدائی ہوں اور بھارت کے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اور فسادات میں ہندو انہیں جس طرح قتل کرتے ہیں وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں نے نور بابا سے معلوم کیا کہ علی شاہ اور امداد علی اگلے ہفتے مالیر کوٹلہ مزار پر آ رہے ہیں۔ کیونکہ نور بابا نے اس دوران پورا پتہ کروا لیا تھا کہ علی شاہ کے گرفتار شدہ کشمیری ساتھی جالندھر جیل میں کس کوٹھڑی میں بند ہیں۔ علی شاہ اور امداد علی تیسرے دن ہی آ گئے ان کی آمد کے بارے میں ظاہر ہے مجھے پاروتی کو بالکل نہیں بتانا تھا۔ نور بابا نے مجھے رازداری سے کہا کہ آج رات دونوں مجاہد کوٹھڑی میں آ رہے ہیں اگر تم ان سے ملنا پسند کرو تو آ جانا۔ ویسے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ ہم صوفی جی سے ضرور ملنا چاہتے

ہیں۔ نور بابا ہنس کر کہنے لگا۔

"وہ تم سے دعا کروانا چاہتے ہیں کہ ان کا مشن کامیاب ہو جائے۔"

میں رات کے تین بجے نور بابا کی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ دونوں کشمیری کمانڈو مجھے اٹھ کر ملے۔ انہوں نے میرے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ میرے تعویذ نے ان کے انبالہ چھاؤنی والے مشن کی کامیاب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے میری ہدایت کے مطابق نور بابا سے خفیہ نمبر والے تعویذ کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔ نور بابا نے انہیں بتایا کہ دونوں مجاہد جالندھر جیل میں پیپل کے درخت والی پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند ہیں اور انہیں صرف دن میں تھوڑی دیر کے لیے ٹہلوانے کے لیے باہر نکالا جاتا ہے اور اس دوران دو مسلح سپاہی ان کے آگے آگے ہوتے ہیں اور دو مسلح سپاہی ان کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔ علی شاہ اور امداد علی بڑے غور سے نور بابا سے ایک ایک تفصیل سنتے اور غور کرتے رہے۔ میں نے انہیں کہا۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔ تمہارے ساتھی ضرور اس مصیبت سے نکل آئیں گے۔"

علی شاہ بولا۔

"صوفی جی آپ بھی دعا کریں۔ ہم تو اپنی جان کی بازی لگا دیں گے باقی مشن کی کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

میرے ذہن میں پورا منصوبہ تھا۔ میں سب کچھ سوچ کر وہاں گیا تھا۔ میں نے دوبار اللہ اللہ کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نور بابا نے علی شاہ سے سرگوشی کی۔

"بابا جی مراقبے میں چلے گئے ہیں۔"

میں کسی مراقبے وغیرہ میں نہیں گیا تھا صرف ڈرامہ کر رہا تھا میں نے ایک اللہ اللہ کہا اور آنکھیں کھول کر علی شاہ کی طرف دیکھا اور بلف چال کھیلتے

ہوئے کہا۔
"علی شاہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ مالیر کوٹلہ شہر کے جنوب کی جانب ایک ویران جگہ پر چھپے ہوئے ہو۔"
مجھے نور بابا کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ دونوں مجاہد جب بھی ماہر کوٹلہ آتے ہیں تو ایک خفیہ ٹھکانے پر دن کے وقت چھپے رہتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ٹھکانہ کہاں ہے۔ ظاہر ہے کسی غیر آباد جگہ پر ہی ہو سکتا تھا۔ میری بلف چال کامیاب رہی۔ کچھ پہلے سے دونوں کشمیری مجاہدوں پر میرے تعویذ کی کرامت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ علی شاہ نے فوراً" کہا۔
"حضرت جی آپ نے بالکل درست فرمایا۔ ہم شہر کے جنوب میں امرودوں کے باغ کے پیچھے بارہ دری کے پاس۔"
میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
"میں دیکھ رہا ہوں کہ بارہ دری کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔"
میری دوسری بلف چال بھی کامیاب رہی۔ امداد علی بولا۔
"صوفی جی آپ ٹھیک فرما رہے ہیں ہم اسی تہہ خانے میں آ کر چھپتے ہیں۔ کیوں کوئی خاص بات ہے کیا؟"
میں نے اپنی سوچی سمجھی سکیم پر عمل کرتے ہوئے کہا۔
"خاص بات یہ ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے دشمن تمہارے تہہ خانے میں گھس آئے ہیں ان کے پاس بھاری اسلحہ ہے وہ تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ تمہاری کسی نے مخبری کر دی ہے۔"
دونوں مجاہد پریشان ہو گئے۔ علی شاہ بولا۔
"لیکن حضرت جی! ہم تو اس وقت آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"اسی لیے بچ گئے ہو۔ اب واپس اپنے خفیہ ٹھکانے پر ہرگز نہ جانا۔ اس

جگہ کی مخبری ہو گئی ہے۔ انبالے کی پولیس گارد تمہیں پکڑنے کے لیے امرودوں کے باغ میں پہنچ چکی ہے۔ کسی بھی وقت وہاں چھاپہ پڑ سکتا ہے۔ وہاں واپس ہرگز نہ جانا۔"

امداد علی نے کہا۔

"مگر حضرت جی! وہاں ہماری دو سٹین گنیں' دو پستول اور کمانڈوز کا دوسرا سامان بھی ہے جو ہم اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ یہاں سے ہمیں جالندھر اپنے ساتھیوں کو فرار کرانے کے لیے جانا تھا۔"

میں نے آواز میں تھوڑی گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر مرنا چاہتے ہو تو واپس تہہ خانے میں چلے جاؤ۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہاں سے نکل کر اسی طرف کا رخ نہ کرنا۔"

علی شاہ بولا۔

"آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر صوفی جی! ہم واپس اپنے تہہ خانے میں نہیں جائیں گے۔ اسلحہ ہم کسی دوسری جگہ سے حاصل کر لیں گے۔ ہم یہیں سے جالندھر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔"

اس کے بعد میں نے پانچ بار اللہ اللہ کا بلند آواز میں ورد کیا اور اپنے منہ پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ! ہمارے کشمیری مجاہدوں کو ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھنا۔"

نور بابا نے بھی دونوں مجاہدوں کو تاکید کی کہ واپس اپنی کمین گاہ میں ہرگز نہ جائیں۔ اس کے بعد علی شاہ اور امداد علی نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم یہاں سے سیدھا جالندھر جا رہے ہیں۔ وہاں ہم اپنے ساتھیوں کو جیل سے فرار کرانے کی کوشش کریں گے۔ آپ ہمارے لیے دعا کریں۔ میں نے کہا۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

دونوں مجاہد مجھ سے اور نور بابا سے مصافحہ کر کے کوٹھڑی سے نکل گئے مجھے یقین تھا کہ اب وہ مالیر کوٹلہ کے امرودوں کے باغ والی اپنی خفیہ کمین گاہ پر ہرگز نہیں جائیں گے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں اور نور بابا کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ کیونکہ صبح کی اذان کا وقت ہو رہا تھا اتنے میں مزار کی مسجد میں صبح کی اذان کی آواز بلند ہوئی میں نے نور بابا سے کہا۔

"آج مجھے صبح کی نماز کے بعد سٹیشن والی درگاہ پر حاضری دینے کا حکم ہوا ہے۔"

یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ سٹیشن پر مجھے ٹیلی فون کرنے کی سہولت حاصل تھی۔ وہاں ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ تھا جو شاید ریلوے والوں کی طرف سے لگایا گیا تھا یا ٹیلی فون کے محکمے والوں نے لگایا تھا۔ یہ بوتھ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا اور وہاں ایک چوکیدار ہر وقت موجود ہوتا تھا جو پیسے لے کر ٹیلی فون کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ نور بابا خوش ہو کر بولا۔

"وہ بہت بڑی درگاہ ہے۔ ضرور حاضری دیں۔ دوپہر کے بعد میں بھی وہاں حاضری دینے جاؤں گا۔"

ہم دونوں نماز پڑھنے مزار کی مسجد میں آ گئے۔ نماز کے بعد میں اپنی کوٹھری میں آ کر انتظار کرنے لگا کہ دونوں کشمیری مجاہد مالیر کوٹلہ کے علاقے سے نکل جائیں تو میں ٹیلی فون کرنے جاؤں۔ دن کافی نکل آیا تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ کشمیری مجاہد اب مالیر کوٹلہ کی سرحد کے اندر نہیں ہیں اور جالندھر کی طرف نکل گئے ہیں تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"میں سٹیشن والی درگاہ پر جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک آدمی فقیر ملنگ کے بھیس میں بیٹھا ہے۔ اس کو پاکستانی جاسوسوں کے ٹھکانے کا علم ہے۔"

پاروتی بولی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی دھرم چند۔"

میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم ساتھ ہوگی تو وہ ملنگ ہو سکتا ہے زبان نہ کھولے میں تو اس پر کسی نہ کسی طرح اثر ڈال دوں گا اور خود کو پاکستانی جاسوسوں کا ہمدرد ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے تم اکیلے ہی جاؤ میں یہاں کی جاہل گنوار عورتوں کے درمیان جون آف آرک بن کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اے بھگوان! یہاں سے کب دلی جانا نصیب ہوگا۔"

میں نے اسے سختی سے کہا۔

"خبردار! یہاں بھگوان کا نام کبھی زبان پر نہ لانا جانتی نہیں ہو ہم مسلمان بن کر یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"جانتی ہوں' جانتی ہوں۔"

پاروتی نے تنک کر کہا اور مزار کی طرف چل دی۔

میں وہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں سی آئی ڈی کے آدمی موجود ہوتے تھے مگر مجھے ان سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کا آدمی ہوں۔ ریلوے سٹیشن کی ایک جانب نیم کے درخت کے نیچے ٹیلی فون بوتھ کے باہر ایک آدمی سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"بابا لوگ! ہمیں اپنے ایک مرید کو فون کرنا ہے۔"

اس نے ایک درویش بزرگ کو سبز لباس میں اپنے سامنے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بابا جی آپ جتنے چاہیں فون کر لیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کو دعا دی اور بوتھ میں داخل ہو کر اس کا شیشے کا دروازہ بند کر لیا اور مالیر کوٹلہ پولیس کے سب سے بڑے تھانے میں ایس ایچ او وکرم دیال کو فون کیا۔ انبالہ پولیس ہیڈ کوارٹر کی جانب سے وکرم دیال کی ڈیوٹی لگی تھی کہ میں اسے جو آرڈر کروں اس کو فوری طور پر بجا لائے۔ میری اصل حیثیت کے بارے میں اسے پوری طرح بتا دیا گیا تھا۔

گھنٹی بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا کر بے زاری سے کہا۔

"تھانہ..... کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔

"ایس ایچ او وکرم دیال سے بات کراؤ۔"

یہ کوئی محرر تھا کرخت لہجے میں بولا۔

"جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ صاحب کو کیوں بلاتے ہو؟"

میں نے بڑے آرام سے کہا۔

"اگر تمہیں اپنی نوکری اچھی نہیں لگتی مہاشے اور تم اس وقت اپنی پیٹی اتروانی چاہتے ہو تو پھر تم ہی سے بات کر لیتے ہیں۔"

محرر ڈر گیا بولا۔

"سر دیال جی کو بلاتا ہوں۔"

دوسرے لمحے وکرم دیال ایس ایچ او کی آواز آئی۔

"یس سر! حکم سر! میں ایس ایچ او تھانہ وکرم دیال بول رہا ہوں۔"

محرر نے شاید اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتا دیا تھا کہ فون پر کوئی افسر بول رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"وکرم دیال میں نمبر ٹو ڈبل ون ئی بول رہا ہوں۔"

وکرم دیال نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"حکم سر! حکم سر! میں آپ کا خادم بول رہا ہوں۔"
میں نے کہا۔
"میری بات غور سے سنو۔"
پھر میں نے اسے بتایا کہ امرودوں کے باغ کے پیچھے جو بارہ دری ہے اس بارہ دری کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے میں اس وقت دو پاکستانی جاسوس چھپے ہوئے ہیں۔ فوراً" پولیس کی مسلح گارد لے کر وہاں چھاپہ مارو اور دونوں کو گرفتار کر کے انبالہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں پیش کرو۔ وکرم دیال کی آواز آئی۔
"یس سر! ابھی حکم پر عمل ہوتا ہے میں فوراً" گارد لیکر وہاں جا رہا ہوں۔"
"جلدی کرنا دیر کر دی تو دونوں جاسوس ہاتھ سے نکل جائیں گے۔"
"سر ہم ابھی جا رہے ہیں گارد تیار ہے سر۔ اور کے سر!۔"
میں نے فون بند کر دیا دل میں دعا مانگنے لگا اے میرے پاک پروردگار دونوں کشمیری مجاہد علی شاہ اور امداد علی کہیں تہہ خانے میں واپس جانے کی حماقت نہ کر بیٹھے ہوں۔ مگر وہ بڑے عقل مند تھے انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا مالیر کوٹلہ کے ایس ایچ او کی سرکردگی میں بارہ دری کے پاس آ کر تہہ خانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ انہیں بہت جلد جھاڑیوں میں نیچے جاتا راستہ مل گیا۔ وہ برق رفتاری سے نیچے تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ مگر وہاں نام نہاد پاکستانی جاسوس نہیں تھے۔ وہاں ان کی سٹین گنیں دو پستول اور کمانڈو پارٹی کا دوسرا سامان موجود تھا مگر کمانڈو غائب تھے۔ پولیس نے سارے مکان پر قبضہ کر لیا۔ دوپہر تک میں مالیر کوٹلے کے اسٹیشن والے مزار پر ہی دھونی رمائے بیٹھا رہا۔ کیونکہ مجھے دوبارہ فون کر کے چھاپے کا نتیجہ معلوم کرنا تھا۔ میں دو بجے بعد دوپہر کسی بہانے اٹھ کر سٹیشن کے ٹیلی فون بوتھ میں گیا۔ ایس ایچ او وکرم دیال کو فون کر کے ریڈ کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ کمانڈو کے ٹھکانے پر ہم ٹھیک

ٹھیک پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے دو سٹین گنیں دو پستول اور دوسرا سامان بھی برآمد کر لیا ہے مگر افسوس کی کمانڈو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اوپر سے ایس ایچ او پر برس پڑا۔

"تم لوگوں نے چھاپہ مارنے میں دیر کر دی ہوگی۔ تم سب کے سب نا اہل لوگ ہو۔ میں اوپر تمہاری رپورٹ کروں گا تم لوگوں نے ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ تمہارے خلاف محکمانہ کاروائی ہوگی۔"

اس کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور وہاں سے انبالے ڈویژن کے خفیہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں انسپکٹر ورما کو فون کر دیا یہ اس کا خاص نمبر تھا۔ وہ مل گیا تھا کہنے لگا۔

"سر! ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ مالیر کوٹلہ کی پولیس کا ریڈ ناکام رہا ہے۔ آپ نے جگہ کی ٹھیک نشاندہی کر دی تھی مگر مالیر کوٹلہ کی پولیس کا عملہ دیر سے وہاں پہنچا ہوگا۔"

میں نے انسپکٹر ورما پر یہی غصہ نکالنا شروع کر دیا اور اسے بھی خوب ڈانٹا کہ تم سب سول اور خفیہ پولیس والے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ تم سب کے خلاف کارروائی ہوگی۔ ہم نے اتنی محنت سے پاکستانی کمانڈو کا سراغ لگایا اور ان کے ٹھکانے کا پتہ نکالا اور تم سب نے مل کر ہماری ساری محنت مٹی میں ملا دی۔ انسپکٹر ورما بھی معذرت پیش کرنے لگا میں نے کہا۔

"میرے پاس تمہاری وضاحتیں سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں پوری رپورٹ اوپر بھیج رہا ہوں فیصلہ اوپر والے کریں گے کہ تمہارے خلاف کیا کارروائی ہونی چاہیے۔"

اور میں نے فون بند کر دیا۔

بوتھ کے باہر آکر میں نے سٹول پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کو پچاس روپے دے کر کہا۔

"میں نے انبالے اپنے مرید کو بھی فون کیا تھا۔ یہ اس کے پیسے ہیں۔"
وہ پیسے نہیں لے رہا تھا مگر میں نے زبردستی پیسے اس کی جیب میں ڈال دیے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ اللہ! حق اللہ!
اور میں اللہ حق اللہ کا ورد کرتا وہاں سے سیدھا نور بابا کے شاہ جی والے مزار کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب مجھے سٹیشن والے مزار پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں کچھ وقت نکال کر دلی کینٹ سیکرٹریٹ میں ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر سریندر کوہلی کو اپنی کارروائی یا جو ڈرامہ میں نے کھیلا تھا اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ شام تک میں مزار پر ہی رہا۔ پاروتی عورتوں کے درمیان بیٹھی ان کے مسلے مسائل سنتی رہی۔ شام ہوتے ہی میں دوبارہ ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ یہاں سے میں نے دلی ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف کا نمبر ملایا۔ وہ موجود تھا۔ اسی نے ریسیور اٹھایا میں نے انگریزی میں کہا۔
"سر! میں دھرم چند بول رہا ہوں اپ کو ضرور معلوم ہوگیا ہوگا کہ مالیر کوٹلہ کی پولیس نے کیا حماقت کی ہے۔"
چیف نے مالیرکوٹلہ کے ایس ایچ او کو انگریزی میں گالی دیتے ہوئے کہا۔
"وہ تو الو کا پٹھہ ہے۔ لوک سبھا کے ایک ممبر کی سفارش پر ایس ایچ او بن گیا تھا۔ میں نے اسے فورا" معطل کرا دیا ہے۔"
میں نے کہا۔
"سر! اس نے ریڈ کرنے میں دیر کر دی جس وقت میں نے اسے ٹیلی فون کر کے بتایا تھا کہ بارہ دری کے تہہ خانے پر حملہ کر دو۔ اس وقت دونوں پاکستانی جاسوس تہہ خانے میں موجود تھے۔ مگر ایس ایچ او نے نا اہلی دکھائی اور میرے فون کرنے کے ایک گھنٹہ بعد چھاپہ مارا۔"
یہ میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ چیف سریندر کوہلی کہنے لگا۔

"مسٹر دھرم چند! تمہاری کارکردگی نہایت اعلیٰ رہی ہے۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم نے کمانڈو کے خفیہ ٹھکانے کی صحیح نشاندہی کی تھی۔ وہاں سے جو اسلحہ وغیرہ برآمد ہوا ہے اس نے ثابت کر دیا ہے کہ دونوں بڑے تربیت یافتہ اور خطرناک کمانڈو تھے۔ اگر وہ پکڑے جاتے تو یہ ہماری بہت بڑی فتح تھی لیکن پولیس نے ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔"

میں نے کہا۔

"سر! ہم اپنی ڈیوٹی پوری طرح جان لڑا کر ادا کر رہے ہیں۔ یہاں مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں میں رہ کر پاکستانی جاسوسوں کا سراغ لگانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ سر! یہ مسلمان بڑے محتاط ہیں۔ پاکستانی کمانڈو کے بارے میں پوچھو تو ہاتھ نہیں پکڑاتے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ سر! ہم نے بڑی محنت اور زبردست چالاکی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے ان دونوں جاسوسوں کا سراغ لگایا تھا۔ میں چاہتا ہوں سر کہ ہماری کارکردگی کی پوری رپورٹ بال ٹھاکرے جی کو بھی پہنچا دی جائے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم بھارت ماتا کے سپوت یہاں دشمنوں میں بھیس بدل کر آرام سے نہیں بیٹھے ہوئے۔

چیف سریندر کوہلی نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو دھرم چند! یہ رپورٹ آج دوپہر کو ہی ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ بال ٹھاکرے جی کو ٹیلی فون پر بھی بتا دی تھی اور بذریعہ ڈاک بھی روانہ کر دی تھی۔ بال ٹھاکرے جی بھی تمہاری کارکردگی سے مطمئن تھے مگر وہ مالیر کوٹلے کے ساتھ ساتھ انبالہ کی پولیس کو بھی گالیاں دے رہے تھے کہ یہ سب بھارت ورش کے دشمن ہیں اور پاکستانی کمانڈوز سے ملے ہوئے ہیں ان کے کہنے پر وزیر داخلہ نے مالیر کوٹلہ اور انبالہ ہیڈ کوارٹر کے چھ افسروں کو فوری طور پر لائن حاضر کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے۔"

یہ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ مجھے جالندھر واقع بوڑ والے مندر میں مسلمانوں کے قاتلوں کو بھی ٹھکانے لگانے جانا تھا۔ اس کے لیے بھی میں نے ایک سکیم دماغ میں سوچ رکھی تھی۔ چیف نے کہا کہ جس طرح تم مناسب سمجھتے ہو کرو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں میں رہ کر تم ان پاکستانی کمانڈوز کا ایک دفعہ پھر سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکتے ہو تو وہیں بیٹھے رہو۔ اگر تم ایسا نہیں سمجھتے تو پھر تمہیں دوسرے مشن پر بھیج دینا چاہتے ہیں۔ دوسرا مشن وہی تھا جس کے بارے میں' میں پہلے بیان کر چکا تھا۔ یعنی مجھے پاکستانی کمانڈو کے بھیس میں گرفتار کر کے جالندھر جیل میں بند کر کے مجھ پر نمائشی ٹارچر کرنا تھا۔ جیل کے قیدیوں میں یہ خبر مشہور کرنی تھی کہ پولیس نے ایک پاکستانی کمانڈو کو گرفتار کیا ہے جس پر بے پناہ تشدد کیا جا رہا ہے اور اس کے بعد مجھے ان دو کشمیری کمانڈوز میں سے کسی ایک کمانڈو کی کوٹھڑی میں بند کر دینا تھا جو پہلے سے جالندھر جیل میں تھے اور جن کے بارے میں انڈین پولیس کو یہ شبہ تھا کہ وہ پاکستانی کمانڈوز ہیں حالانکہ وہ کشمیری مجاہد تھے۔ میں نے اپنی سوچی سمجھی سکیم پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"سر! اب میرا یہاں مالیر کوٹلہ میں ٹھہرنا بے کار ہے کیونکہ کمانڈو کے خفیہ ٹھکانے پر پولیس کے چھاپے کی خبر یہاں سب میں مشہور ہوگئی ہے اور اب لوگ زیادہ محتاط ہوگئے ہیں۔ اب یہاں کے کسی مسلمان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اگر اس کے پاس کوئی کمانڈو چھپنے کے لیے آ جائے تو وہ پولیس کو یا ہمیں اس کی خبر کرے۔"

"پھر تم دوسرے مشن کی تیاری کے لیے جالندھر سٹی پولیس ہیڈ آفس کے ایس پی ہرپال سنگھ کے پاس جا کر رپورٹ کرو۔ ہم نے ہرپال سنگھ کو تمہارے مشن کے بارے میں بریف بھی کر دیا ہے اور اسے تمہارے مشن کی فائیل کی

کاپی بھی بھیج دی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ ایک بار میں نے جالندھر سٹی پولیس کے ایس پی ہرپال سنگھ کو جا کر رپورٹ کی تو اس کے بعد میں فرضی قیدی سہی لیکن بہرحال قیدی بن کر جیل میں ڈال دیا جاؤں گا اور مجھے اپنے قاتلوں بھاسکر، شیوا اور پاٹیکر کو ٹھکانے لگانے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے جالندھر میں کچھ وقت آزادی سے چلنے پھرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے اس کی بھی ترکیب سوچ رکھی تھی میں نے چیف سے کہا۔

"سر! میں نے یہاں اپنے طور پر جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے ذریعے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان پاکستانی کمانڈوز کا جالندھر کی سبز خانقاہ والی درگاہ کے متولی کے پاس ہی آنا جانا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں سے مجھے ان مفرور کمانڈوز کا کوئی سراغ مل جائے۔"

ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے تم پہلے جالندھر جا کر یہ سراغ لگاؤ اس کے بعد ایس پی ہرپال سنگھ کو رپورٹ کرنا۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے سیدھا ایس پی ہرپال سنگھ کے پاس ہی جاؤں گا۔ لیکن اپنا جیل کے قیدی والا مشن شروع کرنے سے پہلے دو تین روز کے لیے سبز خانقاہ میں قیام کروں گا۔ اگر وہاں کوئی سراغ نہ ملا تو میں اپنا دوسرا مشن شروع کردوں گا۔"

چیف کہنے لگا۔

"لیکن اس دوران تمہیں اپنا حلیہ دوسرے لوگوں سے چھپانا ہوگا۔ دوسرے لوگوں سے میری مراد جیل کے لوگ ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اس کا انتظام میں وہاں جا کر کر لوں گا۔ آپ بے فکر رہیں ہاں پاروتی میرے ساتھ نہیں جائے گی۔"

چیف بولا۔

"اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم اسے مالیر کوٹلہ سے واپس دلی بھیج دو اس مشن پر تم اکیلے جاؤ گے۔"

جب یہ ساری باتیں ہوگئیں تو میں نے فون بند کیا اور واپس شاہ جی کے مزار پر آ کر پاروتی کو بتایا کہ میں اپنے دوسرے مشن پر کل جالندھر جا رہا ہوں تمہیں واپس دلی ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنی ہوگی۔ وہ پہلے اس مشن کی بک بک جھک جھک سے تنگ آ چکی تھی۔ لمبا سانس بھر کر بولی۔

"او تھینک گاڈ۔"

دوسری دن میں نے نور بابا سے اجازت لی اسے کہا کہ ہم بڑے پیر صاحب کی زیارت کے لیے رانچی اور جبل پور کی طرف جا رہے ہیں۔ واپسی پر ملاقات ہوگی۔ نور بابا مجھ سے گلے لگ کر ملا۔ ہم صبح کی ٹرین میں سوار ہو کر پٹیالہ اور وہاں سے انبالہ آ گئے۔ انبالے سے پاروتی کو دلی جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا اور میں لاری میں بیٹھ کر جالندھر پہنچ گیا۔ جالندھر میں آ کر میں سیدھا سٹی پولیس کے ہیڈ کوارٹر آیا۔ خفیہ پولیس کا آفس بھی وہیں ایک علیحدہ ونگ میں تھا۔ ایس پی ہرپال سنگھ بڑے تپاک سے اٹھ کر ملا۔ کہنے لگا۔

"دھرم چند جی! ہمیں آپ کا کل سے انتظار لگا ہوا تھا خیال تھا کہ آپ کل شام کو پہنچیں گے۔"

میں نے کہا۔

"بس ضروری کاموں میں لگا رہا۔ اب آپ ایسا کریں کہ مجھے اپنے اس خاص کمرے میں لے چلیں جہاں آپ کا بھیس بدلنے کا سامان وغیرہ ہوتا ہے۔"

ہرپال سنگھ بولا۔

"مہاراج! پہلے کچھ بھوجن پانی چکھ لیں۔"
میں نے کہا۔
"پہلے ڈیوٹی اس کے بعد بھوجن پانی۔"
ہم ایک کمرے میں آئے جہاں ہر قسم کا بھیس بدلنے کے کپڑے اور دوسرا سامان رکھا ہوا تھا۔ مجھے چونکہ جالندھر :بل کے اور کسی حد تک جالندھر سٹی پولیس کے عملے سے اپنے چہرے کو کم از کم تین چار دن کے لیے چھپانا تھا اس لیے میں نے اپنے لیے لمبے بالوں کی وگ اور ایک لمبی داڑھی پسند کی اور ہرپال سنگھ سے کہا۔
"میں ملنگ بابا کے بھیس میں سبز گنبد والی خانقاہ میں دو ایک دن گزاروں گا۔ ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ وہاں پاکستانی کمانڈوز آئے تھے۔ اس کے بعد اپنا جیل والا مشن شروع ہو گا۔"
ہرپال سنگھ بولا۔
"جیسے آپ کی مرضی مہاراج! ہم تو آپ کے حکم کے پابند ہیں۔۔آپ اپنے ساتھ خفیہ پولیس کے باڈی گارڈ لے جانا پسند کریں گے؟"
میں نے زور دے کر کہا۔
"خبردار! یہ میں سختی سے حکم دیتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی خفیہ والا نہ ہو۔ جہاں میں جاؤں وہاں کم از کم دس میل کے علاقے میں کسی خفیہ پولیس کے آدمی کو موجود نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح ہمارا سارا مشن تباہ ہو سکتا ہے۔ پاکستانی کمانڈوز کے بھی اپنے خفیہ آدمی ہوتے ہیں۔ انہوں نے آپ کی خفیہ پولیس کے آدمیوں کو دیکھ لیا تو اگر کسی پاکستانی کمانڈو کو وہاں آنا بھی ہوا تو نہیں آئے گا۔"
یہ پیش بندی میں نے اس لیے کی تھی کہ جب میں رات کے وقت بوڑ والے مندر میں مسلمانوں کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے جاؤں تو کہیں خفیہ پولیس

والوں کو پتہ نہ چل جائے کہ میں آدھی رات کو بوڑ والے مندر میں گیا تھا اور وہاں تین آدمیوں کا خون ہوگیا تھا۔ مجھ پر تو شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر میرے لیے حالات مزید پیچیدہ ہو سکتے تھے اور جالندھر پولیس کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ آخر ایسا کیسے ہوا کہ میرے مندر میں جانے اور وہاں سے نکلنے کے بعد تین آدمیوں کی لاشیں وہاں پڑی ہیں۔ اگر میں نے وہ خون نہیں کیے تو پھر کس نے کیے تھے اور اگر میں نے تین ہندوؤں کو ہلاک کیا تھا تو ہندو ہو کر میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی سکیم کے مطابق سی آئی ڈی کو اپنے آس پاس رہنے سے منع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جالندھر پولیس کو میری زبردست حیثیت کا علم ہوگیا ہوگا اور انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں نے مالیر کوٹلہ اور انبالے ضلع ہیڈ کوارٹر پولیس کے درجن بھر اہل کاروں کو لائن حاضر کرا دیا ہے۔

ہرپال سنگھ بولا۔

"سر! آپ اطمینان رکھیں۔ آپ جہاں بھی جائیں گے ہماری خفیہ پولیس کا کوئی آدمی وہاں دس دس میل تک موجود نہیں ہوگا۔"

میں نے وہ رات پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں ہی بسر کی۔ دوسرے روز لمبے بالوں کی وگ اور لمبی داڑھی لگا کر ایک ملنگ کے بہروپ میں میں جالندھر شہر کی سڑکوں پر نکل آیا۔ وہاں اس قسم کے سادھو اور ملنگ لوگوں کے لیے کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ جالندھر میں ہی کافی مسلمان مالیر کوٹلہ سے آ کر کاروبار کرنے لگے تھے اور آباد ہوگئے ہوئے تھے میں سیدھا سبز خانقاہ پر پہنچ گیا اور دھمال ڈالنے کی بجائے خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرے پیچھے جالندھر کی سی آئی ڈی نہیں لگی ہوئی اور میں آزادی سے بوڑ والے مندر کی طرف جا سکتا ہوں۔ کچھ دیر سبز خانقاہ کے احاطے میں ملنگوں کے ساتھ بیٹھنے کے بعد میں بوڑ والے مندر کی طرف روانہ ہوگیا۔

سورت کے مسلمانوں کے قاتلوں یعنی بھاسکر، شیوا اور پاٹیکر کی تصویریں

میں نے اچھی طرح سے دیکھ رکھی تھیں اور میں ان کی شکل ایک سیکنڈ میں پہچان سکتا تھا۔ وہ لوگ بھی حلیہ بدل کر وہاں نہیں رہ رہے تھے۔ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کو تو سورت احمد آباد کی شیو سینا نے مسلمانوں کی نظروں سے بچنے کے لیے کچھ دنوں کے لیے یہاں پنجاب میں بھیج دیا تھا۔ کیونکہ سورت کے بھیانک مسلم کش فسادات کے بعد وہاں کے مسلمانوں نے عالمی عدالت انصاف میں مقدمہ درج کرا دیا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کا نتیجہ کبھی مسلمانوں کے حق میں نہیں نکلا تھا مگر گجرات کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں میں سیاسی اور قانونی شعور بہت زیادہ تھا اور وہ اس کا بھرپور استعمال کرنا اور اسے عمل میں لانا چاہتے تھے۔

بوڑ والا مندر ہنومان کا مندر تھا۔ کافی بڑا مندر تھا۔ مندر کے احاطے میں جگہ جگہ ہنومان کی مورتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ کونے میں اونچے چبوترے پر تکونے مینار والے مندر کی عمارت تھی۔ ہندو عورتیں اور مرد پوجا کرنے آ رہے تھے۔ میں ایک ملنگ کے بھیس میں تھا مگر یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں مسلمان ملنگ ہوں۔ میرے بالوں اور لمبے گیروے کرتے سے یہ زیادہ نمایاں تھا کہ میں ہندو جوگی ہوں۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں بھی مندر کے اندر چلا گیا۔ ہنومان کی مورتی کے آگے ہاتھ باندھ کر اسے پرنام کیا۔ سر بالکل نہ جھکایا۔ پھر باہر آ کر احاطے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور آتے جاتے آدمیوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ مجھے ان لوگوں کے چہروں میں بھاسکر، شیوا اور پاٹیکر کی تلاش تھی۔ میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا مگر یہ تینوں چہرے نظر نہ آئے۔

دوپہر کا کھانا میں نے وہیں ایک لنگر پر سے کھا لیا اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں کئی دوسرے جوگی اور سادھو لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مندر میں سے گھنٹیوں کی آوازوں کے ساتھ جے بجرنگ بلی کے نعروں کی آواز بھی کبھی کبھی

آ جاتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی۔ بھاسکر شیوا وغیرہ مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے پاس کافی پیسے موجود تھے۔ میں نے ایک پجاری کو پچاس روپے دے کر کہا۔

"بھیا! میں کیلاش پربت کا سادھو ملنگ ہوں۔ یہاں ہنومان جی کے مندروں کی یاترا کو آیا ہوں رات بسر کرنے کو کوئی اچھا سا ٹھکانہ مل جائے تو بہتر ہوگا۔"

پجاری نے ایک کوٹھڑی کھول دی اور کہا۔

"مہاراج! یہاں آرام کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں۔ یہاں آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔"

کوٹھڑی میں چارپائی پر بستر لگا تھا۔ ایک پرانا سا کمبل بھی پڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے بابا لوگ۔ ہم یہاں رات کاٹ لیں گے۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

جب وہ جانے لگا تو میں نے اسے بلا کر کہا۔

"بھیا! ہمیں یہاں سے آگے مہاراشٹر میں ہنومان جی کے مندروں کی یاترا کرنے جانا ہے تم مہاراشٹر کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہو کہ یہاں ہنومان جی کے مندر کس کس شہر میں ہیں؟ یا اگر یہاں کوئی ایسا پجاری ہو جس کا تعلق مہاراشٹر سے ہو تو میں اس سے پوچھ لوں۔"

پجاری کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"یہاں مہاراشٹر کا کوئی پجاری تو نہیں ہے۔ سارے پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ہاں یہاں دو تین آدمی کچھ عرصے سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے پجاری جی کے مہمان ہیں۔ وہ تینوں مراٹھے ہیں اور مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں۔"

امید کی بجھتی ہوئی شمع پھر سے روشن ہوگئی تھی۔ یقیناً" یہ پجاری شیوا،

بھاسکر اور پاٹیکر کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ تینوں مراٹھے یعنی مرہٹے تھے اور مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔ میں نے کہا۔

"بھیا تم مجھے ان سے ملا دو۔ میں ان سے مہاراشٹر کے مندروں کے بارے میں خود ہی پوچھ لوں گا۔ یا پھر مجھے بتا دو کہ وہ یہاں کہاں ہوں گے۔ میں ذرا ان سے مل لوں گا۔"

پجاری کہنے لگا۔

"وہ رات کو دیر سے آتے ہیں مندر میں وہ سامنے والی کوٹھڑی ان کی ہے۔ رات کو وہ اسی کوٹھڑی میں سوتے ہیں۔ تم وہاں ان سے رات کو مل سکتے ہو۔"

میں نے پجاری کا شکریہ ادا کیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے اس کوٹھڑی کو زور سے دیکھا جہاں مسلمانوں کے دشمن اور سنگین قاتل رہتے تھے۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا تھا۔ اب اس ٹارگٹ کو مارنا تھا۔ ان تینوں قاتلوں کو مارنا تھا۔ انہیں مارنے کا میں مالیر کوٹلہ ہی سے بندوبست کر کے چلا تھا۔ میں نے وہاں ایک ہندو خفیہ پولیس والے سے ریوالور حاصل کر لیا تھا جو اس وقت میرے پاس تھا اور بھرا ہوا تھا۔ میں اپنی کوٹھڑی کے آگے بیٹھ گیا اور دشمنوں کا انتظار کرنے لگا جنہیں رات گئے وہاں آنا تھا۔

شام ہو گئی۔ مندر کی کافی رونق بڑھ گئی تھی۔
اندر خوب گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ پوجا پاٹھ ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر ٹہلتے ٹہلتے تینوں مرہٹوں کی کوٹھڑی تک پہنچ گیا۔ کوٹھڑی پر تالا پڑا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں لنگر کی طرف چل دیا۔ وہاں تھوڑا بہت کھانا کھایا اور اپنی کوٹھڑی میں آ کر دروازے کے پاس چارپائی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں کوٹھڑی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ رات گہری ہونے لگی۔ آدھی رات ہو چکی تھی مندر میں خاموشی چھا رہی تھی کہ میں نے تین آدمیوں کو مندر کے دروازے میں سے گزر کر کوٹھڑی کی طرف آتے دیکھا۔ تینوں جھوم رہے تھے اور آپس میں اونچی آواز میں مذاق کر رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر کوٹھڑی میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا یہ مسلمانوں کے قاتلوں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ اب مجھے اس کی تصدیق کرنی تھی۔ اس کے لیے ان کے پاس جانا ضروری تھا اور سادھو جوگی لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہندو سماج میں کسی بھی جگہ بجرنگ بلی کا نعرہ لگا کر جا سکتے ہیں۔ انہیں ایک بار تو کوئی نہیں روکتا۔
میرے سامنے بھی یہی ایک ترکیب تھی۔
چنانچہ میں نے اٹھ کر چارپائی کو پیچھے کیا۔ کوٹھڑی سے نکل کر اس کا دروازہ بند کیا اور سیدھا تین مراٹھوں کی کوٹھڑی کے باہر آ گیا اور جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا۔ اندر سے ان تینوں آدمیوں کی ہنسنے اور مذاق کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کسی نے کرخت آواز میں

پوچھا۔

"ابے کون ہو تم؟"

میں نے کہا۔

"مجھے ہنومان جی نے تمہارے پاس بھیجا ہے بابا' دروازہ کھولو۔"

جیسا کہ میں پہلے بھی کئی بار بیان کر چکا ہوں ہندو کا تعلق خواہ کسی فرقے سے ہو اور وہ چاہے کتنا پڑھا لکھا ہو مذہب اور دیوی دیوتاؤں کے معاملے میں بے حد ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اور جوگی سادھوؤں کے شراپ یعنی بددعا سے تو یہ لوگ بے حد ڈرتے ہیں۔ ہنومان کا نام سنتے ہی کوٹھڑی کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا۔ روشنی ہو رہی تھی اور میرے سامنے ان تینوں قاتلوں میں سے جن کے فوٹو مجھے حاجی بھائی نے سورت میں دکھائے تھے' ایک شکل کھڑی تھی۔ یہ شیوا تھا یا بھاسکر تھا یا پاٹیکر تھا۔ بہرحال ان تینوں قاتلوں میں سے ایک تھا۔ میں نے باقی تینوں کو بھی پہچان لیا۔ یہ سورت کے مسلمانوں کے قاتل اور مسلمان عورتوں کی اجتماعی بے حرمتی کرنے والے تھے۔ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

"او شیوا کون ہے یہ سادھو بابا؟"

شیوا میرے سامنے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہنومان جی کا پجاری ہے۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا لیا اور بڑی رعب دار آواز میں سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھا اور کہا۔

"تم بڑے بھاگوان ہو۔ ہنومان جی تم سے بڑے خوش ہیں۔ ہمیں کچھ کھلاؤ۔ ہم تمہارے آشرم سے کچھ کھائے پیئے بغیر نہیں جا سکتے یہ ہنومان جی کا حکم ہے۔"

شیوا نے ہاتھ باندھ لیے اور کہا۔

"اندر آ جاؤ سادھو مہاراج!۔"

شیوا تھوڑا تھوڑا جھوم رہا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں وہیں زمین پر جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ ان کے درمیان چھوٹی سی میز پر شراب کی بوتل اور تین گلاس پڑے تھے۔ پاس ہی پانی سے بھرا ہوا جگ پڑا تھا۔ پاٹیکر اور بھاسکر کو بھی میں نے پہچان لیا تھا۔ تینوں آدمیوں نے پہلے ہی سے شراب پی ہوئی تھی اور کوٹھڑی میں آ کر مزید شراب پینے لگے تھے۔ ان کے لباس معمولی سے تھے کسی نے کرتا پاجامہ اور کسی نے پتلون بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ تینوں کے رنگ گہرے سانولے تھے اور بال بھی کالے سیاہ اور گھنگھریالے تھے۔ پاٹیکر اور بھاسکر چارپائیوں پر نیم دراز ہو کر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ پاٹیکر نے ہنس کر کہا۔

"سادھو مہاراج! ہمارے پاس تو اس وقت شراب ہی ہے۔ کہو تو تمہیں بھی ایک گلاس بنا دیں۔"

میں نے جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا اور کہا۔

"بچہ! ہم دارو نہیں پیتے۔ تم اپنے ہاتھ سے پانی پلاؤ تو ہم خوش ہو جائیں گے۔ کیونکہ تم سے ہنومان جی بڑے خوش ہیں۔"

بھاسکر نے نشے میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"سادھو جی مہاراج! ہنومان جی ہم سے کیوں خوش ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہنومان جی نے مجھے کہا ہے کہ تم بھارت ماتا کے سچے سپوت ہو اور اس دیس میں رام راج قائم کرنا چاہتے ہو اور ملیچھ مسلمانوں کا ناس مار دینا چاہتے ہو۔"

بھاسکر نے ہنس کر کہا۔

"سادھو مہاراج! ہنومان جی نے یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی ہے۔ ٹھہرو۔ ہم تمہیں مٹھائی کھلاتے ہیں۔"

اس نے اٹھ کر صندوق سے ایک ڈبہ نکالا جس میں چار پانچ لڈو تھے۔ شیوا اور پاٹیکر بھی مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے پاٹیکر بولا۔

"مہاراج یہ آپ کی قسمت کے تھے۔ میں تو کل رات سارے لڈو کھانے لگا تھا۔"

میں نے ایک اور لڈو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! یہ لڈو ہنومان جی کی امانت تھے انہوں نے اپنے لیے بچا لیے تھے۔"

اور میں مزے لے کر لڈو کھانے اور جھومنے لگا۔ میں نے کہا۔

"بچہ کیا تم ہمیں اتنی اجازت دو گے؟ کہ ہم یہاں ہنومان جی کے پیاروں کے چرنوں میں دھرتی پر کچھ دیر بیٹھ کر پرسن ہوں۔"

شیوا اور بھاسکر اور پاٹیکر تینوں نے خوش ہو کر کہا۔

"بیٹھے رہو سادھو مہاراج بے شک بیٹھے رہو مگر ہمیں دارو پینے سے منع نہ کرنا۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

"جے بجرنگ بلی۔ ہم کون ہوتے ہیں ہنومان جی کے پیاروں کو منع کرنے والے۔ تم اپنا کام کیے جاؤ ہم تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں گے پھر چلے جائیں گے۔"

تینوں پینے پلانے میں لگ گئے۔ پہلے بھی انہوں نے پی رکھی تھی۔ کوٹھڑی میں آنے کے بعد وہ ایک اور بوتل نکال کر خالی کر گئے۔ وہ نشے میں دھت ہو گئے۔ ان کی حالت یہ تھی جہاں کوئی بیٹھا تھا وہیں لیٹ گیا۔ کوٹھڑی کی بتی جل رہی تھی۔ تینوں قاتل بدمعاش بے ہوش پڑے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ مجھے اب گولی مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں فکر مند تھا کہ ریوالور کے فائروں کا دھماکہ ہوگا۔ لوگ اٹھ کر کوٹھڑی کی طرف آ گئے تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے اپنی موت کو خود ہی آسان بنا دیا تھا۔ میں نے دروازے کی درز میں سے جھانک کر باہر دیکھا مندر کا احاطہ رات کے سناٹے میں سنسان پڑا تھا۔

میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور سب سے پہلے بھاسکر کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کی گردن پر چادر کا پلو ڈال دیا تاکہ گلہ دبانے سے گردن پر میری انگلیوں کے نشان نہ پڑ جائیں۔ اس کے بعد میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی شہ رگ کو دبانا شروع کر دیا۔ بھاسکر کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ میں نے دباؤ بڑھا دیا اور پھر سارا زور لگا دیا۔ بھاسکر تڑپا۔ اس کی آنکھیں ایک بار اپنے آپ پوری کھلیں اور پھر اپنے آپ بند ہوگئیں۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ مجھے بمشکل ڈیڑھ یا زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے ہوں گے۔ بھاسکر کا سانس رک گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے پاٹیکر کو اسی انداز میں گلہ دبا کر موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد شیوا کی گردن دبا کر اسے بھی ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ جب میری پوری تسلی ہو گئی کہ مسلمانوں کے یہ تینوں قاتل مر چکے ہیں تو میں نے کوٹھڑی کی بتی بجھا دی۔ کنڈی کھولی اور دبے پاؤں خاموشی سے باہر نکل گیا۔

مجھے مندر کی طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں کوٹھڑی کے عقب سے ہوتا ہوا مندر کی دیوار پھلانگ کر باہر سڑک پر آگیا اور بڑے محتاط مگر بظاہر پرسکون انداز میں سبز خانقاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ درگاہ پر آدھی رات گزر جانے پر بھی روشنی تھی اور چند ایک عقیدت مند مزار کے پاس سر جھکائے بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں مزار کے عقب میں جو چبوترہ بنا ہوا تھا اس پر جا کر لیٹ گیا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ میں نے ان قاتلوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا جنہوں نے سورت کے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا تھا اور مسلمان عورتوں کی سرعام اجتماعی بے حرمتی کی تھی۔ میرا دل مطمئن تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ صبح کافی دن چڑھے ملنگوں کا ایک جلوس دھمال ڈالتا مزار پر آیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت دن کے نو بج رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ لنگر کی چائے وغیرہ پی

اور مزار کو خیر باد کہہ کر جالندھر سٹی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ ایس پی ہرپال سنگھ مجھے اپنے آفس کے باہر مل گیا۔ اس کے پاس دو تھانیدار اور ایک سکھ حوالدار کھڑا تھا۔ وہ تھانیداروں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مندر میں تین آدمیوں کے قتل پر باتیں ہو رہی ہوں گی۔

میں اس کے قریب سے ہو کر اسے زور سے پرنام کرتا ہوا سامنے والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ہرپال سنگھ نے مجھے کمرے میں انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں جاتے ہی میں نے نقلی داڑھی اور نقلی بالوں کی وگ اتار دی۔ اتنے میں ایس پی ہرپال سنگھ بھی آ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"سر! ہنومان جی کے مندر میں رات تین آدمیوں کا خون ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں میں نے بھی یہ خبر مزار شریف پر سنی ہے۔ یہ کون لوگ تھے؟۔"

ایس پی ہرپال سنگھ بولا۔

"تینوں مہاراشٹر سے وہاں آئے ہوئے تھے انہیں گلا دبا کر ہلاک کیا گیا ہے۔ انہوں نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ کسی دوسری بدمعاش پارٹی کا کام لگتا ہے۔ یہ لوگ راتوں کو بازار حسنؔ میں گانا سننے بھی جایا کرتے تھے۔ ڈونٹ وری سر! یہ تو یہاں ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ سنائیں آپ کا مشن کہاں تک پہنچا۔

میں نے نقلی داڑھی اور نقلی بالوں کی وگ کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"سردار جی! میرا مشن تو لمبا لگتا ہے۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سب سے پہلے اس پاکستانی جاسوس کو کریدنے کی کوشش کی جائے جو یہاں سٹی جیل میں بند ہے۔"

ہرپال سنگھ بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی سر! ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم لوگ آج شام کو اپنی سکیم پر عمل شروع کر دو۔"

ہرپاک سنگھ کہنے لگا۔

"پھر آپ شام تک اس کمرے میں رہیں باہر بالکل نہ نکلیں۔"

میں نے کہا۔

"مجھے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن میں دلی ہیڈ کوارٹر میں چیف کو ایک ضروری خفیہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے ہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود ہے؟۔"

ہرپال سنگھ اٹھا اور بولا۔

"کیوں نہیں سر! ہمارے ہیڈ کوارٹر میں سب کچھ موجود ہے۔ میرے ساتھ آ جائیں۔"

وہ مجھے ایک چھوٹے کمرے میں لے گیا۔ جہاں کونے میں لمبی میز لگی تھی جس پر ریڈیو ٹرانسمیٹر رکھے ہوئے تھے۔ ایک سکھ آپریٹر خفیہ کوڈ میں کوئی پیغام نشر کر رہا تھا۔ میں نے ہرپال سنگھ سے کہا۔

"میں چیف کو تنہائی میں پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا۔

"بے فکر رہیں میں ابھی اس آدمی کو باہر بھجوا دیتا ہوں۔"

ہرپال سنگھ نے آپریٹر کو اشارہ کیا۔ آپریٹر نے اپنے پیغام کو مختصر کیا اور ٹرانسمیٹر روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد ہرپال سنگھ بھی چلا گیا۔ میں ٹرانسمیٹر روم میں اکیلا رہ گیا تو میں نے ٹرانسمیٹروں کا جائزہ لیا۔ چھوٹے بڑے پانچ ٹرانسمیٹر تھے۔ ان میں وائرلیس سگنل دینے والے بھی ٹرانسمیٹر تھے اور چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی تھے جن پر دوسری طرف کی بات بھی سنی جا سکتی تھی۔ صرف سگنل ہی نہیں دیے جاتے تھے مجھے اس کی ضرورت تھی۔ مجھے لاہور دو تین خفیہ

پیغام پہنچانے تھے۔ فریکونسی کا مجھے علم تھا۔ کوڈ بھی مجھے معلوم تھا۔ لیکن میں شارٹ ہینڈ میں ہی بات کر سکتا تھا۔ خفیہ کوڈ کی وجہ سے جالندھر سٹی پولیس کے مانیٹر میرے سگنل کو بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے اس لیے میں بے فکر تھا۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر ٹرانسمیٹر آن کیا۔ اپنی مطلوبہ فریکوئنسی ملائی اور پہلا سگنل دیا۔ دوسری طرف سے فوراً جوابی سگنل موصول ہوگیا۔ میں نے کوڈ الفاظ میں کہا۔

"کون ہے؟"

دوسری جانب سے خفیہ زبان میں کہا گیا۔

"میں بٹ صاحب ہوں۔"

میں نے خفیہ زبان میں اپنا نمبر اور نام بتایا اور کہا۔

"سب کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ بھارت کے فرعون کا میں نے پورا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ جالندھر کے جنوب میں انڈیا دور مار میزائل نصب کر رہا ہے یہ ایک ٹیلے کے اندر لگائے جا رہے ہیں۔ پوری تفصیل پھر بیان کروں گا۔ میرے ہم شکل کی پوری کڑی نگرانی کریں۔ اگر اصلی دھرم چند فرار ہو کر انڈیا پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔"

بٹ صاحب نے خفیہ زبان میں کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ شخص قید میں بند ہے اور کڑی نگرانی میں ہے۔"

میں نے کہا۔

"میرے دوسرے خفیہ پیغام کا انتظار کریں۔"

اور میں نے ٹرانسمیٹر بند کر کے ریسیور رکھ دیا۔ یہ پیغام بٹ صاحب تک پہنچانا بہت ضروری تھا جو میں نے دشمن کے ٹرانسمیٹر کو استعمال کر کے پاکستان پہنچا دیا تھا۔ جب رات ہوگئی تو میں نے ایس پی ہرپال سنگھ کے ساتھ کھانا کھایا اس نے مجھے سارا منصوبہ ایک بار پھر سمجھایا اور بولا۔

"سر! آپ کو ذرا سا بھی ٹارچر نہیں کیا جائے گا لیکن جیل کے قیدیوں میں

...ور کر دیا جائے گا کہ ایک پاکستانی کمانڈو پکڑا گیا ہے جس سے پوچھ گچھ ہو
... ہے اور اسے بہت زیادہ ٹارچر کیا جا رہا ہے۔"
...انا لمانے کے کچھ دیر بعد تک میں اور ہرپال سنگھ باتیں کرتے رہے اس
... مجھے ایک بار پھر بتایا کہ مجھے دونوں پاکستانی جاسوسوں میں سے صرف ایک
...ں کی کوٹھڑی میں پھینک دیا جائے گا۔ آگے اس کشمیری یا پاکستانی کمانڈو سے
...ں کے ساتھیوں اور ان کے ٹھکانوں وغیرہ کا سراغ لگانا میرا کام ہو گا۔ میں نے
...ا

"یہ کام میں کر لوں گا۔ مجھے یہ کام کرنا آتا ہے لیکن ایک بات ضرور ذہن
...ں رکھنا کہ میں دن میں یا رات میں کسی وقت کسی خواہش کا اظہار کروں تو
...ے فوراً" پورا کر دیا جائے۔"
ایس پی ہرپال سنگھ کہنے لگا۔
"سر! یہ تو ہمارا فرض ہو گا۔ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔
...ں نے جیل کے متعلقہ عملے کو آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہر کوئی
...پ کا خیال رکھے گا۔ اب چلئے میرے ساتھ دوسرے کمرے میں۔ تاکہ آپ کو
...ں والے کپڑے پہنا دیں۔"
مجھے قیدیوں والے کپڑے پہنانے کے بعد ان پر تھوڑی مٹی مل کر
...انا بنا دیا گیا۔ پھر میرے چہرے اور گردن پر ایسے نشان بنائے جیسے مجھ پر
... تشدد کیا گیا ہو۔ اس کے بعد مجھے آدھی رات کو قیدیوں کی ویگن میں بٹھا کر
...ں پولیس ہیڈ کوارٹر سے جالندھر جیل میں لایا گیا۔ مجھے ہتھکڑی لگی تھی۔ دو
...ں مجھے پکڑ کر گاڑی سے نیچے لے آئے۔ ایک سکھ تھانیدار بھی سات تھا۔
...ہ تھانیدار کو ہمارے خفیہ منصوبے کا علم تھا سپاہیوں اور جیل کے عملے کو اصل
... نہیں بتائی گئی تھی۔ جیل کے سٹاف میں سے چیف وارڈن' سپرنٹنڈنٹ
...ں اور ایک دو سینئر افسروں کو منصوبہ بتا دیا گیا تھا اور انہیں ہدایت کر دی گئی

تھی کہ وہ اس منصوبے کی ہوا تک جیل کے دوسرے تک نہ لگنے دیں۔
میری حالت ایسی تھی جیسے مجھے سخت اذیتیں دی گئی ہوں چہرے اور آنکھوں پر زخم کے مصنوعی نشان بنا کر اوپر پٹی چپکا دی گئی تھی۔ بال پریشان تھے۔ مجھے جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے روز ساری جیل میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ ایک پاکستانی جاسوس پکڑا گیا ہے جس کو پوچھ گچھ کے لیے جالندھر جیل میں لایا گیا ہے۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا اس دوران روزانہ مجھے جیل کی کوٹھڑی سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے سامنے ٹارچر چیمبر میں لے جایا جاتا۔ وہاں جیل کا چیف وارڈن اور سکھ تھانیدار کے علاوہ اور کوئی شخص موجود نہ ہوتا۔ میں ان لوگوں کے درمیان کرسی پر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد میں دو چار بڑی بھیانک قسم کی چیخوں کی آواز حلق سے نکالتا۔ یہ بہت ضروری تھا تاکہ جیل کے باہر جو قیدی تھے یا عملے کے آدمی تھے ان پر یہ ثابت ہو سکے کہ پاکستانی جاسوسوں پر تشدد کیا جا رہا ہے۔
اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس کے بعد مجھ سے مشقت لی جانے لگی۔ یہ ہمارے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ مشقت کے وقت مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کے بہت بڑے لان میں گھاس کاٹنے اور پودوں کی گوڈی کرنے پر یا لمبی بارک میں رسیاں بانٹنے پر لگا دیا جاتا۔ مجھے ان دونوں پاکستانی جاسوسوں میں سے ایک پاکستانی جاسوس کی شکل دکھا دی گئی تھی۔ جو پہلے سے جیل میں بند تھے اور جن سے مجھے دوستی ڈال کر ان سے بھارت میں روپوش پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔ ایک روز مجھے موقع دیا گیا کہ جس جگہ ان دونوں پاکستانی جاسوسوں میں سے ایک جاسوس مشقت کر رہا تھا میں بھی اس کے قریب جا کر کام کروں۔ پاکستانی جاسوس یا پاکستانی کمانڈو بارک کے برآمدے میں ایک طرف بیٹھا رسیاں بانٹ رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی میرے سر پر کھڑا تھا۔ وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ اسے بالکل علم نہیں تھ

کہ مجھے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہاں لایا گیا ہے۔ وہ مجھے پاکستانی جاسوس ہی سمجھ رہا تھا۔ یہ ہندو سپاہی پاکستان کا کچھ زیادہ ہی دشمن تھا۔ اس نے مجھے دو تین ٹھڈے بھی مارے اور پاکستان کو برا بھلا دیا۔ میں خاموش بیٹھا سوتر کو ہتھیلیوں پر جوڑ کر رسیاں بٹتا رہا۔ ساتھ ساتھ میں کنکھیوں سے اپنے قریب بیٹھے پاکستانی جاسوس کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

جب سپاہی ایک طرف چلا گیا تو میں نے پاکستانی کمانڈو سے کہا۔

"یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مگر میں یہاں نہیں رہوں گا۔ تم دیکھ لینا میں بہت جلد یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔"

پاکستانی کمانڈو نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اپنی مشقت میں لگا رہا۔ میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے کہا۔

"تم کیسے بزدل پاکستانی کمانڈو ہو۔ اتنے عرصے سے یہاں کافروں کا ٹارچر اور بے عزتی برداشت کر رہے ہو۔ تم یہاں سے فرار کیوں نہیں ہو جاتے۔"

پاکستانی کمانڈو پھر بھی کچھ نہ بولا اور اپنے کام میں لگا رہا۔ میں نے بھارتی پولیس اور جیل کے عملے کو تین چار گالیاں دیں اور اس کے بعد پاکستانی کمانڈو سے کوئی بات نہ کی۔ لیکن میں زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا آخر میں نے اس سے پوچھا۔

"تم پاکستان کے کس علاقے سے آئے ہو؟"

پاکستانی کمانڈو نے کہا۔

"میں تمہیں کیوں بتاؤں۔"

میں نے اس کے اردو بولنے کے کشمیری لہجے سے فوراً اندازہ لگایا کہ یہ پاکستانی کمانڈو نہیں بلکہ کشمیری مجاہد ہے۔ میں نے اس سے باتیں کرنے کی کافی کوشش کی لیکن کشمیری کمانڈو ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ وہاں یہ بات بڑی عام تھی کہ جیل کا عملہ کبھی کبھی اپنی طرف سے

قیدی ڈال کر دوسرے قیدی کے راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کشمیری کمانڈو بھی یہی سمجھ رہا تھا۔ پولیس کا مخبر بھی ہو سکتا ہوں جو پاکستانی جاسوسوں کے بھیس میں وہاں ڈال دیا گیا ہے۔

ہر دوسرے دن رات کو میری اور ایس پی ہرپال سنگھ کی خفیہ ملاقات ہوتی تھی جس میں مجھ سے پوچھا جاتا تھا کہ مجھے اپنے مشن میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ ایک رات ہماری جیل کے اندر ہی ایک جگہ خفیہ ملاقات ہوئی تو میں نے ایس پی ہرپال سنگھ سے کہا۔

"سردار صاحب! یہ پاکستانی جاسوس مجھے ہاتھ نہیں پکڑا رہا ہے۔ ان کو شک ہے کہ میں پولیس کا آدمی ہوں اور نقلی پاکستانی جاسوس بن کر ان سے راز معلوم کرنے وہاں ڈالا گیا ہوں۔"

ہرپال سنگھ نے پوچھا۔

"سر! تو پھر آپ ہمیں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ اس کا توڑ کیسے ڈھونڈا جائے۔ کیونکہ جب تک ان پاکستانی جاسوسوں کے دل سے یہ شک دور نہیں ہو جاتا وہ آپ کو کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔"

میں نے کہا کہ اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ علاج یہ ہے کہ میں ان دونوں کشمیری کمانڈوز کو جیل سے فرار کرانے میں کامیاب ہو جاؤں۔

"ہم تینوں فرار ہو جائیں انہیں یقین ہو جائے کہ وہ صرف میری کوششوں سے فرار ہوئے ہیں اس کے بعد انہیں یقین ہو جائے گا کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں بلکہ ان کا ساتھی اور پاکستانی کمانڈو ہوں۔ اس کے بعد وہ مجھے ضرور اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جائیں گے تاکہ وہاں وقتی طور پر روپوش ہو کر وہ آگے کشمیر یا پاکستان کی طرف نکل جائیں گے۔ اس کے بعد جب وہ وہاں سے نکلیں گے تو میں آپ لوگوں کو خفیہ طور پر خبر کر دوں گا اور آپ اچانک چھاپہ مار کر ہمیں گرفتار کر لیں گے۔ یوں سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے

گی۔ دونوں کمانڈوز دوبارہ پکڑ بھی لیے جائیں گے اور ہمیں ان کے خفیہ ٹھکانے اور ان کے دوسرے ساتھیوں کا اگر کوئی ہوں گے تو علم بھی ہو جائے گا۔"

ایس پی ہرپال سنگھ کو میری تجویز پسند آئی کہنے لگا۔

"سر! آپ فرار کی سکیم تیار کر لیں۔ آپ جس طرح کہیں گے ہم اسی طرح کریں گے۔"

میں نے اپنے ذہن میں ایک ترکیب تیار کر لی۔ اب صرف جیل میں بند دونوں کشمیری مجاہدوں کو اعتماد میں لینا باقی تھا۔ ایک ہفتے بعد مجھے اس کا موقع بھی مل گیا۔ میں نے ایس پی ہرپال کو بتایا کہ آج شام جیل کے وارڈن کو کیا کرنا ہوگا۔ اس روز شام کے وقت طے شدہ سکیم کے مطابق دونوں کشمیری کمانڈوز کو جیل کے پیچھے کھیتوں میں مشقت پر لگا دیا گیا۔ میں بھی وہاں پہلے سے کھیتوں میں گوڈی کر رہا تھا۔ میں کام چھوڑ کر چپکے سے جھاڑیوں کی اوٹ میں کشمیری کمانڈو کے پاس آیا اور ادھر ادھر دیکھ کر انہیں کہا۔

"میں نے تو یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ اگر تم چلنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے سے ایک بار فرار کی کوشش کرتے ہوئے مر جانا زیادہ بہتر ہے۔"

میں ان سے بات کر ہی رہا تھا کہ سکیم کے مطابق دو جمعدار اور ایک سنتری وہاں پہنچ گئے۔ سنتری نے آتے ہی مجھے دھکا دے کر گرایا اور گالی دے کر کہا۔

"تم کو یہاں آنے کی اجازت کس نے دی؟"

اس کے ساتھ ہی دونوں جمعداروں اور سنتری نے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ انہیں ہمارے منصوبے کا علم تھا چنانچہ مجھے اس طرح مار رہے تھے کہ زیادہ چوٹ نہ لگے۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے بارک میں لے آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے مجھے ایک اندھیر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

دوسرے دن جیل میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ پاکستانی جاسوس پر جیل کے عملے نے اتنا تشدد کیا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ دوپہر کے بعد یہ افواہ پھیلائی کہ پاکستانی جاسوس مرا نہیں زندہ ہے مگر اسکی حالت مردوں سے بدتر ہے۔ تین چار دن تک مجھے کوٹھڑی میں ہی رکھا گیا اور باہر نہ نکلنے دیا۔ کوٹھڑی میں کھانا پینا اور ہر قسم کی سہولتیں ملتی رہیں۔ پانچویں چھٹے دن میرے منہ سر پر پٹیاں باندھ دی گئیں اور جہاں کشمیری کمانڈو مشقت کر رہے تھے اس جگہ کچھ فاصلے پر ہی اس طرح لا کر بٹھا دیا گیا کہ میں آسانی سے انہیں نظر آ سکوں۔ دو سنتری میرے سر پر کھڑے تھے اور میں رسیاں بٹنے کی مشقت کر رہا تھا۔

اس کے تین دن بعد میرے منہ سر کی پٹیاں اتار دی گئیں اور یہ خبر مشہور کر دی گئی کہ پاکستانی جاسوس کو کشمیری کمانڈوز کے ساتھ باتیں کرنے کے جرم میں دن میں صرف ایک سوکھی روٹی دی جاتی ہے۔ پھر ایک دن سکیم کے مطابق مجھے قیدیوں میں چھوڑ دیا گیا۔ سبھی قیدی ہندو اور سکھ تھے۔ صرف میں اور دونوں کشمیری مجاہد مسلمان تھے۔ سنتری اور جمعدار جان بوجھ کر ہم سے کافی دور ہو کر دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گئے تھے۔ میں کھسکتا ہوا دونوں کشمیری مجاہدوں کے پاس آ گیا۔ وہ مشقت کر رہے تھے اور گیلے بان کو بالٹی میں سے نکال نکال کر ان کی رسیاں بنا رہے تھے۔ دونوں نے میری طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھا ان کو مجھ پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آج کی رات میں یہاں سے فرار ہو رہا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ فرار ہونا چاہتے ہو تو رات کے دو بجے جیل کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ جانا۔“

یہ کہہ کر میں تیزی سے دوسری طرف چلا گیا۔

اس رات میری ہدایت کے مطابق جیل کی عقبی دیوار میں جو پرانا دروازہ تھا اور جہاں سے جیل میں سپلائی وغیرہ آیا کرتی تھی وہاں دو سنتریوں کو سب کچھ سکھا پڑھا کر ڈیوٹی پر لگا دیا گیا تھا۔ مجھے بھی ایک پستول دیا گیا تھا جس میں نقلی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ یعنی ان گولیوں میں صرف بارود ہی تھا لوہے کے ٹکڑے نکال کر پھینک دیے گئے تھے۔ جب رات کے ٹھیک دو بجے تو میں اپنی کوٹھڑی سے نکل کر اندھیرے میں دبے پاؤں چلتا جیل کی عقبی دیوار کے سامنے اینٹوں کے ڈھیر کی پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں اس طرف دیکھ رہا تھا جس طرف کشمیری مجاہدوں کی کوٹھڑیاں تھیں۔ اس رات ان کوٹھڑیوں کے آگے پہرہ دینے والوں کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ دو بجے رات کو چل پھر کر پہرہ دینے کی بجائے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سو جانے کی اداکاری کریں چنانچہ میں نے دیکھا کہ دونوں کشمیری مجاہد اندھیرے میں جھک کر چلتے ہوئے اینٹوں کے ڈھیر کی طرف آ رہے تھے۔ جب وہ میرے قریب آئے تو میں نے انہیں پستول دکھا کر کہا۔

"فکر نہ کرو میں نے ایک قیدی کے ذریعے یہ پستول حاصل کر لیا تھا۔ یہ بھرا ہوا ہے۔"

ان میں سے ایک کشمیری مجاہد نے کہا۔

"دیوار والے دروازے پر دو سنتری پہرہ دے رہے ہیں۔ ان پر تم نے فائر کیا تو دھماکے سے جیل کا عملہ ہوشیار ہو جائے گا۔ خطرے کا الارم بج اٹھے گا۔"

میں نے کہا۔

"تم نے میرے پستول کو غور سے نہیں دیکھا اس پر سائلینسر لگا ہوا ہے اس میں فائر کے وقت دھماکے کی آواز پیدا نہیں ہوگی۔ یہاں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ رات کی تاریکی میں میرے قریب ہی اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھ گئے۔ میں بڑے غور سے جیل کی عقبی دیوار والے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا جہاں دو سنتری پہرے پر کھڑے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں میں نے کشمیری مجاہدوں سے کہا۔

"میں آگے جاتا ہوں۔ ان سنتریوں کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میں کامیاب ہوگیا تو تم میرے پاس آ جانا۔ اگر انہوں نے مجھے مار لیا تو پھر تم اپنی اپنی کوٹھڑیوں کی طرف بھاگ جانا۔ سمجھ گئے؟"۔

کشمیری مجاہدوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے ہم تمہیں اس طرح نہیں مرنے دیں گے۔"

میں نے انہیں سختی سے ڈانٹ کر کہا۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ جس طرح میں کہتا ہوں ویسے کرو۔"

دونوں چپ ہوگئے میں نے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔ مجھ پر نگاہ رکھنا۔ اگر میں نے دونوں سنتریوں کو مار ڈالا تو تم دوڑ کر میرے پاس آ جانا۔ اگر مجھے انہوں نے مار ڈالا تو فوراً یہاں سے اپنی کوٹھریوں میں چلے جانا۔ اور جیل کے اندر اگر میری قبر بنائی گئی تو وہاں آ کر ایک بار فاتحہ ضرور پڑھنا۔"

یہ کہہ کر میں اینٹوں کی ڈھیری کی اوٹ سے نکل کر جیل کے عقبی دروازے کی طرف رینگنے لگا۔ ان سنتریوں کو بھی معلوم تھا کہ مجھے رینگتے ہوئے ان کے پاس آنا ہے۔ مجھے بھی پتہ تھا کہ جب میں ان کے پاس پہنچوں گا تو وہ مجھ پر رائفل تان کر ہالٹ کہیں گے اور میں ان پر گولی چلا دوں گا جس کی معمولی سی

آواز پیدا ہوگی۔ اس آواز کے ساتھ ہی دونوں سنتریوں نے ایسے گر پڑنا تھا جیسے انہیں گولی لگ گئی ہو اور وہ مر گئے ہوں۔ اس لیے میں بڑے سکون کے ساتھ بلا کسی ڈر خوف کے اندھیرے میں رینگتے ہوئے سنتریوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے مجھے دیکھ کر رائفلیں تان لیں اور کہا۔

"ہالٹ کون ہو تم؟۔"

اس کے فورا" بعد میں نے ریوالور کا رخ ان کی طرف کر کے اوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ دونوں سنتری ایک کے بعد ایک اچھل کر نیچے گر پڑے اور یوں بے حس ہوگئے جیسے مرگئے ہوں۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا اور پیچھے کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ دروازے کے پاس روشنی تھی۔ دونوں کشمیری مجاہدوں نے سنتریوں کو سائیلینسر والے پستول کی آواز پر گرتے دیکھ لیا تھا۔ پھر جب میں نے زور زور سے ہاتھ ہلایا تو وہ بھاگ کر میرے پاس آگئے۔

میں نے کہا۔

"بھاگ چلو' دروازہ کھلا ہے۔"

ہم تینوں دیوار کے دروازے میں سے نکلے اور میں ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ دونوں کشمیری مجاہد بھی میرے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ایس پی ہرپال سنگھ کے ساتھ بنائے گئے منصوبے کے مطابق جیل کی عقبی دیوار سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے پھاٹک کی طرف ایک پرانی موٹر کار کھڑی کر دی گئی تھی جس کے ڈرائیور کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ ظاہر کرے کہ اس نے بہت شراب پی رکھی ہے اور گہری نیند سو رہا ہے۔

دوڑتے دوڑتے میں کشمیری مجاہدوں کو ریلوے پھاٹک کی طرف لے گیا۔ اس پھاٹک کے قریب ہی ایک جانب موٹر کار کھڑی تھی۔ میں نے رک کر کہا۔

"اگر اس گاڑی میں کوئی نہیں تو اسے اڑا کر لے چلتے ہیں۔"

گاڑی میں حسب ہدایت ڈرائیور شرابی بن کر پڑا تھا۔ حالانکہ وہ جاگ رہا تھا مگر پولیس کی ہدایت کے مطابق وہ سو رہا تھا۔ میں نے اس کو جھک کر دیکھا اور کہا۔

"اس نے شراب پی رکھی ہے۔"

ہم نے اسے گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالا اور فورا" گاڑی میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ کر کے پھاٹک کراس کیا اور ایک طرف کو تیزی سے روانہ ہوگئے۔ اب ان دونوں کشمیری مجاہدوں کو مجھ پر اعتماد ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے نام بتائے جو علی شاہ اور امداد علی کی زبانی معلوم ہو چکے تھے۔ میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں علی شاہ اور امداد علی کشمیری مجاہدوں سے مل چکا ہوں۔ یہ بتانے سے معاملہ الجھ سکتا تھا۔ علی شاہ اور امداد ضرور سوچتے کہ میں تو نور بابا کے مزار پر بیٹھنے والا صوفی درویش تھا مجھے یہ پاکستانی جاسوس کا ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر میں نے ڈرامہ نہیں رچایا تھا تو پھر میں پاکستانی کمانڈو کہاں سے بن گیا۔ یہ پیچیدگی صرف اس وجہ سے پیدا ہو رہی تھی کہ ان میں سے کسی پر بھی میں نے یہ راز نہیں کھولا تھا کہ میں حقیقت میں پاکستانی ہوں اور اپنے طور پر پاکستان کی سلامتی اور اس کے دشمنوں کے ناپاک عزائم کو برباد کرنے بھارت میں داخل ہوا ہوں۔

ان کشمیری مجاہدوں میں سے ایک کا نام سلیمان اور دوسرے کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ لوگ کس طرف جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"جانا کہاں ہے بس جالندھر سے جموں کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

اس پر سلیمان بولا۔

"جموں کی طرف جانا ہمارے لیے خطرناک ہو گا کیونکہ اس طرف پہلے ہی سیکورٹی بڑی سخت ہے اور ہمارے فرار کا علم ہو جانے کے بعد اس طرف فوج کو بھی الرٹ کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

سلیمان بولا۔

"یہاں سے جو سڑک ہوشیار پور کی طرف جاتی ہے وہاں ایک پہاڑی میں قدرتی غار ہے۔ اس میں ہمارا ایک خفیہ ٹھکانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس غار میں چھپ جانا چاہیے جب ذرا حالات ٹھیک ہوں گے تو پھر وہاں سے نکل کر کشمیر چلے جائیں گے۔"

میں نے یہ تجویز مان لی اور کہا۔

"ٹھیک ہے ہم غار والے ہائیڈ آوٹ کی طرف ہی جاتے ہیں وہ یہاں سے کتنی دور ہو گا۔"

عبداللہ بولا۔

"آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

دونوں کشمیری مجاہدوں کی ہدایت پر میں نے گاڑی ایک کچی سڑک پر ڈال دی۔ آدھے گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ایک رات کے اندھیرے میں بلکہ پچھلے پہر کے جھلملاتے اندھیرے میں پہاڑی ٹیلے نظر آئے۔ عبداللہ نے اس طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"ہمیں ان ٹیلوں کے پیچھے جانا ہے۔"

ٹیلوں کے پیچھے جانے کے لیے کوئی کچا راستہ یا سڑک نہیں تھی۔ گاڑی جھاڑیوں اور اونچی نیچی زمین پر چل رہی تھی۔ آخر ہم ایک ٹیلے کے قریب پہنچے تو عبداللہ نے کہا۔

"یہاں گاڑی روک لو۔"

اس ٹیلے میں ایک قدرتی غار تھا۔ غار کے اندر بستر تہہ کیے پڑے تھے۔ چائے کی پیالیاں کیتلی اور دوسرا تھوڑا بہت ضرورت کا سامان تھا۔ کونے میں چھ سات رائفلیں اور بندوقیں بھی تھیں۔ عبداللہ نے بتایا کہ یہ ہماری خفیہ کمین گاہ ہے اور کشمیر سے آنے والے مجاہد کمانڈو ضرورت پڑے تو یہاں آکر چھپ جاتے ہیں۔ میرا پروگرام انہیں وہاں سے بھگانے کا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کا یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ علاقہ جموں کشمیر کے راستے میں ہے اور لگتا ہے کہ پولیس ہماری تلاش میں اس طرف ضرور آئے گی۔ دوسری بات جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہم جس گاڑی پر یہاں تک آئے ہیں اس کے ٹائروں کے نشان برابر زمین پر پڑ چکے ہیں اور کوئی بھی کھوجی جو پولیس کے ساتھ ہماری تلاش میں نکلے گا اسے ان ٹائروں کے نشان بڑی آسانی سے یہاں تک لے آئیں گے اور تمہیں شاید معلوم نہیں کہ پنجاب کے کھوجی سراغ لگانے اور کھرا معلوم کرنے میں ساری دنیا میں مشہور ہیں۔"

سلیمان کہنے لگا۔

"پولیس کو کیسے معلوم ہوگا کہ ہم موٹر کار پر فرار ہوئے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں پولیس کو پتہ نہیں چلے گا کہ رات ریلوے پھاٹک کے پاس ایک کار چوری ہوئی ہے جس کے نشے میں دھت شرابی ڈرائیور کو سڑک پر ڈال دیا گیا تھا۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ ڈرائیور صبح ہوش آنے کے بعد خود ہی تھانے جاکر گاڑی چوری ہونے کی رپورٹ درج کرا دے۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" عبداللہ کہنے لگا "پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟۔"

میں نے کہا۔

"دیکھو بھائیو! تم کشمیری مجاہد ہو۔ میں پاکستانی کمانڈو ہوں۔ تم صبح ہونے سے پہلے یہاں سے پیدل ہی پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے جموں کی طرف نکل جاؤ میں یہاں سے امرتسر وا ہگہ بارڈر کی طرف نکل جاتا ہوں میں اس طرف سے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں گا۔"

دونوں تیار ہوگئے کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم تینوں غار سے نکل آئے۔ انہوں نے رائفلیں بندوقیں اور دوسرا سامان غار میں ہی پڑا رہنے دیا۔ یہ سامان وہ اپنے ساتھ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

"گاڑی میں امرتسر کی طرف لیے جاتا ہوں۔"

سلیمان بولا۔

"بے شک تم گاڑی لے جاؤ۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں جموں تک پہاڑی راستوں کا علم ہے۔ ہم اکثر ادھر سے آتے رہتے ہیں۔"

ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ کشمیری مجاہد کمانڈو عبداللہ اور سلیمان ہوشیار پور کی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوگئے اور میں گاڑی لے کر واپس جالندھر کی طرف چل پڑا۔

میں اتنی جلدی جالندھر سٹی پولیس سٹیشن نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ میں کشمیری مجاہدوں عبداللہ اور سلیمان کو اتنا موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اس علاقے سے بہت دور نکل جائیں۔ چنانچہ میں شہر میں داخل ہونے کے بعد ریلوے سٹیشن پر آکر گاڑی میں ہی ایک طرف بیٹھا رہا۔ جب صبح کی روشنی پھیلنے لگی تو میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور سیدھا جالندھر سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ ایس پی ہرپال سنگھ میرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے کہا۔

"فوراً" پولیس کی بھاری نفری لے کر ٹیلے والی غار پر چھاپہ ماریں۔ وہاں

اس وقت مفرور کشمیری کمانڈو عبداللہ اور سلیمان کے علاوہ دو دوسرے کمانڈو بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ مجھے ساتھ لے کر سیدھے ٹیلے والے غار میں گئے تھے۔ وہاں ان کی خفیہ ہائیڈ آؤٹ ہے۔ جلدی کریں۔ دیر ہوگئی تو مجھے ڈر ہے کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔"

میں نے ایس پی کو بتایا کہ میں یہ کہہ کر ان سے جدا ہوگیا تھا کہ میں چونکہ پاکستانی کمانڈو ہوں اس لیے یہاں سے امرتسر کی طرف نکل جاؤں گا اور وہاں سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ایس پی ہرپال سنگھ نے اسی وقت پولیس پارٹی ترتیب دی اور گاڑیوں میں سوار ہو کر جانے لگے تو میں نے اسے کہا۔

"وہ دونوں کشمیری کمانڈو ہیں۔ ان کا ارادہ آج کا دن ٹیلے والے غار میں چھپے رہنے کا ہے لیکن اگر ان کو ذرا بھی شک پڑ گیا کہ پولیس ان کے غار کی طرف آ رہی ہے تو یاد رکھیں وہ وہاں سے فرار ہو جائیں گے اور تم لوگ انہیں تلاش نہ کر سکو گے خبردار! وہاں وقت سے پہلے کوئی سپاہی فائر نہ کرے۔"

ان احتیاطی تدابیر پر میں نے بہت زیادہ زور دیا اور زور میں اس لیے دے رہا تھا تاکہ بعد میں آپریشن کی ناکامی کی ساری ذمے داری پولیس پارٹی پر ڈال سکوں۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس پولیس ہی ہوتی ہے کوئی فوجی کمانڈو پارٹی نہیں ہوتی۔ کمانڈو پارٹی ایسے موقعوں پر بے حد ڈسپلن اور احتیاط کا مظاہرہ کرتی ہے جبکہ پولیس چاہے بڑے سے بڑے مجرم کو پکڑنے کے لیے وہ اس طرح جاتی ہے جیسے میلے پر جا رہی ہو۔ چنانچہ جب پولیس پارٹی نے ٹیلے والے غار میں چھاپہ مارا اور وہاں دونوں مفرور کمانڈو غائب تھے تو میں نے ساری ذمے داری پولیس پارٹی پر ڈال دی کہ یہ ناکامی پولیس کی بے احتیاطی اور غفلت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں نے ٹیلے والے غار کی جو نشاندہی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی تھی اور وہاں پولیس کو کشمیری کمانڈوز کا اسلحہ اور دوسرا سامان مل گیا تھا جو اس بات کا

ثبوت تھا کہ مفرور کشمیری مجاہد یہاں تھوڑی دیر پہلے موجود تھے۔

مجھ پر کسی کے شک و شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جالندھر سٹی پولیس کی ناقص کارکردگی اور غیر ذمے داری کے خلاف ایک بھرپور رپورٹ لکھ کر اس کی ایک کاپی سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف سریندر کوہلی کو اور ایک کاپی شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کو روانہ کر دی میں نے اس میں لکھا کہ یہ دوسرا موقع ہے کہ پولیس نے میری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں نے کشمیری کمانڈوز کے ساتھ قیدی بن کر انتہائی عقل مندی اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے ان کے خفیہ ٹھکانے کا سراغ لگایا اور پولیس کو ان کی گرفتاری کا پورا موقع فراہم کیا لیکن پولیس نے غفلت اور لاپرواہی سے کام لے کر اس سنہری موقع کو ضائع کر دیا۔ میں نے ساتھ ہی انڈین ڈیفنس کی سیکرٹ سروسز کو تجویز پیش کی کہ آیندہ مجھے پولیس کی بجائے ملٹری انٹیلی جینس کی مدد فراہم کی جائے ورنہ پولیس کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ڈیفنس سیکرٹ سروس کے چیف سے فون پر بھی بات کی اور یہ ساری وضاحت بھی کی اور پولیس کی نا اہلی کے خلاف زبردست احتجاج بھی کیا میں نے چیف سے کہا۔

”سر! شکار ہماری جال میں آیا ہوا نکل گیا اور یہ سب کچھ پولیس کی غفلت کی وجہ سے ہوا ہے میں چاہوں گا کہ آیندہ مجھے ملٹری پولیس کی امداد فراہم کی جائے۔“

چیف نے کہا۔

”ہمیں معاملے کی سنگینی کا احساس ہے۔ تم نے اس بار بھی بڑی عمدہ کارکردگی کا ثبوت مہیا کیا تھا۔ لیکن پولیس پارٹی نے دیر کر دی اس دوران پاکستانی کمانڈو کو اطلاع ہوگئی اور وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔“

میں نے کہا۔

"سر! میں اب بھی نا امید نہیں ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان مفرور پاکستانی کمانڈوز کا سراغ لگا کر ہی رہوں گا۔ مجھے تھوڑی مہلت دی جائے۔"
چیف نے کہا۔

"تم جتنی چاہے مہلت لے لو۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ تم اس علاقے میں گھوم پھر کر ان پاکستانی جاسوسوں کا بھی سراغ لگاؤ جو ہمارے پرتھوی میزائل کا سراغ لگانے اور لانچنگ پوائینٹ کی پوری رپورٹ حاصل کرنے کے لیے مختلف بھیس بدل کر علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔"
میں نے کہا۔

"بھگوان نے چاہا تو میں بہت جلد ان پاکستانی جاسوسوں کا بھی سراغ لگا لوں گا۔ لیکن میں پھر زور دے کر کہوں گا کہ اس بار مجھے پولیس کی بجائے ملٹری پولیس کی امداد فراہم کی جائے۔"
چیف کی پر اعتماد آواز آئی۔

"ایسا ہی ہوگا۔ تم یہاں سے جوگی وال گاؤں میں جاؤ گے کیونکہ پرتھوی میزائیل کا خفیہ اڈہ وہیں ایک ویران ٹیلے کے اندر ہے۔ تمہیں لوکیشن میں نے سمجھا دی تھی تمہیں جس چیز کی جس وقت بھی ضرورت پڑے جالندھر سٹی پولیس کے ایس پی سے رجوع کر سکتے ہو۔ تمہیں ہر مطلوبہ چیز فوری طور پر فراہم کر دی جائے گی۔ باقی جالندھر سٹی پولیس پارٹی کے خلاف پوری محکمانہ کارروائی ہوگی۔"
میں یہ ٹیلی فون ایس پی ہرپال سنگھ کے آفس میں ہی بیٹھ کر رہا تھا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھا ساری گفتگو سن رہا تھا۔ جب میں نے فون ختم کیا تو میں نے دیکھا کہ ہرپال سنگھ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کہنے لگا۔

"سر! اس آپریشن کی ناکامی میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ تو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ہماری پولیس پارٹی کے ایک کانسٹیبل سے حماقت ہوگئی تھی اور اس کی بندوق اتفاقاً" چل پڑی تھی جس کی وجہ سے مفرور قیدی ہوشیار ہوگئے اور غار

سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"
میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"سردار جی! آپ حوصلہ رکھیں۔ آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔"

لیکن یہ بات میں ایک علیحدہ خط میں چیف سریندر کوہلی اور بال ٹھاکرے کو فوراً لکھ کر بھیج دی کہ جائے واردات پر پولیس پارٹی کی بندوق چل گئی تھی جس کی آواز سن کر غار میں چھپے ہوئے پاکستانی جاسوسوں کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تو اس خاص ہندو کانسٹیبل کو معطل کر دیا گیا اور ایس پی ہرپال سنگھ کا تبادلہ ہو گیا۔

اس کی جگہ دوسرے روز ایک ہندو ایس پی کرنال سے تبدیل ہو کر جالندھر آ گیا۔ اس کا نام کشور مہتہ تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ہرپال سنگھ کا تبادلہ کس وجہ سے ہوا ہے اور وہ میری خفیہ اور طاقت ور حیثیت سے بھی واقف تھا۔ چنانچہ مجھ سے ملتے ہی وہ کرسی پر سے ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کو تھوڑے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"مسٹر مہتہ! میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے یا میری خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں سے خوشامد کروانے نہیں آیا۔ میں بھارت سرکار کا ایماندار ورکر ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی ڈیوٹی ایمانداری اور اپنے کرتوے کو سامنے رکھتے ہوئے ادا کریں۔"

جالندھر سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر کا یہ نیا ہندو ایس پی بڑا کائیاں آدمی تھا۔ اس کا پورا نام سرون کشور مہتہ تھا۔ اس کا جسم دبلا تھا مگر بڑا چاق و چوبند تھا۔ اس کی آنکھوں میں پڑے حلقے ظاہر کرتے تھے کہ وہ شراب کا عادی ہے۔ بڑا باتونی تھا اور ہر قسم کے سرکاری افسر کو رام کرنا جانتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ میں دیانتداری اور فرض شناسی کی بات کر رہا ہوں تو فوراً اس نے مجھے سلیوٹ

کیا اور بولا۔

"مہاراج جی! میں کس قدر سوبھاگی ہوں کہ ایک عرصے کے بعد مجھے آپ ایسے بھارت ورش سپوت افسر کے ماتحت کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ مہاراج جی! بھگوان نے چاہا تو آپ کی ماتحتی میں پولیس کی ساری کرپشن ختم ہو جائے گی اور جالندھر پولیس ایک آدرش واری یعنی آئیڈیل پولیس بن جائے گی۔"

میں اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ آپ اپنی ڈیوٹی ادا کرتے جائیں۔ باقی میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا اور آپ بھی کچھ نہ سوچیں۔

میرا دائرہ کار وسیع ہو گیا تھا۔ مجھے ان پاکستانی جاسوسوں کا کھوج لگانا تھا جو بقول بھارتی سیکرٹ ایجنسی کے علاقے میں نصب شدہ پرتھوی میزائیلوں کے لانچنگ پوائینٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنا مشن ان میزائیلوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے انہیں پاکستان کے متعلقہ محکمے کو پہنچانا تھا۔ یہ میرا بطور ایک محب الوطن پاکستانی کے فرض تھا اور میں اس فرض کو اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی ادا کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ میزائیل جنہیں خفیہ فائیلوں میں پرتھوی میزائل کا نام دیا گیا تھا پاکستان کے شہروں لاہور' ملتان اور سیالکوٹ کو تباہ کرنے کے لیے لگائے جا رہے تھے۔ مجھے علی شاہ اور دوسرے کشمیری مجاہدوں نے بتا دیا تھا کہ یہاں کوئی پاکستانی جاسوس نہیں ہے۔ یہ سارا بھارت کا پروپیگنڈا اور اس کا خوف ہے۔ انڈیا میں تو اگر کوئی دیہاتی گائے بھینس چراتا غلطی سے بارڈر کراس کر کے بھارت میں داخل ہو کر پکڑا جاتا تھا تو بھارت کی پولیس اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر جیل میں بند کر دیتی تھی۔ علی شاہ نے مجھے کہا تھا کہ پاکستان کو یہاں اپنے جاسوس بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سارا علاقہ پاکستانی کی نگاہ میں ہے پاکستان کے پاس اس علاقے کے پورے نقشے موجود ہیں جس طرح بھارت ہمارے

علاقوں سے پوری طرح واقف ہے۔ دشمن کہیں کوئی میزائیلوں کا اڈہ بناتا ہے تو اس کی رپورٹ غیر ملکی ایجنسیوں کو فوراً ہو جاتی ہے اور اس طرح پاکستان کی سیکرٹ سروس کو بھی پتہ چل جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود میں پاکستان کے خلاف قائم کیے جانے والے پرتھوی میزائیلوں کے اڈے کی پوری معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ پاکستان کی سلامتی کا معاملہ تھا اور ہندو ہمارا وہ دشمن ہے کہ جس نے آج تک پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور وہ ہر لحہ پاکستان کو نعوذ باللہ تباہ کرنے کے منصوبے تیار کرتا رہتا ہے۔

میرے اس خفیہ مشن کا سوائے میری ذات کے اور کسی کو علم نہیں تھا لیکن جس مشن پر بھارت کے محکمہ دفاع کی سیکرٹ ایجنسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا یعنی پرتھوی میزائیل کے خفیہ اڈے کا سراغ لگانے کے لیے وہاں آتے ہوئے پاکستانی جاسوسوں کا کھوج لگانے اور انہیں گرفتار کروانے کا مشن' تو اس کی میری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ میں تو چاہتا تھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا پاکستانی کمانڈو اس علاقے میں آ نکلتا ہے تو میں پہلی فرصت میں اسے خطرات سے آگاہ کر کے وہاں سے کسی دوسرے علاقے میں بھجوا دوں گا۔

میرے اس مشن کے بارے میں جالندھر سٹی پولیس کے ایس پی کشور مہتہ کو سرکاری طور پر سب کچھ بتا دیا گیا تھا اور اسے حکم دیا گیا تھا کہ دھرم چند یعنی میری ہر ضرورت کو فوری طور پر پورا کیا جائے اور مشن کے راز کو بے حد خفیہ رکھا جائے۔ لیکن بھارت سرکار کی طرف سے مجھے دیے گئے مشن پر نکلنے سے پہلے میرے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ پہلے میں خود یہ معلوم کروں کہ پرتھوی میزائیلوں کا اڈہ کس مقام پر ہے اس کے اندر کیا ہے۔ کہاں لانچنگ پیڈ بنایا گیا ہے اور میزائیلوں کی رینج حقیقت میں کتنی دور تک ہے۔ یہ ساری معلومات میں پاکستان میں بٹ صاحب کو خفیہ کوڈ کے ذریعے پہنچانے کے لیے بے تاب تھا۔

لیکن میزائیلوں کے اڈے کا معائینہ کرنے کے لیے میں خفیہ ایجنسی کے خاص سیکرٹ نمبر T / L _ 211 کو استعمال کرنے کی بجائے محکمہ دفاع کی باقاعدہ اجازت حاصل کر کے وہاں جانا چاہتا تھا تاکہ محکمے کو یہ شک نہ گزرے کہ مجھے سیکرٹ نمبر دکھا کر میزائیلوں کے اڈے پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔

چنانچہ میں نے باقاعدہ ایک کیس بنا کر ڈیفنس سیکرٹ ایجنسی کے چیف سریندر کوہلی کو بھجوا دیا۔ اس نے اس میں لکھا کہ اپنا سیکرٹ مشن شروع کرنے سے پہلے میں میزائیلوں کے اڈے کا پورا معائینہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں یہ اطمینان کر سکوں کہ کوئی پاکستانی جاسوس کسی ورکر کی حیثیت سے میزائیلوں کے اڈے کے اندر گھسنے میں کامیاب تو نہیں ہوگیا۔ میں چونکہ پاکستان میں بھارتی قیدی کی حیثیت سے کافی دیر رہ چکا ہوں اس وجہ سے میں پاکستانی لوگوں کے چہرے مہرے پہچان لیتا ہوں۔ چوتھے روز دلی سیکرٹریٹ سے میرے خط کا جواب آ گیا۔ یہ خط ڈیفنس سیکرٹ چیف سریندر کوہلی کی طرف سے میرے نام لکھا گیا تھا۔ اس میں میری تجویز کو پسند کیا گیا تھا۔ اور کہا گیا تھا کہ تم جب اور جس وقت چاہو میزائیلوں کے اڈے کا معائینہ کر سکتے ہو۔ ساتھ ہی پرتھوی میزائیل سینٹر کے انچارج بریگیڈیر شیاما پرشاد کے نام ایک خط بھی منسلک تھا۔ اس خط کی ایک نقل بریگیڈئر شیاما پرشاد کو بھی بھجوا دی گئی تھی۔ خط میں انڈین ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے بریگیڈئر کو ہدایت کی گئی تھی کہ نمبر T / L _ 211 کے سیکرٹ آفیسر دھرم چند کو میزائیلوں کے لانچنگ پوائنٹ میں آنے اور معائینہ کرنے کی اجازت دی جائے یہ خط پڑھ کر میں بڑا خوش ہوا۔

میں نے یہ خط ایس پی مہتہ کو دکھایا اور کہا کہ میرے لیے پرتھوی میزائیل سنٹر جانے کا فوری انتظام کیا جائے اسی وقت ایک سٹیشن ویگن آ گئی۔ اس میں ایک ڈرائیور پہلے سے بیٹھا میرے اشارے کا منتظر تھا۔ یہ ڈرائیور خفیہ پولیس کا آدمی تھا اسے میزائیلوں کے اڈے کی صحیح لوکیشن کا پتہ تھا۔ میں اس وقت کھدر کے

کرتے پاجامے میں ملبوس تھا اوپر میں نے گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ کیونکہ پنجاب
میں سردیوں کا موسم اب شروع ہو چکا تھا۔ خفیہ پولیس کی گاڑی جالندھر شہر سے
نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ جی ٹی روڈ پر کوئی بیس تیس کلومیٹر
سفر کرنے کے بعد گاڑی ایک جگہ کچی سڑک پر مڑگئی۔ یہاں سے دیہات کا علاقہ
شروع ہو جاتا تھا۔ ہم کئی دیہات کے قریب سے گزرے۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ
پرتھوی میزائیلوں کا خفیہ اڈہ جوگی وال گاؤں کے آس پاس ہی ہے۔ میں نے
ڈرائیور سے پوچھا۔

”جوگی وال گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟“

وہ بولا۔

”سر دس پندرہ میل ہوگا۔ ہم اس طرف جا رہے ہیں سر۔“

کچھ دیر بعد بائیں جانب ایک اونچے ٹبے پر مجھے ایک گاؤں نظر آیا جو
درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ جوگی وال گاؤں ہے۔ یہاں سے
اس نے گاڑی دائیں جانب ایک ویران میدان میں ڈال دی۔ اس میدان کی
زمین سیم تھور زدہ تھی۔ کوئی کھیت نہیں تھا۔ گاڑی پندرہ بیس منٹ تک اس
تھور زدہ میدان میں چلتی رہی۔ میں نے سامنے نگاہ ڈالی تو ایک اونچا ٹیلہ دکھائی
پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ ٹیلہ ہے جس کے اندر بھارت نے میزائیلوں کا اڈہ
قائم کیا ہوا ہے اور لانچنگ پیڈ بھی اسی ٹیلے میں کنوئیں کی شکل میں ہے۔
ڈرائیور خاموشی سے گاڑی ٹیلے کی طرف لے جا رہا تھا۔

ٹیلے کے قریب پہنچے تو وہاں دس فٹ اونچی خاردار تار والی دیوار تھی جس
نے سارے ٹیلے کو اپنے احاطے میں لے رکھا تھا۔ خاردار تار کو درختوں کی
جھاڑیوں اور جنگلی بیلوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ابھی ہم اس دیوار سے کچھ
فاصلے پر ہی تھے کہ ایک جانب درختوں کے پیچھے سے تین فوجی جوان نکل کر
سامنے آ گئے۔ ان کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ جن کا رخ گاڑی کی طرف تھا۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک
دی۔ وہ فوجی جوان جس نے گاڑی رکوائی تھی تیز تیز چلتا میری کھڑکی کے پاس آ
گیا۔ دوسرے دو فوجی پوزیشن لیے کھڑے رہے۔ فوجی کے کاندھے پر لیفٹیننٹ کا
نشان تھا۔ اس نے پوچھا۔

"اس طرف کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں سرکاری افسر ہوں اور مجھے تمہارے آفیسر کمانڈنگ بریگیڈیر شیاما
پرشاد سے ملنا ہے۔ میرا نام دھرم چند ہے۔"

اس فوجی جوان کو شاید کمانڈنگ آفیسر کی طرف سے بتا دیا گیا تھا کہ اس نام
کا ایک آدمی آئے گا اسے اندر آنے دیا جائے اس کے باوجود بھارتی لیفٹیننٹ
نے مجھ سے میرا آئی ڈی کارڈ طلب کیا اور کہا۔

"آپ کے پاس دھرم چند ہونے کا کوئی ثبوت موجود ہونا چاہیے۔"

میں نے بھارت سرکار کی طرف سے دیا ہوا سیکرٹ طلسمی نمبر اسے نہ
دکھایا۔ اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے لیفٹننٹ رینک کے اس فوجی کو اس نمبر کی
طاقت کا اندازہ نہ ہو اور اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس نمبر کی کیا اہمیت ہے میں
نے کہا۔

"ہم یہاں گاڑی میں بیٹھے ہیں تم گیٹ پر سے بریگیڈیر صاحب کو ٹیلی فون
کر کے بتاؤ کہ دھرم چند دلی سے آیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے تھیلے میں سے ڈیفنس سیکرٹ سروس کے
چیف کا سرکاری اجازت نامہ نکال کر دکھایا۔ لیفٹننٹ خط کو غور سے دیکھتا رہا۔
پھر خط اس نے مجھے واپس کر دیا اور بولا۔

"آپ لوگ یہاں ٹھہریں۔"

وہ ٹیلے کی جانب چل دیا۔ دونوں فوجی جوان سٹین گنیں ہماری طرف کیے

اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ کوئی چھ سات منٹ کے بعد انڈین آرمی کا لیفٹیننٹ
واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"اوکے سر! آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ آگے جا کر بائیں طرف گھوم جائیں
گیٹ پر سرکاری اجازت نامہ دکھا دیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہماری گاڑی ذرا آگے جا کر بائیں جانب
خاردار دیوار میں بنے ہوئے گیٹ کے سامنے جا کر رک گئی۔ گیٹ بند تھا۔ اند
کی جانب ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ وہاں سے ایک فوجی ڈبل مارچ کرتا آیا
دروازے کے ذیلی دروازے میں سے نکل کر گاڑی کے پاس آ کر بولا۔

"سر! اپنا آئی ڈی کارڈ دکھائیں۔"

میں نے سرکاری خط جو چھوٹی سی فائیل میں لگا ہوا تھا اس کے آگے کر
دیا۔ اس نے خط کو غور سے دیکھا پھر دوڑ کر خاردار تار والے دروازے کو ایک
طرف سے کھول دیا۔ ہماری گاڑی اندر چلی گئی۔ اس جانب ٹیلے کے دامن میں
ایک لمبی سی بیرک بنی ہوئی تھی۔ بیرک پر خاموشی چھائی تھی۔ کوئی انسان نظر
نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"سامنے والی بارک کے پاس گاڑی کھڑی کر دو۔"

پارک کی ایک جانب ہماری گاڑی کھڑی ہوئی تو پارک کے اندر سے ایک
ملٹری پولیس کا حوالدار ڈبل سے ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے جھک کر کھڑکی میں
سے مجھے دیکھا اور بولا۔

"دھرم چند۔"

میں نے کہا۔

"یس جوان آئی ایم دھرم چند۔"

وہ مجھے ٹیلے کی دیوار کی طرف لے گیا۔ وہاں اونچی اونچی جھاڑیاں اگی ہوئی
تھیں۔ ڈرائیور گاڑی میں تھا۔ جھاڑیوں کے آگے ٹیلے کی دیوار میں لوہے کا

گیٹ تھا جو بند تھا اور جس کے آگے دو فوجی سٹین گنیں لیے اٹن شن کھڑے تھے۔ میرے ساتھ جو فوجی آیا تھا اس نے اشارہ کیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول دیا گیا۔ دروازے کے اندر چھوٹی سی پختہ سیمنٹ کی بنی ہوئی ڈیوڑھی تھی۔ یہاں کونے میں مشین گن کی پوسٹ تھی۔ ایک جانب نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ میرا گائیڈ بھارتی فوجی مجھے سیڑھیوں سے اترتا ہوا نیچے ایک کمرے کے دروازے پر لے آیا اور بولا۔

"سی او صاحب کا یہی کمرہ ہے۔"

یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔ میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا بند دروازے کے باہر کسی فوجی افسر کی نیم پلیٹ وغیرہ نہیں لگی ہوئی تھی۔ کال بیل کا بٹن بھی نہیں تھا۔ کوئی چپڑاسی اردلی بھی باہر نہیں تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا۔ پھر میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے ایک با رعب مردانہ آواز آئی۔

"کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"دھرم چند سر!"

"اندر آ جاؤ' دروازہ کھلا ہے۔"

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ چھوٹے سے کمرے میں دیواروں پر چارٹ لٹک رہے تھے۔ تکونی میز کے پیچھے ایک سانولے رنگ کا بڑی بڑی مونچھوں والا بریگیڈیر رینک کا مضبوط جسم والا فوجی بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تم ہی دھرم چند ہو؟"

میں نے کہا۔

"یس سر! میں ہی دھرم چند ہوں۔"

اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کہنے لگا۔
"ہم اس قسم کی انسپکشن کے عادی نہیں ہیں یہ انتہائی نازک میزائیل سنٹر ہے لیکن ہمیں سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کی طرف سے تمہارے بارے میں جو خط وصول ہوا ہے اس کے آگے ہم مجبور ہیں لیکن تمہیں اپنی شناخت کروانی ہو گی۔"
میں نے کہا۔
"کیا آپ کے پاس میری فوٹو نہیں پہنچی؟"
"نہیں۔" بریگیڈیر نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
میں نے کہا۔
"تو پھر میری شناخت کیسے ہو سکتی ہے؟"
بریگیڈیر نے سوال کیا۔
"کیا تمہارے پاس کوئی خفیہ نمبر نہیں ہے؟۔"
میں اپنا طلسمی نمبر دکھانے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے کہا۔
"مجھے کاغذ پنسل دیجئے میں اپنا خفیہ نمبر آپ کو لکھ کر بتائے دیتا ہوں۔"
بریگیڈیر نے ایک سادہ کاغذ اور بال پوائینٹ میرے آگے کر دیا۔ میں نے اس پر اپنا سیکرٹ نمبر 211 _ T / L لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ نمبر دیکھتے ہی اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر احتراماً" سلام کیا اور بولا۔
"سر! آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہم ڈیفنس ہیڈ کوارٹر کی ہدایات پر پورا پورا عمل کریں گے۔ فرمائیے آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"
وہ تم سے آپ پر آ گیا تھا۔ یہ اس خفیہ نمبر کا کمال تھا۔ میں نے کہا۔
"میں سب سے پہلے تو یہاں کے عملے کو ایک نظر دیکھ کر یہ تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری سرکار کے اتنے حساس ادارے ہیں کوئی پاکستانی جاسوس تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ دوسرے میں لانچنگ پیڈ اور میزائیل فائرنگ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔"

بریگیڈیر نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور ہم ایک لفٹ میں بیٹھ گئے جو ٹیلے کے اندر زمین کے نیچے چار منزلوں تک جا کر رک گئی۔ لفٹ سے باہر نکلے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جہاں دیواروں پر مختلف ڈائیل نصب ہیں۔ پچاس ساٹھ کے قریب آدمی سفید لباس پہنے مختلف کمپیوٹروں کے آگے بیٹھے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بریگیڈیر کو دیکھ کر کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے رہے میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا چلا گیا۔

پورے ہال کمرے کا چکر لگانے کے بعد بریگیڈئر نے مجھ سے پوچھا۔
"کیا آپ نے ان لوگوں کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے۔"
میں نے کہا۔
"سرسری نظر سے دیکھ لیا ہے اب میں لانچنگ پیڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
بریگیڈئر لمبے کونے والے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک کالے رنگ کا کمزور جسم والا ادھیڑ عمر آدمی چشمہ لگائے بیٹھا ایک نقشہ سامنے کھولے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر پاکستان کا بہت بڑا نقشہ لگا ہوا تھا۔
بریگیڈئر نے میرا اس سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔
"مسٹر گھوش سے ملیں۔ یہ میزائیل انجینئر ہیں یہ آپ کو پرتھوی میزائیلوں کا لانچنگ پیڈ دکھائیں گے۔"
یہاں سے میں بنگالی انجینئر مسٹر گھوش کے ساتھ ہو گیا۔ وہ مجھے ایک لفٹ کے ذریعے زمین کے مزید دو منزلیں نیچے لے گیا۔ یہاں ایک اونچی چھت والی روشن سرنگ بنی ہوئی تھی سرنگ کی پتھر کی دیواروں پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور نیلے اور زرد رنگ کے موٹے تار آگے پھیلے جا رہے تھے۔ سرنگ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوجی سیکورٹی گارڈ کے جوان پہرہ دے رہے تھے۔ سرنگ کے آخر میں ایک فولادی دروازہ تھا۔ دروازہ کے باہر چھوٹا سا کیبن تھا۔ کیبن میں ایک فوجی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ مسٹر گھوش نے اپنا شناختی کارڈ مشین میں ڈال کر اپنی شناخت کرائی اور میرے بارے میں کہا۔

"یہ پرتھوی راج چوہان کے آدمی ہیں۔"

یہ ان کا کوئی خاص کوڈ ورڈ تھا۔ پرتھوی میزائیل کا نام بھی ایک لحاظ سے پرتھوی راج چوہان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جو ہندو راجپوتوں کا ہیرو ہو گزرا تھا اور جس کو محمود غزنوی نے عبرتناک شکست دی تھی۔ یہ سن کر کیبن کے اندر بیٹھے سیکورٹی گارڈ نے ایک بٹن دبایا بٹن کے دبانے سے فولادی دروازہ آہستہ آہستہ ایک طرف کو دیوار کے اندر سرکتا چلا گیا۔ میں مسٹر گھوش کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ یہ میزائیل کا لانچنگ پیڈ تھا۔ یہ گول دیواروں والا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک پینل تھا۔ جس پر دس بارہ ڈائیل نصب تھے۔ یہاں سرخ نیلی اور زرد بتیاں روشن تھیں۔ ایک دراز قد آدمی سفید لباس پہنے ہماری طرف بڑھا۔ مسٹر گھوش نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ میزائیل کنٹرولر مسٹر چکرورتی ہیں۔"

مسٹر چکرورتی نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر بادل نخواستہ مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسٹر گھوش سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سر! مجھے بریفنگ نہیں دی گئی یہ صاحب یہاں کس لیے آئے ہیں۔"

اتنی دیر میں کونے میں دیوار کے ساتھ لگے ٹیلی فون کی سرخ بتی جلنے بجھنے لگی۔ مسٹر چکرورتی میزائیل کنٹرولر نے لپک کر ریسیور کان سے لگا کر انگریزی میں اپنا کوڈ ورڈ بتایا وہ چند سیکنڈ تک باتیں کرتا رہا۔ پھر ہمارے پاس آکر مسٹر گھوش سے کہنے لگا۔

"بریگیڈئر صاحب نے مجھے فون پر بریف کر دیا ہے۔"

پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"میرے ساتھ آ جائیں مسٹر دھرم چند جی۔"

ہم اس کمرے سے نکل کر ایک اور کمرے میں آ گئے۔ یہ اس سے بھی چھوٹا اور گول کمرہ تھا۔ یہ کمرہ ایک کشادہ کنوئیں کی طرح تھا۔ اس کے درمیان

ں ایک بہت بڑا میزائیل نصب تھا اس میزائیل کا رنگ کیسری تھا جو سورج کا
رنگ ہے اور جو ہندوؤں میں مقدس سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ لوگ سورج دیوتا کی
ستش کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ میزائیل کی ایک جانب ہندی اور دوسری جانب
گریزی میں پرتھوی کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ گول دیوار پر ایک جانب مختلف
ائیل لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ذرا اوپر کر کے تین بلور کے بڑے بٹن
لگے ہوئے تھے۔ مسٹر گھوش نے مجھے بتایا کہ ان تینوں کا تعلق میزائیل کے فائر
رنے سے ہے۔ پہلا بٹن زرد ہے جس کے جلنے پر الرٹ کا سگنل ملے گا۔ دوسرا
ن سبز ہے جس کے جلنے پر ہمیں آرڈر ہے کہ ہم میزائیل فائر کرنے والے بٹن
اپنی انگلی رکھ دیں۔ اس کے بعد جب سرخ بٹن جلے گا تو ہم میزائیل فائر کر
یں گے۔

میں نے ظاہرا" طور پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہمارے دشمن پاکستان کا ایک شہر جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

یہ جملہ میں نے ایسے ادا کیا تھا جیسے کوئی کڑوی گولی نگلتا ہے اس وقت دل
ں میں نے کہا تھا کہ کافرو! وہ وقت کبھی نہیں آئے گا اس سے پہلے کہ تم سرخ
ن دباؤ تمہارا یہ میزائیلوں کا اڈہ آگ کے دھماکہ خیز شعلوں کی نظر ہو چکا ہو گا۔
ں نے میزائیل کنٹرولر سے پوچھا۔

"بھگوان نہ کرے یہ میزائیل لانچنگ پیڈ پر تو نہیں پھٹے گا؟۔"

میزائل کنٹرولر اور مسٹر گھوش مسکرانے لگے۔ مسٹر گھوش نے کہا۔

"ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

وہ مجھے پرتھوی میزائیل کے قریب لے گیا۔ اس میزائل کی گولائی میں
ین سے کوئی چار فٹ کی اونچائی پر ایک میٹر لگا ہوا تھا۔ اس میٹر کے آگے شیشہ
ا تھا شیشے میں سے مجھے سرخ رنگ کی ایک ہتھی نظر آ رہی تھی یہ ہتھی باہر کو
ی ہوئی تھی۔ مسٹر گھوش کنے لگا۔

"یہ ہتھی ہمارے میزائیل کا سیفٹی والو ہے۔ اس وقت یہ ہتھی باہر
ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس میزائیل کو اگر آگ بھی لگا دی جائے
زمین پر لٹا کر ہتھوڑوں سے بھی کوٹا جائے تب بھی یہ میزائیل نہیں چلے
لیکن جب اس کی سیفٹی والو والی ہتھی اندر کو دبا دی جائے گی تو یہ صرف
سرخ بٹن دبانے سے فائر ہو جائے گا۔ چنانچہ ہنگامی صورت حال میں پہلا
سگنل ملنے پر ہم اس کی ہتھی کو اندر کر دیں گے تا کہ اس کا سیفٹی سسٹم خ
جائے اور یہ بٹن دبانے سے دشمن کے ٹارگٹ پر فائر کیا جا سکے۔"

میں نے مسٹر گھوش سے سوال کیا۔

"اگر فرض کر لیں کہ دشمن کا کوئی جاسوس یہاں گھس کر یہ سیفٹی
نکال کر لے جاتا ہے تو کیا اس صورت میں یہ میزائیل بیکار نہیں ہو جائے گا۔

اس پر میزائیل کنٹرولر نے جواب دیا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میزائیل بے کار نہیں ہوگا صرف اتنا فرق پڑ
کہ میزائل فائر کرنے میں آدھا گھنٹے کی دیر لگ جائے گی کیونکہ اس کے و
سسٹم کو اون کرنے میں آدھا گھنٹہ ضرور لگ جائے گا۔"

میں نے یہ ساری تفصیلات اپنے ذہن میں بٹھا لیں۔ میرے ذہن میں ا
طور پر ان میزائیلوں کو تباہ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا لیکن میں اس منصو
کسی وقت عمل کرنے کی سکیم تیار کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ میزائیل میرے وطن
شہروں کو تباہ کرنے کے لیے لگایا گیا تھا اور اس کو تباہ کرنا میرے لیے
ضروری تھا۔ اس کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ ابھی ہم نے کتنے میز
تیار کر رکھے ہیں۔ میں نے بڑے جوش میں آ کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ بھارت ماتا کے آورش کو پھر سے زندہ کروں
پاکستان کے کم از کم سارے بڑے شہروں کو ایک ہی حملے میں تباہ کر دیا جائے۔

مسٹر گھوش مجھے ساتھ لے کر لانچنگ پیڈ سے نکل کر دوسرے کمرے

ا۔ کہنے لگا۔

"ابھی ہم نے صرف یہ ایک ہی میزائیل تیار کیا ہے۔ اس پر بڑی رقم
ہ ہوتی ہے۔ ہماری سرکار کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں لیکن ہماری یوجنا ہے
ہم آنے والے سال میں اس قسم کے تین میزائیل اور تیار کر لیں گے تاکہ
ان کے چار شہروں کو ایک ہی وقت میں نشانہ بنا کر تباہ کر دیا جائے۔ ان چار
وں کی تباہی کے بعد پاکستان گھٹنے ٹیک دے گا۔"

میں نے اپنے دل میں مسٹر گھوش کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا یہ منحوس خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔"

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ پاکستان اپنے دشمن کے جارحانہ
م سے غافل نہیں تھا۔ اس کا ایک معمولی سا مگر بڑا جامع ثبوت یہ تھا کہ ابھی
ت نے ایک ہی میزائیل تیار کیا تھا اور اس کو تباہ کرنے والا ایک محب
ن پاکستانی اس میزائیل کے پاس کھڑا تھا اور خود بھارتی میزائیل کنٹرولر اسے
کل کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔

چکرورتی جو میزائیل کنٹرولر تھا اور جس کی ڈیوٹی دن کے وقت میزائیل
امیں آٹھ گھنٹے تک ہوتی تھی۔ پندرہ دن وہ دن کی ڈیوٹی دیتا تھا اور پندرہ
رات کی ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ میں نے اس دراز قد منحنی جسم والے بنگالی کو اپنے
ٹ کے طور پر منتخب کر لیا۔ کچھ دیر بعد میں بریگیڈئر کے کمرے میں اس کے
ا بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ جب اس نے مجھ سے میزائیل سنٹر کے سیکورٹی سسٹم
ارے میں پوچھا تو میں نے ہندو بن کر بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"بریگیڈئر صاحب! اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ہم بھارت ماتا کے ٹوٹے
بازو کو پھر سے جوڑ سکیں گے اور بہت جلد ہمارا پورے پاکستان پر قبضہ ہو
گا۔ جہاں تک میزائیل کے سیکورٹی سسٹم کا تعلق ہے اس سے میں بالکل
ہوں اور میں کل ہی آپ لوگوں کے بارے میں بڑی اچھی رپورٹ لکھ

کر دلی سیکرٹریٹ روانہ کر رہا ہوں۔"

بریگیڈئر بڑا خوش ہوا اور بسکٹوں کی پلیٹ میرے آگے کرتے ہوئے بو

"یہ بسکٹ بھی لیجئے۔ میرا ایک دوست یہ ہالینڈ سے لایا تھا۔"

میں نے بریگیڈئر سے کہا۔

"ابھی تک تو مجھے میزائیل سینٹر کے عملے کے کسی آدمی پر کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن کچھ عرصہ مجھے ڈیفنس انٹیلی جنیس اور آپ کی بڑی ہائی کما حکم کے مطابق ان لوگوں کی کڑی نگرانی کرنی ہوگی اس کے لیے مجھے ہو کبھی ان کے دن کے وقت اور کبھی رات کے وقت اچانک میزائیل سنٹر پڑے۔ چنانچہ آپ ایسا انتظام کر دیجئے کہ مجھے ہر بار سیکورٹی سسٹم کے چکر پڑنا پڑے۔ کیوں کہ کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی پیدا ہو سکتی ہے۔ جس میرا فورا" میزائل سینٹر پہنچنا ضروری ہوگا۔"

بریگیڈئر شیاما پرشاد سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"نو پرابلم! آپ تو ہماری سنٹرل سیکرٹ سروس کے اہم ترین آفیس میں آپ کو ایک کوڈ ورڈ لکھ دیتا ہوں۔ اسے یاد بھی کر لیں آپ یہ بول کر اور دکھا کر جس وقت چاہیں خواہ رات ہو یا دن میزائیل سینٹر میں ہو سکیں گے یہ ایک طرح سے انتہائی خفیہ پاس ورڈ ہے۔"

بریگیڈئر نے مجھے یہ پاس ورڈ کاغذ پر لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا ہندی میں چار لفظ لکھے تھے۔

"کالیداس کی شکنتلا آئی ہے۔"

میں اسے پڑھ کر ہنس دیا۔

"بریگیڈئر صاحب آپ نے بڑا رومانٹک کوڈ ورڈ رکھا ہے۔ کوئی د ورڈ آپ کو نہیں ملا؟"

برگیڈئر سگریٹ کی راکھ کو ایش ٹرے میں گراتے ہوئے بولا۔

"پاس ورڈ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے جو بہت کم کسی کے دماغ میں آ سکے۔ مثلاً" ہم رکھنے کو جے کالی ماتا اور جے بجرنگ بلی کو بھی پاس ورڈ کے طور پر رکھ سکتے تھے لیکن یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہمارے بھارت ورش میں تقریباً" ہر تیسرے ہندو کی زبان پر ہوتے ہیں آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

میں نے کافی کا گھونٹ بھر کر پیالی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میں بالکل سمجھ گیا ہوں۔ لیکن احتیاط کے طور پر آپ کو پاس ورڈ کو کچھ عرصے کے بعد بدل دینا چاہیے۔"

بریگیڈئر کہنے لگا۔

"آپ سینٹرل انٹیلی جینس کے تجربہ کار افسر ہیں یہ بات آپ کے ذہن میں ہی آ سکتی تھی ہم ہر تین ماہ بعد پاس ورڈ بدل دیتے ہیں۔"

"ویری گڈ" میں نے خوش ہو کر کہا۔

میں مزید کچھ دیر بریگیڈئر کے پاس بیٹھا انڈین آرمی کی فوجی تیاریوں کی تعریف کرتا رہا اور دل پر پتھر رکھ کر کچھ باتیں پاکستان کے خلاف بھی کہیں۔ یہ میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ میں آپ کو بتا دوں کہ میں نے اسی وقت اس میزائیل کو اس کے سارے ساز و سامان اور عملے سمیت تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا یہ منصوبہ اتنا آسان نہیں تھا۔ میزائیل کو میں بڑی آسانی سے تباہ کر سکتا تھا لیکن میرا اصل منصوبہ یہ تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی میزائیل سینٹر کی تباہی کا مجھ پر شک نہ پڑے۔ اس سے پہلے میں دو بار کشمیری مجاہدین کو پولیس کے چنگل سے فرار کروا چکا تھا۔ اب میں بڑی ہوشیاری سے اور بڑی عقل مندی سے باقاعدہ سکیم بنا کر اس منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ جس کا میرے ذہن میں ایک خاکہ تیار ہو چکا تھا۔ میں نے بریگیڈئر سے اجازت لے کر میزائیل سینٹر سے باہر آ کر دور کھڑی پولیس کی گاڑی میں بیٹھا اور جالندھر سٹی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہیڈ کوارٹر میں آتے ہی ایس پی مہتہ سے کہا۔

"پرتھوی میزائیل کو دیکھ کر جی خوش ہوگیا ہے۔ اب مجھے پورا وشواش ہے کہ پاکستان بہت جلد اکھنڈ بھارت کا حصہ بن جائے گا۔"

ایس پی مہتہ خوش ہو کر بولا۔

"مہاراج جی! ہم لوگوں نے تو پاکستان کو ختم کرنے کا شروع ہی سے فیصلہ کر رکھا ہے بلکہ اس فیصلے پر عمل بھی کر رہے ہیں ہماری پالیسی تو چانکیہ جی کی پالیسی ہے کہ اوپر اوپر سے شانتی اور اہنسا کی باتیں کرو۔ ڈیموکریسی کی باتیں کرو اور اندر اندر پاکستان کی جڑیں کاٹتے چلے جاؤ اور ہمارے پرتھوی میزائیل تو پاکستان کو ایک ہی وار میں ختم کر دیں گے۔"

"جے ہند۔"

میں نے جوش میں آ کر کہا۔

ایس پی مہتہ بولا۔

"مہاراج جی! اب لنچ کا بھوجن میرے ساتھ ہوگا۔ ہم آدرش ریسٹورنٹ میں لنچ کریں گے۔ آپ ویشنو ہیں مجھے معلوم ہے۔ آدرش ریسٹورنٹ میں جو سبزیاں ترکاریاں بنتی ہیں جالندھر کیا سارے پنجاب میں کہیں نہیں بنتیں۔"

میں نے کہا۔

"پہلے مجھے بمبئی بال ٹھاکرے جی کو ایک ضروری فون کرنا ہے اس کے بعد آپ سے بات ہوگی۔"

ایس پی مہتہ نے قدرے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"مہاراج جی! خیر خیریت تو ہے ناں؟۔"

میں نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے ٹھاکرے جی سے اپنی ایک بات کرنی ہے۔"

ساتھ والے چھوٹے کمرے میں تین چار ٹیلی فون پڑے تھے۔ میں نے اس کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا اور بال ٹھاکرے نے مجھے جو اپنا خفیہ نمبر بتایا تھا بمبئی شہر کا کوڈ ملا کر وہ نمبر ڈائیل کیا تو دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اپنے سیکرٹ مشن پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے ازلی دشمن بھارت نے پاکستان پر کاری ضرب لگانے کے واسطے اپنا میزائیل تیار کر کے لگا دیا تھا۔ میں اس میزائیل کو سب سے پہلے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر گھنٹی بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسور اٹھا کر کہا۔ "کون ہے؟"

یہ بال ٹھاکرے کا انداز اور اس کی آواز تھی۔ وہ فون سنتے وقت کبھی ہیلو نہیں کہتا تھا بلکہ یہی کہتا تھا کون ہے؟ یہ بھی اس کی رعونت کی ایک مثال تھی۔ میں نے کہا۔

"سینا پتی جی! میں ہوں آپ کا سیوک دھرم چند۔"

بال ٹھاکرے نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"ہاں دھرم چند! کہو کیا بات ہے؟۔"

میں یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کر رہا تھا۔ میں اپنی سکیم کے پہلے مرحلے میں انتہائی سیاست کاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے داخل ہوا تھا۔ میں نے ڈیفنس انٹیلی جینس کے سریندر کوہلی کو بیچ میں سے نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور براہ راست بال ٹھاکرے سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے انتہائی خوشامدانہ لیکن بڑے ذمے دارانہ انداز میں کہا۔

"سینا پتی جی! میں آج جالندھر کے پاس جوگی وال والے پرتھوی میزائیل سنٹر میں گیا تھا۔"

بال ٹھاکرے نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟ وہاں سب ٹھیک ہے ناں؟"

میں نے کہا۔

"سر ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن میزائیل سنٹر کے سٹاف سے ملنے کے بع
مجھے ایک آدمی کی نقل و حرکت پر کچھ شک سا پڑا ہے۔"
"کس قسم کا شک؟ کھل کر بات کرو۔"
بال ٹھاکرے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ میں نے فوراً کہا۔
"سینا پتی جی! باقی کا سارا سٹاف بالکل ٹھیک ہے اور ان میں دیش بھگتی
جذبہ بھی ہے لیکن ایک آدمی پر مجھے شبہ ہے کہ وہ پاکستان کا ایجنٹ ہے۔"
یہ سن کر بال ٹھاکرے کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ مجھے جھڑکتے ہوئے بولا۔
"تم نے اسے گرفتار کیوں نہیں کرایا؟ ہمارے اتنے امپارٹنٹ اور ڈیفنس
کے اتنے سیکرٹ میزائیل سنٹر میں پاکستان کا ایجنٹ موجود ہو۔ میں تو ان سب
ڈس مس کرا دوں گا۔ مجھے اس کا نام بتاؤ کون ہے وہ؟۔"
میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔
"سر! اس کا نام مسٹر چکرورتی ہے اور وہ میزائیل کنٹرولر ہے۔"
بال ٹھاکرے نے گرج کر کہا۔
"میں اس کو ابھی گرفتار کرواتا ہوں۔ میں ہاٹ لائن پر پردھان منتری س
بات کرتا ہوں۔"
میں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"سر بھگوان کے لیے ایسا نہ کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس پر محض
ہلکا سا شک ہی پڑا ہے۔ میں اس کے پیچھے لگ گیا ہوں پہلے مجھے پورا کھوج لگا لین
دیجئے اگر مجھے یقین ہوگیا کہ اس کا پاکستان سے کوئی تعلق ہے تو پھر میں اس کی
چوبیس گھنٹے نگرانی کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس کے دوسرے
ساتھی اور پاکستانی ایجنٹ یہاں کہاں کہاں پر ہیں۔ اگر ہم اس وقت چکرورتی کو
پکڑیں تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کے ساتھی پاکستانی ایجنٹ فوراً روپوش
ہو جائیں گے اور اگر پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران ٹارچر سے مسٹر چکرورتی نے

پاکستانی ایجنٹوں کے نام بتا بھی دیے تو ہم انہیں گرفتار نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ وہ تو مسٹر چکرورتی کی گرفتاری کا سنتے ہی فرار ہو چکے ہوں گے۔ سینا پتی جی! ہمیں بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مسٹر چکرورتی کی نگرانی کروں' اسے نگاہوں میں رکھوں۔ وہ جہاں جہاں جاتا ہے جس جس کو ملتا ہے اس کی خبر رکھوں اور یہ ساری رپورٹیں آپ کو بھیجتا رہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران اگر یہ ثابت ہوگیا کہ مسٹر چکرورتی پاکستانی ایجنٹ ہے تو پھر یقین کریں چکرورتی کی گرفتاری سے پہلے میں اس کے ساتھی پاکستانی جاسوسوں کو ہتھکڑیاں لگوا چکا ہوں گا۔"

بال ٹھاکرے بڑے تحمل اور صبر سے میری لمبی بات سنتا رہا تھا۔ حالانکہ یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی کو بھی بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر چونکہ یہ معاملہ بھارت ورش کی سلامتی کا تھا اور بال ٹھاکرے چاہے مسلمانوں کا جانی دشمن کیوں نہ ہو مگر اپنے ملک بھارت کا سچا پرستار تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن اگر اس دوران چکرورتی نے ہمارے میزائیل سینٹر کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟۔"

میں نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

"سر! اس کی میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ وہ جوگی وال میزائیل سینٹر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ وہ چوبیس گھنٹے میری نگاہوں میں ہوگا اور اس کی تمام نقل و حرکت میری نگاہوں میں ہوگی۔ اگر اس نے کوئی ایسا نقصان دہ قدم اٹھانا چاہا تو وشواش رکھیں مجھے پہلے پتہ چل جائے گا اور میں اسے گرفتار ہی نہیں کراؤں گا بلکہ وہیں گولی مار دوں گا۔"

بال ٹھاکرے کچھ دیر خاموش رہا۔ میں سمجھا شاید وہ ریسیور رکھ کر کسی طرف چلا گیا ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"سینا پتی جی۔"
بال ٹھاکرے کی بھاری آواز آئی۔
"میں سن رہا ہوں دھرم چند! تو پھر یہ تمہاری ذمے داری ہے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو اس کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"
میں نے یقین کے ساتھ کہا۔
"سر جی! وہ وقت ہی نہیں آئے گا وشواش رکھیں وہ وقت ہی نہیں آئے گا۔"
بال ٹھاکرے نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"ٹھیک ہے تم اس حرام خور غدار کی نگرانی جاری رکھو۔ اس کی ایک ایک حرکت کی مجھے فل رپورٹ دیتے رہو۔ میں اپنے طور پر ایک بیان بھی جاری کر دوں گا کہ پاکستان کے ایجنٹ ہماری دفاعی اداروں میں گھس آئے ہیں اور ہماری سرکار بھنگ پی کر سو رہی ہے۔"
میں یہی چاہتا تھا۔ بال ٹھاکرے کے اس بیان سے دلی سیکرٹریٹ میں ڈیفنس کے محکمے میں ایک بار تو کھلبلی مچ جائے گی اور ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سریندر کوہلی میرے آگے پیچھے پھرنے لگے گا۔ اس طرح سے میرے ہاتھ مزید مضبوط ہو جائیں گے اور میرے لیے جوگی وال پر تھوی میزائیل سینٹر میں آزادانہ اور دن رات کسی بھی وقت آنے جانے میں مزید آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور میں میزائیل کی تباہی کے مشن کے ٹارگٹ کو آسانی سے مار لوں گا اور مجھ پر کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا۔ اگر میں بال ٹھاکرے کی بجائے ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سریندر کوہلی کے ساتھ فون پر یہ باتیں کرتا تو اس کا اتنا اثر نہیں ہونا تھا جتنا اثر بال ٹھاکرے کو فون کرنے اور اس کے بیان دینے سے پڑتا۔ بال ٹھاکرے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بھی اپنے حمایتی ارکان سے یہ سوال اٹھا سکتا تھا۔ میں نے بال ٹھاکرے کو تاکید کر دی تھی کہ میزائیل سینٹر اور مسٹر چکرورتی کا نام ہرگز

ہرگز وہ اپنے بیان میں نہ لے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو چکرورتی تو ضرور پکڑ لیا جائے گا مگر اس کے ساتھی پاکستانی ایجنٹ فرار ہو جائیں گے۔ بال ٹھاکرے نے جواب میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں اپنے بیان میں کسی میزائیل سینٹر کا نام نہیں لوں گا۔"

میں نے اسے مزید پکا کرتے ہوئے کہا۔

"سینا پتی جی! آپ حساس اداروں کا نام بھی نہ لیں بس یہی کہیں کہ بھارت کے سرکاری محکموں تک غیر ملکی ایجنٹ گھس گئے ہیں اس سے آگے کچھ نہ کہیں۔ اس طرح ہم چکرورتی کو اگر وہ واقعی پاکستان کا ایجنٹ ہوا تو گرفتار کرنے سے پہلے سارے پاکستانی جاسوسوں کو گرفتار کر سکیں گے۔"

بال ٹھاکرے کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے میں اس طرح کروں گا۔"

میں نے آخر میں کہا۔

"سر! آپ میری آسانی کے لیے صرف اتنا کر دیجئے کہ میں دن اور رات کسی بھی وقت میزائیل سینٹر میں پاس ورڈ بول کر داخل ہو سکوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں پاس ورڈ ہر دوسرے تیسرے ہفتے بدل دیا جاتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پاکستانی ایجنٹ کو پکڑنے کے لیے میزائیل سینٹر میں داخل ہونے لگوں اور وہاں پاس ورڈ بدل گیا ہو اور وہ لوگ مجھے اندر نہ جانے دیں اور پاکستانی ایجنٹ موقع پا کر فرار ہو جائے۔"

میں پاکستانی ایجنٹ کے الفاظ کی رٹ بار بار اس لیے لگا رہا تھا کہ یہ الفاظ اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ پاکستانی ایجنٹ کا نام سن کر اس کا پارہ ایک دم چڑھ جاتا تھا۔ اس نے زور دار آواز میں کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں ابھی دلی سیکرٹریٹ میں ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سریندر کوہلی کو فون کرتا ہوں۔ تم اپنا کام کرتے رہو اور کھوج لگاؤ کہ اگر

میزائیل کنٹرولر چکرورتی پاکستانی ایجنٹوں کے ساتھ مل گیا ہے تو یہ پاکستانی ایجنٹ بھارت میں کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

میں نے جواب میں کہا۔

"سر! میں اپنی جان لڑا دوں گا مگر پاکستانی جاسوسوں کا سراغ ضرور لگاؤں گا اور ان سب کو پولیس کے حوالے کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد بال ٹھاکرے نے ٹیلی فون بند کر دیا میں نے ریسیور رکھ دیا اور اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ میرے منصوبے کا پہلا مرحلہ بڑی خیر و خوبی سے مکمل ہوگیا تھا جب میں کمرے سے نکل کر ایس پی مہتہ کے پاس آیا تو اس کے چہرے پر تشویش اور فکر مندی کے اثرات تھے کہنے لگا۔

"مہاراج جی! بڑی لمبی بات ہوئی ہے بال ٹھاکرے جی سے۔"

میں نے کہا۔

"مہتہ جی ہم لوگ سیکرٹ سروس کے لوگ ہی نہیں ہیں ہم دیش بھگت بھی ہیں۔ ہمیں اپنے دیش کو دشمن کے ہتھکنڈوں سے بچانا بھی ہے۔ اور ان ہتھکنڈوں سے بھارت سرکار کو خبردار بھی کرنا ہے۔"

دوپہر کے وقت ایس پی مہتہ مجھے زبردستی لنچ کے لیے اپنے ساتھ جالندھر چھاؤنی کے آردش ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ میرا دل گوشت کھانے کو چاہتا تھا مگر میں نے وہاں سے اپنے آپ کو ویشو ظاہر کیا ہوا تھا اس لیے مجبوراً ترکاریاں کھانا پڑیں۔ کچھ میں اس خیال سے بھی اس کے ساتھ چلا آیا تھا کہ تھوڑا کرید کر اس کے بارے میں معلوم کروں کہ اس کی مار کہاں تک ہے۔ کھانے کے بعد ہم چائے پی رہے تھے کہ مہتہ نے میرے قریب جھکتے ہوئے کہا۔

"سر! ایک بات میں آپ کو بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

میں نے کسی قسم کا اشتیاق ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

"بتائیں مہتہ جی ایسی کون سی بات ہے؟"
وہ کرسی گھسیٹ کر میرے مزید قریب ہوگیا کہنے لگا۔
"سر! یہاں جالندھر چھاؤنی میں اونچی سوسائیٹی میں ایک عورت بڑے فیشن ایبل انداز میں سول اور فوجی افسروں کے درمیان تتلی کی طرح پھرتی نظر آتی ہے۔"
میں سمجھ گیا کہ مہتہ ایک عیاش طبع آدمی ہے۔ یہ مجھے بھی اس طرف لگانا چاہتا ہے میں نے کہا۔
"تو پھر میں کیا کروں مہتہ جی۔"
مہتہ بولا۔
"سر! آپ پوری بات سن لیں پہلے پھر آپ کی مرضی جو چاہے فیصلہ کریں۔"
میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور کہا۔
"ٹھیک ہے بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
مہتہ کہنے لگا۔
"سر! اس عورت کا نام نرملا کماری ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ قسم کے ہندو چندو شاہ کی بیوی ہے۔ چندو شاہ اسے جالندھر کی اونچی سوسائیٹی کی پارٹیوں میں افسروں اور بڑے بڑے کاروباری لوگوں سے ملاتا ہے اور ان سے اپنا کام نکالتا ہے۔ چندو شاہ نے اس عورت نرملا کماری کو اپنے جرائم کے کاروبار کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ناجائز سمگلنگ کا کام بھی کرتا ہے۔"
میں نے کہا۔ "یہ تمہاری سول پولیس کا کیس ہے اس کے خلاف تمہیں کاروائی کرنی چاہیے۔"
مہتہ نے اس کے بعد جو جملہ کہا اس سے میں ضرور چونکا کہنے لگا۔

"سر! جو بات آپ کو خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس عور
کے بارے میں ہم نے جو تحقیقات کرائی ہے اس سے ہمیں شک پڑا ہے کہ ا
عورت نرملا کماری کا تعلق پاکستانی جاسوسوں سے ہے۔"

"تو پھر تم لوگوں نے اسے پکڑا کیوں نہیں؟"

مہتہ نے کہا۔

"سر! ہمارے پاس ابھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نرملا کماری کا وا
پاکستان کی خفیہ ایجنسی سے کوئی تعلق ہے دوسرے اس کا ملنا بڑے بڑے افسرو
اور منتریوں سے ہے ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور کسی ثبوت کا انتظار
رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں مل سکتی ہے میں خود اس سلسلے م
کھوج لگاؤں گا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے یا نہیں۔ اگر ایسی بات ہوئی تو ہمار
پاس کوئی ثبوت ہو چاہے نہ ہو میں اسے گرفتار کروا کر تم لوگوں کے حوالے
دوں گا۔ اگر کسی سول یا فوجی افسر نے اس کی سفارش کی تو میں اسے بھی نوکر
سے برخاست کرا دوں گا۔"

مہتہ تو خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے پاس اتنی طاقت ہے۔
کہنے لگا۔

"سر! پتہ کیا کرنا ہے چندو شاہ جرائم پیشہ آدمی ہے۔ اگرچہ بڑے اثر
رسوخ والا ہے لیکن ہمارے ساتھ تو اس کا واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے میں اسے کہوا
گا کہ کیندریا سرکار کے ایک بڑے افسر یہاں آئے ہیں۔ وہ فوراً آپ ک
دعوت کر دے گا۔ اس میں نرملا کماری تو ضرور ہوگی آپ کو اس سے مل ک
اندازہ ہو جائے گا کہ عورت کس قسم کی ہے۔"

ایس پی مہتہ نے اسی روز جبکہ میں میزائیل سینٹر گیا ہوا تھا چندو شاہ کو فوا
کر کے رات کی دعوت پکی کر دی۔ میں شام کو سٹی پولیس سٹیشن کے آفیسر

ہوٹل میں آیا تو مہتہ نے مجھے فون پر کہا۔
"مہاراج جی! آج رات کا کھانا چندو شاہ کے بنگلے پر ہے۔ وہ تو آپ کا سن کر بڑا خوش ہوا میرے ساتھ یہاں آپ سے ملنے آیا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ اب تیار رہیے گا نو بجے میں آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"
میں نے کہا "ٹھیک ہے آ جانا۔"

پولیس والوں کے اندازے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مہتہ اپنے نمبر بنانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے وہاں شراب شباب کی محفل لگے گی اور مہتہ ایسی محفلوں کا بڑا رسیا تھا۔ کچھ وہ اس لیے بھی یہ سب کچھ کر رہا تھا کہ نرملا کماری سے مجھے ملا کر میری خوشنودی حاصل کر سکے گا۔ میں نے بھی چندو شاہ کی دعوت صرف اس وجہ سے قبول کر لی تھی کہ نرملا کماری کو ایک نظر دیکھنے میں کیا حرج ہے ہو سکتا ہے اس کا تعلق کسی واسطے سے کشمیری کمانڈوز سے ہو۔ کیونکہ یہ حقیقت مجھ پر اچھی طرح سے واضح تھی کہ یہاں نہ تو کوئی پاکستانی جاسوس ہے اور نہ کسی پاکستانی جاسوس کو وہاں آنے کی ضرورت ہی ہے۔

ابھی تک میں نے نقلی پیر فقیر کا بھیس بدل کر میزائیلوں کے علاقے میں کسی جگہ دھونی رمانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے پاکستانی جاسوسوں کی کھوج کا میزائیلوں کے اڈے کے اندر ہی چکر چلا دیا تھا۔ شام کو جب میں پرتھوی میزائیلوں کے اڈے میں پاس ورڈ بتا کر گیا تھا تو میری ملاقات بریگیڈیئر سے نہیں ہو سکی تھی۔ مسٹر گھوش ملا تھا اور میں میزائیل کنٹرولر مسٹر چکرورتی سے خاص طور پر ملا تھا۔ چندو شاہ کی دعوت پر جانے سے پہلے میں نے اپنی خفیہ ڈائری میں میزائیل سنٹر کے دورے کی رپورٹ بھی درج کی اور دلی فون کر کے ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف سریندر کوہلی سے بات کی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا بال ٹھاکرے نے بی جے پی کے لیڈر اور لوک سبھا کے ممبر کو ساری بات بتا دی تھی اور اسے ڈانٹ بھی پلائی تھی۔ اس نے ڈیفنس سیکرٹری کو فون پر میری خفیہ

رپورٹ پہنچا دی تھی۔ ڈیفنس سیکرٹری نے اسی وقت سریندر کوہلی کو بلا کر ہدایت دی تھی کہ سیکرٹ سروس کے سپیشل آفیسر مسٹر دھرم چند کو جالندھر کے علاقے میں اور خاص طور پر میزائیل سینٹر میں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ بال ٹھاکرے نے میرے مشورے پر پورا پورا عمل کیا تھا اور یہ بات کسی پر بھی ظاہر نہیں کی تھی کہ دھرم چند کو میزائیل کنٹرولر مسٹر چکرورتی پر شبہ ہے کہ وہ پاکستانی ایجنٹوں سے ملا ہوا ہے۔ چنانچہ جب میں نے مسٹر سریندر کوہلی کو فون کیا تو وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"سر! ہم نے آپ کے بارے میں جالندھر سٹی پولیس اور پنجاب کی سیکرٹ پولیس کو بڑی سختی سے ہدایت جاری کر دی ہے کہ آپ کو ہر قسم کی سرکاری اور غیر سرکاری سہولت دی جائے میزائیل سنٹر کے انچارج بریگیڈئر شیاما پرشاد کو تو پہلے ہی ہدایات جاری کی جا چکی تھیں لیکن اب اسے مزید تاکید کر دی گئی ہے۔ سرا اس کے باوجود آپ کو کسی قسم کی پریشانی محسوس ہو تو مجھے فوراً فون کر دیجئے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے کوہلی صاحب! اگر کوئی دقت محسوس ہوئی تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کر دیا۔

رات کے پونے نو بجے چندو شاہ نے اپنے نئے ماڈل کی گاڑی مجھے لینے کے لئے بھیج دی۔ میں اور مہتہ اس میں بیٹھ کر اس کے بنگلے پر آ گئے۔ شہر کے مضافات میں چھوٹا سا بنگلہ بڑا خوبصورت بنگلہ تھا۔ چندو شاہ لابی کے باہر ہمارے استقبال کو خود موجود تھا۔ اس کا جسم بھاری رنگ سانولا تھا۔ سلک کا کرتہ اور سلک کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پمپ شو تھا کاندھے پر قیمتی شال تھی۔ انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ باندھ کر اس نے مجھے نمسکار کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بولا۔

"ہمارے دھن بھاگ کہ چیونٹی کے گھر میں نارائن پدھارے ہیں۔"

ڈرائینگ روم خوب سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر پنڈت نہرو اور گاندھ
تصویروں کے علاوہ اس زمانے کی مشہور فلم ایکٹرسوں کی اشتعال انگیز تصو
لگی ہوئی تھیں۔ ٹی وی' وی سی آر ٹیپ ریکارڈر سب کچھ وہاں پر موجود
سردی ابھی اتنی نہیں ہوئی تھی اس لیے ہیٹر نہیں لگا ہوا تھا۔ مہتہ نے چند
سے میرا ایک بہت بڑے اور با اثر سرکاری افسر کی حیثیت سے تعاون کر
چندو شاہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! ہم تو آپ کے داس ہیں۔ بس آپ ہمیں اپنا داس ہی رکھ
ہمارے لائق کوئی سیوا ہو تو حکم کریں۔ بس آپ کے حکم کی دیر ہوگی کہ آ
وہ سب کچھ مل جائے گا۔"

یہ شخص خوشامدانہ اور لچھے دار باتیں کرنے میں بڑا ماہر معلوم ہوتا
اس قسم کے لوگ عام طور پر ایسے ہی ہوا کرتے ہیں میری آنکھیں نرملا کمار
تلاش کر رہی تھیں۔ مہتہ سمجھ گیا۔ اس نے چندو شاہ سے کہا۔

"چندو شاہ! اندر سبھا کا دربار تو لگ گیا ہے مگر نرتکی ابھی تک نہیں آئ
چند شاہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ اس نے میری طرف متوجہ ہو کر ء
سے کہا۔

"مہاراج! گولی کس کی اور گہنے کس کے وہ ذرا تیار ہو رہی تھی۔
اتنی دیر کچھ پی لیں۔ کیا شوق فرمائیں گے امپورٹیڈ بیئر بھی ہے۔ سکاچ بھی
حکم کریں۔"

میں ان دونوں میں سے کسی چیز کا بھی شوق نہیں کرتا تھا۔ میں ابھی
دینے ہی والا تھا کہ مہتہ جلدی سے بولا۔

"سکاچ لے آؤ بیئر تو پانی ہوتا ہے۔"

"کیوں مہاراج جی؟"

مہتہ نے جملے کا آخری حصہ میری طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا۔ میں نے کہا "شراب وغیرہ میں بالکل نہیں پیتا۔"

اور چندو شاہ سے کہا۔

"میرے لیے تو کافی منگوا دیں تو بہتر ہوگا۔"

ایس پی مہتہ اور چندو شاہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے اور چندو شاہ بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی مہاراج۔"

اس نے نوکر کو اشارہ کیا کہ کافی بنوا کر لے آئے۔ جب تک کافی آتی چندو شاہ گندریا سرکار کے وزیروں مشیروں اور بی جے پی اور راشٹریہ سنگھ کے لیڈروں سے اپنی واقفیت اور دوستی کی ڈینگیں مارتا رہا۔ مجھے اس شخص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نرملا کماری کے لیے وہاں آیا تھا اور اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم تینوں کے لیے کافی آگئی۔ کافی ایک بڑی خوبصورت نازک اندام ریشمی ساڑھی میں ملبوس لڑکی لے کر آئی۔ وہ واقعی بڑی خوبصورت تھی اور اس کا جسم بھی بہت صحت مند تھا۔ ماتھے پر بندیا لگی تھی۔ صرف آنکھوں کے گرد مجھے سیاہ حلقے نظر آئے جنہیں میک اپ سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چندو شاہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"مہاراج! یہ نرملا کماری جی ہیں۔ نرملا جی! دھرم چند جی بہت بڑے افسر ہیں۔ دلی سے جالندھر سرکاری محکموں کی انسپکشن کرنے آئے ہیں۔ انہیں پرنام کرو۔"

نرملا کماری نے ہاتھ باندھ کر مجھے پرنام کیا اور ریشمی ساڑھی کو سمیٹتی ہوئی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نرملا کماری کے آنے سے کمرے کی فضا کسی قیمتی پرفیوم کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ چندو شاہ خدا جانے کیا کیا باتیں کر رہا تھا۔ میں اس کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں بھی کیے جاتا تھا اور نرملا کا بھی

جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اس خوبصورت اور انتہائی قیمتی لباس والی لڑکی کے چہر
پر ایک گہری اداسی اور افسردگی میک اپ کی رنگینیوں سے چھنتی ہوئی نظر آ رہ
تھی۔ جب میں نے اس سے باتیں شروع کیں تو مجھے محسوس ہوا کہ نرملا کماری
لہجہ مشرقی پنجاب کی عام ہندو عورتوں ایسا نہیں ہے۔ مہتہ اور چندو شاہ نے ا
لیے سکاچ منگوا لی تھی اور ہم سے اجازت طلب کرنے کے بعد شراب کا دو
شروع کر دیا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے چندو شاہ سے کہا۔

"چندو جی! آپ لوگ تو اپنے لوگ تو اپنی تفریح میں لگ گئے ہیں۔ م
خیال ہے مجھے اور نرملا کماری کو موقع دیں کہ ہم کونے والی کھڑکی کے پاس
کر باتیں کریں۔"

"بالکل مہاراج بالکل۔ نرملا جی تم دھرم چند جی سے کھڑکی والے صوفے
بیٹھ کر باتیں کرو یہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

میں اور نرملا کماری ڈرائینگ روم کے کونے میں کھڑکی کے پاس آ
صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے نرملا سے پوچھا کہ وہ کس شہر میں پیدا ہوئی تھی۔
مسکرائی کہنے لگی۔

"میرا جنم جالندھر کے قریب ایک گاؤں میں ہوا تھا۔ بی اے میں
جالندھر گورنمنٹ گرلز کالج سے کیا ہے۔ جالندھر میں ہمارے رشتے دار ر
ہیں۔ ماتا جی بھی میرے ساتھ جالندھر میں ہی آ گئی تھیں۔"

میں نے پوچھا۔

"چندو شاہ جی سے تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟ تم عمر میں چندو شاہ
بہت چھوٹی لگتی ہو۔"

وہ ہنس پڑی اور ساڑھی کے پلو کو درست کرتے ہوئے بولی۔

"بس مہاراج جہاں سنجوگ ہوتا ہے وہاں وواہ ہو جاتا ہے یہ تو جنم
ساتھ ہوتا ہے۔"

مجھے نرملا کماری کی باتوں میں کوئی ایسی خاص بات دکھائی نہ دی جس سے یہ اندازہ ہوتا یا شک پڑتا کہ اس کا تعلق جاسوسوں کے کسی گروہ سے ہے۔ وہ ایک ایسی خوبصورت ہندو لڑکی تھی جس کی شادی کسی مجبوری کے تحت اس سے زیادہ عمر کے ہندو سے ہوگئی تھی جو جرائم پیشہ تھا اور جو اس کے ذریعے سرکار دربار میں اپنا کام نکلواتا تھا اور عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میرے لیے اب نرملا کماری میں دلچسپی لینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چندو شاہ میرے بہت آگے پیچھے پھرتا رہا اور نرملا کماری کو میرے پاس چھوڑ کر ایس پی مہتہ اور چندو شاہ دوسرے کمرے میں بھی چلے گئے لیکن یہ ساری باتیں میرے لیے بیکار کی باتیں تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے مہتہ سے کہا۔

"میں چلتا ہوں مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔"

اس دوران میں نے ایک بات ضرور نوٹ کی تھی کہ نرملا کماری کا رویہ بے حد محتاط تھا اور اس نے از خود میرے قریب ہونے کی ایک بار بھی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اسے عورت کی بنیادی شرم و حیا پر محمول کیا۔ یہ بات تجربے میں آ چکی تھی کہ عورت خواہ کتنی عیاش اور پیشہ ور کیوں نہ ہو وہ خود کسی قسم کی دست درازی نہیں کرتی۔ جانے کا سن کر چندو شاہ بولا۔

"مہاراج ابھی تھوڑی دیر اور بیٹھیں ہمیں سیوا کا تھوڑا اور موقع دیں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں چندو شاہ جی۔ میرا جانا ضروری ہے۔"

مہتہ کو معلوم تھا کہ میرے ٹیلی فون اہم اور ضروری ہوتے ہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چندو شاہ جی! اس وقت ہمیں اجازت دیں پھر کسی روز سہی۔"

وہاں سے ہم چندو شاہ کی گاڑی میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔ راستے میں مہتہ نے مجھ سے پوچھا۔

"مہاراج جی! کیا خیال ہے نرملا کماری کے متعلق۔"

میں نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

وہ بولا۔ "مہاراج جی! آپ نے کچھ اندازہ لگایا کہ یہ کسی قسم کی عورت ہے میرا مطلب ہے اس کا لنک کسی پاکستانی جاسوس کے ساتھ ہے یا نہیں؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے ایسی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ اس کی نگرانی کرتے رہیں۔ اگر آپ کی سی آئی ڈی نے کوئی خاص بات نوٹ کی تو مجھے خبر کر دیجئے گا۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔"

سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک وائرلیس روم تھا جہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ریڈیو رسیور پر سگنل کے ذریعے دوسری جگہ پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کی سہولیات میسر تھیں۔ یہ سرکاری سگنلز روم تھا اور پولیس یہاں سے وائرلیس پر پیغام دیتی اور ریسیور پر پیغام وصول کرتی تھی۔ دن کے وقت یہاں دو آپریٹر حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ رات کو صرف ایک کانسٹیبل آپریٹر ہی ڈیوٹی دیتا تھا۔ یہاں سے میں نے دو ایک بار سریندر کوہلی اور بال ٹھاکرے کو خفیہ نمبر پر فون بھی کیا تھا مگر میری نظر ریڈیو ٹرانسمیٹر پر تھی۔ اس کے ذریعے میں پاکستان میں بٹ صاحب کو سگنل بھیج کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا کسی طرح نرملا کماری نام کی عورت ان کی جاسوسی کی لسٹ میں ہے یا نہیں؟ اگرچہ میں جانتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر بھی میں اپنا شک دور کر لینا چاہتا تھا تاکہ میں اطمینان سے اپنے اصل مشن پر کام کر سکوں۔

میں سٹی پولیس کے ہوسٹل میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک بڑا آرام دہ کمرہ مجھے مل گیا تھا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر والا کمرہ یہاں سے ایک بلاک چھوڑ کر سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر کے کمپلیکس میں ہی تھا۔ مجھے ہر جگہ جانے کی اجازت تھی۔ وہاں سب کو میری طاقت ور خفیہ حیثیت کا علم تھا لیکن اس کے باوجود میں کوئی ایسی غیر ذمے

ارانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے کسی کو مجھ پر شک پڑ سکے۔ پاکستان میں ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے کوڈ الفاظ میں خفیہ پیغام پہنچانا ایک خطرناک کام تھا۔ یہاں سے جو بھی سگنلز یا ریڈیو پیغام نشر کیے جاتے تھے اس کی کنٹرول روم میں مانیٹرنگ بھی ہوتی تھی۔ اطمینان کی بات صرف اتنی ہی تھی کہ میں جس کوڈ زبان میں پیغام نشر کرنے والا تھا اس کا کوڈ کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس سے پہلے میں انبالے کے پولیس ہیڈ کوارٹر سے بھی پاکستان کچھ خفیہ پیغام ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے پہنچا چکا تھا اور کچھ نہیں ہوا تھا۔

چنانچہ میں آدھی رات کے بعد اپنے ہوسٹل سے نکلا اور سگنل روم میں آ گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر موجود جو کانسٹیبل تھا مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

"جوان مجھے بمبئی ایک ضروری پیغام وائرلیس کرنا ہے۔ تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔"

وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر اون کر کے پاکستان کی فریکوئنسی ملائی سگنل نشر کیا۔ دوسری کوشش میں دوسری طرف سے مجھے سگنل کا جواب مل گیا۔ میں نے کوڈ زبان میں پوچھا کون بول رہا ہے؟"

دوسری طرف سے خفیہ کوڈ میں ہی کسی نے کہا۔

"میں نمبر دس ہوں۔"

یہ بٹ صاحب تھے۔ یہی ان کا خفیہ نمبر تھا۔ میں نے مختصر خفیہ الفاظ میں ان سے نرملا کماری کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس نام کی کوئی عورت کسی پاکستانی یا کشمیری ایجنٹ کے لیے کام کر رہی ہے؟ بٹ صاحب نے جواب دیا ہمارا کوئی پاکستانی ایجنٹ اس وقت بھارت میں نہیں ہے۔ ہم کسی نرملا کماری کو نہیں جانتے۔ میں نے کہا اوکے! بس مجھے یہی پوچھنا تھا۔ بٹ صاحب نے سوال کیا۔

"تمہارے مشن کی کیا صورت حال ہے؟"

انہوں نے خفیہ کوڈ میں پرتھوی میزائیل کے بارے میں دریافت کیا میں نے کہا۔ اس بارے میں آپ کو پہلے جو اطلاع دے چکا ہوں ابھی تک ویسی ہی صورت حال ہے کوئی پیش رفت ہوئی تو اطلاع کروں گا۔" اور میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

پرتھوی میزائیل سینٹر کے سلسلے میں یہاں جو پیش رفت ہوئی تھی اور جس طرح میں چکرورتی کو بیچ میں لا کر سازش کا جال بن رہا تھا اس کے متعلق میں ابھی بٹ صاحب کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں پاکستان خفیہ پیغام دینے کے بعد ریڈیو ٹرانسمیٹر روم سے باہر نکلا تو دوسرے کمرے میں کانسٹیبل آپریٹر کے ساتھ ایک اور آدمی کھیس کی بکل مارے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس آدمی کو میں اس پولیس کمپلیکس میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر آپریٹر سے دبی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ سکھ آپریٹر مجھے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً" اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے جوان بمبئی کی لائن نہیں ملی میں نے دلی فون کیا ہے۔"

میں وہاں سے باہر آیا تو اس نئے آدمی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آکر مجھے پریشان کرنے لگا۔ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ کہیں سیکرٹ پولیس نے میری نگرانی پر بھی کوئی سی آئی ڈی والا تو نہیں لگا دیا؟ ایسا وہ کر سکتے تھے۔ سی آئی ڈی اور ڈیفنس انٹیلی جینس والوں کو بڑی وسیع مراعات حاصل ہوتی ہیں وہ تو پردھان منتری اور ملک کے صدر کے پیچھے بھی خفیہ آدمی لگا دیتی ہیں لیکن میرے پیچھے اگر کوئی سی آئی ڈی کا آدمی میری نگرانی کے لیے لگا دیا گیا تھا تو یہ بات میرے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں نے اس سلسلے میں ڈیفنس انٹیلی جینس والوں کو احتجاج بھی کیا تو وہ اوپر سے یہ کہہ کر میری تسلی کر دیں گے کہ جناب کس کی جرات ہے کہ آپ کے پیچھے خفیہ آدمی نگرانی پر لگائے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی

آدمی پر آپ کو شک ہو کہ وہ آپ کی نگرانی کر رہا ہے تو فوراً" ہمیں اس کا نام اور حلیہ بتائیں ہم اسے نوکری ہی سے نکال دیں گے لیکن اندر سے وہ اپنے موقف پر قائم رہیں گے۔ اگر ایک بار میری نگرانی کا فیصلہ کر دیا گیا ہوگا اور کوئی آدمی میرے پیچھے لگا دیا ہوگا تو پھر وہ ہر حالت میں میری نگرانی کرتا رہے گا یہ الگ بات ہے کہ وہ کبھی میرے سامنے نہیں آئے گا۔

میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رات کو جو آدمی ریڈیو ٹرانسمیٹر آپریٹر کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا وہ کون تھا اور آدھی رات کو وہاں کیا کرنے آیا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہاں میرا کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جس پر میں اپنے دل کا راز کھول سکتا اور اس کو اس قسم کی سراغ رسانی پر لگا سکتا۔ سب کچھ مجھے ہی کرنا تھا۔ اگلے روز میں ایس ایس پی مہتہ کے کمرے میں گیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی بولا۔

"آپ لوگوں کا یہاں سیکورٹی کا انتظام اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہے۔"

مہتہ نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں مہاراج جی کوئی غلطی ہوگئی ہے ہم سے؟"

میں نے کہا۔ "رات مجھے بال ٹھاکرے جی کو ایک ضروری ریڈیو میسج دینا تھا میں نے آپ کے ریڈیو ٹرانسمیٹر روم میں جا کر یہ پیغام بمبئی دیا اور جب پیغام دے کر باہر آیا تو وہاں ایک اجنبی شخص کھیس کی بکل مارے ریڈیو آپریٹر کے پاس بیٹھا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ریڈیو ٹرانسمیٹر روم بڑا حساس کمرہ ہے پھر وہاں ایک اجنبی شخص کیسے اور کیوں آگیا اور وہ بھی آدھی رات کے وقت؟"

ایس ایس پی مہتہ نے اسی وقت فون کر کے کہا۔

"رات کو ڈیوٹی پر ریڈیو ٹرانسمیٹر روم میں کون تھا؟ جو کوئی بھی تھا اسے فوراً" میرے کمرے میں حاضر کرو۔"

فون بند کر کے مہتہ نے کہا۔

"مہاراج جی! ریڈیو آپریٹر کا کوئی رشتے دار ہوگا جو رات کی گاڑی سے

جالندھر آیا ہوگا۔ ورنہ یہاں باہر کا آدمی انٹر ہی نہیں ہو سکتا۔"

میں نے دل میں کہا خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد سکھ کانسٹیبل آپریٹر جو رات کو ٹرانسمیٹر روم میں ڈیوٹی پر تھا حاضر ہوگیا۔ اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ رات کی ڈیوٹی دینے کے بعد سو رہا تھا اور اسے اٹھا کر لایا گیا ہے۔ مہتہ نے اس سے پوچھا۔ کہ رات کو اس کے پاس کون آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ سکھ کانسٹیبل آپریٹر ذرا گھبرا گیا۔ اس کی شکل سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ صاحب آپ نے خود تو اس آدمی کو وہاں ڈیوٹی پر لگایا تھا پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ آپریٹر سکھ تھا اور سکھ صاف دل اور صاف گو ہوتے ہیں اس لیے اس کے دل کا حال چہرے پر آگیا تھا۔ اس کی جگہ ہندو ہوتا تو اپنی کیفیات کو کبھی چہرے پر نہ آنے دیتا لیکن سکھ آپریٹر کے چہرے پر بھی اس قسم کا تاثر ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت کے لیے آیا اور گزر گیا۔ میں نے اپنی چہرہ شناسی کی مہارت کی وجہ سے اس تاثر کو نوٹ کر لیا تھا اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا اور اسے سنٹرل گورنمنٹ کی سیکرٹ سروس کی جانب سے میری نگرانی پر لگایا گیا ہے۔ سکھ کانسٹیبل نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"سر! وہ میرے تایا کا چھوٹا بھائی تھا جی۔ نکودر سے رات کی گاڑی پر آگیا تھا۔ کوارٹر میں تالا پڑا دیکھ کر میرے پاس آگیا۔ سر غلط ہوگئی آیندہ یہ غلطی نہیں کروں گا۔"

ایس پی مہتہ نے اس کو خوب ڈانٹا اور کہا۔

"اگر پھر مجھے اس قسم کی رپورٹ ملی کہ رات کی ڈیوٹی پر ٹرانسمیٹر روم میں تمہیں کوئی ملنے آیا تھا تو میں تمہیں اسی وقت ڈس مس کرا دوں گا۔ اب جاؤ۔"

آپریٹر چلا گیا۔ مہتہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"مہاراج جی! میں بھی آپ سے اس غفلت کے سلسلے میں معافی چاہتا ہوں۔

ہم سیکورٹی کا بے حد خیال رکھتے ہیں مہاراج جی۔ آپ نے تو خود دیکھ لیا ہے
اس کانسٹیبل سے بھول ہوگئی۔ اب وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔"

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا کی میرے ساتھ میرا ایک ساتھی کمانڈو ضرور ہونا چاہیے تھا جو کم سے کم میری نگرانی کرنے والوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کر سکتا اور مجھے کسی کمانڈو آپریشن شروع کرنے سے پہلے پورے حالات کا علم ہو جاتا۔ ایسا میرا ایک ساتھ اپنا کشمیری مجاہد امرتسر میں تھا۔ مگر وہ امرتسر میں تھا اور میں جالندھر میں تھا۔ دوسرے وہ خود سی آئی ڈی کی نگرانی میں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کشمیری مجاہد تو اس علاقے میں کمانڈو آپریشن کو آتے ہی رہتے ہیں ان کا کھوج لگانا چاہیے اور کسی تجربہ کار کشمیری کمانڈو کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہیے۔ میں اسے یہ بتانے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور میرا نام حیدر علی ہے۔ کیونکہ یہ میرا خاص راز تھا۔ اور میں اسے کسی پر بھی ظاہر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں یہی ظاہر کر سکتا تھا کہ میں کشمیر کی جنگ آزادی میں جہاد کرنے والوں کے ساتھ ہوں اور کشمیر کے محاذ سے دور رہ کر یہاں خفیہ روپ میں کشمیر کی آزادی کے لیے کام کر رہا ہوں۔ سوال یہ تھا کہ جالندھر شہر میں اور اس کے گرد و نواح میں سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی چند ایک گھرانوں پر مشتمل تھی جو مالیر کوٹلہ سے آ کر یہاں کاروبار کرنے لگے تھے۔ انبالے والے مزار پر بھی کسی کشمیری کمانڈو سے ملاقات ہونے کی امید تھی۔ مگر میں جالندھر کا میزائیل سینٹر چھوڑ کر وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ میرا سارا کمانڈو آپریشن جالندھر کے علاقے میں ہی شروع ہونے والا تھا۔ اچانک مجھے خیال آگیا۔ ایس پی مہتہ نے ایک بار کہا تھا

کہ جالندھر میں ایک مسلمانوں کا پرانا قبرستان ہوا کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد وہاں لوگوں نے قبرستان کو مٹا کر مکان بنا لیے ہیں لیکن وہاں ایک قبر رنگ سائیں کی تھی جس پر ہندو سکھ بھی آ کر چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے اور منتیں مانگتے تھے۔ وہ سارا قبرستان مٹ گیا ہے مگر رنگ سائیں کی قبر اسی طرح ہے۔ اس پر پورا مزار بن گیا ہے اور ایک سکھ وہاں متولی بن کر بیٹھ گیا ہے۔ جو لوگوں سے نذرانے وصول کرتا ہے اس کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ رنگ سائیں کے مزار پر جموں کشمیر سے بھی مسلمان چڑھاوے چڑھانے اور منتیں مانگنے آتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وہاں چلنا چاہیے ہو سکتا ہے وہاں کسی کشمیری مجاہد یا کشمیری کمانڈو سے ملاقات ہو جائے۔

اب سوال یہ تھا کہ مجھے رنگ سائیں کے مزار پر بیٹھنے کے لیے ایس پی مہتہ اور خاص طور پر خفیہ پولیس کے اس آدمی کو بے خبر رکھنا تھا جو میرے پیچھے لگا دیا گیا تھا۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی دوسری جگہ جا کر لمبے بالوں کی وگ اور لمبی داڑھی لگا کر اپنا حلیہ پورا بدل ڈالوں اور رنگ سائیں کے مزار پر بھی دن کی بجائے رات کو جا کر کچھ دیر کے لیے دھونی رماؤں اور مسلمان زائرین پر خاص طور پر جموں کشمیر سے آئے ہوئے زائرین پر نظر رکھوں۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی کشمیری مجاہد بھی ہو اور میں اسے اپنے ساتھ ملا لوں۔ اس کے ساتھ ملانے سے میں اپنے پیچھے لگے ہوئے خفیہ سروس کے آدمی کی توجہ دوسری طرف ہٹا سکتا تھا۔

میں نے ایک منصوبہ بنایا اور پہلے یہی سوچا کہ پولیس ہوسٹل کے کمرے سے نکل کر شہر کے کسی ہوٹل میں چلا جاؤں پھر خیال آیا کہ خفیہ پولیس والا میرا پیچھا کرتا وہاں بھی آ جائے گا۔ بہتر یہی تھا کہ پولیس ہوسٹل میں ہی رہوں اور ایسے طریقے سے رات کے وقت بھیس بدل کر نکلوں کہ خفیہ پولیس کو کان خبر نہ ہو۔ میں نے رات کے وقت کمرے کی بتی بجھا کر اپنے

کھڑکیوں کا بار بار جائزہ لیا۔ میرا کمرہ ہوسٹل کی پہلی منزل پر تھا۔ سامنے چھوٹی سڑک تھی جو پولیس کی عمارت کے بڑے گیٹ تک چلی گئی تھی۔ یہاں مجھے کوئی خفیہ آدمی نظر نہ آیا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھا ہوا اور میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ رات کے وقت یہ لوگ بھی تھوڑے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ میرے بارے میں خاص طور پر خفیہ پولیس والے کو معلوم تھا کہ میں رات کے وقت اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد پھر باہر نہیں نکلتا اور جلدی سو جاتا ہوں۔

میک اپ اور حلیہ بدلنے کا سامان میں نے اپنے کمرے میں ہی رکھا ہوا تھا۔ دن کے وقت میں نے جائزہ لے لیا تھا کہ مجھے کس طرف سے ہوسٹل سے باہر نکلنا ہے۔ میں شام کے سات بجے تک ایس پی مہتہ کے کمرے میں بیٹھا رہا اور اسے یہ تاثر دیتا رہا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ہوسٹل میں جا کر جلدی سو جانا چاہتا ہوں۔ وہیں میں نے تھوڑا کھانا کھایا اور ہوسٹل میں آگیا۔ آتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ اور کھڑکی بند کر دیں۔ اندر سے چٹخنیاں چڑھا دیں اور رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ہوسٹل والے میرے کمرے کا دروازہ چھوٹی سڑک کی جانب کھلتا تھا۔ میں نے کھڑکی کی درز میں سے باہر دیکھا سڑک۔ پر بتیاں روشن تھیں۔ دوسری جانب کچھ درخت تھے۔ ان کے پیچھے پولیس لائن کی بیرکیں تھیں۔ وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میری عقابی نظروں نے اس دھندلے اندھیرے میں ایک انسانی سائے کو ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر دوسرے درخت کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ انسانی سایہ دوسرے درخت کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ میری نگرانی کرنے والا خفیہ پولیس والا ہی ہے۔ جب رات کے دس بج گئے اور سردیوں کی وجہ سے باہر خاموشی ہوگئی تو میں نے کپڑے اتار کر فقیروں والا لمبا چغہ پہنا۔ سر پر بالوں کی وگ لگائی۔ لمبی داڑھی اچھی طرح سے جمائی کاندھے پر کمبل ڈالا ہاتھ میں ڈانگ

پکڑی۔ گلے میں چھ سات چھوٹی بڑی تسبیحیں ڈالیں۔ کمرے کی بتی بجھائی اور پچھلی طرف والی کھڑکی آہستہ سے کھولی اور دوسری طرف جھاڑیوں میں اتر گیا۔

اس راستے کا تعین میں نے پہلے ہی سے کر لیا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے جھک کر چلتا پولیس لائن کے کواٹروں کے پیچھے سے ہوتا ہوا اس سڑک پر آگیا جو رنگ سائیں کے قبرستان کو جاتی تھی۔ دوپہر کے وقت میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اس قبرستان کو بھی دور سے دیکھ آیا تھا۔ قبرستان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا قبرستان کی قبریں اب باقی نہیں رہی تھیں۔ وہاں مکان بنے ہوئے تھے۔ میں درختوں کی اوٹ میں ان کے پیچھے رنگ سائیں کی قبر پر آکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ رات کے وقت سکھ متولی وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کی جھونپڑی نما کوٹھڑی بند پڑی تھی۔ رنگ سائیں کے مزار کے گرد چھوٹی دیوار بنی ہوئی تھی۔ قبر کے سرہانے تین چار مٹی کے دیے روشن تھے۔ وہاں اس وقت کوئی آدمی نہیں تھا میں سوچنے لگا کہ رات کے وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس وقت تو یہاں نہ کوئی بندہ نظر آتا ہے کہ بندے کی ذات۔ میں نے غلطی کی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے دن کے وقت آیا کروں گا۔ میرا حلیہ ایسا ہے کہ سی آئی ڈی والا مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ اگر اس نے پہچان بھی لیا تو اس وقت تک کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب تک کہ مزار پر میری ملاقات کسی کشمیری کمانڈو سے نہیں ہوگی۔ اگر واقعی مجھے کوئی کشمیر مجاہد یہاں مل گیا تو پھر میں اپنے نگرانی کرنے والے سے محتاط ہو جاؤں گا اور اس حلئے میں یہاں نہیں آؤں گا۔ کشمیری مجاہد کے ساتھ کسی دوسری جگہ ملاقات کا وقت طے کر لوں گا۔

پھر بھی میں نے سوچا کہ اب آیا ہوں تو کچھ دیر بیٹھنا چاہیے ہو سکتا ہے کوئی امید کی کرن نظر آ جائے میں مزار کی سرہانے والی دیوار کی دوسری جانب مٹی کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ رات اتنی سرد نہیں تھی لیکن سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ کسی کسی وقت سر اٹھا کر چاروں

طرف ایک نگاہ ڈال لیتا تھا۔ کچھ فاصلے پر جو مکان تھے ان پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ میرا خیال ہے مجھے وہاں بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے گردن پھیر کر دیکھا۔ آبادی کے مکانوں کے درمیان سے ایک چھوٹا سا راستہ رنگ سائیں کے مزار تک آتا تھا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا مجھے ایک انسانی سایہ مزار کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے جسم پر کالی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو دیوار کی اوٹ میں اس طرح چھپا لیا کہ میں انسانی سائے کو دیکھ سکتا تھا مگر مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انسانی سایہ مزار کے اندر آکر قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ اس وقت قبر پر جلتے چراغوں کی ہلکی ہلکی روشنی اجنبی کے چہرے پر پڑی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس چہرے کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ یہ ایک عورت کا چہرہ تھا۔ مگر چونکہ اس عورت نے منہ اور سر کالی چادر سے لپیٹ رکھا تھا تو اس لیے میں پہلی نظر میں اسے پہچان نہ سکا۔

میں اس کے پہلو میں بائیں جانب چھوٹی دیوار کے پیچھے بیٹھا ذرا سا سر اوپر کر کے اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت نے دونوں ہاتھ چادر میں سے نکالے اور فاتحہ پڑھنے لگی۔ اس کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے۔ اچانک میں نے اسے پہچان لیا۔ جب میں نے اسے پہچان لیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ یہ عورت چندو شاہ کی بیوی نرملا کماری تھی۔ ٹھیک ہے رنگ سائیں کے مزار پر ہندو سکھ عورتیں اور مرد منتیں مانگنے آتے تھے مگر وہاں فاتحہ سوائے کسی مسلمان عورت یا مرد کے اور کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ تو کیا نرملا کماری مسلمان ہے؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس سوال نے مجھے ایک الجھن میں ڈال دیا تھا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد نرملا کماری نے ذرا اونچی آواز میں ایک بار الحمد شریف پڑھی اور ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگی۔

"سائیں جی! مجھے چندو شاہ سے نجات دلا دیں میں بڑے دکھے دل کے

ساتھ آپ کے مزار پر فریاد لے کر آئی ہوں۔ میں بے بس ہوں۔ پنجرے میں بند پنچھی کی طرح ہوں مجھے میرا کوئی ایسا کشمیری بھائی ملا دیں جو مجھے اپنے ساتھ سری نگر لے جائے۔ چندو شاہ کے آدمی چوبیس گھنٹے پستولیں لیے میری نگرانی کرتے ہیں۔ میں اکیلی کچھ نہیں کر سکتی میرے ماں باپ مکتی باہنی والوں نے شہید کر دیے۔ دونوں بھائی بھی ڈھاکہ میں شہید ہو گئے۔ میں بدنصیب کس لیے زندہ رہ گئی ہوں۔ یا تو مجھے سری نگر میرے رشتے داروں کے پاس پہنچا دیں یا پھر خدا سے کہیں کہ وہ مجھے موت دے دے۔"

اتنا کہہ کر نرملا کماری چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا کر سسکیاں لے کر رونے لگ گئی۔ نرملا کماری کے بارے میں عجیب انکشاف ہو رہے تھے۔ پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ اسے مکتی باہنی والوں نے ڈھاکہ سے اغوا کیا تھا اور اس کے ماں باپ اور بھائیوں کو شہید کر دیا تھا۔ میں نرملا کماری پر اپنے مسلمان ہونے کا انکشاف نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کے ناطے میرا فرض تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور جس مصیبت میں وہ پھنسی ہوئی ہے وہاں سے اسے نکالوں۔

اس وقت میں اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں دیوار کے پیچھے چھپا رہا۔ رونے دھونے اور مزار پر دعا مانگنے کے بعد جب نرملا کماری چلی گئی تو اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی واپس ہو گیا۔ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف سے گزرتا ہوا میں کھڑکی کھول کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے اس مہم میں کوئی کشمیری کمانڈ تو نہیں ملا تھا لیکن ایک بدنصیب مسلمان لڑکی سے ضرور ملاقات ہو گئی تھی جس کی مدد کرنا میرا فرض بن گیا تھا۔

کمرے میں آ کر میں نے داڑھی اور بالوں کی وگ اتار کر الماری میں رکھی اور منہ ہاتھ دھو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کافی دیر تک نرملا کماری کے بارے میں سوچتا رہا۔ یقیناً" یہ عورت ڈھاکہ فال کے دنوں میں اغوا ہوئی ہو گی۔ جب ڈھاکہ فال

کے آخری دنوں میں بھارت نے مکتی باہنی کی شکل میں کمانڈو فورس مشرقی پاکستان
میں داخل کر دی تھی۔ تو اس نے وہاں آ کر زبردست تباہی مچائی تھی۔ یہ فورس
ہندو فوجیوں پر مشتمل تھی۔ پاکستان آرمی کی تعداد بے حد کم تھی اس کے
باوجود وہ محاذوں پر آخری جوان اور آخری گولی تک لڑ رہی تھی۔ پاک آرمی
نہ کمک مل رہی تھی نہ پورا ایمونیشن مل رہا تھا اور نہ بٹالین کی بدلی ہو رہی
تھی۔ جو جوان پہلے روز سے لڑ رہا تھا وہی تیس دن کے بعد بھی لڑ رہا تھا۔ بنگا
اور مکتی باہنی والے مورچوں کے پیچھے تخریبی کاروائیں کر رہے تھے۔ پل اڑ
رہے تھے۔ جن کشتیوں اور چھوٹے بحری جہازوں میں پاک آرمی کی گنتی کی
نفری کے واسطے ایمونیشن لے جایا جاتا تھا انہیں دھماکوں سے اڑا رہے تھے۔ ان
حالات میں مکتی باہنی غیر بنگالی مسلمان شہریوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اور مردوں بچوں
اور بوڑھی عورتوں کو بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا اور جوان لڑکیوں کو اغوا
کر کے کلکتے اور بمبئی پہنچایا جا رہا تھا جہاں انہیں بازار حسن میں فروخت کرا
جاتا تھا۔ یقیناً نرملا کماری کے ساتھ بھی ایسا ہی المیہ ہوا تھا۔ مجھے اس کا اصل
مسلمانوں والا نام معلوم نہیں تھا۔

دوسرے روز میں سب سے پہلے اپنے اصلی ٹارگٹ میزائیل سینٹر میں گیا
وہاں بریگیڈیئر شیاما پرشاد مسٹر گھوش سے ملاقات کی۔ تھوڑی دیر وہاں میزائیل
کے چارٹوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ اور
خاص طور پر ڈیفنس انٹیلی جنیس والوں نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں بھارت
کے اس حساس ادارے اور میزائیلوں کی تنصیب اور اس کی کارکردگی کے
بارے میں ہر دوسرے روز دلی سیکرٹریٹ کو رپورٹ بھیجوں۔ دوپہر کو میں
آدرش ریسٹورنٹ میں اکیلے کھانا کھایا اور پھر تھوڑی دیر ہوسٹل میں آرام کر
کے بعد ایس پی مہتہ کے پاس آ گیا۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے اس
رازداری کے ساتھ کہا۔

"مسٹر مہتہ! مجھے اوپر سے اشارہ ملا ہے کہ چندو شاہ کی پتنی نرملا کی نگرانی کروں اس سے ملوں اور اسکے بارے میں پوری رپورٹ لکھ کر بھیجوں۔"

ایس پی مہتہ بولا۔

"مہاراج جی! میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے اس عورت پر شک ہے کہ یہ دشمن کے ایجنٹوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو اس کی کسی حرکت سے یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی ہو سکتا ہے میری نگاہ دھوکا کھا گئی ہو۔ اب اوپر سے سگنل ملا ہے تو میں بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ اس عورت نرملا کماری کا پاکستان یا کشمیری کمانڈو سے کوئی نہ کوئی رابطہ ضرور ہے۔"

ایس پی مہتہ نے سول پولیس کے افسروں کی طرح فوراً" کہا۔

"تو مہاراج جی ہم آج ہی اسے پکڑ کر تھانے لے آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں اس طرح تو اس کے ساتھی روپوش ہو جائیں گے۔ انڈر گراؤنڈ چلے جائیں گے۔"

"پھر مہاراج جی آپ کا سجھاؤ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "پہلے مجھے اس عورت کے ساتھ علیحدگی میں دو تین ملاقاتیں کر لینے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس سے باتوں ہی باتوں میں اس کے پاکستانی کشمیری ساتھیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب ہمیں ان لوگوں کا سراغ معلوم ہو جائے گا تو سب سے پہلے ہم ان جاسوسوں کو چھاپہ مار کر گرفتار کریں گے۔ نرملا کماری تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس کو تو ہم جب چاہیں پکڑ سکتے ہیں۔"

یہ بات ایس پی مہتہ کی سمجھ میں آ گئی۔ کہنے لگا۔

"یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں آج شام کو چندو شاہ کے گھر جا کر نرملا کماری سے ملاقات کرتا ہوں
مجھے یقین ہے کہ چندو شاہ کو نرملا کماری سے میری علیحدگی میں ملاقات پر کوئی
اعتراض نہیں ہوگا۔"

ایس پی مہتہ جھکتے ہوئے بولا۔

"مہاراج جی! چندو شاہ تو بڑا خوش ہوگا۔ وہ تو خود نرملا کماری آپ کے
حضور پیش کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں میرے سامنے ایسی بات زبان پر نہیں لانی چاہیے۔ میں اس قسم کا
آفیسر نہیں ہوں۔ بال ٹھاکرے جی نے ہمیں سب سے پہلی سکشا جو دی تھی وہ یہ
تھی کہ اپنے کریکٹر کو ہنومان جی کے مانند محفوظ رکھنا ہے۔"

ایس پی مہتہ بال ٹھاکرے کا نام سن کر سہم سا گیا اور بولا۔

"مہاراج جی غلطی ہو گئی۔ شما کر دیں۔"

میں نے اس کی بات سنی اور ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"تم چندو شاہ کو فون کر دو کہ سپیشل انٹیلی جینس آفیسر دھرم چند جی آ[illegible]
شام کو اس کے پاس چائے پینے آئیں گے۔ تم یہی کہنا کہ وہ تو نہیں آتے [illegible]
لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے راضی کر لیا ہے۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے مہاراج جی! میں اسے فون کر دوں گا۔ ہم چھ سات [illegible]
وہاں پہنچ جائیں ۔۔۔"

ایس پی مہتہ اپنے آپ کو بھی میرے ساتھ نتھی کر رہا تھا۔ میں نے ا[illegible]
وہیں ٹوک دیا۔

"نہیں مہتہ صاحب۔ اس مشن پر میں اکیلا ہی جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے مہاراج جی!"

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں وہاں سے واپس اپنے ہوسٹل میں آ گیا۔ شام

ٹھیک سات بجے میں پولیس کی سٹاف کار میں چندو شاہ کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہ پہلے سے میرے انتظار میں تھا۔ نرملا کماری کو اس نے بڑی قیمتی ریشمی ساڑھی پہنائی ہوئی تھی۔ بڑے تپاک سے ملا۔ جوس پلایا' پھر کھانے کے لیے کہنے لگا۔ میں نے کہا۔

"شاہ جی کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔ بس چائے پی لوں گا۔ آج آپ لوگوں سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ اصل میں آپ کا سبھاؤ ایسا ہے کہ میں آپ کو اور نرملا جی کو بڑا پسند کرنے لگا ہوں۔"

چندو شاہ کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ سنٹرل گورنمنٹ کے اہم ترین محکموں کی چابی میرے ہاتھ میں ہے اور اگر میں اس کی سفارش کر دوں تو اسے کوئی بھی نہیں ٹال سکے گا۔ میری دھاک ایس پی مہتہ نے بہت بٹھا رکھی تھی۔ نرملا کماری میرے پاس صوفے پر بیٹھی تھی۔ چندو شاہ نے جان بوجھ کر ہمیں تنہائی کا موقع دیتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ نرملاجی سے باتیں کریں میں سامنے والے سٹور سے ہو کر ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

چندو شاہ چلا گیا۔ کمرے میں میں اور نرملا کماری اکیلے رہ گئے۔ میں اس کش مکش میں تھا کہ نرملا کماری پر اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں یا نہ کروں۔ اگر اس پر یہ ظاہر نہیں کرتا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہوگی کہ ہندو ہوتے ہوئے مجھے ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ میں راستے میں بھی یہی سوچتا رہا تھا اور وہاں بیٹھا نرملا کماری سے موسم کی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آخر میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے ہرگز ہرگز یہ راز نہیں بتاؤں گا کہ میں حقیقت میں مسلمان ہوں۔ یہ راز بتانے سے کوئی خاص فائدہ تو مجھے نہیں پہنچ سکتا تھا مگر بے شمار مسائل اور خطرناک پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ یہ میرا سب سے اہم

راز تھا۔ میں اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے نرملا کماری سے اصل موضوع پر اچانک بات شروع کر دی۔

ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے میں نے صاف لفظوں میں اس سے کہا۔

"نرملا جی! میرے ساتھ ایک عجیب بات ہوئی ہے۔"

وہ میری طرف تکنے لگی۔

"کونسی بات سر؟"

میں نے کہا۔ "نرملا جی! ویسے تو میں ہندو ہوں اور برہمن ہندو ہوں۔ مگر مسلمان درویشوں اور پیر فقیروں سے مجھے شروع ہی سے بڑی عقیدت رہی ہے۔ میں نے انبالے اور دلی میں مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر چلے بھی کاٹے ہیں۔ یہ بات آپ کو بڑی عجیب لگے گی۔"

نرملا کماری نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر جی! ایسا ہو جاتا ہے۔ سادھو جوگی اور مسلمان درویش یہ سب محبت کے آدمی ہوتے ہیں۔ اب جالندھر والے رنگ سائیں کے مزار کو ہی دیکھ لیں۔ وہاں کا متولی ایک سکھ ہے اور وہاں پر ہندو بھی منتیں ماننے آتے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔

"میں رنگ سائیں جی کی ہی بات کرنے لگا تھا۔"

میں نے دیکھا کہ نرملا کماری کے چہرے پر تجسس کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ کیونکہ وہ کل رات کو ہی رنگ سائیں کے مزار پر دعا مانگنے گئی تھی۔ اس نے بے اختیار پوچھا۔

"کیا آپ کو بھی رنگ سائیں جی سے عقیدت ہے؟"

میں نے کہا۔ "عقیدت ہی نہیں میں تو ان کا پجاری ہوں۔ میں نے ان کی ۔ ی کرامتیں، بڑے چمتکار دیکھے ہیں۔ ایک کرامت تو آج رات کی ہے۔ وہ میں تمہیں سناتا ہوں۔"

نرملا کماری خاموش اور ساکت نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "کل رات رنگ سائیں جی میرے خواب میں آئے اور کہنے لگے دھرم چند! تم ہمارے بالکے ہو۔ ہمارے سیوک ہو اور ہم سے محبت رکھتے ہو۔ ہمارا ایک کام کر دو۔ میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی سائیں جی حکم کریں۔ میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ رنگ سائیں جی نے مجھے ایک ایسی بات سنائی کہ جس کو سن کر میں حیران رہ گیا۔"

نرملا کماری کا تجسّس بڑھ گیا تھا کہنے لگی۔

"سائیں جی نے کیا بتایا سر؟"

میں نے کہا۔ "رنگ سائیں جی نے کہا۔ جالندھر سٹی میں چندو شاہ کے گھر جاؤ۔ اس نے ایک عورت کو گھر میں ڈال رکھا ہے۔ اس عورت کا نام نرملا کماری ہے۔ مگر وہ اصل میں مسلمان ہے وہ اس وقت بڑی مصیبت میں ہے۔ تم جا کر اس کی مصیبت سنو اور اس کی مدد کرو۔ نرملا جی! جب میں نے یہ سنا کہ چندو شاہ کے ہاں جو عورت ہے وہ مسلمان ہے تو میں حیران پریشان ہو کر رہ گیا۔ میں نے رنگ سائیں جی سے کہا۔ مہاراج! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ عورت ہندو ہے اور اس کا نام نرملا کماری ہے۔ اس پر رنگ سائیں جی نے کسی قدر سختی سے کہا۔ تم آگے سے مت بولو۔ جو ہم کہہ رہے ہیں ویسا ہی کرو۔ وہ عورت بڑی مصیبت کی ماری ہے اور مسلمان ہے۔ جا کر اس کی دکھ بھری کہانی سنو اور اس کو چندو شاہ کے جہنم سے نجات دلاؤ۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ نرملا کماری جی! میں تو صبح سے بے چین تھا کہ کسی طرح آپ کے پاس پہنچوں۔ آخر ایس پی مہتہ سے کہہ کر چندو شاہ سے ٹائم طے کیا اور میں تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہاری دکھ بھری داستان کیا ہے۔ مجھ سے کسی بات کو چھپانا نہیں۔ کیونکہ سائیں جی نے خواب میں آ کر مجھ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ صرف تمہاری دکھ بھری داستان نہیں بتائی۔ یہ بتا دیا

ہے کہ تم مسلمان ہو۔ ایک بات میں تمہیں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر بھروسہ
کرنا۔ تمہارا ہر راز میرے دل میں راز بن کر رہے گا۔ میں دنیا کے انسانوں سے
دھوکا کر سکتا ہوں لیکن رنگ سائیں جی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ میرے
مرشد ہیں۔ میرے گورو دیو ہیں۔ اب بے دھڑک ہو کر مجھے اپنی بپتا سناؤ اور
مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے وہ ساری باتیں بیان کر دی تھیں جو نرملا کماری نے گزشتہ رات کو
رنگ سائیں کے مزار پر اپنی زبان سے کہی تھیں اور چندو شاہ سے نجات مانگی
تھی۔ میں نے صرف یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کشمیر اپنے رشتے داروں کے پاس جانا
چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کا اصلی مسلمانوں والا نام بھی نہیں بتایا
تھا۔ میری گفتگو کا نرملا کماری پر شدید رد عمل ہوا۔ کیونکہ وہ گزشتہ رات ہی
سائیں جی کے مزار پر فریاد لے کر گئی تھی اور میں اس کے اگلے دن اس کے
پاس آ کر اسے یہ خوش خبری سنا رہا تھا کہ سائیں جی رات میرے خواب میں
آئے تھے اور انہوں نے مجھے اس کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔

نرملا کماری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے آسمان کی
طرف دیکھا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اللہ پاک تو نے سائیں جی کے ذریعے میری دعا سن لی۔ میں کتنی خوش
نصیب ہوں۔"

میں نے کہا۔

"نرملا! مجھے مختصر الفاظ میں بتاؤ کہ سائیں جی نے خواب میں آ کر جو کچھ کہا
ہے کیا یہ سب درست ہے؟ اگر درست ہے تو میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

نرملا کماری نے مجھے اپنی دکھ بھری داستان سناتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے ماں
باپ اور دو بھائیوں کے ساتھ ڈھاکہ کے محمد پور کے علاقے میں رہتی تھی۔ وہ
لوگ کشمیر سے یہاں آئے تھے۔ اس کا باپ قالینوں کے رفو کا بڑا ماہر تھا۔ محمد پور

میں اسے ایک دکان پر قالینوں کی رفوگری کا کام مل گیا تھا۔ انہیں مشرقی پاکستان میں آئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ وہاں ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس کے بعد انڈیا نے حملہ کر دیا۔ پھر مکتی باہنی والے آ گئے۔ وہ غیر بنگالی مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کھلی گراؤنڈ میں لے جاتے جہاں ان کی آنکھیں نکالی جاتیں۔ ایک ایک عضو کاٹا جاتا اور بڑی اذیت دے کر شہید کر دیا جاتا۔ جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ ہم اس وقت گھر پر ہی تھے۔ جب مکتی باہنی کے دس بارہ فوجی دروازہ توڑ کر اندر آ گئے۔ میں اور میری والدہ کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن انہوں نے میرے سامنے میرے والد' میری ماں اور میرے بھائیوں کو گولیاں مار کر شہید کر دیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ باہر ایک جیپ میں مجھے ڈالا اور خدا جانے کہاں لے جانے کے لیے جیپ روانہ ہو گئی۔ نرملا کماری کہہ رہی تھی۔

"میری حالت ایسی تھی کہ صدمے کی وجہ سے کوئی ہوش نہ تھا۔ ایک ریلوے سٹیشن آ گیا۔ یہاں مجھے ایک دوسرے ٹرک میں ڈال دیا گیا۔ اس ٹرک میں پہلے ہی سے کچھ لڑکیاں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ ٹرک سارا دن ساری رات چلتا رہا۔ آخر ایک بہت بڑا شہر آ گیا۔ یہ شہر کلکتہ تھا۔ ہمیں شہر کے باہر ایک مکان میں بند کر کے رکھا گیا۔ دوسرے روز کچھ لوگ آ گئے۔ وہ ہمیں ٹٹول کر دیکھتے۔ جس طرح قصائی بکریوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ مکتی باہنی کے سارے آدمی کلکتے کے بنگالی ہندو تھے۔ انہوں نے ہم سب لڑکیوں کو فروخت کر دیا۔ ان خریدنے والوں میں چندو شاہ بھی تھا۔ اس نے مجھے خرید لیا۔ میرا نام اس نے نرملا کماری رکھ دیا اور دلی میں آ کر ایک کوٹھی میں رہنے لگا۔ وہ مجھے سرکاری افسروں کے آگے پیش کرتا اور لاکھوں کے ٹھیکے حاصل کرتا۔ اس کے بعد وہ جالندھر آ گیا۔ یہاں اس نے یہ بنگلہ خرید لیا۔ یہ ہے میری مختصر دکھ بھری کہانی۔"

"تم اب کہاں جانا چاہتی ہو۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اور تمہارا اصلی مسلمانوں والا نام کیا ہے۔"

نرملا کماری نے ساڑھی کے پلو سے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو خشک کر کے کہا۔

"میرا اصلی نام سلطانہ بی بی ہے۔ ہمارے رشتے دار کشمیر میں بڈگام کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ اگر تم مجھے کسی طرح وہاں پہنچا دو تو میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گی۔"

میں اسے بڑی آسانی سے کشمیر پہنچا سکتا تھا۔ لیکن میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ چونکہ اسے ہمیشہ کشمیری مجاہدوں کی جستجو رہی تھی جو اسے چندو شاہ کے جہنم سے نکال کر کشمیر پہنچا دیں اس لیے ہو سکتا ہے اس دوران اس کا رابطہ کسی کشمیری کمانڈو سے رہا ہو۔ میں نے اس سے کہا۔

"سلطانہ بی بی! تم جانتی ہو کہ میں ہندو ہوں اور سرکار کا ایک ذمے دار افسر ہوں۔ کشمیر میں جنگ ہو رہی ہے۔ اگر میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے گیا تو ممکن ہے وہاں لوگ مجھے پہچان لیں یا راستے میں ہی ہم پکڑے جائیں کیونکہ مجھے کشمیر پہنچنے کے خفیہ اور محفوظ راستوں کا علم نہیں ہے۔ ہاں میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اس دوران کوئی کشمیری مجاہد ہمارے ہاتھ آ گیا تو میں اس سے جموں سے آگے کشمیر تک خفیہ پہاڑی راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے تمہیں اپنے کسی ذمے دار آدمی کی حفاظت میں تمہارے رشتے داروں کے پاس پہنچا دوں گا۔"

میرا ہوا میں چلایا ہوا تیر کام کر گیا اور ٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھا سلطانہ بی بی عرف نرملا کماری کہنے لگی۔

"دھرم چند جی! تم بھی سائیں جی کے مرید ہو۔ میں بھی سائیں جی کی مریدنی ہوں۔ اسی طرح سے ہم آپس میں پیر بھائی بہن ہیں۔ اگر تم مجھ سے وعدہ کرو

کہ کسی کے آگے ذکر نہیں کرو گے تو میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔"
میں نے کہا۔
"میں سائیں جی کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔ اب بتاؤ راز کی بات کیا ہے؟"
نرملا کماری نے کہا۔
"ایک بار سائیں جی کے مزار پر رات کے وقت جب میں دعا مانگنے گئی تھی تو مجھے ایک کشمیری مجاہد ملا تھا۔ اس نے چھپ کر میری فریاد سن لی تھی۔ پھر وہ میرے سامنے آگیا کہنے لگا بہن! میں اس وقت ایک خطرناک مشن پر نکلا ہوں۔ تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی بار آیا تو تمہیں ضرور اپنے ساتھ کشمیر لے چلوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے تمہاری آمد کا کیسے پتہ چلے گا؟ اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ تم دس پندرہ دنوں کے بعد امرتسر شہر کی پرانی مسجد میں جانا۔ وہاں بابا ہمدانی حجرے میں رہتے ہیں۔ ان سے میرے بارے میں معلوم کر لینا۔ اگر میں آیا تو انہیں میرے ٹھکانے کا پتہ ہوگا۔ اس بات کو آج ایک مہینہ گزر گیا ہے میں کیسے امرتسر جا سکتی ہوں۔ چندو شاہ تو مجھے ایک پل کے لیے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا اس کے باڈی گارڈ ہر وقت رائفلیں لیے میرے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔"
میں نے سلطانہ بی بی عرف نرملا کماری سے پوچھا۔
"اس کشمیری مجاہد نے تمہیں اپنا نام بتایا تھا؟"
وہ کچھ یاد کر کے بولی۔
"شیر باز۔ ہاں یہی نام اس نے بتایا تھا۔"
میں نے نرملا کماری سے کہا۔
تم اطمینان رکھو۔ شیر باز کے متعلق میں امرتسر جا کر معلومات حاصل کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھے مل گیا تو میں تمہیں خفیہ طریقے سے اس کے پاس لے جاؤں گا

اور تمہیں اس جہنم سے نجات مل جائے گی۔"

سلطانہ بی بی عرف نرملا کماری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکنے لگے۔ کہنے لگی۔

"دھرم چند جی! آپ انسان کی شکل میں کوئی فرشتہ ہیں۔"

اتنے میں چندو شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا لفافہ تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ کے لیے ڈمپل سکاٹ بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ اب آپ رات کا بھوجن میرے ساتھ ہی کریں گے۔"

ڈمپل سکاٹ شراب کی ایک قسم ہے جس کا شمار اعلیٰ ترین شرابوں میں ہوتا ہے۔ ڈمپل اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی بوتل میں دونوں جانب چھوٹا سا گڑھا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

"چندو شاہ جی! میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ بس چائے آپ کے ساتھ ضرور پی لوں گا۔"

چندو شاہ بڑے خوشامدانہ انداز میں اصرار کرنے لگا لیکن میں نے اسے سختی سے انکار کر دیا۔ چائے میز پر لگا دی گئی۔ چائے کے ساتھ کھانے کو بہت کچھ تھا۔ جالندھر کی مشہور مٹھائیاں تھیں۔ میں نے چائے وغیرہ پی۔ کچھ دیر چندو شاہ سے باتیں کرتا رہا۔ دلی کے قریب ایک چھوٹا سا ہائیڈل پاور ڈیم بن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس کا ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں چندو شاہ کو ابھی قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے کہا کہ جب ٹینڈرز کا اعلان ہو تو وہ ٹینڈر بھر کر داخل کرا دے۔ اس کے بعد میں دیکھ لوں گا۔ چندو شاہ بڑا خوش ہوا۔ نرملا کماری یعنی سلطانہ بی بی بھی بڑی خوش تھی۔ اسے اس جہنم سے نجات حاصل کرنے کی راہ نظر آ گئی تھی۔ اسے ضرور خوش ہونا چاہیے تھا۔

اب مجھے کشمیری مجاہد شیر باز کا پتہ کرنے امرتسر جانا تھا۔ امرتسر جانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن میرے پیچھے سی آئی ڈی کا جو آدمی لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر امرتسر پہنچنا تھا۔ اگرچہ اس کے بعد میں نے اپنے پیچھے لگے ہوئے خفیہ سروس کے آدمی کو بالکل نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے ہر حالت میں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ پیچھے لگے ہوئے خفیہ سروس کے آدمی بہت کم نظر آیا کرتے ہیں۔ میں نے وہی حربہ استعمال کیا جس کو استعمال کر کے میں آدھی رات کو سائیں جی کے مزار پر گیا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی کشمیری کمانڈو کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے اور اسے اعتماد میں لے کر جالندھر کے علاوہ بھارت کے دوسرے شہروں میں بھی پاکستان کے خلاف جو فوجی تیاریوں کے مراکز ہیں ان کو تباہ کیا جائے۔ کیونکہ اس دوران میں نے بھارت کے کئی شہروں میں بھارت کی زبردست فوجی تیاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ تیاریاں خفیہ مقامات پر سنگر میزائیلوں' پرتھوی میزائیلوں اور آکاش میزائیلوں کی شکل میں ہو رہی تھیں۔ ایک مقام پر تو میرے سننے میں آیا تھا بھارت نیو کلروار ہیڈ کی تیاریاں بھی شروع کر چکا ہے۔ اتنے بڑے محاذ پر میں اکیلا نہیں لڑ سکتا تھا۔ علی شاہ اور امداد علی مجھ سے جدا ہو چکے تھے۔ اب ان کا ملنا مشکل تھا۔ شیر باز کشمیری مجاہد کا پتہ مجھے سلطانہ بی بی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ میں اس سے ہر حالت میں ملنا چاہتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اسے بتا دوں گا کہ میں دھرم چند نہیں ہوں بلکہ مالیر کوٹلہ کا ایک مسلمان مجاہد

ہوں جو بھارت میں اور کشمیر میں مسلمانوں پر بھارتی ظلم و ستم کیخلاف جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور ایک ہندو نام سے شیو سینا کا چمچہ بن کر بال ٹھاکرے کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اسے یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

چندو شاہ کے بنگلے سے میں سیدھا ایس پی مہتہ کی کوٹھی پر آیا۔ اسے نرملا کماری سے اپنی ملاقات کی روداد سنائی تاکہ اسے کسی قسم کا مجھ پر شک و شبہ نہ پڑے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نرملا کماری کا کسی بھی پاکستانی یا کشمیری مجاہد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ محض ایک عیش پرست دولت کی خواہشمند عورت ہے اور چندو شاہ کے ساتھ بڑی خوشی سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایس پی مہتہ کہنے لگا۔ "تو پھر اس کو ہم اپنی لسٹ سے خارج کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اگر اس کا ذرا سا بھی پاکستانی جاسوسوں یا کشمیری مجاہدوں سے کوئی تعلق ہوتا تو جس طرح میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے پوچھا تھا وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب ثابت ہوگیا ہے کہ یہ عورت بیکار ہے۔"

ایس پی مہتہ سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے اس سے کہا کہ مجھے کل ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے دلی جانا پڑ گیا ہے۔ دن کی فلائیٹ میں سیٹ مل گئی تو دوپہر کے بعد ہی واپس آ جاؤں گا۔ اگر دوپہر کی فلائیٹ میں سیٹ ملی تو رات کو واپس آ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے اپنے ہوسٹل کی طرف آ گیا۔

میں نے کمرے میں آ کر سوچا کہ اب جبکہ میں نے ایس پی مہتہ کو بتا دیا ہے کہ میں کل صبح کی کسی فلائیٹ میں دلی جا رہا ہوں تو پھر بھیس بدل کر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ سی آئی ڈی کا آدمی اگر واقعی میرے پیچھے لگا ہوا ہے تو وہ زیادہ

سے زیادہ ایئر پورٹ تک ہی میرے پیچھے آئے گا۔ اسے میرے ساتھ طیارے میں سوار ہو کر دلی جانے کی کیا ضرورت ہوگی۔ میں نے اسی وقت فون اٹھا کر انڈیا کی ایئر کمپنی کو فون کر دیا۔ پتہ چلا کہ دن کے سوا آٹھ بجے کی فلائیٹ میں مجھے جگہ مل جائے گی۔ میں نے اسی وقت گاڑی پکڑی اور ایئر انڈیا (شاید یہی نام تھا اس ہوائی کمپنی کا) کے آفس پہنچ گیا۔ امرتسر کا ٹکٹ خریدا اور صبح سوا آٹھ بجے والی فلائیٹ میں سیٹ کنفرم کروا لی۔ وہاں میں نے اپنا نام دھرم چند کی جگہ کوئی دوسرا ہندو نام لکھوایا تھا۔ تاکہ اگر سی آئی ڈی والا آدمی بعد میں معلوم بھی کرے تو اسے میرا نام معلوم نہ ہو سکے۔

میں صبح ساڑھے سات بجے ایئر پورٹ پر پہنچ گیا۔ بورڈنگ کارڈ لینے سے پہلے میں اس بات کی پوری تسلی کر لی تھی کہ میرے پیچھے کوئی مشتبہ شخص نہیں لگا ہوا۔ کسی وقت مجھے خیال آتا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ کیونکہ اس رات جو آدمی سٹی پولیس جالندھر کے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے باہر کانسٹیبل کے پاس کھیس کی بکل مارے بیٹھا تھا وہ اس کے بعد مجھے ایک بار بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ بہرحال میرے نازک اور خطرناک مشن کا تقاضا تھا کہ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاؤں۔

یہ چھوٹا دس پندرہ سیٹوں والا فوکر جہاز تھا۔ اس نے بیس منٹ میں مجھے امرتسر پہنچا دیا۔ میں ایئر پورٹ سے نکل کر سیدھا امرتسر کی پرانی مسجد کی طرف چل پڑا۔ یہ میں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امرتسر میں اس نام کی کوئی مسجد نہیں ہے اور بابا ہمدانی کا کسی مسجد میں حجرہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک مسلمان کشمیری بزرگ امرتسر شہر میں موجود تھا۔ کیونکہ کشمیر میں حریت پسندوں کی قابض بھارتی فوجوں کے خلاف جنگ آج بھی ہو رہی ہے اور وہ کشمیری بزرگ آج بھی امرتسر میں موجود ہے۔ میں کھدر کے کرتے پاجامے میں تھا اوپر گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں گلو بند تھا۔ ہاتھ میں کوئی تھیلا یا بریف کیس نہیں

تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ امرتسر کے جس علاقے میں وہ مسجد جہاں بھی تھی میں وہاں آکر وضو کر کے مسجد میں نفل پڑھنے لگا۔ ظاہر ہے وہ کشمیری بزرگ جو وہاں پر یقینی طور پر موجود تھا میرے پوچھنے پر کہ کشمیری مجاہد شیر باز تو یہاں نہیں آیا' کبھی نہیں بتائے گا کہ وہ کب آیا تھا اور کب آئے گا۔ اس کے لیے بڑی ہوشیاری اور عقل مندی سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

دو نفل پڑھنے کے بعد میں وہیں مسجد میں ایک طرف ہو کر صف پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مسجد تقریباً" خالی تھی یہ اور امرتسر کی دو ایک اور مسجدیں جو امرتسری مسلمان چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے تھے کشمیر سے آئے ہوئے محنت کش کشمیری مسلمانوں نے سنبھال لی تھیں۔ وہاں دبی آواز میں پانچ وقت اذان بھی ہوتی تھی اور وہاں جو تھوڑے بہت کشمیری مزدور رہتے تھے وہ نماز پڑھنے آ جاتے تھے۔ میری نگاہیں کشمیری بزرگ کو تلاش کر رہی تھیں جس کا نام نرملا کماری نے بابا ہمدانی بتایا تھا۔ اصل اس نے کوئی دوسرا نام بتایا تھا مگر میں نے اس کا فرضی نام بابا ہمدانی رکھ دیا ہے۔ کشمیری مجاہد کا اصلی نام شیر باز ہی اس کا فرضی نام اس لیے نہیں رکھا کہ یہ مجاہد تو میدان جنگ میں دشمن کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ان کو پولیس کہاں پکڑنے جا سکتی تھی۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا اور مسجد کی چھت پر ایک کشمیری اذان دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چھ سات کشمیری محنت کش مزدور آ گئے۔ ایک سرخ و سفید نورانی چہرے والا بزرگ بھی حجرے سے نکل کر آ گیا۔ نماز کھڑی ہوگئی۔ میں بھی نمازیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد دبی زبان میں دعا مانگی گئی اور بہت ہی دبی زبان میں کشمیری مجاہدوں کی کامیابی کی دعا کی گئی۔

یہ کشمیری محنت کش مزدور لوگ کچھ گھبرائے گھبرائے سے لگ رہے تھے۔ دعا کے بعد آپس میں کچھ دیر سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے اٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے میری طرف مشکوک نظروں سے

ضرور دیکھا۔ کشمیری بزرگ نے بھی ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے حجرے میں
چلے گئے۔ میں نے یہی سمجھا کہ کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اس
وجہ سے یہ کشمیری لوگ کسی بھی اجنبی کو جو مسجد میں آئے مشتبہ نگاہوں سے ہی
دیکھیں گے۔ اس وقت میں نے کشمیری بزرگ سے کوئی بات کرنی مناسب نہیں
سمجھی اور مسجد سے نکل کر سامنے والے کشمیر ہوٹل میں آگیا۔ یہ ہوٹل ایک
دکان تھا جس کے تین چار کمرے تھے۔ جو بازار ہی سے نظر آ رہے تھے۔ معلوم
ہوا کہ یہ ایک کشمیری مسلمان کا ہوٹل ہے اور کشمیر سے جو کاروباری لوگ کبھی
کبھار کاروبار کے سلسلے میں امرتسر ایک دو دن کے لیے آتے ہیں اسی ہوٹل میں
قیام کرتے ہیں۔ کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر کا کشمیری مسلمان سر پر گلوبند لپیٹے بیٹھا
تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے ایک کمرہ چاہیے۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک
دیکھا۔ پھر کوئی بات نہ کی اور پوچھا۔

"کتنے دن رہو گے بابو؟"

میں نے کہا۔ "مالیر کوٹلہ سے آیا ہوں پلاسٹک کا کاروبار شروع کیا ہے۔
امرتسر میں مارکیٹ کا حال چال معلوم کرنے آیا ہوں۔ دو ایک دن لگ جائیں
گے۔"

"نام کیا ہے بابو؟"

"غلام حسن۔"

"پتہ لکھواؤ۔"

میں نے مالیر کوٹلہ کا فرضی پتہ لکھوا دیا۔ اس نے ایک لڑکے کو آواز دے
کر کہا۔ "صاحب کو کونے والے کمرے میں لے جاؤ۔"

لڑکا جو مجھے کونے والے کمرے میں لے کر آیا اصل کشمیری تھا اور کشمیری
لہجے میں اردو اور پنجابی بولتا تھا۔ کمرے میں ایک چارپائی پر بستر لگا تھا۔ پرانا لحاف
تہہ کیا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی تپائی پڑی تھی۔ وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں

نے لڑکے کو پانچ روپے کا نوٹ دیا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "غیشو نام ہے جی میرا۔"

"یار یہ تمہارے بازار میں اتنی پولیس کیوں کھڑی ہے۔ کیا یہاں کسی جوئے خانے میں چھاپہ پڑا ہے۔"

لڑکا بڑی رازداری سے کہنے لگا۔

"صاحب جی! رات کو ایک کشمیری مجاہد پکڑا گیا ہے۔ پولیس اسی وجہ سے یہاں چکر لگا رہی ہے۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ مین نے جیب سے پانچ روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر کشمیری لڑکے کو دیا اور کہا۔

"غیشو! یہ کشمیری مجاہد یہاں ہوٹل میں پکڑا گیا تھا کیا؟"

وہ دوڑ کر دروازے کے پاس گیا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر واپس آ کر کہنے لگا۔

"صاحب جی! آپ بھی ہوشیار رہیں۔ کہیں پولیس آپ کو بھی کشمیری مجاہد سمجھ کر نہ پکڑ لے۔"

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار میں کوئی کشمیری مجاہد تو نہیں ہوں۔"

"صاحب جی! اس علاقے میں پولیس کو جس مسلمان کو چاہے کشمیریوں کا جاسوس سمجھ کر پکڑ کر لے جاتی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"جو کشمیری کمانڈو پکڑا گیا ہے۔ اس کا نام کیا تھا؟ اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں نام تو ضرور لکھوایا ہوگا۔"

کشمیری لڑکا ہنسنے لگا۔ بولا۔

"صاحب جی! آپ بھی مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس نے نام غلط لکھوایا تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور ہے جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا چاہے آپ مجھے ایک ہزار روپیہ کیوں نہ دے دیں۔"

یہ کہہ کر کشمیری لڑکا کمرے سے نکل گیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ رات اسی ہوٹل سے ایک کشمیری مجاہد پکڑا گیا ہے۔ نرملا کماری عرف سلطانہ بی بی نے کہا تھا کہ شیر باز کشمیری مجاہد ان دنوں میں امرتسر کشمیری بزرگ کے پاس آنے والا تھا۔ کہیں یہ کشمیری مجاہد شیر باز ہی تو نہیں؟ اصل حقیقت کا علم پولیس سٹیشن پر جا کر ہی ہو سکتا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوٹل کے مالک سے کہا۔

"میں ذرا بازار مارکیٹ کا پتہ کرنے جا رہا ہوں۔ کھانا ہوٹل میں ہی آ کر کھاؤں گا۔"

وہ بولا۔ "کوئی بات نہیں جی بے شک جائیں۔"

وہ مجھے برابر مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ امرتسر کے یہ سارے بازار میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں وہاں سے پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ پروگرام یہ تھا کہ تھانے پہنچ کر سب سے پہلے یہ تصدیق کروں گا کہ پولیس نے جو کشمیری کمانڈو پکڑا ہے وہ شیر باز ہی ہے۔ اس کے بعد اپنے خفیہ نمبر 211_L/T کو استعمال کر کے اسے حوالات سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ابھی پولیس سٹیشن کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میں رک گیا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں کیا کرنے لگا ہوں۔ میں تو خود اپنے ہی جال میں پھنسنے کا بندوبست کر رہا ہوں۔ اگر میں تھانے جا کر انہیں مرکزی حکومت کا سیکرٹ نمبر دکھا کر کشمیری کمانڈو کو چھڑا کر لے گیا تو یہ بات نہ صرف جالندھر سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر کے مہتہ، بلکہ ڈیفنس انٹیلی جینس کے سریندر کوہلی اور وہاں سے بال ٹھاکرے تک پہنچ جائے گی کہ میرے حلیے کا آدمی بھارت کی مرکزی

سیکرٹ سروس کا خاص خفیہ نمبر دکھا کر کشمیری کمانڈو کو نکلوا کر لے گیا ہے اور یہ بات میرے سارے مشن کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی تھی۔ بعض اوقات انسان کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ بڑی ہوشیاری اور بڑی بے خبری میں اپنے ہی لیے گڑھا کھود رہا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اگر عین وقت پر اللہ کی طرف سے مجھے اپنی غلطی کا احساس نہ ہوتا تو میں مارا گیا تھا اور اپنے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔

چنانچہ میں وہیں سے دوسری طرف بازار میں نکل گیا۔

امرتسر کے بازار بڑے گنجان اور تنگ تھے میں بازار سے گزر رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ عین وقت پر مجھے عقل آ گئی اور میں تباہی کے گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بال ٹھاکرے اور ڈیفنس انٹیلی جنیس کے چیف کو پتہ نہ چلتا کہ کشمیری کمانڈو کو دھرم چند حوالات سے نکال کر لے گیا ہے۔ کیونکہ سیکرٹ سروس کا انتہائی خفیہ نمبر بھی میرے پاس تھا۔ میں غور کرنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ میں وہیں سے پرانی مسجد کی طرف روانہ ہوگیا اور مسجد میں آ کر بابا ہمدانی کے حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بابا ہمدانی حجرے میں کچھ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے سامنے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ وہی اجنبی ہے جو کل دن کے وقت مسجد میں نماز پڑھنے آیا تھا۔ انہوں نے پوچھا ”کیا بات ہے بھائی؟“

میں نے کہا۔

”ہمدانی صاحب! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

ہمدانی صاحب پیچھے ہٹ گئے۔ ”آ جاؤ۔“

میں حجرے میں آ کر چھوٹے سے تخت پوش کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ بابا ہمدانی بھی اس تخت پوش پر بیٹھ کر سفید کاغذ پر قلم سے لکھنے میں مصروف ہوگئے

انہوں نے کہا۔

فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

میں نے تمام تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمدانی صاحب! کل پولیس جس کشمیری مجاہد کو گرفتار کر کے لے گئی ہے میں اسے چھڑانے کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔"

بابا ہمدانی نے بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی مجھے اس کشمیری مجاہد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ پولیس جانے اور وہ جانے۔"

میں نے کہا۔ "ہمدانی صاحب! اگر آپ کو کشمیری مجاہدوں سے واقعی کوئی دلچسپی نہیں ہے تو کل آپ نماز کے بعد دبی آواز میں کشمیریوں کی جنگ آزادی میں کامیابی کی دعا کیوں مانگ رہے تھے؟"

بابا ہمدانی نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے دعا مانگی تھی۔ ہر مسلمان کشمیری حریت پسندوں کی کامیابی چاہتا ہے۔"

میں نے ہمدانی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور انتہائی اعتماد کے ساتھ کہا۔

"ہمدانی صاحب! مجھے سی آئی ڈی کا آدمی نہ سمجھیں۔ میں پکا مسلمان ہوں اور کشمیری حریت پرستوں کا دوست ہوں۔ میں کون ہوں کہاں سے آیا ہوں مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بابا ہمدانی نے کاغذ قلم اور تختی ایک طرف رکھ دی ان پر میری صاف صاف باتوں کا اثر ہوگیا تھا۔ کہنے لگے۔

"اگر تم کشمیری مجاہد کو پولیس کی قید سے چھڑا سکتے ہو تو جا کر چھڑا دو۔ میرے پاس کس لیے آئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میری سب سے بڑی مجبوری یہی کہ میں خود پولیس سٹیشن

نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے کسی تیسرے آدمی کو زحمت کرنی پڑے گی۔

"لیکن تیسرا آدمی کشمیری مجاہد کو کیسے چھڑائے گا۔ پولیس تو اسے بھی پکڑ کر اندر کر دے گی۔"

میں نے کہا۔

"جو آدمی کشمیری مجاہد کو چھڑانے کے واسطے پولیس سٹیشن جائے گا میں اسے ایک خفیہ نمبر لکھ کر دوں گا۔ یہ نمبر دکھانے سے تھانیدار خود اٹھ کر حوالات کا دروازہ کھولے گا اور کشمیری مجاہد کو اس آدمی کے سپرد کر دے گا۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لیجئے۔"

"وہ خفیہ نمبر کیا کوئی طلسمی نمبر ہے؟"

"بس اسے طلسمی نمبر ہی سمجھیں بلکہ اس کا اثر طلسم سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ آپ خود دیکھ لیں گے مجھے کوئی ایسا بھروسے کا آدمی دے دیں جس کو خفیہ نمبر دے کر میں پولیس سٹیشن کی طرف روانہ کر دوں۔"

بابا ہمدانی گومگو اور کشمکش کے عالم میں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میری باتوں پر اعتبار کریں یا نہ کریں۔ جب میں نے بھرپور اعتماد کے ساتھ بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ کہنے لگے۔

"ٹھیک ہے میں آپ کو ایک آدمی سے ملواتا ہوں وہ آپ کا خفیہ نمبر لے کر تھانے چلا جائے گا لیکن اگر آپ کا خفیہ نمبر کارگر ثابت نہ ہوا تو پھر سمجھ لیں کہ وہ آدمی بھی واپس نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

بابا ہمدانی کہنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔ اب آپ ایسا کریں کہ امرتسر شہر سے جو سڑک جالندھر کی طرف جاتی ہے وہاں راستے میں امرتسر شہر سے نکلتے ہی بجلی والی نہر آتی ہے۔ اس نہر کے دوسرے کنارے پر آموں کا ایک باغ ہے اس باغ میں ایک جھونپڑا

ملا ہوا ہے۔ تم یہاں سے سیدھے وہاں جاؤ اور جھونپڑے میں بیٹھ کر انتظار کرو۔ وہاں ایک آدمی آئے گا جو تمہیں کہے گا دلی کا موسم کیسا ہے؟ تم سمجھ جانا کہ یہ میرا بھیجا ہوا آدمی ہے۔ اس کا نام حسن بٹ ہوگا۔ وہی آدمی تمہارا کام کرے گا۔"

میں نے ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا اور مسجد والے بازار کی نکڑ سے سائیکل رکشا لیا اور بجلی والی نہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں جلدی اس لیے کر رہا تھا کہ کہیں کشمیری کمانڈو شیر باز کو پولیس امرتسر کی حوالات سے نکال کر جالندھر یا دلی روانہ نہ کر دے۔ میں نہر پر پہنچ گیا۔ وہاں آموں کا باغ دور ہی سے نظر آگیا۔ اس باغ میں ایک جھونپڑا تھا۔ چونکہ آموں کا موسم نہیں تھا۔ اس لیے جھونپڑا خالی پڑا تھا۔ اور باغ بھی خالی خالی تھا۔ میں جھونپڑے میں بیٹھ کر حسن بٹ کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے درختوں میں سے ایک آدمی جھونپڑے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ جھونپڑے میں آکر بیٹھ گیا اور بولا۔

"دلی کا موسم کیسا ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔"

"حسن بٹ۔" اس نے کہا۔

تب میں نے اسے ساری بات اچھی طرح سے سمجھا دی۔ آدمی سمجھدار تھا اور پڑھا لکھا بھی تھا اور کشمیری کمانڈوز کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ سنٹرل خفیہ پولیس کا ایک خاص نمبر ہوتا ہے جس کو دیکھ کر پرائم منسٹر ہاؤس کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ میں نے اسے کاغذ پر خفیہ نمبر لکھ کر دیا اور کہا۔

"یہ نمبر صرف تھانے کے ایس ایچ او کو دکھانا ہے اس کو دینا نہیں ہے۔"

حسن بٹ بولا۔ "مجھے معلوم ہے تم فکر نہ کرو۔ اگر یہ نمبر واقعی انڈیا کی سینٹرل انٹیلی جینس کا خاص نمبر ہے تو میں کمانڈو شیر باز کو لے کر اسی جگہ پہنچ

جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کشمیری کمانڈ کا نام شیر باز ہی ہے؟"

حسن بٹ نے کہا۔ "بالکل شیر باز ہی ہے جناب۔ اس کی گرفتاری کے لیے تو پولیس نے بہت بڑے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔ مگر میں اسے لے کر یہاں نہیں آؤں گا بلکہ اسے ایک دوسری خفیہ جگہ پر لے جاؤں گا۔ آپ اسی جگہ رہیں۔ میں یہاں آ کر آپ کو لے جاؤں گا۔"

میں نے اسے تاکید کی کہ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے پیچھے خفیہ پولیس نہ لگ جائے۔ حسن بٹ نے ایک ایسی بات کی جس سے میں بھی تھوڑا سا شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"سر! آپ کو یہ طلسمی نمبر تو کہیں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ مگر آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی طاقت کس قدر ہے۔ اس نمبر کو دکھا کر اگر کوئی شخص کسی قاتل کو بھی پھانسی کے کوٹھڑے سے نکلوا کر لے جاتا ہے تو خفیہ پولیس کی جرات نہیں کہ وہ پیچھا کرے۔ کیونکہ اس نمبر کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ اس آدمی کی سنٹرل گورنمنٹ کی انٹیلی جینس کو ضرورت ہے اور کوئی خفیہ سروس کا آدمی اس نمبر والے خفیہ سروس والے کا پیچھا نہیں کر سکتا۔ اگر پتہ چل جائے تو پیچھا کرنے والے کو نہ صرف نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ اسے پانچ سال کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔"

یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ بہرحال میں نے حسن بٹ کو مزید ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد میں کچھ دیر جھونپڑے کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ پھر باہر درختوں میں آ کر ٹہلنے لگا۔ سارا علاقہ خالی تھا۔ نہر کنارے ایک سکھ گائے بھینسوں کو لے کر چلا جا رہا تھا۔ جب وہ دور نکل گیا تو میں نہر کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی تیز نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی مشتبہ آدمی

طرف آیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نہر کے پل پر ایک سائیکل رکشا چلا آ رہا تھا۔
میں جلدی سے جھونپڑے میں آ کر بیٹھ گیا۔ رکشا پل کی ایک جانب رک گیا اس
میں سے حسن بٹ باہر نکلا اور رکشے والے کو پیسے دینے کے بعد جھونپڑے کی
طرف آنے لگا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا خدا کرے کہ یہ آدمی کمانڈو شیر باز کو
حوالات سے نکلوانے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ جب وہ جھونپڑے میں آ گیا تو میں
نے بے تابی سے پوچھا۔

"مشن کامیاب رہا حسن بٹ؟"

"کامیاب کیسے نہ ہوتا سر! یہ نمبر تو پردھان منتری کو بھی ایک بار اپنی جگہ
سے ہلا دیتا ہے۔ جب میں نے ایس ایچ او کو یہ نمبر دکھا کر کہا کہ میں کیندری
انٹیلی جینس کی طرف سے آیا ہوں۔ کمانڈو شیر باز سے کیندری انٹیلی جینس نے
ایک خاص کام لینا ہے اس کے لیے اسے دلی طلب کیا گیا ہے اور میں اسے لینے
آیا ہوں۔"

ایس ایچ او سکھ تھا۔ سیکرٹ سروس کا نمبر دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے فوراً
اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"مہاراج آپ اکیلے ہی اسے لے جائیں گے یا میں پولیس کی گارد ساتھ کر
دوں؟"

میں نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ ہمیں
پولیس وین کے ذریعے ریلوے سٹیشن تک پہنچا دیں۔ وہاں ہماری سینٹرل
گورنمنٹ کی مسلح خفیہ پولیس ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ چنانچہ میں نے کمانڈو شیر
باز کو جب حوالات سے نکلوایا تو اس نے مجھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس کی رہائی
کے لیے جال بچھایا گیا ہے۔ میں نے بھی اسے آنکھ مار کر بتا دیا تھا کہ سب ٹھیک
ہے میں نے اسے پولیس وین میں بٹھا دیا۔ پولیس وین سٹیشن پر آ کر رکی تو میں
نے کمانڈو شیر باز کو وین سے باہر نکالا شیر باز کو الٹی ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ پولیس

کو میں نے واپس بھیج دیا اور کمانڈو شیر باز کو لے کر سٹیشن میں داخل ہوگیا۔ تب میں نے اسے بتایا کہ یہ سارا ڈرامہ تمہاری رہائی کے واسطے رچایا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ چلو۔ وہ جہاں ہے میں تمہیں وہاں لیے چلتا ہوں۔"

کمانڈو شیر باز امرتسر ریلوے سٹیشن کے جنوب کی جانب ریلوے لائن کے پاس امرودوں کے باغ میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ حسن بٹ نے اس کی ہتھکڑی کھول دی ہوئی تھی۔ میں نے کمانڈو شیر باز کو دیکھا کہ ایک خوش شکل دراز قد سرخ و سپید کشمیری نوجوان ہے۔ آنکھوں میں غضب کی چمک ہے جیسے بجلیاں چمک رہی ہوں۔ اس وقت پرانے شلوار قمیض میں تھا اوپر مٹیالے رنگ کی جرسی پہن رکھی تھی۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر آئی ہوئی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے میری طرف اپنی چمکیلی آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہ سارا ڈرامہ تم نے کس لیے کھیلا ہے؟ مجھے تم بھی بھارت سرکار کے ٹوڈی خفیہ پولیس والے لگتے ہو۔"

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں پولیس کا آدمی ہوتا تو تمہیں پولیس کی قید سے نکالنے کی مجھے کیا ضرورت تھی؟"

"پھر تم نے مجھ پر یہ عنایت کیوں کی ہے؟ ہم تو اپنی جان کا سودا کر کے کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ تم کہاں سے بیچ میں آ گئے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کمانڈو شیر باز! ابھی میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور تمہیں دشمن کی قید سے آزاد کرانا میرا فرض تھا۔"

"مگر تمہارے پاس سنٹرل انٹیلی جینس کا خفیہ نمبر کہاں سے آ گیا؟ یہ تو مرکزی انٹیلی جینس سیکرٹ ایجنسیوں کے پاس ہی ہوتا ہے۔ یقیناً" تمہارا تعلق بھی بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس سے ہے۔"

حسن بٹ ہمارے مکالمے بڑے غور اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"شیر باز! اس بات کو تو تم ضرور تسلیم کرو گے کہ میں تمہیں گرفتار نہیں بلکہ تمہیں پولیس کی قید سے رہا کروا چکا ہوں۔ اس اعتبار سے میں تمہارا خیر خواہ ثابت ہوتا ہوں۔ باقی ساری باتیں میں تمہیں یہاں سے لے جانے کے بعد بتاؤں گا۔"

"تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

شیر باز نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اچانک کہہ دیا۔

"فی الحال تمہیں سلطانہ بی بی کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔ جس سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے اس کے گاؤں بڈگام پہنچا دو گے۔"

سلطانہ بی بی کا نام سن کر کمانڈو شیر باز چونک پڑا۔ بولا۔

"کیا تم سلطانہ کو جانتے ہو؟ وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟ میں اسی کی طرف جالندھر جا رہا تھا کہ امرتسر میں پکڑ لیا گیا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس سب سے پہلے تو ہم سلطانہ بی بی کے پاس جائیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں بتا دوں گا کہ یہ مرکزی انٹیلی جینس کا خفیہ نمبر میرے پاس کہاں سے آیا ہے۔"

کمانڈو شیر باز نے مجھ سے پوچھا۔

"جالندھر میں تمہارے پاس کوئی ایسی محفوظ خفیہ جگہ ہے جہاں تم سلطانہ بی بی کو لا سکو؟"

تب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس جالندھر میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے اور جگہ ہوتی بھی تو میری موجودگی مین سلطانہ بی بی عرف نرملا کماری کے جالندھر سے فرار ہونے سے پہلے دوسروں کو مجھ پر شبہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں اس روز تنہائی میں دیر تک اس سے باتیں بھی کرتا رہا تھا۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"دوست! اصل بات یہ ہے کہ جالندھر میں میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ یہاں امرتسر میں کسی جگہ چھپ جاتے ہیں۔ میں حسن بٹ کو جالندھر سلطانہ بی بی کے پاس بھیجتا ہوں اور اسے ٹیلی فون پر تاکید بھی کر دیتا ہوں کہ وہ حسن بٹ کے ساتھ فوراً چلی آئے پھر تم لوگ اسے یہاں سے بڈگام اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دینا۔ کیا یہاں امرتسر میں کوئی ایسی الگ تھلگ جگہ ہوگی جہاں ہم دونوں ایک دن کے لیے چھپ سکیں؟"

حسن بٹ کہنے لگا۔

"کیوں نہیں ہم پرانے تالاب والے اپنے خفیہ اڈے پر چلے چلتے ہیں۔"

کمانڈو شیر باز نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جگہ بالکل ٹھیک رہے گی۔ شہر سے دور بھی ہے اور پولیس کو ابھی تک ہمارے اس ٹھکانے کا علم نہیں ہوا۔ علم ہو بھی گیا تو ہمارے پاس طلسمی نمبر موجود ہے۔ پولیس ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے میں جالندھر سلطانہ بی بی کے گھر اسے فون کرنا چاہتا ہوں۔"

حسن بٹ بولا۔

"میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو ٹیلی فون کروائے دیتا ہوں۔"

اس خفیہ جگہ سے نکل کر ہم سنگھ پورے والی سکھوں کی آبادی سے آگے تحصیل پورے میں واقع ایک کشمیری سوداگر کے مکان میں آگئے۔ یہ پشمینے کا

سوداگر تھا۔ اس کے گھر فون لگا ہوا تھا اور وہ کشمیری مجاہدوں کا زبردست ہمدرد تھا۔ میں نے جالندھر کا کوڈ نمبر ڈائیل کرنے کے بعد نرملا کماری کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی نوکر یا چندو شاہ دوسری طرف سے بولے گا تو میں فون بند کر دوں گا۔ کسی نے ریسیور اٹھایا۔ پھر نرملا کماری کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ہیلو!

میں نے کہا۔ "کیا نرملا جی بول رہی ہیں؟"

نرملا کماری نے کہا۔ "جی ہاں! آپ کون مہاشے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سلطانہ بی بی! میں تمہارا ہمدرد بھائی بول رہا ہوں۔"

پھر میں نے اپنا تعارف کرایا اور اسے کہا کہ کمانڈو شیر باز مجھے مل گیا ہے۔ میں حسن بٹ نامی ایک آدمی کو تمہارے پاس جالندھر بھیج رہا ہوں۔ تم جیسے بھی ہو اس آدمی کے ساتھ میرے پاس امرتسر پہنچ جاؤ۔ یہاں سے تمہیں تمہارے رشتے داروں کے ہاں بڈگام پہنچا دیا جائے گا۔

سلطانہ بی بی کی آواز وفور مسرت سے کپکپا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "میں تمہارے آدمی کے ساتھ فوراً یہاں سے نکل پڑوں گی۔"

میں نے اسے مزید تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"وہ آج شام تک کسی بھی وقت تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ جس طرح بھی ہو جیسے بھی تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے ساتھ چل پڑنا۔ یہ تمہاری زندگی کا شاید آخری چانس ہے۔ اسے ضائع نہ کرنا اوکے۔" اور میں نے فون بند کر دیا۔ حسن بٹ کہنے لگا۔

"اب ہم پرانے تالاب والے خفیہ اڈے پر چلتے ہیں۔ کمانڈو شیر باز وہاں پہلے ہی پہنچ گیا ہوگا۔ تمہیں وہاں چھوڑ کر میں کوئی بھی لاری پکڑ کر جالندھر روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے تم سلطانہ یعنی نرملا کماری کے مکان کا ایڈریس اور اس کا ٹیلی فون نمبر لکھوا دو۔"

میں نے ایک کاغذ پر نرملا کماری کے بنگلے کا ایڈریس اور اسکا ٹیلی فون نمبر لکھ کر حسن بٹ کو دیا اور کہا۔

"تمہارا یہ کام ہے کہ کسی طرح نرملا کماری کے مکان پر پہنچ کر اسے ساتھ لے کر نکل آؤ یا اگر تم اسے مناسب نہیں سمجھتے تو اسے فون کر کے بتا دینا کہ وہ فلاں جگہ پر آ جائے۔"

حسن بٹ کہنے لگا۔

"میں اسے ٹیلی فون پر ہی بلا لوں گا۔ اس کے گھر جانے سے حالات بگڑ بھی

سکتے ہیں۔"

ہم اسی طرح باتیں کرتے ریلوے لائن عبور کر کے ایک میدان میں آگئے۔ یہاں سکھوں کے زمانے کا ایک پرانا تالاب تھا جو اب سوکھ گیا تھا۔ اور اس طرف کوئی نہیں آتا تھا۔ اس کے قریب ہی ٹاہلی کے درختوں میں اینٹوں کا ایک بھٹہ تھا جو خالی پڑا تھا۔ ان لوگوں کی خفیہ کمیں گاہ اسی بھٹے میں زمین کے نیچے تہہ خانے کی شکل میں بنائی گئی تھی۔ یہاں کمانڈر شیر باز پہلے سے ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے حسن بٹ کو کچھ رقم دے کر جالندھر روانہ کر دیا۔

اب میں اور کمانڈو شیر باز تہہ خانے میں اکیلے تھے۔ یہاں میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا صرف یہ نہیں بتایا کہ میں پاکستان سے دھرم چند نامی ایک دہشت گرد کا ہم شکل بن کر یہاں آیا ہوں۔ اسے صرف یہی بتایا کہ مالیر کوٹلہ کا مسلمان ہوں۔ صرف جذبہ ایمانی اور کشمیری مسلمانوں پر ہوتے ہوئے ظلم و ستم کو دیکھ کر میدان جہاد میں اتر آیا ہوں اور ہندو بن کر پہلے شیو سینا میں بھرتی ہوا۔ پھر اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے بال ٹھاکرے کا با اعتماد ساتھی بن گیا اور اب اس کے خاص آدمی کی حیثیت سے جالندھر میں پرتھوی میزائیل سینٹر کا خفیہ جائزہ لے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ میں نے کمانڈو شیر باز کو پرتھوی میزائیل سینٹر کے اپنے مشن کے بارے میں نہ بتایا۔

"ان لوگوں کے واسطے میں شیو سینا کا زبردست ورکر اور مسلمانوں کا جانی دشمن دھرم چند دہشت گرد ہوں لیکن حقیقت میں میں ان اسلام دشمن فرعونوں کی سازشوں کو برباد کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔"

کشمیری کمانڈو شیر باز میری باتیں غور سے سنتا رہا۔ اس دوران وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے برابر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طوفانی کیفیت تھی۔ لگتا تھا سیاہ بادلوں میں تھوڑی دیر بعد بجلیاں چمک جاتی ہیں۔ میں

نے بات ختم کی تو کمانڈو شیر باز نے میری کلائی کو اتنی مضبوطی سے پکڑ لیا کہ مجھے لگا جیسے میری کلائی کلاشنکوف کے شکنجے میں آ گئی ہے۔ مجھے ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا۔ "تمہارا اصلی نام کیا ہے ساتھی؟"

"حیدر علی۔"

اس کی آنکھوں میں بجلی چمکی اور بولا۔

"اس نام کی لاج رکھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اب میں سلطانہ کو لے کر بڈگام نہیں جاؤں گا۔ یہ ڈیوٹی حسن بٹ انجام دے گا۔ وہ سلطانہ بی بی کو اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دے گا۔ میں یہاں سے تمہارے ساتھ جالندھر چلوں گا۔ ہم میزائیل سینٹر کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیا تم نے کمانڈ ٹریننگ حاصل کی ہوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بس معمولی سی ٹریننگ لی تھی۔"

"بڑے چاقو سے دشمن کا گلا اس طرح کاٹ سکتے ہو کہ دشمن کی آواز بھی نہ نکلے اور خون کا ایک قطرہ بھی تم پر نہ گرے؟"

میں نے کہا۔ "اس کی ٹریننگ مجھے نہیں دی گئی۔"

"پہاڑی علاقے میں رات کے گھپ اندھیرے میں بارش اور بجلیوں کے طوفان میں دشمن کی پوسٹوں کے پیچھے جا کر اس کی پکٹوں اور مورچوں کے نیچے پہنچ کر انہیں اڑا سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "کسی حد تک یہ کام کر لیتا ہوں۔"

کمانڈ شیر باز نے زور سے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور بولا۔

"کمانڈو کو کسی حد تک نہیں کمال کی حد تک کام کرنا ہوتا ہے۔ تم ادھورے ہو۔ میں تمہیں مکمل کر دوں گا۔ میں تمہیں ٹریننگ دوں گا۔"

جو کچھ میں کمانڈو شیر باز سے چاہتا تھا وہ خود ہی تیار ہو گیا تھا مگر وہ بہت زیادہ جذباتی اور سیمابی کیفیت والا کمانڈو تھا۔ یہ چیز کمانڈو کو کبھی کبھی نقصان پہنچا

سکتی ہے۔ مگر میں نے اس کی اس کمزوری کی نشان دہی کرنی مناسب نہ سمجھی۔ کیونکہ کشمیر میں حریت پرست آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ بھارتی فوجیں ان کے گھروں کو دھماکوں سے اڑا رہی تھیں اور کشمیر کی مظلوم بچیوں کے ساتھ غیر انسانی وحشیانہ سلوک کر رہی تھیں۔ اس وقت اس سیمابی جذبے اور چمکتی بجلیوں کی ضرورت تھی جو دشمن پر کڑک کڑک کر گریں۔ لیکن جوگی وال ضلع جالندھر کے پرتھوی میزائیل سینٹر کے مشن کو میں بڑی دور اندیشانہ حکمت عملی سے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ کمانڈو شیر باز کہہ رہا تھا۔

"میں نے کشمیری میں دشمنوں کے کئی ایمونیشن اور پٹرول کے ذخیروں کو کمانڈو ایکشن سے تباہ کیا ہے۔ فوجی کانواؤں کو گھات لگا کر برباد کیا ہے۔ سینکڑوں بھارتی فوجیوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تم اس علاقے یعنی پنجاب میں کس مشن پر آئے تھے؟"

وہ اپنے بالوں میں زور سے ہاتھ پھیر کر بولا۔

"میرا پہلا مشن تو اس مسلمان عورت سلطانہ کو بدبخت ہندو بدمعاش کے چنگل سے نکال کر اس کے گھر کشمیر پہنچانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس ہندو جس کا نام چندو شاہ ہے کو ہلاک کر کے کشمیر کی بیٹی کی بے حرمتی کا انتقام لینا تھا۔ اس کے علاوہ تم بھی جانتے ہو کہ کشمیر پر قابض بھارتی فوج کو سارا اسلحہ اور گولہ بارود پنجاب اور سنٹرل انڈیا کی فوجی چھاؤنی سے سپلائی ہوتا ہے۔ میں ان چھاؤنیوں کے اسلحہ کے سپلائی ڈپوؤں کو تباہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ کشمیر پر قابض فوجیوں کو اتنی تیزی سے اسلحہ اور گولہ بارود کی سپلائی نہ ہوسکے۔ کشمیر میں تو ہماری حریت پرست گوریلے بھارتی فوج کے سپلائی کانوائیوں اور گولہ بارود کے ذخیروں پر کامیاب حملے کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان سرچشموں کو اڑایا جائے جہاں سے یہ سپلائی کشمیر پہنچائی جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم اکیلے یہ کام کیسے کر سکتے ہو؟"
کمانڈو شیر باز نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
"شیر اکیلا ہی دشمن سے لڑتا ہے۔ ایک کمانڈو اگر اس میں عقل ہے تو وہ دشمن کی پوری بریگیڈ کو تباہ کر سکتا ہے اور پھر اب تم بھی میرے ساتھ ہو گے۔ لیکن یہ یقین کرنے کے لیے کہ تم ہندو نہیں ہو مسلمان ہو تمہیں اپنے ختنے دکھانے ہوں گے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو۔"
میں نے کہا۔
"تم اپنی تسلی کر سکتے ہو۔"
کمانڈو شیر باز کا یہ شک و شبہ حق بجانب تھا۔ جب اس نے میرے ختنے دیکھے تو اسکی تسلی ہو گئی کہنے لگا۔
"اب ایک مسلمان ہونے کے ناطے میں تمہارے بیان پر یقین کر لیتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھی ہو اور ہماری جنگ آزادی کے لیے کام کر رہے ہو اگر یہ بات کسی وقت ظاہر ہو گئی کہ تم سرکار کے مسلمان پٹھو ہو اور خفیہ پولیس کے مخبر ہو تو مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ میں تمہیں، تم جہاں بھی ہو گے جس حالت میں بھی ہو گے بڑی آسانی سے ہلاک کر سکوں گا۔"
مجھے کمانڈو شیر باز کی ایمانی جذبے والی پر جوش باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ مجھے دشمنوں کے ملک میں ایک ایسے ہی جوشیلے اور جانباز کمانڈو کی ضرورت تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"شیر باز! یہ بات تم نے اس لیے کہہ دی کہ تم میرے ماضی سے واقف نہیں ہو۔ تم مجھے بالکل نہیں جانتے لیکن وقت آنے پر تمہیں اپنے آپ میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا اور تم مجھ سے پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگو گے۔ لیکن ایک بات کا میں تم سے وعدہ لینا چاہتا ہوں۔"
"کونسی بات؟" کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"یہ کہ ابھی تم اپنے کسی کمانڈو ساتھی اور کشمیری مجاہد کو میرے بارے میں یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں دھرم چند نہیں ہوں بلکہ مجاہد کمانڈو ہوں اور ان کی جنگ آزادی اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگائے دشمنوں کے پیٹ میں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"وعدہ رہا' پکا وعدہ۔"

حسن بٹ یہاں آتے ہوئے کھانے کے لیے نان کباب لفافے میں لپیٹ کر لے آیا تھا۔ ہم دونوں نے وہیں بیٹھ کر نان کباب کھائے۔ حسن بٹ کو جالندھر گئے ہوئے دو ڈھائی گھنٹے ہوگئے تھے۔ امرتسر سے جالندھر چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ دوپہر کے بعد آ گیا۔ سلطانہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے سیاہ گرم چادر سے سارا جسم لپیٹ رکھا تھا۔ مجھے اور شیر باز کو دیکھ کر وہ جھک کر ہمارے پاؤں چھونے لگی تو کمانڈو شیر باز نے کہا۔ "اس ہندوانہ رسم کو اب دل سے نکال کر باہر پھینک دو۔ میں نے اور حیدر علی نے اپنا اسلامی فرض ادا کیا ہے۔"

حیدر علی کے نام پر سلطانہ بی بی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"حیدر علی ہمارا ایک اور کشمیری مجاہد ہے۔ جس نے تمہارے لیے بڑا کام کیا ہے۔ اب حسن بٹ تمہیں بڈگام تمہارے گاؤں تک لے جائے گا۔"

"کیا آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے۔" سلطانہ نے پوچھا۔

کمانڈو شیر باز بولا۔

"نہیں مجھے یہاں کچھ اور کام کرنے ہیں۔ حسن بٹ تمہیں حفاظت سے تمہارے رشتے داروں کے پاس پہنچا دے گا۔"

پھر اس نے حسن بٹ سے کہا۔

"میرے مجاہد جانباز! یہ لڑکی ہماری امانت ہے اس کو اس کے رشتے داروں کے حوالے کر کے واپس آنا۔ تمہیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ ایسا کرنا اپنے

سٹیشن والے ساتھی سے رقم لے لینا۔"
سلطانہ بی بی فوراً بولی۔
"بھائی جان میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ اس کی فکر نہ کریں۔"
کمانڈو شیر باز بولا۔
"ٹھیک ہے حسن بٹ! تم ہماری بہن کو لے کر ابھی امرتسر شہر سے نکل جاؤ۔ چندو شاہ کا تم نے کیا کیا؟"
حسن بٹ بولا۔
"افسوس کمانڈو! میں اسے ہلاک نہیں کر سکا اتنا وقت ہی نہیں تھا۔"
کمانڈو شیر باز نے کہا
"یہ کام ہم کریں گے، تم اب نکل جاؤ۔"
ہم دونوں نے سلطانہ بی بی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے شفقت بھرا پیار کیا سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ حسن بٹ کے ساتھ چلی گئی تو میں نے شیر باز سے کہا۔
"دوست! میں نے سلطانہ کو یہ نہیں بتایا ہوا تھا کہ میرا نام حیدر علی ہے اور میں مسلمان ہوں۔ میں نے اسے یہی کہا تھا کہ میں ہندو ہوں۔ دھرم چند میرا نام ہے مگر مجھ سے تمہاری حالت نہیں دیکھی جاتی اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تب سلطانہ نے مجھے کہا تھا کہ اگر کمانڈو شیر باز تمہیں مل جائے تو اسے کہنا کہ اس کی بہن اس کی مدد کا انتظار کر رہی ہے۔"
کمانڈو شیر باز بولا۔
"چلو اچھا ہوا۔ یہ فرض ادا ہوگیا۔ لیکن ابھی چندو شاہ کو ٹھکانے لگانا باقی ہے۔ اس سے اپنی مسلمان بہن کی بے حرمتی کا انتقام لینا باقی ہے۔ کوئی بات نہیں یہاں سے ہم سیدھے جالندھر جائیں گے۔ وہاں ہمارا ایک خفیہ ہائیڈ آؤٹ ہے۔ میں وہاں چھپ جاؤں گا اور رات کو چندو شاہ کی کوٹھی میں آ کر اسے

ہلاک کر دوں گا۔"

ہم شام کا اندھیرا ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اندھیرے میں جالندھر کی طرف روانہ ہوں۔ فوری طور پر کمانڈو شیر باز کا مشن کیا تھا اس بارے میں مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ابھی تو وہ صرف چندو شاہ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا شروع سردیوں میں شام کا اندھیرا جلدی چھانے لگتا ہے۔ جب باہر فضا دھندلی ہوگئی اور دن کی روشنی بجھنے لگی تو ہم دونوں پرانے تالاب والے مکان سے نکل کر جی ٹی روڈ پر جا کر کھڑے ہوگئے۔ یہاں سے جالندھر کی طرف بہت سی لاریاں اور بسیں جاتی تھیں۔ ہمیں ایک بس میں جگہ مل گئی اور ہم جالندھر کی طرف چل پڑے۔ ایک گھنٹے میں ہم جالندھر پہنچ گئے۔ کمانڈو شیر باز مجھے لے کر جالندھر شہر کی ایک بڑی نہر کے پل پر اتر گیا۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یہاں کافی آگے جا کر ایک ویران علاقے میں کشمیری کمانڈوز نے زیر زمین ایک کیمپ گاہ میں کمانڈوز آپریشن میں کام آنے والا تقریباً ہر قسم کا چھوٹا بڑا اسلحہ موجود تھا۔ ایک بوڑھا کشمیری سکھ کے بھیس میں وہاں موجود رہتا تھا۔ اس نے کیمپ گاہ کے باہر ایک جھونپڑا ڈال رکھا تھا اور وہیں بیٹھا نگرانی کرتا تھا۔ کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"حیدر علی! اگر تم اپنے پولیس ہوسٹل میں جانا چاہتے ہو تو بے شک چلے جاؤ۔ میں آج رات کو ہی چندو شاہ کا کام تمام کر دوں گا۔ اس کے بعد میں جالندھر سے بھیس بدل کر جبل پور کے علاقے میں چلا جاؤں گا۔ ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ جبل پور کے گرد و نواح کی پہاڑیوں میں کوئلے کی ایک کان ہے۔ وہاں سے اب کوئلہ نہیں نکلتا۔ بھارتی فوج نے وہاں گولہ بارود اور اسلحہ اور دیگر فوجی ساز و سامان کا بہت بڑا ڈپو بنایا ہوا ہے۔ اسلحہ کے اس ذخیرے سے براہ راست کشمیر میں قابض بھارتی فوجوں کو اسلحہ سپلائی ہوتا ہے۔ میں سب سے پہلے اس کا پورا سروے کروں گا۔ مجھے تین چار دن لگ جائیں گے واپس آ کر اپنے

بوڑھے کشمیری ساتھی کے ذریعے پیغام پہنچا دوں گا کہ میں آگیا ہوں یہ بوڑھا ساتھی وہی ہے جو سکھ بن کر ہماری اس کمیں گاہ کے باہر جھونپڑے میں رہتا ہے۔ پھر تم میرے پاس یہاں آ جانا اور اکٹھے بیٹھ کر جبل پور کے سپلائی ڈپو کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنائیں گے۔ ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے' میں اب جاتا ہوں۔"

کمانڈو شیر باز نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں خاموشی سے کمیں گاہ سے نکل کر رات کے اندھیرے میں نہروں نہر سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر کے ہوسٹل کی جانب چلنے لگا۔ راستے میں مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر ہی ہوسٹل پہنچنا چاہتا تھا۔ رات کو بار بار میری آنکھ کھل جاتی مجھے معلوم تھا کہ کمانڈو شیر باز نے چندو شاہ کو آج رات ختم کرنا ہے۔ آخر صبح ہوگئی۔ میں نے صبح صبح ایس پی مہتہ کو فون کیا کہ میں رات دلی میں ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے کے بعد رات آگیا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ کو کچھ معلوم ہوا؟"

مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ شیر باز نے اپنا کام کر لیا تھا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"کیوں کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟"

اس نے کہا۔

"چندو شاہ کا قتل ہوگیا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ وہ بولا۔

"سچ کہہ رہا ہوں مہاراج جی! اسے رات کو کوٹھی میں گھس کر کوئی قتل کر گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"نرملا کماری کہاں ہے؟"

"نرملا کماری تو دوپہر کو ہی غائب ہوگئی تھی یہ کسی دوسرے بدمعاش کی
علی کا معاملہ لگتا ہے۔ آپ دفتر آئیں گے تو بات کریں گے۔"
میں دس بجے کے بعد ایس پی مہتہ کے آفس پہنچ گیا۔ وہ کہنے لگا۔
"نرملا کماری پہلے غائب ہوئی۔ اس کے بعد رات کو چندو شاہ قتل ہوگیا۔ یہ
ال گہری سازش لگتی ہے۔ بہرحال ہماری ایک پولیس پارٹی کلکتے کی طرف چلی
گل ہے۔ کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ چندو شاہ نے نرملا کماری سے کلکتے میں شادی
لی تھی۔ آپ سنائیے دلی کا دورہ کیسا رہا؟ کن کن سے ملاقات ہوئی؟ کیا کیا
الم ڈس کس ہوئیں۔"
میں نے کہا۔
"مسٹر مہتہ! یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دلی کی میٹنگ میں جس ایجنڈے پر
اری بات ہوئی ہے وہ میں تمہیں بتا دوں گا؟"
ایس پی مہتہ بڑا شرمندہ ہوا۔ میں اسے شرمندہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی
ردود سے باہر نکل آیا تھا۔ میں اسے اس کی حد کے اندر رکھنا چاہتا تھا۔
اب میں نے اپنی ساری توجہ پاکستان کے خلاف استعمال کیے جانے والے
نھوی میزائیل کی طرف مبذول کر دی۔ یہ اس وقت میرا سب سے اہم اور
ک مشن تھا۔ میزائیل کنٹرولر مسٹر چکرورتی کے بارے میں میں پہلے ہی اوپر
لی کمان کو یہ تاثر دے چکا تھا کہ اس پر مجھے شک ہے کہ وہ پاکستانی ایجنٹوں کے
اتھ ملا ہوا ہے اور خطرہ ہے کہ میزائیل سینٹر کے خفیہ راز ان ایجنٹوں کے
یعہ پاکستان نہ پہنچ جائیں۔ جس پر ہائی کمانڈ نے اور خاص طور پر ڈیفنس انٹیلی
بس کے چیف اور شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں
ٹر چکرورتی کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کروں۔ اس وجہ سے مجھے میزائیل
ٹرمیں دن رات میں کسی بھی وقت بے دھڑک آنے جانے کی خصوصی اجازت
ہوئی تھی۔ میرے لیے پاس ورڈ کی پابندی بھی اٹھا لی گئی تھی۔ صرف میرا

ایک معمولی آئی ڈی کارڈ ہی کافی تھا جو میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جس پر میری تصویر لگی تھی اور میرا نام دھرم چند لکھا تھا۔

میں نے پوری سرگرمی سے میزائیل کمانڈو آپریشن کی تیاری شروع کر دی۔ سٹی پولیس ہیڈ کوارٹر کے انٹیلی جنیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک سیل تھا جہاں بھیس بدلنے کا ہر قسم کا لباس اور دھماکہ خیز مواد تیار کرنے کا سامان موجود تھا۔ میں نے یہاں سے اپنی ضرورت کی دو چار چیزیں اٹھالیں اور اپنے ہوسٹل میں آ کر اس پر کام کرنے لگا۔ میں نے دو دن کی محنت سے ایک انگلی کے ناخن کے سائز کا چپس تیار کر لیا۔ اس چپس میں انسانی رگوں سے بھی زیادہ باریک رگوں ایسی نالیاں لگی تھیں جن کے آخری سرے پر انتہائی دھماکہ خیز مواد تھا اور شروع میں تیزابی مادے کا ایک ننھا سا قطرہ نالی میں بھرا ہوا تھا۔ ایک انتہائی طاقتور ایٹم بم تھا۔ اس چپس بم کو مجھے پرتھوی میزائیل کے مائع گیس کے پہلے مرحلے والے خول کے کنٹرول میٹر کے اندر نصب کرنا تھا اور نصب کرنے سے پہلے چپس کی نالی کے شروع میں جو تیزابی مادہ تھا۔ وہاں انگلی کی ہلکی سی ٹھوکر سے نالی کو توڑ دینا تھا۔ جس کے بعد تیزابی مادے کا چپس کی باریک ترین سوراخ والی نالیوں میں سفر شروع ہو جاتا تھا۔ اس تیزابی مادے کا سفر انتہائی سست رکھا گیا تھا۔ اسے چار دن کے بعد نالی کے آخری سرے پر پہنچ کر دھماکہ خیز مادے کو بھڑکا دینا تھا جس کے بعد زبردست دھماکہ ہونا تھا اور پرتھوی میزائیل کے مائع ایندھن نے جوالا مکھی کی طرح پھٹ کر نہ صرف پرتھوی میزائیل کے پرخچے اڑا دینے تھے بلکہ اس سارے سینٹر کو تباہ کر دینا تھا۔

جب یہ چپس بم بالکل تیار ہوگیا تو میں نے اس کے پیچھے چپکانے والا مادہ لگا

کر اس کے اوپر روغنی باریک کاغذ لگا دیا۔ چپس بم کو میزائیل میں لگاتے وقت مجھے یہ روغنی باریک کاغذ اتار کر اسے میزائیل کے کنٹرول میٹر کی دیوار پر چپکا دینا تھا۔ مجھے اپنی دھماکہ خیز مواد کی مہارت اور تجربے پر بھروسہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ چپس بم کام کر دکھائے گا۔ اس کے بعد میں نے تقریباً" روزانہ میزائیل سینٹر جانا شروع کر دیا۔ میں کسی وقت رات کو بھی چلا جاتا۔ ہر روز میں دلی ڈیفنس انٹیلی جینس اور بمبئی بال ٹھاکرے کو فون پر اپنی کارکردگی سے آگاہ کر دیتا کہ میں مسٹر چکرورتی کی برابر نگرانی کر رہا ہوں۔ ایک روز میں نے بال ٹھاکرے کو بتایا کہ آج مسٹر چکرورتی جب اپنے فلیٹ میں گیا تو اس کے فلیٹ کے باہر ایک مشکوک قسم کا آدمی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آدمی چکرورتی کے ساتھ ہی فلیٹ میں چلا گیا اور تقریباً" دو گھنٹے تک دونوں اندر کمرہ بند ہو کے باتیں کرتے رہے۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ تھا مگر میرے لیے زمین ہموار کرنا بہت ضروری تھا وگرنہ میں بھارت میں اپنے پاکستان کی سلامتی کے مشن کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ میں میزائیل سینٹر میں دھماکے کے فوراً" بعد گرفتار کر لیا جاتا اور سارا معاملہ ختم ہو جاتا۔

بال ٹھاکرے غصے میں آ گیا۔ فون پر بھڑک کر بولا۔

"تم کو چاہیے تھا کہ کسی طرح کمرے میں جا کر ان کی باتیں سنتے تم نے وہاں خفیہ مائیکرو فون کیوں نہیں لگایا ابھی تک؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج بس یہ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں صبح ہی یہ کام کرتا ہوں۔ چکرورتی میزائیل سینٹر جائے گا تو میں ٹیلی فون ٹھیک کرنے والے کے بھیس میں اس کے فلیٹ کو کھلوا کر وہاں جاؤں گا اور انتہائی چھوٹا مگر انتہائی طاقتور مائیکروفون کسی خفیہ جگہ لگا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے دھرم چند! تم کو یہ کام بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ اب وہاں چکرورتی سے کوئی بھی ملنے آئے ان کی گفتگو کی فل رپورٹ بھیجنا۔"

"یس سر! ایسا ہی کروں گا۔"

بال ٹھاکرے کی طرف سے ٹیلی فون بند ہوگیا۔ پرتھوی میزائیل سینٹر کو اڑانے کے لیے میں نے کافی پیش بندی کر لی تھی اور مزید زمین ہموار کر رہا تھا۔ مجھے مسٹر چکرورتی کے کمرے میں خفیہ مائیکرو فون لگانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ کمانڈو شیر باز جبل پور کی طرف انڈین آرمی کے ایمونیشن ذخیرے کا سراغ لگانے گیا ہوا تھا۔ جو وہاں کوئلے کی ویران کان کے نیچے تہہ خانے میں تھا اور جہاں سے اسلحہ اور گولہ بارود کشمیر کے محاذ پر سپلائی ہوتا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ چار چھ دن میں واپس آ جائے گا اور مجھے اسے پرانے تالاب والی خفیہ پناہ گاہ میں ملنا تھا۔

میں نے مزید تین دن گزار دیے۔ چوتھے دن بال ٹھاکرے کو ان تین دنوں کی اپنی خفیہ کارگزاری کی جھوٹی رپورٹ لکھ کر پوسٹ کر دی۔ اس میں میں نے لکھا کہ میں نے مسٹر چکرورتی کے کمرے میں خفیہ مائیکرو فون لگا دیا ہے۔ اس دوران اس سے ملنے صرف ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آیا تھا جو پہلے تو بنگلہ زبان میں باتیں کرتے رہے پھر انگریزی میں بولنے لگے۔ ان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ مسٹر چکرورتی کو ابھی تک معاوضہ نہیں ملا۔ میرے خیال میں یہ معاوضہ وہ رقم ہے جو اسے پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے عوض دی جا رہی ہے۔ انہوں نے کھل کر بات نہیں کی مگر میں اصل حقیقت معلوم کر کے آپ کو اگلے ہفتے پوری رپورٹ بھیجوں گا۔ میں نے بال ٹھاکرے کو یہ بھی لکھا کہ ان حقائق سے انڈین سینٹر ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر سریندر کوہلی کو بھی آگاہ کر دیا جائے تاکہ میزائیل سینٹر کی خاطر سیکورٹی کا بندوبست ہو۔ میں نے یہ رپورٹ ارجنٹ میل سروس سے رجسٹر کروا کر بھیجی تھی۔ دوسرے دن شام کو مجھے بال ٹھاکرے کا ٹیلی فون آگیا۔

اس نے کہا۔

"دھرم چند! مجھے تمہاری رپورٹ مل گئی ہے۔ مسٹر چکرورتی کے بارے میں مکمل ثبوت حاصل کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پاکستان کے لیے جاسوسی کر رہا ہے۔ مگر جب تک ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ وہ بھارت کے وزیر دفاع کا خاص آدمی ہے۔ ویسے تو میں راجیہ سبھا میں اپنے کسی سینٹر سے ایک بیان دلوا کر اس کو نوکری سے برخاست کرا سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی ہو۔ پھر ان کی زیادہ بے عزتی ہوگی کہ وزیر دفاع کا اپنا آدمی پاکستانی ایجنٹوں سے ملا ہوا ہے۔"

میں نے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"سر! آپ مطمئن رہیں۔ بہت جلد مجھے کوئی نہ کوئی ثبوت مل جائے گا۔"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"میں نے تمہاری رپورٹ کی ایک کاپی ڈیفنس انٹیلی جینس کے مسٹر سریندر کوہلی کو بھجوا دی ہے تاکہ اس کے بھی کان کھڑے ہو جائیں۔"

اب میرے لیے میدان صاف تھا۔

کمانڈو آپریشن کا وقت آگیا تھا۔ میں نے میزائیل سینٹر کے آفس شیڈول کا مطالعہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ مسٹر چکرورتی اگلے پندرہ دنوں کے لیے رات کی ڈیوٹی پر ہوگا۔ مجھے یہی چاہیے تھا جس رات مجھے میزائیل سینٹر میں جا کر پرتھوی میزائیل میں چپس بم لگانا تھا اس روز شام کو ہی میں اپنے پولیس ہوسٹل کے کمرے میں آگیا۔ میں نے پلاسٹک کی ڈبیا میں سے چپس بم کو چمٹی سے نکال کر اپنے سامنے میز پر رکھا اور اس کی میکنیزیم کی بڑے غور سے پڑتال کی۔ اس کا جائزہ لیا۔ انسانی انگلی کے ناخن کے برابر یہ چپس بم بالکل تیار تھا۔ میں محدب شیشے کی مدد سے اس کی باریک سوراخ دار نالیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چپس کے اوپر سے یہ باریک نالی شروع ہو کر کتنے ہی پیچ کھاتی ہوئی چپس بم کے نیچے بائیں کونے میں نصب دھماکہ خیز محلول کی ٹیوب تک جاتی تھی۔ یہ نالی انسانی بال

جتنی باریک تھی۔ اوپر والے سرے پر ننھی سی نقطے کے برابر شیشے کی ٹیوب میں
تیزابی مادہ بھرا ہوا تھا۔ بم لگاتے وقت مجھے اس ٹیوب کو انگلی کی ہلکی سی ٹھوکر
لگانی تھی جس کے ساتھ ہی ٹیوب میں سے تیزابی مادے نے باریک نالیوں میں
سے گزرنا شروع کر دینا تھا۔ میں نے جس حساب سے یہ باریک نالیاں لگائی تھیں
اس حساب سے تیزابی مادے کو چپس بم کے آخری سرے والے دھماکہ خیز محلول
تک پہنچنے میں چار دن لگنے تھے۔ اتنا وقفہ میں نے جان بوجھ کر ڈالا تھا۔

میں نے چپس کے پیچھے لگے ہوئے پتلے سے سٹیکر کو چیک کیا یہ روغنی کاغذ
تھا جسے سٹیکر کی طرح اتار کر مجھے چپس بم کو میزائیل کے ہیٹ کنٹرول میٹر کے
اندر چپکا دینا تھا۔ روغنی کاغذ بالکل صحیح پوزیشن میں لگا ہوا تھا۔ میں نے چپس کو
چمٹی سے اٹھا کر ماچس کی ڈبی میں بند کر کے ڈبی اپنی جیب میں رکھ لی۔ یہ کام مجھے
رات دس بجے کے بعد میزائیل سینٹر میں جا کر انجام دینا تھا۔ میں نے کھانا کھایا
اور وقت گزارنے کے لیے ایک انگریزی فیشن میگزین لے کر بستر پر لیٹ گیا۔
ٹھیک پونے دس بجے میں اٹھا۔ گرم جیکٹ پہنی اپنا عارضی شناختی کارڈ جیکٹ کی
جیب کے ساتھ لٹکایا اور گاڑی نکال کر میزائیل سینٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔

مجھے وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ لگے۔ گاڑی میں نے میزائیل سینٹر کے
ٹیلے سے کچھ دور درختوں کے اندھیرے میں کھڑی کی اور جیسے رات کو وہاں جایا
کرتا تھا اسی طرح بڑی بے نیازی اور سکون کے ساتھ نیم اندھیرے میں چلتا
میزائیل سینٹر کے گیٹ پر آ گیا۔ وہاں رات کو زیادہ روشنی نہیں کی جاتی تھی۔
گیٹ پر صرف ایک کم روشنی والا بلب جلتا رہتا تھا۔ گارڈ سنتری مجھ سے اچھی
طرح واقف ہو چکے تھے۔ رسمی طور پر میں نے اپنا آئی ڈی دکھایا اور انہوں نے
گیٹ تھوڑا سا کھول دیا۔ مجھے اب پاس ورڈ بولنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی
تھی۔ میں سیدھا مسٹر گھوش کے کمرے میں گیا۔ اس کی بھی رات کی ڈیوٹی تھی۔
ایک دو منٹ اس کے پاس ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں کنٹرول روم کی

طرف آ گیا۔ مسٹر گھوش بنگالی تھا اور میں اس سے بنگلہ میں ہی گفتگو کرتا تھا جس سے وہ بڑا خوش ہوتا تھا۔ بنگلہ زبان مجھے میری بنگالن بیوی زیب النساء کی وجہ سے آ گئی تھی۔

کنٹرول روم میں مسٹر چکرورتی تختی ہاتھ میں لیے دیوار پر لگے ڈائیلوں کے آگے کھڑا نوٹس لے رہا تھا۔ میں نے دروازے کے چوکور شیشے سے اسے دیکھا اور بٹن دبایا۔ اندر گھنٹی بجنے کی دھیمی آواز آئی۔ چکرورتی نے مڑ کر دروازے کی طرف نگاہ ڈالی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پنسل پر ایک بٹن دبایا اور معمول کے مطابق ہاتھ کے اشارے سے بتایا دروازہ کھل گیا ہے۔ میں دروازے کو ذرا سا دھکیل کر کنٹرول روم میں داخل ہو گیا۔ میں پینل کے پاس لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور چکرورتی سے بنگلہ زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے کہا۔

"مسٹر چکرورتی! آج باہر بڑی سردی ہے۔ تمہارا کنٹرول روم تو خوب گرم ہے مگر باہر سے آدمی آئے تو اسے یہاں چائے کی بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

میں کنٹرولر میزائیل مسٹر چکرورتی کو کچھ دیر کے لیے کنٹرول روم سے باہر بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بابو صاحب' اس وقت کینٹین تو کھلی ہوتی ہے مگر آپ کو معلوم ہے کینٹین کے آدمی چھٹی پر گئے ہوتے ہیں۔"

میں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے چائے کی بات چھیڑی تھی۔ میں نے کہا۔

"مسٹر چکرورتی! تم یہاں کے آفیسر ہو۔ کینٹین والے ہمارے آرڈر کی پروا نہیں کریں گے۔ میں یہاں مانیٹرنگ کرتا ہوں تم کینٹین میں جا کر چائے کے لیے کہو۔ تمہارے کہنے سے کینٹین کا مالک خود چائے لے کر آ جائے گا۔ بھائی تم یہاں کے بڑے آفیسر ہو۔"

مسٹر چکرورتی میری باتوں سے بڑا خوش ہوا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ

کنٹرول روم کا بلکہ میزائیل سینٹر کے کسی بھی کمرے کا کینٹین کے ٹیلی فون سے رابطہ نہیں تھا۔ خدا جانے یہ کس وجہ سے مل گیا تھا۔ چنانچہ دن کے وقت بھی چائے کے لیے چپڑاسی وغیرہ کو کینٹین بھجوانا پڑتا تھا۔ مسٹر چکرورتی مجھے میزائیل سینٹر کا بڑا با اعتماد اور ذمے دار آدمی سمجھتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوا تھا کہ میرا تعلق بھارت کی مرکزی ڈیفنس انٹیلی جینس سے بھی ہے۔ کہنے لگا۔

"بابو صاحب! ہم ابھی جا کر آپ کے لیے چائے لاتا ہے۔ مانیٹرنگ کی ضرورت نہیں یہ تو ضروری نوٹیش ہوتی ہے جو ہر آدھ گھنٹے بعد مجھے کرنی پڑتی ہے۔"

اس نے چمٹی والی تختی اور بال پوائنٹ پنسل پینل پر رکھ دی اور کنٹرول روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے دو منٹ بعد میں کرسی سے اٹھ کر دروازے کے پاس آیا۔ چوکور شیشے میں سے باہر راہ داری پر نظر ڈالی۔ راہ داری بالکل خالی پڑی تھی۔ میرے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔ اس دوران مسٹر چکرورتی نے چائے لے کر آ جانا تھا۔ بہت ہیبت ناک پرتھوی میزائیل گول کمرے کے وسط میں کسی عفریت کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ میں تیزی سے میزائیل کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں میزائیل کے پہلے مرحلے والے راکٹ کے اوپر سوکٹ تھا۔ میں نے سوکٹ کو کھولا۔ اس کے اندر ہیٹ کنٹرول کرنے والا چھوٹا سا تھرمو سٹیٹ میٹر لگا تھا۔ میٹر کے پیچھے تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ میں نے جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی۔ اس میں سے چپس بم نکالا۔ اس کے پیچھے لگا ہوا سٹیکر کا روغنی کاغذ اتار کر ماچس میں ڈال کر ماچس کو جیب میں ڈالا اور بڑی احتیاط اور انتہائی سکون کے ساتھ چپس کو اپنی سیدھے ہاتھ کی انگلی کے اوپر الٹا رکھ کر میٹر کے پیچھے چپکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چپس کی نالی کے اوپر والے سرے کو انگلی کی ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ احتیاط کے طور پر میں نے دوبار تار کو ٹھوکر لگا کر جھٹک دیا۔

میں نے آنکھیں قریب لے جا کر تیزابی مادے کی ٹیوب کو دیکھا۔ میں صاف طور پر نہ دیکھ سکا اور صاف طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ قطرے سے بھی زیادہ باریک ٹیوب ٹوٹی ہے یا نہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ میری انگلی کی ٹھوکر نے اپنا کام کر دیا ہے۔ ٹیوب ٹوٹ گئی ہے اور اس میں سے تیزابی مادے کا چپس بم کے آخری سرے پر لگی ہوئی انتہائی طاقتور دھماکہ خیز ٹیوب تک کا سفر شروع ہو گیا ہے۔ بہرحال میں یہ یقین کرنے پر مجبور تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا آلہ یا محدب شیشہ نہیں تھا جس میں دیکھ سکتا کہ تیزابی مادہ ٹیوب ٹوٹنے کے بعد چل پڑا ہے۔ میں نے سوکٹ کی فولادی پلیٹ میٹر کے اوپر لگا کر اسے دبایا۔ سوکٹ بند ہو گئی۔ میں بڑے اطمینان سے قدم قدم چلتا دیوار پر لگے ڈائیلوں اور پینل پر بڑے کمپیوٹروں کو یونہی جھک کر دیکھتا اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت میرے دل کی دھڑکن واقعی تیز ہو گئی تھی۔ میں نے بھارت کے پاکستان دشمن عزائم پر کاری ضرب لگائی تھی اور اس کے میزائیل کی تباہی کی الٹی گنتی شروع کر دی تھی جس نے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اس لانچنگ پیڈ سے فائر ہو کر لاہور شہر پر گر کر قیامت خیز تباہی مچانی تھی۔ اصولی طور پر جو کچھ کر سکتا تھا میں نے کر دیا تھا اب آگے کوئی انسانی غلطی بدقسمتی سے درمیان میں آ جاتی ہے تو چپس بم بیکار ہو سکتا تھا ورنہ میں نے اس پاکستان کے قاتل میزائیل کی بربادی کا بٹن دبا دیا تھا۔ جس پر بھارت کے محکمہ دفاع نے اپنی بھوکی جنتا کا پیٹ کاٹ کر کروڑوں ڈالر خرچ کر ڈالے تھے۔ میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر وقت اور اس دن کی تاریخ لکھ کر کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ اس کام میں مجھے صرف سات منٹ لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میرے دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی۔ میں دیوار پر لگے گول آٹو میٹک کلاک پر نگاہ ڈالی۔ اسی وقت گھڑی کی سوئیاں رات کے پورے ساڑھے دس بجا رہی تھیں۔ اگر میری انگلی کی ٹھوکر سے چپس بم کے تیزابی مادے والی ٹیوب ٹوٹ گئی تھی اور تیزابی مادے نے چپس

کی ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی تاروں کے اندر اپنا تباہ کن سفر شروع کر دیا تھا تو حساب کے مطابق دس نومبر کی رات کے ٹھیک ساڑھے دس بجے تیزابی مادے نے چپس بم کے آخری حصے میں لگے ہوئے دھماکہ خیز محلول تک پہنچ جانا تھا اور پھر وہاں ایک دھماکہ ہونا تھا۔ اس دھماکے نے پر تھوی میزائل کے مائع ایندھن میں آگ لگا کر ایک اور قیامت خیز دھماکہ کرنا تھا۔ اور میزائل کے اوپر لگے ہوئے غیر نیوکلیائی وار ہیڈ نے ایک ایسے بھیانک دھماکے کے ساتھ پھٹنا تھا کہ جس کے بعد اس سارے میزائل سینٹر کے ٹیلے نے جوالا مکھی کی طرح ابل کر دور دور تک بکھر جانا تھا۔

میزائل کنٹرولر مسٹر چکرورتی چائے لے کر آ گیا تھا۔ اس کے پاس دروازے کے لاک کی چابی تھی۔ اس کو باہر سے گھنٹی دبانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو اس کے ہاتھوں میں چائے سے بھرے ہوئے مگ تھے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ایک مگ لے لیا اور بنگلہ زبان میں کہا۔

"مسٹر چکرورتی! میں نے تمہیں بڑی تکلیف دی ہے۔"

طبیعات کا لائق ترین بنگالی سائنس دان چکرورتی بچوں کی طرح مسکرانے لگا۔

"نہیں نہیں بابو صاحب' ہم کو تو خوشی ہوتی ہے ہمارا جی بھی اس وقت چائے پینے کو بہت چاہ رہا تھا۔"

وہ رات ۶ نومبر کی تھی۔ میں تھوڑی دیر چکرورتی کے ساتھ بیٹھ کر کلکتے کی باتیں کرتا رہا۔ وہ کلکتے کا رہنے والا تھا۔ ہوسٹل میں واپس آ کر میں نے اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میرا مشن شروع ہو چکا تھا مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے اپنے ذہن میں طے کر لیا اور سو گیا۔ میں نے سات نومبر کا دن بیچ میں ڈالا اور آٹھ نومبر کی صبح کو ٹرین میں سوار ہو کر بال ٹھاکرے سے ملاقات کرنے بمبئی کی طرف روانہ ہوا۔ ٹرین میں اس لیے جا رہا تھا کہ میں مزید کچھ وقت بال ٹھاکرے سے دور رہ کر گزارنا چاہتا تھا۔ نو نومبر کی صبح کو میں بمبئی میں تھا۔ بال ٹھاکرے جی کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اس نے اسی وقت بلا لیا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور اس انتہا پسند ہندو' مسلمانوں کے دشمن اور شیو سینا کے سب سے بڑے اور با اثر لیڈر بال ٹھاکرے کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

بال ٹھاکرے کے ملازم نے مجھے لیڈر کے خاص ویٹنگ روم میں بٹھا دیا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ پندرہ بیس منٹ تک بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ بال ٹھاکرے کسی کو بھی انتظار کرائے بغیر نہیں ملتا خواہ کتنا ہی ایمرجنسی کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کے خاص ڈرائینگ روم میں جا کر ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہی بھنوئیں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا رام نام کا تلک کہاں گیا دھرم چند۔"

میں نے کئی روز سے ماتھے پر تلک نہیں لگایا تھا۔ جالندھر میں مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر معذرت پیش کی اور کہا۔

"سیناپتی جی! اپنے کام میں اتنا گم رہا کہ تلک لگانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔"
"چکرورتی کے بارے میں بتاؤ تم نے کیا پروگریس کی ہے کوئی ثبوت ملا؟
امرم چند اس شخص کو پکڑنے کے لیے مجھے سالڈ قسم کے پروف کی ضرورت ہے تاکہ میں اپوزیشن کے رکھشا منتری کو لوک سبھامیں سب کے سامنے ذلیل کر سکوں۔ یہ چکرورتی رکھشا منتری کا بھانجہ ہے میں نے اس کا پورا بائیو ڈیٹا حاصل کرلیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج جی! بہت جلد ثبوت مل جائے گا۔ میں اب ثبوت حاصل کرنے کے پیچھے ہی لگا ہوں۔ چکرورتی بڑا چالاک شخص ہے۔ اپنے فلیٹ میں کسی سے خفیہ بات نہیں کرتا۔ اس روز اس نے پے منٹ کی بات کی تھی۔ اس کے بعد ایک عورت اس کے فلیٹ میں آئی تھی۔ میں اپنے کنٹرول روم میں کان لگائے بیٹھا ان کی باتیں سپیکر پر سنتا رہا۔ دونوں بنگلہ میں دیر تک رشتے داری کے جھگڑوں جھمیلوں کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں عورت نے چکرورتی سے کہا کہ کسی آدمی نے میرے گھر فون کیا تھا کہ مسٹر چکرورتی سے کہیں کہ ہمیں سپاٹ پر آج رات ملیں۔ میں نے اسے کہا تم خود فون کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ بولا چکرورتی بابو کا فون خراب ہے۔ اس کے جواب میں چکرورتی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اس نے تمہیں کیوں فون کیا۔ وہ ایک پاگل آدمی ہے مجھے فون کرکے ہی کہتا رہتا ہے کہ سپاٹ پر ملو۔ اب فون کرے تو اسے جھڑک دینا۔ یہ باتیں سننے کے بعد میں نے دو راتیں مسٹر چکرورتی کی نگرانی کی کہ وہ کس خفیہ سپاٹ پر کسی ایجنٹ سے ملنے جاتا ہے یا نہیں۔ مگر وہ اپنے فلیٹ سے رات کو باہر نہ نکلا۔ شاید اس نے ایجنٹ کو سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ اس نے اس کی رشتے دار عورت کے گھر کیوں فون کیا۔"

بال ٹھاکرے میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم کو چاہیے تھا کہ خفیہ پولیس کا کوئی آدمی اس کے پیچھے لگا دیتے جو رات کے وقت اس کی نگرانی کرتا۔"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"مہاراج! یہ نازک معاملہ ہے۔ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ چکرورتی کو اگر پتہ چل جاتا کہ رات کے وقت اس کی نگرانی ہو رہی ہے تو وہ تو اس قدر محتاط ہو جاتا کہ میرے لیے کوئی سراغ لگانا دشوار ہو جاتا۔"

بال ٹھاکرے اپنے بالوں میں انگلی پھیرنے لگا۔ جب وہ کسی گہری الجھن میں ہوتا تھا تو اپنے چمکیلے سیاہ بالوں میں اس طرح انگلی پھیرنے لگتا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب تم یہاں بمبئ آ گئے ہو۔ پیچھے چکرورتی کی نگرانی کون کرے گا؟"

میں نے اپنے بمبئ آنے کا جواب پیش کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج جی! مجھے اک خاص ذریعے سے یہ اطلاع ملی تھی کہ بمبئ کے میرین ڈرائیو والے علاقے میں سبز رنگ کی ایک تین منزلہ عمارت ہے جہاں ایک کشمیری فوٹوگرافر رہتا ہے۔ چکرورتی کو کبھی کبھی اس کا بھی فون آتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کشمیر میں ہماری سینا لڑ رہی ہے۔ یہ کشمیری بھی کوئی مجاہد ہی ہو سکتا ہے۔ بس میں اس کا سراغ لگانے بھی یہاں آیا ہوں۔ کچھ آپ کے درشن میں ضروری تھے تاکہ جو باتیں فون پر نہیں ہو سکتیں زبانی ہو جائیں۔"

بال ٹھاکرے نے پوچھا۔

"تم کتنے دن بمبئ میں ٹھہرنا چاہتے ہو؟ ہمیں زیادہ دن چکرورتی سے دور نہیں رہنا چاہیے۔"

میں ذہن میں سارا حساب لگا کر آیا تھا۔ اس روز ۹ نومبر کا دن تھا۔ دوسری دن یعنی گیارہ نومبر کی رات ساڑھے دس بجے میزائیلوں کے زیر زمین اڈے کے اندر زور دار دھماکہ ہونا تھا۔ اس دھماکے کی خبر یقینی طور پر اسی روز رات کی

خبروں میں نشر ہو جاتی اور بال ٹھاکرے کو تو دھماکہ ہونے کے فوراً بعد پتہ چل جانا تھا۔ بس میں ایک ہی دعا بار بار اپنے خدا سے مانگتا کہ میری کوئی انسانی غلطی مجھے دھوکہ نہ دے جائے۔

میں نے بال ٹھاکرے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"سینا پتی جی! میں زیادہ سے زیادہ دو دن یہاں رکوں گا۔ اسی دوران میرین ڈرائیور والے کشمیری فوٹو گرافر کا کھوج لگا لوں گا اور آپ کو مکمل رپورٹ دے ہی جاؤں گا۔"

بال ٹھاکرے پر میری کارکردگی کا بڑا اثر پڑ چکا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میری کارکردگی ابھی تک میرے حق میں ہی کامیاب رہی تھی۔ اس سے بھارت کے ان فرعونوں کو نہ کوئی فائدہ پہنچ سکا تھا اور نہ میں کوئی فائدہ پہنچانے کی سوچ ہی سکتا تھا۔ لیکن بال ٹھاکرے کی طرح میں نے اس دشمن پاکستان پر اپنی باتوں سے متاثر کیا ہوا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے دیرینہ ساتھی مرہٹہ لیڈر بالا جی راؤ سے زیادہ اہمیت دینے لگا تھا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم یہ کام کر کے ہی یہاں سے جانا۔ اگر وہ فوٹو گرافر یہاں موجود ہوا تو میں اسے فوراً اغوا کروا کر اپنے ٹریننگ سینٹر پہنچا دوں گا۔ وہاں ہم خود اس سے پوچھ گچھ کر لیں گے کہ چکرورتی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ تم ابھی میرین ڈرائیو جا کر اسکا سراغ لگاؤ۔ تمہیں اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

میں بھی اس دشمن اسلام کے سر پر شاہ خرچیاں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ویسے تو مجھے ذاتی خرچ کی پرواہ نہیں ہے لیکن کسی وقت کوئی بھی اچانک ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لیے آفس سیکرٹری سے کہہ کر رقم دلوا دیں تو بہتر ہے۔"

بال ٹھاکرے نے اسی وقت ڈائیل پر شیو سینا کے آفس کا نمبر گھمایا اور آفس سیکرٹری سے کہا۔

"دھرم چند آ رہا ہے۔ اسے پارٹی کے سپیشل اکاؤنٹ میں سے پانچ ہزار روپے نکلوا کر دے دو۔"

بال ٹھاکرے نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔ میری طرف گہری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"آفس میں جا کر پیسے لے لینا اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے فون کر دینا۔"

میں نے اٹھ کر اس کے پاؤں چھوئے' پرنام کیا اور الٹے پاؤں وہاں سے نکل گیا۔

شیو سینا کے آفس میں گیا آفس سیکرٹری ایک نیا مرہٹہ آ گیا ہوا تھا۔ بوڑھا خزانچی ٹائپ کا آدمی تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"دھرم چند جی! میں نے چیک دے کر لڑکے کو بینک بھیج دیا ہے۔ ابھی رقم لے کر آ جائے گا۔ آپ کو کہیں جلدی تو نہیں جانا۔"

میں نے کہا۔

"ابھی نہیں جانا۔"

آدھ گھنٹے بعد مجھے پانچ ہزار روپے مل گئے۔ آفس کی عمارت کے اوپر والے فلیٹ پر میری رہائش ہوا کرتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہاں بالا جی راؤ مجھ سے ملنے آ گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں بھاسکر اور پاٹیکر وغیرہ کا پتہ چلا؟"

میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا انہیں؟"

"انہیں پچھلے دنوں جالندھر کے مندر میں کسی نے قتل کر دیا تھا۔ تم جالندھر میں ہی تھے۔ تمہیں معلوم ہوا؟"

میں نے بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بڑا افسوس ہوا یہ دردناک خبر سن کر۔ میں کچھ روز کے لیے جالندھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ کسی نے ذکر ضرور کیا تھا کہ جالندھر کے کسی مندر میں تین بھائیوں کا قتل ہوگیا ہے مگر مجھے خیال تک نہ آیا کہ یہ ہمارے آدمی بھاسکر پاٹیکر اور شیوا بھی ہو سکتے ہیں۔ آخر کس نے قتل کیا انہیں؟"

بالا جی بولا۔

"کچھ پتہ نہیں چل سکا ابھی تک۔ میرا تو خیال ہے پینے پلانے والے آدمی تھے۔ مجرا سننے بھی جاتے تھے۔ کسی بائی جی کے آدمی سے جھگڑا کر بیٹھے ہوں گے اس نے موقع پا کر انہیں مار دیا۔ اس قسم کے غلط کاموں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ تم سناؤ دھرم چند آج کل جالندھر میں کس مشن پر ہو؟ یہاں ہمارے ٹریننگ سینٹر میں اس وقت کچھ عورتیں بھی دہشت گردی کی ٹریننگ لے رہی ہیں۔ یہ بمبئی کی دو طوائفیں ہیں۔ انہیں ایڈ کی بیماری ہے۔ بال ٹھاکرے نے انہیں دہشت گردی کی ٹریننگ دے کر اس لیے بھی پاکستان بھیج رہے ہیں کہ یہ پاکستان میں جا کر جگہ جگہ پاکستانی نوجوان سے جنسی تعلقات قائم کر کے ایڈز کی بیماری پھیلائیں۔"

وہ ہنس کر بولا۔

"بھیا! تمہیں تو معلوم ہے ہم پاکستان کو ہر طرح سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا۔ یہ طوائفیں کہاں سے تلاش کر لیں تم لوگوں نے؟"

بالا جی ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"ارے دھرم چند جی! سالا بمبئی میں ہر تیسری طوائف کو ایڈز کی بیماری لگی ہوئی ہے۔ بال ٹھاکرے جی کی سکیم یہی ہے کہ ان عورتوں کا یہاں علاج تو ہو نہیں سکتا۔ کیوں نہ ان سب کو باری باری پاکستان سمگل کر دیا جائے۔ اس طرح سے بھارت کو اس بیماری سے نجات بھی مل جائے گی اور پاکستان اس بیماری سے

تباہ ہونا شروع ہو جائے گا۔"

میں نے اس سے کہا۔ "میں آج شام کو ٹریننگ سینٹر آؤں گا۔"

"ضرور آنا۔ میں تو شام کو روز سینٹر پر موجود ہوتا ہوں۔"

باقی کا دن میں نے میرین ڈرائیو کے علاقے میں سمندر کے کنارے یونہی ادھر ادھر پھرتے گزار دیا۔ جو لوگ بمبئی رہ چکے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ میرین ڈرائیو جدید طرز کی عمارتوں کی اس قطار کو کہتے ہیں جو سمندر کے کنارے کنارے خم کھاتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے یعنی بال کیشر گارڈن کی پہاڑی کے دامن تک چلی گئی ہے۔ ایک طرف میرین ڈرائیو کی فلیٹوں والی اونچی اونچی خوبصورت بلڈنگیں ہیں۔ بلڈنگوں کے آگے چھوٹی سڑک ہے۔ گرین بیلٹ ہے۔ وہاں ناریل اور تاڑ کے درخت اگے ہوئے ہیں۔ گرین بیلٹ کے ساتھ ہی میرین ڈرائیو کی کشادہ سڑک ہے جس پر گاڑیوں کی آمد و رفت رات گئے تک جاری رہتی ہے۔ سڑک کے سمندر والے کنارے کی جانب سڑک سے کوئی چار فٹ اونچی پشتے کی دیوار بنی ہوئی ہے جس کی چوڑائی دو ڈھائی فٹ سے کم نہیں ہے۔ دیوار کے دوسری جانب بڑے بڑے پتھر ڈال دیے گئے ہیں تاکہ جوار بھاٹا کے وقت سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کا زور توڑا جا سکے۔ ان پتھروں کے آگے ریت کا کنارا آ جاتا ہے جو دور سمندر تک چلا گیا ہے۔ اس ریتلے کنارے یعنی بیچ کو چوپاٹی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چوپاٹی بمبئی کے مشہور بیچ کا نام ہے اور تفریح کی بڑی مشہور جگہ ہے شام ہوتے ہی یہاں لوگ اپنے بال بچوں کے ساتھ ساحل سمندر پر پھرنے آ جاتے ہیں۔ گول گپے، نمکین چنے اور بمبئی کی رابوں کا ٹھنڈا رس پیتے ہیں۔ بچوں کو بھی پلاتے ہیں۔ یہاں سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد تک بڑی رونق رہتی ہے۔ انڈیا کی اکثر فلموں میں ہیرو ہیروئن کا گانا گاتے ہوئے چوپائی کے ساحل سمندر پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوڑتے بھاگتے دکھایا جاتا ہے۔

میں چوپاٹی پر جا کر سمندر کے کنارے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا اور بالا جی کی زبانی مجھے بال ٹھاکرے کی پاکستان کے خلاف جس مکروہ اور بہیمانہ سازش کا پتہ چلا تھا اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ ایڈز کی بیماری میں مبتلا بھارتی طوائفوں کو فیشن ایبل لڑکیوں کے روپ میں پاکستان میں سمگل کر کے پاکستان میں ایڈز کی بیماری پھیلانے کی گھناؤنی سازش کر رہا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا شدت سے احساس ہوا کہ ہندو تو ازل سے پاکستان کا اور مسلمان کا دشمن تھا ہی مگر بال ٹھاکرے سے بڑھکر بھارت میں شاید ہی کوئی ہندو مسلمانوں کا اس قدر جانی دشمن ہو وہ مسلمانوں اور پاکستان کی دشمنی میں بھارت کے سبھی متعصب ہندوؤں سے بازی لے گیا تھا۔ مجھے اب ان ایڈز زدہ طوائفوں سے بھی نمٹنا تھا جو ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں سمگل کی جانے والی تھیں۔ یہ میرا فرض بن گیا تھا کہ میں ان عورتوں کو پیشتر اس کے وہ پاکستان کی طرف قدم اٹھائیں یہیں ختم کر دوں۔ میں شام کو بمبئی کے مضافات میں شیوسینا کے ٹریننگ سینٹر پہنچ گیا۔ جہاں پاکستان میں تخریب کاری کرنے کے واسطے شیوسینا کے خاص خاص آدمیوں کو بھرے بازار میں اندھا دھند فائرنگ کر کے فرار ہونے اور بموں کے دھماکے کرنے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ بالا جی راؤ مجھے وہیں پر مل گیا۔

اس نے مجھے دونوں طوائفوں سے ملایا۔ دبلی پتلی مراٹھی طوائفیں تھیں۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ نین نقش تیکھے تھے۔ ان کی بیماری کی تشخیص ہو چکی تھی کہ ان کو ایڈز ہے اور ظاہر ہے اس بیماری کا یورپ اور امریکہ ایسے ملکوں میں ابھی تک کوئی علاج نہیں دریافت ہو سکا بھارت میں علاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہیں شیوسینا نے بھاری معاوضہ دے کر اور بھارت ماتا کی سیوا کا کہہ کر پاکستان جانے پر راضی کر لیا تھا۔ ان کا نام رامی بائی تھا۔ دوسری کا نام گنگا بہنی تھا۔ دونوں بمبئی کے بازار حسن میں رہتی تھیں۔ میں ان سے باتیں کرنے لگا اور انہیں کہا کہ وہ بھارت ماتا کی سیوا کے لیے چنی گئی ہیں۔ وہ پاکستان میں جا کر

وہاں کے جوانوں میں جتنی زیاہ ایڈز کی بیماری پھیلائیں گی بھارت ماتا اتنی ہی ان سے خوش ہوگی اور اگلے جنم میں وہ آکاشی کی ایسراؤں کے روپ میں جنم لیں گی۔ وہ میری باتوں سے بڑی متاثر ہوئیں بالا جی راؤ بھی متاثر ہوا۔ کہنے لگا۔

"دھرم چند! تم تو واقعی بڑے کام کے آدمی ہو۔ سینا پتی جی یونہی تمہیں پر اتنا بھروسہ نہیں کرتے۔"

باتوں ہی باتوں میں میں نے بازار حسن میں ان کی کھولیوں کا پتہ چلا لیا۔ یہ عورتیں شام کو ٹریننگ ختم کرنے کے بعد واپس بازار حسن چلی جاتی تھیں اور رات گئے تک وہاں اپنا دھندا کرتی تھیں۔ ہم ابھی ٹریننگ سنٹر میں ہی تھے کہ دونوں طوائفیں شہر واپس چلی گئیں۔

بالا جی راؤ اور میں نے اکٹھے وہیں ویشنو کھانا منگوا کر کھایا۔ بالا جی نے پوچھا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا۔ "شیو سینا کے آفس اپنے خالی (فلیٹ) میں جا کر آرام کروں گا۔"

میں نے بالا جی راؤ کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ میں میرین ڈرائیو کے ایک کشمیری فوٹو گرافر کی کھوج میں ہوں۔ بال ٹھاکرے نے مجھے اس بات کو خاص طور پر خفیہ رکھنے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ بالا جی راؤ اپنی گاڑی میں مجھے شیو سینا والے فلیٹ پر چھوڑ کر چلا گیا۔ کمرے میں آکر میں سوچنے لگا کہ ان طوائفوں کو کس طرح ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ سوال ان کو صرف ٹھکانے لگانے کا نہیں تھا میں انہیں رات کے وقت بڑی آسانی سے ٹھکانے لگا سکتا تھا مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس طرح سے بال ٹھاکرے کی سازش کا پورا سدباب نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی جگہ کوئی دوسری ایڈ زدہ طوائفیں سامنے آ جاتیں۔ بمبئی کے بازار حسن میں اس قسم کی ایڈ زدہ طوائفوں کی کمی نہیں تھی۔ میں کوئی ایسی ترکیب سوچنا چاہتا

تھا کہ جس پر عمل کرنے سے صرف یہ دونوں طوائفیں ہی ہلاک نہ ہوں بلکہ ان کی موت کے بعد کوئی دوسری طوائف پاکستان سمگل ہونے کا نام نہ لے۔

ایسی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ وقت کم تھا سوچ سوچ کر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں دور درشن اون کر کے ایک پروگرام دیکھنے لگا۔ سکرین پر کوئی فلمی ڈانس دکھایا جا رہا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس وقت مجھے یہی ایک ترکیب سب سے کار آمد لگی۔ میں نے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے دونوں طوائفوں رامی بائی اور گنگا بہنی سے ان کی کھولیوں کا پتہ معلوم کرلیا تھا اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ بمبئی کا بازار حسن تو رات بارہ بجے بند ہو جاتا ہے لیکن ان معمولی درجے کی طوائفوں کی کھولیوں والا بازار اس کے بعد بھی دیر تک کھلا رہتا ہے۔ شیو سینا کے آفس میں ایک خفیہ سیل تھا جہاں بھیس بدلنے کے ساز و سامان اور اسلحہ رکھا رہتا تھا۔ میں آٹھ بجے رات نیچے آفس میں آیا۔ دفتر بند تھا صرف چوکیدار بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بیڑی پھینک دی اور سلام کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

"مجھے ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔ میرا فون خراب ہوگیا ہے۔ دفتر کا کمرہ تو کھول دو۔"

اس نے فوراً جیب سے چابیوں کا گچھا نکال اور دفتر کی سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کے دروازے کا تالا کھول دیا اور خود باہر جا کر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس پر میری شخصیت کا رعب تھا۔ اس نے مجھے وہاں ایک بار خود بال ٹھاکرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ بالا جی راؤ کے ساتھ بھی میں دفتر میں آتا جاتا رہتا تھا۔ دفتر کے کمرے میں آ کر میں نے فون کے ڈائیل کا یونہی ایک نمبر گھمایا اور اونچی آواز میں ہیلو ہیلو کرنے لگا تاکہ باہر بیٹھا چوکیدار بھی میری آواز سن لے۔ تین چار مرتبہ ہیلو ہیلو کہنے کے بعد میں تیزی سے دفتر کے کونے میں جو چھوٹا دروازہ تھا اس کو کھول کر بھیس بدلنے والے کمرے میں آ

گیا۔ اس کمرے کی ہر چیز میری دیکھی بھالی تھی۔ مجھے صرف تین چیزوں کی ضرورت تھی جو میں نے پہلے سے سوچ رکھی تھیں۔ وہ تینوں چیزیں میں نے اٹھا کر جیب میں ڈالیں اور باہر نکل کر کمرے کو بند کر دیا۔ چونکہ یہ کمرہ آفس کے کمرے کے اندر تھا اور آفس کو تالا لگ جاتا تھا اس لیے اس چھوٹے کمرے کو تالا نہیں لگایا جاتا تھا۔

کمرے میں آتے ہی میں نے ریسیور اٹھا کر دو تین بار اونچی آواز میں ہیلو ہیلو کہا اور پھر زور سے ریسیور رکھ دیا۔ باہر آ کر چوکیدار سے کہا۔

"جہاں مجھے فون کرنا تھا ان کا فون بھی نہیں بول رہا۔ تالا لگا دو۔"

"جی مالک!"

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے کمرے کی سیڑھیاں دفتر کے دروازے کے عقب میں تھیں۔ اوپر آ کر میں نے سفید کاغذ نکال کر سامنے رکھا۔ تالا مارکر نکال اور اس پر ہندی میں ایک مختصر سی عبارت بڑے بڑے لفظوں میں لکھ دی۔ ہندی کی یہ عبارت میں نے جان بوجھ کر خراب خط بنا کر لکھی تھی تاکہ پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ یہ کسی مسلمان نے لکھی ہے جس کو ہندی لکھنی زیادہ نہیں آتی۔ عبارت کو سامنے رکھکر دو تین بار غور سے پڑھا۔ جب میں اس سے مطمئن ہو گیا تو اس کی ایک اور نقل تیار کر لی۔ دونوں کاغذوں کے درمیان میں سوراخ کر کے ان میں فائیلوں کا مضبوط دھاگہ پرو کر اسے اتنا کھلا رکھا کہ کسی انسان کی گردن میں ڈالا جا سکے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے دونوں کاغذوں کو تہہ کر کے اپنی پرانی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ یہ پرانی جیکٹ ایک مدت سے بمبئی والے فلیٹ میں ہی ٹنگی ہوئی تھی۔ اب میں اسے نہیں پہنتا تھا۔ جب رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ کا وقت ہو گیا تو میں نے کمرے کی بتی بجھا دی۔ غسل خانے میں آ کر غسل خانے کی بتی جلائی اور وہ تین چیزیں نکال کر سامنے رکھ لیں جو میں خفیہ لباس والے کمرے سے نکال کر لایا تھا۔

ان میں سے ایک الجھے ہوئے ہپی ٹائپ کے بالوں کی ایک وگ تھی۔ ایک اسی رنگ کے بالوں کی گھنی داڑھی تھی جس میں مونچھیں ساتھ ہی لگی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں وگیں بڑی پائیدار اور مضبوط تھیں اور بالکل اصلی بالوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ یہ بغیر گوند کے چہرے کے ساتھ اس طرح چپک جاتی تھیں کہ ایک دو بار معمولی طریقے سے کھینچنے پر اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلتی تھیں۔ یہ وہ وگیں تھیں جنہیں لگا کر وہشت گرد ضرورت کے مطابق پاکستان جاتے تھے۔ اس کے بعد میں نے کھدر کا پاجامہ اتار کر پرانی پتلون پہنی۔ شیشے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ میں بالکل نہیں پہچانا جاتا تھا۔ بالکل بھنڈی بازار کا کوئی دادا غنڈہ یا موالی لگتا تھا۔ میں نے اوپر جیکٹ پہن لی اور سب سے ضروری چیز جو میں خفیہ ساز و سامان والے کمرے سے اٹھا کر لایا تھا اسے جیکٹ کی جیب میں سے نکالا۔ یہ نیلے رنگ کی چھوٹی سی ڈبی تھی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا میرا خیال تھا وہ پیازی رنگ کی گولیوں سے بھری ہوئی ہوگی مگر اس میں صرف پانچ گولیاں ہی تھیں۔ جو پانی میں فورا" حل ہو جاتی تھیں۔ ان کا کوئی ذائقہ نہیں تھا اور بے داغ تھیں۔ پانی کا رنگ بالکل نہیں بدلتا تھا۔ یہ بے ہوش کر دینے والی گولیاں تھیں۔ ایک گولی پانی میں ڈال کر اگر اس کا ایک گھونٹ پانی کوئی پی لے تو وہ دس سیکنڈ میں بے ہوش ہو جاتا تھا۔

میں نے ڈبیا میں سے دو گولیاں نکال کر جیب میں رکھ لیں۔ باقی گولیوں کو غسل خانے کے کموڈ میں ڈال کر بہا دیا۔ ڈبی اپنے پاس ہی رکھی۔ میں یہ ڈبی وہاں سے کافی دور جا کر ویران علاقے میں پھینکنا چاہتا تھا۔ رومال پہلے سے میری پتلون کی جیب میں موجود تھا۔ نائیلون کی سبز رنگ کی پتلی ڈوری بھی میں نے جیب میں رکھ لی تھی۔ اس ڈوری سے میں اپنے اٹیچی کیس کو باندھ کر لایا تھا جس کا بکل ٹوٹ چکا تھا اور وہ کھل جاتا تھا۔ ڈوری پتلی مگر بے حد مضبوط تھی۔ میں نے اسے گز بھر کاٹ لیا تھا۔

جب میں ہر طرح سے تیار ہوگیا تو غسل خانے کی بتی کو جلتے رہنے دیا۔ پتلون کی پچھلی جیب میں پچاس پچاس روپے کے پندرہ نوٹ میں نے پہلے ہی رکھ لیے تھے۔ ان نوٹوں نے بڑا کام دکھانا تھا۔ اس کے بعد میں نے کمرے کو تالا لگایا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر بازار کی دوسری جانب ہو کر یوں جھوم جھوم کر مزے مزے سے سگریٹ سلگا کر چلنے لگا جیسے واقعی میں کوئی موالی دادا ہوں۔ چوک میں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے فارس روڈ چلنے کو کہا۔ بمبئی کے بازار حسن کو فارس روڈ کہتے ہیں۔ یہ وہاں سے کوئی دس پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر سر پیچھے ڈالے بیٹھا ایک فلمی گیت گنگنا رہا تھا اور ڈرائیور پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے میں نے پی رکھی ہے۔ ڈرائیور نے راستے میں مجھ سے پوچھا۔

"بابو! کیا ہے کہ بمبئی میں آج کل ولایتی دارو کی بڑی مشکل ہے۔"

میں نے موالیوں والے لہجے میں کہا۔

"تو اپنا منہ بند رکھ کر گاڑی چلا۔ کیا؟"

جیب میں مال ہو تو بمبئی میں سب کچھ ملتا ہے سالا کیا؟"

اس کے بعد فارس روڈ کے ناکے تک ڈرائیور بالکل نہ بولا۔ میں ناکے پر اتر کر اونچے درجوں کی طوائفوں والے بازار کی طرف جانے کی بجائے اس کے پہلو میں ایک دوسرے بازار کی طرف چلا جہاں بہت کم روشنی تھی۔ یہاں نچلے درجے کی طوائفوں کی کھولیاں تھیں۔ اکثر کھولیاں بند تھیں۔ مجھے تشویش ہوئی کہیں گنگا اور رامی بائی کی کھولیاں بھی نہ بند ہوں۔ میں نے ان کی کھولیاں دیکھی نہیں تھیں۔ مجھے ان کا پتہ معلوم کرنا تھا۔

بازار کی نکڑ میں سگریٹ پان کا کھوکھا تھا۔

وہاں کچھ اوباش قسم کے لوگ کھڑے تھے۔ میں نے ان سے رامی بائی اور گنگا بہنی کی کھولیوں کا پتہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کھولیاں ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ ہر کھولی کے باہر ایک طوائف نیم عریاں لباس میں کھڑی یا دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھی تھی۔ خوب میک اپ کیا ہوا تھا۔ میں ذرا دور رہ کر ہر کھولی کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ بازار کے آخر میں ایک کھولی کے ادھ کھلے دروازے میں میں نے رامی بائی اور گنگا بہنی کو دیکھ لیا۔ رامی بائی کواڑ کے سہارے کھڑی تھی۔ گنگا بہنی بیٹھی ہوئی تھی۔ اندر کی جانب کوٹھڑی میں کمزور روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں نے ان دونوں کو فوراً پہچان لیا تھا۔ دونوں نے گوا کی دیہاتی عورتوں کی طرح کمر تک دھوتی باندھی ہوئی تھی اوپر کے جسم پر صرف بلاوز ہی تھا بال خوب بنے ہوئے تھے۔ ایک آدمی ان کے سامنے کھڑا انہیں گھور گھور کر دیکھے جا رہا تھا۔ رامی بائی نے اسے گالی دے کر کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔ مال ہے تو اندر آ جاؤ نہیں تو دفع ہو جاؤ کیا؟"

آدمی شرمندہ سا ہو کر واپس مڑ گیا۔ اس کے بعد میں ان کے سامنے آ گیا۔ رامی اور گنگا نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ یہ ان کی کمرشل مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے مجھے بالکل نہیں پہچانا تھا۔ میرا حلیہ اتنا بدلہ ہوا تھا کہ وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکتی تھیں میں نے آگے ہو کر پوچھا۔

"کیا ریٹ چل رہا ہے بائی؟"

گنگا اور رامی کو یہ جملہ برا لگا۔ ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں نے پتلون کی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر دکھایا اور کہا۔

"پچاس روپلی ٹھیک رہیں گے؟"

ان کے چہروں کی مسکراہٹ واپس آ گئی۔ ان کا ریٹ دس پندرہ روپوں سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ میں نے پچاس کا ایک اور نوٹ نکال لیا۔

"کیا ہے کہ پچاس پچاس ہم تم دونوں کو دے گا۔ تم دونوں ہمارے ساتھ اندر جائے گا۔

رامی اور گنگا شرما گئیں۔ عورت چاہے طوائف بن جائے مگر شرم و حیا کا تھوڑا بہت دامن اس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ میں ان کی طرف بڑھا وہ دونوں دروازے سے ہٹ کر اندر چلی گئیں۔ میں بھی اندر آ گیا۔ رامی نے کھولی کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لی۔ کھولی میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جھلنگا سی کھاٹ پر میلا بستر لگا تھا۔ میلا سا تکیہ پڑا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہاں زیادہ دیر بیٹھنا میرے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ میں نے جیب سے پچاس پچاس کے مزید دو نوٹ نکال کر دونوں کو سو سو روپے دیے اور کہا۔

"دارو پیوں گا پہلے۔"

سو سو روپے لے کر وہ میرے اشاروں پر جیسے ناچنے لگیں۔ رامی نے چارپائی کے نیچے سے دیسی شراب کی بوتل نکال کر لوہے کی چھوٹی سی میز پر رکھ دی۔ گنگا نے ایک گلاس بھی رکھ دیا۔ میں نے کہا۔

"اگر تم دونوں بھی میرے ساتھ دارو کا ایک ایک گلاس پیو گی میں تمہیں اس کے پچاس پچاس روپے الگ دوں گا۔"

اتنے پیسے وہ دونوں مل کر ساری رات میں نہیں کماتی تھیں۔ میں نے پچاس پچاس کے دو نوٹ نکال کر ان کی طرف اچھال دیے۔ انہوں نے لپک کر

لوٹ دبوچ لیے رامی بولی۔

"کیا ہے کہ ہم دارو نہیں پیتیں۔ پر تمہاری خاطر ایک ایک گلاس پی لیں گی۔"

میں نے کہا۔ "پانی کا جگ بھی لے آؤ میں دارو میں پانی ملا کر پیئوں گا۔"

اسی وقت رامی باہر گئی۔ باہر کسی دوسری کھولی سے وہ پانی سے بھرا ہوا عام پانی کا ایک جگ اور سلور کے دو گلاس لے آئی۔ میں نے تینوں گلاسوں میں تھوڑی شراب ڈالی۔ آدھا آدھا گلاس پانی ڈال دیا۔ اب میرے آپریشن کا سب سے اہم اور سب سے نازک مرحلہ آگیا تھا۔ میں نے پہلے سے سوچی سمجھی سکیم کے مطابق جیب سے پچاس پچاس روپوں کے دس پندرہ نوٹ نکالے اور انہیں چارپائی کی دوسری طرف اچھال کر کہا۔

"یہ جمنا دیوی کے بھینٹ ہیں انہیں تم لے لو۔"

دونوں طوائفیں فرش پر گرے ہوئے نوٹوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ایسا کرتے ہوئے دونوں چارپائی کی اوٹ میں ہوگئیں۔ میں اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے جیب سے پیازی رنگ کی مٹر کے دانوں کے برابر گولیاں نکال کر دو گلاسوں میں ڈال دیں اور اپنا گلاس جس میں گولی نہیں ڈالی تھی ہاتھ میں اٹھا لیا۔

اتنے میں رامی اور گنگا نوٹوں کو اپنے بلاؤز کے اندر ڈالتی ہوئی میرے پاس چارپائی پر آکر بیٹھ گئیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہ طوائفیں ایک ایسے مہلک مرض میں مبتلا ہیں جس کا ابھی تک علاج دریافت نہیں ہوا اور جس میں مبتلا ہو کر آدمی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر ختم ہو جاتا ہے۔ خدا جانے یہ اپنی بیماری کس کس کو نہیں لگا چکی ہوں گی اور اگر یہ پاکستان سمگل ہو جاتی ہیں تو وہاں نہ جانے کتنے معصوم نوجوانوں کو ایڈز کا مرض لگا کر انہیں سسک سسک کر دم توڑنے پر مجبور نہیں کر دیں گی۔ دونوں گلاسوں میں ڈالی ہوئی بے ہوشی کی گولیاں شراب کی وجہ سے جلدی گھل چکی تھیں۔ میں نے شراب کے گلاس کو بلند کرتے ہوئے

کہا۔
"شیو دیوتا کی پجارنو! اٹھاؤ مدھورا کا پیالہ اور دیوتاؤں کے نام پر میرے
ساتھ چڑھا جاؤ۔"
ان دونوں کو اتنے پیسے مل چکے تھے کہ میری بے دام غلام بنی ہوئی تھیں
میں نے گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا کر ذرا اوپر کر لیا اور اپنے ہونٹوں کو بند کر
رکھا اور گلے کو یوں حرکت دینے لگا جیسے غٹاغٹ شراب پی رہا ہوں۔ رامی اور
گنگا نے بھی تین تین گھونٹ چڑھا لیے۔ شراب تیز تھی میرے بند ہونٹوں کو
مرچوں کی طرح لگ رہی تھی۔ انہوں نے گلاس رکھ دیے۔ میں نے بھی گلاس
لوہے کی میز پر رکھ دیا۔ رامی نے دیوار میں بنی ہوئی الماری سے ایک لفافہ لا
کا پھاڑا اور میز پر رکھ دیا۔ اس میں بھنے ہوئے چنے تھے۔ اب دونوں میرے
دائیں بائیں بیٹھ کر مجھ سے چہلیں کرنے لگیں۔ گنگا میرے بالوں میں انگلیاں
پھیرنے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پیچھے کر دیا اور غصے میں کہا۔
"میرے بالوں میں صرف کاجل دیوی ہی انگلیاں پھیر سکتی ہے کیا؟"
گنگا نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔
"کاجل کون ہے بابو؟"
رامی نے ہنس کر پوچھا۔ میں نے اسے بھی جھڑک دیا۔ "تم کو اس سے
غرض ہے۔"
میں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ انگلیاں پھیرنے سے میری بالوں کی وگ
سکتی تھی اور ساتھ ہی داڑھی بھی اتر جاتی۔ اگرچہ اس وقت وہ میری شکل
کر مجھے پہچان بھی لیتیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان کی زندگی
کے صرف چند لمحے ہی باقی رہ گئے تھے لیکن مجھے اس بات کا خیال تھا کہ اگر
کوئی دوسرا شخص یا پولیس والا آ گیا تو وہ میری اصلی شکل دیکھ لے گا۔ گنگا
مجھے بستر پر کھینچنا چاہا تو میں نے کہا۔

"پہلے اپنا اپنا گلاس ختم کرو۔ پھر آگے کا دھندا شروع ہو گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ میں نے گلاس اٹھایا۔ انہوں نے بھی گلاس اٹھا لیے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان پر دوائی کا اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے پہلے کی طرح گلاس منہ کے ساتھ لگا کر ہونٹ بند کر لیے اور گلاس کو یوں اوپر چڑھایا جیسے پی رہا ہوں۔ دونوں طوائفیں حقیقی طور پر اپنا اپنا دارو پی گئیں۔ خالی گلاس انہوں نے میز پر رکھے اور گنگا کوئی فلمی گیت گنگنانے لگی۔ رامی بائی نے میرے گلے میں باہنیں ڈال دیں اور بولی۔

"بابو! تم کہاں سے آئے ہو؟ پہلے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔

گنگا میری جیکٹ اتارتے ہوئے بولی۔

"بابو تم دو دو عورتوں کے شوقین ہو تو دن کے وقت ہماری کھولی میں آیا کرو۔"

میں نے گنگا کا ہاتھ پیچھے کر دیا۔

"ابھی ایک ایک گلاس اور چلے گا۔ ابھی دارو کا نشہ نہیں ہوا۔"

رامی کا سر ڈول گیا بولی۔

"مجھے تو بڑا نشہ چڑھ گیا ہے بڑی تیز شراب ہے۔

اس دوران گنگا کا سر بھی ڈولنے لگا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے دونوں بے ہوش ہو کر چارپائی پر گر گئیں۔ میں جلدی سے الگ ہو گیا۔ پہلا کام میں نے یہ کیا کہ کھولی کی کنڈی کھول کر دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پان سگریٹ کے کھوکھے تک بازار خالی پڑا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لی۔ اب مجھے ان دونوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ میں پہلے رامی بائی پر جھک گیا۔ نائیلون کی باریک رسی اس کی گردن میں ڈالی اور پھندے کو کس دیا۔ رامی کا جسم ہلکے ہلکے جھٹکے کھانے لگا۔ جب یہ جھٹکے ختم ہو گئے اور اس کا کھلا ہوا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تو میں نے پھندا ڈھیلا کر کے اس کی گردن کی خاص رگ پر انگلی رکھ دی۔ یہ

رگ دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکا کرتی ہے۔ رگ ساکت ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر زور سے بائیں جانب گھما دیا مجھے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اسی طرح میں نے دوسری طوائف گنگا بہنی کا بھی کام تمام کر دیا۔ رومال سے ان کی گردنوں پر اپنی انگلیوں کے نشان رگڑ رگڑ کر مٹا دیے۔ اگرچہ اس کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ بمبئ کے کسی تھانے میں بھی میری انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ پھر بھی احتیاط بہت ضروری تھی۔ اب ایک آخری اور انتہائی ضروری کام باقی تھا۔

میں نے جیب سے دونوں کاغذ نکالے جو ڈوریوں میں پروئے ہوئے تھے۔ دونوں کاغذ میں نے دونوں طوائفوں کی لاشوں کی گردن میں ڈال دیے۔ ان کاغذوں پر میں نے ہندی میں جو عبارت لکھی تھی وہ یہ تھی۔

"رامی بائی اور گنگا بہنی کو پاکستان بھیجا جا رہا تھا تاکہ وہاں جا کر یہ طوائفیں ایڈز کی بیماری پھیلائیں۔ خبردار! ان کا انجام دیکھ لو۔ جو طوائف پاکستان جانے کے لیے تیار ہوئی اس کا یہی انجام ہو گا۔ اگر بھارت میں نہیں تو پاکستان میں پہنچتے ہی انہیں قتل کر دیا جائے گا ۔۔۔۔۔۔۔ محمود غزنوی سینا۔"

میرا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے طوائفوں کو دیے ہوئے سارے نوٹ اکٹھے کر کے اپنی جیب میں ڈالے اور کھولی سے باہر نکل گیا۔ چھوٹا سا گناہ کا بازار خالی پڑا تھا۔ کہیں کہیں دو تین آدمی آگے کی کھولیوں کے سامنے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اس طرف جانے کی بجائے میں وہیں سے ایک کھیت میں اتر گیا اور تیز تیز دوسری طرف چلنے لگا۔ دور بمبئ کی کچھ عمارتوں کی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں اس علاقے سے ناواقف نہیں تھا۔ کھیت ختم ہوئے تو ایک کچرے کا میدان آ گیا یہاں سے میں ایک سڑک پر چڑھ گیا اب میں محفوظ تھا۔ ایک کالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور شیو سینا کے آفس

بجائے اس کے پیچھے جو رائل آپرا ہاؤس تھا ٹیکسی والے کو وہاں چلنے کے لیے کہا۔

رائفل آپرا ہاؤس وہی جگہ ہے جہاں پرتھوی تھیٹرز بن گیا تھا اور پرتھوی راج نے دیوار نام ایک ڈرامہ پلے کیا تھا جو پاکستان کے خلاف تھا۔ یہاں میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل چلتا اپنے فلیٹ میں آکر بستر پر بیٹھ گیا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور وگ اور داڑھی وغیرہ اتار کر تھیلے میں بند کر کے ایک محفوظ جگہ پر سنبھال کر رکھ دی۔ رات آدھی سے کچھ زیادہ نہیں گزری تھی۔ میرا مشن بغیر کسی رکاوٹ کے خوش اسلوبی سے ختم ہو گیا تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر کرتا پاجامہ پہن لیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کمرے کی بتی بجھا کر ہی گیا تھا۔ میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے دونوں پاکستان سمگل کی جانے والی ایڈز زدہ طوائفوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی گردنوں میں فرضی محمود غزنوی سینا کی طرف سے انتباہ کے جو خط ڈال دیے تھے۔ ان کی وجہ سے آیندہ پاکستان میں بھارتی ایڈز زدہ طوائفوں کی سمگلنگ ہمیشہ کے لیے بند کر دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی نچلے درجے کی طوائف اپنی جان کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ خواہ اسے کتنا ہی لالچ کیوں نہ دیا جائے۔ محمود غزنوی سینا کا خیال مجھے شیوسینا سے آیا تھا اور میں نے ان طوائفوں کے سامنے گویا ان کی موت کا فرشتہ کھڑا دیا تھا۔ محمود غزنوی کا تصور مہاراشٹر خاص طور پر بمبئی اور سوراشٹر کے لوگوں میں بڑا دہشت ناک تھا۔ محمود غزنوی نے ان کے سب سے بڑے دیوتا کے بت کے پرخچے اڑائے تھے اور اس کے آدھے دھڑ کو اپنے گھوڑے کے پیچھے رسی سے باندھ کر غزنی تک گھسیٹتا لے گیا تھا۔ اس علاقے کا بچہ بچہ ابھی تک محمود غزنوی کے نام سے ڈرتا تھا۔ یہ میں نے اس سارے علاقے میں رہ کر دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے میں نے خط کے نیچے محمود غزنوی سینا کا نام لکھا تھا۔ اس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ بال ٹھاکرے کی مسلمان دشمنی شیوسینا کے مقابلے میں ہندوؤں کی

جانی دشمن ایک خفیہ تنظیم قائم ہوگئی ہے' جو بھارت میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکے گی۔ پاکستان میں بھارت کی ہلاکت خیز بمباری ایڈز کا داخلہ میں نے روک دیا تھا۔

اس کا سب سے زیادہ ردعمل سیوسینا کے فرعون لیڈر بال ٹھاکرے پر ظاہر ہونا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ مجھ پر شک پڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ دوسرے روز سارے بمبئی شہر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ فارس روڈ کی دو طوائفوں کو محمود غزنوی سینا کے آدمیوں نے قتل کر دیا ہے۔ اگر میں نے ان عورتوں کی لاشوں کے گلوں میں فرضی محمود غزنوی کے خط نہ لٹکائے ہوتے تو بھارت کا پریس اس دوہرے قتل کو کبھی اتنی اہمیت نہ دیتا۔ بس ایک چھوٹی سی خبر چھپ جاتی کہ فارس روڈ پر دو طوائفیں رات قتل ہوگئی ہیں لیکن یہ قتل کی خفیہ تنظیم محمود غزنوی سینا نے کیے تھے اور سینا نے اس دوہرے قتل کی ذمے داری بھی قبول کر لی تھی۔ اس وجہ سے بھارتی پریس میں اس خبر کو بے حد اچھالا گیا اور طوائفوں کی لاشوں کی تصویروں کے ساتھ محمود غزنوی کے دونوں خطوں کو بڑا کر کے چھاپا گیا۔ کئی گجراتی اخباروں نے تو خبر کے آخر میں بال ٹھاکرے کو مخاطب کر کے سوال بھی کیا کہ اس بارے میں بال ٹھاکرے کیا پالیسی اختیار کریں گے اور کیا وضاحت فرمائیں گے۔ بال ٹھاکرے کو میں نے ہر معاملے میں بڑا محتاط پایا تھا لیکن اس میں ایک زبردست کمزوری تھی۔ یہ کمزوری بھارت کے مسلمانوں اور خاص طور پر پاکستان کے مسلمانوں سے دشمنی تھی۔ جب وہ مسلمانوں کا ذکر کرتا تو اس کے اندر کی نفرت کا لاوا ابل پڑا تھا اور جو جی میں آتا تھا کہے جاتا تھا۔ چنانچہ گزشتہ دنوں اس نے ایک اخبار نویس کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے بیان کے نتائج پر غور کیے بغیر کہہ دیا تھا کہ بھارت کی طوائفوں میں ایڈز کی بیماری بہت ہوگئی ہے۔ ہم ان ایڈز زدہ طوائفوں کو پاکستان بھیج دیں گے۔ تاکہ وہاں ایڈز کی بیماری کو وبا کی طرح پھیلا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک

اخباروں نے بھارتی مسلمانوں کی خفیہ تنظیم محمود غزنوی سینا کے قیام اور دونوں طوائفوں رامی بائی اور گنگا بہنی کے قتل کی ذمے داری بال ٹھاکرے پر ڈال دی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ایک تیر سے دو شکار کر لیے تھے۔

ابھی مجھے ایک اور تیر چلانا تھا اور اس سے پیشتر کہ اخباروں میں یہ سنسنی خیز خبر پڑھ کر وہ مجھے بلاتا مجھے خود اس کے پاس پہنچنا تھا۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ بال ٹھاکرے بہت صبح سویرے اٹھتا ہے اور غسل کرنے کے بعد شیو دیوتا کی مورتی کی پوجا کرتا ہے۔ اس کی بیوی اس کے ماتھے پر شیو دیوتا کا زعفرانی تلک لگاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ہیرو شیوا جی مرہٹہ کی مورتی کے آگے بیٹھ کر اس کی پوجا کرتا ہے اور پھر ناشتے کی میز پر بیٹھ کر اخباروں کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ سارے کام وہ سات بجے تک پورے کر لیتا ہے میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور ٹیکسی پکڑ کر بال ٹھاکرے کی کوٹھی پہنچ گیا۔

وہاں بالا جی راؤ پہلے سے موجود تھا۔ بال ٹھاکرے انتہائی غصے کے عالم میں ڈرائینگ روم میں اپنے صوفے پر بیٹھا بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے پھٹ پڑا۔

"تم لوگ بمبئی میں کیا کرتے پھرتے ہو؟ آج کا اخبار پڑھا تم نے؟"

میں نے آگے بڑھ کر بال ٹھاکرے کے گھٹنے کو چھوا اور کہا۔

"مہاراج! مجھے تو یہ سب ڈرامہ لگتا ہے۔" بال ٹھاکرے نے محمود غزنوی سینا کو گالی دے کر کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ غزنوی سینا ڈرامہ ہے؟ تم سارے لوگ نکمے لوگ ہو۔ یہاں کے مسلمانوں نے اندر ہی اندر ہمارے خلاف ایک سینا تیار کر لی ہے اور تم اسے ڈرامہ سمجھ رہے ہو۔ کیا دونوں طوائفوں کا قتل ڈرامہ ہے؟"

پھر وہ بالا جی راؤ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"مہاراشٹر کے اقلیتی مسلمانوں کی یہ ہمت کہ شیوسینا کے مقابلے پر ہتھیار اٹھائے؟ مجھے دودن کے اندر اس خفیہ سینا کی پوری رپورٹ چاہیے۔ یہ کون مسلمان ہیں؟ ان کا خفیہ ٹھکانہ کہاں ہے؟ ان کو کس مسلمان لیڈر کی حمایت حاصل ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے کل شام تک معلوم ہو جانی چاہئیں سمجھے۔"

"جی سینا پتی جی۔"

اس کا غصہ تھوڑا اترا تو مایوسی کے ساتھ سر کو دائیں بائیں کرتے ہوئے میری فرضی محمود غزنوی سینا کو مراٹھی زبان میں گالیاں دیتے ہوئے بولا۔

"اس نے میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں ایڈز کی بیماری کو بھارت سے نکال کر پاکستان پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے دو دو تین تین کر کے ایک مہینے میں کلکتہ مدراس بمبئی کی ساری بیمار طوائفوں کو پاکستان سمگل کرا دینا تھا۔"

پھر مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب مقناطیسی کشش تھی۔ مجھے ڈر لگا کہیں اس کو مجھ پر شک تو نہیں ہوگیا لیکن یہ اس کی عادت تھی جس سے وہ بات کرتا تھا اس کی طرف بات کرنے سے پہلے گھور کر ضرور دیکھتا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس حرام زادے چکرورتی کے کشمیری جاسوس ساتھی کا تم نے کچھ پتہ چلایا؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج جی! میں کل سارا دن اسی کام میں لگا رہا۔"

"پھر تم نے کیا پتہ کیا؟" بال ٹھاکرے نے سخت لہجے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔

"سینا پتی جی! مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک کشمیری فوٹوگرافر کچھ عرصہ پہلے میرین ڈرائیو کے پیچھے کتابوں کے ایک اسٹال پر رات کو آکر سویا کرتا تھا لیکن ایک ہفتے سے وہ نہیں دیکھا گیا۔"

بال ٹھاکرے نے اس کشمیری فوٹوگرافر کو بھی گالی دی اور بولا۔ "میں

تمہیں چوبیس گھنٹوں کی مہلت دیتا ہوں اس کا کھوج لگاؤ۔ اس سالے چکرورتی کو تو میں ابھی گرفتار کرواتا ہوں۔"

اس نے ٹیلی فون آگے کر کے دلی کا کوڈ نمبر ملایا اور دوسری طرف سے کوئی آواز آئی ہوگی۔ بال ٹھاکرے نے پوچھا۔

"تم کون بول رہے ہو؟ ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سریندر کوہلی کا گھر نہیں ہے کیا؟ تو پھر وہ کہاں ہے؟ اسے کہو ٹھاکرے جی بمبئی سے بات کریں گے۔"

ریسیور اس نے کان سے نیچے کر لیا اور نفرت سے بڑبڑانے لگا۔ "سالے آٹھ آٹھ بجے تک لمبی تان کر سوئے رہتے ہیں۔"

ریسیور اس نے کان کے ساتھ لگا لیا۔

"ہاں سریندر کوہلی سنو۔ جوگی وال میزائیل سینٹر میں چکرورتی نام کا جو میزائیل کنٹرولر تم لوگوں نے رکھا ہوا ہے۔ وہ پاکستان کا جاسوس ہے۔ اسے فوراً گرفتار کیا جائے۔ کیا کہا؟ تمہارا ڈیفنس منسٹر کون ہوتا ہے اعتراض کرنے والا؟ تم اس لیے ڈرتے ہو کہ چکرورتی اس کا بھانجا ہے؟ یہ بھارت کی ٹاپ نیشنل سیکورٹی کا معاملہ ہے۔ اگر تم نے چکرورتی کی گرفتاری کے آڈر جاری نہ کیے تو پھر تم بھی اپنی جگہ پر نہیں رہو گے سمجھے؟ ہاں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"سالے یہ سارے بیوروکریٹس بھارت کے دشمن ہیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔"

بالا جی راؤ ابھی تک ڈر کے مارے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میں کہہ رہا تھا وہ سر جی۔"

"کہہ رہا تھا کہ میں پنجاب کے انٹیلی جینس چیف سے بات کرتا ہوں۔ فکر نہ کریں شام تک چکرورتی اپنی پوسٹ پر نہیں ہو گا۔"

اس نے سریندر کوہلی کو بھی تین چار گالیاں دیں اور کہا۔ "مجھے خطرہ ہے وہاں میزائیل سینٹر میں کچھ گڑ بڑ نہ ہو جائے۔"

بالا جی راؤ کو ہم نے اس معاملے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا سچ مچ میزائیل کنٹرولر چکرورتی پاکستانی جاسوس ہے؟"

بال ٹھاکرے نے بے دلی سے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ دھرم چند کی رپورٹ ہے اور اس معاملے میں مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بال ٹھاکرے کی نظروں میں میں ابھی تک کسی شک شبے سے بالا تر تھا۔ میں نے بالا جی راؤ سے کہا۔

"یہ بات ننانوے پرسنٹ ثابت ہو چکی ہے بالا جی کہ چکرورتی کا پاکستانی ایجنٹوں سے ملنا جلنا ہے۔"

"پھر وہ ابھی تک وہاں کیوں بیٹھا ہے؟" بالا جی راؤ نے تعجب کے ساتھ کہا۔ "اس کو تو ختم کر دینا چاہیے تھا۔"

بال ٹھاکرے نے چکرورتی اور پھر بھارت کے رکھشا منتری کو گالی دینے کے بعد کہا۔

"یہ چکرورتی سالا رکھشا منتری کا بھانجہ ہے اور رکھشا منتری کا بھارت کی حکمران پارٹی سے تعلق ہے۔ یہ حرامی سیاسی کھیل کھیل رہے ہیں اور انہیں بھارت ورش کی تباہی کا بھی کوئی خیال نہیں ہے۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ دوپہر تک سریندر کوہلی نے چکرورتی کو گرفتار نہ کروایا تو میں سیدھا پردھان منتری سے بات کروں گا۔"

میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میرے لگائے ہوئے چپس بم میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی اور وہ بم ابھی تک اسی طرح پرتھوی میزائیل کے ہیٹ کنٹرولر سوکٹ میں چپکا ہوا ہے تو آج رات کے

ساڑھے دس بجے وہاں جو تباہی مچے گی اس کے بعد بال ٹھاکرے کا کیا حال ہو گا؟ میں نے اپنے حساب سے اس تباہی کی ساری ذمے داری مسٹر چکرورتی پر ڈال دی تھی اور بال ٹھاکرے کو چکرورتی کے پاکستانی ایجنٹوں سے ملے ہونے کا یقین بھی ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود میں کچھ گھبرا بھی رہا تھا۔ کیونکہ تباہی بہت بڑی ہونے والی تھی اور اس تباہی کے نتیجے میں بھارت سرکار کے ایوانوں میں زلزلہ سا آ جانا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو پوری طرح سے قابو میں رکھا ہوا تھا اور طے کر رکھا تھا کہ اس بھیانک تباہی کے بعد بال ٹھاکرے سے زیادہ واویلا مچاؤں گا اور اپنے اس موقف کو دہراؤں گا کہ میں نے تو آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ یہ شخص چکرورتی پاکستان کا جاسوس ہے۔

ہم بال ٹھاکرے کی کوٹھی سے باہر نکلے تو بالا جی راؤ کہنے لگا۔

"ٹھاکرے جی سے بھی ایک غلطی ہو گئی ہے۔ ان کو یہ بیان نہیں دینا چاہیے تھا کہ بھارت میں جن طوائفوں کو ایڈز کی بیماری ہے ہم انہیں پاکستان پہنچا دیں گے۔ ان کے اسی بیان نے محمود غزنوی سینا کو جنم دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بالا جی یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "دھرم چند جی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بھنڈی بازار کے مسلمان مڈل کلاس کے کاروباری لوگ ہیں وہ نہیں ہو سکتے۔ یہ کام یا تو بڑے اونچے طبقے کے اوباش اور لوٹ مار کرنے والے کسی گروہ کا ہے اور یا پھر اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو جی۔ میں ان کا کھوج لگا کر ہی چھوڑوں گا۔ ایک بار پتہ چل گیا کہ یہ کون مسلمان ہیں اور بمبئی کے کس مسلمان محلے میں ان کا گھر یا ٹھکانہ ہے تو پھر یہ ہم سے نہیں بچ سکیں گے۔"

باتیں کرتے ہم شیو سینا کے آفس میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں بھی رات قتل ہو

جانے والی طوائفوں اور ان کی گردنوں میں لٹکے ہوئے خط کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ گجراتی، ہندی، مراٹھی، اردو اور انگریزی کے سبھی اخباروں میں اس خط کی مقتول طوائفوں کی فوٹو چھپی تھی۔ ابھی یہاں ایک اور دھماکہ ہونے والا تھا یہ دھماکہ رات ساڑھے دس بجے جالندھر کے پاس جوگی وال گاؤں کے ٹیلے کے اندر میزائیل سینٹر میں ہونا تھا۔ اس دھماکے نے سارے بھارت کو ہلا ڈالنا تھا۔ بال ٹھاکرے کا پارہ ابھی اور چڑھنا تھا مگر میں نے اپنی کھال بچانے کے لیے زمین پہلے ہی سے ہموار کر رکھی تھی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں بال ٹھاکرے نے میزائیل کنٹرولر چکرورتی کو گرفتار کرنے کے لیے دلی ٹیلی فون بھی کیا تھا۔

مجھے امرتسر جا کر پرانے تالاب والی خفیہ پناہ گاہ میں کشمیری کمانڈو شیر باز سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ وہ جبل پور میں آرمی ایمونیشن اور کشمیر کے محاذ پر استعمال ہونے والے فوجی اسلحہ کے ذخیرے کا پتہ چلانے گیا ہوا تھا۔ لیکن ابھی اس کے آنے میں تین چار دن باقی تھے۔ میں ابھی بمبئی سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میزائیل سینٹر اگر دھماکے سے تباہ ہو جاتا ہے تو میں بال ٹھاکرے کے پاس موجود رہوں۔ دوپہر کا کھانا میں نے اور بالا جی راؤ نے شیوسینا کے بمبئی والے دفتر میں ہی کھایا۔ اس کے بعد بالا جی راؤ چلا گیا۔ میں دفتر والے فلیٹ میں آ کر سو گیا۔ آفس سیکرٹری کو میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر بال ٹھاکرے جی کا فون آئے تو مجھے اوپر اطلاع کر دینا۔

سو کر اٹھا تو ہمیں شام ہو چکی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بمبئی کی بارش مجھے شروع ہی سے اچھی لگتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت کا یہ واحد ساحل سمندر کا شہر تھا جہاں برسات کے دنوں میں حبس برائے نام ہوتا تھا۔ بمبئی میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر اس وقت میں بمبئی کے موسم سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ میری ساری توجہ جالندھر والے میزائیل سینٹر کی طرف تھی جہاں پرتھوی میزائیل میں لگائے ہوئے میرے چپس بم نے رات کے ٹھیک دس بجے پھٹنا تھا اور ساتھ ہی سارے کمپلیکس کو اڑا دینا تھا۔ میں اس وقت تک شیوسینا کے دفتر میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں گیٹ وے آف انڈیا کی طرف نکل گیا اور کشتی میں سمندر کی سیر کرتا رہا۔ پھر میٹرو سینما کی کینٹین میں بیٹھ کر چائے پی اس دوران رات ہوگئی۔ میں شیوسینا کے آفس میں واپس آگیا۔

میں نے اپنی کارکردگی ڈالنے کے لیے بال ٹھاکرے کو فون کر دیا۔ اس نے مجھے اپنا جو خاص ٹیلی فون نمبر دیا ہوا تھا میں نے اس کا نمبر ڈائیل کیا تھا۔ دوسری طرف بال ٹھاکرے نے ہی ریسیور اٹھایا۔ اس نے حسب عادت پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "سیناپتی جی میں ہوں آپ کا سیوک دھرم چند۔"

بال ٹھاکرے نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"ہاں دھرم چند! کہو کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج! میں نے اب تک جو تفتیش کی ہے اس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ بمبئی اور سورت کے چند ایک جرائم پیشہ مسلمان ہیں جنہوں نے محمود غزنوی سینا بنائی ہے لیکن اس پارٹی کو دوسرے مسلمانوں کی سمرتھا (حمایت) حاصل نہیں ہے۔"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"یہ سراغ لگاؤ کہ اس سینا کا لیڈر کون ہے۔"

میں نے کہا۔

"سر! میں یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

بال ٹھاکرے نے زور دے کر کہا۔

"کوشش نہیں دھرم چند لیڈر کا نام پتہ معلوم کرو۔ یہ پارٹی ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کل کو یہ سیاسی پارٹی بن کر سامنے آ گئی تو اس کو مہاراشٹر، سوراشٹر اور مدھیہ پردیش کے سارے مسلمانوں کی سمرتھا حاصل ہو جائے گی اور اس کے نمائندے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں پہنچ جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پارٹی کو ابھی سے ختم کر دوں۔ اس سینا کے جتنے جرائم پیشہ یا دوسرے جتنے ممبر ہیں۔ ان کا سراغ لگاؤ۔ میں ان سب کو ایک ایک کر کے ختم کروا دوں گا۔"

"ایسا ہی ہوگا مہاراج! میں ان کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔

میں نے دفتر کی دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی۔ کلاک کی سوئیاں رات کے آٹھ بجا رہی تھیں۔ میں اٹھ کر باہر بازار میں آ گیا ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے ایک ایرانی ریستوران میں آ کر کھانے کا آرڈر دیا۔ بڑے مزے سے مرغ پلاؤ کھایا۔ سگریٹ سلگایا اور چائے کی پیالی سامنے رکھ کر سوچنے لگا کہ

الٹی گنتی ختم ہونے والی ہے۔ خدا کرے کہ چپس بم اپنے وقت پر بلاسٹ ہو جائے امید نہیں تھی کہ چپس بم مجھے دھوکہ دے گا۔ اس سے پہلے میں اس قسم کے تین بم بنا کر گجرات، کاٹھیاوار کے بھارتی کیمپوں میں آزما چکا تھا۔ وہاں ان بموں نے بڑی تباہی پھیلائی تھی اور ٹھیک وقت پر پھٹے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ چپس بم بھی مجھے دھوکہ نہیں دے گا اور رات کے ٹھیک ساڑھے دس بجے اپنا کام دکھا دے گا۔

میرے لیے یہ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایرانی ریستوران میں ساڑھے نو بجے تک بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اٹھ کر شیوسینا کے دفتر والے فلیٹ میں آ گیا۔ بوندا باندی اب ہلکی بارش میں بدل گئی تھی۔ بمبئی کی گیلی سڑکیں عمارتوں اور دکانوں کی روشنیوں میں چمک رہی تھیں۔ میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیا اور سگریٹ سلگا کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر نیچے بازار کا منظر دیکھنے لگا۔ دل میں بے چینی سی لگی تھی۔ کھڑکی سے ہٹ کر کونے والی میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور صبح کا اخبار دیکھنے لگا۔ اس میں رامی بائی اور گنگا بہنی کی لاشوں کی تصویریں تھیں۔ میں نے اخبار کو پرے کر دیا۔ میری ساری توجہ، میرے سارے خیال جوگی وال کے میزائیل سینٹر کی طرف لگے تھے۔ اس وقت مسٹر گھوش اور چکرورتی رات کی ڈیوٹی پر ہوں گے۔ اگر چکرورتی کو گرفتار نہیں کیا جا سکا تو وہ میزائیل کنٹرول روم میں ہی ہو گا۔ گھڑی دس بجا رہی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا اور بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں ایک ایک سیکنڈ گن رہا تھا۔ سوا دس بج گئے پھر ساڑھے دس بجنے میں دس منٹ پھر پانچ منٹ پھر دو منٹ باقی رہ گئے۔ جب گھڑی نے پورے ساڑھے دس بجا دیے تو میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے میری گھڑی دو تین منٹ آگے ہو۔ ابھی وہاں کچھ بھی نہیں ہوا ہو گا لیکن وہاں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا تھا۔ ٹھیک رات کے ساڑھے دس بجے چپس بم نے پھٹ کر میزائیل کے کمپریسر مائع ایندھن میں ایسا زور

دار دھماکہ کیا تھا کہ اس نے پورے ٹیلے کو ریت کے ذرے بنا کر اڑا دیا تھا۔ اس کے بعد میزائیل کے دونوں راکٹ بھی دھماکے کے ساتھ پھٹ گئے تھے اور ان دھماکوں نے پورے زیر زمین میزائیل سینٹر کو اس طرح اڑادیا تھا جس طرح کوئی جوالہ مکھی پوری طاقت کے ساتھ پھٹ کر پتھروں کو راکھ بنا کر فضا میں بکھیر دیتا ہے۔ اس کی ساری تفصیل مجھے بعد میں جالندھر جا کر معلوم ہوئی تھی۔ میزائیل سینٹر کے عملے کا ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچا تھا۔ لیکن میں بمبئی میں بیٹھا تھا۔

اور گھڑی کی سوئیاں ساڑھے دس بجا کر آگے نکل گئی تھی۔ میں ریزلٹ معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا مگر کسی سے پوچھنا اس کو خوامخواہ شک میں مبتلا کرنے کے برابر تھا۔ میں نے دور درشن اون کیا۔ وہاں ایک ڈرامہ نشر ہو رہا تھا۔ اس کے بعد خبریں شروع ہوگئیں۔ میں ٹیلی ویژن کے نزدیک ہوگیا۔ خبروں میں میزائیل سینٹر کی کوئی خبر نہیں تھی میں مایوس ہوگیا۔ میرا بنایا ہوا چپس بم مجھے دھوکہ دے گیا تھا۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے حکومت نے اس حادثے کی خبر نشر کرنے کی اجازت نہ دی ہو۔ میں نے ایک اخبار کے دفتر میں عام شہری بن کر فون کیا اور پوچھا۔ "کیوں بھائی آج کی کوئی خاص خبر ہو تو بتاؤ۔"

دوسری طرف یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ "کوئی خبر نہیں ہے۔"

میں نے جیسے ہی ٹیلی فون کا ریسیور رکھا فون کی گھنٹی بجنے لگی میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف بالا جی راؤ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"تمہیں کچھ معلوم ہوا۔"

"کیا ہوا بالا جی؟"

"بیڑا غرق ہوگیا ہے دھرم چند بس تم جلدی سے ٹھاکرے جی کی کوٹھی پہنچ جاؤ۔"

اور اس نے فون بند کر دیا۔ میری جان میں جان آگئی میں نے زور سے

اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور دبی زبان میں اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ میرے چپس بم نے مجھ سے پوری وفاداری کی تھی۔ یہ جوگی وال میزائیل سینٹر کی تباہی کی خبر تھی جس کی وجہ سے بالا جی راؤ گھبرایا ہوا تھا اور بال ٹھاکرے کے بنگلے پر بھی پہنچا ہوا تھا۔ دوسری کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں فوراً فلیٹ سے نکلا اور ٹیکسی لے کر بال ٹھاکرے کے بنگلے پر آگیا بالا جی راؤ برآمدے میں ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"جالندھر میں بڑی تباہی ہوئی ہے۔ میزائیل سینٹر دھماکے سے اڑ گیا ہے۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ مجھے پنجاب شیوسینا کے پرشاد نے تھوڑی دیر پہلے فون پر بتایا تو میں گھبرایا ہوا یہاں پہنچا۔"

میں نے چہرہ لٹکا لیا۔ میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہے بھگوان! یہ کیا ہوگیا؟ سینا پتی جی کو خبر ہوئی کیا؟"

"خبر ضرور ہوگئی ہوگی۔ وہ چیف منسٹر ہاؤس گئے ہوئے ہیں۔ وہاں اسی بارے میں ایمرجینسی میٹنگ ہو رہی ہے۔"

میں نے اداکاری شروع کر دی اور سر پکڑ کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں تو کئی دنوں سے کہہ رہا تھا۔ کہ مسٹر چکرورتی پاکستانی ایجنٹوں سے مل کر کوئی سازش کر رہا ہے۔ آخر وہ بدبخت اپنی سازش میں کامیاب ہوگیا۔ یہ تو ہمارا بہت بڑا نقصان ہوا ہے بالا جی۔ کاش چکرورتی کو ایک ماہ پہلے گرفتار کر لیا جاتا پھر شاید یہ تباہی نہ ہوتی۔"

بالا جی راؤ بھی میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری رپورٹ بالکل درست تھی۔ ٹھاکرے جی نے تو چکرورتی کی گرفتاری کی پوری کوشش کی تھی مگر رکھشا منتری نے ایک نہ چلنے دی۔ اب وہ بھی نہیں بچے گا۔"

میں نے بالا جی راؤ سے کہا۔
"دور درشن نے کوئی خبر نہیں دی۔"
وہ بولا۔ "سرکار نے اس خبر کو دبا دیا ہے۔ مگر دبانے سے کیا ہوگا۔ بی بی سی نے یہ خبر دے دی ہوگی۔ اس قسم کی خبریں کبھی دبائی نہیں جا سکتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں جب میزائیل سینٹر میں دھماکے ہوئے ہوں گے تو کتنی تباہی نہیں مچی ہوگی۔ وہاں تو ہماری رپورٹ کے مطابق دس پرتھوی میزائیل تھے۔"
میں نے کہا۔ "سارا ٹیلہ اڑ گیا ہوگا۔"
بالا جی کہنے لگا۔
"اردگرد کوئی آبادی نہیں تھی۔ بھگوان نے بچا لیا ورنہ بہت زیادہ تباہی پھیلتی۔ پرشاد جی خود بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تباہی کی پوری رپورٹ دوں گا۔ وہ اسی وقت امرتسر سے جالندھر روانہ ہوگیا تھا۔"
اتنے میں بنگلے میں بال ٹھاکرے کی گاڑی داخل ہوئی۔ ہم جلدی سے اٹھ کر پورچ میں آ گئے۔ گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ پورچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ بال ٹھاکرے کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص زعفرانی ریشمی لباس میں تھا مگر چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا تو بال ٹھاکرے نے باہر نکل کر مجھے گھور کر دیکھا۔ میں اندر سے گھبرا گیا۔

وہ بولا۔
"دھرم چند! تمہاری انٹیلی جینس رپورٹ درست تھی۔"
اور وہ بھارت سرکار کی بیوروکریسی کو مراٹھی میں گالیاں دیتا بڑے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھ پر بال ٹھاکرے کا اعتماد بحال تھا اور مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کیا گیا تھا۔ یہ میری بہت بڑی جیت تھی۔ اس کے بعد اپنے کمرے میں آ کر بال ٹھاکرے صوفے پر نہیں بیٹھا۔ چاندی کی موٹھ والی چھتری ہاتھ میں لیے پنجرے میں بند

بھالو کی طرح ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہا اور گرجتا رہا اور بھارت کے اس وقت کے رکھشا منتری بھارت کی ملٹری انٹیلی جینس' سول پولیس انٹیلی جینس اور جالندھر کی پولیس کو مراٹھی زبان میں اور بمبئی کے موالیوں کی زبان میں ہر طرح کی گالیاں دیتا رہا۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اسے مجھ پر کسی طرح کا بھی شک نہیں تھا بلکہ اس نے دو تین بار میری طرف اشارہ کر کے بالا جی راؤ سے کہا۔

"ان حرام زادوں سے تو یہ ان پروفیشنل ہماری سینا کا جاسوس ہزار درجے بہتر ہے جس نے مجھے ایک مہینہ پہلے بتا دیا تھا کہ مسٹر چکرورتی پر اسے شک ہے کہ وہ پاکستانی ایجنٹوں سے ساز باز کر رہا ہے۔"

اس نے بھارت کے وزیر داخلہ کو بھی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

"یہ سالے بھی کرسیوں پر بیٹھے حرام کی کمائی کھا رہے ہیں۔ ان سب کو قطار میں کھڑا کر شوٹ کر دینا چاہیے۔ میں چیختا رہا' شور مچاتا رہا کہ جوگی وال میزائل سینٹر میں سازش ہو رہی ہے۔ چکرورتی کو گرفتار کر لو۔ مگر میری کسی نے نہیں سنی۔ اب میٹنگ میں ڈی سی بہاری لال اور چیف منسٹر بھی ہاتھ باندھ کر کہہ رہے تھے ٹھاکرے جی آپ سچے تھے۔ اب ان کا سنگھاسن ڈولنے لگا ہے تو میرے آگے ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ مگر میں تو ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں صبح پہلی فلائیٹ سے دلی جا رہا ہوں۔ پردھان منتری سے اپوائنٹمنٹ ہو گیا ہے۔ انہیں ان سب حرامیوں کی پوری رپورٹ دوں گا۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ پانی کا گلاس سنہری موتیوں والی جالی سے ڈھکا ہوا تپائی پر پڑا تھا۔ اس نے پانی غٹاغٹ پی لیا اور بالا جی سے کہا۔

"میں تو رکھشا منتری کو جیل بھجوا کر چھوڑوں گا۔ یہ ساری سازش اسی کے بھتیجے چکرورتی کی تھی۔ میرے کہنے پر بھی اس نے چکرورتی کو نہیں پکڑا۔ اگر پکڑ لیتا تو ممکن تھا کہ میزائیل سینٹر میں یہ بھیانک تباہی نہ مچتی۔ مگر اب جو ہونا تھا وہ

وگیا۔ میں ان سب بدمعاشوں سے ایک ایک کر کے نمٹوں گا۔"

آپ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ بال ٹھاکرے کوئی احمق اور بے وقوف آدمی تھا۔ نہیں ایسی بات نہیں تھی۔ وہ ایک انتہائی ہوشیار زیرک اور معاملہ فہم شخص تھا لیکن میں نے اس کے گرد اس سے زیادہ ہوشیاری' چالاکی اور معاملہ فہمی سے جال بنا تھا یہ میری ذہانت اور زیرکی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ میں نے اس کے دہشت گردوں کو بھارت کے اندر اور پاکستان میں موت کے گھاٹ اتارا' کشمیری مجاہدوں کو جیل سے چھڑا کر فرار کرایا' اسلحہ کے ذخیروں کو تباہ کیا' سورت کے مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کرنے والے مرہٹہ قاتلوں کو سینکڑوں میل دور جا کر قتل کیا اور اب پاکستان کے خلاف استعمال کیے جانے والے پرتھوی میزائیلوں کے اڈے کے پرخچے اڑا دیے مگر بال ٹھاکرے کو ذرا سا بھی شک کرنے کا موقع نہ دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اپنے وطن سے پاکستان کی سلامتی کے لیے نکلا تھا اور میرا مشن پاکستان کے دشمن نمبر ایک بھارت کے پاکستان کے خلاف اس کے مذموم عزائم کو خاک میں ملانا تھا۔ مجھے پاکستان کی طرف سے کوئی وظیفہ نہیں مل رہا تھا۔ پیچھے میرے نام بینک میں کوئی رقم جمع نہیں کرائی گئی تھی۔ ایسا بالکل نہیں تھا۔ میں تو اپنی جان پر کھیل کر وطن عزیز کے دشمنوں سے جنگ کر رہا تھا اور یہ جنگ ان کی سرزمین میں ان کے مورچوں میں آ کر لڑ رہا تھا۔ جہاں ہر قدم پر میرے لیے موت ہی موت تھی۔ یہ درست ہے کہ میری بیوی شیوسینا کے دہشت گردوں کے ہاتھوں ماری گئی تھی اور اتفاق سے میری شکل شیوسینا کے ایک زخمی دہشت گرد سے بے حد ملتی جلتی تھی اور مجھے اسی کے روپ میں یہاں بھیجا گیا تھا لیکن یقین کریں کہ مجھے پاکستان کے بٹ صاحب اور سلطان صاحب نے اس مشن پر جانے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ حیدر علی صاحب یہ مشن پاکستان کی سلامتی کا مشن ہے۔ اس مشن میں آپ کو دشمن کے پیٹ میں گھس کر اس کے پاکستان دشمن عزائم کو ناکام

بنانا اور پاکستان کو ان سے باخبر کرنا ہوگا۔ موت ہر قدم پر آپ کو آنکھ دکھائے گی۔ ہم وہاں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ یہ صرف اپنے وطن کے استحکام اور اسلام کے قلعے پاکستان کو سلامت رکھنے' اسے ترقی کرتے رکھنے" اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا کر کھڑا کرنے اور اسے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا مشن ہے۔ اس کے باوجود ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔ آپ کی مرضی ہے کہ انکار کر دیں۔ لیکن پاکستان میرا وطن تھا۔ میرے آباؤ اجداد نے اس ملک کے لیے ایسی ایسی قربانیاں دی تھیں کہ انہیں یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں چنانچہ میں اس مشن پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ مجھے باقاعدہ کمانڈو اور جاسوسی کی ٹریننگ بھی نہیں دی گئی تھی۔ بس تھوڑی سی واجبی ٹریننگ ہوئی تھی اور ایک روز میں بھارت میں داخل ہوگیا تھا۔ میں دولت یا شہرت حاصل کرنے کے لیے دشمنوں کے درمیان نہیں آیا تھا میں نے صرف اس لیے اپنی زندگی کو موت کے ہاتھوں گروی رکھ دیا تھا کہ پاکستان دہشت گردوں کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رہے۔ ہمارا دشمن ملک جن دہشت گردوں کو تربیت دے کر پاکستان میں تباہی پھیلانے کے لیے بھیجتا ہے ان کو بارڈر کراس کرنے سے پہلے بھارت میں ہی ختم کر دیا جائے۔ یہ میرے دل کی سچائی پاکستان سے میری محبت' اسلام سے میری عقیدت اور پاکستان میں بسنے والے مردوں' عورتوں' بچوں' بہنوں' بھائیوں بزرگوں سے میری والہانہ محبت تھی جس نے میری زبان میں اثر ڈال دیا تھا۔ میرے دماغ میں عقل ڈال دی تھی اور میں اتنا معاملہ فہم ہوگیا تھا کہ بال ٹھاکرے ایسا آدمی مجھ سے دھوکہ کھا گیا۔ یہ میرے دل کی سچائی اور خدا رسول اور پاکستان سے میری محبت تھی کہ دشمن ہر محاذ پر مجھ سے مات کھا رہا تھا۔ اس تمہید کے بعد میں واپس اپنی ایڈونچرس اور وطن پرستی کی کہانی سنانی شروع کرتا ہوں۔

جوگی وال کا پرتھوی میزائیل سینٹر مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ چکرورتی اور

مسٹر گھوش سمیت عملے کا ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچا تھا۔ ان لوگوں کی لاشوں
کے بھی پرزے اڑ گئے تھے۔ صرف بریگیڈئر شیاما پرشاد بچ گیا تھا۔ وہ بھی اس
لیے کہ وہ رات کو ڈیوٹی پر نہیں ہوتا تھا۔ جہاں میزائیل سینٹر والا ٹیلہ تھا میں
خود جا کر وہ جگہ دیکھ تو وہاں بہت بڑا وسیع گڑھا پڑ چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں
آسمان سے کوئی بہت بڑا شہاب ثاقب آ کر گرا ہو۔ اردگرد کے میدانوں کی زمین
آگ سے جل کر سیاہ ہوگئی تھی۔ سارا علاقہ تباہی و بربادی کی عبرت ناک داستان
سنا رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے لبریز تھا اس لیے کہ میں نے دشمن کے ان
میزائیلوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا جنھوں نے پاکستان کے شہروں میں گر کر انہیں تباہ
و برباد کرنا تھا۔ جو میزائیل بھارت نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے نصب کیے
تھے میں نے انہیں ان کے گھر میں ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ یہ میرا فرض
تھا۔ پاکستان کا شہری اور ایک محب وطن مسلمان ہونے کے ناطے میرا فرض تھا
میں نے ادا کیا تھا۔ مجھے بھارت سے کوئی خداً واسطے کا بیر نہیں تھا۔ بھارت میں
بھی ایسے ہندوؤں اور سکھوں کی کمی نہیں جو بڑے خدا ترس ہیں۔ انسانوں سے
محبت کرتے ہیں اور پاکستان کے لوگوں سے امن و شانتی کے ساتھ رہنے کے
خواہشمند ہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ بھارت
اکثریت کٹر اور متعصب ہندوؤں پر مشتمل ہے جو اس وقت سے مسلمانوں کی جانی
دشمن چلی آ رہی ہے جب سے محمد بن قاسم نے سندھ میں داخل ہو کر ہندو راجہ
داہر کی قید سے اغوا کی ہوئی مسلمان عورتوں کو آزاد کرایا تھا اور راجہ داہر
حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کی حکومت ظلم و ناانصافی
حکومت تھی۔ اس کے بعد محمود غزنوی نے بھارت کے بتوں کو پاش پاش کر
یہاں توحید کا پرچم بلند کیا۔ پھر سلطان ٹیپو اور سید احمد شہید اور جنگ آزادی
مسلمان مجاہدوں نے اپنی جان کے نذرانے دے کر بھارت میں اسلام کی شمع
روشن رکھا۔ ہندو اسی دن سے مسلمانوں کا بھارت سے نام و نشان مٹانے

ناپاک ریشہ دوانیوں میں لگا ہوا ہے۔ شدھی سنگھٹن کی تحریک اس سازش کا ایک حصہ تھی کہ بھارت کے سارے مسلمانوں کو ہندو بنا دیا جائے۔ پاکستان کے قیام کے بعد تو انتہا پسند ہندو جماعتوں کے سینوں میں سانپ لوٹ رہے ہیں۔ وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بھارتی جنتا دل راشٹریہ سیوک سنگھ اور شیو سینا ایسی اسلام دشمن جماعتیں ہندو کی پاکستان دشمن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بھارتی جنتا دل پارٹی نے تو الیکشن میں کامیابی اسی لیے حاصل کی تھی کہ اس نے ہندوؤں سے وعدہ کیا تھا کہ برسر اقتدار آکر وہ بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ٹیلی ویژن پر ساری دنیا نے دیکھا کہ ہندو جوگی سادھو اور عام شہری گینتیاں ہتھوڑے اور کدالیں لے کر بابری مسجد پر ٹوٹ پڑے تھے اور مسلمانوں کی تاریخی مسجد کو مکمل طور پر مسمار کر دیا تھا۔ آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ کیا ایسی قوم آپ کی دوست ہو سکتی ہے جو آپ کی مسجدوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا عہد کیے ہوئے ہو؟ جو آپ کے بچوں کو قتل کرنے اور آپ کی ماں بہنوں کی بے حرمتی کرنے پر تلی ہوئی ہو؟ کوئی غیرت مند قوم خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی دشمن قوم کو اتنی اجازت دے کہ وہ اس کی عبادت گاہوں کو مسمار کرے' اس کے بچوں کو قتل کر دے اور اس کی ماں بہنوں کو اٹھا کر لے جائے۔ یہی وہ جذبہ ملی یا جذبہ اسلامی یا جذبہ غیرت تھا جو مجھے اپنی جان موت کے حوالے کر کے بھارت میں لے آیا تھا اور اب جب میں جالندھر کے نواح میں پاکستان کے خلاف استعمال ہونے والے مہلک ترین میزائیلوں کے قبرستان میں ان کے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھ رہا تھا تو میرے اس جذبہ ملی' جذبہ اسلامی اور جذبہ غیرت کو تسکین پہنچ رہی تھی۔

اس کے بعد جالندھر میں میرا مشن فی الحال ختم ہوگیا تھا۔ مجھے جالندھر بال ٹھاکرے نے ہی میزائیل سینٹر کی مکمل رپورٹ فراہم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ میں

تین دن جالندھر میں پولیس ہوسٹل میں رہا۔ یہاں آکر میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں پاکستان میں ریڈیو ٹرانسمیٹر پر میزائیلوں کی تباہی کی اصل حقیقت ملک صاحب اور بٹ صاحب تک پہنچا سکوں۔ کیونکہ یہاں مجھے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بات کرنے کی سہولت حاصل تھی۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کہیں کوئی انٹیلی جنس والا میری نگرانی نہ کر رہا ہو۔ لیکن بعد کے واقعات اور حالات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی میری نگرانی پر نہیں لگایا گیا۔ چنانچہ ایک دن میں بمبئی شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے سے اس کے خفیہ نمبر پر فون کرنے کے بہانے ٹرانسمیٹر روم میں چلا گیا۔ وہاں سکھ کانسٹیبل مانیٹرنگ ڈیوٹی پر بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خود ہی باہر چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں سیکرٹ کال کرنے والا ہوں۔

میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر اون کر کے فریکوئنسی سیٹ کی اور سگنل دیا۔ دوسری طرف سے فوراً سگنل کا جواب آ گیا۔ اس قسم کے ریڈیو ٹرانسمیٹروں پر چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے کوڈ الفاظ میں کہا کہ بٹ صاحب یا ملک صاحب سے بات کرا دو۔ دوسری طرف سے ملک صاحب نے کوڈ الفاظ میں بتایا کہ میں بول رہا ہوں۔ میں نے انہیں تین خفیہ جملوں میں جوگی دال میزائیلوں کی تباہی کے بارے میں اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا اور ان کو اس بات کی خفیہ زبان میں ہی بہت تاکید کی کہ اصلی دھرم چند کی کڑی نگرانی کی جائے۔ اگر اس مرحلے پر وہ قید سے فرار ہو کر بھارت پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے اپنی موت کی پروا نہیں ہے لیکن میرا پاکستان کی سلامت کا مشن ادھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا جا رہا ہوں بھارت سرکار کی پاکستان دشمن سازشیں کھل کر میرے سامنے آتی جا رہی ہیں۔ مجھے ایک ایک کر کے ان تمام سازشوں کو ناکام بنانا ہے۔ ملک صاحب نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اصلی دھرم چند ہماری قید میں ہی ہے۔ وہ اس وقت تک قید میں ہی رہے گا جب تک

تم واپس پاکستان نہیں آ جاتے میں نے راجر کہہ کر ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ کبھی کبھی مجھے فکر لگ جاتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اصلی دھرم چند جس کا روپ بنا کر میں یہاں یہ تمام کارروائیاں کر رہا ہوں اچانک شیوسینا کے دفتر میں پہنچ جائے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ پھر مجھ پر کیا گزرتی لیکن مجھے یقین تھا کہ پاکستان میں ملک صاحب اور بٹ صاحب کو حالات کی سنگینی کا پورا پورا احساس ہے اور وہ اصلی دھرم چند کو تہہ خانے میں اس وقت تک زنجیروں میں جکڑے رکھیں گے جب تک کہ میں اپنے مشن کو مکمل کر کے پاکستان واپس نہیں پہنچ جاتا۔

جالندھر کی پولیس انٹیلی جینس کا سارے کا سارا عملہ تبدیل کر دیا گیا تھا۔ سول انتظامیہ میں صرف ایس پی مہتہ بھی موجود تھا۔ وہ بھی ڈرا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دبی زبان میں مجھ سے کہہ بھی چکا تھا کہ مہاراج جی میرا خیال رکھیے گا۔ مجھے جالندھر آنے کا موقع خود بال ٹھاکرے نے فراہم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ میزائیلوں کے اڈے کی پوری تباہی کی رپورٹ چاہتا تھا اور چونکہ اسے مجھ پر بھروسہ تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ یہ رپورٹ میں ہی اسے فراہم کروں۔ چنانچہ مجھے کشمیری کمانڈو شیر باز کے بارے میں یہ معلوم کرنے کا موقع مل گیا تھا کہ وہ بخیریت واپس خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا ہے یا نہیں۔ اسے گئے ہوئے سات دن ہوگئے تھے۔ مجھے جالندھر سے امرتسر جانا تھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ ایس ایس پی مہتہ سے کہا کہ میں واپس دلی جا رہا ہوں اور میں نے دلی جانے والی فلائیٹ میں اپنی سیٹ بک کرا لی ہے۔ وہ چھوڑنے ایئرپورٹ تک آنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ کیونکہ میں نے دلی کی بجائے امرتسر جانے والی فلائیٹ پر سیٹ بک کرائی تھی۔ چنانچہ میں دوسرے روز جالندھر سے چھوٹے طیارے میں سوار ہو کر امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر میں ہمارا اپنا کشمیری جاسوس بھی تھا لیکن مجھے خوامخواہ اس کے پاس جانے کا خطرہ مول لینے کی

ضرورت نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میزائیلوں کے اڈے کی تباہی کے بعد سارے پنجاب میں سیکورٹی بے حد سخت کر دی گئی تھی۔ خفیہ پولیس کے آدمی خاص طور پہ شہروں میں ہر جگہ پھیل گئے تھے۔ میں ایر پورٹ سے سیدھا امرتسر کے امپیریل ہوٹل میں آگیا جو اس زمانے میں اچھا انگریزی ہوٹل شمار کیا جاتا تھا۔

میں نے ایک کمرہ لے لیے تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر اس خیال سے کہ اگر کوئی خفیہ پولیس والا میری نگرانی کر رہا ہو تو اسے دھوکے میں رکھا جائے میں نے سائیکل رکشا پکڑا اور سب سے پہلے ستیلا مندر چلا گیا۔ وہاں اندر جا کر یونہی ایک طرف بیٹھا مورتیوں کو دیکھتا رہا۔ وہاں سے نکل کر اسی رکشا میں دوسرے مندروں کی یاترا کو نکل کھڑا ہوا۔ چھ سات مندروں کی یاترا کرنے کے بعد میں امرتسر کے گولڈن ٹمپل یعنی سکھوں کے مقدس استھان دربار صاحب آگیا۔ یہاں آ کر میں نے کسی قدر سکون محسوس کیا۔ کیونکہ سکھوں کے گوردواروں اور مقدس استھانوں میں مورتیوں اور بتوں کی پوجا نہیں ہوتی۔ سکھ بھی توحید پرست ہیں اور ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے احترام کے لیے سر پر رومال رکھ لیا تھا۔ کچھ دیر اندر بیٹھا شبد کیرتن اور مقدس گربانی کا پاٹھ سنتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چل کر پورے پوتر سرورد کا چکر لگایا اور باہر آگیا۔

سائیکل رکشا میں نے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ دوپہر کو ہوٹل میں واپس آیا ہوٹل والوں سے میں نے یہی کہا تھا کہ میں دلی سے مندروں اور دربار صاحب کی یاترا کرنے آیا ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ چار بجے سہ پہر کو اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی لے لی۔ اب مجھے کمانڈو شیرباز کی خفیہ پناہ گاہ پر جانا تھا۔ ٹیکسی میں نے اس لیے لی تھی کہ وہ تیز رفتار سواری تھی اور اگر کوئی میری نگرانی کر بھی رہا ہو تو وہ اتنی جلدی میرا پیچھا نہ کر سکے گا اور اگر کر رہا ہو گا تو مجھے نظر آ جائے گا۔ میں ٹیکسی کو لے کر

سیدھا پرانے تالاب والے میدان کی طرف نہ گیا بلکہ امرتسر کی بڑی نہر کی طرف نکل گیا۔ اس دوران میں نے اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے تسلی کر لی تھی کہ میرے پیچھے کوئی آدمی نہیں ہے۔ بڑی نہر پر دس پندرہ منٹ ایسے بیٹھا رہا جیسے تفریح کر رہا ہوں۔ وہاں سے ٹیکسی والے کو مقبول پورے چلنے کو کہا جو پرانے تالاب والے میدان اور بڑی نہر کے درمیان میں ایک پرانی آبادی تھی۔ قیام پاکستان سے پہلے اس کا نام مقبول پورہ تھا اب یہ نام سکھوں نے بدل دیا تھا۔ جس طرح سکھوں نے امرتسر کی مسلمانوں کی مشہور آبادی شریف پورے کا نام بدل کر سنگھ پورہ رکھ دیا تھا۔

مقبول پورے کے باہر ہی میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔

میں آبادی کے چھوٹے بازار میں سے ہوتا دوسری طرف نکل آیا۔ آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس کے آگے ریلوے لائن تھی میں ریلوے لائن پر آ کر امرتسر سٹیشن کی طرف رخ کر کے چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے ڈیڑھ میل کے بعد بائیں جانب وہ میدان آ جاتا ہے جہاں پرانے تالاب کے پاس ایک ویران بھٹے کے نیچے کمانڈو شیر باز کی خفیہ پناہ گاہ ہے۔ کمانڈو شیر باز نے مجھے ایک نشانی بتا دی ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ پناہ گاہ میں آنے کے بعد اگر تمہیں کونے میں مٹی کا گھڑا الٹا پڑا نظر آئے تو سمجھ لینا کہ میں جبل پور سے امرتسر پہنچ گیا ہوں۔ پھر تم رات کے وقت آنا میں تمہیں رات کے وقت ہی مل سکوں گا۔ چنانچہ میں پرانے تالاب پر آ کر بیٹھ گیا اور کنکھیوں سے اردگرد کے ماحول کو گہری نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ آس پاس دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں پیچھے کی طرف سے ہو کر ویران بھٹے میں داخل ہوا اور اینٹوں کے ڈھیروں کے عقب میں جو تنگ سی سرنگ بنی ہوئی تھی اس میں سے گزر کر نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔ یہاں اوپر سرنگ کے دہانے سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی

رہی تھی۔ میری نظریں سیدھی کونے میں گئیں۔ وہاں مٹی کا ایک گھڑا ضرور تھا مگر وہ الٹا نہیں پڑا ہوا تھا بلکہ سیدھا رکھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کمانڈو شیر باز ابھی تک جبل پور سے واپس نہیں آیا۔ میں جلدی سے پناہ گاہ سے باہر نکل آیا اور پرانے تالاب کے کنارے چھترے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کمانڈو شیر باز سے ملنا بھی بہت ضروری تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کل کا دن دیکھ لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے شیر باز کل آ جائے۔ میں وہاں سے سیدھا ہوٹل آ گیا۔ رات کو ایک سینما ہاؤس میں انگریزی فلم دیکھنے چلا گیا۔ بھارتی فلمیں میں کبھی نہیں دیکھتا تھا۔ دوسرا شو دیکھنے گیا تھا۔ رات کے تقریباً" بارہ بجے واپس آیا اور سو گیا۔ دوسرے روز اٹھا اور اپنی احتیاط کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ایک بار پھر مندروں کی یاترا کرنے نکل گیا۔ مگر صرف سیتلا مندر ہی گیا۔ وہاں سے دربار صاحب آ گیا۔ یہاں کافی دیر تک گربانی سنتا رہا۔ وہاں سے نکل کر ہوٹل آ گیا۔ دوپہر کے بعد میں ٹیکسی لے کر کمپنی باغ کی طرف آ گیا۔ ظاہر یہ کرنا مقصود تھا کہ میں کمپنی باغ دیکھنے آیا ہوں۔ یہاں میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور کمپنی باغ کا ایک چکر لگانے کے بعد بھائیوں والی نہر کے ریلوے پھاٹک سے لائنوں لائن جالندھر کی طرف چلنے لگا۔

پرانے تالاب والا میدان راستے میں ہی پڑتا تھا۔

امرتسر جالندھر ریلوے لائن پر تقریباً" دو میل تک چلنے کے بعد میری دائیں جانب وہ میدان آگیا جہاں پرانا تالاب تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ پیدل چلنے سے مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں بڑے حساب سے ادھر ادھر منڈلانے کے بعد بھٹے میں داخل ہوگیا۔ نیچے پناہ گاہ میں آکر دیکھا تو طبیعت بشاش ہوگئی۔ کونے میں مٹی کا گھڑا الٹا رکھا ہوا تھا۔

کمانڈو شیر باز جبل پور سے واپس آگیا تھا۔ مگر وہ پناہ گاہ میں نہیں تھا۔ یاد آگیا اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو ملنے کے لیے آئے گا۔ دن کے وقت کسی اور جگہ چھپا ہوا ہوگا۔ اب مجھے بھی رات کے وقت یہاں آنا تھا۔ میں اسی طرح ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا واپس کمپنی باغ والے پھاٹک پر آیا۔ وہاں سے ٹیکسی پکڑی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ باقی کا دن اور رات کا شروع کا حصہ میں نے ہوٹل میں اپنے کمرے میں گزارا۔ جب رات گہری ہوگئی تو میں ہوٹل سے چل پڑا۔ رات کے وقت مجھے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جالندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ پر ہوگیا۔ سردیوں کی رات تھی۔ سڑک پر کوئی آدمی نہیں تھا کسی کسی وقت کوئی ٹرک گزر جاتا تھا۔ ایک خاص مقام پر پہنچ کر میں کھیتوں میں ہوگیا۔ ان کھیتوں سے آگے پرانے تالاب والا میدان تھا۔ سردی خوب پڑنے لگی تھی۔ رات سرد تھی۔ میں نے کرتے پاجامے کے اوپر گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ دور سے مجھے پرانے تالاب والے بھٹے کی ایک طرف کو جھکی ہوئی چمنی نظر آئی۔

میدان میں ایک طرف سے دو کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں چلتا گیا۔ بھٹے کے پاس جا کر رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں اینٹوں کے ڈھیر کی اوٹ میں ہوگیا اور جو رستہ نیچے زمین کے اندر جاتا تھا اس کو جھک کر دیکھا۔ مجھے سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

"حیدر علی۔"

میں مڑ گیا۔ تین چار قدموں کے فاصلے پر اندھیرے میں ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ میں نے جان بوجھ کر کمانڈو شیر باز کا نام نہ لیا۔ کیونکہ یہ کوئی دوسرا آدمی بھی ہو سکتا تھا جسے میرا اصل نام کسی طرح معلوم ہوگیا ہو۔ احتیاط کا تقاضہ یہی تھا سایہ میرے قریب آگیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ کمانڈو شیر باز ہی تھا۔ کہنے لگا۔

"میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ نیچے آ جاؤ۔"

تہہ خانے میں آکر کمانڈو شیر باز نے موم بتی روشن کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کل تہہ خانے میں آکر دیکھ گیا تھا۔ گھڑا الٹا پڑا ہوا تھا میں سمجھ گیا تم آ گئے ہو۔

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"میں جبل پور سے جلدی آ جاتا وہاں پہنچنے کے دوسرے ہی دن میں نے کوئلے کی ویران کان کا سراغ لگا لیا تھا لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہاں سے گائیڈڈ مشنگر میزائیلوں اور ترشول نام کی بڑی توپوں کے گولوں کی بھاری تعداد سپیشل ملٹری ٹرین میں لوڈ کر کے جموں اور اکھنور کے درمیان ایک خفیہ مقام پر پہنچا دی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خفیہ مقام اکھنور کی ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ میں نے سوچا کہ انڈین آرمی آزاد کشمیر پر کوئی بہت بڑا حملہ کرنے والی ہے۔ فوراً" میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس خفیہ فوجی قلعے کا سراغ لگایا جائے۔ چنانچہ

میں وہاں سے سیدھا جموں پہنچا۔ وہاں اپنے خاص جاسوس مجاہد سے ملا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ فوجی قلعہ اکھنور کی سب سے بلند پہاڑی پر بنایا گیا ہے جہاں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ فوجی قلعہ انڈین آرمی نے آزاد کشمیر پر حملہ کرنے کے واسطے بنایا ہے یا جنگ کی صورت میں مقبوضہ کشمیر کے دفاع کے کے لیے تیار کیا ہے۔ میں نے مجاہد جاسوس کو بتایا کہ قلعے میں گائیڈڈ سنگر میزائیلوں کی بھی بھاری تعداد پہنچائی گئی ہے جو لڑاکا اور بمبار طیاروں کے انجنوں کی گرمی کا تعاقب کر کے ان سے ٹکراتے ہیں اور انہیں فضا میں تباہ کر دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انڈین آرمی پاکستان کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کا منصوبہ تیار کر رہی ہے۔ مجاہد جاسوس نے کہا کہ وہ اس کی پوری تحقیقات کر کے ہی کچھ بتا سکے گا۔ وہ ایک دن کے لیے ہمارے جموں ہائیڈ آؤٹ سے غائب ہوگیا۔ دوسرے دن آکر اس نے بتایا کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود اکھنور والے بھارتی فوجی قلعے کے بارے میں کوئی نئی معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ اس کے بعد میں نے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ میں بھی پہاڑی قلعے کے قریب نہ جا سکا۔ ایک جنگلی راستہ پہاڑی کی دوسری طرف دریا کی جانب سے ہو کر پہاڑی کے اوپر ضرور جاتا تھا مگر مجھے اپنے مخبروں نے بتایا کہ وہاں بھی مشین گنوں کے پیرا میٹریعنی پکے مورچے ہیں جہاں رات کے وقت ذرا سے کھٹکے پر اوپر تلے روشنی کے راؤنڈ فائر ہونے لگتے ہیں جس سے سارا علاقہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نے فیصلہ کیا کہ واپس امرتسر جاتا ہوں اور تم سے مشورہ کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے بھارت سرکار کے ارادے خطرناک لگتے ہیں جو گولے ملٹری ٹرین میں اکھنور کے فوجی قلعے میں لے جائے گئے ہیں وہ سب سے بڑی فیلڈ گنوں کے، ہیں۔ یہ گنیں بھارت نے حال ہی میں سویڈن سے خریدی ہیں۔ ان کے گولے کا وزن چار من سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور اس کی مار بہت دور تک ہوتی ہے۔ اس توپ کا نام بھارت سرکار نے ترشول رکھا ہے۔ صرف آزاد کشمیر

پر حملہ کرنے کے لیے بھارت کو اتنی بڑی اور اتنی دور تک مار کرنے والی توپیں وہاں لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ بھارت بہت جلد پاکستان پر ایک اور حملہ کرنے والا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے۔"

میں کمانڈو شیر باز کی ساری گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب اس نے بات ختم کی تو میں نے کہا۔

"تم نے بڑی تشویش ناک خبر سنائی ہے۔ اگر تمہاری اطلاعات صحیح ہیں جو یقیناً" صحیح ہوں گی تو اس کا مطلب ہے کہ بھارت پاکستان پر حملے کا منصوبہ تیار کر چکا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس منصوبے کا پورا پتہ چلایا جائے اور ان دور مار توپوں والے قلعے کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا جائے۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"یقیناً" یہ پاکستان پر حملے کی تیاریاں ہیں کیونکہ ترشول توپوں کے گولے جہلم سے لے کر سیالکوٹ' گجرات وزیر آباد اور گوجرانوالہ تک کو آسانی سے اپنا نشانہ بنا کر وہاں تباہی مچا سکتے ہیں۔"

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"کمانڈر! اس کے لیے مجھے دلی جانا پڑے گا۔ اگر واقعی انڈین ملٹری ہائی کمانڈ نے پاکستان پر حملے کا کوئی منصوبہ بنایا ہے تو اس منصوبے کی تصدیق دلی سیکرٹریٹ میں ڈیفنس انٹیلی جینس آفس سے ہی ہو سکتی ہے۔"

"وہاں تم کیسے پتہ چلاؤ گے۔"

میں نے کہا "یہ بات تم مجھ پر چھوڑو لیکن تمہیں میرے ساتھ دلی چلنا ہو گا۔"

"میں تیار ہوں پاکستان کی سلامتی کی خاطر میری جان بھی حاضر ہے۔"

میں نے غور کرنے کے بعد کمانڈو شیر باز سے پوچھا۔

"تم دلی تو پہلے ضرور گئے ہو گے۔"

"کیوں نہیں دو تین بار جا چکا ہوں۔"

"وہاں اپنا کوئی خاص آدمی موجود ہے کیا؟"

کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"احد غنی نام کا ایک حریت پرست مجاہد وہاں دو سال سے رہ رہا ہے۔ ہم اس کے پاس جتنے دن چاہیں جا کر چھپ سکتے ہیں۔"

میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"مجھے اپنے مجاہد جاسوس کا ایڈرس بتا دو۔ تمہاری میری ملاقات اب دلی میں مجاہد جاسوس کے ہاں ہوگی۔"

"تم کب دلی پہنچو گے؟"

میں نے کہا "میں صبح صبح یہاں سے کوئی فلائیٹ پکڑ کر دلی نکل جاؤں گا کیونکہ میرا کام ایسا ہے کہ مجھے وہاں وقت لگے گا۔ تم بے شک ٹرین کے ذریعے دلی آ جانا۔"

میں نے اسے بال ٹھاکرے کے دیئے ہوئے روپوں سے پانچ سو روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو تمہیں ضرورت ہوگی۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"نہیں نہیں دوست! میرے پاس پیسے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ بال ٹھاکرے کا مال ہے اس کو بے دریغ خرچ کرو۔"

ہم تھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھے اکھنور کے فوجی قلعے کی مورچہ بندی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد میں اس سے رخصت ہو کر اندھیری سرد رات میں واپس چل پڑا۔ دوسرے دن نو بجے والی امرتسر دلی فلائیٹ میں مجھے ایک سیٹ مل گئی۔ میں دلی پہنچ گیا۔ میرا ذہن سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ اکھنور کے قریب پہاڑ قلعے کی مورچہ بندی یقیناً پاکستان کے خلاف تھی۔ میں

اس کی وجہ سے پریشان تھا اور اس کی اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے
پریشانی نہیں تھی کہ اکھنور کے قلعے کی تفصیلات کیسے حاصل کر سکوں گا یہ میر
لیے اتنی زیادہ دقت طلب بات نہیں تھی۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ اگر وا
بھارت پاکستان پر ایک بار پھر حملہ کرنے کے عزائم رکھتا ہے تو نہ جانے اس
اس قسم کی قلعہ بندیاں کہاں کہاں قائم کی ہوں گی۔ مجھے اپنی پاک آرمی
جرات و دلیری اور پیشہ ورانہ فوجی مہارت اور پاک آرمی کے افسروں سے
کر جوانوں تک کے جذبہ حریت اور ان کی فوجی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ
لیکن بھارت کے پاس پھونکنے کو بے شمار اسلحہ تھا۔ اس نے چین کا ہوا دکھ
امریکہ اور روس سے بے پناہ اسلحہ لے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے ملک
سے دنیا کی سب سے بڑی توپیں ترشول بھی خرید رکھی تھیں۔ پاکستان کے پاس
دفاعی بجٹ نہیں تھا۔ بھارت اتنے زیادہ اور ملک ملک سے اکٹھے کیے ہوئے ا
کے زور پر پاکستان کو کافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے میں پریشان تھا
طے کر چکا تھا کہ میرے سامنے جہاں جہاں بھارت کی پاکستان کے خلاف
بندیاں آئیں گی میں انہیں سلامت نہیں رہنے دوں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھ
مجھے اتنی جلدی شہید بھی نہیں ہونا۔ جب تک میں پاکستان کے خلاف استعمال
جانے والی ساری قلعہ بندیوں کا سراغ لگا کر انہیں تباہ نہیں کر لیتا میں
مروں گا۔ میں دشمن کی کمر توڑ کر مرنا چاہتا تھا۔ اگر واقعی مجھے مرنا ہی تھا دلی
آ کر میں نے ایرپورٹ سے ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر کوہلی کو اس
خفیہ نمبر پر فون کیا اور اسے بتایا کہ میں دلی میں ہوں اور اس کے پاس
ہوں۔ اس نے فون پر کہا۔

"پدھاریئے دھرم چند جی مہاراج میں اپنے کمرے میں ہی ہوں۔
پلیز۔"

میں نے ٹیکسی لی اور سیدھا دلی سیکرٹریٹ کے بڑے داخلہ گیٹ پر پہنچ

رے پاس خفیہ شناختی کارڈ موجود رہتا تھا۔ یہاں اپنا سیکرٹ 211 _ T / L والا
ر دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ خفیہ شناختی کارڈ مجھے بال ٹھاکرے کی ذاتی
ارش پر بھارت کے محکمہ دفاع نے ہی ایشو کیا ہوا تھا۔ سیکرٹریٹ میں ہی ڈیفنس
ٹیلی جینس کا بلاک ہے۔ مسٹر کوہلی میری راہ دیکھ رہے تھے۔ بال ٹھاکرے نے
رائیل سینٹر کی تباہی کے بعد ان لوگوں پر عتاب نازل کر رکھا تھا اور کوہلی کو
لوم تھا کہ میں بال ٹھاکرے کا خاص آدمی ہوں۔ یہ بات ڈیفنس انٹیلی جینس کے
رٹری اور دوسرے عہدہ داروں سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی۔ مسٹر سریندر
ہلی اٹھ کر مجھ سے ملا۔ پرتھوی میزائیل سینٹر کی تباہی پر سخت افسوس کا اظہار
نے لگا۔ "سر! یہ ساری سازش پاکستانی ایجنٹوں کی تھی یہ سو فیصد سبوتاژ تھا۔"

میں اس موضوع پر ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا
۔ ہمیں زیادہ بات کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ اسی لیے کمانڈو جاسوس
ت کم گو ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی زیادہ سنتا ہے اور اپنی بہت کم کہتا ہے۔
ہ ازیں اس وقت میں مسٹر سریندر کوہلی سے اکھنور کے پہاڑی قلعے بندیوں کا
معلوم کرنے آیا تھا۔ مجھے گر آگیا ہوا تھا کہ اپنے مطلب کی بات کس طرح
م کی جاتی ہے اور پھر یہ لوگ تو مجھے بھارت کا بڑا ذمے دار اور محب دلیش
ت سمجھتے تھے جس کا تعلق بھارت کی انتہا پسند ہندو جماعت شیو سینا سے تھا۔

نے پاکستان کی فوجی تیاریوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیں اور کہا۔
"مسٹر کوہلی! تم یہاں کمرے میں بیٹھے ہو ہم باہر اندر پھرتے رہتے ہیں۔
ہر طرح کی خبر رکھنی پڑتی ہے۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ پاکستان کو باہر سے بڑا
مل رہا ہے جسے وہ بھارت کے خلاف استعمال کرے گا۔ اگر پاکستان نے
ت پر حملہ کر دیا تو اس کے نتیجے میں بھارت کا بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔"

مسٹر کوہلی نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ "شریمان دھرم چند جی! ہم
یں بند کر کے نہیں بیٹھے ہوئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی فوجی

تیاریوں پر پوری نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے بھارت پ
پاکستان کے حملے کی صورت میں اپنے دفاع اور جوابی حملے کے سلسلے میں پور
بندوبست کر رکھا ہے۔"
میں نے سریندر کوہلی کو کریدتے ہوئے کہا۔
"آپ کی انٹیلی جینس کی اس بارے میں کیا رپورٹ ہے کیا پاکستان کشمیر
حملہ کرنے والا ہے؟"
ڈیفنس انٹیلی جینس چیف مسکرانے لگا۔
"سر! اول تو پاکستان ایسی بیوقوفی کبھی نہیں کرے گا اگر اس نے ایسی بیوقو
کر بھی دی تو ہم اسے ایسا جواب دیں گے جسے وہ ساری عمر یاد رکھے گا۔"
میں نے اس شخص سے راز کی بات نکلوانے کی خاطر کہا۔ "کیا آپ لاہو
اسلام آباد پر ایٹم بم چلا دیں گے؟"
سریندر کوہلی نے نفی میں سر ہلایا۔
"یہ حماقت تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرے گا۔ ہم کسی اور طریقے
جواب دیں گے۔ روایتی ہتھیاروں سے لڑیں گے۔"
مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ بھارت نے اکھنور
زبردست قلعہ بندی کر کے ترشول توپیں اور سنگر میزائیل لگائے ہوئے ہیں
میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا یہ واقعی پاکستان پر بھارت کی جانب سے کسی فو
حملے کی تیاریاں ہیں۔ میں نے کہا۔
"اس سے بہتر ہے کہ ہم ایک ہی بار پاکستان پر بھرپور طریقے سے چار
طرف سے چڑھائی کر دیں آخر ہماری نفری زیادہ ہے۔ ہمارے پاس بے شمار ا
ہے' پاکستان چھوٹا ملک ہے۔ کب تک ہمارا مقابلہ کر سکے گا۔"
سریندر کوہلی بھی ایک تجربہ کار اور منجھا ہوا انٹیلی جینس افسر تھا اگر اس
معلوم بھی تھا کہ بھارت پاکستان پر حملے کا پروگرام بنا چکا ہے تب بھی اس نے

نہ پکڑایا اور میرے سوال پر بڑی ڈپلومیسی سے بولا۔

"سر! ہم نے نہ پہلے کبھی پاکستان پر حملہ کیا ہے نہ اب کریں گے۔ ہم تو صرف اپنے ڈیفنس کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں۔ باقی کشمیر میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ تو چلتی ہی رہے گی۔"

میں نے دو تین بار حملہ کر کے بڑی چالاکی سے پاکستان پر حملے کی تیاریوں کی بابت معلوم کرنا چاہا مگر سریندر کوہلی ہر بار مجھے طرح دے گیا۔ اس نے کسی قسم کا کوئی اقرار نہ کیا۔ میں نے موضوع تبدیل کر دیا اور بال ٹھاکرے کے بارے میں باتیں کرنے لگا کہ میزائیل سینٹر کی تباہی کی خبر سن کر ٹھاکرے جی کس قدر پریشان ہوئے اور انہیں کس قدر غصہ آیا تھا۔

"کوہلی صاحب! میں نے پہلے ہی روز سراغ لگا کر ٹھاکرے جی کو بتا دیا تھا کہ مسٹر چکرورتی پاکستانی ایجنٹوں سے ملا ہوا ہے۔ آخر میری بات سچ نکلی۔"

سریندر کوہلی دبی زبان میں بولا۔

"سر کیا کریں۔ ہماری بھی بعض مجبوریاں ہوتی ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے....."

جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں اس سے زیادہ مسٹر سریندر کوہلی سے معلومات حاصل نہیں کر سکتا تو میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ مجھے بال ٹھاکرے جی کو ایک ضروری فون کرنا ہے میں چلتا ہوں۔ ڈیفنس انٹیلی جینس چیف بولا۔

"سر! آپ یہاں سے فون کر لیں دوسرے کمرے میں آپ کے مطلب کا فون رکھا ہوا ہے۔"

مجھے بال ٹھاکرے سے کچھ اہم باتیں ضرور کرنی تھیں مگر یہ باتیں فون پر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے سامنے اکھنور والی قلعہ بندی کا اہم ترین مشن تھا جس کے لیے مجھے وقت درکار تھا اور مجھے کافی دنوں کے لیے بال ٹھاکرے سے دور رہنا تھا۔ اس کی پیش بندی کے لیے میرا خود بمبئی جا کر بال ٹھاکرے سے ملنا

ضروری تھا۔ بھارت میں میری کمانڈو اور پاکستان کی سلامتی کی جاسوسی سرگرمیوں کو اگر کوئی خطرہ لاحق تھا تو وہ صرف شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے سے تھا اور میں اسے ہر حال میں مطمئن رکھنا چاہتا تھا۔ ابھی تک اس انتہائی زیرک اور چالاک شخص کو مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ اس میں میری موقع شناسی' معاملہ فہمی اور ایک ایک قدم پر بال ٹھاکرے کو اپنے اعتماد میں لیے رکھنے کی پالیسی کو بڑا دخل تھا۔ میں نے کسی مرحلے پر بھی بال ٹھاکرے کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ مجھے بھارت میں صرف اس ایک شخص کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ دوسرے کسی سرکاری نیم سرکاری فوجی یا انٹیلی جینس کے اعلیٰ اور ادنیٰ آفیسر کی اتنی فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ شخص جس کا نام بال ٹھاکرے ہے اور جو بھارت کی انتہا پسند ہندو جماعت شیوسینا کا لیڈر ہے کسی سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتے ہوئے بھی ایک زبردست طاقت کا مالک ہے۔ اگر بال ٹھاکرے مجھ سے مطمئن ہے' اسے مجھ پر شک نہیں ہے تو مجھے کسی کی فکر نہیں۔ لیکن اگر اسے مجھ پر شک پڑ جاتا ہے تو پھر میرے لیے اپنا کوئی مشن مکمل کرنا تو دور کی بات ہے میرے لیے بھارت سے فرار ہو کر بارڈر کراس کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے میں نے اکھنور کی ... بند ... کا بھید معلوم کرنے والے کمانڈو آپریشن پر روانہ ہونے سے پہلے یہی فیصلہ کیا کہ میرا خود بمبئی جا کر بال ٹھاکرے سے ملنا ضروری ہے۔

میں نے مسٹر سریندر کوہلی سے کہا۔

"تھینک یو مسٹر کوہلی مگر میں ٹھاکرے جی کو شام کے وقت فون کرنا زیادہ پسند کروں گا۔ اس وقت وہ یقین طور پر گھر پر ہی ہوں گے۔"

مسٹر کوہلی سے رخصت ہو کر میں دلی سیکرٹریٹ کے خوشنما لانوں کے درمیان سے گزرتا بڑے گیٹ سے باہر آ گیا۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔

اب مجھے اپنے کشمیری جاسوس احد غنی کے ہاں جا کر کمانڈو شیر باز سے ملنا

اور اسے مسٹر کوہلی سے کی گئی گفتگو سے آگاہ کرنا تھا۔ کمانڈو شیر باز نے مجھے امرتسر سے دلی روانہ ہوتے ہوئے کشمیری جاسوس احد غنی کا پتہ دیدیا تھا جو میں نے اس وقت بھی آپ کو نہیں بتایا اور اب بھی نہیں بتاؤں گا آپ یوں سمجھ لیں کہ میں احد غنی کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں کمانڈو شیر باز ابھی نہیں پہنچا تھا کیونکہ میں بذریعہ ہوائی جہاز دلی آیا تھا جبکہ کمانڈو شیر باز ٹرین کے ذریعے آ رہا تھا۔ اسے رات کو پہنچنا تھا۔ میں شیر باز کو بڑی آسانی سے اپنے ساتھ جہاز میں لا سکتا تھا لیکن ایسا کرنا ہم دونوں کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ میزائیل سینٹر کی تباہی کے بعد پنجاب میں سی آئی ڈی ریلوے سٹیشنوں' لاریوں کے اڈوں اور ہوائی اڈوں پر چوبیس گھنٹے موجود رہتی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ میں نہیں تو کمانڈو شیر باز سی آئی ڈی کی نگاہوں میں آ جاتا۔ چنانچہ میں نے خود کمانڈو شیر باز کو ریل کے ذریعے دلی پہنچنے کو کہا تھا۔ احد غنی اپنی شناخت کے لیے شیر باز نے مجھے خفیہ کوڈ ورڈ بتا دیا ہوا تھا۔ جب میں نے احد غنی کے سامنے جا کر خفیہ کوڈ اسے بتایا تو اس نے دکانداروں والے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب ابھی آپ کے کپڑے تیار نہیں ہوئے اگر آپ کو جلدی نہیں ہے تو شام کو آ کر لے جایئے گا۔"

معلوم ہوا کہ کمانڈو شیر باز نے امرتسر سے روانہ ہوتے وقت احد غنی کو کسی ذریعے سے اطلاع کر دی تھی کہ وہ شام کو دلی پہنچے گا۔ اس نے میرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ وہ احتیاط تھی جو ہر جاسوس اور کمانڈو دشمن ملک کے اندر ٹیلی فون یا وائرلیس پر کوئی پیغام عام یا کوڈ الفاظ میں نشر کرتے وقت ضرور اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ ملک کے اندر دیئے جانے والے سگنل میڈیم ویو لینتھ کے ہوتے ہیں اور آسانی سے کسی بھی مانیٹرنگ سیٹ پر پکڑے جا سکتے ہیں جبکہ ملک کے باہر نشر کیے جانے والے سگنل عام طور پر شارٹ ویو لینتھ کے ہوتے ہیں اور ان کی بلندی بھی کافی ہوتی ہے۔

بہرحال میں نے احد غنی کی جگہ دیکھ لی تھی اور اس سے اپنا تعارف بھی کرا دیا تھا۔ اب میرا کوئی کام نہیں تھا میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب۔ میں شام کو آ جاؤں گا۔ آداب عرض۔"

"آداب عرض۔"

احد غنی نے جوابی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ دلی کی کاروباری فضا کا اخلاق تھا جس پر دلی کے لوگ خاص طور پر وہاں کے مسلمان ابھی تک سختی سے کاربند تھے۔ میں ایک سینما ہاؤس میں گھس گیا۔ وقت گزارنے کا اس سے زیادہ محفوظ ذریعہ اور کوئی نہیں تھا۔ دلی کے کچھ سینما ہاؤس صبح دس بجے سے لے کر رات بارہ بجے تک چلتے رہتے ہیں۔ ایک فلم دیکھ کر نکلا تو کھانا کھایا اور دوسرے سینما ہاؤس گھس گیا۔ نو بجے دوسرا شو ختم کر کے نکلا پھر کھانا کھایا اور احد غنی کی دکان یا شو روم جو کچھ بھی وہ تھا اس کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں مجھے کمانڈ شیر باز مل گیا۔ وہ احد غنی کے پاس نہیں بیٹھا تھا بلکہ ایک خفیہ جگہ پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کشمیری کمانڈو تھا اور جموں کشمیر اور پنجاب کی پولیس اس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔

میں نے اسے وہ ساری باتیں بیان کر دیں جو میرے اور انڈین ڈیفنس انٹیلی جنس کے چیف کے درمیان ہوئی تھیں۔ کمانڈو شیر باز نے ساری بات سنی اور کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ رپورٹ تو مل گئی ہے کہ بھارت کی طرف سے پاکستان کی سرحدوں پر سنگر میزائیل اور بھاری دور مار توپیں خفیہ مقامات پر نصب کی جا رہی ہیں۔ باقی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بھارت پاکستان پر حملے کی تیاریاں بھی کر رہا ہے۔"

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"بھائی حیدر علی! اکھنور کی پہاڑی والی قلعہ بندی کا تو تمہیں پتہ لگ گیا ہے۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہاں ترشول نام کی بھاری دور مار توپیں نصب ہیں اور آزاد کشمیر کے علاوہ پاکستان کے شہر جہلم گجرات وزیر آباد اس کی زد میں ہیں سب سے پہلے ہم ان کو تو تباہ کریں اس کے بعد دوسری کی قلعے بندی کا بھی سراغ لگا لیں گے۔"

کمانڈو شیر باز کا مشورہ بالکل صحیح اور بر وقت تھا۔ اگرچہ بھارت میں میرا مشن بنیادی طور پر پاکستان میں سمگل کیے جانے والے بھارتی دہشت گردوں کا خاتمہ کرنا تھا اور وہ میں کر بھی رہا تھا اس کے باوجود اگر مجھے کوئی اس قسم کی تنصیبات نظر آ جاتی ہیں یا ان کا سراغ مل جاتا ہے جو پاکستان یا آزاد کشمیر کے شہروں کو تباہ کرنے کے لیے بھارت نے نصب کر رکھی ہوں تو میں اسے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اکھنور کی قلعہ بندی اس کی واضح مثال تھی۔ یہ قلعہ بندی پاکستان کے خلاف تھی۔ اس کے اندر مشکر میزائیل گائیڈڈ میزائیل پاکستانی شاہینوں کے طیاروں کو فضا میں تباہ کرنے کے لیے اور بھاری توپیں پاکستان کے شہروں پر گولہ باری کرنے کے لیے لگائی گئی تھیں اور ان کا تباہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"شیر باز! میں اس مشن کے لیے تیار ہوں۔ لیکن دو ایک دن کے لیے میرا بمبئی جانا بہت ضروری ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ بمبئی سے واپس آ کر ہمیں اکھنور مشن کہاں سے شروع کرنا ہو گا۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"سب سے پہلے تو ہمیں اکھنور کی فوجی قلعہ بندی کی فل رپورٹ حاصل کرنی ہو گی کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک ہی قلعہ بندی ہے یا دوسری قلعہ بندیاں بھی ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ان کے اندر کہاں کہاں کتنی ترشول توپیں لگی

ہیں۔ دوسرے یہ کہ سٹنگر میزائیل کہاں لگائے گئے ہیں۔ اس فوجی تنصیبات کی سیکورٹی کے کیا انتظامات ہیں۔ اگر پکے مورچوں کے پیرا میٹر ہیں تو ان کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ ان کے اندر جو مشین گنیں ہیں ان کے سوراخوں کی چوڑائی کتنی ہے۔ ان کے علاوہ وہاں پہاڑی ڈھلان پر بھارتی فوج نے دوسرے کتنی گن پوسٹیں بنا رکھی ہیں۔ وہاں فوج کی نفری کتنی ہے اور رات کو کسی پوسٹ کے سنتری کس طرف گشت لگاتے ہیں۔ وہاں راشن کی سپلائی کی کیا صورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہمیں ان ساری تفصیلات کا علم ہوگیا تو ہمارا مشن سمجھو آدھا مکمل ہو جائے گا۔ ان معلوم کے بغیر ہمارا اکھنور کی فوجی قلعہ بندی کا رخ کرنا اپنے آپ کو خوا مخواہ بغیر کسی مقصد کے موت کے منہ میں ڈالنے کے مترادف ہو گا۔"

میں نے کمانڈو شیرباز سے پوچھا۔

"شیر باز! کیا تمہارے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ تم اپنے طور پر یہ معلومات حاصل کر سکو؟"

وہ کہنے لگا۔

"ذرائع تو نہیں ہیں لیکن میں کوشش ضرور کروں گا کیونکہ یہ ہمارے پیارے اسلامی ملک پاکستان کی سلامتی کا معاملہ ہے۔"

کشمیری مجاہدوں کے اس جذبہ ایمانی نے مجھے ہمیشہ بڑا متاثر کیا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کوشش میں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ بھی کروں گا اور جو نہیں ہو سکتا اسے بھی کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔"

کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"تم بمبئ کب جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں اس بار ریل گاڑی سے نہیں بلکہ ہوائی جہاز سے بمبئ جاؤں گا۔ میرے پاس کافی رقم ہے دوسرے ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں

ہے۔"

وہ بولا۔ "تم کل بمبئی گئے تو واپس کب تک آ جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ دو دن وہاں رہوں گا اس سے زیادہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے شیر باز بولا۔ "میں اتنے دن یہاں دلی میں ہی چھپا رہوں گا۔ تم جب دلی سے واپس آؤ تو میرے اسی ہائیڈ آؤٹ میں آ جانا میں دن کے وقت اسی جگہ تمہیں ملوں گا۔"

وہ رات میں نے دلی کے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں بسر کی۔ دوسرے دن انڈیا کی ایک ہوائی سروس کے آفس میں پہنچ کر معلوم کیا کہ بمبئی کو کون کون سی فلائیٹ کس وقت جاتی ہے۔ ایک فلائیٹ گیارہ بجے دن کی تھی۔ اس میں مجھے ایک خالی سیٹ مل گئی میں نے ٹکٹ لے کر کنفرم کروا لی اور ہوٹل میں آ گیا۔

ساڑھے دس بجے دلی ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔

فلائیٹ رائیٹ ٹائم پر تھی بمبئی کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جہاز بارش میں بھیگتا ہوا بمبئی کے ایئرپورٹ پر اترا۔ مجھے بمبئی کی بارش بڑی اچھی لگی۔ ایئرپورٹ سے ٹیکسی لے کر شیوسینا کے دفتر آیا تو معلوم ہوا کہ بالا جی راؤ بنگلور گیا ہوا ہے۔ بال ٹھاکرے بمبئی میں ہی تھا۔ میں نے اس وقت ٹھاکرے جی کو فون کیا اور بتایا کہ میں جالندھر سے واپس آ گیا ہوں اور جو تفصیلات میں نے معلوم کی ہیں ان کی رپورٹ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بال ٹھاکرے کی تھکی تھکی آواز آئی۔ "رات آٹھ بجے آنا دھرم چند۔"

اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں ٹھیک آٹھ بجے رات بال ٹھاکرے کے کمرہ خاص میں اس کی خدمت میں بڑے ادب سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ اس کے گلے کی مالاؤں کے موتی اور انگوٹھیوں کے ہیرے کمرے کی روشنی

میں چمک رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔

"کہو دھرم چند! کیا رپورٹ لائے ہو؟ میں نے تو وہاں کی ساری انٹیلی جینس نفری نکلوا دی ہے۔ دلی سیکرٹری کے دس آدمیوں کو بھی معطل کروا دیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"سینا پتی جی! ہمیں آپ ایسے دیش بھگتوں کی ضرورت ہے۔ آپ بھارت ماتا کے بہادر سپوت ہیں۔ بھارت میں شیوا جی مرہٹہ کے اوتار ہیں۔"

بال ٹھاکرے کو میں نے ہوا دی تو وہ پھول گیا۔ فرعون ٹائپ کے آدمی اپنی تعریف سن کر ہمیشہ خوش ہوتے ہیں اور بال ٹھاکرے بھارت کا بہت بڑا فرعون تھا۔ چنانچہ وہ میری تعریف سے بہت خوش ہوا۔ اس کے کالے کالے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ آنکھیں اس مسکراہٹ کی وجہ سے مزید سکڑ سی گئیں۔

اس نے کہا۔ "تمہاری انٹیلی جینس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟"

میں نے کہا۔

"مہاراج! کھوج لگانے سے وہی بات سامنے آئی ہے جو میں پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کرتا رہا ہوں۔ مسٹر چکرورتی کو اگر عین وقت پر گرفتار کر لیا جاتا تو یہ تباہی نہ مچتی۔ میں اس بار جالندھر سادھو کے بھیس میں مندروں اور گوردواروں میں پھرا ہوں۔ مسلمان درویش بن کر مالیر کوٹلہ اور جالندھر کی خانقاہوں میں راتوں کو بیٹھا رہا ہوں۔ تاکہ کسی طرح ان پاکستانی جاسوسوں کا سراغ مل سکے جو چکرورتی کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔"

"پھر کچھ پتہ چلایا تم نے۔"

بال ٹھاکرے نے بیئر کا گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد پوچھا۔

میں نے کہا۔

"مہاراج جی! آپ مجھ سے بہتر اس بات کو سمجھتے ہیں کہ جب اس قسم کی واردات ہو جاتی ہے تو دوسرے جاسوس فوراً" انڈر گراؤنڈ چلے جاتے ہیں

جالندھر میں میزائیلوں کی تباہی کے بعد بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ چکرورتی تو میزائیلوں کے ساتھ ہی ختم ہوگیا تھا۔ اس کے پاکستانی جاسوس ساتھی جہاں جہاں تھے وہاں وہاں سے روپوش ہوگئے۔ مجھے صرف دو پاکستانی جاسوسوں کا سراغ ملا ہے۔"

"کہاں چھپے ہوئے ہیں وہ؟"

بال ٹھاکرے نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

میں نے ایسی صورت بنا لی جیسے میں کسی بڑے نازک مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج جی! یہ دونوں پاکستانی جاسوس میری اطلاع کے مطابق اس وقت جموں کشمیر کی سرحد پر ایک جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔

بال ٹھاکرے نے فوراً" تیز لہجے میں کہا۔

"ان کو جا کر پکڑتے کیوں نہیں؟ تم یہاں کیوں آ گئے؟ تمہیں جالندھر سے سیدھا اس طرف جانا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا۔ "سیناپتی جی! چور ڈاکوؤں کو پکڑنا مشکل نہیں ہوتا انہیں تو پولیس گھیرا ڈال کر فوراً" پکڑ لیتی ہے لیکن جاسوسوں کو پکڑنے کے لیے اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں ان کے دوسرے ساتھی ان کی گرفتاری کا بالکل علم نہ ہو اور وہ کہیں انڈر گراؤنڈ نہ چلے جائیں۔ میں نے ان لوگوں کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ مجھے یہ بھی رپورٹ مل چکی ہے کہ جنگل میں جہاں جہاں وہ چھپے ہوئے ہیں وہ جگہ ان کی پکی ہائیڈ آؤٹ ہے اور وہ ابھی وہاں سے واپس پاکستان نہیں جا رہے۔ میں آپ کو صرف یہ رپورٹ دینے آیا تھا۔ میں کل کی فلائیٹ سے واپس جموں روانہ ہو جاؤں گا اور جموں کی خفیہ پولیس کے ساتھ مل کر پاکستانی جاسوسوں کے ہائیڈ آؤٹ کا سراغ لگاؤں گا اور وہاں پولیس کی پوری فورس کے ساتھ اس وقت حملہ کروں گا جب سارے پاکستانی جاسوس وہاں پر موجود ہوں گے۔ میرا حملہ اتنا اچانک اور سوچا سمجھا ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی

فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔"

بال ٹھاکرے آنکھیں سکیڑے خاموشی سے میری طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیئر کا ایک اور گھونٹ پیا اور سگار سلگانے کے بعد بولا۔

"ٹھیک ہے تم کل کی فلائیٹ سے جموں پہنچ جاؤ۔ اگر جہاز میں کل کی کوئی سیٹ نہ ملی تو مجھے بتانا میں کسی کی سیٹ کینسل کرا کر تمہیں دلوا دوں گا۔ پیسوں کی ضرورت ہو تو آفس سیکرٹری سے لے لینا۔"

میں نے کہا۔ "بہت بہتر سینا پتی جی۔ اب آگیا بھی دیجئے اور مجھے اپنا آشیر باد بھی دیجئے کہ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو سکوں۔"

میں نے اپنا سر آگے کر دیا۔ بال ٹھاکرے نے ہاتھ آگے کر کے میرے سر کو چھوا اور ہاتھ ہلا کر مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس فرعون کے گھٹنوں کو چھوا اور الٹے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

ہمیں اپنے اکھنور مشن کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی کیونکہ اس مشن میں ہمیں کچھ اسلحے کی بھی ضرورت تھی۔ اگرچہ چھوٹے ہتھیار ہم بھارتی گشتی سنتریوں سے گھات لگا کر حملہ کر کے سنتریوں کو موت کے گھاٹ اتار کر حاصل کر لیا کرتے تھے میں نے شیو سینا کے دفتر میں آ کر آفس سیکرٹری سے کہا۔

"بال ٹھاکرے جی کے حکم کے مطابق مجھے کل مزید چھ سات ہزار روپے کا چیک لکھ دینا۔"

آفس سیکرٹری نے میز کا دراز کھولتے ہوئے کہا۔

"شریمان! کل کیوں آج ابھی چیک لے لیں۔"

بال ٹھاکرے کا حکم ان کے لیے بھگوان کے حکم کا درجہ رکھتا تھا اور ان لوگوں کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بال ٹھاکرے کے ذاتی فنڈ میں کروڑوں روپے جمع تھے۔ پانچ ہزار روپے اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم ایسا کرو۔ سات ہزار روپے کا بیئرر چیک لکھ دو میں صبح جموں جاتے ہوئے بینک سے رقم نکلوا لوں گا۔"

آفس سیکرٹری نے چیک لکھ کر بڑے ادب سے میرے حوالے کیا۔ میں نے چیک جیب میں رکھا اور دفتر سے نکل کر اپنے دفتر والے فلیٹ میں آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے اور رات کا کھانا کھانے کے لیے ویشنو ہوٹل میں جانے کی بجائے ایرانی ریستوران میں مرغ پلاؤ کا آرڈر دے دیا۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد میں نے چائے پی اور سگریٹ سلگا کر لیمنگٹن روڈ کی طرف نکل گیا۔ اس وقت بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ دلی پنجاب میں سخت سردی پڑ رہی تھی مگر بمبئی میں موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میرا ذہن اپنے نئے مشن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ مشن مجھے اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔ اس میں ایک ہزار ایک خطرے تھے۔ خطرے اس بات کے نہیں تھے کہ ہم مارے نہ جائیں اس کی ہمیں پروا نہیں تھی۔ خطرے اس بات کے تھے کہ کہیں ہم ٹارگٹ مارنے سے پہلے نہ مر جائیں۔ سب سے اہم اور ضروری بات یہ تھی کہ اکھنور کی فوجی قلعہ بندی کا پورا سروے کیا جائے۔ یہ معلوم کیا جائے وہاں تک پہنچنے کے راستے میں پہاڑی کی ڈھلان پر بھارتیوں نے مشین گن پوسٹیں کہاں کہاں بنائی ہوئی ہیں۔ اگر انہوں نے کہیں بوبی ٹرپ لگائے ہوئے ہیں اور بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی ہیں تو ان کا علاقہ کس جگہ پر ہے۔ کیونکہ امن کے زمانے میں ایسی فوجی قلعہ بندیوں کے اردگرد دشمن کے کمانڈو کے شب خون کے ڈر سے سیکورٹی کی خاطر بارودی سرنگیں بچھائی جاتی ہیں تو وہاں خفیہ طور پر سرخ نشان لگا دیے جاتے ہیں تاکہ دن کے وقت اپنے فوجیوں کو نظر آ جائیں۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنا تھا کہ رات کے وقت وہاں سیکورٹی کا کیسا انتظام ہوتا ہے۔

یہ تمام معلومات ہمارا کوئی ایک کشمیری مجاہد نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کے لیے

خود وہاں جانا ضروری تھا۔ مجھے ایک سہولت بھی حاصل تھی وہ یہ کہ میرے پاس انڈیا کی مرکزی انٹیلی جینس کا سب سے زیادہ خفیہ اور طاقتور سیکرٹریٹ نمبر 211 _ L / T تھا۔ اس کی مدد سے میں اکھنور کی قلعہ بندی اور پیرا میٹروں کے علاقے میں بغیر روک ٹوک داخل ہو سکتا تھا۔ کمانڈو شیر باز یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بھارتی فوجی اور سول افسروں سے ڈپلومیسی کی باتیں کرنے کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے ہندی زبان پر بھی عبور تھا۔ مجھے ہندو مت کی مقدس کتابوں وید اور پرانوں کے سنسکرت اشلوک بھی زبانی یاد تھے۔ مجھے بال ٹھاکرے کی سیاسی اور اخلاقی حمایت حاصل تھی اور میں بال ٹھاکرے کو کہہ آیا تھا کہ میں جموں اکھنور کے علاقے میں پاکستانی جاسوسوں کی سراغ رسانی کرنے اور انہیں گرفتار کروانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ ساری باتیں میرے حق میں جاتی تھیں۔

میں بمبئی کی بھیگی ہوئی رات میں لیمنگٹن روڈ پر بمبئے سنٹرل ریلوے سٹیشن تک نکل گیا۔ وہاں سے موٹر رکشے میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ پر واپس آیا اور سو گیا۔

دوسرے دن میں نے بینک سے چیک کیش کروایا اور ٹیلی فون کر کے معلوم کیا کہ بمبئ سے دلی کی فلائیٹ میں کوئی سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں۔ دوپہر کے بعد کی ایک فلائیٹ پر سیٹ مل گئی۔ میں نے بمبئ کی ایک مارکیٹ سے اپنے لیے کچھ نئے کپڑے خریدے۔ ایک جرسی کمانڈو شیر باز کے لیے خریدی۔ کیمیکلز کا کچھ ایسا مختصر سا سامان خریدا جو مائیکرو چپس بم بنانے میں کام آتا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کو طیارے میں سوار ہو کر دلی کی طرف پرواز کر گیا۔ دلی پہنچ کر میں نے خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں کمانڈو شیر باز سے رابطہ قائم کیا۔ اگرچہ دن کا وقت تھا مگر کمانڈو شیر باز مجھے وہاں مل گیا۔ میں نے اسے نئی جرسی دی۔ بال ٹھاکرے کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اس بارے میں مختصر بتایا اور کہا کہ یہاں سے آگے جموں ہم دونوں ایک ساتھ طیارے میں سوار ہو کر جائیں گے۔

کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"اس میں میرے پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ جاؤں۔ تم بے شک طیارے کے ذریعے جاؤ میں اپنے حساب سے وہاں آ جاؤں گا۔"

کمانڈو شیر باز ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مصلحت کا تقاضا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ جموں میں مجھے کس جگہ اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ بولا۔

"تم نے جموں کا کیلاش ہوٹل دیکھا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں! میں نے ایک بار اس ہوٹل میں قیام بھی کیا تھا۔ بڑا

ماڈرن ہوٹل ہے۔

"بس تم اسی ہوٹل میں ٹھہرے رہنا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ میں کون سے کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں؟"

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"یہ میں معلوم کر لوں گا۔"

میں اسی شام دلی سے جموں روانہ ہو گیا۔

جموں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ ایک سفری اٹیچی کیس رکھ لیا تھا۔ اس میں میری ضرورت کی چیزیں تھیں اور یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ میں باہر سے جموں آیا ہوں۔ کیلاش ہوٹل میں مجھے کمرہ نمبر ۱۵ مل گیا۔

میں نے کمانڈو شیر باز کا انتظار شروع کر دیا۔

کمانڈو شیر باز دوسرے دن رات کو مجھے ملا۔ رات کے سوا دس بجے میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا ٹیلی ویژن پر خبریں سن رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل کا ایک بوڑھا کشمیری ملازم باہر کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ دھرم چند جی ہیں؟ دلی سے آئے ہیں؟ آپ بال ٹھاکرے کے سیکرٹری ہیں؟"

بوڑھے کشمیری نے بیک وقت مجھ سے تین سوال پوچھ ڈالے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کشمیری مسلمان ہے اور حریت پسند مجاہدوں کے لیے کام کر رہا ہے اور اسے کمانڈو شیر باز نے ہی میرے پاس بھیجا ہے۔ میں نے کہا۔

"ہاں بابا جی کیوں کیا بات ہے؟"

بوڑھے نے کاریڈور میں ایک نگاہ ڈالی پھر اپنی ہوٹل کی وردی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میرے حوالے کیا اور آگے چل دیا۔ میں نے کمرے میں آ کر کاغذ کھولا۔ اس پر اردو زبان میں لکھا تھا۔

"جس بوڑھے نے تمہیں یہ خط دیا ہے وہ کل رات بارہ بجے کیلاش ہوٹل کے پیچھے مندر والی ٹیکری کے پاس جانوروں کے پانی پینے کا جو پیاؤ بنا ہوا ہے وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ تم اس کے پاس آ جانا یہ تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔

کمانڈو شیر باز!"

دوسرے دن رات کے ٹھیک بارہ بجے میں اس مقام پر پہنچ گیا۔ رات کے وقت ٹیکری والے پانی کے پیاؤ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دوسری جانب جو مندر تھا اس طرف روشنی تھی۔ وہاں ہوٹل والا بوڑھا کشمیری ایک طرف چھپ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر دوسری ٹیکری کی طرف چلا۔ دو تین گھاٹیاں اترنے کے بعد ایک ڈھلان پر نالے کے کنارے لکڑی کا جھونپڑا تھا۔ کمانڈو شیر باز وہاں مجھے مل گیا۔ بوڑھا کشمیری واپس چلا گیا۔ ہم اندھیرے میں باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"میں نے اپنے ایک خاص آدمی کی ڈیوٹی لگا دی ہے وہ ہمیں اکھنور قلعہ بندی کے بارے میں کل رات کو رپورٹ لا کر دے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ آدمی وہاں کیسے جا کر تفصیلات معلوم کرے گا؟"

شیر باز نے کہا۔

"وہ قلعہ بندی میں روزانہ صبح دودھ لے کر جاتا ہے۔"

میں نے کمانڈو شیر باز سے آگے کوئی بات نہ کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اکھنور کی قلعہ بندی کو اڑانے کے لیے جن خاص معلومات کی ہمیں ضرورت ہے وہ یہ گوالا حاصل نہیں کر سکے گا۔ لیکن اس وقت میں خاموش رہا کمانڈو شیر باز بولا۔

"تم اسی وقت کل رات کو یہاں آ جانا وہ آدمی یہاں پر موجود ہو گا۔"

اسکے بعد میں وہاں سے واپس آ گیا۔

دوسرے دن رات کو ٹھیک وقت پر میں اسی خفیہ جگہ پر پہنچ گیا۔ لکڑی کے جھونپڑے میں پتلی سی موم بتی اس طرح جل رہی تھی کہ اس کی روشنی جھونپڑی کے دروازے اور کھڑکی پر نہیں پڑ رہی تھی۔ کمانڈو شیر باز کے پاس ایک دیہاتی نوجوان کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ شیر باز کہنے لگا۔

"یہ عبداللہ ہے۔ اس نے جو رپورٹ دی ہے اس کے مطابق قلعہ بندی ٹیلے کی چوٹی پر ہے جہاں یہ نہیں جا سکا۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ ٹیلے کی ڈھلان جہاں شروع ہوتی ہے وہاں ایک طرف نشیب میں فوجی بیرک ہے۔ قلعہ بندی کو جانے والے راستے کا گیٹ کانٹے دار تاروں سے بنا ہوا ہے۔ اس کی دونوں جانب ذرا بلندی پر دو پکے مورچے ہیں۔ یہ مشین گن مورچے ہی ہوں گے۔ گیٹ پر دو مسلح سنتری ہر وقت پہرہ دیتے ہیں۔"

کمانڈو شیر باز نے جو تفصیلات بیان کیں وہ میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ میں نے عبداللہ گوالے سے پوچھا۔

"ٹیکری کی دوسری جانب کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "دوسری طرف ڈھلان ہے جہاں جنگلی جھاڑیاں نیچے پہاڑی نالے تک چلی گئی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "وہاں کوئی گن پوسٹ بھی ہے کیا؟"

عبداللہ گوالا بولا۔ "یہ مجھے معلوم نہیں اس طرف بھی کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے ان جھاڑیوں کو دور ہی سے دیکھا ہے۔"

میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"یہ نوجوان بڑی اچھی معلومات ہمارے لیے لایا ہے۔ ضرورت پڑی تو ہم اسے دوبارہ وہاں بھیجیں گے۔"

کمانڈو شیر باز نے عبداللہ گوالے کو واپس بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے شیر باز سے کہا۔

"شیر باز! یہ مشن اتنا اہم اور اتنا پیچیدہ ہے کہ اگر ہم نے سوچ سمجھ کر اس میں ہاتھ نہ ڈالا تو یہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔"

کمانڈو شیر باز سمجھ گیا۔ کہ عبداللہ گوالے کی لائی ہوئی رپورٹ سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ کہنے لگا۔

"پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا۔ "مطلوبہ معلومات میں وہاں خود جا کر حاصل کروں گا۔"

"تم کیسے جاؤ گے؟" شیر باز نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب ایسا ہے کہ مجھے کیلاش ہوٹل بدلنا ہو گا۔ یہاں کوئی اس سے بہتر ہوٹل ہو تو مجھے بتاؤ۔"

وہ یاد کر کے بولا۔ "بلیو سٹار ہوٹل ہی ہے جو کیلاش ہوٹل سے زیادہ مہنگا ہے۔ وہاں بڑے بڑے آفیسر آ کر ٹھہرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں صبح ہی اٹھ جاؤں گا۔ تم مجھ سے رابطہ رکھو گے۔"

وہ بولا۔ "وہی بوڑھا کشمیری ہمارے درمیان رابطے کا ذریعہ ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "کل سے اپنا جاسوسی کا مشن شروع کر رہا ہوں۔ پہلے مکمل جاسوسی ہو گی اکھنور قلعہ بندی کا پورا سروے گا۔ اس کے بعد ٹارگٹ پر کمانڈو اٹیک ہو گا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

میں شیر باز سے اجازت لے کر ہوٹل میں واپس آ گیا۔ اس بات کا میں خاص خیال رکھے ہوئے تھا کہ انٹیلی جینس کا کوئی آدمی میرا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ جہاں تک میرے علم اور میرے تجربے کا تعلق تھا ابھی تک جموں میں میری نگرانی شروع نہیں ہوئی تھی۔ میری نگرانی ہوتی بھی رہتی تو مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ صرف اتنی احتیاط ضروری تھی کہ جب میں کمانڈو شیر باز سے چھپ کر ملاقات کرنے جاؤں تو کوئی انٹیلی جینس والا میرے پیچھے نہ لگ جائے۔

اگلے روز میں کیلاش ہوٹل سے اٹیچی کیس اٹھا کر بلیو سٹار ہوٹل میں آ گیا۔ یہاں بھی میں نے دھرم چند کے نام ہی سے کمرہ لیا اور رجسٹر میں اپنے نام کے آگے آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی انڈین ڈیفنس انٹیلی جنس۔ کمرے میں آ کر میں نے اپنی خاص خاص چیزوں کا جائزہ لیا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری کھول کر فوجی گیریزن کا نمبر تلاش کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ اکھنور کے قریب ہی ۱۶ جاٹ رجمنٹ کی ایک ریزرو بٹالین کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس کے آفیسر کمانڈ کا نام کرنل رام سنگھ درج تھا۔ مجھے بال ٹھاکرے کی رضامندی بلکہ سفارش سے سنٹرل انڈین ڈیفنس انٹیلی جنس کی طرف سے او ایس ڈی یعنی آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کا اعزازی عہدہ ملا ہوا تھا۔ میں نے اپنے اس عہدے کو کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اب اسے استعمال کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ جاٹ رجمنٹ کی ریزرو بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر سے ملاقات کرنے سے پہلے میں نے جیب سے بال ٹھاکرے کا خفیہ نمبر نکالا اور بمبئی شہر اسے فون کر دیا۔ اسی نمبر پر وہ ہمیشہ مل جاتا تھا۔ اسی نے ریسیور اٹھایا اور حسب معمول پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے بڑے ادب سے پرنام کیا اور کہا۔

"سینا پتی جی میں آپ کا سیوک دھرم چند بول رہا ہوں۔"

"کہو دھرم چند! کیا پروگریس ہے؟"

میں نے کہا۔ "سر بالکل ٹھیک پروگریس جا رہی ہے۔ میں نے پاکستانی دشمنوں کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے ایک پاکستانی جاسوس جموں کے قریب اکھنور میں جو ہماری بڑی اہم ملٹری انسٹالیشن ہے وہاں کسی بھیس میں آتا جاتا ہے۔ میں اب اکھنور کی اس انسٹالیشن کا رخ کر رہا ہوں"۔

بال ٹھاکرے نے زور سے کہا۔

"اس دفعہ دشمن بچ کر نہیں جانا چاہیے۔"
میں نے کہا۔
"سر! میں اسے نہیں نکلنے دوں گا بلکہ اس کے سارے ساتھیوں کو بھی پکڑ لوں گا۔ آپ صرف اتنی کرپا کریں کہ اکھنور میں تعینات جاٹ رجمنٹ کے بٹالین آفیسر کمانڈنگ کو میرے بارے میں اپنے طور پر کہہ دیں کہ مجھے وہاں آنے جانے کی سہولت مل جائے۔"
بال ٹھاکرے نے فوراً" حامی بھرتے ہوئے کہا۔
"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی دلی سیکرٹریٹ فون کر کے مسٹر سریندر لوہلی سے کہتا ہوں کہ اکھنور والی رجمنٹ کے بٹالین کمانڈر کو میرے بارے میں طلاع بھیج دے۔ باقی تم اسی طرح مجھ سے رابطہ رکھنا۔"
میں نے کہا۔ "سینا پتی جی! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"
اور بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔
بمشکل ڈیڑھ منٹ لگا اور میرے لیے اکھنور کی پاکستان دشمن فوجی قلعہ بندی ک راستہ صاف ہوگیا۔ اب میں نے اپنا شیڈول تبدیل کر لیا۔ اس روز اپنے گٹ پر جانے کی بجائے میں نے دوسرے روز جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس ران جاٹ رجمنٹ کے بٹالین کمانڈر کو انڈین ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف کا ے بارے میں پیغام مل جائے۔ بھارت کی مرکزی ڈیفنس انٹیلی جینس بڑا ور ادارہ تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس بھی اس کے ماتحت تھی۔ اس حقیقت سے میں نبر تھا۔ اسی لیے میں نے یہ پیش بندی کرائی تھی۔ وہ دن میں نے ہوٹل میں لزار دیا۔ صرف رات کے وقت ایک فلم دیکھنے چلا گیا۔
دوسرے دن میں نے بھارت کے سیاسی ورکروں والا لباس یعنی کھدر کا کرتا مہ اور گلے میں شیوسینا کے خاص زعفرانی رنگ والا گلوبند ڈال لیا۔ یکٹری سے مجھے بٹالین ہیڈ کوارٹر کو جانے والی سڑک کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ یہ

جگہ جموں شہر سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ میں نے ٹیکسی لی اور ا
ٹارگٹ کی طرف چل پڑا۔ شہر سے باہر پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ہمار
کوہ مری اور ایبٹ آباد کی طرح کا پہاڑی علاقہ نہیں تھا۔ سوکھے خشک پہاڑ تھے۔
کسی کسی پہاڑ پر سبزے کا ٹکڑا نظر آ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ ہموا
میدان بھی تھے اور اونچی نیچی زمین بھی شروع ہو جاتی تھی۔ جموں میں سردی تھ
میں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر کونے میں لگ کر بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ ٹیکسی کافی د
تک سفر کرنے کے بعد ایک طرف کو پختہ سڑک پر مڑ گئی۔ یہاں دونوں جانب
کہیں کہیں جنگلی جھاڑیاں اور سوکھی گھاس کے درمیان ملٹری ٹرک کھڑے تھے۔
دور سے تین چار بیرکیں دکھائی دیں۔ پھر ایک خاردار تاروں والا لکڑی کے
شہتیروں سے بنا ہوا گیٹ آ گیا۔ یہاں فوجی سنتریوں نے ہاتھ کے اشارے سے
ٹیکسی کو دور ہی رکنے کے لیے کہا۔ ایک سنتری مارچ کرتا ٹیکسی کے پاس آ گیا۔
میں نے کہا۔

"میرا نام دھرم چند ہے۔ میں ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ دلی سے آیا ہوں۔"

"انٹیلی جینس کا نام میں نے جان بوجھ کر نہیں لیا تھا کہ یہ فوجی سپاہ
ڈیپارٹمنٹ جلدی سمجھ جائے گا۔ اس نے کہا۔

"سر! ٹھیک ہے مگر ہمیں آرڈر نہیں ہے۔ آپ کو کوئی آئی ڈی کارڈ دکھا
ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "جوان آئی ڈی کارڈ تو میرے پاس نہیں ہے تم اپنے آفیس
کمانڈنگ سے فون پر میری بات کرا دو۔"

"ٹھیک ہے صاحب! گاڑی ادھر لگا کر میرے ساتھ آ جاؤ۔"

میں نے ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ دلی سے ڈیفنس
انٹیلی جینس کے چیف کا ٹیلی فون یہاں آ چکا ہو گا۔ میں خاردار تار والے گیٹ
کے پاس ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سنتری اندر بوتھ میں فون کرنے چلا گیا

میں نے گہری نگاہوں سے ماحول کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ میرا اصل ٹارگٹ یعنی اکھنور والی قلعہ بندی وہاں سے کچھ فاصلے پر دوسری پہاڑی کی چوٹی پر تھی لیکن یہاں بھی فوج نے سیکورٹی کا زبردست انتظام کر رکھا تھا۔ اتنے میں سنتری تیز تیز قدم چلاتا میرے پاس آکر بولا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔ بڑے صاحب نے آپکو بلایا ہے۔ میرے ساتھ آ جائیں۔"

میں اندر داخل ہوگیا۔ یہ اسی طرح کا بھارتی فوجی کیمپ تھا جس طرح کے فوجی کیمپ ہوا کرتے ہیں۔ ایک طرف بارکیں بنی ہوئی تھیں یہاں وہاں فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ خاردار تاریں تھیں۔ میں ایک ذرا اچھی قسم کی بارک کی طرف بڑھا تو اندر سے ایک فوجی افسر فل وردی میں باہر نکلا اور میری طرف دونوں ہاتھ بڑھا کر انگریزی میں بولا۔

"اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا تو آپ دھرم چند آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی ہیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"بالکل میں وہی ہوں اور آپ بھی ضرور کرنل رام سنگھ ہوں گے۔"

"بالکل بالکل! پلیز اندر آ جائیے۔"

معلوم ہوا کہ یہ جاٹ آرٹیلری یعنی توپ خانے کی رجمنٹ کی بٹالین ہے اور کرنل رام سنگھ ٹیلے والی قلعہ بندی کا انچارج ہے۔ میرے لیے مزید سہولت پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے میری خوب آؤ بھگت کی۔ اسے سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف کا ٹیلی فون آ چکا تھا اور فون پر مسٹر کوہلی نے اسے میرا پورا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس شناخت کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے میں نے کرنل رام سنگھ کو اپنا خفیہ نمبر T / L _ 211 بھی بتا دیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کافی پی۔ نام اس کا رام سنگھ تھا مگر اس کے بال وغیرہ نہیں تھے۔ وہ راجپوت سنگھ تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے کشمیر کے محاذ پر حریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی فوجی

کارروائیوں کا اور پاکستان کی طرف سے کشمیر پر ممکنہ حملے کا ذکر کیا اور کہا۔
"مجھے یقین ہے کہ ہماری بھارتی آرمی کا ڈیفنس یہاں بہت مضبوط ہوگا۔"
رام سنگھ کہنے لگا۔
""""سر! ڈیفنس تو ہمارا اتنا زبردست ہے کہ ہمارے اوپر سے پاکستان کا تیز سے تیز رفتار جیٹ فائٹر بھی نہیں گزر سکتا۔ اس کے سواگت کے لیے ہمارے سنگر میزائیل اوپر ٹیلے پر جگہ جگہ لگے ہوئے ہیں۔"
میں نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
"اور ہماری ترشول توپیں بھی تو ہیں۔"
کرنل بولا۔
"سر! اس وقت برصغیر ایشیا میں اتنی طاقتور اور سینکڑوں میل تک مار کرنے والی توپیں یا تو اسرائیل کے پاس ہیں اور یا پھر ہمارے پاس ہیں۔ پاکستان کے شہر جہلم گجرات وزیر آباد ہماری ترشول توپوں کی زد میں ہیں۔"
گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔
"اس کے باوجود ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔ پاکستانی فوج بھی پیشہ ور فوج ہے اگر اس نے حملہ کر دیا تو ہماری توپوں کی طرف ضرور ایڈوانس کرے گی اور گولہ باری بھی کرے گی۔"
رام سنگھ کہنے لگا۔
"سر ان کے پاس کوئی ایسی توپ نہیں ہے جس کے گولے ہمارے پیرا میٹروں تک پہنچ سکیں باقی جہاں تک جنگ کی صورت میں دشمن کے ایڈوانس کرنے کا تعلق ہے تو وہ صرف ٹیلے کی دوسری طرف سے ہی ایڈوانس کر سکتا ہے۔ وہاں ہم نے پہاڑی ڈھلان سے لے کر نیچے نالے تک بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ دشمن کے چھوٹے او پی طیاروں کو مار گرانے کے لیے اینٹی کرافٹ گنوں کے مورچے بھی جھاڑیوں میں موجود ہیں۔"

اس ایک ہی ملاقات میں کرنل رام سنگھ نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اب مجھے صرف خود اپنی آنکھوں سے ٹیلے والی توپوں کا مشاہدہ کرنا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کیمپ کے میس MESS میں کھایا۔ اس کے بعد جب میں نے ٹیلے والے پیرامیٹرز کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو کرنل رام سنگھ مجھے جیپ میں بٹھا کر ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ انکار وہ اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ مجھے انڈین سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس نے اسی کام کے لیے بھیجا ہے کہ میں جا کر ڈیفنس کا معائنہ کروں اور رپورٹ تیار کر کے لاؤں۔

جب قلعہ بندی والا ٹیلہ آیا تو میں چوکنا ہوگیا۔ اور گہری نظروں سے ایک ایک جھاڑی اور درخت کو غور سے دیکھنے لگا۔ ٹیلے والی چھوٹی سڑک پر جو اوپر توپوں تک جاتی تھی خاردار تار کا گیٹ لگا تھا۔ کرنل کی گاڑی دیکھتے ہی سنتریوں نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ گیٹ کی دونوں جانب ذرا بلندی پر دو پکے مورچے تھے جن میں سے مشین گنوں کی نالیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ عبداللہ گوالے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ گیٹ کے پاس مشین گنیں لگی ہیں۔ ٹیلے پر سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی اوپر جا رہی تھی اوپر جا کر معلوم ہوا کہ وہاں ایک قلعہ بندی نہیں ہے بلکہ ساتھ ساتھ بنی ہوئی دو قلعہ بندیاں ہیں۔ یہ سیمنٹ اور لوہے کے بنے ہوئے پیرا میٹر تھے۔ جن کے اوپر جال ڈال کر ان میں درختوں کی جھاڑیاں اڑس دی ہوئی تھیں۔ اس طرح انہیں کیمو فلاج کر دیا گیا تھا۔ دو پیرامیٹروں میں دو دو ترشول توپیں نصب تھیں۔ بہت بڑی بڑی توپیں تھیں۔ دونوں پیرامیٹروں کے دائیں بائیں تھوڑے سے تھوڑے فاصلے پر جھاڑیوں میں سنگر میزائیل کی سرخ نوک اس طرح نظر آ رہی تھی جیسے جھاڑی میں جنگلی پھول کھلا ہوا ہو۔ کرنل رام سنگھ نے مجھے پیرا میٹروں کے آگے نشیبی ڈھلان دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ سارا علاقہ بارودی سرنگوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں سے اوپر جو بھی

فوج ایڈوانس کرے گی راستے میں ہی ختم ہو جائے گی۔"

پیرا میٹروں یعنی قلعہ بندیوں کے اندر کمپیوٹر لگے ہوئے تھے یہ توپیں کمپیوٹر سے نشانہ لیتی تھیں اور کمپیوٹر ہی انہیں فائر کرتا تھا۔ توپچی کو صرف کمپیوٹر کے کی بورڈ کے ہندسے پر صرف انگلی کی ضرب ہی مارنی پڑتی تھی۔ اندر ایک جانب دیوار کے ساتھ توپوں کے بڑے بڑے گولے لگے ہوئے تھے۔ کرنل رام سنگھ نے دوربین مجھے دے کر کہا۔

"سر ادھر ذرا بائیں جانب دیکھیں۔ آپ کو سیالکوٹ کی چھاؤنی کے مکان نظر آئیں گے۔"

میں نے دور بین آنکھوں سے لگا کر دیکھا تو حیران رہ گیا میری آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے ماچس کی ڈبیوں کے سائز کے کچھ مکان تھے۔ یہ پاکستان کی سیالکوٹ چھاؤنی کا علاقہ تھا۔ یہاں سے اگر گولہ فائر کیا جائے تو وہ سیالکوٹ چھاؤنی کے علاقے میں زبردست تباہی مچا سکتا تھا۔ میں نے دور بین اپنی آنکھوں سے لگائے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ انشاء اللہ ان توپوں کا ایک بھی گولہ فائر نہیں ہونے دوں گا۔

پہلے میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے ایک ہی دن میں اتنی بڑی فوجی انسٹالیشن کی پوری تفصیلات حاصل کر لی ہوں۔ یہ اس لیے ہوا تھا کہ بال ٹھاکرے نے میرے لیے پہلے سے میدان صاف کر دیا ہوا تھا اور بجائے اس کے کہ ہم لوگ چھپ چھپ کر یا بھیس بدل کر ان تنصیبات کا جائزہ لیتے وہاں کا ذمے دار بھارتی فوجی افسر خود مجھے ساری تنصیبات دکھا رہا تھا اور ان کی کارکردگی کے بارے میں بھی بتاتا جا رہا تھا۔

میں جب وہاں سے ہوٹل واپس آیا تو میرا ذہن بھرا ہوا تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کاغذ پر شارٹ ہینڈ اور خفیہ اشاروں میں یہ ساری تفصیل اس طرح سے لکھ دی کہ کوئی دوسرا اسے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹ کر میں سوچنے لگا کہ ٹارگٹ میرے سامنے بطخ کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ صرف چند ایک جگہوں پر دھماکہ خیز مائیکرو چپس لگانے ہیں۔ وہ میں بڑی آسانی سے دوسری بار معائینہ کرنے کے بہانے جا کر لگا سکتا تھا۔ لیکن ایک خیال بار بار میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ اگر میں نے یہ قلعہ بندیاں تباہ کر دیں تو کہیں بال ٹھاکرے اور ڈیفنس انٹیلی جینس والے مجھ پر شک تو نہیں کرنے لگیں گے کیونکہ اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا کہ میں پرتھوی میزائیلوں کے اڈے کا معائینہ کر کے بمبئی واپس آیا تو پیچھے سارا اڈہ تباہ ہو گیا تھا۔ میزائیلوں کے اڈے کی تباہی سے پہلے تو میں نے پیش بندی کے طور پر چکرورتی کا ڈرامہ بھی کھیلا تھا اس بار تو ایسے کسی ڈرامے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

یہ خیال مجھے پریشان کرنے لگا۔ کیونکہ میں پاکستانی جاسوسوں کو بھی نہیں پکڑوا سکوں گا اور اکھنور کی قلعہ بندیاں بھی دھماکے سے اڑ جائیں گی۔ پچھلی بار تقریباً" یہی ہوا تھا کہ میں نے کسی پاکستانی جاسوس کو گرفتار نہیں کیا تھا اور پرتھوی میزائیلوں کا اڈہ نیست و نابود ہوگیا تھا۔ بال ٹھاکرے کو مجھ پر چاہے کتنا ہی اعتماد سہی مگر آخر وہ ایک ذہین شخص ہے۔ وہ کوئی احمق آدمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی امکان تھا کہ بالا جی راؤ میرے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دے۔ وہ پہلے ہی مجھ سے حسد کرنے لگا تھا۔ کیونکہ میں اس کی نسبت بال ٹھاکرے کے زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ان توپوں اور سٹنگر میزائیلوں کو تباہ کرنا بھی ضروری تھا۔ ٹھیک ہے بھارت کے پاس سٹنگر میزائیلوں کی کمی نہیں تھی وہ اور منگوا سکتا تھا۔ توپیں بھی وہ اور منگوا سکتا تھا لیکن جو توپیں اور سٹنگر میزائیل لگے ہوئے ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ان کو ملیامیٹ کرنا میرا فرض تھا۔ میں نے آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ کمانڈو شیر باز سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔ دوسرے روز ہوٹل میں وہی بوڑھا کشمیری میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں آج رات خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں شیر باز سے ملنے آ رہا ہوں۔ وہ میرا پیغام لے کر چلا گیا۔ میں نے دن بڑی بے چینی سے گزارا رات آدھی گزری ہی نہیں تھی کہ میں ہوٹل سے نکل کر خفیہ ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ کمانڈو شیر باز وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی ساری صورت حال کھول کر بیان کر دی اور پوچھا۔

"تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ اگر تو ان قلعہ بندیوں کو تباہ کرنے کے بعد مجھے بال ٹھاکرے سے کوئی سروکار نہیں رکھنا اور سینٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس سے بھی اپنا ناطہ ہمیشہ کے لیے توڑ دینا ہے تو میں آج ہی جا کر توپوں اور سٹنگر میزائیلوں میں دھماکہ خیز مائیکرو چپس لگا آتا ہوں لیکن اگر ہمیں ان لوگوں کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو، کشمیری مجاہدوں کو اور پاکستان کو بھارت کے جارحانہ مذموم فوجی

عزائم سے باخبر رکھنا ہے تو پھر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔"
کمانڈو شیرباز گہری سوچ میں گم تھا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔
"تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے اس بار اس بات کا امکان ہے کہ بال ٹھاکرے وغیرہ کو تم پر شک پڑ جائے لیکن حیدر علی بھائی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ان توپوں کو پاکستان کے شہروں پر آگ اور بارود اگلنے کی اجازت دے دیں۔"

میں نے فوراً اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ایسی بات بالکل نہیں ہے شیرباز۔ یہ ٹارگٹ تو ہمیں مارنا ہی ہے۔ ان توپوں اور گائیڈڈ سنگر میزائیلوں کو تو ہمیں ہر حالت میں تباہ کرنا ہے لیکن چونکہ ایسی کوئی ایمرجنسی ابھی پیدا نہیں ہوئی کہ یہ توپیں پاکستان کے شہروں پر گولہ باری شروع کر دیں اس لیے ہم اس مشن کو تھوڑا سا لیٹ کر سکتے ہیں۔ اس دوران میں یہاں سے بمبئی چلا جاؤں گا اور وہاں جا کر بال ٹھاکرے سے کہوں گا کہ میری اطلاع کے مطابق پاکستانی جاسوس گجرات کا ٹھیاواڑ کے علاقے میں بھارتی فوجی تنصیبات کی سراغرسانی کرنے کے لیے داخل ہوگئے ہیں۔ اس طرح کچھ عرصے بعد جب اس کی توجہ اکھنور کی ان فوجی قلعہ بندیوں کی طرف سے ہٹ جائے گی تو پھر میں کسی دوسرے شہر جانے کا بہانہ بنا کر بمبئی سے سیدھا یہاں تمہارے پاس آ جاؤں گا اور ہم اپنا کمانڈو آپریشن شروع کر دیں گے۔ پھر میں کرنل رام سنگھ سے بھی بطور انٹیلی جینس سپیشل آفیسر کے بھی نہیں ملوں گا۔ اسے اپنی شکل تک نہیں دکھاؤں گا اور رات کے اندھیرے میں ہم اپنے ٹارگٹ پر جا کر مائیکرو چپس لگا کر آئیں گے۔ علاقے کا سروے تو میں کر چکا ہوں۔ ایک ایک پیرا میٹر ایک گن پوسٹ اور ایک ایک جھاڑی میری نگاہوں میں ہے۔"
کمانڈو شیرباز کو میری تجویز پسند آئی۔ کہنے لگا۔
"لیکن اگر اس دوران بھارت نے جنگ چھیڑ دی تو کیا تم اتنی جلدی یہاں

پہنچ سکو گے۔ پہنچ بھی جاؤ گے تو جنگ کی حالت میں ہمارا توپوں کے مورچوں تک پہنچنا ناممکن ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر جنگ چھڑنے والی ہو گی تو مجھے بال ٹھاکرے کی وجہ سے پہلے معلوم ہو جائے گا میں جنگ شروع ہونے سے پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

دوسرے روز میں بمبئی جانے کے باری میں سوچ رہا تھا کہ ہوٹل میں اچانک اکھنور والی ریزرو آرٹیلری بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر رام سنگھ کا فون آ گیا۔ ری پشن سے جو مجھے فونً پر کہا گیا کہ کرنل رام سنگھ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے تشویش ہوئی کہ اس کو مجھے اچانک فون کرنے کی ضرورت کیسے پڑ گئی۔

میں نے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر سے کہا۔

"ملا دیجئے۔"

کرنل رام سنگھ نے پوچھا۔

"سر! آپ دھرم چند جی بول رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں کرنل صاحب! میں دھرم چند ہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "سر! دلی سے مجھے وائرلیس پر کہا گیا ہے کہ میں آپ سے رابطہ کر کے کہوں کہ آپ شریمان بال ٹھاکرے جی کو فون کر لیں۔"

میں نے کہا۔ "اوکے کرنل صاحب! میں ابھی بمبئی فون کرتا ہوں۔ تھینک یو۔"

کرنل رام سنگھ نے فون منقطع کر دیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ خدا خیر کرے کہیں پیچھے کوئی گڑ بڑ نہ ہو گئی ہو۔ مجھے ہر وقت صرف ایک ہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پاکستان کی جیل سے کہیں اصلی دھرم چند فرار ہو کر انڈیا نہ پہنچ جائے۔ اگر وہ انڈیا کا بارڈر کراس کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر میرا انڈیا میں کہیں

کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور میرا کسی بھاری مصیبت میں پھنس جانا یقینی تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بمبئی کا نمبر ڈائیل کیا۔ بمبئی سے بال ٹھاکرے کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر جوشی نے کہا۔ "دھرم چند جی ہولڈ کریں میں سینا پتی جی سے بات کراتا ہوں۔"

دوسرے لمحے بال ٹھاکرے کی آواز سنائی دی۔

"دھرم چند! تم ہو؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج میں ہوں آپ کا سیوک دھرم چند حکم کیجئے۔"

بال ٹھاکرے نے مجھ سے میری پروگریس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔ "سر! میری اطلاع کے مطابق یہ تین پاکستانی جاسوس ہیں اور انہیں کمانڈو ٹریننگ بھی ملی ہوئی ہے اس وقت وہ جموں کشمیر میں نہیں ہیں۔ خبر ملی ہے کہ وہ گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس علاقے میں داخل ہو کر ان کا سراغ لگاؤں۔"

بال ٹھاکرے بولا۔

"ٹھیک ہے تم آ جاؤ۔ میں خود بھی تمہیں یہاں بلانا چاہتا تھا۔ یہاں تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ آؤ گے تو بتاؤں گا۔ بس تم کوئی بھی فلائیٹ پکڑ کر بمبئی پہنچ جاؤ۔"

اور بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔

اس خیال سے میں خوش ہوا کہ میرا راستہ بال ٹھاکرے نے خود ہی صاف کر دیا تھا مگر اس بات سے تشویش بھی ہوئی کہ ایسی کونسی ایمرجنسی پڑ گئی ہے۔ بہرحال ایک گھنٹے بعد میں جہاز میں بیٹھا تھا اور جہاز بمبئی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ سارا راستہ یہی سوچتا رہا کہ ایسا کون سا کام ہو سکتا ہے۔ بمبئی پہنچتے ہی بال ٹھاکرے جی سے ملاقات کرنے اس کی کوٹھی پر آ گیا۔ اس کے پاس بالا جی راؤ بھی بیٹھا تھا بالا جی کو دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں اس شخص نے میرے خلاف

کوئی سازش تو نہیں کر رکھی۔ کیونکہ وہ مجھ سے زبردست حسد کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کی جگہ لے لی تھی اور بال ٹھاکرے اب سارے مشورے مجھ سے ہی کرتا تھا۔ بال ٹھاکرے نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کہنے لگا۔

دھرم چند! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ یہاں ہم پاکستان میں بھیجنے کے لیے دہشت گردوں کی ایک نئی پارٹی کو ٹریننگ دے رہے ہیں۔ یہ پارٹی بڑے خونی اور قاتل قسم کے جرائم پیشہ لوگوں کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے دو دو تین تین خون کیے ہیں اور عمر قید کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہم نے انہیں اس شرط پر جیل سے پیرول پر رہا کروایا ہے کہ اگر پاکستان میں جا کر ان میں سے ہر ایک نے کم از کم پندرہ پندرہ مسلمانوں کا خون کیا تو یہاں آنے پر ان کی باقی سزا معاف کر دیجائے گی۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ شخص واقعی مسلمانوں کا جانی دشمن ہے۔ کیسی کیسی خون ریزی کی سکیمیں پاکستانی مسلمانوں کے خلاف تیار کرتا رہتا ہے۔ بالا جی راؤ اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔

"دھرم چند جی! تم اس پارٹی کے انچارج ہو گے اور تمہارا کام یہ ہو گا کہ ان میں سے ہر ایک کی باری باری راہ نمائی کرو۔ ان کو پاکستان میں مسلمانوں کی بڑی بڑی مذہبی جماعتوں کے لیڈروں کی شکلیں دکھاؤ تاکہ یہ باری باری انہیں موت کے گھاٹ اتارتے رہیں۔ ان دہشت گردوں میں سے ہر ایک دہشت گرد سے تم نے کم از کم پاکستان کے پندرہ مذہبی لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کروانا ہے۔ یہ لوگ تمہاری نگرانی میں مسجدوں میں بھی بم پھینکیں گے۔ تم ان کے قتل کا حساب لکھو گے۔"

بال ٹھاکرے بولا۔

"تمہیں اس لیے چنا گیا ہے کہ تم پاکستان کے حالات اور شہروں سے واقف ہو۔ کیا تم اس مشن کے لیے تیار ہو؟"

میں اپنے انتہائی اہم مشن اکھنور کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بال ٹھاکرے مجھے اس قسم کے متبادل مشن پر پاکستان بھیجنے کا پروگرام بنا چکا ہے۔ مگر میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں دہشت گردوں کے بارے میں سمگل کیے جانے کے بعد جب چاہوں انہیں گرفتار کروا سکتا تھا لیکن اس طرح سے مجھ پر شبہ کیا جا سکتا تا۔ اس سے پہلے میں مہا بھارت کے کئی دہشت گردوں کو پاکستان میں ہلاک کروا چکا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ بالا جی راؤ نے بال ٹھاکرے کو مشورہ دیا ہو کہ اس قاتلانہ مہم پر دھرم چند کو گائڈ کے طور پر بھیجا جائے۔ ہو سکتا ہے درپردہ اس نے بال ٹھاکرے کے کان میں یہ بات ڈال دی ہو کہ دھرم چند کی پاکستان میں کارکردگی اطمینان بخش نہیں رہی اور دھرم چند کی قیادت میں ہمارے کئی دہشت گرد یا تو پکڑے گئے ہیں یا مارے گئے ہیں اس بنا پر مجھے شک پڑتا ہے کہ کہیں دھرم چند ڈبل ایجنٹ تو نہیں بن گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دولت کے لالچ میں آ کر پاکستان کی انٹیلی جینس کے لیے کام کرنے پر راضی ہوگیا ہو۔ یہ بات تو بالا جی راؤ کے بھی وہم و گمان میں ابھی تک نہیں تھی کہ اصلی دھرم چند نہیں ہوں بلکہ پاکستانی مسلمان ہوں اور میرا نام حیدر علی ہے اور میں دھرم چند کا ہم شکل ہوں اور اس کا ہم شکل بن کر بھارت میں پاکستان کی سلامتی کے خفیہ مشن پر آیا ہوا ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اب تک میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھارت کے گدھوں کو کھلائے جا چکے ہوتے۔ چونکہ میرا یہ راز ابھی تک راز ہی تھا اور افشا نہیں ہوا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔ صرف میں نے اس بار زیادہ محتاط ہونے کا فیصلہ ضرور کر لیا تھا۔

چنانچہ میں نے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"سیناپتی جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں انکار کر دوں۔ مجھے تو بھارت ماتا کی سیوا کا بھی موقع مل رہا ہے۔

بال ٹھاکرے نے بالا جی راؤ سے کہا۔
"راؤ! تم دھرم چند کو ابھی ٹریننگ سینٹر سے لے جاؤ اور ان آدمیوں سے ملا دو۔"
بال ٹھاکرے نے پاکستانی جاسوسوں کے گجرات کاٹھیا واڑ کے علاقے میں داخل ہونے کی میری اطلاع کے بارے میں کہا۔
"ان جاسوسوں کا سراغ ہماری شیوسینا کی انٹیلی جنیس لگا لے گی تمہارا اس مشن پر پاکستان جانا بہت ضروری ہے اور ہاں۔ اسلام آباد میں جو عورت تمہاری بیوی بن کر تمہارے فلیٹ میں رہ رہی تھی اسے ہم نے واپس بلا لیا ہے اب اسلام آباد والے فلیٹ میں ہمارے سفارت خانے کا ایک ملازم رہ رہا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو تمہارا کاروباری پارٹنر ظاہر کیا ہوا ہے۔ تمہارے شو روم کا تمہارا مسلمان ملازم ہی چلا رہا ہے۔ تم ان قاتل دہشت گردوں کو اسلام آباد میں بیٹھ کر گائیڈ کرو گے اور جس پاکستانی مسلمان کو قتل کروانا ہو گا اس کی سکیم تم اپنے فلیٹ پر ہی تیار کرو گے۔"
میں نے دل میں کہا کہ یہ تو تم بھول جاؤ بھارت کے نمرود بال ٹھاکرے کہ میرے ہاتھ سے کسی پاکستانی مسلمان کا خون ہو گا۔ خدا نے چاہا تو جن قاتل دہشت گردوں کو تم مسلمانوں کا خون بہانے اور پاکستان میں انتشار پھیلانے کے لیے بھیج رہے ہو ان میں سے ایک بھی واپس نہیں آ سکے گا۔ اس دفعہ ایسی حکمت عملی سے کام لوں گا کہ تم اور بالا جی راؤ خود کہہ اٹھیں گے کہ دھرم چند نے تو اپنی جان کی بازی لگا دی تھی ہمارے دہشت گردوں سے کچھ نہیں ہو سکا۔
میں نے بال ٹھاکرے سے کہا۔
"ایسا ہی ہو گا۔ سینا پتی جی۔ آپ بے فکر رہیں۔"
اس کے بعد بالا جی راؤ مجھے لے کر بمبئی کے مضافات میں دہشت گردوں کا جو ٹریننگ سینٹر تھا اس طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے راستے میں بالا جی راؤ سے

پوچھا۔

"یہ کل کتنے دہشت گرد ہیں بالا جی؟

جب اس نے بتایا کہ کل تین دہشت گرد ہیں تو میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"صرف تین ہی ہیں؟"

بالا جی راؤ کہنے لگا۔

"دھرم چند جی! یہ تین آدمی پچاس قاتلوں کے برابر ہیں ان میں سے ہر ایک نے کم از کم تین تین خون ضرور کیے ہیں۔ موقع کی شہادتیں نہ ملنے کی وجہ سے انہیں عمر قید ہوئی ہے ورنہ اب تک یہ پھانسی پا چکے ہوتے۔ یہ تین کئی دہشت گردوں پر بھاری ہیں۔"

میں نے دل میں اطمینان کا سانس لیا تھا کہ صرف تین ہی دہشت گرد ہیں۔ حیرانی کا اظہار میں نے اوپر اوپر سے کیا تھا۔ ان تینوں کو میں پاکستان جا کر آسانی سے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ ٹریننگ سینٹر پہنچے تو دیکھا کہ نیا انسٹرکٹر تین آدمیوں کو دیوار پر بنے ہوئے گول نشانوں پر پستول کا نشانہ لگانے کی مشق کرا رہا تھا۔ بالا جی راؤ کہنے لگا۔

"یہ تین قاتل ہیں۔ ویسے تو یہ ہر قسم کا اسلحہ چلانے کے ماہر ہیں لیکن انہیں نشانہ لگانے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ کیونکہ دہشت گرد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی گولی ٹھیک نشانے پر جا کر لگے۔"

میں ان تینوں قاتل دہشت گردوں سے ملا۔ یہ تینوں پنجابی ہندو تھے اور ان کا تعلق ضلع فیروز پور کے علاقے سے تھا پیدائشی جرائم پیشہ تھے۔ شکل سے لگتا تھا کہ خونی ہیں۔ ان کی ٹریننگ پہلے سے ہو رہی تھی۔ میرے جانے کے بعد مزید ایک ہفتہ کی ٹریننگ میں انہیں نشانے بازی کی مشق کرا دی گئی۔ اب وہ پاکستان سمگل ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان کے مسلمانوں والے نام رکھے گئے۔ ان کے

موریشش آئی لینڈ کے جعلی پاسپورٹ تیار کئے گئے۔ موریشش آئی لینڈ کے ملک کا اس لیے انتخاب کیا گیا کہ اس ملک کے ساتھ بھارت کے تجارتی تعلقات تھے اور وہاں بے شمار ہندو کاروبار کرتے تھے۔ پاسپورٹ اس لیے بنا کر دیے گئے تھے کہ اگر کبھی وہ پکڑے جائیں تو پاسپورٹ دکھا کر کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو موریشش کے مسلمان ہیں۔ ایک آدمی ہمیں پاکستان میں روزگار کے بہانے لایا تھا۔ ہم ان پڑھ ہیں۔ یہاں لا کر اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم نے اسے پچاس پچاس ہزار روپے فی کس دیے تھے وغیرہ وغیرہ۔

ہماری پاکستان میں سمگل کیے جانے کی تاریخ مقرر کر دی گئی میں کمانڈو شیر باز تک کسی طریقے یہ پیغام پہنچانا چاہتا تھا کہ مجھ پر یہ ایک نئی مصیبت پڑ گئی ہے اور اس میں پاکستان جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں مجھے کچھ وقت لگ جائے۔ لیکن کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ امرتسر میں جو اپنا مجاہد جاسوس بیٹھا ہے اس کے پاس ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود ہے۔ کیوں نہ اسے یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی جائے بمبئی کے شیو سینا والے آفس میں وائرلیس پر بات کرنے کی سہولت موجود تھی۔ چنانچہ ایک رات موقع پا کر میں آفس کے ٹرانسمیٹر روم میں چلا گیا اور ریڈیو ٹرانسمیٹر آن کر کے امرتسر والے اپنے مجاہد کو سگنل دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنا مجاہد جاسوس رات کو ضرور موجود ہوگا۔ دوسرے ہی سگنل پر ادھر سے سگنل کا جواب ملنے لگا۔ میں نے خفیہ اشاروں کی زبان میں مجاہد جاسوس سے اپنا تعارف کرایا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ کمانڈو شیر باز سے کسی صورت ملاقات کر سکتا ہے ادھر سے جواب آیا۔ اگر کوئی ایمرجینسی ہے تو شیر باز سے رابطہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا میرا ایک پیغام اس تک پہنچا دینا۔ پھر میں نے اسے مختصر اشاروں میں پیغام دیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے پاکستان جا رہا ہوں شیر باز سے کہنا واپس آتے ہی میں خود اسے ملوں گا۔

یہ پیغام دینے کے بعد مجھے اطمینان ہوگیا۔

بالا جی راؤ نے مجھے بریف کرتے ہوئے کہا۔
"تمہارے اسلام آباد والے فلیٹ میں جو آدمی مسلمان بن کر تمہارے کاروباری پارٹنر کی حیثیت سے رہ رہا ہے وہ ہمارے سفارت خانے کا خاص جاسوس ہے جس کا نام سفارتی عملے کی لسٹ پر نہیں ہے۔ مگر اس کا انڈین سفارت خانے کے ساتھ برابر رابطہ رہتا ہے۔ وہ تمہاری طرح ہندو ہے۔ مرہٹہ ہے مگر ہندی' اردو' پنجابی' سندھی اور انگریزی بڑی روانی سے بول لیتا ہے۔ اس کا نام پلوسکر ہے۔ تمہارا پورا تعارف اس سے خفیہ طریقے سے کرا دیا گیا ہے۔ وہاں وہ امجد خان کے نام سے رہ رہا ہے۔ تم لوگوں کو جموں کشمیر کے خفیہ پہاڑی راستوں سے پاکستان پہنچایا جائے گا۔"
میں نے کہا۔
"ہمیں یہاں سے کس وقت نکلنا ہو گا۔"
بالا جی راؤ کہنے لگا۔
"کسی وقت بھی تم لوگ نکل سکتے ہو۔ لیکن پاکستان میں تمہیں آدھی رات کے وقت پہنچایا جائے گا تم آج رات کی ٹرین سے بمبئی سے جموں روانہ ہو جاؤ گے۔ اور گائیڈ بمبئی ہی سے تمہارے ساتھ چلے گا۔ وہی تمہیں بارڈر کراس کرائے گا۔"

دوپہر کے بعد گائیڈ بھی آ گیا۔ یہ ہندو ڈوگرا تھا اور جموں کشمیر کی سرحدوں پہاڑی علاقے کا چوہا تھا اسے ایک ایک گھاٹی اور ایک ایک ٹیلے کا علم تھا۔ وہ پہلے بھی دہشت گردوں کو بارڈر پار کرا چکا تھا۔ اس کا نام خدا جانے کیا تھا۔ بالا جی نے اسے بنواری کے نام سے مخاطب کیا تھا اور اس نام سے میرے ساتھ بھی اس کا تعارف کرایا تھا۔ ہم رات کی گاڑی سے جموں توی ایکسپریس میں بیٹھ گئے اور جموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے ساتھ تین قاتل دہشت گرد اور ایک ہمارا گائیڈ ڈوگر بنواری تھا۔ یہ پہاڑیا تھا اور جموں کشمیر کے پہاڑی جنگلوں کے

چپے چپے سے واقف تھا۔ ہم جموں پہنچ گئے۔ یہاں سے بنواری ہمیں گائیڈ کرنے لگا۔ رات ہم نے شہر سے باہر ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں گزاری۔ دوسرے روز منہ اندھیرے ہم ایک لاری میں سوار ہوگئے۔ ہمارے ٹکٹ بھی بنواری نے لیے اور اس کو معلوم تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کس جگہ سے لاری سے اتر جانا ہے۔

تیسرے پہر تک ہم نے تین لاریاں بدلیں۔ چوتھی بار ایک جگہ سے ہمیں خچر مل گئے۔ وہاں پانچ خچر پہلے سے موجود تھے۔ ہم ان پر بیٹھ کر پہاڑی علاقے میں چل پڑے۔ سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا ہونے تک ہم اونچے نیچے پہاڑی رستوں پر چلتے رہے۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو ہمارے گائیڈ بنواری نے کہا۔

"یہاں ہم رات بسر کریں گے۔"

رات ہم نے ایک ٹیلے کے دامن میں گزار دی۔ دوسرے دن پھر سفر پر چل پڑے۔ وہ سارا دن بھی پہاڑیوں کی گھاٹیوں اور دشوار گزار کھڈوں میں سفر کرتے گزر گیا۔ جب سورج چھپ گیا تو بنواری نے مجھ سے کہا۔

"ہم پاکستان کے بارڈر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے میں تم لوگوں سے جدا ہو جاؤں گا آدھی رات کے بعد ایک آدمی آئے گا وہ تمہیں بارڈر کے پار پہنچا دے گا۔"

ہم ایک ایسے علاقے میں آکر ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے جہاں ہماری دونوں جانب اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں کوئی ٹیلہ یا اونچے درخت نظر نہیں آ رہے تھے۔ آسمان کے تارے دور تک دکھائی دے رہے تھے بنواری کہنے لگا۔

"آگے ایک ندی ہے اس کی دوسری طرف پاکستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں پاکستان کی سیکورٹی کا زبردست انتظام ہے۔ مگر ہمارا آدمی ہمیں ایک

خاص سرنگ کے اندر سے نکال کر پاکستان پہنچا دے گا۔"

آدھی رات کے بعد دوسرا گائیڈ آ گیا۔ ہمیں اس کے حوالے کر کے ڈوگرہ گائیڈ واپس چلا گیا۔ دوسرے گائیڈ نے اندھیرے میں ہمارے قریب ہو کر زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم میں سے کون پانی کے اندر زیادہ دیر تک غوطہ لگا سکتا ہے؟"

تینوں قاتلوں نے کہا کہ وہ بڑے اچھے تیراک ہیں اور کافی دیر تک پانی کے اندر رہ سکتے ہیں۔ گائیڈ بولا۔

"پھر ٹھیک ہے زیادہ نہیں تم لوگوں کو صرف تین منٹ تک پانی کے نیچے رہ کر ندی کراس کرنی ہوگی۔"

میرا سانس بھی بڑا پکا تھا۔ میں تیراک بھی بڑا اچھا تھا۔ ہم ایک جگہ سے ندی میں اتر گئے۔ نیا گائیڈ ہمارے آگے آگے تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ ندی میں غوطہ لگاؤ۔ اس سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ندی کا پانی سرد تھا۔ اوپر سے سرد رات تھی تین پونے تین منٹ تک پانی کے اندر ہی اندر چلنے کے بعد جب باہر نکلے تو تینوں قاتلوں کی حالت خراب تھی۔ وہ تینوں سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگے نئے گائیڈ نے سرگوشی میں کہا۔

"اٹھ کر چلو۔ ادھر رکو گے تو پاکستانی رینجرز کی مشین گن تمہیں بھسم کر ڈالے گی۔"

پاکستانی رینجرز کا نام سن کر تینوں دہشت گرد جلدی سے اٹھ کر اندھیرے میں چلنے لگے۔ ہمیں ایک جگہ پہنچا کر گائیڈ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ جاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"اب تم لوگ پاکستان میں کھڑے ہو۔"

یہ کون سا علاقہ تھا؟ قریبی شہر کون سا تھا؟ اس کو چھوڑیں بہرحال میں ان تین قاتل دہشت گردوں کو لے کر اسلام آباد کے علاقے میں پہنچ گیا۔ تینوں کو پہاڑی علاقے کی ایک سرنگ میں چھپے رہنے کی ہدایت کی اور خود اپنے بنگلے نما چھوٹے سے خوبصورت فلیٹ پر آ گیا۔ میرا نقلی شریک کاروبار مرہٹہ پلوسکر وہاں پہلے سے بیٹھا تھا۔ چپڑاسی بھی بدل گیا تھا۔ دفتر اور بنگلے کے در و دیوار شکستگی سے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میرے زمانے میں ایک ٹائپسٹ دفتر میں ہوتا تھا اب وہاں ٹائپ کی مشین بھی نہیں تھا۔ بھارتی سفارت خانے کے جاسوس پلوسکر نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور پوچھا۔

"اپنے آدمی کہاں ہیں؟"

مجھے اس پر بڑا غصہ آیا کہ میرے بنگلے اور آفس میں مالک بن کر بیٹھا ہوا ہے اور آتے ہی منہ پھاڑ کر قاتل دہشت گردوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں نے دل میں کہا۔ کوئی بات نہیں ایسی خبر لوں گا کہ اگر بچ گیا تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔ میں نے کہا۔

"وہ جنگل والی سرنگ میں ہیں۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہو گا کہ جنگل والی سرنگ کہاں ہے۔"

پلوسکر نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"دھرم چند جی! مجھے یہاں جاسوسی کرتے ایک عرصہ گزر گیا ہے یہاں کے پہاڑی علاقے کی ایک ایک سرنگ سے واقف ہوں۔ تم بتاؤ یہ سرنگ لال ٹیکری

والی سرنگ تو نہیں؟"

اس نے ٹھیک جگہ کا نام لیا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اب ان لوگوں کو وہاں کھانا پانی پہنچانے کا کام تمہارے ذمے ہے۔ وہ لوگ رات کو وہاں نہیں رہ سکتے۔ اس سردی میں ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ ان کا کوئی دوسرا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"نو پرابلم ہو جائے گا۔"

مرہٹہ جاسوس پلوسکر مجھ سے ایک ہزار روپیہ لے کر چلا گیا۔ میں نے اپنے کچھ پرانے دوستوں کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ مجھے کاروبار کے سلسلے میں اس بار یورپ امریکہ میں بہت دیر تک رہنا پڑ گیا تھا۔ اب واپس آ گیا ہوں۔ لیکن میں نے ان میں سے کسی کو اپنے ہاں آنے کی دعوت نہ دی اور کہا کہ میں کاروبار کو سیٹ کر لوں پھر پرانی محفلوں کی یاد تازہ کریں گے۔ میرے یہ نئے امیر بنے ہوئے ایسے کاروباری دوست تھے کہ جو مجھے صرف میری دعوتوں کی وجہ سے مجھے ملتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ یہ دعوتیں ملتوی ہو گئی ہیں تو انہوں نے بھی مجھے دوبارہ فون کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اس دفعہ مجھے اوپر سے ہدایت کر کے بھیجا گیا تھا کہ اسلام آباد میں زیادہ لوگوں سے میل جول نہ رکھوں تاکہ دہشت گردی کا کام یک سوئی سے جاری رکھ سکوں۔ مرہٹہ جاسوس پلوسکر نے تینوں قاتلوں کو ایک گاؤں میں کچا مکان لے کر دے دیا تھا جہاں وہ پنجاب سے محنت مزدوری کرنے آئے ہوئے محنت کش بن کر رہنے لگے تھے۔ چھ سات دن گزر گئے۔

اس دوران مرہٹہ جاسوس پلوسکر نے مجھے دہشت گردی کا پہلا منصوبہ بنا کر پیش کر دیا۔ یہ منصوبہ خالص دہشت گردی کا منصوبہ تھا جس کے مطابق ان قاتلوں کو راولپنڈی کے کسی عام درمیانہ درجے کے شہری کے گھر میں گھس کر گھر کے سارے افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کا مقصد محض دہشت

اور افراتفری پھیلانا تھا۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کی وارداتوں سے ایک دہشت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور اقتصادی ترقی کے عمل میں زبردست رکاوٹ آ جاتی ہے جب اوپر تلے ایسی وارداتیں ہونے لگیں تو عوام کے لیے دیانت داری سے تعمیر و ترقی کا کام کرنے والی حکومت بھی پریشان ہو جاتی ہے لوگ حکومت کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعی قتل اور اجتماعی آبرو ریزی کی وارداتوں پر دشمن کا مقصد حکومت کے ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ ڈالنا اور لوگوں کو حکومت کے خلاف بدزبان کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد مختلف مذہبی فرقوں کی آپس میں جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ملک کی فضا انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی ناپاک عزائم لے کر ان تین دہشت گرد قاتلوں کو پاکستان میں بھیجا گیا تھا۔ جس کی راہ نمائی مرہٹہ جاسوس پلوسکر نے کرنی تھی اور جس کی نگرانی کی ذمے داری مجھ پر عائد کی گئی تھی۔

میں نے پہلی واردات کی سکیم دیکھی تو پلوسکر سے پوچھا۔

"اس واردات کے لیے تم نے راولپنڈی کے کس گھر کا انتخاب کیا ہے؟"

وہ اس وقت میرے فلیٹ کے ڈرائینگ روم میں صوفے پر ٹانگیں پسارے میرے پاس ہی بیٹھا سکاچ کا پیگ بنا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"آج کسی وقت پنڈی جاتے ہیں وہاں ہزاروں گھر ہیں کسی ایک گھر پر نشان لگا دیں گے جو زیادہ بال بچوں والا گھر ہو۔ اس قسم کے گھروں میں واردات کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ وہاں رات کو کوئی گارڈ بھی نہیں ہوتا۔ اسلام آباد کی کوٹھیوں میں تو کلاشنکوفوں والے گارڈ رات کو پہرہ دیتے ہیں ویسے بھی ہم پاکستان کے مڈل کلاس کے طبقے میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں۔ یہی طبقہ حکومتیں بناتا ہے اور ختم کرتا ہے۔"

مرہٹہ جاسوس نے سکاچ کا گھونٹ پینے کے بعد سگریٹ کا کش لگایا اور بولا۔

"مگر نہیں یہ کام میں اکیلا ہی کروں گا۔ مجھے سراغ لگانا ہو گا کہ کس گھر میں

زیادہ بال بچے رہتے ہیں۔ ان کو قتل کرنے میں آسانی بھی ہوگی اور شہر میں دہشت بھی زیادہ پھیلے گی۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ سروے کرنے وہ اکیلا جائے۔ کیونکہ اس دوران میں لاہور ملک صاحب سے رابطہ کر کے انہیں اس سکیم سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے پلوسکر تم اکیلے ہی جانا۔ مگر کوئی ایسا مکان دیکھ کر آنا جہاں سے ہمارے آدمیوں کو فرار ہونے کا موقع مل جائے۔"

وہ بولا۔ "وہاں کون سی رات کو پولیس کی گارڈ بیٹھی ہوگی ہمارے آدمی واردات کے بعد بڑے آرام سے نکل آئیں گے اور پھر ہم باہر جیپ لے کر تیار کھڑے ہوں گے۔"

میں نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت پلوسکر سے کہا۔

"پلوسکر تم شراب کم از کم دن کے وقت مت پیا کرو۔ یہ عادت ہمارے مشن کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

پلوسکر نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

دھرم چند تم ابھی اس لائن میں نئے نئے آئے ہو۔ میں شراب پی کر پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتا ہوں۔"

میں نے دل میں کہا میری طرف سے پی پی کر بے شک مر جا میں تو تمہارے خلاف نوٹس تیار کر رہا ہوں۔ شراب کے دو پیگ پینے کے بعد پلوسکر یہ کہہ کر چلا گیا کہ مجھے اسلحہ کا انتظام کرنے بھارت سفارت خانے کے ایک آدمی سے ملنے جانا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لاہور میں ملک صاحب کو فون کر دیا۔ ان سے میری بات چیت پاکستان میں میرے داخل ہونے کے دوسرے ہی دن ہوگئی تھی اور میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں شیو سینا کی دہشت گردی کے ایک خاص مشن پر آیا ہوں۔ باقی باتیں آپ کو زبانی بیان کروں گا۔ اب وقت آگیا تھا

کہ انہیں راولپنڈی میں ہونے والے اجتماعی قتل کے منصوبے سے آگاہ کر دیا جائے۔ ٹیلی فون میں نے ملک صاحب کے خاص موبائیل کے نمبر پر کیا تھا۔

ان کی آواز آئی۔

"یس"

وہ کبھی فون اٹھاتے اور دوسرے سے مخاطب ہوتے وقت اپنا نام نہیں بتاتے تھے۔ میں نے کہا۔

"میں حیدر علی بول رہا ہوں۔"

پاکستان میں رہ کر مجھے ٹیلی فون پر ملک صاحب یا بٹ صاحب کے خفیہ کوڈ یا اشاروں کی زبان میں بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ میرا ملک تھا اور میں جو کچھ کر رہا تھا اپنے وطن اپنے ملک پاکستان کی سلامتی اور اس کے استحکام کے لیے کر رہا تھا۔ ملک صاحب نے پوچھا۔

"کوئی نئی بات حیدر علی؟"

میں نے کہا۔

"آپ پہلی فلائیٹ پکڑیں اور اسلام آباد پہنچ جائیں آپ سے بڑے اہم مسئلے پر بات کرنی ہے۔"

ملک صاحب نے کہا کہ وہ بڑی جلدی اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔ ہم نے ملاقات کے لیے ایک ریستوران کا بھی انتخاب کر لیا۔ یہاں ہم اس سے پہلے بھی آپس میں میٹنگیں کیا کرتے تھے۔ ملک صاحب نے کہا تھا کہ میں اپنے آفس میں ہی رہوں وہ لاہور سے روانہ ہوتے وقت مجھے فون کر دیں گے۔

مرہٹہ جاسوس پلاسکر جا چکا تھا میں آفس میں اکیلا تھا۔ مجھے ایک خفیہ اشاروں کی زبان یعنی کوڈ زبان سکھا دی گئی تھی جس زبان میں ہم دلی یا بمبئی ڈیفنس انٹیلی جینس چیف یا بال ٹھاکرے کو رپورٹ لکھ کر بھارتی سفارت خانے کے ذریعے پہنچا سکتے تھے۔ یہ ایسی زبان تھی کہ جسے سوائے میرے' بال ٹھاکرے

اور ڈیفنس انٹیلی جینس چیف کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ بڑی محفوظ زبان ہوتی ہے۔ اس خفیہ محفوظ زبان میں بھارتی سفارت خانے کے ایک دو خاص آدمی جو حکومت کی طرف سے متعین کیے گئے ہوتے ہیں اپنی حکومت کو سفارت خانے کے مختلف سیکرٹریوں اور بعض اوقات خود سفیر کے بارے میں اپنے ملک کی متعلقہ وزارت کو ان لوگوں کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹ بھیجتے ہیں۔ یہ رپورٹ سفارتی تھیلے کی ڈاک میں ہی جاتی ہے مگر چونکہ خفیہ زبان میں لکھی ہوتی ہے اس لیے خود سفیر بھی اس سے بے خبر رہتا ہے۔ یہ کوئی اشاروں کی زبان نہیں ہوتی۔ اس کی عبارت عام خطوں والی عبارت ہوتی ہے مثلاً" لکھا ہوتا ہے کہ سب کام بہت خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے سب لوگ اپنی اپنی ذمے داریاں پوری دیانت داری سے نبھاہ رہے ہیں۔ کچھ ملکی حالات پر تبصرہ ہوتا ہے لیکن اس عبارت کے اندر بعض الفاظ کی نشست ایسی ہوتی ہے کہ ان کو وہاں سے نکال کر جب ایک جگہ جوڑا جاتا ہے اور پھر ان الفاظ کا کلیدی کوڈ بک کی راہنمائی میں ڈی کوڈ کیا جاتا ہے یعنی کھولا جاتا ہے تو وہ عبارت سامنے آ جاتی ہے جو لکھنے والے کا اصل مقصد ہوتا ہے۔

میں نے اسی وقت اس خاص خفیہ زبان میں ایک مختصر سی رپورٹ لکھی جس میں لکھا کہ پلوسکر کی بعض غیر ذمے دارانہ حرکات سے ہمارے مشن کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ پلوسکر بڑا دیش بھگت ہے' دیانتدار ہے مگر وہ دن کے وقت بھی شراب پیتا ہے اور شراب پی کر وہ نہ صرف غیر ذمے داری کی باتیں کرنے لگتا ہے بلکہ اس سے غلط فیصلے بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ اسے کسی طریقے سے سمجھایا جائے۔ میرا پلوسکر کو یہ کہنا کہ وہ دن کے وقت شراب نہ پیا کرے اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یہ خط میں نے جس طرح لکھا تھا اس کو کوئی بھی ہندی جاننے والا پڑھتا تو اسے اس میں یہی لکھا ہوا ملتا کہ ہم اپنے مشن پر پوری توجہ دے رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی انتشار کی کیفیت ہے۔ اپنے سفارت خانے

کا عملہ ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ اس خط کو سفارتی تھیلے میں بند کرنے سے پہلے پریس سیکرٹری نے ضرور پڑھنا تھا۔ خط لکھ کر میں نے لفافے میں بند کیا اور گاڑی نکال کر خود بھارت کے سفارت خانے جا کر پریس سیکرٹری کے حوالے کر دیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو پہلا سوال یہ کیا۔

"دھرم چند جی! تمہیں دن کے وقت کھلے بندوں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ خفیہ پولیس ضرور تمہارا پیچھا کر رہی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "میں کہہ دوں گا کہ ویزا لگوانے آیا تھا۔"

میں بے دھڑک بھارتی سفارت خانے میں چلا گیا تھا کہ مجھے تو کسی قسم کا ڈر نہیں تھا۔ پاکستان کی انٹیلی جینس مجھے جانتی تھی اور ان سب کو معلوم تھا کہ میں کون ہوں اور پاکستان کی سلامتی کے لیے کیا کچھ کر رہا ہوں۔ یہ خط بال ٹھاکرے کو پہنچانا بہت ضروری تھا تاکہ آگے چل کر جو کچھ میں نے کرنا تھا اس کے لیے جواز پیدا ہو سکے۔ میں سفارت خانے سے واپس اپنے فلیٹ پر آیا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ملک صاحب کی آواز سنائی دی۔

"میں لاہور سے روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ فون میں لاہور ائیرپورٹ سے کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آدھ گھنٹے کے بعد ریستوران میں پہنچ جاؤں گا۔"

جیٹ طیارے پر یہ فلائیٹ زیادہ سے زیادہ تیس منٹ کی تھی۔ اسلام آباد ائیرپورٹ پر ملک صاحب کی گاڑی موجود ہوگی وہ وہاں سے سیدھا ریستوران آ جائیں گے۔ آدھا گھنٹہ میں نے اپنے آفس میں ہی گزار دیا۔ اس کے بعد اپنی پرانی گاڑی نکال کر میں طے شدہ ریستوران کی طرف چل پڑا۔

یہ ریستوران اسلام آباد کے مضافات میں تھا اور یہاں گاہکوں کا کبھی بھی

رش نہیں ہوتا تھا۔ ریستوران تقریباً خالی پڑا تھا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی ٹیبل پر کافی منگوا کر پینے لگا اور اخبار پڑھنے لگا۔ وہاں سے سڑک صاف نظر آتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں سڑک کو دیکھ لیتا تھا۔ آخر مجھے ایک گاڑی نظر پڑی۔ وہ ریستوران کے پارکنگ میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس میں سے ملک صاحب باہر نکلے اور دروازہ لاک کرنے کے بعد ریستوران میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے دور سے مجھے دیکھ لیا اور میرے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

"حیدر علی! تم نے دشمن کے میزائیلوں کے اڈے کو تباہ کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

میں نے کہا۔ "ملک صاحب ایک محب وطن پاکستانی ہونے کے ناطے یہ میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔ میں انشاء اللہ آئندہ بھی اپنے فرائض انجام دیتا رہوں گا۔"

وہ بولے۔ "اب کیا صورت حال ہے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میرے ساتھ بھارت کے تین بڑے قاتل قسم کے ہندو دہشت گرد یہاں آئے ہوئے ہیں۔ انہیں ایک گاؤں میں رکھا گیا ہے۔ ایک مرہٹہ پلوسکر یہاں بھارتی سفارت خانے کے توسط سے جاسوسی کرتا ہے۔ اس نے پنڈی شہر میں ایک گھر کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں اس منصوبے کی نگرانی کر رہا ہوں۔ ملک صاحب کہنے لگے۔

"یہ آدمی جس کا نام تم نے پلوسکر بتایا ہے ہماری انٹیلی جینس کی نگاہ میں ہے۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بھارت کی انٹیلی جینس اور بال ٹھاکرے کو مجھ پر پورا اعتماد ہے۔ کم از کم میں ابھی تک یہی سمجھتا ہوں۔ لیکن کسی کسی وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کی جا رہی ہے اور میں ان کی نگاہوں میں آ رہا ہوں۔ اس کی وجہ آپ بھی جانتے ہیں کہ اس سے پہلے میں بھارت کے کئی

دہشت گرد گرفتار اور ہلاک کروا چکا ہوں۔ اس بار ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔ کوئی ایسی سکیم تیار کریں کہ جب یہ قاتل دہشت گرد پنڈی کے مکان میں اہل خانہ کو قتل کرنے جائیں تو گھر کے افراد کو بھی بچا لیا جائے اور یہ لوگ بھی بچ کر نہ نکل سکیں۔"

ملک صاحب کہنے لگے۔

"یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم وقت سے پہلے اس گھر کے تمام افراد کو وہاں سے نکال کر وہاں اپنے سی آئی اے کے آدمی اور دو تین عورتیں اور بچے سلا دیں گے۔ مردوں کے پاس باقاعدہ اسلحہ ہوگا اور وہ جاگ رہے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ آپ اس آپریشن میں تینوں بھارتی دہشت گردوں کو ہلاک کریں۔ صرف ایک دہشت گرد کو ہلاک کریں اور وہ بھی اس طرح کہ وہ جوابی فائرنگ سے گھبرا کر نکل کر گلی میں بھاگیں اور آپ کے آدمی جو سفید کپڑوں میں ہوں گے شور مچاتے ان کا پیچھا کریں اور کم از کم ایک دہشت گرد ضرور مار گرائیں۔ باقی دو کو فرار ہونے کا موقع دیں۔ کیا آپ ایسا انتظام کر لیں گے؟"

ملک صاحب نے کہا۔

"کیوں نہیں آپ جس طرح کہتے ہیں ہم اسی طرح کریں گے۔ آپ صرف کچھ وقت پہلے ہمیں اس مکان کی نشاندہی کرا دیں۔ جہاں رات کو دہشت گرد حملہ کرنے آئیں گے۔"

میں نے کہا۔

"یہ میں آپ کو آج شام کو ہی بتا دوں گا آپ اسلام آباد میں ہی رہیں مجھے اپنا یہاں کا فون نمبر دے دیں۔"

ملک صاحب نے ایک چٹ پر فون نمبر ملا کر مجھے دیا اور کہا۔ "اس نمبر پر میں آپ کو ہروقت مل سکوں گا۔"

کچھ دیر میرے پاس بیٹھنے کے بعد ملک صاحب چلے گئے۔ دوپہر کے بعد مرہٹہ جاسوس پلوسکر واپس آگیا۔ آتے ہی مجھے کمرے میں لے گیا۔ اور بولا۔

"دھرم چند جی! میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے ایک مکان دیکھ لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے چل کر دکھاؤ۔"

وہ بولا۔ "تمہارے دیکھنے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے پھر بھی اگر تم ضرور دیکھنا چاہتے ہو تو ابھی میرے ساتھ پنڈی چلے چلو۔"

میں نے کہا۔ "پلوسکر جی! بال ٹھاکرے جی نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں اس مشن کی نگرانی کروں۔ اگر کوئی حرج مرج ہوگیا تو وہ مجھے پکڑیں گے آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

وہ بولا۔ "شریمان جی! میں کب انکار کر رہا ہوں چلئے میرے ساتھ۔"

ہم پلوسکر کی کھٹارا گاڑی میں بیٹھ کر اسلام آباد سے راولپنڈی آ گئے۔ یہاں بھائیوں والے باغ کی آبادی کے کونے میں ایک دو منزلہ مکان سب سے الگ کھڑا تھا۔ کم بخت پلوسکر نے بڑا موزوں مکان چنا تھا۔ ہم سڑک کی ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ پلوسکر نے مجھے اشارہ کیے بغیر مکان دکھایا اور بولا۔

"اس مکان میں میری اطلاع کے مطابق ایک ریٹائرڈ ریلوے سٹیشن ماسٹر بیوی بہو' بڑے بیٹے' دو بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ آج کل اس کے دوسرے دو بیٹے بھی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اس طرح سے اہل خانہ کی تعداد سات بن جاتی ہے۔ ہم ان ساتوں افراد کو قتل کریں گے۔ ریٹائرڈ سٹیشن ماسٹر شیعہ ہے۔ اس کے اور اس کے سارے اہل خانہ کے قتل سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ انہیں کسی سنی نے قتل کیا ہے اس طرح سے دونوں فرقوں کے درمیان منافرت اور

دشمنی اور زیادہ بڑھے گی اور اور شیعہ لوگ سینوں کو بدلہ لینے کے لیے قتل کر دیں گے۔"

پلوسکر بڑی مکاری سے ہنس رہا تھا۔ میں نے مکان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کوئی سیکورٹی گارڈ وغیرہ تو نہیں ہیں۔"

"ارے نہیں دھرم چند جی! یہ مڈل کلاس کے محنت کش لوگ ہیں۔ ان کا اپنا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے یہ سیکورٹی گارڈ کہاں رکھ سکتے ہیں۔ رات کو صرف ایک چوکیدار لٹھ لے کر کبھی کبھی آواز لگاتا اس طرف آ جاتا ہے اسے ہم پہلے ہی قابو میں کر لیں گے۔"

واردات کا وقت کیا مقرر کیا ہے؟"

"پچھلے پہر رات کے تین بجے۔ اس وقت گھر کے لوگ گہری نیند سو رہے ہوں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ واردات آج رات کرنے کا پروگرام ہے یا کل رات؟"

جاسوس پلوسکر بولا۔

"مہاراج شبھ کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے تینوں آدمیوں کو اسلحہ وغیرہ دے کر بالکل تیار کر دیا ہے۔ یہ کام آج رات ہی ہو جائے گا۔ کل ضمیمے بازار میں آ جائیں گے اور شہر میں افراتفری پھیل جائے گی لوگ حکومت اور پولیس کو گالیاں دے رہے ہوں گے اور دوسرے فرقے کے لوگ اپنے شیعہ لوگوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اپنے سینوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔"

مرہٹہ جاسوس کے چہرے پر مکار مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ ہمیں یہ واردات آج رات ہی کر دینی چاہیے۔"

ہم گاڑی میں بیٹھے باتیں کرتے واپس اسلام آباد آ گئے۔ میں نے پلوسکر سے کہا۔

"تم اب یہاں سے سیدھا گاؤں اپنے آدمیوں کے پاس جاؤ۔ کیا تم نے انہیں واردات والا مکان دکھا دیا ہے؟"

پلوسکر بولا۔ "ابھی نہیں لیکن میں یہی کام کرنے جا رہا ہوں۔ تینوں کو اپنے ساتھ لا کر جائے واردات پر آؤں گا اور یہ بھی بتا دوں گا کہ وہ پچھلی طرف جو درخت ہے اس کے ذریعے مکان کی چھت پر چڑھیں گے اور وہیں سے مکان کے کمرے میں آ کر چارپائیوں پر لحافوں میں سوئے ہوئے سارے آدمیوں عورتوں اور بچوں کو کلاشنکوفوں کے برسٹ مار کر ہلاک کر ڈالیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اس بات کی انہیں تاکید کرنی ہوگی۔ کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔"

پلوسکر سگریٹ کی راکھ چٹکی مار کر گراتے ہوئے بولا۔

"مہاراج! ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ ہمارے آدمی بڑے پیشہ ور خونی ہیں۔"

اس کے بعد پلوسکر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے ملک صاحب کو فون کرکے کہا کہ وہ بھائیوں والے باغ کی آبادی میں مشرقی کونے کی جانب گلی کے کونے پر جو دو منزلہ سبز کھڑکیوں والا مکان ہے اس کے سامنے والی بڑی سڑک پر آ جائیں۔ میں گاڑی لے کر وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

دس منٹ بعد میں اور ملک صاحب جائے واردات پر اس مکان سے کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑے تھے جہاں آج رات کو اجتماعی قتل کی واردات طے پا چکی تھی۔ ملک صاحب نے مکان کو اچھی طرح سے دیکھ لیا تھا۔ ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو ملک صاحب نے ایک باغ کے کونے میں گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور کہا۔

"میرا تمہارے ساتھ تمہارے گھر تک جانا ٹھیک مناسب نہیں۔ پلوسکر اگر وہاں موجود ہوا تو وہ ایک اجنبی کو ساتھ دیکھ کر شک کر سکتا ہے۔ تم یہاں سے ٹیکسی لے کر چلے جانا۔ باقی تم کسی بات کا فکر نہ کرو۔ اس وقت شام کے ۶ بجے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ رات کے نو بجے تک اس مکان کے اصلی آدمی سارے کے سارے یہاں سے شفٹ ہو کر دوسری جگہ پہنچ چکے ہوں گے اور ان کی جگہ ہمارے آدمی اور عورتیں اور ان کے بچے مکان میں آ چکے ہوں گے۔"

میں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی مارا جائے وہ لوگ تو اندر آتے ہی چارپائیوں پر سو رہے لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیں گے۔"

ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حیدر علی! ہم لوگ پیشہ ور اہل کار ہیں جس وقت دہشت گرد مکان کے کمرے میں داخل ہوں گے تو چارپائیوں پر لحافوں کے اندر کوئی آدمی یا عورت یا بچہ نہیں ہوگا۔ لحافوں کے اندر پرانے تکیے اس طرح ڈال دیے گئے ہوں گے کہ لگے گا کہ آدمی گہری نیند سو رہے ہیں۔ جب دہشت گرد فائرنگ کرنے کے بعد یہ یقین کر کے کہ سارے لوگ مارے جا چکے ہیں وہاں سے بھاگیں گے تو ہماری پولیس نے سارے علاقے کا محاصرہ کر رکھا ہوگا مگر یہ پولیس سفید کپڑوں میں ہوگی تاکہ انہیں یہی معلوم ہو کہ محلے کے لوگ ہیں جو ان کا پیچھا کر رہے ہیں تم یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

ملک صاحب گاڑی لے کر چلے گئے۔ میں ٹیکسی لے کر اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔ میں نے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو کھانا وغیرہ پکاتی تھی۔ وہ کھانا پکا کر شام کو ہی جا چکی تھی۔ میں نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ رات گزرتی جا رہی تھی رات کے گیارہ بجے پلوسکر آ گیا۔ میں نے فرضی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے آدمی کہاں ہیں؟"

وہ بولا۔ "انہیں بالکل تیاری کی حالت میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ وہ دوپہر سے لے کر اس وقت تک سوتے رہے تھے۔ اب نہیں سوئیں گے۔ تینوں آدمیوں کو خفیہ مقام سے ساتھ لیں گے اور جائے واردات پر پہنچ جائیں گے۔"

"پلوسکر میں تمہیں آج رات شراب پینے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم ڈیوٹی پر ہو اور کوئی بھی ذمے دار کارکن ڈیوٹی کے دوران شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا۔"

پلوسکر نے برا سامنہ بناتے ہوئے شراب کا کواٹر جیب میں ڈال لیا اور بولا۔

"دھرم چند جی! تم ایسا ذمے دار انٹیلی جینس افسر میں نے آج ہی دیکھا ہے۔ ٹھیک ہے میں آج دارو نہیں پیوں گا۔ میرا خیال ہے ہمیں بھی کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔ ایک بجے رات کا الارم لگا دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔"

یہ کہہ کر مرہٹہ جاسوس صوفے سے اٹھا۔ کارنس پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کا اس نے ایک بجے کا الارم لگایا اور سامنے والے دیوان پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس آدمی میں جانوروں والی صفات زیادہ تھیں۔ یہ شخص ہر وقت کھانا کھا سکتا تھا۔ جس وقت چاہے سو سکتا تھا۔ ہر گھر کو اپنا گھر سمجھ کر وہاں کی چیزیں بے تکلفی سے استعمال کرنے لگتا تھا۔ چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے وہ خراٹے لینے لگا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ پہلے سے پی کر آیا ہے۔ اس کی یہ غیر ذمے داری کی حرکتیں بال ٹھاکرے اور بھارتی ڈیفنس انٹیلی جینس کے آگے میرے موقف کو مضبوط کرتی تھیں۔ اسی لیے میں نے پیش بندی کے طور پر اس کے بارے میں رپورٹ لکھ کر بال ٹھاکرے کو بھارتی سفارت خانے کی سفارتی ڈاک میں بمبئی پہنچا دی تھی۔ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ جائے واردات پر کسی بے گناہ پاکستانی شہری کا خون نہیں بہے گا بلکہ الٹا ایک بھارتی دہشت گرد ہی مارا جائے گا۔ اس کے باوجود نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں

بیڈ روم میں آ گیا۔ یہاں بھی میں نے ایک چھوٹا ٹیلی ویژن رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک چینل اون کیا اور بی بی سی کے پروگرام دیکھنے لگا۔ رات بڑی آہستہ آہستہ گزرتی محسوس ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے رات کے بارہ بجے پھر ایک بجا اور اس کے ساتھ ہی دوسرے کمرے کے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا۔ الارم کے شور کے باوجود پلوسکر گھوڑے بیچ کر سویا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہلا کر جگاتے ہوئے کہا۔

"الارم کیوں لگایا تھا اگر سوئے ہی رہنا تھا۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا ایک بج گیا رات کا؟"

میں نے کہا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ ابھی ہمیں اپنے آدمیوں کو بھی جا کر لینا ہے۔"

وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا اور بولا۔ "میں تیار ہوں چلو نکل چلتے ہیں۔"

دس منٹ بعد ہماری گاڑی اسلام آباد کے مضافات میں سے پہاڑیوں کی طرف تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ یہاں ایک خفیہ جگہ پر تینوں آدمی ایک مکان کے اندر لحاف اوڑھ کر سو رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"یہ سورمے بھی گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ جگاؤ انہیں۔"

جاسوس پلوسکر نے ان کے اوپر سے باری باری لحاف کھینچ لیے اور کہا۔

"جے بجرنگ بلی' جے بجرنگ بلی۔ اٹھو سورمو! اپنا اپنا اسلحہ چیک کرو۔"

تینوں قاتل جلدی جلدی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوٹھڑی میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ سب سے پہلے میں نے تینوں کلاشنکوفوں کو چیک کیا۔ میگزین بھرے ہوئے تھے۔ سیفٹی کیچ چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے دہشت گردوں سے کہا۔

"سیفٹی کیچ وہاں جا کر کھولنا نہ بھولنا۔"

ان میں سے ایک قاتل بولا۔

"مہاراج! بڑی کلاشنکوفیں چلائی ہیں۔ فکر نہ کریں۔ مکان میں ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے انہیں تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ لحاف اوڑھ کر سو رہے ہوں گے تمہارا کام ہے کہ ان سب پر گولیوں کے برسٹ مارتے جاؤ کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے' سمجھ گئے۔"

"سمجھ گئے مہاراج۔"

ایک قاتل نے جواب دیا۔ پلوسکر نے ان سے پوچھا۔ "خنجر بھی ساتھ رکھ لیے ہیں نا؟"

تینوں نے اپنے اپنے خنجر قمیض کے اندر سے نکال کر دکھائے۔

"خنجر بھی تیز کر کے رکھ لیے ہیں مہاراج۔ اگر وقت پر اسلحہ نہ چلا تو ان خنجروں سے ان سب کی گردنیں کاٹ ڈالیں گے مسلمانوں کو مارنے میں بڑا مزہ آتا ہے مہاراج۔"

"حرامیو! تم میں سے ایک تو ہر حالت میں ضرور کتے کی موت مرے گا۔ کاش میں باقی دونوں کو بھی مروا سکتا۔"

مگر یہ میری مجبوری تھی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ ان تینوں میں سے اس واردات کے موقع پر صرف ایک کو ہلاک کیا جائے۔ باقی دونوں کو زندہ گرفتار کر لیا جائے۔ ہماری اس واردات سے بھارتی سفارت خانے کی انٹیلی جینس پوری طرح باخبر تھی بلکہ پلوسکر کے ذریعے ہمیں بھارتی سفارت خانے کی پوری آشیرباد اور حمایت حاصل تھی مجھے معلوم تھا کہ واردات کے بعد ایک رپورٹ تو مجھے اوپر بھیجنی ہوگی اور دسری رپورٹ بھارتی سفارت خانے کی طرف سے بھارتی وزارت خارجہ کو جائے گی۔

ہم لوگ پوری طرح سے تیار ہو کر جائے واردات کی جانب روانہ ہو گئے۔ رات بڑی سرد تھی۔ پنڈی اسلام آباد میں زیادہ سردی ہوتی ہے۔ راولپنڈی کی

سڑکیں آدھی رات کے بعد سنسان تھیں کسی کسی وقت کوئی گاڑی اسلام آباد کی طرف جاتی نظر آ جاتی تھی۔ ہم لوگ ٹھیک پونے تین بجے موقع پر پہنچ گئے۔ ہمیں کچھ فاصلے پر چھپ کر اس خونی واردات کا دور سے مشاہدہ کرنا تھا۔ تینوں دہشت گرد بھارتی قاتلوں نے پوٹھوہار کے علاقے کا لباس یعنی شلواریں لمبی قمیض اور گرم سویٹر پہن رکھے تھے اوپر کھیس لیے ہوئے تھے جن کے اندر کلاشنکوفیں چھپائی ہوئے تھیں۔ ہم نے انہیں خاص مکان سے چند قدم پیچھے اتار دیا۔ مکان کا پورا محل وقوع انہیں معلوم تھا اور وہ درخت بھی انہیں دکھا دیا ہوا تھا جس پر چڑھ کر انہوں نے مکان کی چھت پر جانا تھا۔

چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ وہاں سے کوئی چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم ایک طرف اندھیرے میں کار کھڑی کر کے اس کے اندر چھپ کر بیٹھے تھے پلوسکر کہنے لگا۔

"آج چوکیدار بھی کہیں نظر نہیں آ رہا۔ میرا خیال تھا کہ اسے سب سے پہلے قتل کرنا پڑے گا مگر لگتا ہے شاید آج وہ بیمار ہے۔ اس کی موت نہیں لکھی ہوئی تھی۔"

میں سمجھ گیا کہ چوکیدار کو ملک صاحب کی خفیہ پولیس نے ادھر ادھر کر دیا ہے۔ میں دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ مکان کے اندر کوئی پاکستانی ہلاک نہ ہو جائے۔ سڑک پر ایک جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بتیاں روشن تھیں جن کی روشنی سردی اور دھند کی وجہ سے دھندلی دھندلی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں ہم نے تینوں بھارتی دہشت گردوں کو تیزی سے دوڑتے ہوئے اندھرے میں گم ہوتے دیکھا۔ اسی جانب مکان کا پچھواڑا تھا جہاں درخت پر چڑھ کر انہوں نے مکان کی چھت پر کودنا تھا۔ اب مجھے فائرنگ کے دھماکوں کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری پولیس کے آدمی سویلین کپڑوں میں مکان کے باہر مکان کے اندر اور مکان کے آس پاس اسلحہ لیے موجود ہوں گے۔

اگرچہ مجھے ان میں سے ایک آدمی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ وقت دل کی دھڑکن کی رفتار کے ساتھ گزر رہا تھا۔

کسی بھی وقت پنڈی کی سرد خاموش رات کی فضا کلاشنکوفوں کے دھماکوں سے گونج سکتی تھی۔ ٹک ٹک ٹک۔ ٹک سیکنڈ منٹوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پلوسکر سے کہا۔

"یہ لوگ اوپر جا کر مر گئے ہیں کیا؟"

پلوسکر نے ابھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ فضا کلاشنکوفوں کے تڑاکوں اور دھماکوں سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مکان کے اندر اور نیچے گلی میں سے لوگوں کی "پکڑ لو پکڑ لو دہشت گرد ہیں" کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ پلوسکر نے گھبرا کر کہا۔

"ان ملیچھوں نے سارے محلے والوں کو جگا دیا ہے۔"

کلاشنکوفوں کے دھماکوں کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ اس میں اب پستولوں اور رائفلوں کے دھماکوں کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ ان آوازوں کو میں نے پہچان لیا تھا۔ پلوسکر نے نہیں پہچانا تھا یہ رائفلوں اور پستولوں کے دھماکے اپنی پولیس کے تھے جو وہاں پہلے سے چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

اتنے میں سارے علاقے میں شور مچ گیا۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔
ہم نے دو دہشت گردوں کو مکان کے دروازے سے نکل کر گلی میں بھاگتے دیکھا۔ وہاں روشنی تھی۔ پلوسکر اور میں اندھیرے میں گاڑی کے اندر چھپ کر بیٹھے تھے۔ پلوسکر بولا۔

"یہاں سے بھاگ چلو۔ ہم پکڑے گئے تو سارا پول کھل جائے گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ پولیس ہماری طرف نہیں آئے گی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر غصے میں کہا۔

"نہیں ہمیں اوپر پوری رپورٹ بھیجنی ہے۔ ہم پوری کارروائی کا جائزہ لیں گے۔"

دونوں دہشت گرد بازار کی طرف دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے سویلین کپڑوں والی پولیس کے دو آدمی دوڑ رہے تھے۔ پلوسکر نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ دو ہیں تیسرا کہاں ہے سالا؟"

میں سمجھ گیا کہ تھا کہ تیسرے دہشت گرد کو پولیس نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اوپر ہی ختم کر دیا ہوگا۔ ان دونوں کو بھی وہاں سے فرار ہونے کا موقع دیا جا رہا تھا۔ انہیں کچھ دور جا کر پکڑنا تھا۔ جس طرف دونوں دہشت گرد بھاگ رہے تھے ادھر کچھ دور سویلین کپڑوں والی پولیس کی پوری مسلح گارد موجود تھی۔ انہیں سویلین کپڑے اس لیے پہنائے گئے تھے کہ دہشت گرد بھی بعد میں

شہادت دے سکیں کہ انہیں پولیس نے نہیں بلکہ محلے کے لوگوں نے پکڑا تھا۔ میری سکیم اس طرح کامیاب ہو سکتی تھی۔

جب دونوں بھارتی دہشت گرد دوڑتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بازار اور گلی میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تو میں نے یہ کہہ کر گاڑی سٹارٹ کر دی کہ اب ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے میں نے تیزی سے گاڑی کو واپس موڑا اور اسلام آباد جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ میں نے کہا۔

"ہمارے صرف دو آدمی وہاں سے نکل سکے ہیں۔ تیسرا کہاں چلا گیا۔ وہ نظر کیوں نہیں آیا۔"

پلوسکر بولا۔ "میرا خیال ہے پولیس مقابلے میں مارا گیا ہو گا۔ یہ دونوں تو نکل گئے ہیں اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "مکان میں تو کوئی نہیں بچا ہو گا۔"

"بڑی فائرنگ کی ہے ان لوگوں نے اتنی فائرنگ میں کون بچا ہو گا۔ سب کے سب مارے گئے ہوں گے۔"

پلوسکر نے جملہ ختم کیا تو میں نے کہا۔

"بھگوان نے بڑی مدد کی ہے ہماری۔ اس طرف آج گشتی پولیس کا بھی کوئی آدمی نہیں تھا۔"

میں نے یہ جملہ جان بوجھ کر اور ریکارڈ میں ڈالنے کے لیے کہا تھا تاکہ یہ شک کسی کے ذہن میں نہ آئے کہ پولیس کو پہلے خبردار کر دیا گیا تھا۔ اسی خاطر ملک صاحب نے ساری پولیس کو سویلین لباس میں رکھا تھا۔

پلوسکر بولا۔ "مہاراج بڑا کامیاب آپریشن رہا ہے۔ ہمارا ایک آدمی مارا گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ جس طرح فائرنگ کی آواز سے سارا محلہ اٹھ بیٹھا تھا ایسی حالت میں تو ان تینوں کا مارا جانا یقینی تھا۔"

میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"حیرانی کی بات ہے لوگوں کے پاس بھی اسلحہ موجود تھا۔"
پلوسکر کہنے لگا۔ "تمہیں شاید معلوم نہیں یہاں ہر دوسرے آدمی کے پاس کچھ نہیں تو باڑے کا ایک پستول ضروری ہے۔"
ہم اسلام آباد پہنچے تو آسمان پر پچھلے پہر کا سپیدہ سحری نمودار ہونا شروع ہوگیا تھا۔ پلوسکر کہنے لگا۔
"ہمیں یہاں سے سیدھا پہاڑیوں والی خفیہ جگہ پر جانا چاہیے۔ دونوں مفرور آدمی وہیں پہنچیں گے۔"
میں جانتا تھا کہ اب وہ نہیں آئیں گے اور انہیں پنڈی پولیس نے پکڑ لیا ہو گا اور اس وقت تو علاقے کے تھانے کے حوالات میں بند ہوں گے لیکن میں نے کہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو۔"
ہم فلیٹ میں رکے بغیر وہاں سے سیدھا اسلام آباد سے آگے پہاڑیوں کی طرف چل پڑے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے صبح کی سپیدی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ہم نے خفیہ پناہ گاہ میں جا کر دیکھا۔ ان دونوں میں سے ابھی تک ایک بھی نہیں پہنچا تھا۔ ہم ٹیلے کے دامن میں بنی ہوئی چھوٹی سی ویران کوٹھڑی میں بیٹھ گئے۔ اندر کی فضا گرم تھی میں نے کہا۔
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا تیسرا آدمی بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔"
"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔" پلوسکر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
میرا خیال ہے ایسا ہی ہوگا۔ وہ تینوں دن نکلنے تک یہاں پہنچ جائیں گے۔"
ہم کافی دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں بیٹھے بیٹھے وہاں زیادہ بور ہو رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ان تینوں دہشت گردوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا لیکن مجھے پلوسکر خود ہی کہنے لگا۔

"دھرم چند جی! میرا خیال ہے پولیس ان کے پیچھے لگی تھی وہ پولیس کو جل دے کر کسی دوسری طرف نکل گئے ہیں اور کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔ اب وہ رات کا اندھیرا ہو جانے کے بعد ہی یہاں آئیں گے ہمیں شہر واپس چلنا چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ پنڈی کے اس مکان میں کتنے لوگ قتل ہوئے ہیں۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس چل پڑے۔ پلوسکر بولا۔

"واردات لیٹ نائیٹ کو ہوئی ہے۔ اخباروں کی آخری کاپی پریس میں جا چکی ہوگی۔ صبح کے اخباروں میں تو شاید ہی اس کی خبر آئے لیکن ضمیمہ ضرور مارکیٹ میں آ جائے گا۔"

لیکن ہم بھول گئے تھے کہ اخبار آج کل بجلی کی تیز رفتار مشینوں پر چھپتے تھے اور آخری کاپی تین بجے تک بھی جا سکتی تھی۔ پھر بھی صبح کے صرف دو اخباروں میں اس خونیں واردات کی خبر چھپ سکی۔ باقی اخباروں نے ضمیمے چھاپ دیے۔ خبر بڑی سرخیوں کے ساتھ چھپی تھی جس میں لکھا تھا کہ رات پچھلے پہر پنڈی کے بھائیوں والے محلے کے ایک مکان میں دہشت گردی کی ایک خونیں واردات میں کچھ مرد عورتیں اور بچے دہشت گردوں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک کر دیے گئے۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ محلے کے لوگ فائرنگ کی آواز سن کر جاگ پڑے۔ انہوں نے دہشت گردوں کا پیچھا کیا جو واردات کرنے کے بعد بھاگ رہے تھے۔ ایک دہشت گرد لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ باقی دو کو لوگوں نے پکڑ کر تھانے پہنچا دیا۔ اخبار میں اس بات کا خاص نوٹس لیا گیا تھا کہ جائے واردات پر پولیس ایک گھنٹے کے بعد پہنچی۔

پلوسکر نے اخبار کی خبر پڑھ کر اخبار میری طرف بڑھا دیا۔

"آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ دونوں پکڑے گئے ہیں۔ ایک مارا گیا ہے یہ حرامی پولیس کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔ یہاں کی پولیس کا ٹارچر وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

پلوسکر پریشانی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے خبر کو بڑے غور سے پڑھا۔ یہ خبر ہماری انٹیلی جینس پولیس نے ملک صاحب کی سرکردگی میں بڑی سوچ سمجھ کر تیار کر کے چھپوائی تھی اور بہت ممکن تھا کہ نیشنل سیکورٹی کا حوالہ دے کر پریس کو بھی اعتماد میں لے لیا گیا تھا اور یہ جملہ خاص طور پر لکھوایا گیا تھا کہ پولیس جائے واردات پر ایک گھنٹے بعد پہنچی۔ بعد میں ملک صاحب سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ موقع واردات پر پولیس کی موجودگی کسی طرح سے بھی ظاہر نہ ہو۔ اس میں میرے آنے والے پاکستان کی سلامتی کے کمانڈو آپریشن کی کامیابی کا انحصار تھا۔ پولیس کی موجودگی بال ٹھاکرے اور بھارتی انٹیلی جینس کے اس شک کو تقویت پہنچا سکتی تھی کہ پولیس کو واردات کا پہلے سے علم ہوگیا تھا اور یہ شک مجھ پر ہی پڑ سکتا تھا۔

پلوسکر کسی جگہ فون کر رہا تھا۔ دو تین فون کرنے کے بعد وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔

"میں اپنی ایمبیسی جا رہا ہوں۔ ان سے مشورہ کرنا ہوگا۔ ہمارے آدمیوں کا پکڑا جانا ہم سب کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں میں کوئی بک پڑا تو نہ صرف میں اور تم دونوں گرفتار کر لیے جائیں گے بلکہ ہمارے ملک بھارت کی بھی سیاسی سطح پر بڑی بدنامی ہوگی۔"

وہ چلا گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کا اندیشہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا ہوگا نہیں۔ میں نے ایک سکیم کے تحت جان بوجھ کر دونوں دہشت گردوں کو گرفتار کرایا تھا۔ اب مجھے ملک صاحب سے مل کر ان دونوں کو حوالات سے یا جیل سے فرار کروانا تھا تاکہ بال ٹھاکرے اور بھارت کی انٹیلی جینس کو میری نیت پر ذرا سا بھی شک نہ رہے۔ میں نے ملک صاحب کا نمبر ڈائیل کیا۔

وہ فون پر موجود تھے۔ میری آواز پہچان کر بولے۔ "میرا خیال ہے سب

کچھ ایسے ہی ہوا ہے جیسے کہ تم چاہتے تھے کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔ "ملک صاحب! اخباروں میں جو خبر چھپی ہے اس نے میرے موقف کو بڑی طاقت دی ہے۔ میں یہی چاہتا تھا۔"

ملک صاحب بولے۔ "ساری باتیں بیٹھ کر ہوں گی۔ تم ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ۔"

پھر انہوں نے مجھے وہ آفس بتایا جہاں وہ بیٹھے تھے۔ میں کاڑی لے کر وہاں پہنچ گیا۔ یہ آفس پنڈی میں ہی تھا اور ایکسپورٹ امپورٹ کا معمولی سا آفس تھا۔ ہم نے یہ طے کر رکھا تھا کہ میں انہیں پولیس کے کسی بھی آفس میں نہیں ملوں گا۔ اس کی وجہ محض یہ خدشہ تھا کہ کہیں میرے پیچھے بھارتی سفارت خانے کا کوئی انٹیلی جینس والا نہ لگا ہوا ہو۔ یہ واردات اور برآمدات کا آفس تھا اور میرا کاروبار بھی ایکسپورٹ امپورٹ کا تھا۔ اس لیے میرا وہاں جانا کاروباری ضروریات کے تحت بھی ہو سکتا تھا۔ ملک صاحب پچھلے کمرے میں بجلی کا ہیٹر لگائے بیٹھے تھے۔ مجھ سے اٹھ کر ہاتھ ملایا کہنے لگے۔

"آپریشن بڑا کامیاب رہا۔"

کہنے لگے۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف چاروں چارپائیوں کے لحافوں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے ان کے اندر سرہانے تکیے ہی تھے اپنے آدمی تو اسلحہ لے کر گلی میں چھپے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "اخبار میں جو خبر چھپی ہے وہ بڑی متوازن اور ہماری پالیسی کے عین مطابق تھی۔"

ملک صاحب بولے۔ "اسی سلسلے میں نیشنل سیکورٹی کا حوالہ دے کر پریس کو اپنے ساتھ ملانا پڑا ہے۔ پریس نے بھی ملکی سلامتی کی خاطر ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"جو دہشت گرد مارا گیا تھا اس کی لاش کہاں پر رکھی ہے۔"

"ہسپتال میں ہے اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ کل کے اخباروں میں اس کی تصویر بھی آ جائے گی باقی جن دونوں کو ہم نے سکیم کے مطابق گرفتار کیا تھا وہ علاقے کے تھانے کے حوالات میں بند ہیں۔ آگے آپ کا کیا منصوبہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "منصوبہ یہ ہے کہ بال ٹھاکرے اور بھارت کی انٹیلی جینس کے سامنے اپنا اعتماد بحال کرانے اور ان لوگوں کے دلوں میں میرے بارے میں اگر شک شبہ ہے تو اسے ہمیشہ کے لیے دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جب میں کہوں اس وقت ان دونوں دہشت گردوں کو فرار ہونے کا موقع دیا جائے مگر اخباروں میں بھی ان کے فرار کی خبر چھپنی چاہیے۔"

ملک صاحب کہنے لگے۔ "مگر حیدر علی! اس میں پولیس کی بدنامی ہوگی کہ ان کی حراست سے بھارت کے دو دہشت گرد فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔"

میں نے کہا۔ "ڈپلومیسی اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ ان دونوں کو بھاگ جانے کا موقع بھی دیا جائے اور اخباروں میں یہ خبر بھی چھپنی چاہیے۔ اگر خبر نہ چھپی تو انڈین انٹیلی جینس کو یہ گمان گزر سکتا ہے کہ ان دونوں کا فرار سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے اور پولیس کو بدنامی سے بچانے کی خاطر اخباروں میں خبر بھی نہیں چھپنے دی گئی۔"

ملک صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر ملکی سلامتی کے لیے یہ ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ملک صاحب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے ملک کی سلامتی کی خاطر ہی کر رہا ہوں۔ میں جو موت کے منہ میں جا کر بیٹھ گیا ہوں تو صرف اس لیے کہ میرے وطن پاکستان کو نقصان پہنچانے والوں کے ناپاک ارادوں کو جہاں تک مجھ سے ہو سکے خاک میں ملا دوں۔ اس

میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔"

ملک صاحب نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بڑے جذباتی لہجے میں کہنے لگے۔

"حیدر علی! تم پاکستان کے بہادر مجاہد ہو۔ پاکستان کو دشمنوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس وقت ہمیں تم ایسے جیالے' بے غرض اور محب وطن مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ تم جس طرح کہو گے ہم اسی طرح کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں وہی کر رہا ہوں جس کی اس وقت میرے وطن پاک کو ضرورت ہے۔ میرے سامنے اکھنور کی توپوں اور اس کے پیرا میٹروں اور سنگر میزائیلوں کی تباہی کا مشن ہے جو دشمن نے صرف پاکستان کے شہروں کو تباہ کرنے کے لیے لگائی ہوئی ہیں۔ اگر اسی مرحلے پر مجھ پر شک پڑ گیا تو میرا اصلی مشن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اب ایسا ہے کہ میں آپ سے ایک دن بعد رابطہ پیدا کروں گا۔ آپ پنڈی میں ہی رہیں۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ ان دونوں بھارتی دہشت گردوں کو کس وقت فرار ہونے کا موقع دینا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

اس کے بعد ملک صاحب چلے گئے۔

رات کو پلوسکر میرے پاس آیا کہنے لگا۔

"میں نے پتہ چلایا ہے کہ اپنے دونوں آدمیوں کو پولیس مکر والی ٹارچر سیل لے گئی ہے جہاں اس سے پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔ ان کو اس قدر اذیتیں دی جائیں گی کہ وہ سب کچھ بتا دیں گے وہ ہمارے بارے میں بھی بتا دیں گے۔ دھرم چند جی! اس سے پہلے کے اپنے آدمی ہمارا راز فاش کر دیں میں ان دونوں کو مکروالی سنٹر سے فرار کرا دینا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا ۔لیکن مکر والی ٹارچر سنٹر پر تو سیکورٹی کا زبردست انتظام ہو گا۔"

وہ بولا۔ ''ہوگا تو ہوتا رہے ہمیں ہر حالت میں رات کو اٹیک کر کے اپنے دونوں آدمیوں کو وہاں سے نکالنا ہے۔''

میں نے اسے کہا۔ ''وہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں مکروالی سنٹر کا پورا سروے کرنا ہوگا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اپنے آدمی کس جگہ پر قید ہیں۔''

پلوسکر کہنے لگا۔

''یہ ہم اکٹھے رات کے اندھیرے میں جا کر پتہ لگالیں گے میرا خیال ہے ہمیں مزید دو تین آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔''

میں نے اسے کہا۔ ''تم پہلے مکروالی جا کر وہاں کے سنٹر کا پورا پورا سروے کر کے آؤ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔''

اگلے روز پلوسکر مکروالی چلا گیا۔ میں نے اس کے بعد ملک صاحب سے فون پر فوری رابطہ پیدا کیا اور ان سے پوری بات طے کرلی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسی منصوبے کے تحت دونوں دہشت گردوں کو جوڈیشل حوالات سے نکال کر مکروالی لے گئے ہیں۔ آخر وہ پاکستان کے ایک ذمے دار پولیس آفیسر تھے۔ کہنے لگے۔

''حیدر علی! اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ دونوں بھارتی دہشت گرد ہیں مفرور ہونے کے بعد یہ تخریبی کارروائیاں ضرور کریں گے۔''

میں نے تب انہیں بتایا کہ یہ دونوں زیادہ دیر تک مفرور نہیں رہیں گے۔ ''آپ یہ نہ بھولیں کہ دونوں بھارتی دہشت گرد میری نگرانی بلکہ میرے کنٹرول میں ہوں گے گویا یہ ایک پاکستانی پولیس افسر کی قید سے بھاگ کر دوسرے پاکستانی پولیس افسر کی قید میں آجائیں گے فکر نہ کریں۔ ہم ان دونوں کو اگلی بار ہمیشہ کے لیے ختم کردیں گے۔''

پلوسکر بھی دیہاتی آدمیوں کے بھیس میں مکروالی سنٹر کا سروے کر کے واپس

آ گیا۔ کہنے لگا۔

"وہاں سے اپنے آدمیوں کو فرار کرانا ناممکن ہے۔ پاکستانی سیکورٹی کا اتنا سخت انتظام ہے کہ کوئی چڑیا بھی اندر سے باہر اور باہر سے اندر نہیں جا سکتی۔"

میں نے کہا۔

"میں خود موقع دیکھنے جاؤں گا پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔"

موقع دیکھنے کا تو ایک بہانہ ہی تھا۔ مجھے تو وہ جگہ دیکھنی تھی جہاں ملک صاحب کی ہدایت کے مطابق پولیس گارڈز کو ایک پل کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جانا تھا۔ میں نے واپس آ کر پلوسکر سے کہا۔

"ہم آج رات اٹیک کریں گے۔ تم میرے پاس ہی رہنا۔"

رات کو ہم مکر والی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے اپنے پاس ایک ایک پستول چھپا کر رکھ لیا تھا میں نے دونوں پستولوں میں ایسی گولیاں بھری تھیں جن میں سکہ نہیں تھا۔ صرف بارود ہی تھا۔ گویا یہ بے ضرر گولیاں تھیں۔ پلوسکر اس حقیقت سے بے خبر تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جب رات کے دو بجے ہم سینٹر کے اُس سیل کے عقب میں واقع کھائی میں آئے تو ہم نے دیکھا کہ دونوں کانسٹیبل جو پہرہ دے رہے تھے وہ وہاں پر موجود نہیں تھے۔ میں نے پلوسکر سے کہا۔

"بھگوان ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ سنتری غائب ہیں تم یہاں رہو۔ میں اوپر جا کر دونوں کو نکال کر لاتا ہوں۔"

کسی قسم کی پریشانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بھی مقفل نہیں تھا۔ صرف باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں کنڈی کھول کر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ اپنی دونوں بھارتی دہشت گرد لکڑی کے فرش پر پرانے لحاف اوڑھے سو رہی تھے۔ میں نے انہیں جگایا اور کہا۔

"اٹھو میرے ساتھ نکل چلو۔"

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں انہیں نکال کر نیچے لے آیا جہاں پلوسکر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے وہاں سے دوڑنا شروع کر دیا۔ کھائیوں اور گھاٹیوں میں کچھ دور تک دوڑنے کے بعد میں نے پلوسکر سے کہا۔ "ہم خطرے سے باہر نکل آئے ہیں۔"

ہم تیز تیز چلتے چڑھائی چڑھ کر کچی پہاڑی سڑک پر آ گئے جہاں ہم نے اپنی پرانی گاڑی کھڑی کی ہوئی تھی۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی راولپنڈی اسلام آباد کی طرف دوڑنے لگی۔ پلوسکر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سارا کام اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب بھگوان کی کرپا سے ہوا ہے۔ ورنہ پاکستانی پولیس کبھی اتنی غافل نہیں ہوتی بھگوان جانے دونوں کانسٹیبل کس کام سے کس طرف چلے گئے تھے۔

"بال ٹھاکرے جی کا آشیر باد تھا پلوسکر۔ تعجب کی بات ہے کہ کوٹھڑی کو تالا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔"

دوسرے دن طے شدہ منصوبے کے مطابق صرف ایک اخبار میں یہ خبر بھی آ گئی کہ دو قیدی مکروالی سینٹر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ پولیس سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ اسی رات مجھے بمبئی سے بال ٹھاکرے کا پیغام ملا کہ میں تمہاری کارکردگی سے خوش ہوا ہوں کہ تم اپنے آدمیوں کو پاکستانی قید سے چھڑا لائے۔ مجھے یہاں کے لوگوں پر کوئی وشواس نہیں ہے ان لوگوں کی حماقت سے ہمارا ایک آدمی مارا گیا۔ لیکن تمہارا مشن کامیاب رہا۔ اخباروں نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ پنڈی کے مکان میں کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ معلوم کر کے مجھے لکھو۔ اس دفعہ پنڈی کے راجہ بازار میں اپنے آدمیوں سے کھلی فائرنگ کراؤ۔"

یہ پیغام اشاراتی زبان میں تھا۔ اس پیغام کو سفارتی عملے نے نوٹ کیا تھا۔ عبارت کو عام نظر سے پڑھا جائے تو اس میں میرے مشن کی اور سفارتی عملے کی تعریف کی گئی تھی مگر جب میں نے اپنے فلیٹ پر آ کر کلیدی کتاب کھول کر عبارت کو ڈی کوڈ کیا تو یہ عبارت بدل کر وہی عبارت بن گئی جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔

میں نے اسی رات بال ٹھاکرے کو جوابی پیغام بھجوا دیا جس میں کہا کہ میں نے پوری تحقیق کی ہے۔ پنڈی کے مکان میں چار آدمی دو عورتیں اور چار بچے ہلاک ہوئے تھے۔ پولیس نے جان بوجھ کر مرنے والوں کی صحیح تعداد کو چھپا دیا تھا۔ ساتھ ہی بال ٹھاکرے کو یقین دلا دیا کہ اب میں راجہ بازار میں کھلی فائرنگ

کروا رہا ہوں۔ بہت جلد کامیابی کی رپورٹ روانہ کروں گا۔ اس پیغام اور جوابی پیغام کے بارے میں میں نے ملک صاحب کو بھی تفصیل سے بتا دیا۔ وہ فکر مند ہو گئے کہنے لگے۔

"راجہ بازار تو گنجان بازار ہے وہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اگر ان دہشت گردوں نے کھلی فائرنگ کی تو بڑے لوگ مارے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں یہاں کس لیے بیٹھا ہوں ملک صاحب؟ میرے ہوتے ہوئے کسی بھارتی دہشت گرد کی جرات ہے کہ وہ کسی پاکستانی کا خون بہائے۔ میرے ذہن میں ایک ایسی سکیم ہے کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔

"وہ کیا سکیم ہے۔" ملک صاحب نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ابھی مجھے تھوڑا سا مزید غور کر لینے دیں۔"

پلوسکر کو معلوم ہو گیا تھا کہ میرے نام بال ٹھاکرے کا پیغام آیا ہے اور کہنے لگا۔ "ٹھاکرے جی نے کیا کہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ٹھاکرے جی نے آرڈر دیا ہے کہ اس بار راجہ بازار میں کھلی فائرنگ کر کے جتنے لوگ مارے جا سکتے ہیں مار دیے جائیں۔"

پلوسکر مسکرایا کہنے لگا۔

"یہ بات ہوئی ناں۔ کچھ نہیں تو ساٹھ ستر پاکستانی ضرور ڈھیر ہو جائیں گے۔"

میں نے دل میں کہا۔ "صرف دو آدمی ڈھیر ہوں گے اور وہ بھارتی دہشت گرد ہوں گے۔ اوپر سے میں نے خوش ہو کر کہا۔

"پلوسکر جی! اس سے زیادہ لوگ مریں گے۔ کلاشنکوفیں دو ہوں گی۔ ان کے برسٹ بوچھاڑوں کی طرح گریں گے۔ کلاشنکوف کی ایک گولی کم از کم تین آدمیوں کے جسم سے گزر جاتی ہے۔"

"تو پھر شبھ کام میں دیری نہیں ہونی چاہیے دھرم چند جی۔"
پلوسکر نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "اپنے آدمی ٹارچر سینٹر سے آئے ہیں انہیں خفیہ پناہ گاہ میں دو دن آرام کر لینے دو۔"

ہم نے ہفتہ کا ایک دن اور وقت مقرر کر لیا۔ وقت دن کے ایک بجے کا مقرر کیا گیا پلوسکر کا خیال تھا کہ یہ واردات شام کے وقت ہونی چاہیے کیونکہ شام کے وقت راجہ بازار میں زیادہ رش ہوتا ہے۔ میں نے دوپہر کا وقت اس لیے طے کیا تھا کہ دن کی روشنی میں پولیس کے آدمیوں کو بھارتی دہشت گرد صاف نظر آ جائیں۔ میں نے کہا۔

"شام کے وقت راجہ بازار میں اتنا رش نہیں ہوتا جتنا دن کے وقت ہوتا ہے۔ شام کے وقت لوگ زیادہ تر اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے ہوتے ہیں۔"
پلوسکر کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہنے لگا۔

"ہمیں ٹرنک بازار والے چوک سے داخل ہو کر حملہ کرنا ہوگا۔ ہمارے آدمیوں کو اس طرح آگے بڑی مسجد کی طرف سے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا کیونکہ ادھر بازار کافی کھلا ہو جاتا ہے اور آگے میدان بھی ہے۔"

میں نے دل میں کہا۔ چاہے جس طرف سے اٹیک کرو یہ بھارتی دہشت گرد تو اب زندہ نہیں بچیں گے۔ میں نے کہا۔

"تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے ہمارے آدمیوں کو موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر آنا ہوگا۔ وہ ٹرنک بازار سے فائرنگ کرتے راجہ بازار میں داخل ہوں گے اور فائرنگ کرتے بڑی مسجد کی طرف نکل جائیں گے لیکن موٹر سائیکل بڑی درست حالت میں ہونے چاہیں۔"
پلوسکر کہنے لگا۔

"ہم ان کا تیل پانی وغیرہ چیک کریں گے۔ ہم نئے موٹر سائیکل خرید لیں

گے۔ آخر ہمارے سفارت خانے کے پیسے اور کس کام آئیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تم اپنی ذمے داری پر خریدو گے۔"

وہ بولا۔ "دھرم چند! واردات کی کامیابی کے لیے نئے موٹر سائیکلوں کا ہونا ضروری ہے۔ نئے موٹر سائیکل کبھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

ملک صاحب کو اس سارے منصوبے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ معاملہ بڑا نازک ہے اور بازار میں لوگوں کا ہجوم ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم انہیں قابو کریں وہ ایک آدھ برسٹ ضرور فائر کرچکے ہوں گے اور کئی بے گناہ مارے جائیں گے۔ کوئی ایسی ترکیب کرو کہ یا تو عین وقت پر ان کی کلاشنکوفیں جام ہو جائیں یا پھر عین وقت پر ان کے ہتھیاروں سے میگزین نکال لیے جائیں۔ میں نے اس ترکیب پر بہت غور کیا۔ اس ترکیب پر عمل مشکل معلوم ہوتا تھا کیونکہ سارا اسلحہ پلوسکر کے قبضے میں تھا اور ہتھیاروں کو جام کرنا یا ان میں سے گولیاں نکال لینا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ جب میں نے ملک صاحب سے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا آپ کوئی اس کا حل نکالیں تو وہ ٹیلی فون پر کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے۔

"ٹھیک ہے تم ہمیں بالکل صحیح وہ روٹ اور راستہ بتا دو جس راستے سے یہ دونوں دہشت گرد موٹر سائیکلیں لے کر راجہ بازار میں داخل ہوں گے۔"

میں نے انہیں روٹ بتایا تو انہوں نے کہا۔

"اب یہ ذمے داری تمہاری ہے کہ یہ لوگ اسی روٹ سے آئیں۔"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ دہشت گرد اسی روٹ سے آئیں گے یہ روٹ راولپنڈی کے کالج موڑ' نالہ لئی اور ٹرنک بازار کے چوک والا روٹ تھا۔ ٹرنک بازار کے چوک میں سے انہیں راجہ بازار میں داخل ہونا تھا اور داخل ہوتے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دینی تھی۔ وقت اور دن طے ہوگیا۔ دہشت گردی

کی واردات شروع کرنے سے پہلے ہتھیاروں کو دو دو تین تین بار چیک کیا گیا کہ عین موقع پر دھوکہ نہ دے جائیں۔ دونوں دہشت گردوں نے اپنے پاس ایک ایک خنجر بھی رکھ لیا تھا۔ لباس ان کا وہی شلوار قمیض گرم کوٹ اور اوپر سے کمبل لپیٹے ہوئے تھے۔ کمبلوں کے اندر انہوں نے بھری ہوئی کلاشنکوفیں چھپا رکھی تھیں۔

دن کے ٹھیک دس بجے یہ لوگ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر واردات کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ہم اپنی گاڑی میں ان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ ہمارے ساتھ ساتھ رہیں۔ راولپنڈی کی مری روڈ سے ہوئے ہوئے ہم لوگ ریلوے پل کی طرف چلے جا رہی تھے۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی موسم سرد تھا لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک جاری تھا۔ مجھے ملک صاحب کے منصوبے کا علم نہیں تھا۔ میں بھارتی دہشت گردوں کو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ راجہ بازار میں داخل ہو کر پہلے دو تین ہوائی برسٹ فائر کریں۔ ایسا کرنے کا کوئی تک نہیں تھا۔ خوامخواہ مجھ پر شک پڑ سکتا تھا۔ دل میں بھی یہی دعا کر رہا تھا کہ ملک صاحب نے کوئی ایسا منصوبہ سوچا ہو جس سے کوئی بھی شہری ہلاک نہ ہو بلکہ زخمی تک نہ ہو۔ کیونکہ ان دہشت گردوں کی کلاشنکوفیں میگزینوں سے بھری ہوئی تھیں اور یہ دونوں بھارتی دہشت گرد سنگ دل پیشہ ور قاتل تھے اور ان کی نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا کہ وہ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قتل کریں۔ صرف اسی صورت میں انہیں بھارت واپس جا کر جیل سے عمر قید سے رہائی مل سکتی تھی۔

دونوں دہشت گرد ہماری گاڑی سے تھوڑا آگے سڑک پر الگ الگ ہو کر موٹر سائیکلوں پر سوار چلے جا رہے تھے۔ پلوسکر گاڑی چلا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ نیلم سینما کے سامنے سے سڑک کالج روڈ کی طرف جاتی تھی۔ دہشت گردوں کو تین چار بار اس روٹ پر چلا کر ریہرسل کرا دی گئی

تھی۔ اب ہم کالج روڈ پر آ گئے تھے۔ لوگ آ جا رہے تھے ہر قسم کی ٹریفک سڑک پر جاری تھی۔ ہماری بائیں جانب لیاقت باغ آیا اور گزر گیا۔ پھر سینما گھر شروع ہوگئے۔ نالہ لئی کا پل بھی پیچھے رہ گیا۔ سامنے ٹرنک بازار والا چوک تھا۔ اس چوک سے دہشت گردوں کو راجہ بازار کی طرف مڑنا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ ملک صاحب کی طرف سے ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ چوک آگیا تھا۔ یہاں سے راجہ بازار کا فاصلہ بمشکل دس سیکنڈ میں طے کر کے ان بھارتی دہشت گردوں نے راجہ بازار میں داخل ہوتے ہی لوگوں پر گولیاں برسانی شروع کر دینی تھیں۔ یا اللہ تو ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا۔ میں نے دل میں جو دعائیں یاد تھیں پڑھنے لگا۔ کہیں ملک صاحب عین وقت پر بیمار تو نہیں پڑ گئے؟ پھر ہماری پولیس کہاں ہے؟ ان لوگوں کو اب کون روکے گا؟ اچانک مجھے پولیس کے دو مسلح جوان ایک طرف سے نکل کر چوک کے عین درمیان میں آتے نظر آئے۔ ان کے دائیں بائیں کچھ اور مسلح سپاہی بھی نکل کر چوک میں آئے۔ انہوں نے دونوں دہشت گردوں کی موٹر سائیکلوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں روک لیا۔ وہ اتنی جلدی سامنے آ گئے تھے کہ دہشت گردوں کو کمبل کے اندر سے کلاشنکوفیں نکالنے کا موقع نہ مل سکا۔

ہم نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی تھی اور گاڑی سے باہر نکل کر ایک طرف ہٹ کر کھڑے تھے۔ پلوسکر نے دبی زبان میں گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔ یہاں چیکنگ ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو وہ ہمارے آدمیوں کی تلاشی نہیں لیں گے۔ گذشتہ ہفتے کی واردات کی وجہ سے پولیس رسمی طور پر لوگوں کو روک کر دو ایک سوال پوچھتی ہے۔ کچھ نہیں ہوگا۔"

دل میں بار بار خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن پولیس کو انہیں روکتے دیکھکر معمول پر آ گئی تھی۔ واقعی پولیس تلاشی وغیرہ نہیں لے

رہی تھی۔ دہشت گردوں کے دائیں بائیں ایک ایک پولیس کا مسلح جوان ہاتھ
بں سٹین گن لیے ضرور کھڑا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی دہشت گردوں کی
نلاشی وغیرہ نہیں لے رہا تھا۔ دونوں سپاہی آگے کو دیکھ رہے تھے۔ آگے پولیس
لی پوری مسلح گارد کھڑی لوگوں کو روک کر ان کی سرسری چیکنگ کر کے انہیں
آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ جو پولیس کے دو
دان بھارتی دہشت گردوں کی موٹر سائیکلوں کے دائیں بائیں کھڑے ہیں یہ یونہی
نہیں کھڑے بلکہ انہیں معلوم ہے کہ یہ سارا ڈرامہ ان دونوں کو قابو میں کرنے
کے لیے رچایا گیا ہے۔ چیکنگ کرتے کرتے پولیس کے جوان ہمارے دہشت
گردوں کے پاس بھی آ گئے۔ جیسے ہی وہ موٹر سائیکلوں کے قریب آئے بھاری
دہشت گردوں نے کمبل اتار پھینکے اور کلاشنکوفیں اٹھا کر فائر کرنے ہی والے تھے
۔ پولیس کے جوانوں نے سٹین گن کے برسٹ مار کر دونوں کو بھون ڈالا۔
پلوسکر جھک کر بڑی تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اور
لا۔ ”اندر آ جاؤ اندر آؤ جلدی۔“
اس نے انگریزی میں کہا اور انجن سٹارٹ کر دیا۔ جیسے ہی میں گاڑی میں
ٹھا گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور ریلوے پل کی طرف دوڑنے لگی۔
سکر سخت پریشان تھا۔ انگریزی میں بار بار کہہ رہا تھا۔
”بڑی بدقسمتی ہو گئی ہے۔ بیڈ لک' بیڈ لک یہ لوگ موٹر سائیکلوں پر مہاتما
ھ بن کر کیوں بیٹھے رہے تھے۔ انہیں اس وقت فائرنگ شروع کر دینی چاہیے
ں جب پولیس نے انہیں روکا تھا مائی گاڈ۔ ہے رام' بڑی بدقسمتی ہوئی ہے بیڈ
ک۔“

میں اس آہ و زاری میں اس کا برابر ساتھ دے رہا تھا۔ لیکن دل میں اس
ر خوش تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ملک صاحب کی جوابی سکیم کی دل کھول
ر داد دے رہا تھا۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ جس

پولیس نے چوک میں انہیں روکا تھا۔ وہ عام پولیس کے جوان نہیں تھے بلکہ پولیس کی وردیوں میں تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔

بھارتی سفارت خانے کو اسی وقت واردات کی ناکامی کا اور بھارتی دہشت گردوں کی ہلاکت کی خبر مل گئی۔ یہ خبر دوسرے لمحے انڈیا کی وزارت خارجہ کو پہنچا دی گئی۔ اور یوں چند لمحوں کے اندر اندر بھارت کی ڈیفنس انٹیلی جینس اور بال ٹھاکرے کو بھی واردات کی ناکامی اور دہشت گردوں کی ہلاکت کا علم ہوگیا۔ دو دن کے اندر اندر اس کی ناکامی کی پوری تحقیقات کے بعد انڈین ڈیفنس انٹیلی جینس نے جو رپورٹ متعلقہ وزارت کو پیش کی اس میں یہی لکھا گیا کہ واردات کی ناکامی کی وجہ پاکستان کے شہروں میں سیکورٹی کے نظام کا جدید سطح پر مضبوط اور مربوط کیا جانا ہے۔ چونکہ پہلے ایک خونی واردات اسی شہر میں ہو چکی تھی اس لیے یہاں خاص طور پر سیکورٹی زیادہ سخت تھی اور پولیس جگہ جگہ موٹر سائیکل والوں کی چیکنگ کر رہی تھی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ یہ واردات ملتوی کر دی جاتی۔ تیسرے دن بال ٹھاکرے کا مجھے خفیہ پیغام ملا کہ واپس بمبئی آجاؤ دہشت گردی کی مہم کو فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے۔ میں نے بمبئی واپس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مجھے واپسی کے لیے بارڈر کراس کرنے کی ضرورت نہیں تھی میرے پاس بھارت کا ایک الگ پاسپورٹ تھا۔ جس کے ذریعے میں شارجہ سے بمبئی جا سکتا تھا۔ جس روز مجھے رات کی فلائیٹ سے شارجہ اور وہاں سے صبح کے طیارے سے بمبئی روانہ ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے کی بات ہے میں کسی ضروری کام سے اپنے اسلام آباد والے فلیٹ سے تھوڑی دیر کے لیے سٹور کی طرف گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ میری نوکرانی دروازے کے باہر کھڑی ایک آدمی سے باتیں کر رہی تھی جس نے کمبل اپنے جسم پر لپیٹ رکھا تھا اور دیہاتی آدمی لگتا تھا۔ مجھے دیکھ کر نوکرانی ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ یہ کون ہے؟"

اس آدمی نے گھوم کر میری طرف دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا یہ آدمی ہندو تھا اور بھارت کے سفارت خانے میں چپڑاسی تھا۔ میں نے دو تین بار سفارت خانے میں اسے دیکھا تھا۔ اس کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

میں نے نوکرانی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے بھارتی سفارت خانے کے چپڑاسی سے پوچھا۔

"تم یہاں کیوں آ گئے ہو؟ کیا تمہیں مجھ سے ملنا تھا۔ تمہیں مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی۔"

وہ بولا۔ "مہاراج! میں ادھر ایک کام سے آیا تھا اپنی ایمبیسی کا راستہ بھول گیا۔ آپ کا مکان دیکھا تو سوچا آپ سے پتہ معلوم کر لیتا ہوں۔ نوکرانی نے کہا۔ آپ یہاں نہیں ہیں۔"

میرے دل میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ خیال گزرا کہ یہ شخص یونہی ادھر نہیں آیا۔ اسے سفارت خانے کی طرف سے میرے پیچھے لگایا گیا ہے۔ مگر میں نے اس پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا اور اسے ایمبسی کا روٹ بتاتے ہوئے کہا۔

"آیندہ اگر راستہ بھول جاؤ تو میرے فلیٹ پر مت آنا۔ یہ بات ہم سب کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے مہاراج! بالکل ٹھیک ہے۔ غلطی ہو گئی۔" اور وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ملک صاحب کو فون کر کے اپنے خفیہ ریستوران میں بلایا اور یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! مجھے لگتا ہے کہ انڈیا کی انٹیلی جینس کو مجھ پر شک پڑ گیا ہے۔ یہ شخص اپنے آپ ادھر نہیں آیا تھا۔ اسے کسی نے خاص طور پر

تھا۔"

ملک صاحب لمبی سوچ میں پڑ گئے۔ پرانے تفتیشی افسر تھے کہنے لگے۔

"تمہارا شک مجھے بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ میرا تو خیال ہے تم بمبئی واپس نہ جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں پہنچتے ہی تمہیں گرفتار کر لیا جائے۔"

میں نے کہا۔

"کچھ ہلکا سا کھٹکا اس بات کا میرے دل میں پیدا ہوگیا ہے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ایسی کوئی خاص بات بھی نظر نہیں آ رہی اور پھر میرے سامنے ایک بہت بڑا مشن ہے۔ مجھے ان توپوں اور خطرناک سنگر میزائیلوں کو تباہ کرنا ہے جن کا رخ پاکستان کے شہروں کی طرف ہے۔"

"ایک بار پھر غور کر لو حیدر علی۔ ہمیں تمہاری زندگی بھی عزیز ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے ملک صاحب سے کہا۔

"اللہ مالک ہے میں کل رات یہاں سے بمبئی کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ میرا ہم شکل اور اصلی دھرم چند فرار نہ ہونے پائے۔ اگر وہ آپ کی قید سے نکل بھاگا اور بارڈر کراس کر کے انڈیا پہنچ گیا بلکہ اگر وہ بھارتی سفارت خانے پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو پھر میرے زندہ پاکستان واپس آنے کی امید دل سے نکال رکھیں۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دھرم چند اس وقت تک ہماری قید میں ہی رہے گا جب تک کہ تم اپنے سارے مشن پورے کر کے اپنی مرضی سے واپس پاکستان نہیں آ جاتے۔"

ملک صاحب نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا دوسرے روز میں رات کو اسلام آباد سے شارجہ پرواز کر گیا۔ وہاں ایک دن ٹھہرا اس کے بعد رات کی فلائیٹ سے بمبئی روانہ ہوگیا۔

بمبئی کی جگمگاتی روشنیاں نظر آئیں تو دل میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔
کہیں ایسا تو نہیں کہ اس شہر میں میری گرفتاری کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔
مجھے بمبئی کی روشنیاں میری گرفتاری کے لیے بچھائے گئے جال کی روشنیاں دکھائی
دیں۔ مگر دوسرے لمحے میں نے اس خوف کو دل سے ہٹا دیا اور اپنے آپ کو یہ
کہہ کر تسلی دی کہ میرے خلاف ان لوگوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر
سفارت خانے کا کوئی آدمی میری نگرانی کر رہا تھا تو یہ ایک نارمل بات ہے۔
دوسرے ملکوں میں کسی ملک کے جاسوس کی نگرانی ہوا ہی کرتی ہے۔ رات کافی
گزر چکی تھی جب میں بمبئی ایئرپورٹ پر اترا تو میں نے اپنے آنے کی اطلاع
نہیں دی تھی۔ میرے شیو سینا کے دفتر والے فلیٹ کی چابی پاس ہی تھی میں ٹیکسی
لے کر اپنے فلیٹ پر آ گیا۔ کپڑے بدل کر بتی بجھائی اور بستر پر لیٹ کر سونے کی
کوشش کرنے لگا۔ جانے کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل میں بار بار وسوسے پیدا
ہو رہے تھے کہیں ان لوگوں کو پتہ تو نہیں چل گیا کہ میں اصلی دھرم چند نہیں
وں بلکہ اس کا ہم شکل بنا کر بھارت میں جاسوسی کے لیے آیا ہوا ہوں۔ طرح
لرح کے خدشے دل میں ابھر رہے تھے۔ آخر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے
ا۔

دوسرے روز بھارت کے نمرود ' شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کے آگے
ئی ہوئی۔ بالا جی راؤ مجھے ساتھ لے کر گیا تھا۔ بالا جی راؤ کی موجودگی سے بھی
ے کھٹکا لگا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مگر میں نے اپنے حواس کو پوری

طرح اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے کافی حد تک یقین تھا کہ ان لوگوں کے پاس ایسای کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ میں پاکستانی انٹیلی جنیس سے ملا ہوا ہوں۔ بال ٹھاکرے اپنے شاندار کمرے میں بڑے صوفے پر بڑے شاہانہ انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔ سلک کا زعفرانی لمبا چولا' سلک کا اسی رنگ کا پاجامہ' انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں' کاندھے پر گہرا سیندوری رنگ کا ریشمی پٹکا۔ پیچھے شیوا جی مرہٹہ کا گھوڑے والا مجسمہ۔ میں نے جاتے ہی ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ جھک کر اس کے گھٹنوں کو چھوا۔ وہ مجھے آنکھیں سکیڑ کر گھورتا رہا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ کہنے لگا۔

"دھرم چند! اس بار تم سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ پنڈی میں پولیس نے ناکہ بندی کر رکھی ہے اور ہر چوک میں چیکنگ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پیشوا جی! یہ غلطی مجھ سے ضرور ہوئی ہے لیکن....."

پیشوا جی کا لقب میں نے اس لیے استعمال کیا تھا کہ بھارتی سفارت خانے کے ایک اسسٹنٹ پریس سیکرٹری نے ٹھاکرے کو خفیہ پیغام بھیجتے ہوئے اس کا یہی لقب لکھا تھا۔ بعد میں بالا جی کی زبانی معلوم ہوا کہ ٹھاکرے کو اپنا یہ لقب بھی بہت پسند ہے۔ میری بات کو کاٹتے ہوئے بال ٹھاکرے بولا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں ہوتا دھرم چند۔ تم سے بڑی خطرناک غلطی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تم آدمی لے کر پاکستان نہیں جاؤ گے۔ تمہاری جگہ بالا جی راؤ جائے گا۔"

میرے سر پر اس خدشے کی جو تلوار لٹک رہی تھی کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہوگیا ہو وہ میرے سر پر سے ہٹ گئی تھی۔ بال ٹھاکرے کو مجھ سے شکایت ضرور پیدا ہوگئی تھی لیکن یہ شکایت ایسی خطرناک نہیں تھی میں نے کہا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر مہاراج۔"

بالا جی راؤ میری طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے میرے خلاف بال ٹھاکرے کے کان بھرے ہیں۔ میں نے کوئی پروا نہ کی۔ مجھے بھارت میں ان لوگوں کے درمیان رہ کر جو کام کرنا تھا وہ مجھے ہر حالت میں کرنا تھا اور میں کر رہا تھا۔ ڈر صرف ایک بات کا تھا کہ کہیں میری اصلیت ظاہر نہ ہو جائے۔ ایسا ابھی نہیں ہوا تھا۔ میں ابھی تک محفوظ رہ کر اپنا پاکستان کی سلامتی کا مشن جاری رکھ سکتا تھا۔ بال ٹھاکرے کہنے لگا۔

"بالا جی پہلے بھی پاکستان دو چار بار جا چکا ہے۔ باقی اسے کچھ پوچھنا ہو گا تو تم سے پوچھ لے گا۔"

میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص میری کیا ڈیوٹی لگاتا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی بھی کارکن کبھی فارغ نہیں رہا تھا۔ یہ لوگ اس کے حکم پر پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کے خلاف کسی نہ کسی تخریبی کاروائی میں لگے رہتے تھے۔ میں خود پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بال ٹھاکرے بالا جی راؤ سے پاکستان میں دہشت گردی کی نئی پالیسی کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"دھرم چند! تم کافی دنوں سے اپنے بال بچوں کے پاس نہیں گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے تم اپنے گاؤں جا کر آرام کرو۔ تمہاری پتنی بھی تمہارے بغیر اداس ہو گی۔ کیوں؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

بال ٹھاکرے کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ میرے بارے میں اس کے دل میں کوئی شکوک و شبہات نہیں تھے۔ کم از کم میں نے یہی نتیجہ نکالا تھا۔ باقی دلوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ "ہاں مہاراج! پتنی جاتی ساوتری ہو تو وہ اپنے پتی کے بغیر تو

ضرور اداس ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم کل اپنے گاؤں چلے جانا۔ پیسوں کی ضرورت ہو تو دفتر سے لے لینا۔ لیکن دس پندرہ دن سے زیادہ نہ لگانا۔ یہاں تمہاری ضرورت رہے گی۔"

میرا بڑا اہم مسئلہ اس نے خود ہی حل کر دیا تھا۔ اس وقت میرے سامنے اکھنور کی توپوں والی قلعہ بندی کا مشن تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا بہانہ بنا کر بمبئی سے نکل سکتا ہوں۔ بال ٹھاکرے نے خود ہی میرے مشن کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"پیشوا جی! ابھی میرے پاس پیسے ہیں ضرورت پڑی تو منگوا لوں گا۔"

بالا جی راؤ کہنے لگا۔

"ان پیسوں کا حساب کتاب بھی رکھتے جانا۔"

بال ٹھاکرے نے اس کے جواب میں کہا۔

"حساب کتاب ہوتا رہے گا۔ دھرم چند تم ہزار بارہ سو روپے آفس سیکرٹری سے لے لینا میں اسے کہہ دوں گا۔"

ایک بات ثابت ہو گئی تھی کہ بالا جی راؤ اندر سے میرے خلاف ہو چکا تھا اور وہ مجھے راستے سے ہٹا کر خود بال ٹھاکرے کی آنکھوں کا تارا بننا چاہتا تھا۔ میرے خلاف بات کرنے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ حالانکہ پہلے اس کا میرے ساتھ سلوک بڑا دوستانہ تھا لیکن جب سے اس نے محسوس کیا تھا کہ بال ٹھاکرے مجھ پر زیادہ اعتماد کرنے لگا ہے تب سے وہ مجھ سے حسد کرنے لگا تھا۔ میں بھی اندر سے ہوشیار ہو گیا تھا اور اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے خلاف بال ٹھاکرے کے کان بھر سکے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں جس مشن کو لے کر بھارت میں داخل ہوا تھا اس اہم مشن کو بھی میں نے نہیں بھلایا تھا۔ وہ میری زندگی کا اہم ترین مقصد بن چکا تھا۔ یعنی بھارت میں رہ

کر پاکستان دشمن شیوسینا' آر ایس ایس اور دوسری متعصب ہندو جماعتوں کے مسلمان اور پاکستان کے خلاف ناپاک عزائم کو خاک میں ملانا۔

میں نے اگلے روز شیوسینا کے آفس سیکرٹری سے بارہ سو روپے لے کر اسے رسید دی اور بذریعہ ٹرین بمبئی سے روانہ ہو کر جموں پہنچ گیا۔ مجھے دھرم چند کی پتنی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں سیدھا کمانڈو شیرباز سے جا کر ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ ہم اکھنور کی توپوں اور سنگر میزائلوں کو اڑانے کا کمانڈو آپریشن جلد سے جلد شروع کر سکیں۔ جموں میں میں اس ہوٹل میں ٹھہرا جہاں ہمارا بوڑھا کشمیری حریت پسند بھی ملازم تھا۔ اور اس علاقے میں چھپ چھپ کر آنے والے کشمیری مجاہدوں کی پیغام رسانی کرتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا کہ میں آ گیا ہوں ہوٹل کے پرانے کمرے میں ہی ٹھہرا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی کمرے میں گلدان رکھنے کے بہانے آگیا۔ میں نے اسے کہا۔

"بابا! کمانڈو شیرباز کو میرا پیغام پہنچا دو کہ میں جموں پہنچ گیا ہوں اور آج رات خفیہ پناہ گاہ میں اس سے ملنے آ رہا ہوں۔"

بوڑھے کشمیری نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور گلدان کارنس پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ کوئی دو گھنٹے میں نے آرام کیا۔ چار بجے اٹھا تو بوڑھا کشمیری بستر کی چادریں بدلنے کے بہانے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے قریب آ کر آہستہ سے بولا۔

"شیرباز تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ کہتا تھا رات گیارہ بجے سے پہلے ہوٹل سے نہ نکلنا۔"

میں نے کہا۔ "ایسا ہی ہو گا۔"

گیارہ بجے ہوٹل سے نکلنے کی بجائے میں نے یہ کیا کہ چھ بجے شام کو ہی فلم دیکھنے چل دیا۔ میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک کو بتا دیا کہ میرا کھانا باہر ہے اور اس کے بعد ہم کچھ دوست مل کر فلم دیکھنے جائیں گے اور رات کو شاید میں دیر

سے آؤں۔ میں ایک سنیما ہاؤس میں گھس گیا۔ ساڑھے نو بجے تک فلم دیکھتا رہا۔ اس کے بعد جموں شہر کے جدید علاقے کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور وہیں چائے وغیرہ پیتے ہوئے وقت گزار دیا۔ جب رات کے گیارہ بج گئے تو میں ہوٹل سے نکلا اور اس علاقے کی طرف چلنے لگا جہاں پہاڑیوں میں ایک جگہ کمانڈو شیر باز نے اپنا عارضی ہائیڈ آؤٹ بنا رکھا تھا۔

خوب سردی پڑ رہی تھی۔ کشمیر کی پہاڑیوں میں برفباری ہوئی تھی جس کی سرد ہوا نے جموں کی رات کو سرد کر دیا تھا۔ میں نے گرم جیکٹ اور گرم پتلون پہن رکھی تھی۔ سر پر اونی ٹوپی تھی اور گلے میں گلوبند تھا۔ جیب میں کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں تھا۔ اگرچہ میں نے کمانڈو ٹریننگ حاصل کی ہوئی تھی مگر اس وقت جیب میں کوئی ریوالور یا کمانڈو چاقو رکھنا مناسب نہیں تھا۔ میں جس خشک پہاڑی علاقے سے گزر رہا تھا وہ خاموش اور سنسان تھا۔ جموں شہر کی روشنیاں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔ جگہ میں نے دیکھی ہوئی تھی اس کی خاص نشانی دو چھوٹے ٹیلے تھے جن کے درمیان ایک درہ تھا۔ یہاں سے گزر کر مجھے کمانڈو شیر باز کی خفیہ کمیں گاہ میں پہنچنا تھا۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور تارے بھی نکلے ہوئے تھے۔ بڑی مدھم روشنی تھی۔

اس روشنی میں ٹیلوں کو پہچان کر میں درے میں داخل ہوگیا۔ یہاں سے گزرنے کے بعد بائیں جانب مڑا تو مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی میں وہیں رک گیا۔ میں نے زبان بند رکھی اور اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں کوئی خشک جھاڑیوں میں سے چل کر میرے قریب آگیا۔

"حیدر علی!"

یہ کمانڈو شیر باز تھا۔ ہم خفیہ پناہ گاہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں پہلے سے ایک موم بتی روشن تھی۔ زمین پر خشک جھاڑیوں کے اوپر دری بچھی تھی اور ایک لحاف پڑا تھا۔ کمانڈو شیر باز میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے پاکستان میر

ہشت گردوں کی عبرتناک موت کے سارے واقعات سنائے تو وہ خوش ہو کر
لا۔
"بہت خوب لیکن بال ٹھاکرے وغیرہ کو تم کو کوئی شک تو نہیں پڑا۔"
میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے خود
مجھے جموں کشمیر کی طرف پاکستانی جاسوسوں کا کھوج لگانے کے لیے بھیجا ہے۔"
میں نے شیر باز کو بالکل نہ بتایا کہ بال ٹھاکرے نے مجھے گاؤں اپنی پتنی دھرم
چند کی پتنی سے ملنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ بات میں کمانڈو شیر باز کو ہرگز نہیں بتا
سکتا تھا کیونکہ اس پر میں نے ابھی تک یہ راز ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں دھرم چند کا
ہم شکل بن کر یہاں آیا ہوا ہوں۔ اب اگر میں اسے بتا بھی دیتا تو اس میں کوئی
حرج نہیں تھا مگر میں ابھی اس راز کو شیر باز پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ
اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یہی معلوم تھا کہ میں محب وطن پاکستانی ہوں
اور پاکستان کی سلامتی اور آزادی کشمیر کے مشن کو لے کر اپنے طور پر بھارت
میں آیا ہوں اور ہندو بن کر شیوسینا میں بھرتی ہو گیا ہوں اور اپنی ہوشیاری اور
عقل مندی سے میں نے بال ٹھاکرے کا بھرپور اعتماد حاصل کر لیا ہے۔
میں نے شیر باز سے کہا۔
"شیر باز! بال ٹھاکرے نے مجھے ہفتہ دس دن کے لیے اس علاقے میں
پاکستانی جاسوسوں کا کھوج لگانے کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے بعد مجھے واپس بمبئی
چلے جانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوران ہم اکھنور کی قلعہ بندیوں کو اڑا
دیں۔ کیا تم اس کمانڈو آپریشن کے لیے تیار ہو؟"
کمانڈو شیر باز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"اللہ پاک کے حکم سے میں بالکل تیار ہوں مجھے بتاؤ کہ ہمیں اس آپریشن
کے لیے کس قسم کا اسلحہ درکار ہوگا۔"
میں نے شیر باز سے کہا۔

"سب سے پہلے میں جس بات کی وضاحت بہت ضروری سمجھتا ہوں اور جو
میری مجبوری ہے وہ یہ ہے کہ یہ کمانڈو آپریشن ہمیں رات کی تاریکی میں چھاپہ
مار گوریلوں کی طرح اپنی جان کی بازی لگا کر دشمن کے مورچوں میں گھس کر سر
انجام دینا ہوگا۔"

کمانڈو شیر باز میری طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔

"لیکن حیدر علی! تمہیں تو یہ آسانی حاصل ہے کہ تم دن کے وقت بھی ٹیلے
کی بھاری قلعہ بندیوں اور پیرا میٹروں میں جا سکتے ہو اور وہاں اپنی مرضی کے
مطابق توپوں اور سنگر میزائیلوں کے بیس میں ڈائنامیٹ لگا سکتے ہو۔ ٹیلے پر
مورچہ بند آرٹیلری ریزرو بٹالین کو تم کہہ سکتے ہو کہ تم بھارت کی سنٹرل ڈیفنس
انٹیلی جینس کے سپیشل آفیسر ہو۔ اس سہولت کے ہوتے ہوئے ہمیں رات کے
اندھیرے میں چھپ کر وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے شیر باز سے کہا۔

"یہی سہولت میری سب سے بڑی مجبوری ہے۔ مین نہیں چاہتا کہ اس
مشن کے دوران وہ لوگ میری شکل دیکھیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ کرنل رام سنگھ
اور اس کی ریزو بٹالین کا ہر چھوٹا بڑا آفیسر میرے بارے میں جانتا ہے کہ میں
سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کا آدمی ہوں۔ مجھ پر دروازے کھلے ہیں۔ میں بڑی
آسانی سے ٹیلے کی قلعہ بندیوں میں جا کر جہاں چاہوں دھماکہ خیز مائیکرو چپس
بم لگا سکتا ہوں۔ اس طرح قلعہ بندیوں کی توپیں اور سنگر میزائیل سارے کے
سارے تباہ ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد جب میں بمبئی گیا تو میری گرفتاری
یقینی ہے۔ اس سے پہلے بھی میں اسی طرح جالندھر کا پرتھوی میزائیلوں کا اڈہ تباہ
کر چکا ہوں۔ اب یہ مورچہ تباہ ہوا تو ان لوگوں کو مجھ پر جو تھوڑا سا شک پڑ
ہے وہ یقین میں تبدیل ہو جائے گا۔ ہم اکھنور کی توپوں کو تو اڑا دیں گے لیکن
اس کے بعد میں پاکستان کی سلامتی کے اپنے مشن کو جاری نہ رکھ سکوں گا

کیونکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ اکھنور کی توپوں کے مورچے اور سٹنگر میزائیلوں کی تباہی کے بعد مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ بالا جی راؤ پہلے ہی میرا دشمن ہے اور وہ میرے خلاف کسی موقع کی تلاش میں ہے۔ اسے موقع مل جائے گا وہ بال ٹھاکرے اور ڈیفنس انٹیلی جینس کے لوگ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ میں جہاں جاتا ہوں وہاں انڈین آرمی کی کوئی نہ کوئی اہم تنصیبات دھماکوں سے اڑ جاتی ہیں۔ نہیں نہیں شیر باز میں موت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رات کے اندھیرے میں دشمن کے مورچوں میں گھس کر ڈائنامیٹ لگانے کی کوشش کروں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے لیکن دشمن کی صرف تین توپوں کو تباہ کرنے کے واسطے میں اپنے پاکستان کی سلامتی کے مشن سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ بھارت ہمارا دشمن نمبر ایک ہے۔ وہ کشمیریوں کی آزادی کو مستقل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے اور پاکستان کو ختم کرنے کے واسطے نت نئے حربے اور ہتھیار تیار کر رہا ہے۔ مجھے ایک ایک کر کے ان حربوں اور ہتھیاروں کا کھوج لگانا اور انہیں تباہ کرنا ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔"

کمانڈو شیر باز کا چہرہ اور اس کی عقابی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ کہنے لگا۔

"تم ٹھیک لائنوں پر سوچتے ہو۔ میں ایک ہزار ایک بار اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہارے ساتھ اس مشن پر جانے کو تیار ہوں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس مشن کی کامیابی کے بعد بھارتی پولیس تمہیں گرفتار کر لے۔ کوئی پروا نہیں ہم کمانڈو ہیں۔ اسلام کے کمانڈو ہیں۔ ہم اس قسم کے مشن پر تو جاتے ہی رہتے ہیں۔ ہمیشہ رات کی تاریکی میں جان خطرے میں ڈال کر دشمن کے پیٹ میں گئے ہیں اور اپنا ٹارگٹ مار کر آئے ہیں۔ انشاء اللہ ہم اس بار بھی کامیاب لوٹیں گے۔ مجھے بتاؤ ہمیں کتنا دھماکہ خیز مواد وغیرہ ساتھ لے جانا ہو گا۔ کیونکہ

قلعہ بندیوں کی تینوں توپیں بہت بڑی ہیں۔ اور بہت مضبوط ہیں۔ ان پر عام قسم کے گرنیڈوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ پوائنٹ میرے ذہن میں ہے۔ میں جانتا ہوں اتنی بڑی توپوں کو اڑانے کے لیے اتنے ہی طاقتور دھماکہ خیز مواد کی ضرورت ہے لیکن تم ایک بات بھول گئے ہو۔ میں ان دونوں توپوں کے پیرامیٹروں اور بائیں جانب ٹیلے کی چوٹی پر نصب شدہ سٹنگر میزائیلوں کا اتنے قریب سے سروے کر چکا ہوں کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ توپوں کی قلعہ بندیوں کے درمیان فاصلہ کتنا ہے اور وہاں گھاس کس قسم کی ں ہوئی ہے۔"

"تو پھر تم کیا مشورہ دیتے ہو؟" شیر باز نے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ "میری بات غور سے سنو یہ دور مار توپیں پکی گنبد نما چھت والے پیرامیٹروں کے اندر لگی ہوئی ہیں۔ ان توپوں کے پچاس کے قریب بڑے بڑے گولے ہر مورچے کے اندر دیوار کے ساتھ کھڑے کیے گئے ہیں۔ لیکن ان گولوں کا اصل ذخیرہ ان قلعہ بندیوں کے عین نیچے ایک تہہ خانے میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ چھوٹا سا ایک اور تہہ خانہ اس تہہ خانے کی دیوار کے جڑا ہوا ہے۔ اس تہہ خانے میں ڈرموں کی شکل میں پٹرول کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ ہمارا اصل ٹارگٹ یہ دونوں تہہ خانے ہوں گے۔ ہم باہر سے چل کر یا رینگ کر توپوں تک نہیں پہنچ سکتے وہاں ہر وقت دس بارہ سنتریوں کی مسلح گارد موجود رہتی ہے۔ ہم اس ٹیلے کے خاردار تاروں والے گیٹ کے راستے سے بھی داخل نہیں ہو سکیں گے ۔ ایک تو وہاں رات کو روشنی ہوتی ہے دوسرے وہاں بھی مسلح گارد چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتی ہے۔"

"تو پھر ہم ٹارگٹ پر کیسے پہنچیں گے؟"

میں نے شیر باز کے اس سوال کے جواب میں کہا۔

"ٹیلے کی تین طرف کھائیاں ' پتھر اور جھاڑیاں ہیں۔ ایک طرف ڈھلان پر

بارودی سرنگیں بچھی ہیں اس طرف جانا خوامخواہ موت کو دعوت دینا ہے۔ ایک جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشین گنوں کی پوسٹیں ہیں۔ تیسری طرف ریزرو بٹالین کی بیرکیں ہیں۔ اس طرف سے بھی اگر رات کے وقت کوئی بلا بھی گزرے گا تو گارڈ پوسٹ کو خبر ہو جائے گی اور روشنی راؤنڈ فائر ہو کر آسمان اور زمین کو روشن کر دیں گے۔ ساتھ ہی مشین گنیں گولیوں کی بوچھاڑیں مارنی شروع کر دیں گی۔"

شیر باز نے بے صبری سے کہا۔

"ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے اسی سوال کے جواب کی طرف آ رہا تھا۔ ٹیلے کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جہاں سے ہم اوپر جانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور وہ ٹیلے کی چوتھی جانب والا برساتی تالاب ہے۔ میں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ ٹیلے کی چوتھی جانب اونچے اونچے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا ایک برساتی تالاب ہے جس میں بارش کا پانی ہر موسم میں جمع رہتا ہے۔"

شیر باز موم بتی کی روشنی میں بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹیلے پر مورچہ بند یونٹ کے لنگر خانے وغیرہ کا فالتو پانی نیچے اسی تالاب میں آ کر گرتا ہے۔ ٹیلے کا یہ پہلو چونکہ بٹالین کی فوجی بیرکوں کے بالکل سامنے ہے اس لیے یہاں ٹیلے کے نشیب میں کوئی مشین گن پوسٹ نہیں ہے اور بارودی سرنگیں بھی نہیں بچھائی گئیں۔ میں پورا سروے کرنے کے بعد تمہیں بتا رہا ہوں۔ اسی جانب ایک چھوٹا سا دھوبی گھاٹ بنا ہوا ہے جہاں دن کے وقت دھوبی فوجی وردیاں چادریں وغیرہ دھوتے ہیں اور وہیں سکھانے کے لیے ڈال دیتے ہیں۔ دھوبی گھاٹ چوڑے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے چار پانچ چبوتروں کی شکل میں ہے۔ یہاں دو چھوٹی حوضیاں ہیں جن میں پائپوں کے ذریعے پانی گرتا ہے۔ دھوبی گھاٹ سے تھوڑا اوپر ٹیلے کی ڈھلان پر ہی پانی کی ایک بڑی ٹینکی ہے جس میں نیچے سے پانی سپلائی ہوتا ہے اسی ٹینکی کے پہلو میں چھ سات سیڑھیاں اتر کر ایک چھوٹا سا تہہ خانہ ہے جہاں دھوبی میلی وردیوں کے گٹھڑ رکھتے ہیں۔ ہمارا ٹارگٹ یہ تہہ خانہ ہوگا۔"

کمانڈو شیر باز کچھ سمجھ نہ سکا۔ کہنے لگا۔

"تہہ خانہ ٹارگٹ ہوگا؟ وہ کیسے؟"

میں نے جیکٹ میں سے نوٹ بک اور پنسل نکال کر شیر باز کے سامنے کاغذ پر ٹیلے کے دھوبی گھاٹ کا نقشہ بنایا۔ پھر وہاں پانی کی بڑی چوکور ٹینکی بنائی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نشان لگا کر کہا۔

"اس جگہ تہہ خانے کی سیڑھیاں ہیں۔ یہ کوئی باقاعدہ تہہ خانہ نہیں ہے۔ زمین پر گہرا گڑھا کھود کر فرش پر پتھروں کا فرش بنا دیا گیا ہے۔ دھوبی یونٹ کے اپنے سپاہی نہیں ہیں بلکہ وہ قریبی گاؤں سے آتے ہیں اور اس گڑھے میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ رکھتے ہیں۔ دھلی ہوئی وردیوں اور چادروں کو وہ اوپر لنگر خانے کے ساتھ والی بارک میں لے جا کر استری کرتے ہیں۔ اس گڑھے یا تہہ خانے کو میں نے ٹارگٹ اس لیے کہا ہے کہ اس کی ایک دیوار دوسری جانب سے توپوں کی قلعہ بندیوں کے نیچے جو گولوں اور پٹرول کا ذخیرہ ہے اس سے ملی ہوئی ہے۔ اسی ذخیرے میں سٹنگر میزائیل بھی ہیں۔ یہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ میں نے اسی وقت دل میں طے کر لیا تھا کہ ان توپوں اور سٹنگر میزائیلوں کا باہر سے میں کیا دنیا کا کوئی ماہر کمانڈو بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایک تو وہاں سیکورٹی اتنی سخت ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مسلح سپاہی وہاں ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ دوسرے توپیں اتنی مضبوط اور بڑی ہیں کہ اگر ان کی نالیوں میں گرنیڈ بھی ڈال دیں تو توپ کی نالی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ توپوں کے نیچے زمین کے اندر جو بارود پٹرول اور توپ کے گولوں کا ذخیرہ ہے اس میں آگ لگا دی جائے۔ جب لاکھوں من بارود دھماکے سے پھٹے گا تو توپوں اور سٹنگر میزائیلوں کے ساتھ سارے کا سارا ٹیلہ بھی اڑ جائے گا۔"

اب میرا خیال ہے تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے دھوبی گھاٹ کے تہہ خانے کو اپنا ٹارگٹ کیوں کہا تھا۔"

کمانڈو شیر باز سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں دھوبی گھاٹ کے تہہ خانے کی دیوار میں شگاف ڈال کر دوسری جانب ایمونیشن کے ذخیرے میں پہنچنا ہو گا۔"

"اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر ہم اس ٹارگٹ کو تباہ کرنا

چاہتے ہیں تو ہمیں دھوبی گھاٹ کے تہہ خانے کی دیوار میں خفیہ طور پر اتنا سوراخ بنانا ہوگا جس میں سے گزر کر ہم دوسری طرف گولہ بارود اور پٹرول کے ذخیرے میں پہنچ سکیں۔

کمانڈ شیرباز کہنے لگا۔

"لیکن یہ ایک رات کا کام نہیں ہے۔ اس میں کم از کم دو تین راتیں ضرور لگ جائیں گی۔"

میں نے کہا۔ "چاہے چھ راتیں لگ جائیں بس ہمیں صرف اتنی احتیاط کرنی ہوگی کہ رات کو دیوار جتنی کھودیں اسے اس طرح سے چھپا دیں کہ دن کے وقت کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ رات کو اس دیوار میں سوراخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس طرف چونکہ کوئی فوجی تنصیبات نہیں ہیں. اس لیے رات کو یہاں گشتی سنتری نہیں آتے ہم کم از کم سنتریوں کی گشت سے بے فکر ہو کر اپنا کام کر سکتے ہیں۔"

شیرباز نے کہا۔

"لیکن ہم کھودی ہوئی دیوار کو چھپائیں گے کیسے؟"

"یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ وہاں میلے کپڑوں کے جو گٹھڑ پڑے ہوتے ہیں ان سے چھپانے کا کام لیا جائے۔ اگر اس میں یہ خطرہ ہے کہ دن کے وقت دھوبی ان گٹھڑوں کو اٹھا بھی سکتے ہیں تو ہم صورت حال کے مطابق کوئی دوسرا طریق کار استعمال کریں گے۔ ویسے بھی دیوار مین زمین کے بالکل ساتھ صرف اتنا سوراخ ڈالنا ہوگا کہ ہم میں سے کوئی ایک آدمی رینگ کر اندر جا سکے۔

کمانڈو شیرباز مطمئن نہ تھا۔ جیب سے مڑا تڑا سگریٹ نکال کر اس نے موم بتی کی لو سے سلگایا اور ایک کش لگا کر کہنے لگا۔

"حیدر علی! کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا؟"

میں نے کہا۔ "دوسرا ایک ہی طریقہ ہے جو بے حد آسان ہے اور جس کے بارے میں تم بھی جانتے ہو کہ میں خود دن کے وقت تہہ خانے میں جا کر ڈائنامیٹ کے مائیکرو بم لگا آؤں۔ لیکن اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے یونٹ کے سنتری اور فوجی مجھے ضرور دیکھ لیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کرنل رام سنگھ کے علم میں بھی یہ بات آ جائے گی کہ میں توپوں کی قلعہ بندی کی تباہی سے ایک دن یا دو دن پہلے وہاں پر موجود تھا۔ اگر ٹیلے کی ساری یونٹ توپوں کے ساتھ اڑ بھی جائے گی تب بھی کرنل رام سنگھ بچ جائے گا۔ کیونکہ وہ پیرا میٹروں میں موجود نہیں ہوگا بلکہ اپنی بیرک میں ہوگا۔ یہ طریقہ کار آسان تو ضرور ہے اس میں جان کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ لیکن وہی بات کہ انڈیا کی انٹیلی جینس کو خاص طور پر بال ٹھاکرے کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اس بربادی میں میرا بھی ہاتھ ہے اور میری گرفتاری یقینی ہو جائے گی۔ اب جس طرح تم کہتے ہو میں اسی پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

کمانڈو شیر باز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تمہیں گرفتار نہیں ہونا چاہیے۔ تم گرفتار ہو گئے تو ہمارے پاکستان کی سلامتی اور کشمیری مجاہدوں کی مدد کے تمام مشن ادھورے رہ جائیں گے۔ ٹھیک ہے ہم دھوبی گھاٹ کے تہہ خانے سے توپوں کے نیچے رینگ کر داخل ہوں گے۔ آگے جو ہوگا اللہ مالک ہے۔"

ہمیں اس مہم کے لیے کسی خاص سامان کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے بڑے کمانڈو چاقو ہی کافی تھے۔ مائیکرو چپس کے چھ دھماکہ خیز بم ہمارے پاس موجود تھے۔ صرف ایک ایک آٹو میٹک، پستول ہم نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا جن کے آگے سائی لینسروں کی نالیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ انتظام بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تھا۔

"چنانچہ اگلی رات ہم شہر سے کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اندھیرے میں

پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم نے سیاہ پتلونیں اور سیاہ جرسیاں پہن رکھی تھیں۔ سروں پر سیاہ رنگ کی اونی کمانڈو ٹوپیاں تھیں۔ اندھیرے میں سایوں کی طرح چلے جا رہے تھے۔ کمانڈو شیر باز انتہائی تربیت یافتہ فل کمانڈو تھا۔ وہ آگے آگے تھا۔ رستہ ہمیں معلوم تھا بھارتی توپوں والی قلعہ بندیوں کا ٹیلہ ہمیں نظر آنے لگا۔ اس کی ڈھلان پر ایک طرف روشنی جھلملا رہی تھی۔ یہی اس ٹیلے کی سب سے بڑی نشانی تھی۔ ہم اوپر سے چکر کاٹ کر ٹیلے کی تالاب والی جانب نکل آئے۔ تالاب کے سرکنڈوں میں چھپ کر ہم نے ماحول کا جائزہ لیا۔ اوپر ٹیلے کی چوٹی پر ایک بتی جل رہی تھی۔ اس کے سوا وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"اوپر سے جو نالہ نیچے آ رہا ہے ہمیں اس کے ساتھ ساتھ چڑھائی چڑھ کر دھوبی گھاٹ تک جانا ہوگا۔"

بڑا کمانڈو چاقو کمانڈو شیر باز کے سیدھے ہاتھ میں تھا اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کہنے لگا۔

"میں آگے جاتا ہوں۔"

وہ سرکنڈوں کے پیچھے سے نکل گیا۔ ۔۔ ایک جگہ نالے کا پانی معمولی سی آواز کے ساتھ تالاب میں گر رہا تھا۔ ہم نالے کے ساتھ اوپر ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ وہاں جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں۔ ہم جھاڑیوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم رک کر ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے کہ کہیں کوئی گشتی پارٹی تو ادھر نہیں آ رہی۔ اگرچہ اس کا امکان بالکل نہیں تھا پھر بھی ہم ہر طرف سے محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔

مجھے اندھیرے میں نالے کی ایک جانب پانی کی چوکور ٹینکی نظر آئی۔ تو میں

نے اسے شیر باز کو بھی دکھایا۔ سرگوشی میں کہا۔

"ہمیں یہاں سے اپنا رخ ٹینکی کی طرف کرنا ہوگا۔"

ہم نالے سے ہٹ کر ٹینکی کے رخ پر چڑھائی چڑھنے لگے۔ اس طرف چھوٹے بڑے پتھر بہت تھے۔ ہم بڑی احتیاط سے پاؤں رکھ رہے تھے۔ تاکہ کہیں کوئی پتھر ہمارے پاؤں کی ٹھوکر سے لڑھکتا ہوا نیچے نہ گرے۔ اس سے آواز پیدا ہو سکتی تھی اور وہاں سے قریب ہی ٹیلے کی دوسری سائیڈ میں ڈھلان پر بھارتی یونٹ کی مشین گن پوسٹیں تھیں۔ ہم جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اب میں شیر باز کے آگے ہوگیا تھا۔ کیونکہ مجھے اس تہہ خانے کا علم تھا جہاں دھوبی رات کو میلی وردیوں کے گٹھڑ رکھتے تھے۔ ہم پانی کی ٹینکی کے قریب سے گزر گئے۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ ٹیلے والے مورچوں کی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ مجھے وہ سیڑھیاں نظر آگئیں جو نیچے گہرے گڑھے میں اترتی تھیں۔ یہ چھ سات پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ میں نے کمانڈو شیر باز کو اشارے سے بتایا کہ ہم سیڑھیوں کے پاس آ گئے ہیں۔ وہ جھک کر چلتا میرے پاس آ گیا۔ اندھیرے میں نیچے گڑھے کے اندر کپڑوں کے بڑے بڑے تین چار گٹھڑ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے۔

میں نے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ کمانڈو شیر باز نے جلدی سے کپڑوں کے گٹھڑوں کو ایک طرف کر دیا۔ ہم دیوار کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم نے بڑے چاقو نکال لیے تھے۔ میں نے دیوار میں چاقو کی نوک چبھوئی تو وہ اندر کو دھنس گئی۔ میں نے شیر باز کے کان میں سرگوشی کی۔

"ٹیلہ مٹی کا ہے پتھریلا نہیں ہے۔"

میں نے اللہ کا نام لے کر زمین کے بالکل برابر دیوار کھودنی شروع کر دی۔ ٹیلہ واقعی مٹی کا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے پتھر نکل آتے تھے۔ میں دل میں

صرف یہی دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے میرا اندازہ صحیح ہو اور توپوں کی قلعہ بندی کے نیچے جو اسلحہ کا تہہ خانہ ہے یہ وہی دیوار ہو۔ پانچ منٹ تک میں دیوار کھرچتا رہا۔ اس کے بعد کمانڈو شیر باز شروع ہوگیا۔ ہم نے دیوار پر دس بارہ انچ قطر کا نشان بنا دیا تھا اور اسی حساب سے دیوار میں شگاف ڈالتے جا رہے تھے۔ مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کو جو دیوار میں سے نکلتے تھے ہم انہیں گڑھے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اس طرح بچھا کر اوپر سے دبائے جاتے تھے کہ دیکھنے سے بالکل معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی کھدائی ہوئی ہے۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ ہمیں کھدائی میں کم از کم دو راتیں ضرور لگیں گی۔ میں نے رک کر دیوار کے ساتھ کان لگائے اور چاقو کے رستے سے ٹیلے کی دیوار پر ٹھک ٹھک کی۔ شیر باز نے بھی دیوار سے کان لگا دیا تھا۔ ہمارے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ دیوار کے اندر کھوکھلے پن کی آواز آئی۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ اسلحہ کے تہہ خانے کی دیوار ہی تھی اور ہم توپوں کے نیچے ٹھیک ٹارگٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم زیادہ تیزی سے کام کرنے لگ گئے۔ مٹی کا ٹیلہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہی ہم نے چاقو دیوار کے شگاف اندر کر کے چلایا تو مٹی اور چھوٹے پتھر ہماری طرف گرنے کی بجائے دیوار کی دوسری جانب گرنے لگے۔ میں نے شیر باز سے سرگوشی میں کہا۔

"خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

ہم نے جلدی جلدی شگاف کو تھوڑا اور چوڑا کیا اور سر ڈال کر میں نے دوسری جانب دیکھا۔ دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"میں اندر جاتا ہوں۔"

میں رینگ کر دیوار کے شگاف میں سے گزر گیا۔

دوسری طرف میں فرش پر دونوں ہاتھ جما کر لیٹ کر آگے کو کھسک گیا۔ میرے ہاتھ آگے کسی سخت چیز سے ٹکرائے۔ میں نے لیٹے لیٹے ٹٹول کر دیکھا۔ یہ لکڑی کا کھوکھا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں اس قدر اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر ایک طرف کو آہستہ آہستہ کھسکتا چلا گیا۔ میرے گھٹنے کسی لوہے ایسی سخت چیز سے ٹکرائے۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹولا۔ میرے خدایا! یہ بڑی توپوں کے گولے تھے جو دیوار کے ساتھ کھڑے کر دیے گئے تھے۔ میں ان گولوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا آگے گیا تو میرے گھٹنے کسی اور سخت چیز سے ٹکرائے میں رک گیا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔ پھر وہیں سے دیوار کو پکڑ پکڑ کر دیوار کے شگاف کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور شگاف میں سر ڈال کر شیر باز کو دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے موم بتی جلا کر دو۔"

اس مقصد کے لیے ہم دو موم بتیاں اور لائیٹر ساتھ لائے تھے۔ کمانڈو شیر باز نے موم بتی روشن کر کے شگاف میں سے مجھے پکڑا دی اور ساتھ ہی کہا۔

"احتیاط رکھنا۔ یہاں پٹرول اور گولہ بارود ہے۔"

میں نے موم بتی ہاتھ میں پکڑ کر ساتھ لے جانے کی بجائے وہیں شگاف کے پاس زمین پر لگا دی۔ موم بتی کی روشنی میں تہہ خانے کی ایک ایک چیز صاف نظر آنے لگی۔ میں حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ یہ تہہ خانہ کوئی پندرہ فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا ہوگا۔ سارے کا سارا تہہ خانہ بڑی توپوں کے بڑے بڑے گولوں، سٹنگر میزائیلوں اور پٹرول کے چھوٹے اور بڑے کینوں سے بھرا ہوا تھا۔ درمیان میں صرف چلنے پھرنے کے لیے تھوڑی سی جگہ تھی۔ سامنے کی جانب تہہ خانے کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس دروازے کی سیڑھیاں اوپر توپوں کی پختہ قلعہ بندیوں کو جاتی تھیں۔ یہ سیڑھیاں میں دن کے وقت قلعہ بندیوں کا معائینہ کرتے

وقت دو تین بار دیکھ چکا تھا۔ میں لکڑی کے کریٹوں اور بڑی توپوں کے گولوں کے درمیان سے دبے پاؤں چلتا تہہ خانے کے دروازے تک گیا۔ دروازہ لوہے کا تھا۔ میں نے کان لگا کر دوسری طرف سننے کی کوشش کی۔ دوسری طرف بھی خاموشی تھی۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ یا دو بجے ہوں گے۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ یہ موقع بے حد غنیمت تھا۔ میں جلدی سے شگاف کے منہ کے پاس جلتی موم بتی کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے جیکٹ کی جیب میں سے پلاسٹک کا لفافہ نکال کر کھولا۔ اس لفافے میں انتہائی طاقتور چھ مائیکرو چپس بم تھے۔

میں ایک ایک مائیکرو چپس کو موم بتی کی روشنی میں اچھی طرح سے چیک کیا۔ اس کے بعد تین چپس توپوں کے تین گولوں اور دو چپس بم پٹرول کے ڈبوں کے ساتھ اور ایک سٹنگر میزائیلوں کے درمیان میں ایک میزائیل کے نچلے حصے کے ساتھ چپکا دیا۔ ان کے دورانئے میں پہلے سے سیٹ کر رکھے تھے جو چوبیس گھنٹے تھا۔ اس حساب سے ان بموں کو اگلی رات اسی وقت یعنی دو بجے کے قریب پھٹنا تھا۔ مجھے شگاف میں سے کمانڈو شیر باز کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "سب ٹھیک ہے آ رہا ہوں۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ کام ایک ہی رات میں ختم ہو جائے گا۔ میں نے چھ کے چھ مائیکرو چپس کے ٹائم ڈیوائس انگلی کی ہلکی سی ٹھوکر سے توڑ ڈالے تھے اور تیزابی مادے کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اس مٹی کو جو شگاف میں اندر کی طرف گری تھی ادھر ادھر فرش پر بکھیر دیا۔ رینگ کر شگاف سے باہر آیا۔ شیر باز نے کہا۔

"شگاف کو بند کس طرح کریں؟"

میں نے کہا۔ "باہر سے کچھ بڑے بڑے پتھر اٹھا کر لاؤ۔"

شیر باز گیا اور دس بارہ چھوٹے بڑے پتھر لے آیا۔ میں نے سب سے پہلے بڑے پتھروں کو ہاتھ اندر ڈال کر ایمونیشن کے تہہ خانے والی دیوار کے آگے اس طرح لگا دیا کہ دوسری طرف سے دیکھنے پر پتہ نہ چلے یہاں سے دیوار کھودی گئی ہے۔ ایک تو اس ایمونیشن ڈمپ میں یونٹ کے سنتری ہر روز نہیں آتے جاتے تھے۔ کیونکہ یہاں رکھے ہوئے اسلحے کی ابھی انہیں ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے وہاں ظاہر ہے ایک آدھ بلب ہی روشن ہوتا ہوگا اور دیوار والا شگاف فرش کے بالکل ساتھ ملا ہوا تھا۔ میں نے پتھر اس طرح رکھے تھے کہ کسی کو شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے مٹی اور چھوٹے پتھر ڈال کر اپنی طرف شگاف کا منہ بند کر کے اس کے آگے بھی پتھر جوڑ کر چھوٹا سا تھڑا بنا دیا۔ تھڑے کے اوپر بھی کچھ خشک مٹی اور بارہ سے لا کر سوکھے پتے ڈال کر انہیں ہاتھوں سے اچھی طرح دبا دیا۔ پھر پرانی وردیوں کے گٹھڑ جیسے پہلے دیوار کے ساتھ لگے تھے ویسے ہی لگا دیے۔ اب ہمیں وہاں سے نکلنا تھا۔

سب سے پہلے میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ اوپر آتے ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور چاروں طرف اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ رات اسی طرح خاموش اور تاریک تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی اور ہم نے اس سارے ٹیلے کو تین قلعہ بندیوں والی بڑی ترشول توپوں اور سنگر میزائیلوں کے ذخیروں سمیت اڑانے کا کام مکمل کر لیا تھا۔ میں نے آہستہ سے شیر باز کو آواز دی۔ وہ بھی گڑھے میں سے باہر نکل آیا۔ ہم جھک کر جھاڑیوں کی اوٹ میں رہ کر نالے کے ساتھ ساتھ ٹیلے کی ڈھلان پر سے اترنے لگے۔ پیرامیٹروں والے کیمپ کی طرف سے کسی ٹرک کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ ہم رک گئے تھے اور اس آواز کو غور سے سن رہے تھے۔ شیر باز نے کہا۔

"یہ ٹرک ریزو بٹالین کی بارکوں کی طرف گیا ہوگا۔"

فوجی ٹرک کی آواز جب دور ہوگئی تو ہم ڈھلان سے اترنے لگے۔ ہم تالاب کے پاس آ گئے۔ یہاں سرکنڈوں کے درمیان چھوٹا راستہ ٹیلے سے نکل کر آگے جنگلی ٹیکریوں کی طرف چلا گیا تھا۔ ہمیں ادھر ہی جانا تھا۔ جیسے ہی ہم چلنے لگے دو تین آدمیوں کی باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آواز آئی۔ ہم جلدی سے سرکنڈوں کے پیچھے ہوگئے۔ ہم بالکل کندھے سے کندھا ملائے سرکنڈوں کے درمیان چھپ کر بیٹھے تھے۔ آوازیں ہماری طرف آ رہی تھیں یہ بھارتی فوجی تھے۔ خدا جانے یہ اس وقت گشت پر کیسے نکل آئے تھے۔ میری اطلاع کے مطابق اس طرف کوئی گشتی پارٹی نہیں آتی تھی۔ ہم نے سانس روک لیے۔ یہ تین فوجی تھے۔ وہ ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے چلے آ رہے تھے۔ ہم سرکنڈوں میں جلدی سے چھپے تھے اور اپنے آپ کو پوری طرح سے محفوظ نہیں کر سکے تھے۔ اگر کوئی ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے غور سے دیکھتا تو رات کے اندھیرے میں بھی ہم انہیں نظر آ سکتے تھے۔

ایک بھارتی فوجی آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دو فوجی تھے۔ پچھلے فوجی اگلے فوجی کو مذاق کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ ان کے مذاق سے تنگ آ کر آگے ہوگیا ہے۔ ان کے درمیان چار پانچ قدم کا ہی فاصلہ تھا۔ راستہ تنگ تھا۔ اگلا فوجی ہمارے قریب سے بڑبڑاتا اور دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو گالیاں دیتا ہوا ہمارے قریب سے گزرا تو مجھے اندھیرے میں اس کی سٹین گن نظر آئی جو اس نے سلنگ کے ذریعے کاندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ شیر باز نے بھی اسے دیکھا اور میرے ساتھ لگ گیا۔ فوجی آہستہ آہستہ چلتا گزر گیا۔ اس کے بعد دونوں فوجی بھی آ گئے۔ وہ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے چلے آ رہے تھے۔ ان کی سٹین گنیں بھی کندھوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے آگے جانے والے فوجی کو آواز دی۔

"ٹھنڈو رام ڈبل سے' ڈبل سے۔"

اور پھر دونوں ہلکے ہلکے قہقہے لگا کر ہنستے ہوئے ہمارے بالکل قریب سے ہو کر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں سگریٹ کے دھوئیں کی بو محسوس ہوئی۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ کافی آگے نکل گئے ہیں تو ہم جلدی سے سرکنڈوں میں سے نکلے اور اندھیرے میں تنگ راستے پر جھک کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ تالاب کے اردگرد اگے ہوئے سرکنڈوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہم کھلی جگہ پر آ گئے۔ جہاں فاصلے فاصلے پر جھاڑیاں تھیں۔ درخت کوئی نہیں تھا۔ ہم نے جھاڑیوں کے درمیان دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم اس علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے دور ہو جانا چاہتے تھے۔ ہم نے رات کی تاریکی میں دوڑتے ہوئے خالی میدان پار کر لیا۔ آگے جموں کی مغربی خشک پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ پہاڑیاں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی شکل میں تھیں جو ہم سے کافی فاصلے پر تھیں۔ یہاں آ کر ہم ایک جگہ سانس لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ شیر باز کہنے لگا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ مائیکرو چپس وقت پر پھٹ جائیں گے؟"

میں نے کہا۔ "پونے سو فیصد یقین ہے۔ ہاں کوئی ٹیکنیکل خرابی نہ پیدا ہو جائے۔"

"خدا نہ کرے۔" کمانڈو شیر باز نے کہا۔

ہم وہاں صرف ایک ڈیڑھ منٹ کے لیے رکے اور آگے چل پڑے۔ ہمیں وہاں سے چھ میل دور جموں شہر کی جنوبی پہاڑیوں کے جنگل میں کمانڈو شیر باز کی خفیہ پناہ گاہ میں جانا تھا۔ ہم رات کی تاریکی میں چلتے گئے۔ چلنے سے سردی کا احساس بالکل ختم ہوگیا تھا۔ ہمارے جسم بھی گرم ہوگئے تھے۔ داہنی جانب ہمیں دور سے پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر جموں شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"یقین نہیں آتا کہ اتنا اہم کمانڈو آپریشن اتنی جلدی ختم ہوگیا۔"

میں نے کہا۔ "ہماری خوش قسمتی تھی کہ ٹیلہ مٹی کا تھا۔ اگر دوسرے

پہاڑوں کی طرح پتھر کا ہوتا تو یہ کام تین راتوں میں بھی مکمل ہونے والا نہیں تھا۔"

اپنی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا پھر دعا مانگی کہ ہمارے لگائی ہوئے فیوز ٹھیک وقت پر پھٹ جائیں۔ اس کے بعد ہم وہیں پڑ کر سو گئے۔ پہلے میری آنکھ کھلی تو پناہ گاہ کے اوپر ایک جانب جو تازہ ہوا کے لیے سوراخ رکھا گیا تھا اور جس کے اوپر جھاڑیاں ڈال کر اسے کیموفلاج کیا گیا تھا وہاں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ شیر باز ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا۔ اس دوران ہم نے اپنا کمانڈو والا کالا لباس اتار کر عام شہریوں والے اپنے کپڑے پہنے۔ کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا۔ "واپس بمبئی جاؤں گا۔"

"لیکن تمہیں کل رات تک تو یہیں ٹھہرنا چاہیے تاکہ اکھنور کی توپوں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔"

میں نے اسے جواب دیا۔

"ان حالات میں میرا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں کی پولیس مجھے پہچانتی ہے۔ ان میں سے کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو ٹارگٹ کی تباہی کے بعد کسی کی زبان سے فوج کے آگے میرا نام نکل سکتا ہے۔ یوں یہ بات بمبئی بال ٹھاکرے تک پہنچ سکتی ہے۔ اس تباہی کے منظر کو تم دیکھنا۔ میں اس کی خبر اخباروں میں پڑھ لوں گا۔ میں تو ابھی جموں شہر سے لاری میں بیٹھ کر جالندھر اور وہاں سے کوئی ٹرین پکڑ کر دلی روانہ ہو جاؤں گا۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"جیسے تم مناسب سمجھتے ہو ویسے ہی کرو۔ اب ایسا ہے کہ اگر تمہیں میری ضرورت پڑے تو جموں کے کیلاش ہوٹل والے بوڑھے کشمیری سے رابطہ پیدا کر

کے تم مجھے پیغام بھجوا سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں۔ دن کافی نکل آیا ہوگا۔"

کمانڈو شیر باز نے اوپر سوراخ کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ "باہر تو بادل چھائے ہوئے ہیں۔"

"پھر تو مجھے بارش سے پہلے یہاں سے چل دینا چاہیے۔ اچھا دوست!"

کمانڈو شیر باز مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا اور مجھے پناہ گاہ کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ باہر واقعی آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے کالے بادل تھے۔ سخت سردیوں کا موسم تھا مگر بادل برسات کے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے شیر باز سے ہاتھ ملایا اور جموں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ لاری اڈے تک سوکھے کپڑوں کے ساتھ پہنچ جاؤں۔ بادل بالکل برسنے کو تیار تھے۔ سرد ہوا بھی چل رہی تھی۔ لیکن بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چلنے کی رفتار تیز کر دی تھی۔

آخر میں ویران جنگلی میدانوں سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہاں مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی والے سے پوچھا کہ اس وقت جالندھر کو کوئی ٹرین جاتی ہے؟ اس نے بتایا کہ ایک گھنٹے بعد جموں امرتسر ایکسپریس جائے گی۔ اس نے میرا سارا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے اسے سٹیشن چلنے کو کہا اور پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

ٹیکسی جموں توی ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچی تو بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مگر اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جموں کے سٹیشن پر کافی مسافر بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب بال ٹھاکرے کو میں دھرم چند کی پتنی یعنی اپنی نقلی پتنی سے ملنے کا کہہ کر آیا ہوں ساتھ ادھر کا بھی ایک چکر لگا لینا چاہیے تاکہ خانہ پری ہی ہو جائے۔ میں نے جالندھر کی بجائے بٹالے کا ٹکٹ لے لیا۔ ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر لگی۔ میں ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹرین چلی تو باقاعدہ بارش ہو رہی تھی۔

میں نے گرم جیکٹ اور مفلر پہنا ہوا تھا۔ سر پر کمانڈو سیاہ اونی ٹوپی کی بجائے عام قسم کی اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جیب میں کافی پیسے تھے۔ ناشتہ میں نے جموں سٹیشن پر ہی کر لیا تھا۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ دوپہر کے بعد بٹالے کا سٹیشن آیا تو میں وہاں نہ اترا۔ کیونکہ دھرم چند کا گاؤں ہر چو وال جہاں اس کی پتنی اور ماتا جی رہتی تھیں قادیاں سے تین میل دور تھا اور قادیاں امرتسر کی جانب اگلا سٹیشن تھا۔ میں قادیاں سٹیشن پر اتر گیا۔ بادل جموں سے لے کر امرتسر تک چھائے ہوئے تھے۔ بڑی سخت سردی تھی۔ یہاں بارش تو نہیں ہو رہی تھی مگر سرد یخ ہوا چل رہی تھی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میں نے یہی سوچا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے دھرم چند کے گاؤں ہروال پہنچ جاؤں گا۔ آرام سے گھر میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا اور خوب گرم ہو کر رات کو سوؤں گا۔ دوسرے دن اپنی پتنی یعنی دھرم چند کی پتنی کو پھر آنے کا کہہ کر واپس بمبئی کی

طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے وہاں آنے کی خبر بٹالے میں شیو سینا کے دہشت
گرد جے دیو کو ہر حالت میں پہنچ جاتی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ اپنی ایک گواہی پکی ہو
جائے اور بال ٹھاکرے کو پتہ چل جائے کہ میں اپنے گاؤں ہی آیا تھا۔ قادیاں
سٹیشن پر اترنے کے بعد میں ایک یکے پر بیٹھا اور یکہ ہرچو وال گاؤں کی طرف
چل پڑا۔ اس میں ایک سکھ دیہاتی عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ بھی بیٹھی
تھی۔ ایک لالہ جی بیٹھے تھے۔ شام کے وقت یہ آخری یکہ تھا جو ہرچووال جا رہا
تھا۔

میرا دھیان اکھنور کی توپوں والے ٹیلے کی طرف برابر لگا ہوا تھا۔ اسے آج
رات دو بجے کے قریب یا دو بجے کے بعد قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ اڑ جانا
تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت میں دھرم چند کے گھر میں موجود رہوں تاکہ بعد
میں یہ بات سب کے علم میں آجائے کہ میں واردات کے وقت جموں میں نہیں
تھا۔ بارش بند ہوگئی تھی مگر صبح جو بارش ہوئی تھی اس کی وجہ سے گاؤں کے
کچے راستے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ یکہ ہچکولے کھاتا جا رہا تھا۔ تین میل کا
فاصلہ تقریباً" ایک گھنٹہ میں طے کر کے میں ہرچووال پہنچا۔ یکے سے اتر کر دھرم
چند کے مکان کی طرف چلا۔ دور سے دیکھا۔ مکان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کوئی
دیا بتی روشن نہیں تھی۔ سوچا یہ لوگ شاید جلدی سو گئے ہیں۔ مکان پر جا کر
دیکھا تو دروازے پر تالا لگا تھا۔ ایک دم پریشان ہوگیا کہ رات کہاں گزاروں گا۔
گاؤں کے دوسرے مکانوں پر بھی سردی کی وجہ سے ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

فوراً" فیصلہ کیا کہ واپس قادیاں چلے جانا چاہیے۔ وہاں سے کوئی نہ کوئی
لاری یا گاڑی مل جائے گی اس میں بیٹھ کر امرتسر چلا جاؤں گا۔ امرتسر میں کوئی
اچھا سا ہوٹل تو ہوگا جہاں رات بھی گرم ہو کر گزار سکوں گا اور اکھنور میں
دھماکہ ہوا تو صبح صبح اس کی خبر بھی شہر میں مل جائے گی۔ میں الٹے قدموں اس
جگہ آیا جہاں یکے والے سردار جی نے مجھے اتارا تھا۔ وہ گھوڑا کھل رہا تھا۔ میں

نے کہا۔

"سردار جی! میرے گھر والے تو امرتسر گئے ہوئے ہیں مجھے قادیاں پہنچا دیں وہاں سے امرتسر والی لاری مل جائے گی۔"

پہلے تو وہ نہ مانا کہنے لگا۔ بڑی سردی ہے۔ گھوڑا کھول دیا ہے۔ لیکن جب میں نے اسے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر دیا تو فوراً تیار ہوگیا۔ اسی یکے میں بیٹھ کر ہچکولے کھاتا واپس قادیاں آگیا۔ وہاں سے ایک لاری میں سوار ہوا اور امرتسر پہنچ گیا۔ امرتسر میں ایک ہی ڈھنگ کا انگریزی سٹائیل کا ہوٹل تھا جس کا نام امپیریل ہوٹل تھا۔ ایک کمرہ لے لیا۔ گرم پانی سے نہایا۔ دوسرے کپڑے پہنے، ہیٹر کمرے میں جل رہا تھا۔ کھانا منگوا کر کھایا اور سگریٹ سلگا کر بستر پر لیٹ کر دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔

ابھی رات کے دو بجنے میں کافی دیر تھی۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی میری تشویش اور فکر مندی بڑھتی جا رہی تھی۔ خدا کرے کہ کوئی ٹیکنیکل خرابی نہ پیدا ہو جائے۔ گولہ بارود اور پٹرول کا ذخیرہ چونکہ بری توپوں کی قلعہ بندیوں کے عین نیچے تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ نیچے تہہ خانے میں دھماکہ ہوا تو وہ بڑا قیامت کا دھماکہ ہوگا اور اس کے ساتھ ہی توپوں کے پیرامیٹر تو معمولی بات ہے سارے کا سارا ٹیلہ اڑ جائے گا اور کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ شرط صرف یہ تھی کہ دھماکہ ہو جائے۔ گھڑی کی سوئی نے رات کے بارہ بج کر دس منٹ بجائے تو میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ کمرے کی بتی میں نے بجھا رکھی تھی۔ صرف بیڈ لیمپ روشن تھا۔ میں نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا سرد ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ امرتسر میں بھی کافی سردی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ منہ پر نیم گرم پانی کے چھینٹے مارے۔ بالوں میں کنگھی پھیری اور پلنگ پر لیٹ کر صبح کا انگریزی اخبار پڑھنے لگا۔ جب رات کے دو بجنے میں چھ سات منٹ باقی رہ گئے تو میں پلنگ سے

اٹھ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں دیوار گیر کلاک پر لگی ہوئی تھیں۔ دو بج گئے۔ پھر دو بج کر دس منٹ' پھر پندرہ منٹ ہوئے۔ اتنی دور جموں سے مجھے دھماکے کی آواز تو نہیں آسکتی تھی۔ ریڈیو ٹیلی ویژن سٹیشن بھی بند ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دھماکہ ہوگیا ہوگا۔ پھر بھی میں تصدیق کرنے کے لیے بے چین تھا۔ تصدیق کون کر سکتا تھا۔ میں جموں کسی کو فون کر کے ہی معلوم کر سکتا تھا کہ وہاں کوئی دھماکہ ہوا ہے یا نہیں۔ مگر کسے فون کروں۔ اچانک خیال آیا کہ کیلاش ہوٹل جموں فون کرنا چاہیے۔ میں نے ڈائریکٹری میں سے کیلاش ہوٹل کا نمبر معلوم کیا۔ امپیریل ہوٹل میں ڈائریکٹ ڈائیلنگ کی سہولت حاصل تھی۔ بعد میں اس کے چارجز بل میں شامل کر لیے جاتے تھے۔ میں نے جموں کے کیلاش ہوٹل کا نمبر ملایا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک گھنٹی بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"کیلاش ہوٹل ری سیپشن۔"

آواز میں جو گھبراہٹ تھی اسے میں نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں امرتسر سے بول رہا ہوں۔ سنا ہے یہاں ریلوے سٹیشن پر کوئی دھماکہ ہوا ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"سٹیشن پر نہیں اکھنور چھاؤنی میں دھماکہ ہوا ہے کہتے ہیں ساری چھاؤنی اڑ گئی ہے۔ بڑا نقصان ہوا ہے۔"

میں نے اپنی خوشی کے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بھگوان ان اگروادیوں کا ستیاناس کرے۔"

اور فون بند کر کے آنکھیں بند کر لیں اور گہرا سانس بھر کر صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ میرے لگائے ہوئے مائیکرو چپس نے

مجھے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ صبح اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی کہ اکھنور چھاؤنی کے ایک گیریزن کو کشمیری اگروادیوں نے دھماکہ سے اڑا دیا ہے۔ پولیس نے دو اگر وادیوں کو پکڑ لیا ہے۔ باقیوں کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ خدا جانے یہ دو کون بے گناہ مسلمان تھے جنہیں پولیس نے پکڑ لیا تھا۔

میں شہر سے نکل آیا۔ امرتسر شہر میں زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی مگر لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس نمایاں تھا۔ پولیس شہر کی سڑکوں پر گشت لگا رہی تھی۔ ایک جگہ میں نے ملٹری کی گاڑیوں کو بھی تیزی سے ایک طرف جاتے دیکھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے مزید کالے کالے بادل اُمڈ آئے اور دن کی روشنی میں شام کی دھندلکوں کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت میں شہر کی مشہور تفریح گاہ کمپنی باغ سے بھی آگے چھوٹی نہر کے پاس ایک جگہ بیٹھا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا۔

اچانک بجلی چمکی۔ بادلوں میں گرج پیدا ہوئی اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ میں واپس ہوٹل جانے کے لیے اٹھا اور ریلوے پھاٹک کی طرف چلنے لگا۔ کیونکہ وہاں سے مجھے کوئی ٹیکسی رکشہ مل سکتا تھا۔ جیسے ہی میں وہاں سے چلا بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ سردیوں کی بارش میں بھیگنا خطرناک ہوتا ہے میں دوڑ کر ایک گھنے درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ درخت نے بھی ٹپکنا شروع کر دیا۔ میں نے گرم جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور گلے میں گلوبند تھا۔ سر پر کچھ نہیں تھا۔ بارش کے ساتھ تیز یخ ہوا بھی چلنے لگی۔ میں سردی میں ٹھٹھرنے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہاں سے دوڑ کر کہاں جاؤں۔ یہ غیر آباد سا علاقہ تھا۔ ایک طرف نہر تھی۔ دوسری جانب کمپنی باغ کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ سڑک بارش میں خالی پڑی تھی۔

اچانک مجھے دور سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ بارش میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کار میں کون بیٹھا ہے۔ میں نے درخت سے نکل کر کار کو ہاتھ دیا تو کار بالکل میرے قریب آکر رک گئی۔ اس کی ونڈ سکرین کے بازو بڑی تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ مجھے بارش کی دھندلی جھالر میں سے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر کہا۔

"اندر آ جاؤ۔"

میں تیزی سے اندر گھس کر بیٹھ گیا۔

کار میں آتے ہی مجھے فرانس کی ایک بڑی قیمتی پرفیوم کی خوشبو آئی۔ کار میں ہیٹر لگا ہوا تھا اور اس کی فضا نیم گرم تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور عورت کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"آپ کو میں نے بڑی تکلیف دی۔"

عورت نے کہا۔ "شریمان جی مجھے تو خوشی ہوئی ہے۔ آپ کو کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کرپا کر کے مجھے مال روڈ والے امپیریل ہوٹل پہنچا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

عورت نے کہا۔ "اس طرف جانے والی ساری سڑکوں پر چار چار فٹ پانی کھڑا ہے۔"

میں نے بے اختیار کہا۔

"او مائی گاڈ۔ اب کہاں جاؤں۔"

عورت تیز بارش میں بڑی مہارت، سے گاڑی چلا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "کوئی بات نہیں آپ میرے ہاں چلیں۔ جب بارش ختم جائے گی تو میں آپ کو امپیریل ہوٹل چھوڑ آؤں گی۔ آپ سگریٹ پیتے ہیں تو سامنے ڈیش بورڈ میں سگریٹ کیس نکال لیجئے۔ ایک سگریٹ مجھے بھی سلگا کر دے دیں۔"

میں نے ڈیش بورڈ میں سے سگریٹ نکال کر دو سگریٹ سلگائے ایک خود رکھ لیا دوسرا عورت کو دینے لگا تو میں اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ جسم بھرا بھرا تھا رنگ گورا تھا۔ بال جدید فیشن کے انداز میں بنائے ہوئے تھے۔ گلے میں نقلی موتیوں کا ہار تھا۔ ساڑھی نیلے رنگ کی تھی۔ بلاؤز گہرے نیلے رنگ کا تھا جس کا گریبان اتنا کھلا تھا کہ عورت کا سینہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی شکل زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن چہرے پر ایک خاص قسم کی کشش تھی۔

مجھے اس پر ایک خاص قسم کی عورت ہونے کا شبہ پڑا لیکن میں نے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔ وہ سگریٹ منہ میں دبائے سڑک پر کھڑے پانی اور بارش میں گاڑی کو ہلکی رفتار سے لے جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"آپ امرتسر کے رہنے والے نہیں ہیں۔ کس شہر سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں امرتسر میں ہی پیدا ہوا تھا۔ خالصہ کالج میں بی اے کیا تھا۔ پھر پتا جی کا تبادلہ ہوگیا اور ہم سب دلی چلے گئے۔ پتا جی اور ماتا جی کے سورگباش ہونے کے بعد میں نے دلی میں اپنا کاروبار شروع کر دیا اسی سلسلے میں امرتسر آیا تھا۔"

"امپریل ہوٹل تو بڑا مہنگا ہوٹل ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس ہوٹل میں آرام بہت ہے۔ میں جب بھی کاروبار کے سلسلے میں دلی سے امرتسر آتا ہوں تو اسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ آپ یہاں کہاں رہتی ہیں؟ ضرور کسی کالج میں پروفیسر ہوں گی یا پھر کالج کی پرنسپل ہوں گی۔"

میں نے یونہی اس کو ہوا دینے کے لیے یہ جملہ کہہ دیا تھا۔ ورنہ وہ شکل صورت سے کسی پہلو بھی پروفیسر وغیرہ نہیں لگتی تھی۔ کہنے لگی۔

"جموں میں رات بڑا دھماکہ ہوا ہے۔ کہتے ہیں اکھنور کی پوری فوجی چھاؤنی تباہ ہوگئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ بھارت کی کوئی بھی سرکار ان کشمیری

اگرواديوں سے کبھی نہیں نمٹ سکتی۔ بھگوان جانے وہاں ہمارے کتنے فوجی جوان اور افسر مارے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بہت برا ہوا ہے شریمتی جی۔ مجھ سے تو صبح کا ناشتہ بھی نہیں ہو سکا۔"

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام چندراوتی ہے۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

میرے ذہن میں یہی نام آیا۔ میں نے کہہ دیا۔

"میرا نام کیلاش ماتھر ہے۔"

اس نے گاڑی کو بارش کی بوچھاڑ میں ایک چھوٹی سڑک کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"بڑا شبھ نام ہے۔ میرے سورگباشی پتی کے بھائی کا بھی یہی نام تھا۔ وہ فوج میں تھا۔ سن ۶۵ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر سورگباش ہوگیا تھا۔"

میں نے انگریزی میں کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔"

اس نے بایاں ہاتھ سٹیرنگ سے ہٹا کر میرے ہاتھ پر رکھ کر آہستہ سے دبایا اور کہا۔

"بھگوان کی لیلا بڑی نیاری ہے ماتھر جی۔ کوئی جنم لیتا ہے۔ کوئی جنم ہار جاتا ہے۔ اور پھر نیا جنم لیتا ہے۔ تم آواگون کو تو ضرور مانتے ہوگے۔"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں آواگون تو ہمارے دھرم کا حصہ ہے۔"

گرتی بارش میں گاڑی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی اور اس کے پورچ میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ چندراوتی نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی ہارن دے دیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت برآمدے میں آکر کھڑی ہوئی تھی۔

"ماتھر جی یہ میرا چھوٹا سا آنند بھون ہے۔ یعنی ہاؤس آف پلیزر۔"

اور وہ مسکراتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آئی۔ میں بھی گاڑی سے باہر آ گیا۔ کوٹھی سو سال پرانی انگریزوں کے زمانے کی لگتی تھی۔ ہم ایک بڑے کمرے میں آ گئے۔ یہاں وکٹورین دور کے پرانے صوفے رکھے تھے۔ اونچے شیڈوں والے لکڑی کے دو ٹیبل لیمپ پرانی طرز کے کارنس کی دونوں جانب کھڑے تھے۔ کارنس کے اوپر دیوار پر ایک بڑے چوکھٹے والی رنگین پینٹنگ لگی تھی جس میں ایک بالکل عریاں عورت تالاب میں سے نہا کر اپنے جسم کو سمیٹتے ہوئے باہر نکل رہی تھی۔ دروازوں پر لمبے لمبے میل خورے رنگ کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کارنس کے اوپر کرشن جی کی ایک تانبے کی مورتی کے آگے لوبان سلگ رہا تھا۔ کمرے کی فضا میں لوبان کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ چندراوتی نے ساڑھی کا پلو اپنے پیٹ کے اوپر کرتے ہوئے عورت سے کہا۔

"رامی! جلدی سے چائے تیار کر دے۔ بڑی سردی ہے۔ بارش تو رکنے کا نام نہیں لے رہی۔"

چندراوتی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"ماتھر جی آؤ ساتھ والے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں یہاں سردی ہے۔ رامی نے آتشدان میں آگ بھی نہیں جلائی۔"

ساتھ والا کمرہ چھوٹا تھا۔ اس میں صرف ایک صوفہ اور بڑا بیڈ لگا تھا۔ یہاں بھی دیوار پر نیم عریاں عورتوں کی تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ چندراوتی نے بجلی کا ہیٹر جلا کر میرے آگے کر دیا۔ کمرے میں کوئی روشن دان نہیں تھا صرف ایک کھڑکی تھی۔ جو بند تھی۔ اس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ کھڑکی میں سے بارش کی آواز آ رہی تھی۔ بیڈ کے داہنی جانب لوہے کی ایک الماری کھڑی تھی۔ چندراوتی اٹھ کر الماری کی طرف گئی۔ کہنے لگی۔

"اتنی سردی میں صرف چائے ہمارے جسم کو گرم نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے تھوڑی برانڈی بھی پینی چاہیے۔"

مجھے اس عورت کی۔۔۔۔۔۔ تمام حرکات پر کوئی تعجب اور حیرانی نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کس ٹائپ کی عورت ہے اور وہ مجھے وہاں اتنی تیز بارش اور سردی میں کیوں لائی ہے۔ میرے لیے مشکل صرف اتنی تھی کہ جس مقصد کیلئے وہ مجھے لے کر آئی تھی وہ میرا مقصد نہیں تھا۔ وہ اس کا اپنا مقصد تھا۔ اور میں اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں بارش سے بچنے کے لیے وہاں آ گیا تھا۔ اور اس انتظار میں تھا کہ ذرا بارش رکے تو میں وہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤں۔ آدمی کسی بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہو تو اسے اس مقصد کی خاطر قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ خاص طور پر عورت اور شراب کی قربانی۔ کیونکہ عورت اور شراب دو ایسی چیزیں ہیں جو آدمی کو اس کے عظیم مقصد حیات سے صرف دور ہی نہیں لے جاتیں بلکہ اسے دشمن کے ملک میں بے موت بھی مار دیتی ہیں۔ اسی لیے میرے استاد نے جس نے مجھے کمانڈو ٹریننگ دی تھی ایک نصیحت خاص طور پر کی تھی کہ لنگوٹے کے پکے رہنا۔ اپنے لنگوٹے کو کسی حالت میں بھی ڈھیلا نہ ہونے دینا۔ نہیں تو مجھ سے لکھوا لو مارے جاؤ گے۔ میں نے اپنے استاد' اپنے کمانڈو انسٹرکٹر کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کیا تھا اور ان دونوں چیزوں کی ترغیبات میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اس وقت بھی میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا اور مجھ پر اس مرد مار ٹائپ کی عورت کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا جبکہ یہ ایسی باتیں تھیں کہ جن کو سن کر بڑے سے بڑا پہلوان بھی ایک بار تو اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے۔ دوسرے میرا یہ ہمیشہ سے عقیدہ رہا ہے کہ آدمی کے سامنے اگر کوئی اہم مشن نہ بھی ہو تب بھی آدمی کو خدا سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ وہ اسے گناہوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔

چندراوتی الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکال کر لے آئی۔ میں نے بوتل کا لیبل دیکھا یہ ولایتی برانڈی تھی۔ لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ برانڈی نقصان دہ نہیں ہوتی اور سردیوں کے موسم میں رات کو تھوڑی سی

برانڈی گرم پانی میں یا دودھ میں ڈال کر پی لینی چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بڑا غلط اور خطرناک خیال ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے ہمارے ملک میں پہاڑوں پر بھی اتنی سردی نہیں پڑتی جتنی ان ملکوں میں پڑتی ہے جہاں لوگ تھوڑی سی برانڈی پی لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ برانڈی شراب نہیں ہے۔ بلکہ برانڈی زیادہ تیز شراب ہوتی ہے۔ اس کو ایک بار پینے سے اس بات کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان اسے بار بار پینا شروع کر دے گا اور پھر اسے اس کی عادت پڑ جائے گی۔ سیانوں کی باتیں بالکل ٹھیک ہوا کرتی ہیں۔ پنجاب میں سیانوں کی ایک کہاوت بڑی مشہور ہے کہ جس پنڈ نئیں جانا اوہدا راہ کیہہ پچھنا۔ یعنی جس گاؤں نہیں جانا پھر اس کا راستہ کسی سے کیوں پوچھا جائے۔ میں آپ کو اپنے تجربے کی بنا پر سرے کی گانٹھ کی طرح ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ شراب اور واہیات قسم کی عورت کے کبھی قریب بھی نہ جانا۔ بس۔

اب میں اپنی داستان آگے بیان کرتا ہوں۔ چندراوتی نے دو بڑے نازک اور خوبصورت بلور کے گلاس بھی نکال کر سامنے رکھ لیے تھے۔ اتنے میں دروازے کے باہر سے رامی کی آواز آئی۔ "بی بی جی چائے تیار ہے۔"

چندراوتی نے میری طرف شرارت سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے بلند آواز میں رامی نوکرانی سے کہا۔

"اب چائے کی ضرورت نہیں ہے رامی! چائے تم پی لینا۔"

وہ میرے گلاس میں برانڈی ڈالنے لگی تو میں نے گلاس کے اوپر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"چندراوتی جی! آئی ایم سوری! مجھے میرے ڈاکٹروں نے ان چیزوں سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔"

چندراوتی حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"ماتھر جی! آپ جوان ہیں صحت مند ہیں اور پھر یہ تو برانڈی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے چندراوتی جی! دو ماہ پہلے مجھے دلی میں ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ یہ ہارٹ اٹیک اتنا شدید تھا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ ایک ماہ تک آئی سی یو میں پڑا رہا؟ ڈاکٹروں نے مجھے خبردار کر رکھا ہے کہ اگر میں نے شراب کا ایک قطرہ بھی حلق میں ڈالا تو میری موت واقع ہو جائے گی۔"

چندراوتی نے مایوسی کے ساتھ سر ہلایا اور اپنے گلاس میں برانڈی ڈالتے ہوئے بولی۔

"ماتھر جی! میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹروں نے آپ کو دنیا کے سورگ دنیا کی جنت میں جانے سے منع کر رکھا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس موسم میں میں تو ضرور پیوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ ضرور پئیں میڈم۔ آپ کے پینے سے مجھے خوشی ہوگی۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چہرہ میرے چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ "پلیز ماتھر جی! مجھے چندرا کہہ کر پکارو میڈم نہ کہو۔"

میں ڈر گیا یہ سوچ کر ڈر گیا کہ ابھی اس نے شراب کا ایک گھونٹ بھی نہیں پیا اور اس کا یہ حال ہے جب اس کے جسم میں شراب کے دو تین گلاس چلے گئے تو پھر اس کا اپنا کیا حال ہوگا اور میرا کیا حشر نہیں کرے گی۔ لیکن میں اپنی طرف سے مطمئن تھا کیونکہ جب آدمی کی نیت نیک ہو اور وہ اس بات کا تہیہ کر کے بیٹھا ہو کہ میں نے گناہ نہیں کرنا تو پھر خدا بھی اس کی حفاظت کرتا ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے لیا ہو اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ برانڈی کے دو پیگ پینے کے بعد چندراوتی نے الٹ پلٹ حرکتیں شروع کر دیں۔ میں اس دوران ڈھال بن کر بیٹھا ترغیبات

جنسی کی تلواروں کے وار ڈھال پر روکتا رہا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اسے کھول کر دیکھا باہر بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ چندراوتی نے کھانا منگوا لیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران بھی وہ اٹھ اٹھ کر میرے پاس آتی رہی اور اپنے ہاتھ سے مجھے روٹی کے ساتھ آلوؤں کی بھاجی لگا کر کھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ کھانے کے بعد میں نے رامی سے کہا کہ کافی بنا کر لائے۔ وہ بلیک کافی بنا کر لے آئی۔ میں نے خود بھی پی اور چندراوتی کو بھی بلیک کافی کے دو کپ پلا دیے۔ کافی نے اس کے نشے کو کافی اتار دیا۔ اس کے بعد اس عورت نے پھر پینی شروع کر دی۔ اب جو اس نے برانڈی کے مزید دو گلاس پیئے تو اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ میں نے اسے صوفے سے اٹھا کر زبردستی پلنگ پر لٹا دیا۔ رامی نے بھی میری مدد کی۔ تھوڑی دیر بعد چندراوتی پلنگ پر بے سدھ ہو کر پڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا بارش رکی ہوئی تھی۔

میں نے رامی سے کہا۔

"بی بی! میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بیڈ روم سے نکل کر ڈرائینگ روم اور وہاں سے کوٹھی کے برآمدے میں آ گیا۔ بارش رک گئی تھی۔ مگر کوٹھی کے لان میں پانی کھڑا تھا۔ میں ایک طرف کیاری کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔ بہت بارش ہوئی تھی جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ ایک خالی تانگہ گزرا۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ اسے پچاس روپے دے کر کہا۔

"مجھے امپریل ہوٹل میں چھوڑ آؤ۔"

ہوٹل میں آکر خدا کا شکر ادا کیا۔ ہوٹل میں اکھنور کی چھاؤنی کی تباہی کا ذکر ہر شخص کے ہونٹوں پر تھا۔ میں کمرے کی چابی لینے کاؤنٹر پر گیا تو کلرک ٹیلی فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

"مہاراج بڑی تباہی ہوئی ہے۔ سرکار کچھ نہیں بتا رہی۔ کہتے ہیں دو جرنیل بھی مارے گئے ہیں۔"

مجھے دیکھ کر کلرک نے سامنے والے خانے سے چابی نکال کر مجھے دی اور دوبارہ فون پر باتیں کرنے لگا۔ میں کمرے میں جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھا۔ لفٹ کے باہر دو ملٹری پولیس کے جوانوں کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے ساتھ وہ بھی لفٹ میں سوار ہو گئے۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"مہاراج سنا ہے جموں میں سارے کشمیری اگروادی پکڑ لیے گئے ہیں۔"

ملٹری پولیس کے جوانوں نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ تیسری منزل پر لفٹ رکی تو وہ باہر نکل گئے۔ میں چوتھی منزل پر لفٹ سے باہر آکر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں شام کی فلائیٹ کے ذریعے امرتسر سے بمبئی نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے فون پر معلوم کیا۔ صرف ایک فلائیٹ رات کے دس بجے بمبئی جا رہی تھی۔ اس میں کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ دلی صبح ۹ بج کر چالیس منٹ پر فرنٹیر میل بمبئی روانہ ہوتی تھی۔ میں نے سوچا فرنٹیر میل ہی پکڑ لیتا ہوں۔ اصل میں میں امرتسر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہاں کی فضا میں مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔

اکھنور فوجی چھاؤنی کی تباہی کی وجہ سے امرتسر شہر کی فضا میں بھی خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ خفیہ پولیس کے آدمی تو جگہ جگہ موجود ہی تھے مگر میں نے دیکھا تھا کہ ملٹری پولیس کی جیپیں شہر میں گشت لگا رہی تھیں اور اب انڈین ملٹری پولیس کے دو جوان ہوٹل میں بھی پہنچ گئے تھے۔

مجھے ایسے لگا جیسے یہ لوگ میری تلاش میں وہاں آئے ہیں۔ میں کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ دس منٹ بعد ہی جیکٹ اور اونی ٹوپی پہن کر گلے میں مفلر ڈالا اور ہوٹل کی لابی میں سے گزرتا ہوا ہوٹل کے دوسرے گیٹ کے قریب پہنچا تو میں نے ایک جانب سڑک کے پار درخت کے پیچھے ایک جانی پہچانی شکل والے آدمی کو دیکھا۔ وہ اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ اپنا امرتسر والا کشمیری مجاہد تھا جو امرتسر کے ایک علاقے میں بھیس بدل کر رہ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے سڑک کے شمالی کونے کی طرف بلایا اور خود اس طرف چلنے لگا۔ میں بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ یہ شروع رات کا وقت تھا۔ صبح کی موسلادھار بارش کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ سڑک پر بہت کم لوگ پیدل چلتے نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے نیچے ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اپنا مجاہد اس دھند میں غائب ہوگیا۔ جب میں اس دھند میں پہنچا تو کشمیری مجاہد یعنی اپنے جاسوس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میرا گھر تم نے دیکھا ہوا ہے نا؟"

"ہاں کیوں؟"

"یہ وہاں چل کر بتاؤں گا میرے گھر پہنچو۔ اس بات کا دھیان رکھنا کہ کوئی تمہارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ اگر کوئی پیچھا کر رہا ہو تو میرے گھر بالکل نہ آنا۔ آگے خالصہ کالج والے انگریزی سنیما ہاؤس کی طرف نکل جانا۔ میرے جانے کے پانچ منٹ بعد یہاں سے چلنا۔"

میں نے کہا۔ "بے فکر رہو۔"

وہ چلا گیا میں پانچ منٹ تک وہیں درختوں میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ اس کے بعد کشمیری مجاہد کے مکان کی طرف چلنے لگا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو اپنے کسی مجاہد کے اصلی ٹھکانے کا پتہ وغیرہ نہیں بتایا اس مجاہد کے بارے میں بھی نہیں بتاؤں گا کہ اس کا مکان امرتسر شہر کے کس محلے میں تھا۔ میں اس مکان میں دو تین بار آ چکا تھا۔ کیونکہ وہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ تھا جہاں سے میں پیچھے اہم معلومات یا کوئی پیغام بھیج سکتا تھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے سڑک پر آ کر رکشہ لے لیا اور کشمیری مجاہد کے محلے سے کچھ فاصلے پر رکشا چھوڑ دیا۔ یہ علاقہ کوئی ماڈرن آبادی والا علاقہ نہیں تھا۔ اس لیے وہاں زیادہ روشنیاں نہیں تھیں۔ کچھ دکانیں بند تھیں۔ پان سگریٹ کی ایک دکان کھلی تھی۔ میں خاموشی سے پان سگریٹ کی کھوکھا نما دکان کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ ایک آدمی دکان کے باہر کرسی پر کمبل اوڑھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور آگے جا کر اس گلی میں مڑ گیا جہاں کشمیری مجاہد کا مکان تھا۔

کشمیری مجاہد مکان پر پہلے پہنچ چکا تھا۔ اس نے کیتلی میں چائے بنا رکھی تھی۔ میرے آنے پر اس نے پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی پیچھے تو نہیں لگا ہوا تھا؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں اتنی سخت سردی میں کون پیچھے آتا ہے۔"

کشمیری مجاہد نے کیتلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا گمان کبھی نہ کرنا۔ تم یہاں کی خفیہ پولیس سے شاید پوری طرح واقف نہیں ہو۔ تم یہی سمجھو کہ اگر آندھی طوفان بھی چل رہا ہو گا تو جس آدمی نے تمہارے پیچھے لگنا ہے وہ تمہارے پیچھے ضرور لگا ہوا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "میں پوری تسلی کر کے آیا ہوں۔"

"بس پھر ٹھیک ہے لو چائے پیو۔"
میں نے پوچھا۔ "تم نے مجھے کسی خاص کام کے لیے بلایا ہے کیا؟"
کشمیری مجاہد نے کہا۔
"تم نے اکھنور کی چھاؤنی کو تباہ کر کے جو کام کر دکھایا ہے اس نے مقبوضہ کشمیر میں انڈین آرمی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اب تمہیں پہلے سے زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اس سارے علاقے میں سول پولیس کے علاوہ ملٹری انٹیلی جینس نے بھی تمہاری گرفتاری کے لیے جال پھیلا دیا ہوا ہے۔"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"مجھ پر یہاں کسی کو شک نہیں پڑ سکتا۔ اور پھر میرے پاس انڈین ڈیفنس انٹیلی جینس کا خاص نمبر موجود ہے۔ جو مجھے معصوم ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔"
کشمیری مجاہد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"اس وقت صورت حال ایسی خوف و ہراس کی بن گئی ہے۔ کہ ملٹری انٹیلی جینس یا سول پولیس کی انٹیلی جینس کسی پر بھی ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا یہ خفیہ نمبر بھی تمہاری مدد نہ کر سکے۔ خیر یہ بتاؤ تم یہاں کس لیے بیٹھے ہو۔ یہاں سے نکل کیوں نہیں جاتے۔"
میں نے اسے بتایا کہ صبح فرنٹیر میل سے بمبئی روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ جملہ ابھی میں نے ادا کیا ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ کشمیری مجاہد نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کون ہے؟"
ہم نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی باہر سے شاید دو آدمیوں نے اتنی زور سے دروازے کو دھکا دیا کہ دروازے کی کنڈی اکھڑ گئی اور دروازہ کھل گیا چار آدمی "خبردار اپنی جگہ سے نہ ہلنا" کا نعرہ لگاتے ہوئے اندر گھسے اور انہوں نے ہمیں قابو میں کر لیا۔ ان میں سے تین

آدمی پولیس افسر کی وردیوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ایک آدمی سویلین کپڑوں میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دروازے میں ایک طرف ہو کر الرٹ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم دروازہ توڑ کر اندر کیوں آئے ہو؟"

ان میں جو تھانیدار کی وردی میں تھا اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور غضبناک لہجے میں کہا۔

"ابھی پتہ چل جائے گا۔ چلو اوئے مکان کی تلاشی لو۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں پتہ نہیں کہ تم کسی آدمی پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ میرا نام دھرم چند ہے۔ میں سنٹرل ڈیفنس انٹلی جینس کا آفیسر اون سپیشل ڈیوٹی ہوں۔ یہ میرا نمبر ہے۔"

اور میں نے کاغذ پر خاص طلسماتی نمبر یعنی 211 _ T / L لکھ کر دیا۔ تھانیدار نے اسے غور سے پڑھا اور کاغذ کے ٹکڑے کو پھاڑ کر پھینکتے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہاری جگہ اگر بھارت کا پردھان منتری بھی ہوتا تو ہم اسے بھی ضرور گرفتار کر لیتے۔"

اس پر کشمیری مجاہد نے کہا کہ میں ایک آزاد بھارتی شہری ہوں۔ تم لوگوں کو اس طرح دروازہ توڑ کر میرے گھر میں گھس آنے کا کوئی حق نہیں۔ تھانیدار بولا۔

"ذرا صبر کرو۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

اتنے میں ایک کانسٹیبل کوٹھڑی سے باہر نکلا تو اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر پکڑ رکھا تھا۔

"سر! یہ وائرلیس سیٹ کوٹھڑی میں ملا ہے۔"

تھانیدار نے وائرلیس سیٹ اپنے قبضے میں کر لیا اور بولا۔ "ان کو ہتھکڑیاں

ڈال کر تھانے لے چلو۔ چلو اوئے۔"

تھانیدار نے ہم دونوں کو گالی دی۔ اسی وقت مجھے اور کشمیری مجاہد کے ہاتھوں کو پیچھے کر کے ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ اب وہاں کچھ عذر پیش کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میرا خفیہ طلسماتی نمبر بھی وہاں کام نہیں آیا تھا۔ اکھنور کی چھاؤنی کی تباہی کے بعد پولیس کو لامحدود اختیار مل چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ تھانے جا کر بمبئی بال ٹھاکرے کو فون کروں گا کہ مجھے خواہ مخواہ پھنسا لیا گیا ہے لیکن سوال یہ تھا کہ میں کشمیری جاسوس کے پاس کیا کرنے آیا تھا؟

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور یہی سوال میرے سارے خفیہ رازوں کو فاش کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہمیں اپنے گھیرے میں لے کر امرتسر پولیس کے سپاہی سرد رات کے اندھیرے میں گلی سے نکال کر سڑک پر لے آئے۔ وہاں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز واقعات آپ
"شیو سینا کے دہشت گرد کی اگلی کتاب نمبر ۳"
میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

Hussain
7/8/2010

اے حمید
کمانڈو ایکشن
3
شیو سینا کے دہشت گرد
Pakistanipoint
Waqar
Azeem

بھارت میں ایک محب وطن پاکستانی کی لرزہ خیز اور سنسنی خیز داستان

ناشر ☜ عبدالحفیظ قریشی

باہتمام ☜ محمد علی قریشی

مطبع ☜ نیراسد پرنٹرز لاہور

کمپوزنگ ☜ خرم آرٹس لاہور

سن اشاعت ☜ 1997

تعداد ☜ 1100

قیمت ☜ [illegible] روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

○○

پولیس کی گاڑی میں پہلے سے تین کانسٹیبل بیٹھے تھے۔
ہمیں آتا دیکھ کر وہ گاڑی سے باہر نکل آئے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ مجھے اور کشمیری مجاہد کو گاڑی میں دھکے دے کر بٹھا دیا گیا۔ ساتھ کانسٹیبل اور دوسرے پولیس آفیسر بیٹھ گئے اور پولیس کی وین امرتسر کے کسی تھانے کی طرف چل پڑی۔ میں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں شیو سینا کا کارکن اور بال ٹھاکرے جی کا خاص آدمی ہوں۔ مجھے گرفتار کر کے آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"

سکھ تھانیدار نے مجھ سے سخت لہجے میں پوچھا۔

"تم رات کے وقت اس کشمیری اگروادی کے پاس کیا کرنے آئے تھے؟ یہ تو پاکستان کا جاسوس ہے۔ اس کے مکان سے ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی برآمد ہو گیا ہے اور ہمارے پاس اس کے پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے دوسرے ثبوت بھی موجود ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بال ٹھاکرے جی کی طرف سے دیے گئے ایک خفیہ مشن پر یہاں آیا تھا جو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ ٹیلی فون پر ٹھاکرے جی سے آپ خود بات کر کے معلوم کر سکتے ہیں۔"

سکھ تھانیدار نے طنز کے ساتھ کہا۔

"ٹھاکرے جی کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے کس آدمی کو کس مشن

پر یہاں بھیجا تھا۔"

ہمیں امرتسر کی کوتوالی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اپنا کشمیری مجاہد چپ تھا۔ جب پولیس کانسٹیبل ہمیں حوالات میں ڈال کر چلے گئے تو اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے بڑی حماقت کی۔ خفیہ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی تھی اور تمہیں پتہ ہی نہ چلا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں صبح بمبئی بال ٹھاکرے سے فون پر بات کروں گا۔ وہ ان پولیس والوں کی کھنچائی بھی کریں گے اور مجھے یہاں سے نکلوا بھی دیں گے۔"
کشمیری مجاہد نے کہا۔

"تمہیں تو شاید یہ چھوڑ دیں گے لیکن مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں آزادی کشمیر کا مجاہد ہوں۔ کشمیر کی آزادی اور اسلام کی حرمت کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاؤں گا لیکن پولیس کے آگے زبان نہیں کھولوں گا۔ میں تم سے بھی یہی چاہوں گا کہ اپنی زبان مت کھولنا۔"

میں نے کہا۔ "تم گھبراؤ نہیں دوست! میں تمہیں بھی اپنے ساتھ ہی یہاں سے نکلواؤں گا۔"

اتنے میں ان چار پولیس آفیسرز میں سے جنہوں نے ہمیں پکڑا تھا دو پولیس آفیسر آئے اور مجھے حوالات سے نکال کر ایک کمرے میں لے گئے جو بڑا دفتر تھا۔
میں نے کہا۔

"سر! مجھے اجازت دیں کہ میں بال ٹھاکرے جی سے فون پر بات کر سکوں۔"

انہوں نے مجھے سٹول پر بٹھا دیا اور خود کرسیاں کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

"میرا تعلق بھارت کی سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس سے ہے۔ T / L _ 211
میرا کوڈ نمبر ہے۔ آپ بے شک سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر سریندر
لال کو فون کر کے خود معلوم کر لیں۔ میرے پاس ان کا خفیہ ٹیلی فون نمبر
ہے۔"

لگتا تھا کہ ان لوگوں کو میرے خلاف اور میرے پاکستانی جاسوس ہونے کا
کوئی پکا ثبوت مل گیا ہے جس کی وجہ سے ان پر میری کسی بات کا اور سنٹرل
ڈیفنس انٹیلی جینس کے طلسماتی نمبر کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے صرف ایک
بات کا ڈر تھا کہ اگر انہوں نے میرے کپڑے اتروا کر میرے جسم کا معائنہ کیا تو
انہیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ میں مسلمان ہوں جبکہ ڈیفنس انٹیلی جینس کے
چیف سے لے کر بال ٹھاکرے تک سب کو یہی معلوم تھا کہ میں ہندو ہوں اور
دھرم چند میرا نام ہے۔ اس انکشاف کے بعد میری ساری بساط ہی الٹ جاتی
تھی۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ میرے مسلمان ثابت ہو جانے کے بعد میری رپورٹ
ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف اور بال ٹھاکرے تک نہ پہنچتی۔ امرتسر پولیس نے تو
فوراً ان لوگوں کو میری اصل حقیقت سے آگاہ کر دینا تھا اور میرے مسلمان
ہونے کی خبر ان لوگوں پر بم بن کر گرتی۔ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے
بعد میرا کیا حشر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو جسمانی معائنے سے ہر حالت
میں بچانا چاہتا تھا۔ جب میں نے سنٹرل ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف مسٹر سریندر کا
نام لیا تو میں نے محسوس کیا کہ دونوں پولیس افسروں نے ایک دوسرے کی طرف
معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ میرے پاس خفیہ طلسماتی نمبر بھی دیکھ چکے تھے۔
جس کو دیکھ کر بھارت کے سیکرٹ سے سیکرٹ اداروں کے دروازے بھی مجھ پر
کھل جاتے تھے۔ میں نے ان پر اپنی باتوں کا اثر پڑتے دیکھ کر زیادہ اعتماد سے
بولنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا۔

"اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں بال ٹھاکرے جی اور بھارت کی سنٹرل

ڈیفنس انٹیلی جینس ایجنسی کی طرف سے کس مشن پر آیا ہوا تھا۔ میں ان پاکستانی جاسوسوں کی سراغ رسانی کے مشن پر تھا جو اکھنور کی چھاؤنی کی تباہی کے ذمے دار ہیں اور ایک اطلاع کے مطابق وہ امرتسر میں روپوش تھے۔ مجھے اس کشمیری مسلمان پر بھی شبہ تھا جس کے گھر سے آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ لیکن اس کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس شخص کو پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے پوچھا۔

"تو پھر اس کے گھر میں وائرلیس سیٹ کس لیے رکھا ہوا تھا؟"

"جہاں تک میں نے اس کشمیر مسلمان کو کریدا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ وائرلیس سیٹ کچھ مدت پہلے کشمیری مجاہد اس کے گھر رکھ گئے تھے جو یہاں آ کر ایک دوسرے سے بات کر لیتے تھے لیکن اس کشمیری مسلمان نے کشمیری حریت پسندوں سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا اور وہ امرتسر میں بھارتی شہری کی طرح امن چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔"

اصل میں' میں اپنے کشمیری مجاہد کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ ہندو پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے پاس پوری رپورٹیں اور ثبوت موجود ہیں کہ اس کا تعلق کشمیری حریت پسندوں اور پاکستان کی انٹیلی جینس سے ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے اس کے متعلق آپ اپنی قانونی کارروائی پوری کرتے رہیں لیکن مجھے اجازت دیں کہ میں بمبئی بال ٹھاکرے جی سے یا دلی ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سے بات کر سکوں۔"

دونوں پولیس افسروں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سکھ تھانیدار بولا۔

"ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم ضابطے کی کارروائی پوری کریں گے۔ تم پاکستانی جاسوس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔"

میں نے سوچا کہ انہیں ذرا دبکا مارنا چاہیے۔ انہیں دھمکانا چاہیے ورنہ ایسا نہ ہو کہ الٹا مجھ پر کوئی بھیانک مصیبت نازل ہو جائے۔ دبکا مارنے سے میرا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آپ سوچ لیں بے شک مجھے فون نہ کرنے دیں لیکن بال ٹھاکرے اور مسٹر سریندر کوہلی کو یہ پتہ چلا کہ میں نے آپ کے آگے ان کے نام بھی لیے تھے اور سنٹرل گورنمنٹ کا انتہائی اہم خفیہ نمبر بھی بتایا تھا اور آپ لوگوں نے پھر بھی مجھے حوالات میں بند کر دیا تو یقین کریں ایک سیکنڈ میں آپ کی وردی اتار دی جائے گی۔"

یہ دھمکی کام کر گئی۔ وردی اترنے کا نام سن کر ان کے چہرے نرم پڑ گئے۔ سکھ تھانیدار نے کہا۔

"مجھے نمبر بتاؤ میں خود فون کرتا ہوں۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنستا پھنستا بچ گیا تھا۔ میں نے اسے ڈیفنس انٹیلی جینس چیف سریندر کوہلی کا خاص نمبر لکھ کر دیا اور کہا۔

"اس نمبر پر چوبیس گھنٹے ان سے بات ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ بھارت میں ہوں خواہ بھارت سے باہر کسی دوسرے ملک میں ہوں۔"

سکھ تھانیدار کو بھی صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ ڈیفنس انٹیلی چیف کا نام بڑا اہم تھا۔ یہ سکھ پولیس افسر اپنی پوزیشن بھی صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے اس نے نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے ایک سیکنڈ بعد ہی کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ میں سکھ تھانیدار کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ مجھے اس کے چہرے کو پڑھ کر معلوم کرنا تھا کہ دوسری طرف سے اسے کیا کہا جا رہا ہے۔

تھانیدار نے ہیلو کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔

"یس سر! یس سر! میں گوربچن سنگھ ایس ایچ او امرتسر سٹی کوتوالی بول رہا ہوں۔ سر ہمارے پاس دھرم چند نام کا ایک شخص یس سر، یس سر اس کے پاس سیکرٹ ایجنسی کا نمبر ہے سر۔ جی ہاں سر یہ نمبر میں نے دیکھا ہے سر۔ جی، جی سر۔"

سکھ تھانیدار کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ چہرے پر مردنی چھانے لگی تھی۔ صرف لگ رہا تھا کہ دوسری طرف سے اسے سخت ڈانٹ پلائی جا رہی تھی۔

"یس سر! یس سر! سوری سر!۔"

سکھ تھانیدار نے ریسیور رکھ دیا اور دو تین سیکنڈ تک سر نیچا کیے خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے ساتھ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی؟"

سکھ تھانیدار نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے میری طرف دیکھا اور بڑے نرم لہجے اور کسی حد تک خوشامدی لہجے میں بولا۔

"سر! ہم پولیس والوں کی بھی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہمیں اپنی ڈیوٹی بھی نبھانی پڑتی ہے۔ غلطی ہم سے بھی ہو سکتی ہے۔ آئی ایم سوری سر! آپ کو جہاں جانا ہے ہماری گاڑی آپ کو وہاں چھوڑ آئے گی۔ میں خود آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کشمیری مسلمان کو بھی چھوڑ دو۔ وہ بھارت کا پر امن شہری ہے اور اس کا کشمیری حریت پسندوں سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! اس کے معاملے میں ہمیں ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس پر کسی قسم کا ٹارچر نہیں ہوگا۔ ہم

! ۔ ل تک چھوڑ دیں گے۔"

یں نے کہا۔ "میں اس کے بارے میں پوری تحقیق کر چکا ہوں وہ کشمیری ہندوں کو اب بالکل پسند نہیں کرتا بلکہ آپ کو چاہیے کہ اس کو اپنے ساتھ ملا لیں وہ آپ کے لیے ایک بہترین مخبر ثابت ہو سکتا ہے۔"

یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ اس طرح ہمارے کشمیری مجاہد کو پولیس کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے گا اور وہ پولیس کے اندر گھس کر بعض قیمتی خفیہ راز معلوم کر کے کشمیر کے حریت پرستوں کو وقت پر خبردار کر سکے گا سکھ تھانیدار نے کہا۔

"آپ نے بڑا اچھا مشورہ دیا ہے سر۔ ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی دونوں پولیس افسر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب وہ میرے ایک طرح سے مطیع ہو گئے تھے۔ میں نے کہا۔ "مجھے امپیریل ہوٹل تک چھوڑ آئیں۔ میں وہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ صبح فرنٹیر میل سے بمبئی جا رہا ہوں۔ جہاز میں مجھے سیٹ نہیں مل سکی۔"

دوسرے ہندو تھانیدار نے کہا۔

"مہاراج! آپ حکم کریں ہم ابھی جہاز میں آپ کے لیے سیٹ خالی کروا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹرین میں ہی جاؤں گا۔ میں نے ہال ٹھاکرے جی کو بھی ٹیلی گرام دے دیا ہے کہ میں فرنٹیر میل سے آ رہا ہوں۔"

"جیسے آپ کی مرضی سر!"

وہ میرے آگے پیچھے پھرنے لگے تھے۔ انہوں نے اسی وقت اپنی گاڑی منگوائی اور دونوں تھانیدار مجھے فوراً" امپیریل ہوٹل چھوڑنے گئے۔ واپس جانے لگے تو ہندو تھانیدار نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔

"سر! اوپر ہماری شکایت نہ کیجئے گا۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا سر اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ہمیں شما کر دیجئے گا۔"

سکھ تھانیدار نے بھی کچھ اس طرح کی بات کی۔ میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں میں آپ لوگوں کی شکایت نہیں کروں گا۔"

انہوں نے ہاتھ باندھ کر مجھے نمستے کہا اور میں ہوٹل کی لابی کی طرف چل دیا۔ لفٹ میں کھڑے ہو کر اوپر چوتھی منزل کی طرف جا رہا تھا اور دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑی تباہی سے بچا لیا تھا۔ لیکن میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ کوئی بڑی مصیبت مجھ پر ٹوٹنے والی ہے۔ یہ ایک طرح کے خفیہ سگنل تھے جو میرے اندر کسی کسی وقت مجھے موصول ہوتے تھے۔ اس کے نتیجے میں میں نے آنے والی کسی بڑی مصیبت کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک محب وطن کمانڈو اپنے ملک کی سلامتی کے مشن پر دشمن ملک میں سرگرمیوں میں مصروف ہوتا ہے تو وہ محفوظ نہیں ہوتا۔ کسی بھی وقت وہ کسی ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں پوری طرح سے ہوشیار تھا۔ دوسرے روز صبح میں فرنٹیر میل میں بیٹھ کر بمبئی کی طرف روانہ ہوگیا۔

ڈیفنس انٹیلی جینس کے چیف نے میری امرتسر والی واردات کی خبر بال ٹھاکرے کو پہنچا دی تھی۔ ٹھاکرے نے میرے دشمن بالا جی راؤ کو یہ بات بتائی تو اس کو میرے خلاف بال ٹھاکرے کے کان بھرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ اس نے پہلے ہی سے بال ٹھاکرے کو میرے خلاف کر رکھا تھا۔ میں اس سے ملاقات

ا ے بمبئی پہنچتے ہی اس کی کوٹھی پر گیا تو وہ مجھ پر برس پڑا۔

"دھرم چند! تم کشمیری مسلمان کے گھر کیا کرنے گئے تھے؟ امرتسر پولیس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پاکستان کا جاسوس ہے۔"

میں نے بڑے تحمل اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"پیشوا جی! میں اپنی ڈیوٹی پوری کرنے اور اپنا فرض نبھانے کے لیے اس ...سلمان کے گھر گیا تھا۔ مجھے میرے مخبر نے بتایا تھا کہ اگرچہ یہ کشمیری ...سلمان اب بھارت کے خلاف کشمیریوں کے لیے جاسوسی نہیں کرتا لیکن اس کے پاس ...شمیری حریت پسند آتے جاتے رہتے ہیں۔ مہاراج! اگر ایسی بات نہ ہوتی تو مجھے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

بالا جی راؤ نے جلتی پر تیل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اگر امرتسر کا یہ کشمیر مسلمان جاسوس نہیں تھا تو اس کے گھر سے خفیہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کیسے برآمد ہوا؟"

بال ٹھاکرے میری طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بالا جی! یہ ٹرانسمیٹر اس کے پاس بہت دیر پہلے کا پڑا ہوا تھا جب وہ بھارت کے خلاف جاسوسی کی کارروائیوں میں مصروف ہوا کرتا تھا۔"

بال ٹھاکرے نے اس کشمیری مسلمان مجاہد کو مراٹھی زبان میں بڑی واہیات گالی دیتے ہوئے کہا۔

"وہ اب بھی پاکستان کا جاسوس ہے۔ تم کو اس نے بے وقوف بنایا اور تم ...ن گئے۔ میں نے امرتسر سٹی پولیس کمشنر کو کہہ دیا ہے کہ وہ کشمیری مسلمان کو ہرگز نہ چھوڑیں اور اس سے دوسرے جاسوسوں کے بارے میں پوری پوچھ گچھ کریں۔"

میں نے دل میں اپنے کشمیری مجاہد کے لیے دعا کی۔ کیونکہ اب اسے خدا ہی ان بھارتی درندوں سے بچا سکتا تھا۔ بال ٹھاکرے نے میری تھوڑی بہت مزید

سرزنش کی اور کہا۔

"تمہیں کل ہی بمبئی سے تامل ناڈو کے لیے روانہ ہونا ہوگا۔ جہاں ساؤتھ میں منڈاپم کیمپ کے مقام پر تامل ٹائیگرز کے گوریلوں کو چھاپہ مار جنگ کی عملی تربیت دی جا رہی ہے۔ ان تامل گوریلوں کو ہم پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کے لیے بھیج رہے ہیں۔ تامل ٹائیگرز کا شمار اس وقت دنیا کے خطرناک گوریلوں میں ہوتا ہے۔ تم اس تربیتی بیس کیمپ میں ان تامل ٹائیگرز کو پاکستان کی مختلف زبانوں اور کلچر کے بارے میں معلومات فراہم کرو گے۔ تم انہیں اردو اور سندھی زبانیں تھوڑی تھوڑی سکھاؤ گے۔ تم سمجھ گئے ہو نا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ بال ٹھاکرے پاکستان کے خلاف ایک نیا حملہ شروع کرنے والا ہے۔ تامل ٹائیگرز بھارت کے صوبہ تامل ناڈو کے لوگ تھے۔ بھارتی سرکار انہیں چھاپہ مار جنگ کی ٹریننگ دے کر سری لنکا میں شورش اور بدامنی پھیلانے کے لیے بھیجتی تھی۔ بال ٹھاکرے کی تجویز پر بھارتی سرکار نے ان تامل ٹائیگرز گوریلوں کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تامل ٹائیگرز کی تحریک بھارت نے سری لنکا کی حکومت کے خلاف شروع کروائی تھی اور بھارت ان تامل ٹائیگرز کو سری لنکا سمگل کرتا تھا اور ان کی پوری فوجی امداد بھی کرتا تھا۔ بال ٹھاکرے نے پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک اور خطرناک چال چلی تھی۔ میرا کام اس دشمن پاکستان کی اس چال کو بھی ناکام بنانا تھا۔ چنانچہ میں تامل ناڈو جانے کے لیے خوشی سے تیار ہوگیا میں نے کہا۔

"جو حکم مہاراج! آپ ہمارے پیشوا جی ہیں۔ ہماری شیوسینا کے سیناپتی ہیں۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو بھی تیار ہیں۔"

اپنی تعریف سن کر بال ٹھاکرے نے مسرت کا اظہار کیا اور بالا جی سے کہا۔

"بالا جی! تم منڈاپم کیمپ کے ٹریننگ سنٹر تک دھرم چند کے ساتھ جاؤ گے اور وہاں گوریلا انسٹرکٹر بھلگو سے اس کا تعارف کراؤ گے۔ باقی ساری باتیں

"ں نے مال انسپکٹر صاحب کو فون پر بتا دی ہیں۔"

"واہ علم مہاراج"۔ بالا جی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

مال لمارے نے ہمیں اپنا آشیر باد دیا اور کہا۔

"ٹھیک ہے تم کل بمبئی سے منڈا پم کیمپ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔"

ہم نے دوسرے دن مدراس میل پکڑی اور چل پڑے۔

بالا جی راؤ اندر سے میرے خلاف تھا مگر اوپر سے میرے ساتھ اس کا سلوک بڑا دوستانہ تھا۔ میں نے بھی اس پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں اس کی نیت سے واقف ہوں۔ جن لوگوں نے بھارت کے صوبہ تامل ناڈو کی جانب سفر کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ یہ صوبہ بھارت کے جنوب میں واقع ہے جہاں بھارت کے دونوں طرف کے ساحل تکون کی شکل میں آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس کے دونوں جانب سمندر ہے۔ نیچے بھی سمندر ہے جس کے آگے پچیس تیس میل کے فاصلے پر سری لنکا کا ملک ہے۔ منڈاپم کیمپ بالکل جنوب میں واقع ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ یہاں سے سمندر کا ریتلا ساحل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ناریل اور تاڑ کے درخت اور کہیں کہیں پٹ سن اور دھان کے کھیت بھی نظر آ جاتے ہیں۔ بمبئی سے اس کا فاصلہ بڑا لمبا ہے۔ ہم ٹرین میں ایک دن' ایک رات اور پھر دوسرا سارا دن سفر کرنے کے بعد کندرا پلی پہنچے جو ایک جنکشن تھا۔ یہاں سے ہم نے دوسری ٹرین پکڑی اور شام کے وقت منڈاپم کیمپ پہنچ گئے۔ تامل گوریلا انسٹرکٹر بھلگو جس کا پورا نام بھلگو داسم تھا اپنے تین تامل گوریلوں کے ساتھ سٹیشن پر ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ تینوں تامل بے حد کالے رنگ کے ناٹے قد کے تھے مگر جسم بڑے مضبوط تھے۔ آنکھوں کا رنگ گلابی تھی وہ عام سی پتلون بش شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ مرہٹہ بالا جی راؤ کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا۔ میں اپنے گورے رنگ کی وجہ سے ان میں انگریز لگتا تھا۔

بھلگو داس ہمیں اپنی کھٹارا جیپ میں بٹھا کر سٹیشن سے پندرہ کلومیٹر دور

ناریل اور تاڑ کے درختوں کے ایک ذخیرے میں لے گیا جہاں کھپریل کی ڈھلوان چھت والی ایک لمبی بارک بنی ہوئی تھی۔ پیچھے تربیتی میدان تھا جہاں ریت کے مصنوعی تودے، گڑھے اور اونچے اونچے بانس کے دروازے بنے ہوئے تھے۔ ان دروازوں کے ساتھ رسے لٹک رہے تھے۔ یہاں گوریلوں کو رسے کے ذریعے عمارتوں پر چڑھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ایک طرف پتھروں کی دیوار پر چاند ماری کے نشان بنے ہوئے تھے۔ یہاں گوریلوں کو نشانہ بازی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ بھلگو تامل گوریلے نے ہمیں یہ سب کچھ دکھایا اور انگریزی میں کہا۔

"اس وقت ہمارے پاس دس گوریلے ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتا ہوا ہمیں بارک میں لے گیا جہاں ایک جانب زیر تربیت تامل گوریلے بانس کی چارپائیوں پر بیٹھے دال چاول کھا رہے تھے۔ بھلگو نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ پھر ہم بارک کے آخری کونے میں آ گئے جہاں میز کی دونوں جانب لکڑی کے بنچ پڑے تھے۔ ہم نے دال چاول کھائے۔ اس دوران تامل انسٹرکٹر بھلگو مجھ سے پاکستان کے شہروں خاص طور پر لاہور کراچی اور راولپنڈی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ ان کی مادری زبان تامل تھی۔ تامل زبان بالا جی راؤ بھی نہیں سمجھتا تھا اور میں بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ہم ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کرنے کی بجائے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ بھلگو واسم بڑی روانی سے انگریزی بول لیتا تھا۔ بھارت کے جنوب میں انگریزی زبان عام لوگ بھی بڑی آسانی سے بول لیتے ہیں۔ وہاں انگریزی تعلیم کا معیار بہت اونچا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بھارت کے جنوبی صوبوں میں آ چکا تھا۔ کرناٹک، کیرالہ، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش کے عام محنت کش مزدور بھی انگریزی بولتے اور سمجھ لیتے تھے۔

ہمارے لیے بارک کے سامنے والے جھونپڑے میں چارپائیوں پر بستر لگا دیے گئے تھے۔ وہاں رات کو بڑا حبس تھا۔ اس سارے علاقے میں حبس بہت

ہوتا ہے۔ خاص طور پر برسات کے دنوں میں تو ہر وقت جسم سے پسینہ بہتا رہتا ہے۔ بارش کے بعد جب یہاں دھوپ نکلتی ہے تو پھر شمال کے رہنے والوں کا حبس کے مارے دم گھٹنے لگتا ہے۔ سمندر کی طرف سے جو ہوا چلتی رہتی ہے اس میں بھی نمی ہوتی ہے جس سے حبس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن میں تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اگرچہ مجھے پوری تربیت نہیں مل سکی تھی پھر بھی جتنی ٹریننگ ملی تھی اس نے مجھے کافی سخت جان بنا دیا تھا اور میں سردی گرمی حبس سب کچھ آسانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ جھونپڑی میں ایک پیڈسٹل پنکھا ہمارے لیے رکھ دیا گیا تھا جس کی ہوا غنیمت تھی۔

اگلے روز بالاجی راؤ واپس بمبئی چلا گیا۔

وہ کل دس تامل ٹائیگرز گوریلے تھے۔ دن کے وقت چار گھنٹے اور رات کے وقت دو گھنٹے اندھیرے میں انہیں مختلف قسم کی گوریلا ٹریننگ دی جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ واقعی بڑے چاق و چوبند اور سخت جان گوریلے ہیں۔ ان کے نشانے بے حد صحیح تھے۔ اندھیرے میں بھی ان کی گولی ٹھیک ٹارگٹ پر جا کر لگتی تھی۔ دوپہر کے بعد دو گھنٹے میں انہیں اردو اور سندھی زبانوں کی ابتدائی قسم کی تعلیم دیتا۔ پاکستان کے شہروں کے بارے میں میں کوئی جگہ بھی صحیح نہیں بتاتا تھا۔ بلکہ میری کوشش یہی ہوتی کہ میں انہیں گمراہ کروں۔ میں نے گوریلا انسٹرکٹر کو بھی یہی مشورہ دیا کہ ان لوگوں کے لیے پنجابی' اردو اور سندھی زبان میں تھوڑی بہت شدھ بدھ حاصل کرنا بڑا ضروری ہے۔ جب ان زبانوں کو تھوڑا بہت سمجھنے لگ جائیں گے تو آخر میں میں انہیں پاکستان کے شہروں کے وہ اہم مقامات بتاؤں گا جہاں انہیں اپنی اپنی کارروائیاں کرنی ہوں گی۔ میرا اصل مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ پاکستان کے شہروں کے بارے میں جس قدر بے خبر رہ سکتے ہیں بے خبر رہیں۔ اس دوران میں نے ان دس کے دس تامل گوریلوں کو ٹھکانے لگانے کی کوئی ایسی ترکیب سوچنی شروع کر دی جس سے مجھ پر ذرا سا بھی

شک نہ پڑے۔ یہ بڑے تربیت یافتہ گوریلے تھے۔ ان کو اجتماعی طور پر ہلاک کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا اگر میں ان کی کشتی یا چھوٹے سٹیمر کو ڈبونے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو یہ لوگ بڑی آسانی سے سمندر میں تیر کر کنارے پر آ جائیں گے۔ آگ لگنے کی صورت میں بھی ان سب کا ایک ساتھ جل کر مر جانا بھی مشکوک تھا۔ صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی سٹیمر میں سوار ہوں۔ ایک جگہ جمع ہوں اور وہاں طاقتور دھماکہ کیا جائے جس سے ان سب کے پرخچے اڑ جائیں۔ اس کے لیے مجھے باقاعدہ بڑا سوچ سمجھ کر منصوبہ بنانے کی ضرورت تھی۔ میرے پاس وقت موجود تھا۔ کیونکہ ہلگو گوریلا انسٹرکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ان لوگوں کی ٹریننگ تقریباً" ایک ماہ میں ختم ہوگی۔ اس کے بعد میں اردو' پنجابی زبانیں سکھانے میں بھی کچھ دیر لگا سکتا تھا۔

وہاں چھوٹے بڑے ہتھیاروں کا اسلحہ موجود تھا۔ اگرچہ گولہ بارود نہیں تھا۔ مشین گن' سٹین گن اور برین گنوں کی گولیوں کا کافی سٹاک تھا۔ مجھے ان گولیوں میں سے بارود نکال کر کوئی طاقتور بم تیار کرنا تھا جس کا دھماکہ کسی سٹیمر میں کیا جانا تھا۔ سمندر قریب ہی تھا اور ان لوگوں کو سمندر میں بھی ٹریننگ دی جاتی تھی۔

میری حیثیت بھی وہاں ایک انسٹرکٹر کی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کو معلوم تھا کہ میں شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کا خاص آدمی ہوں اور یہ مشن بال ٹھاکرے کے مشورے پر ہی تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ کیمپ میں میرے آنے جانے پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ حالانکہ وہاں باہر کا کوئی آدمی کیمپ کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ دن اور رات کے وقت بھی کیمپ کی خاردار دیوار کے چاروں جانب گارڈ کمانڈو پہرہ دیتے تھے اور پٹرولنگ پارٹی بھی گشت پر ہوتی تھی۔ میرا جھونپڑا الگ تھا۔ وہاں میں رات کو سوتا تھا اور دن کے وقت بھی جب گوریلا تامل اپنی ٹریننگ میں مصروف ہوتے تھے میں جھونپڑے میں

چارپائی پر لیٹا کوئی رسالہ یا کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ میگزین کا سٹاک بارک کی ایک کوٹھڑی میں تھا۔ مجھے وہاں سے گولیوں کے تین چار پٹے نکال کر لانے تھے۔ ایک روز میں نے بھلگو تامل گوریلے سے کہا کہ ہمارے پاس میگزین کا سٹاک کم پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ آپ لوگ ٹریننگ کے دوران بے تحاشا اسلحہ استعمال کرتے ہیں۔ بھلگو انسٹرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں فوج کی طرف سے ایمونیشن سپلائی ہوتا ہے۔ ہمیں اجازت ہے کہ جتنا چاہیں اسلحہ استعمال کریں۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی میرے دوست! ہماری ملٹری ہائی کمانڈ اس بارے میں بڑی محتاط ہے اور مجھے یہ بھی ہدایت دے کر بھیجا گیا ہے کہ میں ایمونیشن کا حساب رکھوں کہ روزانہ ہم کتنا میگزین خرچ کرتے ہیں۔

بھلگو انسٹرکٹر سنجیدہ ہو گیا کہنے لگا۔

"اگر یہ بات ہے تو تم بے شک اس کا حساب رکھ سکتے ہو۔"

میں نے اصل بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس وقت میگزین کا جو اسٹاک ہمارے پاس موجود ہے اسے ایک نظر چیک کرلوں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں' بالکل نہیں نو پرابلم۔"

بھلگو نے مجھے جیب سے چابی نکال کر دی اور کہا۔

"تم ابھی جا کر چیک کر سکتے ہو۔ نو پرابلم۔"

"میں یہی چاہتا تھا میں اٹھ کر بارک کے کونے والی اس کوٹھڑی کی جانب چل دیا جس میں مشین گنوں وغیرہ کے میگزین کا سٹاک رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کے کریٹ لگے ہوئے تھے جن میں مشین گنوں اور دوسری گنوں کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ بھی میگزین کے پٹے لٹک رہے تھے۔ کوٹھڑی میں ایک روشندان تھا جس میں سے دن کی روشنی اندر

آ رہی تھی۔ عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ یہی کھڑکی میرے کام آ سکتی تھی۔ اگر کھڑکی نہ ہوتی تو مجھے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی۔ کھڑکی نے میرے راستے کو آسان بنا دیا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس گیا یہ لوہے کے پٹ والی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ اس کے اوپر چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی آہستہ سے چٹخنی کو نیچے کر دیا۔ کھڑکی کو ذرا سا اندر کی طرف کھینچا کھڑکی کھل چکی تھی۔ میں نے اسے پہلے کی طرح بند کر دیا۔

دو تین منٹ کوٹھڑی میں رکنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ کوٹھڑی کو تالا لگایا اور واپس آکر ھگلو انسٹرکٹر کو چابی دی اور کہا۔

"مائی فرینڈ! اندر تو کافی سٹاک موجود ہے۔ تم بے شک ٹریننگ کے دوران جتنا چاہے میگزین استعمال کرو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تامل گوریلوں کو پوری پوری ٹریننگ دی جائے تاکہ دشمن ملک میں جاکر جب یہ رات کے وقت بھی واردات کریں تو ان کی گولیاں ٹھیک نشانے پر جا کر لگیں۔"

گوریلا انسٹرکٹر ھگلو سگریٹ سلگاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہو۔ پاکستان کوئی بزدل لوگوں کا ملک نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی طرح وہاں دال بھات کھانے والے بزدل ہندو نہیں رہتے۔ وہاں کا تو بچہ بچہ فوجی ہے اور ہر دوسرے آدمی کے پاس پستول اور کلاشنکوف ہوتی ہے۔ ہم اخباروں میں وہاں کی خبریں پڑھتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے گوریلوں کو پوری طرح سے تیار کر کے وہاں بھیجنا ہوگا۔"

میں نے فوراً" انگریزی میں کہا۔

"بہت خوب' ھگلو برادر! ہمیں اس وقت تم ایسے گوریلا انسٹرکٹرز کی ضرورت ہے۔ شاباش!"

ھگلو انسٹرکٹر پھول کر کپا ہوگیا۔

دوپہر کے بعد جب میں تامل گوریلوں کو اردو زبان میں بول چال کی ابتدائی

مشق کرا کر فارغ ہوا تو یونہی سگریٹ سلگا کر ٹہلنے کے لیے بارکوں کی طرف چلا گیا۔ تامل گوریلے بارکوں کے پیچھے جو میدان تھا وہاں شام کی ٹریننگ لینے کے لیے چل دیے تھے۔ میں ٹہلتے ٹہلتے میگزین والی کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر ناریل کے ایک درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ ناریل کا یہ تنا زمین سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ کی طرح ایک طرف کو جھک کر اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔ اس ہوا میں میرے سر کے بال ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ میگزین کے ذخیرے والی کوٹھڑی کی پچھلی کھڑکی کو میں دیکھ رہا تھا۔ اس طرف کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ ایک درخت اگا ہوا تھا جو پپیتے کا درخت تھا۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں اٹھا اور اپنے جھونپڑے میں واپس چلا گیا۔ باہر سے یہ جھونپڑا تھا مگر اندر سے چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیواریں بانس کی تھیں اور ڈھلواں چھت ناریل کی شاخوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ کیونکہ اس طرف برسات میں بارشیں بہت ہوتی تھیں۔ میونسپل کمیٹی کے کئی ایک دفتر بھی ایسے ہی جھونپڑوں کی طرح کے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر باہر بیٹھا رات کی ٹریننگ کے دوران گوریلوں کو اندھیرے میں گھات لگا کر ٹارگٹ پر فائر کرتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میں جھونپڑے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ اس علاقے میں یعنی بھارت کے جنوبی علاقوں میں گرمیوں کا موسم ہی ہوتا ہے۔ یہاں سردیوں کے موسم میں بھی موسم گرم مرطوب ہی رہتا ہے۔ میں نے بتی بجھا دی تھی۔ گیارہ بجے رات گوریلوں کی چاند ماری ختم ہوئی اور کچھ دیر کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے مزید انتظار کیا۔ جب میری گھڑی پر رات کا پورا ایک بجا تو میں بستر سے اٹھا اور جھونپڑے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ آسمان پر پھیکے پھیکے سے تارے نظر آ رہے تھے بارک پر جہاں تامل گوریلے سو رہے

تھے سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے والی گاڑی بھی گزر چکی تھی۔ اب صبح تین بجے دھنش کوڑی کی طرف سے ایک گاڑی کو آ کر گزرنا تھا۔

رات اندھیری تھی۔ چاند رات کے پچھلے پہر نکلتا تھا۔ میں جھونپڑے کے پیچھے سے ہو کر چلتا ہوا میگزین والی کوٹھری کے عقب میں آ کر کھڑکی کے پاس رک گیا۔ کھڑکی کے پٹ کو اندر کو دبایا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ میں کھڑکی میں سے کوٹھڑی کے اندر چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ میگزین کی بیلٹیں سامنے والی دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔ میں لکڑی کے کریٹوں کو ٹٹول کر چلتا دیوار کے پاس آیا اور مشین گن کے میگزین کی دو بیلٹیں اتار لیں۔ انہیں قدموں پر چلتا واپس کھڑکی میں آیا اور باہر نکل کر کھڑکی کو بند کر دیا۔ اندھیرے میں گھور کر چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں دم قدم چلتا اپنے جھونپڑے میں آ گیا۔ میگزین کی دونوں بیلٹوں کو میں نے چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح ناشتے کے وقت میں بارک کے کچن میں گیا۔ گوریلا انسٹرکٹر ملگو بھی اپنے گوریلا ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ہم نے مل کر ناشتہ کیا۔ یہ لوگ چائے کی بجائے کافی زیادہ شوق سے پیتے تھے۔ لانگری صرف میرے لیے چائے بناتا تھا۔ کیونکہ کافی مجھے زیادہ پسند نہیں تھی۔ ٹھیک دن کے آٹھ بجے گوریلوں کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ کچھ دیر تک میں سائیٹ پر موجود گوریلوں کو ٹریننگ لیتے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے جھونپڑے میں آ گیا۔

میں نے چارپائی کے نیچے سے میگزین کی ایک بیلٹ نکال کر چارپائی پر رکھ لی اور پلاس کی مدد سے گولیاں بیلٹ میں سے نکالنے لگا۔ یہ کافی گولیاں تھیں۔ گولیاں نکل آئیں تو اب سب سے نازک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ یعنی ہر گولی کے منہ کے آگے جڑا ہوا نوکیلا سکہ الگ کر کے اندر سیاہ رنگ کے دھماکہ

خیز مواد کو ایک جگہ جمع کرنا تھا۔ یہ کافی دشوار کام تھا اور خطرناک بھی گولی کے سیدھے رخ پیچھے ضرب لگنے سے گولی فائر ہو سکتی تھی۔ مگر میں دھماکہ خیز مواد کے بارے میں کافی تجربہ کار تھا۔ اس کام میں مجھے کافی دیر لگ گئی اور میں صرف چھ سات گولیوں کے سکے الگ کر کے سیاہ بارود جمع کر سکا۔ باقی کام میں نے دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا۔ کیونکہ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اور باہر سے تامل گوریلوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ ٹریننگ ختم کر کے بارک کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے سارا سامان چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔

تامل گوریلوں نے دوسرے سے مجھے ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ ہنگلو انسٹرکٹر ان کے آگے آگے تھا۔ اس نے اونچی آواز میں مجھ سے کہا۔

"سر! لنچ پر ضرور آ جانا۔"

میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"فکر نہ کرو میں تم سے پہلے وہاں موجود ہوں گا۔"

اس کے بعد مجھے رات کو ہی وقت مل سکا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی اور سارے گوریلے بارک میں سو گئے تو میں نے باقی کی گولیوں سے بھی بارود نکالنے کا کام شروع کر دیا۔ مجھے تین راتیں صرف کرنی پڑیں تب کہیں جا کر اتنا بارود میرے پاس جمع ہوا جتنے بارود کی مجھے ضرورت تھی۔ مزید دو راتیں لگا کر میں نے اس بارود میں کچھ کیمیکلز ملا کر ان کا لیپ تیار کیا۔ یہ کیمیکلز مجھے منڈاپم کیمپ کے شہر کے بازار سے مل گئے تھے۔ وہ کیمیکلز عام قسم کے تھے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ کیمیکلز کیا تھا۔ بس آپ سمجھ لیں کہ میں ایک ہفتے کی محنت کے بعد ایک گز لمبی پلاسٹک کی سیاہ رنگ کی ٹیپ تیار کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ بظاہر یہ ایک چپکنے والی اور ڈبوں پر لگانے والی پلاسٹک کی ٹیپ تھی مگر حقیقت میں یہ اس قدر دھماکہ خیز اور تباہی مچانے والا بم تھا کہ اس کے پھٹنے سے پتھر کی چٹان میں گہرا

شگاف پڑ جائے اور لوہے کی چادریں دھماکے کے ساتھ اڑ سکتی ہیں۔
اس کو چلانے کا بھی ایک خاص ٹیکنیکل طریقہ ہے جو میں نہیں بتاؤں گا کیونکہ یہ چیزیں راز میں ہی رکھی جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔ اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ پڑھنے سننے والا اس قسم کی چیزیں تیار کرنی نہ شروع کر دے جو خلاف قانون حرکت ہوگی۔ میگزین کی دونوں بیلٹیں گولیوں سے خالی ہوگئی تھیں۔ میں نے ان بیلٹوں کو اور گولیوں کے نوکیلے سکوں کو ایک تھیلے میں ڈالا اور ریلوے سٹیشن کی طرف جاکر ریت کے ٹیلے کے پاس زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ اب مجھے تامل گوریلوں کو جنہیں پاکستان میں تباہی مچانے کی ٹریننگ دی جا رہی تھی کب موت کی نیند سلانا ہے۔ مجھے منڈا پم کیمپ کے ٹریننگ سینٹر میں آئے بمشکل ایک ہفتہ ہی گزرا تھا۔ میں اتنی جلدی یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس ان لوگوں کو تباہ کرنے کی ہر شے موجود تھی۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ ان تامل گوریلوں کو ہفتے میں ایک دن سمندر پر جاکر ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس ٹریننگ میں سمندر میں زیادہ سے زیادہ لمبا غوطہ لگانا' ڈوبتے ہوئے ساتھیوں کی جان بچانا اور سمندر کے اندر دشمن پر فائر کرنا شامل تھا۔ میں ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی دن ممگلو سے پوچھا کہ سمندر پر کب چلنا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ کل دن نکلنے کے فوراً" بعد سمندر کی ٹریننگ کا کورس ہوگا۔

دوسرے دن ہم سب لوگ منہ اندھیرے جیپوں میں بیٹھ کر سمندر کے ساحل پر چلے گئے۔ یہ ساحل ریتلا اور چٹانی تھا۔ ایک طرف چٹانوں کے درمیان سمندر میں پرانا سٹیمر کھڑا تھا۔ یہ سٹیمر نہ زیادہ بڑا تھا نہ چھوٹا تھا۔ اس کے پیندے کا دونوں جانب رنگ اڑ چکا تھا اور جگہ جگہ زنگ لگ رہا تھا۔ اس کے دو عرشے تھے۔ دوسرے عرشے پر تین کیبن تھے۔ یہ سٹیمر گوریلا ٹریننگ کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔ سارے گوریلے سٹیمر کے اوپر والے ڈیک پر آ گئے۔ ممگلو انسٹرکٹر کے ہاتھ میں سیٹی تھی۔ اس نے تامل زبان میں انہیں کوئی آرڈر دیا۔ گوریلے ڈیک کے جنگلے کے ساتھ اٹن شن ہو کر کھڑے ہوگئے۔ دوسرے آرڈر پر انہوں نے ایک نعرہ لگایا اور ساکت ہوگئے۔ ممگلو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی سیٹی کی آواز پر سٹیمر کا لنگر اٹھا دیا گیا۔ انجن چلنے لگا۔ سٹیمر چٹانوں میں سے نکل کر کھلے سمندر کی طرف چل پڑا۔ گوریلے اسی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ممگلو بھی ہاتھ میں سیٹی لیے اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔ ہر گوریلے کے کندھے پر سٹین گن تھی۔ میں ڈیک پر ایک طرف ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا۔

جب سٹیمر ساحل سے کافی دور کھلے سمندر میں آگیا تو ممگلو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز باریک اور بڑی تیز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی سٹیمر کا انجن بند ہوگیا اور ایک سی مین نے سمندر میں لنگر گرا دیا۔ سٹیمر کھڑا ہوگیا۔ انسٹرکٹر نے ایک بار پھر سیٹی بجائی اور دس کے دس گوریلوں نے باری باری سمندر میں چھلانگیں لگا دیں۔ یہاں سمندر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا

عفریت سانس لے رہا ہو۔ بھلگو نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ ہم سمندر میں دیکھ رہے تھے تاآں گوریلے سمندر میں غائب ہو چکے تھے۔ وہ غوطے لگا گئے تھے۔ انسٹرکٹر اپنی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ گوریلے کافی دیر سے سمندر کے اندر ہی رہے۔ پھر باری باری سمندر کی سطح پر آئے اور زور زور سے سانس لے کر دائرے کی شکل میں تیرنے لگے۔ بھلگو نے سب کے غوطوں کے ٹائم نوٹ کر لیے تھے۔

اس نے سیٹی بجائی۔ سارے گوریلے تیرتے ہوئے سٹیمر کی طرف آئے اور سٹیمر کے پہلو میں جو لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں ان کو پکڑ کر سٹیمر کے ڈیک پر چڑھ آئے۔ وہ ڈیک کے جنگلے کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ بھلگو انسٹرکٹر نے تیز آواز میں چیخ کر انگریزی میں کہا۔

"ایکسر سائیز نمبر ٹو۔ نمبر ون۔ گو۔"

اس حکم کے ساتھ ہی ایک گوریلا سمندر میں کود گیا اور یوں ہاتھ پاؤں مارنے لگا جیسے ڈوب رہا ہو۔ انسٹرکٹر نے چیخ کر کہا۔

"گو۔"

گوریلا نمبر دو نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ سمندر میں گرتے ہی وہ ڈوبتے ہوئے گوریلے کی طرف تیرتا ہوا گیا اور نیچے سے ہو کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنا بازو ڈال کر اسے اوپر اٹھا لیا اور تیرتے ہوئے اسے ساتھ تیراتا سٹیمر کی طرف بڑھا۔ اس دوران سمندر کی موجیں اسے سٹیمر سے کچھ دور لے گئی تھیں۔ سٹیمر اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اسے وہاں سے چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ گوریلا اپنے ساتھی کی جان بچانے اور اسے سٹیمر کی طرف لے کر آنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ آخر وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سٹیمر کے سٹار بورڈ کے پاس لے آیا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے لٹکتی ہوئی زنجیر کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو اپنے کاندھے پر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے زنجیر کو پکڑے دونوں پاؤں سٹیمر کے

سٹار بورڈ سے لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ مگر وہ تامل گوریلا اپنے ساتھی کو بچا کر ڈیک پر لے آیا ہھلگو انسٹرکٹر نے گھڑی پر ٹائم دیکھ کر نوٹ بک میں نوٹ کیا اور چیخ کر انگریزی میں کہا۔

"ایکسر سائیز نمبر تھری۔ ٹارگٹ ریڈی!"

اس آواز کو سنتے ہی ایک طرف سے دو گوریلے نکل کر ڈیک کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دو ٹوکرے اٹھائے ہوئے تھے۔ ڈیک کے جنگلے کے پاس آتے ہی انہوں نے ٹوکروں کو سمندر میں الٹ دیا۔ ٹوکروں میں کم از کم دس دس پندرہ پندرہ سیر کی دس بارہ مچھلیاں تھیں۔ سمندر میں گرتے ہی مچھلیاں پانی میں غوطے لگا گئیں۔ انسٹرکٹر کی آواز گونجی۔

"اٹیک۔"

اس حکم کے ملتے ہی دس کے دس تامل گوریلوں نے سٹین گن کاندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑیں اور سمندر میں کود گئے۔ یہ بڑا دلچسپ کھیل یا ایکسر سائیز تھی۔ سارے تامل گوریلے اسلحہ سمیت سمندر میں غوطے لگا گئے۔ ایک دو سیکنڈ بعد ہی سٹین گنوں کے برسٹ فائر ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازوں کے دھماکے سمندر کے اندر ہو رہے تھے جس کی وجہ سے آواز مدہم تھی۔ ہم سمندر کی سطح پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے سمندر کی سطح پر چھ سات مردہ مچھلیاں تیرنے لگیں۔ ہھلگو انسٹرکٹر نے مجھے کہا۔

"ان مچھلیوں کے ٹارگٹ کو ہمارے آدمیوں نے سمندر کے اندر مار لیا ہے۔"

جب تک ساری مچھلیاں مر نہ گئیں اور ان کے مردہ جسم سمندر کی سطح پر نہ نکل آئے کوئی گوریلا سمندر سے ابھر کر باہر نہ نکلا جب ساری مچھلیاں مر گئیں تو ایک ایک کر کے دس کے دس گوریلے سمندری موجوں میں سے ابھر کر باہر نکل آئے۔ وہ اپنی سٹین گنیں لہرا کر نعرے لگا رہے تھے۔

ھلگو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی۔ سارے گوریلے اس طرح سمندر میں تیرتے ہوئے سٹیمر کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے سٹین گنوں والے ہاتھ پانی سے باہر تھے اور وہ ایک بازو اور دو ٹانگوں سے تیر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے جب سارے گوریلے ڈیک پر آ کر فال ان ہو کر کھڑے ہوگئے تو انسٹرکٹر نے سیٹی بجائی۔ سب گوریلوں نے مل کر نعرہ لگایا۔ انسٹرکٹر نے چیخ کر کہا۔ "ایٹ ایز۔"

اور سب لوگ ایک دوسرے سے ہنستے مسکراتے باتیں کرتے نیچے ڈیک نمبر ۲ کی کیبن کی طرف چل دیے۔ انسٹرکٹر ھلگو میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا۔
"ہماری ٹریننگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا۔ "ایک دم نمبر ون تم واقعی بڑی محنت سے ٹریننگ دے رہے ہو۔"

ھلگو میرے ساتھ نیچے کیبن میں آگیا۔ وہاں پہلے سے چائے اور کافی میز پر لگی تھی۔ میں چائے اور ھلگو کافی پینے لگا۔ ساتھ ہی ناشتہ آگیا۔ میں بڑے غور سے ڈیک نمبر ۲ کی ایک ایک شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اس سٹیمر میں بڑی خاص خاص جگہوں پر پلاسٹک کی دھماکہ خیز ٹیپ لگانی تھی۔ سب سے اہم مقام سٹیمر کا انجن روم تھا۔

میں نے ھلگو سے پوچھا۔ "اس سٹیمر میں کتنے انجن کام کر رہے ہیں۔"
"دو انجن ہیں یہ زیادہ بڑا سٹیمر نہیں ہے اس کے دو انجن ہی کافی ہیں۔"
میں نے کہا۔ "مجھے پسٹن والے انجن دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"
ھلگو بولا۔ "ابھی چل کر دکھاتا ہوں۔ ویسے یہ پرانے انجن ہیں۔"

ناشتے کے بعد ہم نیچے انجن روم میں آ گئے۔ چھوٹا سا کیبن نما انجن روم تھا۔ گریس اور تیل میں لتھڑے ہوئے انجن خاموش تھے۔ دو انجن مین ان کے پرزوں کی چیکنگ وغیرہ کر رہے تھے۔ میں نے وہ جگہ ذہن میں رکھ لی جہاں مجھے

دھماکہ خیز ٹیپ لگانی تھی۔ ہم اوپر آکر ڈیک پر بچھی ہوئی بانس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سمندر میں اگلی ٹریننگ اب کس روز ہوگی۔ اس نے کہا۔

"اگلے ہفتے آج ہی کے دن۔ یہ ٹریننگ ہم ہفتے میں صرف ایک بار کرتے ہیں۔ ہمیں سمندری ٹریننگ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم تامل لوگ سمندر میں کھیل کود کر بڑے ہوتے ہیں۔ ہمارا بچہ بڑی جلدی سمندر میں تیرنا سیکھ جاتا ہے۔"

میں بھلگو انسٹرکٹر کی باتیں سنی ان سنی کر رہا تھا۔ اصل میں میرا ذہن صرف ایک سوال پر غور کر رہا تھا کہ مجھے یہ آپریشن کب کرگزارنا چاہیے۔ کون سا وقت اس کے لیے موزوں رہے گا۔ اگر میں اگلے ہفتے ہی دھماکہ خیز ٹیپ لگا کر ان سارے گوریلوں کو سٹیمر سمیت دھماکے سے اڑا کر سمندر میں غرق کر کر دیتا ہوں تو اس کا بال ٹھاکرے اور بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس پر کیا ردعمل ہوگا۔ قدرتی طور پر تو سب سے پہلے تو وہ وہ لوگ یہ سوچیں گے کہ ایسا ہر بار کیوں ہوتا ہے کہ جہاں میں کسی اہم مشن پر جاتا ہوں وہاں میرے جاتے ہی کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہن میں جالندھر والے پرتھوی میزائیل کے اڈوں کی تباہی اور کئی دوسرے بھارتی دہشت گردوں کی موت کا خیال بھی آ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے یہاں ٹریننگ کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ جب میں نے انسٹرکٹر بھلگو سے یہ سوال کیا تو وہ کہنے لگا۔

"ہمارے گوریلے بالکل تیار ہیں۔ یہ پہلے سے تربیت یافتہ ہیں۔ یہاں ایک طرح سے ان کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ یہ تو تم نے طے کرنا ہے کہ تم کتنے دنوں تن ان لوگوں کو سندھی پنجابی اور اردو میں ضروری بول چال سکھا سکتے ہو۔"

میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"میرے خیال میں تو ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے اور پندرہ دن بھی لگ سکتے

ہیں۔ یہ تو تمہارے تامل گوریلوں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلدی سندھی اور پنجابی کے جملے بولنے اور سمجھنے لگیں گے۔"

"تم ایک ہفتے سے انہیں کورس پڑھا رہے ہو۔ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے۔"

میں اپنے حساب سے سوچ رہا تھا کہ یہاں کتنے دنوں کے بعد دھماکہ کرنا مناسب رہے گا۔ میں نے کہا۔

"میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ دس پندرہ دنوں کے بعد مجھے گوریلوں کی کارکردگی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔"

انسٹرکٹر ہکلو بولا۔

"اوکے جب تم کہو گے تو ہم ان گوریلوں کو پاکستان سمگل کریں گے۔"

میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ اس بار میں کوئی ایسی سکیم بنانا چاہتا تھا کہ دھماکہ نہ کیا جائے۔ کوئی دوسرا ایسا منصوبہ بنایا جائے کہ بھارت کی سنٹرل انٹیلی جنیس بال ٹھاکرے اور میرے چھپے دشمن بالا جی راؤ کو ذرا سا بھی مجھ پر شک نہ پڑے۔ لیکن ایسا کوئی منصوبہ' کوئی سکیم میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو زندہ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر انہیں زندہ چھوڑتا ہوں تو ظاہر ہے یہ پاکستان جا کر بے پناہ تباہی مچائیں گے کچھ پتہ نہیں وہاں کتنے بے گناہوں کا خون کریں۔ ان کو ہلاک کرنا تو میری بڑی اہم ذمے داری بن چکی تھی۔ سوچنا یہ تھا کہ انہیں کس طریقے سے ٹھکانے لگایا جائے کہ کسی دشمن کے دماغ میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔ مزید ایک ہفتہ اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

دوسرے ہفتے کے آخری دن جبکہ صبح تامل گوریلوں کو سمندر کی ٹریننگ پر جانا تھا۔ بمبئی سے مجھے بال ٹھاکرے کا فون آ گیا۔ وہ بولا۔

"ابھی تم یہاں کتنی دیر اور لگاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "سینا پتی جی! بس تھوڑی سی مہلت اور دے دیں پنجابی اور سندھی زبان آسانی سے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

بال ٹھاکرے نے اپنے مخصوص کرخت لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں ایک ہفتہ اور دیتا ہوں۔ اس کے بعد چاہے یہ کچھ سمجھیں چاہے نہ سمجھیں تم انہیں لے کر بمبئی آ جاؤ گے۔ ہمیں انہیں بڑی جلدی پاکستان بھیجنا ہے۔"

میں نے دل میں کہا۔ "اس بات کو تو تم بھول جاؤ کہ یہ خطرناک گوریلے پاکستان میں جا کر دہشت گردی کریں گے۔"

اوپر سے کہا۔ "ٹھیک ہے پیشوا جی! مجھے ایک ہفتہ اور ان پر محنت کر لینے دیجئے۔"

بال ٹھاکرے نے اپنی عادت کے مطابق بغیر کوئی لفظ کہے فون بند کر دیا میں سوچ میں پڑ گیا اس کا مطلب تھا کہ مجھے اگلے ہفتے دھماکہ کر کے ان سارے پاکستان دشمن گوریلوں کا صفایا کر دینا تھا۔ جب دوسری کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ان لوگوں کا کام تو تمام کرو۔ ان سانپوں کے تو سر کچلو جنہیں پاکستان کی زمین پر چھوڑا جانے والا ہے۔ آگے جو ہو گا۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے بھی تو میں نے ایسے حالات میں صورت حال کو سنبھال لیا تھا۔ اب میں بے چینی سے اگلے ہفتے کی سمندری مشق کا انتظار کرنے لگا۔

جس روز بال ٹھاکرے کا بمبئی سے ٹیلی فون آیا تھا اسی روز تامل گوریلوں کو سمندری مشقوں پر جانا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ مشقوں کے وقفے کے دوران جب ہم لوگ سٹیمر کے کیبن میں ناشتہ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ میں نے انسٹرکٹر بھلگو سے کہا۔

"تم لوگ جس سمندر میں ایکسرسائز کر رہے ہو اس کی دوسری طرف سری

لنکا کا سمندر ہے جو یہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہی ہے اور سری لنکا ہمارا اور خاص طور پر تم تامل ٹائیگروں کا جانی دشمن ہے اور ان کی برین سروس کے گوریلے بھی یہاں آسکتے ہیں کیا کبھی ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

انسٹرکٹر پھلوگو سر ہلاتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا۔

"ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ سری لنکا کے میرین کمانڈو بھیس بدل کر ہمارے علاقے میں گھس آتے ہیں۔ لیکن ہمارے تامل گوریلے ان سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ ہم انہیں یا تو مار دیتے ہیں یا پکڑ کر ملٹری پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ ہمارے ساحل کے آس پاس دو چار دھماکے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

دوسرے ہی دن میں نے بال ٹھاکرے کو اس کے خفیہ نمبر پر فون کر کے اسے اس صورت حال کے بارے میں اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر بتایا اور کہا۔

"پیشوا جی! سری لنکا کی نیول فورس کے کمانڈو ہمارے سمندر میں آ کر دھماکے کر جاتے ہیں۔ ایسا کئی ماہ سے مسلسل ہو رہا ہے۔ ہماری انٹیلی جینس اس معاملے میں کوئی موثر کارروائی نہیں کر رہی۔"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے' مجھے معلوم ہے لیکن تم اپنا کام کیے جاؤ۔ ہماری انڈین نیوی کی سیکورٹی کو حالات کا پورا احساس ہے۔"

میں نے کہا۔ "سر! پرسوں شام کو میں نے منڈاپم کیمپ میں دو مشکوک آدمیوں کو اپنے ٹریننگ کیمپ کی بارک سے نکل کر سمندر کی طرف جاتے دیکھا ہے میں ان کے پیچھے پیچھے گیا مگر وہ مجھے جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ سر! اس طرف ہمیں توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ جب ہم سمندری ٹریننگ پر جاتے ہیں تو دوسرے ہمیں اپنے دشمن ملک سری لنکا کی نیوی کے

وار شپ صاف نظر آ رہے ہوتے ہیں۔"

بال ٹھاکرے ایک دو لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے میں اس معاملے پر غور کروں گا۔ تم جتنی جلدی ہو سکے تامل گوریلوں کا کورس ختم کر کے انہیں لے کر بمبئی پہنچنے کی کوشش کرو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے سر۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔

میں نے تھوڑی بہت پیش بندی کر دی تھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب جو ہونا ہے ہوتا رہے۔ مجھے تو ہر حالت میں اگلی سمندری ٹریننگ کے فوراً بعد ان لوگوں کو اڑا دینا ہے۔ یہ میں فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک ہفتہ گراؤنڈ ٹریننگ میں گزر گیا۔ اس دن کا آغاز ہوا جس روز سورج نکلنے پر دس کے دس تامل گوریلوں نے اپنے انسٹرکٹر بھلگو کے ساتھ سمندری مشق کے لیے جانا تھا۔ ان مشقوں میں میں ان کے ساتھ ضرور جاتا۔ چنانچہ اس دن بھی تیار ہو کر ساتھ چل پڑا۔ ہم دو پرانی جیپوں میں سوار تھے۔ سٹیمر چٹانوں کی اوٹ میں سمندر میں کھڑا تھا۔ ہم سٹیمر پر آ گئے۔ بھلگو انسٹرکٹر نے گوریلوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے رسمی طور پر ان کی گنتی کی۔ پھر سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز پر انجن مین نے سٹیمر کا انجن چلا دیا۔ سٹیمر ساحل کو چھوڑ کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ ساحل سے کچھ دور جا کر سٹیمر کا لنگر گرا دیا گیا۔ سٹیمر رک گیا۔ اب معمول کے مطابق ایکسر سائز شروع ہو گئی۔ میں نے آج بانس کی کرسی پیچھے کر کے اس جگہ ڈال دی تھی جہاں سیڑھیاں نیچے انجن روم کو جاتی تھیں۔ چونکہ اس وقت انجن بند کر دیا جاتا تھا اس لیے میں نے نوٹ کیا تھا کہ انجن مین اور اس کا اسسٹنٹ فائر مین انجن روم سے نکل کر مشقیں دیکھنے اوپر ڈیک پر آ جاتے تھے۔ اس روز بھی وہ اپنی عادت کے مطابق اوپر ڈیک پر ایک طرف بیٹھے تامل

گوریلوں کو سمندر میں چھلانگیں لگا کر غوطے لگاتے دیکھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ موقع بڑا غنیمت تھا۔ میں آہستہ سے کرسی چھوڑ کر اٹھا اور بڑے سکون کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ دوسری منزل کا ڈیک بالکل خالی پڑا تھا۔ میں نیچے انجن روم میں آ گیا۔

میرے پاس ہر چیز تیار تھی۔ جہاں جہاں مجھے دھماکہ خیز ٹیپ چپکانی تھی ان جہوں کا بھی میں پہلے سے انتخاب کر چکا تھا۔ یہ چھ مقام تھے دو ٹیپیں میں نے خاص طور پر انجن کے بوائلر کے ساتھ نیچے کر کے چپکا دیں۔ باقی ٹیپیں جہاں جہاں لگانی تھیں لگا دیں۔ مجھے معلوم تھا کہ سمندری مشقیں تقریباً" دو گھنٹے تک جاری رہا کرتی ہیں اور اس دوران تامل گوریلے ناشتہ بھی سٹیمر پر ہی کرتے ہیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں تیزی سے چلتا انجن روم سے نکل کر اوپر ڈیک پر آ گیا۔ میرے حساب سے سٹیمر میں ٹھیک پون گھنٹے کے بعد زبردست دھماکہ ہونے والا تھا۔ اس وقت تامل گوریلے دوسری مشق کر رہے تھے اور اپنے ایک ساتھی کو ڈوبنے سے بچانے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں ڈیک کے جنگلے کے ساتھ کھڑا ہو کر یہ نظارہ دیکھنے لگا۔ میرا ذہن اس وقت صرف ایک ہی مسئلے پر غور کر رہا تھا اور وہ مسئلہ تھا کہ میں سٹیمر سے کیسے نکلوں؟ کیونکہ مجھے سٹیمر کے ساتھ دھماکے سے نہیں اڑنا تھا۔ مگر سٹیمر ساحل سے دور تھا۔ سٹیمر کی ایک جانب دو چھوٹی چھوٹی کشتیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ ہنگامی حالات میں استعمال کی جانے والی کشتیاں تھیں۔ دوسری مشق ختم ہوئی تو میں نے انسٹرکٹر ھلگو سے انگریزی میں کہا۔

"پیارے بھائی ھلگو! آج میرا سمندر میں کشتی چلانے کو بہت جی چاہتا ہے۔ بمبئی میں تو میں نے ایک کشتی ٹھیکے پر لے رکھی تھی ہر روز شام کو اس میں بیٹھ کر روئنگ کرتا تھا۔

ھلگو نے فوراً" کہا۔

"ضرور کشتی رانی کرو۔ سٹیمر پر اس وقت دو کشتیاں موجود ہیں۔ ان میں

سے ایک اتروا دیتا ہوں۔ مگر یہ چھوٹی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چھوٹی کشتی مجھے زیادہ پسند ہے۔ شکریہ۔"

اس نے اس وقت ایک تامل گوریلے کو آرڈر دیا کہ دھرم چند جی کے لیے ایک کشتی سمندر میں اتار دو۔ تامل گوریلے نے اونچی آواز میں لیس سر کہا اور مجھے لے کر ڈیک کی سائیڈ پر جہاں دو کشتیاں رسیوں سے بندھی لٹک رہی تھیں اس طرف آ گیا۔ میں ایک کشتی میں بیٹھ گیا اور چپو ہاتھوں میں لے لیے۔ گوریلے نے رسی کھولی اور اسے آہستہ آہستہ چھوڑتا گیا۔ کشتی آہستہ آہستہ نیچے آتی آتی سمندر کی سطح کے ساتھ لگ گئی اور اوپر نیچے ہونے لگی۔ گوریلے نے اوپر سے رسی کھینچ لی۔ میں نے اوپر انسٹرکٹر مھلگو کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"بائی بائی دوست۔"

مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہنے لگا۔ میں نے دل میں کہا ہمیشہ کے لیے الوداع! میرے وطن میں جا کر دہشت گردی کرنے والوں کا میں اسی طرح خاتمہ کروں گا۔ میں چپو چلاتے ہوئے کشتی کو سٹیمر سے دور لے گیا پھر اس کا رخ ساحل کی طرف پھیر دیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر سٹیمر کی طرف دیکھا۔ سٹیمر مجھ سے کافی دور ہو چکا تھا اور تامل گوریلے اب دوسری مشق کے لیے سمندر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ میں کشتی کو دائرے کی شکل میں چکر میں رکھے ہوئے تھا۔ دوسری مشق ختم ہوئی تو سب گوریلے ڈیک پر آ کر انسٹرکٹر کے ساتھ ڈیک پر سے چلے گئے۔ میں سمجھ گیا وہ لوگ دوسرے ڈیک کی کیبن پر ناشتہ کرنے چلے گئے تھے۔ یہ لوگ کافی دیر تک ناشتہ کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر بعد کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ لیتا تھا۔ مجھے انجن روم میں دھماکہ خیز ٹیپ لگائے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ابھی تک سٹیمر کا ڈیک خالی تھا۔ سارے گوریلے اپنے انسٹرکٹر کے ساتھ کیبن میں ہی بیٹھے تھے۔

میں کشتی کو سمندر میں ذرا آگے لے گیا۔ ایک چھوٹا سا چکر لگا کر کشتی کو

ساحل کی طرف لے جانے لگا۔ اس وقت سٹیمر میں دھماکہ ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ میری کشتی سٹیمر سے محفوظ فاصلے پر تھی۔ میں سمندر میں ہی رہ کر سٹیمر کی تباہی کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ جب دھماکہ ہونے میں صرف چار منٹ رہ گئے تو دور سے مجھے سٹیمر کے ڈیک پر تامل گوریلے چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ ان کی تیسری مشق شروع ہونے والی تھی۔ خطرہ اسی بات کا تھا کہ دھماکے سے پہلے تامل گوریلے تیسری مشق کے لیے سمندر میں نہ کود جائیں۔ میں نے چپو چلانے بند کر دیے تھے اور بے چینی سے سٹیمر کے ڈیک کو تک رہا تھا۔ دور سے مجھے گوریلے ڈیک پر چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ابھی وہ مشق شروع کرنے سے پہلے قطار میں فال ان نہیں ہوئے تھے۔ انسٹرکٹر ممگو نے شاید انہیں کسی کام لگا دیا تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

دھماکے کا وقت ہو گیا تھا۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سٹیمر کو دیکھ رہا تھا۔ یا اللہ پاکستان کے ان
منوں کو یہیں ختم کر دے۔ یا اللہ! پاکستان کو ان دشمنوں سے محفوظ رکھنا۔ یا
ند! پاکستان کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پاکستان کو اپنی
فاظت میں رکھنا۔ یہ دعا میرے لبوں پر تھی کہ ایک بجلی چمکی۔ سمندر اس چمک
ب ایک دم روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوا اور جہاں سٹیمر کھڑا تھا
ہاں اس طرح شعلے بلند ہونے لگے جیسے سمندر کے اندر کوئی جوالا مکھی پوری
اقت سے پھٹ گیا ہو۔ سٹیمر کے ٹکڑوں کو میں نے فضا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو
کون کا سانس لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے زبردست دھماکے اور آگ کے شعلوں
بں سٹیمر پر ایک بھی گوریلا زندہ نہیں بچا ہوگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے سٹیمر ٹکڑے
ٹکڑے ہو کر غرق ہو گیا۔ میں نے تیزی سے کشتی کو لے کر اس طرف بڑھا جہاں
سٹیمر کھڑا تھا اور جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ کشتی قریب گئی تو میں نے سمندر
کے پانی کو ابلتے ہوئے دیکھا۔ وہاں گرم پانی کے بھنور پڑ رہے تھے اور بھاپ کے

بادل اٹھ رہے تھے۔

سمندر کی لہروں پر سٹیمر کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ میں نے کشتی کو مزید پیچھے کر لیا۔ میں اس تلاش میں تھا کہ کہیں کوئی تامل گوریلا زندہ تو نہیں بچ گیا مگر مجھے کوئی انسان سمندری لہروں پر تیرتا دکھائی نہ دیا اس کے باوجود میں کشتی میں وہیں ادھر ادھر چکر لگاتا رہا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ سارے تامل گوریلے اپنے انسٹرکٹر سمیت سمندر میں غرق ہوگئے ہیں تو تیزی سے کشتی چلاتا ہوا ساحل پر آگیا۔ ساحل پر آنے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کشتی کے پیندے میں ایک نوکیلے پتھر کی ضربوں سے سوراخ کر دیا۔ کشتی میں پانی بھرنے لگا اور پھر وہ بھی ڈوب گئی۔ میں نے سمندر میں ایک ڈبکی لگائی تاکہ میرے کپڑے گیلے ہو جائیں اور تامل گوریلوں کی بیرک کی طرف دوڑ پڑا۔

بیرک خالی پڑی تھی کچن کے باہر مدراسی نوکر گھبرایا ہوا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "یہ بم کی آواز کہاں سے آئی تھی سر؟"

میں نے بھرپور اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سٹیمر کو مارٹر توپ کا گولہ لگا اور وہ تباہ ہوگیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تم یہیں رہنا میں سٹیشن سے فون کر کے آتا ہوں۔"

میں تیز تیز چلتا منڈاپم کیمپ کے ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ میں نے سب سے پہلے پولیس کو فون کر کے بتایا کہ ہمارے سٹیمر کو مارٹر کے گولے نے تباہ کر دیا ہے۔ گولہ سری لنکا کے ساحل کی جانب سے آیا تھا۔

پولیس آفیسر نے کہا۔

"ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے بمبئی بال ٹھاکرے کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے نوکر نے پوچھا۔ کون ہو؟ میں نے کہا میں دھرم چند بول رہا ہوں۔ مہاراج سے بات کراؤ۔ جلدی کوئی چار پانچ سیکنڈ بعد بال ٹھاکرے کی آواز آئی۔

"دھرم چند کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "پیشوا جی جس بات کا مجھے ڈر تھا آخر وہی ہوا۔ ہم سمندری مشقوں پر تھے کہ سری لنکا کی ساحلی بندرگاہ تالی منار کی طرف سے مارٹر کا گولہ آ کر سٹیمر کو لگا اور سٹیمر کو آگ لگ گئی۔ سٹیمر پھٹ گیا۔ اس وقت اپنے گوریلا ساتھی سٹیمر کی کیبن میں ناشتہ کر رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا سکا ہوں۔ ابھی تک کچھ پتہ نہیں کہ کون کون زندہ بچا ہے۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا۔"

دوسری طرف خاموشی طاری تھی۔ میں اپنی بات ختم کر چکا تھا مگر بال ٹھاکرے کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سر! آپ سن رہے ہیں۔"

"ہاں دھرم چند!" بال ٹھاکرے کی آواز آئی۔ میں سن بھی رہا ہوں اور سوچ بھی رہا ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "سر میں نے آپ سے پہلے بھی ذکر کیا تھا اور اپنے گوریلا انسٹرکٹر بھگلو بھائی سے بھی کہا تھا کہ سری لنکا کی نیول انٹیلی جینس کے آدمی کو میں نے ادھر مشکوک انداز میں پھرتے دیکھا ہے مگر سر! بھگلو بھیا نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مہاراج! سری لنکا کی بندرگاہ تالی منار وہاں سے ہمیں صاف نظر آتی تھی جہاں ہمارا اسٹیمر سمندر میں کھڑا تھا۔ سر! یہ مارٹر کا فائر تھا۔ سٹیمر پر ایک نہیں دو گولے فائر کیے گئے تھے۔"

میں نے بات ختم کی تو بال ٹھاکرے پر پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ جب میں نے کہا کہ میں پولیس کو فون کر دیا ہے۔ پولیس آ رہی ہوگی مجھے کیا بیان دینا چاہیے۔ تو بال ٹھاکرے نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں کیا بتاؤں کہ کیا بیان دینا ہے؟ جو جی میں آئے کہہ دینا۔ مجھے فوراً" رپورٹ کرو کہ گوریلوں میں سے کون کون زندہ بچا ہے۔ بس۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔ میں دل میں پریشان ضرور تھا۔ اس لیے کہ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں میں بال ٹھاکرے کو قائل نہیں کر سکا اور ممکن ہے کہ اسے مجھ پر شک پڑ گیا ہو۔ میں سٹیشن سے واپس گوریلوں کی بیرک میں آ گیا۔ اتنی دیر میں پولیس آ گئی۔ میں نے جو بیان بال ٹھاکرے کو دیا وہی پولیس کو دیا۔ پولیس کو معلوم تھا کہ یہاں تامل گوریلوں کو ہمسایہ ملک پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کے لیے ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے ساتھ لیا اور ہم سمندر کے کنارے آ گئے۔ اس دوران وہاں کوسٹ گارڈ کی دو کشتیاں اور چھ سات کوسٹ گارڈ کے آدمی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی ساتھ لیا اور میری راہ نمائی میں سمندر کی اس جانب چل پڑے جہاں ہمارا سٹیمر غرق ہوا تھا۔

پولیس اور کوسٹ گارڈ کے آدمی کشتیوں میں بیٹھ کر دیر تک لاشیں تلاش کرتے رہے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا مگر کسی گوریلے کی لاش نہ مل سکی۔ جہاں سٹیمر دھماکے سے پھٹ کر غرق ہوا تھا وہاں سمندر کی موجوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سٹیمر کے آہنی ٹکڑے ڈوب چکے تھے۔ لکڑی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے نہ جانے کدھر نکل گئے تھے۔ کوسٹ گارڈ کے آفیسر نے انگریزی میں کہا۔

"کل تک کوئی نہ کوئی لاش کنارے پر آ جائے گی۔ ابھی یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ واپس چلتے ہیں۔"

واپس منڈا پم کیمپ پولیس سٹیشن آ کر میرا بیان لکھا گیا۔ جب کوسٹ گارڈ والے چلے گئے اور پولیس بھی اپنی کارروائی پوری کر چکی تو میں نے مدراسی پولیس انسپکٹر سے کہا۔

"میرے بارے میں کیا حکم ہے سر؟"

پولیس انسپکٹر بولا۔ "اگر کوئی لاش ملی تو آپ سے اس کی شناخت کروا لیں گے۔ آپ دو ایک دن یہیں رہیں ویسے آپ بال ٹھاکرے جی کے آدمی ہیں ہم آپ کو روک بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں یہاں سے ٹھاکرے جی کو فون کر سکتا ہوں۔"

پولیس انسپکٹر نے فون میرے آگے کر دیا۔ میں نے بمبئی کا نمبر ملا کر ڈائیل کیا تو بال ٹھاکرے فون پر موجود تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی تک سمندر سے اپنے کسی آدمی کی لاش نہیں ملی۔ پولیس کا خیال ہے کہ کل تک کوئی نہ کوئی

لاش ضرور ساحل پر آئے گی۔ بال ٹھاکرے کی آواز بڑی سنجیدہ تھی اور بھاری تھی۔ کہنے لگا۔

"تم ابھی یہیں رہو۔ کوئی بھی لاش نکلے تو مجھے اس کی اطلاع دینا۔"

اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں پولیس سٹیشن سے گوریلا ٹریننگ کیمپ میں واپس آگیا۔ گوریلوں کی بیرک پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف اٹھنے والے بازو کو کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں تھی میں تو پہلے ہی اپنی جان موت کے پاس گروی رکھ کر یہاں آیا تھا۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے پاکستان میں دہشت پھیلانے والے اور تباہی مچانے والے خطرناک ترین بھارتی گوریلوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہاں پولیس کے تین سپاہی آ گئے جنہوں نے تامل گوریلوں کے میگزین کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ میگزین والی کوٹھڑی کے باہر مدراسی پولیس کا پہرہ لگ گیا۔ میں نے کینٹین پر کھانا کھایا اور اپنے جھونپڑے میں آ کر لیٹ گیا اور بال ٹھاکرے کی آواز اس کے بولنے کے انداز اور اس تباہی کی خبر کے ردعمل کے بارے میں تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی وقت خیال آتا کہ بال ٹھاکرے کو میرے بارے میں یقین ہوگیا ہے کہ میں ڈبل ایجنٹ بن چکا ہوں اور پاکستان کے لیے بھی کام کر رہا ہوں۔ کسی وقت خیال آیا کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو بال ٹھاکرے کے ایک اشارے پر پولیس مجھے گرفتار کر چکی ہوتی۔ وہ دن گزر گیا۔

رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن کوسٹ گارڈ کے آدمی اور پولیس ساحل سمندر پر پہنچ گئی اور لاشوں کی تلاشی شروع ہوگئی۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی موٹر بوٹ میں بیٹھا تھا۔ ہم نے دور دور تک سمندر کھنگال ڈالا مگر کہیں کوئی لاش یا لاش کا کوئی ٹکڑا تیرتا ہوا نہ ملا۔ تین گھنٹے کی بے سود تلاش کے بعد ہم واپس آ

گئے۔ کوسٹ گارڈ والے شام کو آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔

"جب کوئی مارٹر کا گولہ آ کر چھوٹے سٹیمر کو لگتا ہے تو پھر وہاں کسی انسان کے زندہ سلامت رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر سٹیمر ویسے ڈوب گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ لاشیں نیچے سے اوپر آ جاتیں مگر سٹیمر ڈوبا نہیں تھا۔ وہ تو مارٹر کا گولہ لگنے سے پھٹ گیا تھا۔ انسانوں کے تو ٹکڑے اڑ گئے ہوں گے۔"

اس کے بعد پولیس انسپکٹر مجھ سے مارٹر فائر کے بارے میں پوچھنے لگا کہ مارٹر کا گولہ جب فائر ہوتا ہے تو ایک خاص قسم کی سیٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ "کیا تم نے سیٹی کی آواز سنی تھی؟"

میں نے کہا "ضرور سنی تھی اس آواز سے میرے کان اچھی طرح آشنا ہیں توپ کے گولے اور مارٹر کے گولے کی آواز کا فرق معلوم ہے۔"

دوپہر کے بعد میں کینٹین سے کھانا کھا کر اپنے جھونپڑے میں آیا ہی تھا کہ ایک پولیس کانسٹیبل موٹر سائیکل پر سوار آیا اور بولا۔

"سر! بمبئی سے آپ کی کال آئی ہے۔ جلدی چلیں۔ بال ٹھاکرے جی بات کریں گے۔"

میں کانسٹیبل کے پیچھے بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل پوری رفتار سے مجھے لے کر پولیس اسٹیشن آ گیا۔ پولیس انسپکٹر نے فون ہولڈ کیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں کہنے لگا۔

"ٹھاکرے جی بات کریں گے۔"

اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے ٹھاکرے کی آواز آئی۔ "کوئی لاش ملی یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج جی! ابھی تک ایک بھی لاش نہیں مل سکی مگر میں یہاں بیٹھا ہوں۔ کوسٹ گارڈز کا خیال ہے کہ دو تین دن میں کوئی نہ کوئی لاش

سمندر ضرور کنارے پر پھینک دے گا۔"

بال ٹھاکرے نے کوسٹ گارڈز کو مراٹھی میں فحش گالی دی اور کہا۔ "ان لوگوں کو کچھ پتہ نہیں ہے یہ سب بے کار لوگ ہیں۔ تم یہیں ٹھہرنا۔ تمہیں ابھی بمبئی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوپہر کے بعد تم سمندر پر خود جا کر دیکھنا کوئی نہ کوئی لاش سمندر ضرور پھینکے گا۔"

میں اس خیال سے مطمئن ہوگیا کہ بال ٹھاکرے کو مجھ پر زیادہ شک نہیں پڑا تھا ورنہ وہ مجھے اسی وقت بمبئی بلا لیتا میں نے کہا۔ "یس سر! جیسے آپ کا حکم سر! میں آپ کے حکم کی پابندی کروں گا جب تک آپ کے آرڈر نہیں آئیں گے میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگا کیا واقعی بال ٹھاکرے کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا؟ اس کی باتوں سے ہی ثابت ہو رہا تھا کہ میری تختی صاف ہے اور اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس زبردست تباہی میں میرا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مدراسی پولیس افسر میری طرف دیکھ کر خوشامدانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس بھارت کے فرعون بال ٹھاکرے کا بھارت کے عوام پر شمال سے لے کر جنوب تک کتنا گہرا اثر ہے۔ وہ دن بھی گزر گیا۔

دیکھا جائے تو میرا وہاں اب کوئی کام نہیں تھا لیکن بال ٹھاکرے کو مجھ پر اس قدر بھروسہ ہوگیا ہوا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ جب تک تامل گوریلوں کی لاشوں کا سراغ نہیں ملتا میں جائے واردات پر ہی رہوں۔ مزید ایک دن گزر گیا۔ لاشوں کی تلاش جاری تھی۔ سمندر جیسے تمام لاشوں کو ہضم کر گیا تھا۔ کسی لاش کی انگلی تک نہیں مل رہی تھی۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میں نے سوچا کہ بال ٹھاکرے کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے اور پوچھنا چاہیے کہ مجھے ابھی یہاں کب تک ٹھہرنا ہوگا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی سورج غروب

ہوگیا ہوا تھا اور شام کے سائے جنوبی ہند کے جنگلوں' کھیتوں اور ساحل سمندر کے ریتلے کناروں پر تیزی سے پھیل رہے تھے۔ میں نے سوچ کر فیصلہ کیا کہ کل دن کے وقت بال ٹھاکرے کو فون کروں گا۔ میں نے منڈا پم کیمپ کی نیم فوجی کینٹین پر جا کر کھانا کھایا۔ کافی کی ایک پیالی پی اور اپنے جھونپڑی نما کمرے میں آ کر سگریٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس روز صبح ہی سے آسمان پر بادلوں کا آنا جانا شروع ہوگیا تھا۔ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ موسمی پیشین گوئی کے مطابق بارش ہونے والی تھی۔ ابھی میرا آدھا سگریٹ بھی نہیں جلا تھا کہ باہر مجھے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب آ کر میرے جھونپڑے کے پاس رک گئی۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور بمبئی سے فون آیا ہے اور پولیس کانسٹیبل مجھے بلانے آیا ہے۔

میں جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ باہر کھمبے پر بلب روشن تھا۔ سامنے پولیس کانسٹیبل موٹر سائیکل کھڑی کر کے میری طرف آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! بمبئی سے ٹھاکرے جی کا فون آیا ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے۔ اسی وقت بات کر لیتا ہوں کہ اب میرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے کوئی دوسرا مشن دیا جائے۔ میں موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر پولیس سٹیشن آ گیا۔ مدراسی پولیس افسر کافی کا گلاس سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے ٹیلی فون میری طرف بڑھاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"سر! گورو دیو ٹھاکرے جی کا فون ہے۔"

میں نے ریسیور کان کے ساتھ لگا کر بڑے ادب سے کہا۔

"سیناپتی جی! میں آپ کا سیوک دھرم چند بول رہا ہوں"

دوسری طرف سے بال ٹھاکرے نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"دھرم چند! اچھا ہوا تم مل گئے مجھے ڈر تھا کہیں تم ادھر ادھر نہ نکل گئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "سر! میں آپ کے حکم کے بغیر یہاں سے کیسے ہل سکتا ہوں۔"

بال ٹھاکرے بولا۔ "شاباش! مجھے تمہاری وفاداری پر پورا بھروسہ ہے۔"

میں نے مزید خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"پیشوا جی! حکم کیجئے۔"

بال ٹھاکرے نے مجھے ایک بار پھر شاباش دی اور کہا۔

"مجھے پولیس کے ذریعے اطلاع مل گئی ہے کہ اپنے تامل گوریلوں میں سے کسی کی لاش نہیں مل سکی اور خفیہ ذرائع سے مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ یہ کام سری لنکا کی بحریہ کی انٹیلی جینس کا ہے۔ اب تمہارا یہاں رکے رہنا بے کار ہے تم ایسا کرو آج رات کو ہی کوئی گاڑی پکڑ کر بمبئی کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایک بڑے اہم مشن پر بھیجنا چاہتا ہوں۔ یہ مشن اس قدر اہم ہے کہ اس پر تمہارے سوا میں کسی پر اعتماد بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

میں خوش ہوگیا کہ اس منڈاپم کیمپ سے تو جان چھوٹی۔ میں نے کہا۔

"سر! رات کے بارہ بجے کے بعد یہاں سے ایک گاڑی ناگ پور مدراس کو جاتی ہے میں وہ گاڑی پکڑ کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

بال ٹھاکرے نے ایک سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"نہیں نہیں دھرم چند۔ ٹرین میں دیر لگ جائے گی میں تمہیں جس نئے مشن پر بھیجنا چاہتا ہوں اس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ تم ایسا کرو کی منڈاپم کیمپ سے مدھورائی تک کا ٹکٹ لے کر مدھورائی سٹیشن پر اتر جاؤ۔ مدھورائی سے بمبئی تک انڈین ایئر لائینز کی فلائٹیں آتی ہیں۔ تم مدھورائی کے انڈین ایئر لائینز کے آفس میں پہنچ کر میرا نام لینا۔ جہاز میں سیٹ نہ بھی ہوئی تو کسی دوسرے کی سیٹ کینسل کر کے تمہیں مل جائے گی۔ ایئر لائینز کے مینجر کو ابھی فون کر دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا تھوڑا سا وقت بھی ضائع نہ ہو۔ یہ مشن

میری اور تمہاری زندگی کا بڑا یادگار مشن ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ اس مشن کی کامیابی کے بعد تمہیں بھارت سرکار کی طرف سے پدم شری کا اعزاز بھی مل جائے۔"

میں خوشی سے پھول رہا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بال ٹھاکرے کا دل میری طرف سے بالکل صاف تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ اگر مجھے پدم شری کا سرکاری اعزاز مل گیا تو میرے لیے بھارتی حکومت کے پاکستان کے خلاف منصوبوں تک پہنچنا اور انہیں تباہ کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا میں نے کہا۔

"جو حکم مہاراج جی! میں کل آپ کے چرنوں میں ہوں گا۔"

"شاباش! دھرم چند! تم بھارت ماتا کے سچے بھگت ہو۔ بمبئی کے ائیرپورٹ پر اترتے ہی مجھے فون کر دینا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مہاراج۔"

بال ٹھاکرے نے فون بند کر دیا۔ میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا بلکہ دو بوجھ اتر گئے تھے۔ ایک تو مجھے تامل ناڈو کے منڈاپم کیمپ سے نجات مل گئی تھی دوسرے بال ٹھاکرے کی طرف سے یہ خوش خبری ملی تھی کہ اس کا ذہن میری طرف سے صاف ہے اور اسے مجھ پر کوئی شک شبہ نہیں ہے بلکہ سرکاری طور پر بھی اس کو معلوم ہوگیا ہے کہ سٹیمر پر سری لنکا کی بحریہ کے کسی جہاز پر سے مارٹر فائرنگ کی گئی تھی۔

میں اس نئے انکشاف پر حیران ضرور ہوا کہ بھارت کی ایسی کون سی بے خبر خفیہ ایجنسی ہے جس نے بال ٹھاکرے کو ایسی غلط خبر پہنچائی۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے بیوروکریسی اور بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس والے بھی بال ٹھاکرے کو اس قسم کی خبریں دے کر سری لنکا کی سرکار کے خلاف مزید بھڑکانا چاہتے ہوں کیونکہ بھارت کی حکومت سری لنکا سے دشمنی کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور وہ اپنے عوام کو بھی سری لنکا کے خلاف رکھنا چاہتی تھی اور بال ٹھاکرے [illegible]ام پر

زبردست اثر تھا۔

مجھے تیاری کچھ بھی نہیں کرنی تھی۔ کپڑے کے دو جوڑے اٹیچی کیس میں رکھے اور ٹریننگ کیمپ کی بیرکوں سے نکل کر پولیس سٹیشن آ گیا۔ کیونکہ رات کے بارہ بجے مجھے ٹریننگ کیمپ کے ریلوے سٹیشن تک کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی۔ پولیس کی گاڑی تو مجھے رات بارہ بجے بھی سٹیشن پر پہنچا سکتی تھی۔ پولیس سٹیشن کا عملہ پہلے ہی میرا مطیع ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے میرے لیے ایک کمرہ کھول کر اندر چارپائی بچھا کر پنکھا چلا دیا گیا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

"مجھے رات کے ٹھیک گیارہ بجے جگا دینا۔ مجھے بارہ بجے والی گاڑی پکڑنی ہے۔"

میرا ذہن چونکہ اب ہر قسم کے پریشان کرنے والے خیالات سے پاک ہو گیا تھا اس لیے مجھے بڑی آسانی سے نیند آ گئی۔ ٹھیک گیارہ بجے مجھے مدراسی کانسٹیبل نے جگا دیا۔ میں اٹھ کر پولیس کی گاڑی میں بیٹھا اور منڈا پم کیمپ کے چھوٹے سٹیشن پر آ گیا۔ بارہ بجے والی گاڑی جنوب کی جانب بھارت کی آخری تکونی بندرگاہ دھنش کوڑی سے ساڑھے بارہ بجے آئی۔ گاڑی میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اکثر مسافر سو رہے تھے۔ میں نے بال ٹھاکرے کی ہدایت کے مطابق مدھورائی یا مجورا کا ٹکٹ لیا تھا۔ ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک ٹرین چلتی رہی۔ دوپہر کے بعد مجورا کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں وہاں اتر گیا۔ بارش راستے میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے سٹیشن سے ٹیکسی پکڑی اور اسے انڈین ایئر لائینز کے آفس چلنے کو کہا۔ بال ٹھاکرے کا ٹیلی فون پہلے ہی کمپنی کے آفس مینجر کو پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی میں نے آفس مینجر سے اپنا تعارف کرایا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور انگریزی میں کہنے لگا۔

"مجھے ٹھاکرے جی کا ٹیلی فون کل شام کو ہی آ گیا تھا۔ ہماری ایک ایئر

بس کی فلائیٹ ایک گھنٹے بعد حیدر آباد سے ہوتی ہوئی بمبئی روانہ ہونے والی ہے۔
اس میں آپ کی سیٹ کنفرم کر دی گئی ہے۔ آپ ٹکٹ لے لیجئے۔"

میں نے ٹکٹ لیا۔ بلکہ مدراسی آفس مینجر نے وہیں آفس میں میرا ٹکٹ منگوا دیا۔ کافی پلائی اور کہا۔

"آپ کو ہماری گاڑی ائیرپورٹ چھوڑ آئے گی آیئے میرے ساتھ۔"

باہر ائیرلائینز کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ آفس مینجر نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر مجھے رخصت کیا۔ میں ائیرپورٹ آ گیا۔ تھوڑی دیر وہاں انتظار کرنا پڑا۔ جب میری فلائیٹ کے روانہ ہونے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تو میں نے بورڈنگ کارڈ لیا اور ٹرانزٹ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ فلائیٹ کی روانگی کے اعلان کے ساتھ ہی میں بھی دوسرے مسافروں کے ہمراہ چلتا ہوا ائیربس میں سوار ہوگیا۔ ائیربس مجورائی سے ٹیک آف کرنے کے بعد حیدر آباد دکن رکی۔ وہاں سے ٹیک آف کیا تو سیدھا بمبئی کا رخ کر لیا۔ سارا راستہ بارش ہوتی رہی۔ طیارہ بادلوں میں ہی سفر کرتا رہا اور اس نے کافی ہچکولے بھی کھائے۔ بمبئی کی ائیر پورٹ پر طیارے نے لینڈ کیا تو بمبئی میں بھی بارش ہو رہی تھی جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ بھارت کے تمام شہروں میں سے مجھے بمبئی کی بارش بہت پسند تھی۔

میں نے طیارے کی کھڑکی میں سے ائیرپورٹ کی عمارت اور رن وے کو بارش میں بھیگتے دیکھا تو جی چاہا کہ اس وقت کسی ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر بمبئی کی سڑکوں پر بارش کو گرتے دیکھنا چاہیے۔ طیارہ ائیرپورٹ ٹرمینل کی عمارت سے کچھ دور آ کر رک گیا تھا۔ سیڑھی لگی۔ ہم بارش میں بھیگتے نیچے اتر کر جلدی سے ائیرپورٹ کی بس میں سوار ہو گئے۔ بس نے ہمیں ٹرمینل کی عالی شان عمارت کے گیٹ پر پہنچا دیا۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا ایک اٹیچی کیس ہی تھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں لاؤنج سے نکل کر لابی

میں آیا تو ایک آدمی جنگلے کی دوسری جانب ہاتھ میں پلے کارڈ لیے کھڑا تھا۔ پلے کارڈ پر میرا نام دھرم چند لکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے بال ٹھاکرے نے بھیجا ہے۔ میں نے اس کے قرب جا کر کہا۔ "میرا نام دھرم چند ہے۔ کیا تمہیں بال ٹھاکرے جی نے بھیجا ہے۔"

اس آدمی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"ہاں مہاراج! گورو جی نے آپ کے لیے گاڑی بھیجی ہے۔ میرے ساتھ آیئے۔"

میں مزید خوش ہوا۔ بال ٹھاکرے کے دل پر واقعی میں نے اپنے اعتماد کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ باہر نکل کر اس نے چھتری کھول دی کیونکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ وہ مجھے چھتری کے سائے میں پارکنگ میں اس طرف لے گیا جہاں میں نے بال ٹھاکرے کی جدید ماڈل کی سرخ رنگ کی شاندار گاڑی کو پہچان لیا۔ وردی پوش شوفر سفید دستانے پہنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ میں بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شوفر نے بڑے آرام سے دروازہ بند کیا۔ پھر خود بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا قیمتی انجن ہلکا سا غرایا اور گاڑی ایسے چل پڑی جیسے کشتی پرسکون دریا کی سطح پر چل رہی ہو۔ شوفر نے انڈین فلم کے گانے کی کیسٹ آن کر دی۔ گاڑی میں ہلکا ہلکا ایئرکنڈیشنر چل رہا تھا کیونکہ بمبئی میں بارش کی وجہ سے ہلکا حبس ہو رہا تھا۔ مجھے اس خیال سے تھوڑی حیرانی ضرور ہوئی کہ بال ٹھاکرے نے میرے لیے پہلے کبھی گاڑی نہیں بھیجی تھی اب کیا بات ہوئی ہے۔ پھر یہ سوچ کر دل کو اطمینان دلایا کہ بال ٹھاکرے مجھے کسی نہایت اہم مشن پر بھیجنے والا ہے اور یہ اس کے مجھ پر اعتماد اور بھروسے کا ایک مظاہرہ ہے۔ گاڑی بمبئی کی بارش میں بھیگتی سڑکوں پر بے معلوم آواز کے ساتھ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے سر پیچھے لگا رکھا تھا۔ کسی وقت سرور میں آ کر آنکھیں بند بھی کر لیتا تھا۔ ایک بار آنکھیں بند کر کے کھولیں تو گاڑی باں

ٹھاکرے کے شاندار بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔

مجھے اسی وقت ملازم نے بال ٹھاکرے کے کمرے میں پہنچا دیا۔

شام کا وقت ہوگیا تھا بال ٹھاکرے اپنے ایک سیٹ والے شاندار صوفے پر دونوں بازو پھیلا کر راجے مہاراجوں کی طرح گردن اونچی کیے بیٹھا تھا۔ کانوں میں ہیرے چمک رہے تھے۔ انگلیوں میں زمرد و مرجان اور ہیروں کی انگوٹھیاں تھے۔ زعفرانی سلک کا چولا اور کھلا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں زعفرانی سلک کا پٹکا تھا۔ ماتھے پر شیو دیوتا کے تلک کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب شیشے کی تپائی پر بیئر کی بوتل' گلاس' ایش ٹرے اور سنہری سگریٹ کیس پڑا تھا۔ گلاس میں تھوڑی سی بیئر پڑی تھی۔ اس کے سامنے ایک طرف بالا جی راؤ بیٹھا مجھے پر اسرار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ یہ کم بخت یہاں کس لیے بیٹھا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر بال ٹھاکرے کو پرنام کیا اور آگے بڑھ کر اس کے گھٹنوں کو چھوا اور بڑے ادب سے سامنے والے صوفے پر ذرا آگے ہو کر بیٹھ گیا۔

بال ٹھاکرے اپنی عادت کے مطابق کچھ دیر تک مجھے گھور کر دیکھتا رہا۔ لیکن آج اس کی سکڑی ہوئی آنکھوں میں مجھے کچھ اور ہی طرح کی چمک نظر آ رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ یہ خطرہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ بال ٹھاکرے مجھے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ پھر اس نے میرے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر اپنے گلاس میں بیئر ڈالی۔ بوتل میز پر رکھی۔ بڑے سکون کے ساتھ اور بڑی نفاست کے ساتھ بیئر کا گلاس ہونٹوں تک لے جا کر اس کے تین چار گھونٹ پیئے۔ سگریٹ کیس میں سے اعلیٰ قسم کا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ کبھی وہ سگار پیتا تھا اور کبھی سگریٹ سے شوق کیا کرتا تھا۔ سگریٹ کا کش لگا کر اس نے بالا جی کی طرف دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے اندر سے کسی نے کہا۔ حیدر علی بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔

اتنے میں بالا جی نے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"گورو دیو! آپ ہی بات شروع کریں۔"

بال ٹھاکرے صوفے پر ذرا آگے ہو کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مجھ سے پوچھا۔

"دھرم چند! تم کب سے پاکستان کے لیے جاسوسی کر رہے ہو؟"

یہ جملہ نہیں ایٹم بم تھا جو میرے سر پر گر کر پھٹ گیا تھا۔ میرے کانوں میں دھماکے ہونے لگے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میرے پاؤں کے نیچے سے فرش نکل گیا تھا۔ میں جیسے ہوا میں لٹکنے لگا تھا۔ کانوں میں شاں شاں ہونے لگی تھی مگر میں نے بڑی جلدی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ یہ کیفیت مجھ پر چند سیکنڈ کے لیے ہی طاری رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اندر سے ہل گیا ہوں۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"سینا پتی جی! جس بات کا مجھے ڈر تھا آخر وہ ہو کر رہی۔ میں جانتا تھا کہ آپ مجھ پر جس اعتماد اور بھروسے کا سلوک کرنے لگے ہیں اس سے دوسرے لوگ ضرور حسد کریں گے اور آپ کے کان بھریں گے۔ گورودیو! میں پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ سازش میرے دشمنوں کی ہے جو میرے ساتھ آپ کا محبت بھرا سلوک دیکھ کر جلنے لگے ہیں۔ وہ مجھے آپ کی نظروں میں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔"

بال ٹھاکرے نے بالا جی راؤ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بالا جی! میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ دھرم چند ڈبل ایجنٹ نہیں ہے۔ وہ بھارت ماتا سے غداری نہیں کر سکتا بولو۔ دھرم چند کی اس وضاحت کے بعد تم کیا کہتے ہو۔"

بالا جی راؤ نے کہا۔

"پیشوا جی! یہ شخص جھوٹا اور مکار ہے۔"

بالا جی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ڈبل ایجنٹ بھی نہیں ہو تم پاکستان کے جاسوس اور بھارت میں رہ کر بھارت کے خلاف تخریب کاریاں کر رہے ہو۔ یہ تم ہی تھے جس نے ہمارے تربیت یافتہ دہشت گردوں کو پاکستان میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ یہ تم ہی تھے جس نے جالندھر کے میزائیل سینٹر میں خوفناک دھماکہ کر کے ہمارے سارے میزائیلوں کو بھک سے اڑا دیا۔ تم نے ہی اکھنور کے مورچوں کی توپوں اور مشکر میزائیلوں کو تباہ کیا اور پورے ٹیلے کو فوجی جوانوں سمیت بھسم کر دیا۔ یہ تم ہی تھے جس نے بھارت سے پاکستان سمگل کی جانے والی ایڈز زدہ طوائفوں کو بمبئی میں قتل کر دیا تھا تاکہ وہ پاکستان جا کر ایڈز کی بیماری نہ پھیلا سکیں۔ سورت میں مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگانے والے تینوں مراٹھوں کو تم نے ہی جالندھر کے شیومندر میں قتل کیا اور یہ تم ہی ہو جس نے منڈاپم کیمپ میں سٹیمر کو بم لگا کر غرق کیا اور سارے تامل گوریلوں اور انسٹرکٹر کو موت کی نیند سلایا بولو اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

بال ٹھاکرے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں دھرم چند! بولو۔ اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

میں اپنی جگہ سے ہل ضرور گیا تھا مگر ایک بات کا مجھے اطمینان تھا کہ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں دھرم چند نہیں ہوں بلکہ محب وطن پاکستانی مسلمان ہوں اور دھرم چند کا حلیہ بنا کر بھارت میں آیا ہوا ہوں۔ میں نے بڑے اعتماد سے بال ٹھاکرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"گورودیو! یہ سب جھوٹ ہے۔ مجھ پر بہتان لگایا جا رہا ہے۔ بالا جی راؤ سے پوچھا جائے کہ اس کے پاس مجھے پاکستان کا جاسوس ثابت کرنے کے لیے کیا ثبوت ہے؟"

بال ٹھاکرے نے بالا جی

"راؤ جو الزام تم نے دھرم چند پر لگائے ہیں کیا ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟ اگر ثبوت ہے تو پیش کرو۔"

بالا جی راؤ کے پاس بھلا کیا ثبوت ہو سکتا تھا۔ میں نے جتنے بھی کمانڈو آپریشن کیے تھے بڑے سوچ سمجھ کر کیے تھے اور پیچھے ان کا ایک بھی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ بالا جی راؤ نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"گورو دیو! اگر آپ کوئی ایسا ثبوت مانگتے ہیں جو تحریری شکل میں ہو تو مجھے افسوس ہے کہ ایسا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دھرم چند ڈبل ایجنٹ ہے۔ یہ پاکستان کے لیے بھی جاسوسی کر رہا ہے۔"

میں نے بالا جی راؤ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"راؤ جی! میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو میرے ساتھ کیوں دشمنی ہوگئی ہے۔ آپ مجھے گورو دیو کی نگاہوں میں گرانے کے لیے موقع ڈھونڈھتے رہتے ہیں جبکہ گورودیو ٹھاکرے جی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں دیش بھگت ہوں۔ بھارت کا سپوت ہوں اور پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا تو آپ کو مجھ پر پاکستان کا جاسوس ہونے کا الزام لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے بال ٹھاکرے کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں سکیڑ کر بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ انداز میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ جب میں نے اپنا بیان ختم کیا تو بال ٹھاکرے نے بیئر کے دو گھونٹ پیے۔ دوسرا سگریٹ سلگایا اور بالاجی راؤ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بالا جی! اس کا مطلب ہے کہ دھرم چند کو پاکستانی جاسوس ثابت کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

بالا جی راؤ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! میرے پاس تو ایسا کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت ہو تو وہ دھرم چند کو بتا دیجیے۔“

بالا جی راؤ کے اس جملے پر میں چونک گیا۔ اس جملے کے اندر جو معنی چھپے ہوئے تھے وہ میری سمجھ میں نہ آئے۔ بال ٹھاکرے کے پاس میرے خلاف کیا ثبوت ہو سکتا تھا۔ میں ابھی اسی الجھن میں تھا کہ بال ٹھاکرے نے سگریٹ کی راکو ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس کوئی تحریری ثبوت تو نہیں ہے جو دھرم چند کو پاکستانی جاسوس ثابت کر سکے۔ ہاں البتہ ایک چلتا پھرتا زندہ ثبوت ضرور ہے۔“

میرے بدن میں شدید خطرے کے احساس کی سرد لہر سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ بال ٹھاکرے کیا کہہ رہا تھا؟ میرے خلاف چلتا پھرتا زندہ ثبوت کیا ہو سکتا تھا۔

بال ٹھاکرے نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے میں ایک نوکر پہلے سے کھڑا تھا۔ بال ٹھاکرے کا اشارہ پاتے ہی نوکر پردہ ہٹا کر دوسری طرف چلا گیا۔ میں عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ دوسرے لمحے پردہ ہٹا اور کیا دیکھتا ہوں اصلی دھرم چند کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں جانب شیوسینا کے رضاکار ہاتھوں میں کلاشنکوفیں لیے آ رہے تھے۔

اصلی دھرم چند کو دیکھتے ہی میرا بدن دہشت اور خوف سے سرد پڑ گیا۔ سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس زندہ ثبوت کو رد کرنے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔

اصلی دھرم چند نے بال ٹھاکرے کے گھٹنوں کو چھوا اور ایک طرف کھڑا ہو کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ بال ٹھاکرے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اصلی دھرم چند سے پوچھا۔

”کیوں دھرم چند! بالکل تمہارا حلیہ نہیں ہے؟“

اصلی دھرم چند نے حیرانی کے ساتھ کہا۔

"گورو جی! میں خود حیران ہوں کہ میں یہاں کھڑا ہوں کہ آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔"

مجھے اس حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اصلی دھرم چند پاکستان کی پولیس کو دھوکہ دے کر قید سے فرار ہونے اور باڈر کراس کر کے بھارت میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اتنی دیر میں میں نے بھی اپنے حواس پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔ بالا جی راؤ نے غصیلی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"اتنے بڑے زندہ جیتے جاگتے ثبوت کو تم کس طرح غلط ثابت کر سکتے ہو۔ اصلی دھرم چند تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ تم نقلی دھرم چند ہو۔ جب اصلی دھرم چند پاکستان میں پکڑا گیا تو تمہاری پلاسٹک سرجری کر کے تمہیں ہوبہو اصلی دھرم چند کا حلیہ دے کر جاسوسی کرنے کے لیے بھارت سمگل کر دیا گیا اور تم نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور اب تک پہنچا رہے ہو۔ اگر ہمارا اصلی دھرم چند پاکستانی جیل سے فرار ہو کر بارڈر کراس کر کے بھارت نہ پہنچتا تو نہ جانے تم کب تک بھارت میں تباہی پھیلاتے رہتے۔"

میں نے اپنے اعتما کو ایک مرکز پر جمع کرتے ہوئے بڑے پر جوش لہجے میں کہا۔

"گورودیو! یہ شخص اصلی دھرم چند نہیں ہے۔ یہ نقلی دھرم چند ہے اور اس کی پلاسٹک سرجری کر کے پاکستان نے بھارت میں جاسوسی کے لیے سمگل کیا ہے۔ یقین کریں اصلی دھرم چند میں ہوں۔"

جوش اور جذبات میں آ کر میں نے یہ دعویٰ تو کر دیا تھا لیکن اس حقیقت کو بھول گیا تھا کہ میرے اس دعوے کا پول ایک سیکنڈ میں کھل سکتا ہے۔ بس ذرا میرا پاجامہ اتروا کر میرے ختنے دیکھنے کی تکلیف کرنی پڑنی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بالا جی راؤ نے بال ٹھاکرے سے کہا۔

"گورو دیو! یہ شخص تو کہتا ہے کہ میں اصلی دھرم چند ہوں اور جو سامنے کھڑا ہے وہ نقلی دھرم چند ہے۔ اب اس کا پتہ کیسے چلے کہ اصلی کون ہے اور نقلی کون ہے؟"

بال ٹھاکرے نے کہا۔

"دونوں کے پاجامے اتروا کر دیکھو۔ پہلے اس کا پاجامہ اترواؤ۔ اگر یہ اصلی دھرم چند ہے تو اس کے مسلمانوں والے ختنے نہیں ہوئے ہوں گے۔"

اس وقت میری حالت پھانسی کی کوٹھڑی میں بند اس قیدی کی سی تھی جس کو پھانسی کے تختے پر لے جانے کے لیے جیل کے عہدے دار کوٹھڑی میں آ گئے ہوں۔ بال ٹھاکرے نے اشارہ کیا۔ اس کا ملازم تیزی سے میری طرف آیا اور اس نے میرا پاجامہ نیچے کر دیا۔ میرا یہ راز سب پر کھل گیا کہ میں مسلمان ہوں اور نقلی دھرم چند ہوں۔ اس کے بعد اصلی دھرم چند کا بھی معائنہ کیا گیا۔ اس کے ختنے نہیں ہوئے تھے۔ بال ٹھاکرے نے میری طرف قہر آلود نظریں ڈالیں اور مراٹھی میں دو تین گالیاں دے کر گرج دار آواز میں کہا۔

"اب تم کیا کہتے ہو؟ تم ہمارے ملک کو اتنا نقصان پہنچا چکے ہو کہ بڑی سے بڑی سزا بھی تمہارے لیے کم ہوگی۔ لیکن میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔ تم اپنے آپ کو مرتے خود دیکھو گے۔

درد اور کرب سے گذرتے ہوئے
میں نے دیکھا ہے خود کو مرتے ہوئے

بتاؤ تمہارا اصلی نام کیا ہے اور یہاں تمہارے دوسرے پاکستانی ساتھی کہاں ہیں؟"

میرے آگے پیچھے دائیں بائیں پتھر کی اونچی اونچی دیواریں تھیں فرار کا راستہ نہیں تھا۔ دونوں شیو سینا کے رضاکاروں نے کلاشنکوفوں کی نالیوں کا میری طرف کیا ہوا تھا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے اور کہا۔

"ٹھاکرے جی! آپ مجھے جتنی چاہے اذیتیں دے کر دیکھ لیں میں آپ

تو اپنا اصلی نام بتاؤں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ بھارت میں میرے ساتھی کہاں کہاں پر موجود ہیں۔ آپ مجھے ٹارچر دے کر زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ میں مر جاؤں تو یاد رکھیں ایک سچا مسلمان کافروں سے جہاد کرتے موت کو ہنسی خوشی اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ میں مسلمان ہوں' محب وطن پاکستانی ہوں۔ آپ لوگ میرے ملک کو تباہ کرنے کی کارروائیاں کرتے آ رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہی کیا جو ایسی حالت میں ایک محب وطن پاکستانی کو کرنا چاہیے۔ میں نے آپ کے ملک میں کسی بے گناہ کو نہیں مارا۔ کسی عورت بچے بوڑھے پر ظلم نہیں کیا۔ میں نے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے جو میرے وطن کے دشمن ہیں جو میرے وطن پاکستان کو تباہ کرنے کی ناپاک کارروائیوں میں ملوث تھے۔ میرا ضمیر صاف ہے۔"

بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ کے چہرے غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ اصلی دھرم چند نے کہا۔

"گورو دیو! اسے میرے حوالے کر دیں میں اسے خود قتل کروں گا۔"

بال ٹھاکرے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں دھرم چند! اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ میرا قاتل ہے۔ اس کو میں خود سزا دوں گا۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ یہ موت کی دعائیں مانگے گا مگر اسے موت نہیں آئے گی۔ اس کو باندھ کر لے جاؤ۔"

بال ٹھاکرے نے شیو سینا کے رضاکاروں کو حکم دیا۔ اسی وقت میرے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے کر کے باندھ دیے گئے اور سیو سینا کے آدمی مجھے دھکے دیتے کمرے سے باہر لے گئے۔ دوسرے کمرے میں شیو سینا کے دو مسلح رضاکار پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹی باندھ دی گئی اور مجھے کھینچتے ہوئے کسی طرف سے کوٹھی کے باہر لے جا کر ایک گاڑی میں دھکیل دیا گیا۔ دونوں جانب مسلح گارڈ بیٹھ گئے اور گاڑی کسی نامعلوم مقام کی طرف چل پڑی۔

خدا جانے یہ گاڑی جس میں مجھے قیدی کی حیثیت سے جکڑ کر بٹھا دیا گیا تھ
کہاں کہاں سے گزر رہی تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ مجھے کچھ دکھائی
نہیں دے رہا تھا۔ باہر سڑک پر سے دوسری گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں
ضرور سنائی دے رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں بھی آنا بند ہوگئیں۔ گاڑی بمبئی شہ
کے باہر کے علاقے میں آ گئی تھی۔ گاڑی ایک جگہ سے سڑک کی چڑھائی چڑھ کر
نیچے آ گئی۔ اس کے بعد گاڑی نے کئی موڑ کاٹے اور پھر ایک طرف کو گھوم کر
رک گئی۔ مجھے اتار کر ایک کمرے میں لے گئے۔ دروازہ بند کرنے کی آواز
آئی۔ پھر میری آنکھوں کی پٹی کھلوا دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹے
سے کمرے میں ہوں جس کی دیواریں بالکل خالی تھیں۔ چھت زیادہ اونچی نہیں
تھی۔ میں بانس کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ چھت
کے ساتھ دیوار میں اوپر کر کے ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں لوہے کی
سلاخوں والا جنگلا چڑھا ہوا تھا۔

مجھے اس قید خانے میں بند کر کے شیوسینا کے آدمی چلے گئے۔ مجھے باہر سے
دروازے پر تالا لگانے کی آواز آئی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ درواز
لوہے کا تھا۔ اس میں کوئی درز یا سوراخ نہیں تھا۔ میں نے کمرے کے وسط میں
کھڑے ہو کر روشندان کا جائزہ لیا ایک تو روشندان پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں
دوسرے وہ اتنا چھوٹا تھا کہ میرا جسم سلاخیں توڑنے کے بعد بھی اس میں سے
نہیں گزر سکتا تھا۔ اس کمرے میں مجھے اذیتیں دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اذیتیں
دینے والے ایسے لوگ تھے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے
میرے دوسرے پاکستانی ساتھی جاسوسوں اور کشمیری مجاہدوں کے خفیہ ٹھکانوں کے
بارے میں پوچھا جاتا۔ میرا وہاں کوئی پاکستانی جاسوس ساتھی بالکل نہیں تھا۔ باقی ج
کشمیری مجاہد شمالی بھارت کے شہروں میں اپنے اپنے طور پر جہاد کشمیر کے لیے کام
کر رہے تھے ان کے خفیہ ٹھکانے دو تین ہی تھے جن کا مجھے علم تھا لیکن میں ان

ٹھکانوں کے بارے میں ان دشمنوں کو کبھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کی اذیتیں سہنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور سخت اذیتیں دے کر ہلاک کریں گے۔ میں نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ مر جاؤں گا مگر کشمیری مجاہدوں کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے وہاں سے فرار ہونے کے امکانات پر بھی سوچنا شروع کر دیا تھا مگر بظاہر وہاں سے فرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے چوبیس گھنٹے اس تنگ سے کمرے کے اندر ہی رکھا جاتا تھا۔ باہر ہر وقت دو آدمی کلاشنکوفیں اٹھائے پہرے پر موجود ہوتے تھے اور دروازے پر باہر سے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ جب ٹارچر کرنے والے مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آتے تو دروازے کو کھول کر اسی وقت دوبارہ تالا لگا دیا جاتا تھا۔ انٹیروگیشن کرنے والوں کے ساتھ ہی چار مسلح گارڈ ہوتے تھے جو دروازے میں داخل ہوتے ہی پوزیشنیں لے کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جو لوگ مجھے ٹارچر کرنے اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آتے تھے ان میں پولیس یا ملٹری کا کوئی آدمی نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ سویلین کپڑے میں ہوتے تھے اور ان کے ماتھوں پر شیوسینا کے تلک لگے ہوئے تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ ان لوگوں کا تعلق شیوسینا کی مسلم دشمن تنظیم سے ہے اور پولیس یا ملٹری انٹیلی جینس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ بال ٹھاکرے نے میرے پاکستانی جاسوس ثابت ہو جانے کے سنگین واقعے سے پولیس' خفیہ پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کو بے خبر رکھا تھا۔ کیونکہ اس میں بال ٹھاکرے کی سخت بدنامی کا پہلو نکلتا تھا کہ ایک پاکستانی جاسوس بال ٹھاکرے کی گود میں بیٹھ کر اس کا آشیرباد حاصل کر کے بھارت کی فوجی تنصیبوں کو تباہ کرتا رہا اور بال ٹھاکرے کو علم تک نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے

مجھے شیوسینا کی فوجی تنظیم کے حوالے کر دیا تھا تاکہ مجھ سے جس قدر معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں کی جائیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ بال ٹھاکرے کے پاس ایسے وسائل لا محدود تھے وہ جس مسلمان کو چاہے راتوں رات غائب کروا سکتا تھا۔ وہ بھارت کا فرعون تھا۔ وہ مجھے قتل بھی کروا دیتا تو کسی کو خبر تک نہیں ہو سکتی تھی اور اس نے میرے بارے میں یہی فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اسنے خود مجھے بتا دیا تھا کہ میں تمہیں اس طرح ماروں گا کہ تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کی دعائیں مانگو گے اور تمہیں موت نہیں آئے گی۔

میں اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ لاہور میں بیٹھے ہوئے بٹ صاحب اور ملک صاحب سے کون سی ایسی غفلت ہوگئی تھی کہ اصلی دھرم چند ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ تجربہ کار کمانڈو اور دہشت گرد بڑے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ قید میں رہ کر بھی ہر وقت وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دہشت گرد اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اصلی دھرم چند بھی فرار ہوگیا تھا۔ بال ٹھاکرے کے پاس اصلی دھرم چند موجود تھا۔ اسے پولیس کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ ایک نقلی دھرم چند بھی پکڑا گیا ہے۔ اس میں بال ٹھاکرے کی بے عزتی تھی۔ اس کا اثر اس کے سیاسی کیریئر پر پڑ سکتا تھا۔ اس کی بنی بنائی ساکھ تباہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے میرے معاملے کو وہیں دبا دیا تھا اور اب مجھے ہلاک کر کے دبانے کی فکر میں تھا جو وہ جب اور جس وقت چاہے کر سکتا تھا۔ میں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ میرا ایمان تھا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میری زندگی لکھی ہوئی ہے تو بال ٹھاکرے کا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں فرار کے مختلف منصوبوں پر مسلسل غور کرتا رہتا تھا مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس دوران میرے پاس بال ٹھاکرے یا بالا جی راؤ یا منوویسانی میں سے کوئی

نہیں آیا تھا۔ مجھے ان لوگوں نے ہر قسم کے ٹارچر' ہر قسم کی اذیتوں کا نشانہ بنایا۔ میرے جسم پر زخموں اور جلے ہوئے زخموں کے جگہ جگہ نشان پڑ گئے تھے۔ میں شدید تکلیف میں چیخنے بھی لگتا تھا۔ آخر انسان تھا۔ مجھے اذیتیں برداشت کرنے کی ایسی کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی جو عام طور پر کمانڈوز کو دی جاتی ہے۔ میری ایک آنکھ سوج گئی تھی۔ جسم کے نازک حصے بجلی کے جھٹکے کھا کھا کر سن ہو گئے تھے۔ ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ناخن زخمی ہو گئے تھے۔ مگر میں نے اذیت کے شدید لمحوں میں بھی اپنی زبان نہیں کھولی تھی۔ صرف اپنا نام حیدر علی بتا دیا تھا کیونکہ اپنا نام بتانے میں کوئی ہرج نہیں تھا لیکن کسی کشمیری مجاہد یا کشمیری کمانڈو کا نام تک زبان پر نہیں لایا تھا نہ ان کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ میں ایک ہی جملہ بولتا تھا کہ مجھے پاکستان نے جاسوسی کے لیے بھارت نہیں بھیجا۔ میں اپنے طور پر پاکستان کے دشمنوں سے جنگ کرنے آیا تھا۔ میرا کسی کشمیری مجاہد سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کمرے میں مجھے کتنے دن کتنی راتیں گزر چکی ہیں۔ صبح سے شام تک مجھ پر تشدد کیا جاتا تھا جب اس تشدد کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس فیصلے سے مجھے اس آدمی نے آگاہ کیا جو لوہے کے دروازے کے نیچے سے مجھے باسی چاولوں کی طرف پکڑایا کرتا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس آدمی نے مجھے یہ بات کیوں بتائی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے مرنے سے پہلے موت کی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ وہاں میرے سبھی دشمن تھے۔ دوست کوئی نہیں تھا۔

میری جسمانی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ صرف اپنی قوت ارادی اور ایمان کی قوت پر زندہ تھا۔ روشندان میں سے مجھے صرف دن کی روشنی طلوع ہوتے اور غروب ہوتے نظر آ جاتی تھی۔ کچھ دن میں نے دنوں کا حساب رکھا۔ پھر اذیتوں اور ٹارچر کی وجہ سے میں اس حساب کو یاد نہ رکھ سکا۔ کمرے کی بتی ہر وقت

جلتی رہتی تھی لوہے کے بند دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر پہرے پر کھڑے شیوسینا کے آدمی مجھے کبھی کبھی ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔ اچانک مجھ پر تشدد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ میں سارا دن فرش پر پڑا رہتا۔ اس حالت میں شاید دو یا تین دن گزرے ہوں گے۔ میں ننگے فرش پر پڑا تھا کہ لوہے کا دروازہ کھلا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دروازے میں بالا جی راؤ اور بال ٹھاکرے کھڑے تھے۔ ان کے دائیں بائیں دو باڈی گارڈ موجود تھے۔ بال ٹھاکرے نے بالا جی راؤ سے کہا۔

"اس کو ڈیتھ چیمبر میں لے چلو۔"

یہ کہہ کر بال ٹھاکرے باہر نکل گیا۔ بالا جی راؤ نے اپنے مسلح گارڈز کو جو ان کے ساتھ آئے تھے اشارہ کیا اور وہ بھی بال ٹھاکرے کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا۔ ڈیتھ چیمبر کا نام سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ اب کھیل ختم ہو گیا ہے۔ بال ٹھاکرے خود اسی لیے آیا ہے کہ مجھے اپنے سامنے مرتا دیکھے۔ وہاں مجھے سوائے خدا کے اب کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ میرے سامنے زندہ رہنے کی ایک ہی آخری امید تھی کہ اگر خدا نے میری موت نہیں لکھی تو میں نہیں مروں گا۔ اگر لکھی ہوئی ہے تو پھر مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو مرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ جتنی قرآن پاک کی آیتیں یاد تھیں وہ دل میں پڑھنے لگا۔

بال ٹھاکرے کے مسلح گارڈز نے پہلے میرے ہاتھ پیچھے باندھے پھر دونوں پاؤں رسی سے اس طرح باندھے کہ میں نہ دوڑ سکتا تھا نہ لمبے لمبے ڈگ بھر سکتا تھا۔ بس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چل سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ان کے درمیان چلنے لگا۔ کمرے کے باہر ایک تنگ راہ داری تھی۔ تنگ راہ داری میں پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آئے۔ اس کمرے میں چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا جس چیز نے میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑا دی

وہ لوہے کی ایک کرسی تھی جو کمرے کے وسط میں ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھی تھی۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک میز لگی تھی جس پر مختلف دوائیوں کی شیشیاں تھیں اور ٹیکہ لگانے والے چھوٹے بڑے سرنج بھی پڑے تھے۔ مجھے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کرسی لوہے کے بولٹوں سے چبوترے میں فکس تھی۔ یعنی وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ کرسی کے بازوؤں اور پشت کے اوپر بھی چمڑے کی چوڑی بیلٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے انگریزی فلموں میں دیکھی ہوئی وہ کرسی یاد آ گئی جس پر بٹھا کر موت کی سزا پانے والوں کو بجلی کے جھٹکے دے کر مارا جاتا تھا۔

جیسے ہی میں کرسی پر بیٹھا میرے بازوؤں کو چمڑے کی بیلٹ سے باندھ دیا گیا۔ میرا سر پیچھے لگا کر چمڑے کی پٹی سے کس کر باندھ دیا گیا۔ اسی طرح میرے دونوں پاؤں کو بھی چمڑے کے پٹوں سے کس کا باندھ دیا گیا۔ اب میں نہ اپنا سر ہلا سکتا تھا۔ نہ بازو ہلا سکتا تھا اور نہ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ اتنے میں کمرے میں بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ آ گئے۔ ان کے لیے دو کرسیاں میرے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے بال ٹھاکرے نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ملیچھ! مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ اذیت ناک سزائے موت تمہارے لیے تلاش نہیں کر سکا۔ تمہیں ایک ایسے زہر کا انجکشن لگایا جائے گا جس کے اثر سے تم ایک دم نہیں مرو گے۔ تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں اس وقت ہوش آئے گا جب تم ہزاروں من مٹی کے نیچے اپنی قبر میں پڑے ہو گے۔ تم دس منٹ تک ہوش میں رہو گے تمہارے جسم پر کیڑے رینگ رہے ہوں گے۔ چیونٹیاں اور کیڑے تمہارے جسم کو کاٹ رہے ہوں گے۔ اس زہر کے اثر سے تم ہوش میں ہو گے مگر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکو گے۔ دس منٹ تک یہ اذیت برداشت کرتے رہو گے جب کہ قبر کے اندر آکسیجن بھی کم ہو رہی

ہوگی۔ دس منٹ بعد تم پھر بے ہوش ہو جاؤ گے۔ اب زہر کے دوسرے مرحلے کا اثر شروع ہوگا جو اس قدر شدید ہوگا کہ تمہارا جسم پھٹنا شروع ہو جائے گا۔ تم بے ہوش ضرور ہوگے۔ اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکو گے لیکن جسم کے پھٹنے اور بند بند الگ ہونے کی اذیت تمہیں ضرور محسوس ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ اذیت دے کر تمہیں نہیں مار سکتا۔"

بال ٹھاکرے نے مسلح گارڈ کو اشارہ کیا۔ ایک گارڈ فوراً باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی تھے جنہوں نے ڈاکٹروں والے لمبے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ آتے ہی میری کرسی کے پیچھے جو دوائیوں اور ٹیکہ لگانے والے سرنجوں کی میز تھی اس طرف چلے گئے۔ کوئی دو منٹ کے بعد دونوں ڈاکٹر میری کرسی کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر نے میرے بازو پر کہنی سے اوپر کر کے چھوٹی سی رسی کس کر باندھ دی جس سے میرے کلائی کے قریب بازو کی رگیں پھول گئیں۔ دوسرے ڈاکٹر کے ہاتھ میں انجکشن لگانے والی لمبی سرنج تھی۔ اس نے جھک کر میرے بازو کی ایک خاص پھولی ہوئی رگ کو ہاتھ سے دو تین بار دبایا پھر انجکشن کی سوئی پھولی ہوئی رگ کے اوپر رکھ کر اسے رگ میں داخل کر دیا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت مجھ پر موت کا خوف طاری تھا۔ مجھے سوئی کے چبھنے کا ہلکا سا درد ہوا اس کے بعد جیسے جیسے انجکشن میں بھرا ہوا زہر میرے جسم کے اندر سرایت کرتا گیا مجھ پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں نے دنیا کی جو آخری آواز سنی وہ جے بجرنگ بلی کا نعرہ تھا جو یقیناً بالا جی راؤ نے لگایا تھا۔

اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ کچھ پتہ نہیں میں کب تک بے ہوش رہا اور کب ان لوگوں نے میری لاش کو اس قبر میں دفن کیا جو میرے لیے پہلے سے کھود کر تیار ہو چکی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گھپ اندھیرے میں

سیدھا پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹولا میں قبر میں بند تھا۔ قبر کی چھت میرے سر سے کوئی ایک فٹ اونچی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ چھت سیمنٹ کی تھی یعنی مجھے قبر میں دفن کرنے کے بعد ان لوگوں نے چھت پر لینٹر ڈال کر اسے بند کر دیا تھا۔ یقین کریں مجھے اس قدر خوف اور دہشت محسوس ہوئی کہ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ مگر وہاں میری چیخ سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میرے پاؤں اور پنڈلیوں پر کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ میں نے ٹانگیں اوپر اٹھانی چاہیں لیکن میرے گھٹنے قبر کی چھت کے لینٹر سے ٹکرائے۔ میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا کی یا خدا! مجھے موت عطا کر دے۔ مجھے موت دے دے۔ مجھے اپنی بیوی زیب النساء یاد آ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ قبر میں اس قدر گھٹن تھی کہ میرا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور روتے ہوئے اپنی مرحوم بیوی زیب النساء کی روح سے فریاد کی۔ زیب النساء میری پیار بیوی۔ خدا کے آگے میری سفارش کر دے تاکہ مجھے موت آ جائے۔ مجھے اپنے پاس بلا لے مجھے اپنے پاس بلا لے۔ زیب النساء! مجھے اپنے پاس بلا لے۔ میں روتا رہا' روتا رہا اور روتے روتے مجھ پر ایک بار پھر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرا جسم اس خیال سے کانپ اٹھا کہ اب زہر کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گا اور میرا جسم پھٹنا شروع ہو جائے گا۔"

میں ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

اب جو مجھے ہوش آیا تو مجھے بال ٹھاکرے کا جملہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ دوسری بار جب تمہیں ہوش آئے گا تو تمہارے جسم کا گوشت پھٹنا شروع ہو جائے گا۔ تمہیں اتنا ہوش ہو گا کہ جسم کے پھٹنے اور بند بند کے ٹوٹنے کی اذیت کو محسوس کرو گے مگر اپنے ہاتھ پیر نہیں ہلا سکو گے۔ یہ زہریلے ٹیکے کے دوسرے مرحلے کا اثر ہو گا۔ اس کے بعد تم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو جاؤ گے۔ مجھ پر خوف کے مارے لرزہ طاری تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میرا جسم واقعی پھٹنا

شروع ہو گیا ہے۔ مجھے جسم کے پھٹنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے چیخ مار کر کہا۔

"یا اللہ پاک! مجھے اٹھا لے۔ مجھے اس اذیت سے نجات دے دے۔"

میں نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ اپنے سینے کی طرف اٹھایا تو میرا ہاتھ اوپر کو اٹھ آیا جب کہ بال ٹھاکرے نے کہا تھا کہ زہر کے اثر کے دوسرے مرحلے میں تم اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکو گے۔ میرے کانوں میں ایک عجیب سے آواز آ رہی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا میرا جسم بالکل ٹھیک تھا۔ صرف قبر کی آکسیجن اتنی کم ہو گئی تھی کہ پورا منہ کھول کر بھی سانس لینے میں مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اگر یہ میرے جسم کے پھٹنے کی آواز نہیں تھی تو پھر یہ کیسی آواز تھی؟

میں نے غور سے سنا۔ آواز قبر کے سرہانے کی جانب سے یعنی جس طرف میرا سر تھا اس طرف سے آ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے قبر کے سرہانے کی جانب کوئی قبر کو کھود رہا ہے۔ میں پورا منہ کھولے سانس لے رہا تھا۔ قبر کی آکسیجن ختم ہو رہی تھی قبر کو کھودنے کی آواز میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ کوئی جلدی جلدی کھرپا چلا رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے سر کے پیچھے کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کی لکیر سی آتی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سانس لینے میں جو دقت ہو رہی تھی اس میں کمی ہونے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کی لکیر جھونکے میں بدل گئی۔ اب کھرپا نہیں چل رہا تھا۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے مٹی پیچھے کھینچ رہا تھا۔ مجھے سر کے پیچھے سے اب تازہ ہوا آنے لگی تھی۔ میرا سانس ٹھیک ہو رہا تھا۔ اچانک میرے سر کے اوپر سے روشنی کی کرنیں قبر کے اندر آنے لگیں۔ کسی نے ٹارچ جلا کر قبر میں دیکھا تھا۔ مٹی دوبارہ کھودی جانے لگی۔ میرے سر کے اوپر مٹی گرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اپنے سر پر کسی انسان کی انگلیاں لگیں۔ ساتھ ہی باہر سے کسی نے اردو زبان میں پوچھا۔

"زندہ ہو؟"

میں نے جسم کا سارا زور لگا کر کہا۔

"ہاں میں زندہ ہوں۔"

"فکر نہ کرو ایسے ہی لیٹے رہو۔"

تھوڑی دیر بعد میرے سرہانے کی طرف کافی بڑا سوراخ بن گیا اور اس

آدمی کی آواز آئی۔

"اپنے بازو مجھے پکڑا دو۔"

میں نے دونوں بازو سینے کے اوپر سے لے جا کر پیچھے کر دیے۔ شگاف کے اندر ایک طرف ایک آدمی نے اور دوسری طرف دوسرے آدمی نے میرے بازو پکڑے اور آہستہ آہستہ مجھے قبر سے باہر کھینچنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میرا سر قبر کے سرنگ نما شگاف میں سے گزر کر باہر نکلا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر رات کی تاریکی میں مجھے اپنے اوپر دو آدمیوں کے سائے نظر آئے۔ انہوں نے مجھے باہر کھینچ لیا۔ وہاں دو اور آدمی بھی تھے۔ انہوں نے مجھے زمین پر بٹھا دیا اور میری پیٹھ پر زور زور سے ہاتھوں کی مالش کرنی شروع کر دی۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں قبر میں سے زندہ نکل آیا ہوں۔

میرا سر ڈول رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے محسنوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں مجھے ان کے چہرے کالی چادروں میں چھپے ہوئے نظر آئے۔ میرا سر اپنے آپ ایک طرف کو جھک گیا۔ دوسرے دو آدمی بھی قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"اسے جلدی سے گاڑی میں ڈال کر لے چلو۔"

دو آدمیوں نے مجھے اٹھا کر کھڑا کیا اور پوچھا۔ "کیا تم چل سکتے ہو؟"

میں نے قدم آگے بڑھایا اور نحیف آواز میں کہا۔

"چل سکتا ہوں۔"

وہ مجھے آہستہ آہستہ سہارا دے کر اپنے ساتھ چلانے لگے دو آدمی آگے آگے چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے رک کر کہا۔

"دیر مت لگاؤ۔"

وہ بڑی صاف اردو بول رہے تھے۔ یہ زبان بمبئی کے لوگوں کی زبان نہیں

تھی۔ میں اب تک اس معمے کو نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ مجھے تو زہر دیا گیا تھا اور زہر بھی ایسا کہ جس سے بچنا ناممکن تھا اور بال ٹھاکرے کی موجودگی میں مجھے زہر کا ٹیکہ لگایا گیا تھا۔ باہر رات کا وقت تھا۔ تازہ ہوا میں آنے سے میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے میں نے کہا۔

"میں تیز چل سکتا ہوں۔"

جن دو آدمیوں نے مجھے سہارا دیا ہوا تھا ان میں سے ایک نے کہا۔ "کوئی بات نہیں تم آرام سے چلو۔"

میں نے اندھیرے میں اردگرد نگاہ ڈالی۔ یہ کوئی قبرستان نہیں تھا کیونکہ وہاں اندھیرے میں قبروں کی ڈھیریاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ قبروں کی ڈھیریاں رات کے اندھیرے میں بھی زمین سے ابھری ہوئی نظر آ جاتی ہیں۔ وہاں کوئی درخت بھی نہیں تھے۔ ہوا میں کسی وقت مٹی کے تیل ایسی بو آ جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ قریب ہی کوئی کارخانہ وغیرہ ہے۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان پر تاروں کو دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے چکر آ گیا۔ وہاں زمین پر کہیں جھاڑیاں تھیں۔ کہیں پتھر تھے اور کہیں خالی زمین تھی۔ ہم ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ یہ کوئی غیر آباد ویران جگہ تھی۔ بائیں جانب ایک اونچا ٹیلہ آ گیا۔ ہم ٹیلے کے قریب سے گزر کر آگے نکلے تو وہاں اندھیرے میں مجھے ایک ویگن کھڑی دکھائی دی۔

یہ چاروں آدمی بڑے پر اسرار سے تھے۔ انہوں نے اپنے جسم کو سیاہ چادروں میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے ان کے چہروں کے دھندلے نقوش ہی نظر آ سکتے تھے۔ مجھے ویگن کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ تین آدمی اندر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ویگن میں پڑا ایک ڈبہ کھولا۔ میرے بازو پر سے قمیض اونچی کی۔ پھر مجھے ایک انجکشن لگا دیا۔ اس انجکشن کے لگتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ مجھے آواز آئی۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"
میں سوچنے لگا یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جو مجھے موت کے منہ سے کھینچ لائے ہیں؟ میں نے سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ غنودگی نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔
ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ میرے نیچے گدیلا تھا اوپر چھت سے لگا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مجھے جو چکر آتے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ تشدد کی وجہ سے جسم پر جو زخم آئے تھے وہاں ضرور درد کی ٹیسیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ مختصر سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ تین چار بانس کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میری چارپائی بھی بانس کی تھی۔ تپائی پر ایک گلاس پانی کا جگ اور دوائی کی دو تین شیشیاں پڑی تھیں۔ سامنے دروازہ بند تھا میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھتا محسوس ہوا۔
میرے حلق سے درد کے مارے بے اختیار کراہ سی نکل گئی۔
کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ سلاخوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دروازہ کھلا ایک ادھیڑ عمر کی عورت جس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی سیدھی میری چارپائی کے پاس آئی مجھے جاگتا دیکھا تو بولی۔
"بیٹا! اب طبیعت کیسی ہے؟"
میں نے کہا۔ "جسم درد کر رہا ہے۔"
اس نے ایک بوتل میں سے کسی دوائی کے چند قطرے گلاس میں ڈالے پھر اس میں پانی ڈالا اور گلاس میری طرف بڑھا کر کہا۔
"اسے پی لو' یہ تمہاری دوائی ہے۔"
میں نے دوائی پی لی۔ میں نے پوچھا۔
"بہن جی! میں کہاں ہوں۔"

اس نے کہا۔ "وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تم زیادہ نہ بولو آرام کرو۔"

وہ چلی گئی اس عورت کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ سامنے دیوار پر مجھے ایک کیلنڈر بھی نظر آ گیا جس پر اللہ رسول کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر اسی سوچ میں الجھ گیا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ مجھے تو کوئی فرشتے لگتے تھے۔ مگر دوائی کے اثر سے مجھے پھر نیند آ گئی۔ اب آنکھ کھلی تو کھڑکی کے اندر آنے والی دن کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ شاید سورج غروب ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی توانائی کافی بحال ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔ صرف جسم کے زخم درد کر رہے تھے۔ میں نے آنکھ پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھ کی سوجن بھی کافی کم ہو گئی تھی۔

وہی عورت ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس اور ایک تھالی تھی۔ تھالی میں ابلے ہوئے چاول اور گلاس میں سوپ تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر تکیے کے سہارے بٹھا دیا اور کہا۔

"یہ چاول کھا لو۔ ساتھ یہ مرغ کی یخنی ضروری پینی ہے۔ یہ تمہارے لیے ہی بنائی ہے۔"

مجھے کافی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سارے چاول کھا گیا جو پلاؤ کی طرح تھے اور یخنی بھی پی گیا۔ میں نے خاتون سے پوچھا۔

"آپ لوگ مسلمان ہیں کیا؟"

"ہاں، کیوں تمہیں کوئی شک ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں لیکن آپ لوگ کون ہیں میں کس جگہ پر ہوں؟"

خاتون بولی۔

"ابھی تمہیں ان باتوں کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیگ صاحب تمہیں خود سب کچھ بتا دیں گے۔ ابھی تم آرام کرو۔"

میں نے پوچھا۔

"بیگ صاحب کون ہیں؟"

خاتون نے کہا۔ "یہ بھی وہ تمہیں خود بتائیں گے۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

خاتون اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! کہہ دیا ناں کہ ابھی آرام کرو۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔"

وہ دروازہ کھول کر چلی گئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس نے باہر سے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی۔ میں چارپائی سے اٹھ کر قدم قدم چلتا کھڑکی کے پاس آ گیا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھا سورج غروب ہو چکا تھا۔ دور ایک جانب پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں باہر کھلی جگہ تھی۔ ایک طرف پتھر کی سیڑھیوں والا چھوٹا سا تالاب تھا۔ تالاب کے اوپر گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔ شام کا دھندلکا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ فضا میں ہلکا ہلکا حبس تھا۔ یہ علاقہ مجھے بھارت کا جنوب مشرقی یعنی ست پڑا کے پہاڑی سلسلے کا علاقہ لگتا تھا۔ اس علاقے میں ناریل کے درختوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوتی جتنے درخت بھارت کے جنوب میں نیچے ناگ پور' مدراس اور ترچنا پلی کی طرف میں ہوتے ہیں۔ اس طرف کھیجڑ' مہوا' املی اور جنگلوں میں مہاگنی اور دیار کے گھنے درخت بہت ہوتے ہیں۔ ویسے ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ بھی ہوتے ہیں لیکن اتنی کثرت سے نہیں ہوتے باہر مجھے کوئی انسان دکھائی نہ دیا۔

خاموشی بھی تھی۔ اچانک دور سے ریل گاڑی کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ کافی دور سے آ رہی تھی۔ ریل گاڑی وہاں پہاڑی علاقے میں سے گزرتی تھی۔ میں واپس چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ جب دن کی روشنی رات کے اندھیرے میں ڈوب گئی تو وہی خاتون کمرے میں آئی۔ اس نے مجھے دوائی پلائی۔ پھر یخنی کا ایک پیالہ پینے کو دیا۔ میں نے وقت پوچھا۔ اس نے کہا۔

"شام کے سات بجے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"بہن جی! بیگ صاحب کہاں ہیں میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے محسن ہیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

اس پر خاتون نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں زیادہ بولنا نہیں چاہیے۔ تمہیں ایک بار کہہ دیا ہے کہ وقت آنے پر بیگ صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ یخنی پی لو اس سے تمہاری طاقت بحال ہو جائے گی۔"

میں خاموشی سے یخنی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

رات کے دس بج رہے تھے کہ اس خاتون نے آ کر مجھے چاول کھلائے جن
میں قیمہ ملا ہوا تھا۔ ساتھ یخنی تھی۔ میرے زخموں پر اس نے کوئی مرہم بھی لگا
اور یہ کہہ کر چلی گئی۔ "اب تم آرام کرو میں صبح آؤں گی۔"
بال ٹھاکرے کے ٹارچر چیمبر اور ڈیتھ چیمبر سے نکلنے کے بعد اس رات
پہلی بار میں میں گہری نیند سویا۔ رات کو سویا تو دوسرے دن گیارہ بجے آنکھ
کھلی۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی کسی
درخت پر پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں گہری
خاموشی تھی یہ جگہ شہر سے دور کسی جنگل کے علاقے میں تھی۔ کمرے کی طرز
تعمیر بھی پرانی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی بوسیدہ حویلی کا کمرہ ہے۔
مجھے خیال آیا کہ خاتون دروازے پر قفل نہیں لگاتی مجھے دروازہ کھول کر
ذرا باہر جا کر دیکھنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ میں دروازے کی طرف بڑھا
تو باہر عورت کے قدموں کی آہٹ سنائی دی میں وہیں سے پلٹ کر چارپائی پر آ کر
ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہی خاتون اندر آ گئی اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ٹرے تھا جس
میں میرے لیے ناشتہ تھا۔ اس نے ٹرے میرے قریب تپائی پر رکھ دیا اور بولی۔
"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"
میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے پہلے سے کافی اچھا ہوں۔"
"انشاء اللہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ناشتہ کر لو۔"
وہ چلی گئی میں نے ناشتہ کیا اور چائے پیتے ہوئے ایک بار پھر سوچ میں

ہو گیا کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ میں یقیناً" بھارت کے ملک میں ہی تھا۔ پاکستان میں نہیں تھا۔ یہ لوگ بھارت کے مسلمان تھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے مجھے زہر کا ٹیکہ لگنے سے کیسے بچا لیا؟ یہ معمہ مجھ سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ خاتون مجھے بالکل نہیں بتا رہی تھی کہ مرد لوگ جو مجھے قبر میں سے نکال کر لائے تھے کہاں گئے ہوئے ہیں۔ ایک دو بار میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن خاتون نے مجھے آہستہ سے ڈانٹ دیا تھا اور یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

وہاں کوئی اور عورت بھی نظر نہیں آئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر میں یا اس جنگلاتی حویلی میں یہ ادھیڑ عمر کی عورت اکیلی ہی ہے اور کھانا وغیرہ پکانے کا کام وہ خود ہی کرتی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد خاتون واپس آئی۔ اس نے مجھے دوائی پلائی۔ میرے جسم کے زخموں پر جو اب اچھے ہو رہے تھے مرہم لگائی اور مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔

اس طرح مجھے وہاں پانچ روز ہو گئے۔

میں اب کافی حد تک صحت مند ہو گیا تھا۔ جسم کے چھوٹے چھوٹے زخم بھی ٹھیک ہو گئے تھے۔ آنکھ کی سوجن بھی جاتی رہی تھی۔ پانچویں روز ناشتے کے بعد جب عورت برتن وغیرہ لے کر چلی گئی تو میں نے سوچا کہ باہر نکل کر ذرا سیر کرنی چاہیے دیکھنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ میں چارپائی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ اسے آہستہ سے کھول کر باہر دیکھا۔ باہر ایک ویران سا کچا صحن تھا۔ صحن کے درمیان نیم کا ایک گھنا درخت اگا ہوا تھا۔ آمنے سامنے بوسیدہ ستونوں والا ایک برآمدہ تھا۔ برآمدے میں کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے چھوٹا سا راستہ باہر کو جاتا تھا۔ میں دروازے سے نکل کر صحن میں آیا تو پیچھے سے مجھے خاتون کی آواز آئی۔

"بیٹا! ابھی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ چلو واپس اپنے کمرے میں آ جاؤ۔"
میں نے مڑ کر دیکھا تو ادھیڑ عمر خاتون دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی جس میں سبز ترکاری تھی۔ میں نے کہا۔
"بہن! میں کمرے میں پڑے پڑے تھک گیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ ذرا باہر کی سیر کروں۔"
خاتون بولی۔ "تمہارے لیے ابھی زیادہ چلنا پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کمرے میں جا کر آرام کرو دو ایک روز ٹھہر جاؤ' پھر جہاں چاہے چلنا پھرنا۔"
خاتون کے لہجے میں تھوڑی سرزنش کا پہلو بھی تھا۔ میں واپس کمرے میں آ گیا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ صبح خاتون میرے لیے نئے کپڑے لائی تھی' یعنی کرتہ پاجامہ جو میں نے نہانے کے بعد پہن لیا تھا۔ میری داڑھی کافی بڑھ آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں شیو کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے جواب میں اس نے کہا تھا۔
"مسلمان ہو۔ داڑھی کیوں رکھ لیتے۔ شرعی داڑھی رکھنا سنت ہے۔"
اس وقت مجھے خیال آیا کہ واقعی مجھے داڑھی رکھ لینی چاہیے۔ اس طرح سے میری شکل جو اصلی دھرم چند سے اتنی ملتی جلتی ہے تھوڑی مختلف نظر آنے لگے گی اور مجھے اتنی جلدی کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں شرعی داڑھی رکھ لوں گا۔ میرے سر کے بال بھی گردن سے نیچے تک آ گئے تھے۔ ان کے بارے میں بھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں انگریزی طرز پر بال نہیں کٹواؤں گا بلکہ پٹے رکھ لوں گا۔ پانچواں دن بھی گزر گیا۔
اس دن کی رات کو شام ہی سے آسمان پر بادلوں کا چلنا پھرنا شروع ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی خوشگوار ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ بھارت کے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقوں میں سردیوں کے موسم میں بھی وہ سردی نہیں پڑتی جو شمالی علاقوں میں پڑتی ہے۔ یہ علاقہ بھی بھارت کے جنوب مشرق میں واقع تھا اور کوہ ست پڑا کا

علاقہ تھا جہاں سردیوں میں رات کو تھوڑی خنکی ہو جائے تو ہو جائے باقی دن کے وقت موسم خوشگوار ہی رہتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں بھی پنجاب کی گرمیوں والی لو نہیں چلتی۔ گرمیوں کے موسم کے شروع ہوتے ہی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے موسم مسلسل حبس آلود رہتا ہے۔ جتنی دیر تک بارش ہوتی رہے یا بادلوں سے پہلے ہوائیں چلتی رہیں اتنی دیر تک موسم خوشگوار رہتا ہے۔ جنوبی بھارت میں تو بارش کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو ایسی حبس آلود تپش پڑتی ہے کہ آدمی کا رنگ کالا پڑنے لگتا ہے۔

اس روز بھی شام کو بادل چھا رہے تھے مگر ساتھ ہوا بھی چل رہی تھی۔ ادھیڑ عمر شفیق خاتون میرے لیے رات کا کھانا لے کر آئی۔ اس نے کوئی سبزی پکائی ہوئی تھی۔ ساتھ چاول تھے اور دو تین روٹیاں بھی تھیں۔ ان علاقوں میں مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے لوگوں کی خوراک زیادہ تر چاول ہی ہے۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ اور مہاراشٹر میں تو روٹی گھروں میں ضرور پکتی ہے لیکن نیچے جا کر ناگ پور' دکن' مدراس' کیرالہ اور گوا وغیرہ کے علاقوں میں لوگ چاول ہی کھاتے ہیں۔ مدراس میں تو روٹی بھی چاول کے آٹے کی پکائی جاتی ہے جسے چپلا کہتے ہیں۔ مجھے کھانا دے کر خاتون چلی گئی۔ میں حسب عادت بستر پر لیٹ کر سگریٹ پینے لگا اور سوچنے لگا کہ یہاں مجھے کب تک پڑا رہنا ہوگا۔ وہ چاروں آدمی' وہ چاروں فرشتے جو مجھے قبر سے نکال کر لائے تھے کہاں غائب ہوگئے ہیں۔

کمرے کی بتی میں نے بجھا دی تھی کیونکہ بلب کی روشنی میں مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا کھلی کھڑکی میں سے ساون کی رات کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے کلائی آنکھوں کے قریب کر کے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گھڑی کی چمکیلی سوئیوں نے بتایا کہ رات کے ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ میں نے سگریٹ چارپائی کے پاس فرش پر رکھے ہوئے مٹی کی رکابی میں بجھایا اور چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بادلوں میں

گرج کی آواز پیدا ہوئی۔ بجلی نہیں چمکی تھی۔ اگر چمکی ہوگی تو میرے کمرے سے بہت دور ہوگی کیونکہ اس کی روشنی میرے کمرے تک نہیں آئی تھی۔ بادل دوسری بار گرجے تو مجھے بارش کی آواز سنائی دی۔

بارش کی آواز سن کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یہ آواز ہمیشہ بڑی اچھی لگتی تھی اور یہ آواز مجھے آج بھی اچھی لگتی ہے۔ بہرحال میں آنکھیں بند کر کے بہت کچھ سوچنے لگا کہاں سے چلا تھا' کہاں پہنچ گیا ہوں۔ گزرے ہوئے سارے ڈرامائی واقعات فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے پھر جب مجھے ڈیتھ چیمبر میں اپنی موت کا منظر نظر آیا تو میرے جسم پر خوف کی سنسنی سی طاری ہوگئی۔ اگر ان لوگوں نے بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ کی موجودگی میں مجھے زہر کا ٹیکہ لگایا تھا تو مجھ پر اس کا پورا اثر کیوں نہیں ہوا؟ میں زندہ کیسے بچ گیا اور اگر انہوں نے زہر کا ٹیکہ نہیں لگایا تھا تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ لوگ مجھے زہر کا ٹیکہ نہ لگا سکے؟

عجیب معمہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ الجھنے لگا۔ میں نے ایسے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش شروع کر دی۔ بادلوں کی آواز کے ساتھ اس بار مجھے ایک اور آواز سنائی دی جو پہلے تو مجھے بادلوں کی آواز ہی لگی۔ پھر غور سے سنا تو یہ موٹر گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھلی کھڑکی کے پاس آگیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ باہر بھی اندھیرا تھا کیونکہ بجلی نہیں چمک رہی تھی مجھے کسی موٹر گاڑی کی بتیوں کی روشنی نظر آئی۔ روشنی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ پھر یہ گاڑی میری کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر تالاب کی دائیں جانب سے گھوم کر اس حویلی نما مکان کی دوسری طرف مڑ گئی۔ اس کے بعد گاڑی کے رکنے اور انجن کے بند ہونے کی آواز آئی۔

کسی نے کسی کو آواز دی۔

"گاڑی میں سے چیزیں سنبھال کر نکالنا۔"

گاڑی کے دروازوں کے زور سے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد سوائے بارش کی آواز کے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ چاروں فرشتے واپس آ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کی آواز میں نے پہچان لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی میرا حال چال پوچھنے ضرور آئے گا مگر کوئی نہ آیا۔ میں سوگیا۔ دوسرے دن میں نے اٹھ کر کمرے کے غسل خانے میں منہ ہاتھ دھویا اور چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ چار آدمی کمرے میں آ گئے۔ چاروں جوان تھے۔ قد درمیانے تھے' جسم گٹھے ہوئے تھے۔ دو نے کھلے پائنچوں کے پاجامے اور کرتے پہن رکھے تھے۔ دو نے بش شرٹ پتلونیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پتلون قمیض والا جوان آگے آگے تھا۔ اس نے مجھ کو السلام علیکم کہا اور ہاتھ ملایا۔ کہنے لگا۔

"میرا نام وزیر علی ہے۔ یہ رمضان بھائی ہے۔ یہ قادر خان ہے اور یہ سلطان بھائی ہے۔"

رمضان بھائی اور قادر خان میری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وزیر علی اور سلطان بھائی کرسیاں قریب کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے اس سے پہلے کہ میں ان پر اسرار آدمیوں کے لیڈر وزیر علی سے کوئی سوال پوچھتا وزیر علی خود ہی بولا۔

"میں جانتا ہوں تمہارے دل میں اس وقت بہت سے سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے تم ہم سے یہ پوچھنا چاہو گے کہ جب ڈ-تھ چیمبر میں بال ٹھاکرے اور اس کے چیلے بالا جی راؤ کے سامنے تمہیں زہر کا ٹیکہ لگایا گیا تھا تو تم مرے کیوں نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پاکستان کا ایک محب وطن مجاہد جس کا اصلی نام حیدر علی ہے اور جو ایک خطرناک بھارتی دہشت گرد دھرم چند کے بھیس میں مسلمانوں اور پاکستان کی سلامتی کے لیے

بھارت میں کام کر رہا تھا اصلی دھرم چند کے ظاہر ہو جانے کے بعد پکڑ لیا گیا ہے اور بال ٹھاکرے کے آدمی اسے ٹارچر سیل میں لے گئے ہیں۔ ہم اسی وقت سے تمہیں ان کافروں سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہمارا ایک آدمی ڈیتھ چیمبر میں یعنی بال ٹھاکرے کے اپنے بنائے ہوئے ڈیتھ چیمبر میں خفیہ طور پر ہندو ڈاکٹر کے بھیس میں کام کر رہا تھا۔ جب ہم تمہیں ٹارچر سیل سے فرار نہ کروا سکے تو ہماری آخری امید ڈیتھ چیمبر میں اپنے خاص آدمی پر ہی منحصر تھی۔ ہم نے اسے تمہارے بارے میں پوری طرح بریف کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے تمہیں زہر دینے کے لیے جو ٹیکہ تیار کیا اس میں زہر نہیں تھا صرف بے ہوشی کی دوائی تھی۔ اس کے بعد بال ٹھاکرے کی نگرانی میں تمہیں ایک ویران جگہ پر زمین میں دفن کر دیا گیا۔ پھر جو کچھ ہوا تمہیں معلوم ہی ہے۔ ہم تمہیں قبر سے نکال کر یہاں لے آئے۔ اس سے پہلے بال ٹھاکرے نے مہاراشٹر اور سوراشٹر پرانت کے چھ مسلمانوں کو ڈیتھ چیمبر میں موت کا ٹیکہ لگایا تھا۔ ہم ان کو بھی قبروں سے زندہ نکال کر لے گئے تھے۔ ایسا ہم صرف اپنے گروپ کے اس خاص مسلمان ڈاکٹر کی مدد سے کر سکے تھے جو ڈاکٹر بال مکنہ کے روپ میں ڈیتھ چیمبر میں متعین ہے اور جس نے انجکشن میں زہر کی بجائے بے ہوشی کی دوائی ڈال دی تھی۔"

میں نے وزیر علی کا شکریہ ادا کیا اور اس سے پوچھا۔

"آپ کے مجاہدوں کا یہ گروپ کہاں کہاں کافروں کے خلاف سرگرم عمل ہے؟"

وزیر علی نے رمضان بھائی کی طرف دیکھا۔ رمضان بھائی کہنے لگا۔

"بھارت کے جس صوبے میں راشٹریہ سیوک سنگ بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیو سینا ایسی مسلمانوں کی دشمن انتہا پسند ہندو جماعتیں بھارت کے مسلمانوں کا قتل عام کرتی ہیں ہم وہاں پہنچ کر مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی جتنی مدد کر سکتے ہیں'

کرتے ہیں۔ انہیں جتنا بچا سکتے ہیں بچا لیتے ہیں۔"

وزیر علی کہنے لگا۔ "ہمارے وسائل بڑے محدود ہیں۔ ہمارے پاس اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے وافر مقدار میں اسلحہ وغیرہ بھی نہیں ہے لیکن ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ہے۔ ہمارا جذبہ بلند ہے ہم بھارت میں اپنی بقا اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے بال ٹھاکرے ایسے انتہا پسند ہندوؤں سے جنگ کر رہے ہیں۔ ہماری یہ جنگ کھلی جنگ نہیں ہے ہم گوریلا جنگ لڑنے پر مجبور ہیں۔"

قادر بھائی نے کہا۔

"تم ہمارے مسلمان بھائی ہو اور پاکستان کے محب وطن مجاہد بھی ہو۔ ہمارے آدمیوں نے تمہاری سرگرمیوں کی پوری رپورٹ ہمیں دے دی تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم پاکستان اور اسلام کی سلامتی کی خاطر اپنی زندگی موت کے منہ میں ڈال کر بھارت میں کام کر رہے ہو۔ اسلام اور پاکستان کے لیے ہماری جان بھی حاضر ہے۔"

وزیر علی بولا۔

"یہ بات ہمیں آخری مرحلے میں معلوم ہوئی تھی کہ تم ایک خطرناک بھارتی دہشت گرد کا حلیہ بنا کر بال ٹھاکرے کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اس بھارتی دہشت گرد کا نام دھرم چند تھا جو پاکستان کی کسی جیل میں بند ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اصلی دھرم چند پاکستان کی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو کر بھارت پہنچ گیا ہے اور تمہارا پول کھل گیا اور بال ٹھاکرے نے تمہیں پہلے ٹارچر سیل میں اور بعد میں ڈیتھ چیمبر میں پہنچا دیا۔"

سلطان بھائی نے میری طرف ذرا سا جھک کر کہا۔

"اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سورت کے فسادات میں جن ہندو غنڈوں نے مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا تھا اور مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی

تھی تم نے ان کو جالندھر جا کر ایک ایک کر کے قتل کر دیا۔"
وزیر علی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
"اور ہمارے مخبر نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تم پاکستان میں کئی بھارتی دہشت گروں کو ہلاک کروا چکے ہو اور تم نے جالندھر اور اکھنور کی بھارتی فوجی تنصیبات کو بھی تباہ و برباد کیا ہے اور ان ایڈز زدہ بھارتی طوائفوں کو بھی تم نے ہی ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا جن کو بال ٹھاکرے پاکستان میں ایڈز پھیلانے کے لیے پاکستان سمگل کرنا چاہتا تھا۔"
قادر بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اور پاکستان جا کر تباہی پھیلانے والے تامل ٹائیگرز گوریلوں کے بھی تم نے ہی کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پرخچے اڑائے تھے۔"
میں حیران تھا کہ ان لوگوں کی جاسوسی کا سسٹم کس قدر کارگر اور اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ وزیر علی نے کہا۔
"جو باتیں اپنے اور تمہارے بارے میں تم تک پہنچانی ضروری تھیں وہ ہم نے کہہ دی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"
میں نے کہا۔ "جو خاتون یہاں میری دیکھ بھال کر رہی تھیں یہ اس کی مہربانی اور تیمارداری کا نتیجہ ہے کہ میرے زخم بھی ٹھیک ہوگئے ہیں اور میری کھوئی ہوئی توانائی بھی واپس آگئی ہے۔"
وزیر علی نے گہرا سانس لیا اور بولا۔
"اس خاتون کا نام چاند بائی ہے۔ وہ احمد آباد کی رہنے والی ہے۔ گزشتہ سال احمد آباد کے مسلم کش فسادات میں ہندوؤں نے اس کے سارے خاندان کو شہید کر دیا تھا۔ ہم چاند بائی کو اپنے پاس لے آئے ہیں۔ وہ یہیں رہتی ہے۔"
عین اس وقت وہی ادھیڑ عمر خاتون چاند بائی کمرے میں آئی اور پوچھا۔
"ناشتہ میں نے لگا دیا ہے تم سب چل کر ناشتہ کر لو۔"

"اچھا چاند بن۔"

وزیر علی یہ کہہ کر اٹھا اور ہم سب وہاں سے نکل کر ویران صحن میں سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں آ گئے یہ کمرہ بھی بوسیدہ اور چھوٹا سا تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی اور ناشتہ لگا ہوا تھا۔ چاند بائی نے پراٹھے اور چائے بنائی تھی۔ ہم سب مل کر ناشتہ کرنے لگے۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"کیا آپ کو اصلی دھرم چند کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

وزیر علی نے کہا۔ "وہ بمبئی میں ہے اور ابھی تک بال ٹھاکرے کے ساتھ ہی ہے۔"

ایک سوال قدرتی طور پر میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"اگر بال ٹھاکرے نے میری قبر کھدوا کر میری لاش دیکھنے کی کوشش کی تو اسے تو فوراً علم ہو جائے گا کہ مجھے قبر سے نکال لیا گیا ہے۔"

وزیر علی نے کہا۔ "اس کا حل ہم نے بہت پہلے تلاش کر لیا تھا۔ سورت کے فسادات میں ایک ہندو کی لاش ہم اٹھا کر لے آئے تھے۔ وہ لاش اب کافی گل سڑ چکی ہے۔ جب کبھی بال ٹھاکرے کے ڈیتھ چیمبر میں کسی مسلمان کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور اس کی زندہ لاش کو کسی جگہ قبر میں دبا دیا جاتا ہے تو ہم مقررہ وقت پر رات کو جاتے ہیں اور اس مسلمان کو قبر سے نکال کر اس کی جگہ ہندو کی گلی سڑی لاش لٹا دیتے ہیں۔ چونکہ مرنے والے کو انتہائی خطرناک زہر کا انجکشن لگایا گیا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں لاش نے راتوں رات پھٹ کر گل سڑ جانا ہوتا ہے اس لیے بال ٹھاکرے اگر لاش کو دیکھ بھی لے تو اسے یہ شک بھی نہیں پڑ سکتا کہ لاش اتنی جلدی کیسے گل سڑ گئی۔ ویسے آج تک کبھی ایسا ہوا نہیں اور بال ٹھاکرے ہماری اطلاع کے مطابق کبھی قبر کا معائنہ کرنے نہیں گیا۔

اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے آدمیوں نے مسلمان کو صحیح زہریلا ٹیکہ لگایا ہے۔"
ناشتہ کرنے کے بعد وہ چاروں مجاہد جن کا تعلق گجرات کاٹھیاواڑ سے تھا مجھے حویلی کے نیچے لے گئے۔ حویلی کے نیچے جانے کے لیے ہمیں ایک خفیہ سیڑھیاں اترنی پڑیں جو ایک بوسیدہ کوٹھڑی کے اندر سے حویلی کے نیچے جاتی تھیں۔ یہ تہہ خانہ نہیں تھا بلکہ حویلی کے نیچے محرابی ستونوں والے کئی دالان تھے۔ وزیر علی کہہ رہا تھا۔
"یہ حویلی گجرات کی مسلمان حکمران رضیہ سلطانہ کے ایک جرنیل نے اپنے لیے بنوائی تھی اور یہ تہہ خانے بھی خاص طور پر بنوائے تھے۔ یہاں کی حویلیوں اور محلات کے نیچے اس قسم کے تہہ خانے اکثر بنوائے جاتے تھے۔ اسکی سیڑھیوں کا ایک عام راستہ ہے جو حویلی کی ڈیوڑھی سے ذرا آگے نیچے اترتا ہے۔ ہم نے اس راستے کو بند کر دیا ہے اور اس کی جگہ اس کوٹھڑی سے خفیہ راستہ نکالا ہے۔"
حویلی کے اس زمین دوز محرابی ستونوں والے دالان میں دو کوٹھڑیاں بھی تھیں جن کے دروازے بند تھے۔ وزیر علی نے مجھے دونوں کوٹھڑیاں کھول کر دکھائیں۔ ان کوٹھڑیوں میں کچھ اسلحہ رکھا ہوا تھا جن میں رائفلیں' چند ایک ریوالور اور ہینڈ گرنیڈ اور خنجر تھے۔ وزیر علی نے کہا۔
"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ ہمارے وسائل بڑے محدود ہیں۔ ہمارے پاس اگر پیسے بھی ہوں تو ہم بھارت میں اتنی آسانی سے اسلحہ نہیں خرید سکتے۔ ان میں سے زیادہ اسلحہ وہ ہے جو ہم نے شیوسینا اور ایس ایس ایس والوں سے چھینا ہے۔"
میں نے وزیر علی سے پوچھا۔
"عام زندگی میں آپ کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کا ذریعہ آمدنی کیا ہے۔"

وزیر علی بولا۔

"یہ تمہیں آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا۔ ویسے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر محنت مزدوری کر کے رزق حلال کماتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی شادی شدہ نہیں ہے۔ ہم اپنے گروپ میں بڑی زبردست چیکنگ کرنے کے بعد ایسے مجاہدوں کو شامل کرتے ہیں جو شادی شدہ نہ ہوں۔ ہماری جدوجہد کا مقصد بھارت کے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ ہے اور بھارت کی برہمن سرکار کو یہ احساس دلانا ہے کہ بھارتی مسلمان آزادی اور اپنے دینی شعائر پر آزادی سے عمل کر کے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ہماری طاقت بہت محدود ہے' ہمارا دائرہ کار بھی محدود ہے مگر ہم نا امید نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری مثال کو سامنے رکھتے ہوئے بھارت کے دوسرے صوبوں خاص طور پر آندھرا پردیش اور وسطی بھارت کے مسلمان بھی اپنے جائز حقوق کی حفاظت اور اپنی بقا کے لیے ایک نہ ایک دن ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

میں ان بھارتی مسلمان مجاہدوں کے اس دینی جذبے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس تحریک کو بھارت کے مسلمانوں میں بیدار کرنا بہت ضروری تھا۔ وزیر علی نے مجھے کہا تھا کہ ہم نے اپنی سلامتی اور بقا کے لیے باہر کے کسی مسلمان ملک پر امیدیں نہیں لگائی ہوئیں۔ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک بھارت کے مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے خود بیدار نہیں ہوں گے اور جدوجہد نہیں کریں گے ان کی کوئی ملک مدد نہیں کرے گا۔

تہہ خانے سے نکل کر ہم واپس اس کمرے میں آ گئے جہاں میری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے میں آ کر وزیر علی سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ اس وقت بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ ایسے دشمن ہیں جو اپنی خطرناک دشمنی کا عملی مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں دشمنان

دین کا کام تمام کر دیا جائے؟"

سوراشٹر کے چاروں مجاہد چپ ہو گئے اور ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ وزیر علی نے کہا۔

"بال ٹھاکرے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن تمہیں اسی بات کو ذہن میں رکھنا ہو گا کہ جس وقت ہم نے بال ٹھاکرے کو قتل کیا اس کے ایک گھنٹے کے اندر اندر بھارت کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ کم از کم ایک لاکھ مسلمان تو بمبئی احمد آباد پونا اور سورت میں ہی قتل ہو جائیں گے۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ جب بھارت کی پردھان منتری کو اس کے جیالے سکھ باڈی گارڈ نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اس کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر صرف دلی میں ہندوؤں نے دس بارہ ہزر سکھوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

قادر بھائی نے کہا۔

"ہماری حکمت عملی انتہا پسند اور مسلمانوں کے دشمن ہندو لیڈروں کو قتل کرنے کی نہیں ہے۔ ہمارے سامنے صرف مقصد ہیں۔ پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ بھارت کے کچلے ہوئے پسے ہوئے مسلمانوں میں اپنے دینی اور انسانی حقوق کے تحفظ کا شعور اور بیداری پیدا کرنا جس کی ضمانت بھارت کے آئین میں انہیں دی گئی ہے۔ دوسرے مقصد کا تعلق صرف ہماری جماعتی سرگرمیوں سے ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زیر اثر صوبوں کے جس شہر میں ہندو وہاں کے مسلمانوں پر ظلم کریں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ ان کی اسلام دشمن سازشوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی جائے اور ان پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ بھارت کا مسلمان مردہ نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔"

ان لوگوں نے بڑی منطقی بات کی تھی۔ بال ٹھاکرے اور کسی دوسرے

متعصب ہندو لیڈر کو قتل کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا بلکہ الٹا اس سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"میرے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

وزیر علی نے کہا۔

"تم کوئی بھی فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہو ہم جانتے ہیں کہ تمہارا میدان عمل سوراشٹر اور مہاراشٹر سے لے کر مقبوضہ کشمیر تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں بھارتی فوج کشمیری مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہی ہے۔ اگر تم کشمیر کے جہاد میں شریک ہونا چاہو تو ہمیں خوشی ہوگی اور اگر تم ہمارے ساتھ رہ کر مسلمانوں اور اسلام کے لیے کام کرنا چاہو تو ہمیں مزید خوشی ہوگی۔ تم جو چاہو فیصلہ کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "سب سے پہلے تو میں پاکستان میں اپنے خاص آدمیوں کو یہ اطلاع پہنچانا چاہتا ہوں کہ میں زندہ ہوں اگرچہ میرا راز فاش ہو چکا ہے اور اصلی دھرم چند آپ کی قید سے نکل کر یہاں پہنچ گیا ہے۔"

لیڈر وزیر علی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم یہ پیغام پاکستان کس طرح پہنچاؤ گے؟ کیا یہاں تمہارا کوئی ایسا آدمی ہے جو یہ پیغام لے کر پاکستان پہنچ سکے؟"

میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک ہی ذریعہ ہے۔ اگر مجھے کہیں سے ریڈیو ٹرانسمیٹر مل جائے تو میں کوڈ الفاظ میں یہ پیغام پاکستان میں اپنے خاص آدمیوں کو پہنچا سکتا ہوں۔"

لیڈر وزیر علی نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔"

وزیر علی اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تم آرام کرو۔ ایک گھنٹے بعد میں اکیلا یہاں آؤں گا اور تمہیں ایسی

جگہ لے جاؤں گا جہاں تمہیں ریڈیو ٹرانسمیٹر کی سہولت مل جائے گی۔"

جب وہ چاروں مجاہد جانے لگے تو میں نے پوچھا۔

"بھائیو! مجھے یہ تو بتا دو کہ یہ جگہ کونسی ہے اور میں بمبئی شہر سے کتنے فاصلے پر ہوں؟"

وزیر علی مسکرایا اور کہنے لگا۔

"یہ بھی واپسی پر تمہیں بتا دوں گا۔ ویسے تم بمبئی کے قریبی جنگلوں میں ہو۔ خدا حافظ۔"

اور وہ چاروں مجاہد چلے گئے۔

میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ قدرت کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ خدا نے اس وقت میری جان بچائی جب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی اور میری موت یقینی تھی بلکہ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ میں مرچکا ہوں مگر خدا نے مجھے قبر سے زندہ باہر نکال لیا تھا۔ میں دھرم چند کے بارے میں سوچنے لگا کہ کیا اس کا ہم شکل ہونا مجھے اب کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ فائدہ تو مجھے بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک خطرہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ جہاں کہیں میں بمبئی امرتسر بٹالہ یا جالندھر کے شیوسینا والوں کو نظر پڑ گیا میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی کیونکہ اب ایک تو میں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ دوسرے ہو سکتا ہے جس وقت مجھے شیوسینا والے دیکھیں تو اس سے تھوڑی دیر پہلے اصلی دھرم چند ان سے مل کر گیا ہو یا وہ مدراس یا دلی میں ہو اور شیوسینا والے مجھے دوسرے شہر میں دیکھ لیں۔ کیونکہ ایک بات یقینی تھی کہ شیوسینا کے تمام رضاکاروں اور ان لوگوں کو جن سے میں مل چکا تھا یہ ضرور معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں اصلی دھرم چند نہیں بلکہ نقلی دھرم چند تھا اور پاکستان کے لیے ان کے درمیان رہ کر کام کر رہا تھا۔

اس کا ایک حل میرے ذہن میں آیا کہ کسی طرح پاکستان واپس جاؤں اور چہرے کی دوبارہ پلاسٹک سرجری کروا کر ناک کو پھر سے اپنے پہلے جیسے ناک میں بدلوا لوں۔ جب ایک گھنٹے بعد وزیر علی آیا اور میں نے اس کے آگے خدشات کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"تمہیں پاکستان جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کلکتے میں ہماری جماعت کا ایک سرگرم اور خاموش کارکن ڈاکٹر اور پلاسٹک سرجری کا ماہر ہے۔ ہم تمہیں اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ وہ تمہاری ناک کی جیسے تم کہو گے پلاسٹک سرجری کر دے گا۔"

یہ بڑی ہمت افزا بات تھی میں تیار ہوگیا۔ وزیر علی بولا۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں ایک آدمی کے ساتھ کلکتے روانہ کرتا ہوں۔ اپنے سرجن ڈاکٹر کو میں فون پر ساری بات بتا دوں گا۔ اس کا نام سیف الاسلام ہے۔ وہ بنگالی ہے اور بنگال کے مسلمانوں کے حقوق کے لیے بھارت کی مسلم دشمن ہندو سرکار کے خلاف خاموش رہ کر کام کر رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔ میں اس کی فیس کہاں سے ادا کروں گا۔"

وزیر علی نے مسکرا کر کہا۔

"فیس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر سیف الاسلام بہت امیر آدمی ہے اور پھر ہمارے آدمیوں کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے۔ جب تم واپس آؤ گے تو سوچ لیں گے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے مگر سب سے پہلے تمہارا اپنی اصلی شکل میں واپس آنا بہت ضروری ہے۔ دھرم چند کا ہم شکل ہونا تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ہم شکل ہونے سے تمہیں جتنا فائدہ پہنچ سکتا تھا پہنچ گیا ہے اب نقصان ہی پہنچے گا۔"

جس جنگل کی پرانی حویلی میں وزیر علی اور اس کے احمد آباد سورت کے مسلمان مجاہدوں نے اپنا خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا وہاں سے قریبی سٹیشن اوپر کی جانب برہان پور ہی تھا۔ وزیر علی نے مجھے ایک آدمی کے ساتھ کر دیا۔ میرا حلیہ دھرم چند کے حلئے سے اس اعتبار سے کافی بدلا ہوا تھا کہ میری مونچھیں اور گھنی داڑھی تھی۔ یہ داڑھی میں نے نیچے سے مخروطی انداز میں ترشوائی ہوئی تھی۔

سر کے بال بھی پٹوں کی شکل میں گردن تک آئے ہوئے تھے۔ مجھے کلکتے کے مسلمانوں جیسا لباس پہنا دیا گیا تھا یعنی چارخانہ دھوتی' پاؤں میں چپل' کھدر کا کرتہ اور سر پر سفید ٹوپی۔ وزیر علی نے مجھے ایک چھتری بھی دے دی تھی جو آدمی میرے ساتھ تھا اس نے بھی تقریباً" ایسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ ہم ایک ٹرین میں سوار ہو کر برہان پور پہنچے۔ وہاں سے کلکتہ میل پکڑی اور اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ برہان پور سے ایک رات اور دو دن کے سفر کے بعد ہم کلکتہ پہنچے جو گجراتی مجاہد میرے ساتھ تھا وہ مجھے اپنے بھائی کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ کھانا کھایا اور ڈاکٹر سیف الاسلام کے کلینک آ گئے۔ اسے لیڈر وزیر علی نے فون پر سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ وزیر علی کا خاص آدمی بھی ساتھ تھا۔ سیف الاسلام نے کہا۔ "کل میرے ہسپتال میں آ جائیں۔"

میں ہسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر سیف الاسلام نے میرے ناک کے اوپر اس جگہ کو چیک کیا جہاں سے میری پلاسٹک سرجری کر کے میری ناک کو دھرم چند کی ناک کی طرح بنایا گیا تھا۔ میں نے سیف الاسلام سے کہا۔

"بس میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے میرے ناک کو دوبارہ ذرا سا اوپر اٹھا دیا جائے۔"

ڈاکٹر سیف الاسلام نے کمپیوٹر پر میری ناک کو بالکل میری پہلے والی ناک کا خاکہ بنا کر مجھے دکھایا اور پوچھا۔

"کیا ایسی تھی تمہاری پہلی ناک۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے کہا۔ "بالکل یہی تھی میری ناک۔"

ڈاکٹر سیف الاسلام مسکراتے ہوئے بولا۔

"نوپرابلم! یہ بالکل ایسی ہی کر دی جائے گی۔"

دو دن تک میری پلاسٹک سرجری ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں ایک ہفتہ ڈاکٹر سیف الاسلام کے ذاتی چھوٹے سے ہسپتال میں رہا۔ میں نے آئینے میں اپنی

ناک کو دیکھا تو وہ بالکل میری اصلی ناک بن چکی تھی یعنی اوپر جا کر ذرا سا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اب میری شکل دھرم چند سے مشابہ ضرور تھی جیسا کہ بعض لوگوں کی شکلوں کی مشابہت ہوتی ہے مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں دھرم چند ہوں یا خود میں کسی کو نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں دھرم چند ہوں۔ مجھے مزید ایک ہفتہ ڈاکٹر سیف الاسلام نے کلکتے میں اپنی نگرانی میں رکھا۔ جب میں پوری طرح سے صحت مند ہوگیا تو ہم واپس روانہ ہوگئے۔ اپنی خفیہ کمیں گاہ والی حویلی میں آیا تو لیڈر وزیر علی اور اس کے تینوں ساتھی قادر خان' رمضان اور سلطان بھائی میرے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کچھ بدل گیا ہوں۔ وزیر علی نے پوچھا۔

"کیا ایسی تھی تمہاری اپنی ناک؟"

میں نے کہا۔ "بالکل ایسی ہی تھی۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"میں نے دھرم چند کو دیکھا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری شکل اس سے ملتی جلتی ہے مگر ناک اب بالکل مختلف ہوگئی ہے۔"

وزیر علی نے بھی کہا کہ اب تمہاری شکل دھرم چند جیسی ہرگز نہیں ہے۔ تمہاری داڑھی نے تمہیں اس سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ میں نے کہا۔

"وزیر علی بھائی! اب میں پاکستان اپنے ساتھیوں کو اپنے زندہ ہونے کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ مجھے وہاں لے چلیں جہاں میں ریڈیو ٹرانسمیٹر سے اپنے ساتھیوں سے بات کر سکوں۔"

اس وقت سہ پہر کا وقت تھا۔ وزیر علی مجھے گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے پندرہ بیس میل دور ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ موجود تھا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ جگہ کون سی تھی۔ آپ کو یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

بہرحال میں ایک چھوٹے سے کیبن میں ریڈیو ٹرانسمیٹر اون کر کے بیٹھ گیا۔ میں نے فریکوئنسی سیٹ کی اور سلطان صاحب یا بٹ صاحب کو سگنل دیا۔ دوسری طرف سے فوراً میرے سگنل کا جواب آ گیا۔ میں نے کوڈ الفاظ میں کہا۔

"مجھے بٹ صاحب یا سلطان صاحب سے بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے کوڈ الفاظ میں ہی آواز آئی۔

"تم کون بول رہے ہو۔ اپنی شناخت کراؤ۔"

میں نے اپنا خفیہ نمبر بتایا تو اس آدمی نے کہا۔

"میں بٹ صاحب کو بلاتا ہوں۔"

ریڈیو ٹرانسمیٹر میں ہلکا ہلکا شور سنائی دیتا رہا۔ کوئی دس سیکنڈ بعد بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"کون؟ حیدر علی۔"

میں نے کوڈ زبان میں کہا۔

"میں حیدر علی ہوں۔ دھرم چند کیسے فرار ہو گیا تھا؟ اس نے تو مجھے موت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ میری زندگی اللہ کو منظور تھی بچ گیا۔"

بٹ صاحب نے انتہائی افسوس اور شرمساری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غفلت اور غلطی ہے بس تم سمجھ لو کہ قدرت نے بھی اس کو فرار کرانے میں اس کی مدد کی تھی۔ میں نے امرتسر والے مجاہد کو اسی وقت خبردار کر دیا تھا کیا تمہیں اس نے اطلاع نہیں دی۔"

میں نے کہا۔ "امرتسر والا مجاہد تو خود پکڑ لیا گیا تھا۔ یہ لمبی اور الجھی ہوئی کہانی ہے۔"

"اب تم کہاں ہو، کیسے ہو؟"

میں نے کہا۔ "اب میں بالکل محفوظ جگہ پر ہوں۔ میں نے دوبارہ ناک کی پلاسٹک سرجری کروا کر اپنی ناک پہلے ایسی کروا لی ہے۔ اب میں دھرم چند کا ہم

شکل نہیں ہوں۔"

بٹ صاحب کی آواز آئی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ یہاں ہم نے ایک دہشت گرد کو پکڑا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ بھارت کی بدنام زمانہ اور پاکستان دشمن سرکاری تنظیم را کی طرف سے بھارت کے کسی شہر میں ایک خفیہ ٹریننگ سنٹر قائم کیا گیا ہے جہاں پیشہ ور دہشت گردوں کو پاکستان کے خلاف دہشت گردی اور خوفناک تخریب کاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں بھارت کی حسین ترین پیشہ ور عورتوں کو بھی پاکستان میں جا کر جاسوسی کرنے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ تم جس طرح بھی ہو سکے اس ٹریننگ سنٹر کے بارے میں ہمیں تفصیلی رپورٹ بھی بھیجو اور کوشش کرو کہ جن زہریلے سانپوں کو بھارت کی سرکار پاکستان بھیجنے والی ہے ان کو وہیں کچل دیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس ٹریننگ سنٹر کا پورا کھوج لگاؤں گا اور وہاں تربیت حاصل کرنے والے تمام سانپوں اور ان کے سپیروں کو ہمیشہ کے لیے کچل کر ختم کر دوں گا۔"

بٹ صاحب نے پوچھا۔

"تم سے ٹرانسمیٹر پر اب کیسے رابطہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "امرتسر والے مجاہد سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اس وقت پولیس کی حراست میں ہے۔ میں اگلی بار آپ کو بتاؤں گا کہ آپ مجھے کس جگہ پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ اب میں پیغام رسانی کا سلسلہ بند کرتا ہوں۔"

"اوکے خدا حافظ!" بٹ صاحب کی آواز آئی۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ وزیر علی دوسرے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر

پوچھا۔

"بات ہوگئی؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں ایک ضروری بات آپ سے پوچھنی ہے۔ یہاں نہیں گاڑی میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

ہم اس خفیہ ٹرانسمیٹر والی جگہ سے نکل کر باہر کھڑی وزیر علی کی پرانی گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ قریبی شہر سے کافی دور تھی۔ اردگرد آبادی کہیں نہیں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ہی تھی۔ ہماری گاڑی درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ را کے ٹریننگ سنٹر کے بارے میں جو باتیں مجھے بٹ صاحب نے وائرلیس پر بتائی تھیں وہ میں نے لیڈر وزیر علی کو پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیں اور ان سے پوچھا۔ "مجھے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ را کا یہ ٹریننگ سنٹر کون سے شہر میں اور کس جگہ پر ہے۔"

وزیر علی نے میری باتیں بڑے غور سے سنیں اور ایک دو لمحے خاموش رہے پھر کہا۔ "یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ میں اپنے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ اگر اس قسم کا کوئی سینٹر را کی طرف سے قائم ہوا ہے تو اس کی فل رپورٹ مجھے مل جائے گی۔ مجھے دو چار دن کی مہلت دے دو میں سارا پتہ لگا لوں گا۔"

شام ہو رہی تھی جب ہم واپس اپنی حویلی والی خفیہ کمیں گاہ میں آ گئے اس رات ان مجاہدوں کی جماعت کے کچھ اور رضاکاروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ مہاراشٹر اور سوراشٹر کے شہروں میں اپنی اپنی جگہوں پر بھارت کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ظاہری طور پر اور خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار ان کی آپس میں اسی حویلی کے تہہ خانے میں ملاقات ہوتی تھی۔ وزیر علی نے گجرات کاٹھیاواڑ اور پونا کے ان مسلمان مجاہدوں سے میرا تعارف کرایا۔ لیکن یہ بالکل نہ بتایا کہ اس میں حقیقت میں کون ہوں۔ وزیر

علی نے انہیں یہی کہا کہ حیدر علی مالیر کوٹلہ کا مسلمان مجاہد ہے اور یہاں ہمارے ساتھ رہ کر بھارتی مسلمانوں پر ہندو سرکار کی زیادتیوں کے خلاف کام کرنے آیا ہے۔

اسی رات میں نے وزیر علی سے کہا۔

"وزیر بھائی! میرا خیال ہے اب میرا حلیہ دھرم چند جیسا نہیں ہے۔ میں باہر نکل کر بھی کام کر سکتا ہوں۔ بمبئی یا سورت میں نہ سہی بھارت کے کسی دوسرے شہر مثلاً" احمد آباد میں رہ سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے؟"

وزیر علی کچھ سوچ کر بولا۔ "ایسا ہو سکتا ہے لیکن میں ابھی تمہیں اس طرح کھلے بندوں باہر پھرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ مجھے را کے تربیتی کیمپ کا سراغ لگا لینے دو۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ تمہیں اس خفیہ کمیں گاہ میں رہنا چاہیے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے را کے تربیتی کیمپ کو ختم کرنے کے مشن کے لیے تمہیں کسی دوسرے شہر جانا پڑ جائے۔"

وزیر علی کا مشورہ درست اور عقل مندوں والا تھا۔ میں نے اسی حویلی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے چاروں مجاہد دوست یعنی وزیر علی' قادر خان' سلطان بھائی اور رمضان بھائی چلے گئے۔ میں حویلی میں اکیلا رہ گیا۔ ادھیڑ عمر خاتون چاند بائی مجھے کھانا وغیرہ پکا کر دے دیتی تھی اور میرا پورا خیال رکھتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر بار کی تباہی اور خاوند بیٹوں دو بہوؤں اور ان کے بچوں کے ہندوؤں کے ہاتھوں قتل کی ایسی دلدوز کہانی سنائی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ گاندھی کے یہ چیلے کس منہ سے اپنے آپ کو امن اور شانتی کے پجاری کہتے ہیں۔ ان غنڈوں نے چاند بائی کی دونوں بہوؤں کو ان کے خاوندوں کو قتل کرنے کے بعد سب کے سامنے بے عزت کیا۔ پھر ان کے بچوں کو ایک ایک کر کے ذبح کیا اور چاند بائی کو اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ بڑھاپے میں اپنے بچوں بچیوں کا غم جھیلتی رہے۔

چاند بائی کی دکھ بھری داستان سننے کے بعد میں رات دیر تک جاگتا رہا۔ مجھے نیند نہ آئی۔ سوچتا رہا کہ متعصب ہندو واقعی مسلمان کا دشمن ہے۔ وہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ بھارت میں بھی مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں نے تو اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے اور اس کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بھارت کے مسلمان بھی ہندو کے ظلم و ستم کے خلاف بیدار ہوگئے ہیں اور وزیر علی ایسے مجاہدوں کی شکل میں مسلم دشمن کٹر ہندو جماعتوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی بیداری کی بہت ضرورت ہے۔ اگر بھارت کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے حقوق اور مذہبی آزادی کے حق میں جدو جہد شروع کر دیتے ہیں تو یہ ہندوؤں کے خلاف بہت بڑی طاقت ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ ہندو جو بھارت کے سارے مسلمانوں کو ہندو بنا دینا یا ختم کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ مصروف عمل ہیں۔

وزیر علی کو جنگل والی اس حویلی کی خفیہ کمیں گاہ سے گئے تین دن گزرے تھے کہ ایک رات وہ آگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ را کے ایجنٹوں کے خفیہ تربیتی کیمپ کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر کے لایا ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں کے آدمی بھارت کے ہر صوبے ہر شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔

وزیر علی نے اپنی پرانی گاڑی پیچھے کھڑی کر دی تھی۔ کیونکہ ایک دن پہلے بڑی موسلادھار بارش ہوئی تھی اور باہر والے تالاب کا پانی باہر تک آگیا ہوا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتے ہوئے چاند بائی کو چائے کے لیے کہہ آیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے السلام علیکم کہہ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"وزیر بھائی! کوئی سراغ ملا؟"

اس نے کہا۔ "پہلے چائے پی لیں پھر بات کریں گے۔ میں خالہ چاند بائی کو

چائے کا کہہ آیا ہوں۔ تم سناؤ یہاں بور تو نہیں ہو گئے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں بھائی ہمیشہ ایکشن میں رہنے والا آدمی ہوں۔ یہاں بیکا
پڑے پڑے بور ہی ہو سکتا ہوں۔ میں تو ایکشن چاہتا ہوں۔ یعنی ملک و ملت
اسلام اور مسلمانوں کی سلامتی کی خاطر دشمنوں سے جنگ کرتے رہنا۔"

وزیر علی نے ہنس کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہیں اس کا موقع مل گیا ہے۔ میں نے را کے تربیتی کیمپ
پورا پتہ چلا لیا ہے۔"

وزیر علی نے مجھے را کے اس تخریب کاری کے تربیتی کیمپ کے بارے میں
جو کچھ بتایا وہ پاکستان کے خلاف دہشت گردوں کے اس تربیتی مرکز کی مکمل
رپورٹ تھی جو اس کے مخبروں نے اسے لا کر دی تھی۔ میں آپ کو اپنی زبان
میں اس رپورٹ کی تفصیل بتاتا ہوں۔

بھارت کا صوبہ مدھیہ پردیش بہت وسیع و عریض صوبہ ہے اور اس میں
بھارت کے بڑے بڑے شہر آتے ہیں۔ وسطی ہند کے خطرناک ترین پہاڑی
جنگلوں کا سلسلہ بھی اسی صوبہ میں ہے۔ بھوپال کا شہر بھی اسی صوبے میں واقع
ہے۔ اگر آپ بھوپال سے ٹرین میں بیٹھ کر جنوب کی طرف واردھا کی طرف
جائیں تو راستے میں ایک چھوٹا سا پہاڑی سٹیشن آتا ہے جس کا نام گومل واڑی
ہے۔ اس سٹیشن کے آس پاس وسطی ہند کے ہیبت ناک پہاڑی جنگل ہیں جہاں
بڑے بڑے بہادر ڈاکو بھی پناہ لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ان جنگلوں میں آدم خور
شیر' آوارہ کتوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ ایسی آدم خور جنگلی بیلیں ہیں کہ آدمی
کو اچانک چمٹ جاتی ہیں اور جب تک اس کے جسم کا سارا خون نہ چوس لیں
اسے نہیں چھوڑتیں۔ دلدلیں اتنی گہری ہیں کہ اوپر تلے ان میں دو ہاتھ گر جائیں
تو انہیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ گومل واڑی کا سٹیشن انگریزوں کے زمانے میں بنایا گیا
تھا جس کا مقصد جنگل میں کٹائی کے دنوں میں لکڑی کے گٹھے مال گاڑی میں لاد کر

شہروں کو سپلائی کرتا تھا۔ یہ سٹیشن اتنا ہیبت ناک اور خطرناک ہے کہ انگریز کے زمانے میں یہاں ہفتے میں صرف دو مال گاڑیاں آ کر رکتی تھیں اور لکڑی لاد کر لے جاتی تھیں۔ اسی مال گاڑی میں سٹیشن کے مختصر سٹاف کے لیے راشن پانی بھی آتا تھا۔ آزادی ملنے کے بعد بھارت سرکار نے اس طرف ایک دو مسافر ٹرینیں بھی چلا دیں مگر گومل واڑی سٹیشن پر دن کے وقت بھی کوئی مسافر ڈر کے مارے نہیں اترتا تھا۔ جب بھارت کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا تو گومل واڑی کے قرب و جوار میں نئے نئے قصبے آباد ہو گئے جہاں پہنچنے کے لیے لوگوں نے ٹرین کے ذریعے بھی آنا شروع کر دیا مگر کوئی مسافر گاڑی رات کے وقت یہاں نہیں ٹھہرتی۔

دن کے وقت گاڑی ٹھہرتی تو مسافروں کو جب تک سٹیشن ماسٹر کی طرف سے یقین نہ دلا دیا جاتا تھا کہ پلیٹ فارم پر اور اس کے آس پاس کوئی شیر چیتا نہیں آیا کوئی مسافر ٹرین سے نہیں اترتا تھا۔ اس کے باوجود گومل واڑی کے سٹیشن پر آدم خور شیر کسی مسافر کو اٹھا لے جاتے تھے۔ سٹیشن کا شاف سٹیشن کے واحد کمرے میں بند رہتا۔ شام کو فارسٹ گارڈ کے ساتھ یہ لوگ اپنے کوارٹروں میں جاتے اور صبح تک کوارٹروں کے لوہے کی سلاخوں والے دروازے بند رکھتے تھے۔

را نے تخریب کاری کی تربیت کے لیے خدا جانے کیا سوچ کر یہی علاقہ چنا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ یہ علاقہ ویران رہتا تھا کوئی انسان آتا جاتا نہیں تھا۔ چنانچہ را کے ایجنٹ راز داری اور خفیہ طور پر تربیتی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے تھے۔ وزیر علی کے مخبروں کے بیان کے مطابق را کی پاکستان دشمن تنظیم نے بھارت سرکار کی امداد سے گومل واڑی کے جنگلاتی ٹیلوں کے درمیان ایک ...ہ جنگل کو صاف کروا کر دو تین بیرکیں بنوا لی تھیں جہاں ایک اونچا واچ ٹاور ...ی تھا جہاں ایک سنتری دوربین لیے یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں اس طرف کوئی شیر

چیتا یا کوئی دوسرا جنگلی درندہ تو نہیں داخل ہوگیا۔ تخریب کاری کے اس تربیتی کیمپ میں اس وقت سات بھارتی تخریب کاروں کو تربیت دی جا رہی تھی۔ تربیت دینے والے دو انسٹرکٹر تھے جن میں ایک ہندو تھا جس کا نام چونی لال تھا جو بہار کا رہنے والا تھا۔ دوسرا انسٹرکٹر ایک اسرائیلی تھا جو بڑی روانی سے اردو ہندی بول لیتا تھا اور فلسطین میں ایک عرصے تک اسرائیلی حکومت کی طرف سے تخریب کاری کرتا رہا تھا۔ اس اسرائیلی کا نام جیکب تھا اور وہ مسلمانوں کا جانی دشمن تھا اور پاکستان کے خلاف دل میں نفرت کے شدید جذبات رکھتا تھا۔ تربیتی کیمپ پہاڑیوں کے درمیان ایک وادی نما جگہ پر تھا۔ اس کے اردگرد کانٹے دار دیوار کھنچی ہوئی تھی۔

زیر تربیت ساتوں تخریب کار رات کو بارک میں سوتے تھے۔ ہندو انسٹرکٹر اور اسرائیلی انسٹرکٹر بارک کے پیچھے دو الگ الگ کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ان کے وہ الگ الگ باورچی تھے جو ان کے لیے کھانا وغیرہ بناتے تھے۔ ان کے لیے راشن پانی اور ٹریننگ میں کام آنے والا اسلحہ وغیرہ بھی کبھی مال گاڑی اور کبھی وہ مسافر ٹرین لے کر آتی تھی جو گومل واڑی کے سٹیشن پر بمشکل ایک منٹ رکتی تھی۔ پیشہ ور عورتوں کو جس کیمپ میں تخریب کاری کی ٹریننگ دی جاتی تھی وہ گومل واڑی میں نہیں تھا۔ یہ تربیتی کیمپ بھارت کے صوبہ اتر پردیش میں مراد آباد کے جنوب میں سمبل کے ایک فاریسٹ ریسٹ ہاؤس میں قائم کیا گیا تھا۔ سمبل سے چمبل کے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کیمپ کے بارے میں وزیر علی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں جن پیشہ ور لڑکیوں کو پاکستان میں جا کر تخریب کاری کی تربیت دی جانے والی ہے ان کا انتخاب مشرقی پنجاب کی ہندو لڑکیوں میں سے کیا جا رہا ہے۔ جن کی مادری زبان پنجابی ہو اور اردو بھی روانی سے بول لیتی ہوں۔ ایسی پیشہ ور لڑکیوں کو خاص طور پر ترجیح دی جا رہی ہے جو انگریزی میں بھی بات چیت کر سکتی ہوں اور

جنہیں جدید فیشن کے بارے میں بھی پوری شدھ بدھ ہو۔ جو انتہائی خوبصورت ہوں۔ اس کیمپ میں ابھی ٹریننگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ہمارا ٹارگٹ گومل واڑی کا ٹریننگ سنٹر تھا۔

وزیر علی سے پوری تفصیل سننے کے بعد میں نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو۔"

وزیر علی کہنے لگا۔

"حیدر علی! را کا یہ تخریب کار کا ٹریننگ کیمپ صرف پاکستان کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ ہم بھارت کے مسلمانوں کے خلاف بھی ہے کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ پاکستان کی طاقت ہماری طاقت ہے۔ اگر پاکستان کو خدانخواستہ کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ ہمارا بھی نقصان ہے۔"

میں نے اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ بات تو طے ہے کہ گومل واڑی کا تخریب کاری کا کیمپ مجھے ہر حالت میں تباہ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ اس مشن کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ تم بھارت کے باشندے ہو اور یہاں کے سارے علاقوں اور ان علاقوں میں رہنے والوں سے واقف ہو۔"

وزیر علی نے فوراً کہا۔

"حیدر علی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس مشن میں میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ اسلام اور پاکستان کی سلامتی کے لیے تو ہماری جان بھی چلی جائے تو ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔ ہم تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ سکتے ہیں ہم اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں گے اور اس سے پہلے کہ اس تربیتی کیمپ کا کوئی دہشت گرد ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں داخل ہو ہم گومل واڑی کے جنگل میں ہی اس کا سر کچل ڈالیں گے۔"

وزیر علی کے اس عزم نے میرے جسم میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دبایا اور کہا۔

"تم میرے سچے مومن بھائی ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمارا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟"

وزیر علی کہنے لگا۔ "اس سے پہلے کہ ہم کوئی طریقہ کار وضع کریں مجھے گومل واڑی پہنچ کر تربیتی کیمپ کا پورا سروے کرنا ہو گا۔ وہاں کا محل وقوع دیکھنا ہو گا۔ زیر تربیت بھارتی دہشت گردوں کے روزمرہ معمولات کا جائزہ لینا ہو گا۔ یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ہفتے میں دو بار ان کے لیے مال گاڑی یا مسافر گاڑی میں راشن پانی اور اسلحہ کی جو سپلائی آتی ہے اس کے لینے کون کون لوگ جاتے ہیں۔ ان کے اسلحہ کے ذخیرے کا پتہ چلانا ہو گا کہ ان کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور رات کے وقت وہاں پہرے کی کیا صورت حال ہوتی ہے۔ میں نے فی الحال اپنے مشن کو ملتوی کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ان مسلمان دشمن تخریب کاروں کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "اندازاً" تم کو وہاں کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وزیر علی نے کہا۔ "بہرحال ایک ہفتہ تو ضرور لگ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم وہاں اکیلے جاؤ گے؟ وہاں تو بقول تمہارے ہر طرف ہیبت ناک جنگل ہے جہاں دن کے وقت بھی آدم خور شیر پھرتے رہتے ہیں۔ تم وہاں ایک ہفتہ کہاں رہو گے؟"

وزیر علی مسکرانے لگا۔ بولا۔

"یہ ساری باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے معلوم ہے وہاں مجھے کہاں ٹھہرنا ہو گا اور پھر میں اکیلا نہیں ہوں گا۔ قادر خان میرے ساتھ ہو گا۔ وہ اس علاقے میں جنگل کے ایک ٹھیکیدار کے ساتھ دو تین برس گزار چکا ہے اور جنگل کے

اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

میں اس پرانی حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں مجھے سوائے اس کے اور کوئی بوریت نہیں تھی کہ میں اکیلا تھا۔ لیکن اب میں کسی وقت حویلی سے نکل کر آس پاس کے درختوں اور جنگل میں ٹہلنے نکل جاتا تھا۔ اگرچہ وزیر علی نے مجھے زیادہ دور جانے سے منع کر رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"اگرچہ یہ علاقہ شہر سے کافی دور ہے اور جنگل میں ادھر جنگل درندوں کا بھی زیادہ خطرہ نہیں ہے پھر بھی بمبئی کی خفیہ پولیس بڑی چالاک ہے۔ ممکن ہے انٹیلی جینس کا کوئی آدمی پھرتا ہوا اس طرف سے آ نکلے۔"

چنانچہ میں وزیر علی کی ہدایت کے مطابق ٹہلنے کے واسطے زیادہ دور نہیں جاتا تھا اور اردگرد کے ماحول سے بھی ہوشیار رہتا تھا۔ وزیر علی را کے ٹریننگ سنٹر کا سروے کرنے جا چکا تھا۔ قادر خان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ ایک دن سلطان بھائی اور رمضان بھائی مجھ سے ملنے شام کے وقت آ گئے تھے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔

وزیر علی نے ایک ہفتے کی بجائے پورے نو دن لگا دیے۔ دسویں دن وہ آگیا کہنے لگا۔

"ہم رات کی گاڑی سے آ گئے تھے۔ اس وقت رات زیادہ ہوگئی تھی میں نے سوچا صبح تم سے ملنے جاؤں گا۔"

پھر اس نے مجھے کومل واردی کے را کے ٹریننگ کیمپ کے بارے میں ان لوگوں کے معمولات کی پوری تفصیل سنائی جو ہمارے مشن کے لیے بے حد فائدہ مند تھی۔ کہنے لگا۔

"ان کے پاس اسلحہ کوئی اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ دس بارہ آٹومیٹک پستولیں ہیں۔ چار چھ کلاشنکوفیں ہیں۔ ہفتے میں ایک بار ساتوں دہشت گردوں کو بم بنانے

اور لگانے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ لیکن خطرے والی بات یہ ہے کہ انہوں نے تربیتی کیمپ کے اردگرد جھاڑیوں میں بارودی سرنگیں لگائی ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ سرنگیں زمین میں دبائی گئی ہیں اس لیے ان کا پتہ چلانا مشکل ہے۔"

میں نے کہا۔ "انہوں نے اپنے آدمیوں کو ان بارودی سرنگوں سے بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی نشانی تو وہاں ضرور لگائی ہوگی۔"

وزیر علی نے کہا۔ "بظاہر ہمیں وہاں سے ایسی کوئی نشانی لگی ہوئی نظر نہیں آئی لیکن اپنے آدمیوں کو خبردار رکھنے کے لیے وہاں کوئی نہ کوئی نشانی ضرور لگی ہوگی۔ اس کا ہمیں وہاں جا کر پتہ چل جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"رات کے وقت وہاں پہرے کی کیا پوزیشن ہوتی ہے؟"

وزیر علی بولا۔ "پہرے کی پوزیشن یہ ہے کہ دن کے وقت تو کیمپ کے جنوب میں سٹیشن کی جانب جو واچ ٹاور ہے اس پر ایک سنتری کی ہر وقت ڈیوٹی لگی رہتی ہے۔ اس کے پاس دوربین بھی ہوتی ہے اور لائیٹ مشین گن بھی اس نے لگائی ہوئی ہے۔ یہ واچ ٹاور موٹے موٹے بانسوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے جو زمین سے پچیس تیس فٹ اونچا ہوگا۔ یہاں ایک چھوٹی سرچ لائیٹ بھی لگی ہے جس کی روشنی کسی کسی وقت گھما پھرا کر سنتری آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے لیتا ہے لیکن سرچ لائیٹ کی روشنی اس وقت اون کی جاتی ہے جب گارڈ سنتری کو جنگل میں کوئی آہٹ سنائی دیتی ہے چونکہ یہ کوئی جنگی کیمپ نہیں ہے اس لیے سیکورٹی اتنی سخت نہیں ہے یہ صرف را کی طرف سے دہشت گردوں کی ٹریننگ کو خفیہ رکھنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔"

جب میں نے وزیر علی سے پوچھا بلکہ اس سے مشورہ لیا کہ اس کیمپ کو تباہ کرنے کے سلسلے میں ہمارا طریق کار کیا ہوگا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ بہت کچھ سوچ کر آیا تھا پر اب بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کوئی ایمونیشن ڈپو نہیں ہے کہ جسے بم لگا کر آن کی آن میں اڑا دیں گے یہ ٹریننگ سنٹر ہے اور یہاں سات جرائم پیشہ افراد کو ہر قسم کا اسلحہ چلانے اور بم لگانے بم بنانے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ یہ تربیت میری اطلاع کے مطابق دو ہفتے سے جاری ہے۔ اس دوران ان سات دہشت گردوں کا نشانہ کافی بہتر ہوگیا ہوگا۔ ہمارے مقابلے میں وہ زیادہ مہارت سے ٹارگٹ پر فائر کر سکتے ہیں ان حالات کے پیش نظر ہم ان دہشت گردوں کو ایک ساتھ ہی ہلاک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عام طور پر الگ الگ ہوتے ہیں بلکہ رات کے وقت بھی انہیں الگ الگ بارکوں میں سلایا جاتا ہے یہ را کے اسرائیلی انسٹرکٹر کی حفاظتی پیش بندی ہی ہو سکتی ہے تاکہ دشمن کا کوئی ایجنٹ وہاں آکر ان سب کو ایک ساتھ ہلاک نہ کر سکے ورنہ ان دہشت گردوں کے رات کے وقت بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے دور رکھ کر سلانے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم کسی طرح بارکوں کے نیچے بارود لگا کر انہیں اڑا بھی دیں تو یہ بات ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ساتوں دہشت گرد ہلاک ہوگئے ہیں' اس کے علاوہ تین بارکیں ہیں اور ان تین بارکوں کے نیچے گڑھے کھود کر بارود لگانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ بارکوں کے گرد رات کو برابر پہرہ لگا ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تمہارے خیال میں دوسرا کون سا طریق کار ہو سکتا ہے؟"

اس کے جواب میں وزیر علی ہنسنے لگا۔ میں حیران سا ہوا کہ وہ اتنے اہم اور سنگین سوال پر ہنسنے کیوں لگا ہے۔ کہنے لگا۔

"ہمیں ان دہشت گردوں کو ہلاک کرنے کے لیے غیر روایتی ہتھیاروں سے کام لینا پڑے گا۔"

وزیر علی کی یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا۔
"تمہارا مطلب ہے ہمیں اسلحہ کی بجائے بڑے کمانڈو چاقو استعمال کرنے ہوں گے؟"
وزیر علی نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔
"تو غیر روایتی ہتھیار کون سے ہوں گے؟"
وزیر علی اپنے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا کہنے لگا۔
"ہمیں سپیروں کا بھیس بدل کر جانا ہوگا۔"
میں اس کا منہ تکنے لگا۔ "سپیروں کا بھیس؟" میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ "سپیرے وہاں کیا کریں گے؟"
وزیر علی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ چاند بائی چائے کی چینک ٹرے میں رکھے چلی آ رہی تھی۔ "بیٹا وزیر علی! اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو پہلے تم دونوں چائے پی لو۔ میں کھانا تیار کر رہی ہوں۔ آلو کی بھجیا بناؤں گی آج۔ تمہیں پسند ہے نا؟"
"ہاں بی اماں، بہت پسند ہے۔"
وزیر علی نے کرسی ذرا ایک طرف کر کے کہا۔ چاند بائی نے چائے کا ٹرے چارپائی پر میرے سامنے رکھ دیا اور "وہی بنا رہی ہوں" کہتی ہوئی چلی گئی۔ وزیر علی نے چائے پیالیوں میں ڈالی ایک پیالی مجھے دی اور دوسری پیالی خود لے کر چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔

"یہ فیصلہ میں نے اور قادر خان نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے۔"
میں نے کہا۔ "لیکن سپیرے بن کر ہم کیا کریں گے؟ ان لوگوں کو سانپ کا تماشا دکھائیں گے۔"

وزیر علی مزے سے چائے پی رہا تھا اور سامنے والی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی محویت کے عالم میں جیسے اپنے آپ سے بولا۔

"سانپوں کا ایسا تماشا دکھائیں گے کہ کسی نے آج تک نہ دیکھا ہو گا۔"
اس نے پیالی ٹرے میں رکھ دی اور کہنے لگا۔

"تم کیا سمجھتے ہو ہم احمق ہیں؟ ہمیں عقل نہیں ہے؟" "نہیں نہیں حیدر ملی' ایسی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہم بھگت کبیر جتنے عقل مند نہیں ہیں اور مارے پاس اسلام کے بہادر جرنیل محمود غزنوی جتنی فوجی طاقت بھی نہیں ہے یکن ہمیں خدا نے عقل ضرور دی ہے اور اس عقل کو استعمال کر کے ہم اپنے شمن کو ختم کر سکتے ہیں۔"

میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا۔ وزیر علی کہہ رہا تھا۔

"قادر خان سانپوں کے بارے میں بہت علم رکھتا ہے۔ اس نے راجستھان ور بنگال کے سپیروں کے درمیان بہت وقت گزارا ہے۔ وہ سانپوں کو سدھانا ھی جانتا ہے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔

"لیکن وزیر علی بھائی! سانپوں کا ہمارے اس مشن سے کیا تعلق ہے؟ سانپوں کا علم یہاں ہمیں کیا مدد دے سکتا ہے؟"

وزیر علی بولا۔ "سانپوں کا علم جس طرح ہماری مدد کرے گا' اسے تم دیکھ ر حیران رہ جاؤ گے یہ سب کچھ وقت آنے پر تمہیں اپنے آپ معلوم ہو جائے ۔ ابھی تمہیں میری کسی بات کا یقین نہیں آئے گا۔ آج رات ہم آرام کریں لے میں اور قادر خان بڑا لمبا ٹرین کا سفر کر کے آئے ہیں۔ کل رات کو ۹ بجے

والی گاڑی میں ہم گومل واڑی کے را کے تربیتی کیمپ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد وزیر علی نے مجھ سے را کے تربیتی کیمپ مشن کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے ایک دو بار بات کرنی بھی چاہی تو اس نے کہا۔ "کل بات کریں گے۔"

وہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانے کے بعد چلا گیا۔ کہہ گیا کہ میں اور قادر خان کل دوپہر کے بعد آئیں گے۔ تم سفر کے لیے تیار رہنا۔ رات کو بستر پر لیٹ کر میں کافی دیر سوچتا رہا کہ سانپ ہمارے کس کام آئیں گے؟ یہ طریق کار مجھے الف لیلیٰ کی داستانوں والا لگ رہا تھا۔ دوسرے اور تیسرے پہر قادر خان اور وزیر علی اپنی پرانی کھٹارا گاڑی میں پہنچ گئے۔ قادر خان نے ایک چمڑے کا اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔ میں انہیں کھڑکی میں سے حویلی کے پرانے دروازے کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ صحن کی طرف سے ہو کر وہ میرے کمرے میں آ گئے۔ السلام علیکم۔ دونوں نے یک زبان مجھے سلام کیا' ہاتھ ملائے۔ قادر خان نے اٹیچی کیس چارپائی کے پاس زمین پر رکھ دیا۔ میں نے پوچھا۔

"اس میں کیا ہے قادر بھائی؟"

وہ حاجیوں والے زرد رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"اس میں بڑے زہریلے سانپ ہیں۔"

اور دونوں ہنس پڑے۔ میں نے دل میں کہا۔ یا اللہ خیر ہو۔ یہ سانپوں کا مشن مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ کہیں کوئی الٹی سیدھی بات نہ ہو جائے۔ چاند بائی ہمارے لیے چائے لے آئی۔ ہم چائے پینے اور موسم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ قادر خان نے بات کا رخ بدلتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"حیدر بھائی! تمہارا ہم شکل دھرم چند دہشت گردی کی ماڈرن طریقے سے ٹریننگ لینے اسرائیل کے ملک گیا ہوا ہے۔ اسے بھارت کی کندریہ انٹیلی جینس

نے را کے خرچ پر بھیجا ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہاں ٹریننگ لے کر بھی وہ ہمارے ملک پاکستان کا بال بھی
بانکا نہ کر سکے گا۔"

وزیر علی بولا۔ "یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پاکستان بڑی قربانیوں کے بعد بنا
ہے۔ پاکستان ایک طاقتور ملک ہے۔ پاکستان کے مسلمان اپنے وطن کی حفاظت کرنا
اور دشمن کو تہس نہس کرنا جانتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی مثال ہمارے سامنے
ہے۔ بھارت ورش کے ہندو اور ہندو سرکار اس شکست کو ابھی تک نہیں بھولی۔
ساری دنیا میں بھارت کی بدنامی ہوئی کہ اتنے بڑے ملک نے اتنی بڑی فوج'
تنے زیادہ جنگی ساز و سامان کے ساتھ اتنے چھوٹے سے ملک پر حملہ کیا تھا اور
اکستان کی ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہ کر سکے بلکہ کھیم کرن اور چھمب جوڑیاں
بھی اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے لیکن ہندو کی ذہنیت سے شاید تم ابھی واقف نہیں ہو
ہ میدان جنگ میں تم سے شکست کھا جائے گا لیکن اندر ہی اندر تمہاری جڑیں
کاٹتا رہے گا۔ بس تمہیں ہندو کے اس حملے سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے بالکل سو فیصد درست بات کی ہے وزیر بھائی۔ لیکن
کستان کے لوگ اپنے دشمن کی سازشوں اور اس کی مکار ذہنیت سے اچھی طرح
اقف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ اب ہم میدان جنگ
یں بھی ہندو کو شکست دیں گے اور میدان جنگ کے باہر بھی اس کی کسی پاکستان
شمن کسی ناپاک سکیم کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اس بار دھرم چند اسرائیل کے ملک سے ٹریننگ لے کر
اپس آئے تو اس کا کام بھی تمام کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی
نسری۔ کچھ بھی ہو یہ آدمی پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کے لیے انتہائی
طرناک ہے۔"

میں نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اس کا کام میں تمام کروں گا۔ میں اس کے تمام ہتھکنڈوں سے واقف ہوں۔ ایک بار وہ میرے جال میں آگیا تو پھر میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

میں نے وزیر علی سے بال ٹھاکرے اور بالا جی راؤ کے بارے میں پوچھا کہ ان کو کہیں میرے زندہ بچ نکلنے کا علم تو نہیں ہوگیا۔ وزیر علی نے ہنس کر کہا۔

"حیدر بھائی! ہم نے کچی گولیاں کبھی نہیں کھیلیں۔ ہم بڑا پکا پاؤں ڈالتے ہیں۔ بال ٹھاکرے کے ڈ-تھ چیمبر تک اپنے مسلمان ڈاکٹر کو پہنچانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ شیوسینا کے جاسوس تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ ہم نے ان کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک دی۔ یہ صرف عقل کی فتح نہیں ہے بلکہ اس میں ہمارا جذبہ بھی کام کر رہا ہے۔ اسلام کی فتح اور کافر کا سر کچل ڈالنے کا جذبہ۔ کافر بھی وہ کہ جو اسلام کے خلاف گھناؤنی سازشیں کر رہا ہے اور بھارت کے شہروں میں موقع ملتے ہی مسلمانوں کو قتل کرنا' ان کی بچیوں کی بے حرمتی کرنا' انہیں اغوا کرنا اور ان کے گھروں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہندو ہمارا اصل دشمن ہے بھارت میں جو امن پسند ہندو ہیں ہماری ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم تو اپنے دشمنوں کے دشمن ہیں۔ بال ٹھاکرے کے باپ کو بھی کبھی علم نہیں ہو سکتا کہ جس حیدر علی کو اس نے اپنی دانست میں زہر کا انجکشن دے کر قبر میں دفن کر دیا تھا وہ زندہ ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ تم اس کے سامنے نہ چلے جاؤ اور وہ تمہیں بمبئی کے کسی بازار میں چلتا پھرتا دیکھ کر پہچان نہ لے۔ ہم چائے بھی پیتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ جب سہ پہر کے پانچ بجے تو وزیر علی نے قادر خان سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں تیاری پکڑنی چاہیے۔ ابھی ہمیں سٹیشن پر بھی جانا ہے۔"

قادر خان نے اٹیچی کیس کھول دیا۔ اس میں گیروے رنگ کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ تین لمبے لمبے کرتے تھے' تین دھوتیاں تھیں' تین گلے میں لٹکانے والے کپڑے کے جھولے تھے' تین بینیں تھیں یہ سارا لباس اس علاقے کے سپیروں کا تھا۔ وزیر علی نے مجھ سے کہا۔

"حیدر علی! اب کوئی سوال مت پوچھنا۔ جس طرح ہم کرتے ہیں تم بھی کرتے جاؤ۔"

ہم نے اپنے کپڑے اتار کر سپیروں کا لباس پہن لیا۔ سروں پر بھی گیروے رنگ کے رومال باندھ لیے۔ وزیر علی نے ہم سب کو شہری لباس یعنی بش شرٹیں اور پتلونیں ایک طرف تہہ کر کے رکھ دیں۔ اپنی صدری کی جیب میں سے اس نے بٹوہ نکال کر کھولا۔ اس میں کافی کرنسی نوٹ تھے۔ وزیر علی نے تین سو روپے مجھے دیے۔ تین سو روپے قادر خان کو دیے اور باقی روپے اپنے لمبے کرتے کے اندر جو صدری تھی اس کی جیب میں رکھ لیے۔

میں نے کہا۔

"ہمیں اپنے پاس اسلحہ نہیں تو کم از کم ایک ایک بڑا چاقو ضرور رکھنا چاہیے۔"

قادر خان نے اٹیچی کیس میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلا نکالا اس میں سے تین کمانڈو چاقو اور ایک آٹو میٹک پستول تھا۔ چاقو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیے اور آٹو میٹک پستول مجھے دے کر بولا۔

"ہمیں معلوم ہے تم تربیت یافتہ گوریلے ہو۔ پستول بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔"

میں نے پستول کو غور سے دیکھا۔ بڑا جدید قسم کا پستول تھا۔ اسکے آگے سائی لینسر بھی لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے فائر کا دھماکہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے روپے چاقو اور پستول اپنے گیروے رنگ کے لمبے کرتے کے اندر صدری کی

جیب میں رکھ لیا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی ہم سپیرے تو بن گئے ہیں لیکن ہمارے پاس سانپ ایک بھی نہیں ہے۔"

قادر خان مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"دلہا کے بغیر بھی کبھی برات سجی ہے۔"

اس نے اٹیچی کیس میں ہاتھ ڈال کر ایک درمیانے سائز کی پٹاری نکالی جس پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ کپڑے ہٹا کر اس نے پٹاری ہمارے درمیان فرش پر رکھ دی۔ اپنے ایک ہاتھ میں رومال پکڑ لیا اور بولا۔

"پیچھے پیچھے ہٹ جاؤ ان سانپوں کا زہر نہیں نکالا گیا۔"

میں اور وزیر علی پرے ہٹ گئے۔ قادر خان نے پٹاری کا ڈھکنا اٹھایا تو اس کے اندر سے پھنکاروں کی آواز آئی۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ پٹاری میں بالشت بالشت بھر کے کتنے ہی سانپ ایک دوسرے میں گھس کر رینگ رہے تھے اور اپنے انسانی انگوٹھے کے برابر اپنے منہ اٹھا اٹھا کر زبانیں باہر نکال رہے تھے۔ ان سانپوں کے رنگ مٹیالے تھے۔ قادر خان کہنے لگا۔

"یہ بہت ہی زہریلے سانپ ہیں۔ میں اپنے ایک بڑے پرانے دوست سپیرے سے ایک مہینے کے لیے مانگ کر لایا ہوں۔ میں نے ان کے کاٹے سے ایک آدمی کو مرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سانپ نے اس کے پاؤں پر ٹخنے کے قریب کاٹا تھا۔ جیسے ہی سانپ نے اسے کاٹا وہ کھڑے قد سے گر پڑا تھا۔ جیسے کوئی ٹہنی درخت سے کٹ کر گرتی ہے۔ نہ اس کے جسم سے خون نکلا' نہ منہ ناک سے خون نکلا' نہ اس کا جسم نیلا پڑا' نہ اس کا جسم گلا سڑا۔ بس وہ پتھر بن گیا تھا۔ ہم نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس آدمی کا جسم ایسا تھا جیسے ٹھنڈا پتھر ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر چھڑی ماری تو انگوٹھا یوں ٹوٹ

کر الگ ہوگیا جیسے مٹی کے لوٹے پر چھری ماری جائے تو اس کی ٹوٹنی الگ ہو جاتی ہے۔ جب میں نے اپنے بنگالی سپیرے استاد سے اس سانپ کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ یہ مہاپدم سانپ ہے۔ اس کے کاٹنے سے آدمی اور جانور کا جسم ایک دم سے پتھر بن جاتا ہے۔ پھر اس نے مجھے اس سانپ کی ایک ایسی خوبی یا وصف بتایا جس کو سن کر مجھے الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آ گئیں۔ میرے بنگالی استاد سپیرے نے بتایا کہ اس سانپ میں یہ وصف ہے کہ اسے دشمن کے جسم سے اترا ہوا کوئی کپڑا سنگھا دیا جائے اور اس کے بعد اسے کچھ کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اسے نکال کر چھوڑا جائے تو دشمن جہاں ہوگا یہ سانپ اس کی بو پر وہاں پہنچ جائے گا اور اسے کاٹ کر اپنے سپیرے کے پاس واپس آ جائے گا۔ دشمن چاہے ملک کے کسی کونے میں ہو یہ وہاں پہنچ جائے گا۔ راستے میں چاہے آندھی آئے' طوفان آئے یہ آندھی طوفان گزر جانے کے بعد دوبارہ اس آدمی کی بو پر چل پڑے گا۔ یہ جس آدمی کے اترے ہوئے کپڑے ایک بار سونگھ لے اسے اس آدمی کے جسم کی بو سینکڑوں میل سے محسوس ہو جاتی ہے۔ یہ خاص وصف قدرت نے صرف اسی مہاپدم سانپ کو دیا ہے۔"

اب میں سمجھ گیا تھا کہ ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے۔ جب میں نے اس منصوبے کی کامیابی کے امکانات کا ذکر کیا تو وزیر علی بولا۔

"حیدر بھائی! ہم تمہاری طرح تربیت یافتہ گوریلے یا کمانڈو نہیں ہیں۔ ہمیں ہر طرح کے حربے استعمال کر کے دشمن کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم دشمن کو قتل کرتے ہوئے کبھی نہیں جھجکتے۔ اس وقت ہم جہاد کے میدان میں ہوتے ہیں اور کافر کو صرف اس لیے قتل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کا دشمن ہے۔ ہم اپنے مشن کے دوران جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ہمارے وسائل بھی محدود ہیں۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ بھی نہیں ہے کہ دشمن کے ساتھ زیادہ دیر پوزیشن میں رہ کر لڑائی کر

سکیں۔ ہمیں عیاری اور چالاکی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہم ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جس سے ہم اسلام کے دشمنوں کو تہہ تیغ کر سکیں۔ میرا خیال ہے اب تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

"بالکل سمجھ گیا ہوں۔"

میں نے کہا اور دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھے اس موذی سانپ سے اپنے پناہ میں رکھنا۔ سات بجے ہم نے شام کا کھانا کھا لیا اور پونے آٹھ بجے جب اندھیرا چھا گیا تو ہم گاڑی میں بیٹھ کر قریبی ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری گاڑی بمبئی کے مضافاتی جنگلوں کے پہاڑی راستوں میں سے گزر رہی تھی۔ اندھیرے میں صرف گاڑی کی بتیاں ہی ہمیں راستہ دکھا رہی تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم ایک ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچے۔ سٹیشن کی روشنیاں دیکھ کر وزیر علی نے گاڑی ایک طرف پہاڑی کی کھوہ میں کھڑی کر کے اس کے اوپر جھاڑیوں کی شاخیں کاٹ کر ڈال دیں۔ اب ہم پورے سپیروں کے بھیس میں سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ میں اس ریلوے سٹیشن کا نام نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ بھارت کے یہ مسلمان مجاہد آج بھی اپنے حقوق اور آزادی اور عزت نفس کے وقار کے لیے ہندو سے جنگ لڑ رہے ہوں گے اور کوئی عجب نہیں کہ آج بھی احمد آباد اور سورت کے یہ مسلمان مجاہد اس پرانی حویلی کو اپنی خفیہ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہوں۔ اس لیے میں یہاں اس ریلوے سٹیشن کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ہم سٹیشن کے برآمدے میں جا کر بیٹھ گئے۔

گاڑی کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ یہ بمبئی سے بھوپال جانے والی گاڑی تھی۔ ایک قلی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ ہم سپیروں کی طرح وہیں برآمدے کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھے رہے۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ سپیرے سادھو سنیاسی بھارت کے سٹیشنوں اور شہروں میں عام نظر آ جاتے تھے۔ وزیر علی نے کہا۔

"میں جا کر ٹکٹ لے آتا ہوں۔ تم یہیں بیٹھو۔"

وہ اپنا جھولا اور بین ہمارے پاس رکھ کر اس طرف چلا گیا جہاں لوگ گاڑی کے ٹکٹ لے رہے تھے۔ زہریلے سانپوں والی پٹاری قادر خان کے جھولے میں تھی۔ سانپوں کو اس نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی ایسی دوائی یا مہرہ نہیں ہے جس کو پینے یا منہ میں رکھنے سے ان سانپوں کے کاٹے کا اثر نہ ہو۔"

قادر خان ہنس کر کہنے لگا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کسی سانپ کو تمہارے پاس نہیں آنے دوں گا۔ ویسے ان سانپوں کے کاٹے کی کوئی دوا میرے علم میں نہیں ہے۔ پرانے تجربہ کار سپیرے بھی ان سانپوں سے کبھی غافل نہیں ہوتے اور بڑی عقل مندی سے انہیں پکڑتے ہیں۔ کوئی مہرہ بھی ایسا نہیں ہے جو ان سانپوں کا زہر انسان کے جسم سے چوس لے۔ ان کا زہر اتنا موقع ہی نہیں دیتا۔ ادھر یہ کاٹتے ہیں ادھر آدمی گر کر پتھر ہو جاتا ہے۔ پتھر میں سے مہرہ زہر کہاں سے چوسے گا؟"

اتنے میں وزیر علی ٹکٹ لے کر آ گیا۔ اس نے ایک ایک ٹکٹ ہمار۔
حوالے کر دیا۔ کہنے لگا۔

"ٹکٹ بابو کہہ رہا تھا ٹرین نے کچھ لیٹ نکال لیا ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں
پہنچنے والی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں پلیٹ فارم پر چلے چلنا چاہیے۔"

ہم برآمدے سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر گئے۔ وہاں مسافروں کا کافی رش تھا
بھارت کی آبادی کافی بڑھ گئی تھی۔ پندرہ بیس برس پہلے اتنی آبادی نہیں تھی
ٹرین آ گئی۔ ہم تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ میرے پاس آٹو میٹک
پستول تھا جو بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے لمبے کرتے بلکہ چولے کے اند
صدری کی جیب میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ ساتھ فالتو گولیوں کا ڈبہ بھی تھا۔
دوسری جیب میں بڑا کمانڈو چاقو بھی تھا۔ چونکہ ہم سپیروں کے بھیس میں تھے اس
لیے ہم پر کسی کو شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ ٹرین چل پڑی۔ پہلا بڑا سٹیشن دیولالی
آیا۔ اس کے بعد ناسک کا شہر آیا۔ ناسک سے ٹرین بھوساول کھنڈوا والی لائن پکڑ
لی۔ بھوساول کہیں رات کے دو بجے آیا۔ یہ جنکشن تھا یہاں سے اورنگ آباد کی
طرف ایک ریلوے لائن جاتی تھی۔ بھوپال کا سٹیشن دوسرے دن نو دس بجے کے
قریب آیا۔ یہاں سے ہم ناگ پور جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ یہ ٹرین گومل
واڑی نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہمیں گومل واڑی ہی جانا تھا۔ ہم اس سے سات میل
پیچھے ایک سٹیشن پر اتر گئے۔

یاد نہیں رہا اس سٹیشن کا کیا نام تھا۔ اس وقت دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔
سٹیشن پہاڑی کے نشیب میں ایک سنسان جنگل میں واقع تھا۔ میں نے وزیر علی
سے پوچھا کہ یہاں سے ہمیں کوئی بیل گاڑی وغیرہ نہیں مل سکتی۔ وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے مل جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں سات میل پیدل چلنا
پڑے۔ تم تو کمانڈو ہو۔ تمہیں دشواری نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے کہا۔ "نہیں مجھے کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

قادر خان کہنے لگا۔ "فکر نہ کرو۔ گومل واڑی کا تربیتی کیمپ یہاں سے سات میل کے فاصلے پر ہے مگر ہمیں پانچ میل ہی چلنا پڑے گا۔ وہاں ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں آتا ہے۔ یہ گاؤں ان لوگوں نے آباد کیا ہے جو گومل واڑی کے را کیمپ کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان میں ایک گوالے کا گھر ہے جو تربیتی کیمپ کو تازہ دودھ وغیرہ سپلائی کرتا ہے۔ دو تین گھر کیمپ میں صفائی وغیرہ کرنے والوں کے ہیں۔ ایک مستری ہے' ایک بجلی کا کام کرنے والے کا گھر ہے اور دو گھر دھوبیوں کے ہیں جو کیمپ میں رہنے والوں کے کپڑے وغیرہ پہاڑی ندی پر لے جا کر دھوتے ہیں۔"

"کیا ہم ان گاؤں والوں کے پاس جا رہے ہیں۔"

میرے سوال پر وزیر علی کہنے لگا۔

"قادر خان سب کچھ سوچ سمجھ کر اپنے منصوبے کے مطابق کام کر رہا ہے۔ بس تم دیکھتے جاؤ کہ جہاں جانباز کمانڈو اپنا مشن پورا نہیں کر سکتے وہاں ہم ایسے مجاہد عیاری سے کس طرح کام لیتے ہیں۔"

راستہ جنگلاتی تھی۔ جھاڑیاں' درختوں کے جھنڈ ندی نالے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ حبس بہت ہو رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ خوش قسمتی سے دو ڈھائی میل چلنے کے بعد ایک بیل گاڑی مل گئی جو پیچھے سے آ رہی تھی۔ گاڑیبان نے تین سپیروں کو پیدل جاتے دیکھا تو قریب آ کر گاڑی روک لی۔ قادر خان نے اس علاقے کی دیہاتی زبان میں گاڑیبان سے کہا۔

"بھیا ہمیں گومل واڑی کے دھوبیوں کے گاؤں جانا ہے۔ لے چلو گے؟"

گاڑی بان بولا۔ "بیٹھ جائیں مہاراج' میرا کیا لگتا ہے آ جائیں۔"

گاڑی گے آگے دو بیل جتے ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیٹھنے سے جسم کو تھوڑی ٹھنڈی ہوا لگی تو کچھ سکون محسوس ہوا۔ گاڑی پہاڑی جنگل کے نشیب و فراز میں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی سفر کرتی رہی۔ گاڑیبان نے قادر

خان سے پوچھا۔

"بھیا آپ لوگ جنگل میں سانپ پکڑنے جا رہے ہیں تو مال کنڈی ندی کے طرف سنیر کالے سانپوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اس جوڑے نے ادھر سے راستہ بند کر رکھا ہے۔ ان کو جا کر ضرور پکڑو۔ بڑے پن کا کام ہوگا۔"

قادر خان بولا۔

"ادھر بھی ضرور جائیں گے اور جوڑے کو پکڑ لیں گے' شانت رہو۔"

سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے اوپر جھکنا شروع ہوگیا تھا کہ مجھے دور سے ایک ٹیلے کے پاس کچھ ڈھلواں چھتوں والے جھونپڑی نما مکان نظر آئے یہ وہی گاؤں تھا جہاں ہمیں جانا تھا۔ ہم گاؤں سے تھوڑا پہلے گاڑی سے اتر گئے۔ قادر خان کو سپیروں والی بین بجانی خوب آتی تھی۔ مجھے اور وزیر علی کو بالکل نہیں آتی تھی۔ قادر خان نے ہمیں صرف اتنا سکھا دیا تھا کہ جب وہ بین بجا رہا ہوتا تھا تو ہم اپنی اپنی بین میں سے لمبی آواز نکال لیتے تھے۔

گاڑی کے قریب پہنچے تو قادر خان نے ہمیں اشارہ کیا اور خود بین بجانی شروع کر دی۔ ہم بھی اپنی اپنی بین منہ کے ساتھ لگا کر اس میں سے تھوڑی تھوڑی آواز نکالنے لگے۔ اسی طرح بین بجاتے ہم دس بارہ جھونپڑی نما بوسیدہ مکانوں کی بستی میں داخل ہوئے تو بچے دوڑ دوڑ کر ہمارے پاس آنے لگے۔ کچھ بوڑھے مرد جھونپڑوں کے باہر بیٹھے ناریل کے حقے پی رہے تھے۔ عورتیں اپنے اپنے کاموں میں لگی تھیں۔ کہیں کہیں چولہوں میں آگ جل رہی تھی اور عورتیں روٹیاں پکا رہی تھیں۔ کچھ جوان مرد درختوں کے تنوں سے بندھی ہوئی رسیوں پر سکھانے کے لیے کپڑے ڈال رہے تھے۔ قادر خان نے بین بجانی بند کر دی۔ ہم جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھے ایک سیاہ رنگ کے بوڑھے کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"بھائی لوگ آپ کہاں سے آ رہے ہو؟"

قادر خان نے ان ہی کی زبان اور لہجے میں کہا۔

"ماراج ہم تو جنگل جنگل شہر شہر پھرنے والے سپیرے ماندری ہیں۔ ادھر پتہ چلا تھا کہ زمین کے اندر کسی راجہ کے خزانے پر دو سفید سانپ پہرہ دیتے ہیں بس انہیں پکڑنے آئے ہیں۔"

بوڑھے نے ہنس کر کہا۔

"بابا لوگ ادھر خزانہ دبا ہوا ہوتا تو ہم یہاں بیٹھ کر کیمپ والوں کی مزدوری نہ کرتے۔ تم کو کسی نے غلط خبر دی ہے۔"

وزیر علی بولا۔ "بابا! آپ ہمیں رہنے کو ایک جھونپڑی دے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ راجہ کا خزانہ ملا تو ہم سارا خزانہ تمہیں دے دیں گے کیونکہ ہم تو سفید سانپ پکڑنے کے واسطے آئے ہیں ہم سپیروں کو خزانے کی دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے۔"

بوڑھا لالچ میں آگیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ناریل کا حقہ چارپائی پر ایک طرف ٹکا کر آگے کو جھک کر وزیر علی سے کہنے لگا۔

"اگر تم لوگ وعدہ کرو کہ راجہ کے خزانے کا ذکر گاؤں کے کسی دوسرے آدمی سے نہیں کرو گے تو بے شک جتنے دن چاہو یہاں رہو۔ میں گاؤں والوں سے کہہ دوں گا کہ ادھر زہریلے سانپوں کا جوڑا آگیا ہے۔ یہ ماندری اسے پکڑنے آئے ہیں۔"

وزیر علی نے کہا۔

"بابا جی ہم وعدہ کرتے ہیں۔ اس بات کا ذکر ہم کسی دوسرے آدمی سے نہیں کریں گے۔"

بوڑھے نے ہمارے لیے ایک جھونپڑی نما کمرہ کھول دیا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کو بلا کر کہا کہ اس طرف جنگل میں بڑے زہریلے ناگوں کا جوڑا آگیا ہے۔ خطرہ ہے کہ وہ ہماری بستی میں نہ آجائے۔ یہ ماندری اس جوڑے کو پکڑ

کر لے جائیں گے۔ گاؤں کے دوسرے مردوں نے اس بات کو زیادہ اہمیت
دی۔ وہاں سانپ بھی آ جایا کرتے تھے اور ان کی تلاش میں سپیرے لوگ
آتے رہتے تھے کسی نے ہم پر کوئی اعتراض بھی نہ کیا اور اپنے اپنے کام
مصروف رہے۔ بوڑھے کو ہم نے یقین دلا دیا کہ وہاں سے ایک میل کے فا
پر جنگل میں ایک کھنڈر کے نیچے راجہ کا خزانہ دفن ہے۔ ہم وہ خزانہ ض
تلاش کر لیں گے۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"تم زمین کے اندر خزانہ کیسے دیکھو گے؟"

قادر خان نے کہا۔ "ہمارے پاس ایک ایسا سانپ ہے جو زمین سونگھ
ہمیں بتا دے گا کہ یہاں زمین کے اندر خزانے کے سفید سانپوں کا جوڑا مو
ہے۔ بس وہیں سے ہم زمین کھودنا شروع کر دیں گے۔ جب خزانہ مل گیا تو
سفید سانپوں کے جوڑے کو پکڑ کر لے جائیں گے اور خزانہ تمہیں دے جا
گے کیونکہ ہمارا خزانہ سانپ ہی ہیں۔ ہمیں دنیا والوں کے خزانوں سے ک
دلچسپی نہیں ہوتی۔"

یہ بوڑھا ہماری بہت خاطر مدارت کرتا تھا۔ اس کا بیٹا گومل واڑی کے ت
کیمپ میں مرمتوں وغیرہ کا کام کرتا تھا اور مستری تھا۔ بیرک کی کہیں سے چ
ٹپک رہی ہوتی تو اسے درست کرتا۔ کہیں سے فرش اکھڑا ہوتا تو وہاں سیم
سے مرمت لگا دیتا۔ رات کو ہم نے کھانا کھایا۔ بوڑھا حقہ لے کر ہمارے پ
بیٹھا راجہ کے خزانے کی باتیں کرتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو ہم نے آپس میں
باتیں شروع کر دیں۔ جھونپڑے میں لالٹینیں جل رہی تھیں۔ وزیر علی نے ق
خان سے کہا۔ "اس بوڑھے کے ذریعے معلوم کرنا ہو گا کہ یہاں اس دھوبی
مکان کہاں ہے جو کیمپ کے آدمیوں کے میلے کپڑے لا کر دھوتا ہے۔"

قادر خان بولا۔

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا پہلے تو ہم دن نکلنے کے بعد گومل واڑی کیمپ

اردگرد چل پھر کا ایک بار پھر اس کا جائزہ لیں گے تاکہ اگر ہماری سانپوں والی سکیم کسی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے تو ہم کسی دوسرے طریقے سے ان لوگوں کو ختم کر سکیں۔"

کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم لوگ وہیں لیٹ کر سو گئے۔ دوسرے دن کافی دن چڑھے ہم سپیروں کے ہی بھیس میں گومل واڑی کیمپ کی طرف چل پڑے۔ بوڑھے کو ہم نے یہ کہا کہ راجہ کے خزانے کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔ قادر نے کہا۔

"بابا! تم ساتھ چلو گے تو جس سانپ نے زمین سونگھ کر خزانے کا پتہ لگانا ہے وہ پٹاری سے باہر نہیں نکلے گا۔ تم گاؤں میں ہی رہو۔ اور فکر نہ کرو اگر خزانہ مل گیا تو ہم تمہیں وہاں لے جا کر خزانہ تمہارے حوالے کر دیں گے اور ہم خزانے کے سانپ لے کر چلے جائیں گے۔"

بوڑھا مطمئن ہوگیا۔ قادر خان ہماری راہ نمائی کر رہا تھا۔ گومل واڑی کیمپ وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا مگر قادر خان ہمیں مختصر پہاڑی راستے سے لے جا رہا تھا۔ یہ سارا علاقہ حبس آلود تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں' جنگلی بیلوں سے ڈھکے ہوئے درخت اور زمین سے نکلے ہوئے بڑے بڑے پتھر تھے جن پر سبز کائی جمی ہوئی تھی کہیں کوئی کھیت نہیں تھا۔ کوئی آتا جاتا دیہاتی بھی ہمیں نہ ملا۔ ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر ہم باہر نکلے تو درختوں کے جھنڈ کے پار سامنے گومل واڑی تربیتی کیمپ تھا۔ پہلی نگاہ میں یہ مجھے جنگی قیدیوں کا کیمپ معلوم ہوا۔ چاروں طرف کانٹے دار تاروں کی اونچی دیوار تھی۔ ایک طرف اونچی مچان پر واچ ٹاور تھا۔ مغربی جانب تین بیرکیں تھیں۔

کیمپ کی طرف سے آدمیوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وزیر علی نے بتایا کہ دہشت گردوں کی ٹریننگ شروع ہوگئی ہے۔ ہم درختوں کے جھنڈ میں ایک جگہ آڑے کھڑے کیمپ کو دیکھ رہے تھے۔ قادر خان

بولا۔

"وزیر بھائی! یہاں تو اپنے سانپوں کی ترکیب ہی کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا طریقہ اختیار کیا تو اس میں دشواریاں پیش آ سکتی ہے۔"

قادر خان کا مشورہ بالکل صورت حال کے مطابق تھا۔ کیونکہ ہم اپنے محدود وسائل اور مختصر اسلحے کے ساتھ کیمپ پر کمانڈو اٹیک نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کے سانپ آپ کو دھوکا بھی دے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس طریق کار سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔"

قادر خان بولا۔ "سانپ آخر سانپ ہوتا ہے۔ کوئی گوریلا تو نہیں ہے کہ ٹارگٹ پر جا کر یا ٹارگٹ مار لے یا خود مر جائے۔ سانپ سے کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہے بہرحال یہ طے شدہ بات ہے کہ ہمیں اپنے سانپوں سے ہی کام لینا پڑے گا۔ چلو واپس چلتے ہیں' جنگل خطرناک ہے۔ کسی طرف سے بھی کوئی درندہ نکل کر حملہ کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس درندے کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے چاقو اور آٹومیٹک پستول موجود ہیں۔"

وزیر علی کہنے لگا۔

"حیدر بھائی! یہاں ہلکے سے ہلکا درندہ بھی نکل کر آیا تو وہ شیر ہی ہو سکتا ہے اور شیر تمہارے آٹومیٹک پستول کی ساری گولیاں کھا کر بھی ہم سے ایک دو کو مار کر ہی مرے گا۔"

ہم واپس مڑ گئے۔ اب قادر خان اور وزیر علی کا مشن شروع ہو گیا۔ قادر خان نے بوڑھے کو جا کر بتایا کہ جنگل میں جا کر پٹاری سے سانپ باہر نہیں نکلا۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"وہ باہر کیوں نہیں نکلا ماندری بھائی؟"

قادر خان نے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے بابا کہ ان سانپوں کو مرد آدمیوں کے پرانے کپڑوں کے سونگھنے کی عادت پڑ گئی ہوئی ہے۔ اگر انہیں اردگرد موجود تمام مرد آدمیوں کے پرانے کپڑے ہمیں کسی طرح لا دو تو ہم اپنے سانپ کو باری باری سارے پرانے کپڑے سنگھائیں گے۔ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ ان پرانے کپڑوں میں سے ایک کپڑا ایسا ضرور ہوگا جس کو سونگھنے سے یہ سانپ جنگل میں جا کر پٹاری سے باہر نکل آئے گا۔ ایک بار یہ پٹاری سے باہر نکل آیا تو پھر زمین سونگھ کر ہمیں بتا دے گا کہ راجہ کا خزانہ کس جگہ پر زمین میں دبا ہوا ہے۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"ماراج یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اپنے یہاں جتنے مرد ہیں میں ان سب کے میلے کپڑے تمہارے پاس لا کر ڈھیر کر دوں گا۔"

وزیر علی نے کہا۔

"لیکن صرف ان کپڑوں سے بات نہیں بنے گی جو لوگ کیمپ میں رہتے ہیں تمہیں ان کے میلے کپڑے بھی لانے ہوں گے کیونکہ ہو سکتا ہے ان مردوں کے کپڑوں میں سے کسی کی بو ہمارے سانپ کو پسند آ جائے اور وہ جنگل میں جا کر پٹاری سے نکل کر خزانے کا سراغ لگا لے۔"

بوڑھا بولا۔ "یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اپنا کلوا دھوبی کیمپ کے سارے مردوں کے میلے کپڑے گھاٹ پر لے جا کر دھوتا ہے۔ میں اس کے جھونپڑے سے میلے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر لے آؤں گا۔"

قادر خان نے کہا۔

"لیکن بابا اس میں ایک بات کی شرط ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ کام بڑے خفیہ طریقے سے ہونا چاہیے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم یہ میلے کچیلے کپڑے ہمارے سانپ کو سنگھانے لے جا رہے ہو اگر یہ راز کسی کو

معلوم ہوگیا تو سانپ پٹاری سے باہر نہیں نکلے گا اور تمہیں راجہ کا خزانہ کبھی نہیں مل سکے گا۔"

بوڑھا ہمارے جھونپڑے میں ہمارے سامنے زمین پر بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابا لوگ کسی کو کاہے کو خبر ہوگی۔ ارے یہ کام میں ایسے کروں گا کہ خود کلوا دھوبی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں اس کا میلے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر لے آیا ہوں۔"

وزیر علی نے کہا۔

"بس پھر سمجھو کہ تمہیں راجہ کا خزانہ مل گیا۔ تمہاری باقی زندگی عیش میں گزرے گی۔"

اس بوڑھے کو دھن دولت کا بڑا لالچ تھا۔ اسی لالچ کی وجہ سے وہ یہ سارے کام کرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ قادر خان نے پوچھا۔

"کلوا دھوبی کس روز کیمپ کے مردوں کے میلے کپڑے دھونے کے لیے لاتا ہے؟"

بوڑھا کہنے لگا۔

سات دنوں میں ایک بار لاتا ہے۔ ابھی تین چار روز پہلے وہ کپڑے دھو کر استری کر کے کیمپ میں دے کر آیا ہے۔ اب دو دن بعد ہی وہاں سے کپڑے لائے گا۔ اتنی دیر میں میں اپنے گاؤں کے مرد لوگوں کے میلے کپڑے لا کر تمہیں دیتا ہوں۔"

وزیر علی نے کہا۔ "سارے میلے کپڑے ایک دم سے مت لانا۔ اس طرح گاؤں والوں کو شک پڑ سکتا ہے۔ تم ایک ایک دو دو کر کے کپڑے لاؤ۔ ہم اپنے سانپ کو سنگھاتے جائیں گے۔"

"جیسے آپ کہتے ہیں ویسے ہی کروں گا۔"

جب بوڑھا چلا گیا تو قادر خان کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کیمپ کے دہشت گردوں اور اسرائیلی اور بنگالی انسٹرکٹروں کے میلے کپڑوں کا تین دن تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"مجبوری ہے۔" وزیر علی نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہمیں کون سی جلدی ہے۔ یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں تین دن اور انتظار کر لیں گے۔"

میں نے کہا۔

"کہیں اس دوران کیمپ سے زیر تربیت دہشت گردوں کی پہلی کھیپ بمبئی کی طرف روانہ نہ کر دی جائے۔"

قادر خان بولا۔ "مجھے بھی یہی فکر ہے۔"

اس نے وزیر علی سے کہا۔

"وزیر بھائی! تمہیں دن میں گومل واڑی کیمپ کا ایک چکر ضرور لگانا پڑے گا۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ دہشت گرد ابھی کیمپ میں ہی ہیں اگر وہ نکلنے والے ہوئے تو ہم کسی دوسرے طریقے سے انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔"

وزیر علی بولا۔ "ٹھیک ہے میں سروے کرتا رہوں گا۔"

شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ کہ لالچی بوڑھا کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھا کر ہمارے جھونپڑے میں آ گیا کہنے لگا۔

"میں گاؤں کے مردوں کا تو ایک ایک میلا کپڑا باندھ کر لے آیا ہوں۔ انہیں تو اپنے سانپ کو سنگھائیں۔"

ہم نے گٹھڑی کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ پرانے میلے کچیلے لنگوٹ تھے۔ ایک دو میلی کچیلی بنیانیں تھیں۔ تین چار گھٹنوں سے اوپر تک باندھی جانے والی میلی دھوتیاں تھیں۔ قادر خان نے ان کپڑوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا! اب تم جاؤ ہم اپنے سانپ کو یہ کپڑے رات کو سنگھائیں

گے۔"

لالچی بوڑھا اپنی آنکھوں کے سامنے یہ کام ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔
"ماندری جی! اگر تم میرے سامنے اپنے سانپ کو یہ کپڑے سنگھاؤ تو میری بڑی تسلی ہو جائے گی۔"

قادر خان نے وزیر علی کی طرف دیکھا۔ وزیر علی نے کہا۔

"ہاں ہاں کوئی حرج نہیں۔ بابا کے سامنے سانپ کو کپڑے سنگھاؤ۔"

قادر خان کونے میں رکھی ہوئی خطرناک زہریلے سانپوں کی پٹاری اٹھا کر لے آیا۔ پٹاری کے گرد لپٹا ہوا کپڑا ہٹایا کہنے لگا۔

پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ بابا۔ یہ سانپ بڑا زہریلا ہے۔ اگر اس نے تمہیں کاٹ کھایا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔"

بوڑھا جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ جھونپڑے میں لالٹین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اور وزیر علی بھی پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ قادر خان نے پٹاری کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اندر سے بالشت بھر کے بارہ تیرہ سانپوں کی پھنکاریں سنائی دیں۔ قادر خان جلدی جلدی ایک میلے کپڑے کو پٹارے کے اوپر لے جاتا۔ کپڑے کو دیکھ کر سانپ اور زیادہ پھنکاریں مارتے۔ اسی طرح اس نے سارے کپڑے پٹاری کے اوپر لے جا کر دوسری طرف ڈال دیے اور جلدی سے پٹاری کو بند کر دیا۔ پٹاری بند ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی۔

قادر خان نے بوڑھے سے کہا۔

"بابا! ہم نے گاؤں کے سارے مردوں کے کپڑے سانپوں کو سنگھا دیے ہیں۔ تم یہ کپڑے واپس لے جا سکتے ہو۔ اب خیال رکھنا جس روز کلوا دھوبی کیمپ کے مرد لوگوں کے اترے ہوئے کپڑے لائے گا تم اسی روز رات کو وہ سارے کپڑے ہماری جھونپڑی میں لے آنا۔"

بوڑھا خوش ہو کر بولا۔

"فکر نہ کرو ماندری جی! وہ کام بھی ہو جائے گا پر ماندری جی! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔"

"کون سی بات کی سمجھ نہیں آئی بابا؟" قادر خان نے پوچھا۔

لالچی بوڑھے نے کہا۔

"تم تو کہتے تھے کہ تمہارے پاس ایک ہی سانپ ہے مگر پٹاری میں سے کتنے ہی سانپوں کی پھنکاریں آ رہی تھیں۔"

قادر خان بولا۔ "ہم سپیرے اپنے پاس ہر طرح کے سانپ رکھتے ہیں۔ ان سانپوں میں وہ سانپ تو موجود ہے جس نے ہمیں خزانے کا سراغ لگا کر بتانا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے ماراج! بالکل ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ لکشمی دیوی! ہم پر اپنی دیا کرنا۔"

لالچی بوڑھے کے جانے کے بعد وزیر علی نے سانس بھر کر کہا۔ "اس بوڑھے نے تو ہمیں خطرے میں ڈال دیا تھا۔ خدا نخواستہ اگر سانپ پٹاری میں سے باہر نکل آتے تو ہم سب مارے گئے تھے۔"

قادر خان نے کہا۔

"ایسا ہو سکتا تھا مگر خدا نے ہمیں بچا لیا۔ کیونکہ ایک بار سانپ پٹاری سے نکل آئے تو پھر میں بھی ان کو کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔ چلو بوڑھے کو تسلی تو ہو گئی۔ بابا لوگ اس بوڑھے کی تسلی ضرور ہونی چاہیے تھی۔ اس نے ہمارے مشن کا راستہ صاف کرنا ہے۔"

ہم اس گاؤں میں رہ رہے تھے۔ سپیروں اور سادھوؤں سے ہندو لوگ ڈرتے ہیں اور ڈر کے مارے ان کی خاطر داری کرتے ہیں۔ سادھوؤں سے انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ کسی بات سے ناراض ہو کر انہیں شراپ یعنی بد دعا نہ دے دیں اور سپیروں مداریوں سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں کسی بات سے ناراض ہو کر سپیرے اپنا کوئی سانپ ان کے پیچھے نہ لگا دیں۔ اس کے علاوہ ہمیں گاؤں کے ایک بوڑھے کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ہماری خوب ٹہل سیوا ہوتی۔ مزید تین دن گزر گئے تو دوپہر کے وقت بوڑھے نے آکر ہمیں بتایا کہ کلوا کیمپ کے میلے کپڑوں کی گٹھڑی گھر لے آیا ہے۔ قادر خان نے پوچھا۔

"بس تم ایسا کرو کہ آج رات میلے کپڑوں کی وہ گٹھڑی ہماری جھونپڑی میں لے آؤ۔ کیا تم کسی کو خبر ہوئے بغیر ایسا کر سکتے ہو؟"

بوڑھے کو راجہ کے خزانے کا لالچ تھا۔ کہنے لگا۔

"کیوں نہیں ماراج! میں آدھی رات کو جب گاؤں کے سارے آدمی سو رہے ہوں گے تو کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر یہاں لے آؤں گا۔"

وزیر علی نے پوچھا۔

"کیا اس گٹھڑی میں کیمپ کے سارے آدمیوں کے اترے ہوئے کپڑے ہیں؟"

بوڑھا بولا۔ "ماراج! وہ سب مردوں کے کپڑے لاتا ہے۔ باقی ایک دو آدمیوں کے رہ گئے ہوں تو میں کہہ نہیں سکتا۔"

قادر خان نے کہا۔ "نہیں بابا۔ یہ بات غلط ہے پہلے تو کلوا دھوبی سے یہ معلوم کرو کہ کیمپ کے سبھی مرد لوگوں کے کپڑے لایا ہے کوئی آدمی رہ تو نہیں گیا۔ کیونکہ اس کے بغیر اپنا کام پورا نہیں ہوگا۔"

بوڑھا کہنے لگا۔ "یہ میں پتہ کرلوں گا ماراج۔ آپ فکر نہ کریں۔"

وہ چلا گیا۔ شام کے وقت ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تو بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا۔

"لو ماراج! یہ کام بھی ہوگیا۔ کلوا سے میں نے پوچھا تو وہ بولا۔ میں تو کیمپ کے سبھی مردو لوگوں کے میلے کپڑے ایک بار ہی لاتا ہوں۔ میں نے پھر پوچھا۔ کلوا کسی مرد لوگ کا پرانا کپڑا وہاں رہ تو نہیں گیا؟" وہ بولا۔

"بھیکو بابا تم اتنا کس لیے پوچھ رہے ہو' کیا بات ہے؟"

اور بوڑھا اپنا بغیر دانتوں والا منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ پھر رازداری سے قادر خان کے قریب ہو کر بولا۔

"فکر نہ کریں ماراج! اس کو میں نے شک نہیں پڑنے دیا۔ بس آج رات کو کپڑوں کا گٹھڑ اٹھا کر یہاں لے آؤں گا۔ یہ شرط بھی آج رات پوری ہو جائے گی۔"

اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ ہم رات کو جاگ رہے تھے۔ ویسے بھی اس جھونپڑے میں حبس اور مچھر ہمیں آدھی رات کے بعد تک جگائے رکھتے تھے۔ ہم جھونپڑی کے کھلے دروازے کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ لالٹین روشن تھی۔ ہم نے گاؤں کے جھونپڑوں کی طرف سے بوڑھے کو آتے دیکھا۔ اس نے ایک گٹھڑ سر پر اٹھا رکھا تھا۔ جھونپڑے کے آگے آکر اس نے کپڑوں کا گٹھڑا زمین پر ڈال دیا اور صافے سے منہ کا پسینہ صاف کرتے ہوئے وہ بھی بیٹھ گیا اور بولا۔

"ماراج! گٹھڑا لے آیا ہوں۔ اب جلدی سے سانپ کو یہ کپڑے سنگھا دیں۔ تاکہ میں واپس لے جا کر کلوا کی جھونپڑی میں رکھ دوں۔"

ہم گٹھڑ کو کھینچ کر جھونپڑی کے اندر لے گئے۔ لالٹین کی روشنی میں اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں کھدر کے کرتے اور پاجامے۔ نیکریں' بنیانیں' چار پرانی پتلونیں' ایک فوجی بش شرٹ اور فوجی خاکی رنگ کی پتلون بھی تھی۔ ہم نے سارے کپڑوں کو گنا وہ کل چودہ جوڑے بنتے تھے یعنی چودہ آدمیوں کے کپڑے تھے۔ وزیر علی نے مجھ سے کہا۔

"کیمپ میں میرے سروے کے مطابق دس دہشت گرد ہیں۔ دو انسٹرکٹر ہیں۔ باقی دو آدمی ہو سکتا ہے نوکر اور باورچی ہوں۔"

قادر خان نے کہا۔ "اب جو کچھ بھی ہو ہمیں نہیں سوچنا چاہیے۔ مجھے ایک ایک کر کے کپڑے پکڑاتے جاؤ۔"

بوڑھا جھونپڑی کے باہر ہی بیٹھا سانس درست کر رہا تھا۔ قادر خان کونے سے سانپوں کی پٹاری اٹھا کر لے آیا۔ اس نے پٹاری کا منہ کھول دیا۔ سانپوں کی پھنکاریں گونج اٹھیں۔ وزیر علی قادر خان کو ایک ایک کر کے کپڑے پکڑاتا جاتا تھا اور قادر خان اس کپڑے کو سانپوں کی پٹاری کے اوپر تھوڑی دیر کے لیے رکھتا پھر دوسری طرف رکھ دیتا۔ اسی طرح جب وہ سارے میلے کچیلے کپڑے سانپوں کو اچھی طرح سے سنگھا چکا تو بولا۔

"یہ کام ختم ہوگیا ہے۔ بوڑھے سے کہو کہ یہ کپڑے اٹھا کر لے جائے۔"

وزیر علی نے بوڑھے کو بلا کر کہا۔

"بابا لوگ! سانپ نے سارے کپڑے لتے سونگھ لیے ہیں۔ انہیں واپس لے جا کر جہاں سے اٹھائے ہیں وہاں رکھ آؤ۔"

بوڑھا بے صبری سے کہنے لگا۔

ماراج! اب خزانے کا پتہ لگانے کل جائیں گے ناں؟"

قادر خان نے کہا۔ "نہیں ہمیں دو دن انتظار کرنا ہوگا۔ کیونکہ خزانے کے جاسوس سانپ کے علاوہ ہم نے یہ کپڑے دوسرے سانپوں کو بھی سنگھا دیے

ہیں۔ اب سارے سانپ آپس میں دو دن مشورہ کریں گے اور جاسوس سانپ کو اپنی طرف سے بھی بتائیں گے کہ خزانہ کہاں زمین میں دبا ہوا ہو سکتا ہے۔"

بوڑھے نے سارے کپڑے اکٹھے کر کے ان کا گٹھڑ بنایا۔ اسے سر پر اٹھایا اور جدھر سے آیا تھا ادھر کو واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"ہم دو دن کس لیے ضائع کریں گے؟"

قادر خان کہنے لگا۔

"میں نے آپ لوگوں کو پہلے بھی بتایا تھا کہ ان سانپوں میں سے کسی کو جب اپنے دشمن کا کوئی اترا ہوا کپڑا سنگھایا جاتا ہے تو اس کپڑے میں دشمن کے بدن کی بو ہوتی ہے۔ سانپ اس بو کو سونگھ کر اپنے ذہن میں رکھتا ہے مگر وہ ہمارے دشمن کو مارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتا۔ جب سانپ کو اس کے بعد دو دن تک بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہے تو اس کے اندر غصے اور بھوک سے شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کو اسی آدمی نے بھوکا رکھا ہوا ہے جس کی اس نے بو سونگھی تھی۔ چنانچہ وہ اس کا جانی دشمن بن جاتا ہے اور تیسرے دن جب ہم سانپ کو چھوڑتے ہیں تو وہ اپنے دشمن کی بو کے پیچھے غضبناک ہو کر جاتا ہے اور وہ جہاں کہیں ہوتا ہے اسے جا کر ڈس دیتا ہے۔"

مجھے یاد آ گیا قادر خان نے یہ نقطہ ہمیں پہلے بھی بتایا تھا۔ ہمیں دو دن تک انتظار کرنا تھا۔ قادر خان نے پٹاری بند کر کے کونے میں رکھ دی اور دو دن تک سانپوں کو دودھ پانی کا ایک قطرہ بھی پینے کو نہ دیا۔ ورنہ وہ ان سانپوں کو دن میں دو تین بار دودھ ضرور پلاتا تھا۔ تیسرے دن جھونپڑے میں سانپوں کی غضبناک پھنکاروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں سانپوں کی بند پٹاری میں سے آ رہی تھے۔ قادری خان نے کہا۔

"سانپ بھوکے پیاسے غضبناک ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے دشمن کو ڈسنے کے لیے تلملا رہے ہیں؟"

وزیر علی نے فوراً کہا۔

"تو پھر چلو۔ ابھی جنگل میں چل کر انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

قادر خان بولا۔ "تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو نا وزیر بھائی؟ دن کے وقت سانپوں کو چھوڑ دیا تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا ایک دو کو کاٹیں گے باقیوں کو کیمپ کے لوگ انہیں مار مار کر کچل دیں گے۔ اس کے لیے ہمیں رات پڑنے کا انتظار کرنا ہو گا۔ ہم آدھی رات کے بعد جائیں گے۔"

وزیر علی نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ارے بھائی! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں پاکستان کے دشمنوں کا فوراً سے پیشتر سر کچل ڈالنا چاہتا ہوں۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بھارت کے مسلمان پاکستان سے اور پاکستان کے مسلمان بھائیوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ وہ انہیں طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی طاقت سے انہیں بھی طاقت ملتی ہے۔ جب وہ پاکستان میں دیکھتے ہیں کہ بھائی بھائی سے لڑ رہا ہے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہا ہے تو انہیں دکھ ہوتا ہے۔ کیونکہ آپس کی منافرت اور نا اتفاقی سے پاکستان کمزور ہو جاتا ہے اور بھارت کے مسلمان پاکستان کو کمزور ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اسے روز بروز طاقتور سے طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ہمیں اب رات پڑنے کا انتظار تھا۔ اس دوران بوڑھا دو تین بار ہمارے پاس آکر پوچھ گیا کہ ہم سانپ کو خزانے کا سراغ لگانے کے واسطے کب جنگل میں لے جا رہے ہیں۔ قادر بھائی نے اسے کہہ دیا کہ سانپ اب بالکل تیار ہے اور کل صبح ہم اسے جنگل میں لے جا رہے ہیں رات کو تھوڑا بہت کھانا کھا کر ہم نے لالٹین کی بتی دھیمی کر دی اور بیٹھ کر باتیں کرتے اور مچھروں کو مارتے

رہے۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو قادر خان بولا۔

"میرا خیال ہے اس وقت تک کیمپ کے سارے لوگ گہری نیند سو چکے ہوں گے۔ دشمن پر شب خون مارنے کے لیے اس سے اچھا وقت اور کوئی نہیں چلو۔"

قادر خان نے سانپوں کی پٹاری کو کپڑے میں اچھی طرح سے لپیٹ کر جھولے میں ڈال لیا۔ بھوکے سانپ بڑے غصے کے ساتھ پھنکاریں مار رہے تھے۔ وزیر علی بولا۔

"خدا خیر کرے۔ کہیں یہ اس جگہ پٹاری کے باہر نہ نکل آئیں۔"

قادر خان نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ یہ اسی جگہ پر پٹاری سے نکلیں گے جہاں میں انہیں نکالوں گا۔"

ہم جھونپڑے سے خاموشی کے ساتھ نکلے اور پیچھے کی طرف سے ڈھلان اتر گومل واڑی کیمپ کی طرف چل پڑے۔ عجیب گیلی گیلی بوجھل بوجھ فضا والی خاموش رات تھی۔ پٹاری میں بند پھنکارتے سانپوں کی آواز ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ہم ایک شارٹ کٹ سے ہو کر اس مقام پر آ گئے جہاں سے ہمیں کچھ فاصلے پر را کے تربیتی کیمپ کی چند اک روشنیاں جھلملاتی صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم رک کر کیمپ کی طرف دیکھنے لگے میں نے قادر خان سے کہا۔

"ہمیں کم سے کم کتنے فاصلے پر سانپوں کو چھوڑنا چاہیے؟"

وہ بولا۔ "چاہے دس میل کے فاصلے پر چھوڑ دیں۔ سانپ اپنے دشمنوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ کیمپ کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر سانپوں کو چھوڑوں۔ اس طرف سے آ جاؤ۔"

ایک چھوٹے سے ٹیلے کو پار کرنے کے بعد ہم کیمپ کے عقب میں آ گئے۔ یہ کیمپ کی بیرکوں کا پچھواڑا تھا۔ بیرکوں کے عقب میں صرف دیوار پر دو تین

بلب روشن تھے۔ کیمپ پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم چلتے چلتے بیرکوں کے اور زیادہ قریب آ گئے۔ اب ہمارے درمیان صرف خاردار دیوار حائل تھی۔ ہم ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ وزیر علی بولا۔ "گشتی سنتری نہ آ جائیں۔"

قادر خان نے کہا۔ "تھوڑا ان کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

ہم نے چھ سات منٹ تک انتظار کیا میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے رات کو کوئی گشتی پارٹی نہیں نکلتی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" قادر خان نے کہا۔ "ہمیں دشمنوں پر حملہ کر دینا چاہیے۔ تم لوگ مجھ سے کم از کم دس قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

ہم دس دس قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اس جگہ ایک بیرک کی دیوار پر جلتے بلب کی روشنی پڑ رہی تھی۔ قادر خان نے جھولے میں سے پٹاری نکالی۔ اس پر لپٹا ہوا کپڑا اتار کر جھولے میں ڈالا اور بند پٹاری کو ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ کانٹے دار تاروں والی دیوار کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ہم اسے بیرک کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ خاردار دیوار کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہاں اونچی جگہ تھی۔ اس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے پٹاری کا منہ کھولا اور سانپوں سے بھری ہوئی پٹاری کو زور سے کانٹے دار تاروں والی دیوار کے اوپر سے اندر کی طرف اچھا دیا۔ پٹاری دیوار کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف جا گری۔ ہم نے سانپوں کی بڑی تیز پھنکاروں کی آواز سنی۔ پھر یہ آواز غائب ہو گئی۔

قادر خان دوڑ کر ہمارے پاس آ گیا۔ ہم کیمپ کی بارکوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قادر خان کہنے لگا۔

"دس کے دس دہشت گرد اگر کیمپ سے کہیں باہر نہیں گئے تو وہ ان بیرکوں میں سو رہے ہوں گے۔ وہ تو تھوڑی دیر میں ختم ہو چکے ہوں گے۔ اگر اسرائیلی اور بنگالی انسٹرکٹر کسی دوسری جگہ سو رہے ہیں تو سانپ ان کو بھی

تلاش کر لیں گے اور وہ بھی زندہ نہیں بچیں گے۔"
وزیر علی نے پوچھا۔ "کیا ہمیں یہاں رہ کر ان دشمنوں کی موت کا انتظار کرنا ہوگا۔"

قادر خان اندھیرے میں مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"تمہارا خیال ہے کہ کیمپ میں سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں گی۔ کوئی واویلا مچے گا؟ لوگ ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکاریں گلے؟ ہرگز نہیں اگر ان میں سے کوئی جاگ نہیں رہا اور اس نے سانپ کو نہیں دیکھ لیا تو پھر یہ کیمپ ایک منٹ بعد قبرستان بن چکا ہوگا اور قبرستان میں کوئی واویلا نہیں مچاتا۔ کوئی ایک دوسرے کو مدد کے لیے نہیں پکارتا۔ سانپوں نے اس کیمپ کے سارے آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا ہوگا۔ اگر اتفاق سے کوئی آدمی کیمپ میں موجود نہیں ہوگا اور کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہوگا تو یہ سانپ اس کی بو پر اس شہر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ اگر راستے میں کسی نے اسے مار نہ دیا یا وہ کسی گاڑی وغیرہ کے نیچے نہ آ گیا تو یقین کرو چاہے سانپ دس دن بعد اس شہر میں پہنچے وہ اس شہر میں پہنچ کر اپنے دشمن کو ضرور ہلاک کر دے گا۔"

گومل واڑی کے اس را کیمپ پر اس طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہلے بھی ایسی ہی خاموشی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ موت کی خاموشی ہے یا نہیں۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"پھر تو یہاں ٹھہرے رہنا بے کار ہے۔ ہمیں واپس گاؤں میں جا کر سو جانا چاہیے۔ اب تو صبح ہی پتہ چلے گا کہ ہمارا مشن کامیاب رہا یا نہیں۔"

وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو واپس چلتے ہیں۔" ہم نے خاموشی سے واپسی کی راہ پکڑ لی۔

اپنی جھونپڑی میں واپس آ گئے تو وزیر علی نے قادر خان سے پوچھا۔
"تم نے تو کہا تھا کہ یہ گیارہ سانپ مجھے اپنے دوست سپیرے کو واپس کرنے ہوں گے مگر وہ تو سارے کے سارے تم نے کیمپ میں ہی چھوڑ دیے۔"
وہ کہنے لگا۔
"بھائی! یہ سارے سانپ اگر میرے پاس نہیں آئے تو یقین کرو میرے دوست سپیرے کی جھگی میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے جب ہم واپس جائیں گے تو سانپ وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔"
میں نے کہا۔ "اب تو صبح ہی پتہ چلے گا کہ کیمپ میں کون زندہ بچا' کون مر گیا۔"
قادر خان نے کہا۔
"بچا وہی ہوگا جو کیمپ میں موجود نہیں ہوگا جو کیمپ میں موجود تھا اور اس کے اترے ہوئے کپڑے سانپوں نے سونگھ لیے تھے تو وہ زندہ نہیں ہوگا۔"
ہم سو گئے صبح لالچی بوڑھے نے ہمیں آ کر جگایا وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔
"ماراج بڑا غضب ہوگیا۔"
"کیا ہوا؟" وزیر علی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔
بوڑھے کے اس جملے سے میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جو میں چاہتا تھا وہ ہوگیا تھا۔ بوڑھا بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کہنے

لگا۔

"ماندری ماراج! ادھر کیمپ میں سارے کے سارے لوگ مرگئے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" قادر نے حیرانی سے پوچھا۔

بوڑھا بولا۔ "ماراج کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سارا گاؤں وہاں گیا ہوا ہے۔ صبح گوالا دودھ لے کر گیا تو کیمپ میں کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔ ماراج اس نے بتایا کہ سب کے جسم پتھر ہوگئے ہیں۔"

"یہ تو برا ہوا۔" میں نے کہا۔ "آخر ہوا کیا؟ کچھ پتہ نہیں چلا۔"

بوڑھا بولا۔ "ماراج! کہتے ہیں کسی نے کھانے میں زہر ملا دیا ہوگا۔ سارے مرگئے ماراج ایک بھی نہیں بچا۔"

"چلو چل کر دیکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر قادر خان جھونپڑی سے نکل گیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ چل پڑے کیمپ میں پہلے سے گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ یہ سب سہمے ہوئے تھے اور کیمپ کے اندر ایک طرف دبک کر کھڑے تھے۔ وہاں نہ کوئی سنتری تھا نہ دہشت گرد تھا نہ نوکر چاکر تھا اور نہ انسٹرکٹر ہی تھا۔ گاؤں کا لالچی بوڑھا اور ایک گوالا اور دھوبی ہمارے ساتھ کیمپ کی بارکوں کی طرف آگئے۔ ہم ایک بیرک میں داخل ہوئے۔ وہاں چارپائی پر تین اور لاشیں پڑی تھیں۔ یہ تین دہشت گرد تھے۔ دوسری بارک میں گئے وہاں چار لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسم ہم نے چھو کر دیکھے پتھر کی طرح سخت ہوگئے تھے۔ قادر خان نے ہمیں رازداری سے لاشوں کے جسم پر وہ چھوٹے چھوٹے نشان دکھائے جہاں سانپوں نے انہیں کاٹا تھا۔ یہ نشان لاش کی گردن پر تھا۔ کسی کے ٹخنوں پر اور کسی کے بازو پر تھا یہ لوگ بنیانیں اور نیکریں پہن کر سوئے تھے۔ تیسری بیرک میں بھی تین لاشیں پتھر بنی پڑی تھیں۔ میں نے وزیر علی کے کان میں کہا۔

"دہشت گرد تو دس کے دس مارے گئے ہیں باقی اسرائیلی اور ہندو

انسٹرکٹر کی لاشیں نظر نہیں آ رہیں۔"

گوالے نے کہا۔

"ماراج ایک لاش مچان کے اوپر سنتری کی ہے جو رات کو پہرہ دے رہا تھا۔ رسوئی میں بھی دو لاشیں پڑی ہیں۔ ایک رسویا کی لاش ہے دوسری لاش جمعدار کی ہے جو رات کو رسوئی میں ہی سوتا تھا۔"

کلوا دھوبی بولا۔ "وہ سامنے والی چھوٹی بیرک میں بھی ایک لاش پڑی ہے۔"

ہم چھوٹی بیرک میں آ گئے۔ یہاں پلنگ پر مچھر دانی لگی ہوئی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ مسہری کے اندر ایک لاش پڑی تھی۔ یہ ہندو انسٹرکٹر کی لاش ہی ہو سکتی تھی۔ اس کی تصدیق گوالے نے کر دی۔ کہنے لگا۔

"ماراج! یہ فوجی یہاں دوسرے جوانوں کو قواعد اور چین ماری سکھاتا تھا۔"

میں نے قادر خان کے کان میں سرگوشی کی۔

"اسرائیلی انسٹرکٹر کی لاش کہیں دکھائی نہیں دیتی۔"

قادر خان نے گاؤں کے لوگوں سے باہر آ کر پوچھا۔

"بابا لوگو! کیا اس کیمپ میں اتنے ہی لوگ تھے۔"

ایک نوجوان نے کہا۔

"ماراج اتنے ہی لوگ تھے۔ ہاں ایک گورا فوجی بھی قواعد سکھاتا تھا۔ وہ پتہ نہیں کہیں چلا گیا ہو گا۔ اس کی لاش ہم نے بھی یہاں کہیں نہیں دیکھی۔"

ہم نے فکرمند نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسرائیلی انسٹرکٹر کیمپ میں موجود نہیں تھا۔ وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ میں نے گوالے سے پوچھا۔

"کیا تم نے کل گورے فوجی کو کیمپ میں دیکھا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔

"ماراج! کل مجھے وہ کیمپ میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دن نکلے کیمپ
ں دودھ لے کر آتا ہوں۔ اس وقت فوجی پریڈ کر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں
ورا فوجی نہیں تھا۔"

میں نے قادر خان سے کہا۔

"واپس چلتے ہیں۔"

قادر خان نے گاؤں کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"بھائیو! اس کیمپ میں یا تو کوئی وبا پھوٹ پڑی ہے یا پھر ان لوگوں کے
کھانے میں کوئی زہریلا سانپ بھی پکھل گیا ہوگا۔ جس کے زہر سے یہ سارے کے
سارے مارے گئے۔ اب آپ لوگ گاؤں چلے جاؤ۔ ہم لوگ شہر جاتے ہیں وہاں
پولیس کو خبر کر دیں گے۔ پولیس آکر خود ہی پتہ چلا لے گی کہ یہ لوگ کیسے مر
گئے۔"

گاؤں کے لوگ وبا کا سن کر پریشان ہو گئے۔ ایک بوڑھے نے پوچھا۔

"ماراج! یہ وبا ہمارے گاؤں میں تو نہیں آئے گی۔"

قادر خان بولا۔

"اگر اس وبا نے گاؤں میں آنا ہوتا تو اب تک آ گئی ہوتی۔ تم اطمینان
سے رہو اور پھر یہ وبا کا اثر نہیں ہے۔ مجھے وشواش ہے کہ ان لوگوں کے کھانے
میں کوئی زہریلا سانپ پک گیا ہوگا۔ یہ سانپ کے زہر سے مرے ہیں۔"

ہم واپس گاؤں کی طرف چلے تو لالچی بوڑھا ہمارے پاس آگیا۔ اس نے
قادر خان کے قریب ہو کر کہا۔

"ماراج! خزانے کا پتہ چلانے کب جائیں گے؟ آپ کہیں شہر تو نہیں جا
رہے؟"

قادر خان نے مسکرا کر کہا۔

"بابا لوگ! تم خوامخواہ کیوں پریشان ہوتا ہے ابھی ہم شہر نہیں جائیں گے۔ ہم راجہ کے خزانے کا پتہ چلا کر ہی شہر جائیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم اپنے جاسوس سانپ کو لے کر جنگل میں جائیں گے۔ ہاں۔"

جھونپڑی میں آتے ہی وزیر علی کہنے لگا۔

"وہ اسرائیلی انسٹرکٹر بچ کر نکل گیا۔ یہ بہت برا ہوا۔ اصلی آدمی تو وہی ہے جو دہشت گردوں کو تخریب کاری کی ٹریننگ دیتا ہے۔"

قادر خان نے کہا۔

"مجھے یقین ہے ایک سانپ اس کی بو پر اس کی تلاش میں نکل چکا ہوگا۔ اسرائیلی انسٹرکٹر جہاں کہیں بھی ہوگا سانپ اس کا کام تمام کر کے ہی واپس آئے گا۔

میں نے کہا۔ "اگر اسرائیلی انسٹرکٹر دلی گیا ہوا ہے یا بمبئی گیا ہوا ہوگا تو بالشت بھر کا سانپ اتنا فاصلہ کیسے طے کرے گا؟ وہ تو بمبئی اور دلی پہنچنے سے پہلے ہی کہیں نہ کہیں لوگوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

قادر خان بولا۔

"تم ان خاص سانپوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو۔ یہ بالکل انسانوں کی طرح جاسوسی کرتے ہیں۔ یہ جب اپنے دشمن کی کھوج میں نکلتے ہیں تو اکثر راتوں کو سفر کرتے ہیں کیونکہ ایک تو سانپ رات کے اندھیرے میں ہی راستہ دیکھ لیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان سانپوں نے دشمن کا کوئی کھرا یعنی اس کے پاؤں کا نشان تو دیکھنا نہیں ہوتا کہ وہ اس طرف گیا ہے۔ کسی سے دشمن کے بارے میں پوچھنا بھی نہیں ہوتا یہ سانپ کو دشمن کی بو پر جا رہے ہوتے ہیں جو انہیں سینکڑوں میل سے بھی آ جاتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اسرائیلی انسٹرکٹر اس سانپ سے بچ نہیں سکے گا جو اس کے پیچھے لگ چکا ہے۔"

وزیر علی نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارا یہ سانپ اسرائیلی انسٹرکٹر کی بو لیتا دلی پہنچ جائے تو اسرائیلی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کسی دوسرے شہر چلا جائے یا واپس بھوپال آ جائے اور وہاں سے گومل واڑی تحقیقات کرنے آ جائے پھر یہ سانپ کیا کرے گا؟"

قادر خان کہنے لگا۔

"بھائی! یہ سانپ ہوائی جہاز کی بلندی سے بھی دشمن کی بو پا لیتے ہیں۔ اگرچہ اسرائیلی دلی سے بھوپال یا بمبئی جائے گا تو سانپ بھی اسی طرف روانہ ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ اس سانپ نے بھی اب اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے کہ اپنے اس دشمن کو ہر حالت میں ڈسنا ہے جس نے اسے دو دن بھوکا رکھا تھا اور جس کے کپڑوں سے اس نے اس کے جسم کی بو سونگھ لی تھی۔ ہاں اگر اس آنے جانے میں اگر سانپ کہیں مارا جاتا ہے تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ رہا تو سال گزر جائے چاہے دو سال گزر جائیں یہ اپنے دشمن اسرائلی انسٹرکٹر کو ہلاک ضرور کرے گا۔"

وزیر علی بچ کر نکل جانے والے اسرائیلی انسٹرکٹر کے بارے میں زیادہ فکر مند تھا۔ وہ بار بار ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہتا۔

"اس کافر اور مسلمانوں کے ازلی دشمن کا بچ کر نکل جانا ہماری بہت بڑی ناکامی ہے۔ یہودی تو شروع ہی سے مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں یہ یہودی تو خاص طور پر پاکستان کے خلاف بھارتی دہشت گردوں کو ٹریننگ دینے کے لیے اسرائیل سے منگوایا گیا تھا۔ یہ دہشت گرد مر گئے ہیں تو وہ کسی دوسرے ٹریننگ کیمپ میں ٹریننگ دینی شروع کر دے گا۔ اصل میں تو اس زہریلے درخت کی جڑ کاٹنا ضروری ہے۔"

قادر خان نے کہا۔

"وزیر بھائی! اس یہودی کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں بھی سوچ لیں

گے۔ ایک سانپ تو اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ پہلے ہمیں یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر پولیس وغیرہ آگئی تو ہم سے بھی ضرور پوچھ گچھ کرے گی اور ہمارے پاس پستول بھی ہیں اور کمانڈو چاقو بھی ہیں۔"

وزیر علی نے بے دلی سے کہا۔

"بھائی نکل چلو۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہاں ڈیرا جما کر بیٹھے رہو۔"

لالچی بوڑھا اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور بڑے اطمینان سے جھونپڑے سے نکل کر جنگل میں ایک طرف چل پڑے۔ اس یہودی انسٹرکٹر کا نام ہم نے گوالے سے معلوم کر لیا تھا۔ وہاں اسے جوزف صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ہمارا گومل واڑی والے را کے پاکستان دشمن تربیتی کیمپ کا مشن ختم ہوگیا۔ صرف اس کے اسرائیلی ایجنٹ جوزف کو ختم کرنا باقی تھا۔ وہ ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔ قادر خان کا خیال تھا کہ اس کا سانپ اسے ایک نہ ایک دن ضرور ہلاک کر دے گا مگر میرا اور وزیر علی کا خیال تھا کہ بالشت بھر کا سانپ گومل واڑی سے دلی تک سینکڑوں میل کے جنگل میدان دلدلیں' دریا' ندی نالے اور شہر پار نہ کر سکے گا اور راستے میں ہی مارا جائے گا۔

ہم جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ قادر خان ہمیں جنگل کے مختصر ترین راستوں پر لیے جا رہا تھا۔ جنگل کے یہ راستے اس کے خیال میں خطرناک نہیں تھے۔ اس کے باوجود ہم چوکنے ہو کر چل رہے تھے۔ کیونکہ اس جنگل میں خونخوار درندے اور زہریلے حشرات الارض کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ہم گومل واڑی کے ریلوے سٹیشن کو اپنی دائیں جانب چھوڑتے ہوئے آگے.نکل گئے اور وہاں سے دور پیچھے اسی ریلوے سٹیشن پر آ گئے جہاں سے ہم اتر کر گومل واڑی کے گاؤں میں آئے تھے۔ وہاں پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ یہاں سے ہمیں شام کے وقت بھوپال جانے والی گاڑی ملی جس نے ہمیں رات کے وقت بھوپال پہنچایا۔ بھوپال سے ہم دوسری گاڑی میں سوار ہوگئے اور دوسرے دن آدھی رات کو اس سٹیشن پر اتر پڑے جہاں سے ہماری حویلی والی پناہ گاہ کو جنگل اور پہاڑیوں میں سے راستہ جاتا تھا۔ یہاں ہماری گاڑی اسی جگہ پر موجود تھی جہاں ہم اسے چھپا کر گئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور حویلی والی پناہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ باقی کی رات ہم صبح تک گہری نیند سوئے۔

اٹھے تو کافی دن نکل آیا تھا۔ اپنے سپیروں والے کپڑے ہم نے رات کو ہی بدل ڈالے تھے۔ چاند بائی ہمارے لیے چائے وغیرہ تیار کر کے لے آئی۔ وزیر علی کہنے لگا۔

"اس یہودی انسٹرکٹر کو ٹھکانے لگانا ہمارا فرض ہے جو بھارتی دہشت گردوں کو پاکستان میں جا کر تخریب کاری کی تربیت دیتا ہے۔ وہ ہمارے اور

پاکستان کے لیے دہشت گردوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس کو ٹھکانے لگانا بہت ضروری ہے۔"

جب قادر خان نے کہا کہ سانپ اسے اپنے آپ ہلاک کر دے گا تو وزیر علی نے جھنجلا کر کہا۔

"میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ خارج از امکان بات ہے۔ اگر وہ گومل واڑی کیمپ میں ہوتا تو سانپ اسے ضرور ہلاک کر دیتا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ دلی بیٹھا ہوا ہے بہت ممکن ہے سانپ ابھی مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں ہی ہو اور یہودی انسٹرکٹر دلی سے بمبئی پہنچ جائے۔"

میں نے ان دونوں کی توجہ اس سے بھی اہم مسئلے کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہودی انسٹرکٹر کے مشن کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر کے مراد آباد کے جنوب میں سمبل کے ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس میں جو را کا دوسرا تربیتی کیمپ ہے اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ اس تربیتی کیمپ میں بھارتی پنجاب اور اتر پردیش کی پیشہ ور لڑکیوں کو دہشت گردی کی تربیت دے کر پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور یہ پیشہ ور لڑکیاں مسلمان بن کر پاکستان کی اونچی سوسائٹی میں گھس کر بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔"

وزیر علی نے قادر خان سے کہا۔

"مراد آباد میں اپنا ایک آدمی تو موجود ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے اور ہمیں اس کیمپ کے بارے میں مکمل تفصیلات مہیا کر سکتا ہے۔"

قادر خان کہنے لگا۔

میرا خیال ہے ہمیں اب را کے اس دوسرے ٹریننگ سنٹر کی طرف توجہ دینی چاہیے۔"

وزیر علی بولا۔ "میری تجویز یہ ہے کہ تم اور حیدر علی یہاں سے مراد آباد

کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں یہاں رہ کر یہودی انسٹرکٹر کے بارے میں سراغ لگانے کی کوشش کروں گا کہ وہ مرگیاہے کہ زندہ ہے۔ اگر زندہ ہے تو اس کی تازہ سرگرمیاں کیا ہیں۔"

میں نے اور قادر خان نے اس پر اتفاق کیا۔ طے یہ پایاکہ وزیر علی اسی جگہ رہ کرگومل واڑی اور بمبئی کا چکر لگاتا رہے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہودی انسٹرکٹر جوزف کس حال میں ہے۔ اگر سانپ نے اسے ہلاک نہیں کیا توکیاگومل واڑی کیمپ میں اس نے را کی مدد سے دہشت گردوں کو دوبارہ ٹریننگ دینی شروع تو نہیں کر دی۔ جبکہ میں اور قادر خان وہاں سے اپنے نئے مشن پر مراد آباد کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

میں نے قادر خان سے دریافت کیاکہ مراد آباد میں جو اپنا آدمی ہے وہ اس کیمپ کے سلسلے میں ہماری کہاں تک راہ نمائی کر سکے گا۔ قادر خان نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہو سکے گا پہلے تو یہ معلوم کرنا ہوگاکہ ان پیشہ ور عورتوں کو کس قسم کی دہشت گردی کی ٹریننگ دی جانے والی ہے۔"

میں نے کہا۔

"انہیں بم لگانے یا بازاروں اور چوراہوں میں سر عام فائرنگ کرنے کی ٹریننگ نہیں دی جائے گی۔ انہیں ایک تو پاکستانی جاسوسی کی تربیت دی جائے گی اور دوسرے پاکستان کے نو دولتیے طبقے میں گھل مل کر پاکستان منافرت اور بد امنی کی فضا پیدا کرنے اور پاکستان کے دفاعی راز معلوم کرنے کے سلسلے میں تیار کیا جائے گا۔"

وزیر علی بولا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ان عورتوں کو اسی کیمپ میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان تمام پیشہ ور عورتوں یا

لڑکیوں کی تصویریں اور مکمل تفصیلات پاکستان کی انٹیلی جینس کو پہنچا دی جائیں تاکہ جب یہ عورتیں ٹریننگ کے بعد پاکستان سمگل کی جائیں تو پاکستان انٹیلی جینس انہیں بارڈر کراس کرتے ہی گرفتار کر لے۔"

قادر خان نے اس کے جواب میں کہا۔

"اس میں اس بات کا امکان ہے کہ ساری کی ساری عورتیں ایک دم نہ پکڑی جا سکیں۔ کیونکہ ظاہر ہے انہیں ہجوم کی شکل میں کسی ایک جگہ سے بارڈر کراس نہیں کرایا جائے گا۔ اس میں خطرہ ہے کہ دو ایک تو گرفتار کر لی جائیں مگر باقی روپوش ہونے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس کے بعد انہیں تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ اپنی ایک دو ساتھیوں کی گرفتار کے بعد یہ لڑکیاں محتاط ہو جائیں گی اور ان کے ماسٹر سپاہی بھی انہیں کچھ دیر کے لیے انڈر گراؤنڈ کر دیں گے۔"

بات بڑی معقول تھی۔ میں نے کہا۔

"تو پھر کیا طریق کار اختیار ہمارے لیے بہتر ہوگا؟"

قادر خان نے کہا۔ "اس کا فیصلہ تو مراد آباد میں اپنے آدمی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔"

مراد آباد کے اس آدمی کے بارے میں میں تفصیل سے کچھ بیان نہیں کروں گا۔ اس کا حلیہ نہیں بتاؤں گا۔ یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ کاروبار کیا کرتا تھا اور جہاں وہ رہتا تھا اس کا محل وقوع بھی بیان نہیں کروں گا۔ آپ اس کا کوئی فرضی نام رکھ لیں۔ چلیں اس کو نواب صاحب کہیں گے۔ یہ آدمی بہت امیر کبیر شخص تھا۔ مراد آباد خاص کا رہنے والا نہیں تھا۔ مگر میں نے اس لیے اس کی اصلی جائے رہائش کا نام نہیں لکھا کہ انڈین انٹیلی جینس کو معلوم نہ ہو جائے۔ یہ شخص پاکستان کا عاشق اور بھارت کے مسلمانوں کا سچا غم خوار اور ان کی ترقی اور فلاح کے لیے ہر لمحے ظاہری طور پر اور خفیہ طور پر کام کرنے والا

آدمی تھا۔ اب میں اسے نواب صاحب کے نام سے ہی یاد کروں گا۔ نواب صاحب کے ہاں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ کوٹھی کیا تھی، چھوٹا سا محل تھا۔ بھارت کے کونے کونے میں جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی فلاحی انجمن بھی تھی تو نواب صاحب کی طرف سے انہیں ہر ماہ ایک کثیر رقم باقاعدہ ملتی تھی۔

وزیر علی قادر خان اور رمضان بھائی کی خفیہ تنظیم کا بھی نواب صاحب سے رابطہ تھا اور نواب صاحب بھارت میں مسلمانوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی تنظیم کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ قادر خان نے مجھے بتایا کہ نواب صاحب پاکستان کو اسلام کا حقیقی معنوں میں قلعہ کہتے ہیں۔ صرف پاکستان کے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی وہ پاکستان کا قلعہ کہتے ہیں اور پاکستان کا نام آتے ہی ان کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور کہا کرتے ہیں کہ پاکستان بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو اسلام کی سربلندی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے رونما ہوا ہے۔ یہ باتیں سن کر مجھے نواب صاحب سے ملنے کا بے حد شوق پیدا ہوگیا۔ میں انہیں پہلی فرصت میں ملنا چاہتا تھا۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق وزیر علی تو وہیں جنگل والی پرانی حویلی میں اور قادر خان ایک روز مراد آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ مراد آباد کا شہر بھارت کے صوبہ اترپردیش یعنی پرانے یوپی میں واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں کی بھی کافی آبادی ہے اور ہندو بھی بھاری تعداد میں رہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی کئی تاریخی اور عالی شان مسجدیں بھی ہیں اور ہندوؤں کے مندروں کی تعداد تو بے شمار ہے۔ آزادی ملنے کے بعد سے یہاں بھی ہندوؤں نے اپنی مسلم دشمن دل آزار سرگرمیوں سے مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کیا ہوا ہے۔ اگرچہ مراد آباد کے بہادر مسلمان متعصب ہندوؤں کا ہر موقع پر ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں لیکن چونکہ حکومت ہندوؤں کی ہے اس لیے وہ بے بس ہیں۔ یہاں بھی اعلیٰ سرکاری

ملازمتوں میں مسلمانوں کو کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ ہر کلیدی آسامی پر ہندو یا سکھ تعینات ہیں۔ مراد آباد کے برتن مشہور ہیں۔ ان تانبے کے برتنوں پر مسلمان کاریگر حیرت انگیز نقاشی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان بھی ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں اور قادر خان مراد آباد کے سٹیشن سے اتر کر سیدھے نواب صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے میں آپ کو یہ بالکل نہیں بتاؤں گا کہ نواب صاحب کی کوٹھی یا حویلی یا مکان مراد آباد میں کس مقام پر واقع تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ ہم مراد آباد شہر کے آس پاس کے علاقے میں تھے۔ نواب صاحب گھر پر ہی تھے۔ ہمیں بڑے تپاک سے ملے۔ جب قادر خان نے میرا ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ میں بھارت اور پاکستان کے مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لیے کام کر رہا ہوں اور محب وطن پاکستانی ہوں اور اپنے طور پر پاکستان کی سلامتی کے مشن پر بھارت آیا ہوں تو وہ مجھ سے گلے لگ کر ملے۔

"جزاک اللہ! جزاک اللہ! بھائی تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ خدا پاکستان کو تاقیامت آباد رکھے اور دشمن اس سے منہ کی کھائیں۔ ایک بار پھر مجھ سے لگ لگے کر ملو۔"

انہوں نے دوبارہ مجھے گلے لگا لیا۔ حویلی کے ساتھ ہی نواب صاحب کا ایک چھوٹا سا مہمان خانہ تھا۔ ہمیں وہاں ٹھہرایا گیا۔ ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ اس کے بعد نواب صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کس مشن پر آیا ہوں تو وہ ہماری باتیں بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر کہا۔

"میاں قادر خان اور حیدر علی! یہ ساری کارستانیاں اس ناپاک تنظیم را کی ہیں جس کی مدد سے بھارت کی سرکار پاکستان کے لوگوں اور حکومت کو سکھ کا سانس نہیں لینے دے رہی۔ پاکستان میں ساری دہشت گردی را کے آدمی ہی

بھارت کی شہ پا کر کر رہے ہیں۔ اب جو پاکستان میں تخریب کاری اور پاکستان کی فوجی دفاعی تنصیبات کی جاسوسی اور وہاں انتشار پھیلانے کے لیے اترپردیش اور پنجاب سے پیشہ ور عورتیں ٹرینڈ کر کے بھیجی جا رہی ہیں تو یہ را کے اس ناپاک منصوبے کا ایک شاخسانہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم بھارت کے اس ناپاک منصوبے کو ہر حالت میں ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ یہ منصوبہ انتہائی خفیہ طور پر بنایا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے پاکستان سمگل کی جانے والی پیشہ ور ہندو اور سکھ لڑکیوں کو پاکستان کی اونچی سوسائیٹی میں گھومنے پھرنے کی تربیت دی جائے گی۔ ابھی یہ منصوبہ ہماری اطلاع کے مطابق ابتدائی مرحلے میں ہے۔"

نواب صاحب بڑے غور سے میری گفتگو سن رہے تھے۔ جب میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا تو انہوں نے کہا۔

"بھائی حیدر علی! آپ لوگ اطمینان رکھیں میں اس سلسلے میں ساری معلومات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ احتیاط کے طور پر آپ کو اپنی حویلی کی بجائے اپنے جنگل والے مکان میں منتقل کر دوں۔"

قادر خان بولا۔ "آپ کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔"

نواب صاحب کہنے لگے۔

"اگرچہ میں ہندوؤں کی فلاحی تنظیموں کو بھی ہر سال چندہ دیتا ہوں لیکن چونکہ میں مسلمانوں کی فلاحی انجمنوں کی بھی سرپرستی کرتا ہوں اس لیے بھارت سرکار کی اور یہاں کی پولیس انٹیلی جینس کی نظروں میں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری نگرانی ضروری ہوتی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری حویلی میں رہنے کی بجائے میرے جنگل والے کاٹج میں کچھ دن قیام کریں۔ قادر خان تم تو میرے جنگل والے کاٹج سے واقف ہی ہو۔"

قادر خان نے کہا۔

"کیوں نہیں نواب صاحب! میں وہاں کئی دفعہ جا چکا ہوں۔"

"بس آپ لوگ آج ہی وہاں چلے جائیں۔ وہاں میرا ملازم موجود ہے۔ کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ اتنی دیر میں میں را کے اس ناپاک منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کار آمد معلومات حاصل ہوئیں میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

ہم تیسرے پہر مراد آباد شہر سے نواب صاحب کے جنگل والے کاٹج کی طرف روانہ ہوگئے۔ مراد آباد شہر سے ایک مین لائن رام پور' بریلی' لکھنؤ سے ہوتی ہوئی بنارس اور کلکتے کو جاتی ہے۔ یہاں سے ایک برانچ لائن سمبل اور بدایوں کی طرف نکل جاتی ہے ہم نے مراد آباد پہنچ کر اسی برانچ لائن کی ایک گاڑی پکڑی اور سمبل کے سٹیشن پر اتر گئے۔ یہ چھوٹا سا برانچ لائن کا سٹیشن جنگل میں واقع تھا۔ قادر خان کو نواب صاحب کے کاٹج کا راستہ معلوم تھا۔ ہم ایک بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بیل گاڑی جنگل میں چل پڑی۔ چھ سات میل کے سفر کے بعد ایک نہر آ گئی۔ نہر کے کنارے کنارے آموں کے باغ تھے۔ آموں کا موسم نہیں تھا۔ اس لیے باغ ویران پڑے تھے۔ رکھوالے اور ٹھیکیداروں کے آدمیوں کی جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں۔

ان باغوں کی دوسری طرف نہر کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر جنگل کے ریسٹ ہاؤس کی طرز کی ایک بوسیدہ سی کوارٹر نما عمارت کھڑی تھی جس کی کھپریل کی ڈھلواں چھت ایک طرف سے جنگل بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہمارے مخبر نے ہمیں پہلے جو معلومات فراہم کی تھیں ان کے مطابق را کے پیشہ ور لڑکیوں والا ٹریننگ سنٹر سمبل ہی کے جنگل میں کسی جگہ پر تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ٹریننگ کیمپ اسی جنگل کے شمال مشرق میں ہاپڑ برانچ کی بڑی نہر کے پاس کسی خفیہ مقام پر واقع ہے۔ یہ اطلاع ہمیں مراد آباد میں ہی مل گئی تھی۔ ہم

نے اس کا ذکر نواب صاحب سے نہیں کیا تھا۔ یہ نواب صاحب کا کاٹج تھا۔ جب کبھی وہ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے آتے تو اسی کاٹج میں قیام کرتے تھے۔ یہاں ایک ملازم مستقل طور پر رہتا تھا جو نواب صاحب کا پرانا ملازم تھا۔ وہ ہمیں کاٹج میں مل گیا۔ بوڑھا آدمی تھا اس نے ہمارے لیے کمرہ کھول دیا۔ ہمیں چائے بنا کر دی اردگرد گھنا جنگل تھا۔ شمال کی طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو اوپر پیلی بھیت کے جنگلوں سے جا ملتا تھا۔

ہمیں یہاں رہتے ہوئے دو دن گزرے تھے کہ تیسرے دن دوپہر کے بعد نواب صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔

"را کا ٹریننگ کیمپ یہاں سے شمال کی طرف بدایوں ہاڑ برانچ نہر کے پار جنگل میں کسی جگہ پر ہے۔ جالندھر امرتسر سے چار اور دو لڑکیاں انبالے سے کیمپ میں پہنچ گئی ہیں۔ ایک اسرائیلی انسٹرکٹر جس کا نام جوزف ہے ان لڑکیوں کو چھوٹے بڑے ہتھیار چلانے، بم بنانے، بم بلاسٹ کرنے کی ٹریننگ دیتا ہے۔ بمبئی کی ایک تجربہ کار، فیشن ایبل عورت ان لڑکیوں کو اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے اور مردوں کو اپنی اداؤں اور عشوہ طرازیوں سے رام کرنے کے گر سکھاتی ہے۔"

اسرائیلی انسٹرکٹر جوزف کا نام سن کر میں اور قادر خان چونک پڑے تھے۔ گویا یہ یہودی ابھی تک زندہ تھا اور قادر خان کے سانپ نے اسے کاٹا نہیں تھا۔ ہم نے اس بارے میں نواب صاحب سے نہ پہلے کوئی بات کی تھی نہ اس وقت ان پر کچھ ظاہر کیا تھا۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ میں نے نواب صاحب سے پوچھا۔

"یہاں اسلحہ وغیرہ کی کیا پوزیشن ہے؟"

نواب صاحب بولے۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنے خاص آدمی کو تمہارے پاس بھیج دیتا ہوں میرا خیال ہے اسے ان ساری باتوں کی تفصیل معلوم ہوگی اگر

معلوم نہیں ہوگی تو وہ یہ تفصیلات معلوم کر لے گا۔"

اسی شام نواب صاحب واپس چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! تمہارے سانپ نے تو اپنا کام نہیں دکھایا۔ یہودی انسٹرکٹر ابھی تک زندہ ہے۔"

قادر خان بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ سانپ اس یہودی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ وقت لگ جائے لیکن اگر سانپ ابھی تک زندہ ہے تو وہ اس یہودی کو چھوڑے گا نہیں۔"

دوسرے روز شام کے وقت نواب صاحب کا خاص آدمی آگیا۔ درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ چائے تیار تھی۔ ہم کاٹج کے عقبی برآمدے میں بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اس آدمی کا نام احمد میاں تھا۔ احمد میاں کہنے لگا۔

"ٹریننگ کیمپ میں اتنا ہی اسلحہ ہوتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ہفتے میں تین بار ایک فوجی ٹرک اسلحہ کی سپلائی لے کر آتا ہے۔ اس وقت وہاں سات لڑکیاں ہیں۔ چار لڑکیاں جالندھر امرتسر کی ہیں۔ تین لڑکیاں انبالے کی ہیں۔ یہ اونچی سوسائیٹی کی طوائفیں ہیں جن کا کام اعلیٰ سرکاری افسروں کا جی لبھا کر اپنے ایجنٹوں کو ٹھیکوں وغیرہ کا کام دلوانا ہوتا ہے۔ اس کے عوض وہ ٹھیکیداروں سے کمیشن وصول کرتی ہیں۔ یہ پڑھی لکھی فیشن ایبل لڑکیاں ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیمپ میں ان کی رہائش کا کیا انتظام ہے؟"

احمد میاں نے کہا۔

"یہ ٹریننگ کیمپ ان ضروریات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔ جنگل کی پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ کیمپ آمنے سامنے تین بیرکوں پر مشتمل ہے۔ ایک بیرک

میں یہ ساری لڑکیاں رہتی ہیں۔ بھارت کی سرکار نے را کے پاکستان دشمن منصوبوں کی خاطر ان پیشہ ور طوائفوں کو بھاری رقم پیشگی دے کر ملازم رکھا ہے۔ جب انہیں پاکستان میں تخریب کاری اور جاسوسی کے لیے سمگل کیا جائے گا تو انہیں اسلام آباد کے بھارتی سفارت خانے سے بھی روزانہ کافی رقم ملا کرے گی اور انہیں اجازت ہوگی کہ اس کے علاوہ بھی وہ جتنا چاہیں خرچ کریں۔ انہیں اس بات کی بھی ضمانت دی گئی ہے کہ ان سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جائے گا جس میں ان کی جان کو خطرہ ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو وہ کسی خاص جگہ پر صرف بم رکھ کر آ جائیں گی جو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ زیادہ تر ان کا کام اونچی سوسائٹی میں گھل مل کر پاکستان کے بعض فوجی راز معلوم کرنا ہوگا۔"

میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! یہ عورتیں پاکستان کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتی ہیں۔ انہیں پاکستان پہنچنے سے پہلے اسی جنگل میں ختم کرنا ہوگا۔"

قادر خان بولا۔ "ایسا ہی کریں گے تم فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد قادر خان نے احمد میاں سے کچھ مزید ضروری معلومات حاصل کیں اور اسے واپس مراد آباد بھیج دیا۔ اب ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ قادر خان کہنے لگا۔

"ہمارے پاس وہ خاص سانپ بھی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو ہم ان کی مدد سے ان پاکستان دشمن عورتوں کو یہودی انسٹرکٹر سمیت ہمیشہ کی نیند سلا سکتے تھے۔ اب ہمیں کوئی دوسری سکیم سوچنی پڑے گی۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں یہ پوائنٹ پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ہمارا مشن صرف ان لڑکیوں کو ہلاک کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اصل مشن یہ ہے کہ ان کی ہلاکت سے اس قدر دہشت پیدا ہو جائے کہ آئندہ بھارت کی کوئی عورت تخریب کاری یا جاسوسی کے

مشن پر پاکستان جانے کے لیے تیار نہ ہو۔"

"یہی سب سے اہم بات ہے۔" قادر خان بولا۔ "یہی سوچنے کی بات ہے۔"

سورج غروب ہو رہا تھا ہم نہر کی طرف نکل گئے۔ نہر کنارے دور تک چلتے گئے۔ سوچ بھی رہے تھے کوئی سکیم ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ پیشہ ور لڑکیوں کی ٹریننگ شروع ہو چکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ پندرہ بیس دن کی ٹریننگ کے بعد انہیں پاکستان سمگل کر دیا جائے گا۔ ایک بار وہ پاکستان سمگل ہوگئیں تو پھر ان کا پیچھا کرنا اور ایک ایک کو تلاش کر کے انہیں ہلاک کرنا مشکل کام تھا۔

دن کی روشنی آہستہ آہستہ پھیکی پڑ رہی تھی۔ ہم زیادہ تر خاموش تھے۔ دونوں گہری سوچ میں گم تھے نہر نہ چھوٹی تھی نہ زیادہ بڑی تھی۔ پانی مٹیالے رنگ کا تھا۔ جو بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم ایک پل پر پہنچ کر رک گئے۔ نہر اس پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ قادر خان بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ شام کا اندھیرا ہوگیا تو جنگل درندوں کا خطرہ ہوگا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم دونوں وہاں سے واپس مڑ گئے۔ ابھی ہم چند قدم پیچھے تھے کہ اچانک قادر خان رک گیا۔ وہ ادھر ادھر زمین پر دیکھنے لگا۔ میں بھی ٹھہر گیا۔ میں نے دیکھا کہ قادر خان جھک کر نہر کنارے جو گھاس اگی ہوئی تھی اس کو دیکھ رہا تھا اور سانس اوپر کھینچ کر کچھ سونگھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"قادر بھائی! کیا بات ہے؟"

وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"اونچا مت بولو' مجھے سانپ کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"کون سا سانپ؟"

میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

"بولو مت۔ ابھی بتاتا ہوں۔ تم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اس نے ایک درخت کی ٹہنی توڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ قادر خان ایک جھاڑی کی طرف دبے پاؤں بڑھا۔ یہ جھاڑی آدھی نہر کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ قادر خان جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں ماہر سپیرا بھی تھا۔ اس نے زندگی کے کچھ برس بنگال کے سپیروں کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کا استاد بھی ایک بنگالی سپیرا ہی تھا۔ وہ جھاڑی کے قریب جا کر جھک گیا۔ اس نے درخت کی شاخ سے جھاڑی کی شاخوں کو ایک طرف ہٹایا تو سانپ کے پھنکارنے کی آواز آئی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں ٹکٹکی باندھے جھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ قادر خان نے چھڑی پیچھے کر لی۔ دوسری بار چھڑی یعنی درخت کی شاخ کو جھاڑی میں ڈالا تو جھاڑی میں سے ایک چھوٹا سا سانپ اچھل کر باہر آ گیا اور منہ کھول کر قادر کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکار مارنے لگا۔

قادر خان ذرا نہ گھبرایا۔ اس نے درخت کی شاخ کو سانپ کے منہ کے سامنے لے جا کر دائیں بائیں ہلانا شروع کیا تو سانپ بھی اپنی گردن کو دائیں بائیں ہلانے لگا۔ پھر اچانک قادر خان نے درخت کی شاخ سانپ کی گردن پر رکھ کر اسے وہیں دبوچ لیا۔ اب منظر یہ بن گیا تھا کہ قادر خان نے درخت کی شاخ سے سانپ کی گردن کو دبا رکھا تھا اور سانپ کے بدن کا نچلا حصہ شاخ کی چھڑی سے بے چین ہو کر بار بار پٹ رہا تھا۔ سانپ کے حلق سے عجیب عجیب قسم کی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے قادر خان نے سانپ کو گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ سانپ کی گردن قادر خان کی گرفت میں تھی اور وہ جلیبی کی طرح قادر خان کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ قادر خان نے سانپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حیدر علی! تم نے اس سانپ کو پہچانا نہیں۔ یہ وہی سانپ ہے جو یہودی

انسٹرکٹر جوزف کے جسم کی بو پر اس کی تلاش میں نکلا تھا۔ یہ خدا جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا ہے اور اب ٹریننگ کیمپ میں جا کر یہودی انسٹرکٹر کو ڈسنے کے لیے بے تاب ہے۔"

میں غور سے سانپ کو دیکھنے لگا۔ یاد آگیا یہ واقعی ان گیارہ بالشت بھر کے سانپوں میں سے ایک سانپ تھا جنھوں نے بمبئی والے ٹریننگ سنٹر میں تامل گوریلا دہشت گردوں کو ڈس کر ہلاک کیا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کو چھوڑ دو تاکہ یہ یہودی انسٹرکٹر کو جا کر ڈس آئے۔"

قادر خان بولا۔

"میرے ذہن میں ایک سکیم آگئی ہے۔ ابھی میں اس سانپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

کاٹج میں آکر قادر خان نے بالشت بھر کے خطرناک زہریلے سانپ کو چائے کے خالی ڈبے میں بند کر کے اس کے ڈھکن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیے اور ڈبے کو الماری کے اوپر رکھ لیا میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"کیا ہمیں ایک بار پھر سپیرے بن کر ٹریننگ کیمپ جانا ہوگا؟"

قادر خان میرے ذہن کی بات کو سمجھ گیا تھا کہنے لگا۔

"نہیں اس دفعہ ہم ایک دوسرے روپ میں جائیں گے۔ سپیرے اس لیے نہیں بن سکتے کہ ہمارے پاس صرف ایک ہی سانپ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں انگریزی پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں۔ ان پر سپیروں کا اتنا اثر نہیں ہوگا۔"

"تو پھر دوسرا کون سا بھیس بدل کر جائیں گے؟"

میرے سوال پر قادر خان بولا۔

"تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تم ہندی زبان لکھ پڑھ لیتے ہو۔ تمہیں ہندوؤں کی مقدس کتابوں یعنی ویدوں اور پرانوں کے اشلوک بھی زبانی یاد ہیں اور تم

تھوڑی بہت سنسکرت بھی جانتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں میں نے ٹھیک بتایا تھا۔"

قادر خان کہنے لگا۔ "تو پھر اس بار ہم سادھو سنیاسی بن کر جائیں گے۔ ہندو لوگ اور خاص طور پر ہندو عورتیں خواہ وہ ان پڑھ ہوں یا پڑھی لکھی ہوں بہت ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ ہر ہندو کا عقیدہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد کسی نئے جسم میں جنم لیتا ہے۔ یہ جسم انسان کا بھی ہو سکتا ہے اور یہ جسم کتے بلی سانپ بچھو کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو آواگون کہتے ہیں۔ سپیروں سے تو یہ لوگ اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ان کے پیچھے کوئی سانپ نہ لگا دے۔ لیکن سادھو جوگی سے انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر کسی جوگی سنیاسی یا سادھو نے انہیں بد دعا دے دی تو ان کا گلا جنم کہیں سانپ' ناگن' کتے بلی یا بچھو کا نہ ہو جائے اور وہ مرنے کے بعد سانپ' کتیا' بلی کی شکل میں نہ پیدا ہو جائیں۔ ہم ان عورتوں کی سب سے کمزور رگ پر حملہ کریں گے اور اس اٹیک کے لئے ہمارا سادھو جوگی بننا ضروری ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے سانپ کو پکڑ کر ڈبے میں بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

قادر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ وقت آنے پر تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ میں صبح مراد آباد جا رہا ہوں تم یہیں ٹھہرو گے میں مراد آباد سے وہ چیزیں خرید کر لاؤں گا جن کی ہمیں اس مشن میں ضرورت پڑے گی۔"

قادر خان کا منصوبہ کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا' کچھ نہیں آیا تھا۔ مجھے اس منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین نہیں تھا۔ لیکن میں نے اعتراض اس لیے نہ کیا کہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دوسرا کوئی طریق کار ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ قادر خان اگلے دن مراد آباد روانہ ہو گیا۔ وہ وہاں دو دن لگا کر واپس آیا تو اس

کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک اٹیچی کیس تھا۔ اس نے مجھے اٹیچی کیس کھول کر دکھایا۔ اس میں وہ تمام اشیاء موجود تھیں جن کی ہمیں اس مشن میں ضرورت تھی۔

کہنے لگا۔

"میں نے نواب صاحب کو ساری سکیم بتا دی ہے۔ انہوں نے مجھے صرف ایک ہی ہدایت کی ہے کہ اس بارے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جائے۔ یہاں کاٹج میں جو ان کا پرانا بوڑھا ملازم کام کر رہا ہے وہ اسے بھی اپنا آدمی بھیج کر کچھ دنوں کے لیے واپس مراد آباد بلا رہے ہیں تاکہ ہم خفیہ رہ کر اپنے مشن پر کام کر سکیں۔"

قادر خان نے اٹیچی کیس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر کھولا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ اس پر پنسل کی آڑی ترچھی لکیروں سے ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سمبل کے ٹریننگ کیمپ کا نقشہ ہے۔ نواب صاحب نے اپنی خاص جاسوس کی مدد سے یہ نقشہ خود تیار کیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کسی بھی آدمی کو بطور گائیڈ بھی نہیں بھیجنا چاہتے۔"

قادر خان نے مجھے نقشے کی مدد سے سب سمجھایا کہ نواب صاحب کے کاٹج سے ہمیں کس طرف جانا ہوگا اور پھر کہاں کہاں سے گزر کر رام گنج نام کے شیومندر میں جا کر قیام کرنا ہوگا۔

"سمبل کا ٹریننگ کیمپ اس مندر سے شمال کی جانب تین میل کے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ میرا خیال ہے سارا نقشہ تمہارے ذہن میں آگیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "تم تو اچھی طرح سمجھ گئے ہو ناں؟"

"میں تو آنکھ بند کر کے اپنے ٹارگٹ پر پہنچ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہمیں تمہارے خیال میں کب روانہ ہونا چاہیے۔

قادر خان کہنے لگا۔

"کیمپ میں پاکستان کے خلاف ٹریننگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ جاسوس اور تخریب کار عورتیں دہشت گردی اور جاسوسی کے مشن پر کسی بھی دن پاکستان کی طرف روانہ ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ صرف اس بات کا انتظار ہے کہ نواب صاحب کا آدمی آکر کاٹج کے بوڑھے نوکر کو اپنے ساتھ مراد آباد لے جائے۔"

نواب صاحب ہمارے مشن کو اپنے بااعتماد ملازم سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ حسب وعدہ ان کا ایک آدمی آیا اور دوسرے روز کاٹج کے بوڑھے ملازم کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اب ہم اپنے مشن پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں نے اپنی داڑھی اور مونچھیں اس طرح ترشوا رکھی تھیں کہ نہ میں سکھ لگتا تھا نہ کوئی مجھے مسلمان سمجھ سکتا تھا۔ اس قسم کا حلیہ بنانا میری مجبوری بھی تھی اور وقت کی ضرورت بھی تھی۔ قادر خان کلین شیو آدمی تھا۔ صرف اس کے سر کے بال لمبے تھے ہم نے کاٹج کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر کپڑے تبدیل کیے۔ اپنا حلیہ بھارت کے جوگی سنیاسیوں والا بنایا۔ اپنے پاس لمبے چولے کے اندر چھپا کر ایک ایک سائی لینسر والا پستول اور ایک ایک کمانڈو چاقو رکھ لیا۔ ہم چلنے لگے تو میں نے قادر خان سے کہا کہ وہ سانپ کا ڈبہ ساتھ نہیں لے جا رہا۔ وہ بولا۔

"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہم اپنے جنگل والے کاٹج سے دوپہر سے ذرا پہلے نکلے۔ کیلے کے پتوں میں ہم نے کھچڑی ڈال کر رکھ لی تھی۔ اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ دوپہر اور رات کو ہمیں وہاں کھانے کو کچھ نہ ملے ہم جنگل میں ایک تنگ سی پگ ڈنڈی پر

چلے جا رہے تھے۔ قادر خان راستے سے واقف تھا کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بھورے رنگ کی ان چھوٹی پہاڑیوں میں پہنچ گئے جن کے درمیان ٹریننگ کیمپ تھا۔ ہم نے ایک جگہ کھڑے ہو کر نیچے وادی میں کیمپ کا جائزہ لیا۔ وہاں دو تین آدمی ادھر ادھر کام کاج میں مصروف نظر آئے۔ قادر خان بولا۔

"ہمیں سامنے کی جانب جو چھوٹی پہاڑی ہے وہاں سادھی لگا کر بیٹھنا چاہیے آؤ میرے ساتھ۔"

ہم ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر اس پہاڑی پر آگئے جو ٹریننگ کیمپ کے عقب میں تھی یہ چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ اس کی چوٹی پر گھنے درختوں کی چھاؤں تھی۔ ہم نے وہاں جگہ بنالی اور بیٹھ گئے۔ جب تھوڑا سانس لے چکے تو قادر خان نے کہا۔

"دیکھتے ہیں نیچے صورت حال کیا ہے؟"

پہاڑی کی درختوں میں ایک جگہ سے نیچے ٹریننگ کیمپ اور اس کی آمنے سامنے بنی ہوئی بیرکیں دن کی روشنی میں بڑی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس وقت وہاں دو آدمی زمین صاف کر رہے تھے۔ لکڑی کے دو کھمبے زمین گڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ رسے لٹک رہے تھے۔ اتنے میں سیٹی بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس آواز پر بیرکوں میں سے لڑکیاں دوڑتی ہوئی باہر نکلیں اور لکڑی کے کھمبے کے سامنے قطار بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ دوسری طرف سے ایک گورے رنگ کا آدمی نمودار ہوا۔ میں نے اسے دور سے ہی پہچان لیا یہ یہودی انسٹرکٹر جوزف تھا۔ قادر خان نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"حیدر علی! میں نے اسے پہچان لیا ہے کیا تم نے پہچانا؟ یہ اسرائیلی انسٹرکٹر جوزف ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے بھی پہچان لیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس وقت کاٹج کی کوٹھڑی میں

ڈبے میں بند سانپ کی بری حالت ہو رہی ہوگی۔ وہ ڈبے سے باہر نکلنے اور اس یہودی کو ڈسنے کے لیے پھنکاریں مار رہا ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" قادر خان بولا۔ "مگر ابھی اس یہودی کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں۔"

لڑکیوں نے نیکریں اور بنیانیں پہنی ہوئی تھیں۔ سروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ یہودی جوزف نے انہیں کوئی حکم دیا۔ لڑکیوں نے دوڑ کر کھمبے کے ساتھ لٹکتے رسوں کو پکڑا اور اوپر چڑھنے کی پریکٹس شروع کر دی۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"یہ کل سات لڑکیاں ہیں۔ میرا خیال ہے ان کے علاوہ اور کوئی لڑکی یہاں ٹریننگ نہیں لے رہی۔"

"ہوں" قادر خان نے کہا۔

وہ بڑے غور سے نیچے لڑکیوں کو رسوں کی مدد سے کھمبے کے اوپر چڑھتے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ لڑکیاں شام کے وقت جنگل میں چلنے پھرنے کے لیے ضرور نکلتی ہوں گی۔ ہمیں اس وقت ان میں سے کسی لڑکی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اگر ہم نے ان میں سے کسی ایک لڑکی پر اپنا اثر ڈال لیا تو باقی کی لڑکیاں اپنے آپ ہمارے زیر اثر آ جائیں گی۔"

اب ہم دن غروب ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر کو ہم نے تھوڑی تھوڑی کھچڑی کھائی تھی۔ تیسرے پہر کیمپ کی ٹریننگ دوبارہ شروع ہوگئی۔ اس کے بعد کیمپ پر خاموشی چھا گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہم نے پہاڑی کے آس پاس چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ مگر ہمیں وہاں کوئی لڑکی دکھائی نہ دی۔ ہم واپس اپنی جگہ پر آ رہے تھے کہ ایک عورت خچر پر بیٹھ کر کیمپ سے نکلتی دکھائی دی۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"یہ عورت مجھے ان لڑکیوں کی نائیکہ انسٹرکٹر لگتی ہے۔"
قادر خان نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خچر پر بیٹھی ہماری طرف آ رہی تھی۔ ہم درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ عورت قریب سے گزری تو ہم نے دیکھا کہ وہ ادھیڑ عمر کی تھی۔ اس نے پتلون اور آدھی آستینوں والی بنیان پہن رکھی تھی۔ جب اس کا خچر پہاڑی پگڈنڈی پر ذرا دور نکل گیا تو میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! میرا خیال ہے ہمیں اس عورت کو قابو میں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے اثر میں آ گئی تو باقی کی سات لڑکیوں کو قابو کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔"

قادر خان کو میری تجویز پسند آئی۔ کہنے لگا۔
"مگر یہ عورت کہاں جا رہی ہے۔ یہاں قریب تو کوئی گاؤں نہیں ہے۔"
ہم کچھ فاصلہ ڈال کر اس عورت کا تعاقب کرنے لگے پہاڑی پگڈنڈی پر خچر بڑی سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ ایک پہاڑی سے اتر کر خچر دوسری پہاڑی کے پیچھے کی طرف گھوم گیا۔ ہم بھی اسی طرف گھوم گئے۔ پہاڑی کی دوسری طرف سامنے درختوں میں ایک کیبن دکھائی دیا۔ عورت اس کیبن کی طرف چلی گئی۔ کیبن ذرا چڑھائی چڑھ کر بنا ہوا تھا۔ ہم دوسری جانب سے ہو کر جھاڑیوں میں چھپ کر عورت کو دیکھنے لگے۔ کیبن کا چھوٹا سا صحن ہمیں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک آدمی پودوں کی گوڈی کر رہا تھا۔ عورت کو دیکھ کر وہ دوڑ کر خچر کی طرف گیا۔ عورت کو سہارا دے کر نیچے اتارا اور خچر لے کر دوسری طرف چلا گیا۔ عورت نے اپنی بنیان کو نیچے کیا اور بڑی بے نیازی سے چلتی ہوئی کیبن کے اندر چلی گئی۔ قادر خان بولا۔

"یہ وہی عورت ہے جس کے بارے میں نواب صاحب کے مخبر نے بتایا تھا کہ یہ بمبئی کی اونچی سوسائٹی کی طوائف ہے جو ان لڑکیوں کو اعلیٰ سرکاری

افسروں اور سرمایہ داروں کو رام کرنے کی ٹریننگ دیتی ہے۔"
میں نے قادر خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
"پھر کیا خیال ہے؟"
قادر خان بولا۔ "تمہارے کمال دکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ نیچے چلو میدان صاف ہے۔ میں تمہارا چیلا ہوں۔ تم میرے گورو ہو۔"
قادر نے آہستہ سے اولکھ نرنجن کا نعرہ لگایا۔ میں سمجھ گیا قادر خان میرے سامنے کیا تجویز رکھی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"جے شیو شنکر۔ آ جاؤ۔"
میں نے شیو دیوتا کا ترشول جو قادر خان کے ہاتھ میں تھا اس سے لے کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میرے ایک ہاتھ میں پیتل کا لوٹا تھا جس میں پانی تھا اور رتن جوت کے کچھ پھول پڑے تھے۔ میں آگے آگے تھا۔ قادر خان میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم جوگیوں کے بھیس میں بڑے سکون سے چلتے پہاڑی پگ ڈنڈی سے اتر کر کیبن کے صحن میں آ گئے۔ اس دوران وہ ملازم خچر لے کر دوسری طرف گیا تھا۔ واپس آ رہا تھا وہ بھی ہندو تھا۔ اپنے سامنے باغیچے میں دو جوگیوں سنیاسیوں کو دیکھا تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر ہمیں جے شیو شنکر کہا۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ "تیرا کلیان ہو بچہ۔"
اس کے ساتھ ہی ہم اپنے پروگرام کے مطابق ہم وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ ملازم بولا۔
"مہاراج! میں آپ کے لیے بھوجن پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "بچہ تمہاری مالکن کہاں ہے؟ اس کو جا کر کہو کہ شیو جی مہاراج نے اس کے نام ایک سندیس بھیجا ہے جو ہمیں خود اس کو دینا ہے۔"
ملازم یہ کہہ کر جلدی سے کیبن نما مکان کے اندر چلا گیا کہ مہاراج میں ابھی مالکن کو خبر کرتا ہوں۔

قادر خان نے میری طرف جھک کر کہا۔
"تم صورت حال کو سنبھال لو گے نا؟ کہیں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہو گی؟"
میں نے اسے تسلی دی۔
"تم بے فکر رہو قادر بھائی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔"
دوسرے لمحے کمرے میں سے وہی عورت باہر نکلی۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کا لباس ابھی تک وہی بنیان پتلون ہی تھا۔ اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر عورت نے ہمیں پرنام کیا اور پوچھا۔
"مہاراج! کیسے آنا ہوا؟"
اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بڑے شہر کی رہنے والی ہے اور ہمارے ایسے سادھو سنیاسیوں کا اس پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ میں نے اپنا ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔
"تو ساوتری ہے۔ تو ساوتری ہے۔ پچھلے جنم میں تو اپنے ستیہ وان سے بچھڑ گئی تھی۔ تیرا اگلا جنم آکاش کی اپسرا کا ہوگا۔ میں تیرے ماتھے پر لکھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔ تو اگلے جنم میں آکاش کے دیوتاؤں کے دربار میں رقص کیا کرے گی۔"
عورت پر میرے جملوں کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لگایا تو میں نے کہا۔
"ساوتری! یہ سگریٹ دوزخ کی آگ کا دھواں ہے۔ یہ تجھے تیرے ستیہ وان سے دس جنموں تک ملنے نہیں دے گا۔ اس کو پھینک دے۔ پھینک دے۔"
ایسا میں نے جان بوجھ کر یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اس پر میری تقریر کا کتنا اثر ہوا ہے۔ عورت نے فوراً سگریٹ پھینک دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔
"مہاراج! پدھاریئے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں۔"
وہ ہمیں کیبن کے اندر لے گئی۔ کمرا بڑا سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر رقص

کرتی ہوئی بمبئی کی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں تھیں۔ میں نے اندر جاتے ہی اداکاری شروع کر دی۔ پیتل کے لوٹے میں سے چلو میں پانی لے کر ادھر ادھر چھڑکا۔ رتن جوت کے تین چار پھول پھینکے اور ترشول والا بازو بلند کر کے کہا۔

"ساوتری! تو دھن ہے' دھن ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا اگلا جنم اپسراؤں کی ملک ہوگا۔ تو بھگوان شیو کے دربار میں رقص کیا کرے گی۔"

دوسرے جنم میں آکاش کی اپسرا یعنی آکاش کے سب سے بڑے دیوتا شیو مہاراج کے دربار میں بطور شاہی رقاصہ کے رقص کرنا ایک رقص کرنے والی طوائف کے لیے بہت بڑا اور بلند مقام تھا۔ وہ عورت خوش ہو کر بولی۔

مہاراج! مجھے آشیرباد دیجئے۔"

میں نے اپنے ماتھے پر لگے ہوئے تلک پر انگلی رکھ کر اس کا تھوڑا سا رنگ انگلی پر لگایا اور اسے عورت کے ماتھے پر لگا دیا۔ وہ تو میرے آگے بچھی جا رہی تھی۔ قادر خان میرے پیچھے ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا تھا۔ عورت نے کہا۔

"ماراج! یہاں بیٹھئے میں آپ کے لیے حلوہ پوری لاتی ہوں۔"

میں صوفے پر اور قادر خان میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"بالکہ! ہمیں کھانے پینے کی اس وقت حاجت نہیں ہے۔ ہم تیری جنم کنڈلی دیکھ کر تجھ کو بدھائی دینے آئے ہیں کہ تو جنم جنم کے بندھن سے آزاد ہو گئی ہے تو نے شکتی پا لی ہے۔ جو عورت شیو بھگوان کی نرتکی بن جاتی ہے اس کو آگے کوئی جنم نہیں ہوتا۔ وہ شکتی پا جاتی ہے اور سدا سورگ میں رہتی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے سنسکرت کے اشلوک گا کر پڑھنے شروع کر دیے۔ اتفاق سے اس عورت کا اصلی نام بھی ساوتری ہی تھا۔ اس نے اپنا دوسرا نام کامنی دیوی رکھا ہوا تھا۔ میں نے تو ستیہ دان ساوتری کی ہندو مائیتھالوجی کی کہانی کا سہارا لے کر اسے ساوتری کہہ کر پکارا تھا۔ اس دیومالائی کہانی کی ہیروئن کا نام ساوتری تھا جس نے اپنے خاوند ستیہ دان کی خاطر اپنی جان قربان کر دی

تھی لیکن حسن اتفاق سے اس عورت کا نام ساوتری نکل آیا۔ وہ ہماری آؤ بھگت میں لگ گئی۔ میں نے کہا۔

"نہیں بالکہ! ہمارے پاس اس وقت ٹائم نہیں ہے۔ ہمیں آکاش پر بھگوان شیو جی کے درشن کرنے جانا ہے۔ ہم کل اسی وقت تمہارے پاس آئیں گے اور تمہیں اپنا آشیرباد دیں گے۔ ہمارا آشیرباد ملنے کے بعد تیری قسمت کھل جائے گی۔ تو بمبئی کی سب سے مشہور اور مالدار نرتکی بن کر ابھرے گی۔ جے شیو شنکر! چل بالکے۔"

میں نے قادر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے تو ساوتری نائیکہ نے میرے قدم چھو کر کہا۔

مہاراج! اپنی بالکہ کو بھول نہ جائیے گا۔ کل میرے غریب بھون پر ضرور پدھاریے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہم اوش آئیں گے۔ اوش آئیں گے۔"

اور میں جے شیو شنکر جے شیو شنکر بولتا وہاں سے چل پڑا۔ جب تک ہم ساوتری کے کیبن سے دور نہیں ہوگئے میں برابر جے شیو شنکر کا الاپ کرتا رہا۔ جب ہم وہاں سے کافی دور نکل آئے تو میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"قادر بھائی! کیا خیال ہے؟"

وہ خوش ہو کر بولا۔

"بھائی! تم نے تو کمال کی اداکاری کی ہے۔ اب یہ عورت ہمارے ہاتھ سے نہیں جاتی۔"

ہم دوسرے دن پوری تیاری کر کے وہاں گئے۔

وہ بھی ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے طرح طرح کے پکوان پکا رکھے تھے۔ ہمارے پاؤں چھو کر سواگت کیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ ہم کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی گودڑی میں سے ایک پوتھی نکالی اور ساوتری سے کہا۔

"ساوتری! بالکہ! آج ہم تمہیں شیو بھگوان کے درشن کرانے آئے ہیں۔"

وہ نائیکہ تو خوشی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ میں نے کہا۔

"اس پوتھی میں آکاش کی تمام اپسراؤں' نرتکیوں کی جنم کنڈلیاں ہیں اس میں تمہاری جنم کنڈلی بھی ہے۔ میرے سامنے آکر بیٹھ جا۔ میں تمہیں بھگوان شیو کے درشن کرا دوں گا۔ تو بڑی بھاگوان ہے۔ اوم ہرتت ست' اوم ہری تت ست۔"

میں نے یونہی پوتھی کے ورق الٹنے شروع کر دیے۔ پھر ایک صفحے کو غور سے پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے اپنی آواز کو زیادہ گھمبیر بناتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

"ساوتری! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اور بھگوان شیو کے درمیان سات عورتیں دیوار بن کر کھڑی ہیں۔"

ساوتری نائیکہ کا چہرہ اتر گیا۔ میں نے پوتھی بند کر دی اور اس سے سوال کیا۔

"ساوتری! کیا یہاں تمہارے ساتھ سات نرتکیاں بھی رہتی ہیں۔"
وہ فوراً بولی۔
"ہاں مہاراج! سات لڑکیاں ہیں۔ میں انہیں ڈانس وغیرہ سکھاتی ہوں۔"
میں نے جے شیو شنکر کا نعرہ لگا کر کہا۔
"میری پوتھی کبھی غلط نہیں کہتی۔ ساوتری! یہ سات لڑکیاں تجھے شیو شنکر بھگوان سے کبھی نہیں ملنے دیں گی۔ یہ تیری دشمن ہیں یہ چاہتی ہیں کہ اگلے جنم میں خود بھگوان شیو کے دربار میں نرتکیاں بن جائیں۔"
ساوتری پریشان ہوگئی تھی۔ کہنے لگی۔
"مہاراج! اس کا کوئی اپائے نہیں ہے۔"
میں نے کہا۔ "ہے اپائے ہے۔ ہم نے تمہاری خاطر اس کا اپائے تلاش کر لیا ہے۔ یہ اپائے خود بھگوان شیو نے ہمارے دل میں ڈالا ہے۔"
ساوتری نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔
"مہاراج! مجھے بتائیے۔ ہمیں اپائے بتائیے۔ میں اس کے لیے ہر طرح کا بلیدان دینے کو تیار ہوں۔"
میں نے کہا۔ "ساوتری! بلیدان دینے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ تیری خاطر ہم بلیدان دیں گے ہاں تجھے صرف ایک کام کرنا ہوگا۔"
"حکم کریں مہاراج!"
ساوتری نے عاجزی سے کہا۔ میں نے سب کچھ سوچ رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"ساوتری! کیا یہ سات لڑکیاں انگیا پہنتی ہیں۔"
اس نے کہا۔ "ہاں مہاراج! ساتوں انگیا پہنتی ہیں۔"
میں نے بازو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔
"بس بس ساوتری سمجھو تمہارا کام ہوگیا۔ فوراً ان ساتوں لڑکیوں کی انگیا

لا کر مجھے دے۔ میں ان پر ایک منتر پڑھ کر پھونکوں گا پھر ایک رات کا ابھیاس کروں گا۔ پھر تمہیں ساتوں کی ساتوں انگیا واپس کر دوں گا اس کے بعد ان سات لڑکیوں کی دیوار تمہارے راستے سے ہٹ جائے گی اور تو شیو بھگوان کے درشن بھی کرے گی اور دوسرے جنم میں شیو بھگوان کی نرتکی بھی بن جائے گی۔"

ساوتری بولی۔ "مہاراج! میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں کل ہی ان لڑکیوں کی انگیا اتروا کر اپنے پاس رکھ لوں گی۔ یہ کام میں کر سکتی ہوں۔ وہ میرا ہر حکم مانتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دھن ہے، تو دھن ہے بالکے۔ بس ہم کل اسی وقت تمہارے بھون پر آئیں گے اور ساتوں انگیا اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پھر تیرا کلیان ہو جائے گا۔ جے شیو شنکر! جے ماتا بھوانی! اب ہم چلتے ہیں کل آئیں گے۔"

ساوتری ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

"مہاراج بھوجن تو کرتے جائیں میں نے آپ کی خاطر اپنے ہاتھ سے کچوریاں بنائی ہیں۔

میں نے دل میں کہا کم بخت ہم مسلمان پلاؤ زردہ اور مرغ مسلم کھاتے ہیں۔ یہ کچوریاں تیرا باپ کھائے گا مگر ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اور قادر خان نے کچوریوں سے ہی پیٹ بھر لیا اور واپس چل پڑے۔ ساوتری ہمیں پہاڑی پگ ڈنڈی تک چھوڑنے آئی۔ قادر خان پگ ڈنڈی کا موڑ مڑتے ہی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سب کام ٹھیک ہو گیا ہے! وہ بولا۔ "بالکل سو فیصد ٹھیک ہوا ہے۔"

قادر خان نے مجھے بتا دیا تھا کہ ہمارے پاس ان پاکستان دشمن عورتوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے صرف ایک ہی سانپ ہے۔ اگر ہم نے ان عورتوں کی

ساڑھیاں وغیرہ اسے سنگھائیں تو اس میں اتنا زہر پیدا نہیں ہو سکے گا کہ وہ ایک ہی وقت میں ان ساتوں لڑکیوں کو ڈس سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان لڑکیوں کی اتری ہوئی انگیا اسے سنگھائی جائیں۔ انگیا میں عورت کے جسم کی بڑی تیز بو ہوتی ہے یہ بو سونگھنے کے بعد سانپ میں اتنا زہر پیدا ہو جائے گا کہ وہ ایک ہی وقت میں دو درجن انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار سکے گا۔

دوسرے دن ہم شام کے بعد ساوتری کے پہاڑی کیبن میں پہنچ گئے۔ اس نے ہمارے پاؤں چھو کر ہمارا سواگت کیا۔ ہمیں کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ میں نے پوچھا۔

"ساوتری! کیا تو لڑکیوں کی انگیا لے آئی ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں مہاراج! میں ابھی لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر ایک الماری کی طرف گئی اسے کھول کر اس میں سے ایک تھیلا نکال کر لے آئی۔ تھیلا میرے سامنے رکھ کر بولی۔

"مہاراج اس میں ساتوں لڑکیوں کی انگیا ہیں۔"

میں نے تھیلا الٹا دیا۔ اس کے اندر سے لال ہرے پیلے اور سیاہ رنگ کی زنانہ زیگ باہر نکل آئیں۔ میں نے پوچھا۔

"بالکہ! یہ نئی انگیا تو نہیں ہیں نا؟"

ساوتری نے فوراً" کہا۔

"نہیں نہیں مہاراج! میں نے خود ان کے جسموں سے اپنے سامنے اتروائی ہیں۔ مہاراج۔ سب ان لڑکیوں کی پہنی ہوئی انگیا ہیں۔"

"تب ٹھیک ہے تب ٹھیک ہے۔ اب تو فکر مت کر سمجھو تیرے اور بھگوان کے درمیان جو دیوار کھڑی تھی وہ ہٹ گئی۔ اب مجھے اس پر منتر پڑھ کر ابھیاس کرنے دے۔ جے سیا ساوتری! جے سیا ساوتری۔"

میں نے ساتوں لڑکیوں کی رنگ برنگی انگیاں تھیلے میں ڈال دیں اور تھیلا

قادر خان کی طرف اچھال کر کہا۔

"بچہ! اس کو اپنے پاس رکھ لے۔ آدھی رات میں جب یگیہ کر رہا ہوں گا تو مجھے دے دینا۔"

قادر خان نے تھیلا پکڑ لیا اور بولا۔

"جو آگیا مہاراج۔"

مجھے یہ فکر تھی کہ کہیں رات کو لڑکیاں ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ میں نے ساوتری سے پوچھا۔

"ساوتری! یہ تیری دشمن لڑکیاں کہیں چلی تو نہیں جائیں گی؟"

وہ بولی۔ "نہیں مہاراج! انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ ابھی سات آٹھ دن اسی جنگل میں رہ کر مجھ سے ڈانس سیکھیں گی۔"

میں مطمئن ہوگیا۔ قادر خان کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ مجھے آنکھوں سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غور کیا تو وہ ساوتری کے سینے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے غور کیا۔ کیا مجھے وہ کچھ کرنا چاہیے جو قادر خان کہہ رہا ہے؟ تھوڑی دیر ساوتری سے باتیں بھی کرتا رہا اور سوچتا بھی رہا۔ آخر میں نے قادر خان کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے سوچا کہ یہ عورت بھی فساد کی جڑ ہے۔ اگر یہ زندہ رہی تو دوسری طوائفوں کی تربیت کر کے انہیں بھی جاسوسی کے لیے پاکستان بھجوا سکتی ہے۔

میں نے ساوتری کی طرف جھک کر اس کو غور سے دیکھا۔ ساوتری کچھ گھبرا گئی۔ بولی۔

"مہاراج! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں ساوتری! تجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی غلطی مجھ سے ہو گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں بھول گیا ہوں کہ ان انگیوں پر ابھیاس کرنے کے بعد تمہاری انگیا پر منتر پڑھ کر پھونکنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے بالکہ! تو اپنی

انگیا بھی اتار کر مجھے دے دے۔"

ساوتری شرما گئی۔ اگرچہ وہ ایک تجربہ کار پیشہ ور طوائف تھی مگر آخر عورت تھی اور عورت کے اندر تھوڑا بہت شرم و حیا کا مادہ ضرور باقی رہتا ہے۔ میں نے کہا۔

"شرماؤ نہیں بالکہ! اپنے گورودیو سے مت شرماؤ۔ ہم تو سادھو سنیاسی لوگ ہیں ہم سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "بہت اچھا مہاراج! میں ابھی اندر جا کر اپنی انگیا اتار کر لاتی ہوں۔"

مجھے خیال آیا کہیں یہ عورت کوئی دھوبی کی دھلی ہوئی انگیا نہ آئے محض اس خیال سے کہ کون انگیا اتارنے کی بک بک کرے۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں ساوتری! اگر تجھے جنم جنم کے بندھن سے مکتی حاصل کرنی ہے۔ اگر تجھے بھگوان شیو کے درشن کرنے ہیں تو تجھے میرے سامنے اپنی انگیا اتار کر مجھے دینی ہوگی۔ اگر تو ایسا نہیں کرے تو میرا سارا ابھیاس بھنگ ہو کر رہ جائے گا۔"

یہ سن کر ساوتری طوائف کے پاس جو تھوڑی بہت شرم و حیا تھی اس نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ ریشمی مردانہ قمیض اور پتلون پہنے تھی کہنے لگی۔

"جو حکم مہاراج!"

اور اس نے فوراً اپنی ریشمی قمیض اتار دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا جسم کافی صحت مند تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی انگیا پہنی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے آرام سے اپنی انگیا اپنے جسم سے الگ کی اور میرے پاؤں میں رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ لیجئے مہاراج! آپ کی آگیا کا پالن کرنا آپ کی داسی کا فرض ہے۔"

ساوتری نے اپنی اتاری ہوئی ریشمی قمیض جو اتارتے وقت الٹی ہوگئی تھی کو سیدھا کیا اور بڑے آرام سے اسے دوبارہ پہن لیا۔ وہ ساتھ ساتھ میری طرف دیکھ کر مسکراتی بھی جا رہی تھی۔ اس پیشہ ور طوائف کی نیت بدل چکی تھی۔ مگر میری نیت نہیں بدلی تھی۔ میں نے اس کی انگیا قادر خان کے حوالے کی اور کہا۔

"بچہ ستی ساوتری کی انگیا بھی تھیلے میں سنبھال کر رکھ لے۔"

قادر خان نے فوراً ساوتری کی انگیا بھی تھیلے میں ڈال لی۔ اب ہمارا وہاں سوائے پیٹ پوجا کرنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ ساوتری نے اس رات بھی ہمارے واسطے طرح طرح کے پکوان پکائے ہوئے تھے۔ اس نے ہمارے آگے کھانا لگوا دیا۔ ہم دونوں کھانا کھانے لگے۔ ساوتری میرے سامنے بیٹھی مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ میں اس کی نظروں کی زبان کو سمجھتا تھا۔ مگر میں ایک اعلیٰ مقصد لے کر دشمن کے علاقوں میں آیا ہوا تھا۔ اس اعلیٰ مقصد کا تقاضا تھا کہ میں ہر قسم کی لذت پرستیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھوں اور کوئی ایسی حرکت نہ کروں جو خدا کو ناپسند ہو۔ اور مجھ پر خدا کا عذاب نازل ہو جائے۔ کیونکہ میرا یہ ایمان بھی تھا اور میرا یہ تجربہ بھی تھا کہ آدمی اگر کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے اس کی سزا مل کر رہتی ہے۔ میں نے ساوتری سے پوچھا۔

"ساوتری! یہاں لڑکیوں کو فوج کے لیے قواعد سکھائے جاتے ہیں۔"

"ہاں مہاراج! بھارت سرکار لڑکیوں کی فوج بھی تیار کر رہی ہے۔"

ساوتری مجھ سے اصل بات چھپا گئی تھی۔ میں نے پوچھا "لیکن ان عورتوں کو ڈانس کیوں سکھایا جاتا ہے بالکہ؟ کیا یہ لڑکیاں محاذ جنگ پر ڈانس کیا کریں گی۔"

ساوتری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں مہاراج! ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں بھی ان لوگوں نے کچھ نہیں

بتایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان لڑکیوں کو بھارتی فوجی افسروں کا دل بہلانے کے لیے بھرتی کیا جائے گا۔"

"نارائن! نارائن۔" میں نے کانوں پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا کل جگ آگیا ہے' کیا کل جگ آگیا ہے۔"

رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی کہ ہم ساوتری کے ہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں میں نے قادر خان سے پوچھا۔

"کیا اس عورت کو ہلاک کرنا ضروری ہے قادر بھائی؟"

وہ بولا۔ "زہر تیار کر کے دوسروں کو پلانے والا زہر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ زہر تو صرف ایک آدمی کو مارتا ہے مگر زہر تیار کرنے والے کے ہاتھوں کوئی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد میں نے قادر خان سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ ہم وہاں سے سیدھے واپس نواب صاحب کے کاٹج میں آ گئے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے قادر خان سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ وہ بولا۔

"توپوں کا رخ دشمن کی طرف کر دیا گیا ہے۔ ٹارگٹ رجسٹر ہوگئے ہیں۔ اب فائرنگ شروع ہو جانی چاہیے۔"

"اوکے۔"

قادر خان کوٹھڑی کے کونے میں جا کر سانپ کا ڈبہ اٹھا کر لے آیا۔ ڈبے کے اندر سانپ پھنکار رہا تھا۔ قادر خان بولا۔

"اس کو یہودی انسٹرکٹر کے جسم کی بو بڑے قریب سے آ رہی ہے۔ سانپ اس وقت اپنے ٹارگٹ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اب یہ چاہتا ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔"

پھر وہ سانپ سے باتیں کرنے لگا۔

"گھبراتے کیوں ہو؟ دو چار اور دشمنوں کے کپڑے سونگھ لو۔ آج رات تمہیں کچھ اور پاکستان کے دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ ذرا صبر کرو۔ ذرا صبر کرو۔"

میں نے کہا۔ "سانپ کو لڑکیوں کی انگیا کیسے سنگھاؤ گے؟"

قادر خان اس دوران تھیلے کو کھول کر لالٹین کی روشنی میں تھیلے اندر رنگ برنگی انگیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

"سانپ کو ڈبے سے نکالنا خطرناک ہوگا۔ ڈبہ چھوٹا ہے۔ یہ باہر آکر ہمیں بھی ڈس سکتا ہے۔ اس کو ڈبے سمیت تھیلے میں ڈال دوں گا۔ ڈبے کے سوراخوں میں سے اس کو لڑکیوں کی انگیوں کی بو پہنچ جائے گی۔ کپڑے کے اس ٹکڑے میں عورت کے جسم کی بڑی تیز بو رچی ہوتی ہے۔ سانپ اسے بڑی جلدی سونگھ لیتا ہے۔"

قادر خان نے ڈبے کو کھولنے کی بجائے اسے بند کا بند انگیوں والے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ منہ بند کرنے کی دیر تھی کہ تھیلے کے اندر سانپ کی پھنکاروں نے شور مچا دیا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ سانپ ابھی ڈبے کو توڑ کر تھیلے میں سے باہر نکل آئے گا۔ قادر خان تھیلے کے پاس ہی بیٹھا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کم از کم آدھا گھنٹہ ڈبہ تھیلے کے اندر ہی رہے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر میں ہندی میں مضمون کاغذوں پر لکھ لیتا ہوں۔"

قادر خان بولا۔

"ہاں الماری میں سے رجسٹر اور بال پوائنٹ نکال کر مضمون تیار کر کے اس کی نو کاپیاں تیار کر لو۔ سات کاغذ لڑکیوں کے لیے ایک یہودی انسٹرکٹر کی لاش اور ایک سادتری کی لاش کے گلے میں باندھنے کے لیے۔"

میں نے الماری میں سے خالی صفحوں والا رجسٹر نکال لیا اور گہرے سیاہ بال پوائینٹ قلم سے ہندی کا ایک مضمون لکھ کر قادر خان کو دکھایا۔ وہ ہندی پڑھ لیتا تھا۔ یہ مضمون میں پہلے بھی بمبئی والے ٹریننگ سینٹر کے دہشت گردوں کی لاشوں کے گلے میں ڈالنے کے لیے لکھ چکا تھا۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ ہم بھارت کی ایک مسلم تنظیم کی طرف سے خبردار کرتے ہیں کہ ہم بھارت سرکار کے اسلام دشمن منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ اگر آئندہ بھارت کی متعصب اور پاکستان دشمن سرکار کی طرف سے اس قسم کا کوئی ناپاک منصوبہ بنایا گیا تو ان عورتوں کا بھی یہی انجام ہوگا میں نے اس مختصر مضمون کی نو کاپیاں تیار کر کے ان میں نائیلون کے دھاگے پرو دیے۔

قادر خان بولا۔ "سانپ نے جتنی بو سونگھنی تھی سونگھ لی ہے۔ میں اسے اب چھوڑنے لگا ہوں۔ تمہارے خیال میں ساتوں لڑکیاں اور یہودی انسٹرکٹر کیمپ میں ہی ہوگا ناں؟"

میں نے کہا۔ "لگتا تو یہی ہے۔ آگے خدا بہتر جانتا ہے۔"

قادر خان نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر سانپ کا ڈبہ نکال لیا۔ کہنے لگا۔ "اب ہمیں اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔"

ہم نے کوٹھڑی کی لالٹین بجھا دی۔ باہر نکل کر کوٹھڑی کو تالا لگایا اور ٹریننگ کیمپ کی طرف روانہ ہوگئے ہم چاہتے تھے کہ سانپ کو ٹارگٹ کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر چھوڑا جائے۔ ہم اسی پہاڑی پر آ گئے جہاں سے ہمیں نیچے کیمپ کی بیرکیں اور ساوتری کے کیبن کے باہر جلتی لالٹین کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ یہاں بجلی نہیں تھی اور رات کو لالٹین اور لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔ قادر خان نے کہا۔

"میں سانپ کو چھوڑنے لگا ہوں۔ تم پرے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ قادر خان نے تھیلے میں سے ڈبہ نکال لیا۔ پھر

بڑی احتیاط کے ساتھ اس کا ڈھکن الگ کیا اور جلدی سے سانپ کو نیچے ڈھلان کی طرف پھینک دیا۔ سانپ کی پھنکار کی آواز بلند ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

رات کی تاریکی میں سانپ کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم درختوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے اور نیچے کیمپ کی طرف دیکھنے لگے۔ کیمپ کی بیرکوں کے کونوں پر لیمپ روشن تھے جن کی روشنی بہت دھندلی تھی۔ قادر خان کہنے لگا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق ان بیرکوں میں سے ایک بیرک میں ساتوں لڑکیاں رات کو سوتی ہیں۔ ایک بیرک میں یہودی انسٹرکٹر ہوتا ہے اور دوسرے ملازم بھی وہیں سوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے سانپ ان نوکروں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"سانپ کو ہم نے دو دن تک بھوکا پیاسا رکھا ہے۔ ویسے سانپ کئی کئی دن تک تھوڑی سی آکسیجن پر زندہ رہ سکتا ہے اور کھائے بغیر بھی کئی دن نکال لیتا ہے مگر یہ سانپ جو سب سے زیادہ زہریلا ہے اور چھوٹا ہے اس کے اندر زہر کی بہت سخت گرمی خشکی ہوتی ہے اس کو دن میں تین بار پیاس لگتی ہے۔ اسے پانی نہیں ملا۔ یہ پاگل ہو چکا ہے۔ جن کی بو پر یہ جا رہا ہے ان کو تو یہ ہر حالت میں مار ڈالے گا۔ لیکن اس کے راستے میں کوئی دوسرا آدمی بھی آیا تو یہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ اپنے ٹارگٹ کے خون سے اپنی پیاس بجھائے گا۔"

"اس کے بعد یہ ساوتری کے مکان پر آ جائے گا ناں؟"

میرے سوال کے جواب پر قادر خان نے کہا۔ "بہت ممکن ہے کہ یہ سب سے پہلے ساوتری کو ڈسے کیونکہ اس کا کیبن راستے میں ہی آتا ہے لیکن خیال یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی یہودی انسٹرکٹر کو نشانہ بنائے گا کیونکہ اس کی تلاش

میں یہ ایک مدت سے بھٹکتا پھر رہا ہے۔ بہرحال ہمیں کچھ دیر اسی جگہ بیٹھ کر انتظار کرنا ہو گا۔"

رات گزرتی جا رہی تھی کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جنگل ایسے سنسان تھا جیسے اسے بھی سانپ سونگھ گیا ہو۔ بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نیچے کیمپ میں سے کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں آدمیوں کی تھیں۔ قادر خان نے میری طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔

"لگتا ہے نوکروں کی آنکھ کھل گئی ہے۔"

آوازیں جیسے ایک بار ہی بلند ہو کر جیسے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ قادر خان مسکرایا کہنے لگا۔

"سانپ نے کیمپ کا ٹارگٹ مار لیا ہے۔ کیمپ کے سارے مردوں اور لڑکیوں کو اس نے ڈس کر ہلاک کر دیا ہے۔ چلو نیچے چل کر پتہ کرتے ہیں۔"

وہ تھیلا ہمارے پاس ہی تھا جس میں لڑکیوں اور ساوتری کی انگیاں تھیں۔ سانپ والا خالی ڈبہ بھی اور وہ چھوٹے کاغذ بھی تھے جنہیں ہم نے لاشوں کی گردنوں میں ڈالنا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے اندھیرے میں پہاڑی کی ڈھلان اتر کر نیچے کیمپ میں آ گئے۔ یہ بالکل وہی منظر تھا جو اس سے پہلے میں بمبئی والے ٹریننگ سینٹر میں رات کو دیکھ چکا تھا۔ وہاں کوئی گارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک بیرک کا دروازہ کھول کر اندر گئے تو دیکھا کہ لالٹین جل رہی تھی اور ایک چارپائی پر ایک گورے آدمی کی لاش پڑی تھی۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو اسے پہچان لیا۔ یہ یہودی انسٹرکٹر جوزف کی لاش تھی۔ لاش پتھر بن چکی تھی۔ سانپ نے سب سے پہلے شاید اسی دشمن کو ڈسا تھا۔ دوسرے بیرک میں گئے تو

وہاں تین ملازموں کی لاشیں زمین پر ادھر ادھر پڑی تھیں۔ ایک لاش کے ہاتھ میں ابھی تک لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ لگتا تھا کہ انہوں نے سانپ کو مارنے کی کوشش کی تھی کہ سانپ نے انہیں بھی ڈس کر ہلاک کر دیا۔

ہم نے واپس جا کر یہودی جوزف کی گردن میں لکھا ہوا کاغذ نائیلون کی رسی سے لٹکا دیا۔ اس کے بعد ہم کونے والی بیرک میں گئے۔ یہاں بڑا دردانگیز منظر تھا۔ ساتوں کی ساتوں طوائف لڑکیاں اپنی اپنی چارپائیوں پر مردہ پڑی تھیں۔ ان کی لاشیں بھی سانپ کے ڈسنے سے پتھر بن چکی تھیں۔ ہم نے جلدی جلدی ان کی گردنوں میں بھی لکھے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے لٹکائے اور وہاں سے تیز تیز قدموں سے باہر نکل کر اوپر ساوتری کے کیبن کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ساوتری کا صرف ایک ہی بوڑھا ملازم تھا۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ کیبن میں اندھیرا تھا۔ باہر جو لیمپ جل رہا تھا اس کی کمزور روشنی میں صحن کا باغیچہ سنسان پڑا تھا۔

ہم نے دروازے کو کھولنا چاہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم دوسری طرف گئے جدھر کھڑکی تھی۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ ہم بوڑھے ملازم کی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ خدا جانے نوکر کہاں چلا گیا تھا۔ اس کی لاش بھی کہیں نہیں پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے بڑی مشکل سے ساوتری کے کمرے کے دروازے کا تالہ اندر سلاخ ڈال کر توڑا اور اندر داخل ہو گئے۔ اندر چھوٹا سا لیمپ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں ہم نے ساوتری کو دیکھا کہ پلنگ پر اس طرح مردہ پڑی تھی کہ اس کا آدھا دھڑ پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ سانپ کی پھنکار سن کر اس نے پلنگ سے اٹھ کر دوڑنے کی کوشش کی ہو گی کہ سانپ نے اسے پلنگ سے نیچے اترنے کی مہلت نہ دی اور وہیں ڈس کر ہلاک کر دیا۔ ہم نے ساوتری کے گلے میں کاغذ کا ٹکڑا لٹکایا اور وہاں سے باہر نکل آئے۔ ابھی ہم ساوتری کے مکان کے صحن میں ہی تھے کہ ہمیں سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ قادر خان وہیں رک گیا اور اندھیرے میں دیکھنے لگا۔

"سانپ یہیں ہے۔ مگر وہ ہماری طرف کیوں آ رہا ہے؟ ایسی حالت میں سانپ واپس اپنے سپیرے کی طرف نہیں آیا کرتا۔ وہ پانی کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ کیونکہ اتنے آدمیوں کو ڈسنے سے اس کے بدن میں بہت زیادہ گرمی پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اچھا ہے کہ سانپ یہیں ہے۔ تم اسے پکڑ کر ڈبے میں بند کر لو یہ آگے بھی ہمارے کام آئے گا۔"

قادر خان نے اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے تجربہ کار سپیروں کی چمک نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگا۔

"مجھے کچھ اور ہی شبہ ہے۔ یہاں سے نکل چلو۔ مگر احتیاط سے چلنا تم اناڑی ہو۔ میرے آگے آگے چلو۔"

ہمارا رخ ہمارے نہر والے کاٹج کی طرف تھا۔ رات کا اندھیرا جنگل میں پھیلا ہوا تھا۔ ہم ایک ایسے راستے سے جا رہے تھے جو ذرا کھلا کھلا راستہ تھا اور ادھر درخت بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہم نہر کے کنارے نکل آئے۔ رات کے سناٹے میں نہر خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ یہاں سے ہمارا کاٹج چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔

چلتے چلتے قادر خان رک گیا۔ میں اس سے دو قدم آگے تھا۔ کہنے لگا۔

"حیدر علی! محتاط رہنا۔ مجھے لگتا ہے کہ سانپ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔"

میں ڈر گیا کم بخت یہ سانپ ہمارا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟ میں قادر خان کے قریب آ گیا۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے سانپ نہر پر آیا ہو۔ تم نے کہا تھا ناں کہ اتنے آدمیوں کو ڈسنے کے بعد سانپ کے اندر گرمی اور خشکی بڑھ جاتی ہے اور وہ پانی کی تلاش

میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔"

قادر خان اندھیرے میں ادھر ادھر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے بازو کو پکڑ کر کاٹج کی طرف کھینچا اور کہا۔

"یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ آ جاؤ۔"

کاٹج والی کوٹھڑی کھول کر ہم اندر گئے۔ قادر خان نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ لالٹین جلائی اس کی روشنی میں فرش کے چاروں کونوں کو دیکھا پھر وہ تھیلا چارپائی پر رکھ دیا جس میں سات لڑکیوں اور ساوتری کی انگیاں تھیں اور سانپ کا خالی ڈبہ تھا۔ اس نے خالی ڈبہ نکال کر باہر رکھ لیا کہنے لگا۔

"سانپ کو میں صبح پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا ہمارے پیچھے لگے رہنا میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

ہم نے اپنے سادھوؤں والے کپڑے اتار کر دوسرے عام کپڑے پہن لیے تھے۔ اپنی پستولیں اور کمانڈو چاقو کپڑے میں لپیٹ کر چارپائی کے نیچے رکھ دیے تھے۔ قادر خان کے چہرے پر تشویش کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ ماہر سپیرا تھا۔ اسے کوئی چیز، کوئی خیال پریشان کر رہا تھا۔

کہنے لگا۔ "سانپ کو ہمارا تعاقب نہیں کرنا چاہیے حیدر علی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ قادر خان چونک پڑا۔ "وہ یہاں بھی آ گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بھائی یہ اس کا اڈہ ہے۔ وہ اپنے ڈبے کی پٹاری میں واپس جانا چاہتا ہے۔"

قادر خان کسی ماہر سپیرے کی طرح بولا۔

"نہیں حیدر علی! تم نہیں جانتے مجھے اس میں کوئی اور ہی بات نظر آ رہی.

ہے۔ چارپائی پر سے پرانی چادر اٹھا کر لے آؤ۔"

میں نے پرانی چادر اٹھائی اور کوٹھڑی کے دروازے میں جہاں جہاں درزیں تھیں ان کو چادر سے بند کر دیا۔

"میں سانپ کو صبح تک باہر ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

کوٹھڑی کی کھڑکی میں بھی کچھ درزیں تھیں۔ قادر خان کہنے لگا۔

"تھیلا ادھر لاؤ۔ ہم ان درزوں میں لڑکیوں کی انگیاں پھنسا کر انہیں بھی بند کر دیتے ہیں۔"

تھیلا کھول کر قادر خان نے اس کے اندر جتنی انگیاں تھیں ساری باہر نکال لیں۔ تھیلے کی تہہ میں کھدر کوئی کپڑا دیکھ کر قادر خان بولا۔

یہ کھدر کی انگیا کس کی ہے؟"

میں نے کھدر کا کپڑا باہر نکالا تو وہ میری ایک پرانی بش شرٹ تھی۔

میں نے کہا۔ "یہ تو میری پرانی بش شرٹ ہے۔"

یہ اسی تھیلے میں کہاں سے آ گئی؟"

قادر خان نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بولا۔

"اب سمجھ میں آیا کہ سانپ اس کوٹھڑی کے گرد چکر کیوں لگا رہا ہے اور ہمارا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔ اس نے لڑکیوں کی انگیوں کے ساتھ تمہاری قمیض کی بو بھی سونگھ لی ہے۔ اب وہ تمہیں ڈسنے کی فکر میں ہے۔"

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس موذی اور خطرناک سانپ کی ہلاکت خیزی سے واقف تھا۔ میں قادر خان کا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا۔

"ہمیں اس سانپ کو مار ڈالنا چاہیے یہ تو مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔"

قادر خان کو بھی تشویش لگ گئی تھی۔ کہنے لگا۔

"بالشت بھر کے سانپ کو مارنا اتنا آسان نہیں ہے اور پھر یہ انتہائی چالاک سانپ بھی ہے۔ خطرہ محسوس ہو تو پلک جھپکنے میں جہاں چاہے چھپ جاتا ہے۔

اسے زمین جگہ دے دیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اس سانپ سے نہیں بچ سکتا۔"

قادر خان اٹھ کر کھڑکی اور دروازے کی جو درزیں باقی رہ گئی تھیں ان میں لڑکیوں کی انگیاں ٹھونسنے لگا۔

"تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ سانپ عیار اور موذی ہے تو میں نے بھی زندگی کے پانچ سات سال بنگالی سپیروں کے ساتھ یونہی نہیں گزارے۔ میرے پاس اس کا ایک توڑ ہے۔"

کسی حد تک مجھے تسلی ہوئی اور ذرا خوف کم ہوا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"قادر بھائی! ہماری زندگیاں اس لیے بڑی قیمتی ہیں کہ ہمارا مشن بڑا قیمتی ہے۔ یہ بڑا المیہ ہوگا کہ ایک بالشت بھر کا سانپ مجھے ڈس کر میری زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے۔ میں تو صبح ہوتے ہی اس کی تلاش میں نکل جاؤں گا اور اسے ڈھونڈھ کر ہلاک کر دوں گا۔"

قادر خان بولا۔

"میں تمہیں اس کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دوں گا جب تک کہ میں اس مصیبت کا حل تلاش نہیں کر لیتا۔ تم سانپوں کی اور خاص طور پر اس سانپ کی نفسیات اور طاقت سے واقف نہیں ہو تم اسے آگے تلاش کر رہے ہوگے اور یہ پیچھے سے آ کر تم پر حملہ کر دے گا۔ اس کی ساتویں بلکہ آٹھویں حس بھی ہے جو نہ صرف اسے ایک میل سے دشمن دکھا دیتی ہے بلکہ یہ ایک میل کے دائرے کے اندر اندر یہ اپنے دشمن کی معمولی سے معمولی آہٹ کو بھی پہچان کر روپوش ہو جاتا ہے۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس اس کا ایک توڑ موجود ہے۔ وہ کیا

ہے؟"

میرے سوال پر قادر خان کہنے لگا۔

"جنگل میں ایک بوٹی ہوتی ہے۔ میں اس بوٹی کو پہچانتا ہوں۔ یہ بوٹی بھارت کے سبھی جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے اتر پردیش کے اس جنگل میں بھی ضرور ہوگی۔ میں صبح جنگل میں جاکر اسے تلاش کروں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ بوٹی کیا کرے گی۔"

قادر خان نے کہا۔

"اس بوٹی کے دو تین پتے چبا کر کھاؤ گے تو تمہارے بدن سے تمہاری اپنی بو کے ساتھ ساتھ اس بوٹی کی بو بھی خارج ہونی شروع ہو جائے گی۔ تمہارے بدن کی بو سانپ کو تمہاری طرف لائے گی مگر اس بوٹی کی بو سانپ کو تمہارے قریب نہیں آنے دے گی۔ اس کے سوا اس موذی سانپ سے بچنے کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا کہ اس بوٹی کا اثر میرے جسم پر کتنی دیر تک رہے گا۔ قادر خان نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ تین دن تک بوٹی کی خاص بو تمہارے بدن سے خارج ہوتی رہے گی۔ چوتھے دن تمہیں دوبارہ بوٹی کے پتے چبا کر نگلنے پڑیں گے۔

"میں نے کہا۔ "یہ تو میرے واسطے ایک مصیبت ہوگی۔ بوٹی کے آخر کتنے پتے میں اپنے پاس رکھ سکوں گا؟ ایک دن بوٹی ختم ہو جائے گی اور میں جنگل میں اس کو تلاش بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں جان کی بازی لگا کر سانپ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی کوشش کروں۔"

قادر خان بولا۔

"کیوں نہیں۔ بوٹی کے پتے کھانے کے بعد تم سانپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کر سکتے ہو لیکن اس کے باوجود یہ بڑا خطرناک کھیل ہوگا۔ ایک تو یہ

مشکل ہوگی کہ سانپ تم سے دور دور رہے گا۔ تم اس کے قریب جاؤ گے اور کسی جگہ پر اسے گھیر بھی لوگے تو وہ گھبرا کر تم پر وار کر دے گا۔ اگرچہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا مگر میں بھی وہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ سانپ تمہیں اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تم بھی ان عورتوں میں شامل ہو جنہوں نے اسے تین دن تک بھوکا پیاسا ڈبے میں بند رکھا تھا۔"

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ قادر خان سورج نکلنے کے بعد جنگل میں جا کر بوٹی تلاش کر کے لائے گا جس کے پتے چبا کر میں نگل لوں گا اور یوں تین دن کے لیے موذی سانپ سے محفوظ ہو جاؤں گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ رات ہم نے کسی طرح کچھ سو کر کچھ جاگ کر گزار دی۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ ٹریننگ کیمپ میں پیشہ ور لڑکیوں اور یہودی انسٹرکٹر کی موت اور ان کے گلے میں جو ہم نے دوسری طوائفوں کو خبردار کرنے کے لیے رقعہ لکھ کر لٹکایا تھا۔ اس کی خبر پریس میں چھپی ہے یا نہیں۔ جہاں ہم رہ رہے تھے وہاں کسی اخبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر موذی سانپ کی نئی مصیبت کھڑی نہ ہو جاتی تو قادر خان نے اخبار لینے مراد آباد جانا تھا۔ مگر اب وہ دن نکلتے ہی بوٹی کی تلاش میں چلا گیا۔ ساری رات کوٹھڑی کے اردگرد سانپ کی پھنکار کی آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتی رہی تھیں۔

قادر خان کے جانے کے بعد میں نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے ساری درزوں کو ان میں کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا تھا۔ قادر خان نے جنگل میں بڑی دیر لگا دی وہ کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس دوران مجھے باہر سے کسی کسی وقت سانپ کی پھنکار کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ یہ پھنکاریں بڑی غصیلی تھیں۔ قادر خان کے ہاتھ میں جھاڑی کا مٹھا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم خوش قسمت ہو حیدر علی! مجھے بوٹی کے واسطے جنگل میں زیادہ دربدری نہیں کرنی پڑی۔"

ہم نے دروازہ اور کھڑکی بند کر رکھی تھی۔ صرف سانپ کے ڈر کی وجہ سے لالٹین جلا دی تھی۔ قادر خان نے بوٹی کی جھاڑی میں سے پتے الگ کرنے شروع کر دیے۔ کہنے لگا۔

"میں اسے نہر میں اچھی طرح سے دھو کر لایا ہوں۔"

کافی پتے نکل آئے تھے۔ اس نے چھ سات پتے مجھے دے کر کہا۔

"بسم اللہ کر کے انہیں چبا کر نگل جاؤ۔ باقی میں پوٹلی میں باندھ کر رکھ لیتا ہوں۔"

یہ پتے نیم کے پتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور کنگریوں والے تھے۔ میں نے ایک پتہ منہ میں ڈال کر چبایا تو اس کا ذائقہ ہلکا کڑوا تھا۔ قادر خان بولا۔

"اس کے ذائقے پر نہ جانا۔ بس چھ سات پتے چبا کر نگل جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تین دن تک یہ سانپ تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ تم ابھی

اس کی تاثیر دیکھو گے باہر جو کسی کسی وقت سانپ کی پھنکار سنائی دے جاتی ہے یہ دور بہت دور چلی جائے گی۔"

میں چھ سات پتے منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ پھر انہیں نگل لیا۔ میرا منہ کڑوا ہوگیا۔ میں نے قادر خان سے کہا۔

"بھائی تھوڑا پانی پی لوں۔"

قادر خان نے مجھے پانی پینے سے منع کر دیا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تمہارا ذائقہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ایسے ہی ہوا۔ پتے کھانے کے کوئی ایک منٹ بعد میرے منہ کا ذائقہ میٹھا میٹھا سا ہوگیا۔ قادر خان نے بڑے اعتماد کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ کپڑے جو درزوں میں ٹھونس رکھے تھے وہ بھی باہر نکال دیے۔ کہنے لگا۔

"بالکل فکر نہ کرو۔ تمہارے جسم سے بوٹی کی بو خارج ہونا شروع ہوگئی ہے۔ سانپ یہاں سے دور چلا گیا ہے۔"

اس کا کہنا واقعی درست ثابت ہوا۔ پہلے جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانپ کے پھنکارنے کی آواز آ جاتی تھی اب بالکل بند ہوگئی۔ بوٹی جس پوٹلی میں بند تھی قادر خان نے اسے تھیلے میں ڈال کر تھیلا دیوار کے ساتھ لٹکا دیا اور کہنے لگا۔

"اب بے شک تم میرے ساتھ مراد آباد چلو ہو سکتا ہے آج کے اخباروں میں ٹریننگ کیمپ والے واقعے کی خبر چھپ گئی ہو۔"

ہم نے کوٹھڑی کو تالا لگایا اور مراد آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں جنگل میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ مگر سانپ کی پھنکار بالکل غائب ہو چکی تھی۔ قادر خان واقعی بڑا زبردست سپیرا تھا۔ ہم مراد آباد پہنچنے کے بعد سیدھا نواب صاحب کے ہاں گئے۔ نواب صاحب نے ہم سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

قادر خان بولا۔ "نواب صاحب پہلے ناشتہ کرائیے۔ بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

نواب صاحب مسکرانے لگے۔ انہوں نے ہمارے کھلے ہوئے چہروں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارا مشن کامیاب رہا ہے۔ ناشتے پر ہم نے بلکہ قادر خان نے نواب صاحب کو سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا نواب صاحب بولے۔

"آج کے اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں چھپی۔ ہو سکتا ہے کل کے اخبار میں چھپ جائے۔ تم لوگوں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ برائی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔"

ہم نے نواب صاحب کو موذی سانپ کے میرے پیچھے لگ جانے اور جڑی بوٹی کے پتے کھا کر تین دن کے واسطے سانپ سے محفوظ ہو جانے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم نے وہ دن اور رات نواب صاحب کے مکان پر ہی گزاری۔ اس دوران ہم باقاعدگی سے ریڈیو اور بھارت کے ٹیلی ویژن پر خبروں کے بلٹن سنتے رہے۔ ٹریننگ کیمپ والے واقعے کی کوئی خبر نشر نہیں کی گئی تھی۔ نواب صاحب کہنے لگے۔

"حکومت نے جان بوجھ کر اس خبر کو دبا دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پریس میں بھی یہ خبر نہ آئے۔"

دوسرے دن نواب صاحب نے اپنے ملازم کو بھیج کر ہندی انگریزی اور اردو کے تقریباً سارے اخبار منگوا لیے۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی اخبار میں بھی یہ خبر نہیں چھپی تھی۔ اس سے پہلے جب ہم نے بمبئی والے ٹریننگ کیمپ میں واردات کی تھی تو اس کی خبر تقریباً سبھی اخباروں میں چھپی تھی۔ اس بار بھارتی حکومت نے اس خبر کو دبا دیا تھا اور چھپنے یا نشر ہونے نہیں دیا تھا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے بیٹھے تو نواب صاحب بھی آ گئے۔ کہنے لگے۔

"یہ خبر اخباروں میں تو نہیں آئی۔ دوردرشن پر بھی اسے نشر نہیں کیا گیا

لیکن مرد آباد شہر میں لوگ دبی زبان میں اس واقعے پر تبصرے کر رہے ہیں اور حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ ایک دم سے دس بارہ آدمیوں کو کس نے قتل کر ڈالا۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ڈاکوؤں کا کام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ کشمیری کمانڈوز کی کارروائی تھی اور تم لوگوں نے جو لاشوں کی گردنوں میں اس مضمون کے کاغذ لٹکا دیے تھے کہ آئندہ اگر کسی عورت کو جاسوسی اور تخریب کاری کے لیے پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا تو اسکا انجام بھی یہی ہوگا۔ عام لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ کارروائی کشمیری کمانڈوز نے کی ہے۔"

ہمارا مشن کامیاب رہا تھا۔ ہمارا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ ہم بھارتی سرکار کی پاکستان دشمن ایجنسی کو خبردار کرنا چاہتے تھے کہ اگر ان کی طرف سے آئندہ اس قسم کا کوئی ناپاک منصوبہ بنایا گیا تو اس کا حشر بھی یہی ہوگا اور یہ انتباہ حکومت تک پہنچ گیا تھا۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ اب ہمارا وہاں پر کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے نواب صاحب سے کہا کہ ہمارا مشن مکمل ہو گیا ہے اب ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بخوشی اجازت دے دی۔ دن کے وقت ہم مراد آباد سے ان کے نہر کنارے والے کاٹیج میں گئے۔ وہاں سے وہ تھیلا اٹھایا جس میں ہمارے پستول دو چاقو اور سانپ سے محفوظ رکھنے والی بوٹی کے پتے تھے اور واپس مراد آباد جانے کی بجائے سنبل کے سٹیشن سے برانچ لائن والی ایک ٹرین میں سوار ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ وہاں سے مین لائن شروع ہو جاتی تھی اور جی آئی پی سیکشن کی گاڑیاں آگرہ، گوالیار، جھانسی اور بھوپال سے ہوتی ہوئی بمبئی کو جاتی تھیں۔

میں دنوں کا حساب برابر رکھ رہا تھا۔ مجھے سانپ کے تریاق کی بوٹی کے پتے کھائے دو دن گزر گئے تھے۔ اگرچہ قادر خان نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا کہ ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں سانپ مجھ سے دور دور رہ کر میرے جسم کی بو

پر تعاقب کرتا بہت پیچھے رہ گیا ہوگا اور وہ ہمارے بمبئی کے جنگل والی حویلی میں پہنچنے کے دس بارہ دن بعد وہاں پہنچے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں سانپ سے ڈرا ہوا تھا۔ میں پتھر کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ ہمیں بمبئی پہنچتے پہنچتے مزید دو دن لگ گئے۔ میں نے تین دن گزرنے کے بعد چوتھے دن ٹرین میں سفر کرتے ہوئے تریاق بوٹی کے چھ پتے تھیلے میں سے نکال کر چبا کر نگل لیے۔

قادر خان مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ویسے اچھا کرتے ہو کہ احتیاط سے کام لیتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "بھائی میں یہ مصیبت زیادہ دیر تک اپنے اوپر مسلط نہیں کر سکتا۔ بمبئی والی حویلی میں پہنچنے کے بعد میں اس سانپ کو یقینی طور پر ہلاک کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد ہی میں سکون کے ساتھ اپنا کوئی اگلا مشن شروع کر سکوں گا۔"

قادر خان نے کوئی جواب نہ دیا اور سگریٹ پیتے ہوئے ڈبے کی کھڑکی میں سے ریل کے باہر کا منظر دیکھتا رہا۔

بمبئی کے قرب و جوار کے جنگل میں قادر خان اور وزیر علی بھائی کی جو خفیہ حویلی تھی وہاں پہنچے تو وزیر علی نے کہا۔

"سنبل والے ٹریننگ کیمپ کی دہشتناک خبر بمبئی تک پہنچ گئی ہے۔ تم لوگوں نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے۔ مجھے اس کی تفصیل سناؤ۔"

ہم نے اسے سارے واقعات سنائے اور قادر خان نے اسے یہ بھی بتایا کہ موذی سانپ نے میرے کرتے کو سونگھ کر میرے جسم کی بو پا لی ہے اور اب وہ مجھے ڈسنے کے لیے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بھائی وزیر علی تو پریشان ہوگیا۔ کہنے لگا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ سانپ تو چھلاوہ سانپ ہے۔ کسی کے قابو میں نہیں آئے گا۔ وہ حیدر بھائی پر حملہ ضرور کرے گا۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

تب قادر خان نے اسے جنگل کی بوٹی کے بارے میں بتایا۔ وزیر علی بڑے غور سے سنتا رہا۔ وہ کچھ مطمئن نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"قادر خان! حیدر علی کی زندگی بڑی قیمتی ہے یہ زندگی اتنی سستی نہیں ہے کہ ایک بالشت بھر کا سانپ جھاڑیوں میں سے نکل کر اسے ڈس کر ختم کر دے۔ ہمیں اس سانپ کو ڈھونڈھ کر ہلاک کرنا ہوگا۔ اس مصیبت کا یہی ایک حل ہے۔"

قادر خان بولا۔ "ابھی تو سانپ بہت پیچھے رہ گیا ہوا ہے۔ وہ حیدر علی کی بو پر ضرور آئے گا۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اسے کچھ نہیں تو دس دن ضرور لگ جائیں گے۔ ہم ریل گاڑی سے یہاں پہنچے ہیں اور سانپ جنگلوں میں سے گزر کر دریاؤں، نہروں، کھڈوں اور نالوں کو پار کرتا ہوا آ رہا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں"۔ وزیر علی بولا۔ "ہم سانپ کا انتظار کر لیں گے۔ جب تک ہم اس سانپ کا سر نہیں کچل دیتے یہاں سے کہیں آگے نہیں جائیں گے۔"

قادر خان نے وزیر علی سے پوچھا۔

"تم ہمیں پہلے تو یہ بتاؤ کہ ہمارے بعد یہاں کے حالات کیسے رہے؟ کیا بمبئی سے کوئی ایسی خبر تو نہیں ملی کہ بال ٹھاکرے پر یہ راز کھل گیا ہو کہ جس شخص کو اس نے زہر کا ٹیکہ لگا کر زمین میں دفن کیا تھا وہ مرا نہیں زندہ ہے؟"

قادر کا اشارہ میری طرف تھا۔ وزیر علی بولا۔

"قادر بھائی! تم کیسی بچوں والی باتیں کرتے ہو۔ یہ راز کیسے کھل سکتا ہے؟ ہم نے جس قبر میں سے اپنے دوست حیدر علی کو زندہ نکال لیا تھا اس قبر میں ہم نے ایک انسانی ڈھانچہ بھی رکھ دیا تھا۔ بال ٹھاکرے کے آدمیوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ حیدر علی زندہ بچ گیا تھا؟"

"بس میں یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ پتہ نہیں چلا۔"

قادر خان بولا۔ "بھائی! شیوسینا کے جاسوس زمین کے اندر بھی گھومتے پھرتے ہیں۔ ہمیں ان سے پوری طرح ہوشیار رہنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے جموں جا کر کشمیری کمانڈو شیر باز سے ملنا چاہیے۔ کشمیر میں حریت پسند زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں انہیں میری ضرورت ہے۔"

وزیر علی اور قادر خان سوچ میں پڑ گئے۔ وزیر علی کہنے لگا۔

"حیدر علی! ہم تمہیں جہاد پر جانے سے نہیں روک سکتے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس موذی سانپ کو ہلاک نہیں کر لیتے جو تیری جان کا دشمن بن گیا ہے تمہیں یہاں ہمارے پاس ہی رہنا چاہیے۔"

اس خیال کی قادر خان نے بھی تائید کی اور کہا۔

"وزیر علی ٹھیک کہتا ہے حیدر! کشمیر کے محاذ پر تم دشمن سے جنگ کر رہے ہو گے۔ تمہیں کہاں اتنی فرصت ملے گی کہ تین دن کے بعد تمہیں بوٹی کے پتے کھانے ہیں تاکہ سانپ تم سے دور رہے اور سانپ تو تمہارا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک تمہیں ڈس نہیں لیتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم ابھی اسی حویلی میں ہمارے ساتھ رہو۔ میں اور وزیر علی سب سے پہلا کام یہی کریں گے کہ تمہارے دشمن سانپ کو مار ڈالیں۔"

یہ تجویز میرے بھی دل کو لگی۔ دراصل میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اب ہمارا مشترکہ مشن اس سانپ کو ہلاک کرنا ہے۔"

"اور انشاء اللہ ہم اسے ہلاک کر کے چھوڑیں گے۔"

وزیر علی نے جوش میں آ کر کہا۔ قادر خان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا ہے۔ جب وزیر علی نے اس سے اس کی الجھن کی وجہ دریافت کرنا چاہی تو وہ سر کو جھٹک کر بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

بعد میں قادر خان نے بتایا کہ اسے یقین تھا کہ ہم سانپ کو اتنی آسانی کے ساتھ ہلاک نہیں کر سکیں گے۔ وہ اسی لیے اندر سے پریشان تھا۔ مجھے سانپ کے تریاق کی بوٹی پیئے ہوئے پورے تین دن گزر گئے اور میرے جسم سے میرے بدن کی بو کے ساتھ جنگلی بوٹی کی خاص بو خارج ہونا بند ہو گئی تو وزیر علی اور قادر خان نے مجھے حویلی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ وہ خود کوٹھڑی کے باہر جھاڑیوں میں مورچہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں مراد آباد سے یہاں آئے سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ قادر خان کا خیال تھا کہ سانپ اتنی دیر میں ہمارے آس پاس کے جنگلوں میں پہنچ چکا ہو گا۔

پہلے دو تین دن تو میں دن کے وقت کوٹھڑی سے باہر نکل آتا تھا لیکن اس کے بعد مجھے دن کے وقت بھی کوٹھڑی سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوٹھڑی کی کھڑکی اور روشندان لکڑی کے تختے لگا کر بند کر دیے گئے تھے۔ صرف دروازہ دن کے وقت کھلا رہتا تھا جس کے آگے ایک جانب قادر بھائی اور دوسری جانب وزیر علی کارتوس سے بھری ہوئی بندوقیں لیے بیٹھے ہوتے۔ میں دروازے کے درمیان چارپائی پر لیٹا یا بیٹھا رہتا تاکہ میرے جسم کی بو تیزی سے سانپ تک پہنچ جائے۔ رات کے وقت دروازے کو بند کر کے میں اس کی درزوں میں کپڑے کی دھجیاں پھنسا کر انہیں بند کر دیتا تھا۔ دروازے کے آگے رات کو دو بڑے لیمپ روشن کر دیے جاتے۔ شام کے اندھیرا ہو جانے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک قادر خان بندوق اور لوہے کی سلاخ پاس رکھ کر پہرہ دیتا۔ اس کے بعد وزیر علی آ جاتا۔ قادر خان سو جاتا اور وزیر علی میرے پہرے پر آن موجود ہوتا اور سورج نکلنے تک چل پھر کر پہرہ دیتا اور سانپ کو ادھر ادھر دیکھتا رہتا کہ کہیں کسی طرف سے نکل نہ آئے۔

مزید تین دن گزر گئے۔ سانپ نہ آیا۔ چوتھی رات کو میں کوٹھڑی میں

جاگ رہا تھا اور باہر وزیر علی پہرہ دے رہا تھا۔ رات کے تین بجے ہوں گے کہ مجھے سانپ کے پھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وزیر علی نے بھی سانپ کی پھنکار سن لی تھی۔ باہر سے اس نے مجھے آواز دی۔

"حیدر علی! جاگ رہے ہو؟ میں نے سانپ کی پھنکار سنی ہے۔ وہ آگیا ہے۔"

"میں نے کہا۔ "ہاں میں نے بھی آواز سنی ہے۔ ہوشیار رہنا۔ سانپ بچ کر نہ جائے۔"

"فکر نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنا بھی خیال رکھنا۔ یہ کہیں تم پر بھی حملہ نہ کر دے۔"

وزیر علی نے جواب دیا۔

"میں اسے اتنی مہلت نہیں دوں گا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ جیسے ہی وہ تمہاری کوٹھڑی کی طرف بڑھا میں اسے وہیں ختم کر دوں گا۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ سانپ کی پھنکار سنائی نہ دی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پھنکار بڑی قریب سے سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بندوق کے فائر کا دھماکہ ہوا۔ وزیر علی نے اونچی آواز میں کہا۔

"مار ڈالا' مار ڈالا۔"

فائر کے دھماکے کی آواز سن کر قادر خان بھی باہر آگیا تھا۔ اس نے وزیر علی سے پوچھا۔ کیا ہوا؟ وزیر علی بولا۔

"سانپ کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا میں نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ ضرور مر گیا ہوگا۔ میں نے اندر سے کہا۔

"میں باہر آ رہا ہوں۔"

قادر خان کی غصے والی آواز بلند ہوئی۔

"حیدر علی! خبردار باہر مت نکلنا۔"

میں کوٹھڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وزیر علی اور قادر خان کی آوازیں کبھی قریب سے آئیں اور کبھی کچھ دور چلی جاتیں۔ شاید وہ سانپ کی لاش کو تلاش کر رہے تھے۔ دونوں سانپ کی لاش کو تلاش کرتے ہوئے واپس کوٹھڑی کے پاس آ گئے۔ وزیر علی نے کہا۔ "میں نے سانپ کو دیکھ کر نشانہ لگایا تھا۔"

قادر خان بولا۔

"اگر نشانہ ٹھیک لگا تھا تو پھر سانپ کی لاش کے ٹکڑے یہیں ہونے چاہیں تھے مگر یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ سانپ بچ کر نکل گیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دن کا اجالا پھیلنے لگا تو قادر خان نے میری کوٹھڑی کے بند دروازے کو کھٹکھٹا کر کہا۔

"حیدر بھائی! باہر آ جاؤ۔"

میں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر بھی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ مجھے چارپائی پر بٹھا دیا گیا معلوم ہوا کہ سانپ کی لاش کے ٹکڑے کہیں نہیں ملے اور سانپ بچ کر نکل گیا ہے۔ وزیر علی نہیں مان رہا تھا۔ چاند بائی نے ہمیں وہیں ناشتہ لا کر دیا۔ ہم تینوں چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ اس دوران ہم تھوڑی دیر کے بعد گردن پھیر کر چارپائی کے چاروں طرف اور نیچے جھانک کر دیکھ لیتے تھے کہ کہیں سانپ آ تو نہیں گیا۔ قادر خان مجھے کسی گہری سوچ میں لگتا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا ہم سانپ کو ہلاک کر سکیں گے یا نہیں؟ تو اس نے پیالی میں چینک سے چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"مثلاً" تم کیا سوچ رہے ہو؟" وزیر علی نے پوچھا۔

قادر خان کہنے لگا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے سانپ کو مارنے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ بچ بھی سکتا ہے جیسے آج رات بچ کر نکل گیا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو غافل پا کر یا اپنے اوپر حملہ ہوتے دیکھ کر حیدر علی پر حملہ کر دے اور اسے ڈس لے۔ اسے تو حیدر بھائی کے جسم کے ساتھ صرف منہ ہی لگانا ہوگا اور اس کا سارا زہر حیدر بھائی کے خون میں شامل ہو کر اسے پتھر کر دے گا۔"

میں اور وزیر علی کچھ نہ بولے۔ قادر خان نے کہا۔

"ہمیں اس کا بھی کچھ بندوبست پہلے سے کر رکھنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ سانپ حیدر بھائی کو ڈس لیتا ہے تو اسے کس طرح بچایا جا سکتا ہے؟

میں نے کہا۔ "اس طرف تو میرا خیال بھی نہیں گیا تھا۔ کیونکہ تم نے خود ہی ہمیں بتایا تھا کہ اس سانپ کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے۔"

قادر خان بولا۔

"دنیا میں کوئی سانپ ایسا نہیں ہے جس کے کاٹے کا علاج قدرت نے پیدا نہ کیا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ سانپ ڈسنے کے بعد آدمی کو اتنی مہلت ہی نہ دے کہ وہ اپنا علاج کر سکے۔"

وزیر علی نے کہا۔ "تو تمہارے دماغ میں اس موذی سانپ کے کاٹے کا کیا علاج ہے؟"

قادر خان نے سگریٹ لگا لیا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس نے آنکھیں سکیڑ لیں اور آہستہ آہستہ بولا۔

"قدرت نے ہر زہر کا تریاق پیدا کر رکھا ہے۔ جو بچھو آدمی کو کاٹ کر مار ڈالتا ہے یا موت کے قریب پہنچا دیتا ہے اس کے زہر کا توڑ اسی بچھو کے جسم میں موجود ہے۔ اگر آدمی اسی بچھو کو مار کر اس کو جلا دے اور اس کی راکھ اس جگہ لگا دے جہاں بچھو نے کاٹا تھا تو زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ

سانپ اس قدر مہلک زہر اپنے منہ میں رکھتا ہے کہ اگر آدمی کے جسم میں ذرا سا داخل ہو جائے تو آدمی مر کر پتھر کا ہو جاتا ہے مگر خود اس سانپ کو زہر کچھ نہیں کہتا۔ سانپ پھر نہیں مرتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ سانپ کے اندر اس زہر کا تریاق ضرور موجود ہو گا۔"

وزیر علی نے کہا۔ "کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو۔ مگر سانپ کے منہ میں زہر کہاں ٹھہر سکتا ہے۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"سانپ کے تالو کے ساتھ ایک نرم جھلی کی تھیلی بنی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر اس تھیلی میں ہوتا ہے۔ اس تھیلی کو قدرت نے اس قدر طاقتور بنایا ہے کہ زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا اثر اس تھیلی پر نہیں ہوتا۔ جو زہر انسان کے خون میں داخل ہو کر اس کے جسم کو موم کی طرح پگھلا دیتا ہے وہی زہر سانپ کے منہ کی تھیلی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

وزیر علی نے کہا۔

"لیکن ہمارے دوست حیدر بھائی کے پاس تو ایسی کوئی تھیلی نہیں ہے۔ اس کو سانپ کے زہر سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ سوچنے کی تو یہ بات ہے۔"

قادر خان غور و فکر کرنے کے انداز میں بولا۔

"جنگل میں اور خاص طور پر بمبئی اور مدھیہ پردیش کے جنگلوں یں ہر قسم کے زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں اور سینکڑوں' آدمی ان سانپوں کے ڈسنے سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بہت کم سپیروں کو یہ راز معلوم ہے کہ ان جنگلوں میں ہی قدرت نے ایک ایسی جڑی بوٹی بھی اگائی ہوئی ہے جس پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلتے ہیں۔ ان پھولوں کی شکل سانپ کی شکل جیسی ہوتی ہے۔ یہ پھول اس بوٹی کو بارہ مہینے لگتے ہیں۔ اگر ان پھولوں کو کوٹ کر اس کا سفوف آدمی کو کھلا دیا جائے تو اس پر زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا بھی ارز نہیں

ہوتا۔"

وزیر علی خوش ہو کر بولا۔

"قادر بھائی! تم نے تو سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ آج ہی جنگل میں جا کر یہ پھول لے آتے ہیں اور حیدر بھائی کو ان کا سفوف کھلا دیتے ہیں۔ ساری مشکل حل ہو جائے گی۔"

قادر خان کہنے لگا۔

"مشکل یہ ہے کہ یہ بوٹی آسانی سے نہیں ملتی۔ اس کو تلاش کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے لیکن میں نے اسے تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حیدر بھائی کی مصیبت کا یہی ایک حل ہے۔"

میں نے اپنی تسلی کے لیے اس سے پوچھا۔

"کیا یہ بوٹی ہمارے آس پاس کے جنگل میں مل جائے گی؟"

قادر خان کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر تلاش کی جائے تو ضرور مل جائے گی۔ بنگال کے سندر بن والے جنگل میں تو یہ بوٹی عام مل جاتی ہے۔ پہلے میں یہاں دیکھتا ہوں۔ اگر یہاں نہ ملی تو میں سندر بن جا کر اسے لے آؤں گا۔ تم لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ سانپ کے کاٹے سے کبھی کوئی سپیرا نہیں مرتا۔ اس لیے نہیں مرتا کہ اس کے پاس سانپ کا منکا ہوتا ہے۔ نہیں۔ منکا محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے سپیرے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر سپیرے نے قرنگ پھنی بوٹی کا سفوف پی رکھا ہوتا ہے اور ساری زندگی کے لیے وہ سانپ کے زہر سے محفوظ ہوگیا ہوتا ہے۔ اس بوٹی کو سپیرے اپنی زبان میں قرنگ پھنی کہتے ہیں۔"

اب قادر خان نے اس پرانی حویلی کے اردگرد کے جنگل میں قرنگ پھنی بوٹی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ دن کے وقت نکل جاتا اور سورج غروب ہونے کے بعد واپس آ جاتا۔ اس دوران ہم لوگ چوکس اور پوری طرح ہوشیار

ہو کر بیٹھے رہتے۔ میں کوٹھڑی کے دروازے میں چارپائی پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھا رہتا اور وزیر علی بھری ہوئی بندوق لیے کوٹھڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھا پہرہ دیتا۔

اس طرح تین دن گزر گئے۔ اس دوران رات کے وقت ہم نے سانپ کی پھنکار کی آواز بھی سنی۔ یہ آواز سن کر ہمیں یقین ہوگیا کہ سانپ ابھی زندہ ہے اور میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہم زیادہ چوکس ہوگئے۔ چوتھے روز قادر خان نے قرنگ چھنی کی بوٹی جنگل میں ڈھونڈ نکالی۔ بوٹی کی پوری جھاڑی وہ اکھیڑ کر لے آیا۔ بوٹی کی شاخوں پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی شکل چھوٹے سانپ کی سری سے ملتی جلتی تھی۔ اس وقت ان پھولوں کو کوٹ کر پیسا گیا۔ پھر ان کا سفوف بنایا گیا۔ آدھا سفوف پانی میں گھول کر قادر خان نے مجھے پلا دیا۔ باقی جو آدھا بچا اسے گھول کر قادر خان اور وزیر علی نے پی لیا۔

وزیر علی سفوف پینے کے بعد بولا۔

"لو بھائی، ساری عمر کے لیے ایک دشمن سانپ سے تو نجات مل گئی۔"

سفوف کا ذائقہ پھیکا پھیکا تھا اور اس میں سے سونف کی طرح کی خوشبو آ رہی تھی۔ جب میں سفوف پی چکا تو قادر خان نے کہا۔

"حیدر بھائی! اب اگر اس سانپ نے تمہیں کاٹ بھی لیا تو اللہ کے فضل سے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے تمہیں کاٹنے سے اس بوٹی کے اثر کی وجہ سے سانپ خود مرجائے یا بے ہوش ہو جائے۔"

میں نے کہا۔

"اب تو مجھے کوٹھڑی کی قید سے بھی نجات مل جانی چاہیے۔ میں یہاں پڑے پڑے پتھر ہوگیا ہوں۔"

قادر خان بولا۔

"نہیں بھائی! جب تک ہم سانپ کو کچل نہیں ڈالتے میں تمہیں یہاں سے

باہر نکلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ بوٹی آخر بوٹی ہوتی ہے۔ اس کا اثر کم بھی ہو سکتا ہے۔"

اب ہم کچھ بے فکرے ہو کر سانپ کی کھوج میں رہتے۔ کبھی میں چارپائی سے نیچے اتر کر کوٹھڑی کے آگے ٹہلنے لگتا۔ کبھی وزیر علی یا قادر خان بندوق مجھے دے کر حویلی کی دوسری طرف نکل جاتے۔ انہیں اپنی خفیہ کمین گاہ کی پہرے داری بھی کرنی ہوتی تھی۔ کیونکہ مہاراشٹر کی خفیہ پولیس ان کے پیچھے لگی تھی۔ خفیہ پولیس کا مجھے بھی ہر لمحہ خطرہ لگا رہتا تھا۔ کیونکہ میں بھارتی شہری نہیں تھا۔ میں پاکستان سے آیا ہوا تھا اور میرے پاس ضروری کاغذات وغیرہ بھی نہیں تھے سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ میں شیوسینا کے مشہور دہشت گرد دھرم چند کا ہم شکل تھا۔ اگرچہ میں نے اپنی ناک کی ہڈی اوپر کروا لی تھی اور داڑھی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں پھر بھی شیوسینا کا کوئی آدمی مجھے غور سے دیکھے تو دھرم چند کہہ کر بلا سکتا تھا اور یہ بات میرا راز فاش کر سکتی تھی کہ جو پاکستانی کمانڈو دھرم چند کا ہم شکل بن کر شیوسینا میں گھسا ہوا تھا اور جسے بال ٹھاکرے نے اپنے سامنے زہر کا ٹیکہ لگوایا اور زمین میں اس کی لاش کو دفن کیا تھا وہ شخص زندہ ہے۔ چنانچہ مجھے اس طرف سے بھی ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرنگ بھنی کا سفوف پینے کے بعد ہم تینوں موذی سانپ کی طرف سے کچھ غافل ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سانپ میری گھات میں لگا ہوا تھا مگر وہ بھی محتاط ہو گیا تھا۔ خدا جانے اس کی چھٹی ساتویں یا آٹھویں حس نے بتا دیا تھا کہ تین آدمی اس کی جان لینے حویلی میں بندوقیں لیے تیار بیٹھے ہیں اور ایک بار تو اس پر فائر بھی کر دیا گیا تھا۔ ایک دن میں ناشتے کے بعد کوٹھڑی کے دروازے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وزیر علی میرے سامنے والی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ قادر خان حویلی کی طرف گیا ہوا تھا کہ اچانک سانپ کی بڑے زور سے پھنکار سنائی دی۔ وزیر علی چارپائی پر سے اچھل پڑا۔ میں چارپائی پر گھبرا کر

کھڑا ہو گیا۔

وزیر علی نے بندوق سیدھی کر لی۔ پھنکار کی آواز پر چارپائی کی پائینتی کی طرف سے آئی تھی۔ زیر علی نے ادھر بغیر دیکھے بھالے فائر کر دیا۔ میں اپنی چارپائی سے چھلانگ لگا کر وزیر علی کی چارپائی پر آ گیا۔ وزیر علی نیچے اتر کر دیکھنے لگا کہ سانپ مر گیا ہے کہ نہیں میں چھلانگ لگانے کے بعد ابھی چارپائی پر سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اچانک کوئی چیز زور سے میری گردن کے ساتھ آ کر لگی اور چمٹ گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے ہاتھ سے جھٹک دیا۔ یہ وہی موذی سانپ تھا میں نے چیخ مار کر کہا۔

"وزیر بھائی! یہ سانپ ہے۔ اس نے مجھے کاٹ لیا ہے۔"

وزیر علی نے پلٹ کر دیکھا۔ بالشت بھر کا سانپ ایک طرف جاتا مجھے بھی نظر آیا۔ وزیر علی نے فائر جھونک دیا۔ میں گردن کو پکڑ کر چارپائی پر گر پڑا۔ یہ خوف اور دہشت کا اثر تھا۔ وزیر علی نے بندوق میں دو کارتوس بھرے اور جدھر اسے سانپ نظر آیا تھا اس طرف اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ فائرنگ کی آواز سن کر قادر خان دوڑتا ہوا آ گیا۔

"کیا ہوا' کیا ہوا؟"

وہ چلایا۔ میں چارپائی پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا مگر مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میرا جسم سانپ کے زہر سے پتھر نہیں ہوا۔ سانپ نے مجھے گردن پر کاٹا تھا۔ وزیر علی اور قادر خان دوڑ کر میری طرف آئے۔ قادر خان نے میری گردن کو غور سے دیکھا۔ میں نے دہشت بھری آواز میں کہا۔

"سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

قادر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر بجا لاؤ۔ سانپ نے تمہیں ڈسا ضرور ہے مگر تم پر اس کے زہر کا اثر نہیں ہوا۔ اگر اثر ہونا ہوتا تو تم یہ کہنے کے لیے زندہ نہ رہتے کہ مجھے

سانپ نے ڈسا ہے۔"

اس نے وزیر علی سے کہا۔

"وزیر علی! قرنگ بوٹی نے اپنا کام دکھا دیا ہے۔ حیدر علی اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہے۔ سانپ کو تم نے مار ڈالا ہے ناں؟"

وزیر علی نے جھاڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تین فائر کیے ہیں میں نے وہ زندہ نہیں بچا ہوگا۔"

مجھے چارپائی پر ویسے ہی چھوڑ کر قادر خان اور وزیر علی سانپ کی لاش کے ٹکڑے تلاش کرنے جھاڑیوں کی طرف گئے مگر انہیں کچھ نہ ملا۔ قادر خان مایوس ہو کر بولا۔

"وزیر علی! سانپ ایک بار پھر بچ کر نکل گیا ہے۔ تمہیں نشانے پر فائر کرنے کی مشق کی ضرورت ہے۔"

قادر خان نے میری گردن پر جہاں سانپ نے کاٹا تھا انگلی لگا کر دیکھا اس کی انگلی پر میری گردن سے نکلا ہوا خون کا قطرہ لگا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہارے خون پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سارا زہر تمہارے جسم میں پھیلے ہوئے تریاقی سفوف نے چوس کر بے اثر کر دیا ہے۔"

اس نے انگلی پر لگے ہوئے خون کو سونگھا۔

"اس میں زہر کی ذرا سی بھی بو نہیں ہے۔ خدا نے تمہیں نئی زندگی دی ہے حیدر بھائی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر صرف سانپ کی دہشت کا تھوڑا سا اثر تھا۔ مجھے اپنے اندر کوئی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ قادر خان کہنے لگا۔

"آج کے بعد تمہیں چھوت کی کوئی بیماری نہیں لگ سکے گی۔ سانپ کے زہر نے تمہارے جسم کو ایک نئی توانائی دے دی ہے۔"

وزیر علی بولا۔ ”لیکن سانپ بچ کر نکل گیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تھوڑی دیر میں اس کی تلاش میں جاتا ہوں۔“

قادر خان بولا۔

”اب سانپ کو ہلاک کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔“

”کیوں؟ وہ حیدر بھائی کو دوبارہ آ کر کاٹ سکتا ہے۔ کیا جانے تریاقی سفوف کا اثر دو تین دن بعد کمزور پڑ جائے۔“

قادر خان کسی تجربہ کار گورو سپیرے کے انداز میں بولا۔

”وزیر بھائی! اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر انسان کو سانپوں کا تھوڑا بہت علم ضرور ہونا چاہیے۔“

پھر قادر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”حیدر بھائی اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتانے لگا ہوں جس پر تمہیں مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ سنو چونکہ تم اس موذی سانپ کے کاٹے سے مرے نہیں اس لیے یہ سانپ تمہیں مہاناگ کا انسانی روپ سمجھنے لگا ہے۔“

میں نے کہا۔

”سانپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔“

قادر خان نے جواب دیا۔ ”اگر تم اس کے ڈسنے سے مر جاتے تو تمہارے جسم سے وہ بو نکلنی بند ہو جاتی جس کو سونگھنے کے بعد سانپ تمہارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اب چونکہ اسے تمہارے جسم کی بو برابر محسوس ہو رہی ہوگی تو اسے یقین ہو جائے گا کہ تم زندہ ہو اور اس کے زہر کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سانپ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ان کے زہر کا اثر صرف اس شخص پر نہیں ہوتا جس نے مہاناگ کا انسانی روپ اختیار کر رکھا ہو اور مہاناگ کو سارے سانپ اپنا دیوتا مانتے ہیں۔ پس اب سانپ تمہیں اپنا دیوتا سمجھنے لگا ہے۔ وہ تمہارا ادب کرے گا۔ تمہاری خدمت کرے گا۔ تمہارے قریب آنے کی کوشش کرے گا۔

تمہارے پاؤں پر سر رکھنے کی کوشش کرے گا۔ پس اگر وہ ایسا کرے تو تم نہ تو
ڈرنا اور نہ اسے مارنے کی کوشش کرنا۔ یاد رکھو سانپ اگر دوست بن جائے تو
وہ انسان کا بہترین اور نہایت عقل مند دوست ثابت ہوتا ہے۔"

وزیر علی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"قادر بھائی! پھر تو مجھے سانپ سے ڈسوا لینا چاہیے۔ یہ سانپ تو میرے بڑے کام آسکتا ہے۔"

قادر خان نے کہا۔

اسے تمہارے جسم کی وہ خاص دشمنی کی بو نہیں آ رہی جس پر یہ سانپ بپھر کر حملہ کرتا ہے۔ لیکن جان بوجھ کر کسی سانپ کے ساتھ ایسا کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس میں آگے چل کر کئی خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی بات ہے کہ سانپ آدمی کا دوست بن جائے۔"

قادر خان نے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"ایسی پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ آدمی کی نیت نیک ہو تو خدا ہر مرحلے پر اپنے فرشتوں کے ذریعے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیدا ہو گئی تو تم خدا کے فضل سے محفوظ رہو گے۔ چلو اب باورچی خانے میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ آؤ وزیر بھائی! چلو بھائی۔"

اور ہم حویلی کے کچن کی طرف چل پڑے۔

پہلے میرا ارادہ بمبئی مہاراشٹر اور گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف جانے کا تھا تاکہ وہاں کے پس ماندہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کروں لیکن مراد آباد سے جو اخبار آئے تھے ان میں پڑھا کہ کشمیر میں حریت پسندوں نے اپنی

سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور وہ ہر محاذ پر بھارتی مقبوضہ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انڈین آرمی نے بھی کشمیری مسلمانوں کے خلاف اپنی وحشیانہ کاروائیاں تیز کر دی تھیں۔ چنانچہ میں نے کشمیر کے محاذ پر جا کر اپنے حریت پسند کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

موذی سانپ کا خطرہ بقول قادر خان ٹل گیا تھا۔ ویسے بھی اس کے کاٹنے سے میں ہلاک نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ قادر خان نے کہا تھا کہ قرنگ پھنی کے پتوں کا سفوف ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے احتیاط کے طور پر باقی بچا ہوا سفوف ایک ڈبی میں بند کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میرے کشمیر کے محاذ پر جانے کی قادر خان اور وزیر علی نے بھی دل سے تائید کی۔ چنانچہ میں ایک روز ان سے رخصت ہو کر مراد آباد کے سٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا اور جموں توی کی طرف روانہ ہوگیا۔

جموں توی کے کیلاش ہوٹل میں مجھے بوڑھے کشمیری سے مل کر کمانڈو شیر باز کو اپنی آمد کی اطلاع دینی تھی۔ بوڑھا کشمیری مجاہد مجھے ہوٹل میں ہی مل گیا۔ اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے ایک خاص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ مجھے کمانڈو شیر باز سے ملنا ہے۔ مجاہد کشمیری نے جواب میں مجھے خاص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ میں تمہیں کمرے میں آ کر ملوں گا۔ کیلاش ہوٹل جموں کے اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں میں سے تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں چھ سات روز تک اس مہنگے ہوٹل میں رہ سکتا تھا۔ مہنگے ہوٹل کا انتخاب میں اس لیے کرتا تھا کہ وہاں سی آئی ڈی کا خطرہ کم ہوتا تھا۔ خفیہ پولیس والے وہاں موجود ضرور ہوتے تھے مگر ہوٹل میں رہائش پذیر افراد کی بااثر شخصیت کے پیش نظر ان پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ صرف نگرانی کرتے تھے۔ جبکہ چھوٹے ہوٹلوں میں ذرا کسی مسافر پر شک پڑتا تھا تو اسے پکڑ کر تھانے لے جاتے تھے۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کر

جموں سے چھپنے والا ایک انگریزی کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے تین بار خاص انداز میں دستک دی۔ میں سمجھ گیا کہ کون آیا ہے میں نے آواز دی۔ "آ جاؤ۔" دروازہ کھول کر بوڑھا کشمیری مجاہد اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ تھا جس پر شیشے کا ڈھکن چڑھا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! آپ کے لیے پانی لایا ہوں۔ یہ معدنیاتی پانی ہے سر!"

میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور مجاہد کشمیر سے کہا۔

"شیر باز خان مجھے کہاں مل سکتا ہے؟"

کشمیری مجاہد دروازے سے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ کہنے لگا۔ "وہ جموں میں نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے۔ میں اسے آج رات کو پیغام بھجوا دوں گا کہ تم آئے ہوئے ہو اور اس سے ملنا چاہتے ہو۔"

یہ کہہ کر کشمیری مجاہد چلا گیا۔

"دوسرے دن میں دوپہر تک ہوٹل کے کمرے میں ہی رہا۔ اس دوران مجھے سانپ کا دو ایک بار خیال آیا۔ مگر چونکہ اب مجھے اس کی طرف سے جان کا خطرہ نہیں تھا اس لیے قدرتی طور پر میرے ذہن سے اس کا خیال محو ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ویسے بھی میں سانپ کے علاقے سے بہت دور بھارت کے شمال میں آ چکا تھا۔ اتنی دور سانپ کو میرے پیچھے آنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اس نے مجھے ڈسنا بھی نہیں تھا۔ میں ایک طرح سے میدان جنگ میں آگیا تھا اور میدان جنگ میں آنے کے بعد مجھے سانپ کے بارے میں قادر خان کی باتیں بے حقیقت اور بے سروپا محسوس ہونے لگی تھیں۔

مجھے جموں کے کیلاش ہوٹل میں ٹھہرے تین دن گزر گئے۔ کشمیری مجاہد میرے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے اسے کمانڈو شیر باز خان کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا تھا۔ میں زیادہ وقت ہوٹل کے کمرے میں ہی گزارتا۔ اس خیال سے کہ خوامخواہ باہر نکلنے سے خفیہ پولیس والوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔

تیسرے دن شام کے وقت میں کمرے میں لیٹا لیٹا تنگ آگیا اور جیکٹ اور اونی ٹوپی پہن کر باہر نکل گیا۔ جموں میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ کشمیر میں برفباری بھی ہو رہی تھی۔ جموں شہر میرا جانا پہچانا شہر تھا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دریائے توی کی طرف آگیا۔ ہوٹل سے نکلنے کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ میں نگاہوں میں آگیا ہوں اور میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ ہوٹل کے گیٹ سے نکلتے وقت میں نے ایک آدمی کو دیکھا تھا جو ایک طرف بنچ پر سویٹر کوٹ اور اونی ٹوپی پہنے گیٹ کے چوکیدار کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھ پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔ میں ایسی نگاہوں کو خوب پہچانتا تھا۔ میں خاموشی سے آگے نکل گیا۔ سامنے سڑک کی دونوں جانب بتیاں روشن تھیں۔ ساٹھ ستر قدم آگے جا کر سڑک دریا کے پل کی طرف مڑ جاتی تھی۔ سڑک مڑتے ہوئے میں نے گردن کو کھجانے کے بہانے پیچھے دیکھا تو مجھ سے بیس پچیس قدم پیچھے وہی گیٹ والا آدمی چلا آ رہا تھا۔ میں سڑک کا موڑ گھوم گیا۔ سمجھ گیا کہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اپنے ساتھ مراد آباد سے چلتے وقت کمانڈو چاقو یا پستول وغیرہ نہیں لایا تھا۔

"اس کی وجہ یہ تھی کہ جموں کا علاقہ حساس ترین علاقہ تھا اور یہاں داخل ہوتے وقت مسافروں کی تلاشی لی جاتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں جنگ کے محاذ پر جا رہا تھا اور محاذ پر مجھے ہر قسم کا اسلحہ مل سکتا تھا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ یہ جو خفیہ پولیس کا آدمی میرے پیچھے لگا ہے اس کے خیال میں میں ہوٹل میں اجنبی ہوں۔ پنجاب ہریانہ وغیرہ سے آیا ہوں اور وہ معمول کی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے۔ اسے میرے بارے میں پوری تفصیل اور میرے پورے ریکارڈ کا علم نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ فوراً پولیس کو اطلاع کر دیتا کہ گجرات مہاراشٹر کا خطرناک پاکستانی جاسوس اس وقت ہوٹل میں موجود ہے اور پولیس اسی وقت آ کر مجھے گرفتار کر لیتی۔ وہ محض اپنی نوکری اور اپنی ڈائری کے لیے میرا

پیچھا کر رہا تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہا تھا۔

چنانچہ میں اس سے بہت حد تک بے نیاز ہو کر چل رہا تھا۔ سامنے دریائے توی کا پل تھا جس میں اوپر پہاڑ کی ڈھلان پر بنی ہوئی عمارتوں کی روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ دریا کے پل پر آ کر میں کچھ دیر ٹہلتا رہا۔ پل پر ٹریفک آ جا رہی تھی۔ جنگلے کے ساتھ چھوٹا سا فٹ پاتھ بنا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے پیدل چلنے والے کم ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے دو ایک بار دیکھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی مجھ سے کچھ فاصلے پر میری برابر نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ تھوڑی سی تشویش مجھے ضروری ہوئی۔ میں نے سوچا کہ واپس ہی چلے جانا بہتر ہے۔ خوامخواہ کی مشکل میں نہ پھنس جاؤں۔ مقبوضہ جموں کشمیر کا سارا علاقہ بڑا حساس علاقہ تھا۔ یہاں پولیس کو بھی کافی اختیارات حاصل تھے۔ اگرچہ میرے ذہن میں سنٹرل انٹیلی جینس کا خفیہ نمبر تھا لیکن میں اسے ظاہر کرتے ہوئے اس لیے گھبراتا تھا کہ ایک بار اس خفیہ نمبر کا راز فاش ہو چکا تھا اور بھارت کی سنٹرل انٹیلی جینس کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ نمبر ایک پاکستانی یا کشمیری کمانڈو کے پاس بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حکومت کی طرف سے اس نمبر کو نہ صرف منسوخ کر دیا گیا ہو بلکہ یہ بھی ہدایات جاری کر دی گئی ہوں کہ اس نمبر کے دکھانے والے کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہوا ہو۔ مگر مجھے بہرحال ایسا ہی سمجھنا چاہیے تھا اور بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے ہوٹل واپس آنے کے لیے ایک خالی ٹیکسی لے لی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ میری کھڑکی سے نیچے ہوٹل کا گیٹ نظر آ رہا تھا اس وقت تک خفیہ پولیس والا وہاں نہیں پہنچا تھا میں ٹیکسی میں پہلے آ گیا تھا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد میں نے پردے کے پیچھے سے دیکھا تو گیٹ کے پاس خفیہ پولیس والا اس طرح بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ اب

مجھے احتیاط کی ضرورت تھی۔ کیونکہ دو ایک دن میں مجھے کمانڈو شیر باز خان سے ملنے اس کی خفیہ کمین گاہ میں بھی جانا تھا اور ظاہر ہے یہ خفیہ پولیس والا میرا پیچھا ضرور کرے گا۔

میں دوسرے دن بھی ہوٹل میں ہی رہا۔ شام کے وقت اپنا کشمیری مجاہد آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کمانڈو شیر باز خان جموں پہنچ گیا ہے اور اپنی خفیہ کمین گاہ میں آج آدھی رات کے بعد میرا انتظار کرے گا۔ میں نے بوڑھے کشمیری مجاہد سے ہوٹل کے گیٹ پر بیٹھے ہوئے سی آئی ڈی کے آدمی کی بات کی اور اسے بتایا کہ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ بوڑھا کشمیری مجاہد بولا۔

"یہ تو اس کی ڈیوٹی ہے۔ ہوٹل میں جو کوئی نیا مسافر آتا ہے یہ اس کی دو ایک دن ضرور نگرانی کرتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ خطرناک آدمی نہیں ہے دو ایک دن پیچھا کرتا ہے اور اپنی ڈائری میں لکھ کر رپورٹ کر دیتا ہے کہ مسافر مشکوک نہیں ہے۔"

لیکن مجھے اس خفیہ پولیس والے کے پیچھا کرنے کے انداز میں ایک غیر معمولی بات نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی تشویش کا کشمیری مجاہد کے آگے اظہار نہ کیا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ رات کو مجھے کمانڈو شیر باز خان سے ملنے خفیہ کمین گاہ میں جانا ہے۔ اس آدمی کا پیچھا کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس پر کشمیری مجاہد نے کہا۔

"اس کی ڈیوٹی رات کے دس بجے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ پر بھی کوئی نہیں آتا مجھے معلوم ہے اس لیے تم آدھی رات کے بعد بے فکر ہو کر نکل جانا۔ صرف اتنی احتیاط کرنا کہ گیٹ کی طرف سے نکلنے کی بجائے ہوٹل کے پچھلے کوارٹروں والے دروازے میں سے نکل جانا۔ اب میں جاتا ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔"

میرا دل چاہا کہ اسے کہوں کہ مجھے ایک بڑا کمانڈو چاقو لا دو۔ پھر خیال آیا

کہ یہاں چاقو کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔

"بہتر ہے اس وقت مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

بوڑھا کشمیری مجاہد چلا گیا۔

میں آدھی رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی تھی تاکہ باہر سے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہو کہ میں سو گیا ہوں۔ صرف غسل خانے کی بتی روشن تھی جب رات کے پورے بارہ بج گئے تو میں نے کمرے کو تالا لگایا اور ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر لابی کی دوسری طرف سے گزر کر ہوٹل کے عقبی دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ رات بڑی سرد تھی۔ سڑک پر ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر کو اونی ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا میں دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دیے خاموشی سے سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ مجھے وہ راستہ معلوم نہ تھا جہاں سے ہو کر مجھے کمانڈو شیر باز خان کی خفیہ کمین گاہ تک جانا تھا۔ میں نے شہر کی طرف جانے والی سڑک کو چھوڑ کر وہ پگ ڈنڈی پکڑ لی جو شہر کے باہر سے ہوتی ہوئی جموں کی شمالی پہاڑیوں کی طرف نکل جاتی تھی اس پگ ڈنڈی پر اندھیرا تھا۔ شہر پیچھے رہ گیا تو میں پہاڑیوں میں گھرے ہوئے میدان میں آ گیا۔ یہ چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلے تھے مجھے اس میدان کے شمال مشرقی ٹیلے کی طرف جانا تھا۔ رات سرد اور کہر آلود تھی۔ میدان کہیں سنگلاخ تھا اور کہیں اونچا نیچا تھا اور خشک جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

خاموشی بڑی گہری تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کبھی کسی موٹر گاڑی کے انجن کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ آواز تھوڑی دیر کے لیے سنائی دیتی اور پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ میرے چاروں طرف تاریکی تھی مگر اس تاریکی میں بھی جھاڑیاں اور موڑ

کی پہاڑیوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ میں ایک جگہ جھاڑیوں میں سے ہو کر دوسری طرف کو مڑا تو مجھے اپنے پیچھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی خشک جھاڑیوں میں سے گزرا ہے۔ میں رک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عین اسی لمحے مجھے ایک انسانی سایہ دوڑ کر ایک طرف کو اندھیرے میں گم ہوتا نظر آیا۔ میرا پیچھا کیا جا رہا تھا۔ میں ایک دم چوکس ہوگیا۔ یہ خفیہ پولیس والے آدمی کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کا میرا تعاقب کرنا انتہائی خطرناک تھا۔ کیونکہ میں وادی کشمیر کے ایک اہم ترین کمانڈو کی خفیہ کمین گاہ کی طرف جا رہا تھا جس کا علم جموں پولیس کو کسی طرح بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں نے وہیں سے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ شمال مشرقی ٹیلے کی طرف جانے کی بجائے میں بائیں جانب ہوگیا اور اس پگڈنڈی پر آ گیا جو واپس شہر کی طرف جاتی تھی میں نے کمانڈو شیر باز خان سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب میں واپس اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ اب میں تیز تیز چلنے لگا تھا۔ میں جلدی ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ میرا پیچھا کیا جا رہا تھا۔ میں کشمیر بانہال روڈ پر آ گیا۔ سڑک خالی پڑی تھی میں نے اپنا رخ شہر کی طرف کر لیا اور سڑک کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ سڑک پر کہیں کہیں بجلی کے کھمبے لگے تھے جن پر بلب روشن تھے۔ چلتے چلتے جیسے ہی میں ایک کھمبے کے پاس پہنچا۔ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دو آدمی میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ بالکل میرے قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ دوسرے نے گرم کوٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی بوڑھا نہیں تھا۔ کوٹ پتلون والا آدمی میرے پاس آ کر رک گیا۔ اس نے ڈوگری زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر نے مجھے رات کو سیر کرنے کے لیے کہا ہوا ہے۔ مجھے معدے کی تکلیف رہتی ہے۔ بات میں نے غلط کہہ دی

تھی مگر اس وقت مجھے اور کچھ سوجھا بھی نہیں تھا۔ وہ آدمی بولا۔
"ڈاکٹر نے تمہیں آدھی رات کو سیر کرنے کے لیے کیوں کہا ہے؟"
میں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ دس بجے میں نے کھانا کھایا کچھ مہمان آ گئے۔ گیارہ بج تک وہ بیٹھے رہے جب وہ گئے تو میں نے سوچا کہ تھوڑی سیر ضرور کر لینی چاہیے۔"

میں ڈوگری پنجابی لہجے میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں ڈوگری زبان کو بھول چکا تھا۔ کافی عرصے سے بمبئی سورت کے علاقے میں رہ رہا تھا۔ دوسرے کمبل والے آدمی نے مجھ سے پوچھا میرا نام کیا ہے اور میں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے یونہی اپنا ایک ہندوانہ نام بتا دیا اور کہا کہ میں جالندھر سے آیا ہوں۔ سنگر مشینوں کا ایجنٹ ہوں جموں میں مارکیٹ کا جائزہ لینے کمپنی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ کوٹ پتلون والے آدمی نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے کہ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے تھے۔ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن تک چلنا ہو گا۔"

میں نے ان پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"آپ لوگ کون ہوتے ہیں مجھے پولیس سٹیشن لے جانے والے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟ آپ کا انسپکٹر جنرل پولیس میرے پتا جی کا دوست ہے میں نے ایک فون کر دیا آپ سب کو لائن حاضر کر دیا جائے گا۔"

کھمبے پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں میں ان دونوں خفیہ پولیس والوں کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کمبل

والے آدمی نے اپنا ہاتھ کمبل سے باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے کہا۔

”خاموشی سے آگے چلو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو میں یہیں ڈھیر کر دوں گا۔ تھانے جا کر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے تمہیں جس جرم میں پکڑا ہے۔ چلو۔“

میں ایک لمحے کے لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ پھنس گیا ہوں۔ یہاں اونچ نیچ نہیں کرنی چاہیے ذرا آگے جا کر سڑک پر اندھیرا ہے۔ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ جیسے ہی میں ان کے آگے لگ کر چلا۔ کوٹ پتلون والے آدمی نے بلند آواز میں کسی کو پکار کر کہا۔

”آ جاؤ' اوئے آ جاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی سڑک کے آگے جہاں اندھیرا تھا اس اندھیرے میں کسی موٹر گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر پولیس کی گاڑی اندھیرے میں سے نکل کر تیزی سے ہمارے پاس آ کر رک گئی۔ گاڑی میں سے تین وردی پوش کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر باہر آ گئے۔

”پکڑ لیا اس پاکستانی جاسوس کو؟“

کمبل والے آدمی نے کہا۔

”ملکھی راما ہمارے ہاتھ سے کبھی کوئی پاکستانی جاسوس بچ کر نکلا ہے؟ چل اوئے بیٹھ جا گاڑی میں۔“

انہوں نے مجھے پولیس کی گاڑی میں اپنے درمیان بٹھا لیا۔ کوٹ پتلون والے آدمی نے کہا۔

”اس نے اپنا نام پرکاش چند بتایا ہے۔ کہتا ہے میں جالندھر سے آیا ہوں۔ سنگر مشینوں کا ایجنٹ ہوں۔“

ملکھی رام کانسٹیبل نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"ابھی اس کی پتلون اترواتے ہیں۔ معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہندو ہے کہ مسلا ہے۔"

اور وہ مجھے گالیاں دینے لگے۔ گاڑی سڑک پر روانہ ہوگئی۔ رات کے وقت سڑک خالی پڑی تھی۔ پولیس کی گاڑی فل سپیڈ سے جا رہی تھی میں مسلح پولیس کانسٹیبلوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دماغ میں طرح طرح کی ترکیبیں آ رہی تھیں کہ تھانے جا کر مجھے کیا موقف اختیار کرنا ہوگا۔ یہ امر طے شدہ تھا کہ تھانے پہنچنے کے بعد میرے مسلمان ہونے کا راز ان پر کھل جائے گا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں یہ موقف اختیار کروں گا کہ میں مالیر کوٹلہ کا مسلمان پنجابی ہوں اور کشمیر کے جہاد میں حصہ لینے کے لیے جموں آیا تھا۔ میرے پاس کچھ روپے تھے میں کیلاش ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ اب اس انتظار میں تھا کہ یہاں کوئی کشمیری حریت پسند مل جائے تو اس کی مدد سے کشمیر میں جا کر اسلام کے جہاد میں حصہ لوں۔

پولیس کی گاڑی جموں شہر کی دھند میں ڈوبی ہوئی سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد ایک پولیس سٹیشن میں داخل ہوگئی۔ سپاہی مجھے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں گاندھی اور اندرا گاندھی کی تصویریں دیوار پر لگی تھیں۔ مجھے زمین پر بٹھا دیا گیا۔ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا پولیس افسر اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"یہاں تمہارے پاکستانی ساتھ کہاں کہاں ہیں صاف صاف بتا دو گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا اس کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میں مالیر کوٹلے کا مسلمان ہوں"

اور اس کے ساتھ ہی میں نے ذہن میں جو کچھ سوچ رکھا تھا وہ دہرا دیا۔

پولیس افسر نے ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اس نے کیا نام بتایا تھا۔"
اس نے کہا۔ "پرکاش چند بتایا تھا جناب۔"
"اس کی پتلون اتروا کر دیکھو۔"
میں نے کہا۔ "میری پتلون اتروانے کی کیا ضرورت ہے میں نے کہہ دیا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔"
پولیس افسر نے کہا۔
"اگر یہ سچ بتا دیا ہے تو یہ بھی بتا دو کہ تمہارے پاکستانی جاسوس ساتھی جموں میں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"جناب میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔"
"تو پھر تم آدھی رات کو پہاڑی ٹیلوں پر کیا کرنے جا رہے تھے؟"
میں نے کہا۔ "میں بیمار رہتا ہوں جناب۔ میرے پیٹ میں کھانا کھانے کے بعد درد ہوتا ہے۔ مالیر کوٹلے کے ایک ڈاکٹر نے مجھے کہا تھا کہ میں رات کو کھانا کھانے کے بعد تھوڑی سی سیر کر لیا کروں۔"
پولیس افسر نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو تم آدھی رات کی سردی میں پہاڑی ٹیلوں کی طرف سیر کرنے جا رہے تھے؟"
میں نے کہا۔ "ہاں جناب!"
پولیس افسر نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں پیچھے کو گر پڑا۔ ہرا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ اس کے تھ پولیس افسر نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے مجھ پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر ا۔ جب وہ مجھے مار مار کر تھک گیا اور ہانپنے لگا تو اٹھ کر کھڑا ہوا اور بولا۔

"اس کو پچھلی حوالات میں بند کر دو۔ صبح اس کو تھرڈ ڈگری کی خوراک دیں گے اس کا باپ بھی سب کچھ بتا دے گا۔"

میرا سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ ہر جگہ درد ہو رہا تھا۔ مجھے دو سپاہی گھسیٹتے ہوئے کمرے میں سے نکال کر راہداری میں سے لے جاتے ہوئے تھانے کے پچھلے برآمدے کی تنگ کوٹھڑی میں دھکا دے کر پھینک دیا اور کوٹھڑی پر تالا ڈال دیا۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ لوہے کی سلاخوں والا تھا۔ یہ تھانے کی چھوٹی حوالات تھی۔ فرش مٹی کا تھا۔ وہاں کوئی چٹائی بھی نہیں بچھی ہوئی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے کوئی میلا کچیلا کمبل بھی نہیں تھا۔ میں کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ باقی کی ساری رات اسی طرح بیٹھے بیٹھے درد کی ٹیسیں برداشت کرتے گزر گئی۔ دن کا اجالا پھیلا تو میں نے دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں پودوں کی کیاریاں تھیں۔ کونے میں نلکہ لگا تھا۔ ایک پرانی گاڑی کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ صحن کی دیوار دس بارہ فٹ اونچی تھی۔

کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر ایک خاکروب قسم کا آدمی مجھے چائے کا ایک گلاس اور سوکھی روٹی دے کر چلا گیا۔ میں خاموشی سے چائے میں ڈبو کر سوکھی روٹی کھانے لگا۔

سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک منظر کیسے تبدیل ہو گیا۔ میں کس مزے سے ہوٹل کے کمرے میں ناشتہ منگوا کر کیا کرتا تھا۔ اور اب اسی ہوٹل سے تھوڑی دور حوالات میں بیٹھا بد مزا چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھا رہا ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں کمانڈو شیر باز خان کی خفیہ کمین گاہ میں نہیں پہنچا تھا۔ اگر میرے پیچھے پیچھے چلتا خفیہ پولیس کا آدمی وہاں تک آ جاتا تو میرے ساتھ کمانڈ شیر باز کا پکڑا جانا بھی یقینی تھا۔ اگرچہ مجھے خیال ضرور تھا کہ پولیس نے ان پہاڑیوں کی چھان بین ضرور کی ہوگی مگر کمانڈو شیر باز کی خفیہ کمین گاہ ایسی جگہ پر ہے کہ پولیس وہاں تک نہیں پہنچی ہوگی۔ یہ بھی سوچتا کہ کمانڈو شیر باز میرا انتظار کرتا

رہا ہو گا۔ میرے نہ پہنچنے پر وہ کشمیری مجاہد سے ضرور رابطہ کرے گا۔ میں واپس اپنے ہوٹل میں بھی نہیں گیا۔ بوڑھا کشمیری مجاہد جب اسے بتائے گا کہ کمانڈر حیدر علی رات ہوٹل میں بھی نہیں آیا تو وہ میرا سراغ لگانے کی کوشش کرے گا لیکن وہ خود پولیس کو مطلوب ہے اور اس سے روپوش ہو کر پھرتا ہے۔ اسے میرا سراغ کیسے مل سکے گا۔ ہوٹل میں میرا صرف ایک چمڑے کا تھیلا ہی تھا جس میں میرے کچھ ضروری سفری سامان کے علاوہ موذی سانپ کا تریاق یعنی قرنگ بھنی کے سفوف والی ڈبی بھی تھی۔

مجاہد کشمیری کو جب پتہ چلے گا کہ دو دن گزر جانے کے بعد بھی میں ہوٹل میں نہیں آیا تو سمجھ جائے گا کہ میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ اور وہ میرا چمڑے کا تھیلا اٹھا کر لے جائے گا۔ بہرحال میری جان ضرور مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اس روز بھی سارا دن مجھ پر تشدد ہوتا رہا۔ کیسی کیسی اذیت نہیں تھی جس کا مجھے نشانہ نہیں بنایا گیا۔ شام کا اندھیرا ہونے کے بعد مجھے پچھلی حوالات میں لا کر پھینک دیا گیا۔ خدا کا شکر ہے ابھی انہیں میرے پورے ریکارڈ کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہیں صرف پیچھے سے یہی اطلاع ملی تھی کہ ایک مشکوک آدمی جالندھر سے جموں میں داخل ہوا ہے اور کیلاش ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میرا حلیہ بھی بتا دیا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنی زبان بند رکھی تھی۔ ہر طرح کا وحشیانہ تشدد برداشت کیا مگر یہی کہتا رہا کہ میں مالیر کوٹلے کا مسلمان ہوں اور کشمیر کے جہاد میں حصہ لینے کے لیے آیا تھا۔

اب رات کو میری کوٹھڑی کے باہر ایک حوالدار بندوق لے کر پہرے پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ مجھے اس ٹارچر سیل میں تین دن گزر گئے۔ نہ میں نے زبان کھولی نہ انہوں نے تشدد کرنا اور اذیت دینی بند کی۔

چوتھی رات کو میں حوالات کے ٹھنڈے فرش پر ادموا ہو کر پڑا تھا کہ مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی۔ یہ سانپ کی پھنکار کی آواز تھی جسے میں بڑی اچھی

طرح سے پہچانتا تھا۔ یہ اسی بالشت بھر کے سانپ کی آواز تھی جس کے زہر
تریاق میں نے پی لیا ہوا تھا اور جو بقول قادر خان کے اب مجھے اپنا دیوتا سمجھنے ا
تھا اور میری خدمت کرنا چاہتا تھا۔ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ میں سانپ کی
پھنکار سن کر ایک دم چونک سا گیا۔ اتنے دنوں کے بعد مجھے اس کی آواز سنائی
دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ سانپ میری تلاش میں تھا اور مجھے تلاش کرتے
کرتے مراد آباد سے جموں پہنچ گیا تھا۔ اسے میرے جسم کی بو کھینچ کر یہاں تک
لے آئی تھی۔ ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ یہ سانپ میری مدد کر سکتا ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ باہر برآمدے میں بلب روشن تھا۔ اس کی کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے باہر برآمدے میں نظر دوڑائی سانپ کی آواز قریب سے آئی تھی مگر برآمدہ خالی پڑا تھا۔ حوالدار جو پہرہ دے رہا تھا وہ برآمدے میں ٹہلتے ٹہلتے چار قدم دور چلا گیا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے سانپ کی پھنکار نہیں سنی تھی۔ دوسری بار سانپ کی پھنکار کی آواز آئی تو حوالدار نے بھی یہ آواز سن لی۔ اس نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔

"پوپٹ چند ڈانگ سوٹا لے کر آؤ۔ ادھر سانپ ہے۔"

حوالدار دوڑ کر پیچھے ہوگیا اور بندوق کی نالی آگے کر کے اس نے پوزیشن لے لی۔ اتنے میں ایک طرف سے رات کا چوکیدار ڈانگ زمین پر زور زور سے مارتا آگیا۔

"کہاں ہے سانپ حوالدار جی؟"

"اس کی آواز سامنے والی جھاڑی سے آئی تھی۔"

چوکیدار پوپٹ چند نے جھاڑی پر اندھا دھند لاٹھی برسانی شروع کر دی۔ میں یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ سانپ جھاڑی میں نہ ہو۔ جب چوکیدار لاٹھیاں برساتے تھک گیا تو برآمدے میں آکر حوالدار سے کہنے لگا۔

"حوالدار جی! اگر سانپ جھاڑی میں تھا تو اب تک اس کا کچومر نکل گیا

ہو گا۔ اب تم بے فکر ہو کر پہرہ دو۔"

چوکیدار چلا گیا۔ اس کے بعد حوالدار بڑا محتاط ہو کر پہرہ دینے لگا۔ دوسرے قدم پر رک کر دائیں بائیں برآمدے کے فرش کو دیکھ لیتا تھا۔ حوالات کے فرش پر خاموش پڑا رہا۔ مجھے دو پرانے کمبل دے دیے گئے تھے نے کمبل اوپر کر لیے تھے میرے جسم کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے اسے اد کر رکھ دیا ہو۔ سارا جسم درد کرتا رہتا تھا۔ اس کے بعد سانپ کی آواز آئی شاید اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے دشمن اسے مارنے کے لیے وہاں موج ہیں۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا ایک دوست اور مہاناگ کا اوتار بھ اسی جگہ پر ہے یعنی میں حوالات میں موجود تھا اور سانپ ہر حالت میں مجھ تک پہنچنا چاہتا تھا اسے میرے بدن کی بو آ رہی تھی۔

نہ جانے رات کے کس لمحے مجھے نیند آ گئی۔ دوسرے دن مجھے ایک گاڑی میں بٹھا کر ایک ایسی جگہ پر لایا گیا جہاں چاروں طرف بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ یہاں چھ سات کوارٹر بنے ہوئے تھے کواٹروں کے سامنے ایک فوجی جیپ کھڑی تھی میں سمجھ گیا کہ اب مجھے ملٹری انٹیلی جینس کے سامنے پیش کیا جائے گا اور تشدد اور اذیت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مجھے ایک کواٹر کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت دن کا پہلا پہر تھا۔ میری یہ حالت تھی کہ جسم مسلسل اذیتیں سہتے سہتے اور نیم فاقہ کشی سے نڈھال ہو چکا تھا۔ سر چکراتا رہتا تھا مگر میری ہمت نے جواب نہیں دیا تھا۔ میں اللہ کے بھروسے پر زندہ تھا۔

کوارٹر کے کمرے میں مجھے دوپہر کو ایک ڈانگری والا فوجی آیا اور دو روٹیاں دے گیا جن پر دال رکھی ہوئی تھی۔ میں نے صبر شکر کر کے روٹی کھا لی۔ رات کو بھی دو روٹیاں اور دال دی گئی۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا کہ دو فوجی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک کیپٹن کے رینک کا تھا۔ دوسرا حوالدار تھا۔ دونوں فوجی

وردیوں میں تھے۔ فوجی کیپٹن نے اپنے ماتھے پر تلک لگایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بڑا متعصب قسم کا ڈوگرہ ہندو ہے۔ عام طور پر فوج میں اس قسم کے تلک لگانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ میرے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا اور مجھ سے بڑی پیار محبت کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ پھر بولا۔

"ہم بھی کشمیری مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں ہم خود انہیں آزادی دینا چاہتے ہیں مگر وہ ہمارے آدمیوں کو گولیوں سے اڑا رہے ہیں گھات لگا کر ہمارے فوجی ٹرکوں پر حملے کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم لوگ جو کشمیری مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے ہو اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ تم نے کشمیر پر زبردستی قبضہ اور کشمیریوں کی مرضی کے خلاف قبضہ کیا ہوا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ تشدد تو انہوں نے مجھ پر کرنا ہی ہے کیوں نہ حق بات ان کے منہ پر کہہ دوں۔ ہندو کیپٹن اندر ہی اندر ضرور غصے سے پیچ و تاب کھا رہا ہو گا مگر اوپر سے وہ مسکراتا رہا کہنے لگا۔

"مگر تم مالیر کوٹلہ کے پنجابی مسلمان ہو۔ تمہیں کشمیریوں کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے۔"

میں نے کہا۔

"مسلمان خواہ کسی صوبے کسی ملک کا ہو دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ کشمیری مسلمان بھی ہمارے بھائی ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر دوسرے مسلمان پر کافر لوگ ظلم کر رہے ہوں تو اس کی مدد کرے۔"

اب ہندو کیپٹن سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے میرے سینے پر اتنی زور سے ٹھڈا مارا کہ میں پیچھے کو الٹ گیا۔ اس نے مجھے بے

طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے چیخ چیخ کر اللہ اکبر یا علی کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ دونوں فوجی مجھے لکڑی کے فرش پر نیم جان چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ پر اس قدر شدید تشدد کیا جا رہا تھا کہ اب میری ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔

اس رات میرا جسم اس قدر درد کرتا رہا کہ تھوڑی دیر بعد میرے منہ سے بے اختیار ہائے نکل جاتی تھی۔ نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فرش پر کمبل اوپر ڈال کر پڑا کراہ رہا تھا کہ میرے کانوں میں پھر وہی سانپ کی پھنکار کی آواز آئی۔ اب یہ آواز میرے قریب سے آ رہی تھی جس کواٹر میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کا دروازہ سلاخوں والا نہیں تھا۔ دروازہ لکڑی کا تھا اور اسے باہر سے قفل لگا دیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی قفل لگا ہوا تھا۔ رات کو باہر پہرہ دینے والے فوجی کے قدموں کی آواز نہیں آتی تھی۔ کواٹر میں چھت کے ساتھ صرف ایک بتی روشن تھی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اچانک پھنکار کی آواز پھر آئی۔ یہ آواز کونے کی طرف سے آئی تھی۔

میں نے کونے کی طرف دیکھا۔ کونے میں ایک نالی بنی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ وہی بالشت بھر کے بھورے رنگ کا سانپ نالی کے آگے کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کا رخ میری طرف تھا اور مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ مجھ کو خوف محسوس ہوا پھر خیال آیا کہ میں نے تریاق والا سفوف پی رکھا ہے اس کے زہر کا مجھ پر اثر نہیں ہوگا۔ پہلے بھی اس نے مجھے ڈسا تھا تو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ بھی خیال آگیا کہ بقول قادر خان یہ سانپ اب میرا مطیع ہوگیا ہے۔ سانپ نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنی گردن نیچے جھکائی اور جھکاتے ہی اپنا چھوٹا سا سر فرش کے ساتھ لگا دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی مجھے اپنا مالک سمجھتا ہے۔ اس کی اس حرکت سے میرا بھی حوصلہ بڑھ

گیا۔ میں نے سانپ کو اسی طرح پچکارا جس طرح پالتو کتے بلی کو پچکارا جاتا ہے۔
سانپ آہستہ آہستہ میری طرف رینگنے لگا۔
رینگتے رینگتے وہ مجھ سے کوئی دو تین فٹ کے فاصلے پر آکر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اب وہ بار بار اپنی گردن کو میرے آگے جھکا رہا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا اس وقت وہ سانپ ہی اپنا دوست تھا۔ میں نے اسے کہا۔
"دوست! میں ظالموں میں پھنس گیا ہوں کسی طرح مجھے ان لوگوں سے نجات دلا تجھے خدا نے میری مدد کے لیے بھیج دیا ہے۔ اب میری مدد کر۔"
میں یونہی بولے جا رہا تھا۔ بھلا سانپ کہاں انسان کی زبان سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی تسلی کے لیے کہہ رہا تھا۔ اچانک باہر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی سانپ نے فوراً گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور تیزی سے رینگتا ہوا نالی میں جا گھسا۔ فوجی بوٹوں کی آواز دروازے کے باہر آکر رک گئی۔ تالا کھلنے کی آواز آئی اور وہی ہندو کیپٹن اپنے ساتھ حوالدار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ خدا جانے اس نے ٹارچر کے لیے رات کا پچھلا پہر کیوں منتخب کیا تھا۔ دیوار کے ساتھ دو سٹول پڑے رہتے تھے۔ ان پر بیٹھ کر ملٹری انٹیلی جینس والے مجھ سے پوچھ گچھ کرتے تھے۔ حوالدار نے جلدی سے ایک سٹول کھینچ کر میرے آگے رکھ دیا۔ کیپٹن اس پر بیٹھ گیا۔ حوالدار کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ دونوں اس وقت بھی فوجی وردیوں میں تھے۔ یہ وردیاں ہرے رنگ کی تھیں جو انڈین آرمی کی وردیوں کا رنگ تھا۔

"میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ صبح تمہیں فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا لیکن اگر اب بھی تم ہمیں اپنے ساتھی پاکستانی اور کشمیری کمانڈوز کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ بتا دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ میں تمہیں اس کا وچن دیتا ہوں۔ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا اور جہاں تم چاہو گے تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے

گا۔ کہو کیا کہتے ہو؟ موت چاہتے ہو یا زندگی؟

میں نے کہا۔ "جب میرا کوئی پاکستانی ساتھی ہی نہیں ہے تو میں آپ لوگوں کو کیسے بتا دوں کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟"

ڈوگرہ کیپٹن طیش میں آ گیا اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر فرش پر لٹا دیا اور مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیے۔ جانے اس وقت میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے بے اختیار ہو کر سانپ کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔

"میرے دوست! ظالم مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھے ان سے بچا سکتا ہے تو بچا۔ دوست! میری مدد کر۔ دوست میری مدد کر۔"

"کس کو بلا رہا ہے؟" ڈوگرہ کیپٹن نے مجھے گالی دے کر کہا۔ "یہاں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔"

خدا جانے کیا بات ہوئی سانپ میری آواز پر نالی میں سے بجلی کی طرح نکل کر ڈوگرہ پر جھپٹا اس نے کوئی پھنکار نہ ماری۔ میں نے کوارٹر کی روشنی میں صرف نالی میں سے سانپ کو بجلی ایسی تیزی کے ساتھ نکل کر آتے دیکھا۔ دوسرے لمحے ڈوگرہ کیپٹن کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گر پڑا اور اس کا سر اس کے دھڑ سے الگ ہو گیا۔ حوالدار جو سٹین گن لیے کھڑا تھا۔ سکتے میں آ گیا۔ وہ باہر کو دوڑا مگر سانپ نے اسے دروازے تک جانے کی بھی مہلت نہ دی اور اسے بھی ڈس لیا۔ ڈوگرہ حوالدار بھی دھڑ سے نیچے گر پڑا۔ وہ بازو کے بل پر گرا اور اس کا بازو اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔

میں ان دونوں لاشوں کو دیکھتا کبھی سانپ کو دیکھتا جو میرے سامنے فرش پر کنڈلی مارے بڑے ادب سے بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب اس سانپ نے ٹریننگ کیمپ میں یہودی انسٹرکٹر کو ڈسا تھا اور اس کا جسم پتھر بن گیا تھا تو میں نے یہودی انسٹرکٹر کی سخت لاش کے انگوٹھے کو ذرا زور سے دبایا تھا تو وہ اس طرح بھربھرا تھا جیسے ابھی الگ ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ڈوگرہ

کیپٹن اور حوالدار کے جسم سانپ کے زہر سے پتھر بن جانے کے بعد جب دھڑام سے فرش پر گرے تھے تو ڈوگرہ کیپٹن کا سر اور حوالدار کا بازو اس کے جسم سے الگ ہوگیا تھا۔

پہلے تو میں کچھ دیر دہشت کی حالت میں رہا۔ پھر مجھے صورت حال کا احساس ہوا۔ میں نے اٹھ کر دروازے کے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر صحن خالی پڑا تھا۔ کونے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ شاید یہ دونوں ڈوگرہ فوجی اس جیپ پر آئے تھے۔ میں نے سانپ کو دیکھا۔ سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا گردن گھما گھما کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر اپنی پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیب میں رکھ لوں۔ پھر میں ڈر گیا۔ سانپ اگرچہ میرا دوست تھا مگر اسے پکڑتے ہوئے مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دوست! میں یہاں سے بھاگ رہا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟ آ جاؤ۔"

میں دروازے میں سے دوڑتا ہوا دیوار کی طرف گیا۔ دیوار اونچی تھی مگر خدا جانے اس وقت مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی میں دوڑ کر اچھلا اور دیوار کے اوپر میرے ہاتھ پڑ گئے۔ میں دوسری طرف جھاڑیوں میں کود گیا۔ میرے کپڑے میلے کچیلے تھے پاؤں میں پرانا جوتا تھا جیکٹ پھٹ چکی تھی۔ میں نے اندازہ لگا کر جموں شہر کی شمال مشرقی پہاڑیوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ فرار ہونے کی گرمجوشی میں دوڑ ضرور پڑا تھا مگر تھوڑی دور دوڑنے کے بعد ہی میرے جسم میں ٹیسیں پڑنی شروع ہوگئیں۔ میں دوڑنے کی بجائے چلنے لگا۔ کچھ معلوم نہیں تھا رات کتنی گزر چکی ہے دوڑنے اور تیز چلنے سے سردی کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ جموں شہر کی یہ پہاڑیاں میرے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ اگرچہ رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور کہیں کہیں پہاڑی ٹیلوں پر سردی کا کہر بھی پھیلا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں صحیح سمت کو جا رہا ہوں۔ شہر کی آبادی جب ذرا

پیچھے رہ گئی اور اس کی روشنیاں مدھم پڑنے لگیں تو میں دم لینے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں شیر باز خان کی خفیہ کمیں گاہ میں جانا چاہتا تھا۔ اس وقت وہی میرے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔

میں نے اندھیرے میں آنکھیں کھول کر اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ شاید میرا دوست سانپ بھی میرے ساتھ رینگتا ہوا آگیا ہو۔ اندھیرے اور دھند میں وہ مجھے دکھائی تو نہیں دے سکتا تھا مگر اس کی پھنکار بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دو منٹ تک سانس لینے کے بعد میں دوبارہ چل پڑا۔ سنگلاخ زمینوں' اونچی نیچی پہاڑی گھاٹیوں میں ہوتا ہوا آخر میں اس چھوٹے میدان میں آگیا جس کے سامنے کی طرف والی پہاڑیوں اور ٹیلوں کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ انہی پہاڑی ٹیلوں میں ایک جگہ کمانڈو شیر باز خان کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ میں پیچھے کسی ڈوگرہ رجمنٹ کے ایک کیپٹن اور حوالدار کی لاش چھوڑ کر فرار ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پتہ چل جانے کے بعد اس سارے علاقے کو ملٹری نے گھیرے میں لے لینا تھا کیونکہ پولیس نے مجھے انہی پہاڑیوں میں مشکوک حالت میں رات کو پھرتے ہوئے گرفتار کیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ شیر باز خان کی خفیہ کمیں گاہ تک انڈین ملٹری کے دو آدمی نہیں پہنچ سکیں گے۔ آخر میں نے دو ٹیلوں کے درمیان اس چھوٹے سے تنگ راستے کو اندھیرے میں دیکھ لیا جو خفیہ کمین گاہ کو جاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں ان اونچی اونچی جھاڑیوں کے سامنے کھڑا تھا جن کے پیچھے ٹیلے کے اندر والے قدرتی غار کو راستہ جاتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈو شیر باز غار میں ہی ہوگا۔ وہ اتنی دور کشمیر کے محاذ سے آیا تھا۔ اتنی جلدی شاید واپس نہ جائے لیکن کمانڈو شیر باز وہاں نہیں تھا میں غار کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے وہاں میرے لیے زیادہ دن ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے پانی

وغیرہ کی تلاش میں باہر نکلنا تھا اور باہر خطرہ تھا۔ وہاں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ کوٹھڑی کی فضا گرم تھی اس گرم فضا نے میرے جسم کو بڑا سکون عطا کیا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے بوریئے پر لیٹ گیا۔ مجھ پر نیند اور بیدار کی حالت طاری ہوگئی۔ کبھی لگتا کہ میں گہری نیند سو رہا ہوں۔ کبھی لگتا کہ جاگ رہا ہوں یہ حالت نہ جانے کب تک مجھ پر طاری رہی۔

غار والی کوٹھڑی میں کوئی دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ دیوار میں ایک تنگ شگاف تھا جس میں سے جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ کوٹھڑی کی قدرتی چھت کافی اونچی تھی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کمانڈو شیر باز نے یہاں موم بتیاں اور ماچس کہاں رکھی ہوتی ہے۔ میں نے ٹٹول ٹٹول کر موم بتی اور ماچس تلاش کر لی۔ موم بتی روشن ہوئی تو کوٹھڑی میں روشنی پھیل گئی۔ دیوار کے ساتھ کمانڈو شیر باز کی پرانی پتلون اور گرم اونی جیکٹ لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا پھٹا ہوا پاجامہ اور جیکٹ اتار کر کمانڈو شیر باز کی جیکٹ اور پتلون پہن لی۔ میرے جسم پر کوئی گہرا یا تشویش ناک زخم نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اس طرح کی اذیتیں دی تھیں کہ جسم پر زخم نہ آئے مگر اندر سے میرا انجر پنجر تباہ ہو جائے لیکن سارا بدن دکھ رہا تھا۔ لیٹنے سے مجھے آرام پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد واقعی مجھے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو کوٹھڑی کے شگاف میں سے ہلکی ہلکی سفید روشنی اندر آ رہی تھی۔ غار میں اس کوٹھڑی کے باہر چھت پر بہت اوپر کر کے ایک قدرتی شگاف بنا ہوا تھا۔ یہ روشنی دن کی روشنی تھی اور اسی شگاف میں سے اندر آ رہی تھی۔

گہری نیند سونے سے میرے جسم کو کافی آرام مل گیا تھا۔ جسم پر جو ٹیسیں پڑتی تھیں وہ بھی گم ہوگئی تھیں۔ میں اٹھ کر شگاف میں سے باہر آگیا اوپر دیکھا تو گول سوراخ میں سے دن کی روشنی ایک سفید ستون کی طرح غار میں آ رہی تھی۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی میں نے سوچا باہر چل کر دیکھنا چاہیے شاید کہیں سے پانی مل جائے۔ میں غار کی دہانے سے نکل کر جھاڑیوں میں آکر ٹیلوں کے درمیان جو تنگ راستہ بنا ہوا تھا اس طرف دیکھنے لگا۔ دھوپ اوپر اوپر تھی۔ پھر معلوم ہو رہا تھا کہ کافی دن چڑھ آیا ہے۔ اس وقت تک میرے فرار کا علم سب کو ہو چکا ہوگا اور دونوں فوجی عہدیداروں کی پتھریلی لاشیں بھی مل چکی ہوں گی جن میں سے ایک لاش کا سر الگ ہو چکا تھا اور دوسری لاش کا بازو الگ ہوگیا ہوا تھا۔ سول پولیس اور ملٹری پولیس شہر میں میری تلاش میں سرگرداں ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس پہاڑی علاقے میں بھی مجھے تلاش کیا جا رہا ہو۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ میں نے سوچا اس پہاڑی درے سے ذرا باہر نکل کر دیکھنا چاہیے۔ شاید کسی جگہ کوئی چشمہ بہہ رہا ہو۔ مجھے واقعی بڑی شدید پیاس لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہونے لگا تھا۔ عام حالت میں میں پیاس بہت دیر تک برداشت کر لیتا تھا مگر مجھ پر اتنا ٹارچر کیا گیا تھا کہ جسم کی قوت مدافعت بے حد کمزور پڑ چکی تھی۔ میں جھاڑیوں میں سے باہر نکل آیا۔

پہاڑی ٹیلوں کا درمیانی تنگ راستہ سنسان پڑا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں سوکھی گھاس اور سرکنڈوں میں سے آہستہ

آہستہ گزرتا تنگ درے کے باہر آگیا۔ سامنے سنگلاخ اونچی نیچی زمین تھی۔ آگے پھر ٹیلے شروع ہو جاتے تھے۔ اچانک مجھے ایک طرف سے آدمیوں کی آواز آئی۔ دو آدمی باتیں کرتے چلے رہے تھے یا چلے جا رہے تھے۔ میں دوڑ کر غار میں آگیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں غار کے دہانے کے پاس بیٹھ کر ان آواز کو غور سے سننے لگا۔ آوازیں دو آدمیوں کی تھیں۔ مجھ تک صرف آواز آ رہی تھی کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ پھر یہ آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ میں وہیں کان لگائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ اس کے بعد مجھے اپنے دوست سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ کا خوف ایک قدرتی بات ہے۔ اگرچہ یہ سانپ میرا دوست تھا پھر بھی سانپ سانپ ہی ہوتا ہے۔ ابھی میں اس کے ساتھ اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا مجھے سانپ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے یونہی اپنی تسلی کے لیے کہا۔

"سامنے آؤ"

مجھے معلوم تھا کہ سانپ کو صرف میری آواز ہی آئے گی۔ وہ میرے الفاظ بالکل نہیں سمجھ سکے گا۔ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ وہ آواز کو اپنی زبان اور جسم کی مدد سے محسوس کرتا ہے۔ سانپ جو بار بار زبان نکالتا ہے اس سے وہ ایک تو فضا کو سونگھتا ہے دوسرے باہر کی آوازوں کو بھی اسی زبان اور اپنے جسم کی مدد سے سنتا ہے۔ آواز کی لہریں اس کے جسم اور زبان سے ٹکرا کر اسے خبردار کرتی رہتی ہیں۔ میری آواز کی لہروں کو بھی سانپ نے اپنے جسم پر محسوس کر لیا تھا۔ میری بو تو وہ پہلے ہی سے محسوس کر رہا تھا۔ میری آواز کی لہروں کو محسوس کرنے کے بعد وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ غار کے اندر آکر وہ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھ کر اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہلانے لگا۔ مجھے ابھی تک ان آدمیوں کی آوازوں کا خیال لگا ہوا تھا۔ جو مجھے

تنگ راستے کے باہر سنائی دی تھیں اور اب غائب ہو چکی تھیں۔ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ پہاڑیے بھی ہو سکتے ہیں اور خفیہ پولیس والے بھی ہو سکتے ہیں۔

غار کے دہانے پر بیٹھے رہنا خطرناک تھا۔

میں نے سانپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دوست میں اندر کوٹھڑی میں جا رہا ہوں تم بے شک باہر جا کر سیر کرو۔ پھر کسی وقت آ جانا۔

میں سانپ کے ساتھ کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے سانپ سے ڈر لگتا تھا۔ یہ کہہ کر میں غار کے اندر چلا آیا۔ سانپ نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ جب میں کوٹھڑی میں آ گیا تو ایک منٹ بعد سانپ بھی اندر آ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دوست اب ایک طرف ہو کر بیٹھے رہنا۔ اگر تم میرے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے قریب آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

سانپ نے خدا جانے کیا سنا اور کیا سمجھا۔ بہرحال وہ کوٹھڑی کے شگاف کے باہر ایک طرف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے اٹھ کر دیکھا تو وہ بالکل جلیبی کی طرح بنا ہوا تھا۔ مجھے پیاس نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب زبان بھی سوکھنے لگی تھی۔ یا اللہ! پانی کہاں سے ملے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ اندر ہی بیٹھا رہوں کہ باہر نکل کر پانی کی تلاش کروں۔ آدمیوں کی آوازوں نے مجھے خبردار کر دیا تھا۔ اب میں باہر جاتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا۔

بیٹھے بیٹھے جب کافی وقت گزر گیا اور باہر سے بھی کسی کی دوبارہ آواز نہ آئی تو میں نے سوچا ایک بار پھر نکل کر دیکھنا چاہیے شاید کہیں سے پانی مل جائے۔ میں شگاف سے باہر آیا تو سانپ نے گردن اونچی کر کے مجھے دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ میں نے کہا۔

"دوست! مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ میں پانی کی تلاش میں جاتا ہوں تم اسی جگہ بیٹھے رہنا۔"

میں غار میں سے گزرتا اس کے دہانے پر آ کر رک گیا۔ ہمہ تن گوش ہو کر باہر کی فضا کو غور سے سنا۔ باہر سناٹا تھا۔ کوئی پہاڑی کوا دور کسی جگہ کائیں کائیں کر رہا تھا۔ میں نے خدا کا نام لیا اور غار کے منہ کے آگے جھاڑیوں کی جو دیوار کھڑی تھی اس میں سے ہو کر پہاڑی درے میں چلنے لگا۔ یہ تنگ راستہ ختم ہوا تو میں نے سر آگے نکال کر دیکھا۔ سامنے چھوٹا سا پہاڑی میدان بالکل خالی پڑا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے سانپ کی ہلکی سی بھنکار کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سانپ میرا پیچھا کرتا آ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ میرے قریب سے ہو کر رینگتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ میں سمجھ گیا کہ سانپ نے سیر کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے

سامنے میدان میں سوائے سوکھی گھاس اور خشک جھاڑیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دائیں جانب دوسرے پہاڑی ٹیلے کی دیوار شروع ہو جاتی تھی۔ بائیں جانب ڈھلان تھی۔ سانپ اسی ڈھلان کی طرف گیا تھا۔ عجیب بات ہے اس نے ڈھلان کی طرف مڑتے ہوئے میری طرف گردن اٹھا کر دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں غیر ارادی طور پر ڈھلان کی طرف چلا آیا۔ یہ ڈھلان زیادہ گہری نہیں تھی۔ نیچے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ سانپ اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی دور تک وہ مجھے نظر آیا پھر پتھروں اور گھاس میں گم ہوگیا۔ میں نے اردگرد غور سے دیکھا جب مجھے تسلی ہوگئی کہ وہاں کوئی آدمی نہیں ہے تو میں ڈھلان اتر کر درختوں کے جھنڈ میں آ گیا۔ یہاں آتے ہی مجھے ترل ترل پانی کے گرنے کی مدھم آواز آئی۔ پانی کی آواز سن کر میری جان میں جان آ گئی۔ یہ پانی درختوں کے نیچے ٹیلے کی دیوار میں سے نالے کی شکل میں نیچے گر رہا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور ہاتھوں کی

اوک بنا کر خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پانی پی کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں سانپ کو بھول گیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی اگرچہ بہت ٹھنڈا تھا مگر اس وقت وہ بہت بڑی نعمت تھا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو دیکھا کہ میرا دوست سانپ جہاں پانی کے گرنے سے چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا وہاں ایک پتھر پر کنڈلی مارے بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ سانپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ ظاہر ہے وہی مجھے پانی کے اس چشمے تک لایا تھا۔ یہ خدائی راز تھے جن کو سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ انسان اتنا عقلمند ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھتا اور جانور بے عقل ہوتے ہوئے بھی کیا کچھ نہیں سمجھ لیتے؟ یہ راز میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس خیال سے بلکہ اسی ڈر سے کہ وہاں خفیہ پولیس ضرور موجود ہوگی میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا چڑھائی چڑھ کر اپنے غار میں آگیا۔

پانی پینے سے میرے جسم کی توانائی کافی حد تک بحال ہوگئی تھی۔ میں نے دیوار کے شگاف کی طرف دیکھا۔ سانپ وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ باہر پہاڑیوں میں سیر کرنے نکل گیا تھا۔ دن گزرتا چلا گیا غار کی چھت کے سوراخ میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی وہ مدھم پڑنے لگی۔ لگتا تھا کہ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اب مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا سانپ بھی وہاں نہیں ہے اگر وہ میرے پاس ہوتا تو اس سے کہتا کہ دوست اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میرے کھانے پینے کا کوئی انتظام کر سکتے ہو تو کر دو۔ مجھے اپنے اس خیال سے ہنسی آ گئی۔ پھر میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ کیونکہ میں اپنے دوست سانپ کی عقلمندی کا مظاہرہ دیکھ چکا تھا۔ ممکن ہے اگر وہ میرے پاس ہوتا تو مجھے کسی ایسی جگہ لے جاتا جہاں جنگلی سیبوں کے درخت ہوتے اور میں سیب کھا کر ہی پیٹ کی آگ بجھا لیتا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرا دوست سانپ اندر آ گیا۔

اندر آ کر وہ حسب عادت کونے میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھ کر دو تین بار گردن کو جھکایا اور پھر سر نیچے کر کے بالکل جلیبی کی طرح بن کر سمٹ گیا۔ میں نے بھی اس کی طرف سے توجہ ہٹا لی۔ بھوک کی وجہ سے میرے جسم میں کمزوری آنے لگی تھی۔ صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ غار کی چھت کے سوراخ میں سے جو دن کی روشنی سارا دن آتی رہی تھی وہ اب بہت مدھم ہو گئی تھی۔ باہر شام کا وقت ہو گیا تھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا ہونے لگا تھا۔ میں نے موم بتی روشن کر لی اور سوچنے لگا کہ اگر شیر باز خان نہ آیا تو میں یہاں کب تک بھوکا بیٹھا رہوں گا۔ میں نے وہاں سے رات کی تاریکی میں نکل کر سری نگر کی طرف جانے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ بڑا مشکل کام تھا کیونکہ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ ویسے بھی بھوکا تھا اور وہاں سے سری نگر بانہال کو جانے والی سڑک بھی کافی دور تھی۔ پھر یہ بھی خطرہ تھا کہ لاقے میں ملٹری پولیس اور انٹیلی جنس کے آدمی پھیلے ہوئے ہوں گے۔ سڑک پر ناکے لگے ہوں گے۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہو گی۔ سڑک سے ہٹ کر پہاڑوں ا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ پہاڑی سلسلہ اتنا وسیع تھا اور درمیان اتنے ۔ے بڑے سنگلاخ میدان تھے کہ میں انہیں پیدل چل کر عبور نہیں کر سکتا تھا۔

میں اسی سوچ میں الجھا پریشان بیٹھا تھا کہ مجھے اچانک باہر سے کوئل کی واز سنائی دی۔ میں ایک دم چونک پڑا۔ اس موسم میں جموں کے علاقے میں

کوئل نہیں بولا کرتی۔ یہ شیر باز خان کا سگنل تھا۔ جب ہماری کوئی کمانڈو پارٹی کسی مشن پر جاتی تھی تو ٹارگٹ کے پاس پہنچ کر ہم کوئل کی آواز نکال کر ایک دوسرے کی موجودگی سے باخبر رہا کرتے تھے۔ کوئل کی آواز دوسری بار آئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اپنے منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ میرے آواز نکالنے پر باہر سے کوئل کی آواز تین بار آ کر خاموش ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ کمانڈو شیر باز خان کو معلوم ہوگیا ہے کہ میں کمیں گاہ میں ہی ہوں۔ اس نے میری موجودگی معلوم کرنے کے لیے ہی غار کے باہر سے کوئل کی آواز میں مجھے سگنل دیا تھا۔ میں اٹھا تو سانپ نے بھی ایک دم اپنی گردن اونچی کر لی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ سانپ کمانڈو شیر باز کو ڈس نہ لے۔ پہلے میں نے سوچا کہ سانپ کو پکڑ کر برتن میں بند کر لوں مگر وہاں کوئی ایسا برتن نہیں تھا۔ سانپ برابر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی وقت وہ کوٹھڑی کے باہر کی طرف گردن پھیر لیتا تھا۔ اس نے کسی اجنبی انسان کی بو کو سونگھ لیا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ میں نے پرانی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے سانپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دوست! جو آدمی اندر آ رہا ہے وہ میرا دوست ہے۔ میرا بھائی ہے اس کو ہرگز ہرگز نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ میرا دوست کمانڈو شیر باز آ رہا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ ٹھیک ہے؟ تم سمجھ گئے ہو؟"

سانپ گردن اٹھائے میری طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے تین بار گردن جھکائی اور جیسے پہلے بیٹھا تھا ویسے ہی جلیبی بن کر بیٹھ گیا۔ یقین کریں اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ سانپ اصل میں کوئی انسان ہے جو بھیس پلٹ کر سانپ کے روپ میں ظاہر ہوگیا ہے۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ میری بات کو اچھی طرح سے سمجھ گیا ہے۔ مجھے غار میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔

غار میں اندھیرا تھا۔ قدموں کی آواز رک گئی۔ پھر کوئل کی ہلکی سی آواز بلند ہوئی۔ میں نے بھی جواب میں کوئل کی آواز نکالی تو کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو۔"

وہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آیا تو ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر ملے۔ کوٹھری میں داخل ہونے لگے تو میں نے کمانڈو شیر باز کو ہاتھ سے پہلے روک لیا۔ وہ بولا۔

"کیا بات ہے حیدر علی! اندر کوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اندر ایک سانپ ہے مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے یرا خیال ہے کہ وہ تمہیں بھی کچھ نہیں کہے گا۔"

"کیا مطلب؟" شیر باز نے تعجب سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "مطلب میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔ مگر یہ سانپ میرا ست بن گیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ اندر آ جاؤ۔"

کمانڈو شیر باز خان کے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا تھا۔ میں نے تھیلا اس کے ھ سے پکڑ لیا اور خود اندر کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ شیر باز نے سر آگے کر ، دیکھا۔ میں نے کہا۔

"وہ دیکھو سانپ کونے میں اسی طرح بیٹھا ہے جیسے میں اسے چھوڑ کر گیا ۔"

واقعی سانپ اسی طرح جلیبی بن کر سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ کمانڈو شیر باز ٹھڑی میں آ گیا۔ وہ سانپ کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔

"حیدر علی! یہ تو بڑا خطرناک جلیبی سانپ ہے یہ تمہارا دوست کہاں سے بن کیا اس نے ابھی تمہیں نہیں ڈسا؟"

میں نے کہا۔ "دیکھ لو میں تمہارے سامنے زندہ موجود ہوں۔ باقی ساری بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم میرے لیے کچھ کھانے کو لائے ہو؟"

کمانڈو شیر باز بوریئے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"جو تھیلا تمہارے ہاتھ میں ہے اس میں تمہارے کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ڈوگرہ کیمپ سے فرار ہو کر اسی جگہ آئے ہو گے ا ابھی تک بھوکے ہو گے۔ مجھے تو آج صبح معلوم ہوا کہ تم پکڑے بھی گئے تھے ا فرار بھی ہو گئے ہو۔ اس رات میں نے صبح تک تمہارا انتظار کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پہلے کچھ کھا لوں۔ پھر تمہیں ساری کہانی سناؤں گا۔"

وہ حیرانی کے ساتھ پوچھنے لگا۔

"یہ بتاؤ کہ تم نے ڈوگرہ کیپٹن اور حوالدار کو کیسے ہلاک کیا؟ ان کے بدن تو لوگ کہتے ہیں پتھر بن گئے تھے۔ ایک کی گردن اور دوسرے کا بازو ٹوٹ کر الگ ہو چکا تھا۔ یہ سب کیا معمہ ہے حیدر علی؟"

میں تھیلا کھول کر اس میں سے نان تلی ہوئی مچھلی اور پانی کی بند دو بوتلیں باہر نکال چکا تھا۔ میں نے نان مچھلی کھانی شروع کر دی۔ دو تین نوالے نگلنے کے بعد شیر باز سے کہا۔

"یہ سارا کرشمہ میرے اس دوست سانپ کا ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ کام اسی سانپ نے دکھایا ہے۔ اگر یہ سانپ میری مدد نہ کرتا تو میں اس وقت تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔"

کمانڈو شیر باز ایک باعمل مرد میدان آدمی تھا۔ یہ دیو مالائی کہانی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تعجب سے کبھی مجھے اور کبھی سانپ کی طرف دیکھتا۔ میں نے کہا۔

"عین وقت پر یہ سانپ کہیں سے نکل آیا اس وقت ڈوگرہ کیپٹن مجھ پر شدید تشدد کر رہا تھا۔ میری چیخیں نکل رہی تھیں۔ خدا جانے یہ سانپ کہاں سے آ گیا۔ اس نے پلک جھپکتے میں ڈوگرہ کیپٹن اور ڈوگرہ حوالدار کو ڈس دیا۔ دونوں دھڑام سے گرے۔ گرنے سے ایک کی گردن اور دوسرے کا بازو الگ

ہوگیا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا دونوں کے جسم پتھر کی طرح سخت ہوگئے ہوئے تھے۔"

"اس سانپ نے تمہیں کیوں نہیں ڈسا؟"

کمانڈو شیر باز کے اس سوال کا جواب میرے پاس تھا۔ مگر میں س سانپ کی ہسٹری اور کہانی کمانڈو شیر باز کو نہیں سنانا چاہتا تھا۔ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بس یہی بات میری سمجھ میں ابھی نہیں آئی کہ اس نے مجھے کیوں نہیں ڈسا۔"

کمانڈو شیر باز خاموش ہوگیا۔ میں نے سانپ کو دیکھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کھاتے ہوئے ڈیڑھ دو نان ختم کر دیے تھے۔ بوتل میں سے پانی پیا اور شیر باز سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سانپ میری بات سمجھتا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" شیر باز نے کہا۔

میں نے جواب دیا۔

"اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب تم نے مجھے کوئل کی آواز کا سگنل دیا تھا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ تم آگئے ہو۔ سانپ نے بھی گردن اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا کہ میرا دوست آ رہا ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور بھائی بھی ہے۔ دیکھ لو اس نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"بھائی ان سانپوں وغیرہ کے چکر میں نہ پڑو۔ اس کو باہر لے جا کر پہاڑیوں میں چھوڑ دو۔ سانپ آخر سانپ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے صبح اسے پہاڑیوں میں چھوڑیں گے۔"

کمانڈو شیر باز مجھ سے میری داستان پوچھنے لگا کہ میں کیسے پکڑا گیا اور مجھ پر

کیا گزری؟ جب میں نے اسے اپنی ساری روداد سنائی تو اسے میری ہر بات
یقین آگیا لیکن جب میں نے اپنے دوست سانپ کی کارکردگی بیان کی وہ تو !
شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک سانپ ڈوگرہ کیمپ کی حوالات میں اچانک ا
کر تمہارے دشمنوں کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "تم دیکھ لو۔ سانپ تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ اس نے
مجھے کچھ کہا ہے نہ تمہیں کچھ کہا ہے۔ یہ میری دشمنوں کا دشمن اور دوستوں
دوست ہے۔"

"بہرحال!" شیر باز بولا۔ "تم اس سے جتنی جلدی پیچھا چھڑا لو بہتر ہے
سانپ کبھی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ تمہارا ایک تھیلا کیلاش ہوٹل کے کشمیری مجا
کے پاس ہے جو اس نے تمہارے ہوٹل کے کمرے سے اٹھایا تھا۔ اس میں ایک
ٹین کی ڈبی میں سبز رنگ کا سفوف سا کیا ہے۔"

وہ سبز رنگ کا سفوف فرنگ پھلی کا تریاق تھا۔ میں نے شیر باز کو چونک
اپنے دوست سانپ کی ہسٹری بالکل نہیں بتائی تھی اس لیے کہا۔

یہ میرے بمبئی کے دوست وزیر علی نے مجھے حکیم صاحب سے لا کر دیا تھا۔
یہ پیٹ درد کی دوا ہے وہ بھی ساتھ لے آتے تو اچھا تھا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں سے کس طرف جانے کا پروگرام ہے۔ میں تو کشمیر کے محاذ پر اپنے
حریت پسند بھائیوں کے شانہ بشانہ ڈوگرہ فوج سے لڑنا چاہتا ہوں۔"

کمانڈو شیر باز بات کرتے ہوئے رک گیا۔ پھر بولا۔

"ایک بڑے اہم مشن کے بارے میں تم سے بات کرنی ہے لیکن پہلے یہاں
سے نکل جائیں تو بات کروں گا۔"

میں نے دوبارہ سوال کیا۔
"کیا اس اہم مشن کے بارے میں تھوڑا بہت بھی نہیں بتاؤ گے۔"
کمانڈو شیر باز نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔
" سرینگر والے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد بات کریں گے۔"
میں نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فوج اور پولیس تو میری تلاش میں جگہ جگہ موجود ہوگی۔"
کمانڈو شیر باز نے کہا۔
"اس کا میں نے کچھ انتظام کر لیا ہے جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم ڈوگرہ کیمپ سے فرار ہوگئے ہو تو میں اسی بندوبست میں لگ گیا تھا۔ کیونکہ مجھے تمہیں اپنے ساتھ کشمیر لے جانا تھا۔"
"تو پھر کیوں نہ آج رات ہی یہاں سے نکل چلیں؟"
کمانڈو شیر باز بولا۔
"تمہیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں ابھی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ کل رات کا اندھیرا ہوتے ہی تمہارے پاس آؤں گا پھر ہم دونوں یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے لیکن اس سانپ کو یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا۔ ہمارے ساتھ اس سانپ کا کوئی کام نہیں ہے۔ تم کمانڈو ہو کوئی سپیرے نہیں ہو۔"
اب میں شیر باز کو کیسے بتاتا کہ کبھی کبھی کمانڈو کو سپیرے کا روپ بھی بدلنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا۔
"اوکے شیر باز خان۔ میں سانپ کو یہیں پہاڑیوں میں چھوڑ دوں گا۔ ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کل اندھیرا ہوتے ہی یہاں پہنچ جانا اور اپنے کشمیری مجاہد سے میرے پیٹ درد کی دوائی یعنی سفوف والی ڈبی ضرور لیتے آنا۔ کبھی کبھی میرے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔"
"لیتا آؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تھیلے میں تمہارے کل تک کے لیے

کھانا موجود ہے اور پانی کی ایک فالتو بوتل بھی ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے دوست سانپ نے کئی روز سے دودھ نہیں پیا۔ اسے دودھ پلانا چاہیے۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"اگر ہو سکے تو تھوڑا سا دودھ بھی بوتل میں ڈال کر لے آنا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دوست سانپ کو تھوڑا دودھ پلا کر رخصت کروں۔"

کمانڈو شیر باز نے کسی قدر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"حیدر علی! کیا بچوں ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا اب تم سانپ پالو گے؟ دفع کرو اس سانپ کو۔ یہ سانپ جنگل میں سب کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں کل اندھیرا ہوتے ہی آ جاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

کمانڈو شیر باز کے جانے کے بعد میں نے کونے میں بیٹھے ہوئے سانپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے دوست! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں وہ تم سمجھ لیتے ہو۔ سب سے پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میری بات کی عزت رکھی اور میرے دوست کمانڈو شیر باز کو کچھ نہیں کہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے یہ بھی سن لیا ہو گا کہ کمانڈو شیر باز تمہیں مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں یہاں جموں کی پہاڑیوں میں چھوڑ جاؤں۔ لیکن میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ میں تمہیں جب تک میری اور تمہاری زندگی ہے ' اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

سانپ جلیبی کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں ساری زندگی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تو میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھا لی اور میری طرف دیکھ کر سر کو دوبارہ جھکا دیا۔ جیسے میرا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ میں دل میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ یہ کس زمین کا سانپ ہے کہ میری ایک ایک بات کا مطلب سمجھ رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"تم نے مجھے ڈوگروں کی اذیت ناک قید سے رہائی دلا کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ویسے بھی مجھے تم سے انس ہوگیا ہے۔ میں اس دوستی کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے کمانڈو شیر باز کی دوستی بھی بڑی عزیز ہے۔ ہم اسلام کی سربلندی' کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے مشن پر نکلے ہوئے ہیں اور اپنی جان کی بازی لگا کر اس مشن کی تکمیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنا یہ مشن اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اب میں ایسا کروں گا کہ کل رات جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو میں تمہیں اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ تم مجھے کاٹو گے تو نہیں نا؟ ویسے کاٹ بھی لو گے تو مجھ پر تمہارے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

میں ہنسنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سانپ نے دو تین بار اپنی گردن کو میرے سامنے جھکایا اور آہستہ آہستہ منہ سے پھنکار کی آوازیں نکالیں اس کا مطلب ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میں تو تمہارا خادم ہوں۔ میں اپنے مالک کو کیسے ڈس سکتا ہوں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اپنی جیب میں ڈال کر غار سے لے چلوں گا اور باہر پہاڑیوں میں جا کر چھوڑ دوں گا۔ تم تیزی سے چلے جانا۔ لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ میں جہاں بھی جاؤں گا میرے ساتھ رہو گے۔ البتہ جب کمانڈو شیر باز میرے پاس موجود ہو تو تم سامنے نہیں آؤ گے کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

سانپ نے اسی طرح ایک بار پھر سر کو تین بار جھکایا اور منہ سے دھیمی دھیمی پھنکاروں کی آواز نکالی اور خاموش ہوگیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا دوست! شب بخیر! اب میں سونے لگا ہوں۔ تم پہرہ دیتے رہنا۔ کوئی دشمن آگیا تو مجھے جگا دینا یا اسے ختم کر دینا۔ جموں کی ساری سول اور ملٹری پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد میں وہیں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ اس کی خماری چڑھی تو مجھے فوراً نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو موم بتی ساری کی ساری پگھل کر بجھ چکی تھی۔ کوٹھڑی میں دروازے کے شگاف میں سے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ میری نظریں کونے کی طرف گئیں۔ سانپ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ جنگل میں کچھ کھانے پینے کے لیے نکل گیا ہوگا۔ میری طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ جسم کی ٹیسیں غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے تھیلے میں سے رات کے نان اور بھنی ہوئی مچھلی نکال کر تھوڑی کھائی۔ بوتل میں سے پانی پیا اور اٹھ کر غار کے دہانے پر آ گیا۔ باہر دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ میرے پاس گھڑی وغیرہ نہیں تھی۔ سامنے چھوٹا سا سنگلاخ میدان خالی پڑا تھا۔

اچانک مجھے کسی چوپائے کے آہستہ آہستہ ڈکرانے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگیا۔ یہ کسی بھینس یا گائے کی آواز تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی گوالا یہاں آس پاس موجود ہے جو گائے بھینسوں کو چرا رہا ہے۔ آواز آہستہ آہستہ مسلسل آ رہی تھی۔ اس آواز میں خوف اور دہشت کا ملا جلا تاثر تھا۔ میرے دل میں اچانک ایک خیال آگیا میں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر جس طرف پہاڑی کی ڈھلان تھی آہستہ آہستہ چل کر اس طرف آ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈھلان پر ایک گائے کھڑی ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور اس کے حلق سے دہشت ناک آواز نکل رہی ہے۔ میں جلدی سے اتر کر گائے کے پیچھے آ گیا۔ میرا قیاس بالکل درست نکلا۔ میرا دوست سانپ گائے کے تھن سے چمٹا ہوا اس کا دودھ پی رہا تھا۔ میں نے اسے بالکل آواز نہ دی اور وہیں سے الٹے قدم چل کر اوپر آ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا تھا کہ سانپ اپنے دودھ کا انتظام کہاں سے کرتا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے وہاں نہ کوئی گوالا نظر آیا اور نہ کوئی دوسری گائے ہی دکھائی دی۔ یہ کوئی آوارہ گائے تھی جو چرتی چراتی اس طرف نکل آئی تھی اور سانپ اس سے چمٹ کر اس کے

دودھ سے پیٹ بھرنے لگا۔

میرا وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص گائے کے ڈکرانے کی آواز سن کر ادھر آ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گائے کو ہندو لوگ اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہیں اور اس کی بڑی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کی بڑی ٹہل سیوا کرتے ہیں۔ گائے کو اگر کوئی تکلیف ہو تو اپنا سب کچھ بھول کر اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میں پہاڑی درے میں سے ہوتا ہوا واپس اپنی غار والی کمین گاہ میں آ گیا۔ اب مجھے رات ہونے کا شدت سے انتظار تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد لیٹا تھا۔ دوبارہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔ اس بار سو کر اٹھا تو غار کی چھت سے آنے والی روشنی غائب ہو چکی تھی۔ یعنی باہر شام کا وقت ہو گیا تھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر جہاں ماچس رکھی ہوئی تھی وہاں سے ماچس اٹھائی اور نئی موم بتی جلائی۔ کوٹھڑی میں روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سانپ کونے میں اسی طرح جلیبی بن کر پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ بھر کے دودھ پینے کے بعد اسے بھی خماری چڑھ گئی تھی اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اسے نہ جگایا اور دیوار پر سے اپنی بلکہ شیرباز کی جیکٹ اتار کر پہن لی۔

کمانڈو شیرباز نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہوتے ہی آ جائے گا۔ ابھی باہر رات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی میں غار کے دہانے پر جھاڑیوں کی دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ میرے حساب سے باہر رات پڑ چکی تھی۔ یہ شام کا اندھیرا نہیں تھا۔ رات کا ابتدائی اندھیرا تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے خاکے اندھیرے میں جذب ہو رہے تھے۔ میں واپس کوٹھڑی میں آ گیا۔ سانپ اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ میرا اس سے عارضی طور پر جدا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ مجھے اس سے الگ ہونے کا کوئی غم وغیرہ بالکل نہیں تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ یہ سانپ میرے مشن میں میرے بڑے کام آ سکتا تھا اور اب پتہ نہیں مجھ سے الگ ہو کر مجھ سے

پھر ملنا بھی ہے یا نہیں۔ اگر مجھ سے ملنا بھی چاہے تو اس کے ساتھ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے اور وہ ہلاک ہو سکتا ہے۔

کمانڈو شیر باز کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ مجھے سانپ کو اٹھا کر جیب میں ڈالنا تھا۔ میں اس مرحلے سے بھی گزرنا چاہتا تھا۔ میں نے سانپ کو آواز دی۔

"دوست! جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو؟"

سانپ نے اپنی گردن اٹھا لی۔ "کمال ہے۔ یہ سانپ میری آواز باقاعدہ سن رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب ہم دونوں کا ایک دوسرے سے عارضی طور پر جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میں تمہیں اٹھا کر جیب میں ڈال رہا ہوں تاکہ تمہیں غار سے باہر نکل کر پہاڑیوں میں چھوڑ دوں۔ تم مجھے ڈسنے کی کوشش تو نہیں کرو گے نا؟"

سانپ نے دوبارہ اپنے سر کو جھکا دیا۔ مجھے حوصلہ ہوا۔ میں نے آہستہ آہستہ قدم اٹھایا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ سانپ نے کوئی حرکت نہ کی، کوئی پھنکار تک نہ ماری۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سانپ اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں نے آہستہ سے اپنی انگلی اس کے سر پر رکھ دی۔ اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ میں نے اسے بڑی آہستگی سے اپنی ہتھیلی پر اٹھا لیا۔

"میرے دوست! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملتے رہو گے۔ جب تک زندہ ہو مجھ سے ملتے رہو گے۔ مگر کمانڈو شیر باز کی موجودگی میں مجھ سے دور رہو گے۔ ہاں اگر کوئی خطرناک حالات پیدا ہوگئے تو جس طرح تم میری مدد کرتے رہے ہو۔ اسی طرح کمانڈو شیر باز کی بھی مدد کرو گے کیونکہ ہم صرف خدا کی رضا کے لیے جہاد کر رہے ہیں۔ ہماری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔"

سانپ نے اپنی چھوٹی سی سری کو دائیں بائیں اس طرح ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "ایسا ہی کروں گا دوست! ایسا ہی کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "اب میں تمہیں اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال رہا ہوں۔

وہاں تمہیں سردی بھی نہیں لگے گی اوکے؟"

سانپ میری ہتھیلی پر کنڈلی مارے ساکت بیٹھا تھا۔ واقعی یہ ذہین ترین سانپ بالکل بالشت بھر کا سانپ تھا۔ رنگ بھورا تھا اور سرخ آنکھیں چھوٹے نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے سانپ کو اپنی ہتھیلی پر ہی بٹھائے رکھا اور کہا۔

"جب تک میرا دوست نہیں آ جاتا میں تم سے باتیں کروں گا۔ افسوس یہ ہے کہ تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے۔ مجھے یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ تم صرف میری آواز ہی نہیں سنتے بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سمجھتے بھی ہو۔ کاش تم بول بھی سکتے۔ یا کم از کم تم زبان میں بات کرتے ہو وہ زبان مجھے سمجھا دیتے تو بات ضرور ہو۔ تمہاری ہلکی ہلکی پھنکاریں کہہ رہی ہوتی ہیں کہ تم کوئی بات کر رہے ہو مگر صد افسوس کہ تم میری زبان میں مجھ سے بات نہیں کر سکتے۔"

اچانک سانپ نے اپنی گردن گھما کر کوٹھڑی کے شگاف کی طرف دیکھا۔ اس کے اس قسم کے اشارے اب میں سمجھنے لگا تھا۔ اس کا اس طرح اچانک ایک طرف دیکھنے کا مطلب تھا کہ اس نے کسی اجنبی کی بو سونگھ لی ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔ اس کے فوراً" بعد کوئل کے بولنے کی آواز آئی۔ یہ کمانڈو شیر باز خان کا سگنل تھا۔ سانپ سچا تھا' شیر باز آ گیا تھا۔ میں نے کوٹھڑی سے باہر نکل کر کوئل کی آواز منہ سے نکال کر اس کے سگنل کا جواب دیا اور کوٹھڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"اچھا دوست! اب میری جیب میں جا کر آرام کرو۔"

میں نے سانپ کو جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ غار میں قدموں کی آواز آئی اور پھر کمانڈو شیر باز اندر آ گیا۔ کہنے لگا "آ جاؤ حیدر علی! سب ٹھیک ہے۔"

میں نے موم بتی بجھائی اور شیر باز کے ساتھ غار سے باہر آ گیا۔ ہم دو

پہاڑی ٹیلوں کے درمیانی راستے سے گزر رہے تھے کہ کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"وہ سانپ کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری جیب میں ہے۔"

"لا حول ولا قوہ"

کمانڈو شیر باز وہیں رک گیا۔

"بھائی اس کو جیب میں ڈال کر کہاں لے جا رہے ہو۔ یہیں پھینک دو اسے۔"

میں نے جیب سے سانپ نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور اسے کہا۔

"دوست! خدا حافظ!"

اور میں نے ہتھیلی نیچے کر کے سانپ کو چھوڑ دیا۔ اندھیرے میں سانپ میری ہتھیلی سے اچھل کر نیچے گرا اور غائب ہو گیا۔ شیر باز بولا۔

"آ جاؤ' دیر نہ کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ ہمارے دو آدمی ٹیلے کی دوسری طرف جیپ لے کر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم ایک پہاڑی کے پہلو سے ہوتے ہوئے دوسرے ٹیلے کے دامن میں آ گئے۔ اندھیرے میں ہمیں ہر شے سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ مجھے سانپ کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ہم سے دور رہ کر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ جب ہم جیپ میں بیٹھ کر سفر شروع کریں گے تو سانپ بہت پیچھے رہ جائے گا لیکن میں جہاں بھی چلا جاؤں گا میرا دوست سانپ میرے جسم کی بو پا کر وہاں ایک نہ ایک دن ضرور پہنچ جائے گا۔"

ٹیلے کی دوسری جانب اندھیرے میں مجھے دو آدمی کھڑے نظر آئے۔ ان کے قریب ہی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ قریب جا کر دیکھا کہ وہ ایک جیپ تھی جس پر ترپال کی چھت پڑی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے وہاں پہنچتے ہی کہا۔

"اوکے' رحمان بٹ چلو۔"

ہم جیپ کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ہمارے دونوں گائیڈ جیپ کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جیپ کا انجن سٹارٹ ہوا اور رات کے اندھیرے میں جموں کی نیم خشک پہاڑیوں میں ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ ہمارے گائیڈ کو راستے کا علم تھا۔ یہ کچا پہاڑی رستہ تھا جو پہاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان سے اور کبھی ان کے اوپر سے ہو کر جاتا تھا۔ کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے۔ ہماری جیپ ان جھنڈوں کے نیچے سے آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ کبھی بالکل سپاٹ سنگلاخ زمین آ جاتی۔ اندھیرے میں آسمان پر تارے چمکتے دکھائی دیتے۔ جیپ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر اچھلتی ہوئی چل رہی تھی۔ جیپ کا عقبی حصہ کھلا تھا جہاں سے سرد ہوا آ رہی تھی۔ میں اور کمانڈو شیر باز ایک دوسرے کے آمنے سامنے والی نشستوں پر ہاتھ بغلوں میں دے کر بیٹھے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"راستے میں کوئی چیک پوسٹ تو نہیں آئے گی؟"

شیر باز بولا۔

"ہم پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر جا رہے ہیں۔ یہ راستہ لمبا ضرور ہے مگر اس طرف ایسی کوئی سڑک نہیں ہے جس پر چیکنگ پوسٹ کا خطرہ ہو۔ ویسے اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوگئی تو میں نے پستول اپنے پاس رکھ لیا ہے۔"

"مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

شیر باز نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میرے پاس کوئی دوسرا پستول تو اس وقت نہیں ہے یہ چاقو تم اپنے پاس رکھ لو۔"

اس نے مجھے جیب سے بڑا کمانڈو چاقو نکال کر دے دیا۔ جسے میں نے جیب میں رکھ لیا۔ جیپ میں ہمیں جو دھچکے لگ رہے تھے وہ بتا رہے تھے کہ گاڑی دشوار گزار پہاڑی علاقے سے گزر رہی ہے۔ جیپ کے اوپر ترپال کی چھت اس طرح ڈالی گئی تھی کہ صرف آگے اور پیچھے کا حصہ کھلا تھا جہاں سے سرد ہوا آ

رہی تھی۔ جیپ کبھی نشیب میں اترنے لگتی۔ کبھی چڑھائی چڑھنا شروع کر دیتی۔ کہیں میدان آ جاتا اور جیپ بالکل ہموار ہو کر چلنے لگتی۔

رات کے تین بجے تک جیپ اسی طرح پہاڑی اور میدانی علاقوں میں چلتی رہی۔ اس دوران ایک بار شیر باز خان سو گیا۔ اندھیرے میں مجھے اس کے سونے کا اس طرح پتہ چلا کہ میں نے اسے آواز دی تو وہ نہ بولا۔ دوسری بار میں بھی سو گیا۔ اگلی نشستوں پر ہمارے دونوں کشمیری گائیڈ بڑے ہوشیار ہو کر بیٹھے تھے۔ جو مجاہد جیپ چلا رہا تھا وہ بڑا ماہر ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اسے پہاڑی رستوں سے پوری واقفیت تھی۔ ایک جگہ موڑ کاٹ کر جیپ ٹیلے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت کمانڈو شیر باز گردن ڈھلکائے سو رہا تھا۔ جیپ کے رکنے سے ہلکا سا دھچکا لگا تو وہ بولا۔

"رحمان بٹ! کیا ہوا؟"

رحمان بٹ گاڑی کا انجن بند کرتے ہوئے بولا۔

"خواجہ صاحب! سیتل واڑی پہنچ گئے ہیں۔"

میں جاگ رہا تھا۔ شیر باز نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نیچے آ جاؤ۔"

معلوم ہوا کہ یہاں سے آگے خچروں پر سفر کرنا ہو گا۔ رحمان بٹ ہمیں وہیں چھوڑ کر اندھیرے میں ٹیلوں کی طرف چلا گیا۔ شیر باز بولا۔

"اپنا ایک آدمی خچر لے کر یہاں آ گیا ہو گا۔ ہمیں اگلا سارا دن خچروں پر بیٹھ کر سفر کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "ہم اس وقت کون سے علاقے میں ہیں۔"

کمانڈو شیر باز نے مجھے علاقے کے بارے میں بتایا۔ جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ یہ مجاہدین کشمیر کا وادی سے جموں تک خفیہ پہاڑی راستہ ہے جہاں سے وہ ضرورت کے وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی اسی

راستے سے آتے جاتے تھے اور آج بھی اسی خفیہ پہاڑی راستے کو استعمال کرتے ہیں کیونکہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ کشمیری مجاہد اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد رحمان بٹ پچھلی رات کے دھندلے اندھیرے میں نمودار ہوا۔ وہ خچر پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے تین خچر ایک قطار میں چلے آ رہے تھے۔ ہم خچروں پر بیٹھ گئے اور آگے چل پڑے۔ آگے آگے ہمارا گائیڈ رحمان بٹ تھا۔ اس کے پیچھے اس کے ساتھ کشمیری مجاہد تھا۔ اس کی پیچھے کمانڈو شیر باز کا خچر تھا۔ سب سے پیچھے میرا خچر چلا آ رہا تھا۔ میدانی علاقہ تقریباً ختم ہوگیا تھا اور وادیاں گھاٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ ہم اس طرح سفر کر رہے تھے کہ ایک پہاڑی کے گرد چکر لگا کر اوپر چڑھتے اور پھر دوسری طرف سے نیچے اتر کر دوسری پہاڑی کی چڑھائی شروع ہو جاتی۔ رستہ بڑا خطرناک تھا۔ پہاڑی پگ ڈنڈی تھی جو پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ اس کی دوسری جانب گہری گھاٹی تھی۔ خچر ان راستوں پر چلنے کے ماہر تھے۔ رات کو ہم اس لیے سفر کر رہے تھے کہ یہ حساس علاقہ تھا اور انڈین آرمی کے فوجی کا نوائے ان پہاڑیوں پر سے گزرتے رہتے تھے۔

سورج نکلنے کے بعد ہم ایک وادی میں پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے دوپہر تک آرام کیا۔ کھانا وغیرہ بھی وہیں پکا کر کھایا اور خچروں پر سوار ہو کر آگے چل پڑے۔ ہم کشمیری کی وادی میں داخل ہو چکے تھے اگرچہ سری نگر وہاں سے ابھی کافی دور تھا۔ اسی طرح سفر کرتے ہم تین دن کے بعد مقبوضہ کشمیر کی جنت نظیر وادی میں آ گئے۔ یہاں سے ہمارے دونوں گائیڈ ہم سے جدا ہو گئے اور ایک نیا کشمیری مجاہد ہماری راہ نمائی کے لیے آ گیا۔ شام کے وقت ہم کشمیر کی سرد فضاؤں میں پہاڑی جنگل میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں نیچے گہری کھائی تھی۔ ہم خچروں پر سوار تھے۔ ہمارا گائیڈ ہمیں ایسے راستے سے لے جا رہا تھا جہاں ڈھلان زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ گھاٹی جہاں ختم ہو گئی وہاں ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ چھوٹا سا نالہ تھا۔ سرد پانی پتھروں سے ٹکرا کر اچھل اچھل کر بہہ رہا تھا۔ ہم نے خچروں پر بیٹھے بیٹھے نالہ پار کیا۔ آگے پھر تھوڑی چڑھائی آ گئی۔ بڑے بڑے زنگ آلود پتھر اور بڑی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ اوپر اخروٹ اور بادام کے گھنے درختوں نے چھت ڈال رکھی تھی۔ یہاں ہم خچروں پر سے اتر گئے۔ ہمارا گائیڈ خچر لے کر واپس چلا گیا۔

میں اور شیر باز اکیلے رہ گئے۔ شیر باز نے کہا۔

"ہم اپنے خفیہ ٹھکانے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی ہیں۔"

اونچی اونچی دیو پیکر چٹانوں کے درمیان سے گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے درختوں میں لکڑی کا ایک شکستہ سا مکان ہے جس کی ڈھلانی چھت پر

گھاس پھوس پڑا ہے۔ چھوٹے سے صحن میں ایک بوڑھا کشمیری فرن اپنے جسم کے گرد لپیٹے کانوں تک گرم اونی ٹوپی پہنے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمانڈو شیر باز کو سلام کیا اور کشمیری میں کہا۔

"خواجہ صاحب! راستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

میں تھوڑی تھوڑی کشمیری زبان سمجھ لیتا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ بس مطلب نکال لیتا تھا۔ شیر باز بوڑھے سے کشمیری میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے بوڑھے کشمیری سے میرا تعارف کروایا۔ ہم لکڑی کے مکان کے چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں آ گئے۔ یہاں درمیان میں انگیٹھی پڑی تھی جو بجھی ہوئی تھی۔ بوڑھے کشمیری نے جس کا نام قادر بٹ تھا اسی وقت انگیٹھی میں کوئلے جلا دیے۔ ہمارے لیے وہ کشمیری چائے سماوا میں تیار کرنے لگا۔ میری جیکٹ کی جیب میں میرا دوست سانپ خاموشی سے آرام کر رہا تھا۔ راستے میں میں اسے دیکھ لیتا تھا۔ ایک جگہ میں نے اسے جنگل میں سیر کے لیے چھوڑ بھی دیا تھا مگر اس کے قریب منہ لے جا کر اسے تاکید کر دی تھی کہ وہ جنگل میں زیادہ دور نہ جائے اور جلدی واپس آ جائے۔

سانپ واقعی جلدی واپس آ گیا تھا۔

کمانڈو شیر باز کو معلوم نہیں تھا کہ میں سانپ کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ سانپ بھی میرے ساتھ پوری دوستی نبھاہ رہا تھا سفر کے دوران اس نے ایک جگہ بھی نہ تو اپنا سر میری جیکٹ کی جیب سے باہر نکالا تھا اور نہ ہلکی سی پھنکار ہی ماری تھی۔ خدا جانے وہ کیسے سمجھ گیا تھا کہ میں اسے اپنے دوست شیر باز خان سے چھپا کر لیے جا رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے زبانی اسے کہہ دیا تھا کہ کمانڈو شیر باز پر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ تم میری جیب میں ہو اور میرے ساتھ سفر کر رہے ہو لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ سانپ حسب معمول میری گفتگو اور الفاظ کو پوری طرح سمجھ گیا تھا اور میں حیران تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیسے سمجھ گیا ہے۔ ہم

نے دوپہر کا کھانا اسی مکان کی کوٹھی میں کھایا' چائے پی۔ اسی دوران رات گہری ہوگئی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے تھیلے میں سے وہ ڈبی نکال کر مجھے دکھائی جس میں سانپ کے تریاق کا سفوف تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری دوائی اسی تھیلے میں پڑی ہوگی۔ تھیلا اس کوٹھڑی میں ہی ہوگا۔ اب میرے ساتھ آؤ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

مکان کے باہر کوئی لیمپ روشن نہیں تھا۔ اندھیرا بڑا گہرا تھا لیکن ہم لوگ اس اندھیرے کے عادی ہوگئے تھے اور اس اندھیرے میں بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے اور راستہ تلاش کر لیتے تھے۔ اس مکان کے پیچھے ایک پگ ڈنڈی نیچے چھوٹی سی گھاٹی اترتی تھی۔ گھاٹی کی دوسری طرف ذرا اوپر کر کے درختوں کی کٹی ہوئی سوکھی شاخوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر کے پیچھے سے ایک تنگ اور نظر نہ آنے والا راستہ لکڑی کے ڈبہ نما چھوٹے سے کیبن میں آ جاتا تھا۔ اسی کیبن میں بھی خشک گھاس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گھاس کے ڈھیر کے پیچھے کھلی جگہ تھی جہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ لالٹین کی بتی کافی نیچی کی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہاں روشنی دھندلی اور معمولی سی تھی۔

لکڑی کے فرش پر نمدہ بچھا ہوا تھا۔ دو پرانے لحاف بھی پڑے تھے۔ ہم جوتے اتار کر لحافوں میں گھس کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیر باز بولا۔

"تم جیکٹ کیوں نہیں اتارتے؟ اسے اتار کر دیوار سے لٹکا دو۔ سردی روکنے کے لیے یہ لحاف کافی ہے۔"

میں جیکٹ اس لیے نہیں اتارتا تھا کہ اس کی جیب میں میرا دوست سانپ تھا۔ جب شیر باز نے بہت مجبور کیا تو اس خیال سے کہ اسے کوئی شک نہ پڑے میں نے جیکٹ اتاری اور دیوار پر کیل کے ساتھ لٹکا دی۔ ساتھ ہی سرگوشی میں جیب کے قریب منہ لے جا کر سانپ سے کہا۔

"دوست! اب راز کو راز ہی رکھنا باہر مت نکلنا۔"

شیر باز خان نے جلدی سے آواز دی۔ میں جلدی سے واپس مڑ کر بولا۔
"تمہارے کان بج رہے ہیں شیر باز خان میں سوائے تمہارے یہاں اور کس سے بات کر سکتا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ وہ کون سی خاص بات ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو۔"
میں شیر باز کے پاس ہی اپنے لحاف کو اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ لالٹین بڑی مدھم جل رہی تھی۔ کہنے لگا۔
"یہاں ہم موم بتی اس لیے نہیں جلاتے کہ آگ لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے لالٹین ہی رات کو جلاتے ہیں۔ مگر اسے بھی مدھم رکھتے ہیں اور باہر لے کر نہیں جاتے۔"
میں نے کہا۔ "یہ تو میں سمجھ گیا ہوں لیکن تم کسی خاص مسئلے پر مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ میں وہ مسئلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"
کمانڈو شیر باز گہرا سانس بھر کر بولا۔
"بات یہ کہ حیدر علی کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے بھارت نے اپنی فوج لاکھوں کی نفری میں یہاں بھیج کر کشمیر پر زبردستی قبضہ کیا ہوا ہے اور ہم کشمیری اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف بھارت کی سرکار کا بھی بے پناہ بجٹ کشمیر میں بھیجی ہوئی فوج پر خرچ ہو رہا ہے۔ بھارت سرکار کشمیر پر قبضہ بھی رکھنا چاہتی ہے لیکن زیادہ دیر تک اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے اپنے ملک بھارت مین غریب عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کوئی ایسا طریق کار وضع کرنا چاہتی ہے کہ بھارت کا کشمیر پر زبردستی کا قبضہ بھی برقرار رہے اور یہ جنگ بھی ختم ہو جائے۔"
میں نے پوچھا۔
"اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے جو کشمیریوں کا جائز مطالبہ بھی ہے کہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دے دیا جائے۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"یہی تو بھارتی حکومت نہیں چاہتی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کشمیری مسلمان بھارت سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بھارت نے آرمی کی مدد سے ان کے ملک کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔"

"تو پھر اور کیا طریقہ بھارت کی سرکار سوچ رہی ہے۔"

کمانڈو شیر باز نے سر کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے غور و فکر کے انداز میں بولا۔

"ہمیں یہی معلوم کرنا ہے تم سمجھ لو کہ یہی ہمارا اگلا مشن ہے۔"

"وہ تم کھل کر بات کرو شیر باز خان۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

شیر باز خان بولا۔

"بات یہ ہے حیدر علی کہ ہمارے مخبروں نے ہمیں خبر دی ہے کہ یہاں سے ساٹھ ستر میل جنوب مشرق کی جانب جو ایک گھنا پہاڑی جنگل ہے اور جہاں ایک چھوٹی سی جھیل بھی ہے وہاں پر اسرار قسم کی فوجی سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ رات کے اندھیرے میں فوجی ٹرک آتے ہیں اور چھوٹے بڑے لوہے اور لکڑی کے کریٹ اتار کر چلے جاتے ہیں۔ یہ کریٹ رات کے اندھیرے میں ہی کسی خفیہ جگہ پر اسی پہاڑی جنگل میں منتقل کر دیے جاتے ہیں۔ دن کے وقت یہاں چاروں طرف خاموشی چھائی رہتی ہے نہ کوئی فوجی یا دوسرا ٹرک نظر آتا ہے اور نہ کوئی فوجی جوان یا سویلین آدمی چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ دن کے وقت ہمارے آدمی گوالوں اور دیہاتیوں کے بھیس میں بکریاں وغیرہ چرانے کے بہانے اس علاقے میں کئی بار گھوم پھر آتے ہیں۔ مگر انہیں وہاں کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جس سے یہ ظاہر ہو کہ رات کو یہاں فوجی ٹرکوں پر سے کوئی سامان اتار گیا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ جو سامان اتارا جاتا ہے وہ کس جگہ پر رکھا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے کسی آدمی کو رات کے وقت وہاں چھپ کر معلوم کرنا چاہیے کہ فوجی ٹرکوں سے جو سامان اتارا جاتا ہے وہ کہاں لے جایا جاتا ہے۔"

شیر باز کہنے لگا۔

"رات کے وقت جب فوجی ٹرک ان پہاڑیوں میں آتے ہیں تو فوج کی پوری رجمنٹ اس علاقے کو گھیرے میں لے لیتی ہے۔ جگہ جگہ ایسے حساس آلات لگا دیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی چوہا بھی رینگ کر آگے جانے کی کوشش کرے تو فوراً پتہ چل جاتا ہے اور فوج کی پٹرول پارٹیاں ٹھیک اسی جگہ کو نشانہ بنا کر مشین گن کی فائرنگ شروع کر دیتی ہے۔ ہمارے آدمی راتوں کو اس علاقے میں سراغ رسانی کرنے گئے تھے مگر انہیں حساس آلات کا چونکہ پہلے سے علم ہو چکا تھا اس لیے خطرناک لائن سے پیچھے رہ کر اندھیرے میں ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ کئی بار رات کے اندھیرے میں کوئی لومڑ، مرغی، گیدڑ یا کوئی دوسرا جنگلی جانور حساس آلات کی لائن پار کر کے جیسے ہی گزرا اس پر مشین گن کی بوچھاڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ ہمارے آدمیوں کو دن کے وقت وہاں کئی مرے ہوئے جنگلی جانوروں کی لاشیں ملی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے پہاڑیوں میں کوئی خفیہ ایمونیشن ڈپو بنایا جا رہا ہو۔"

شیر باز نے کہا۔

"ایمونیشن ڈپو بنانے کے واسطے سیکورٹی کے اتنے سخت انتظام نہیں کیے جاتے۔ ہمارے خدشات کی اس بات سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے ایک مجاہد نے سری نگر ملٹری پولیس کے ہیڈ کوارٹر سے ہمیں ایک ایسا کاغذ لا کر دیا ہے جو اس نے وہاں کی ٹاپ سیکرٹ فائیل سے فوٹو کاپی کر لیا تھا۔ اس کاغذ پر ایک نقشہ بنا ہوا ہے جس میں اونچے نیچے گہرے بنکرز لمبی لمبی چکی دار وادیاں اور تین سرنگیں دکھائی گئی ہیں۔ کاغذ پر انگریزی میں کچھ نمبر بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے

علاوہ اور کچھ نہیں لکھا ہوا۔ اس نقشے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انڈین آرمی یہاں پہاڑیوں کے اندر کوئی ایمونیشن ڈپو یا ایمونیشن ڈمپ نہیں بنا رہی بلکہ زیر زمین کوئی پر اسرار پراجیکٹ بنا رہی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ انڈین آرمی کا یہ خفیہ پراجیکٹ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پراجیکٹ کا مقصد کشمیری حریت پسندوں کی سرگرمیوں کو کچلنا اور کشمیری مجاہدین پر کوئی زبردست حملہ کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انڈین آرمی ہائی کمان آزاد کشمیر پر حملے کا ناپاک منصوبہ تیار کر رہی ہو۔ بہرحال یہ سب کچھ ابھی تک ایک سربستہ راز ہی ہے۔ ہمیں اس راز کو بے نقاب کر کے معلوم کرنا ہے کہ اس پہاڑی جنگل کے زیر زمین کیا ہو رہا ہے۔"

میں بھی سوچنے لگا کہ اگر واقعی انڈین آرمی کوئی اس قسم کا خطرناک منصوبہ تیار کر رہی ہے تو یہ تو پاکستان کے لیے بھی خطرے کی علامت ہے۔ پہلا فیصلہ تو میں نے یہ کیا کہ پاکستان میں بٹ صاحب کو اس خطرناک بھارتی منصوبے سے آگاہ کر دیا جائے۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اس خطرناک زیر زمین پراجیکٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں خود میدان میں نکلنا ہوگا۔"

شیر باز نے کہا۔

"حیدر علی! میں نے اس پر بھی کافی غور کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی ایسا کمانڈو مشن نہیں ہے کہ جس کا ٹارگٹ ہمارے سامنے ہو اور ہم شب خون مار کر ٹارگٹ کو تباہ کر کے آ جائیں لیکن ہمیں تو ٹارگٹ نظر ہی نہیں آ رہا۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ٹارگٹ کیا ہے اور کس نوعیت کا ہے۔ یہ خاص سراغ رسانی اور جاسوسی کا مشن ہے۔ اس کے لیے ہمیں کمانڈوز کی دلیری اور جرات مندی کی بجائے جاسوسوں والی چالاکی اور عیاری کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ ”اس کے لیے میں تیار ہوں۔ میں اتنا اچھا کمانڈو نہیں ہوں جتنا اچھا جاسوس اور سراغ رساں ہوں۔ تم صرف اپنے مخبروں سے یہ معلوم کروانے کی کوشش کرو کہ اس خفیہ فوجی پراجیکٹ کا کلیدی افسر کون ہے۔ یعنی کس فوجی افسر کی زیر قیادت اس پراجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ اس فوجی افسر کا نام کیا ہے اس کی بیوی کا نام کیا ہے۔ اس کا ملنا جلنا کن لوگوں سے ہے۔ اگر اس کی تصویر مل سکے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کے بعد ہی میں اپنے طریقے سے اس پراجیکٹ کا راز معلوم کرنے کی کوشش کر سکوں گا۔“

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

”یہ میں معلوم کروا دوں گا لیکن میں تمہیں یہ ضرور کہوں گا کہ اگرچہ یہ جاسوسی کا مشن ہوگا لیکن تمہیں بے حد احتیاط سے قدم اٹھانا ہوگا کیونکہ وہ جو کوئی بھی فوجی یا سویلین افسر ہوگا وہ اس خفیہ پراجیکٹ کے بارے میں اتنی آسانی سے تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔“

میں نے کہا ”تم پہلے معلوم تو کرو کہ وہ فوجی افسر یا سویلین افسر کون ہے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

ہمارا قیام اس پہاڑی چٹانوں سے گھرے ہوئے چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں ہی تھا۔ دن کے وقت کمانڈو شیر باز چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ میں زیادہ تر بوڑھے کشمیری کے لکڑی کے ایک کمرے والے مکان میں ہی رہتا شام کو چٹانوں کے پیچھے درختوں میں ٹہلنے چلا جاتا۔ یہاں کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔ بوڑھا کشمیری بھی اکثر غائب رہتا تھا۔ یہ کمانڈو شیر باز نے اپنا خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا جو سری نگر شہر کے مغرب میں کافی فاصلے پر تھا ادھر کوئی باقاعدہ بڑی سڑک بھی قریب سے نہیں گزرتی تھی۔ کبھی کسی موٹر گاڑی یا ٹرک وغیرہ کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ دن کے وقت نیچے جو پہاڑی نالہ بہتا تھا اس کی ہلکی ہلکی آواز آتی رہتی تھی۔ رات کے وقت یہ آواز زیادہ سنائی دیتی تھی۔

رات کو یا شام کے وقت شیر باز آتا تو ہم لکڑی کے مکان سے اٹھ کر پیچھے گھاس پھوس والے چٹانی جھونپڑے میں آ کر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کمانڈو شیر باز نے اپنے تین آدمیوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ انڈین آرمی کے زیر زمین خفیہ پراجیکٹ کے سربراہ کا پتہ چلائیں کہ وہ کون ہے اس کا نام کیا ہے اور اس کے کوائف کیا ہے۔ ایک ہفتہ گزر گیا ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ آٹھویں روز کمانڈو شیر باز اپنے ساتھ ایک مجاہد کو لے کر آیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لکڑی کے مکان میں ہی بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیر باز نے اپنے مجاہد سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام صمد بٹ تھا۔ شیر باز نے صمد بٹ سے کہا۔

"صمد! تم جو کچھ پتہ کر کے آئے ہو حیدر بھائی کو بتا دو۔"

صمد بٹ کہنے لگا۔

"پہاڑی جنگل والے اس زیر زمین پراجیکٹ کے بارے میں تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہاں کیا کام ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہ کوئی فوجی پراجیکٹ ہے جو انڈین آرمی کے ماتحت ہے۔ اس پراجیکٹ کا دفتر سری نگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ہے۔ اس کا ڈائریکٹر ایک ڈوگرہ میجر ہے جس کا نام ارجن سنگھ ہے۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہے۔ رنگ کالا ہے' ناک تیکھی ہے' مونچھیں بڑی بڑی ہیں۔ قد پانچ فٹ سے نکلتا ہوا ہے۔ سگار پیتا ہے۔ رات کو آفیسرز میس میں بیٹھ کر شراب بھی پی لیتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ اس میں سے میجر ارجن سنگھ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔ دوسری بیوی کا نام ورشا سنگھ ہے۔ وہ بھی جموں کالج کی بڑھی ہوئی ہے۔ گندمی رنگ کی بڑی خوش شکل لڑکی ہے۔ نوجوان ہے۔ عمر بیس بائیس سال کے قریب ہے۔ فیشن ایبل ہے مگر اپنے خاوند کی وفادار ہے۔ دوسرے فوجی افسروں کو زیادہ منہ نہیں لگاتی۔ میجر ارجن سنگھ بھی جموں کا رہنے والا ہے۔ جموں میں ان کا آبائی مکان ہے جہاں اب تالہ پڑا رہتا

ہے۔ کیونکہ میجر ارجن سنگھ کے ماں باپ مر چکے ہیں اس کا کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے۔"

صمد بٹ نے مجھے کافی معلومات فراہم کر دی تھیں۔ وہ ارجن سنگھ کی تصویر پیدا نہیں کر سکا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ سری نگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں میجر ارجن سنگھ کا دفتر کس جگہ پر ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کی رہائش کہاں پر ہے؟"

صمد بٹ کہنے لگا۔

"سری نگر فوجی ہیڈ کوارٹر کے عقب میں آرمی افسروں کے لیے کچھ کاٹج بنے ہوئے ہیں۔ میجر ارجن سنگھ وہیں کاٹج نمبر F - 11 میں رہتا ہے۔ گھر میں ایک اردلی رہتا ہے۔ ایک عورت کام کرنے صبح آتی ہے شام کو چلی جاتی ہے۔ اس کی بیوی بھی اکثر گھر پر ہی رہتی ہے۔ شام کو کبھی کبھی خود گاڑی لے کر شاپنگ کرنے سری نگر آ جاتی ہے۔ کسی شام اپنے خاوند کے ساتھ آفیسرز میس میں بھی چلی جاتی ہے۔"

"ان کے ہاں فوجی افسروں کی دعوتیں تو اکثر ہوتی رہتی ہوں گی۔"

میرے اس سوال پر صمد بٹ نے کہا۔

"جہاں تک ایک ہفتے میں ہمیں معلوم ہوا ہے صرف ایک پارٹی میجر ارجن سنگھ کے گھر پر ہوئی ہے جس میں ایک دو کرنل اور ان کی فیملی بھی شریک تھی۔"

میں نے صمد بٹ سے پوچھا۔

"میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا کس قسم کی عورت ہے۔ میرا مطلب ہے کیا مذہبی پوجا پاٹھ کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہے یا آزاد خیال ہے۔"

صمد بٹ نے کہا۔

"جس عورت سے ہم نے اس کے گھر کی معلومات حاصل کی تھیں۔ اس

نے بتایا تھا کہ میجر کی بیوی نے گھر کے ایک کونے میں رام اور سیتا کی مورتیاں سجا رکھی ہیں جن کی وہ صبح اٹھ کر آرتی اتارتی ہے اور ماتھا ٹیکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے یہی کافی ہے۔"

صمد بٹ چلا گیا تو کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"کیا اتنی معلومات تمہاری جاسوسی کے لیے کافی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بہت ہیں۔"

"تم کیا لائن آف ایکشن اختیار کرو گے؟"

کمانڈو شیر باز نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"صرف ایک لائن آف ایکشن میرے ذہن میں آئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی لائن آف ایکشن یہاں کارآمد ہوگی۔"

"مثلاً" تم سراغ رسانی کہاں سے شروع کرو گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! ابھی میں اپنے طریق کار کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں اپنا کام شروع کروں گا تو تمہیں سب سے پہلے خبر ہو جائے گی۔ اس بارے میں تم اطمینان رکھو۔ بلکہ تمہاری راہ نمائی میں میرا یہ جاسوسی کا مشن آگے بڑھے گا۔"

کشمیری مجاہد صمد بٹ جب مجھے انڈین آرمی کے پر اسرار پراجیکٹ کے سربراہ اور اس کی بیوی کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا تو میرا ذہن ساتھ ساتھ کام کرنے لگا تھا اور پورے کا پورا ایکشن میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ کمانڈو شیر باز کو میں اس لیے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہتا تھا۔ پورا ایکدن میں اپنے مشن پر غور کرتا رہا۔ اس کے ہر پہلو پر غور کیا۔ اپنے طریق کار کی تمام کمزوریوں کا تجزیہ کیا۔ جب اپنی طرف سے ایکشن کے لیے پلان تیار ہو گیا تو میں نے کمانڈو شیر باز سے پہلے پہلے اپنے ایک اور

دوست سے مشورہ ضروری سمجھا اور میرا یہ دوسرا دوست سانپ تھا جسے میں نے مکان کے پیچھے ایک پہاڑی کھوہ میں خشک گھاس پھوس بچھا کر رکھا ہوا تھا۔ میں وقت نکال کر دن میں ایک بار اسے دودھ ضرور پلا دیتا تھا۔ چونکہ تجربے نے مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ میری بات سمجھتا ہے۔ میرے الفاظ کو سمجھتا ہے۔ اس لیے میں نے اسے کھوہ میں خشک گھاس پر بیٹھاتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

"میرے دوست! تم یہاں میرے پاس رہو گے۔ میں بھی تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ دن بھر جنگل میں جہاں چاہے پھرتے رہو مگر رات کو اس جگہ واپس آ جایا کرنا۔ جنگل میں بھی اس طرف مت جانا جدھر آدمیوں کی آمد و رفت زیادہ ہو کیونکہ مجھے تمہاری زندگی بڑی عزیز ہے۔"

سانپ اپنی عادت کے مطابق سر اٹھا کر بڑے غور سے میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تھی تو اس نے سر کو دو تین بار نیچے جھکا دیا تھا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میری ہدایات کو سمجھ گیا ہے۔ رات کو جب کمانڈو شیر باز چلا گیا تو میں مکان کی کوٹھڑی سے نکل کر پیچھے ٹیلے کے کھوہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے سانپ کی سرخ آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر سانپ کو پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر بٹھا لیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! ایک بڑا اہم مشن میرے سامنے ہے۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی کامیابی اور پاکستان کی سلامتی کا مشن ہے۔ اس مشن میں تمہیں میرے ساتھ بڑا اہم کردار ادا کرنا ہے۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا اور اس لیے بتاؤں گا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میری ہر بات سمجھ لیتے ہو لو اب تم دودھ پی لو۔"

میں اپنے ساتھ نیم گرم دودھ چھوٹی بوتل میں ڈال کر لے گیا تھا۔ سانپ کے پاس میں نے ایک چھوٹی پیالی رکھ دی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ہتھیلی سے

نیچے اتار دیا۔ پیالی میں دودھ ڈالا۔ سانپ بڑے مزے سے دودھ پینے لگا۔

"اچھا دوست! اب میں بتاتا ہوں کل رات کو پھر تم سے ملاقات کرنے آؤں گا۔"

میں ہر رات اپنے دوست سانپ سے ملنے آ جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا ہوتا تھا کہ وہ اپنے خفیہ ٹھکانے پر موجود بھی ہے کہ نہیں۔ ایک طرح سے یہ سانپ بھی ایک کمانڈو سانپ بن گیا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میری داڑھی نہ زیادہ بڑھی ہوئی تھی نہ چھوٹی تھی۔ داڑھی کی وضع قطع میں نے جان بوجھ کر ایسی بنائی تھی کہ خاص طور پر مسلمانوں ایسی داڑھی نہ لگے۔ جب چاہوں سادھو یا سنیاسی بن سکوں۔ کیونکہ آپ میری داستان شروع سے سن رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کمانڈو ایکشن کے ساتھ ساتھ میرا کام جاسوسی اور سراغ رسانی کا بھی تھا اور جاسوسی کرنے کے لیے مجھے کسی بھی وقت کوئی بھیس بدلنا پڑتا تھا اور چونکہ میں ایک ایسے ملک میں تھا جہاں ہندوؤں کی حکومت تھی تو مجھے زیادہ تر ہندو جوگیوں یا سنیاسیوں کا بھیس بدلنا پڑتا تھا۔ اس بھیس کے لیے کھلی داڑھی بڑی موزوں تھی۔

سری نگر شہر میں، میں کئی بار گھوم پھر چکا تھا اور سری نگر کے مضافات میں جو انڈین آرمی کا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں پر اسرار پراجیکٹ کے سربراہ کا آفس بھی تھا۔ میں نے کئی بار دور سے دیکھا تھا۔ اسی کمپلیکس میں ملٹری انٹیلی جنس کے دفاتر بھی تھے اور اسی ہیڈ کوارٹر کے پیچھے آفیسرز کے کوارٹرز یا کاٹج تھے جن میں سے ایک کاٹج میں خفیہ پراجیکٹ کا ڈائریکٹر میجر رجن سنگھ اپنی جوان سال فیشن ایبل مگر مذہبی بیوی ورشا سنگھ کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ ان کی شادی کو بقول صمد بٹ کے تین سال گزر گئے تھے مگر ان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔ دن کے وقت میں نے کشمیری مزدوروں والا حلیہ بنایا اور سوٹی کاندھے پر رکھ کر سری نگر شہر کی طرف چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آکر میں ایک بس میں سوار ہوگیا۔ موسم صاف تھا۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ میں نے کشمیری مزدوروں والا لمبا گرم چولا یعنی فرن پہن رکھا تھا۔ فرن کے اوپر پرانا گرم کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ چھڑی کاندھے پر رکھی ہوئی تھی اور سر پر اونی ٹوپی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں کشمیری میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات میرے حلئے کے خلاف جاتی تھی اور مجھے کسی بھی وقت کسی مصیبت میں پھنسا سکتی تھی۔ لیکن ایسے موقعوں پر میں گونگا بن جاتا تھا اور غوں غاں کرنی شروع کر دیتا تھا۔

میں ایک ایسے بس سٹاپ پر اتر گیا جہاں سے انڈین مقبوضہ آرمی کا ہیڈ کوارٹر زیادہ دور نہیں تھا۔ جو سڑک فوجی ہیڈ کوارٹر کو جاتی تھی میں اس سڑک سے ہٹ کر دوسری طرف چل پڑا۔ یہاں سری نگر شہر کی جدید کالونیاں تھیں میں

باہر ہی باہر سے ہوتا ہوا ہیڈ کوارٹر کے عقب میں جو نیم پہاڑی علاقہ تھا وہاں آ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو اٹھ کھڑا ہوا اور ایک چھوٹے پہاڑی ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد اس مقام پر آ کر چنار کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا جہاں نیچے پتلی سی سڑک فوجی افسروں کے کوارٹرز کے سامنے سے گزرتی تھی۔ میرے ٹارگٹ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے فوجی کواٹر کا نمبر F - 11 تھا مگر وہاں سے مجھے پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس نمبر کا کوارٹر کہاں ہے۔ ابھی مجھے نمبر معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ابھی میں صرف موقع کا طائرانہ جائزہ لینے آیا تھا کہ ان کواٹروں کا حدود اربعہ کیا ہے۔ ان کے پیچھے کس قسم کا علاقہ ہے۔ کواٹروں کے آگے پیچھے کے لان کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ جائزہ میرے مشن کے لیے بہت ضرورت تھا۔ جب میں ٹیلے کے اوپر سے فوجی کواٹروں کا اچھی طرح سے مشاہدہ کر چکا تو ڈھلان سے دوسری طرف اتر گیا۔ یہ کواٹر چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کی طرز کے بنے ہوئے تھے۔ دیواریں پتھروں کی تھیں۔ چھتیں لکڑی کی تھیں اور ڈھلوان تھیں ہر کواٹر کے آگے پیچھے چھوٹے چھوٹے صحن تھے جہاں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ وہاں کوئی فوجی پہرہ دیتا نظر نہیں رہا تھا۔ ان کواٹروں کے سامنے کچھ فاصلے پر فوجی ہیڈ کواٹر کی پختہ اونچی دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔

جب میں نے ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے فوجی کواٹر کے اردگرد کے ماحول کا اچھی طرح سے جائزہ ـ لیا تو وہاں سے واپس کمانڈو شیر باز خان کی خفیہ کمیں گاہ یعنی پہاڑی چٹانوں کے درمیان بنے ہوئے بوڑھے کشمیری کے لکڑی کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ شیر باز خان میرے وہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد پہنچا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں جائے واردات کا علاقہ اچھی طرح دیکھ آیا ہوں۔

وہ کہنے لگا۔

"مگر تمہاری لائن آف ایکشن کیا ہو گی؟"

میں نے کہا۔ "لائن آف ایکشن تو کافی لمبی ہے لیکن ابھی میں تم سے صرف ایک بات کا خواہش مند ہوں۔"

"وہ کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم سنو گے تو ضرور ہنسو گے لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ وہ سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر مجھے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا ہے۔"

کمانڈو شیر باز مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے اسے کہا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مجھے میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا سنگھ کے جسم کا کوئی اترا ہوا کپڑا مل جائے۔ مثلاً" اس کی بنیان' بلاؤز' انگیا وغیرہ۔"

کمانڈو شیر باز میرے اس مطالبے پر ہنسنے کی بجائے اور سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو؟ ڈوگرہ میجر کی بیوی کی بنیان یا بلاؤز یا انگیا لے کر تم کیا کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بلکہ تمہیں اپنے آپ معلوم ہوتا جائے گا۔ اس وقت تم صرف میرے سوال کا جواب دو کہ کیا ڈوگرہ میجر کی بیوی کا اترا ہوا بلاوز' بنیان یا انگیا مل سکتی ہے۔"

شیر باز سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔

"اپنے آدمیوں سے معلوم کرنا پڑے گا کہ فوجی آفیسرز کے میلے کپڑے کہاں دھوئے جاتے ہیں اور کون دھوبی دھونے کے لیے لے جاتا ہے۔"

"بس یہ مجھے آج ہی پتہ کر دو بلکہ کوشش کرو کہ شام تک ڈوگرہ میجر کی بیوی ورشا کے بدن کا کوئی بھی اترا ہوا کپڑا مجھے مل جائے۔"

شیر باز حیرت کے عالم میں اپنا سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے شیشے کی بوتل میں ہانڈی میں سے دودھ نکال کر ڈالا اور بوتل لے کر پیچھے چٹان کی کھوہ میں اپنے دوست سانپ کے پاس آ گیا۔ وہ کنڈلی مارے اپنا سر کنڈل میں چھپائے شاید سو رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ یا میری جسم کی بو پر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی پیالی میں دودھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"دوست! میں تمہیں کل یا پرسوں ایک بڑے اہم مگر بڑے نازک مشن پر بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ رہی ہوں۔ کیونکہ اس مشن کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم میری ایک ایک بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ جاؤ۔ یہ بڑا خطرناک مشن ہے۔ تمہیں بڑی عقلمندی سے کام لینا ہوگا۔ اگر تم سے ذرا بھی اونچ نیچ ہوگئی تو ہمارا اہم ترین مشن ناکام ہو جائے گا۔"

سانپ پیالی میں سے دودھ پی رہا تھا۔ مجھے اس طرح اندازہ ہوا کہ وہ میری باتوں کا مفہوم سمجھ رہا ہے۔ جب وہ دودھ پی چکا تو میں نے اسے کہا۔

"دوست! اگلی بار آؤں گا تو تمہیں وہ مشن بتا دوں گا جس کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ خدا حافظ۔"

میں واپس لکڑی کے جھونپڑے میں آ گیا اور درپیش مشن کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگا۔ کمانڈو شیر باز شام کو بھی نہ آیا۔ بوڑھا کشمیری آ گیا تھا۔ اس نے چاول اور سبزی وغیرہ بنا لی تھی۔ رات ہوگئی میں نے تھوڑا بہت کھانا وغیرہ کھا لیا اور فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر گرم دھسہ اور لوئی لے کر لیٹ گیا۔ اس روز بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی اوپر پہاڑیوں پر صبح سے برفباری ہو رہی تھی اور ان پہاڑیوں کی طرف سے جو یخ بستہ ہوا آ رہی تھی وہ بدن میں تیر کی طرح لگ رہی تھی۔ کمانڈو شیر باز کافی رات گئے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"اس دھوبن کا پتہ چل گیا ہے جو ڈوگرہ میجر کے گھر پر کپڑے دھونے کے لیے جاتی ہے۔ ایک عورت کی ہم نے ڈیوٹی لگا دی ہے۔ خدا نے چاہا تو کل کسی وقت میجر ارجن سنگھ کی بیوی درشا سنگھ کے بدن کا کوئی نہ کوئی اترا ہوا کپڑا یہاں پہنچ جائے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت ایک کشمیری مجاہد آ گیا۔ کمانڈو شیر باز اسے، میرے پاس لے آیا۔

شیر باز خان نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

کشمیری مجاہد نے لمبے پرانے گرم کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے، ہاتھ میں سرخ رنگ کی انگیا تھی۔ کہنے لگا۔

"اس وقت ارجن سنگھ کی بیوی کی یہی ایک انگیا دھوبن کے پاس تھی جسے وہ دھونے کے لیے لائی ہوئی تھی۔ یہ انگیا کل دھوبن کو ہر حالت میں واپس مل جانی چاہیے۔"

میں نے انگیا ہاتھ میں لے کر اسے اچھی طرح سے دیکھا۔ پھر اسے چمڑے کے تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیا اور کہا۔

"کل دوپہر کو آ کر یہ انگیا واپس لے جانا۔"

کشمیری مجاہد عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں عورت کی انگیا کو لے کر کیا کروں گا۔ جب کشمیری مجاہد چلا گیا تو میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"شیر باز خان! مجھے کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہے۔"

وہ بولا۔ "تم بتاؤ کیا کیا چیز چاہیے۔ میں وہ تمہیں لا دوں گا۔"

میں نے ایک کاغذ پر کچھ چیزیں لکھ کر اسے کاغذ دے دیا۔ وہ کاغذ پر لکھی ہوئی جیزیں پڑھتے ہوئے مسکراتا رہا۔

"یہ تم جوگی سادھو کا بھیس بدلنے والے ہو؟ چیزیں تو ساری وہی ہیں جو جوگی سادھوؤں کے کام آتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"بس تم مجھے یہ چیزیں لا کر دے دو۔ آگے جو اللہ کو منظور ہے وہ ہوگا اور یقین کرو کہ بہتر ہی ہوگا۔

کمانڈو شیر باز دوسری دن گیارہ بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ بوڑھا کشمیری بھی اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں جو باورچی خانہ بھی تھا سو گیا تھا۔ میں نے میجر ارجن سنگھ کی بیوی کی انگیا اور دودھ کی بوتل اٹھائی اور پیچھے ٹیلے کی کھوہ میں جہاں میرا دوست سانپ رہتا تھا آ گیا۔ سانپ کھوہ میں تھا۔ اسکی خالی پیالی ایک طرف پڑی تھی۔ میں ایک طرف بیٹھ کر سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سانپ مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"دوست! آ جاؤ۔ مجھے تم سے بڑی اہم باتیں کرنی ہیں۔"

میں اب سانپ سے اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے کسی انسان سے باتیں کی جاتی ہیں۔ سانپ نے بھی مجھے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ وہ میری ہر بات سمجھ رہا ہے۔ تجربے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی سانپ کھوہ کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دودھ کی بوتل ایک طرف رکھ دی تھی۔ میں نے پیالی میں دودھ نہیں ڈالا تھا۔ میں نے ورشا کی انگیا نکال کر سانپ کو دکھائی اور کہا۔

"دوست! یہ ایک ایسی عورت کی انگیا ہے جس کو تم نے ڈسنا ضرور ہے مگر اس کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کرنا ہے کہ جس سے وہ بے ہوش ہو جائے مرے نہیں۔ یہ بڑی نازک بات ہے۔ کیا تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ سنو! یہ ایک ایسی عورت کے بدن کی انگیا ہے جس کو تم نے ڈسنا ضرور ہے مگر اس کے جسم میں اتنا زہر داخل کرنا ہے کہ یہ عورت

زندہ رہے مگر بے ہوش ہو جائے مرے بالکل نہیں۔ میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

سانپ میری طرف سر اٹھائے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے دوسری دفعہ اپنی بات کو دہرایا تو اس نے اپنا سر دو بار اوپر نیچے کیا۔ میرے دوست سانپ کی عادت تھی کہ جب وہ میری بات کو سمجھ جاتا تھا تو دو یا تین بار اپنے سر کو اوپر نیچے کرتا تھا۔ سانپ نے ظاہر تو یہی کیا تھا کہ وہ میری بات سمجھ گیا ہے لیکن میں دل میں ڈر رہا تھا کہ خدا کرے ایسا ہی ہو کیونکہ اگر سانپ نے میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا کو اسی طرح ڈسا جس طرح وہ دوسرے دشمنوں کو ڈستا ہے تو وہ تو مر کر پتھر ہو جائے گی اور میرا مشن ادھورا رہ جائے گا۔ اس سلسلے میں میں نے ایک اہتمام ضرور کیا تھا۔ کہ جب اس نے سانپ کو دہشت گرد طوائفوں کے اترے ہوئے کپڑے سنگھائے تھے تو اس کے بعد سانپ کو دو دن تک بھوکا رکھا تھا۔ خاص طور پر اسے دودھ کا ایک قطرہ بھی پینے کو نہیں دیا تھا اور اسے ڈبے میں بند کر دیا تھا۔ میں یہ طریقہ کار ہرگز نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ میں نے ورشا کی انگیا سانپ کے آگے کر دی۔ سانپ انگیا میں گھس گیا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دو تین منٹ تک وہ انگیا میں ادھر سے ادھر رینگتا رہا۔ اس کے بعد انگیا سے باہر نکل کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے انگیا اٹھا کر جیب میں رکھ لی اور بوتل میں سے دودھ پیالی میں ڈال کر پیالی اس کے آگے رکھ دی۔ سانپ دودھ پینے لگا۔

اس میں ایک اہم نقطہ تھا وہ یہ کہ جب سانپ کو قادر خان دشمن کا اترا ہوا کپڑا سنگھا کر بند کر دیتا تھا اور اسے دو تین دن تک کچھ کھانے پینے کو نہیں دیتا تھا تو سانپ یہی سمجھتا تھا کہ جس آدمی کی بو اسے کپڑے میں سے آئی تھی اسی نے اسے بھوکا پیاسا بند کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا دشمن بن جاتا تھا اور جب سانپ کو تیسرے یا چوتھے روز رہا کر کے چھوڑا جاتا تھا تو وہ اپنے دشمن کی بو پر جا کر اسے ہلاک کر آتا تھا۔ اگرچہ میرے دوست سانپ کا معاملہ تھوڑا مختلف تھا۔ یہ سانپ خدا جانے کسی کرامت کے زیر اثر میری باتیں سمجھنے لگا تھا اور میرا دوست بن گیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دودھ پلانا مناسب سمجھا۔ پٹاری میں وہ پہلے ہی سے بند نہیں تھا۔ میں نے اسے آزاد رکھا ہوا تھا۔ دودھ میں نے اسی لیے اسے پلا دیا کہ جس عورت کی انگیا کی اس نے بو سونگھی ہے اسے اپنا دشمن نہ سمجھ بیٹھے۔ سانپ دودھ پیتا رہا اور میں اسی کے پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ دودھ پی چکا تو میں نے اس یقین کے ساتھ وہ میری بات اور میرے الفاظ سمجھ رہا ہے کہا۔

"دوست! تم نے جس عورت کی انگیا کو سونگھا ہے اور جس کے جسم کی بو سے تم اچھی طرح واقف ہو گئے ہو اس کا نام ورشا ہے۔ میں تمہیں آج آدھی رات کے بعد اپنے ساتھ لے جا کر اس عورت کے مکان کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تمہیں اس عورت کو جہاں بھی وہ سو رہی ہوگی جا کر ڈسنا ہے۔ مگر اس کو ہلاک نہیں کرنا۔ اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کرنا ہی کہ وہ زندہ رہے مگر

تمہارے زہر کے اثر سے بے ہوش ہو جائے۔ میری باتوں کو اپنے دماغ میں اچھی طرح سے بٹھا لینا۔ میں شام کو پھر آؤں گا تمہیں دودھ پلانے۔"

جاتے ہوئے میں نے سانپ کی دودھ والی خالی پیالی میں مزید دودھ ڈال دیا۔ سمجھانے کو تو میں نے سانپ کو ایک ایک بات پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا دی تھی مگر تذبذب میں ہی تھا کہ آخر یہ سانپ ہے کوئی انسان تو ہے نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے دماغ میں میری بات پڑی بھی ہو یا نہ پڑی ہو۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ انسان کو ڈسنا بھی تھا اور ایک خاص مقدار سے زیادہ انسان کے جسم میں زہر بھی داخل نہیں کرنا تھا۔ اس قسم کا نازک کام تو آدمی کمپیوٹر کے ذریعے ناپ تول کر کر سکتا ہے۔ سانپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ جتنا زہر اس نے ورشا کے جسم میں ڈسنے کے بعد داخل کر دیا ہے اس کو بے ہوش کرنے کے لیے صرف اتنا زہر ہی کافی ہے۔ ایک ملی گرام بھی زہر جسم میں زیادہ چلا گیا تو معاملہ چوپٹ ہو جائے گا اور میجر ارجن سنگھ کی بیوی ورشا مر چکی ہوگی اور ہمارے مشن پر پانی پھر جائے گا۔ بس اللہ توکل ہی کام ہو رہا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے میں ایک بار دوبارہ اپنے دوست سانپ کو دودھ پلا دیا تاکہ اس کے ذہن پر اس چیز کا معمولی سا اثر بھی باقی نہ رہے کہ جس عورت کے جسم کی بو اس نے سونگھی ہے وہ اس کی دشمن ہے۔ میں اپنی حکمت عملی میں کس حد تک کامیاب ہوا تھا؟ میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سارا کام اللہ توکل کر رہا تھا۔ رات کو اپنے خیالوں میں الجھا سو گیا۔ دن چڑھے اٹھا۔ بارہ بجے کے قریب کمانڈ شیر باز میرے ضروری کپڑے اور دوسرا سامان لے کر آ گیا۔ میں نے ان ساری چیزوں کا معائنہ کیا اور کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"کیا تم جوگی بن کر میجر ارجن سنگھ کے گھر جاؤ گے؟"

کمانڈو شیر باز کے اس سوال پر میں نے ہنس کر کہا۔

"ارادہ تو یہی ہے آگے اللہ مالک ہے۔"

"شیر باز نے تجسس کے ساتھ سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم جوگی بن کر اس ڈوگرہ فوجی افسر کے گھر جاؤ گے اور خفیہ پراجیکٹ کا راز معلوم کر لو گے۔"

میں نے کہا "جو کچھ ہو گا تمہارے سامنے ہی ہو گا۔ پورا یقین تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن مجھے اپنی طرف سے ایک کوشش تو کر کے دیکھ لینے دو۔ ہو سکتا ہے کامیاب ہو جائے۔"

"کب اس سراغ رسانی کی مہم پر نکلنے کا اراد ہے؟"

میں نے کہا۔

"کل نکلنے کا ارادہ ہے۔ تم یہاں نہ بھی ہوئے تو میں اپنے مشن پر نکل جاؤں گا۔"

"واپس کس وقت آؤ گے؟" کمانڈو شیر باز نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے خدا تمہیں کامیاب کرے۔ تمہارا کامیاب ہونا ہمارے مشن کے لیے بے حد ضروری ہے۔ تمہاری کامیابی کے بعد ہی ہم آگے کچھ کر سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"امید تو بہت ہے۔"

دوپہر کا کھانا ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ اس کے بعد کمانڈو شیر باز چلا گیا۔ میں فوراً اپنے دوست سانپ کے پاس آگیا۔ اسے ایک بار پھر دودھ پلایا۔ اس کے ذہن میں تمام ضروری باتیں دوبارہ ڈالیں اور لکڑی کے کمرے یا جھونپڑے میں آ کر لیٹ گیا۔

مجھے سانپ کو لے کر رات کے وقت میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر کی طرف جانا تھا لیکن اس سے پہلے اس کوارٹر کی نشان دہی ضروری تھی۔ چنانچہ تیسرے پہر میں نے دیہاتیوں والا لباس پہنا اور چھڑی کاندھے پر رکھ کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑا۔ اس بار میں کوارٹروں کے عقب میں جانے کی بجائے کوارٹروں کے سامنے جو چھوٹی سی کچی سڑک تھی اس پر آگیا۔ میں دوسری طرف کے ٹیلوں کی طرف سے سڑک پر آیا تھا۔ میں بالکل ان پڑھ دیہاتیوں کی طرح سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اس طرف آفیسرز کوارٹروں کے صدر دروازے تھے۔ چھوٹے چھوٹے صحن تھے۔ گارڈینیا کی جھاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ لکڑی کے ستونوں والے برآمدے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان برآمدوں میں کہیں کہیں پھولدار گملے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر کے باہر چھوٹا سا محرابی دروازہ تھا جس کے نیچے سے ہو کر ایک چھوٹا سا راستہ گملوں کی قطاروں کے درمیان سے برآمدے کے زینے تک جاتا تھا۔ کوارٹروں کی کرسی اونچی بنائی گئی تھی۔ تین چار لکڑی کا زینہ چڑھ کر آدمی برآمدے میں داخل ہوتا تھا۔ ہر دروازے کے باہر کوارٹر کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ مجھے کوارٹر نمبر F - 11 کی تلاش تھی۔ آخر اس نمبر کا کوارٹر مجھے مل گیا میں اس کوارٹر کو بڑے غور سے دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ دن ڈوب رہا تھا جب میں واپس پہنچا آج رات مجھے اپنے دوست سانپ کو اس کے عقل فہم والے مشن پر لے جانا تھا۔ دل میں ڈر رہا تھا کہ سانپ سے کوئی غلط نہ ہو جائے۔

رات کو کمانڈو شیر باز نہ آیا۔

یہ میرے حق میں مفید بات تھی۔ میں رازداری کے ساتھ یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دن کے وقت آفیسرز کوارٹروں کے آگے کوئی فوجی سنتری چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ رات کے وقت اس بات کا امکان تھا کہ کوئی سنتری پہرے پر موجود ہو۔ مجھے اس سے ہوشیار رہنا تھا۔ میں خفیہ کمیں گاہ سے

بھی سانپ کو اس کے مشن پر روانہ کر سکتا تھا مگر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ سانپ کو سری نگر شہر میں سے یا اس کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا اور شہر آخر شہر ہوتا ہے رات کے وقت بھی سڑکوں پر روشنی ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی گاڑی آتی جاتی رہتی ہے۔ خطرہ تھا کہ سانپ کہیں مارا نہ جائے۔ اس خدشے کے پیش میں نے فیصلہ کیا تھا کہ سانپ کو اپنے ساتھ لے جا کر میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر کے قریب کسی جگہ چھوڑ دوں اور وہیں چھپ کر سانپ کی واپسی کا بھی انتظار کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے سانپ سے کہا کہ عورت کو ڈس کر سیدھا میرے پاس واپس آ جائے تو وہ ضرور واپس آ جائے گا۔ رات کے دس بجے میں نے اپنے دوست سانپ کو دودھ پلایا اور اسے اس کے ٹھکانے سے اٹھا کر اپنے لکڑی کے جھونپڑے میں لے آیا۔ ابھی مجھے جوگی یا سادھو کا بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ میرے مشن کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے پر میرا دیہاتی لباس ہی کافی تھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے بھرا ہوا آٹو میٹک پستول اپنے پاس رکھ لیا تھا جس پر سائی لینسر کی فولادی نالی لگی ہوئی تھی۔ یہ نالی پستول کے فائر کے دھماکے کو دبا لیتی تھی۔

جب رات کے گیارہ بجے تو میں نے مزید ایک گھنٹہ انتظار کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ سانپ کو اس وقت کوارٹر نمبر ایف گیارہ کے باہر چھوڑوں جب گھر کے دونوں فرد یعنی میجر ارجن سنگھ اور اس کی نوجوان بیوی ورشا سو چکے ہوں۔ میں نے سانپ کو ایک بار پھر اس کے مشن کو کھول کر بتایا اور کہا۔

''دوست! اب ہم ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔''

سوا گیارہ بجے میں خفیہ کمین گاہ سے نکل کر نیچے اس سڑک پر آ گیا تھا جو سری نگر جانے والی پکی سڑک کے پہلو میں چیڑھ اور دیودار کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی سری نگر تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر عام طور پر کشمیری گوالے اور

چرواہے اپنا مال مویشی لے کر گزرا کرتے تھے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ سانپ کو میں نے اپنے گرم چولے کی جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ اوپر میں نے پرانے دھسے کی بکل ماری ہوئی تھی۔ پستول میرے فرن یا چولے کی اندر والی جیب میں تھا جسے میں ایمرجنسی کے وقت بڑی آسانی سے ہاتھ ڈال کر نکال سکتا تھا۔ میں اس سارے علاقے کا بھیدی تھا۔ میں ان راستوں سے بچ کر غیر آباد راستوں سے ہو کر جا رہا تھا۔ جہاں رات کے وقت گشت لگانے والی پولیس اور انڈین آرمی کی پٹرولنگ پارٹیوں کا خطرہ تھا۔ میں ایک لمبے راستے سے ہوتا ہوا اس چھوٹے ٹیلے پر آگیا جس کی دوسری جانب ڈھلان تھی اور نیچے فوجی افسروں کے کوارٹر تھے۔ میجر ارجن سنگھ کا کوارٹر بھی یہیں تھا۔ وہی کوارٹر میرا ٹارگٹ تھا۔ میں چیڑھ کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے دوست سانپ کو جیب سے نکال کر اپنی ہتھیلی پر بٹھالیا اور اس سے کہا۔

"میرے دوست! تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے الفاظ کو اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ الفاظ سمجھو چاہے نہ سمجھو مگر اتنا مجھے تجربہ ہوگیا ہے کہ میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں تم اس کا مفہوم سمجھ لیتے ہو۔ خواہ میں مشکل الفاظ بولوں خواہ میں آسان لفظوں میں بات کروں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

وہاں خاموشی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔ میں نے غور سے سانپ کو دیکھا۔ میں حسب معمول حیران رہ گیا۔ سانپ نے دوبار گردن کو اثبات میں ہلایا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے آج بھی جبکہ آپ کو اپنی داستان سنا رہا ہوں' یقین ہے کہ وہ سانپ اصل میں کوئی انسان تھا جس نے کسی وجہ سے سانپ کا روپ اختیار کر رکھا تھا۔ میں مطمئن ہوگیا۔

میں نے سانپ کو نیچے فوجی کوارٹروں کی کہیں کہیں جھلملاتی روشنیاں دکھائیں اور کہا۔

"میرے دوست! ان کوارٹروں میں وہ عورت بھی موجود ہے جس کی انگیا کی بو تم نے سونگھی تھی اور جس کے بدن کی بو تمہیں اس وقت بھی آ رہی ہوگی۔ تمہیں یہاں سے اس عورت کے کوارٹر میں جا کر اسے ڈسنا ہے۔ مگر اس طرح ڈسنا ہے کہ عورت تمہارے زہر سے پتھر بن کر ہلاک نہ ہو۔ صرف بے ہوش ہو جائے مگر زندہ رہے۔ یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہوگا اور اپنی جان بچا کر کرنا ہوگا۔ عورت کو ڈسنے کے بعد تم واپس اسی جگہ میرے پاس آ جاؤ گے۔ میں یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ میری بات سمجھ گئے ہو نا دوست؟"

سانپ کا سر میں نے رات کے اندھیرے میں اثبات میں ہلتے ہوئے دیکھا تو میری تسلی ہوگئی۔ میں نے آہستہ سے سانپ کو ہتھیلی سے اتار کر نیچے زمین پر رکھ دیا اور کہا۔

"دوست! وہی کرنا جو کچھ میں نے کہا ہے۔ وہ عورت ہماری دشمن نہیں' دوست ہے جاؤ۔ جلدی واپس آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

سانپ آہستہ سے رینگ کر ڈھلان اترنے لگا۔ وہ رات کی اندھیرے اور ڈھلان پر اگی ہوئی گھاس اور جھاڑیوں کی اوٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ لمحات میرے لیے بڑے جان کاہ لمحات تھے۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں سانپ سمجھ دار ہے۔ جو کچھ میں نے اسے کہا ہے وہ اس پر عمل کرے گا۔ وہ میجر کی بیوی ورشا کو ڈس کر ہلاک نہیں کرے گا۔ صرف اس کے بدن میں اتنا زہر داخل کرے گا کہ جس سے وہ بے ہوش ہو جائے۔ کبھی خیال آیا کہ سانپ آخر سانپ ہے کیا معلوم جاتے ہی ورشا کو ڈس کر پورا زہر اس کے بدن میں داخل کر دے۔ سانپ جب ایک بار اپنے دانت اس کے جسم میں چبھوتا ہے تو پھر کہاں اسے اتنا خیال رہتا ہے کہ زہر تھوڑا سا داخل کرنا ہے زیادہ داخل نہیں کرنا۔ عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ اپنے آپ کو دوست سانپ کی عقل و فہم

کے حوالے کر دیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ میرا دوست سانپ بالکل ویسا ہی کرے گا جیسا کہ میں چاہتا ہوں۔ اب مجھے نتیجے کا انتظار تھا اور میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

نیچے کوارٹروں کے عقبی برآمدوں میں کہیں کہیں روشنی تھی۔ سخت سردی میں وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک کوارٹر کے دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی کوارٹروں کے کمروں میں اندھیرا تھا۔ رات آدھی ہو گئی تھی۔ کہر آلود سرد رات میں سبھی لوگ جلدی سو گئے تھے۔ میری نظر ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر پر جمی ہوئی تھی۔ اس کوارٹر کے کمروں میں بھی اندھیرا تھا۔ صرف عقبی لان کے برآمدے والا بلب جل رہا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ ہو سکتا ہے جب سانپ میجر کی بیوی ورشا کو ڈسے تو اس کی آنکھ کھل جائے اور ڈر کر چیخ مارے۔ پھر سوچا کہ ان کے بیڈ روم میں بھی اندھیرا ہے۔ سانپ ورشا کے لحاف میں پاؤں کی طرف سے گھس کر اس کے ٹخنوں پر ڈسے گا اور ڈسنے کے فوراً بعد لحاف سے نکل کر باہر کو بھاگے گا۔ ورشا کی آنکھ کھل بھی گئی تو اندھیرے میں بالشت بھر کے سانپ کو دیکھ نہ سکے گی۔ ممکن ہے زہر کے اثر سے اس پر فوراً بے ہوشی طاری ہو جائے اور اس کے ساتھ سوئے ہوئے ڈوگرہ میجر کو خبر بھی نہ ہو کہ اسکی بیوی سانپ کے ڈسنے سے بے ہوش ہو چکی ہے۔

لیکن اس کے بالکل الٹ ہوا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر میں سے عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ساتھ ہی بیڈ روم میں روشنی ہو گئی۔ آدمی کی آواز بھی آنے لگی۔ نوکر بھی جاگ پڑے۔ وہاں شور مچ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ یقیناً سانپ کے ڈستے ہی ورشا کی آنکھ کھل گئی ہو گی یا وہ جاگ رہی ہو گی کہ سانپ نے اسے ڈس لیا اور اس

نے شور مچا دیا۔ اس کے بعد عورت کی آواز آنا بند ہو گئی۔ اردلی اور دوسرے نوکر ٹارچ لے کر کوارٹر کے عقبی باغیچے میں آ گئے۔ ان کی آوازیں آنے لگیں۔

"ادھر گیا ہو گا' ادھر دیکھو' یہیں کہیں ہو گا۔"

ظاہر ہے وہ سانپ کو تلاش کر رہے تھے۔ میں درختوں کے نیچے چھپ کر بیٹھا سانپ کا انتظار کر رہا تھا اور دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ سانپ ان لوگوں سے بچ کر نکل آئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار کی آواز آئی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ میرا دوست سانپ گردن اٹھائے میرے سامنے گھاس میں موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ٹیلے سے دوسری طرف اترنے لگا۔ یہ امر طے شدہ تھا کہ سانپ میجر کی بیوی ورشا سنگھ کو ڈس آیا تھا۔ اب یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ورشا سنگھ زندہ ہے یا سانپ کے زہر سے مر گئی ہے۔ اس کا علم مجھے دوسرے دن ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ سانپ بول کر مجھے نہیں بتا سکتا تھا کہ جس عورت کو میں نے ڈسا ہے وہ مری نہیں زندہ ہے مگر بے ہوش ہے۔ جس راستے سے میں گیا تھا اسی راستے سے ہو کر چھپتا چھپاتا میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ لکڑی کے جھونپڑے میں آتے ہی میں نے دھوتی اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور جیب سے سانپ کو نکال کر پوچھا۔

"دوست! تم نے ورشا سنگھ کو مارا تو نہیں؟ وہ بے ہوش ہی ہوئی ہے ناں؟"

سانپ نے اثبات میں سر ضرور ہلایا مگر مجھے پوری طرح سے یقین نہیں آیا تھا۔ اس کا علم دوسرے روز وہاں جا کر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے سانپ کو اپنی چارپائی کے پاس ہی نمدے پر بٹھا کر دودھ پلایا اور کہا۔

"دوست! اگر تم نے ہدایات کے مطابق عمل کیا ہے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب تم آرام کرو' باقی باتیں کل ہوں گی۔"

میں نے سانپ کو جھونپڑی کے پیچھے اس کے چٹانی کھوہ میں لا کر بٹھا دیا اس کے اردگرد خشک گھاس ڈالی اور اپنے کمرے میں یا جھونپڑے میں آ کر گرم بستر میں گھس گیا۔

باقی کی رات میں بے سدھ ہو کر صبح تک سویا رہا۔ دن کے دس بج رہے تھے جب میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ بوڑھے کشمیری نے میرے لیے ناشتہ تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کمانڈو شیر باز خان آ گیا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تم میجر ارجن سنگھ کے کوارٹروں کی طرف مت جانا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں وہاں کیا ہو گیا ہے؟"

کہنے لگا۔ "میجر ارجن سنگھ کی بیوی کو رات کوئی سانپ کاٹ گیا ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ میڈیکل کور کے سارے ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے ہیں مگر اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔"

"کیا میجر کی بیوی گھر پر ہی ہے؟"

کمانڈر شیر باز بولا۔

"نہیں اسے ملٹری ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ وہیں اس کا علاج ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہمارے حق میں بڑا اچھا ہوا ہے۔"

شیر باز میرا منہ تکنے لگا۔

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

میں نے کہا۔

"میں جوگی سادھوؤں کا لباس تم سے اسی لیے منگوایا تھا کہ میں جوگی بن کر ان کے گھر جاؤں گا اور اپنے ہندی مائتھیولوجی اور ویدوں اور سنسکرت کے تھوڑے علم کا ان پر رعب جما کر ان کو زیر اثر کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن سانپ کے کاٹنے سے میرا راستہ آسان ہو گیا ہے۔"

"تم کیا کرو گے؟" شیر باز نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔ میں وہ کام کروں گا جو فوجی ہسپتال اور انڈین میڈیکل کور کا کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔"

"کیا تمہارے پاس سانپ کا مہرہ ہے جس کے ذریعے تم میجر کی بیوی کا زہر نکال سکو گے؟"

میں نے کہا۔ "تم یہی سمجھ لو کہ میرے پاس سانپ کا مہرہ ہے۔"

شیر باز بولا۔ "ہو سکتا ہے تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر سانپ کے زہر کا اثر ختم کر دیں اور میجر کی بیوی کو ہوش آ جائے۔"

میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔"

اس سے زیادہ میں نے کچھ نہ کہا۔ اس سے زیادہ میں ابھی کمانڈو شیر باز کو کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کمانڈو شیر باز خان کمانڈو اٹیک کا آدمی تھا۔ دشمن کے مورچوں میں گھس کر شب خون مارنے والا باعمل مجاہد تھا۔ میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں خود چونکہ مطمئن تھا اس لیے شیر باز کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھا۔ یہ معلوم کر کے اپنے دوست سانپ کے بارے میں میرے اعتماد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کہ میجر کی بیوی مری نہیں تھی زندہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سانپ نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا تھا اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ جب تک میں میجر کی بیوی کا علاج نہیں کروں گا وہ بے ہوش ہی رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ خیال بھی تھوڑا تھوڑا پریشان کر رہا تھا کہ سانپ کے کاٹے کے ایسے ایسے انجکشن تیار ہو چکے ہیں کہ اگر بر وقت مریض ڈاکٹر کے پاس پہنچ جائے تو اسے انجکشن لگا کر مرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے جلدی جلدی اپنا بہروپ سادھوؤں جوگیوں والا بنانا شروع کر دیا۔

سارے کپڑے اور ماتھے پر لگانے والے تلک کا سرخ رنگ اور کرمنڈل وغیرہ کمانڈو شیر باز پہلے ہی وہاں لا چکا تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ میں پورا سادھو بن کر تیار ہوگیا۔ شیر باز مجھے بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے میری لائن آف ایکشن پر اتنا زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"تم تو بالکل سادھو بن گئے ہو۔ کیا ابھی ملٹری ہسپتال جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں میں ملٹری ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ میں میجر ارجن سنگھ کے گھر جاؤں گا۔"

"وہاں جا کر کیا کرو گے؟" شیر باز بولا۔ "میجر کی بیوی تو فوجی ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے ایک اشارے پر وہ لوگ میجر کی بیوی کو اٹھا کر گھر لے آئیں گے۔ میرے پاس ایک زبردست طلسمی منتر ہے۔"

کمانڈو شیر باز ہنسنے لگا۔ بولا۔

"میرا خیال ہے تم کھانا میرے ساتھ کھا لو ہو سکتا ہے میجر ارجن سنگھ کے ہاں تمہیں کھانے کو بھنا ہوا گوشت نہ ملے۔"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔ "میں جو کہوں گا وہاں آ جائے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

میں مکان سے نکل کر پیچھے جو گھاٹی کی ڈھلان تھی اس طرف جانے لگا تو کمانڈو شیر باز کی آواز آئی۔

"اس طرف سے کیوں جا رہے ہو۔ سیدھی سڑک پر سے جاؤ۔ تمہیں اس بھیس میں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

مگر مجھے تو پیچھے گھاس پھوس کی جھونپڑی کے قریب چٹان کی کھوہ میں سانپ بیٹھا تھا۔ اسے ساتھ لینا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میں احتیاط سے کام لینا چاہتا ہوں۔"

پیچھے آ کر میں نے اپنے دوست سانپ کو ہتھیلی پر رکھ لیا اور کہا۔
"میرے دوست! تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ تم نے وہی کیا جو میں نے تمہیں کہا تھا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جس عورت کو تم ڈس کر آئے ہو اس کے جسم کا زہر تم چوس بھی لو گے؟"
میں سانپ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سانپ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میجر ارجن سنگھ اور اس کی بیوی کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے میرے پاس ہی سب سے بڑا حربہ تھا۔ اس کے بعد سانپ سے ایک سوال پوچھنا بہت ضروری تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"دوست! میجر کی بیوی کے جسم سے تمہارے زہر چوسنے سے پہلے تو اس کو ہوش نہیں آ جائے گا؟"
سانپ نے دوسری مرتبہ سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ حیران اس لیے کہ یہ سانپ میری باتیں کس قدر صحیح طور پر سمجھ رہا تھا اور خوشی اس بات کی ہوئی کہ میجر کی بیوی ہوش میں نہیں آئے گی جب تک کہ میں اپنی کرامت نہیں دکھاتا۔ میں نے سانپ کو اٹھا لیا اور کہا۔
"میرے دوست! تم بھی میرے ساتھ کشمیر کے جہاد میں شریک ہو۔ آزادی کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کے مشن کے تم بھی ایک مجاہد ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اس عورت کے گھر لیے جا رہا ہوں جس کو رات تم نے ڈسا تھا۔ وہاں پہنچ کر جب میں تمہیں کہوں تو تمہیں اس کے جسم میں سے اپنا سارا زہر چوس لینا ہو گا۔"

میں نے سانپ کو اس گودڑی میں ڈال لیا جو میں نے اپنے کندھے کے ساتھ لٹکائی ہوئی تھی یہ گودڑی بھی گیروے رنگ کی سادھوؤں والی تھی۔ اسی رنگ کا میرا چولا بھی تھا۔ پاؤں میں جوتی تھی اور کندھوں پر میں نے کشمیری لوئی ڈال رکھی تھی۔ جوگی لوگ تو لوئی نہیں رکھتے مگر میں اصلی جوگی نہیں تھا۔ مجھے

سردی لگ رہی تھی۔ میں ٹیلے کی اترائی اتر کر سری نگر شہر کو جانے والی سڑک پر آ گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں لوہے کی سلاخ والا ترشول تھا۔ گلے میں رنگٹھوں کی مالائیں تھیں۔ کلائیوں میں کانچ کے کڑے تھے۔ ماتھے پر شیو دیوتا کے پجاریوں والے تلک کا نشان تھا۔ اس مشن پر مجھے اپنے ساتھ کمانڈو چاقو یا پستول لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا سب سے بڑا ہتھیار میرا دوست سانپ میرے پاس تھا۔ یہ مشن جاسوسی کا مشن تھا۔ کمانڈو آپریشن کا مشن نہیں تھا۔ کمانڈو آپریشن کا مشن اس کے بعد شروع ہونے والا تھا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ انڈین آرمی ہائی کمان سری نگر شہر سے دور جنگل کی پہاڑیوں کے زیر زمین کس قسم کا پر اسرار پراجیکٹ شروع کر رہی ہے۔

میں نے ایک بس پکڑی اور سری نگر کے ایک چوک میں جا کر اتر گیا۔ یہاں سے میں پیدل ہی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کے پیچھے میجر ارجن سنگھ کا آفیسر کوارٹر تھا۔ بھارت میں لوگ سپیروں کے پیچھے بھی لگ جاتے ہیں کیونکہ وہ بین بجا رہا ہوتا ہے لیکن جوگی سادھوؤں کی طرف اس وقت تک کوئی دھیان نہیں دیتا جب تک کہ ان کے ساتھ کسی کو کوئی کام نہ پڑے۔ ویسے بھی بھارت کے شہروں میں آوارہ گائے بیلوں کی طرح جوگی سادھو لوگ عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندو لوگ سادھوؤں کی عزت بھی کرتے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ان کی بددعاؤں سے ڈرتے بھی بہت ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی جوگی یا سادھو ناراض ہو کر بد دعا دے دے تو اس کی بد دعا لگ کر رہتی ہے۔ اسی طرح ہندو لوگ گائے اور بیل کا بھی بے حد احترام کرتے ہیں۔ گائے کو تو وہ ماں کے برابر سمجھتے ہیں اور بیل کا اس لیے احترام کرتے ہیں کہ نندی بیل دیوتا شیوا کا پسندیدہ اور محبوب بیل تھا جس کی وہ سواری کیا کرتا تھا۔ چنانچہ شیو دیوتا کے مندروں میں نندی بیل کے بڑے بڑے بت بھی بنے ہوتے ہیں۔

مجھے کسی سی آئی ڈی کا خطرہ نہیں تھا۔ جوگی سادھوؤں سے سی آئی ڈی والے ہندو اہل کار بھی گھبراتے ہیں کہ کیا خبر جس جوگی کا وہ مفرور ملزم یا جاسوس سمجھ کر پیچھا کر رہے ہیں وہ اصلی جوگی سادھو نکل آئے اور ان کو بد دعا دے دے۔

میں بڑے اطمینان کے ساتھ سادھوؤں کی طرح چلتا آفیسرز کوارٹرز والی چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ یہاں چھ کوارٹر چھوڑ کر میجر ارجن سنگھ کا کوارٹر تھا۔ کوارٹر کے باہر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے پاس ایک فوجی جوان موجود تھا۔ میں سادھوؤں کی طرح شان بے نیازی سے چلتا فوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جاتے ہی میں نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"کیا اس کوارٹر میں ایک سانپ نے کسی عورت کو کاٹا ہے؟"

فوجی جوان بھی ہندو تھا۔ سادھوؤں اور جوگیوں کا احترام کرنا اس کے خون میں شامل تھا۔ بولا۔

"ہاں مہاراج یہی وہ کوارٹر ہے۔"

میں نے ترشول والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے۔

اس میلا (عورت) کو ہمارے سامنے لاؤ ہم ابھی اس کو ٹھیک کرے گا۔"

فوجی جوان بولا۔ "مہاراج وہ میجر صاحب کی دھرم پتنی ہے۔ میجر صاحب اسے ہسپتال لے گئے ہیں۔"

میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔

"مورکھ وہ ہسپتال میں مر جائے گی۔ اس کا علاج ہمارے سوائے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ اسے ہمارے پاس لاؤ۔"

میری آواز سن کر اندر سے دو عورتیں باہر نکل آئیں۔ ان میں ایک ذرا جوان تھی اور دوسری بوڑھی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری آواز سن کر اندر سے کوئی آ جائے۔ بوڑھی عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! میری چھوٹی بہن کی بچی کو سانپ نے کاٹا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے مہاراج۔"

میں نے اپنا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

"مورکھ بہن! تمہاری بھانجی ہسپتال میں سورگباش ہو جائے گی۔ اگر اس کی زندگی چاہتی ہو تو اسے فوراً میرے پاس لاؤ۔ ہم اس کا علاج کر دے گا۔ ہسپتال والے کچھ نہیں کر سکتے۔"

دوسری عورت بھی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! اندر آ جائیں۔ میں ابھی ہسپتال میجر صاحب کو فون کرتی ہوں۔"

میں یہی چاہتا تھا میں اندر چلا گیا۔ انہوں نے مجھے ایک سجے سجائے خوبصورت کمرے میں صوفے پر بٹھا دیا۔ میں ادلکھ نرنجن اولکھ نرنجن کا ورد کرنے اور سر ہلانے لگا۔

"جلدی فون کرو میجر صاحب کو۔ سانپ کا زہر عورت کے جسم میں پھیل چکا ہے۔ دیر کر دی تو وہ پرلوک سدھار جائے گی۔"

جوان عورت ٹیلی فون کرنے لگی وہ گھبرائی ہوئی بھی تھی اور اضطراب کی حالت میں بھی تھی۔ پھر اس نے کسی سے کہا۔

"ہیلو! کون ارجن بھیا؟ بھیا۔"

اس نے میجر ارجن کو بتایا کہ ایک دھرم آتما سادھو آیا ہے جو ورشا کو ٹھیک کر دے گا۔ بھگوان کے لیے اسے لے کر یہاں آ جائیں۔ دوسری طرف سے فوجی ڈوگرے نے جھڑک دیا ہوگا۔ جس کے جواب میں جوان عورت اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ ورشا بہن ہسپتال میں مر جائے گی۔ سادھو مہاراج نے کہہ دیا ہے کہ اسے فوراً یہاں لے آؤ۔ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو جوان عورت سے کہا۔

"فون مجھے دو۔"

میں نے فون ہاتھ میں لیتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

"سن ارجن سنگھ سن! تیری پتنی کو شیو مہاراج کے اگنی سانپ نے کاٹا ہے۔ ہم تیری پتنی کو ٹھیک کرنے آئے ہیں۔ اسے لے کر فوراً ہمارے پاس آ جا۔ دیر کر دی تو تیری پتنی مرجائے گی۔"

اور میں نے فون بند کر دیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد باہر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہوئی۔ بوڑھی عورت میرے قدموں میں بیٹھی رہی جوان عورت باہر کو دوڑی۔ دو منٹ بعد دو فوجی جوان ایک سٹریچر اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ سٹریچر پر ایک جوان خوش شکل عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا مالک ایک فوجی افسر ساتھ تھا جو پریشان تھا۔ کاندھے پر میجر کا کراؤن لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں۔"

پھر جوان عورت سے کہا۔

"بڑی دیدی! ورشا کو بیڈ روم میں لٹا دو۔"

میں نے میجر سے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا' میرا مطلب ہے تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"ارجن سنگھ مہاراج!"

"ہوں۔ تو بڑا دھن وان ہے ارجن سنگھ کہ ہمیں تمہاری مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ سارا چمتکار تیری سورگباش ماتا جی کی آتما کی پرارتھنا کا ہے۔ سورگ میں تمہاری ماتا جی کی آتما پریشان ہوگئی۔ وہ شیو دیوتا کی بھگتی تھی۔ اس نے شو دیوتا کے آگے رو رو کر فریاد کی کہ میری بہو کو بچا لو۔ شیو دیوتا کو رحم آ گیا۔ شیو جی نے ہمیں حکم دیا کہ جاؤ اور جا کر ارجن سنگھ کی پتنی کا علاج کرو۔"

ہندو ویسے ہی اس معاملے میں ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اور اگر آگے کوئی سادھو زیادہ رعب والا ہو اور کڑک دار آواز میں حکم دینے کے انداز میں بولے تو ہندو چاہے وہ پردھان منتری ہی کیوں نہ ہو ایک بار اپنی جگہ سے ضرور ہل جاتا ہے۔ ارجن سنگھ پہلے ہی اپنی جگہ سے ہل چکا تھا کیونکہ بعد میں پتہ چلا کہ ہسپتال کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ آدھی رات سے لے کر دن کے بارہ بجے تک وہ ورشا کا علاج کرتے رہے تھے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ ورشا کا سانس بھی اکھڑنے لگا تھا۔ ڈوگرہ میجر تو میرے پاؤں پر گر پڑا۔

"مہاراج! آپ انتریامی ہیں۔ میری پتنی کو بچا لیں۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا ہے۔"

میں نے کڑک کر کہا۔

"ارجن سنگھ سن! سن ارجن سنگھ سن! سردم برھیم جگتے۔ جانتے ہو سنسکرت کے اس اشلوک کا مطلب کیا ہے؟ تم کیا سمجھو گے تم مورکھ ہو' نادان ہو' چلو اندر چلو ہم تمہاری پتنی کو دیکھیں گے۔"

ارجن سنگھ میجر مجھے بڑے ادب سے بیڈ روم میں لے آیا۔ بیڈ روم بھی بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر بھارتی اور ہالی ووڈ کی ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بڑا عیاش انڈین میجر تھا یہ۔ ورشا بیڈ پر بالکل سیدھی بے ہوش پڑی تھی۔ گردن تک قیمتی گرم کمبل پڑا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ میں نے یونہی ورشا کی نبض دیکھی اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ارجن سنگھ! تم نے بڑی دیر کر دی۔ بڑی دیر کر دی تم نے ارجن سنگھ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ارجن سنگھ اور بوڑھی عورت تو میرے پاؤں پر گر پڑے اور التجائیں کرنے لگے کہ میں کسی طرح ورشا کو بچا لوں۔ میں پوری اداکاری کر رہا تھا۔ میں نے

ترشول اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بس بس پیچھے ہٹ جاؤ۔"

دونوں جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے کہا۔

"مجھے دھیان لگانے دو۔ شیو جی مہاراج کے چرنوں میں جا کر ان کی آگیا لینی ہوگی۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اوم نشوا اوم نشوا کے الفاظ تین بار بولے اور چپ ہوگیا۔ میں نے زور سے سانس اوپر کھینچ لیا۔ میں بہت بے معلوم انداز میں سانس لے رہا تھا وہاں بیٹھے ہوئے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں نے دم روک لیا ہے جس طرح کہ سادھو لوگ عام طور پر حبس دم کیا کرتے ہیں۔ کوئی تین منٹ اسی حالت میں رہنے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر ارجن سنگھ کی طرف دیکھا۔

"سن ارجن سنگھ سنگ! شیو جی مہاراج نے تم پر اپنی خاص کرپا کی ہے۔ تیری پتنی اب ٹھیک ہو جائے گی۔"

میجر اور دونوں عورتیں تو خوشی سے نہال ہوگئیں۔ میجر کی بیوی ورشا کی حالت واقعی ایسی تھی کہ لگتا تھا مرنے والی ہے۔ میرے دوست سانپ کا زہر واقعی بہت مہلک تھا حالانکہ اس نے اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کیا تھا کہ جس سے وہ صرف بے ہوش ہو جائے۔ میں بھی اب زیادہ دیر نہیں لگانا چاہتا تھا کہ کہیں سارے کئے کرائے پر پانی نہ پھر جائے۔ میں اٹھ کر ورشا کے قریب کرسی بچھوا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ڈرامہ کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ میں نے ارجن سنگھ سے کہا۔

"ارجن سنگھ! جلدی سے ایک پیالی میں اپنے ہاتھ سے دودھ ڈال کر لے آ۔"

وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے سنسکرت کے جو چھ سات اشلوک مجھے

یاد تھے اونچی آواز میں پڑھنے شروع کر دیے پھر بوڑھی عورت سے کہا۔

"بالکہ! گھر میں لوبان ہو تو اسے سلگا دو۔"

بوڑھی عورت بھی دوڑ کر بیڈ روم سے باہر نکل گئی۔ اتنے میں ارجن سنگھ دودھ سے بھری ہوئی پیالی لے کر آ گیا۔ میں نے کہا۔

"وہ چھوٹی میز یہاں لے آؤ۔"

ارجن سنگھ بالکل نوکروں کی طرح کام کر رہا تھا۔ خدا کسی پر مصیبت نہ ڈالے مصیبت میں آدمی اپنی حیثیت وغیرہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس نے چھوٹی میز لا کر ورشا کے پلنگ کے پاس میرے سامنے لا کر رکھ دی۔ میں نے دودھ کی پیالی میز پر رکھ دی۔ بوڑھی عورت تھالی میں لوبان سلگا کر لے آئی۔ میں نے عورت سے کہا۔

"لوبان پلنگ کے سرہانے کی طرف نیچے رکھ دو۔"

عورت نے ایسا ہی کیا۔ لوبان کی بو سے میرا بھی ناک میں دم آنے لگا۔ میں نے خوامخواہ لوبان منگوا لیا تھا۔ مگر اب ڈرامہ پورا کرنا بڑا ضروری تھا۔

"دروازہ بند کر دو۔ کوئی اندر نہ آئے' نہ اندر سے کوئی باہر جائے۔"

ارجن سنگھ خود اٹھ کر دروازے تک گیا۔ باہر منہ نکال کر اس نے کسی سے کہا۔

"کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ وہ پلنگ کی پائینتی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف جوان عورت بیٹھی تھی۔ بوڑھی عورت میری کرسی کے پاس قالین پر ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔

اس وقت اگر آپ مجھے دیکھتے تو آپ بھی یہی سمجھتے کہ میں کوئی بڑا پہنچا ہوا جوگی سادھو ہوں۔ اب مجھے ڈرامے کا کلائمکس سین کرنا تھا۔ میں نے کھدر کے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور اندر سے بالشت بھر کے سانپ کو باہر نکال کر ہتھیلی پر

بٹھا لیا۔

سانپ کو دیکھ کر قالین پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت ڈر کر پرے ہٹ گئی۔ میجر ارجن سنگھ اور جوان عورت پلنگ کی پائینتی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ سب لوگ میری ہتھیلی پر بیٹھے ہوئے سانپ کو ڈری ڈری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے سانپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میرے وشوامتر! اگنی سانپ کے ساتھی! شیو جی مہاراج کے حکم پر اس عورت کے جسم میں اگنی سانپ نے جتنا زہر داخل کیا ہے وہ سارے کا سارا چوس لے۔"

دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک تو جانتا ہے کہ میں یہ سارا ڈرامہ کسی روپے پیسے کے لالچ میں نہیں کر رہا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں دشمن کے پاکستان اور آزادی کشمیر کی جدوجہد کے خلاف جو ناپاک عزائم ہیں انہیں تباہ و برباد کرنے کے لیے کر رہا ہوں تو ہر شے پر قادر ہے۔ سانپ کو حکم دے دے کہ وہ عورت کے جسم سے سانپ کا زہر چوس لے۔ ذرا غور کریں۔ اگر اس وقت سانپ میری بات نہ مانتا اور میری ہتھیلی پر ہی بیٹھا رہتا تو مجھے کس قدر ذلت اور ندامت اٹھانی پڑتی۔ لیکن اللہ پاک نے میری عزت رکھ لی۔ سانپ میرا حکم سنتے ہی میری ہتھیلی پر سے اچھل کر بے ہوش عورت کے جسم پر کمبل کے اوپر گرا اور اس کے پاؤں کی طرف رینگنے لگا۔ عورت یعنی میجر ارجن سنگھ کی پتنی ورشا کے پاؤں کمبل کے اندر تھے۔ سانپ پاؤں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا بلکہ مجھے عقل آ گئی۔ سانپ میری طرف دیکھ رہا تھا' بلکہ کہہ رہا تھا۔

"احمق انسان! عورت کے پاؤں کمبل سے باہر نکلوا۔ میں نے کمبل کے اندر گھس کر عورت کے ٹخنوں پر منہ رکھ کر زہر چوسا تو کسی کو نظر نہیں آئے گا۔

سب یہی کہیں گے کہ یہ ہسپتال کے ڈاکٹروں کی دوائیوں کا اثر تھا کہ ورشا کو ہوش آگیا ہے۔ سانپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"عورت کے دونوں پاؤں کمبل سے باہر نکال لو۔ جلدی کرو۔ شیو مہاراج کا سانپ تمہارا نوکر نہیں ہے کہ انتظار کرے۔"

ارجن سنگھ نے لپک کر اپنی پتنی کے دونوں پاؤں کمبل سے باہر نکال دیے اور سانپ سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"میرے بچے! میرے وشوامتر! اس ابھاگن میجر کی بیوی کے پاؤں کے بدن سے اگنی سانپ کا سارا زہر چوس لے اور اس کو پھر سے سوبھاگن بنا دے۔"

دل میں کہنے لگا۔ یا اللہ میری عزت رکھ لینا۔ سانپ نے میجر کی بیوی کے پاؤں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے۔ کمال ہے یہ سانپ بھی مجھے دیکھ کر ڈرامہ کرنے لگا تھا۔ حالانکہ اسے پتہ تھا کہ اس نے ورشا کو کس ٹخنے کے پاس ڈسا ہے۔ یا ہو سکتا ہے وہ کوئی اپنی رسم روایت پوری کر رہا ہو۔ ورشا کے دونوں پاؤں آدھی پنڈلیوں تک ننگے تھے۔ پاؤں بھی زرد ہو رہے تھے۔ آخر سانپ نے ورشا کے بائیں ٹخنے پر ایک جگہ اپنا منہ لگا دیا۔ بیڈ روم میں عجیب دہشت ناک قسم کی خاموشی چھا گئی۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سب دم بخود تھے۔ ارجن سنگھ اور جوان عورت آنکھیں پھاڑے سانپ کو ورشا کے جسم کا زہر چوستے دیکھ رہے تھے۔ بوڑھی عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف و دہشت کے اثرات تھے۔ کوئی ایک منٹ تک سانپ زہر چوستا رہا۔ پھر اس نے اپنے منہ سے سیاہ رقیق مادہ جو یقیناً" زہر ہی ہوگا کمبل پر اگل دیا۔ دونوں عورتوں کے حلق سے خوف زدہ آوازیں نکل گئیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ڈانٹ دیا کہ خبردار کوئی آواز نہ نکالو۔

سانپ زہر چوستا اور پھر کمبل پر ہی زہر اگل دیتا۔ اس طرح اس نے کوئی دس بارہ مرتبہ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ کمبل کے اوپر سے رینگتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ میں نے اسے آہستہ سے ہتھیلی پر اٹھا کر تپائی پر بٹھا دیا اور کہا۔

"میرے بچے! میرے متر! لے اب دودھ پی لے۔"

سانپ کے ہونٹ زہر کی وجہ سے سیاہ ہو رہے تھے۔ اس نے پیالی میں سے دودھ پینا شروع کر دیا۔ اتنے میں بے ہوش ورشا نے ایک گہرا سانس لیا۔ ارجن سنگھ اور دونوں عورتوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ ورشا کے سرہانے کی طرف لپکے۔ میں نے انہیں ڈانٹ دیا۔

"خبردار! ابھی اس کے قریب مت جانا۔"

تینوں جہاں تک آئے تھے وہیں رک گئے۔

"پہلے میرے بچے کو' میرے وشوامتر کو دودھ پی لینے دو۔"

ارجن سنگھ اور بوڑھی عورت نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"جے شیو شنکر کی جے۔"

وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر کھڑے تھے اور ورشا کو ہوش میں آتے دیکھ رہے تھے۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ ورشا نے اپنے سر کو دو تین بار دائیں بائیں پھیرا۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ دونوں عورتیں اور ارجن سنگھ میرے حکم کے منتظر تھے کہ میں انہیں حکم دوں تو وہ ورشا کی طرف بڑھ کر اس کو مبارک باد دیں۔ اسے گلے لگائیں۔ ورشا نے مجھے بھی دیکھا۔

سانپ کو بھی دیکھا جو دودھ پی رہا تھا۔ اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خشک سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہی سانپ تھا' یہی سانپ تھا۔"

وہ سچی تھی۔ اس نے جب سانپ نے اسے ڈسا تھا تو اس کو ٹیبل لیمپ جلا کر پلنگ سے اتر کر قالین پر رینگتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے فوراً" کہا۔

"مورکھ عورت! یہ وہ سانپ نہیں ہے۔ وہ اگنی سانپ تھا۔ یہ سانپ شیتل سانپ ہے۔ یہ شیو دیوتا نے تجھے بچانے کے لیے بھیجا ہے۔ اس سانپ نے تجھے ہلاک کرنے کے لیے ڈسا تھا۔ اس سانپ نے تیرے بدن کا سارا زہر چوس کر تجھے پر سے زندہ کر دیا ہے۔"

ورشا آنکھیں کھول کر دودھ پیتے سانپ کو دیکھنے لگی۔

"ہاں مہاراج! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ دوسرا سانپ تھا۔ آہ! مجھے نیند آ رہی ہے۔"

میں نے اس کے خاوند ارجن سنگھ اور دونوں عورتوں سے کہا۔

"اس کو پیار کرو۔ دلاسا دو دیوتاؤں نے اس کو دوبارہ زندگی دی ہے۔"

ارجن سنگھ اور دونوں عورتیں، ورشا کے پاس جا کر اس کو حوصلہ دلاسا اور تسلیاں دینے لگے۔ ورشا کمزور آواز میں کہہ رہی تھی مجھے نیند آ رہی ہے، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

بوڑھی عورت نے کہا۔

"پتر! اسے سونے نہ دینا۔ زہر پھر اثر کرنے لگے گا۔"

میں نے اسے جھڑک دیا۔

"مائی تم کون ہوتی ہو کوئی حکم دینے والی۔"

پھر میں نے ارجن سنگھ سے کہا۔

"ارجن سنگھ! اپنی پتنی کو بے شک سو جانے دو۔ جب یہ سو کر اٹھے گی تو تر و تازہ ہوگی۔ ہاں اس کے لیے تین چوزوں کی یخنی تیار کر کے رکھ لے۔ جب سے اٹھے گی تو ہم اسے خود پلائیں گے۔ اس کے جسم کی کھوئی ہوئی طاقت واپس آ جائے گی۔"

میجر ارجن سنگھ فوراً بیڈ روم کے دروازے کی طرف دوڑ پڑا تاکہ چوزوں کی یخنی تیار کروانے کا آرڈر دے دے۔ یہ لوگ میرے مرید ہو گئے تھے۔ میں

نے چھٹکارا یعنی کرامت ہی ایسی دکھائی تھی کہ انہیں مرید ہونا ہی تھا۔ آپ سب نے سانپ کو قبرستانوں میدان جنگل میں ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے یا سپیروں کے آگے بین پر جھومتے دیکھا ہو گا۔ آپ میں سے شاید یہ ایک آدھنے سانپ کو کسی انسان کو ڈستے بھی دیکھ لیا ہو مگر آپ میں سے کسی نے آج تک سانپ کو انسان کے جسم سے زہر چوستے نہیں دیکھا ہو گا۔ یہ اللہ کے حکم سے اور میرے دوست سانپ کی مہربانی سے ہو گیا تھا اور وہ لوگ میرے مطیع ہو گئے تھے۔

میں ورشا کے پلنگ سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ سانپ کو میں نے اپنے جھولے میں واپس رکھ لیا تھا۔ ارجن سنگھ، بوڑھی اور جوان دونوں عورتیں میرے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ انہیں جو اشلوک مجھے یاد تھے سنا سنا کر ان کا مطلب بتا رہا تھا۔ میرے آگے میز پر ملازمہ چینی کی قیمتی تھالیوں میں طرح طرح کی مٹھائیاں اور پھل رکھ گئی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے خوب سیر ہو کر پھل اور مٹھائیاں کھا لی تھیں اور اب کشمیری قہوہ پی رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کی نیند کے بعد ورشا نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بالکہ! اب طبیعت کیسی ہے؟"

ورشا اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میجر اور دونوں عورتیں بھی پلنگ پر اس کے پاس جا بیٹھیں۔ کوئی اس کے بال ٹھیک کرنے لگی۔ کوئی اس کی بلائیں لے رہی تھی۔ ارجن سنگھ اپنی بیوی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے دبا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"ورشا ڈارلنگ! گورو جی کی کرپا سے تم بالکل ٹھیک ہو گئی ہو۔ سانپ نے تیرے بدن کا سارا زہر چوس لیا ہے۔"

اس دوران ورشا کا وہ کمبل جس پر سانپ نے زہر چوس کر اگلا تھا تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ورشا نے سہم کر پوچھا۔

"کیا سانپ نے میرے جسم کا زہر نکالا تھا؟"
میں نے کہا۔ "ورشا! گھبرانے کی ضرورت نہیں سانپ نے شیو مہاراج کے حکم پر تمہارے جسم میں سے سانپ کا زہر چوس کر پھینک دیا ہے۔ اب تو پوری تندرست ہوگئی ہے۔ تیرے شریر میں ایک رتی بھر بھی سانپ کا زہر نہیں رہا۔"
میں نے ارجن سنگھ سے کہا۔
"ارجن سنگھ!"
"جی مہاراج!" وہ بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"ورشا بی بی کو یخنی پلاؤ۔"
میجر ارجن نے دروازے میں کھڑی ملازمہ کو اشارہ کیا۔ ملازمہ ٹرالی لے کر اندر آگئی۔ ٹرالی پر یخنی کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ میجر ارجن سنگھ خود اپنی بیوی ورشا کو یخنی پلانے لگا۔ وہ یخنی نہ بھی پلاتا تو اس کی بیوی کو کچھ نہیں ہونا تھا۔ مگر اداکاری کے ساتھ یہ میناکاری بڑی ضروری تھی۔ میں اس کے فوراً بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ترشول والا ہاتھ بلند کر کے کہا۔
اب ہم جاتے ہیں۔ جس کام کے لیے بھگوان شیوا نے ہمیں یہاں بھیجا تھا وہ پورا ہوگیا۔"
میجر ارجن سنگھ اور دونوں عورتیں میرے جانے کا سن کر جیسے پریشان ہوگئیں۔
"مہاراج! ابھی کچھ دیر رک جائیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"
یہ التجا میجر ارجن سنگھ کی تھی جس کے ساتھ مجھے بڑے کام پڑنے والے تھے۔ مگر میں اس کی عقیدت کو مزید مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔
"نہیں بچہ! ہمیں اس سے زیادہ دیر یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم چلتے ہیں۔"
ارجن سنگھ ہاتھ باندھ کر سامنے آگیا۔ بڑی عاجزی سے بولا۔

"مہاراج! کل رات کا کھانا ہمارے بھون پر کھائیے۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"

میں خود اپنے مشن کو تیزی سے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ جب اس نے کل کی دعوت دے دی تو میں نے کہا۔

"اچھا بالکے! اگر تیری اچھیا ہے تو پھر ہم کل صرف تمہاری خاطر آ جائیں گے۔"

دونوں عورتیں اور میجر ارجن سنگھ خوشی سے نہال ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی میجر کی خوبصورت بیوی ورشا بھی ہاتھ باندھے میری طرف بڑی عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے ترشول والا ہاتھ اٹھا کر اسے آشیرباد دی اور کہا۔

"ورشا! فکر مت کر۔ اب تجھ پر سانپ تو کیا کسی چیونٹی کے کاٹے کا بھی اثر نہ ہوگا۔ ہم کل آئیں گے۔ جے گنگا میا! جے ماتا شیراں والی کی جے ہو۔"

اور میں بیڈ روم سے نکل گیا۔ میجر ارجن سنگھ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ کو جہاں جانا ہے میری گاڑی آپ کو وہاں چھوڑ آئے گی۔"

میں نے کہا۔ "ارجن سنگھ ہم جوگی سنیاسی ہیں ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ہم بھی نہیں جانتے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ جے شیو شمبھے!"

اور میں پیدل ہی واپس اس ٹیلے کی طرف چل پڑا جس ٹیلے سے اتر کر میں ان کوارٹروں میں آیا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ پیچھے میجر ارجن سنگھ کب تک مجھے دیکھتا رہا؟ بہرحال جب میں ٹیلے کے پاس پہنچ کر مڑ گیا تو میں نے پلٹ کر دیکھا فوجی کوارٹر وہاں سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر اوپر چیڑھ کے درختوں میں آ گیا تو جھولے میں سے سانپ کو نکال کر کہا۔

"میرے دوست! تم نے دوستی کا حق ہی نہیں نبھایا بلکہ اسلام کے دشمنوں

کے خلاف جہاد میں اپنے طور پر حصہ ڈالا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

بوڑھے کشمیری والی خفیہ کمین گاہ میں آ کر میں نے سانپ کو ایک بار پھر دودھ پلایا اور اسے اس کی کھوہ میں سوکھی گھاس پر بٹھا دیا۔ سانپ نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر سر نیچے کر کے جلیبی کی طرح ہو گیا اور سر اپنی کنڈلی میں چھپا لیا۔

لکڑی کے جھونپڑے میں بوڑھا کشمیری میرے لیے کھانا لے کر بیٹھا تھا۔

"شیر باز خان ابھی تک نہیں آیا۔ میں نے تم دونوں کا کھانا تیار کر رکھا ہے۔"

میں میجر ارجن سنگھ کے ہاں سے مٹھائیاں اور پھل کھا آیا تھا۔ میں نے بوڑھے کشمیری مجاہد سے کہا۔

"بابا! آج مجھے بھوک نہیں ہے۔ شیر باز کے لیے کھانا رکھ چھوڑو۔ ہو سکتا ہے وہ رات کو کسی وقت آ جائے۔"

کشمیری مجاہد نے کوئی جواب نہ دیا اور کھانے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چل دیا۔ میں رات دیر تک لحاف اوڑھے جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا طریقہ کار عمل میں لانا ہوگا۔ ڈوگرہ میجر پر اور اس کی ساری فیملی پر میں نے اپنا زبردست اثر ڈال دیا تھا۔ اب مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کسی دوسرے انسان پر اثر ڈالنا آسان ہوتا ہے لیکن اس اثر کو اپنے خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا بڑا نازک کام ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑی عقل اور بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے نہ صرف دوسرے پر ڈالا ہوا اثر ختم ہو جاتا ہے بلکہ خود آدمی کی اپنی حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ ایک طرح سے میرا مرید بن چکا تھا۔ یہ انڈین فوجی افسر اس پر اسرار ملٹری پراجیکٹ کا انچارج تھا جو سری نگر شہر کی نواحی پہاڑیوں کے جنگل میں زیر زمین کام کر رہا تھا۔ یا کام کرنے والا تھا۔ مجھے اس خفیہ پراجیکٹ کی پوری سراغ

رسائی کرنی تھی اور پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ ملٹری پراجیکٹ کس نوعیت کا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ پراجیکٹ پاکستان اور آزاد کشمیر کی سلامتی اور مقبوضہ کشمیر کے حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا تو اسے تباہ و برباد کرنا تھا۔

یہ ایک طرح سے ڈبل مشن تھا۔ پہلا مشن جاسوسی اور سراغ رسانی کا تھا اور دوسرا مشن پراجیکٹ کو تباہ کرنے کا تھا۔ دونوں معاملوں میں انتہائی احتیاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔ دوسرے دن کمانڈو شیر باز خان آیا تو وہ خوش بھی تھا اور حیران بھی تھا۔ کہنے لگا۔

"حیدر علی! کل میجر ارجن سنگھ کے گھر جو سادھو آیا تھا اور جس نے اسکی بیوی کو موت کے منہ سے نکال لیا تھا اگر وہ تم ہی تھے تو تم نے جو کرامت وہاں دکھائی ہے اس کا چرچا پورے شہر میں جگہ جگہ ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک سپیرے کے پاس ایسا سانپ ہے جس نے میجر کی بیوی کے جسم کا سارا زہر چوس لیا کیا واقعی یہ تم ہی تھے یا وہاں تمہاری بجائے کوئی دوسرا سادھو سپیرا آ گیا تھا؟"

پہلے تو میں نے سوچا کہ شیر باز کو اصل حالات نہ بتاؤں پھر خیال آیا کہ یہ باتیں میں کب تک اس سے چھپا کر رکھوں گا۔ وہ میرا ساتھی ہے اس کے ساتھ مل کر ہی ہمیں اس پر اسرار پراجیکٹ کا پتہ چلانا اور اسے برباد کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے کمانڈر شیر باز کو سارے واقعات بتا دیے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ یہ کارنامہ اسی سانپ کا ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتا تھا اور کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑ دو۔ شیر باز چہرے پر حیرت کے اثرات لیے میری باتیں سنتا رہا۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بولا۔

"حیدر علی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ ایک سانپ یہ کام کر سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ "بہرحال یہ کام اسی سانپ نے کیا ہے یہ کرشمہ اسی سانپ

نے دکھایا ہے میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ میرا دوست سانپ ہے۔ اب تمہیں بھی اسے اپنا دوست سمجھنا ہوگا۔ یہ ہمارا ساتھی ہے اور ہماری کمانڈو پارٹی کا رکن بن چکا ہے۔"

کمانڈو شیر باز پر پھر بھی سانپ کے بارے میں کوئی زیادہ اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہے۔ میں نے کہا۔

"پہلے چائے پیتے ہیں پھر غور کریں گے۔"

کشمیری مجاہد ہمارے لیے کشمیری چائے سے بھرا ہوا سماوار لے کر آ گیا۔ ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک حکمت عملی سوچ لی تھی۔ ایک لائن آف ایکشن تیار کر لی تھی۔ میں نے کمانڈو شیر باز کو اس سے آگاہ کیا تو وہ خاموشی سے غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ ٹھیک رہے گا۔"

"کیوں نہیں؟ سو فیصد ٹھیک رہے گا۔"

میں نے جب لائن آف ایکشن یعنی اپنی سراغ رسانی کی پوری تفصیلات اسے بتائیں تو وہ بہت حد تک قائل ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ سراغ رسانی کا یہ مشن آج رات سے شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ میں اسی رات میجر ارجن سنگھ کے گھر جانے والا تھا۔ کمانڈو شیر باز نے صرف اتنا کہا۔

"دوست! بے حد محتاط رہنا۔ تم جانی دشمنوں کے پاس جا رہے ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تمہارے پیچھے خفیہ پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس والے بھی لگ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں اس سے غافل نہیں ہوں۔ تمہیں بہرحال انڈین آرمی کے خفیہ ملٹری پراجیکٹ کا سراغ لگانا ہے خواہ اس کے لیے ہمیں کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

کمانڈو شیر باز شام تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے میجر ارجن سنگھ کے ہاں جانے کی تیاری شروع کر

دی۔ منہ ہاتھ دھو کر ماتھے پر شیو جی کا نیا تلک لگایا۔ سادھوؤں والا لباس پہنا۔ سانپ کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تیار ہو کر سانپ کے پاس اس کی کھوہ میں گیا اور اسے کہا۔

"دوست! میں اپنے ٹارگٹ پر جا رہا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے طویل سفر طے کرنا ہے۔ لیکن ہم اس مشن میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ خدا حافظ!"

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب بھی میں سانپ کے سامنے جاتا تھا وہ ایک بار ادب سے سر ضرور جھکا دیتا تھا۔ مجھے قادر خان کے الفاظ یاد آ جاتے کہ حیدر علی! یہ سانپ اب تمہارا دوست ہی نہیں بلکہ تمہارا مطیع اور مرید بن چکا ہے۔ یہ تمہیں اپنے مہا ناگ دیوتا کا اوتار سمجھنے لگا ہے۔ یہ تمہارا ہر حکم مانے گا۔ تمہارا غلام بھی ہوگا اور تمہارا دوست بھی ہو گا۔ اس وقت بھی جب میں سانپ کو خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو سانپ نے سر جھکا کر مجھے الوداع کہا۔ میں پہاڑی راستوں سے ہوتا ہوا میجر ارجن سنگھ کے کوارٹروں میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میجر ارجن سنگھ کا اردلی کوارٹر کے باہر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ کوارٹر کے برآمدے کے باہر بلب روشن تھا۔ جیسے ہی اردلی نے مجھے دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج پدھاریئے' میجر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اتنے میں ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ بھی تیز تیز فوجی قدم اٹھاتا باہر آگیا۔ آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! چیونٹی کے گھر نارائن آ گئے ہیں۔ پدھاریئے مہاراج' آیئے۔"

وہ مجھے بڑے احترام کے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں چھ سات دوسری عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ خوب بنی سنوری تھیں۔ کمرے میں طرح طرح کے پرفیومز کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے یہ

دوسرے فوجی افسروں کی بیویاں یا بہنیں ہی تھیں۔ میجر کی بیوی ورشا بھی نہا دھو کر نئی ساڑھی پہنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر سب عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سب نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ مجھے ان عورتوں سے کوئی کام نہیں تھا بلکہ یہ عورتیں میرے مشن میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی تھیں۔ میں صوفے پر نہ بیٹھا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے ترشول اٹھا کر کہا۔

"ارجن سنگھ! کمرے میں سے تمام عورتوں کو نکال دو۔ نہیں تو ہم ابھی واپس جاتے ہیں۔"

میجر گھبرا گیا مگر میرا حکم تھا۔ عورتیں بھی پریشان ہوگئیں۔ میجر نے اسی وقت سب عورتوں کو دوسرے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔ میں نے کہا۔

"صرف اپنی پتنی ورشا کو یہاں رہنے دو۔ ہم اس کا علاج کرنے آئے ہیں۔ یہاں کوئی چمتکار دکھانے نہیں آئے۔"

جب کمرے سے تمام عورتیں چلی گئیں اور صرف میجر ارجن سنگھ اور اس کی پتنی ورشا ہی وہاں رہ گئے تو میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد میجر اور اس کی پتنی بھی صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے ترشول ایک طرف رکھ دیا اور جھولے میں سے ایک پرانی نوٹ بک نکال کر اسے کھولا۔ یہ پرانی نوٹ بک کمانڈو شیر باز نے مجھے کہیں سے لا کر دی تھی۔ اس پر میں نے اپنے ہاتھ سے ہندی میں کہیں کہیں اوم اور ہندی کے اشلوک اور تلسی داس کے دوہے لکھ رکھے تھے۔ ایک کاغذ پر میں نے ہندی میں جے شیوا لکھا تھا۔ میں نے وہ کاغذ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ کوئی ایک منٹ تک میں کاغذ کو غور سے تکتا رہا۔ کسی کسی وقت بیچ میں سر کو نفی میں ہلاتا رہا۔ یہ سب اداکاری تھی اور میرے مشن کے لیے انتہائی ضروری تھی۔ پھر میں نے کاپی بند کر دی اور میجر کی پتنی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ورشا رانی! اب تم کیسی ہو؟"

ورشا بڑی عقیدت کے ساتھ بولی۔
"مہاراج آپ کی کرپا سے بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا سی کمزوری باقی ہے۔"
میں نے کہا۔ "بھگوان نے چاہا تو کل تک وہ بھی جاتی رہے گی۔"
میں نے گہرا سانس بھرا اور صوفے سے ٹیک لگا دی۔ ورشا کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ پھر میجر کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ارجن سنگھ! تم بڑے خوش قسمت ہو' بڑے بھاگوان ہو۔ تمہاری بیوی کو جس اگنی سانپ نے کاٹا تھا اس کا کاٹا آج تک زندہ نہیں بچا۔ اگر تم ایک دن اور ورشا رانی کو ہسپتال میں رکھتے تو اس کے سارے بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ اگنی سانپ جس کسی کو کاٹتا ہے وہ پہلے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ زہر جسم میں اندر ہی اندر کام کرتا رہتا ہے۔ ایک دن گزر جانے کے بعد آدمی کے خون کے ذرے جلنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دم جسم میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔"
ورشا کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ میجر بولا۔
"مہاراج! ہسپتال کے ایک ڈاکٹر نے مجھے پہلے روز ہی بتا دیا تھا کہ آپ کی پتنی کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ زہر اس کے دماغ تک پہنچ چکا ہے۔"
میں نے کہا۔ "اس نے تمہیں ٹھیک کہا تھا ارجن سنگھ۔ ہم عین وقت پر آ گئے اس لیے کہ ہمیں دیوتاؤں کی طرف سے آرڈر ملا تھا۔"
نوکرانی پھل فروٹ رکھ کر چلی گئی۔ ورشا مجھے سیب چھیل چھیل کر دینے لگی۔ یہ عورت واقعی بڑی خوش شکل تھی۔ مگر مجھے اس کی خوبصورتی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اب میں نے وہ بات شروع کی جو میری حکمت عملی اور لائن آف ایکشن کا پہلا قدم تھا۔ میں نے کہا۔
"میجر ارجن سنگھ! اس وقت تمہاری پتنی بھی یہاں موجود ہے۔ میں اس کے سامنے تمہیں ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر ورشا رانی اور میجر کے چہرے لٹک سے گئے۔

"مہاراج! کیا کوئی غلطی ہو گئی ہے ہم سے؟"

میں نے میجر سے کہا۔

"ارے نہیں بالکے! ایسی بات نہیں ہے۔ غلطی تمہاری پتنی سے ہوئی ہے۔"

دونوں حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ورشا سے کہا۔

"ورشا رانی! جس رات تمہیں اگنی سانپ نے کاٹا تھا اس کی شام کو تم جب اپنے مکان کے باغیچے میں ٹہل رہی تھیں تو تمہارا پاؤں گھاس پر اس جگہ پڑ گیا تھا جس کے نیچے اگنی سانپ کے دو چھوٹے چھوٹے بچے سوئے ہوئے تھے۔ تمہارے پاؤں کے نیچے آ کر اگنی سانپ کا ایک بچہ مر گیا تھا۔ بس اگنی سانپ نے اپنے اس بچے کا انتقام لینے کے لیے رات کو تمہیں آ کر ڈس لیا۔"

میجر ارجن کہنے لگا۔

"مہاراج! اگنی سانپ نے میری پتنی سے اپنے مرے ہوئے بچے کا بدلہ لے لیا۔ اب کس بات کا خطرہ ہے مہاراج؟"

میں نے فوراً کہا۔

"مگر تمہاری پتنی زندہ ہے۔ وہ مری نہیں۔ میں نے اسے بچا لیا ہے۔ اگنی سانپ اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ پھر تمہاری پتنی پر حملہ کرے گا۔"

میرا اتنا کہنا تھا کہ ورشا رونے لگی۔ میجر کا بھی رنگ اڑ گیا۔ اس نے میرے گھٹنے پکڑ لیے اور عاجزی سے بولا۔

"مہاراج! میری پتنی کو بچا لیجئے۔ ورشا کو اگنی سانپ سے بچا لیجئے۔ میں جنم جنم آپ کا داس رہوں گا۔"

یہ میرا پہلا تیر تھا جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا تھا۔ میں نے کہا۔

"مورکھ! ہماری وجہ سے ہی ابھی تک اگنی سانپ کو تمہاری پتنی کے پاس

آنے کی ہمت نہیں ہوئی' اس لیے کہ ورشا رانی کے بدن کو ہم نے اپنے ہاتھ سے چھوا تھا۔ ہمارے ہاتھ کی خوشبو ورشا رانی کے جسم میں سمو گئی ہے۔ اس خوشبو کی وجہ سے اگنی سانپ اس کے قریب نہیں آتا ورنہ وہ تو تمہارے کوارٹر کے اردگرد رات کو کئی چکر لگا چکا ہے۔"

ورشا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج اگر یہ بات ہے تو پھر اگنی سانپ میرے پاس کبھی نہیں آ سکے گا۔"

میں نے کہا۔

"مورکھ لڑکی! میرے ہاتھ کی خوشبو زیادہ دیر تک تمہارے جسم میں قائم نہیں رہ سکتی زیادہ سے زیادہ ایک دن اور رہے گی۔ اس کے بعد جیسے ہی میرے ہاتھ کی خوشبو غائب ہوئی اگنی سانپ آ کر تمہیں ڈس لے گا اور پھر شاید تمہیں میں بھی نہیں بچا سکوں گا۔ کیونکہ اگنی سانپ تمہیں ڈس کر بے ہوش نہیں کرے گا۔ وہ اپنے زہر سے اسی وقت تمہارے جسم میں آگ بھڑکا دے گا۔"

ورشا کا چہرہ خوف کے مارے زرد پڑ گیا۔ میجر ارجن سنگھ بھی پریشان ہوگیا۔ کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔ میں بھی جان بوجھ کر خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ان دنوں میں سے کوئی پوچھے کہ اس کا کوئی علاج یا توڑ بھی ہے۔ آخر میجر ارجن نے پوچھ لیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ اس کا کچھ اپائے کریں۔ آپ دیوتا سمان ہیں۔ آپ چاہیں تو میری پتنی کو اس پتا سے مکتی مل سکتی ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ پھر آنکھیں کھول کر کہا۔

"اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اگنی سانپ کو ڈھونڈھ کر ہلاک کر دیا جائے۔"

میجر جلدی سے بولا۔ "مہاراج مجھے بتائیں اگنی سانپ کہاں مل سکتا ہے۔ میں اپنی فوج کی پوری یونٹ بھیج کر اس کے ٹکڑے اڑا دوں گا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم نادان ہو' ارجن سنگھ! تمہاری یونٹ دشمن کی فوج کا تو مقابلہ کر سکتی ہے مگر اگنی سانپ کو نہیں مار سکتی۔ اگنی سانپ تمہاری پوری یونٹ کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے۔ تمہارے فوجیوں کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اگنی سانپ کہاں پر ہے اور سانپ اندھیرے میں چھپ کر تمہارے ایک ایک فوجی کو آگ لگاتا جائے گا۔"

میجر خاموش آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"مہاراج! اگنی سانپ کا کوئی ٹھکانہ تو ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "وہ اگنی دیوی کا سانپ ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں لگا سکتی اس کو ہر جگہ زمین جگہ دے دیتی ہے۔ وہ نظر آتے آتے غائب ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر....."

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہوگیا۔ ورشا اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ میجر ارجن نے سہمی ہوئی مگر پر امید آواز میں پوچھا۔

"فرمایئے مہاراج اگر کیا؟"

میں نے کہا۔ "اگر میں اگنی دیوی کا یگیہ کروں یعنی چلہ کاٹوں تو میں سانپ کا سراغ لگا کر اسے ہلاک کر سکتاہوں پھر وہ غائب ہو کر بھی مجھے نظر آ جائے گا۔"

میجر ارجن نے میرے پاؤں چھو کر کہا۔

"مہاراج! ہم پر کرپا کریں۔ آپ یہاں میرے گھر میں یگیہ کریں آپ جو کہیں گے میں لا دوں گا جتنا گھی کہیں گے' جتنا دودھ' چینی کہیں گے لا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "اس یگیہ کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ہمیں صرف ایک خالی کمرہ چاہیے اور ایک موم بتی چاہیے۔ باقی ہمیں اگنی دیوی کے اشلوک پانچ ہزار بار دل میں پڑھنے پڑیں گے۔"

میجر ارجن سنگھ میری منت سماجت کرنے لگ گیا۔ ورشا رانی نے بھی مجھ سے چلہ کرنے کی التجا کی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آج کی رات اسی جگہ بیٹھ کر چلہ کروں گا۔"

اس کے بعد ہم نے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بڑا پر تکلف کھانا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے ورشا سے کہا۔

"بالکہ! تمہارے بدن میں سے میرے ہاتھ کی خوشبو مدھم نہ ہو جائے اور اگنی سانپ تم پر حملہ نہ کر دے اس لیے میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر دوں تاکہ تین دن تک تم اگنی سانپ سے محفوظ ہو جاؤ۔"

ورشا جلدی اٹھ کر میرے قدموں میں آکر بیٹھ گئی۔ میں نے یونہی اس کی پیٹھ پر گردن سے لے کر نیچے تک دو تین بار ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"جا بالکہ! تین دن تک اگنی سانپ تیرے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔"

ورشا میرے چرن چھو کر واپس صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے رات کے ٹھیک بارہ بجے جعلی چلہ شروع کیا۔ موم بتی روشن کر کے سامنے پلیٹ میں رکھ لی اور اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ بیٹھنے کے بعد میں تھک گیا۔ پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ اس پہلو پر بھی بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے موم بتی بجھا دی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ وہاں مجھے دیکھنے والا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ اگر کسی نے مجھے چلہ کرتے ہوئے نگاہ ڈال کر دیکھ لیا تو میرا چلہ ضائع ہو جائے گا اور پھر ورشا کو اگنی سانپ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ خوب مرغن کھانا کھایا ہوا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ میں وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند آ گئی۔ اچانک آنکھ کھلی تو باہر سے پرندوں کے بولنے کی آواز آ

رہی تھی۔ کھڑکی بند تھی۔ روشندان پر صبح کی روشنی ہو رہی تھی۔ دن چڑھ گیا تھا۔

میں زور زور سے اشلوک پڑھنے لگا۔ میری آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ کوئی دس منٹ تک میں اشلوک پڑھتا رہا۔ پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی۔

"ارجن سنگھ اندر آ جا تیرا کام ہوگیا ہے۔"

میں صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میری آواز پر فوراً ارجن سنگھ اندر آگیا وہ فل وردی میں تھا۔ میرے چرن چھو کر ادب سے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"میں نے یگیہ کر لیا ہے۔ رات کے پچھلے سے آکاش کا ایک گندھرو میرے پاس آگیا۔ اس کے آنے سے روشنی ہوگئی۔ میں نے موم بتی بجھا دی۔ گندھرو نے کہا مہاراج کا یگیہ آکاش کے دیوتاؤں نے سویکار کر لیا ہے۔ آپ میں وہ شکتی آ گئی ہے کہ جس کی مدد سے آپ اگنی سانپ کو زمین کی تہوں میں بھی دیکھ لیں گے اور اسے مار سکیں گے۔"

ورشا رانی بھی اندر آ گئی تھی۔ میجر نے اپنی پتنی کو خوش خبری سنائی کہ مہاراج نے یعنی میں نے کامیابی سے چلہ کر لیا ہے اور اب میں اس کے دشمن کو زمین کی گہرائیوں میں بھی دیکھ سکوں گا۔ میں نے کہا۔

"ارجن سنگھ! تمہیں ایک دن چھٹی کر کے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ مجھے اگنی سانپ کی ہلکی ہلکی بو آنے لگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سانپ سری نگر شہر کے آس پاس کی پہاڑیوں میں کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ پستول کی بجائے چاقو ضرور رکھنا ہوگا۔ ویسے تو میں اسے اپنے ترشول سے ہلاک کر ڈالوں گا۔ پھر بھی تم چاقو ضرور رکھ لینا۔"

میجر ارجن سنگھ بولا۔

"مہاراج! آپ جیسا کہیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔ آپ کس وقت اگنی سانپ کی تلاش میں نکلنا چاہتے ہیں؟"

مجھے معلوم تھا کہ اتوار چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ اتوار کے دن زیر زمین فوجی پراجیکٹ پر کام بند ہوگا۔ وہاں اگر کچھ لوگ کام کر رہے ہوں گے تو وہ بھی اتوار کی چھٹی پر ہوں گے اور میجر ارجن سنگھ آسانی سے مجھے وہاں لے جا سکے گا۔ کیونکہ میرا ٹارگٹ وہی تھا۔ میں نے کہا۔

"یگیہ کے حساب سے شبھ گھڑی کا لگن اتوار کو بیٹھتا ہے۔ ہم اتوار کے دن یہاں سے نکلیں گے۔"

میجر ارجن سنگھ بولا۔

"مہاراج اتوار کون سی دور ہے۔ پرسوں اتوار ہے۔ بیچ میں ایک ہی دن باقی ہے۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ اتوار کے دن تک ہمارے ہاں ہی رہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں بابا۔ ہم اتنے دن کسی کے ہاں نہیں ٹھہرتے۔ ہم آج چلے جائیں گے اتوار کی صبح کو آ جائیں گے۔ تم سپیشل جیپ تیار رکھنا۔ ہمیں سری نگر کے آس پاس کی ساری پہاڑیاں اور جنگل دیکھنے ہوں گے۔ اگنی سانپ وہیں چھپا ہوا ہے۔"

میجر ارجن سنگھ نے کہا۔

"جو حکم مہاراج!"

اس کے بعد میں وہاں سے اپنی کیمپ گاہ میں واپس آگیا۔ کمانڈو شیر باز خان بے چینی سے میری راہ دیکھ رہا تھا۔

"خیریت تو تھی؟ تم ساری رات غائب رہے میں تو پریشان ہوگیا تھا۔"

میں نے اسے ساری روداد سنا ڈالی اور کہا۔

"انڈین ملٹری کے خفیہ پراجیکٹ کی سراغ رسانی کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔

اتوار کو میں اپنے اصلی مشن پر روانہ ہوں گا اور کیسی دلچسپ بات ہے کہ دشمن اپنا خفیہ پراجیکٹ خود مجھے دکھائے گا۔"

شیر باز بولا۔ "ہوشیار رہنا۔ کہیں میجر کو شک نہ پڑ جائے۔"

میں نے کہا۔ "میجر ارجن سنگھ میرا اس قدر مطیع اور مرید ہو چکا ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں محتاط رہوں گا۔ تم بے فکر رہو۔"

اتوار کے دن میں صبح ۹ بجے ہی ناشتے کے بعد جوگی کے بھیس میں ترشول ہاتھ میں لیے میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر میں پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی پتنی ورشا کے جسم پر ہاتھ پھیرے آج تیسرا دن ہے۔ چنانچہ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی ورشا رانی کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور کہا۔

"بالکہ! تو شاید بھول گئی ہو مگر ہمیں یاد ہے کہ تمہارے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرے آج تیسرا دن ہے۔ کل تمہارے جسم میں سے ہمارے ہاتھ کی خوشبو مدھم پڑنے لگے گی اور سانپ حملہ کر سکتا ہے۔ آؤ ہم تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر کر تمہیں اور تین دنوں کے لیے سانپ کے زہر سے محفوظ کر دیں۔"

ورشا رانی بڑے ادب سے سر جھکا کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے یونہی اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"جاؤ اب اگلی سانپ تم سے ایک ایک فرلانگ تک دور رہے گا۔"

پھر میجر سے پوچھا۔

"ارجن سنگھ! کیا تم تیار ہو؟"

وہ بولا۔ "بالکل تیار ہوں مہاراج!"

"تو پھر چلو۔ وقت کم ہے بہت سارا علاقہ دیکھنا ہے۔"

ہم باہر کھڑی جیپ میں آ کر بیٹھ گئے۔ میجر ارجن سنگھ فوجی وردی میں نہیں تھا۔ اس نے عام گرم پتلون سویٹر اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے جیپ میں

بیٹھنے کے بعد کہا۔

"ابھی جیپ سٹارٹ نہ کرنا۔ مجھے دیکھ لینے دو کہ سانپ کی بو کس طرف سے آ رہی ہے۔"

میں نے سانس اوپر کو کھینچا۔ پھر آہستہ آہستہ سانس باہر نکالتے ہوئے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"سانپ کی بو ان پہاڑیوں کی طرف سے آ رہی ہے ان پہاڑیوں کی طرف چلو۔"

میجر نے اسی طرف جیپ کو ڈال دیا۔ آسمان اس روز ابر آلود تھا۔ سری نگر شہر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہم بڑی جلدی شہر سے باہر آ گئے۔ وہ علاقہ میری نگاہ میں تھا جس طرف مجھے میجر ارجن سنگھ کو لے کر جانا تھا۔ میں نے اک جگہ جیپ کو ٹھہرایا۔ نیچے اتر کر چاروں طرف منہ کر کے یونہی سونگھنے کی اداکاری کی اور ان ٹیلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا جن کے درمیان وہ چھوٹی سی سنگلاخ اور ویران وادی تھی ' جہاں فوجی سرگرمیاں دیکھنے میں آئی تھیں اور جس کے نیچے ہماری اطلاع کے مطابق کسی خطرناک پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"ارجن سنگھ! سانپ کی بو ان ٹیلوں کے درمیان سے آ رہی ہے۔ تمہاری پتنی کی جان کا دشمن سانپ ان ٹیلوں کے درمیان کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ ڈوگرہ میجر اس وادی کی طرف جاتے ہوئے تھوڑا ہچکچایا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! ہو سکتا ہے سانپ ان ٹیلوں کی دوسری طرف ہو۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ٹیلوں کے درمیان والی وادی میں نہیں لے جانا چاہتا جو فوجی اعتبار سے حساس علاقہ تھا۔ میں نے کہا۔

"ارجن سنگھ! اگر یہ بات ہے تو پھر ہم جاتے ہیں۔ تم خود جا کر سانپ کو تلاش کر لو۔"

اور میں وہیں سے پیدل واپس چل پڑا۔ میجر ارجن سنگھ دوڑ کر میرے آگے آگیا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! میرا مطلب یہ نہیں تھا بھگوان کے لیے آپ نہ جائیں۔ آپ جس طرف کہتے ہیں میں ادھر ہی آپ کو لیے چلتا ہوں۔ پلیز! آ جائیں۔"

میں نے اسے رعب سے کہا۔

"خبردار! آئندہ میرے کام میں دخل نہ دینا نہیں تو اپنی پتنی کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اگنی سانپ تمہاری پتنی کے بعد تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"شما کر دیں مہاراج۔"

میں جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ ٹیلوں کے درمیان حساس علاقے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں کوئی سڑک وغیرہ نہیں تھی۔ جیپ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر اچھلتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہم ٹیلوں کے درمیان والی وادی میں داخل ہوگئے۔ اچانک ایک طرف سے دو مسلح فوجی درختوں میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جیپ کو رکنے کے لئے کہا۔ میجر سویلین لباس میں تھا۔ اس نے جیپ روک لی۔ دونوں فوجی لمبے لمبے قدم اٹھاتے قریب آئے۔ میجر ارجن سنگھ نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ فوجیوں نے باری باری شناختی کارڈ دیکھا۔ پھر میجر کی طرف دیکھا۔ یہ ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی لگتے تھے۔ ایک فوجی نے کہا۔

"سر! ٹھیک ہے اوکے۔"

وہ آگے سے ہٹ گئے۔ جیپ آگے کو چل پڑی۔ میں نے میجر سے پوچھا۔

"یہاں یہ فوجی کس لیے پہرہ دے رہے ہیں؟ یہاں تو کوئی لڑائی نہیں ہو رہی۔"

میجر بولا۔ "مہاراج! اس علاقے میں کبھی کبھی فوجی مشقیں ہوتی ہیں۔ اس

لیے سویلین کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں سویلین کپڑوں میں تھا۔ اس لیے انہوں نے مجھے روک لیا۔ فوجی وردی میں ہوتا تو کوئی نہ روکتا۔"

میں بڑی گہری نظروں سے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بظاہر وہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک جگہ دیودار کے درختوں کے نیچے مجھے تین فوجی ٹرک کھڑے نظر آئے جن کے اوپر پتوں والا جال ڈال کر انہیں کیمو فلاج کیا گیا تھا۔ ان ٹرکوں سے تھوڑی دور ٹیلے کی نشیبی دیوار میں مجھے دو فوجی سروں پر کریٹ اٹھائے جاتے نظر آئے۔ دیوار کے پاس آ کر انہوں نے کریٹ زمین پر رکھ دیے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ زیر زمین ملٹری پراجیکٹ کا راستہ یہیں سے نیچے جاتا ہو گا۔"

میں نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور ٹیلے کی اسی دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ارجن سنگھ! تو خوش قسمت ہے۔ اگنی سانپ کے ہم بڑے قریب آ گئے ہیں۔ اس کی بو تیز ہونے لگی ہے۔"

میجر ارجن سنگھ نے ٹیلے کی دیوار کی جانب دیکھا اور ایک بار پھر اس کے چہرے پر ایسے اثرات ابھر آئے جیسے وہ اس طرف نہیں جانا چاہتا۔ لیکن یہ اس کی بیوی کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ جیپ سے اتر کر بولا۔

"مہاراج! آگے ہم پیدل ہی جائیں تو اچھا ہے۔ وہاں جیپ گاڑیوں کا راستہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے مگر جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اگنی سانپ ہوشیار ہو جائے اور یہاں سے فرار ہو جائے۔ اگر وہ نکل گیا تو پھر قابو میں نہیں آئے گا۔"

میں بھی جیپ سے اتر پڑا۔ ہم جھاڑیوں' خشک گھاس اور پتھروں کے درمیان پیدل چلنے لگے۔ میجر ارجن سنگھ آگے آگے چل رہا تھا۔ ٹیلے کی دیوار

کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ کہنے لگا۔ "مہاراج! اب دیکھیں سانپ کی بو کس طرف سے آ رہی ہے۔"

وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں ٹیلے کی دیوار کے قریب نہ جاؤں اور میں اسی طرف جانا چاہتا تھا۔ یہی میرا مشن تھا میں نے سانس لے کر کہا۔

"سانپ کی بو سامنے والے ٹیلے کی طرف سے آ رہی ہے ادھر چلو۔"

ڈوگرہ میجر مجبور ہوگیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مجھے ساتھ لے کر ٹیلے کی طرف بڑھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس طرف سیکورٹی کا انتظام انتہائی سخت ہے اور کوئی بڑے سے بڑا فوجی افسر بھی پیشگی اجازت کے بغیر اس طرف نہیں آ سکتا تھا۔ جھاڑیوں کے پاس چنار کا درخت تھا۔ ڈوگرہ میجر وہاں رک گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! یہاں ہماری ایک پلٹن فوجی مشقوں کے لیے ٹھہری ہوئی ہے۔ آپ یہاں تھوڑی دیر کے لیے رکیں میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

وہ ٹیلے کی دیوار کی طرف چلا گیا۔ جہاں مجھے انڈین آرمی کے دو تین جوان کسی کام میں لگے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کی وردیاں ہرے رنگ کی تھیں اور سروں پر ہلمٹ تھے جن میں درختوں کی ٹہنیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دور سے دیکھا کہ میجر ارجن سنگھ ان کے پاس کھڑا باتیں کر رہا ہے۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک وہ ان سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اس سارے پراجیکٹ کا انچارج تھا۔ شاید وہ میرے ساتھ علاقے میں دورہ کرنے کو ملٹری پولیس اور انٹیلی جینس سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ واپس آ کر کہنے لگا۔

"آ جائیں مہاراج! آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہاں کشمیری کمانڈوز نے ہماری آرمی کو سخت مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ روز دھماکے ہوتے ہیں ہمارے فوجی روز مارے جا رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔"

میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم کشمیر کے سارے مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے بموں سے کیوں

نہیں اڑا دیتے؟"

ڈوگرہ میجر ذرا سا مسکرا کر بولا۔

"مہاراج! کشمیر میں مسلمانوں کی بڑی بھاری اکثریت آباد ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

ہم سامنے ٹیلے کی دیوار میں ایک محراب دار دروازہ بنا ہوا تھا۔ دروازہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس کے کواڑ بھی نہیں تھے۔ دروازے کا آدھا حصہ درختوں کی شاخوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہاں پہلے جو تین فوجی جوان نظر آئے تھے اب ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ڈوگرہ میجر رک گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! سانپ اس طرف نہیں آ سکتا۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے دروازے کے پاس نہیں لے جانا چاہتا تھا اور مجھے دروازے کے پاس ہی نہیں بلکہ اس کے اندر جانا تھا۔ میں نے سانس کھینچ کر چھوڑا اور جلالی آواز میں کہا۔

"ارجن سنگھ! اگنی سانپ کی بو اس دروازے کے اندر سے آ رہی ہے۔ جلدی سے اندر چلو۔ نہیں تو سانپ فرار ہو جائے گا۔ لگتا ہے اسے میرے آنے کی خبر ہو گئی ہے۔"

ڈوگرہ میجر آگے بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اسے انتہائی مجبوری کے عالم میں وہ کچھ کرنا پڑ رہا تھا جو وہ کسی حالت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ میں اس کے آگے آگے ٹیلے والے دروازے کی طرف بڑھا اور ترشول آگے کر کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ میجر دوڑ کر میرے ساتھ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر ایک غار سا ہے۔ پہلے تو اندھیرا سا تھا۔ میں رک رک کر قدم اٹھانے لگا اور ساتھ ہی لمبے لمبے سانس لے کر سانپ کی بو سونگھنے کی اداکاری کرتا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بول بھی رہا تھا۔

"اگنی سانپ! میں شیو دیوتا کا بھگت ہوں۔ میں نے تجھے کیل کر لیا ہے۔ میں نے تجھے اپنے منتروں میں جکڑ لیا ہے۔ بھاگنے کی کوشش کی تو تجھے منتر پھونک کر بھسم کر دوں گا۔"

چھ سات قدم چلنے کے بعد غار کی ڈھلان آ گئی۔ چھوٹی سی ڈھلان تھی۔ ڈھلان اترتے ہی غار کا نقشہ ہی بدل گیا۔ چھت اونچی ہو گئی جگہ جگہ غار کی دیواروں پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ میں غار میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ترشول کو کبھی دیوار سے ٹکراتا کبھی فرش کی طرف جھکاتا اس طرح چل رہا تھا جس طرح بارودی سرنگوں کو تلاش کرنے والے فوجی ڈی ٹیکٹر راڈ لے کر چلتے ہیں۔ ساتھ ساتھ میں شیو دیوتا کی تعریف کے اشلوک بھی بولتا جا رہا تھا۔ میجر ارجن سنگھ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج یہاں سانپ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں تو پکے فرش ہیں۔"

میں نے پلٹ کر غضبناک آنکھوں سے ڈوگرہ میجر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اب اگر تو نے ایسی بات کی تو میں اسی جگہ سے واپس چلا جاؤں گا پھر اپنی پتنی کو بچا لینا اگر بچا سکتے ہو تو' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تمہاری خاطر اپنی جان مصیبت میں ڈالوں؟ اگنی سانپ مجھ پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔"

ڈوگرہ میجر نے میرے گھٹنے چھو کر کہا۔

"مہاراج شما کر دیں اب ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

میں نے دوبارہ سانپ کی تلاش شروع کر دی۔ میں قدم قدم غار میں آگے بڑھ رہا تھا اور ترشول کو بار بار غار کی دیوار اور فرش کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ ساتھ ہی میں بڑی گہری نظر سے غار کی دیواروں اور چھت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ غار آگے جا کر بائیں طرف مڑ گیا۔ یہاں مجھے آمنے سامنے بنے ہوئے کوٹھڑیوں کے دروازے نظر آئے۔ میں نے میجر سے بالکل نہ پوچھا کہ یہ کوٹھڑیاں یہاں کس لیے بنائی گئی ہیں۔ میں ایک کوٹھڑی کے قریب سے گزرا تو مجھے اندر سے

کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ چیخ بڑی درد ناک تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی عورت سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ میں نے میجر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ارجن سنگھ! اندر کیا ہو رہا ہے؟"

ڈوگرہ میجر بولا۔ "مہاراج! کبھی کبھی ہم یہاں ان کشمیری کمانڈوز کو پوچھ گچھ کے لئے لے آتے ہیں جو ہمارے فوجی جوانوں کو گھات لگا کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ان میں کشمیری عورتیں بھی ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بہت اچھا کرتے ہو۔ ان ملیچھ کشمیری مسلمانوں کو ہرگز زندہ نہ چھوڑنا۔"

میں ترشول دیوار کے ساتھ لگاتا اشلوک پڑھتا آگے گزر گیا۔ ذرا آگے گیا تو ایک دو کوٹھڑیوں میں سے تین چار آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے میجر سے کچھ نہ پوچھا۔ اسی طرح اشلوک پڑھتا اور کسی کسی وقت اگنی سانپ کو مخاطب کر کے اس کو خبردار کرتا چلا گیا۔ آگے ایک کافی بڑا دروازہ آ گیا۔ جہاں دو مسلح فوجی دونوں طرف کھڑے تھے۔ میجر ارجن سنگھ کو دیکھ کر انہوں نے سیلوٹ تو نہ کیا مگر ایڑیاں بجا کر اٹن شن ہوگئے۔ اگر فوجی افسر وردی میں نہ ہو تو دوسرا فوجی عہدے دار اسے سیلوٹ نہیں کرتا۔ صرف ایڑیاں بجا کر تعظیم بجا لاتا ہے۔ میں ترشول کو جھکائے اس دروازے میں داخل ہوگیا۔

ڈوگرہ میجر نے دونوں فوجیوں سے کوئی بات کی اور میرے پیچھے ہوگیا۔ غار کے اندر یہ ایک ہال نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے لکڑی کے کریٹ ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ میں ایک دم سے ایک جگہ رک گیا اور ڈگرہ میجر سے پوچھا۔

"ارجن سنگھ کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

میجر نے جلدی سے کہا۔

"ہاں مہاراج! آگے بائیں جانب ایک راستہ ہے۔"

میں نے ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔
"جے شیو جی مہاراج کی۔ ارجن سنگھ سانپ اسی طرف گیا ہے۔ چلو اس طرف۔"
ہال کمرے کے کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے بھی کواڑ نہیں تھے۔ میجر اب میرے آگے ہوگیا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب تنگ غار شروع ہوتا تھا۔ اسی غار سے باہر کی تازہ ہوا آ رہی تھی۔ یہاں صرف ایک بلب روشن تھا۔ غار کی دیواریں پکی تھیں مگر چھت اور فرش کچے ہی تھے۔ میں نے کہا۔
"ارجن سنگھ میرے پیچھے آ جاؤ۔ ہم سانپ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ کہیں وہ تم پر حملہ نہ کر دے۔"
ڈوگرہ میجر جلدی سے میرے پیچھے ہوگیا۔ کہنے لگا۔
"مہاراج! یہ غار ٹیلے کی دوسری طرف نکل جاتا ہے۔"
میں نے سانس بھر کر کہا۔
"مجھے سانپ کی بو اسی ٹیلے کی طرف سے آ رہی ہے۔ آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔ چاقو نکال کر ہاتھ میں لے لو۔"
میجر نے چاقو جیب سے نکال کر کھولا اور اسے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں اشلوک پڑھتا ترشول کو بار بار زمین اور دیواروں کی طرف جھکاتا اس جگہ پر آ گیا جہاں غار ختم ہو جاتا تھا اور غار کے دہانے پر سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں دوڑ کر غار سے باہر آ گیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ ٹیلے کا پچھلا علاقہ تھا۔ یہاں بھی غار کے دہانے کو درختوں کی شاخوں سے ڈھانپ کر کیموفلاج کیا ہوا تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو فوجی اچانک کسی طرف سے نکل کر میری طرف دوڑے اور مجھے وہیں دبوچ لیا۔ اتنے میں ڈوگرہ میجر غار کے دہانے سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے وہیں سے آواز دی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جوان۔"

دونوں فوجی سنتریوں نے سویلین کپڑوں میں اپنے کمانڈنگ آفیسر کو پہچان لیا۔ مجھے فوراً چھوڑ کر وہ پرے ہٹ گئے اور ایڑیاں جوڑ کر بولے۔

"ٹھیک ہے سر!"

میجر ارجن سنگھ نے فوجی جوانوں کو بھیج دیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"مہاراج! سانپ کا کچھ پتہ چلا؟"

میں نے وہیں ایک لمبا سانس لیا اور سخت غصے میں کہا۔

"تمہارے ان فوجی جوانوں نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے ارجن سنگھ۔ سانپ کی بو یہاں بڑی تیز تھی۔ وہ اس جھاڑی میں تھا مگر تمہارے جوان جھاڑی میں سے دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ سانپ کی بو ایک دم مدھم پڑ گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔"

میں بو سونگھتا ترشول کو ادھر ادھر پھراتا دوسرے ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ میجر مایوسی کے عالم میں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں اسے کہتا جا رہا تھا۔

"یہ کم بخت کہاں سے نکل آئے تھے۔ ان کے پاؤں کی دھمک سے سانپ فرار ہوگیا۔ اگر یہ نہ آتے تو میں نے سانپ کو پکڑ لیا تھا۔ کوئی بات نہیں تم گھبراؤ نہیں وہ مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔ مگر اس کی بو بڑی دور ہو رہی ہے۔ لگتا ہے وہ اس علاقے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔"

میرا کام پورا ہوگیا تھا۔ مجھے زیر زمین جو سراغ رسانی کرنی تھی وہ میں نے کر لی تھی۔ سنگلاخ وادی کے نیچے انڈین آرمی کے خفیہ پراجیکٹ کے بارے میں ابتدائی معلومات اور زمین دوز پراجیکٹ کے اندر جانے اور باہر نکلنے کا راستہ مجھے معلوم ہوگیا تھا لیکن میں ڈوگرہ میجر کو ابھی اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی تھی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میجر بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! اب کیا ہو گا۔ سانپ اگر بہت دور آزاد کشمیر کی طرف نکل گیا تو ہم اسے کیسے ہلاک کریں گے۔ یہ تلوار تو میری پتنی کے سر پر لٹکتی رہے گی کہ سانپ کسی بھی وقت کسی بھی روز آکر اسے ڈس دے گا۔"

میں نے کہا۔ "میجر ارجن سنگھ! تم کویں غم کرتے ہو؟ کیا میں تمہارے پاس نہیں ہوں۔ جب تک میں تمہارے اور تمہاری پتنی کے ساتھ ہوں سانپ تمہارے کوارٹر کے قریب بلکہ ورشا رانی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ میں ہر تیسرے دن اس کے جسم پر اپنا ہاتھ پھیر کر اپنے جسم کی خوشبو اس کے جسم میں داخل کر دیا کروں گا۔ تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ میری بو سے اگنی سانپ ڈرتا ہے ورنہ اب تک اس نے تمہاری پتنی کا کام تمام کر دیا ہوتا۔"

ڈوگرہ میجر کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! اب کیا پروگرام ہے۔"

میں نے کہا۔ "پروگرام یہ ہے کہ تمہارے ہاں چل کر تھوڑا آرام کروں گا۔ ورشا رانی کو بھی تسلی دوں گا اس کے بعد جنگل میں رام رام کی مالا جپنے اور پتپا کرنے نکل جاؤں گا۔ چلو تمہاری جیپ کس طرف ہے؟ مجھے تو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ ہم کس طرف آ گئے ہیں یہ کون سی جگہ ہے ارجن سنگھ؟"

میں جان بوجھ کر نادان بن رہا تھا۔ ڈوگرہ میجر بولا۔

"مہاراج جس ٹیلے سے ہم غار میں داخل ہوئے تھے یہ اس ٹیلے کا پچھلا علاقہ ہے۔ ہماری جیپ دوسری طرف کھڑی ہے۔ آ جائیے مہاراج۔"

ہم ٹیلے کے نشیب میں سے جھاڑیوں درختوں میں سے گزرتے واپس اسی جگہ آ گئے جہاں چیڑھ اور چنار کے درختوں میں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ ہم جیپ میں بیٹھ کر واپس چل پڑے۔

میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر میں اس کی پتنی اور دونوں عورتیں بے تابی سے ہماری راہ دیکھ رہی تھیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ اگنی سانپ پکڑا نہیں گیا تو وہ

پریشان ہوگئیں۔ ورشا رانی تو صوفے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جوگی اور سادھو ہندو گھرانوں میں بڑے تکلف ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اسی قسم کا مظاہرہ کیا اور ورشا رانی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بالکا! تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ جب تک ہم تمہارے پاس ہیں سانپ اس طرف آنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ ہم کل پھر اس کی تلاش میں جائیں گے۔ ہم جب تک اپنے ترشول سے اس کے ٹکڑے نہیں کر لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

ورشا رانی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ہاتھ باندھ کر بولی۔
"مہاراج کی کرپا ہے۔"

دوپہر کا کھانا میں نے وہیں میجر ارجن سنگھ اور ورشا رانی کے ساتھ کھایا۔ اس کی دونوں رشتے دار عورتوں کو میں نے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ دوپہر کے بعد میں اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے ڈوگرہ میجر کے کوارٹر سے نکل کر اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ چھوٹا سا جنگلاتی علاقہ تھا۔ میں درختوں، جھاڑیوں میں سے گزرتا اسی راستے سے سری نگر شہر کے بڑے چوک کی طرف واپس جا رہا تھا جہاں سے مجھے بس پکڑنی تھی اور شہر سے دور اپنی خفیہ کمین گاہ والی سڑک پر جا کر اترنا تھا۔ میں ابھی ان درختوں میں ہی تھا کہ میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھے خبردار کر دیا کہ تمہارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔

ایک آدمی کو میں نے اپنے برابر کچھ فاصلے پر درختوں میں جاتے دیکھا تھا۔ کچھ دور تک وہ آدمی میرے متوازی درختوں میں چلتا رہا۔ پھر اچانک غائب ہوگیا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ میں سادھوؤں کی طرح بڑے لا ابالی انداز میں آرام آرام سے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے اسی آدمی کو دوبارہ دیکھا۔ اب وہ ایک درخت کی اوٹ میں مجھ سے کچھ فاصلے پر ذرا بلندی پر کھڑا

سگریٹ پی رہا تھا اور پیچھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ شک ہوا۔ جب میں اس کے برابر سے ہو کر گزرا تو میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے غور سے مجھے تک رہا تھا۔ اس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اصولی طور پر اسے میرا پیچھا کرنا چاہیے تھا میں ایک ڈوگرہ میجر کے ساتھ انڈین آرمی کے سیکرٹ پراجیکٹ کے علاقے سے ہی نہیں گزرا تھا بلکہ اس پراجیکٹ کے اندر سے گھوم پھر کر آیا تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس کو تو میرا پیچھا کرنا ہی تھا کہ میں کون ہوں اور میجر کے ساتھ خفیہ پراجیکٹ میں کیا کرنے گیا تھا۔ وہ سارا علاقہ حساس علاقہ تھا۔ حریت پسند مجاہدین ہر محاذ پر مقبوضہ انڈین آرمی کا بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے اور ان کا ظلم و بربریت کا منہ توڑ جواب دے رہے تھے۔ یقینی طور پر ڈوگرہ میجر سے بھی ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے پوچھ گچھ ہونے والی تھی کہ وہ ایک سادھو کو لے کر خفیہ پراجیکٹ میں کیا کرنے گیا تھا۔ ظاہر ہے میجر اس حقیقت سے باخبر تھا اور اس نے اس کے لیے کوئی نہ کوئی وضاحت ذہن میں تیار کر رکھی ہوگی لیکن یہ جو ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی میرے پیچھے لگ گیا تھا یہ میرے لیے بلکہ ہمارے سارے مشن کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں وہیں محتاط ہوگیا۔

سری نگر شہر کے بس سٹاپ پر آکر میں وہاں بالکل نہیں رکا بلکہ بس سٹاپ سے آگے نکل گیا۔ سامنے ایک چائے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میں دکان میں گھس گیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ دکان میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ تین چار بزرگ ٹائپ کے کشمیری بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر وہ چپ ہوگئے۔ یہ بات بڑی عام تھی کہ سری نگر پولیس کی سی آئی ڈی کے آدمی سادھوؤں کا بھیس بدل کر شہر میں اور دیہات میں پھرتے رہتے ہیں اور حریت پرست مجاہدوں کا کھوج لگا کر انہیں گرفتار کروا دیتے ہیں جو کشمیری حریت پرستوں کی طرف داری بھی کر رہے ہوں ان کی بھی مخبری کر کے

پکڑوا دیتے ہیں۔ میں دکان کے کونے میں بنچ پر بیٹھ گیا اور دکاندار سے کہا۔
"میاں جی! ایک پیالی چائے بنا دیں اور سادھوسنت سے دعا لیں۔"
میری نظریں برابر باہر بازار کی طرف لگی تھیں۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ وہی آدمی دکان کے آگے سے سگریٹ پیتے ہوئے گزرا جو میجر کے کوارٹر سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے اس نے نگاہ اندر ڈال کر دیکھا تھا۔ ضرور اسے میں دکان میں بیٹھا ہوا نظر آگیا ہوں گا بلکہ اس نے تو مجھے چائے کی دکان میں داخل ہوتے بھی دیکھ لیا ہوگا۔
اب میں سوچنے لگا کہ اس آدمی سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس کو ساتھ لے کر میں اپنی خفیہ کمین گاہ پر نہیں جا سکتا تھا۔ پہلے سوچا کہ اس کو اپنے پیچھے لگا کر اوپر لے جاتا ہوں۔ وہاں اس کو اپنے دوست سانپ سے ڈسوا کر اس کا کام تمام کر دوں گا۔ پھر خیال آیا کہ یہ لوگ اور خاص طور پر ملٹری انٹیلی جینس کے لوگ جب کسی مشکوک شخص کا تعاقب کرتے ہیں تو اکیلے نہیں ہوتے کم از کم دو آدمی ہوتے ہیں اور دونوں مسلح ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کو خبر کر دیتے ہیں کہ ہم مشتبہ آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے فلاں علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر تک میں دکان میں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ وہاں شاید سبھی مسلمان کشمیری تھے۔ کسی نے مجھ سے کوئی بات نہ کی میں زیادہ دیر وہاں بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے واپس خفیہ ٹھکانے پر جا کر دن بھر کی ساری رپورٹ کمانڈو شیر باز کو دینی تھی جو وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک ادھر ادھر بھی نہیں پھر سکتا تھا اس طرح سے انٹیلی جینس کے آدمی کا شک یقین میں بدل جاتا کہ میں واقعی کشمیری کمانڈو ہوں۔
ایک ہی طریقہ باقی تھا کہ میں کسی طرح سے آدمی کو دھوکا دے کر نکل جاؤں۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ یہ ایک آدمی نہیں ہے اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی ہے جو دوسری جانب سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔ کافی دیر تک دکان میں بیٹھا

یہی کچھ سوچتا رہا۔ چائے کی دو پیالیاں پی گیا۔ آخر دکان سے نکل کر سرد کہرے میں ڈوبی ہوئی سڑک پر ایک طرف چل پڑا۔ آسمان پر بادل گھرے ہو گئے تھے۔ کہر بالکل بادلوں کی طرح سڑک پر چھایا ہوا تھا۔ یہ کہر میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا مجھے سوائے کہرے کی دھند کے کچھ نظر نہ آیا۔ میں تیز تیز چلنے لگا کہرے کا بادل ختم ہوگیا۔ سڑک میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں ایک دکان کے آگے کھڑا ہوگیا اور شو کیس میں لگی ہوئی چیزیں دیکھنے لگا۔ وہاں سے چلتے وقت بڑی چالاکی سے گردن موڑ دیکھا تو وہی آدمی مجھ سے تھوڑی دور ایک دکان کے باہر موجود تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

کم بخت یہ تو جان نہیں چھوڑے گا۔ میں نے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس علاقے میں وشنو جی کا ایک مندر بھی ہے۔ میں اس مندر کی طرف چل پڑا۔ دو تین بازار اور ایک گھاٹی اترنے کے بعد سامنے مندر کے کلس پر لہراتا بھورے رنگ کا جھنڈا دکھائی دیا۔ میں مندر میں گھس گیا۔ مندر میں یہ کوئی پوجا پاٹھ کا وقت نہیں تھا پھر بھی پجاری لوگ آ جا رہے تھے ان میں عورتیں بھی تھیں یہ بڑا چھوٹا سا مندر تھا۔

مندر کے پیچھے ایک چبوترے پر دو سادھو آگ کا الاؤ جلا کر بیٹھے ہوئے تھے میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے سادھوؤں سے باتیں کرنے کا تجربہ تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی ابھی تک کہیں دکھائی نہیں دیا تھا کچھ وقت گزرانے کے بعد میں اٹھ کر مندر کے دروازے کی طرف آ گیا۔ دیکھا تو انٹیلی جینس کا آدمی مندر کے دروازے کے باہر ایک طرف بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا حلیہ ہندو کشمیریوں والا تھا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا میں سمجھ گیا کہ یہ میرے باہر نکلنے کے انتظار میں ہے۔ کیونکہ مندر کا کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ دوسری

طرف اونچی دیوار تھی۔ میں واپس سادھوؤں کے پاس چلا گیا۔ سوچنے لگا کہ یہ موقع اچھا ہے اگر میں کسی طریقے سے دیوار پھاند کر نکل جاؤں تو اس آدمی سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ میں نے چبوترے پر بیٹھے سادھوؤں سے باتیں کرتے ہوئے سامنے مندر کی عقبی دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار کچھ نہیں تو دس فٹ کے قریب بلند تھی۔ اس کے قریب کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ دیوار کے آخری سرے کی طرف میری نظر گئی تو وہاں مجھے ایک کوٹھڑی دکھائی دی۔ اس کوٹھڑی کی چھت مندر کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ اگر میں کسی طرح اس کوٹھڑی کی چھت پر چڑھ جاؤں تو دیوار پھاند کر دوسری طرف جا سکتا ہوں۔

میں کوٹھڑی تک جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔

اس وقت یہی ایک موقع اور یہی ایک راستہ تھا۔ میں اولکھ نرنجن کا ہلکا سا نعرہ لگا کر اٹھا اور چبوترے سے اتر کر کوٹھڑی کی طرف آ گیا۔ کوٹھڑی بند تھی۔ باہر ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں کوٹھڑی کی دوسری طرف آیا تو وہاں بھی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا دیکھا۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر پر پاؤں رکھ کر کوٹھڑی کی چھت پر چڑھ گیا سردی اور کہرے کی وجہ سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیوار کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک نالہ بہہ رہا تھا مگر دیوار کے ساتھ پیدل چلنے کے واسطے راستہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں دیوار کی منڈیر کو پکڑ کر دوسری طرف لٹک گیا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔ میں الٹ کر نالے میں گرتا گرتا بچا۔ پگ ڈنڈی پر گرتے ہی میں نے بڑی جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک طرف جتنی تیز چل سکتا تھا چلنے لگا۔

نالے میں پانی بے معلوم انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس میں کوڑا کرکٹ بھی بہہ رہا تھا۔ میں چلتا چلا گیا۔ آگے جا کر لکڑی کا پل آ گیا میں پل پر سے ہو کر دوسری طرف سڑک پر نکل آیا۔ یہاں مجھے ایک موٹر رکشا مل گیا۔ میں اس میں گھس گیا اور اس سے کہا۔

"نشاط باغ کی طرف چلو۔"

جس سڑک پر مجھے جانا تھا وہ نشاط باغ سے آگے تھی۔ رکشا روانہ ہو گیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انٹیلی جینس کے آدمی کو دھوکا دے کر نکل آیا ہوں۔ نشاط باغ پیچھے رہ گیا۔ جب میں سری نگر شہر سے باہر جانے والی سڑک پر کافی

آگے نکل آیا تو ایک جگہ میں نے رکشہ رکوا کر اتر گیا۔ رکشے والے کو کرایہ دیا اور سڑک کے ساتھ جو پہاڑی راستہ اوپر جاتا تھا اس طرف کا رخ کیا۔ یونہی میں نے پیچھے ایک نگاہ سڑک پر ڈالی تو کچھ فاصلے پر ایک موٹر رکشا کھڑا تھا میں ٹھٹھک سا گیا۔ پھر خیال آیا کہ یہ موٹر رکشا ویسے ہی کھڑا ہوگا۔ اس میں کوئی سواری ہوتی تو باہر نکل آئی ہوتی۔ میں درختوں میں سے گزرنے لگا۔ میں اپنی کمین گاہ کی طرف سیدھے راستے سے جانے کی بجائے پیچ دار اور دشوار گزار راستوں سے گزر رہا تھا۔ تاکہ اگر کوئی میرا پیچھا کر بھی رہا ہے تو وہ پہاڑی راستوں کی بھول بھلیوں میں پھنس جائے۔ کبھی گھاٹی آ جاتی' کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے اور کبھی کوئی چٹان سامنے آ جاتی تھی۔ میں کافی چکر لگا کر آخر اس پگ ڈنڈی پر آ گیا جو ایک گھاٹی اور نالے میں سے ہوتی ہوئی ہماری خفیہ کمین گاہ کی طرف جاتی تھی۔

میں اس پہاری پگ ڈنڈی پر بھی احتیاط کے طور پر بالکل سیدھا نہ گیا بلکہ پگڈنڈی سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے سے ہو کر چڑھائی چڑھنے لگا۔ آگے گھاٹی آ گئی۔ گھاٹی اتر گیا۔ سامنے نالہ بہہ رہا تھا یہ پہاڑی نالہ تھا سامنے ذرا بلندی پر ہمارے کشمیری مجاہد کی لکڑی کی جھونپڑی تھی جو ہماری خفیہ کمین گاہ بھی تھی یہاں میں رک گیا۔ بادل اونچے ہو گئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جس کی وجہ سے دھند اور کہر غائب ہو گیا تھا۔ میں نالے کے ساتھ ساتھ چل کر اوپر لکڑی کی جھونپڑی کے پیچھے نکل آیا۔ جھونپڑی کے سامنے کی جانب آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوٹھڑی کو تالا نہیں لگا تھا مگر وہ خالی پڑی تھی نہ کمانڈو شیر باز ابھی تک پہنچا تھا نہ اپنا کشمیری مجاہد ہی نظر آ رہا تھا۔ کچن والی جھونپڑی بھی خالی پڑی تھی۔ تعجب ہوا کہ کمانڈو شیر باز ابھی تک کیوں نہیں پہنچا۔ اسے تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ میں پیچھے چٹان والی گھاس پھوس کی جھونپڑی کی طرف آ گیا۔ یہاں میرے دوست سانپ کی آرام گاہ تھی میں نے جھک کر دیکھا۔ سانپ

نے میرے خیر مقدم کے طور پر ہلکی سی پھنکار ماری۔ وہ بیدار تھا اور گردن اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دو بار گردن کو آگے کی طرف جھکایا جیسے میری تعظیم بجا لا رہا ہو۔ میں نے کہا۔

"دوست! میں جس مشن پر گیا تھا وہ کامیاب رہا ہے اب آگے ہمیں تمہاری ضرور پڑے گی۔ تم ہماری مدد کے لیے تیار ہو نا؟

سانپ نے سر کو دوبار جھکا دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "میں تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کمانڈو شیر باز کہاں ہے؟ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اسے آجانا چاہیے تھا۔"

سانپ خاموش بیٹھا میری طرف تکتا رہا۔ وہ بول کر مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ سانپ بول بھی سکتا۔ میں نے اسے کہا۔

"کیا تم بات نہیں کر سکتے؟"

سانپ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے سوال پر خود ہی ہنسی آگئی۔ وہ بول کہاں سکتا تھا۔ ویسے اگر وہ میری اردو پنجابی زبان کو سمجھ لیتا تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ کسی روز اردو یا پنجابی میں مجھ سے باتیں بھی کرنے لگے۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"دوست! کیا تم دنیا کی ساری زبانیں جانتے ہو یا صرف اردو اور پنجابی ہی سمجھتے ہو۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں تم سے زیادہ تر ان دو زبانوں میں ہی بات کرتا ہوں اور تم سمجھ بھی لیتے ہو۔"

سانپ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں میجر ارجن سنگھ کے گھر سے آرہا ہوں۔

"میں نے سارا زیر زمین پراجیکٹ دیکھ لیا ہے اور میجر کی پتنی بھی تندرست ہوگئی ہے اب ہمیں کمانڈو ایکشن کی تیاریاں کرنی ہیں تم میرے پاس رہتے ہوئے

بور تو نہیں ہوگئے؟ میرا مطلب ہے تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے الگ ہو کر جنگلوں میں نکل جاؤ اور اپنی مرضی سے پہاڑوں' جنگلوں میں سیر کرتے پھرو؟"

میں بڑے غور سے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس دفعہ سانپ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے بے اختیار ہو کر سانپ کے سر پر انگلی سے پیار کیا اور کہا۔

"دوست! تم واقعی بوے وفادار ساتھی ہو مجھے تمہاری دوستی پر بڑا ناز ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی اپنے سے الگ نہیں کروں گا۔ خدا نے چاہا تو ہم دونوں ایک ساتھ جہاد کشمیر کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ زندہ رہے تو ایک ساتھ زندہ رہیں گے مرگئے تو خدا کرے کہ ایک ساتھ مریں مگر دشمن کو زبردست نقصان پہنچا کر مریں۔ یونہی مرجانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

سانپ کے منہ سے ہلکی سی پھنکار نکلی۔ میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک' تم یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟"

سانپ نے ایک بار پھر ہلکی سی پھنکار کی آواز نکالی۔ وہ کچھ بے چین سا نظر آنے لگا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ مجھے ایک زبردست خطرے سے آگاہ کر رہا تھا اور میں بالکل نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے سانپ کے سر پر انگلی رکھی اور کہا۔

"اچھا دوست! میں کوٹھڑی میں چل کر بیٹھتا ہوں مجھے کمانڈو شیر باز کا انتظار ہے۔ شام تک وہ ضرور آ جائے گا۔"

آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی میں نے سانپ کے کھوہ کے آگے درخت کی ٹہنیوں کی آڑ سی بنا دی تھی تاکہ سرد ہوا سے تھوڑا بچاؤ ہو جائے۔ اٹھ کر گھاٹی کی معمولی سی ڈھلان اتر کر لکڑی کی جھونپڑی کے صحن میں آگیا۔ صحن اسی طرح خالی پڑا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی کا مجھے احساس ہوا۔ اسی خاموشی میں مجھے

خطرے کی بے معلوم سی بو محسوس ہوئی مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ مجھے خیال کرنا چاہیے تھا لیکن مجھ سے بھول ہوگئی دشمن کے گھر میں بیٹھ کر آدمی کو ہر لمحے چوکس رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی غفلت اور بے خیالی اسے موت کے منہ میں لے جا سکتی ہے۔

لکڑی کی جھونپڑی نما کوٹھڑی کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ باہر سردی تھی۔ میں اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دروازہ میں نے بند کر دیا تھا۔ سوچنے لگا کمانڈو شیر باز ابھی تک کیوں نہیں، آیا۔ اسے آ جانا چاہیے تھا کہیں کسی مشکل میں نہ پھنس گیا ہو۔ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اپنا بوڑھا کشمیری مجاہد ٹوکری میں سبز ترکاری لیے چلا آ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول لیا۔

"شیر باز خان ابھی تک کیوں نہیں آیا؟"

میں نے کشمیری مجاہد سے پوچھا۔ اس نے کہا۔

"معلوم نہیں رات کہہ کر گیا تھا کہ صبح دس گیارہ بجے تک آ جاؤں گا۔ میں صمد بٹ کے ہاں جا کر پتہ کرتا ہوں کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔"

کشمیری مجاہد نے سبزی والا تھیلا کچن کی کوٹھڑی میں رکھا اور واپس چلا گیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ شیر باز کو ساتھ ہی لے کر آئے کشمیری مجاہد کو گئے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ میں کوٹھڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کوٹھڑی کی فضا میں سردی کا احساس بہت کم تھا۔ بوڑھے کشمیری کی کانگڑی وہاں پڑی تھی جس کی راکھ میں ابھی تک کچھ راکھ آلود انگاروں میں حرارت باقی تھی میں نے کانگڑی اپنے قریب کر لی تھی۔ صحن میں دوبارہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں سوچنے لگا کہ کشمیری مجاہد اتنی جلدی کیسی واپس آ گیا ہے۔ صمد بٹ کا ٹھکانہ وہاں سے کم از کم تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ انسانی قدموں کی آواز دروازے کی طرف آ رہی تھی میں نے اندر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"بابا! اتنی جلدی واپس آ گئے؟"

اس کے ساتھ دروازہ دھڑاک سے کھل گیا اور دو اونچے لمبے آدمی اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ دونوں سویلین لباس میں تھے۔ ایک دروازے کے پاس ہی ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑا ہوگیا۔ دوسرے نے ریوالور کی نالی میری گردن کے ساتھ لگائی اور کہا۔ "چپکے سے ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

میں ابھی تک جوگی سادھو کے بھیس میں ہی تھا۔ میں نے اشلوک وغیرہ بول کر ان پر رعب جمانے کی اور ان کے ضعیف عقیدے پر اثر ڈالنے کی کوشش کی مگر ان پر میرے اشلوکوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ دونوں ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا تھا یہ وہی آدمی تھا جو میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"بابا! ہم جوگی لوگ ہیں۔ ہمیں کیوں پریشان کرتے ہو۔"

اس آدمی نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"تم پاکھنڈی ہو' تم جوگی نہیں ہو۔ تم پاکستانی کمانڈو ہو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو ہمارے ریوالوروں سے نکلی ہوئی گولیاں تمہیں یہیں ڈھیر کر دیں گی۔"

میں نے کہا۔ "بابا اگر تم یہی چاہتے ہو تو چلو ہم تمہارے ساتھ چلے چلتے ہیں لیکن یاد رکھو۔ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے گا۔"

اب دوسرا آدمی سخت لہجے میں بولا۔

"بک بک بند کرو اور سیدھی طرح چلو۔"

میں نے کہا۔

"ایک جگہ میں نے اپنا منڈل رکھا ہے میں وہ لے آؤں۔ بے شک تم لوگ میرے ساتھ چلو۔"

دوسرے آدمی نے دو تین سیکنڈ کے اندر اندر رسی سے میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ اب میرے لیے بھاگنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت میری ساری توجہ اپنے دوست سانپ کی طرف تھی۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا۔ میں کرمنڈل کے بہانے ان انٹیلی جینس والوں کو سانپ کی کھوہ کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ مگر انہوں نے مجھے اس کی اجازت نہ دی اور مجھے دھکیلتے ہوئے ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے۔ ریوالور ان کے ہاتھوں میں تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اکیلے نہیں آئے۔ نیچے سڑک پر ان کی جیپ کھڑی ہوگی اور جیپ میں سیکرٹ سروس اور ملٹری انٹیلی جینس کے تین چار مسلح افراد ضرور ہوں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فوجی جوان بھی ہوں۔ ایک طرح سے میں مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

یہی وہ خطرہ تھا جس کی بو میں نے فضا کی خاموشی میں محسوس کی تھی اور یہی وہ اجنبی لوگ تھے جن کی بو میرے دوست سانپ نے محسوس کر لی تھی اور اس نے پھنکارتے ہوئے ایک طرف گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت میں سانپ سے دور تھا اور مزید دور ہوتا جا رہا تھا۔

پہاڑی کے نشیب سے اترنے کے بعد جب ہم برساتی نالے پر پہنچے تو مجھے سانپ کی ہلکی سی پھنکار سنائی دی۔ اس آواز کو انٹیلی جینس والوں نے بھی سنا مگر انہوں نے کوئی خیال نہ کیا اور مجھے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ مگر میں نے اپنے دوست سانپ کی آواز کو پہچان لیا تھا۔

جیسے ہی ہم نالے پر جو لکڑی کا چھوٹا سا پل تھا وہاں پہنچے تو میرا دوست سانپ ایک جھاڑی میں سے نکلا اور میری طرف گردن اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میرے سوا سانپ کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ملٹری انٹیلی جینس کی قید میں جانے کا مجھ پر خوف سوار تھا میں نے چلا کر کہا۔

"دوست میری مدد کرو۔"

دونوں آدمیوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا بک بک کرتا ہے'

خاموش رہ کر چلتا چل"۔

میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ بالکل چپ چاپ ساکت ہو کر بیٹھا تھا۔ جیسے اس نے میری مدد کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ ہم سانپ سے آگے نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دہشت ناک آواز فضا میں گونج اٹھی۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز واقعات

اس داستان کی اگلی کتاب نمبر ۴۲ میں

ملاحظہ فرمائیں۔

Hassam
9/26/10

گولکنڈہ کے مجاہد
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
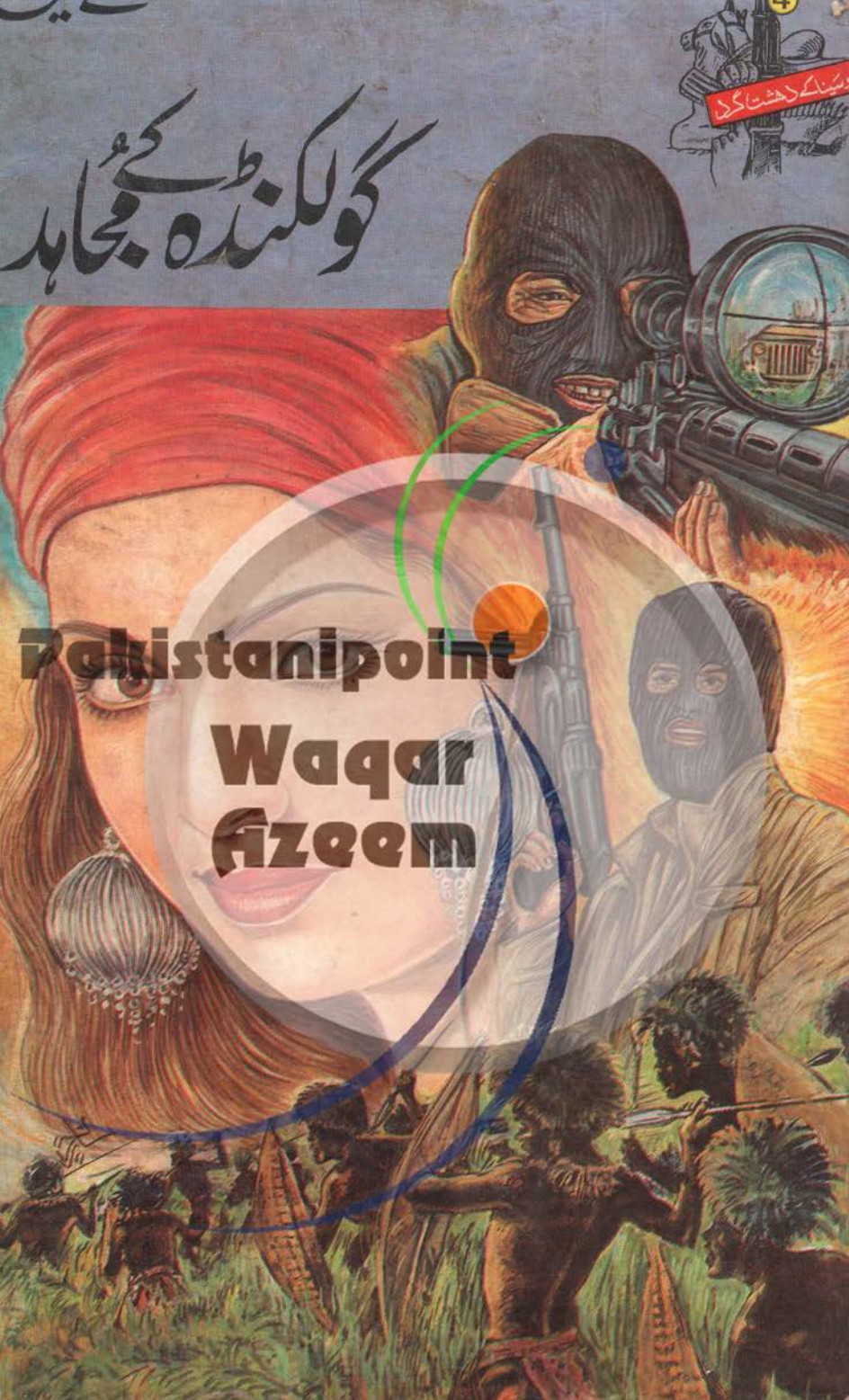
بھارت میں ایک محب وطن پاکستانی کی لرزہ خیز اور سنسنی خیز داستان

مکتبہ القریش - اردو بازار لاہور

ناشر	عبدالحفیظ قریشی
باہتمام	محمد علی قریشی
مطبع	نیر اسد پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ	خرم آرٹس لاہور
سن اشاعت	1997
تعداد	1100
قیمت	/= روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

میں اس لرزہ خیز آواز کو پہچانتا تھا۔

انڈین ملٹری انٹیلی جینس کے دونوں آدمیوں نے اس دہشت ناک آواز کو سنا تو وہیں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں بھرے ہوئے پستول تھے۔ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا اب کیا ہوگا۔ میرا دوست میری مدد کو پہنچ گیا تھا۔ ان میں ایک نے کہا۔

"کوئی ناگ ہے۔ یہاں سے جلدی سے نکل چلو۔"

اور وہ مجھے دھکیلتے ہوئے پہاڑی ڈھلان اترنے لگے۔ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ان میں سے ایک آدمی بائیں جانب جھاڑیوں پر گر پڑا۔ دوسرا اس کو اٹھانے کے لئے جھکا تو وہ بھی منہ کے بل پہلے آدمی پر گر پڑا۔ مجھے معلوم تھا اب یہ دونوں انڈین ملٹری انٹیلی جینس والے قیامت تک وہاں سے نہیں اٹھ سکیں گے۔ میں جلدی سے جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دونوں آدمیوں کی کلائیوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ دونوں کے جسم پتھر کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ یہ کارنامہ میرے ساتھی، میرے سانپ دوست کا تھا۔ بالشت بھر کا سانپ تھا مگر خدا جانے اس کے زہر میں اتنا ہلاکت خیز اثر کہاں سے پیدا ہو گیا تھا کہ جس کو ڈستا تھا اس کا جسم اسی وقت پتھر کی طرح سخت ہو جاتا تھا اور اس کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو آواز دی۔

میرا دوست سانپ جھاڑی کی شاخوں میں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"دوست! یہیں بیٹھے رہنا۔"

ایک پتھر ٹیلے کی دیوار میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پشت لگا دی اور اسی رسی کو پتھر کے ساتھ رگڑنے لگا جس سے میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس قسم کی ترکیبیں ہمیں ٹریننگ کیمپ میں بہت سکھائی ہوئی تھیں۔ مجھے دو منٹ لگے ہوں گے۔ پتھر کے تیز کنارے کی رگڑ نے رسی کاٹ دی۔ میں نے ہاتھوں کو جھٹک کر رسی پھینکی اور سانپ کو اٹھا کر اپنے سادھوؤں والے لمبے چولے کی سائیڈ والی جیب میں ڈال لیا۔ میں وہاں سے پہاڑی ڈھلان کی دوسری طرف نکل گیا۔ میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ ان آدمیوں کے ساتھ انٹیلی جنس کے دوسرے آدمی بھی آئے ہیں یا نہیں۔ میں چھوٹا سا چکر کاٹ کر ایک چٹان کے پاس آ گیا یہاں سے نیچے پتلی سی کچی سڑک نظر آتی تھی۔ میں نے سڑک کے ایک طرف درختوں کے سائے میں فوجی جیپ کھڑی دیکھی تھی۔ ایک جوان فوجی وردی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دوسرا فوجی جیپ کے بونٹ کے پاس کھڑا اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس سٹین گن تھی۔ وہ آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ مجھے تک صرف ان کی مدھم آواز ہی پہنچ رہی تھی۔ پھر دونوں پہاڑی کی پگ ڈنڈی پر چڑھنے لگے۔ وہ اپنے ساتھیوں کا پتہ کرنے آ رہے تھے کہ انہوں نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ میرا ذہن تیزی سے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اوپر جا کر بوڑھے کشمیری کو خبردار کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے آنے کے بعد وہاں سے چلا گیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مکان پر ہی ہو۔ انڈین ملٹری کے یہ دونوں جوان اب اس جھاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں ان کے ساتھیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ سانپ کو میں نے جیب سے نکال لیا۔ اسے اپنے چہرے کے قریب لا کر آہستہ سے کہا۔

"دوست! دو دشمن آ رہے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی لاش دیکھنے کے بعد وہ اوپر کی طرف ضرور دوڑیں گے اور اوپر بوڑھا کشمیری مجاہد ہوا تو اسے پکڑ کر لے جائیں گے۔ ان دشمنوں کو اسی جگہ ختم کر دو۔"

اور میں نے سانپ کو نیچے چھوڑ دیا۔

سانپ گھاس میں غائب ہو گیا۔ اسی وقت دونوں فوجی جھاڑی کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر اپنے ساتھیوں پر پڑی تو اس نے اونچی آواز میں اپنے ساتھی کو کچھ کہا۔ دونوں لاشوں پر جھک گئے۔ پھر فوراً ایک فوجی نے سٹین گن کا رخ اوپر کی طرف کر کے پوزیشن سنبھال لی۔ دوسرے نے بھی ریوالور نکال لیا۔ وہ تیز تیز بول رہے تھے۔ دونوں جھک کر ایک دوسرے کے پیچھے اوپر چڑھائی چڑھنے لگے۔ وہ مجھ سے سو سوا سو قدموں کے فاصلے پر ہوں گے۔ میں کاؤنٹ ڈاؤن کر رہا تھا۔ میرا دوست سانپ ان کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔ میں نے بالشت بھر کے اس سانپ کو پہاڑی رستوں پر بھی بڑی تیزی سے بھاگتے دیکھا تھا۔ انڈین ملٹری انٹیلی جنس کے دونوں جوان آگے پیچھے اوپر جا رہے تھے۔ ان کے ریوالور اور سٹین گن کا رخ اوپر کی جانب تھا۔ انہیں اوپر کشمیری مجاہد کا لکڑی کا مکان ضرور نظر آ رہا ہو گا۔

میں ان کے یکے بعد دیگرے گرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میری نظریں باری باری ان دونوں فوجیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ میں اپنی نظریں ٹارگٹ سے بالکل نہیں ہٹا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے پیچھے آنے والے فوجی کو ایک دھچکا سا لگا اور وہ پیچھے کو گر پڑا۔ اس کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی تو اگلے فوجی نے رک کر پیچھے دیکھا۔ وہ پیچھے کی طرف پلٹ کو دوڑا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے ساتھی کی لاش کے قریب آیا ہی تھا کہ وہ بھی گر پڑا۔ اس سانپ کے زہر کی یہ خوبی بھی تھی کہ آدمی کو بولنے کی بھی مہلت نہیں ملتی تھی۔ میں نے اس قسم کا زہریلا سانپ زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دوسرا فوجی گرا تو میں

درختوں، پتھروں اور جھاڑیوں میں سے تیز تیز گذرتا دونوں فوجیوں کی لاشوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ان کی موت کا مجھے اسی وقت یقین ہوگیا تھا جب وہ ایک دوسرے کے پیچھے گرتے تھے۔ میں نے دونوں لاشوں کو چھوا دونوں پتھر بن چکے تھے۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ یہ انٹیلی جنس والے جب اپنے ہیڈکوارٹر سے مکان پر چھاپہ مارنے اور مجھے پکڑنے کے لئے چلے ہوں گے تو ظاہر ہے وہاں بتا کر آئے ہوں گے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ گھنٹے دو گھنٹوں تک واپس نہ پہنچے۔ تو ہیڈ کوارٹر سے کوئی نئی پارٹی ان کی تلاش میں ضرور آئے گی۔ اس زمانہ میں ابھی موبائیل ٹیلی فون نہیں آئے تھے۔ ان چاروں فوجیوں کی لاشوں کا وہاں پڑا رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو سیٹی بجا کر آواز دی۔ اب میں کبھی کبھی منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکال کر بھی اسے بلا لیا کرتا تھا۔ سانپ ایک ڈوگرہ فوجی کی لاش کے پہلو سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ اس کے فوراً بعد میں جلدی جلدی چڑھائی چڑھ کر اور مکان کے صحن میں آگیا۔ مجاہد کشمیری کچن والے جھونپڑے سے نکل کر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"شیر باز خان کا کچھ پتہ چلا؟"

میں اس کے پاس چلا گیا۔ مختصر الفاظ میں اسے ساری بات بیان کی۔ اسے یہ ہرگز نہ بتایا کہ چاروں ڈوگرہ فوجیوں کو سانپ نے ہلاک کیا ہے۔ یہی کہا کہ انہیں کوئی جنگلی کیڑا کاٹ گیا ہے جس سے چاروں مرگئے ہیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ہمیں ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

وقت بہت کم تھا۔ چاروں لاشوں کو نیچے پہاڑی سڑک پر لے جا کر انہیں فوجی جیپ میں ڈالنا اور پھر جیپ کو کھڈ میں گرانا تھا۔ تاکہ یہ پتہ چلے کہ

جیپ سڑک سے پھسل کر کھڈ میں جا گری تھی اور چاروں آدمی حادثے میں مارے گئے ہیں۔ یہ علاقہ جیسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں غیر آباد تھا۔ اردگرد کوئی مکان یا گاؤں نہیں تھا۔ چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے۔ جن کے درمیان کہیں کہیں ایک آدھ کچا راستہ تھا۔ جس پر خچر وغیرہ چلتے تھے۔ کشمیر مجاہد اگرچہ بوڑھا تھا مگر مضبوط کاٹھی والا طاقتور کشمیری تھی۔ میں تو جوان آدمی تھا۔ وہ میرے ساتھ پہلی لاش اٹھانے لگا تو بولا۔

"میرے اللہ! یہ تو پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"کسی بہت زیادہ زہریلے کیڑے نے کاٹا ہو گا۔"

ہم ایک ایک لاش کو ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا کر نیچے پہاڑی راستے تک لائے۔ اس کام میں ہمیں کافی وقت لگ گیا۔ اس کے بعد چاروں لاشوں کو فوجی جیپ میں ڈالا۔ میں نے کشمیری مجاہد سے کہا۔

"ہمیں جیپ کو کافی آگے لے جا کر کھڈ میں گرانا چاہیئے۔ جائے حادثہ ہماری کمیں گاہ سے جتنی دور ہو اتنا ہی اچھا ہے۔"

جیپ کو پہاڑی راستے پر دھکیلتے ہوئے لے جانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ راستہ تھوڑا ڈھلوان بھی تھا۔ میں نے جیپ کے ہنڈل کو سنبھالے رکھا۔ ساتھ ساتھ دھکا بھی لگاتا رہا۔ ہم جیپ کو ایک فرلانگ سے بھی زیادہ آگے لے گئے۔ میں نے پٹرول کی ٹینکی کا ڈھکنا کھول دیا۔ اس کے بعد ہم نے جیپ کو کھڈ میں دھکا دے دیا۔ جیپ تین چار لڑھکنیاں کھاتی ہوئی نیچے گہرے کھڈ میں ایک دھماکے سے جا کر گری اور گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی۔ ہم دونوں طرف سے ہوتے ہوتے اوپر اپنی کمیں گاہ والے مکان میں آ گئے۔ کشمیری مجاہد کہنے لگا۔

"اسی طرف اب خطرہ بڑھ گیا ہے۔ یہ جگہ محفوظ نہیں رہی۔ ہمیں یہ جگہ بدل دینی ہو گی۔"

سانپ میرے چولے کی جیب میں ہی تھا۔ ہمارے کشمیری مجاہد کو ابھی تک میرے سانپ دوست کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"شیر باز خان آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔ پھر کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کر لیں گے۔"

کشمیری مجاہد کچن کی طرف چل دیا۔ میں پچھلی طرف چٹانی کھوہ کی طرف آگیا۔ سانپ کو جیب سے نکال کر کھوہ کے اندر گھاس پر رکھ دیا اور کہا۔

"دوست تمہار بہت بہت شکریہ۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے دوست سانپ کو پیالہ بھر کر دودھ پلایا اور کہا۔

"ہو سکتا ہے ہمیں یہ ٹھکانہ بدلنا پڑے۔ مگر تم ہمارے ساتھ ہی جاؤ گے۔ فکر نہ کرنا۔"

شام ہو گئی تھی۔ جب کمانڈو شیر باز خان آیا۔ میں نے اسے سارے واقعات سنائے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ سانپ کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا تھا۔ کہنے لگا۔

"ابھی تک جیپ کے حادثے کی خبر شہر میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کو ضرور معلوم ہوگیا ہوگا۔ وہ لوگ اس علاقے کا جائزہ بھی لے گئے ہوں گے۔ بہرحال خواہ وہ اس کو حادثہ ہی سمجھیں لیکن یہ سارا علاقہ ملٹری انٹیلی جنس کی نگاہ میں آگیا ہے۔ ہمیں کسی دوسری جگہ چلے جانا چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"کیا شہر کے قریب قریب کوئی دوسری جگہ تمہارے ذہن میں ہے؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کل کا تمہارا کیا پروگرام ہے اور خفیہ ملٹری پراجیکٹ کا مشن ہمیں کب اور کس مقام سے شروع کرنا ہوگا؟"

میں نے اسے کہا۔

"ڈوگرہ میجر کو میں نے ابھی اپنے زیر اثر اور اپنا محتاج ہی رکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ آتشی سانپ ابھی زندہ ہے اور جس وقت بھی اس کی بیوی ورشا سنگھ کے جسم سے میرے ہاتھ کی بو ختم ہو گئی۔ آتشی سانپ اسے آ کر ہلاک کر دے گا۔ چنانچہ وہ قدرتی طور پر میرا دست نگر اور میرا ہر حکم ماننے پر مجبور ہے۔ کل رات کو میں اس کے ہاں جاؤں گا۔ کیونکہ میں نے انہیں یہی کہا ہے کہ ورشا کے جسم میں میرے ہاتھ پھیرنے کا اثر صرف تین دن تک رہتا ہے۔ پرسوں تیسرا دن ختم ہو جائے گا۔"

شیر باز خان کہنے لگا۔

"یہ باتیں تو اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں اپنا کمانڈو آپریشن کب اور کس طرح شروع کرنا ہو گا۔ تم نے بتایا تھا کہ پہاڑیوں کے درمیان زیر زمین انڈین آرمی جو خفیہ پراجیکٹ تیار کر رہی ہے وہاں سے مردوں اور عورتوں کی چیخوں کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ فوجی انٹیلی جنس نے وہاں خفیہ عقوبت خانے بنائے ہوئے ہیں۔ جہاں سری نگر اور اس کے اردگرد کے علاقوں سے عورتوں اور خاص خاص کشمیری حریت پسندوں کو اغوا کر کے لے جایا جاتا ہے اور انہیں اذیتیں دے کر ان سے خفیہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اپنے ان کشمیری مجاہدوں کو وہاں سے نکالنا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی معلومات حاصل کرنی ہوں گی کہ زیر زمین ملٹری پراجیکٹ میں اور کیا کام ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے انڈین آرمی وہاں صرف ٹارچر سیل بنانے کے لئے زیر زمین کھدائی پر اتنا روپیہ خرچ نہیں کر رہی۔"

میں نے کہا۔

"یہ ساری معلومات مجھے اس خفیہ فوجی پراجیکٹ کا ڈائریکٹر جنرل ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ ہی دے سکتا ہے۔ میں کل ہی اس سے یہ راز معلوم کرنے کی

کوشش کروں گا۔"

شیر باز بولا۔

"حیدر علی! صرف کوشش نہیں کرنی بلکہ جلدی سے جلدی اس راز کو معلوم کرنا ہے اور اس بارے میں یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ وہاں کہیں بارودی سرنگیں تو زمین میں نہیں دبائی ہوئیں؟ اگر دبائی ہوئی ہیں تو وہ کونسا علاقہ ہے۔"

میں نے شیر باز خان کو تسلی دی کہ میں ڈوگرہ میجر سے جب تک یہ ساری معلومات حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک میں اسے اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا اور اس فرضی سانپ کو ہلاک نہیں کروں گا۔ جو موت بن کر اس کے اور اس کی بیوی ورشا کے سر پر سوار ہے۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے اسی پرانے ٹھکانے والے مکان میں بیٹھ کر کھایا۔ اس روز بھی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ باہر برف گرنا شروع ہو گئی۔ سری نگر اور کشمیر کے دوسرے نیم میدانی علاقوں میں اسی موسم میں برفباری شروع ہوتی تھی۔ شیر باز خان اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"میں جاتا ہوں۔ مجھے کسی دوسرے ٹھکانے کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ اگر میں نے کوئی انتظام کر لیا تو صبح صبح آ کر تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ ہم یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں اچھا ہے۔"

وہ گرتی برف میں چلا گیا۔

ساری رات برف گرتی رہی۔ شیر باز خان ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی کہ لمبے گرم کوٹ میں ملبوس سر پر چمڑے کی ٹوپی پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے آ گیا۔ وہ برف میں سفید ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں پر سے برف جھاڑی اور بولا۔

"تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ میں نے دوسری جگہ کا بندوبست کر لیا ہے۔"

میں اس وقت جوگی سادھوؤں والے لباس میں نہیں تھا۔ اس لباس کو
میں نے پلاسٹک کے ایک تھیلے میں ڈال رکھا تھا۔ اپنے دوست سانپ کو چنار کی
لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی ڈبی میں بند کرکے ساتھ لے لیا۔ جوگیوں والے کپڑوں کا
تھیلا بھی ساتھ لے لیا۔ گرم جیکٹ کے اوپر موم جامے کا بنا ہوا لمبا رین کوٹ یا
برساتی پہنی۔ سر پر کانوں تک بند اونی ٹوپی پہنی۔ چھڑی ہاتھ میں لی اور شیر باز
خان کے ساتھ پرانی کمین گاہ سے نکل پڑا۔

درخت برف میں سفید ہو رہے تھے۔ رات کافی برف گر چکی تھی۔
لیکن ابھی سرد ہوا نہیں چل رہی تھی اس لئے برف نرم تھی۔ سخت نہیں ہوئی
تھی۔ سخت برف پر چلنا بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اناڑی آدمی پھسل کر گر پڑتا
ہے۔ ایک تو سخت برف پر پھسلنے سے چوٹ بہت لگتی ہے دوسرے آدمی گر پڑے
تو اس کے لئے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک کوئی دوسرا آدمی اسے سہارا نہ
دے وہ برف سے نہیں اٹھ سکتا۔ اٹھتے اٹھتے دوبارا پھسل جاتا ہے۔ درختوں کے
نیچے کئی جگہوں پر برف نہیں تھی۔ ہم ان درختوں کے نیچے سے ہو کر چلے جا
رہے تھے۔ ٹیلے سے اتر کر ہم نیچے میدانی علاقے میں آ گئے۔ کچھ فاصلے پر سری
نگر جانے والی سڑک تھی۔ برفباری کی وجہ سے سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ کسی
کسی وقت کوئی لاری یا کوئی فوجی گاڑی گزر جاتی تھی۔ برف گرنا رک گئی تھی۔
جب تک برف گرتی رہے سردی کا احساس زیادہ نہیں ہوتا لیکن جب برف گرنی
بند ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہوا چلتی ہے تو سردی سے دانت بجنے لگتے ہیں۔
ہم نے برف پر سے گزر کر سڑک پار کی اور دوسری طرف کھیتوں میں آ گئے
اس فصل کی کٹائی ہو چکی تھی اور برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں آپ
کو نہیں بتاؤں گا کہ ہمارا دوسرا خفیہ ٹھکانہ سری نگر کے قرب و جوار میں کس
جگہ تھا۔ صرف اتنا بتاؤں گا کہ یہ ٹھکانہ زمین دوز تھا۔ یعنی ایک مکان کے نیچے
تہہ خانے میں تھا۔ یہ مکان کس کا تھا؟ یہ مکان کس جگہ واقع تھا؟ یہ باتیں میں

ظاہر نہیں کروں گا۔

"وہاں ہمارا ساتھی صمد بٹ بھی موجود تھا۔ دوپہر کو کچھ دوسرے کشمیری حریت پرست مجاہد بھی ہم سے ملنے آ گئے۔ ان سب کے چہروں پر جوش اسلام اور جہاد کشمیر کا نور جھلک رہا تھا۔ رات ہونے تک وہ سب ایک ایک کرکے اپنے اپنے مشن پر نکل گئے۔ تہہ خانے میں مقبوضہ بھارتی فوجیوں سے چھینا ہوا اسلحہ بھی موجود تھا۔ ضرورت کے مطابق حریت پرست دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے یہاں سے اسلحہ لے جاتے تھے۔ مجھے رات کے وقت ڈوگرہ میجر کے گھر جانا تھا مگر موسم خراب ہونے کی وجہ سے نہ گیا۔ ویسے بھی ابھی میجر کی بیوی ورشا سنگھ کے جسم سے میرے ہاتھ کی بو ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ میں اس سے اگلے روز جوگی سادھوؤں والا بھیس بدل کر ڈوگرہ میجر کے کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سردی کی وجہ سے میں نے اپنے سادھوؤں والے کھدر کے چولے کے اوپر پرانا موٹا گرم لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر کو کھدر کے موٹے تولیے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اس طرح سخت سردی سے کافی بچاؤں ہو گیا تھا۔ اس روز برف نہیں گر رہی تھی۔ برف میں ڈھکی ہوئی سڑک پر سے مجھے ایک لاری مل گئی جو سری نگر شہر کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ کنڈیکٹر نے مجھ سے ٹکٹ بالکل نہ لیا۔ جیسا کہ آپ کو اب تک معلوم ہو چکا ہو گا کہ بھارت میں لاریوں اور ٹرینوں میں جوگیوں اور نابینا لوگوں سے کرایہ نہیں لیا جاتا۔"

میں ایک خاص مقام پر جاکر لاری سے اتر گیا۔ یہاں سے ایک برف سے ڈھکا ہوا راستہ اوپر اس ٹیلے کی طرف جاتا تھا۔ جس کے عقب میں انڈین فوجی افسروں کے کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی ڈھلوان چھتیں بھی برف میں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوگرہ میجر ارجن سنگھ کے فوجی کوارٹر کے آگے برآمدے میں ایک نوکرانی پانی سے بھرا ہوا برتن لے کر آئی اور پانی باہر پھینک کر جانے لگی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور وہیں برتن برآمدے کے فرش پر رکھ کر

ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور بولی۔

"پدھاریئے مہاراج۔ صاحب جی تو ابھی دفتر گئے ہیں۔ بی بی جی گھر پر ہی ہیں۔"

میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم میں آتشدان تھا۔ اس میں آگ جل رہی تھی۔ فضا خوب گرم تھی۔ میں نے ٹوپی اور کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور اولکھ نرنجن کا نعرہ لگایا۔ اتنے میں بی بی ورشا ہاتھ باندھے کمرے میں داخل ہوئی اور میرے پاؤں چھو کر وہیں بیٹھ گئی۔

"مہاراج! آپ کی راہ تکتے میری آنکھیں تھک گئی تھیں۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی کہ آپ کے درشن ہو گئے۔ مہاراج! آج تیسرا دن ہے شام تک میرے جسم سے آپ کے پوتر ہاتھ کی خوشبو ختم ہو جائے گی۔ مجھ پر دیا کریں اور میرے جسم پر ہاتھ پھیر دیں تاکہ میں اگنی سانپ سے محفوظ ہو جاؤں۔"

میں نے ہنس کر اس کے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا۔

"ورشا رانی! پہلے ہمیں کافی پلاؤ۔ پھر تم سے بات کریں گے۔ یہ بتاؤ ارجن سنگھ تمہارا پتی دیو کہاں ہے؟"

مجھے نوکرانی کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر میں گیا ہوا ہے لیکن ورشا رانی سے پوچھنا بھی ضروری تھا۔ وہ بولی۔

"مہاراج! وہ تو ابھی تھوڑی دیر ہوئی آفس گئے ہیں۔ میں ابھی فون کر کے بلا لیتی ہوں۔"

وہ اٹھنے لگی تو میں نے اس کو بازو سے پکڑ کر وہیں بٹھا دیا۔

"نہیں نہیں ورشا رانی! ابھی ہمیں تمہارے پتی کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ہم صرف تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے مگر پہلے ہمارے لئے کافی منگواؤ۔ جلدی سے۔"

ورشارانی نے وہیں سے نوکرانی کو آواز دے کر کہا کہ جلدی سے کافی اور مٹھائی لے کر آؤ۔ پھر وہ ہاتھ باندھ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! آج کا دن تو اگنی سانپ مجھے ڈسنے نہیں آئے گا ناں؟"

میں نے اس کے لمبے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بالکہ! تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔ جب تک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں کوئی چنتا نہیں کرنی چاہئے۔ اٹھو اور ہمارے ساتھ صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

ورشارانی قالین پر سے اٹھ کر میرے بالکل ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ یہ لوگ جوگیوں' سنیاسوں کے پاس بیٹھنے' ان کے جسم کے ساتھ اپنا جسم لگانے کو معیوب نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو یہ سمجھتے ہیں بلکہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر کسی جوگی سنیاسی کے جسم کے ساتھ اپنا جسم لگ جائے تو ان کے سارے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ورشا نے اپنا جسم میرے جسم کے ساتھ اس طرح لگا رکھا تھا کہ مجھے اس کے جسم کی نرمی اور گرماہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے ورشارانی یعنی ڈوگرہ میجر کی بیوی سے کوئی جسمانی لالچ نہیں تھا۔ میرا یہ عقیدہ تھا اور آج بھی ہے کہ انسان کو ہر حالت میں اپنا کردار مضبوط اور پاک صاف رکھنا چاہئے۔ دوسرے کی بیوی اور ماں بہن کا احترام کرنا چاہئے خواہ وہ ہندو کی بیوی اور ماں بہن کیوں نہ ہو۔ ہماری جنگ بھارت کے فوجیوں اور ان انتہا پسند ہندوؤں سے تھی جو کشمیری مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ جنہوں نے زبردستی کشمیر پر قبضہ کر رکھا تھا اور جو بھارت کے مسلمانوں کے دشمن تھے اور ان کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتے تھے۔ ہمیں بھارت کے امن پسند سیدھے سادے ہندوؤں سکھوں سے کوئی بیر نہیں تھا۔ ان سے کوئی دشمنی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ورشارانی سے کہا۔

"ورشارانی! تم ایسا کرو کہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ اسی وقت اٹھ کر سامنے والے صوفے پر جا بیٹھی۔ یہ صوفہ بھی بالکل قریب تھا۔ اتنا قریب تھا کہ ورشا کے پاؤں کی ایک پنڈلی میری پنڈلی سے چھو رہی تھی۔ اس نے اپنی پنڈلی پیچھے نہیں کی تھی۔ خدا ہی جانے اس عورت کے دل میں کس قسم کا فتور اٹھ رہا تھا۔ نوکرانی کافی لے آئی۔ ورشارانی نے خود اٹھ کر میرے لئے کافی بنائی اور مجھے اپنے ہاتھ سے مٹھائی دیتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! یہ رس گلے میں نے خود بنائے ہیں۔"

میں نے ایک رس گلا لے لیا۔ کافی نے میرے جسم کو بڑا سکون پہنچایا۔ ورشا مجھے بڑی محبت اور عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں اس روز مجھے عقیدت اور محبت کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی نظر آ رہا تھا۔ میں اس جذبے کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر مجھے اس قسم کے جذبات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو اپنے ایک خاص مشن پر آیا تھا۔ یہ مشن جہاد کشمیر اور پاکستان کی سلامتی کا مشن تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ سری نگر کی نواحی پہاڑیوں کے درمیاں جو زیر زمین خفیہ فوجی پراجیکٹ بن رہا ہے۔ بلکہ بن چکا ہے وہاں ٹارچر سیل کے علاوہ اور کیا ہو رہا ہے اور اس پراجیکٹ کا اصل مقصد کیا ہے۔ میں نے کافی پیتے ہوئے ورشا سے کہا۔

"اس روز ہم تمہارے دشمن اگنی سانپ کی کھوج میں انڈرگراونڈ پراجیکٹ میں بھی گئے۔ مگر اگنی سانپ بڑا ہوشیار نکلا۔ میں اس کی بو سونگھتا اس کو ہلاک کرنے کے لئے اس کے پیچھے لگا تھا اور وہ میری بو پا کر مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

ورشا کہنے لگی۔

"مہاراج! یہ یم دوت اگنی ناگ کب تک میرا پیچھا کرتا رہے گا۔ مہاراج! مجھے اس کا خوف لگا رہتا ہے۔ رات کو نیند بھی نہیں آتی۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم چنتا نہ کرو ورشارانی! میں بہت جلد اگنی سانپ کو مار کر اس کی لاش کو ٹکڑے تمہارے سامنے لے آؤں گا۔"

ورشارانی خوش ہو کر بولی۔

"مہاراج! وہ شبھ دن کب آئے گا۔ مہاراج! میں آپ کی ہر قسم کی سیوا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ جو حکم کریں گے میں ویسا ہی کروں گی۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھیں۔"

میں نے اس کی معنی خیز پیش کش سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"ورشا! میں نے اس روز یہ محسوس کیا ہے کہ اگنی سانپ ان پہاڑیوں کی طرف زیادہ رہتا ہے۔ اب بھی وہ وہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔ جہاں ہماری فوج زمین کے اندر سرنگ بنا رہی ہے۔ تہہ خانے بنا رہی ہے۔ کیا وہاں کوئی مال گودام بنائے جا رہے ہیں؟"

ورشارانی نے دروازے کی طرف دیکھا جو بند تھا۔ پھر میرے قریب آ کر بولی۔

"مہاراج ! آپ کسی کو تو نہیں بتائیں گے ناں؟"

میں چوکس ہوگیا۔ میں نے بظاہر بڑی بے نیازی سے کہا۔

"بالکے! اری ہمارے من میں تو دیوتاؤں کے راز چھپے ہوئے ہیں۔ ہم کسی کو تمہاری بات بھلا کیوں بتائیں گے؟ تو جو کہنا چاہتی ہے بلا جھجک کہہ دے۔"

ورشا پر اس روز مجھے زیادہ سے زیادہ خوش کرنے اور اپنے قریب لانے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کا بھوت سوار تھا۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! ہمارے فوجی زمین کے اندر سرنگ میں زہریلی گیس کے بم بنا رہے ہیں۔ ارجن جی کہتے تھے کہ یہ بم اتنے خطرناک ہوں گے کہ صرف چار بم

مارے آزاد کشمیر کے لوگوں کو موت کی نیند سلا دیں گے۔ مہاراج! میرے پتی کو اس کا پاپ کو نہیں لگے گا؟ وہ تو بھارت کی سرکار کے کہنے پر یہ بم بنانے والوں کی نگرانی کر رہا ہے۔"

یہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ انڈین آرمی اس زیر زمین پراجیکٹ میں کسی خفیہ منصوبے پر کام کر رہی ہے۔ میں نے ورشا سے کہا۔

"تمہارے پتی کو اس کا کوئی پاپ نہیں لگے گا۔ وہ تو سرکار کے کہنے پر ایسا کر رہا ہے۔ سارا پاپ تو سرکار کو لگے گا۔"

یہ میں نے ورشارانی کو اس لئے کہا تھا کہ کہیں وہ گھبرا کر اپنے خاوند کو یہ نہ کہنا شروع کر دے کہ اس خطرناک منصوبے پر کام کرنا چھوڑ دو۔ تمہیں پاپ ہوگا اور میجر کے کریدنے پر کہیں وہ یہ نہ کہہ دے کہ مجھے مہارج نے کہا تھا۔ اس طرح میجر ارجن سنگھ کو مجھ پر شک پیدا ہو سکتا تھا کہ آخر میں اس قسم کی باتیں اس کی بیوی سے کیوں پوچھ رہا تھا۔ میرے پیچھے پہلے ہی ملٹری انٹیلی جنس لگی ہوئی تھی اور بہت ممکن تھا کہ یہ بات میجر کے علم میں ہو کہ میرا پیچھا کیا جا رہا ہے اور وہ اس لئے خاموش ہو کہ ملٹری انٹیلی جنس کو اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے میں سچ مچ دشمن ملک کا جاسوس نکل آؤں۔ چنانچہ میں نے میجر کی بیوی کو پورا اطمینان دلا دیا کہ زمین کے نیچے جس پراجیکٹ میں زہریلی گیس کے بم بنائے جا رہے ہیں۔ اس کے لئے دیوتا ارجن سنگھ سے ناراض نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں کہ وہ ہندو دھرم کے دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے کام کر رہا ہے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ ورشا بالکل مطمئن ہوگئی تو میں نے اس سے کہا۔

"اس بات کا ذکر اپنے پتی میجر ارجن سے مت کرنا کہ تم نے مجھ سے زہریلی گیس کے بارے میں بات کی تھی۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"مہاراج! میں پاگل ہوں جو ایسی بات کروں گی۔ ارجن جی نے بھی مجھے قسم دے کر کہا تھا کہ کسی سے بات نہ کرنا لیکن میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا۔ اس لئے کہ آپ منش نہیں ہیں۔ میرے لئے دیوتا کے برابر ہیں۔"

میں نے کہا۔

"شاباش بالکہ! تو بڑی دھنوان ہے۔ تیرا اگلا جنم آکاش کی اپسرا کا ہو گا۔"

ورشا نے خوش ہو کر میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔

"مہاراج! آپ سچ مچ بھگوان شیو کے اوتار ہیں۔ مجھے اپنی بالکہ بنا لیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں ساری زندگی آپ کی سیوا کروں گی۔"

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ورشارانی! تم اپنے گھر میں رہ کر اپنے پتی کی سیوا کرو۔ تمہارا پتی ہی تمہارا دیوتا ہے۔ ہم کسی غیر مرد کی عورت کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ اس کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔"

نوکرانی برتن اٹھانے اندر آئی تو ورشارانی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ جب مہاراج میرے پاس بیٹھے ہوں۔ تو اندر مت آیا کرو۔ چلی جاؤ۔"

نوکرانی الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ مجھے ورشارانی کی نیت میں فتور نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے اور قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ بات مجھے گوارا نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ بات میرے مشن کے خلاف تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ورشارانی! آج تیسرا دن ہے۔ ہم تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر کر اپنے ہاتھ کی بو تمہارے بدن میں داخل کرتے ہیں تاکہ اگلے تین دنوں تک تم اگنی سانپ کے حملے سے محفوظ ہو جاؤ۔"

ورشارانی نے ساڑھی شانوں پر سے اتار دی۔ کہنے لگی۔
"مہاراج! میں چاہتی ہوں آپ میرے سارے بدن پر ہاتھ پھیر دیں۔ اس طرح سے میرے سارے پاپ بھی جھڑ جائیں گے۔"
میں نے جلدی سے کہا اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔
"نہیں ورشارانی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنا میں ہاتھ پھیرتا ہوں۔ تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب ہم جاتے ہیں۔ دو دن بعد آئیں گے۔"
میں چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ورشا تو میرے آگے بچھنے لگی۔
"مہاراج! تھوڑی دیر اور بیٹھیں۔ آج میرا من آپ سے بہت باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔"
میں جانتا تھا وہ مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میرے پاس اس کی باتیں سننے کے لئے نہ وقت تھا اور نہ اس قسم کی باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے کہا۔
"ورشارانی! ہم اب رک نہیں سکتے۔"
اور میں اولکھ نرنجن کا ہلکا سا نعرہ لگا کر کمرے سے نکل گیا۔
اپنی نئی کمیں گاہ میں واپس آیا تو کمانڈو شیر باز خان وہاں بیٹھا کچھ حریت پسند کشمیری مجاہدوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مجاہدوں کو کچھ ضروری ہدایت دیں اور انہیں رخصت کر دیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔
"حیدر علی! دوست کوئی نئی خبر لائے ہو کیا؟"
میں نے کہا۔
"پہلے مجھے یہ سادھوؤں والا لباس اتار لینے دو۔ پھر بات کریں گے۔"
میں نے وہ لباس اتار کر اپنے گرام کپڑے یعنی جیکٹ پتلون وغیرہ پہنی اور کمانڈو شیر باز کے سامنے پرانے قالین پر بیٹھ گیا۔ تہہ خانہ میں سردی بہت

معمولی تھی۔ میں نے کہا۔

”کمانڈو شیرباز! مجھے میجر ارجن سنگھ کی بیوی کی زبانی جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ تم سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے؟“

”خدا کے لئے جلدی بتاؤ۔“

کمانڈو شیر باز کا اشتیاق بڑھ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

”ڈوگرہ میجر کی بیوی نے بتایا ہے کہ اس زیر زمین پراجیکٹ میں انڈین ملٹری کے زیر نگرانی زہرلی گیس تیار کی جا رہی ہے۔“

کمانڈو شیر باز کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ زہریلی گیس سے مطلب اعصابی گیس ہی ہو سکتا ہے اور اعصابی گیس تیار کرنا تو اقوام متحدہ کے بین الاقوامی قوانین کے خلاف ہے۔“

میں نے کہا۔

”شیر باز خان! اقوام متحدہ کی بھارت نے کب پروا کی ہے۔ اقوام متحدہ کے ریزولیوشن کے تحت تو بھارت نے خود تسلیم کیا تھا کہ وہ کشمیر میں رائے شماری کرائے گا لیکن وہ تو ایک بیکار ادارہ ہے۔ میجر کی بیوی کی اطلاع غلط نہیں ہے۔ زیر زمین پراجیکٹ میں ضرور اعصابی گیس تیار کی جا رہی ہے۔ جس کی مدد سے وقت آنے پر بھارت آزاد کشمیر پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ اعصابی گیس وہ پاکستان کے خلاف بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ ہمیں یہ پراجیکٹ ہر حالت میں تباہ و برباد کرنا ہوگا۔“

کمانڈو شیر باز خان کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نمایاں تھے۔ کہنے لگا۔

”میرے آدمیوں کی لائی ہوئی اطلاعات کے مطابق اس پراجیکٹ کے دونوں خفیہ دہانوں پر رات کے وقت اوپر سے نیچے فولادی شٹر گرا دیئے جاتے

ہیں۔ ان فولادی چادروں پر گولی اور بم کا دھماکہ بھی کوئی اثر نہیں کرتا۔ اس کے باوجود پر دونوں بند دروازوں پر مسلح گارڈ موجود ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے دن کے وقت ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ ہمیں رات کے وقت ہی شب خون مار کر سرنگ کے اندر جانا ہوگا۔ تم میجر کی بیوی کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ زیر زمین پراجیکٹ کے اندر جانے کا اگر کوئی خفیہ راستہ ہے تو وہ راستہ کس طرف سے اندر جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی خفیہ راستہ ضرور ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"اگر کوئی خفیہ راستہ وہاں پر ہے تو میں اس کی پوری رپورٹ لا کر تمہیں دوں گا۔ ایک اور بات بھی معلوم ہوئی ہے مگر اس بارے میں تم پہلے ہی سے جانتے ہو کہ اس پراسرار زیر زمین پراجیکٹ میں تین چار ٹارچر سیل بھی ہیں۔ جہاں ہمارے کشمیری مجاہدوں اور اغوا کی ہوئی کشمیری خواتین کو اذیتیں دی جاتی ہیں اور ان سے خفیہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"اگر ہم زیر زمین پراجیکٹ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو سب سے پہلے اپنے مجاہدوں کو رہا کرائیں گے۔ اس کے بعد دوسرا کمانڈو آپریشن شروع کریں گے۔"

میں نے شیر باز سے کہا کہ میں اب ایک دن بعد ڈوگرہ میجر کے گھر جا رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

"ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے تم کل ہی وہاں جاؤ اور ضروری معلومات حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرو۔"

اس رات میں نئی تہہ خانے والی کمیں گاہ میں ہی سویا۔ سونے سے پہلے دیر تک دماغ میں مختلف سکیموں پر غور کرتا رہا کہ مجھے کس طرح ڈوگرہ میجر کی بیوی سے یہ معلومات حاصل کرنی چاہئیں کہ اسے اور اس کے خاوند کو بھی ذرا سا شک نہ ہو۔ یہ بڑا نازک کام تھا۔ یہ معلومات ڈوگرہ میجر کی بیوی نے اپنے خاوند سے حاصل کرنی تھیں اور وہ انٹیلی جنس کا فوجی آفیسر تھا۔ اسے شک پڑنے کا خدشہ موجود تھا۔ آخر ایک ترکیب اچانک میرے ذہن میں آگئی اور میں مطمئن ہو کر سو گیا۔ کمانڈو شیر باز خان میرے قریب ہی قالین پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے رات کے پچھلے پہر ایک اہم کمانڈو مشن پر جانا تھا۔

وہ رات کے پچھلے پہر چلا گیا۔ میں جب اٹھا تو وہ موجود نہیں تھا۔ صمد بٹ اوپر سے سیڑھیاں اتر کر نیچے تہہ خانے میں آیا۔ میں نے اس سے وقت پوچھا۔ وہ بولا۔

"صبح کے آٹھ بج رہے ہیں۔ باہر برف گر رہی ہے۔"

جن علاقوں میں برفباری ہوتی ہے وہاں صبح کے سات بجے بڑی سویرے کا وقت ہوتا ہے۔ صمد بٹ میرے لئے کشمیری چائے لایا تھا۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر کمبل کاندھوں پر لے کر چائے پینے اور صمد بٹ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کو ہمارے مشن کا علم تھا لیکن ہم جو اس کھیل میں چھوٹی چالیں چل رہے تھے اور سکیمیں لڑا رہے تھے ان کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔ ہم اسے بتانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہ ساری باتیں صرف مجھ تک

اور کمانڈو شیرباز خان تک ہی محدود تھیں۔ صمد بٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

وہ ہمارا ساتھی مجاہد تھا لیکن بعض باتیں ہمیں اپنے ساتھی مجاہدوں سے بھی مخفی رکھنا پڑتی تھیں۔ میں نے کہا۔

"پراجیکٹ کے بارے میں پوری معلومات ابھی حاصل نہیں ہوئیں۔ کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج پھر میجر کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"اللہ کامیاب کرے تمہیں۔ یہ کوئی بڑا خطرناک قسم کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"سب پتہ چل جائے گا۔ جب پورا پتہ چل جائے گا تو اسے تباہ کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں کریں گے۔"

میں نے دن کے پورے نو بجے تیاری شروع کر دی۔ جوگی سادھوں والا بھیس بنایا اور صمد بٹ سے کہا۔

"کمانڈو شیرباز آئے تو اسے کہنا یہیں ٹھہرے۔ میں دوپہر کو نہیں تو شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے واپس آ جاؤں گا۔"

میں نے ایک کام صمد بٹ کی آنکھ بچا کر کیا تھا۔ وہ کام یہ تھا کہ میں نے اپنے دوست سانپ والی لکڑی کی چھوٹی ڈبی اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ آج مجھے اپنے دوست سانپ سے پھر ایک بڑا اہم کام لینا تھا۔ میں جس وقت خفیہ کمیں گاہ کے تہہ خانے سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی۔ کل پرسوں کی گری والی برف سخت ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ میں لوہے کا ترشول تھا جس کے سہارے میں بڑی احتیاط سے سخت اور پھسلواں برف پر قدم جما کر چل رہا تھا۔ یہ سری نگر شہر کے مضافات کا علاقہ تھا۔ کوئی دور افتادہ پہاڑی مقام نہیں تھا کہ جہاں برف باریوں میں ویرانی چھا جاتی ہے۔ یہاں ٹریفک اور شہر کا کاروبار برفباری میں

بھی جاری رہتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر آنے کے تھوڑی دیر بعد مجھے بس مل گئی جس نے مجھے میرے خاص مقام تک پہنچا دیا۔

اس مقام پر میں بس سے اتر کر میجر ارجن سنگھ کے فوجی کوارٹر کی طرف چلنے لگا۔ یہاں فوجی بل ڈوزروں نے چلنے کے لئے اور فوجی گاڑیوں کے لئے برف صاف کرکے چھوٹے چھوٹے راستے بنا دیئے تھے۔ میں ان پر سے گزرتا ہوا ڈوگرہ میجر کے کوارٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دوسری بار گھنٹی دینے سے نوکرانی نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ دیئے۔

"مہاراج اندر آ جائیں۔"

ڈوگرہ میجر کی پتنی ڈرائنگ روم میں نہیں تھی۔ نوکرانی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میں نے ورشارانی کا پوچھا تو وہ بولی۔

"بی بی جی نہا رہی ہیں۔ آپ تشریف رکھیں مہاراج میں انہیں خبر کر دیتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اتنی جلدی نہیں ہے اسے نہا لینے دو۔"

سانپ کی خالی ڈبی میری جیب میں تھی۔ سانپ کو میں نے فوجی افسروں کے کوارٹروں کے علاقے میں داخل ہوتے ہی ایک جگہ درختوں کے نیچے نشیب میں چھوڑ دیا تھا۔ راستے میں اپنے دوست سانپ سے باتیں کرتا آیا تھا اور اسے اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ اس کا مشن کیا ہے۔ اسے چھوڑنے سے پہلے بھی اسے کہہ دیا تھا۔

"دوست! جس طرح میں نے کہا ہے اسی طرح کرنا۔ کشمیر کے جہاد کے اپنے طور پر تم بھی ایک جانباز سپاہی ہو۔ تم بڑی سخت سردی میں باہر رہو گے۔ مجھے اس کا احساس ہے مگر تمہیں یہ کام اپنی ڈیوٹی سمجھ کر کرنا ہوگا۔ او کے۔"

میں صوفے پر بیٹھا سامنے دیوار پر لگی فریم والی پنڈت نہرو اور

اندراگاندھی کی تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے پنڈت نہرو کی تصویر کو مخاطب
کر کے دھیمی آواز میں کہا۔

"پنڈت جی! اگر آپ نے اقوام متحد کی قرارداد پر عمل کرتے ہوئے
کشمیر میں ریفرنڈم یا انتخابات کرا دیئے ہوتے تو آج کشمیر آزاد ہوتا۔ نہ مجھے
سادھو کا بھیس بدل کر یہاں آنا پڑتا اور نہ تمہارے فوجی یہاں مجاہدوں کے
ہاتھوں چیونٹیوں کی طرح مرتے۔"

کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد ورشارانی بالوں کو تولیے سے رگڑتی اندر
داخل ہوئی۔ اس نے گرم کشمیری گاؤن سے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ
اس نے گاؤن کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا اور میرا سن کر کپڑے پہنے بغیر ہی صرف
گاؤن سے بدن ڈھانپ کر میرے پاس آ گئی ہے۔ اس کے آنے سے کمرے کی
فضا میں ولایتی پرفیوم سپرے کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیل گئی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے
مجھے پرنام کیا اور میرے قدم چھو کر وہیں قالین پر بیٹھ گئی۔ اس کے گاؤن کا کمر
بند کھل گیا۔ میں نے دیکھا یا ورشارانی نے خود مجھے دکھایا کہ گاؤن کے نیچے وہ
عریاں ہے۔ مجھ پر اس کی اس حرکت کا کچھ زیادہ اثر نہ ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ
میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں۔ آخر مرد تھا۔ مجھ پر تھوڑا سا اثر ہوا۔ جذبات میں ہل
چل سی مچی لیکن میں نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ جب کوئی عظیم مقصد
سامنے ہو تو بلند کردار والا انسان اس قسم کی حقیر باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔
جس طرح میدان جنگ میں لڑتا ہوا سپاہی لاشوں کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ میں
کوئی بلند کردار والا انسان نہیں ہوں لیکن میرا مشن بڑا بلند تھا۔ مجھے اپنے مشن
کے تقدس کا ہر لمحے احساس رہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ورشارانی کی ترغیبات جنسی کو
نظر انداز کر دیا اور اس سے کہا۔

"بالکہ! جاؤ جا کر کپڑے پہنو۔ پھر میرے پاس آؤ۔ ہمیں تم سے آج
ایک بڑی ضروری بات کرنی ہے۔"

ورشارانی مجھ سے ڈرتی بھی تھی۔ فورا" اٹھ کر چلی گئی۔ آتش دان میں رات کی جلی ہوئی آگ کی تپش ابھی باقی تھی۔ جس سے کمرے کی فضا باہر کی سخت سرد فضا کے مقابلے میں گرم تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں اپنے دوست سانپ کو سخت سردی میں باہر چھوڑ آیا ہوں۔ پھر یہ خیال آگیا کہ سانپ کا خون انتہائی گرم تاثیر رکھتا ہے۔ سانپ انتہائی سردی بھی آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔ پھر اگر سانپ برف کے اندر گھس جائے تو وہ سردی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

چونکہ میں نے ورشا سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس لئے وہ جلدی کپڑے پہن کر آ گئی۔ اس نے فوراً گرم لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ آکر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ورشارانی! تمہیں اگنی سانپ سے ہمیشہ کے لئے نجات مل سکتی ہے۔"

ورشا کا چہرہ کھل اٹھا۔ کہنے لگی۔

"مہاراج پلیز! مجھے اس دشمن سانپ سے مکت کر دیں۔ میں آپ کی سارے جیون آدھاری رہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"اس کے لئے تمہیں بڑی رازداری سے کام لینا پڑے گا۔ کیا تو اس کے واسطے تیار ہے؟"

وہ بولی۔

"مہاراج! آپ جو کہیں گے میں کروں گی۔ میں رازوں کو چھپانا جانتی ہوں۔ آپ حکم کریں مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"سن ورشارانی! کل میں نے اپنے گورو جی کا چلہ کیا تھا۔ گورو جی نے

ظاہر ہو کر مجھے ایک خاص منتر بتایا ہے۔ اس منتر کو پڑھ کر پھونکنے سے تمہارا
دشمن اگنی سانپ میرے قبضے میں آ جائے گا۔ یہ تماشہ تم اپنی آنکھوں کے سامنے
دیکھو گی۔ لیکن یہ منتر پھونکنے کے واسطے مجھے اس جگہ پر جا کر بیٹھنا ہو گا جہاں
حویلی کے نیچے اگنی سانپ اس وقت چھپا ہوا ہے۔"

ورشا بے چین ہو کر بولی۔

"مہاراج! میرا دشمن سانپ کہاں چھپا ہوا ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہی وہ بات ہے جس کو راز سمجھ کر تمہیں چھپانا ہو گا۔ اگر تم نے یہ
راز اپنے خاوند یا کسی دوسرے شخص پر ظاہر کر دیا تو اگنی سانپ پھر میرے ہاتھ
سے بھی نکل جائے گا۔ پھر میرے ہاتھ کی بو بھی اسے تمہارے پاس آنے سے
نہیں روک سکے گی۔ وہ فوراً آ کر تم جہاں کہیں بھی ہو گی تمہیں ڈس لے گا اور
تم جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔"

ورشا ڈر گئی۔ ہاتھ باندھ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! میں بھگوان کرشن کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں یہ راز کسی
کو نہیں بتاؤں گی۔ اپنے پتی دیو ارجن کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ آپ حکم کریں۔"

جب میں نے دیکھا کہ وہ سیدھی راہ پر آ گئی ہے تو اسے کہا۔

"ورشا رانی! تمہارا دشمن اگنی سانپ اس وقت اس سرنگ کے نیچے
زمین کے اندر چھپا ہوا ہے جہاں ہمارے انڈین فوجی تمہارے پتی میجر ارجن کی
نگرانی میں زہریلی گیس کے پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ یہ بات مجھے اگنی سانپ
کے ایک دشمن سانپ نے بتائی ہے۔ جس کو میں نے گورو جی کا منتر پڑھ کر اپنے
سامنے بلا لیا تھا۔ یہ چھوٹا سانپ اگنی سانپ کا دشمن ہے اور چاہتا ہے کہ میں
اسے ہلاک کر دوں۔ میں ابھی تمہارے سامنے اس چھوٹے اور اگنی سانپ کے
دشمن سانپ کو بلاتا ہوں۔"

اس حرکت سے میں ورشا پر صرف اثر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے ورشا سے کہا۔

"میں سانپ کو بلانے کا منتر پڑھنے لگا ہوں۔ چھوٹا سا سانپ یہاں حاضر ہو جائے گا۔ اس سے ڈر کر بھاگنا نہیں۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ یہ چھوٹا سانپ اگنی سانپ کا دشمن ہے۔ یہ تمہارا دشمن نہیں ہے۔ میں منتر پڑھتا ہوں۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور یونہی بڑبڑانے لگا۔ ظاہر یہ کیا کہ میں کوئی منتر پڑھ رہا ہوں۔ میں کوئی ایک منٹ تک منتر پڑھتا رہا۔ پھر میں نے آنکھیں کھول کر ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف منہ کر کے تین بار پھونک ماری۔ ساتھ ہی ہلکی سی سیٹی کی آواز بھی نکالی اور اٹھ کر دروازے کو تھوڑا سا کھول دیا تاکہ میرے دوست سانپ کو اندر آنے میں آسانی ہو۔ اسے کوئی راستہ تلاش نہ کرنا پڑے۔ میں واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ورشا نے پاؤں زمین پر سے اوپر صوفے پر کر لئے اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ دروازے کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اور دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اے میرے مولا! اس سانپ کو حکم دے کہ وہ میرے پاس آ جائے۔ ہمیں اس طرح ساکت بیٹھے اور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے تین چار منٹ گزر گئے۔ سانپ اصل میں دوسری طرف میں نے چھوڑا تھا۔ اسے چکر کاٹ کر آنا پڑا تھا۔ چار منٹ کے بعد ڈرائنگ روم کے دروازے کی دہلیز پر میں نے سانپ کے سر کو دیکھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ورشا سے کہا۔

"ورشارانی! تمہارے دشمن سانپ کا دشمن اور تمہارا دوست چھوٹا سانپ آ گیا ہے۔"

اس نے میرے دوست سانپ کو دروازے کی دہلیز سے سے رینگ کر کمرے میں آتے دیکھا تو اس کے حلق سے خوف کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے کہا۔

"ارو نہیں ورشا! یہ تمہارا دوست سانپ ہے۔ اس نے مجھے جاسوس
بتایا ہے کہ تمہارا دشمن اگنی سانپ اس وقت زیر زمین سرنگ کے نیچے
بیٹھا ہے۔"

میرا دوست سانپ قالین پر رینگتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے
کر اس نے اپنی عادت کے مطابق سر کو جھکا کر میری تعظیم کی اور کنڈلی
کیا۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے ہمارے دوست ہمارے متر سانپ! میں اور ورشارانی تیرے شکر
گزار ہیں۔ تیرے دھنوادی ہیں کہ تو نے ہمیں ہمارے دشمن اگنی سانپ کا ٹھکانہ
بتایا۔ اب میں اس سانپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آ جا! میرے پاس آ جا۔ باہر
سردی ہے۔ برف گر رہی ہے۔ تو سردی سے ٹھٹھر جائے گا۔ میرے پاس آ
جا۔"

میرا دوست سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میرے صوفے کے قریب آ
گیا۔ میں نے اسے بڑے آرام سے اٹھا لیا اور اس کے سر پر پیار کی انگلی رکھ
دیا۔

"چل میرے چولے میں گھس کر آرام کر۔ جب میں یہاں سے جاؤں گا
تو تمہیں تمہارے ٹھکانے پر چھوڑ دوں گا۔"

میں نے سانپ کو جیب میں رکھ لیا۔ ورشارانی پر میرے اس ڈرامے کا
زبردست اثر ہوا تھا۔ وہ ابھی تک دہشت زدہ تھی۔ جب میں نے سانپ کو
جیب میں ڈال لیا تو اس نے ٹانگیں صوفے سے نیچے کر لیں اور سہمی ہوئی آواز
میں بولی۔

"مہاراج! اب مجھے پورا وشواش ہو گیا ہے کہ مجھے میرے دشمن اگنی
سانپ سے مکتی مل جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"لیکن اس کے لئے تمہیں ایک کام کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر ہم اگنی سانپ کو نہیں مار سکتے۔"

ورشارانی نے کہا۔

"مہاراج! آپ حکم کریں۔"

میں نے کہا۔

"مجھے رات کے وقت اس جگہ بیٹھ کر اپنے گورو جی کا منتر پڑھ کر پھونکنا ہو گا جہاں ہمارے فوجی زمین کے اندر سرنگ میں کام کر رہے ہیں۔ یہ سانپ میرے ساتھ ہو گا۔ جب میں منتر پڑھ کر پھونکوں گا تو تمہارا دشمن اگنی سانپ تڑپتا ہوا زمین سے باہر نکل کر میرے سامنے آ جائے گا اور ناچنا شروع کر دے گا۔ ناچتے ناچتے جب وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ تو میں اس پر یہ سانپ چھوڑ دوں گا۔ یہ سانپ اسے ڈس دے گا۔ اس کے زہر کے اثر سے اگنی سانپ کے جسم میں آگ لگ جائے گی اور وہ جل کر بھسم ہو جائے گا اور تمہیں تمہارے دشمن سانپ سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہاں میری سوا دوسرا کوئی نہ ہو۔ اس لئے مجھے آدمی رات کو وہاں جانا پڑے گا۔"

ورشارانی بڑے غور سے میری باتیں سن رہی تھی۔ جب میں نے گفتگو ختم کی تو اس نے پوچھا۔

"مہاراج! مجھے حکم کریں۔ میں کیا سیوا کر سکتی ہوں؟"

جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کے اس خفیہ راستے والی سرنگ کے دہانے کو بھی رات کے وقت آہنی شٹر گرا کر بند کر دیا جاتا ہے اس وقت سے ہمیں یہ پریشانی تھی کہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں داخل ہونے کے لئے کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا چاہئے۔ ہمیں یقین تھا کہ زیر زمین پراجیکٹ کا کوئی ایمرجنسی گیٹ انہوں نے ضرور رکھا ہو گا۔ میں نے ورشارانی سے کہا۔

"میں یہ بات تمہارے پتی ارجن سنگھ سے بھی معلوم کر سکتا تھا مگر یہ راز صرف تمہارے اور میرے درمیان ہی رہنا چاہئے۔ اگر کسی تیسرے کو یہ راز معلوم ہوگیا۔ تو اگنی سانپ پر میرے منتر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے تم خود اپنے پتی میجر صاحب سے کسی طریقے سے معلوم کرو کہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کا ایمرجنسی راستہ کونسا ہے اور کہاں پر ہے۔ میں آدھی رات کو اسی راستے سے سرنگ میں جا کر چلہ کروں گا اور منتر کے ذریعے تمہارے دشمن اگنی سانپ کو زمین کے اندر نکال کر اسے بھسم کر دوں گا۔"

ورشارانی یعنی ڈوگرہ میجر کی بیوی پڑھی لکھی تھی۔ وہ میری بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ چونکہ ہر ہندو عورت کی طرح وہ بھی بے حد ضعیف الاعتقاد تھی اور پھر میرا سانپ ڈرامہ بھی دیکھ چکی تھی۔ اس لئے اس کا خیال اس طرف جا ہی نہیں سکتا تھا کہ میں اس کے ساتھ کوئی فراڈ بھی کر سکتا ہوں۔ کہنے لگی۔

"گوروجی! آپ فکر نہ کریں۔ میں آج ہی ارجن جی سے یہ ساری باتیں معلوم کر لوں گی۔"

میں نے اسے ایک بار پھر تاکید کی۔

"لیکن بالکے! تمہارے پتی کو یہ ہرگز معلوم نہ ہو کہ یہ سب کچھ تم مجھے بتانے کے لئے پوچھ رہی ہو۔ نہیں تو اگنی سانپ سے تمہیں کبھی نجات نہیں مل سکے گی۔ وہ کسی بھی وقت آ کر تمہیں ڈس کر ہلاک کر دے گا۔"

ورشا نے دونوں ہاتھ کانوں سے لگا کر کہا۔

"مہاراج میں پاگل ہوں جو اپنے پاؤں پر کلہاڑا ماروں گی۔"

اس کے بعد میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد دوسرے دن صبح آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے واپس آگیا۔ شیر باز خان نے یہ ساری باتیں سنیں تو میری کارکردگی پر بہت حد تک مطمئن ہوگیا۔ وہ کہنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے یہ عورت اپنے خاوند سے یہ تمام باتیں معلوم کر سکے گی؟ کیا اس کا خاوند اسے انڈگراؤنڈ فوجی پراجیکٹ کا ایمرجنسی راستہ بتا دے گا؟"

میں نے کمانڈ شیر باز سے کہا۔

"دوست! میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ عورت اگر چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ عورت نے تو تاریخ کے رخ پلٹ دیئے ہیں۔ ورشا یہ راز معلوم کرے گی۔ یہ اس کی زندگی موت کا سوال بھی ہے۔ اس کے علاوہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں کوئی ایمرجنسی گیٹ یا فائر اسکیپ ضرور رکھا گیا ہوگا اور اس قسم کے ہنگامی دروازوں پر دروازے نہیں لگائے جاتے۔"

جب میں اگلے روز ڈوگرہ میجر کے کواٹر میں پہنچا میں معلوم ہوا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے ایک ضروری کانفرس میں شرکت کرنے کے واسطے نئی دلی چلا گیا ہے۔ گھر میں اسکی پتنی ورشا اکیلی تھی اور میری راہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرے قدم چھوئے اور میرے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ آتشدان میں آگ نہیں جل رہی تھی مگر بجلی کا ہیٹر گرم تھا جس سے ڈرائنگ روم کی فضا میں باہر والی سخت سردی نہیں تھی۔ برف باری رکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی۔

میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ورشارانی سے اصل مقصد کی بات کی تو وہ میری طرف دیکھ کر عجیب نظروں سے مسکرائی۔ میں تین چار دنوں سے اس کے انداز کچھ بدلے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک تو وہ اپنی زندگی بچانے کی خاطر مجھے ہر طرح خوش کرنا چاہتی تھی۔ دوسرے میں روایتی سادھوؤں کی طرح بدشکل اور بھوت نما آدمی نہیں تھا۔ بھرپور جوان تھااور خوش شکل بھی تھا۔ ورشارانی نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"کیا بات ہے ورشا رانی! تم مسکرا کیوں رہی ہو؟"

وہ بولی۔

"مہاراج! آپ میرے واسطے دیوتا سمان ہیں۔ میں اپنے دیوتا کو دیکھ کر خوش کیوں نہ ہوؤں؟"

میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے اپنے خاوند سے وہ باتیں معلوم کی ہیں۔ جو میں نے تمہیں کہیں تھیں؟"

وہ بولی۔

"میں نے سب کچھ معلوم کر لیا مہاراج مگر ایک چھوٹی سی عرض ہے۔ بنتی ہے۔ آپ اسے ضرور سوئیکار کریں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے میرے پاؤں پکڑ کر کہا۔

"مہاراج! میرے پتی دیو دلی گئے ہوئے ہیں۔ مجھے رات کو اکیلی ڈر لگے گا کہ کہیں اگنی سانپ آ کر مجھے ڈس نہ لے۔ آپ کرپا کر کے آج کی رات میرے ہاں ٹھہر جائیں۔ کل سے میجر صاحب کے اردلی کی بیوی میرے پاس آ کر رات کو رہا کرے گی۔ آپ صرف ایک رات کا کشٹ اٹھا لیجئے۔ میری خاطر۔ آپ ہوں گے تو مجھے سانپ سے ڈر نہیں لگے گا۔"

میں نے کہا

"کوئی بات نہیں ہم آج کی رات تمہاری رکھوالی کریں گے لیکن ہمیں بتاؤ کہ تمہیں ارجن جی نے انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

وہ شرارت سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے اور بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"مہاراج! وہ تو میں آپ کو رات ہی کو بتا دوں گی۔"

اور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی۔

"میں آپ کے لئے کافی بنواتی ہوں۔ مٹھائی بھی لاتی ہوں۔"

میں نے ورشا کو قابو کرنے کے لئے پورا جال پھیلایا ہوا تھا اور اس نے مجھے اپنے پھندے میں پھنسانے کے لئے مجھ پر جال پھینک دیا تھا۔ جب وہ واپس آئی تو ہاتھ میں برفی اور امرتیوں سے بھری ہوئی تھالی تھی۔ وہ بڑے پیار سے میرے سامنے آ کر قالین پر بیٹھ گئی اور تھالی میری طرف بڑھا کر بولی۔

"مہاراج! تھوڑا کھا لیجئے۔ امرتیاں بڑی تازہ ہیں۔ میں نے صبح ہی بنائی تھیں۔"

میں اس کے بچھائے ہوئے جال سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"مورکھ لڑکی! ہمیں ابھی ساری بات بتا دے ہم رات کو کسی کے گھر نہیں ٹھہرکرتے۔"

وہ بڑی ادا کے ساتھ بولی۔

"مگر مہاراج! آپ رات کو میرے ہاں ٹھہرنے کا وچن دے چکے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ جب سادھو سنت کوئی وچن دیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"مگر ورشا رانی! تیرا پتی گھر پر نہیں ہے۔"

وہ بے دھڑک ہو کر بولی۔

"پھر کیا ہوا مہاراج! آپ بھی تو میرے لئے پتی سمان ہیں۔"

یقین کریں میں اس عورت کی بے باکی پر حیران بھی ہوا اور شرم سے پانی پانی بھی ہوگیا۔ اس سے خفیہ فوجی پراجیکٹ کے ایمرجنسی دروازے کے بارے میں معلومات حاصل کرنی بھی ضروری تھیں بلکہ یہ میرے مشن کا اہم حصہ تھا۔ میں اس کے گھر رات رہنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں اس سے وعدہ کر چکا

تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ سادھو سنت وعدے سے کبھی نہیں پھرتے۔ یہ خیال بھی آیا کہ اگر میں نے اس کے پاس رات ٹھہرنے سے انکار کر دیا تو اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی۔ ہو سکتا ہے پھر وہ پوری بات مجھے نہ بتائے۔ عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ آخر مجھے اس کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ میں نے کہا۔

"تم جیت گئیں ورشارانی۔ ہم ہار گئے۔ ٹھیک ہے ہم آج رات یہاں رہ کر تمہاری رکھوالی کریں گے۔"

وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ نوکرانی کافی لے کر آگئی تھی مگر اسے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ورشا نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ جب میں اور وہ کمرے میں اکیلے ہوں تو وہ پوچھ کر اندر آئے۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو ورشا دوڑ کر دروازے پر گئی اور نوکرانی سے کافی کا ٹرے خود لے کر آگئی۔ اس نے میرے لئے اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر مجھے دی اور کہا۔

"مہاراج! آج کی رات میں کتنی خوش قسمت ہوں گی کہ میرے گھر میں آکاش کے دیوتا اتریں گے۔"

میں نے دل میں کہا۔ دیوتا کہاں سے اتریں گے۔ بس میں ہی ہوں گا اور تم سے خفیہ فوجی پراجیکٹ کا راز معلوم کرکے چلا جاؤں گا۔ پھر شاید کبھی تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔ دوپہر کا کھانا میں نے ورشارانی کے گھر پر اس کے ساتھ ہی کھایا۔ میں نے اپنی خفیہ کمیں گاہ پر جا کر کمانڈ شیر باز کو سارے واقعے کی رپورٹ دی۔ وہ ہنس پڑا۔

"تو گویا آج کی رات تم ورشا رانی کے ہاں مہمان ہو گئے؟"

میں نے کہا۔

"مجبوری ہے شیر باز خان۔ ورنہ تمہیں تو معلوم ہی ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔"

وہ بولا۔

"کیوں نہیں میں جانتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب تم سے کل ملاقات ہوگی۔"

ورشارانی سے میں کہہ آیا تھا کہ مجھے جنگل میں ایک ضروری جڑی بوٹی کی تلاش میں جانا ہے۔ میں رات ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔ چنانچہ شیر باز خان کے پاس ہی میں شام تک بیٹھا اپنے منصوبے کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ شام کو اندھیرا گہرا ہوگیا تو میں نے سادھیوں والے لباس کے اوپر گہرے رنگ کے گرم کمبل کی بکل ماری اور میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔

"برف اس روز بھی نہیں گری تھی۔ آسمان کو بادلوں نے ضرور ڈھانپ رکھا تھا۔ ریڈیو ٹیلی ویژن پر موسم کا حال بتانے والی نے کہا تھا کہ سری نگر اور اس کے آس پاس کی پہاڑیوں میں رات کو برف گرنے کا امکان ہے۔ میں ورشارانی کے آفیسرز کوارٹر میں پہنچ گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی بے چینی سے میری راہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرے لئے تین چار قسم کے کھانے تیار کروا رکھے تھے۔ خود بھی خوب بن سنور کر بیٹھی تھی۔ فوراً" میرے لئے کشمیری چائے لے آئی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! آج میرے گھر میں چندر ماں نے پرویش کیا ہے۔"

یعنی میرے گھر میں چاند اتر آیا ہے۔ میں اس سے انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کے خفیہ ایمرجنسی دروازے کا راز معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا مگر وہ ہنس کر ٹال جاتی۔ یہی کہتی رات کے پچھلے پہر بتا دوں گی۔ بڑی بے تکلف ہو رہی تھی۔ میں خاموش بیٹھا اس کے جذبات کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس قسم کے حالات میں انسان واقعی اپنے جذبات کے ہاتھوں تماشہ بن جاتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں ہی ایک طرف ڈائننگ ٹیبل لگی تھی۔ ہم نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ کھانا واقعی بڑا لذیذ تھا۔ اس کے بعد کشمیری قہوہ آگیا۔ میں نے اصل بات چھیڑ دی اور کہا۔

”ورشارانی! میرا خیال ہے اب تمہیں وہ راز بتا دینا چاہئے جس کے لئے تم نے مجھے یہاں رات رہنے پر مجبور کیا ہے۔“

وہ ہنس کر بولی۔

”مہاراج! وہ راز تو میں اس وقت بتاؤں جب آدھی رات گذر جائے گی۔“

میں نے ذرا سختی سے کہا۔

”تم کیا بچوں ایسی باتیں کر رہی ہو ورشا!“

وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

”مہاراج! مجھے شما کر دیں مگر میں نے بھگوان کو حاضر ناظر جان کر قسم کھائی تھی کہ اپنے خاوند کا راز اس وقت بتاؤں گی جب رات آدھی گذر جائے گی۔ اس وقت مجھ پر پاپ نہیں لگے گا۔“

عجیب ضعیف الاعتقاد عورت تھی۔ یہاں بھی وہ دیوتاؤں کو بیچ میں لے آئی تھی۔ میں نے دل میں سوچا چلو ٹھیک ہے۔ مجھے تو رات یہیں رہنا ہے۔ اب نہیں بتاتی۔ تین چار گھنٹوں بعد بتا دے گی۔ میں نے قہوہ پینے کے بعد کہا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہو۔ اس کے بعد

رات کو اٹھ کر مجھے تپسیا بھی کرنی ہوگی۔"

وہ بڑی شوخی سے بولی۔

"مہاراج! آج رات آپ ہمارے بیڈ روم میں سوئیں گے۔"

پھر فوراً" ہی کہنے لگی۔

"گھبرائیں نہیں مہاراج! میں قالین پر یا صوفے پر سو جاؤں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ بیڈ روم میں سوئیں تاکہ ہمارے بیڈ روم کے پاپ بھی جھڑ جائیں اور وہ پوتر ہو جائے۔"

وہ مجھے جس طرح کہہ رہی تھی۔ میں اسی طرح کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے بیڈ روم میں ہی سوئیں گے۔"

وہ مجھے بیڈ ردم میں لے گئی۔ بیڈ روم میں صرف کونے والا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ جس کی روشنی بڑی مدھم اور خواب انگیز تھی۔ فضا انگریزی پرفیوم کی خوشبو سے لبریز تھی۔ ڈبل بیڈ پر بستر لگا تھا۔ دو کمبل تہہ کرکے رکھے ہوئے تھے۔ آتشدان میں آگ کی بجائے بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا۔ فضا گرم اور خوشبودار اور رومان انگیز تھی۔ میں بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ورشارانی نے میرے جوتے اور ترشول کونے میں لے جا کر رکھ دی۔ وہ بستر کے کنارے بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے پڑھا ہے کہ آکاش کے دیوتا جب کسی دیوی پر خوش ہوتے ہیں تو خود بھی سوم رس پیتے ہیں اور دیوی کو بھی سوم رس پلاتے ہیں اور پھر خوشی سے رقص کرتے ہیں۔ مہاراج! آپ بھی میرے لئے آکاش کے دیوتا ہیں۔ میں آپ کی داسی ہوں۔ مجھے اپنی دیوی بنا لیں۔ میں جنم جنم آپ کی داسی رہوں گی۔ میں سوم رس لاتی ہوں۔ آپ بھی پئیں اور مجھے بھی اپنے ہاتھ سے پلائیں۔ میرے جنم جنم کے پاپ دھل جائیں۔"

یہ عورت حد سے آگے جا رہی تھی۔ جو میں نہیں چاہتا تھا اور پھر ابھی تک اس نے مجھے وہ راز بھی نہیں بتایا تھا جس کی خاطر میں یہ سارا ڈرامہ کھیل رہا تھا۔ شراب سے مجھے نفرت تھی اور غیر عورت میرے لئے حرام تھی۔ وہ اٹھ کر گئی اور الماری سے سکاچ کی بوتل اور شیشے کے دو گلاس اٹھا لائی۔ میں نے اسی وقت ایکشن کا فیصلہ کر لیا۔ میں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور جلالی آواز کے ساتھ بولا۔

"سن ورشا سن! سن ارجن سنگھ کی پتنی سن۔ تیرے دل میں جو برا خیال پیدا ہو گیا ہے اسے دل سے نکال دے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھ اگنی سانپ ابھی زمین کے اندر سے نکل کر آئے گا اور تجھے ڈس لے گا۔ پھر میں بھی تمہیں نہ بچا سکوں گا۔ اس شراب کی بوتل کو وہیں الماری میں جا کر رکھ دے۔ چل۔ چل۔"

ورشا ڈر گئی۔ اسی وقت شراب کی بوتل الماری میں رکھ دی اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے قالین پر بیٹھ گئی۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں۔ مجھ سے بھول ہو گئی ہے میں ایسا خیال پھر کبھی اپنے دل میں نہیں لاؤں گی۔"

میں اسی وقت سوچنے لگا کہ واقعی اگر میں سادھو سیناسی کے بھیس میں نہ ہوتا تو اپنے مشن میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بازو اوپر اٹھا کر ایک اشلوک پڑھا اور کہا۔

"میجر ارجن سنگھ کی پتنی! میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف تیری بھلائی کے لئے' تیری جان بچانے کے لئے کر رہا ہوں اور تو میری تپسیا بھنگ کرنا چاہتی ہے۔"

وہ تو رونے لگی۔

"مہاراج! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

میں نے کہا۔

"سن ورشارانی! تجھے اپنے پتی کی عزت کا خیال ہونا چاہئے۔ اگر تو نے اپنے پتی کو دھوکا دیا اور اس کی عزت کو بٹہ لگایا تو یاد رکھ اگلے جنم میں تو ناگن بن کر پیدا ہوگی اور ایک کروڑ سال تک ناگن ہی کا جنم لیتی رہے گی۔"

میری ان باتوں نے ورشا پر لرزہ طاری کر دیا۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ تب میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ تو برائی اور پاپ کے راستے پر چل پڑی تھی۔ مگر واپس آ گئی ہے۔ دیوتاؤں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ اب میری بات غور سے سن۔ اگنی سانپ تجھے ڈسنے کے لئے منصوبے بنا رہا ہے۔ مجھے فوراً بتا کہ جہاں تیرا دشمن سانپ زمین کے نیچے موجود ہے وہاں تک جانے کا خفیہ راستہ کون سا ہے اور تمہارے پتی میجر ارجن سنگھ نے تمہیں کیا بتایا تھا۔"

میجر کی بیوی سیدھے راستے پر آ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! ارجن جی نے مجھے بتایا ہے کہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کا ایک ایمرجنسی راستہ بھی ہے۔ یہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ اگر وہاں ہنگامی حالت پیدا ہو جائیں۔ گیس لیک کرنے لگے یا آگ لگ جائے تو لوگ اس راستے سے باہر نکل سکیں۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ راستہ کس جگہ پر ہے؟"

اس کے بعد ڈوگرہ میجر کی بیوی نے بڑی تفصیل کے ساتھ راز کی وہ ساری باتیں بیان کر دیں جو اسے اس کے خاوند نے بتائی تھیں۔ آپ کو یہ ساری تفصیلات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں اور کمانڈو شیر باز کمانڈو آپریشن پر نکلیں گے تو آپ کو خودبخود ساری باتیں اور انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کے ایمرجنسی دروازے کے بارے میں علم ہو جائے گا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا

کہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں تین کمرے صرف کشمیری حریت پرستوں سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں ٹارچر سیل ہے اور ایک میں تین کشمیری عورتیں قید ہیں اور دوسرے کمرے میں چار کشمیری مجاہد بند ہیں۔ یہ لوگ تین ماہ سے وہاں قیدوبند اور ٹارچر کی اذیتیں برداشت کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں انٹیلی جنس نے یہ مشہور کر رکھا ہے یہ چاروں مجاہد اور تین کشمیری عورتیں ایک فوجی جھڑپ میں مارے گئے تھے۔

یہ تینوں کمرے پراجیکٹ کی سرنگ میں دیکھ چکا تھا۔ جب میں میجر ارجن سنگھ کے ساتھ اگنی سانپ کی تلاش میں وہاں سے گذرا تھا اور مجھے ایک عورت اور دو مردوں کے کراہنے کی آواز سنائی دی تھی۔ جب میاں نے ساری معلومات حاصل کرلیں تو ڈوگرہ میجر کی بیوی ورشا سنگھ سے کہا۔

"ورشا! اگر تمہارے پتی دیو نے تمہیں کوئی اور بات بتائی ہے تو وہ بھی مجھے بتا دے تاکہ میں تمہارے دشمن اگنی سانپ کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو کر جاؤں۔"

ورشا بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مہاراج! پتی دیو نے جو کچھ بتایا تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ارجن جی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں کل رات آدھی رات کو اگنی سانپ کو مارنے کے لئے نکل پڑوں گا۔ اس دفعہ دشمن سانپ میرے ہاتھوں بچ نہ سکے گا۔ میں اسے ہلاک کرکے اس کے ٹکڑے لاکر تمہیں دکھاؤں گا۔"

"مہاراج! آپ بھگوان کے اوتار ہیں۔ آپ میرے لئے سب کچھ ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔"

اس وقت رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ اتنی سخت سردی اور برف میں

واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ورشا سے کہا۔

"اب تم یہاں اپنے بیڈ روم میں آرام سے بسرام کرو۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا کر صوفے پر آرام کریں گے۔"

ورشارانی جلدی سے اٹھ کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا تو وہ میرے پیچھے پیچھے آئی۔ ڈرائنگ روم میں بھی بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا۔ میں صوفے پر لیٹ گیا۔ ورشا نے مجھ پر الماری میں سے، کمبل نکال کر ڈال دیا اور میرے پاؤں بڑے احترام سے چھو کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے بعد میں بھی سو گیا۔ اگلے روز میں منہ اندھیرے اپنی کمیں گاہ میں پہنچ گیا۔ کمانڈو شیرباز دن کے دس بجے آیا۔

میں نے اسے ساری تفصیل بیان کر دی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ انڈر گراؤنڈ فوجی پراجیکٹ کے ایمرجنسی گیٹ کا اسے بھی علم نہیں تھا۔ یہی ایک راہ داری تھی جہاں سے ہم زیر زمین سرنگ میں داخل ہو سکتے تھے۔ کمانڈو شیرباز کہنے لگا۔

"ہمارا مشن سب سے پہلے زیر زمین تہہ خانوں میں قیدوبند کی اذیتیں برداشت کرنے والے اپنے مجاہدوں اور مجاہد خواتین کو نکالنا ہو گا۔ اس کے بعد ہم وہاں پر موجود اعصابی گیس کے ذخیرے کو تباہ کریں گے۔"

میں نے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا گیس کے ذخیرے کو تباہ کرنے سے اس سارے علاقے میں ہلاکت خیز گیس نہیں پھیل جائے گی؟"

کمانڈو شیرباز کہنے لگا۔

"انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں ہم گیس کے سلنڈروں کو یا جن کنٹینروں میں بھی اعصابی گیس جس حالت میں موجود ہے اس طرح تباہ کریں گے کہ اوپر کی ساری زمین ایک دم نیچے بیٹھ جائے گی اور گیس کا ذخیرہ زمین میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے گا۔ اس طرح دب جانے سے گیس باہر نہیں آ سکے گی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دھماکہ خیز ٹیکنیک کی تھوڑی بہت مہارت میں بھی رکھتا تھا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"شیرباز! اس کے لئے تو ہمیں زیر زمین سرنگوں میں کئی ایک جگہوں پر انتہائی دھماکہ خیز بارودی سٹکیں لگانی پڑیں گی اور ان سب کو تاروں کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک کرنا ہوگا تاکہ بٹن دبانے سے سارا دھماکہ خیز مواد ایک ساتھ پھٹ کر تمام انڈر گراؤنڈ سرنگیں ایک ساتھ بیٹھ جائیں۔"

کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"ہمارے پاس اس کام کا ایک ماہر مجاہد موجود ہے اور انتہائی جدید ٹیکنکل سامان بھی ہمیں مل جائے گا۔ یہ سارا سامان جس میں ریموٹ کنڑول اور ڈائنامیٹ کی زبردست دھماکہ پیدا کرنے والی سٹکیں بھی ہیں۔ ہم نے انڈین فوجی کیمپوں میں چھاپہ مار کر حاصل کیا ہوا ہے۔ ہمیں صرف زمین کے نیچے سرنگوں اور کمروں اور دروازوں کی محرابوں میں بارودی سٹکیں لگانی ہوں گی۔ انہیں ایک دوسرے سے تاروں کے ذریعے منسلک کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ سارم کام ریموٹ کنڑول کرے گا۔ ریموٹ کنڑول کا بٹن دبانے سے سرنگیں ایک ہی دفعہ پھٹ کر بیٹھ جائیں گی اور اس کے ساتھ ہی پراجیکٹ کا سارا عملہ اور گیس کا سارا ذخیرہ جو وہاں پر موجود ہوگا کروڑوں من مٹی کے نیچے دفن ہو جائے گا۔ لیکن یہ ہمارا دوسرا مشن ہوگا۔ پہلا مشن یہ ہوگا کہ ہم اپنے مجاہدوں کو وہاں سے نکالیں گے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اس کے لئے بھی ہمیں انتہائی احتیاط سے کوئی حکمت عملی تیار کرنی پڑے گی۔"

شیر باز خان نے کہا۔

"احتیاط صرف اتنی کرنی پڑے گی کہ جب تک ہمارے مجاہد زمین دوز

تہہ خانوں سے باہر نکل کر روپوش نہیں ہو جاتے وہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کیونکہ رات کے وقت بھی وہاں سنتری گارڈز موجود ہوں گے اور یہ کوئی عام چوکیدار نہیں ہوں گے بلکہ تربیت یافتہ فوجی ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہم دونوں اس مشن پر جائیں گے یا ہمارے ساتھ کوئی اور بھی کمانڈو ہو گا؟"

شیر باز خان نے کہا۔

"ہمارے ساتھ صرف کمانڈو مجید بٹ ہو گا۔ وہ تجربہ کار کشمیری کمانڈو ہے اور اس سے پہلے کئی مشن پر ہمارے ساتھ جا چکا ہے۔"

میں نے شیر باز سے کہا۔

"تو پھر ہمیں اس کمانڈو آپریشن میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ اس وقت انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کا انچارج میجر ارجن سنگھ بھی کوئی کانفرنس اٹینڈ کرنے دلی گیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی کہہ رہی تھی کہ اسے وہاں چار پانچ دن لگ جائیں گے۔ ہمیں اس کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر دونوں مشن مکمل کر لینے چاہئیں۔"

کمانڈو شیر باز ایک لمحے کے لئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

"حیدر علی! ہمیں سب سے پہلے خود رات کی تاریکی میں جا کر ایمرجنسی گیٹ اور اس کے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینا ہو گا۔ کیونکہ جب تک ساری جگہ کا نقشہ ہمیں معلوم نہیں ہو گا ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"یہ کام ہمیں آج ہی کر لینا چاہئے۔"

شیر باز کہنے لگا۔

"ہمیں اس رسکی مشن پر دن کے وقت جانا ہو گا۔ تاکہ جس مقام سے

"میں انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں داخل ہونا ہے اسے دن کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ لیں۔"

میں نے اس کے جواب میں کہا۔

"لیکن وہاں تو فوج کا سخت پہرہ ہوتا ہے۔ ایک ایک فرلانگ تک کسی سویلین کو اس علاقے میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم وہاں گئے تو پکڑے جائیں گے۔"

شیر باز بولا۔

"اس کے لئے ہمیں کوئی بھیس بدلنا پڑے گا یا تو ہم ڈوگرہ فوجی بن کر جائیں گے۔ اگر ہم ڈوگرہ فوجی بن کر گئے تو ظاہر ہے ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کس رجمنٹ کے فوجی جوان موجود ہیں۔ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے تب بھی خطرہ ہے کہ ہم اجنبی ہوں گے ہم سے پوچھ گچھ ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر کسی سویلین بھیس میں جاتے ہیں۔"

شیر باز بولا۔

"وہاں تو ایک ایک فرلانگ تک کوئی سویلین داخل نہیں ہو سکتا۔ ہم وہاں کیسے جائیں گے؟"

میں نے کہا۔

"پھر ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تم یہیں ٹھہرو گے۔ میں اپنے اسی سادھوؤں والے بھیس میں وہاں جاؤں گا۔ کسی فوجی نے پکڑا تو کہہ دوں گا کہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ہوں۔ ویسے بھی جوگیوں سے فوجی بھی ڈرتے ہیں کہ ان سے زیادہ بات کی تو وہ کوئی بددعا نہ دے دیں۔"

کافی دیر تک ہم اس سکیم پر غور کرتے رہے۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ میں تیسرے پہر انڈر گراؤنڈ خفیہ فوجی پراجیکٹ کے ایمرجنسی گیٹ کی طرف جاؤں گا

اور خود اس جگہ کا مشاہدہ کروں گا۔ جہاں سے ہمیں رات کی تاریکی میں زمین دوز سرنگوں میں داخل ہونا ہے۔ سارا دن میں اور شیر باز کیمں گاہ کے تہہ خانے میں ہی رہے۔ تیسرے پہر میں نے سادھوؤں والے کپڑے پہنے۔ ہاتھ میں ترشول پکڑا۔ کاندھے پر گیروے رنگ کا ہی گرم کمبل ڈالا۔ سر پر اسی رنگ کی اونی ٹوپی پہنی اور جو جگہ میجر کی بیوی نے مجھے بتائی تھی کہ وہاں ایمرجنسی دروازے کی راہ داری ہے اس طرف روانہ ہوگیا۔

رات اور دن کو بھی برفباری نہیں ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے کئی جگہوں پر برف پگھل چکی تھی۔ سڑکوں پر سے برف ہٹا دی گئی تھی۔ شہر میں ٹریفک جا رہی تھی۔ خفیہ پراجیکٹ شہر کے باہر چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے درمیان تھا۔ میں نے ایک موٹر رکشا پکڑا اور اپنے ٹارگٹ سے کافی پیچھے رکشا چھوڑ دیا۔ یہاں سے میں نے رک کر سامنے والے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں کو غور سے دیکھا جس کی دوسری جانب وادی میں انڈرگراؤنڈ پراجیکٹ کا کیمپ تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کشمیر میں بھارتی مقبوضہ فوج نے اس پراجیکٹ کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور وہاں نہ تو کوئی فوجی کیمپ لگایا تھا۔ نہ ظاہر طور پر فوجی گارڈ ہی کہیں رکھے تھے۔ اگرچہ میجر کی بیوی کی زبانی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جہاں سے بڑا دروازہ زمین کے اندر جاتا ہے وہاں دونوں جانب اوپر ٹیلے پر مشین گن کے مورچے بنے ہوئے ہیں اور ڈوگرہ میجر جب مجھے لے کر اس پراجیکٹ میں گیا تھا تو مشین گن کی ان پکٹوں کو میں نے قریب سے بھی دیکھ لیا تھا۔ بھارتی فوج ہائی کمانڈ اس اعصابی گیس تیار کرنے والے پراجیکٹ کے بارے میں خصوصی طور پر بڑی راز داری سے کام لے رہی تھی۔

باہر سے کوئی فوجی چلتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن چاروں طرف ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر مشین گنوں کے مورچے بنے ہوئے تھے۔ جن میں بیٹھے فوجی ہر وقت علاقے پر دوربینوں سے نگاہ رکھتے تھے کہ کوئی باہر کا آدمی وہاں نہ آ

جائے۔ میں سادھو بن کر وہاں آیا تھا۔ مجھے چھپنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے باوجود احتیاط سے کام لے رہا تھا اور پراجیکٹ کے سامنے کی جانب سے آنے کی بجائے میں پیچھے کی جانب سے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ڈھلان پر کہیں کہیں سفید برف جمی ہوئی تھی۔ درختوں پر بھی برف نظر آ رہی تھی۔ اردگرد آدمی کوئی نہیں تھا۔ کہیں کوئی بکری یا چرواہا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈوگرہ میجر کی بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ عقبی ٹیلی کی دوسری جانب نیچے بائیں طرف چنار کے تین درخت ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک اونچا ٹبہ ہے۔ اس ٹبے کے نیچے پراجیکٹ کا ایمرجنسی راستہ ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ زیر زمین سے آنے والے راستے کے دہانے پر کوئی دروازہ نہیں لگا ہوا مگر اسے درختوں کی شاخوں سے ڈھانپ گیا ہے تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ یہاں کوئی خفیہ راستہ اندر کسی سرنگ کو جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس ایمرجنسی دروازے پر دن کے وقت اور رات کے وقت صرف ایک فوجی سپاہی پہرہ دیتا ہے جو جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ میں ٹیلے کے اوپر آگیا تھا۔

میں نے دوسری طرف نگاہ ڈالی تو مجھے نیچے کوئی سو قدم کے فاصلے پر چنار کے تین درخت ساتھ ساتھ کھڑے دکھائی دیئے۔ ان درختوں کی اوپر شاخیں برف میں چھپی ہوئی تھیں۔ مجھے ان درختوں کے عقب میں ایک اونچا سا مٹی کا ٹبہ نظر آیا۔ بقول ڈوگرہ میجر کی بیوی کے اسی ٹبے میں ہی ایمرجنسی دروازہ تھا۔ میں ٹیلے کی ڈھلان اتر کر چنار کے درختوں والے ٹبے کے پہلو میں آگیا۔ میں ایسی جگہ پر تھا جہاں سے مجھے ٹبے کی دیوار میں ذرا اندر کر کے درخت کی شاخیں نظر آ رہی تھیں۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ شاخیں درختوں سے کاٹ کر یہاں لگائی گئی ہیں تاکہ ایمرجنسی دروازے کو کیموفلاج کیا یعنی چھپایا جائے۔ میں یہاں محتاط ہوگیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں بظاہر تو مجھے کوئی فوجی سنتری پہرہ دیتا نظر نہیں آئے گا لیکن وہ کسی نہ کسی جگہ چھپ کر پہرہ دے رہا

ہوگا اور میری نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا ہوگا۔ میں سادھوؤں والے بھیس میں تھا۔ ترشول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے یہ کیا کبھی کسی درخت کی چھال ترشول سے اتار کر اسے سونگھتا۔ کبھی جھک کر زمین پر سے جہاں برف نہیں تھی وہاں گھاس یا کوئی جھاڑی اکھاڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگتا۔ یہ کرتے کرتے میں ٹیلے کے نیچے ٹبے کے بالکل قریب آگیا۔

اب میں نے صاف دیکھ لیا کہ جہاں درختوں کی کٹی ہوئی شاخوں سے دیوار سی بنائی ہوئی تھی اس کے پہلو میں ایک راستہ اندر جاتا تھا۔ مجھے یہی دیکھنا تھا۔ میں واپس ٹیلے کی طرف چلنے لگا تو اچانک ایک طرف ایک فوجی سنتری سٹین گن لئے نکل کر میرے سامنے آگیا۔

"کون ہو تم؟ ادھر کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اولکھ نرنجن کا نعرہ لگایا اور کہا۔

"بابا لوگ! ہم سادھو سنیاسی ہے۔ جڑی بوٹیوں کو تلاش کرتا ادھر آیا ہے۔"

وہ ڈوگرہ فوجی مجھے غور سے اوپر سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھولے میں سے جھاڑیوں کی کچھ شاخیں اور پتے نکال کر اسے دکھائے اور کہا۔

"یہ دیکھو بچہ! یہ اگن تنتری بوٹی ہے۔ اس کو پانی میں بھگو کر تین دن پینے سے آدمی کے آدھے سر کا درد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔"

میں نے دوسری شاخ اسے دکھائی اور کہا۔

"یہ یگن پتری بوٹی ہے۔ اس کو کوٹ کر چھان کر رات کو ایک چٹکی دودھ کے ساتھ پی جائے تو آدمی کی طاقت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔"

ڈوگرہ فوجی کو یقین ہوگیا کہ میں کوئی خطرناک آدمی نہیں ہوں بلکہ سنیاسی ہی ہوں کہنے لگا۔

"مہاراج! تم اس طرف سے چلے جاؤ یہاں کسی کو آنے کا آرڈر نہیں

ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔"

میں نے موقع واردات کا معائنہ کر لیا تھا۔ مجھے وہاں رکنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایمرجنسی خفیہ دروازے کے قریب ہی سنتری چھپ کر پہرے پر ہوتا ہے۔ دن کو یہ فوجی تھا۔ رات کو کوئی دوسرا ہوتا ہوگا۔ اس ایک یا دو فوجیوں پر قابو پانا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے اولکھ نرنجن کا نعرہ لگا کر کہا "رام بھلی کرے گا بچہ!"

اور وہاں سے چل دیا۔ میں جس راستے سے وہاں گیا تھا اسی راستے سے واپس ہوتا ہوا شہر کو جاتی سڑک پر آ گیا۔ وہاں سے میں ایک تانگے میں بیٹھا اور اس جگہ پر اتر گیا جہاں سے ہماری خفیہ انڈر گراؤنڈ کمیں گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے شیر باز کو پوری رپورٹ دی اور کہا۔

"ایمرجنسی خفیہ راستہ میں دیکھ آیا ہوں۔ میرا خیال ہے اگر وہاں رات کے وقت بھی ایک ہی فوجی پہرے پر ہوگا تو زمین دوز پراجیکٹ میں داخل ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔"

کمانڈو شیر باز اس کے باوجود سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"انڈین آرمی اور خاص طور پر آرمی انٹیلی جنیس والے اتنے احمق نہیں ہیں کہ اتنے اہم ملٹری پراجیکٹ کی سیکورٹی کے معاملے میں اتنے لاپرواہ ہوں کہ رات کو بھی صرف ایک ہی فوجی وہاں ڈیوٹی دے رہا ہو۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں وہاں ڈوگرہ رجمنٹ کا پورا بریگیڈ پہرہ دے رہا ہوگا؟ بھائی ایک سنتری نہیں تو دو ہوں گے زیادہ سے زیادہ تین کی پارٹی ہوگی۔ ہم ان پر قابو پانا جانتے ہیں۔"

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں کمانڈو مجید بٹ کو لے کر آتا ہوں۔"

کمانڈو شیر باز خان چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد واپس آیا اس کے ساتھ

ایک گورا چٹا خوبصورت کشمیری جوان تھا جس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور شرعی ڈاڑھی تھی جو اسے بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ماتھے پر محراب کا نشان تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ پانچ وقت کا نمازی ہے۔ سر کے سیاہ گھنگھریالے بال گردن تک بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے پرانا لمبا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں گلو بند تھا۔ شیر باز نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ کمانڈو مجید نے السلام علیکم کہہ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ شیر باز بولا۔

"میں نے مجید بٹ کو ساری بات سمجھا دی ہے۔ ہمارے مشن کے بارے میں یہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ یہاں رہ کر ہماری واپسی کا انتظار کرے گا۔ مگر اب یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

کمانڈو مجید بٹ بھی ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ سماوار گرم گرم چائے سے بھرا ہوا تھا۔ شیر باز نے پیالیوں میں چائے ڈال کر ہمیں دی۔ کمانڈو مجید بٹ نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کیا ٹیلے کے اوپر کوئی مشین پوسٹ بھی تھی؟"

میں نے یاد کر کے کہا۔

"جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں۔ مجھے وہاں کوئی مشین گن پوسٹ نظر نہیں آئی۔"

کمانڈو مجید بٹ نے شیر باز سے مخاطب ہو کر کہا۔

"شیر باز! مجھے یقین ہے کہ وہاں دو نہیں تو ایک مشین گن پوسٹ ضرور ہو گی۔ انڈین آرمی اتنے اہم پراجیکٹ سے اتنے لاپروا نہیں ہو سکتے کہ وہاں صرف ایک فوجی پہرہ دے رہا ہو۔"

کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ ہم مشین گن پوسٹ کا بھی کھوج لگا لیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ساتھیو! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم ایک دن یا ایک رات
"مین گن پوسٹ کا کھوج لگانے میں ضائع کر دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میجر ارجن
لعل کے واپس آنے سے پہلے پہلے ہم اپنے دونوں کمانڈو آپریشن مکمل کر لیں یعنی
اپنے ساتھی مجاہدوں کو بھی انڈر گراؤنڈ ٹارچر سیل سے نکال لیں اور اس کے
فوراً" بعد اس اعصابی گیس کے پراجیکٹ کو بھی مکمل طور پر تباہ کر کے ناکارہ بنا
دیں۔"

کمانڈو مجید بھی ہماری طرح دلیر اور نڈر کشمیری مجاہد تھا۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے ہم اللہ کا نام لے کر آج رات نکل پڑتے ہیں۔ وہاں جا کر
"مین گن پوسٹ کا بھی سراغ لگا لیں گے۔ سراغ لگانے کی ضرورت بھی نہیں
ہے۔ ہم اتنی احتیاط سے ایمرجنسی دروازے تک جائیں گے کہ گن پوسٹ والوں
اور وہاں پر پہرے دیتے ڈوگرہ فوجیوں کو احساس تک بھی نہیں ہو گا۔"

"یہی میں بھی چاہتا ہوں۔ میں نے فوراً" کہا۔ تمہارا کیا خیال ہے شیر باز
خان؟"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور ہمیں کونسی کوئی پوری کمانڈو پلاٹون
تیار کرنی ہے۔ ایک میں' ایک تم اور ایک مجید بٹ ہی تو ہے۔ یہی ہماری کمانڈو
پارٹی ہے۔ اس سے زیادہ آدمیوں کو وہاں رات کے وقت جانا بھی مناسب نہیں
ہے۔ آج رات کو اللہ کا نام لے کر نکل پڑتے ہیں۔"

کمانڈو مجید بٹ نے بڑے جذبے کے ساتھ مگر دھیمی آواز میں کہا۔

"یا علی مولا مشکل کشا۔"

اور دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرنے لگا۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے پوچھا۔

"ہمیں تمہارے خیال میں کتنا اور کس قسم کا اسلحہ ساتھ لے جانا
ہو گا؟"

شیر باز غور کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارا یہ کمانڈو آپریشن خاموش کمانڈو آپریشن ہوگا۔ ہمیں وہاں نہ تو کوئی دھماکہ کرنا ہوگا اور نہ اوپن فائرنگ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ہم اپنے ساتھ سائی لنسر والی شاٹ گنیں لے جائیں گے۔ ہمیں ہینڈ گرنیڈ بھی ساتھ نہیں لے جانے ہوں گے۔ البتہ بڑے کمانڈو چاقو ہمارے پاس ضرور ہوں گے۔ دشمن کو اوپن سائیٹ میں لا کر اس پر وار نہیں کرنا ہوگا بلکہ اچانک شیر کی طرف دبوچ کر اس کی شہ رگ چاقو سے کاٹ دینی ہوگی اور آپ لوگ تربیت یافتہ کمانڈو ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب دشمن کی شہ رگ پر چاقو پھیرا جاتا ہے تو اسے فوراً اپنے سے الگ کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کی شہ رگ سے خون کا جو فوارہ نکلے گا وہ خون ہمارے اوپر نہ پڑے اور یہ کام ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں مکمل ہو جانا چاہئے۔ اس کمانڈو آپریشن پر ہمیں صرف چاقو اور شارٹ گنوں کی ہی ضرورت ہوگی۔ البتہ اس کے بعد جب ہم پراجیکٹ کو دھماکے سے اڑا دینے کے مشن پر جائیں گے تو ہمیں ہر قسم کے اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔"

یہاں کمانڈو مجید بٹ نے ایک بڑے اہم نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں دو الگ الگ مشن پر جانا ہوگا یعنی ایک کمانڈو آپریشن اپنے ساتھی مجاہدوں کو دشمن کے ٹارچر سیل سے آزاد کرانے کے لئے ہوگا اور دوسرا کمانڈو ایکشن خفیہ پراجیکٹ کو تباہ کرنے کے لئے ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمارے پہلے مشن کی کامیابی کے بعد انڈین آرمی ہوشیار نہیں ہو جائے گی؟ وہ یقیناً" وہاں سیکورٹی سخت کر دے گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہاں پوری کمانڈو فورس آ کر بیٹھ جائے۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے دوسری بار انڈرگراؤنڈ پراجیکٹ میں داخل ہو کر اسے تباہ و برباد کرنا تقریباً" ناممکن ہو جائے گا۔"

یہ نقطہ ایسا تھا کہ اس پر ہم بھی سوچ میں پڑ گئے۔ کمانڈو مجید بٹ نے بڑے اہم پوائنٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شیر باز خان نے اس سے پوچھا۔

"تو تمہارا خیال یہ ہے کہ ہمیں اپنے پہلے کمانڈو مشن میں ہی دونوں کام کر دینے چاہئیں۔ یعنی ہم وہاں سے اپنے ساتھی مجاہدوں کو بھی نکال لائیں اور وہاں اہم ٹھکانوں پر دھماکہ خیز مواد بھی رکھ آئیں۔"

کمانڈو مجید بولا۔

"میں یہی چاہتا ہوں اور میرے خیال میں ہونا بھی یہی چاہیے۔ دوسری بار ہمارے لئے وہاں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ جب انڈر گراؤنڈ ٹارچر سیل سے ہمارے ساتوں ساتھی مجاہد فرار ہو گئے تو انڈین آرمی اور وہاں سیکورٹی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھی رہے گی۔ وہ تو آس پاس کی پہاڑی ٹیلوں کے ایک ایک انچ پر بارودی سرنگیں بھی بچھا دے گی اور فوج کا پورا بریگیڈ وہاں حفاظت کے لئے ڈیپلائے کر دے گی۔"

ہم خاموشی سے غور کرنے لگے۔ میں نے کمانڈو شیر باز کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

"کمانڈو مجید کا خیال درست ہے۔ ہمیں دونوں مشن ایک ہی کمانڈو آپریشن میں مکمل کرنے ہوں گے۔"

یہی فیصلہ ہوگیا۔ شیر باز بولا۔

"اب ہم آج رات نہیں نکل سکتے۔ ہمیں اس بڑے کمانڈو آپریشن کے لئے پورا انتظام کرنا ہوگا۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کمانڈو حیدر علی! اس آپریشن کے لئے تم ہمیں گائیڈ کرو گے کیونکہ تم اس انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں میجر ارجن سنگھ کے ہمراہ جا چکے ہو۔ تم نے اس

پراجیکٹ کی سرنگ' ہال کمرے اور محرابی دروازوں اور کوٹھریوں کو دیکھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اگرچہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پراجیکٹ کا جائزہ نہیں لے سکا لیکن جتنا کچھ میں نے دیکھا ہے میرے خیال کے مطابق اسے تباہ کرنے کے لئے کافی ہے۔"

کمانڈو مجید نے کہا۔

"سبحان اللہ! ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں سب سے پہلے ایمرجینسی دروازے سے انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دونوں یا تینوں کوٹھڑیوں میں سے اپنے چار مجاہد ساتھیوں اور تین مجاہد خواتین کو نکال کر انہیں وہاں سے فرار کروانا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ان مجاہد مرد اور عورتوں کے ساتھ ہمارے کسی آدمی کا جانا ضروری تو نہیں ہوگا؟"

شیر باز خان بولا۔

"بالکل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے چاروں مجاہد کمانڈو ہیں۔ وہ خود باقی خواتین کو بھی اپنے ساتھ پہاڑی ٹیلوں سے نکال کر رات کی تاریکی میں اپنی کیمپ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"اس سے ہمارے اصل کمانڈو آپریشن میں رکاوٹ نہیں پڑے گی۔"

شیر باز نے کہا۔

"اس کی شرط یہ ہے کہ ہمارے پہلے مشن کی تکمیل تک وہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"ہم اس کی پوری کوشش کریں گے۔" کمانڈو مجید بٹ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خواہ اس کے لئے ہمیں اپنی جان سے کیوں نہ گذرنا پڑے۔"

اب کمانڈو شیر باز خان نے ایک اہم پوائنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"تم سادھو بن کر جب پراجیکٹ انچارج میجر ارجن سنگھ کے ساتھ زمین دوز پراجیکٹ میں گئے تھے تو وہ تمہیں سیدھے راستے سے لے کر گیا تھا۔ اس راستے سے تم جس سرنگ میں داخل ہوئے تھے وہ کوٹھڑیاں اسی سرنگ میں آگے جا کر آتی تھیں۔ جن میں ہمارے حریت پرست مجاہد اور تین مجاہد خواتین قید ہیں لیکن اب ہمیں پراجیکٹ کے ایمرجینسی دروازے سے داخل ہونا پڑے گا۔ کوئی پتہ نہیں کہ یہ ایمرجینسی راہ داری ہمیں کہاں لے جائے گی۔ ضروری نہیں کہ یہ ہمیں اسی سرنگ کی طرف ہی لے جائے جہاں ہمارے مجاہدوں کی کوٹھڑیاں ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے ساتھیوں کو سب سے پہلے وہاں سے نکالنا ہوگا۔ ان کے نکلنے کے بعد ہم وہاں دھماکہ خیز مواد لگائیں گے۔"

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ بات کافی غور طلب تھی۔ کیونکہ وہ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کافی بڑا تھا۔ اس میں کئی کمرے ہوں گے۔ آخر وہاں زہریلی گیس تیار ہو رہی تھی یا تیار گیس کے بم بنائے جا رہے تھے۔ وہاں لیبارٹریاں اور سٹور روم بھی ہوں گے۔ اگر ایمرجینسی راہداری ہمیں کسی سٹور یا لیبارٹری کی جانب لے گئی تو ہم وہاں بھول بھلیوں میں پھنس سکتے ہیں۔ شیر باز خان نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا۔ کمانڈو مجید بولا۔

"اللہ مالک ہے۔ ہم اسلام کی سربلندی کے مشن پر جا رہے ہیں۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔ مولا علیؑ ہمیں راہ دکھائیں گے۔ یہ میرا یقین ہے۔ ہمارا ایک بار انڈر گراؤنڈ میں پراجیکٹ میں داخل ہونا ضروری ہے۔ آگے ہم اپنا ٹارگٹ تلاش کریں گے۔"

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ ہمیں کمانڈو آپریشن پر نکل پڑنا چاہئے۔ آگے جو ہوگا ہم اپنی عقل، اپنی فہم کے مطابق سوچتے جائیں گے اور ایکشن کرتے چلے جائیں گے۔ اس بات کو ہمیں یقین تھا کہ ہم ناکام واپس نہیں آئیں گے۔ اپنے مشن کو مکمل بلکہ کامیاب کر کے ہی رہیں گے خواہ ہم میں سے کوئی بھی واپس نہ آئے۔

جب کمانڈو آپریشن کا منصوبہ طے ہوگیا تو ہم نے اسی لمحے سے اپنے مشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہم وہاں سے سیدھے صمد بٹ کے ٹھکانے پر گئے۔ وہ ہمیں ایک اور جگہ پر لے گیا جہاں ہر قسم کا اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد موجود تھا۔ صمد بٹ اور مجید بٹ اس کام کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے ضرورت کی ساری چیزیں وہاں سے لے لیں اور اپنے خفیہ ٹھکانے پر دھماکہ خیز سٹکوں کی تیاری کے لئے چل دیئے۔ میں اور شیر باز خان اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔ آدھی رات تک ہم اپنے کمانڈو مشن کے منصوبے پر غور کرتے رہے۔ اس کی تمام کمزوریوں اور تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ پہلے خیال تھا کہ صمد بٹ اس آپریشن میں ہمارے ساتھ جائے گا مگر اب یہ فیصلہ ہوا کہ صمد بٹ ہمارے لئے ضروری دھماکہ خیز بم وغیرہ تیار کرے گا اور پیچھے رہے گا۔ اس مشن پر میں، کمانڈو شیر باز خان اور کمانڈو مجید بٹ جائیں گے۔

دوسرا دن بھی ضروری تیاریوں میں گذر گیا۔ کمانڈو آپریشن کا وقت اسی دن رات کے بارہ بجے کا طے ہوا تھا۔ رات کے دس بجے ہم چاروں کمانڈو ساتھی تہہ کانے والی کیمپ گاہ میں پہنچ گئے تھے جو ہمارے ٹارگٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ موسمی پیش گوئی کے مطابق اس رات کسی وقت بھی برف گرنا شروع ہو سکتی تھی۔ تمام ضروری سامان ہم اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ ہمارے پاس سائی لنسرز والی چار شارٹ گنیں تھیں۔ سائی لنسر والے پستولوں اور ریوالوروں سے شارٹ گنیں زیادہ ٹھیک نشانہ لیتی تھی اور ان کی گولی بھی زیادہ ہلاکت خیز

تھی۔ اس کے علاوہ تار کاٹنے والا بڑا پلاس تھا۔ چار بڑے بڑے کمانڈو چاقو تھے۔ بیس ہینڈ گرنیڈ تھے۔ سٹین گنیں ہم نے اپنے ساتھ نہیں رکھی تھی۔ اس لئے کہ یہ انڈر گراؤنڈ آپریشن تھا۔ یہاں دستی بم اور شارٹ گنیں ہی کافی تھیں۔ اگر زیادہ دور تک اوپن فائرنگ کرنی ہوتی تو سٹین گنوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی مگر یہاں ایسی بات نہیں تھی۔

ہم نے اپنی طرف سے خوب سوچ سمجھ کر پلان تیار کیا تھا۔ یہ پلان میرے مشاہدے اور میجر ارجن سنگھ کی بیوی کی رپورٹوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ میں دوسرے روز میجر کی بیوی کے ہاں نہیں گیا تھا۔ میں نے اسے فون کرکے کہہ دیا تھا کہ میں ایک دن بعد آؤں گا۔ رپورٹوں کے مطابق ہم نے اپنے سارا پلان بنایا تھا۔ لیکن موقع پر حالات بدل جانے یا کوئی دوسرا رخ اختیار کر جانے کی صورت میں بھی ہم حالات سے نمٹنے سے تیار ہو کر جا رہے تھے۔ ہم نے کمانڈو سوٹ پہن لئے تھے۔ گرم سیاہ جیکٹوں کے نیچے گرم سیاہ پتلونیں اور سیاہ بوٹ تھے۔ سر پر گرم اونی ٹوپیاں تھیں۔ اپنے چہروں کی گوری رنگت چھپانے کے لئے ہم نے چہروں اور گردنوں پر آڑی ترچھی سیاہ لکیریں کھینچ لی تھیں۔ اس طرح اندھیرے میں ہمارے گورے چہرے کیموفلاج ہو جاتے تھے۔ گیارہ بج کر تین منٹ پر ہم نے اپنا اپنا اسلحہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ ہر کمانڈو کے پاس چار چار ہینڈ گرنیڈ' ایک ایک شارٹ گن جس کی نالی پر سائی لنسر چڑھا ہوا تھا۔ ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو تھا۔ صرف کمانڈو شیر باز خان کے پاس لوہے کے تار کاٹنے والا پلاس تھا۔ اس سے زیادہ سامان ہم اپنے پاس رکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ صرف کمانڈو مجید بٹ کے کندھے سے نائیلون کا ایک سیاہ تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس تھیلے میں انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کے خاص خاص مقامات پر لگایا جانے والا دھماکہ خیز مواد تھا۔ یہ مواد بارودی سٹکوں اور محلول کیمیکلز سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے کیپسولوں کی شکل میں تھا۔ کمانڈو مجید بٹ کی ڈیوٹی یہ دھماکہ خیز

مواد لگانے کی تھی۔ صمد بٹ کے پاس بھی اتنا ہی اسلحہ تھا مگر اسے ہمارے ساتھ پراجیکٹ کے اندر نہیں جانا تھا۔ بلکہ باہر ایمرجینسی والے گیٹ کے قریب چھپ کر ہمارے مجاہدوں کا انتظار کرنا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ مجاہد اور مجاہدہ خواتین کو ہم تہہ خانوں سے نکال کر باہر لے آئیں تو وہ انہیں اپنے ساتھ وہاں سے نکال کر کمیں گاہ میں لے جائے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ کام رہا ہونے والے کشمیری مجاہد خود ہی کریں گے لیکن بعد میں خیال آیا کہ مسلسل انڈین آرمی کی اذیتیں سہہ سہہ کر نہ جانے ان کی حالت کیسی ہوگی۔ اس لئے اس ڈیوٹی کے لئے کمانڈو صمد بٹ کو منتخب کیا گیا۔

جب تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ لگے چھوٹے کلاک نے رات کے ٹھیک بارہ بجائے تو شیر باز خان نے اپنی کلائی والی گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"چیک!"

سب نے ٹائم چیک کر کے اپنی اپنی گھڑی کو کلاک والی گھڑی کے مطابق ملا لیا۔ اس کے بعد ہم نے چاروں کمانڈوز نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ کمانڈو شیر باز خان اس مہم میں ہمارا لیڈر تھا۔ اس نے تہہ کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"گو"

اور ایک ایک کر کے ہم چاروں کمانڈو تہہ خانے سے نکل گئے۔

آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ ہمیں اتنی تگ و دو کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ انتہائی زہریلا اور میرا مطیع سانپ میرے پاس تھا۔ میں بڑے آرام سے اکیلا ہی اسے اپنے ساتھ لے کر انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں چلا جاتا۔ اسے حکم دیتا کہ یہاں جتنے انڈین فوجی ہیں انہیں موت کی نیند سلا دو۔ وہ سب کو ڈس کر ہلاک کر دیتا اور میں بڑے سکون سے اپنے ساتھی مجاہدوں کو بھی نکال لاتا اور جہاں جہاں دھماکہ خیز مواد لگانا تھا لگا آتا۔ میں نے آپ کو اصل بات نہیں بتائی۔ اصل بات یہ تھی کہ میرا دوست سانپ اس رات برفباری میں میجر ارجن سنگھ کے کوارٹر کے باہر کچھ دیر پڑا رہا تھا جس کی وجہ سے اسے سردی لگ گئی تھی اور میرے خیال کے مطابق بیمار ہو گیا تھا۔ میرے بلانے پر یا مجھے دیکھ کر

بھی وہ اپنا سر نہیں اٹھاتا تھا۔ بس لکڑی کے بکس میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہتا تھا۔ میں نے اس سے مدد لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ میرا دوست اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ ہماری کمانڈو پارٹی اس کے بغیر ہی اپنے مشن پر جا رہی تھی۔ موسمی پیش گوئی یہی تھی کہ آدھی رات کے بعد برفباری ہو گی مگر ابھی تک اس کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہماری کمانڈو پارٹی خفیہ کمیں گاہ سے نکل کر اس مختصر سی دیہاتی آبادی کے بوسیدہ مکانوں کے عقب میں جا رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ رکھ کر جا رہے تھے۔ رات تاریک اور سرد تھی۔ ہم نے اپنی اپنی شارٹ گنیں اپنی چمڑے کی جیکٹوں کے اندر چھپا کر رکھی تھیں اور سیاہ ٹوپیوں کے نقاب ابھی نہیں گرائے تھے۔ ایک گلی کی نکڑ پر بلب روشن تھا۔ ہم اس سے بچ کر نکل گئے۔

آبادی کے مکان ختم ہو گئے۔ سبزیوں کے کھیت شروع ہو گئے۔ پھر سیب کے ایک باغ میں سے گذرے۔ سیب کے درختوں کی بے برگ و بار ٹہنیاں برف میں چھپی ہوئی تھیں۔ یہاں باغ کے کونے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ ہمارا ایک کشمیری حریت پرست ساتھی رات کی سرد تاریکی میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اندھیرے میں اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا تو جلدی سے جیپ کی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ کا انجن سٹارٹ ہوگیا اور اس میں سے غراہٹ کی ہلکی ہلکی آواز نکلنے گئی۔ ہمارے مشن کا لیڈر کمانڈو شیر باز آگے آگے تھا۔ اس نے رک کر ہمیں ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جاتے ہی جیپ میں سوار ہو گئے۔ ہمارے بعد کمانڈو شیر باز بھی دوڑتا ہوا آیا اور اچھل کر جیپ میں ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"گیلانی گو گو!"

گیلانی ہمارے جیپ کے کشمیری مجاہد ڈرائیور کا نام تھا۔ جیپ کے انجن

لی آواز ذرا ہلکی ہوئی اور پھر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ جیپ تین طرف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ صرف پیچھے کا حصہ خالی تھا جس میں سے سری نگر شہر کی ٹھٹھرتی ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ جھلملاتی روشنیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جیپ ایک طرف گھوم گئی۔ یہاں سے زمین اونچی نیچی ہو جاتی تھی۔ جیپ خالی راستے پر بھاگ رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں راستے کی دونوں جانب سفید سفید برف ایسے دکھائی دے رہی تھی جس طرح رات کے وقت سمندر کے کنارے سمندری جھاگ نظر آتی ہے۔ ہماری جیپ پہاڑی علاقے میں آ گئی۔ جیپ کی رفتار ہلکی ہوگئی۔ پھر ایک ٹیلے کی دیوار کے ساتھ رک گئی۔ کمانڈو شیر باز نے آہستہ سے کہا۔

"ٹارگٹ ون۔ گٹ ڈاؤن۔"

ہم چھلانگیں لگا کر جیپ سے نکل آئے اور ہدایات کے مطابق ٹیلے کی دیوار کی اوٹ میں جہاں اندھیرا گہرا تھا ٹیلے کی سخت دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے اپنی اپنی شارٹ گنیں جیپ میں ہی جیکٹوں سے نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں۔ کمانڈو شیر باز نے جیپ کے ڈرائیور سے کہا۔

"گیلانی! تم یہاں صمد بٹ کا انتظار کرو گے۔"

کشمیری مجاہد گیلانی نے اپنے کوٹ کے اندر سے سٹین گن نکال کر ہاتھ میں لے لی اور کہا۔

"یس سر۔"

اور جیپ کے بونٹ کے پاس تاریکی میں کھڑا ہوگیا۔

کمانڈو شیر باز نے ہاتھ سے ہمیں اشارہ کیا۔ میں' کمانڈو مجید بٹ اور کمانڈو صمد بٹ اس کے پیچھے چل پڑے۔ ہم نے ابھی تک اپنی سیاہ ٹوپیوں کے نقاب نہیں گرائے تھے۔ ہم ٹیلے کے دامن میں ٹیلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہاں اندھیرا اور خاموشی تھی۔ برف صرف درختوں کی شاخوں پر

تھی۔ نیچے کہیں کہیں زمین خالی تھی۔ اب میں آگے ہو گیا تھا۔ کیونکہ مجھے را۔
کا پتہ تھا۔ میں انہیں گائیڈ کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس فٹ کا فا
تھا۔ جب ہم ٹیلے کی دوسری طرف آئے تو میں رک گیا۔ میں نے ٹیلے کی اوپر
جانب ہاتھ سے اشارہ کیا اور جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر جھک کر ٹیلے
چڑھائی چڑھنے لگا۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ ٹیلے پر کہیں کہیں برف
سفید ڈھیر رات کے اندھیرے میں دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔
بڑے غور سے ادھر ادھر دیکھتا ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ میرے پیچھے کمانڈو شیر باز تھ
اس کے پیچھے مجید بٹ اور صمد بٹ سب سے آخر میں تھا۔ ہمیں ٹیلے کی دوسر
طرف جانا تھا۔ ہم نیچے سے ہو کر ٹیلے کی دوسری جانب نہیں جا سکتے تھے۔ ا
میں خطرہ تھا کہ اس طرف کوئی فوجی گشتی پارٹی نہ مل جائے۔ ٹیلے کی بلندی زی
نہیں تھی۔ ٹیلے کے اوپر آ کر ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے ہاتھ سے ٹیلے
دوسری طرف اشارہ کیا۔ ہم اشاروں میں بات کر رہے تھے۔ کمانڈو شیر باز
جھکے دوڑ کر میرے پاس آ کر دوسری طرف جھانکنے لگا۔ میں نے نیچے اس ٹیبے
طرف اشارہ کیا جس کے اندر سے خفیہ فوجی پراجیکٹ کو ایمرجینسی راستہ جاتا تھ
میں نے شیر باز کے کان میں سرگوشی کی۔

"سامنے والے چھوٹے ٹیلے پر مشین گن پوسٹ ہے۔"

کمانڈو شیر باز میرے پاس ایڑیوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ
دوسرے ساتھیوں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ کمانڈر مجید بٹ اور صمد بٹ جل
سے ہمارے پاس آ گئے۔ وہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قریب ہی چنار
درخت تھے۔ رات کی تاریکی میں ان کی ٹہنیوں پر کہیں کہیں برف کی سفیدی
آتی تھی۔ شیر باز نے جہاں ہم بیٹھے تھے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔
اشارہ کمانڈو صمد بٹ کو کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تم اسی جگہ ہمارے
کشمیری مجاہدوں کا انتظار کرو گے۔ جنہیں ہم زمین دوز اذیت گاہ سے نکال

لائیں گے۔ کمانڈو صمد بٹ نے اثبات میں سر کو ہلایا اور اپنی سیاہ ٹوپی کا نقاب چہرے پر گرا لیا۔ اب اس کی چمکتی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ شارٹ گن لے کر ایک طرف درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ کمانڈو شیر باز نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"مشین گن پوسٹ سے ہوشیار رہنا۔ ہم تمہیں یہاں سے کور دیں گے۔ گو گو۔"

میں ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگا۔ ڈھلان مشکل نہیں تھی۔ میں بیٹھ کر نیچے اتر رہا تھا۔ کہیں کہیں برف تھی۔ باقی اندھیرے میں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے شارٹ گن جیکٹ کے اندر کر لی تھی اور ہاتھ میں کمانڈو چاقو پکڑ رکھا تھا۔ میں نیچے ٹبے کی طرف جانے کی بجائے ڈھلان پر سامنے والے ٹیلے کی طرف جا رہا تھا جہاں ہمیں بتایا گیا تھا کہ مشین گن پوسٹ ہے۔

سامنے والے ٹیلے پر کوئی درخت نہیں تھا۔ یہاں مجھے اندھیرے میں پوسٹ کے جوان سائے کی طرح دیکھ سکتے تھے۔ میں ٹیلے پر کچھ دور تک اوپر چڑھ گیا۔ اوپر سے میں 75 ڈگری کا زاویہ بناتا ہوا جھاڑیوں سے بچ بچ کر نیچے اترنے لگا۔ جھاڑیوں کو پکڑنے سے آواز پیدا ہو سکتی تھی اور یہ آواز رات کے سناٹے میں گن پوسٹ کے جوانوں کو ہوشیار کر سکتی تھی۔ ٹیلے کی آدھی ڈھلان اترنے کے بعد میں وہیں رک گیا۔ لگتا تھا کہ میں دشمن کی گن پوسٹ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں اس کی بو سونگھنا چاہتا تھا۔ کسی طرف سے ذرا سی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عام طور پر مشین گن پوسٹوں کے جوان اگر محاذ پر نہ ہوں تو مورچے میں سگریٹ وغیرہ پی لیا کرتے ہیں۔ مجھے کسی جانب سے سگریٹ کی بو بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہو سکتا تھا یہاں سکھ رجمنٹ کے جوان ہوں۔ سکھ سگریٹ نہیں پیتے۔ میں نے سوچا کہ ذرا اور نیچے چل کر دیکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے نیچے کہیں مشین گن پوسٹ ہو۔ میں بیٹھ کر اتر رہا تھا۔ میں نے آگے قدم بڑھایا ہی

تھا کہ مجھے کسی کی ہنسی کی دھیمی آواز سنائی دی۔ میرا اٹھا ہوا قدم وہیں رک گیا۔ میرے خدا! مشین گن پوسٹ مجھ سے قریب ہی تھی۔

میں ڈھلان پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ ہنسی کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے کسی سے کہا کہ باہر جا کر یہ کام کرو۔ میں نے لیٹے لیٹے چاقو جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور شارٹ گن نکال کر سنبھال لی اور جس طرف سے آوازیں آئی تھیں اس طرف اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس طرف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ آواز ان جھاڑیوں کے پیچھے سے آئی تھی۔ یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ چالیس پینتالیس فٹ ہوگا۔ میں کہنیوں کے بل آگے کو رینگنے لگا۔ اتنے میں اندھیرے میں مجھے ایک انسانی سایہ جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر اپنی طرف آتا نظر آیا۔ میں وہیں ساکت ہوگیا۔ میری شارٹ گن کا رخ انسانی سائے کی طرف ہوگیا۔ انسانی سایہ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ چند قدم چل کر میری طرف آیا۔ پھر وہ رک گیا۔ میں نے بڑے غور سے اس کو دیکھا۔ وہ فوجی وردی میں تھا اور کھڑے ہو کر پتلون کے بٹن کھول رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کر رہا ہے میں نے اسے اپنی شارٹ گن کے نشانے میں لے لیا تھا۔ مگر خطرہ تھا کہ اگر گولی اس کے سر میں نہ لگی اور اس کے جسم کے کسی دوسرے حصے میں لگی تو وہ آواز نکال کر مشین گن پوسٹ کے جوانوں کو خبردار ضرور کر دے گا اور ہمارے مشن کی کامیابی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ ہمارے مشن کی کامیابی کا راز اسی میں تھا کہ ہر ایکشن خاموشی سے ہو۔ وہاں شور مچ جانے کی صورت میں ہم نہ تو انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں ڈائنامیٹ لگا سکتے تھے اور نہ اپنے ساتھی مجاہدوں کو وہاں سے نکال سکتے تھے۔ میں اندھیرے میں زمین کے ساتھ چمٹ کر فوجی جوان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا جو وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا۔ جب میرا اس کا فاصلہ اتنا رہ گیا کہ میں اس کے سر کو نشانہ بنا سکتا تھا تو میں نے شارٹ گن کی نالی کو اوپر کر کے اسی کے چہرے کو ٹارگٹ بنا لیا۔ میری انگلی ٹریگر پر ہی

تھی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ بھارتی فوجی جوان اب پتلون کے بٹن بند کر رہا تھا۔ وہ پیچھے مڑنے ہی لگا تھا کہ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور بھارتی فوجی آگے کو گر پڑا۔ میری گولی اس کے چہرے پر کسی ایسی جگہ لگی تھی کہ وہ ہلکی سی آواز بھی نہیں نکال سکا تھا۔ سائی لنسر کی وجہ سے شارٹ گن کے فائر کا دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ بڑی ہلکی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں تیزی سے رینگ کر جوان کے پاس گیا۔ وہ منہ کے بل پڑا تھا۔ اندھیرے میں مجھے اس کا چہرہ لہولہان اور ایک طرف سے آدھی کھوپڑی کے ساتھ اڑا ہوا نظر آیا۔ اتنے میں گن پوسٹ کے اندر سے کسی نے آواز دی۔

"او جانگی باہر کیا کرتا ہے؟"

میں تیزی سے اٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے ہوگیا۔ مجھے گن پوسٹ میں سے دوسرے جوان کے نکلنے کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اپنے ساتھی کا معلوم کرنے باہر ضرور آئے گا۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کوئی دو منٹ بعد گن پوسٹ کی جھاڑیوں میں سے ایک اور انسانی سایہ باہر نکلا۔ سٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اپنے مردہ ساتھی کو آواز دی۔

"کہاں ہو جانگی ملکھی رام؟"

مجھے صرف ایک احتیاط کرنی تھی اور ایک ہی خطرہ تھا کہ میری شارٹ گن کے فائر کے ساتھ ہی کہیں اس کی سٹین گن بھی فائر نہ کر دے۔ سٹین گن کے دھماکوں سے مورچے میں اگر کوئی تیسرا جوان بیٹھا ہے تو وہ ہوشیار ہو جائے گا اور اس کے علاوہ فائرنگ کی آواز پراجیکٹ کے دوسرے سنتریوں کو بھی ہوشیار کر دے گی۔ سٹین گن اس فوجی نے اس طرح ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی کہ لگتا تھا اس کی انگلی ٹریگر پر ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا اور اپنے ساتھی کو آواز دیتا آگے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اس کے سر کو اپنی شارٹ گن کے نشانے کی زد میں لے لیا تھا۔ وہ لاش کے قریب پہنچ گیا تھا لیکن اندھیرے میں اسے زمین پر

پڑی اپنے ساتھی کی لاش ابھی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں اسے اتنی مہلت دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لاش دیکھ لینے کی صورت میں وہ ہوائی فائرنگ کر کے علاقے میں میں سارے فوجیوں کو خبردا کر سکتا تھا۔ مجھ سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ رک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ لاش اس سے تین فٹ کے فاصلے پر ہو گی۔

اس نے ایک بار پھر اپنے ساتھی کو گالی دے کر آواز دی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ میری شارٹ گن سے گولی نکل کر سیدھی اس کی کھوپڑی میں لگی اور وہ پیچھے کی طرف گر پڑا۔ میں وہیں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ مورچہ بہت قریب ہے۔ شارٹ گن کی آواز اگرچہ بہت دھیمی تھی مگر پھر بھی ہو سکتا تھا کہ گن پوسٹ میں بیٹھے تیسرے فوجی نے اس سن لیا ہو اور وہ باہر نکل آئے۔ میں نے دس پندرہ سیکنڈ انتظار کیا۔ جب مورچے کی طرف سے کوئی جوان نہ آیا تو میں زمین پر گرے ہوئے دوسرے فوجی کی لاش کے پاس آیا اور جھک کر دیکھا۔ گولی نے اسی کی کھوپڑی کو بھی اڑا دیا تھا۔ میں دبے پاؤں گن پوسٹ کی طرف بڑھا۔ جھاڑیوں میں دبے پاؤں چلتا ذرا آگے گیا اور دیکھا کہ وہاں درختوں کی ٹہنیوں سے کیموفلاج کی ہوئی ایک مشین گن تھی۔ جس پر گولیوں کا پٹہ چڑھا ہوا تھا۔ وہاں کوئی فوجی مجھے نظر نہ آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس گن پوسٹ میں صرف دو ہی گز تھے۔ میں وہاں سے نیچے اترائی اترنے لگا۔

جس گن پوسٹ سے ہمیں سب سے زیادہ خطرہ تھا اسے میں نے صاف کر دیا تھا۔ اب مجھے اس سنتری کی تلاش تھی جو ہماری خیال کے مطابق وہاں کسی جگہ چل پھر کر ڈیوٹی دے رہا ہوگا۔ ٹیلے کی ڈھلان اتر گیا۔ سامنے وہ ٹبہ تھا جس پر اوپر چٹان باہر کو نکلی ہوئی تھی اور اس کو درختوں کی شاخوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر یہاں کوئی سنتری گارڈ چل پھر کر پہرہ دے رہا ہے تو وہ اس طرف ضرور آئے گا۔ میں ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سٹین گن جیکٹ کے اندر چھپالی تھی اور بڑا کمانڈو چاقو سیدھے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا

تھا۔ سرد رات کی تاریکی میں میری آنکھیں عقاب کی آنکھوں کی طرح اپنے شکار کو تلاش کر رہی تھیں۔ ایک منٹ گذر گیا مجھے یہ بھی احساس تھا کہ پیچھے ٹیلے کے اوپر کمانڈو شیر باز خان اور کمانڈر مجید بٹ میری اشارے کا انتظار کر رہے ہیں۔ میرا اشارہ بلبل کی آواز کی شکل میں تھا۔ مجھے یہ ظاہر کرنے کے لئے سب ٹھیک ہے۔ نیچے آ جاؤ۔ اپنے منہ سے بلبل کی ہلکی سی آواز ایک بار نکالنی تھی۔ اندھیرا اب میرے لئے اتنا گہرا نہیں تھا۔ میں درختوں اور جھاڑیوں کو سایوں کی شکل میں دیکھ رہا تھا۔ آدمی کی آنکھیں جب اندھیرے کی عادی ہو جائیں تو پھر اندھیرے میں بھی اسے تھوڑا بہت نظر آنے لگتا ہے۔

تیسرا منٹ گذر رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں جلدی سے ٹبے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میں منہ سے آہستہ آہستہ سانس لینے لگا۔ اس طرح سانس لینے سے آواز بالکل پیدا نہیں ہوتی۔ آہٹ میری دائیں جانب سے قریب آ رہی تھی۔ کوئی جھاڑیوں میں سے گذر کر چلا آ رہا تھا۔ مجھے اس کی ہلکی سی کھانسی کی آواز آئی۔ یقیناً" یہ رات کی گشت پر لگا ہوا ڈوگرہ فوجی ہی تھی۔ میں ٹبے کی دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا اور میں نے اپنا سر بھی پیچھے لگا رکھا تھا۔ دائیں جانب سے ایک انسانی سایہ نکل کر میری طرف آنے لگا۔ چاقو کے دستے پر میری ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مجھے اس دشمن کا بھی اس طرح کام تمام کرنا تھا کہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ اندھیرے میں میں نے اس کی وردی اور سر پر پڑی فوجی ٹوپی کو دیکھ لیا تھا۔ شاید اسے میرے قریب سے ہو کر آگے جانا تھا۔ شاید اس کی نائٹ پٹرول کا یہی راستہ تھا۔ اس کے پاس بھی سٹین گن تھی لیکن یہ سٹین گن اس نے اپنے کاندھے پر لٹکائی ہوئی تھی۔ اس لئے اسے وہاں بظاہر کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ میرے بہت قریب آگیا۔ مجھے اس کے سانس کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں چونکہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا اس لئے اسے میرے قریب سے ہو کر گذرنا تھا۔ وہ میرے قریب آگیاتھا۔ وہ بڑے

اطمینان سے چل رہا تھا۔ مجھے چپ چپ سی آواز آئی۔ وہ کچھ کھا بھی رہا تھ
میں نے سانس روک لیا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب سے گذر کر ایک قدم آ
گیا میں نے پیچھے سے جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا اور دائ
ہاتھ سے چاقو اس کے گلے پر پھیر دیا۔ ایک کمانڈو جب دشمن کے گلے پر چا
پھیرتا ہے تو اس کا وار کبھی ناکام نہیں جاتا۔ اس سے گردن نہیں کٹتی صرف
رگ کٹ جاتی ہے اور یہی کمانڈو کا مقصد ہوتا ہے۔ میں نے دشمن فوجی کی
رگ پر چاقو پھیرتے ہی اسے اپنے سے الگ کر کے آگے کو دھکا دے دیا۔ ا
کے گلے سے خر خر خر کی آواز نکلنے لگی۔ وہ کسی کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا
کٹی ہوئی شہ رگ میں سے خون کے فوارے کے ساتھ صرف خرخراہٹ کی آوا
باہر آ رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ اب وہ وہاں سے کبھی نہیں اٹھ سکے گا اور کسی
آواز دے کر بلا بھی نہیں سکے گا۔ میں دوڑ کر ٹیبے کی درختوں کی ٹہنیوں وا
دیوار کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ٹہنیوں کے پیچھے ایک سرنگ نما راست
اندر کو جاتا تھا۔ یہی انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کا ایمرجنسی دروازہ تھا۔ میں تیز تیز ٹیل
کی چڑھائی چڑھ کر اس مقام پر آگیا جہاں میں نے کمانڈوں ساتھیوں کو چھوڑا تھا۔
میرے ساتھی کمانڈو اندھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے آہستہ سے بلبل کی
آواز نکالی۔ جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے سے تینوں ساتھی باہر آ گئے۔ میں نے
کمانڈو شیر باز سے دھیمی آواز میں کہا۔

"سب ٹھیک ہے آ جاؤ۔"

کمانڈو شیر باز خان نے کمانڈو صمد بٹ کو وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی اور
کمانڈو مجید بٹ کو ساتھ لے کر میرے ہمراہ ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگا۔ میں نے
اسے ڈھلان پر پڑی دونوں گنروں کی لاشیں اور مشین گن پوسٹ دکھائی۔ ہم بغیر
کوئی بات کئے نیچے اتر گئے۔ وہاں پٹرول ڈیوٹی پر مرنے والے فوجی کی لاش بھی

پڑی تھی۔ وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ سامنے ٹبے کا ایمرجنسی راستہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے اس خفیہ ہنگامی سرنگ نما راستے میں گھس گئے۔

یہ ایک کشادہ سرنگ تھی جس کی دیواریں پتھریلی تھیں اور ان پر پلستر نہیں ہوا تھا۔ کمانڈو مجید بٹ سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں اور شیر باز دوسری دیوار کے ساتھ لگ کر قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ میں آگے آگے تھا۔ کیونکہ مجھے اس علاقے کو پہچان کر اس طرف جانا تھا جدھر وہ ٹارچر سیل تھے جہاں کشمیری مجاہدوں کو ڈوگرہ فوج نے قید کر رکھا تھا۔ کمانڈو شیر باز بالکل میرے ساتھ ساتھ مگر پیچھے ہو کر چل رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے کے پاس پاس منہ لا کر سرگوشی کی۔

"جگہ پہچان رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"اللہ مالک ہے۔"

وہ سرنگ میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں اللہ توکل چلا جا رہا تھا۔ وہاں کوئی روشنی ہی نہیں تھی۔ ہم اندھیرے میں قدم قدم چل رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر روشنی سی نظر آئی۔ وہاں سرنگ گھوم جاتی تھی اور روشنی دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے میرے کندھے پر آہستہ سے تھپکی دے کر مجھے آگے جانے کی ہدایت کی۔ وہ اور کمانڈو مجید بٹ وہیں رک کر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں سائی لنسروں والی شارٹ گنیں تھیں۔ میں نے بھی چاقو جیب میں رکھ لیا تھا اور شارٹ گن تھام لی تھی۔ میں آگے نکل گیا۔

سرنگ گھوم کر ایک پختہ راہ داری میں داخل ہو گئی تھی۔ جہاں ایک جانب دیوار کے ساتھ بجلی کا بلب روشن تھا۔ راہ داری خالی تھی۔ یہ جگہ بھی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔ ذرا

آگے گیا تو آدمیوں کی باتیں کرنے کی دھیمی آوازیں سنائی دیں۔ میں رک گیا۔ آواز کسی کمرے سے آ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ ذرا آگے گیا تو ایک دروازہ دیکھا جو بند تھا۔ آوازیں اس کے اندر سے آ رہی تھیں۔ تین آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے ہنس کر کچھ کہا اور پھر اس کے قدموں کی آواز دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں تیزی سے تین چار قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ بلب کی وجہ سے روشنی میں نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک فوجی وردی والا جوان باہر نکل کر راہداری میں آگے کی طرف چل پڑا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا۔ جب وہ راہداری میں آگے جا کر ایک طرف گھوم گیا تو میں دبے پاؤں چل کر دروازے کے پاس آیا۔ دروازہ لکڑی کا تھا جس پر بھاری روغن پھرا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ خدا کا شکر ہے کہ دروازے نے کوئی آواز نہ پیدا کی۔ میں نے ذرا سے کھلے دروازے کی درز میں سے دیکھا کہ اندر ایک اونچی چھت والا ہال کمرہ ہے۔ جس کی دیواروں کے ساتھ اوپر تک لوہے کے ریک بنے ہوئے ہیں۔ درمیان میں لوہے کی بڑی میز کے گرد دو فوجی جوان بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی سٹین گنیں میز پر رکھی ہوئی ہیں۔ بجلی کے دو بلب جل رہے تھے۔ ان کے عقب میں بھی تین بڑے بڑے المونیم کے ڈرم پڑے تھے۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔ ہمیں اپنے لیڈر کے آرڈر تھے کہ جو کچھ بھی کرنا ہے ہمیں جلدی کرنا ہوگا خواہ کتنا بڑا خطرہ ہی مول کیوں نہ لینا پڑ جائے۔ میں نے ایک دم سے دروازہ کھول دیا اور ہال میں قدم رکھتے ہی دو فائر کیئے۔ نشانے میں پہلے ہی متعین کر چکا تھا۔ میری سائی لنسر والی شارٹ گن کی پہلی گولی سامنے والے فوجی کے سینے میں لگی۔ دوسرے فوجی نے گھبرا کر اپنی سٹین گن اٹھانی چاہی مگر میں نے اسے اتنی مہلت نہ دی۔ میری شارٹ گن کی دوسری گولی اس کی گردن میں

لگی اور وہ پیچھے کو گر پڑا۔ میں دوڑ کر ان دونوں کے قریب گیا اور ایک ایک گولی باری باری ان کی کھوپڑیوں میں اتار دی تاکہ ان کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ اس کے بعد میں دوڑ کر دروازے میں آیا اور راہداری میں سے پیچھے کی طرف جا کر کمانڈو شیرباز اور کمانڈو مجید بٹ کو اشارہ کیا۔ وہ بھی تیز تیز چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے کسی نے دشمن فوجیوں کی لاشوں کی طرف توجہ نہ دی۔ شیلفوں میں لگی گول المونیم کی بوتلوں اور کونے میں پڑے المونیم کے بڑے ڈرموں کو دیکھا۔ کمانڈو شیرباز نے کمانڈو مجید بٹ کو اشارہ کیا۔ مجید بٹ پہلے ہی اپنے تھیلے کو کھول چکا تھا میں نے شیرباز کو سرگوشی میں کہا۔

"ایک باہر نکل گیا ہے۔"

کمانڈو شیر باز نے کچھ کہنے کی بجائے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں لپک کر دروازے کے پاس گیا۔ دروازے کو بند کیا اور ایک طرف شارٹ گن تھام کر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا کہ اگر باہر سے کوئی آئے تو اسے وہیں ڈھیر کر دیا جائے۔ اس دوران کمانڈو مجید بٹ نے بڑی تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔اس نے دس پندرہ سیکنڈ کے اندر اندر آہنی شیلفوں میں تین جگہوں پر ڈائنامیٹ کی چھوٹی چھوٹی سٹکیں چھپا کر لگا دی تھیں۔ پھر وہ المونیم کے بڑے ڈرموں کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں بھی اس نے خفیہ جگہوں پر دھماکہ خیز مواد کے کیپسول لگائے اور تھیلے کے زپ کو بند کرتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کمانڈو شیر باز نے مجھے اشارہ کیا۔ میں آہستہ سے دروازہ کو کھول کر باہر آ گیا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ باہر آ گئے۔ ہم نے دروازہ بند کر دیا اور ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہو کر راہداری میں آگے کی جانب بڑھے۔ مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ یہاں راہداری میں جگہ جگہ چھت پر بجلی کی گول ٹیوبیں لگی ہوئی تھیں۔ جن کی روشنی بہت زیادہ تھی۔ ہم کسی جگہ چھپ نہیں سکتے تھے۔ ہم بھی اب دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے کی بجائے وی V کی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم نے جوگر شوز پہن رکھے تھے۔ جن کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ چہرے کو ہم نے نقاب سے چھپا لیا تھا۔ ہماری صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ یہ راہداری ایک بڑے دروازے کے سامنے جا کر ختم ہو گئی۔

دروازہ بند تھا۔ کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ ہم نے بجلی کی تیزی کے ساتھ دروازے کے دونوں جانب پوزیشنیں لے لیں۔ دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلا۔ اندر سے ایک اور فوجی باہر نکلا۔ سٹین گن اسی کے کندھے پر لٹک رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ہمیں دیکھ کیا اور اپنی سٹین گن کو کاندھے سے اتار ہی رہا تھا کہ کمانڈو مجید بٹ کی شارٹ گن نے فائر کیا۔ گولی دشمن فوجی کے سینے میں اس کے دل کے آرپار ہو گئی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"دھرم سنگھ کیا ہوا ہے؟"

جب دھرم سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا تو دروازے میں ایک بڑی مونچھوں والا فوجی باہر آگیا۔ دھرم سنگھ کی لاش کو دیکھ کر اس نے بھی سٹین گن کاندھے سے اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے اس دوران ہمیں بھی دیکھ لیا تھا۔ اس بار میری اور کمانڈو شیر باز کی شارٹ گنوں سے بیک وقت ایک ایک فائر ہوا۔ دونوں گولیاں اس مونچھوں والے فوجی کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ جھکا اور بائیں جانب گرا۔ کمانڈو شیر باز نے ہمیں ایک اشارہ کیا اور خود چھلانگ لگا کر ادھر کھلے دروازے میں سے اندر جھانکنے لگا۔ ہم دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر دیوار کے پاس لے گئے۔ کمانڈو شیر باز نے ایک اور اشارہ کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ ہم دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر کمرے کے اندر لے گئے۔ یہ بھی ایک بڑا کمرہ تھا۔ جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے ڈرم پڑے تھے۔ یہ ڈرم المونیم کے تھے۔ دیوار کے ساتھ زرد رنگ کے کتنے ہی سلنڈر کھڑے تھے۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ ہم نے دونوں لاشوں کو ڈرموں کے پیچھے ڈال دیا۔ کمانڈو شیر باز نے کمانڈو مجید بٹ کو اشارہ کیا۔

وہ تھیلا گلے میں ڈالے المونیم کے ڈرموں کے پیچھے جا کر ڈائنامائیٹ اور دوسرا دھماکہ خیز مواد لگانے لگا۔ میں اور کمانڈو شیر باز بند دروازے کی دونوں

جانب پوزیشن لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ چہروں پر گہرا سکوت اور فکر مندی تھی۔ ابھی ہمارے کمانڈو مشن کا آدھا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ کمانڈو شیر باز نے اپنے منہ سے شی کی آواز نکالی۔ اس کا اشارہ کمانڈو مجید بٹ کی طرف تھا اور مطلب یہ تھا کہ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ کمانڈو مجید بٹ المونیم کے بڑے ڈرموں کے پیچھے سے نکل کر زرد رنگ کے آہنی سلنڈروں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ باری باری اس نے سلنڈروں کے پیچھے پوشیدہ جگہوں پر چار جگہوں پر دھماکہ خیز مواد والے کیپسول لگائے اور دوڑ کر ہمارے پاس آگیا۔ کمانڈو شیر باز نے میری طرف دیکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔

"ٹارچر سیل والی سرنگ؟"

میں نے سامنے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ کمانڈو شیر باز اور مجید بٹ پیچھے ہٹ گئے۔ جہاں المونیم کے ڈرم پڑے تھے وہاں ان کے عقب میں بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ ہمیں اس دروازے سے دوسرے طرف جانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دروازے سے گذرنے کے بعد ہم اس سرنگ کی راہداری میں پہنچ جائیں گے جہاں تین کوٹھڑیوں میں ہمارے کشمیری مجاہد قید ہیں۔ میں سب سے پہلے چھوٹے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا دروازہ دوسری طرف سے کھلا تھا۔ اس دروازے نے بھی چرچراہٹ کی آواز پیدا کی۔ اس آواز پر ہم تینوں جلدی سے نیچے بیٹھ گئے۔ جب دیکھا کہ کوئی نہیں آیا تو میں نے دروازے کی درز میں سے دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف ایک راہداری تھی۔ میں باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ دور سے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی جو قریب آ رہی تھی۔ میں نے راہداری میں ذرا سا سر باہر نکلا کر دیکھا۔ راہداری میں کافی روشنی تھی۔ چھت کے ساتھ لگی ہوئی ٹیوبیں روشن تھیں۔ سامنے کی طرف سے ایک فوجی سٹین گن لٹکائے بڑے مزے مزے سے ٹہلتا چلا آ رہا تھا۔ رات کے وقت اس انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں صرف ڈیوٹی

گارڈز ہی تھے۔ پراجیکٹ کا عملہ اور دوسرے فوجی وہاں نہیں تھی۔ ہم نے اسی لئے کمانڈو آپریشن کے واسطے رات کا وقت منتخب کیا تھا۔

میں نے جلدی سے سر پیچھے کیا اور اشارے سے اپنی کمانڈو پارٹی کو بتایا کہ ایک فوجی آ رہا ہے اور میں اسے سنبھالتا ہوں۔ کمانڈو شیر باز نے اشارے ہی سے مجھے ہوشیاری سے کام کرنے کی ہدایت کی اور مرے دونوں ساتھی شارٹ گنیں سیدھی کئے دروازے کے قریب کھسک آئے۔ ڈیوٹی گارڈ کے قدموں کی آواز اب قریب آ گئی تھی۔ جب میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دروازے سے چھ سات گز کے فاصلے پر آگیا ہے تو میں ایک دم چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر نکلا اور اس کے بالکل سامنے آکر اس پر فائر کر دیا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ گولی اس کے پیٹ سے ذرا اوپر سینے کے دائیں جانب لگی تھی۔ میرا نشانہ چوک گیا تھا۔ میں نے اس کے دل کا نشانہ لیا تھا مگر میرا ہاتھ ذرا اوپر کو اٹھ گیا۔ میں نے فوراً ہی دوسرا فائر کر دیا۔ وہ گر پڑا۔ ہم نے اس کی لاش کو بھی اندر کھینچ لیا اور ڈرموں کے پیچھے چھپا دیا۔ دروازہ بند کر کے ہم سامنے کی طرف دوڑے۔ ہمارا انداز تجربہ کار کمانڈوز کا تھا۔ ہم دیوار کے ساتھ لگ کر اور جھک کر دوڑ رہے تھے۔ یہ راہ داری آگے جا کر بائیں جانب مڑی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی سرنگ تھی جہاں میں اسی پراجیکٹ کا انچارج ڈوگرہ میجر مجھے ایک بار لا چکا تھا۔ میں جلدی سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ کمانڈو شیر باز اور مجید بٹ میرے قریب آکر وہ بھی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے شیر باز کو سرگوشی میں کہا۔

"ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔"

یہاں بھی سرنگ کی چھت پر بجلی کی ٹیوبیں روشن تھیں۔ کمانڈو شیر باز نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ میں نے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد ہمیں کسی انسان کے کراہنے کی آواز آئی۔

میں نے سامنے کی جانب دیکھا اس طرف دو کوٹھڑیاں تھیں۔ جس طرف میں کھڑا تھا اس طرف ایک کوٹھڑی تھی۔ کراہنے کی آواز سامنے والی کوٹھڑیوں میں سے ایک کوٹھڑی میں سے آ رہی تھی۔ اس آواز نے ہم پر واضح کر دیا کہ یہی وہ ٹارچر سیل ہیں جہاں ہمارے کشمیری مجاہد جوان اور عورتیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہی ہیں۔ ہم کوٹھڑیوں کے پاس گئے۔ تینوں کوٹھڑیوں کے دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔

میں نے شارٹ گن سیدھی کی۔ میں فائر کرکے تالوں کو توڑنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہماری دائیں جانب سے دو فوجی نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو ہماری طرف دوڑے۔

"کون ہو؟"

ان میں سے ایک نے چلا کر پوچھا اور پھر فائر کھول دیا۔ گولیاں ہمارے قریب سے ہو کر نکل گئیں۔ راہداری فائرنگ کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ کمانڈو شیر باز، مجید اور میں ایک دم زمین پر لیٹ گئے اور دونوں ڈوگرہ فوجیوں پر تینوں شارٹ گنوں کی فائرنگ کرکے انہیں بھون ڈالا۔ دونوں رقص بسمل کرتے چکراتے ہوئے گر پڑے۔ کمانڈو شیر باز نے اٹھتے ہی مجھے حکم دیا۔

"سامنے کی طرف بھاگ کر جاؤ۔ فائرنگ کی آواز سن کی فوجی آئیں گے۔"

میں دوڑ کر اس طرف گیا جدھر سے فوجی چلے آ رہے تھے۔ ادھر آگے راہداری بند تھی۔ سامنے ایک سٹور روم تھا جس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں چھلانگ لگا کر اندر گھس گیا۔ وہاں ہر قسم کے لوہے کے اوزار اور خالی ڈرم وغیرہ پڑے تھے مگر آدمی کوئی نہیں تھا۔ میں بھاگ کر واپس آگیا۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے اس وقت پراجیکٹ پر یہی دو آخری گارڈز بچے تھے۔"

شیر باز نے فائر کر کے دونوں کوٹھڑیوں کے تالے توڑ ڈالے۔ میں اور
ٰیر باز اکٹھے ایک کوٹھڑی میں گھس گئے۔ اندر ننگے فرش پر پھٹے پرانے کمبلوں
میں لپٹے ہمارے تین کشمیری مجاہد بے بسی اور زخمی حالت میں پڑے تھے۔ شیر باز
نے کشمیری زبان میں انہیں بتایا کہ ہم انہیں نکالنے آئے ہیں۔ ان مجاہدوں کے
ن مردہ میں جیسے جان پڑے گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سوجھے
ہوئے تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ ہم
انہیں نکال کر راہداری میں لائے۔ اس دوران کمانڈو مجید دوسری کوٹھڑی سے
ہی دو مجاہدوں کو سہارا دے کر باہر لے آیا تھا۔

شیر باز نے تیسری کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم اس کا تالا توڑ کر اندر
گئے تو اندر تین کشمیری مجاہد خواتین کونے میں سمٹی سہمی ہوئی کمبل اوڑھے بیٹھی
تھیں۔ کمانڈو شیر باز نے انہیں کشمیری زبان میں کہا۔

"پیاری بہنو! ہم تمہارے کمانڈو بھائی ہیں۔ جلدی سے ہمارے ساتھ
نکل چلو۔"

ہم نے انہیں بھی ساتھ لیا اور بجائے دوسرے کمروں میں سے گذر کر
ایمرجینسی گیٹ کے طرف جانے کے ہم اسی سرنگ کے خفیہ دروازے کی طرف
راہداری میں چل پڑے۔ یہی وہ راستہ تھا جدھر سے میجر ارجن سنگھ مجھے اپنے
ساتھ لے کر باہر نکلا تھا۔ دوسرا راستہ لمبا تھا اور ادھر خطرہ بھی تھا کہ فائرنگ کے
دھماکوں کی وجہ سے پراجیکٹ کے باہر سے کوئی پٹرول پارٹی اندر نہ آگئی ہو۔ ہم
سرنگ میں جتنا تیز چل سکتے تھے۔ چلتے اور اپنے ساتھی مجاہدوں کو بھی چلاتے
آگے بڑھ رہے تھے۔ شیر باز نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں حیدر علی؟"

میں نے کہا۔

"سر! یس سر۔"

تیس پینتیس قدم چلنے کے بعد سامنے کی جانب سے تازہ اور سرد ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ وہاں سے سرنگ کا خفیہ دہانہ قریب ہی تھا۔ ہم انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ سے باہر نکل آئے۔ یہاں ہمیں کوئی سنتری نظر نہ آیا۔ کمانڈو شیر باز نے مجھ سے کہا۔

"میں ان ٹیلوں سے واقف ہوں۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر دوسرے ٹیلے پر صمد بٹ کے پاس جاتا ہوں۔ تم اور مجید بٹ واپس ان کوٹھڑیوں میں جاؤ اور جتنا ڈائنامیٹ بچا ہے وہاں لگا آؤ۔ گو۔"

"سر! یس سر۔"

کمانڈو مجید بٹ نے کہا اور مجھے ساتھ لے لیا۔ شیر باز کشمیری مجاہدوں کو لے کر رات کی تاریکی میں ایک طرف غائب ہوگیا۔ ہم دونوں واپس راہداری کی سرنگ میں گھس گئے۔ کمانڈو مجید بٹ نے ڈائنامائیٹ والا تھیلا کاندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ شارٹ گن اس کے ہاتھ میں بھی تھی اور میرے ہاتھ میں بھی تھی۔ جن کوٹھڑیوں سے ہم اپنے مجاہدوں کو نکال کر لائے تھے۔ ان کوٹھڑیوں کے قریب ہی آمنے سامنے دو محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سرنگوں اور راہداری کو سہارا دینے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ کمانڈو مجید بٹ وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے تھیلے میں سے ڈائنامائیٹ کی سٹکوں کے دو مٹھے نکال کر محرابوں کے نیچے ایک طرف ٹیپ سے چپکا دئے اور بولا۔

"حیدر علی! ابھی میرے پاس کافی ذخیرہ ہے۔ آگے چلو۔ اس قسم کی محرابیں آگے بھی ہوں گی۔ یہ سارا بارود یہیں لگانا ہے۔"

اب میں آگے جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو راہداری میں دونوں فوجیوں کی لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ دوسرے ان فوجیوں نے سٹین گنوں سے ہم پر جو فائرنگ کی تھی۔ اس کی آواز ضرور پراجیکٹ میں دور تک گئی ہوگی۔ خطرہ تھا کہ ادھر سے کوئی تازہ فوجی پارٹی معاملے کی کھوج

لگانے نہ آ جائے مگر میں نے مجید بٹ سے اس شک شبے کا اظہار نہ کیا اور اس کے ساتھ راہداری میں آگے چل پڑا۔ راہداری کے آخر میں ایک محراب تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے ستون تھے۔ کمانڈو مجید بٹ نے دو بم وہاں بھی پلاسٹک کی ٹیپ چپکا دیئے۔ وہ اور آگے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے کہا۔

"مجھے آگے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"

وہ بولا۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔ میرے پاس ڈائنامائیٹ کی دو سٹکیں باقی ہیں۔ آؤ۔"

میں اس کے آگے ہو گیا۔ کیونکہ یہ سرنگ میری دیکھی بھالی تھی اور میں ادھر سے ایک بار پہلے بھی گزر چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے ایک راہداری پراجیکٹ کے صدر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ اس طرف جانا واقعی خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اگر ادھر سے کوئی پٹرول پارٹی آ جاتی ہے اور ہم پکڑے جاتے ہیں تو لازمی بات تھی کہ وہاں فوراً جانچ پڑتال کرنے والی فوجی پارٹی پہنچ جاتی اور ڈی ٹیکٹروں سے ٹریکنگ کرنے کے بعد وہ لوگ ہمارے لگائے ہوئے ایک ایک بم اور دھماکہ خیز مواد کے کیپسول اپنے قبضے میں کر لیتے اور یوں ہمارا سارا مشن ایک دم ناکام ہو جاتا۔ مگر میں کمانڈو مجید بٹ کی ضد کے آگے نہ جانے کیوں مجبور ہو گیا تھا۔ ہم چند قدم آگے گئے تھے کہ اچانک ہمارے پیچھے سے کسی نے فوجی انداز میں کاشن دیا۔

"ہالٹ!"

ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک فوجی جس کی وردی خون میں لت پت تھی اور جو ایک طرف کو جھکا ہوا تھا ہاتھ میں سٹین گن لئے راہداری کے درمیان میں کھڑا ایسے جھول رہا تھا جیسے اس پر کسی نے جادو ٹونہ کیا ہوا ہو۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی سنتری تھا جس کو میں نے دو گولیاں ماری تھیں۔ ایک

پیٹ میں اور ایک سینے میں دل کے پاس۔ خدا جانے وہ کیسے زندہ بچ گیا تھا اور اب وہاں سے اٹھ کر لڑکھڑاتا' ڈگمگاتا ہوا ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تو ہم دونوں حیرت زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ کمانڈو مجید بٹ نے چلا کر مجھے کہا۔

"شوٹ کر دو۔"

جیسے ہی میں نے شارٹ گن سیدھی کی اس نیم مردہ سنتری نے بھی سٹن گن کا رخ میرے طرف کر دیا۔ اب کمانڈو مجید بٹ نے بھی اسے اپنی شارٹ گن کے نشانے میں لے لیا اور اسے سختی سے کہا۔

"گن پھینک دو۔ گن پھینک دو۔"

نیم مردہ سنتری کسی بھوت کی طرح ڈولنے لگا۔ میری انگلی شارٹ گن کے ٹریگر پر بے حس ہو گئی تھی۔ میں کوشش کے باوجود ٹریگر نہ دبا سکا۔ اس دوران مجید بٹ کی شارٹ گن نے فائر کیا۔ گولی نیم مردہ فوجی کے ماتھے پر جا کر لگی اور وہ پیچھے کر طرف گر پڑا۔

"نکل چلو۔"

یہ کہہ کر کمانڈو مجید بٹ راہداری کے دہانے کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ ہم راہ داری کے خفیہ دہانے سے باہر آ گئے تو مجید بٹ رک گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اوپر ---- اوپر ٹیلے کی جانب۔"

وہ آہستہ سے کہنے لگا۔

"میں باقی کا بارود یہاں لگاؤں گا۔"

اور وہ خفیہ دروازے کی محرابی دیوار کے پاس بیٹھ کر پتھر کے ساتھ دھماکہ خیز مواد کی بچی ہوئی سٹکیں چپکانے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس خفیہ دروازے کے آس پاس رات کی ڈیوٹی پر کوئی نہ کوئی فوجی ضرور ہو گا۔ میں ایک طرف

اندھیرے میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ میں ٹیلے کی سامنے والی ڈھلان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں جھاڑیاں بھوتوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ میں نے مجید بٹ سے سرگوشی میں مگر سختی سے کہا۔

"دیر نہ لگاؤ۔ دیر نہ لگاؤ۔ جلدی کرو۔"

مجھے اندھیرے میں کمانڈو مجید بٹ خفیہ دہانے کی دیوار کے پاس بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ میں نے شارٹ گن نیچے کر لی تھی مگر ابھی تک اندھیرے میں ہی ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہی بیٹھا تھا۔ حالانکہ وہاں بظاہر کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن احتیاط ہر حالت میں ضروری تھی۔ یہ ہماری ٹریننگ کا پہلا سبق تھا۔

اچانک مجھے ایک ذرا اوپر ایک انسانی سایہ دکھائی دیا۔ اس سے پیشتر کہ میں اس کو غور سے دیکھتا کہ یہ کوئی ہمارا ساتھی ہے یا دشمن کا آدمی ہے۔ سائے نے چھلانگ لگائی اور دوسرے لمحے وہ مجید بٹ کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ جس کا رخ اس نے مجید بٹ کی طرف کیا اور بلند آواز سے کہا۔

"خبردار ہاتھ اوپر اٹھا لو نہیں تو شوٹ کر دوں گا۔"

میں ایک لمحے کے لئے تو سکتے میں آگیا۔ پھر فوراً" شارٹ گن کا رخ اس آدمی کی طرف کر دیا جو یقیناً" انڈین آرمی پٹرول پارٹی کا کوئی سنتری تھا اور سرنگ کے اس دہانے پر رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا کہ مجید بٹ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے تھے۔ شاید اسے اطمینان تھا کہ میں دشمن کو سنبھال لوں گا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میں نے سوچا کہ اگر میں نے فائر کر دیا تو بہت ممکن ہے کہ گھبراہٹ میں یا گولی لگنے کے دھچکے سے اس سنتری کی انگلی جو ٹریگر پر ہے دب جائے۔ ایسی صورت میں گولیوں کا پورا برسٹ کمانڈو مجید بٹ کے جسم سے پار ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں مجھے مجید بٹ کا سایہ زمین سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ سنتری نے کڑک کر کہا۔

"بیٹھے رہو۔ بیٹھے بیٹھے دو قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

اصل میں سنتری یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ آدمی یہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ میں نے رات کے اندھیرے میں مجید بٹ کو بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹتے دیکھا۔ سنتری کی سٹین گن کا رخ مجید بٹ کی طرف ہی تھا اور وہ بالکل فائرنگ پوزیشن میں تھا۔ اسی صورت حال میں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکا تھا۔ یہ بھی ہمیں کمانڈو کی ابتدائی ٹریننگ میں بتایا گیا تھا۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے حوالدار۔ کون بیٹھا ہے یہاں؟"

سنتری یہ سمجھا یہ میں کوئی اسی کی یونٹ کا فوجی ہوں۔ اس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ میں نے فائر کر دیا۔ گولی میری شارٹ گن سے نکل کر اندھیرے میں خدا جانے اس کی گردن میں لگی یا کھوپڑی میں لگی یا ریڑھ کی ہڈی پر لگی' وہ ایک دم دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ کمانڈو مجید بٹ غصے میں بولا۔

"تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی تھی۔ اگر وہ مجھے شوٹ کر دیتا تو؟"

میں نے کہا۔

"خدا کے لئے اب یہاں سے نکل چلو۔ یہ گارڈ سنتری تھا۔ یہاں کوئی دوسرا سنتری بھی موجود ہو سکتا ہے۔ چلو چلو۔"

یہ کہہ کر کمانڈو مجید بٹ سامنے والے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ٹیلے کے اوپر جا کر ہم دوسری طرف اتر گئے اور وہاں سے بائیں طرف کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس ٹیلے کے پاس آ گئے جدھر انڈرگراؤنڈ پراجیکٹ کا ایمرجنسی گیٹ تھا اور جس کی چوٹی پر کمانڈو شیر باز خاں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق کمانڈو شیر باز نے کشمیری مجاہدوں اور تینوں خواتین کو صمد بٹ کے ساتھ رات کے اندھیرے میں خفیہ کمیں گاہ کی طرف روانہ کرکے ہمارا اسی جگہ چھپ کر انتظار کرنا تھا۔

ہم ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ یہ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھ۔ ایک جگہ برف پر

سے میرا پاؤں پھسل گیا۔ اگر میرا ہاتھ جھاڑیوں میں نہ پڑتا تو میں پھسلتا اور لڑکھڑاتا ہوا کافی نیچے تک جا سکتا تھا۔ مجید بٹ نے میری آواز سنی تو رک گیا۔ جلدی سے پلٹ کر میرے پاس آیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ ہم اب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چڑھائی چڑھنے لگے۔ ٹیلے کی چوٹی کے قریب پہنچ کر میں نے اپنے منہ سے بلبل کی آواز نکالی۔ ایک دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد ٹیلے کے اوپر سے بھی بلبل کی آواز آئی۔ یہ سگنل کمانڈو شیر باز نے دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سب ٹھیک ہے۔ اوپر چلے آؤ۔ ہم ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بھی ہمیں غافل نہیں ہونا تھا۔ ہر حالت میں ہمیں احتیاط اور چوکسی کی ضرورت تھی۔ ہم ابھی تک دشمن کے علاقے میں تھے اور کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک طرف سے انسانی سایہ ہماری طرف بڑھتا ہوا آیا۔ اس نے دور ہی سے آہستہ سے کہا۔

"اوکے۔"

اور سایہ ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ یہ ہمارا اس کمانڈو آپریشن کا لیڈر کمانڈو شیر باز خان تھا۔ اس نے کمانڈو مجید بٹ سے پوچھا۔

"سب کام ٹھیک طریقے سے ہوگیا ہے؟"

"یس سر! بالکل ہوگیا ہے۔"

"کوئی سٹک بچی تو نہیں؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"سر! دو سٹکیں بچی تھیں وہ میں نے سرنگ کے دروازے کی دیوار سے چپکا دی ہیں؟"

"کون سا سرنگ کا دروازہ؟"

کمانڈو شیر باز نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔ تب ہم نے اسے بتایا کہ ہم ایمرجنسی گیٹ کی طرف سے نہیں آئے بلکہ دوسری سرنگ والے خفیہ

دروازے سے آئے ہیں جہاں سے مجھے میجر ارجن سنگھ لے کر آیا تھا۔ اس راستے میں ہمیں جن سنتریوں کو ٹھکانے لگانا پڑا تھا ہم نے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

کمانڈو شیر باز نے آہستہ سے کہا۔

"ہم اسی سرنگ کے دہانے کے قریب ہی ہیں۔ ویسے بھی اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہمارا کمانڈو آپریشن ابھی تک کامیاب ہے۔ چلو آ جاؤ۔"

ہم ٹیلے کی دوسری جانب ڈھلان اترنے لگے۔ نیچے آکر ہم ایک کھڈ کے اوپر ٹیلے کی دیوار کے ساتھ بنی ہوئی چھوٹی پگڈنڈی پر سے ہوتے ہوئے ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔ اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اردگرد کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے سخت سرد رات میں دھند کی چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ کمانڈو شیر باز نے رک کر اندھیرے میں پہاڑیوں کا جائزہ لیا اور ایک طرف اشارہ کرکے بولا۔

"ہم اس پہاڑی پر جائیں گے۔"

یہ پہاڑی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی مگر ہم کافی دیر تک چلتے رہے تب کہیں جاکر اس پہاڑی کے دامن میں پہنچے۔ یہ پہاڑی ٹیلے کی شکل میں دوسری پہاڑیوں سے منسلک تھی۔ یہاں برف پگھل چکی تھی۔ ہم پہاڑی کے اوپر آئے تو میں نے دیکھا کہ دوسری جانب چھوٹی سی وادی رات کے اندھیرے میں سیاہ پیالے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس وادی کو اندھیرے میں بھی پہچان لیا۔ یہ وہی چھوٹی سی وادی تھی جس کے نیچے زمین کے اندر مقبوضہ انڈین آدمی نے اعصابی گیس کی تیاری کا خفیہ پلانٹ لگا رکھا تھا اور جہاں ہم بارود لگا کر آ رہے تھے۔ کمانڈو شیر باز خان نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا ریموٹ کنٹرول نکال لیا۔ اس نے کمانڈو مجید سے پوچھا۔

"ریموٹ کنٹرول کی ڈسکیں لگا دی تھیں ناں؟"

"یس سر!"۔ کمانڈو مجید نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ میں نے جتنے پراجیکٹ کو اپنے کنٹرول میں کیا تھا وہاں ناپ تول کر تین جگہوں پر ڈسکیں لگائی ہیں جن کا تعلق ڈائریکٹ آپ کے ریموٹ کنٹرول سے ہے۔ تینوں ڈسکوں کے ساتھ انتہائی زبردست دھماکہ خیز مواد لگایا گیا ہے۔ باقی جہاں جہاں بارودی سٹکیں لگائی ہیں۔ وہ ڈسکوں کے دھماکے سے خود بخود پھٹ جائیں گی۔"

کمانڈو مجید بٹ دھماکہ خیز مواد کی تکنیک کا ماہر تھا۔ کمانڈو شیر باز خاموش رہا۔ اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک بار پھر کمانڈو مجید بٹ سے پوچھا۔

"تم سے ان جانے میں بھی کوئی غفلت تو نہیں ہوئی؟"

کمانڈو مجید بٹ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"نو سر۔ بالکل نہیں۔ ایک ذمے دار کمانڈو بھول کر بھی غلطی نہیں کرتا۔"

کمانڈو شیر باز نے نیچے وادی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وادی پر دھند کے بادل چھانے لگے تھے۔ ایک عجیب سا مرگ آلود سکوت وہاں طاری تھا۔ یہ موت سے پہلے کا سکوت لگتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ساری وادی زمین بوس ہونے سے پہلے دم بخود ہو گئی ہے۔ کمانڈو مجید بٹ نے شیر باز سے پوچھا۔

"سر! آپ کو یقین ہے کہ اس انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ میں اعصابی گیس کا جو ذخیرہ ہے۔ تباہی کے بعد اس کی گیس باہر نہیں نکلے گی؟"

کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"میں نے جس طریقے اور تکنیک کے ساتھ اپنی نگرانی میں تم سے بارودی کیپسول اور ڈائنامائیٹ کی ڈسکیں لگوائی ہیں۔ وہ ہمارا آزمایا ہوا طریقہ ہے۔ اسی تکنیک سے یورپ اور امریکہ کی کئی کئی منزلہ پرانی بلڈنگوں کو زمین

بوس کیا جاتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب میں ریموٹ کنڑول کا سرخ بٹن دباؤں گا تو ایک زمین دوز دھماکہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی گڑگڑاہٹ کی آوازیں اٹھیں گی۔ جیسے زمین اندر سے پھٹ رہی ہو۔ پھر کئی دھماکے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی وادی کی زمین بیٹھ جائے گی اور انڈین آرمی کا آزاد کشمیر اور پاکستان کے خلاف بنایا ہوا منصوبہ اور انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کروڑوں من مٹی کے نیچے دفن ہو جائے گا۔ اعصابی گیس کا سارے کا سارا ذخیرہ بھی اس مٹی میں دفن ہو جائے گا۔ اگر زمین کے پھٹنے سے تہہ خانے کی سرنگوں میں کسی سرنگ میں سے پانی نکل آیا تو پھر ساری کی ساری گیس کا اثر زائل ہو جائے گا۔"

کمانڈو مجید بٹ کہنے لگا۔

"سر! میں نے جتنی طاقت کا دھماکہ خیز مواد لگایا ہے اس سے زمین کے اندر جہاں بارود پھٹے گا کنوئیں بن جائیں گے اور پانی نکل آئے گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ یہ ساری وادی صبح تک جھیل کی شکل اختیار کر چکی ہوگی۔"

شیر باز خان نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اس سے گیس کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

پھر اس نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور آہستہ سے کہا۔

"دشمن کے مذموم منصوبے کے خاتمے کا وقت پورا ہوگیا ہے۔ میں بٹن دبانے لگا ہوں۔"

ہم ٹیلے کے اوپر گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ مجھے اپنے دوسرے ساتھیوں کا پتہ نہیں لیکن میں نے بیٹھے بیٹھے جھاڑیوں کو پکڑ لیا۔ کیونکہ زیر زمین دھماکے سے وہاں زلزلے کی کیفیت کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ کمانڈو شیر باز نے دس سے الٹی گنتی شروع کر دی۔ جب گنتی پوری ہو گئی اس نے اس ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی پہاڑی ٹیلہ ذرا سا ہلا۔ جیسے کسی بہت بڑے جن نے اسے دھکا دے دیا ہو۔ پھر ٹیلے کو بہت ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ کمانڈو مجید بٹ نے دھیمی آواز میں پرجوش نعرہ لگایا۔

"یا علیؑ!"

نیچے وادی میں گڑگڑاہٹ کی آواز گونجنے لگی۔ ہم نیچے دیکھ رہے تھے۔ وادی میں دھند چھٹ چکی تھی اور درخت اور جھاڑیاں سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ ہم اپنی جگہ سے بری طرح ہل گئے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نیچے وادی میں دیکھا۔ وہاں اب درختوں اور جھاڑیوں کے سیاہ دھبے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کی جگہ گرد و غبار کے بادل اوپر کو اٹھ رہے تھے۔ کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"واپس چلو۔ مشن مکمل ہوگیا ہے۔"

ہم اٹھے اور ٹیلے کی دوسری جانب سے اترنے لگے۔ ٹیلے کو معمولی معمولی جھٹکے اب بھی لگ رہے تھے۔ وادی کی طرف سے ایسی گڑگڑاہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی بہت بڑا عفریت چٹانوں کے گرنے سے ان کے

نیچے آ کر بری طرح بلبلا رہا ہو۔ نیچے سے لوگوں کی آوازیں اور ایک دو فوجی گاڑیوں کے سٹارٹ ہونے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ ہم ٹیلے سے اتر کر تیز تیز چلتے شارٹ کٹ اور خفیہ پہاڑی راستے پر ہو گئے۔ جب ہم بڑی سڑک کے قریب آئے تو فوج کی تین چار گاڑیاں طوفانی رفتار کے ساتھ گذر گئیں۔ کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں کامیابی عطا کی۔"

آدھے گھنٹے کے بعد ہم زمین دوز تہہ خانے میں بیٹھے تھے۔ صمد بٹ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ زیر زمین پراجیکٹ کے دھماکے شہر میں بھی سنائی دیئے تھے۔ صمد بٹ نے کہا۔

"جب زمین لرزنے لگی تو میں سمجھ گیا کہ کمانڈو آپریشن کامیاب رہا ہے۔"

پھر اس نے بتایا کہ زخمی کشمیری مجاہدوں اور مجاہد خواتین کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ کمانڈو شیر باز کہنے لگا۔

"دھماکوں کے بعد فضا میں گیس کی بو بالکل نہیں تھی۔ گیس کی بو یہاں کی فضا میں بھی محسوس نہیں ہو رہی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے لگائے ہوئے ڈائنامائیٹ کے پھٹنے سے وہاں گہرے گڑھے بلکہ کنوئیں بن گئے ہیں اور پانی نکل آیا ہے۔ پانی نے گیس کے مضر اثرات کو زائل کر دیا ہے۔"

کمانڈو مجید بولا۔

"میں نے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر دھماکہ خیز مواد تیار کیا تھا۔"

میں نے کہا۔

"صبح پتہ چل سکے گا کہ وہاں زمین کی کیا حالت ہو گئی ہے۔"

شیر باز کہنے لگا۔

"بھارتی فوج کی یہ بہت بڑی شکست ہے کہ کشمیری مجاہد ان کے اتنے

اہم اور خفیہ اور قیمتی پراجیکٹ کو پورے کا پورا تباہ کر گئے ہیں۔ میرا خیال ہے فوج صبح تک اس سارے علاقے کو گھیر کر گھر گھر تلاشی شروع کر دے گی۔"

کمانڈو مجید بٹ نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے کہ ہمیں شمالی پہاڑیوں کے جنگل والی خفیہ کمین گاہ میں چلے جانا چاہئے؟"

اس تجویز پر میں بھی خاموش ہوگیا اور کمانڈو شیر باز بھی سوچنے لگا۔ کمانڈو مجید نے مزید اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"ہم شہر کے قریبی علاقے میں ہیں۔ اگر ہم یہاں پکڑے گئے تو اس بستی کے سارے مکینوں کی کم بختی آ جائے گی۔ بھارتی فوجی سب کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ ابھی رات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔"

کمانڈو شیر باز اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو یہاں سے چلے چلو۔"

تہہ خانے سے نکل کر ہم اوپر آئے۔ مکان کے مالک کو ساری صورت حاصل بتائی۔ اس نے بہت کہا کہ آپ اسی جگہ چھپے رہیں۔ بھارتی فوجیوں کو آپ کا پتہ نہیں چل سکے گا مگر شیر باز فیصلہ کر چکا تھا۔ اس وقت آسمان پر پچھلے پہر کی نیلی نیلی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ ہم بستی کی گنجان اور اونچی نیچی گلیوں کے اندھیرے میں چھپتے چھپاتے وہاں سے نکل گئے۔ شہر سری نگر کو جو سڑک جاتی تھی۔ وہ ہمارے دائیں جانب کافی دور تھی مگر اس پر فوجی گاڑیوں کے گذرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ فوج کو تو مصیبت پڑ گئی ہوگی۔ ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس انٹیلی جنس الرٹ ہو چکی ہوگی۔ کمانڈو شیر باز نے کھیت کے اندھیرے میں آ کر کہا۔

"کچھ پتہ نہیں کہ آگے انڈین فوج کے آدمی چھپے ہوئے ہوں۔ ہمیں

روٹ بدلنا ہوگا۔"

وہ ہمیں گائیڈ کرتے ہوئے کھیتوں کے پہلو سے نکال کر ایک میدان میں لے آیا جس کے آخری کنارے پر درختوں کے جھرمٹ اندھیرے میں سیاہ بادل کی طرف دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں زمین پر بہت جگہوں پر برف کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔

شہر کے شمالی جنگل والی خفیہ کمیں گاہ اخروٹ' چنار اور چیڑھ کے درختوں میں گھرے ہوئے ایک اونچے پہاڑ کے اندر ایک قدرتی غار تھی۔ یہ راستہ بڑا دشوار گذار تھا اور زمیں سے باہر نکلی ہوئی نوکیلی چٹانوں اور گہری گھاٹیوں میں سے ہو کر اوپر پہاڑ کے دامن تک جاتا تھا۔ کشمیری حریت پرست مجاہد وہاں موجود تھے۔ راستے میں دو تین جگہوں پر انہوں نے ہمیں روکا اور شیر باز اور کمانڈو مجید بٹ کو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ کر واپس اپنی پوزیشنوں میں چلے گئے۔ یہ ایک قدرتی غار تھا۔ پہاڑوں کے اندر جو قدرتی غار ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر انسانی عقل بعض اوقات حیران رہ جاتی ہے۔ یہ سرنگ کی طرح کے غار نہیں ہوتے کہ چھت بھی کچی ہو اور زمین بھی کچی ہو اور دیواروں پر جالے لگے ہوں اور چھت سے بھی جالے لٹک رہے ہوں۔ یہ بڑے صاف ستھرے غار ہوتے ہیں۔ زمیں پر چھوٹے بڑے گول گول اور نوکیلے پتھروں کا فرش بچھا ہوتا ہے۔ اونچی چھت ہوتی ہے اور اوپر دیکھو تو گول گول پتھروں کی محرابیں باہر کو نکلی ہوتی ہیں۔ دیواریں چٹانوں کی ہوتی ہیں۔ یہ کشادہ اور نیم روشن ہوتے ہیں۔ چھت کے پتھروں میں کسی نہ کسی سوراخ سے روشنی اندر آ رہی ہوتی ہے۔ بارش ہو تو ان سوراخوں سے پانی چھوٹی چھوٹی آبشاروں کی طرف غار میں آنے لگتا ہے۔ غاروں کے فرق پر پتھروں کے بہنے کے نشان بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ چلتے چلتے کہیں غار میں بڑا دالان آ جاتا ہے۔

قدرتی غار کے ایسے ہی ایک دالان میں ہمارے مجاہدوں نے اپنا خفیہ

ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ یہاں بڑے بڑے چٹانی پتھروں کی سیڑھیاں اوپر چھت تک چلی گئی تھیں۔ اوپر جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں۔ وہاں ایک جانب پہاڑ میں گول سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں سے اس وقت رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ہلکی نیلی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہ سوراخ پہاڑی ڈھلان کے پہلو میں باہر نکلتا تھا۔ جہاں دن اور ات کے وقت ہمارا ایک مجاہد پہرے پر موجود رہتا تھا۔ غار کے دالان میں چٹانوں کے بڑے بڑے قدرتی ستون بنے ہوئے تھے۔ ان ستونوں کے پیچھے ایک جگہ نمدوں اور کمبلوں کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ یہاں فضا نیم گرم تھی اور باہر والی سخت سردی نہیں تھی۔ ہم نے وہاں پہنچ کر اپنا کمانڈو لباس اتار کر دوسرے کپڑے پہنے اور کمبل اوڑھ کر بے سدھ ہو کر پڑ گئے۔

سخت تھکے ہوئے تھے۔ ایسی گہری نیند آئی کہ جب ایک مجاہد نے ہمیں اٹھایا تو اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم نے وہیں ناشتہ کیا اور سماوار میں سے گرم گرم کشمیری چائے پی۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے صمد بٹ آگیا۔ وہ خوش بھی تھا اور پریشان بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ شہر میں فوج ہی فوج پھر رہی ہے۔ انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ کی تباہی کو بھارتی ملٹری انٹیلی جنس چھپا رہی ہے مگر سری نگر کے تمام مسلمانوں کو پراجیکٹ کی تباہی کا علم ہوگیا ہے اور لوگ خوش ہیں لیکن بھارتی فوج نے بے دریغ پکڑ دھکڑ شروع کر دی ہے۔ پراجیکٹ والے علاقے کے آس پاس کی دیہاتی بستیوں میں فوجی گھروں میں گھس کر تلاشی لے رہی ہے۔ کچھ لوگوں کو یونہی شبے میں پکڑ کر بھی لے گئی ہے۔ شیر باز نے پوچھا۔

"جہاں انڈر گراؤنڈ پراجیکٹ تھا اس جگہ کی کیا پوزیشن ہے؟"

صمد بٹ نے بتایا کہ وہاں جھیل بن چکی ہے۔ لیکن فضا میں گیس کی ہلکی ہلکی بو کسی وقت محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے ابھی تک کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا۔ اس گیس کی وجہ سے شہر کے لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ بھارتی فوجی زمین کے اندر گیس کے بم بنا رہے تھے۔ جسے کشمیری مجاہدوں نے تباہ

کر دیا ہے۔ کمانڈو مجید بٹ نے پوچھا۔

"اپنے حریت پرست مجاہدوں میں سے تو کوئی نہیں پکڑا گیا؟"

صمد بٹ نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"کوئی نہیں پکڑا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ رات کے پچھلے پہر جب زیر زمین پراجیکٹ میں پہلا دھماکہ ہوا اور زمین ہلی تو کشمیری مجاہد سمجھ گئے کہ ہمارے کمانڈوز نے بھارتی فوج کا کوئی بہت بڑا اسلحے کا ذخیرہ تباہ کیا ہے اور اب فوج پکڑ دھکڑ شروع کرے گی۔ چنانچہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے خفیہ ٹھکانوں پر روپوش ہو چکے تھے۔"

کمانڈو شیر باز نے صمد بٹ سے کہا۔

"میں تمہارے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ پریشانی کے اثرات بھی دیکھ رہا ہوں۔ کھل کر بتاؤ کیا بات ہے؟"

صمد بٹ نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

"بھارتی فوجی بابو شمس الدین کی بہو کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اس کی ایک ہفتہ پہلے شادی ہوئی تھی۔ جاتی دفعہ اس کے خاوند کو کہہ گئے ہیں کہ ادھر پاکستانی کمانڈو چھپے ہوئے تھے ان کو پکڑوا دو اور اپنی دلہن کو واپس لے جاؤ۔ دلہن کا نام نور بانو ہے اور اس کے خاوند کا نام غلام دین ہے۔ غلام دین اپنی دلہن کو چھڑانے کے ۔لئے بھارتی فوجیوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ انوہن نے اسے بہت بری طرح مارا پیٹا اور نور بانو کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور لے گئے۔"

یہ سن کر ہم سب کے خون کھول اٹھے۔ چہرے غصے سے لال سرخ ہو گئے۔ کمانڈو شیر باز نے دو تین بار اپنے ماتھے پر زور زور سے ہاتھ مارا۔ کمانڈو مجید بٹ نے جوش میں آ کر کہا۔

"ہم اس بے عزتی کا بدلہ لیں گے۔ ہم بھارتی فوجی افسروں کی ساری بیویوں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیں گے۔ مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں

ہو رہی۔"

کمانڈو شیر باز نے مجید بٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مجید بٹ! جو اس وقت تمہاری حالت ہے وہی حالت ہماری بھی ہے۔ لیکن جذبات کے جوش میں اٹھایا ہوا قدم ہمیں الٹا نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"تو پھر کمانڈو کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں گے؟"

کمانڈو شیر باز نے اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ایسا نہیں کریں گے۔ بابو شمس الدین کی بہو کو عزت آبرو کے ساتھ اس کے گھر واپس لائیں گے۔"

پھر اس نے صمد بٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"صمد بٹ! ابھی یہاں سے نکل جاؤ اور معلوم کرو کہ نور بانو کو کون سے فوجی کیمپ میں رکھا گیا ہے۔ یہ معلومات تمہیں ہر حالت میں اور بڑی جلدی حاصل کر کے مجھے بتانی ہوگی۔"

صمد بٹ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"سر! یس سر۔"

اور وہ مزید کوئی بات کیے غار کے دہانے کی طرف تیز تیز چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمانڈو مجید بٹ جو پیچ و تاب کھا رہا تھا کہنے لگا۔

"سر! اس طرح کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں کمانڈو ایکشن کر کے کسی بڑے بھارتی فوجی افسر کی بیوی یا بیٹی کو یرغمال بنانا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں شمس الدین کی بہو کی عزت بھی محفوظ رہے گی اور وہ واپس بھی آ جائے گی۔"

شیر باز نے کہا۔

"لیکن پہلے ہمیں معلوم تو ہو کہ نور بانو کون سے فوجی کیمپ میں ہے۔ اس کے بعد ہم کوئی ایکشن کر سکتے ہیں۔"

کمانڈو مجید بٹ پیچ و تاب کھاتا رہا مگر ہر کمانڈو ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے

اور اپنے لیڈر کے حکم کو مانتا ہے۔ میں بھی ایک ہفتے کی بیاہی ہوئی دلہن کے اغوا کا سن کر پریشان ہوگیا تھا اور میرے جذبات بھی بھڑک رہے تھے مگر میں بھی ڈسپلن کا پابند تھا اور اپنے لیڈر کمانڈو شیر باز خان کے حکم کے بغیر اپنے طور پر کوئی ایکشن نہیں لے سکتا تھا۔ بابو شمس الدین کی بہو کے اغوا کا سن کر ماحول پر افسردگی اور ہیجان کی کیفیت چھا گئی تھی۔ کمیں گاہ میں جو دوسرے مجاہد تھے وہ بھی شدید غصے کی حالت میں تھی مگر سب کمانڈ شیر باز کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ کوئی آرڈر دے تو وہ سب اس کی تکمیل کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگا دیں۔ ہم سے دوپہر کا کھانا نہ کھایا گیا۔ بس خالی چائے پی کر خاموش بیٹھے رہے۔ کمانڈو مجید بٹ نے تو چائے بھی نہیں پی تھی۔ وہ زخمی شیر کی طرح کبھی بیٹھ کر پہلو بدلنے لگتا اور کبھی اٹھ کر غار کے دہانے تک جاتا اور واپس آ کر کہتا۔ صمد بٹ ابھی تک نہیں آیا اور بیٹھ جاتا اور پہلو بدلنے لگتا۔ دوپہر کے بعد صمد بٹ واپس آگیا۔ کہنے لگا۔

"بابو شمس الدین کی بہو کو بھارتی فوج نے شاہی چشمے والی پہاڑی کے کیمپ میں رکھا ہوا ہے۔ میرے مخبر کی اطلاح کے مطابق نور بانو کیمپ کے کوارٹر گارڈ میں بند ہے۔ ہو سکتا ہے آج شام تک اسے کسی دوسری جگہ لے جائیں لیکن ابھی تک وہ شاہی چشمے والے کیمپ کے کوارٹر گارڈ میں ہی ہے۔"

ہم خاموش بیٹھے رہے۔ کسی نے ایک دو لمحے کوئی بات نہ کی۔ پھر کمانڈو شیر باز نے صمد بٹ سے پوچھا۔

"اس کیمپ کا کمانڈنگ آفیسر کون ہے؟"

صمد بٹ بولا۔

"میں نے اس کا بھی پتہ لگا لیا ہے۔ یہ سولہ جاٹ رجمنٹ کا کیمپ ہے۔ اس کیمپ کے کمانڈنگ آفیسر کا نام کرنل واڈیکر ہے۔ وہ مرہٹہ کرنل ہے اور بنگلور کا رہنے والا ہے۔"

شیر باز کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا کرنل واڈیکر یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہا ہے؟"

صمد بٹ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس کا پتہ کرنا پڑے گا۔"

شیر باز خان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تو پھر ابھی الٹے قدموں واپس جاؤ اور یہ پتہ کرکے آؤ کہ کرنل واڈیکر اکیلا رہ رہا ہے یا اس کی فیملی بھی اس کے ساتھ ہے۔ اگر فیملی اس کے ساتھ تو فیملی میں کون کون ہے اور عورتیں کتنی ہیں۔"

کمانڈو مجید نے بے تابی سے کہا۔

"اگر اس کی فیملی اس کے ساتھ ہے تو خدا کی قسم میں اس کی ساری فیملی کو اغوا کرکے لے آؤں گا۔"

شیر باز نے اس کی دبی زبان میں کہا۔

"مجید بٹ! اپنے اوپر قابو رکھو۔ ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جو تم چاہتے ہو لیکن ہم جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا چاہتے ہیں۔"

پھر اس نے صمد بٹ سے کہا۔

"یہ کام تمہیں آج ہی کرنا ہوگا۔ شام تک میں چاہتا ہوں کہ تم کرنل واڈیکر کی فیملی کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کرکے میرے پاس آ جاؤ۔"

"لیس سر!"

اور صمد بٹ چلا گیا۔ شام تک وقت گذارنا ہمارے لئے مشکل ہو گیا۔ بابو شمس الدین کی بہو ہماری عزت اور غیرت تھی۔ ہم بڑی جلدی اسے بھارتی درندوں کی قید سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کوئی زبردست کمانڈو آپریشن کرکے نور بانو کو بھارتی درندوں کی قید سے نکال

لائیں۔ شام تک کا وقت بڑی بیزاری اور بے چینی کی حالت میں گذرا۔ شام ہوتے ہی صمد بٹ واپس گیا۔ شیر باز نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیا خبر لائے ہو؟"

صمد بٹ نے بتایا کہ جاٹ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل واڈیکر کی عمر تیس بتیس سال ہے۔ اس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے اور وہ کیمپ میں اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ رہ رہا ہے۔ شیر باز خان نے اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں اور کہا۔

"خدا کی قسم! ہم کرنل کی بیوی کو اسی طرح اٹھا کر یہاں لائیں گے جس طرح کرنل واڈیکر کے فوجی بابو شمس الدین کی بہو کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

کمانڈو مجید بٹ کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"ہم آج ہی رات کمانڈو ایکشن کریں گے۔ ہم کیمپ کے کوارٹر گارڈ پر کمانڈو اٹیک کریں گے اور اپنی کشمیری بہن کو نکال کر لے آئیں گے۔"

صمد بٹ کہنے لگا۔

"یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔ کوارٹر گارڈ کیمپ کے درمیان میں ہے اور کیمپ کے گرد بھارتی فوج جگہ جگہ مورچے بنا کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

کمانڈو شیر باز نے قدرے برہم ہو کر مجید بٹ سے کہا۔

"تم اپنے ہوش و حواس میں کب آؤ گے؟ ہم کمانڈو ہیں۔ ہم کوئی فوجی پلاٹون نہیں ہیں کہ کیمپ پر دھاوا بول دیں۔"

میں نے اور شیر باز خان نے صمد بٹ کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ کرنل واڈیکر کی بیوی کے بارے میں پوری رپورٹ لا کر دے کہ اسکی معمولات کیا ہیں۔ وہ دن کے وقت کہاں کہاں جاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں کہاں کہاں پر ہیں اور وہ شاپنگ کرنے اکیلی جاتی ہے یا گارڈ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ صمد بٹ دوسرے دن جو معلومات لے کر آیا وہ یہ تھیں۔

"1- کرنل کی بیوی کا نام سرلا دیوی ہے۔"

"2- وہ شہر میں جب بھی شاپنگ کرنے آتی ہے تو دو فوجی سپاہی اس کی گاڑی کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

"3- سری نگر میں اس کی ایک ہی سہیلی روپا دیوی ہے۔ جو عورتوں کے کالج میں لیکچرار ہے۔ سرلادیوی دوسرے تیسرے روز اس کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ اس وقت کوئی گارڈ اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ خود گاڑی چلا کر جاتی ہے۔"

صمد بٹ نے اور بھی معلومات مہیا کی تھیں مگر کمانڈو شیر باز کی توجہ نمبر تین معلومات پر تھی۔ اس نے صمد بٹ سے پوچھا۔

"نور بانو اس وقت کہاں ہے؟"

صمد بٹ بولا۔

"میری اطلاع کے مطابق وہ ابھی تک کیمپ کے کوارٹر گارڈ میں ہی ہے۔ کرنل واڈیکر اس انتظار میں ہے کہ نور بانو کا شوہر یا اس کے رشتے دار کیمپ میں آ کر پاکستانی کمانڈوز کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کہاں چھپے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ نور بانو کو ان کے حوالے کر دے گا۔"

شیر باز نے صمد بٹ سے کہا۔

"او کے۔ صمد بٹ کرنل کی بیوی روپا دیوی کے مکان کا معلوم کرو کہ شہر میں کس جگہ پر ہے اور روپا کے گھر میں کون کون رہتا ہے۔"

صمد بٹ دوسرے دن واپس آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

صمد بٹ کی زبانی دوسرے روز روپا دیوی کے مکان کے بارے میں جو تفصیلات معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ روپا دیوی جو مقامی کالج میں لیکچرار ہے۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ اپنے کوارٹر میں رہتی ہے۔ وہ بیوہ ہے۔ اس کا مکان کیمپ کے جنوب میں تھوڑے فاصلے پر ایک نئی آبادی کے شروع میں ہے اور کرنل کی بیوی عام طور پر شام ہونے سے ذرا پہلے وہاں آتی ہے۔ دونوں سہیلیاں اکٹھی بیٹھ کر چائے پیتی ہیں۔ باتیں کرتی ہیں۔ انگریزی اور ہندوستانی فلموں کے گانے کیسٹ پلیئرز پر لگا کر سنتی ہیں اور شام ہوتے ہی کرنل کی بیوی سرلا دیوی واپس چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی گارڈ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی چھوٹی سی گاڑی خود ڈرائیو کر کے آتی ہے۔ اس دوران میں نے اپنے سانپ دوست سے بھی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اسے لکڑی کی چھوٹی ڈبی میں بند کر کے اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میرا دوست سانپ خدا جانے بیمار تھا یا اس کو کیا ہو گیا تھا کہ میرے بلانے پر بھی نہیں بولتا تھا اور اپنا سر بھی اوپر نہیں اٹھاتا تھا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"ہم سانپ کو بھی اس مشن پر ساتھ لے جائیں گے۔ وہ ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

کمانڈو شیر باز خان سانپ کے ڈرامے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ کہنے لگا۔

"جو کام مرد کر سکتے ہیں وہ سانپ نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی یہ تماشہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔
"آزما کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔"
کمانڈو شیر باز کمانڈو مجید بٹ کے ساتھ کمانڈو آپریشن کے منصوبے پر غور کر رہا تھا۔
"جیسے تمہاری مرضی حیدر علی۔ ویسے میں سانپ کو ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں ہوں۔"
ہمارا منصوبہ کرنل واڈیکر کی بیوی سرلا دیوی کو اس وقت اغوا کرنے کا تھا۔ جب وہ اپنی سہیلی روپا دیوی کے گھر آ رہی ہو۔ اس کے گھر آ چکی ہو یا اس کے گھر سے واپس جا رہی ہو۔ اس وقت اس کے ساتھ فوجی گارڈ نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ روپا دیوی کا گھر فوجی کیمپ کے قریب ہی تھا اور وہ علاقہ بھارتی فوج کے زیر اثر علاقہ تھا۔ میں نے انہیں غار میں چھوڑا اور خود غار کے باہر اس جگہ آگیا جہاں میں نے اپنے سانپ دوست کو ایک جگہ چھپایا ہوا تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں ایک بڑی اچھی جگہ بنا دی ہوئی تھی۔ وہاں سانپ کی ڈبی ذرا سی کھول کر رکھ دیتا تھا کہ سانپ کو تازہ ہوا بھی آتی رہے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ سانپ کو آکسیجن کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ میں جھاڑیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ہاتھ اندر کر کے لکڑی کی ڈبی باہر نکالی۔ وہ آدھی کھلی تھی۔ اسے پورا کھولا تو دیکھا کہ وہ خالی تھی۔ سانپ اس میں نہیں تھا۔
میں نے خیال کیا وہ ادھر ادھر چہل قدمی کرنے یا شکار کی تلاش میں نکل گیا ہوگا۔ میں نے خاص طرح کی سیٹی بجا کر اسے آواز دی۔ آواز دے کر بھی پکارا مگر سانپ نہ آیا۔ میں کچھ پریشان ہوا کہ کہیں اسے کوئی سپیرا نہ لے گیا ہو مگر اس طرف کبھی کوئی غیر آدمی نہیں آیا تھا۔ کبھی کسی سپیرے کے بین بجانے کی آواز نہیں سنی تھی۔ ڈبی میں نے جھاڑیوں میں ہی رہنے دی اور یہ سوچ کر غار میں آگیا کہ رات کو آ کر پھر دیکھوں گا تب تک سانپ آگیا ہوگا۔ رات کو

بھی میں نے جھاڑیوں میں آ کر دیکھا۔ ڈبی اسی طرح خالی پڑی تھی۔ سانپ کہیں نہیں تھی۔ میں نے اسے آواز دی۔ منہ سے ہلکی سی سیٹی بھی بجائی مگر سانپ وہاں ہوتا تو آتا۔ اسے تو جیسے زمین نگل گئی تھی۔ رات گزر گئی تھی۔ اگلے دن بھی آ کر دیکھا۔ سانپ کہیں نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سانپ کہیں چلا گیا ہے اور اب وہ میری پاس نہیں آئے گا۔ مجھے اسے بھول جانا چاہئے۔ اسی روز صمد بٹ نے آ کر اطلاع دی اور آج تیسرے پہر کرنل واڈیکر کی بیوی سرلا دیوی اپنی سہیلی کے ہاں جانے والی ہے۔ ہم اسی خبر کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے فوراً اپنی کمانڈو پارٹی تیار کی اور ضروری تفصیلات طے کرنے لگے۔ اس کمانڈو پارٹی میں شیر باز تھا' میں تھا اور کمانڈو مجید بٹ تھا۔ صمد بٹ نے اس پر اعتراض کیا کہنے لگا۔

"صرف ایک عورت کو اغوا کرنے کے لئے ہمیں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔"

شیر باز نے پوچھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مشن کے لئے میں اور کمانڈو بٹ ہی کافی ہیں۔ آپ کو اور کمانڈو حیدر علی کو اس ایکشن میں حصہ لینے کی ضروری نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سارا علاقہ بھارت کا فوجی علاقہ ہے۔ وہاں کسی قسم کے بھی حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔"

کمانڈو مجید بٹ نے بھی صمد بٹ کی تجویز اور اس کے خیال کی تائید کی اور کہا۔

"صمد بٹ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس مشن کے لئے ہم دونوں کافی ہیں۔"

میں اور شیر باز سوچنے لگے۔ شیر باز نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم براہ راست کمانڈو ایکشن میں حصہ نہیں لیں گے لیکن دور رہ کر نگرانی ضرور کریں گے۔"

یہی فیصلہ ہوا کہ میں اور شیر باز خان کرنل کی بیوی کے اغوا میں باقاعدہ طور پر حصہ نہیں لیں گے مگر کچھ فاصلے پر کمانڈو آپریشن کی نگرانی کریں گے۔ صمد بٹ نے دو اور مجاہد ساتھ رکھنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ اس کی اطلاع تھی کہ کرنل کی بیوی سہ پہر کو تین اور چار بجے کے درمیان فوجی کیمپ سے نکل کر اپنی سہیلی کے گھر کی طرف جائے گی۔ صمد بٹ اور مجید بٹ کو سارے رستے کا پتہ تھے۔ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ پھر بھی شیر باز نے ان کو ساتھ لیا اور واردات کی جگہ کا معائنہ کرنے نکل پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم نے عام شہریوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ہم جہاد کشمیر کے خطرناک ترین اور جانباز کمانڈو ہیں۔

جہاں کرنل واڈیکر کی بیوی کی سہیلی کا کوارٹر تھا اس سے کوئی آدھا کلومیٹر پہلے برساتی نالے کا ایک چھوٹا سا پل آتا تھا۔ برساتی نالہ خشک تھا۔ اس نالے کے ایک طرف گھاٹی تھی اور دوسری طرف ویران سا میدان تھا۔ جہاں جوار کی اونچی اونچی فصل کھڑی تھی۔ ہم نے کرنل کی بیوی کو اغوا کرنے کے لئے اس پل کا انتخاب کیا۔ کیونکہ لازمی بات تھی کہ اس پل کا موڑ مڑتے وقت کرنل کی بیوی گاڑی کی رفتار آہستہ کرے گی۔ میں نے کمانڈو مجید بٹ اور صمد بٹ کو پل کی دونوں جانب وہ جگہیں بتا دیں جہاں وہ پوزیشنیں لے کر گھات لگا کر بیٹھیں گے۔ ایک مجاہد اچانک سڑک کے درمیاں میں آ کر گر پڑے گا۔ سرلا دیوی گاڑی کو بریک لگائے گی۔ اس دوران کمانڈو مجید اور صمد بٹ اچانک نکل کر سرلا دیوی کو اس طرح قابو کریں گے کہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ پھر اسے اس کی گاڑی سے نکال کر کھیتوں کی فصل میں چھپی ہوئی اپنی جیپ میں لے آئیں گے اور وہاں سے اسے لے کر خفیہ کمیں گاہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

انسان پروگرام تو بڑے سوچ سمجھ کر بناتا ہے مگر کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ عین وقت پر جا کر کیا سے کیا ہو جائے اور سارا پروگرام اور منصوبہ دھرے کا دھرہ رہ جائے اور خود آدمی کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جائے لیکن اس قسم کی باتوں سے گھبرا کر ہم اپنا منصوبہ ترک نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے پورا سوچ سمجھ کر ناپ تول کر منصوبہ تیار کیا اور واپس آ گئے۔ صمد بٹ کو وہیں رہنے دیا کہ جس وقت کرنل کی بیوی کو اپنی سہیلی کے ہاں جاتے دیکھے تو فوراً ہمیں آ کر اطلاع کرے۔

کوئی تین سوا تین بجے صمد بٹ نے آ کر خبر دی کہ کرنل کی بیوی سرلا دیوی اپنی سہیلی روپا دیوی کے مکان کی طرف چلی گئی ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں ہی آئی تھی اور اس کے ساتھ کوئی فوجی گارڈ نہیں تھا۔ ہم نے فوراً تیاری شروع کر دی۔ ابھی دن کا وقت تھا۔ کمانڈو وردی پہننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے چھوٹے ہتھیاروں کا اسلحہ یعنی ایک ایک ریوالور ضرور اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ چونکہ رپورٹ کے مطابق کرنل کی بیوی کے ساتھ کوئی فوجی گارڈ نہیں آیا تھا۔ اس لئے ہم بڑی آسانی سے کرنل واڈیکر کی بیوی کو واپس آتے ہوئے اغوا کر کے لا سکتے تھے۔ ہم ایک ڈھکی ہوئی جیپ میں بیٹھ کر جائے واردات پر پہنچ گئے۔ جیپ ہم نے اونچی فصل کی اوٹ میں ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ خود ایک اونچی جگہ پر بیٹھ کر برساتی نالے کے پل کو دیکھنے لگے جہاں واپسی پر صمد بٹ، مجید بٹ اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے سرلا دیوی کو اٹھا کر اپنے قبضے میں کرنا تھا۔ ہم نے ہر ایک کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ہم سب کے پاس بھرے ہوئے آٹومیٹک پستول اور کچھ فالتو میگزین بھی تھا لیکن ہمیں یقین تھا کہ فائرنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔

اب ہمیں انتظار کرنا تھا۔ یہ کام بڑا صبر آزما تھا۔ دن ڈھلتا گیا۔ سورج سری نگر کی مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ نالے کے پل کے قریب ہی آمنے

سامنے گھات لگا کر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ کرنل کی بیوی سرلا دیوی کی گاڑی کے پل پر آتے ہی ایک مجاہد کو نکل کر اچانک سڑک کے درمیان گاڑی سے کچھ فاصلے پر گر پڑنا تھا۔ کرنل کی بیوی نے جلدی سے بریک لگانی تھی۔ اس دوران دونوں جانب سے کمانڈو مجید بٹ اور صمد بٹ نے پستول ہاتھ میں لئے نکل کر گاڑی میں گھس جانا تھا۔ کرنل کی بیوی کو پستول دکھا کر قابو کرنا تھا اور اسی گاڑی کو گھما کر اونچی فصل کی طرف لے آنا تھا۔ جہاں اونچی جگہ پر ہم بیٹھے تھے۔ گاڑی میں سے کرنل کی بیوی کو گھسیٹ کر نکالنا اور اسے اپنی جیپ میں ڈال کر وہاں سے نکل جانا تھا۔

ہمیں بعد میں انہیں خفیہ کمیں گاہ پر ملنا تھا اور اس کے بعد کرنل واڈیکر کو اطلاع بھجوانی تھی کہ اگر وہ اپنی بیوی کو واپس لینا چاہتا ہے تو شمس الدین کی بہو نور بانو کو ہمارے پاس پہنچا دے اور اپنی بیوی واپس لے جائے۔ اگر اس نے دو روز کے اندر اندر نور بانو کو عزت و آبرو کے ساتھ واپس نہ کیا تو اس کی بیوی کی لاش کے ٹکڑے اس کے کیمپ میں پہچا دیئے جائیں گے۔ ایسا ہم نے کرنا نہیں تھا کیونکہ کمانڈو کبھی کسی عورت پر خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو خواہ وہ دشمن کی بیوی اور ماں بہن کیوں نہ ہو' کبھی ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کا احترام کرتا ہے۔

ہماری نظریں سڑک پر لگی تھیں۔ صمد بٹ نے ہمیں بتایا تھا کہ کرنل واڈیکر کی بیوی جس گاڑی میں آتی جاتی ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہے اور وہ بھارت کی بنی ہوئی ماروتی کار ہے۔ جو چھوٹی ہوتی ہے۔ اچانک دور سے ہمیں سرخ رنگ کی ایک گاڑی پل کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ کرنل کی بیوی کی گاڑی ہے۔"

وہ بھی غور سے گاڑی کو دیکھنے لگا۔ ہم نے آٹو میٹک پستول جیبوں سے نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ گاڑی قریب آ رہی تھی۔ ابھی دن کی ہلکی ہلکی

روشنی تھی اور شام کا اندھیرا پوری طرح نہیں چھایا تھا۔ سڑک پر برف صاف کر دی گئی تھی۔ صرف گرین بیلٹ پر کہیں کہیں برف ڈھیریوں کی شکل میں موجود تھی۔ گاڑی قریب آئی تو اس میں بیٹھی ہوئی ایک سانولے رنگ کی ساڑھی والی عورت نظر آئی۔ گاڑی برساتی نالے کے پل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ پل کی قریب پہنچی ایک طرف سے ہمارا ایک مجاہد اچانک نکلا اور سڑک پر گر پڑا۔ گاڑی کو بریک لگی اور عین مجاہد کے اوپر آکر رک گئی۔ اس کے ساتھی ایک جانب سے کمانڈو مجید بٹ اور دوسری جانب سے صمد بٹ چیتے کی طرح اچھل کر آئے اور آتے ہی انہوں نے گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشوں کو پستول کے بٹ مار کر توڑ ڈالا اور چیخ کر کہا۔

"خبردار۔"

ہم نے دیکھا عورت اندر سہم کر ایک طرف ہوگئی تھی۔ ایک طرف سے مجید بٹ اور دوسری طرف سے صمد بٹ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈال کر دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ خدا جانے دروازہ لاک تھا یا وہ گھبراہٹ میں تھے۔ دونوں طرف سے کوئی بھی دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ دور کچھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ عورت نے چیخ ماری۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"مجھے کام خراب ہوتا نظر آ رہا ہے شیر باز۔"

شیر باز اوپر سے نیچے مجید بٹ اور صمد بٹ کی طرف دیکھ کر ہیجان خیز انداز میں کہہ رہا تھا۔

"جلدی کرو۔ جلدی کرو کیا ہوگیا ہے تمہیں۔"

اچانک کیمپ کی طرف سے ایک فوجی ٹرک آگیا۔ عورت کی چیخ و پکار کی آواز پر ٹرک نے ایک دم بریک لگا دی۔ اس وقت تک مجید بٹ کھڑکی میں سے آدھا اندر کار میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ ٹرک کے فوجیوں نے شاید اپنے آفیسر کمانڈنگ کرنل واڈیکر کی گاڑی اور اس کی بیوی کو پہچان لیا

تھا۔ ٹرک میں سے چھ سات فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودے اور انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پہلا برسٹ سیدھا صمد بٹ کو لگا جو گاڑی کا دروازہ کھولکر اندر گھسنے ہی لگا تھا۔ سٹین گن کا پورا برسٹ اس کے پیٹ میں سے نکل گیا۔ وہ وہیں دوہرا ہو کر سڑک پر گر پڑا۔ میں نے فائر کرنے کے لئے پستول سیدھا کیا تو شیر باز نے میرا ہاتھ نیچے کر دیا اور غصے میں کہا۔

"کھیل ختم ہوگیا ہے حیدر علی!"

کمانڈو مجید بٹ جو کھڑکی میں سے آدھا کار میں داخل ہو چکا تھا۔ فائرنگ کی آواز پر باہر کو نکلا تو چھ سات فوجیوں نے اسے اپنی اپنی سٹین گنوں کے برست مار کر چھلنی کر دیا۔ وہ بھی وہیں دہرا ہو کر گر پڑا۔ کشمیری مجاہد جو سڑک پر گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر بھاگا تو فوجیوں نے اس کی ٹانگوں میں برسٹ مار کر اسے بھی گرا دیا اور دوڑ کر پکڑ لیا۔

شیر باز خان جلدی سے یہ کہہ کر اٹھا۔

"یہاں سے نکل چلو۔"

ہم دوسری طرف سے دوڑ کر نیچے آئے۔ فصل کی اوٹ میں جیپ کھڑی تھی۔ وہاں اپنے دونوں مجاہد حیران پریشان کھڑے اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے سٹین گنوں کی فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ ہمیں اپنی طرف دوڑ کر آتے دیکھ کر وہ جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے۔ سمجھ گئے کہ معاملہ الٹا ہوگیا ہے۔ ہم بھی جیپ میں چھلانگ لگا کر بیٹھ گئے۔

"واپس چلو جلدی۔"

جیپ وہیں سے پیچھے کو مڑی اور سڑک پر شہر کی طرف دوڑنے لگی۔ شیر باز خان نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میں خود پریشان تھا کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوگیا تھا۔ ہماری دونوں ساتھی شہید ہو گئے تھے۔ ان کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سٹین گنوں کے نہ جانے کتنے برسٹ ان کے

جسموں سے پار ہو گئے تھے۔ اگر ہم اس وقت فائرنگ کر دیتے تو ہم اپنے ساتھیوں کو تو نہیں بچا سکتے تھے لیکن خود بھی پھنس سکتے تھے کیونکہ ٹرک میں سے جو فوجی باہر نکلے تھے وہ مسلح تھے اور ان کی نفری بھی زیادہ تھی۔ جیپ شام کے اندھیرے میں پہاڑی کمیں گاہ والی پگ ڈنڈی کے پاس جا کر رک گئی۔ میں اور شیر باز وہاں اتر پڑے۔ جیپ ہمیں چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ ہم نے جیپ میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ اپنے ساتھیوں کی شہادت سے ہمارے دل بوجھل تھے۔ ہم گھاٹیوں سے بچتے ہوئے رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے میں پتھروں پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شیر باز نے غمگین آواز میں کہا۔

"اللہ کو یہی منظور تھا۔ ہماری سکیم پوری سوچی سمجھی ہوئی تھی۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے بندہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈو مجید اور صمد بٹ کی لاشیں وہ لوگ وہیں پھینک گئے ہوں گے۔ ہمیں رات کو لاشیں اٹھا لانی چاہئیں۔"

شیر باز خان نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"دونوں کی لاشوں کو بھارتی فوجی ساتھ ہی لے گئے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں کہ اگر ان میں زندگی کی رمق باقی ہو تو ان سے دوسرے کمانڈو ساتھیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے اگر مجاہد شہید ہو چکے ہوں تو وہ لاشوں کو پٹرول ڈال کر جلا دیتے ہیں۔"

شیر باز آہ بھر کر خاموش ہوگیا۔ ہم اپنی کمیں گاہ کے قریب آ گئے تھے۔ وہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"صمد بٹ اور مجید بٹ شہید ہو گئے تھے۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر گولیاں ان کے بدن سے نکل گئی تھیں۔ میرے خدا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم کرنل واڈیکر سے اپنے شہید ساتھیوں کا بدلہ لیں گے۔ ہم کل رات کو پوری کمانڈو فورس کے

ساتھ فوجی کیمپ پر اٹیک کریں گے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ نور بانو کو بھی نکال کر لے آئیں گے اور کیمپ کو بھی دھماکوں سے اڑا دیں گے۔"

کمیں گاہ والے غار کے باہر تین مجاہد کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہمارے قریب آ گئے۔ وہ کمانڈو آپریشن کا نتیجہ سننے کے لئے بے تاب تھے۔ جب انہیں کمانڈو مجید اور صمد بٹ کی شہادت کا علم ہوا تو انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔

"دعائے مغفرت۔"

ایک مجاہد نے دعائے فاتحہ پڑھی۔ ہم نے بھی ہاتھ اٹھا لئے تھے۔ دعائے مغفرت کے بعد شیر باز خان وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ہم بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے کشمیری مجاہدوں کو سارا حال سنایا اور کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارے شہیدوں کی لاشیں ان لوگوں نے کہاں رکھی ہیں۔ ہم انہیں یہاں لا کر خود دفن کرنا چاہتے ہیں۔"

ایک مجاہد نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ہمارے ساتھی شدید زخمی حالت میں ہوں اور ابھی زندہ ہوں۔"

شیر باز نے مایوسی کے ساتھ سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے جس طرح ان پر سٹین گنوں کی بوچھاڑ پڑتے دیکھی ہے۔ ان کا زندہ بچنا ناممکن ہے۔ بہرحال آج کسی بھی وقت ہماری پوری صورت حال کا علم ہو جائے گا۔"

شیر باز نے ایک مجاہد کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ پتہ کرے کہ ہمارے شہیدوں کی لاشیں اگر وہ شہید ہو گئے ہیں تو کیمپ میں کہاں پر رکھی ہوئی ہیں اور دوسرے یہ معلوم کرے کہ بابو شمس الدین کی بہو نور بانو ابھی تک کوارٹر گارڈ میں ہی ہے یا اسے کسی دوسری جگہ پہنچا دیا گیا ہے۔

"مجاہد احکامات سن کا اٹھا اور خاموشی سے ایک طرف نکل گیا۔"
شیر باز خان مجھے لے کر غار کے اندر آگیا۔ رات کا اندھیرا جنگل میں چھا گیا تھا۔ غار میں لالٹین روشن تھی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔
"اگر ہم کیمپ پر کمانڈ اٹیک کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کیمپ میں فوج کی نفری اور اسلحے کے بارے میں پوری رپورٹ ملنی چاہئے۔ ہمیں یہ بھی سراغ لگانا ہوگا کہ کیمپ میں اسلحہ کا ذخیرہ کس جگہ پر ہے؟"
کمانڈو شیر باز نمدے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بھی آگے کوئی بات نہ کی۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد شیر باز آہستہ سے بولا۔
"حیدر علی! ہمارے وسائل بہت کم ہیں۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ ہم بھارتی فوج کے کیمپ پر حملہ کرکے نور بانو کو وہاں سے چھڑا سکیں اور کرنل واڈیکر سے اپنے شہیدوں کا بدلہ لے سکیں۔"
میں نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ ہمیں شب خوب مار کر کیمپ میں سے سب سے پہلے نور بانو کو نکالنا چاہئے۔ اس کے بعد ہم کیمپ کا کمانڈو اٹیک سے دھماکوں سے تباہ کرسکتے ہیں اور سکیم بنا کر کرنل واڈیکر کو بھی ہلاک کرسکتے ہیں۔"
شیر باز بولا۔
"سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نور بانو کیمپ میں ہے یا نہیں۔"
رات ہم سب نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ ہماے دو بڑے تجربہ کار اور سینئر کمانڈو ایک دم سے ہم سے جدا ہو گئے تھے۔ ہم دیر تک ان کی باتیں کرتے رہے۔ اگلے روز صبح صبح کشمیری مجاہد آگیا۔ کہنے لگا۔
"سر! افسوس ناک خبر یہ ہے کمانڈو مجید بٹ اور صمد بٹ سڑک والی

جھڑپ میں شہید ہو گئے تھے۔ بھارتی فوجی ان کی لاشوں کو اٹھا کر لے گئے تھے اور انہوں نے پٹرول ڈال کر نہیں جلایا بلکہ کیمپ میں ہی گڑھا کھود کر دفن کر دیا ہے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ کرنل واڈیکر ہنگامی بنیادوں پر تبادلہ کروا کر اپنی بیوی کے ساتھ بنگلور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں چلا گیا ہے۔"

"اور شمس الدین کی بہو نور بانو کہاں ہے؟"

شیر باز نے پوچھا۔ کشمیری مجاہد نے کہا۔

"سر! نور بانو کو واڈیکر کے حکم سے ہی سری نگر سے راتوں رات ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر جموں روانہ کر دیا گیا ہے۔ جہاں سے ہماری معتبر اطلاع کے مطابق اسے بھی بنگلور کے ملٹری ہیڈ کوارٹر کی جیل میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

یہ خبر ہمارے لئے حیران کن تھی۔ کرنل واڈیکر کا اپنی بیوی کو ساتھ لے کر سری نگر سے بھاگ جانا تو ٹھیک تھا لیکن اس نے نور بانو کو بنگلور ہیڈ کوارٹر میں کس لئے بھجوایا تھا۔ کیا وہ وہاں بیٹھ کر نور بانو کو بطور یرغمال رکھنا چاہتا تھا؟ یہ بات ہماری عقل میں نہیں آ رہی تھی۔ کشمیری مجاہد نے کہا۔

"سر! نور بانو کا خاوند تو سری نگر میں ہی ہے۔ یہ کرنل اس کی بیوی کو بنگلور کے فوجی ہیڈ کوارٹر کس لئے لے گیا ہے؟"

شیر باز بولا۔

"یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔

اس نے کشمیری مجاہد کو بھجوا دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"حیدر علی! حالات نے بالکل ہی نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ اگر واقعی نور بانو کو کرنل واڈیکر بنگلور لے گیا ہے تو ہمیں اس کی بازیابی کے لئے بنگلور جانا ہو گا۔ کیونکہ نور بانو ہماری عزت و حرمت کی علامت ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک کھلا چیلنج بھی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میں اپنی کشمیری بہن کو کافروں کے چنگل سے نکالنے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔"

"تم بھارت میں کافی دور دور تک پھرتے رہے ہو کیا بنگلور شہر تمہارا دیکھا ہوا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں بنگلور ابھی تک نہیں جا سکا لیکن اس کے اردگرد کے جنگلوں میں کچھ دیر رہا ہوں۔"

شیر باز خاموشی سے سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے میں اس نئی خبر کی مزید تصدیق کروں گا۔ اس کے بعد ہم بنگلور کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ کرنل واڈیکر نے ہمیں نہیں دیکھا ہے۔ اسلئے ہمیں بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہم نے نور بانو کو بھی نہیں دیکھا ہوا۔ ہم اس کے سسر سے اس کی تصویر حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ہمیں اس کی شناخت ہو سکے۔"

شیر باز خان مجھے کمیں گاہ میں چھوڑ کر خود شہر کی طرف چل دیا۔ وہ کوئی تین گھنٹے کے بعد آیا اور کہنے لگا۔

"ہمارے مجاہد کی سراغ رسانی کی رپورٹ بالکل سچی تھی۔ کرنل واڈیکر اپنی بیوی کو لے کر بنگلور جا چکا ہے اور نور بانو کو بھی اس کے حکم سے راتوں رات جموں پہنچانے کے بعد وہاں سے ایک فوجی طیارے کے ذریعے بنگلور بھجوا دیا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"وہی جو ہم نے بنایا تھا۔"

شیر باز نے کہا۔

میں نے کہا۔

"نور بانو کی تصویر ملی کیا؟"

وہ بولا۔

"تصویر آج کسی بھی وقت ہم تک پہنچ جائے گی۔ میرا خیال ہے ہمیں آج شام کو یہاں سے جموں کی طرف چل پڑنا چاہیے۔"

پھر میری طرف پلٹ کر بولا۔

"ہم جالندھر سے بنگلور کے لئے کسی ٹرین میں سوار ہوں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ بنگلور تک کا ریل کا کرایہ کتنا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"یہ جالندھر پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔ ریل کے کرائے اب کچھ بڑھ گئے ہیں۔"

"ہوں" شیر باز نے سر جھکا دیا اور غور و فکر کرنے لگا۔

میں نے کہا۔

"ہمیں بنگلور میں کسی اچھے سے ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا۔ اس کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

وہ بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ دلی میں ہمارے آدمی موجود ہیں۔ وہ ہماری ہر ضرورت پوری کر دیں گے۔"

ہم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ تیسرے پہر نور بانو کی پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر بھی ہمیں مل گئی۔ یہ شادی کی تصویر تھی اور اس میں نور بانو کی دلہن بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے تصویر کو غور سے دیکھا اور نور بانو کی شکل اپنے ذہن میں بٹھا لی۔ شیر باز کہنے لگا۔

"ہم یہ تصویر اپنے ساتھ ہی رکھیں گے۔"

ہم بعض ضروری تیاریوں میں لگ گئے۔ کوئی خاص تیاریاں نہیں تھیں۔ بس اپنا لباس اس طرح کا رکھنا تھا کہ مشرقی پنجاب اور دلی کے آگے اسے تبدیل کیا جا سکے۔ کیونکہ سردی کا موسم دلی سے ذرا آگے تک ہی تھا۔ وسطی ہند میں اس زمانے میں بھی موسم خوشگوار ہوتا ہے اور سردی صرف رات کو ہوتی ہے۔ بنگلور کے علاقے میں تو رات کو بھی سردی نہیں پڑتی۔

ہمارا لباس عام شہریوں والا تھا۔ پتلون' جاگر شوز' میں نے گرم جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ شیر باز خان نے موٹی گرم جرسی پہن لی تھی۔ سروں پر ہم نے گرم گلو بند لپیٹ لئے تھے۔ کچھ روپے میرے پاس تھے۔ کچھ رقم شیر باز نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ہم کوئی اسلحہ اور چاقو وغیرہ اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے تھے۔ یہ چیزیں ہمیں دلی میں اپنے مجاہد سے بھی مل سکتی تھیں۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ کرنل واڈیکر نور بانو کو اپنے ساتھ بنگلور ہیڈ کوارٹر کیوں لے گیا ہے؟ اگر وہ اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے تو ایک گھریلو عورت اسے کیا معلومات فراہم کر سکے گی۔"

شیر باز اپنے بوٹ کے تسمے باندھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ میرے لئے بھی ایک معمہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی بیوی پر کمانڈو اٹیک کا اس عورت سے بدلہ لینا چاہتا ہو۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کرنل واڈیکر نے کشمیری مجاہدوں کے اٹیک سے گھبرا کر اپنا تبادلہ بنگلور کروایا ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن وہ اپنی بیوی کو بنگلور بھجوا کر خود یہاں رہ سکتا تھا۔ ایک تو وہ خود بنگلور چلا گیا اور پھر نور بانو کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔"

شیر باز خان کہنے لگا۔

"جو کچھ بھی ہو ہمیں بہرحال اپنی بہن کو بنگلور ملٹری ہیڈ کوارٹر سے یا

وہ جہاں بھی قید میں ہوگی وہاں سے نکال کر واپس سری نگر اس کے گھر پہنچانا ہے۔ یہی ہمارا مشن ہے اور ہمیں اس پر اپنی توجہ مرکوز رکھی چاہیئے۔"

جب سورج سری نگر کی مغربی پہاڑیوں میں غروب ہوگیا تو ہم اپنی کمیں گاہ سے نکل پڑے۔ میں نے یونہی اپنا شک دور کرنے کے لئے پیچھے جھاڑیوں میں جا کر دیکھا۔ لکڑی کی ڈبی خالی پڑی تھی۔ میرا دوست سانپ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں سے کہاں نکل چکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے کسی نے مار دیا ہو یا پھر کسی نیولے نے اسے ہلاک کر دیا ہو۔

"میں نے اپنے سانپ دوست کا خیال دل سے نکال دیا۔ ہم خفیہ پہاڑی راستوں پر چل رہے تھے۔ سول اور ملٹری انٹیلی جنس ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس لئے ہم شہر کے کسی لاری اڈے سے لاری میں سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سارے رستے شیر باز خان کے دیکھے بھالے تھے۔ میں بھی ان راستوں سے کافی واقف ہو چکا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ رستے میں کہیں کوئی چشمہ آ جاتا۔ کوئی برساتی نالہ آ جاتا۔ جیسے جیسے ہم نیچے میدان میں اتر رہے تھے برف کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہم کئی گھاٹیوں میں سے گذرے۔ آخر ایک سڑک پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے جموں کو جانے والی لاریاں گذرتی تھیں۔ ہمارے حلیے ایسے تھے کہ عام شہری لگ رہے تھے۔ ایک دو لاریاں ہم نے ہاتھ دیا۔ وہ مسافروں سے بھری ہوئی تھیں۔ گذر گئیں۔ آخر ایک لاری کو ہاتھ دیا تو وہ ٹھہر گئی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے اور لاری جموں کی طرف چل پڑی۔

میں سرینگر سے جموں تک کے رستے کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بس ہم جموں پہنچ گئے۔ رستے میں ایک جگہ پولیس کی چیک پوسٹ پر چیکنگ ہوئی لیکن ہمیں کسی نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ پولیس نے ابھی تک اس علاقے کے اخباروں میں ہمارے فوٹو نہیں دیئے ہوئے تھے۔ جموں ہم دوسرے دن رات کو پہنچے۔ رات ہم نے اپنے ایک خاص آدمی کے گھر پر بسر کی اور دوسرے روز منہ

اندھیرے جموں توی کے ریلوے سٹیشن سے دلی جانے والی ایکسپریس گاڑی پکڑ لی۔ اس ٹرین نے ہمیں رات کو ایک بجے کے قریب دلی پہنچا دیا۔ دلی میں بھی سردی تھی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم باقی رات پلیٹ فارم پر یا مسافر خانے میں گذارتے ہیں۔ صبح صبح اپنے مجاہد کے پاس جائیں گے۔"

شیر باز خان نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم جموں سری نگر انٹیلی جنس سے کافی دور نکل آئے ہیں۔ یہاں ہمارا پیچھا کرنے والا بظاہر کوئی نہیں ہے۔ ہم اپنے مجاہد کے گھر اسی وقت جائیں گے۔ آ جاؤ۔"

دلی سٹیشن کے اندر اور باہر آدھی رات کے بعد بھی بڑی رونق تھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات اتنی گذر چکی ہے۔ دلی کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہوا تھا۔ ہم نے ایک موٹر رکشا لے لیا۔ شیر باز خان نے اسے ایک خاص علاقے کی طرف جانے کو کہا۔ جس کا نام میں یہاں نہیں لوں گا۔ اس خاص علاقے میں ہم آدھ گھنٹے میں پہنچے۔ یہاں شیر باز نے رکشا چھوڑ دیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک چھوٹی سڑک پر چلنے لگا۔ یہ علاقے کچھ آباد اور کچھ غیر آباد تھا۔ گہری اور سرد رات ہونے کی وجہ سے سڑک پر کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ م موڑ گھوم کر دوسری سڑک پر آئے تو ایک چوکیدار لٹھ ہاتھ میں پکڑے مارے سامنے آ گیا۔

"کون ہو یہاں؟ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟ کہاں جا رہے و؟"

شیر باز خان نے کہا۔

"بھائی صاحب گاڑی لیٹ ہو گئی تھی۔ پانی پت سے آ رہے ہیں۔ ادھر رے چچا کا مکان ہے۔ رکشا بھی نہیں ملا۔"

شیر باز خان نے فرضی چچا جان کا فرضی نام اور اس کا فرضی ایڈریس بھی فر فر کر کے بتا دیا اور کہا کہ چچا جان پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر ہیں۔ چوکیدار پر شیر باز خان کی زبان کی روانی کا خاطر خواہ اثر پڑا۔ کہنے لگا۔

"میاں بائیں جانب والے درختوں سے بچ کر جانا۔ ادھر کہتے ہیں رات کو کوئی آسیب پھرتا ہے۔"

شیر باز خان نے ہنس کر کہا۔

"بھائی صاحب! ہم خود آسیب ہیں۔ ہمیں کوئی آسیب کچھ نہیں کہے گا۔"

اور ہم آگے چل دیئے۔ آکر ہم اپنے کشمیری مجاہد کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہ شیر باز خان سے تپے گلے لگ کر ملا۔ شیر باز نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ مجھ سے بھی گلے لگ کر ملا۔ اس کے بعد شیر باز خان نے اسے اپنے مشن کی پوری تفصیلات بتائیں۔ وہ کہنے لگا۔

"بنگلور یہاں سے بہت دور ہے۔ یہ صوبہ آندھرا پردیش میں ہے اور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں اپنا ایک آدمی موجود ہے۔"

یہ ہمارے لئے ایک خوش خبری تھی۔ کیونکہ بنگلور ایسے شہر میں اپنے ایک آدمی کا موجود ہونا ہمارے لئے بے حد فائدہ مند تھا۔ شیر باز نے پوچھا۔

"وہ بنگلور میں کہاں ملے گا؟"

مجاہد نے کہا۔

"بنگلور شہر کے باہر ایک پرانی بستی ہے۔"

اپنے بنگلور والے مجاہد کا نام اور پتہ بھی میں صیغہ راز میں رکھنا چاہتا ہوں۔ پارنی بستی کا میں نے اس لئے ذکر کر دیا ہے کہ بنگلور شہر کے باہر بہت سی پرانی بستیاں ہیں۔ رات ہم نے اپنے مجاہد کے ٹھکانے پر گذاری۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد شیر باز نے مجاہد سے پوچھا۔

"ہمیں بنگلور میں اسلحے کی ضرورت پڑے گی۔ کیا وہاں جو اپنا آدمی ہے۔ وہ ہمارے لئے اسلحے وغیرہ کا بندوبست کر سکے گا؟"

کشمیری مجاہد مسکرانے لگا۔ بولا۔

"جب آپ لوگ اسے ملیں گے تو آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ کیونکہ اپنا یہ آدمی آپ کو جس قسم کے اسلحے کی ضرورت ہو گی مہیا کر دے گا۔"

کشمیری مجاہد نے ہمیں بنگلور والے اپنے آدمی کا نام اور وہ نام بھی بتایا جس نام سے وہ بنگلور شہر میں چھ سات برس سے رہ رہا تھا۔ میں آپ کو ان دونوں ناموں میں سے کوئی ایک نام بھی نہیں بتاؤں گا۔ آپ اس کا کوئی فرض نام رکھ لیں۔ چلیں عالمگیر رکھ لیتے ہیں۔ بنگلور جانے والی گاڑی دلی سٹیشن سے شام کے سوا سات بجے چلتی تھی۔ ساڑھے چھ بجے ہم اپنے کشمیری مجاہد سے جدا ہو گئے۔ ہم نے اپنے گلوبند اور گرم جیکٹ اور جرسی وہیں چھوڑ دی تھیں اور موٹے کپڑے کی بش شرٹیں پہن لی تھیں۔ کیونکہ ہمیں دلی سے نیچے جنوب کی طرف جانا تھا۔ جہاں سردی آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو جاتی تھی۔ یہ کوئی ایکسپریس ٹرین تھی۔ اس کا نام بھی تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ ٹرین رات کے آٹھ بجے چلی۔ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بڑا لمبا سفر ہے۔ بنگلور اگرچہ میں کبھی نہیں گیا تھا مگر اس شہر کے قریب سے ہو کر نیچے جنوب کی طرف دو تین بار گذرا تھا۔ بنگلور کے بارے میں میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہاں صندل کے جنگل ہیں اور صندل کے درخت شہر کی سڑکوں پر بھی اس طرح کھڑے ہیں جس طرح ہمارے ہاں سڑکوں پر پیپل اور ٹاہلیوں کے درخت ہوتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ کارپوریشن اور پولیس کا عملہ رات کو شہر میں گشت لگا کر صندل کے ان درختوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ہمارے شہر لاہور میں چور گٹروں کے ڈھکن اتار کر لے جاتے ہیں اسی طرح بنگلور کے چور رات کو ٹرک لے کر آتے ہیں۔ تین چار چور ہوتے ہیں۔

سڑک کے کنارے ٹرک کھڑا کرتے ہیں۔ صندل کے درخت کو بیٹری سے چلنے والی آری سے کاٹتے ہیں۔ ان کے ٹکڑے کرتے ہیں۔ ٹرک پر لادتے ہیں اور رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ صندل کی لکڑی وہاں بڑی مہنگی بکتی ہے۔

ٹرین دلی سے چل پڑی۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ چل سو چل۔ جو سٹیشن مجھے یاد رہ گئے ہیں وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ دلی سے آگے بڑا شہر گڑ گانواں آیا۔ پھر متھرا آیا۔ اس کے بعد آگرہ' گوالیار' جھانسی' بھوپال اور پھر ناگ پور آیا۔ ناگ پور سے آگے ٹرین انڈیا کی کسی زمانے میں سب سے بڑی مسلم ریاست حیدر آباد دکن کی حدود میں داخل ہو گئی۔ اب یہ ریاست فوجی حملے کے بعد بھارت نے انڈیا میں زبردستی شامل کر لی ہے۔ حیدر آباد دکن کے ریلوے سٹیشن پر مسلم تہذیب و ثقافت کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن بڑا پر شکوہ تھا۔ پلیٹ فارم پر جو دکانیں تھیں ان میں سے اکثر دکانوں میں حیدر آباد دکن کے نواب صاحب کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اچکنوں اور ترکی ٹوپیوں والے آدمی عام نظر آ رہے تھے۔ شیر باز خان کہنے لگا۔

"بھارت نے اس مسلم ریاست پر بھی زبردستی اور یہاں کے مسلم اکثریت کی مرضی کے خلاف فوجی یلغار کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ اسی طرح کشمیر کو بھی ہڑپ کرنا چاہتا ہے مگر کشمیر اس کے حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرف پھنس گیا ہے۔ ہم کشمیری حریت پسند اپنی آزادی کی خاطر جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ بھارتی فوج کو بہت جلد کشمیر سے بھاگنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"انشا اللہ!"

اب ٹرین کی منزل بنگلور تھی۔ آگے بنگلور ہی سب سے بڑا شہر تھا۔ یہ بھی وہاں سے بہت دور تھا۔ ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہا کہ ہم کتنے دن ٹرین میں سفر کرتے رہے۔ بہر حال بنگلور پہنچے تو خدا کا شکر ادا کیا۔ شیر باز خان یہاں پہلی

ہار آیا تھا۔ یہاں کی زبان تیلگو تھی۔ لوگ تامل اور کنڑی زبان بھی بولتے تھے۔ ویسے تیلگو آندھیرا پردیش کی سرکاری زبان ہے۔ اردو جسے وہاں اب ہندی کہا جاتا تھا۔ عام بول چال کی زبان تھی۔ لوگ انگریزی میں اپنے مفہوم کو آسانی سے ادا کر دیتے تھے۔ انگریزی بھی وہاں عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شیر باز خان کہنے لگا۔

"یہاں کے لوگوں کے رنگ بہت کالے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اگر تم نیچے راس کماری اور کینا کماری کی طرف جاؤ تو تمہیں وہاں اس سے بھی زیادہ کالے رنگ کے مرد اور عورتیں ملیں گی۔ ان کے مقابلے میں یہاں کے لوگ گورے ہیں۔"

ہم سٹیشن سے باہر آکر ایک ریستوران میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ میں نے ملازم کو بریانی کا آرڈر دیا تو شیر باز نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا یہاں بریانی بھی ملتی ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ یہ حیدر آباد دکن کی مسلم ثقافت اور تہذیب کا اثر ہے۔ ہم نے بریانی کھائی جو شیر باز کو پسند آئی مگر سالن میں مرچیں بہت تھیں۔ بں نے اسے بتایا کہ یہ سارے مرطوب علاقے ہیں یہاں لوگ مرچیں زیادہ لھاتے ہیں۔ موسم بالکل ہی بدل گیا تھا۔ کہاں ہم کشمیر کی برفوں میں چلے تھے ر یہاں گرمی اور حبس کی وجہ سے پسینے آ رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھا رہے ھے۔ دو دن پہلے بارش ہو کر دھوپ نکلی تھی۔ اس کی وجہ سے شہر میں بے حد س ہو رہا تھا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اپنے مجاہد عالمگیر کے ٹھکانے پر نکل چلنا چاہئے۔"

اس نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر پڑھا۔ اس پر ہمارے دلی کے ہ نے انگریزی میں عالمگیر کا ایڈریس لکھ دیا تھا۔ ہم نے ایک موٹر رکشا لیا۔

اسے ایڈریس بتایا۔ رکشے والے نے کہا۔

"بیٹھیے گا۔ ہم ادھر کو لے جائے گا۔"

دن ڈھل رہا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے ان کی روشنی زیادہ دھندلی ہو رہی تھی۔ رکشا بنگلور شہر کے مضافات میں سے گذر رہا تھا۔ یہاں کھیت تھے اور تاڑ کے اونچے اونچے چھتریوں والے درخت بھی تھے۔ دور دور کوٹھیاں بھی تھیں اور ڈھلواں کھپریل کی چھتوں اور پتھر کی دیواروں والے کوارٹر نما مکان بھی تھے۔ یہ علاقہ سطح مرتفع کا تھا۔ ایک بستی کے قریب آکر رکشا والے نے رکشا روک دیا۔ ہم اتر گئے۔ اپنے مجاہد عالمگیر کی بستی میں ہم آ گئے تھے۔ اس کے مکان کا نمبر ہمارے پاس تھا۔ پوچھتے پوچھتے اس کے مکان پر بھی پہنچ گئے۔ یہ دو منزلہ پختہ مکان تھا۔ جس کے آگے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ جس میں ناریل اور کیلے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک آدمی اس کا بونٹ کھولے انجن کی مرمت میں لگا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔

"مسٹر! کیا عالمگیر کا یہی مکان ہے؟"

اس نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہمارے رنگ ان لوگوں کے مقابلے میں گورے تھے۔ کہنے لگا۔

"سیٹھ عالمگیر کو پوچھتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں سیٹھ کو پوچھتا ہے۔"

اپنا یہ کشمیری مجاہد چھ سات سال سے بنگلور میں مقیم تھا اور اس کا وہاں شہر میں بڑا کاروبار تھا۔ شادی اس نے نہیں کی تھی۔ ایسے لوگ شادی کے جھنجھٹوں سے دور رہتے ہیں۔ وہ ہمیں مکان میں لے گیا۔ اس کی تصویر جو اپنے دلی والے مجاہد نے دکھائی تھی۔ ہو بہو وہی شکل تھی۔ اس کو خفیہ ذرائع سے

ہمارے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ ایک خاص کوڈ لفظ تھا جو دلی والے مجاہد نے شیر باز خان کو بتا دیا تھا۔ اس نے عالمگیر کے سامنے وہ لفظ بولا۔ تو اسے یقین ہوگیا کہ ہم ان کے خاص آدمی ہیں۔ وہ بولا۔

"شیر باز خان! میں نے تمہارا نام بہت سن رکھا تھا۔ آج تمہارے دیدار بھی ہو گئے۔"

اس نے ہم سے بڑا گلہ کیا کہ ہم نے سٹیشن پر کیوں کھانا کھایا۔

"یہ بھی تو تمہارا اپنا ہی گھر تھا۔"

اسی وقت چائے اور کافی اور مٹھائیوں کی طشتریاں آگئیں۔ کہنے لگا۔

"بھائیو! میں بھی اب ان لوگوں کی طرح ہوگیا ہوں۔ ورنہ آپ کو اس وقت گشتابہ اور ہریسہ کھلاتا۔ یہاں چائے کافی اور یہ نازک نازک مٹھائیاں ہی چلتی ہیں۔"

جب ہم کافی وغیرہ پی کر تازہ دم ہو گئے تو عالمگیر نے اپنے نوکر کو کسی کام سے بھجوا دیا اور شیر باز خان سے پوچھا۔

"اب میرے بھائی! بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

شیر باز خان نے شروع سے آخر تک ساری کہانی بیان کر دی اور اپنے بنگلور آنے کا مقصد بھی بیان کیا۔ مجاہد عالمگیر بڑے غور سے ایک ایک لفظ کو سنتا رہا۔ جب شیر باز خان نے بات ختم کی تو عالمگیر بولا۔

"سب سے پہلے تو میں تم سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ یہاں تک آتے ہوئے کوئی تمہارا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟"

میں نے کہا۔

"بظاہر تو ہمیں ایسا کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ آگے کچھ معلوم نہیں۔ ہم نے تو یہاں کی خفیہ پولیس دیکھی نہیں؟"

عالمگیر کہنے لگا۔

"یہ میں صرف احتیاط کے لئے پوچھ رہا تھا۔ تم لوگوں کو بھی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ کیونکہ تمہارا مشن بڑا اہم ہے۔ میں اپنی کشمیری بہن نور بانو کو اگر وہ بنگلور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں قید ہے تو یہاں سے نکلوانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔"

شیر باز نے کہا۔

"تمہارے خیال میں اگر خفیہ پولیس کا خدشہ ہے تو ہمیں یہاں سے دوسری جگہ رہائش اختیار کر لینی چاہئے۔"

عالمگیر بولا۔

"وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ خفیہ پولیس والوں نے مجھے پر کبھی شک نہیں کیا۔ شک کرنے کی وجہ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ میری یہاں ایک سوشل حیثیت ہے۔ میں یہاں کی حکمران پارٹی کا ممبر بھی ہوں۔ دان پن بھی کرتا ہوں اور پولیس افسر میرے دوست ہیں۔ کیونکہ میں ان کو تحفے تحائف بھیجتا رہتا ہوں۔ پھر بھی میں کبھی غافل نہیں ہوا۔ میں تمہیں یہاں سے دور جنگل میں اپنے ریسٹ ہاؤس میں بھجواؤں گا۔ میں نے جنگل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا حکومت سے ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ جہاں لکڑی کی کٹائی ہوتی ہے اور صندل کے کچھ درخت بھی ہیں۔"

شیر باز خان بولا۔

"لیکن سب سے پہلے تمہیں اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ نور بانو فوجی ہیڈ کوارٹر میں کس جگہ پر قید ہے اور کیا کرنل واڈیکر اور اس کی بیوی سرلا دیوی بھی اسی شہر میں ہیں؟"

عالمگیر نے کہا۔

"اس کا کل تک میں پتہ کروالوں گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں خود تمہیں اپنے جنگل والے ریسٹ ہاؤس میں لے کر جاتا ہوں۔"

عالمگیر ہمیں مکان سے باہر لے آیا۔ اس کا ڈرائیور جیپ کو ٹھیک کر رہا تھا۔ عالمگیر کو دیکھ کر اس نے بونٹ گرا دیا اور کہا۔

"سیٹھ صاحب! جیپ ایک دم نیا مافق ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے کرشنم! تم اپنے آفس میں جاؤ۔ ہم اپنے مہمانوں کو سٹیشن پر چھوڑنے جائے گا۔ یہ لوگ وشاکا پٹم جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سیٹھ صاحب۔"

جب عالمگیر ہمیں جیپ میں اپنے ساتھ بٹھا کر وہاں سے کچھ دور آگے نکل آیا تو شیر باز سے کہنے لگا۔

"تمہارے مشن کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر میں یہاں کسی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ تم لوگ میرے ہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ تم لوگ میرے جنگل والے ریسٹ ہاؤس میں ہی رہو گے۔ وہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ کوئی ضروری بات ہو تو مجھے فون کر سکتے ہو۔ میں تمہیں اپنا نمبر لکھوا دوں گا۔"

جیپ شہر سے نکل کر پہاڑی علاقے میں آ گئی تھی۔ ان پہاڑیوں کے رنگ عجیب و غریب تھے۔ کوئی کاسنی رنگ کی تھی۔۔ کوئی بھورے رنگ کی اور کوئی سرخی مائل تھی۔ کوئی سبز تھی۔ ان پر کہیں کہیں تاڑ کے درختوں کی قطار نظر آ جاتی تھی۔ ہماری جیپ ان پہاڑیوں میں سے بھی آگے نکل گئی۔ آگے جنگلاتی علاقہ شروع ہو گیا۔ ایک دو ندیاں بھی آئیں۔ پھر بانس کے درختوں کی ایک لمبی سرنگ میں سے گذرنے کے بعد جنگل شروع ہو گیا۔ درختوں کے درمیان جھاڑیاں کاٹ کر ٹرکوں کے آنے جانے کے واسطے راستہ بنا دیا گیا تھا۔ اونچے اونچے گھنی چھتریوں والے عجیب و غریب درختوں کے جھنڈ تھے۔ جن کی شاخوں پر جنگلی بیلیں سانپوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ عالمگیر کہنے لگا۔

"یہ چیتل ورگ کے جنگل ہیں۔"

میں نے چیتل ورگ کا نام سن رکھا تھا۔ میں نے کہا۔
"یہاں تو آدم خور شیر بھی ہوتے ہیں۔"
عالمگیر مسکرایا۔ کہنے لگا۔
"آدم خور شیر کبھی کبھار ہی اس طرف آتے ہیں۔ ویسے میں آپ لوگوں کو مشورہ دوں گا کہ رات کو ریسٹ ہاؤس کے دروازے کھڑکیاں اندر سے لاک کرکے سوئیں اور رات کے وقت کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ رات کو کبھی کبھار اس طرف شیر شکار کی تلاش میں آ جاتا ہے۔ لیکن شیر کو اگر چھیڑا نہ جائے تو وہ آدمی پر کبھی حملہ نہیں کرتا۔"
ہم گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ مہاگنی کے سیاہ تنوں والے درختوں کے جھرمٹ پر ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ ہمیں صندل کی خوشبو آئی۔ عالمگیر کہنے لگا۔
"یہ چندن کے درختوں کی خوشبو ہے۔ اس جنگل میں چندن کے درخت بہت ہوتے ہیں۔ ان کو آپ لوگ صندل کے درخت بھی کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ انہیں چندن درخت کہتے ہیں۔ میری زمین پر بھی چندن کے پچاس ساٹھ درخت ہیں مگر میرا زیادہ بزنس دوسرے درختوں کی کٹائی اور سپلائی کا ہے۔"
دور سے مجھے درختوں کے درمیان ایک بیرک سی نظر آئی۔ عالمگیر بولا۔
"یہاں سے میری زمین شروع ہو جاتی ہے۔ یہ میری ملکیت نہیں ہے۔ میں نے سرکار سے ٹھیکے پر لی ہوئی ہے۔ وہ ہمارا ریسٹ ہاؤس ہے۔"

ہاؤس ایک اونچے اور لمبے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ اوپر تک چھ
سات سیڑھیاں بنی ہوئی تھی۔ کالے کالے تامل تلیسگو اور چار نوکر جیپ دیکھ کر
ادھر سے نکل کر آ گئے اور ہمیں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنے لگے۔ عالمگیر نے جیپ
کو بریک لگائی اور ان سے ان کی زبان میں دو چار باتیں کرنے کے بعد ہم سے
کہا۔

"یہ بے ضرر لوگ ہیں۔ پھر بھی آپ لوگوں کو احتیاط کرنی ہوگی۔ اندر
آ جاؤ۔"

نوکروں نے ریسٹ ہاؤس کا سامنے والا کمرہ کھول دیا تھا۔ ایک پرانا
صوفہ سیٹ تھا۔ فرش پر بھورے رنگ کی دری بچھی ہوئی تھی۔ کارنس پر لکڑی
کے دو خالی گلدان پڑے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازے پر پرانے پردے لٹکے
ہوئے تھے۔ عالمگیر نے نوکروں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور کھڑکیوں کے پردے
ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پیچھے ایک سونے کا کمرہ ہے۔ باہر کونے میں رسوئی ہے۔ میرا بوڑھا
باورچی اورنگ آباد کا مسلمان ہے۔ تمہیں ہر طرح کے کھانے پکا کر کھلائے گا۔"

صوفے پر وہ ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے شیر باز خان کو کونے میں
رکھی چھوٹی سی میز کے دراز میں سے کاپی پنسل نکال کر اپنا ٹیلی فون نمبر لکھوایا۔ پھر
اٹھ کر کہنے لگا۔

"دوستو! اب میں چلتا ہوں۔ نوکروں کے سامنے اردو' انگریزی یا پنجابی
کشمیری میں بھی کوئی راز کی بات آپس میں مت کرنا۔ میں کل صبح اپنی کشمیری
بہن نور بانو کے بارے میں ساری معلومات لے کر آؤں گا۔ اگر وہ بنگلور میں ہے
تو میرے آدمی اس کی پوری رپورٹ مجھے دے دیں گے۔ اگر اسے کسی دوسری
جگہ پہنچا دیا گیا ہے تو اس کا بھی پتہ چل جائے گا اور ہاں۔"

وہ جاتے جاتے رک گیا اور شیر باز کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"بیڈ روم کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سٹور ہے۔ اس میں ایک دو بندوق اور کارتوسوں کا تھیلا پڑا ہوا ہے۔ خطرے کے وقت تم اسے استعمال سکتے ہو۔"

وہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا تو سب سے پہلے ہم بیڈ روم والے سٹور میں گئے۔ وہاں اندھیرا تھا۔ کھڑکی کھولی تو اندر روشنی آ گئی۔ بڑا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ ایک طرف پرانی بندوق اور کارتوسوں کا تھیلا نظر آگیا۔ ہم اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ شیر باز اسے کپڑے سے صاف کرنے لگا۔ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ شیر باز بولا۔

"عالمگیر بڑا اہم آدمی ہے۔ اس کی مدد سے ہمیں کافی فائدہ پہنچے گا۔"

میں نے کہا۔

"مگر یہ شخص کچھ ضرورت سے زیادہ محتاط ہے۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔"

شیر باز نے کہا۔

"حیدر علی! وہ دشمنوں کے عین درمیان میں بیٹھا ہے۔ اسے احتیاط کرنے کی بہت ضرورت ہے۔"

اتنے میں ایک دبلا پتلا گہرے سانولے رنگ کی چھوٹی سی شرعی سفید داڑھی والا بوڑھا اندر آگیا۔ اس نے ہمیں سلام کیا اور بولا۔

"حضور میرا نام محمد عثمان ہے۔ میں سیٹھ عالمگیر کا پرانا باورچی ہوں۔ اب اسی ریسٹ ہاؤس پر رہتا ہوں۔ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

ہمیں عثمان بابا سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ہم میں سے کسی کو بھی چائے یا کھانا بنانا نہیں آتا تھا۔ وہ ہمارے لئے چائے بنا کر لے آیا۔ ہم ریسٹ ہاؤس کے لکڑی کے فرش والے برآمدے میں بید کی پرانی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ شیر باز خان کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ نور بانو بنگلور کے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں ہی قید ہو گی۔ کرنل واڈیکر بھی یہیں تعینات ہے مگر اس نے نور بانو کو یہاں کس لئے رکھا ہے۔ یہ مسئلہ ابھی تک میں حل نہیں کر سکا۔"

یہ مسئلہ میں خود بھی ابھی تک حل نہیں کر سکا تھا۔ میں نے کہا۔

"کرنل واڈیکر مجھے اذیت پرست آدمی لگتا ہے۔ وہ نور بانو کو اذیت دے کر اس سے اپنی بیوی پر حملے کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ کم از کم میں اب تک یہی سمجھ سکا ہوں۔"

عثمان بابا چائے کے خالی برتن لینے آیا تو اس سے ہم نے پوچھا کہ یہاں نہانے کے لئے کیا کسی ندی پر جانا پڑتا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں حضور! سامنے باہر غسل خانہ ہے۔ نلکہ لگا ہوا ہے۔ تولیہ صابن سب کچھ حاضر ہے۔ ویسے پیچھے بانس کے جھنڈوں میں ندی بھی بہتی ہے۔ دل چاہے تو وہاں جا کر نہا لیجئے۔ ندی گہری نہیں ہے۔"

ہم نے غسل خانے میں غسل کیا۔ دوسرے کپڑے بدلے اور برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے مشن کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ رات کو عثمان بابا نے ہمارے لئے بڑا لذیز مرغ پلاؤ تیار کیا ہوا تھا۔ ہم کھانا کھا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ میرے لئے یہ استوائی علاقوں کے جنگل کوئی نئی بات نہیں تھے مگر شیر باز خان زیادہ تر سرد شمالی علاقوں کے جنگلوں میں پھرتا رہا تھا۔ اسے مچھروں نے کاٹا تو بولا۔

"میں تو اندر جا کر لیٹتا ہوں۔ پنکھے کی ہوا میں مچھر تنگ نہیں کریں گے۔"

کچھ دیر بعد میں بھی ڈرائنگ روم میں آگیا۔ شیر باز خان بیڈ روم میں سویا میں ڈرائنگ روم میں لیٹ گیا۔ جنگل کی دہشت ناک خاموشی کا میں عادی تھا۔ آدھی رات کو دور سے کسی شیر کی دھیمی سی دھاڑ دو ایک بار سنائی دی اور

پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد مجھے بھی نیند آ گئی۔ صبح درختوں پر شور مچاتے پرندوں کی آوازوں نے مجھے جگا دیا۔ شیر باز خان پہلے سے بیدار ہو چکا تھا۔ ہم نے برآمدے میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شیر باز نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے عالمگیر بول رہا تھا۔ شیر باز نے دو تین باتیں کیں اور ریسیور رکھ دیا۔ مسکرا کر بولا۔

"عالمگیر نے نور بانو کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ آ رہا ہے۔"

"کیا وہ بنگلور ہی میں ہے؟"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

شیر باز نے کہا۔

"عالمگیر نے یہ مجھے نہیں بتایا۔ کہتا تھا کہ سب باتیں زبانی ہوں گی۔"

ٹیلی فون آنے کے آدھے گھنٹے بعد دور سے جنگل میں جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ عالمگیر آ گیا تھا۔ اس نے جیپ ایک طرف درختوں میں کھڑی کی اور برآمدے میں آ کر ہم سے ہاتھ ملایا۔

"رات کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی دوستو؟"

"بالکل نہیں۔"

شیر باز نے جواب دیا۔

عالمگیر نے دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی اور بولا۔

"اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

ہم ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ شیر باز خان نے پوچھا۔

"عالمگیر بھائی! نور بانو کے بارے میں کیا پتہ چلا ہے؟"

عالمگیر نے سر کو مایوسی کے ساتھ نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"نور بانو بنگلور کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں نہیں ہے۔"

ماحول پر ایک سیکنڈ کے لئے سناٹا چھا گیا۔ شیر باز نے پوچھا۔

"تو پھر وہ کہاں ہے؟ کرنل واڈیکر تو بنگلور میں ہی ہے؟"

"ہاں" عالمگیر بولا۔ "وہ بنگلور ہی میں ہے مگر اس کی بیوی بھی یہاں نہیں ہے۔ اسے اس نے لندن اپنی بڑی بہن کے پاس بھیج دیا ہے۔"

عجیب مایوس کن صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ نور بانو ایک ایسا معمہ بن گئی تھی جو الجھتا ہی جا رہا تھا۔ ہمیں ہر حالت میں اس کا سراغ لگا کر اسے واپس کشمیر اس کے گھر پہنچانا تھا۔ یہ ہماری غیرت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں نے عالمگیر سے پوچھا۔

"ملٹری ہیڈ میں بھی کسی کو نہیں معلوم کہ نور بانو کو مرہٹہ کرنل نے کہاں رکھا ہوا ہے اور کیوں رکھا ہوا ہے؟"

عالمگیر کہنے لگا۔

"اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنے ایک خاص آدمی کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ جو ملٹری ہیڈ کوارٹر کے اندر آتا جاتا رہتا ہے۔"

میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ عالمگیر کا وہ خاص آدمی فوجی ہیڈ کوارٹر میں کس کام پر متعین تھا۔ ظاہر ہے وہ مسلمان تامل تھا اور صرف اسلام کی سر بلندی اور کشمیری مسلمانوں کی جنگ آزادی کے لئے عالمگیر کے ساتھ اپنے الگ محاذ میں مصروف عمل تھا۔

"یہ میں آپ کو کل تک ہی کچھ بتا سکوں گا۔"

عالمگیر ہمارے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ ہم نے بڑے تذبذب کے عالم میں وہ سارا دن اور رات گذاری۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مرہٹہ کرنل ایک معصوم کشمیری لڑکی سے کس قسم کا انتقام لے رہا ہے اور اس نے اسے کہاں روپوش کیا ہوا ہے؟ رات کو کسی وقت ہلکی سی بارش بھی ہوئی۔ صبح اٹھے تو درخت اور گھاس اور جھاڑیاں رات کی بارش کی وجہ سے گیلی تھیں۔ عالمگیر کے مزدور کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے کام کر رہے تھے۔

عالمگیر کا ہم سارا دن انتظار کرتے رہے۔ ہم نے اسے ٹیلی فون بھی نہ کیا۔ کیونکہ اس نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ نور بانو کے سلسلے میں ہرگز فون پر کوئی بات نہ کی جائے۔ جب جنگل کے ماحول پر شام کا دھندلا اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا تو عالمگیر کی جیپ کی آواز سنائی دی۔ ہم برآمدے میں آ گئے۔ عالمگیر نے جیپ اپنی خاص جگہ کھڑی کی اور ہمارے پاس برآمدے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"عجیب بات سننے میں آئی ہے۔"

"خیریت تو ہے عالمگیر بھائی؟"

شیر باز نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ میں بھی عالمگیر کو تکنے لگا کہ دیکھیں اب کیا انکشاف ہوتا ہے۔ عالمگیر نے محتاط نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیا اور ہماری طرف جھک کر کہنے لگا۔

"نور بانو کو کرنل واڈیکر نے موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔"

"کیا؟" شیر باز چونک کر بولا۔ "کیا نور بانو کو ہلاک کر دیا گیا ہے؟"

عالمگیر نے کہا۔

"اگر اسے فوجی ہیڈ کوارٹر کی گراؤنڈ میں ہی گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا تو زیادہ اچھا تھا مگر اس تنگ نظر متعصب اور مسلمانوں کے دشمن مرہٹے کرنل نے آدم خور جنگلی درندوں کے حوالے کر دیا ہے۔"

شیر باز نے اضطراب کے ساتھ کہا۔

"عالمگیر بھائی! صاف صاف بتاؤ۔ بات کیا ہے۔ خدا کے لئے پہیلیاں نہ بجھاؤ۔"

عالمگیر نے کہا۔

"یہاں سے جنگل کے جنوب میں کوئی ساٹھ ستر کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے کرشن کے پار ایک بڑا خطرناک گھنا جنگل ہے۔ جس کے بارے میں مشہور

ہے کہ وہاں کوئی آدم خور جنگلی قبیلہ رہتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی آدمی
ا دیہاتی عورت غلطی سے اس جنگل میں گئی اور پھر اسے دوبارا نہیں دیکھا گیا۔
وگ بلکہ شکاری لوگ بھی اسلحہ کے ساتھ بھی اس جنگل میں جانے سے ڈرتے
یں۔ اس قبیلے کے لوگوں کو وش گندھاری کہتے ہیں۔ یہ لوگ جنگل ہی میں رہتے
یں اور وہیں جنگلی بلیوں کا شکار کرکے کھاتے ہیں۔ ان کا ایک دیوتا ہے جس کی
ہ پوجا کرتے ہیں۔ اس دیوتا کا نام جیسا کہ ہم نے سن رکھا ہے وشن گندھا ہے۔
اس جنگلی قبیلے کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ جب راجہ رامچندر جی
نے اپنی پتنی کو راون کی قید سے رہا کرانے کے لئے لنکا پر حملہ کیا تھا اور لنکا کو
آگ لگا دی تھی تو یہ لوگ وہاں سے بھاگ کر اس جنگل میں آ کر چھپ گئے
تھے۔ تب سے ان کی نسل اسی جنگل میں چلی آ رہی ہے۔ یہ بڑے پراسرار جنگلی
وگ ہیں۔ ان کی زبان کی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ان کے مرد کبھی کسی شہر میں
ہیں دیکھے گئے۔"

شیر باز نے بے چینی سے کہا۔

"پلیز! جلدی سے یہ بتاؤ نور بانو کہاں ہے؟"

عالمگیر بولا۔

"میں اسی موضوع کی طرف آ رہا ہوں۔ جنگلی قبیلہ اپنے دیوتا وش
گندھا کی پوجا کا ہر چھ ماہ کے بعد ایک جشن مناتا ہے۔ اس جشن میں باہر سے
لائی ہوئی کوئی جوان عورت یا جوان مرد دیوتا پر قربان کیا جاتا ہے۔ ہمیں جو
رپورٹ ملی ہے اس کے مطابق ان جنگلی قبیلے کی پوجا کے جشن میں صرف پندرہ
ن باقی رہ گئے ہیں اور کرنل واڈیکر نے محض اپنی بیوی پر حملے کا کشمیری حریت
پسندوں سے بدلہ لینے کی خاطر نور بانو کو کسی ذریعے سے ان جنگلی لوگوں کے
حوالے کر دیا ہے۔ جو اسے اپنے دیوتا وش گندھا پر قربان کرنے کی تیاریاں کر
رہے ہیں۔"

شیر باز خان نے کہا۔

"ہم نور بانو کو ان جنگلیوں کی قید سے آج ہی چھڑا لائیں گے۔ ہم تربیت یافتہ انڈین آرمی کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ یہ جنگلی ہمارے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ ہمیں صرف اتنا بتادیں کہ یہاں سے اس جنگلی قبیلے کے ٹھکانے کا کونسا راستہ جاتا ہے؟"

عالمگیر کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ اس طرح شیر باز کو دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہلے بار دیکھ رہا ہو۔ جب شیر باز نے اصرار کہ ہمیں وحشی جنگلی لوگوں کے ٹھکانے کا پتہ بتایا جائے تو عالمگیر کہنے لگا۔

"شیر باز بھائی! تم اپنی جگہ پر بالکل درست کہہ رہے ہو۔ تم حریت پسندوں کی بہادری اور دلیری میں کسی کو بھی شک نہیں ہے۔ تم محدود وسائل کے ساتھ بھارت کی ٹرینڈ اور جدید اسلحے سے لیس فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہو لیکن میرے بھائی اس جنگلی قبیلے کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ ہم تک ان لوگوں کے بارے میں جو کہانیاں پہنچی ہیں ان کے مطابق جنگل میں جس مقام پر ان لوگوں کے جھونپڑے ہیں اور دیوتا وش گندھا کا چھوٹا سا مندر ہے وہاں تک کسی انسان کا پہنچنا ناممکن ہے۔ وہ دشوار گزار گھنے جنگل کے عین درمیان میں رہتے ہیں۔ ان کے اردگرد دلدلیں اور جنگلی تالاب ہیں۔ جن میں آدم خور مگرمچھ ہر وقت موجود رہتے ہیں اور کسی جانور یا انسان کی ذرا سی آہٹ پا کر لپکتے ہیں اور آن کی آن میں اسے اپنے نوکیلے دانتوں والے جبڑے میں دبوچ کر اس کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ دلدلیں گھاس میں چھپی ہوئی ہیں۔ آدمی زمین سمجھ کر آگے بڑھتا ہے اور اس کا پاؤں دلدل میں دھنس جاتا ہے۔ بس دلدل کے لئے آدمی کی اتنی غلطی ہی کافی ہوتی ہے۔ وہ آدمی کے پاؤں کو اندر کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔ آدمی جتنا باہر نکلنے کو زور لگاتا ہے۔ اتنا ہی وہ دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس وقت دلدل کے اندر سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلتی ہیں جیسے

وہ آدمی کو نگلتے وقت خوش ہو رہی ہو۔ دیکھتے دیکھتے آدمی دلدل میں ڈوب جاتا ہے۔ دلدل بدقسمت آدمی کا جسم ہڈیوں سمیت کھا جاتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان جنگلی لوگوں کے پاس ماچس کی تیلیوں کے سائز کے زہریلے تیر ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ ایک نلکی میں ڈال کر پھونک مار کر اپنے دشمن پر چلاتے ہیں۔ زہریلے سانپوں کے زہر میں بجھا ہوا تیر آدمی کے جسم میں چبھتا ہے تو زہر آناً فاناً آدمی کے خون میں داخل ہو کر اسے ہلاک کر ڈالتا ہے۔ جنگل میں سے گزرتے ہوئے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ جنگلی لوگ کس درخت کے پیچھے' درخت کے اوپر یا جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے جنگل میں آنے والے آدمی کا دور تک پیچھا کرتے ہیں اور اسے اندر تک آنے دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس آدمی کو کوئی سراغ نہیں ملتا۔"

شیر باز پر عالمگیر کی دہشت زدہ کر دینے والا گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی! مجھے صرف ان جنگلی قبیلے والوں کے گاؤں تک پہنچے کا راستہ بتا دو اور ہمیں تھوڑا بہت ضروری اسلحہ بھی لا دو۔ اس کے بعد ہم جانیں اور ہمارا کام۔"

عالمگیر ہمیں کسی قدر تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ایک بار پھر غور کر لو۔ میں تمہیں ان جنگلی لوگوں کے درمیان جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں صارف بات کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ وہاں سے زندہ واپس نہیں آؤ گے۔"

شیر باز اس مشن کا بھی لیڈر تھا۔ چنانچہ میں اسے موقع دے رہا تھا کہ وہ خود عالمگیر سے ساری بات طے کر لے۔ شیر باز نے کہا۔

"زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم ہم پر صرف یہ مہربانی کرو کہ ہمیں تھوڑا بہت اسلحہ لا دو اور کوئی آدمی ہمارے ساتھ کر دو جو ان جنگلوں سے

واقف ہو اور ہمیں وش گندھاری جنگلی قبیلے کے جنگل تک پہنچا دے۔ ہمیں صرف اس جگہ تک ہی پہنچا دے جہاں سے جنگلی قبیلے والوں کے جنگل کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

عالمگیر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے اسلحہ بھی مہیا کر دوں گا اور ایک گائیڈ بھی ساتھ روانہ کر دوں گا جو تمہیں وحشی قبیلے کے جنگل کی سرحد تک چھوڑ آئے گا۔ بتاؤ تمہیں کس قسم کا اسلحہ چاہئے۔"

شیر باز خان نے اسے بتایا کہ ہمیں دو آٹو میٹک شارٹ گنوں کی بھی ضرورت ہوگی جن کے آگے سائیلنسر کی نالیاں لگی ہوں۔ اس کے علاوہ شیر باز نے ایک ایک کمانڈو چاقو اور کچھ دستی بموں کی فرمائش کی۔ عالمگیر نے کہا۔

"یہ سب چیزیں تمہیں مل جائیں گی مگر ایک بات کی میں تمہیں سختی سے ہدایت کروں گا کہ گندھاری قبیلے کے لوگوں کے جنگل میں پہنچنے کے بعد دستی بم یا شارٹ گنوں کا دھماکہ مت کرنا اس دھماکہ کی آواز جنگلی لوگوں کو فوراً" بتا دے گی کہ تم جنگل میں کس مقام پر ہو۔ اس کے بعد وہ جنگل میں پھیل کر تمہاری تلاش شروع کر دیں گے اور یقین کرو کہ پھر تم ان کے زہریلے تیروں کی زد سے بچ نہ سکو گے۔ وہ بند ہوا میں بھی غیر انسان کی بو سونگھ لیتے ہیں۔"

شیر باز نے کہا۔

"تم اطمینان رکھو۔ ہم اس قسم کے دھماکے سے گریز کریں گے۔"

عالمگیر نے پوچھا۔

"تم لوگ کب اس مہم پر روانہ ہونا چاہتے ہو؟"

شیر باز نے کہا۔

"اگر ہمیں کل صبح گائیڈ مل جائے تو ہم کل ہی روانہ ہو جائیں گے۔"

عالمگیر بولا۔
"ٹھیک ہے۔ میں صبح گائیڈ کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

یہ اس قسم کا کمانڈو آپریشن تھا جس کا مجھے تو پہلے سے تجربہ تھا مگر شیر باز خاں کے لئے یہ ایک بالکل اجنبی اور ان جانی مہم تھی۔ اس کو نہ تو ان جنگلوں کا کچھ پتا تھا اور نہ کبھی وہ ان جنگلوں میں آیا ہی تھا۔ ویسے اس کی دلیری اور بہادری اور جذبے پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک کمانڈو کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بہادری کے جذبے کے ساتھ ساتھ اسے اس علاقے کے موسمی اور جغرافیائی حالات کا بھی پورا پورا علم اور تجربہ ہو۔ جہاں اسے کمانڈو آپریشن کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ میں اس لئے بھی مطمئن تھا کہ جہاں ضرورت پڑی وہاں میں شیر باز کی راہنمائی کروں گا۔ دوسرے روز عالمگیر ایک دبلے پتلے کالے رنگ کے ادھیڑ عمر آدمی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ کہنے لگا۔

"یہ مسلمان ہے اور دکن کا رہنے والا ہے۔ یہ ان جنگلوں میں انگریز شکاریوں کا گائیڈ رہ چکا ہے۔ یہ گندھاری جنگلی قبیلے میں تو کبھی نہیں گیا مگر اسے معلوم ہے کہ اس قبیلے کی جنگلی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ تمہیں وہاں تک پہنچا کر واپس آ جائے گا۔"

اس کے بعد عالمگیر چمڑے کا ایک تھیلا جیپ میں سے نکال کر لایا اور ہمیں ریسٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں اپنے ساتھ لے جا کر بولا۔

"اس تھیلے میں تمہارا مطلوبہ اسلحہ ہے۔ چیک کر لو۔"

ہم نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ اس میں دو پرانی قسم کی شارٹ گنیں تھیں۔ جن کی نالیوں کے آگے سائیلنسر کی نالیاں چڑھی ہوئی تھی۔ بارہ ہینڈ

گرنیڈ تھے۔ دو بڑے کمانڈو چاقو تھے اور ٹین کے بڑے ڈبے میں نمکین اور میٹھے بسکٹ بھرے ہوئے تھے۔ عالمگیر کہنے لگا۔

"گائیڈ تمہیں جنگل کے ایسے علاقے میں سے لے کر جائے گا۔ جہاں راستے میں تمہیں کہیں کہیں پانی اور جنگلی بیروں اور جنگلی کیلوں کے درخت مل جائیں گے۔ تم انہیں کھا کر گزارہ کر لینا لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جب تم وحشی قبیلے کے خطرناک جنگل میں داخل ہو گے تو وہاں تمہیں کچھ کھانے پینے کو ملے گا یا نہیں۔ یہ بسکٹ تم اس وقت کے لئے بچا کر رکھنا۔ یہ تھرمس ہے۔ اس میں میں نے چائے بنا کر بھر دی ہے۔ جہاں ضرورت پڑے پی لینا۔ لیکن جب گندھاری وحشی قبیلے کے جنگل میں داخل ہونے لگو تو اس تھرمس کو خالی کر کے اس میں کسی ندی نالے سے پانی بھر لینا۔ یہ تمہیں وہاں کام آئے گا۔"

اس وقت ابھی دن چڑھا ہی تھا۔ عثمان بابا نے ہمارے لئے پراٹھوں کا ناشتہ بنایا۔ ہم سب نے مل کر کھایا۔ کافی پی۔ عثمان بابا نے چھ سات میٹھے پراٹھے ایک رومال میں باندھ کر ہمارے تھیلے میں تھرمس کے ساتھ ہی رکھ دیئے۔

آسمان پر اس وقت بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہ بادل دو روز سے چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی سی بارش صرف رات کو ہوئی تھی۔ اس وقت بارش رکی ہوئی تھی۔ عالمگیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بادل بارش والے نہیں ہے۔ سفر لمبا ہے مگر گائیڈ تمہیں ایسے راستے سے لے جائے گا کہ تم دن میں دو چار گھنٹے بھی چلتے رہے تو کل رات تک اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔"

ہم نے عالمگیر کو خدا حافظ کہا اور تامل مسلمان گائیڈ کے ساتھ ریسٹ ہاؤس سے نکل کر آندھرا پردیش کے گھنے جنگلوں کی طرف چل پڑے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ گائیڈ ہمیں ایسے رستے سے لے

جا رہا تھا جو جنگل کے درمیان میں سے نہیں بلکہ جنگل کے کنارے کنارے سے ہو کر جاتا تھا اور یہ راستہ بقول اس کے جنگلی درندوں اور خطرناک دلدلوں سے محفوظ بھی تھا۔ ہم دوپہر تک آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ دوپہر کے بعد ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی آگئی۔ یہ بانس اور مہاگنی کے درختوں کے درمیان سے ہو کر گذرتی تھی۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے کچھ کھانا کھایا۔ ندی کا پانی پیا۔ تھوڑی سی چائے تھرمس میں سے نکال کر پی۔ کچھ دیر آرام کیا اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کمانڈو چاقو ہم نے اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ شارٹ گنیں کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ ہینڈ گرنیڈ تھیلے میں ہی پڑے تھے۔ چلتے چلتے گھنا جنگل ختم ہوگیا۔ سامنے خالی میدان تھا۔ جو پتھریلا تھا۔ اس کے آگے اونچی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ گائیڈ نے ان پہاڑیوں کی طرف اشارہ کرکے ہمیں بتایا کہ گندھاری جنگلی قوم کا گاؤں ان پہاڑیوں کی دوسری طرف والے جنگل میں ہے۔

یہ پہاڑیاں کافی فاصلے پر تھیں۔ ہم ایک کچے راستے پر آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ وہاں کی زمین سرخی مائل تھی۔ کہیں کہیں راستے میں دو چار جھونپڑیاں نظر آ جاتیں جن کے باہر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے ہوتے تھے۔ ہم ان سے دور رہ کر آگے گذر جاتے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب ہم دور سے نظر آنے والی پہاڑیوں کے دامن میں آگئے۔ ہمارے گائیڈ نے کہا۔

"اب ہم وش گندھاریوں کے جنگل والی پہاڑیوں میں داخل ہونے والے ہیں۔"

جب تک سورج غروب نہیں ہوگیا ہم چلتے رہے۔ سورج کے غروب ہوتے ہی پہاڑی ٹیلوں اور گھاٹیوں میں شام کے سائے اتر آئے۔ ہمارا گائیڈ ایک جگہ رک کر بالکل ساکت ہوگیا۔ وہ جیسے فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیر باز نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ پھر ہمیں ایک طرف لے گیا اور ہمیں کہا۔

"اس درخت پر چڑھ جاؤ۔ جلدی کرو۔"

جس درخت کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس کی موٹی موٹی ٹہنیاں زمین سے کوئی چھ سات فٹ اونچی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو سہارا دے کر درخت پر چڑھ گئے۔ گائیڈ بھی ہمارے پیچھے درخت پر چڑھ کر ساتھ والی ٹہنی پر بالکل بندر کی طرف بیٹھ گیا۔ وہ جھک کر شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے دبی زبان میں مجھے جھڑک کر کہا۔

"چپ رہو۔"

یہ کالی کالی ڈراؤنی شکل والی پہاڑیوں کے شروع کا علاقہ تھا۔ یہ کوئی اتنا گھنا جنگل نہیں تھا۔ فاصلے فاصلے پر درخت کھڑے تھے۔ ان کے بیچ میں سرکنڈوں ایسی کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور کہیں پتھر زمین سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ اس سے پہلے ایک دو درختوں پر سے پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر اب پرندے بھی چپ ہو گئے تھے۔ چاروں طرف دہشت ناک سناٹا تھا۔ اتنے میں کسی جانور کے ہاؤں ہاؤں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کون سا جانور ہے۔ شیر باز میرے بالکل ساتھ ہی اسی موٹی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ کیسی آواز تھی؟"

اپنا گائیڈ ساتھ والی ٹہنی پر اکڑوں بیٹھا نیچے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شیر باز کی سرگوشی کو سن لیا تھا۔ ہماری طرف دیکھ کر اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کی تلقین کی اور نیچے دیکھنے لگا۔ ہاؤں ہاؤں کی آواز دو

تین بار بلند ہو کر غائب ہو گئی۔ پھر ایسی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی سرکنڈوں میں چل رہا ہے۔ نیچے درختوں اور جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس گہرے ہوتے اندھیرے میں اچانک ایک زرد دھاریدار بہت بڑا شیر نمودار ہوا۔ ایسا زبردست شیر میں نے صرف ایک بار سندربن کے جنگلوں میں دیکھا تھا۔ میں نے درخت کی ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شیرباز نے بھی شیر کو دیکھ لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی لیکن اتنا مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس نے میرے بازو کو پکڑ لیا تھا۔

لگتا تھا کہ جیسے شیر نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہے یا ہماری بو سونگھ لی ہے۔ وہ بڑی شان سے آہستہ آہستہ چلتا اس درخت کے پاس آگیا جس کی شاخوں میں ہم چھپے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں اتنے زیادہ پتے نہیں تھے اور ہم شیر کو نظر آ گئے تھے۔ میں دل میں سخت خوف زدہ تھا۔ کیونکہ زمین سے اس ٹہنی کا فاصلہ جس پر ہم بیٹھے تھا سات فٹ سے زیادہ نہیں تھا اور شیر بڑی آسانی سے جست لگا کر ہمیں نیچے گرا سکتا تھا۔ شیر چند لمحے خاموشی سے ہماری طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہا۔ اس کی دم بے چینی سے دائیں بائیں گردش کر رہی تھی۔ اس کے حلق سے ہلکی ہلکی غراہٹ نکل رہی تھی۔ میرا بدن خوف کے مارے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ شیر نے سر نیچے کر لیا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ پھر ہماری طرف منہ اٹھا کر دیکھا۔ غرایا' سر نیچے کیا اور بڑے شاہانہ انداز میں ہمارے نیچے سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ اس طرف گیا تھا جس طرف سے ہم آئے تھے۔

میں اپنے گائیڈ کی عقلمندی' تجربے اور مہارت پر دل میں اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شخص نے فضا میں شیر کی بو سونگھ لی تھی۔ اگر وہ بو سونگھ کر عین وقت پر ہمیں خبردار نہ کرتا اور درخت پر چڑھنے کا اشارہ نہ کرتا تو اب تک ہم شیر کا نوالہ بن چکے تھے۔ شیر کو وہاں سے گئے ایک ڈیڑھ منٹ گذر گیا مگر ہم دونوں پر ابھی تک اس کا خوف طاری تھا۔ گائیڈ نے آہستہ سے کہا۔

"نیچے اتر آؤ۔ شیر واپس نہیں آئے گا۔"

ہم میں سے کوئی بھی اتنی جلدی نیچے اترنے کو تیار نہیں تھا۔ کیا معلوم شیر کسی جگہ چھپ کر ہمارے نیچے اترنے کا انتظار کر رہا ہو۔ گائیڈ نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ہم دونوں اس طرح درخت کی ٹہنی پر بیٹھے رہے۔ گائیڈ نے نیچے سے آواز دی۔

"کیا کر رہے ہو اوپر۔ نیچے آ جاؤ۔"

میں نے شیر باز سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں نیچے اتر جانا چاہئے۔"

اور ہم باری باری نیچے کود گئے۔ گائیڈ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے شیر کی مخالف سمت سرکنڈوں میں تیز تیز چلنے لگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ اندھیرا زیادہ گہرا ہو رہا تھا۔ آگے تھوڑی سی کھلی زمین تھی۔ یہاں درخت دو چار ہی تھے۔ چٹانوں کی سیاہ ڈھلانیں سایوں کی طرف نظر آ رہی تھیں۔ گائیڈ ان چٹانوں کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ ہم اس کے پاس گئے۔ کہنے لگا۔

"ان چٹانوں کے پیچھے ایک ندی ہے۔ ہم ندی کے پاس رات بسر کرنے کا ٹھکانہ تلاش کریں گے۔"

چٹانوں کے پیچھے گھوم کر آئے تو نیچے نشیب میں درختوں کا جھرمٹ تھا۔ ہم اتر کر اس جھرمٹ میں آ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ شیر خان نے کہا۔

"اس جگہ رات کو شیر کا خطرہ ہو گا۔ وہ واپس آ سکتا ہے۔"

گائیڈ نے کہا۔

"نہیں شیر چوکاورگ کے جنگل میں شکار کی تلاش میں گیا ہے۔ وہ صبح ہونے سے پہلے نہیں آئے گا اور پھر ہم یہاں کوئی محفوظ جگہ دیکھیں گے۔"

ہم ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ جوتے اتار کر پاؤں دھوئے۔ منہ ہا
دھویا۔ ندی کا ٹھنڈا میٹھا پانی پیا۔ اس دوران ہمارا گائیڈ اوپر کی طرف رات بر
کرنے کا ٹھکانہ ڈھونڈنے چلا گیا تھا۔ شیر باز کہنے لگا۔

"میں نے چڑیا گھر کے پنجرے میں شیروں کو کئی بار دیکھا تھا مگر جنگل ک
آزاد فضاؤں میں جنگل کے بادشاہ کو پہلی بار دیکھا ہے۔ خدا کی قسم مجھ پر خوف
طاری ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا۔

"شیر واقعی جنگل کا بادشاہ ہے۔ میں بھی خوف زدہ تھا لیکن حیرانی کی
بات ہے کہ شیر نے ہم پر حملہ کیوں نہیں کی۔"

اتنے میں ہمارا گائیڈ آگیا۔ کہنے لگا۔

"اوپر آ جاؤ۔"

تھوڑا اوپر چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک بہت بڑی سیاہ چٹان کسی عفریت
کی طرح ٹیلے کی دیوار سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا سا
قدرتی غار بن گیا تھا جس کی لمبائی دس پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ ہم وہاں
گھس کر بیٹھ گئے۔ یہاں ہم نے تھیلے میں سے کھانا نکال کر کھایا۔ کافی تھرمس میں
سے نکال کر پی۔ گائیڈ نے ادھر ادھر سے درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں اور
موٹے موٹے ٹہن ایک جگہ جمع کر کے انہیں آگ لگا کر الاؤ روشن کر دیا تھا۔ الاؤ
ہم سے اتنی دور تھا کہ ہم تک اس کی تپش نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہمارے پاس آ
کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"اس آگ کی وجہ سے رات کو کوئی جنگلی جانور اس طرف نہیں آئے
گا۔ شیر یہاں سے جا چکا ہے۔ وہ اگر اس طرف سے واپس آیا تو رات کے پچھلے
پہر ہی یہاں سے گذر جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت تو ہم بے سدھ ہو کر سو رہے ہوں گے۔ شیر ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔ الاؤ بھی بجھ چکا ہوگا۔"

گائیڈ نے کہا۔

"اگر شیر نے ہم پر حملہ کرنا ہوتا تو اس وقت ہی کر دیتا جب ہم درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور شیر درخت کے نیچے کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم اس سے چھ سات فٹ ہی بلند تھے اور یہ بلندی اتنے بڑے شیر کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی لیکن شیر نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ یہ شیر آدم خور نہیں تھا۔ جنگل میں صرف آدم خور شیر ہی انسان پر حملہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسے آدمی کا گوشت کھانے کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔ وہ آدمی کے سوا اور کسی کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتا۔ یہ شیر آدم خور نہیں تھا۔ اسے صرف اس بات پر تھوڑا غصہ آیا تھا کہ شیر جنگل کا بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ جنگل کے سارے جانور خوف کے مارے چپ ہو گئے تھے۔ پھر ہم اس کی راہ میں کیوں حائل ہو گئے تھے۔ شیر کو قدرتی طور پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انسان کی موجودگی ہرنوں' نیل گایوں اور اس کے پسندیدہ دوسرے جانوروں کو وہاں سے بھگا دیتی ہے۔ اسی لئے وہ ہم پر غرا کر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔"

باتیں کرتے کرتے رات گہری ہوتی گئی۔ جنگل کا سناٹا اور زیادہ گہرا ہوگیا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ صرف کسی کسی وقت الاؤ میں کسی لکڑی کے چٹخنے کی آواز آ جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ الاؤ کی آگ بھی مدھم ہوتی گئی۔ الاؤ کی وجہ سے وہاں سے مچھر بھاگ گئے تھے۔ ہم وہیں کھوہ کے اندر ادھر ادھر پڑ کر لیٹ گئے۔ دن بھر چلتے رہے تھے۔ تھک گئے تھے۔ آنکھیں بند کیں تو گہری نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"جس وقت آنکھ کھلی تو جنگل چڑیوں اور پرندوں کی آوازوں سے گونج

رہا تھا۔ ہمارا گائیڈ وہاں نہیں تھا۔ شیر باز بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔"

"یہ گائیڈ کہاں چلا گیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہیں کہیں ہو گا۔"

ہم نے ندی پر جاکر منہ ہاتھ دھویا۔ تھیلے میں سے میٹھے پراٹھے کے دو چار ٹکڑے نکال کر کھائے۔ کافی پی اور شارٹ گنیں کھول کر انہیں صاف کرنے لگے۔ شیر باز خان کہنے لگا۔

"ان جنگلوں میں اس قسم کا کمانڈو آپریشن میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں بھارت کے وسطی جنگلوں میں کافی پھرتا رہا ہوں مگر میں زیادہ تر مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش کے جنگلوں میں رہا ہوں۔ اس طرف میں بھی پہلی بار آیا ہوں۔"

شیر باز شارٹ گن پر سائیلنسر کی نالی فٹ کرتے ہوئے بولا۔

"خدا کرے کہ جس لڑکی کی تلاش میں ہم یہاں آئے ہیں وہ ہمیں مل جائے۔ عالمگیر کی رپورٹ کہیں غلط نہ نکل آئے۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے جس اعتماد سے اس نے ہمیں کہا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ نور بانو اسی جنگل میں وحشی گندھاری قبیلے والوں کی قید میں ہے۔"

شیر باز شارٹ گن کی نالی کو کپڑے سے رگڑ رگڑ کی صاف کر رہا تھا کہنے لگا۔

"ایک بار نور بانو کو کشمیر پہنچا دوں۔ میں اس مرہٹے کرنل واڈیکر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کا کام ضرور تمام کروں گا۔"

اتنے میں گائیڈ بھی آگیا۔ کہنے لگا۔

"رات کو ایک ہاتھی اور پھر ایک ریچھ اس طرف آگیا تھا۔ مگر آگ کو دیکھ کر دونوں درندے دور دور ہی رہے۔ میں نے دونوں کو دیکھا تھا۔ تم گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔"

شیر باز خان بولا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟ میں ہاتھی کا شکار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میری بچپن سے خواہش رہی ہے۔"

گائیڈ نے فوراً کہا۔

"ایسی غلطی یہاں مت کرنا۔ ہم اس وقت وحشی گندھاری قبیلے والوں کے جنگل کی سرحد کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ ہماری تلاش میں ضرور نکل پڑیں گے۔ انہیں اپنے دیوتا وش گندھاری کو انسانی قربانی کرنے کے لئے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

شیر باز نے کہا۔

"ہمارے پاس کافی اسلحہ ہے۔ ہمارے پاس ہینڈ گرنیڈ بھی ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو ان تیر کمان اور نیزے بھالوں والے جنگلی لوگوں کو حملہ کر کے ایک منٹ میں ختم کر سکتے ہیں۔ ہمیں ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

گائیڈ نے کہا۔

"اگر ایسی بات ممکن ہوتی تو آندھیرا پردیش کی گورنمنٹ ان وحشی آدم خور لوگوں کو بہت پہلے ختم کر چکی ہوتی۔ یہاں کی حکومت کی بڑی بدنامی ہے کہ ہر سال اس جنگل میں دو چار آدمی غائب ہو جاتے ہیں۔ پولیس نے کئی بار ان وحشی لوگوں کے قبیلے پر حملہ بھی کیا ہے مگر یہ وحشی اس طرح غائب ہو جاتے ہیں

جیسے زمین انہیں کھا گئی ہو۔ انھوں نے جنگل میں پوشیدہ مقامات پر زمین کے نیچے ایسی سرنگیں بنائی ہوئی ہیں جہاں یہ لوگ چھپ جاتے ہیں۔ آج تک پولیس ان سرنگوں کا سراغ نہیں لگا سکی۔ جو خفیہ پولیس کا آدمی سراغ لگانے جاتا ہے وہیں غائب ہو جاتا ہے۔ آندھیرا پردیش کی حکومت نے اب مجبور ہو کر اعلان کر رکھا ہے کہ گندھاری قبیلے کے جنگل میں مہلک بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ ادھر کوئی شکاری شکار کھیلنے یا کوئی دوسرا لکڑی کاٹنے نہ جائے ورنہ حکومت ذمے دار نہ ہوگی۔ ایسا حکومت نے بدنامی سے بچنے اور اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے کیا ہے۔ اسی لئے میں تمہیں یہی کہوں گا کہ اگر ایسا وقت آ جائے تو چاقو یا کلہاڑی یا نیزے وغیرہ سے کام لینا۔ پستول کا فائر ہرگز نہ کرنا۔ چاقو سے تو تم ہو سکتا ہے اپنے سامنے آئے ہوئے دو چار جنگلی آدمیوں کو مار ڈالو لیکن فائر کرو گے تو اس کی آواز سن کر قبیلے کے سارے جنگلی اس طرف آ جائیں گے اور تمہیں گھیرے میں لے لیں گے اور موقع پا کر تم پر زہریلے تیروں کی بارش کر دیں گے۔ تم زندہ نہ بچ سکو گے۔"

ہم خاموشی سے گائیڈ کی باتیں سنتے رہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ سفر پر چل پڑے۔ دوپہر تک ہم چلتے رہے۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ایک گھنٹے چلتے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے رک جاتے۔ اس کے بعد پھر چلنا شروع کر دیتے۔ دوپہر کو ہم نے ایک جگہ پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کافی ختم ہو رہی تھی۔ صرف ایک پیالی تھرمس میں رہ گئی تھی۔ ہم دونوں نے آدھی آدھی پیالی پی اور خالی تھرمس میں عالمگیر کی ہدایت کے مطابق پینے کا پانی بھر لیا۔ پراٹھے بھی ایک دو ہی رہ گئے تھے۔ وہ سارا دن بھی سفر کرتے گزر گیا۔ جنگل کی شکل تبدیل ہو گئی تھی۔ پہاڑی ٹیلے سرخ اور نیلے نیلے ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں ان پر گہرے سبز رنگ کے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آ رہے تھے۔ زمین پر جو چٹانیں تھیں ان کا رنگ گہرا نسواری اور کتھی تھا۔ کہیں کہیں کیلے اور بیر کے

ل درخت راستے میں آ جاتے تھے۔ ہم تھوڑے بیر اور کیلے توڑ کر کھا لیتے۔
اب شام ہو گئی تو ہم نے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر وہاں پڑاؤ ڈال لیا۔ سارا دن
ہمیں جنگل میں کوئی ہاتھی یا شیر چیتا نہیں ملا تھا۔

گائیڈ نے بتایا کہ شیر چیتے عام طور پر ان جنگلوں میں رات کے وقت
اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ہاتھی جنوب کے جنگلوں میں زیادہ پائے جاتے
ہیں۔ دوسری رات بھی جنگل میں گذر گئی۔ اگلے دن ہم پھر آگے چل پڑے۔
دوپہر ہو رہی تھی کہ ہمیں کچھ فاصلے پر نیم دائرے کی شکل میں پہاڑیوں کا ایک
سلسلہ سا دکھائی دیا۔ گائیڈ نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہم اپنی منزل کے قریب آ گئے ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان وش
قندھاری قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ ہم شام تک ان پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ
جائیں گے۔ میں وہاں تم سے جدا ہو جاؤں گا لیکن آج کی رات ان پہاڑیوں میں
تمہارے ساتھ ہی بسر کروں گا۔"

شام تک ہم ان پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے جن کی دوسری طرف وحشی وش گندھاری قبیلے کے لوگ آباد تھے اور جہاں ہماری کشمیری بہن نور بانو ان لوگوں کی قید میں تھی۔ ہمارا گائیڈ یہاں بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ وہ ہمیں اونچی آواز میں بولنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے ہمیں جھاڑیوں اور درختوں کی شاخیں توڑنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

"یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہاں اگر کوئی کسی درخت یا جھاڑی کی شاخ توڑے تو گندھاری قبیلے والوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ دشمن ان کے علاقے میں داخل ہوگیا ہے۔ وہ اسی جگہ پہنچ جاتے ہیں اور آدمیوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ بوڑھوں اور بچوں کو وہیں ہلاک کر ڈالتے ہیں صرف جوان عورت یا جوان مرد کو دیوتا کی قربانی کے لئے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اس لئے خبردار آگے تمہیں جنگل میں اکیلے ہی سفر کرنا ہوگا۔ کسی درخت یا جھاڑی کی ٹہنی کو ہاتھ لگانے کی بھی حماقت نہ کرنا نہیں تو مارے جاؤ گے۔ تمہاری یہ بندوقیں تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی۔"

ہم گائیڈ کی ہدایات پر عمل کرنے پر مجبور تھے۔ شام کا اندھیرا پہاڑی کے دامن والے جنگل میں پھیل گیا تو گائیڈ نے ایک محفوظ جگہ ڈھونڈ کر وہاں رات ٹھہرنے کا انتظام کر لیا۔ ہم نے آگ کا الاؤ بھی روشن نہ کیا۔ رات کچھ سو کر زیادہ جاگ کر گذار دی۔ ایسی خاموش اور ہیبت ناک خاموشی والی رات میں نے بھارت کے کسی جنگل میں نہیں دیکھی تھی۔ رات کی خاموشی اور سکوت میں

ایک عجیب ڈراونی بات تھی۔ کسی وقت ہمیں ہلکی ہلکی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ جیسے قریب ہی بہت سے سانپ بول رہے ہوں۔ کبھی تھوڑے وقفے کے بعد ایسی آواز کی گونج سنائی دتی جیسے زمین کے اندر کوئی چٹان گری ہو۔ گائیڈ بھی ہمارے ساتھ جاگ رہا تھا اور ان آوازوں کو غور سے سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ گندھاری وحشیوں کے جنگل میں رات کو پھانسی پا کر مرنے والوں اور مردہ چڑیلوں کی بدروحیں اترتی ہیں اور جو سامنے آتا ہے اس سے چمٹ کر اسے ہلاک کر دیتی ہیں اور اس کی روح کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔"

میں نے تو بھارت کے ان جنگلوں میں لوگوں سے اس قسم کی باتیں پہلے بھی سن رکھی تھیں لیکن شیر باز کے لئے یہ عجیب و غریب باتیں تھیں۔ وہ ایک سیدھا سادہ بہادر کمانڈو تھا۔ ویسے میں نے محسوس کیا کہ اس پر گائیڈ کی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"گائیڈ بھائی! میں ان واہیات باتوں کو نہیں مانتا۔ ہم جس مشن پر آئے ہیں انشااللہ اسے پورا بھی کریں گے اور ان درندہ صفت قاتل لوگوں کو ہمیشہ کے لئے ختم بھی کر دیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ ہماری شارٹ گنوں اور ہینڈ گرنیڈوں کے سامنے وہ کیسے ٹھہرتے ہیں؟"

گائیڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموش رہا۔ رات گذر گئی۔ صبح ہوئی تو گائیڈ ہم سے رخصت ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

"جس پہاڑی کے پاس اس وقت ہم کھڑے ہیں تم لوگ اس کے ساتھ ساتھ جاؤ گے۔ جہاں یہ پہاڑی ختم ہو گی وہاں تمہیں درختوں کے درمیان گھرا ہوا ایک ہرا بھرا کھیت نظر آئے گا۔ اس کو کھیت سمجھ کر اس میں داخل مت ہو جانا کیونکہ وہ کھیت نہیں ہوگا۔ وہ سینکڑوں برس پرانا ایک تالاب ہے جس کے

اندر سانپ جتنی موٹی موٹی جونکیں رہتی ہیں۔ کوئی جانور یا آدمی تالاب میں گر پڑے یا غلطی سے چلا جائے تو یہ موٹی موٹی جونکیں اس سے چمٹ جاتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے اس کا سارا خون چوس لیتی ہیں۔ اس خونیں تالاب سے بچ کر تم دائیں جانب درختوں میں چلے جانا۔ یہاں سے وش گندھاری وحشی قبائل کا جنگل شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد تمہیں خطرناک دلدلوں اور خونیں جونکوں والے تالابوں سے خود ہی بچنا ہو گا۔ جنگل میں داخل ہونے کے بعد تم لوگ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے بات نہ کرنا۔ کھانسی آئے تو منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر یا منہ گھٹنوں میں چھپا کر کھانسنا تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ تمہاری آواز کسی نہ کسی طرح ادھر ادھر موجود وحشی جنگلیوں تک پہنچ سکتی ہے۔ کسی درخت یا جھاڑی کی ٹہنی بھی نہ توڑنا۔ آگے اپنی حفاظت کرنا اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنا تمہارا کام ہے۔ ہر قدم پر بے حد احتیاط سے کام لینا۔ تم سے ذرا بھی بھول ہو گئی تو تمہاری موت یقینی ہو گی۔ میں اب واپس جاتا ہوں۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔"

یہ کہہ کر گائیڈ واپس چل دیا۔

میں اور کمانڈو شیر باز جنگل میں پہاڑی کے پاس اکیلے رہ گئے۔ ہم تربیت یافتہ کمانڈو تھے اور یہ ہمارا کمانڈو آپریشن تھا۔ ہم خوف زدہ نہیں تھے مگر ہمیں تشویش ضرور تھی کہ کہیں ہم سے کوئی ان جانے میں غلطی نہ ہو جائے۔ شیر باز خان نے پہاڑی کی بلندی پر ایک نگاہ ڈالی اور آہستہ سے کہا۔

"حیدر علی! اللہ ہمارا نگہبان ہے۔ ہم حق پر ہیں۔ خدا ہماری مدد ضرور کرے گا۔ آ جاؤ۔"

ہم نے اللہ کا نام لیا اور جس طرح ہمارے گائیڈ نے ہمیں کہا تھا پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چلنے لگے۔ یہاں زیادہ درخت جھاڑیاں نہیں تھیں۔ کوئی پگ ڈنڈی بھی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے

آہستہ آہستہ دیکھ بھال کر بڑھے جا رہے تھے۔ پہاڑی کا گھیر کافی بڑا تھا۔ جب ہم اس کی دوسری جانب پہنچے تو ہمیں اونچے اونچے درختوں کے جھنڈوں میں ایک سرسبز اور ہرا بھرا کھیت دکھائی دیا۔ شیر باز نے اشارے سے مجھے کھیت دکھایا۔ یہ وہی کھیت تھا جس کے بارے میں ہمارے گائیڈ نے بتایا تھا کہ وہ کھیت نہیں ہے خونیں تالاب ہے۔ جس میں سانپ سے بھی موٹی موٹی جونکیں رہتی ہیں اور منٹوں میں انسان کا خون چوس کر اسے ہلاک کر ڈالتی ہیں۔

ہم خونیں تالاب سے ہٹ کر آگے چلنے لگا۔ ہماری ایک جانب اونچے اونچے درختوں کی قطار سی نظر آئی۔ میں نے شیر باز خان کو درختوں کی قطار دکھائی اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"گائیڈ نے کہا تھا کہ اس کے آگے جنگلی قبائل کا جنگل شروع ہوتا ہے۔"

شیر باز خان نے آہستہ سے سر ہلایا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ ہم نے وحشی قبائل کے جنگل میں داخل ہونے سے پہلے ہی احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ ہماری کمانڈو تربیت کا اثر تھا۔ درختوں کی قطاروں سے ہم ذرا دور آگے گئے تو سامنے عجیب و غریب شکل کی چھوٹی چٹانیں نظر پڑیں۔ کسی کا رنگ سیاہ تھا۔ کسی کا رنگ سرخ تھا۔ کوئی گہری سبز تھی۔ ان کے اوپر گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی پرندہ بھی نہیں بول رہا تھا۔ کوئی پرندہ کسی درخت پر نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ بڑا آسیبی ماحول تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ جنگل پر سکوت طاری تھا۔ ہم چٹانوں کے درمیان سے گذرنے کی بجائے ان کے پیچھے سے ہو کر چل رہے تھے۔ جھاڑیوں کو ہم آہستہ سے پیچھے ہٹاتے جا رہے تھے۔ اچانک سامنے سیاہ رنگ کی زمین آ گئی۔ شیر باز خان نے مجھے وہیں ہاتھ سے روک لیا اور سیاہ زمین کی طرف اشارہ کرکے میری کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے یہ دلدل لگتی ہے۔"

یہاں ابر آلود دن کی روشنی گھنے درختوں سے دھندلی تھی۔ میں نے جھک کر غور سے زمین کی سطح کو دیکھا۔ زمین کی سطح تارکول کی طرح سیاہ تھی اور آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ پھر اچانک اس میں بڑے بڑے بلبلے پیدا ہونے لگے۔ بلبلے پھٹ گئے۔ بھاپ کی طرح ان سے ہوا اوپر کو فوارے کی طرف نکلی۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بہت بڑا سانپ پھنکار رہا ہو۔ یہ وہی دلدل تھی جس کے بارے میں عالمگیر نے کہا تھا کہ اس کے اندر جنگل کے سارے ہاتھی بھی گر پڑیں تو دلدل انہیں ایک سیکنڈ میں ہڑپ کر جائے گی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔

اب ہم وحشی گندھاری قبائل کے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں فضا میں دلدل اور گیلی زمین کی عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی پھل دار درخت نہیں تھا۔ درختوں پر جنگلی بیلیں اوپر تک چڑھی ہوئی تھیں۔ زمین ہموار تھی۔ پہاڑی یا ٹیلے کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف درخت ہی درخت اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے چلتے چلتے شیر باز کے قریب ہو کر اس کے کان میں دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا نور بانو کی تصویر تم ساتھ لائے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ہاں! اس کی پاسپورٹ سائز کی تصویر میرے پاس ہی ہے۔"

اگرچہ وہاں تصویر کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ہم نور بانو کے چہرے کی شناخت کر سکتے تھے۔ پھر بھی تصویر کا ساتھ ہونا اچھی بات تھی۔ کوئی بھی صورت حال پیدا ہو سکتی تھی۔ ہم اس خطرناک جنگل میں بہت دھیمی رفتار سے قدم قدم چل رہے تھے۔ دو تین قدم چلنے کے بعد رک کر چاروں طرف دیکھتے۔ کان لگا کر کوئی آواز سننے کی کوشش کرتے اور اس کے بعد پھر چل پڑتے۔ ایسا پراسرار اور گھنا جنگل میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فضا میں کیچڑ اور

زنگار کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک پھنکار کی دہشت ناک آواز آئی۔ ہم وہیں رک گئے۔ کمانڈو ہونے کی وجہ سے ہم خوف زدہ ہونے کی بجائے ہوشیار ہو جاتے تھے۔ شارٹ گنیں ہم نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھیں۔ اگرچہ ہمیں گولی چلانے سے منع کیا گیا تھا لیکن ہمیں اپنی جان کی بھی حفاظت کرنی تھی۔ پھنکار کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ جس طرف ہم جا رہے تھے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے کو خاص اشارہ کیا اور شارٹ گنوں کا رخ سامنے کی طرف کرکے آگے بڑھے۔ اونچی اونچی ستونوں ایسی چٹانوں میں سے نکل کر جیسے ہی درختوں میں آئے سامنے ایک گندا سا تالاب تھا۔ جس کے اندر سے دو مگرمچھ سر باہر نکالے پورا منہ کھولے پھنکار رہے تھے۔ شیر باز نے شارٹ گن کا رخ ایک مگرمچھ کی طرف کیا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ سے شارٹ گن کی نالی نیچے کر دی اور سرگوشی میں کہا۔

"یہ غلطی نہ کرنا۔ یہاں سے آگے چلو۔"

یہ وہی تالاب تھا جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس میں آدم خور مگرمچھ رہتے ہیں۔ جو جانوروں کے علاوہ آدمیوں کا گوشت بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ان مگرمچھوں نے ہماری بو سونگھ لی تھی اور اب ہمیں ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ جیسے ہی ہم نے قدم آگے بڑھایا۔ مگرمچھوں کی پھنکاریں بھی تیز ہو گئیں۔ تین اور مگرمچھ تالاب کی سطح پر نمودار ہو گئے۔ تالاب کی سطح پر کائی جمی ہوئی تھی اور درختوں کے گلے سڑے پتوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ مگرمچھوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔ مگرمچھ تالاب کے اندر تھے۔ ہم تالاب کے باہر تھے۔ اس کے باوجود خطرہ موجود تھا۔ مگرمچھ تالاب سے باہر بھی نکل آتا ہے اور خشکی پر دوڑ کر اپنے شکار کو دبوچ لیتا ہے۔

ہم تیز تیز چلتے مگرمچھوں والے تالاب سے دور ہو گئے۔ جیسے جیسے ہم آگے چلے جا رہے تھے جنگل زیادہ ڈراؤنا اور آسیبی ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں پر

موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم چلتے چلتے تھکے تو نہیں تھے مگر بہت زیادہ احتیاط کرنے کی وجہ سے سخت بور ہو گئے تھے۔ شیر باز ایک درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ میں بھی کوئی بات کئے بغیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھیلا میرے پاس تھا۔ میں نے تھیلا کھول کر اس میں سے باقی بچا ہوا میٹھا پراٹھا نکال کر آدھا شیر باز کو دیا اور آدھا خود کھانے لگا۔ تھرمس میں کافی نہیں تھی۔ ہم نے اس میں پانی بھر لیا تھا۔ ہم نے تھوڑا تھوڑا پانی پیا اور خاموش بیٹھے جنگل کا جائزہ لیتے رہے۔ ہم بول نہیں سکتے تھے۔ خطرہ تھا کہ وحشی قبائل کے لوگوں تک ہماری آواز نہ پہنچ جائے۔ ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔ اگرچہ کمانڈو شیر باز ان باتوں کو نہیں مانتا تھا مگر مجھے اس قسم کی مافوق الفطرت باتوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اسی لئے میں نے اس سے عالمگیر اور گائیڈ کی ہدایات پر سختی سے عمل کروا رہا تھا۔

یہ میرا تجربہ تھا کہ اس قسم کے ڈراؤنے جنگلوں میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی پیش آ جاتے ہیں جن کو دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے اور جنہیں عقل کبھی تسلیم نہیں کرتی۔ قدرت کے اکثر اصول و ضوابط کھلے عام ہیں۔ جن کو ساری دنیا جانتی ہے لیکن قدرت کے کچھ راز بھی ہیں جنہیں آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا کہ اصل میں ان کی حقیقت کیا ہے۔ سائنس دان یورپ اور امریکہ کی لیباٹریوں میں تجربے کرتے کرتے تھک گئے ہیں لیکن یہ بات آج تک ان کی سمجھ میں نہیں آ سکی کہ سمندروں کے اوپر سے ہزاروں میل تک سفر کرنے والے پرندے بغیر کسی راڈار کی مدد کے سفر میں اپنی سمت کیسے درست رکھتے ہیں۔ جبکہ اتنے لمبے سفر میں یہ پرندے اڑتے اڑتے سو بھی جاتی ہیں مگر ایک پرندہ بھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا یا اپنی راہ سے نہیں بھٹکتا۔

ہم نے تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کیا۔ اس کے بعد دونوں نے اشاروں اشاروں سے جنگل کے راستے کا تعین کیا اور شارٹ گنیں ہاتھ میں پکڑ کر دوبار اپنے پراسرار اور عجیب و غریب سفر پر چل پڑے۔ درخت ہمارے بہت قریب

ہوتے جا رہے تھے۔ ہم ان کے تنوں اور نیچے تک لٹکتی ہوئی شاخوں کے درمیان سے ہو کر گذرتے۔ اچانک ہمارے راستے میں ایک کوبرا سانپ آگیا۔ ہم وہیں ساکت ہو گئے۔ ہم شارٹ گن کے فائر سے اسے ہلاک کر سکتے تھے لیکن ہمیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ کوبرا سانپ بہت بڑا تھا۔ بالکل سیاہ رنگ کا تھا۔ زمین سے کوئی چار فٹ بلند ہو کر وہ پھن اٹھائے کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ اس کی مقناطیسی نگاہیں مجھے اپنے جسم کے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنا دوست سانپ بہت یاد آیا۔ کوبرا سانپ کچھ دیر تک ہمیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ پھن کو دائیں بائیں ہلاتا رہا۔ پھر اچانک اس نے پھن کو سکیڑ لیا اور گردن نیچی کر کے ایک طرف رینگتا ہوا چلا گیا۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا۔

درخت چونکہ ساتھ ساتھ کھڑے تھے اور انکے درمیان جنگلی جھاڑیاں بھی بے شمار تھیں اس لئے ہم قدم قدم چل رہے تھے۔ وقت زیادہ لگ رہا تھا فاصلہ کم طے ہو رہا تھا۔ جب دن ڈھل گیا اور جنگل میں شام کا سرمئی دھندلکا چھانے لگا تو ہم اپنے اندازے کے مطابق گندھاری قبائل کے جنگل کے وسط میں بھی نہیں پہنچے تھے۔ رات کے وقت تو کمانڈو آپریشن کے دوران ہم کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ یہ ہمارے لئے ایک قدرتی بات تھی لیکن دن کے وقت ہمارا ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں بات کرنا عجیب سا لگا رہا تھا اور ہمیں بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ ایک بار تو شیر باز خان پوری آواز سے بول پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

کمانڈو شیر باز خان ان جنگلوں کی پراسراریت کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اسے اپنی شارٹ گن اور دستی بموں پر بہت زیادہ بھروسہ تھا۔ بھروسہ ہونا بھی چاہئے تھا مگر وہ ان جنگلوں میں رہنے والے وحشی لوگوں سے ناواقف تھا۔ ان لوگوں پر مشین گنیں بھی کوئی اثر نہیں کرتیں۔ مشین گن کے برسٹ

سے دس بارہ جنگلی تو ضرور گریں گے مگر باقی ایسی جگہوں پر چھپ جائیں گے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کمانڈو بھی پتہ نہیں چلا سکتا کہ وہ کہاں روپوش ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد جب اچانک ان کے زہریلے تیر آنے شروع ہو جائیں گے تو مشین گنوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے ٹرینڈ گنر بھی کچھ نہیں کر سکیں گے اور مرتے چلے جائیں گے۔ ان جنگلیوں کے پاس جو زہریلے تیر ہوتے ہیں اور جو بڑے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور جن کو وہ بانس کی نلکی میں رکھ کر پھونک مار کر دشمن کی طرف پھینکتے ہیں۔ اس قدر زہریلے ہوتے ہیں کہ آدمی کے جسم میں چبھتے ہی اس کے اعصاب سن ہو جاتے ہیں۔ دماغ اور دل بند ہو جاتا ہے اور آدمی اسی لمحے مر جاتا ہے۔ یہ زہر ان جنگلیوں نے انتہائی زہریلے سانپوں کے منہ سے نکال کر ان تیروں کے آگے لگایا ہوتا ہے۔ مجھے صرف ان زہریلے تیروں کا ڈر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی خطرہ یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

یہ زہریلے تیر کسی طرف سے بھی اچانک آ کر ہمارے گردن میں یا بازو میں پیٹھ پر چبھ کر ہمیں اسی لمحے موت کی نیند سلا سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شیر باز کو بھی میں سنبھالے ہوئے تھا اور خود بھی ہر دوسرے تیسرے قدم پر رک کر ماحول کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے لیتا تھا۔ سننے کی کوشش کرتا تھا کہ جنگل کے درختوں یا جھاڑیوں میں سے کوئی غیر مانوس سی آواز تو نہیں آ رہی۔ ہمیں راستے میں دلدل کے دو قطعے اور ملے جن کی دلدل تارکول کی طرح اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ یہ دلدل سانس لیتی تھی۔ ایک مگرمچھوں والا خونیں تالاب بھی ہمارے راستے میں آیا۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو ہم نے کسی جگہ محفوظ ٹھکانہ بنا کر رات بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ زمین پر سونا بے حد خطرناک تھا۔ ہم کسی درخت پر چڑھ کر ہی رات گزار سکتے تھے۔ درخت ایسے تھے کہ کانٹے دار جنگلی بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان میں ایسی جنگلی بیلیں بھی تھیں کہ جن کی شاخوں سے جسم لگ جائے تو جسم پر خارش شروع ہو جاتی تھی۔ مجھے ان جنگلی بیلوں کا بھی خطرہ

تھا جو آدم خور بیلیں کہلاتی ہیں اور آدمی کے جسم سے چمٹ کر اس کے جسم میں اپنے سینکڑوں کانٹے چبھو کر اس کا سارا خون پی جاتی ہیں۔

گرمی اور حبس بھی بہت تھا۔ ماحول پر تاریکی چھا رہی تھی۔ رات آ گئی تھی۔ شیر باز ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ہم بوٹ اتار کر اپنے پاؤں خود ہی دبانے لگے۔ شیر باز خان نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہیں کسی درخت پر چڑھ کر رات گذار لیں گے۔"

میں نے تھیلا کھولا۔ میٹھے پراٹھے تو ختم ہو چکے تھے۔ بسکٹوں کا ڈبہ کھول کر میں نے درمیان رکھ دیا۔ تھرمس میں صرف پانی ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا ڈنر صرف خشک بسکٹوں اور سادہ پانی پر مشتمل تھا۔ ہم نے دس بارہ بسکٹ کھائے۔ ایک ایک پانی پیا اور اٹھ کر آس پاس کے درختوں کا جائزہ لینے لگے۔ ایک درخت پر جنگلی بیل صرف نیچے کی شاخوں تک چڑھی ہوئی تھی۔ اس کی اوپر کی شاخیں خالی تھیں۔ میں نے شیر باز کو وہ درخت دکھایا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

ہم کوشش کر کے ایک دوسرے کے پیچھے اس درخت پر چڑھ گئے اور زمین سے کوئی پندرہ بیس فٹ کی بلندی پر درخت کی گھنی اور موٹی موٹی شاخوں میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ درختوں میں ہم بستر تو نہیں بچھا سکتے تھے۔ ہمیں اس طرح ٹیک لگا کر کبھی جاگ کر اور کبھی سو کر رات گذارنی تھی۔ زرد اور سرخ چیونٹیوں کا خطرہ تھا مگر خدا کا بڑا کرم ہوا کہ وہاں ست پڑا کے جنگلوں والی سرخ اور زرد چیونٹیاں نہیں تھیں۔ مچھروں نے ضرور حملہ کر دیا مگر مچھروں کے ہم عادی ہو چکے تھے۔ ہمارے پاس ماچس تھی اور ہم بڑی آسانی سے درخت کے نیچے دھونی لگا کر ان مچھروں سے نجات حاصل کر سکتے تھے مگر ہمارے مجاہد ساتھی

عالمگیر اور گائیڈ نے بھی ہمیں سختی سے منع کیا تھا کہ اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد ہم نے الاؤ جلانے کی غلطی کی تو دھوئیں کی خوشبو پاکر وحشی قبیلے کے لوگ عین اس جگہ پہنچ جائیں گے اور پھر اگر ہمارے پاس راکٹ لانچروں کا ڈھیر بھی ہوگا تو ہمیں ان کے زہریلے تیروں سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ چنانچہ ہم نے نیچے یا درخت سے تھوڑا پرے ہٹ کر بھی آگ نہیں جلائی تھی۔ ہم آپس میں سرگوشیوں میں بات کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے تو ہمیں الجھن ہوتی تھی۔ اب یہ احساس ہونے لگا کہ ہماری آوازیں واقعی بیٹھ گئی ہیں۔ اب ہم اونچی آواز میں کبھی نہیں بول سکیں گے۔ کھانسی آتی تو ہم ٹانگوں میں سر دبا کر منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر تھوڑی تھوڑی کھانسی کھانس لیتے۔ شیر باز خان کا مجھ سے زیادہ برا حال تھا اس نے دل سے وحشی قبیلے والوں کے جان لیوا خطرات کو قبول نہیں کیا تھا مگر اسے میری خاطر یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ سخت پیچ و تاب کھاتا اور کسی کسی وقت میری سخت ہدایت کے باوجود ذرا سی اونچی آواز نکال لیتا تھا۔ ایک دوبار میں نے بھی ذرا سی اونچی آواز نکالی۔ ظاہر کیا کہ میں بھول گیا تھا۔ حقیقت میں میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں واقعی میری آواز تو نہیں جاتی رہی۔

ہماری کلائیوں پر گھڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہم ان پر وقت دیکھ لیتے تھے۔ ایک بار وقت دیکھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ گھڑیوں کی سوئیاں اندھیرے میں چمک کر وقت بتا دیتی تھیں۔ اگرچہ ہم سخت تھکے ہوئے تھے مگر جس طرح ہم درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے تھے ہمیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کے باوجود جب رات کے گیارہ بجنے والے تھے تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ شیر باز خان بھی اونگھنے لگا تھا۔ یہ ڈر تھا کہ کہیں اونگھ آ گئی تو درخت سے نیچے نہ گر پڑیں۔ اس لئے ذرا اونگھ آتی تو جلدی سے بیدار ہو کر اپنے آپ کو سنبھال لیتے۔ شارٹ گنیں ہم نے اوپر والی شاخ پر لٹکا دی تھیں۔ بسکٹوں' تھرمس بوتل اور دستی بموں والا تھیلا بھی ہم نے وہیں ایک ٹہنی سے لٹکا دیا ہوا تھا۔ ہمارے پاس کوئی رسی نہیں تھی ورنہ اگر ہم رسی سے اپنے آپ کو ٹہنی سے باندھ لیتے تو نیچے گرنے کا خطرہ کم ہو سکتا تھا۔ بس جمائیاں لے رہے تھے۔ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے ہم سخت بیزار ہو گئے تھے۔ اب بہت ہوتا تو اشاروں میں بات کر لیتے تھے ورنہ چپ رہتے تھے۔ کچھ معلوم نہیں کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ اچانک شیر باز نے جگا دیا۔ وہ میرے کندھوں کو جنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دی اور پوچھا۔

''کیا؟''

میرے حلق سے آواز نکل گئی تھی۔ شیر باز نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کچھ ڈرا ہوا لگتا تھا۔ اس نے ہاتھ میرے منہ پر ہی رکھا۔

اندھیرے میں مجھے اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ درخت کی ایک جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اپنے کان پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہہ رہا تھا کہ مجھے کوئی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کے اشاروں کو بڑی تیزی سے سمجھ لیتے تھے۔ میں نے بھی کان لگا دیئے۔ جنگل کی رات ایسی خاموش اور ساکت تھی کہ اس پر قبر کی خاموشی کا گمان ہوتا تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ ہم نے اس جنگل میں ابھی تک کسی پرندے اور جانور یعنی ہاتھی' ریچھ' گیدڑ یا شیر چیتے کی آواز نہیں سنی تھی۔ خدا جانے یہ کس قسم کا آسیبی جنگل تھا۔ میں بھی چپ تھا۔ شیر باز خان بھی چپ تھا۔ جنگل کی آسیبی رات بھی چپ تھی۔ ایک مچھر پیں پیں کرتا میرے کان کے پاس آ کر چکر لگانے لگا۔ میں نے ہاتھ سے اسے جھٹک دیا۔ عین اس وقت مجھے جنگل میں ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی عورت کی تھی اور ایک لمبی دردناک گھٹی گھٹی چیخ کی طرح کی تھی۔ جیسے کی عورت کو اذیت دی جا رہی ہو۔ اس کا گلا دبایا جا رہا ہو اور اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی ہو۔ یہ آواز اس عورت کی زندگی کی آخری آواز لگ رہی تھی۔ چیخ جنگل کی فنا آلود ساکت رات کے تاریک سناٹے میں گونج کر غائب ہو گئی۔

آواز اتنی ڈراؤنی اور لرزہ خیز تھی کہ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شیر باز خان نے جلدی سے شارٹ گن ٹہنی پر سے اتار کر پکڑی لی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی میں کہا۔

"فائر نہ کرنا۔"

اس نے میرا ہاتھ پرے کر دیا اور سرگوشی میں بولا۔

"دشمن کو شاید ہمارا پتہ چل گیا ہے؟"

میں نے سرگوشی میں ہی کہا۔

"جو کچھ بھی ہے فائر نہ کرنا ابھی۔"

اس نے بھی جنگل کی خاموشی پر کان لگا دیئے۔ میں بھی ہمہ تن گوش ہوگیا۔ جنگل پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تھا۔ شیر باز خان نے میری کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

"مجھے وقفے وقفے سے دو بار یہ آواز سنائی دی تھی۔ یہ کسی وحشی عورت کی آواز تھی۔"

میں نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر شیر باز خان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سوچنے لگا کہ یہ کس عورت کی آواز ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کسی وحشی قبیلے کی عورت کی آواز نہیں ہوسکتی۔ اس وحشی جنگلی قبیلے کے بارے میں جو باتیں سن رکھی تھیں ان کی روشنی میں وہاں کوئی ایسی عورت زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ عالمگیر نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس قبیلے میں کوئی آدمی یا عورت اگر بیمار ہو جائے تو اس کی کوئی تیمارداری نہیں کرتا۔ وہ مرد یا عورت خود ہی قبیلے سے نکل کر جنگل میں فرار ہو جاتی ہے۔ قبیلے کے وحشی لوگ اس کا پیچھا کرتے ہیں اور اسے زہریلے تیروں سے مار ڈالتے ہیں۔ اگر یہ جنگلی قبیلے کی کوئی بھاگی ہوئی بیمار عورت ہوتی تو وہ کبھی آواز نہ نکالتی۔ اگر آواز نکالتی تو قبیلے والے جنگلی اسے اب تک ختم کر چکے ہوتے۔

"تو کیا یہ کسی چڑیل کی آواز تھی؟"

چڑیلوں اور جن بھوتوں کا میں اس وقت بھی قائل تھا اور اب بھی مانتا ہوں کہ چڑیلیں اور جن دنیا میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنی شکل نہیں دکھاتے۔ میری بھی آج تک کسی بھوت جن' یا چڑیل سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار دور سے رات کے وقت ایک قبرستان میں چڑیل کو دیکھا ضرور تھا مگر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور ہنس کر غائب ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چڑیل نہ ہو کوئی دیوانی عورت ہو جو رات کو قبرستانوں میں پھرتی رہتی ہو۔

بہرحال یہ آواز اس خاموش اور ساکت جنگل میں ہمارے لئے ایک معمہ بن گئی تھی۔ کیونکہ اس جنگل میں ابھی تک ہم نے کسی پرندے تک کی آواز نہیں سنی تھی۔ جب چھ سات منٹ گذر گئے اور وہ چیخ جنگل کی فضا میں بلند نہ ہوئی تو میں نے شیرباز کے کان میں کہا۔

"یہ دشمن عورت کی آواز نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کوئی دیوانی جنگلی عورت ہوگی جو یہاں سے نکل گئی ہے۔ آخر ان جنگلی لوگوں میں بھی تو دیوانے ہوتے ہوں گے۔"

شیرباز خان نے شارٹ گن سینے سے لگا لی اور درخت کی پچھلی ٹہنی سے ٹیک لگاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"ہمیں جتنی جلدی ہو سکے ایکشن کر کے نور بانو کا پتہ چلا لینا چاہئے۔ زیادہ دیر اس جنگل میں رہے تو ہم بھی پاگل ہو جائیں گے۔"

میں نے شیرباز کے منہ پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"اوکے اوکے۔ اب خاموش رہو پلیز۔"

اس وقت رات کے پونے دو بج چکے تھے۔ اس کے بعد ہم میں سے کسی کو نیند نہ آئی۔ ہم جاگتے رہے اور باقی رات جاگ کر ہی گذار دی۔ میں نے آج تک وسطی اور مغربی اور جنوبی بھارت کے جو جنگل دیکھے تھے۔ ان میں صبح ہوتی تو درختوں پر پرندے میٹھی بولیاں بولتے۔ چڑیوں کی چہکار سے جنگل گونج اٹھتا تھا مگر یہ ایسا منحوس اور مردہ جنگل تھا کہ جنگل میں جب صبح کی روشنی پھیلی تو ایک بھی پرندے ایک بھی چڑیا کی چہکار سنائی نہ دی۔ جنگل پر ویسا ہی سناٹا طاری رہا جیسا کہ رات کے وقت طاری تھا۔

آسمان پر چونکہ بادل تھے اس لئے دھوپ نہیں نکلی تھی۔ صرف دن کی روشنی درختوں کے نیچے پھیل گئی تھی۔ ہم نے غور سے نیچے دیکھا۔ نیچے کوئی پرندہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہم درخت کے نیچے اتر آئے۔ ہمارے جسم اکڑ گئے تھے۔

ام نیچے اترتے ہی گھاس پر لیٹ گئے اور ٹانگیں پھیلا دیں۔ ساری رات ہم نے
انگلیں سینے سے لگائی رکھی تھیں۔ اس وقت ٹانگیں پھیلائیں تو اس سے بڑا سکون
اور لذت ملی۔ وہیں ہم نے تھیلے میں سے بسکٹ نکال کر کھائے تھرمس میں سے
ایک ایک چھوٹا کپ پانی نکال کر پیا۔ ہماری پیاس اور بھوک پوری طرح ختم
ہیں ہوتی تھی۔ کل سے ہم صرف بسکٹوں اور پانی پر گذارہ کر رہے تھے۔ دن
کی روشنی اس گھنے جنگل میں زیادہ روشن نہیں تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کی
اور جنگلی بیلوں کی وجہ سے وہاں اتنا جھاڑ جھنکاڑ تھا کہ دن کی روشنی پھیکی پھیکی
تھی۔ ہمیں جو بات کرنی ہوتی تھی وہ ایک دوسرے کے کان کے پاس منہ لاکر
کرتے تھے۔ ہمیں اب اس کی عادت پڑتی جا رہی تھی۔ میں کوئی بات کرنے کے
لئے ذرا منہ شیر باز کی طرف کرتا تو وہ جلدی سے اپنا کان میرے منہ کے قریب
لے آتا۔ شیر باز کہنے لگا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کس طرف جانا چاہئے؟"

سرگوشیوں میں بات کرنے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے بڑی مختصر
ات کرتے تھے۔ زیادہ لمبی بات نہیں کرتے تھے۔ میں جنگل کے جنوبی درختوں کی
طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہمیں اس طرف چلنا چاہئے۔ میرا خیال ہے وہاں نور بانو کا کوئی نہ
کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔"

شیر باز نے سرگوشی میں کہا۔

"ابھی تک کسی جنگلی کی جھونپڑی بھی نظر نہیں آئی۔ خدا جانے یہ کس
م کی مخلوق ہے۔"

میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شیر باز بھی اٹھا۔ ہم نے اپنی اپنی شارٹ
ن کاندھے سے لٹکائی۔ تھیلا بالکل ہلکا ہوگیا تھا۔ تھرمس کا پانی بھی اس میں
شکل ایک دو کپ ہی رہ گیا تھا۔ بسکٹ البتہ کافی تھے جو ہمارے لئے بیکار تھے۔

ان سے بھوک کو صرف بہلایا ہی جا سکتا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ جھاڑیوں کو ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ایک طرف ہٹاتے جنوب کی سمت چل پڑے۔ آگے جنگل زیادہ گھنا ہونے لگا۔ درخت اوپر جا کر ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ درختوں کی وہاں چھت پڑی تھی۔ ایک جگہ ہمیں دو سبز رنگ کے سانپ درخت کی ٹہنی پر بیٹھے نظر آئے۔ شیر باز نے شارٹ گن کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ فائر نہیں کرے گا بلکہ اگر ضرورت پڑی تو گن کی نالی سے سانپوں کو مارنے کی کوشش کرے گا۔ ہم سانپوں کے قریب سے گذر گئے۔

اپنی چھوٹی چھوٹی انار کے دانوں ایسی سرخ آنکھوں سے ہمیں دیکھتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کچھ نہ کہا۔ آگے جا کر مجھے دلدل کی تیز بو محسوس ہوئی۔ میں نے شیر باز کو ہاتھ سے روک دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"آگے دلدل ہے۔"

ہم ایک ایک قدم دیکھ دیکھ کر اٹھانے لگے۔ مگر دلدل ہماری بائیں طرف تھی۔ وہاں ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دلدل میں ایک بہت بڑا موٹا سانپ جو بالکل اژدہا کی طرح تھا پھنس گیا ہوا تھا۔ وہ دلدل میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور دلدل اسے تیزی سے نگل رہی تھی۔ دلدل میں سے سی سی کی آواز نکل رہی تھی اور وہ بڑی تیزی سے اوپر نیچے ہو کر اژدہا کو نگلتی جا رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے سارے کا سارا اژدھا دلدل میں غائب ہوگیا۔ دلدل تھوڑی دیر تک اوپر نیچے ہوتی رہی۔ اس کے بعد بالکل ساکن ہو گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ہم آگے نکل گئے۔ حبس کی وجہ سے ہمیں پسینہ بہت آ رہا تھا۔ گرمی بھی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہمیں پیاس محسوس ہوئی۔ ہم نے تھرمس میں سے پانی نکالا۔ تھرمس میں صرف ایک کپ پانی ہی تھا۔ وہی ہم نے دو دو تین تین گھونٹ پیا۔ ایک دو بسکٹ کھائے اور چل پڑے۔ ہم ساتھ ساتھ کھڑے درختوں

اور گھنی جھاڑیوں میں سے گذر رہے تھے۔ یہاں گھاس اور جھاڑیاں گیلی گیلی تھیں جن کے ساتھ لگ کر گذرنے سے سرسراہٹ کی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ جنگل کی فضا ویسی ہی سنسان تھی۔ جیسی رات کے وقت تھی۔ کسی درخت پر سے ننھی سی چڑیا کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ جنگل کا سکوت جیسے سانس لیتا محسوس ہوتا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو ہمارے قدم ایک دم اپنے آپ رک گئے۔ میں نے شیر باز کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جو آواز سنی تھی وہی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔ وہ کچھ کہنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جدھر سے آواز آئی تھی اس طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی لمبے لمبے گہرے سانس لیتا ہم سے تھوڑے فاصلے پر سے گذر گیا ہو۔ یہ سانس کی آواز ایسی تھی کہ کسی انسان کی بھی ہو سکتی تھی اور کسی درندے کی بھی ہو سکتی تھی۔ ہم کان لگائے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔ مگر اس بار وہ ہم سے دور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے شیر باز کو سرگوشی میں کہا۔

"کوئی درندہ تھا۔"

وہ آنکھیں کھولے جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے کوئی انسان لگتا ہے۔"

میں ایک دم چوکس ہو گیا۔ اگر یہ انسان تھا تو گندھاری قبیلے کے جنگلی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں شیر باز کا بازو پکڑ کر اسے وہیں جھاڑیوں میں بٹھا لیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

"شاید جانگلی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے زہریلے تیروں سے چاہئے۔"

ہم بالکل سانس روک کر بیٹھے تھے کہ اچانک جنگل کی خاموش فضا میں وہی عورت کی چیخ بلند ہوئی جو ہم نے آدھی رات کو سنی تھی۔ ایک بار تو ہم

دونوں کانپ کر رہ گئے۔ شیر باز نے گھبرا کر شارٹ گن کا رخ سامنے کی طرف کر لیا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"خدا کے لئے فائر نہ کرنا۔"

اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"یہ کوئی دشمن ہے۔"

میں نے کہا۔

"کچھ بھی ہے فائر نہ کرنا۔ ہم ویسے اس کو پکڑ لیں گے۔"

عورت کی دہشت بھری چیخ کی آواز بلند ہو کر جنگل میں اپنی دردناک گونج چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی۔ اس چیخ کے بعد جنگل کی خاموشی زیادہ ڈراؤنی لگنے لگی تھی۔ شیر باز نے کہا۔

"ہمیں اس آواز کا پیچھا کرنا چاہئے۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا وہ اٹھ کر جس طرف سے آواز آئی تھی۔ اس طرف آہستہ آہستہ جھک کر چلنے لگا۔ میں نے شارٹ گن کاندھے پر ڈال کر بڑا کمانڈو چاقو اپنے سیدھے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ایک جانب ذرا ہٹ کر چلنے لگا۔ آگے درختوں کے درمیان ایک سرنگ سی بنی ہوئی تھی۔ یہ درختوں کی سرنگ تھی جہاں جنگلی بیلیں جو درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں نیچے لٹک رہی تھیں۔ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ میں درختوں کی ایک جانب سے اور شیر باز خان کمانڈو ایکشن بنا کر دوسری طرف سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہماری نگاہیں بالکل سامنے جمی ہوئی تھیں۔ درختوں کی سرنگ ختم ہو گئی۔ آگے چھوٹی سی کھلی جگہ آ گئی۔ جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ سامنے اور دائیں بائیں گھنے درخت تھے۔ کھلی جگہ کے درمیان میں پتھروں کے درمیان شاید پانی بہہ رہا تھا۔ ہمیں پانی بہنے کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہاں کوئی پانی کا نالہ یا چشمہ تھا۔ ہم اس کی طرف بڑھتے ہی تھے کہ ہمارے قدم ایک ساتھ

رک گئے۔ ہم نے ایک طرف سے ایک انسان کو آتے دیکھا۔

چونکہ وہ جگہ جنگل کے وسط میں قدرے کھلی اور کشادہ تھی۔ اس لئے اوپر سے بادلوں والے آسمان میں سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی نیچے آ رہی تھی۔ اس روشنی میں ہم نے اس انسان کو غور سے دیکھا اور جلدی سے اونچی گھاس میں بیٹھ گئے۔ یہ انسان ایک عورت تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ اس کے بدن پر کوئی لباس نہیں تھا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک عریاں تھی۔ صرف کمر کے گرد اس نے کیلے کے چوڑے پتے لپیٹ رکھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پتھروں کے پاس آئی۔ کچھ دیر وہاں کھڑی نیچے دیکھتی رہی۔ پھر پتھروں پر بیٹھ گئی اور جانوروں کی طرح چشمے میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی۔ اس کے پانی پینے کی آواز بالکل اسی طرح آ رہی تھی جیسے کوئی شیرنی یا دوسرا درندہ زبان کی مدد سے پانی پیتا ہے۔ ہم نے سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم میں کسی کو بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہم ٹکٹکی باندھے جنگل کی اس وحشی عورت کو دیکھ رہے تھے۔ جو بالکل عریاں حالت میں چشمے کے کنارے جھک کر جانوروں کی طرح پانی پی رہی تھی۔ یہ منظر میں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

ہم اپنی جگہ پر سانس روکے بیٹھے تھے۔ وہ عورت ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اس کے پاس جنگلی قبیلے کے لوگوں والا زہریلا تیر کمان بھی نہیں تھا۔ پھر بھی ہمیں اس وحشی عورت سے ایک طرح کا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بڑے غور سے اس کے پاؤں کو دیکھا۔ اس کے پیر سیدھے تھے۔ وہ چڑیل نہیں تھی۔ اتنے میں اچانک وہ وحشی عورت پانی پیتے پیتے رک گئی۔ اس نے جانوروں کی طرح بیٹھے بیٹھے منہ ہماری طرف کیا جیسے اسے ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا ہو اور ہمیں دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ شیر باز نے اپنی گن نیچے کر لی۔ ہم گھاس میں اس طرح چھپے ہوئے تھے کہ وہ عورت ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وہ اس طرح ٹکٹکی باندھے ہمارے جانب اونچی گھاس کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے یا اسے ہماری بو آ گئی ہے۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ اس کے کالے سیاہ بال اس کے شانوں پر دونوں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ سر کے اوپر بھی بال پھولے ہوئے تھے۔ وہ جوان عورت لگتی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

”اس کو قابو کرنا چاہئے۔ شاید اس سے ہمیں نور بانو کا کوئی سراغ مل جائے۔“

یہ بڑی دور کی بات تھی۔ یہ عجیب و غریب وحشی عورت ہمیں کیا بتا سکتی تھی۔ میں نے شیر باز کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عورت بالکل ہماری سیدھ میں

ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اور بالکل پتھر کا بت بن کر کھڑی تھی۔ اچانک شیر باز اپنی جگہ سے اٹھ کر اس عورت کی طرف چلنے لگا۔ اس نے یہ حرکت اتنی تیزی سے کی تھی کہ میں اسے روک بھی نہ سکا تھا۔ اس نے گن سیدھی کر رکھی تھی۔ گن کی نالی کا رخ عورت کی طرف تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھی اس کے پیچھے چلا۔ میں جلدی سے کمانڈو شیر باز کے پہلو میں آگیا۔ ہم دونوں قدم قدم عورت کی طرف بڑھنے لگے۔ عورت ابھی تک اسی طرح کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی تھی۔ نہ بھاگی تھی نہ اس نے ہم پر حملہ کیا تھا اور نہ اس کے حلق سے کوئی چیخ ہی نکلی تھی۔ ہم اس کے بالکل قریب اور سامنے پہنچ کر رک گئے۔ اس عجیب و غریب جنگلی عورت کا اور ہمارا فاصلہ بمشکل چار قدم کا ہوگا۔ کمانڈو شیر باز نے عورت سے اردو بلکہ اس علاقے کی ہندوستانی زبان میں کہا۔

"ہم شکاری ہیں۔ جنگل میں راستہ بھول گئے ہیں۔ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ بتا دو۔"

عورت بالکل بت کی طرح کھڑی ہمیں اپنی چمکیلی وحشی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے دونوں بازو اوپر اٹھائے اور اس کے حلق سے وہی ڈراؤنی چیخ بلند ہوئی جیسے ہم نے رات کو بھی سنا تھا اور تھوڑی دیر پہلے بھی سنا تھا۔ اس چیخ کی آواز پر میں اپنی جگہ سے ہل گیا۔ شیر باز پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اسی طرح گن کا رخ عورت کی طرف کئے کھڑا رہا اور بولا۔

"تم کون ہو؟ یہاں کے جنگلی قبیلے والے لوگ کہاں رہتے ہیں؟ کیا تم نے یہاں ایک باہر کی عورت کو دیکھا ہے؟ یہ اس کی تصویر ہے۔"

میں شیر باز خان کی عقل پر حیران ہو رہا تھا کہ یہ اس جنگلی عورت سے ایسے باتیں کر رہا ہے جیسے وہ شہر کی پڑھی لکھی عورت ہو۔ ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ ہماری زبان سمجھ بھی رہی ہے یا نہیں۔ شیر باز خان نے مزید

بیوقوفی یا جرات سے کام لیتے ہوئے جیب نور بانو کی پاسپورٹ سائز کی تصویر نکال کر عورت کے آگے کر دی۔

"یہ ہماری بہن ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اسے یہاں کے گندھاری قبائل نے قید کر رکھا ہے اور وہ اس کی قربانی دینے والے ہیں۔ کیا اس عورت کو تم نے دیکھا ہے؟"

عورت نے شیر باز خان کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں اور نور بانو کی تصویر پر ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ شیر باز خان کی بلف چال کامیاب ہو رہی تھی۔ شیر باز کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ ایک دو قدم چل کر جنگلی عورت کے قریب ہو گیا اور نور بانو کی تصویر عورت کی آنکھوں کے بالکل سامنے کر دی اور کہا۔

"کیا تم نے اس عورت کو یہاں دیکھا ہے؟"

عریاں جنگلی عورت نے اپنی دائیں جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی اور وہ جن درختوں کی طرف سے آئی تھی ان درختوں کی طرف بھاگ گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمانڈو شیر باز اسی پوزیشن میں گن لئے کھڑا رہا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"تم ضرور مجھے احمق سمجھ رہے ہو گے لیکن میری حماقت نے کام دکھا دیا ہے۔ اس عورت نے نور بانو کی تصویر کو دیکھ کر دائیں جانب اشارہ کیا کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نور بانو جنگل میں اسی طرف کہیں قید ہے۔"

شیر باز سرگوشی کی بجائے اپنی پوری اور نیچرل آواز میں بول رہا تھا۔ میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹ کر کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو شیر باز؟ آہستہ بولو۔ سرگوشی میں بولو۔"

وہ اپنی اصلی آواز میں بولا۔

"یہ عورت اتنی اونچی آواز میں چیخ مارتی ہے۔ میں اس سے اونچی آواز

میں باتیں کرتا رہا تھا۔ یہاں کوئی وحشی جنگلی نہیں آیا۔ اب ہم سرگوشیوں میں بات نہیں کریں گے۔ کھل کر بات کریں گے۔"

میں نے اسے سختی سے اور سرگوشی میں کہا۔

"اگر تم ایسا کرو گے تو میں ابھی تم سے الگ ہو جاؤں گا۔ عالمگیر اور گائیڈ اس جنگل کو ہم دونوں سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں جو ہدایات دی ہیں ہم ان پر پوری طرح عمل کریں گے تاکہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔"

کمانڈو شیر باز نے گن نیچی کر لی اور بولا۔

"او کے او کے مائی لیڈر۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دھیمی آواز میں بولو۔"

شیر باز نے دھیمی آواز میں کہا۔

"او کے او کے چلو جس طرف اس عورت نے نور بانو کی تصویر دیکھ کر اشارہ کیا تھا اسی طرف چلتے ہیں۔ مجھے یقین ہے جنگلی لوگوں نے نور بانو کو اسی طرف جنگل میں کہیں قید کر رکھا ہے۔"

اس کی بات معقول تھی۔ اس جنگلی عورت کو نور بانو کی تصویر دیکھ کر جنگل میں دائیں جانب اشارہ کرتے میں دیکھ چکا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہم اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"مگر پہلے پانی پیتے ہیں۔"

ہم آگے بڑھ کر چشمے پر گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ جنگل میں اوپر کہیں سے زمین کے اندر ہی اندر سے پانی آ رہا تھا۔ ہم نے پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور جنگل میں اس طرف چل پڑے جس طرف اس وحشی عورت نے اشارہ کیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ کہیں اس عورت نے ہمیں دھوکہ نہ

دیا ہو۔ کہیں وہ ہمیں وحشی جنگلیوں کے چنگل میں نہ پھنسانا چاہتی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔ یہ ان جنگلی قبیلے والوں کی کوئی عورت ہوا اور ہمیں ان کے ہاتھوں پکڑوانا چاہتی ہو تاکہ وہ اپنے دیوتا پر ہمیں قربان کر سکیں۔ پھر خیال آیا کہ اس عورت کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر قسم کی کوئی بات ہوگی بھی تو ہمارے پاس کافی اسلحہ ہے۔ ہم جنگلیوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ صرف ان کے زہریلے تیروں ہی سے خود کو بچانا ہوگا۔ ہم گھات لگا کر ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔ کیونکہ نور بانو کو ان کی قید سے نکالنا ضروری تھا۔

یہی ہمارا مشن تھا۔ اب میں دل میں صرف ایک ہی دعا اپنے اللہ سے مانگ رہا تھا کہ عالمگیر کی رپورٹ درست نکلے اور نور بانو ان جنگلیوں کی قید ہی میں ہو۔ یہ بات ہمارے لئے بڑی اطمینان بخش تھی کہ ابھی تک اس جنگل میں رہنے والے وحشی قبیلے کے لوگوں کو ہماری خبر نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک ہم پر کسی نے بھی حملہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ہمیں ان میں سے کسی کی صورت نظر آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ہماری احتیاط اور عالمگیر اور گائیڈ کی ہدایات پر سختی سے عمل کرنے کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ابھی کسی جھاڑی کو نہیں چھیڑا تھا۔ کسی درخت کی ٹہنی کو نہیں توڑا تھا اور اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ کمانڈو شیر باز خان نے دو ایک بار اونچا بولنے کی کوشش کی تھی جس پر میں نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ اس وقت ہم وحشی قبائل کے ہلاکت خیز جنگل کے وسط میں سے گذر رہے تھے۔ کہیں گھنے درختوں کے جھنڈ آ جاتے۔ کہیں دلدل آ جاتی۔ کہیں گندے سبز کائی والے تالاب آ جاتے جن کے کناروں پر بیٹھے بدشکل آدم خود مگرمچھ ہماری طرف دیکھ کر اپنے منہ کھول کر پھنکار ایسی آواز میں نکالتے۔ ہم تیزی سے آگے نکل جاتے۔

دوپہر ہو گئی۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ پیاس بھی لگ رہے تھی۔ ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر بسکٹ کھائے۔ پانی ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم ادھر ادھر پانی

تلاش کرنے لگے۔ ایک طرف پہاڑی کے پتھروں میں پانی بہہ رہا تھا۔ یہاں جنگلی کیلوں اور بیریوں کے درخت بھی تھے۔ ہم نے پانی بھی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور بیر اور کیلے توڑ کر بھی کھائے۔ کچھ کیلے اور بیر توڑ کر تھیلے میں رکھ لئے۔ شیر باز کہنے لگا۔

"حیدر علی۔"

وہ اپنی اصلی آواز میں بولا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کو منع کیا کہ اونچی آواز میں نہ بولے۔ شیر باز نے بیزاری سے سر جھٹک دیا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا۔

"حیدر علی! لگتا ہے یہاں نہ کوئی وحشی قبیلہ رہتا ہے اور نہ نور بانو ہی کہیں ہے۔ عالمگیر کی رپورٹ غلط تھی۔ ہم نے بغیر سوچے سمجھے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔"

اس قسم کے شک و شبے میرے دل میں بھی پیدا ہو رہے تھے مگر میں شیر باز کی طرف مایوس نہیں ہوا تھا۔ ایک امید ضرور باقی تھی کہ عالمگیر کے جاسوس غلط رپورٹ نہیں دے سکتے۔ وہ ایک مدت سے اس علاقے میں رہ رہا ہے اور اس کے آدمی ان جنگلوں اور ان میں رہنے والے جنگلی لوگوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا شیر باز بھائی۔ عالمگیر تو تمہارے کہنے کے مطابق قابل اعتبار آدمی ہے۔ وہ ہمیں غلط رپورٹ کیوں دینے لگا؟"

شیر باز نے سر کو نفی میں ہلایا۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ سن کی آواز آئی اور کوئی چیز ہمارے سروں کے اوپر سے ہو کر گذر گئی۔ ہم کمانڈو تھے۔ اس قسم کے خطرات کو فورا" سمجھ جاتے تھے اور اپنا بچاؤ کرنا بھی جانتے تھے۔ ہم فورا" سمجھ گئے کہ یہ ایک زہریلا تیر تھا جو گندھاری قبیلے کے کسی جنگلی نے ہمیں دیکھ کر ہم پر چھوڑا تھا۔ جیسے ہی سن کی آواز آئی ہم فورا" نیچے جھک گئے اور جھاڑیوں

میں اوندھے لیٹ کر کہنیوں کے بل آگے کھسکنے لگے تاکہ جس مقام پر جنگلی ہمیں دیکھ چکا ہے اس جگہ سے آگے نکل جائیں۔ ہم مگرمچھوں کی طرح تیز تیز رینگتے ہوئے بائیں جانب سیاہ چٹانوں کے پاس آکر اس کی دوسری جانب ہو گئے۔ ہم نے اپنی شارٹ گنیں اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں اور چٹان کی اوٹ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ہم ان جھاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے ہم پر زہریلا تیر چھوڑا گیا تھا۔ اس طرف خاموشی تھی۔ کسی جھاڑی میں کوئی نقل و حرکت نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک میں نے ایک جھاڑی کو نیچے ہوتے دیکھا۔ یہ جھاڑی چار پانچ فٹ اونچی تھی۔ جھاڑی ایک دفعہ نیچے جھک کر دوبارا اونچی ہو گئی۔ ہم دونوں نے یہ نقل و حرکت نوٹ کر لی تھی۔ اس وقت ہم پورے کمانڈو بن گئے تھے۔ میں نے شارٹ گن کی نالی پر انگلی دو بار رکھ کر شیر باز کو خاص اشارہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ فائر صرف اس حالت میں کرنا جب دشمن بہت قریب آ جائے اور اسے بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔ شیر باز نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ ہماری نظریاں جھاڑی پر لگی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد اور ابر آلود موسم میں دھوپ کی روشنی پھیکی پھیکی تھی۔ جسے جنگل کے درختوں نے اور زیادہ مدہم کر دیا تھا مگر ہماری آنکھیں رات کے اندھیروں میں بھی دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ابھی تک ہمیں کوئی جنگلی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہمارے اوپر سے صرف ایک تیر گذرا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے پیچھے صرف ایک ہی جنگلی لگا ہوا ہے۔ اگر زیادہ جنگلی ہوتے تو ہم پر دس پندرہ زہریلے تیر ضرور شوٹ کرتے جنگل پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس سکوت میں ہمیں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کسی درخت پر بندر آپس میں خو خو قیں قیں کر رہے ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں حیران تھے کہ اس جنگل میں ابھی تک ہمیں کسی جنگلی جانور کی آواز نہیں آئی تھی۔ کوئی جنگلی جانور بھی کہیں نظر نہیں

آیا تھا۔ پھر یہ بندروں کی آوازیں کہاں سے آگئیں؟

دوسری بار کیچ کیچ کی آوازیں آئیں۔ یہ بندر کی آواز ہی لگتی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے ہاتھ اوپر اٹھا کر انگلی سے سامنے والی جھاڑیوں کی طرف تین بار اشارہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے یقین ہے کہ دشمن ان جھاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ میں نے اپنی نظریں جھاڑیوں پر جما دیں اور شارٹ گن کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ جھاڑیوں کی ایک جانب حرکت پیدا ہوئی اور ایک دم سے دو ننگ دھڑنگ سیاہ فام جنگلی ہاتھوں میں تیر کمان لئے جھاڑیوں میں سے بھوتوں کی طرح نکلے اور ہماری طرف دوڑے۔ انہوں نے ہمیں ضرور دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھے ہماری طرف آ رہے تھے۔ شیر باز نے دھیمی مگر تیز آواز میں کہا۔

"فائر۔"

اس کے ساتھ ہی شیر باز کی شارٹ گن سے فائر ہوا۔ سائیلنسر کی وجہ سے فائر کے دھماکے کی آواز نہ نکلی۔ اسی لمحے میں نے بھی فائر کر دیا۔ ہم نے اوپر تلے دو دو فائر کئے۔ یہ تمام گولیاں جنگلیوں کے سینوں پر لگیں۔ وہ کم بخت سینہ تانے ہماری طرف دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ ہمارے پاس اس قسم کا مہلک اسلحہ ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے۔ شارٹ گن کی لمبی گولی انگارے سے بھی زیادہ گرم ہو کر گھومتی ہوئی جاتی ہے اور دشمن کے جسم میں اتر کر اس میں آگ سی لگا دیتی ہے اور وہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکلنے دیتی۔

دونوں جانگلیوں کو شارٹ گن کی گولیوں نے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ جہاں وہ گرے تھے۔ وہاں کسی قسم کی کوئی حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے شیر باز کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا کہ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہاں دوسرے جنگلی بھی موجود ہوں۔ ہم پانچ دس منٹ تک وہیں مورچہ بنا کر بیٹھے سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ جب وہاں کوئی دوسرا جانگلی نہ آیا تو ہم اٹھ کر جھکے جھکے جھاڑیوں کی طرف بڑھے جہاں ہم نے دونوں جنگلیوں کو گولیاں مار کر ختم کیا تھا۔ دونوں جانگلی گھاس پر مردہ پڑے تھے۔ ہم نے ان کے تیروں کو دیکھا۔ تیروں کے آگے نسواری رنگ کی کوئی خشک شے لگی ہوئی تھی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"یہ سانپوں کا مہلک زہر ہے۔"

ہم جنگلیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر چٹان کے پیچھے لے گئے۔ وہاں نشیب میں ایک کھڈ تھی۔ ہم نے دونوں لاشوں کو کھڈ میں گرا دیا۔ شیر باز نے آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے فائر کی آواز زیادہ دور تک نہیں گئی ہوگی؟"

"ہمیں یہی سمجھنا چاہئے۔ ویسے فائر کی آواز معمولی سی تھی۔ لگتا ہے یہ دونوں اکیلے جنگل میں گشت لگا رہے تھے کہ انہوں نے ہمیں دیکھا اور ہمیں مار ڈالنے کی کوشش کی۔"

میری بات کو شیر خان غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نے کھڈ کی دوسری

جانب پہاڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

"میرا خیال ہے کہ اس پہاڑی کے دامن میں جنگلی لوگوں کے جھونپڑے ہوں گے۔ ہمیں کھڈ میں سے گذر کر اس پہاڑی کی طرف جانا چاہئے۔"

ہمیں کسی نہ کسی طرف تو جانا ہی تھا۔ شیر باز کا خیال مجھے کافی مناسب لگا۔ چنانچہ ہم نے کھڈ کی ڈھلان اترنا شروع کر دی۔ کھڈ زیادہ گہری نہیں تھی مگر وہاں بے پناہ گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ ہم دوسری طرف چڑھ کر کھڈ کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ یہاں ایک ٹیلے کی اونچی دیوار کھڑی تھی۔ جس پر سر سبز اور سیاہ رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی۔ ٹیلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چھوٹی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس پر جنگلی آتے جاتے ہیں۔ ہم یہاں محتاط ہو کر چلنے لگے۔ ہم آگے پیچھے چل رہے تھے۔ ٹیلے کی دیوار ختم ہوئی تو ایک ہموار زمین کا چھوٹا سا میدان تھا۔ جس کے درمیان میں دلدل اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ ہم اب دلدل کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے کہ یہ سیاہ زمین نہیں بلکہ دلدل ہے۔ ہم میدان کے کنارے کنارے ہو کر سامنے کی جانب بڑھے۔ سامنے زمین اونچی ہو گئی تھی اور بڑے درخت تھے۔ ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے درختوں کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہاں ایک کافی بڑا گڑھا بنا ہوا ہے۔ ہم نے جھک کر غور سے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ گڑھا انسانی کھوپڑیوں اور سینے کے پنجروں اور ٹانگوں بازوؤں کی ہڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے شیر باز کو دھیمی آواز میں کہا۔

"شاید جنگلی لوگ اپنے مردوں کو اس گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔"

وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا جہاں دو سیاہ رنگ کی چٹانیں اوپر جا کر نوکیلی ہو گئی تھیں اور ایک دوسری سے اس طرح گلے مل گئی تھی کہ ان کی درمیان راستہ سا بن گیا تھا۔ شیر باز نے اس طرف اشارہ کیا۔ ہم چٹانوں کی طرف چلنے لگے۔ ان چٹانوں کے درمیان سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ سرکنڈوں

میں بڑی احتیاط کے ساتھ بغیر آواز پیدا کئے گذر کر ہم دوسری طرف آ گئے۔ اس طرف بھی ایک ٹیلے کی دیوار کھڑی تھی۔ شیر باز رک گیا۔ میں بھی رک گیا۔ ہم نے ماحول کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ شیر باز خان نے شارٹ گن کندھے سے لٹکائی اور بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف جھک کر سرگوشی میں کہنے لگا۔

"میں تو سمجھتا ہوں کہ یہاں نور بانو نہیں ہے۔ ہمیں واپس چلے جانا چاہئے۔"

میں نے کہا۔

"آج کی رات دیکھ لیتے ہیں۔ اگر کل تک ہمیں نور بانو کا کوئی سراغ نہ ملا تو واپس چل پڑیں گے۔"

تھرمس میں ہم نے ندی سے پانی بھر لیا تھا۔ تھیلا کھول کر ہم نے دو تین بسکٹ اور کیلے نکال کر کھائے۔ ایک ایک کپ پانی پیا اور آس پاس کے سنسان جنگل کو ویران نظروں سے دیکھنے لگے۔ دن ڈھل چکا تھا۔ اس آسیبی جنگل پر ایک بار پھر شام کا اندھیرا پھیلنے والا تھا اور ڈراؤنی رات کی آمد آمد تھی۔ شیر باز نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں آگے جانے کی بجائے اسی جگہ رات کاٹنی چاہئے۔ اس جنگل میں تو جنگلی درندوں کا نام و نشان نہیں۔ اس لئے کسی درخت پر بسیرا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن جنگلی رات کو آ سکتے ہیں وہ درندوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔"

شیر باز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"بھائی یہاں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں جنگلی وحشیوں کا خطرہ نہ ہو۔ اس لئے جہاں بیٹھ گئے ہیں اب وہیں رات بسر کریں گے۔ شام ہونے والی

ہے۔"

ہم نے وہیں سرکنڈوں میں ایک جگہ چٹان کی دیوار کے ساتھ مورچہ سا بنا لیا۔ یہ اس قسم کا مورچہ تھا۔ کہ خطرے کے وقت ہم یہاں آ کر پوزیشن سنبھال سکتے تھے۔ وہیں ہم نے گھاس اور سوکھی ہوئی ٹہنیاں صاف کر کے رات کو سونے کے لئے جگہ بنا دی۔ اس دوران سورج غروب ہو گیا۔ شام کا اندھیرا ہونے لگا۔ تب ہم نے آسمان کی طرف دیکھا تو بادل غائب ہو چکے تھے۔ آسمان صاف نکل آیا تھا اور وہاں شروع رات کے دو تین ستارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں شیر باز سے کہا۔

"بادل غائب ہو گئے ہیں۔ رات کو بارش کا خطرہ ٹل گیا ہے۔"

جب ہماری گھڑیوں نے رات کے آٹھ بجائے تو ہم نے تھیلا کھول کر تھوڑا بہت کھایا پیا اور بیٹھ کر دبی زبان میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ پھر شیر باز کہنے لگا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ رات کے پہلے حصے میں میں سوؤں گا۔ تم پہرہ دو گے۔ اس کے بعد میں اٹھ جاؤں گا۔ تم سو جانا۔"

میں نے شارٹ گن سنبھالتے ہوئے کہا۔

"او کے۔"

شیر باز وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ جنگل میں اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ حسب سابق کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ مجھے کسی وقت خیال آتا تھا کہ اگر جنگلی لوگوں کو اپنے ساتھیوں کی لاشیں مل گئیں تو ممکن ہے لاش کے سینوں میں سوراخ دیکھ کر وہ سمجھ جائیں کہ انہیں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے جدید اسلحہ نہ دیکھا ہو۔ بہرحال وہ یہ ضرور سمجھ جائیں گے کہ ان کے علاقے میں ان کے کوئی دشمن گھس آیا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ہماری تلاش میں نکل پڑیں۔ میں چٹان کی دیوار والے مورچے میں بیٹھا

یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر گذر رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ جب رات کے ساڑھے گیار بجے تو ٹیلے کے اوپر آسمان پر مغرب کی طرف سے روشنی کا غبار سا پھیلنے لگا۔ میں اس روشنی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے آسمان پر ٹیلے کے اوپر پورے چاند کے زرد چہرے کا کنارا نمودار ہوا۔ یہ چاند تھوڑی دیر میں ٹیلے کے اوپر آسمان پر آگیا اور اس کی روشنی میں اردگرد کے درخت اور ٹیلے چاندنی میں دھندلے دھندلے نظر آنے لگے۔ اس جنگل میں میں پہلی بار چاندنی رات کا نظارہ کر رہا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے رات میں نے شیر باز کو جگا دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے روشنی دیکھی تو آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا۔

"یہ تو چاند نکل آیا ہے۔"

"ہاں' یہاں چاندنی بھی سہمی سہمی سی لگتی ہے۔"

شیر باز نے کلمہ شریف پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا اور شارٹ گن اٹھا کر بولا۔

"تم سو جاؤ۔ میں پہرہ دیتا ہوں۔"

وہ مورچے میں گن لے کر بیٹھ گیا۔ میں وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ ابھی میری آنکھیں بند ہی ہوئی تھیں کہ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے دور کسی جگہ ڈھول بج رہا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ آواز شیر باز نے بھی سن لی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کیسی آواز ہے؟"

وہ بولا۔

"لگتا ہے جنگلی لوگ ناچ گانے میں مصروف ہیں۔"

ہم کان لگا کر ڈھولک کی آواز سن رہے تھے۔ آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"کہیں جنگلی لوگ ادھر تو نہیں آ رہے؟"
شیر باز نے جھنجلا کر کہا۔
"آتے ہیں تو آنے دو۔ میں ان سب کو شوٹ کر دوں گا۔"

کمانڈو شیر باز کی جھنجلاہٹ حق بہ جانب تھی۔ وہ ٹرینڈ اور ایکشن کا قائل کمانڈو تھا اور یہاں اسے چوہے کی طرح جنگلی وحشیوں سے چھپنا پڑ رہا تھا۔ وہ اس صورت حال کے لئے مجبور کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ سوال کشمیر کی بیٹی نور بانو کو جنگلیوں کی قید سے نکالنا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے کان ڈھول کی آواز پر لگے تھے۔ اب ڈھول کے ساتھ چھینے بھی بجنے لگے تھے۔ آواز ہمارے قریب آ کر رک گئی تھی۔ لگتا تھا سامنے والے ٹیلے کے پیچھے کچھ ہو رہا ہے۔ شیر باز مورچے سے نکل آیا۔

"ہمیں ٹیلے کے اوپر جا کر دیکھنا چاہئے کہ دوسری طرف کیا ہو رہا ہے؟"

چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ اس کی چاندنی میں جنگل کے درخت اور جھاڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم چھپتے چھپاتے ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ ٹیلہ زیادہ بلند نہیں تھا۔ ہم اس کی چوٹی پر پہنچ کر اوندھے لیٹ گئے۔ ہم نے جھاڑیوں میں سے ٹیلے کی دوسری طرف جھانک کر دیکھا کہ نیچے ٹیلوں کے درمیان پیالے کی طرح ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں آگ کا الاؤ روشن تھا۔ دس بارہ جنگلی عورتیں اور مرد نیزے ہاتھوں میں لئے' سروں پر درختوں کی جھاڑیاں باندھے الاؤ کے گرد رقص کر رہے تھے۔ ایک طرف دو جنگلی کھڑے ڈھول اور چھینے بجا رہے تھے۔ یہ تمام جنگلی مرد اور عورتیں مادر زاد ننگی تھیں۔ الاؤ کی روشنی میں ان کے تیل میں بھیگے ہوئے سیاہ جسم چمک رہے تھے۔ وہ عجیب وحشیانہ انداز میں ہاتھ اور ٹانگیں ہلا رہے تھے۔ ہم حیرت کے عالم میں ان جنگلیوں کا رقص دیکھ رہے تھے۔ شیر باز نے میرے کان میں کہا۔

"یہی وہ جنگلی وحشی ہیں جن کی ہمیں تلاش تھی۔"
میں نے کہا۔
"ہاں! یہی وہ خطرناک قبیلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نور بانو یہی کسی جگہ قید میں ہوگی؟"

ہم ان جنگلیوں کا رقص دیکھنے میں محو تھے کہ اچانک ایک جنگلی نے باز[و] اوپر اٹھایا۔ حلق سے چیخ کی آواز نکالی۔ رقص ایک دم رک گیا۔ جس جنگلی نے ہاتھ اوپر اٹھایا تھا اس نے دوسری بار حلق سے چیخ کی آواز نکالی تو سارے جنگلی مرد اور عورتیں پرے پرے ہٹ کر ادب سے کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں ایک طرف سے چار ننگ دھڑنگ جنگلی عورتیں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ایک عورت کو پکڑ رکھا تھا۔ اس عورت کو دیکھ کر میں نے اور شیر باز نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"حیدر علی! غور سے دیکھو۔ یہ مجھے نور بانو لگتی ہے۔

ایک تو چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ دوسرے وہاں الاؤ کی روشنی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو جس عورت کو جنگلی عورتیں پکڑ کر لا رہی تھیں۔ وہ نور بانو ہی تھی۔ اس نے کشمیری عورتوں کا لباس یعنی شلوار اور لمبی قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر رومال بندھا تھا۔ شیر باز بے تاب ہوگیا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں ابھی اٹیک کرکے نور بانو کو چھڑانا چاہئے۔ کہیں یہ لوگ اسے آگ میں نہ پھینک دیں۔"

میں نے شیر باز کے بازو کو دباتے ہوئے کہا۔

"پلیز شیر باز۔ ذرا صبر کرو۔ یہ لوگ نور بانو کو آگ میں نہیں جلائیں گے۔ میرا خیال ہے یہ لوگ چاندنی رات میں کوئی رسم ادا کر رہے ہیں۔ نور بانو کو انہوں نے اپنے دیوتا پر قربان کرنے کے لئے قید میں رکھا ہوا ہے۔"

"تو کیا ہم یہاں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں گے؟"

شیر باز نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا۔

"اس وقت بڑی عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ شیر باز۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹارگٹ کے بالکل قریب آ کر ہمارا منصوبہ ملیا میٹ ہو جائے۔"

مگر نور بانو کو دیکھ کر شیر باز خان کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ پیچھے گیا ور پھر دوڑ کر ٹیلے کی ڈھلان اتر کر اپنے مورچے کی طرف گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ شیر باز نے تھیلے میں سے میگزین کے کچھ فالتو پیکٹ اٹھا کر جیب میں ڈالے۔ کچھ ہینڈ گرنیڈ دوسری جیب میں ڈالے اور بولا۔

"میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ تم میرے ساتھ نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ میں نیچے جا رہا ہوں۔"

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ تیزی سے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ابھی وہ چند قدم ہی اوپر گیا تھا کہ اچانک ایک طرف کی جھاڑیوں میں سے ایک بکھرے ہوئے بالوں والی عورت نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ اس عورت نے حلق سے غراہٹ کی آواز نکالی۔ شیر باز خان وہیں رک گیا۔ یہ وہی وحشی عورت تھی۔ جو ہمیں نیچے جنگل والے چشمے پر ملی تھی اور جس کی چیخ کی آواز نے آدھی رات کو ہمیں ڈرا دیا تھا۔ میں دوڑ کر عورت کے قریب آگیا۔ عورت ہمیں جنگلی وحشیوں کی طرف جانے سے منع کر رہی تھی۔ وہ بار بار ہاتھ پیچھے لے جاتی اور پھر اسے نفی کے انداز میں ہلاتی۔ چاندنی میں اس کا عریاں بدن زیادہ عریاں نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسا مجسمہ لگ رہی تھی جیسے یونان کے کسی ماہر سنگتراش نے بنایا ہوا اور جس میں جان پڑ گئی ہے۔ اس کے خوبصورت جسم میں قدرت کے حسن کا کمال دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک پاکیزہ اور معصوم حسن کی علامت تھی۔ شیر باز بھی بت بنا اس کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"یہ عورت ہمیں آگے جانے سے روک رہی ہے۔"

شیر باز خان نے آہستہ سے کہا۔

"اس سے بات کرو۔ اسے بتاؤ کہ جس لڑکی کی تلاش میں ہم نکلے تھے وہ نیچے وحشی لوگوں کے قبضے میں موجود ہے۔"

پہلی بار بھی میں نے ہی اس وحشی عورت سے بات کی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہم لڑکی کو یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔ وہ نیچے ناچنے والے جنگلیوں کے پاس ہے تو عریاں وحشی عورت نے ٹیلے کی طرف چہرہ کیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے مجھے اس طرف جانے سے منع کر رہی ہو۔ اس نے ایک بار پھر دوسری جانب جانے کا اشارہ کیا اور دوڑ کر جس طرف سے آئی تھی اس طرف غائب ہو گئی۔ اس کے جاتے ہی شیر باز بولا۔

"ہمیں اس عورت کے مشورے پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔ نور بانو اس وقت نیچے موجود ہے۔ ہمارے پاس کافی اسلحہ ہے۔ ہمیں اٹیک کر کے نور بانو کو نکال کر لے جانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر شیر باز غصے میں ٹیلے کی دوسری طرف جھک کر دیکھنے لگا۔ اس وقت نیچے سے ڈھول چھینوں کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ شیر باز نے کہا۔

"وہ لوگ نور بانو کو لے کر چلے گئے ہیں۔"

میں نے ٹیلے کے نیچے نگاہ ڈالی۔ چاندنی رات میں وہاں کافی روشنی تھی۔ الاؤ بجھ گیا ہوا تھا۔ وہاں رقص کرنے والی جنگلی عورتوں اور آدمیوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ شیر باز کا خیال تھا کہ ہمیں اس طرف سے نیچے اتر کر نور بانو کو تلاش کرنا چاہئے۔

"ان جنگلیوں کے جھونپڑے نیچے ادھر ادھر کہیں ہوں گے۔ نور بانو کو انہوں نے ان جھونپڑوں میں سے کسی جھونپڑے میں قید کر رکھا ہو گا۔ ہم اسے وہاں سے نکال لیں گے۔"

مگر میں وحشی عورت کی ہدایت پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ

یونہی ہمیں نیچے جانے سے منع نہیں کر رہی تھی۔ نیچے ضرور کوئی خطرہ ہوگا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"اس طرف سے ہم نیچے گئے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کوئی نہ کوئی جنگلی وہاں چھپ کر پہرہ دے رہا ہوگا اور وہ ہم پر پیچھے سے زہریلا تیر چلا سکتا ہے۔ اس طرح ہم ناحق مارے جائیں گے۔ میری مانو اور جس طرف ہمیں وحشی عورت نے جانے کو کہا ہے اسی طرف چلتے ہیں۔"

شیر باز نہیں مان رہا تھا مگر میں نے اسے راضی کر لیا۔ ہم ٹیلے کو پیچھے چھوڑ کر جس طرف وحشی عورت نے اشارہ کیا تھا اسی طرف چل پڑے۔ چاندنی میں ہمیں جنگل کا راستہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں جھاڑیوں کے درمیاں گھنے درختوں کے نیچے پگ ڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں وحشی جنگلی لوگ چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے شیر باز کو بھی محتاط کر دیا۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ درختوں میں سے جو چاندنی چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ اس سے بچ کر چلیں۔ آگے ڈھلان آ گئی۔

ہم ڈھلان پر جا کر رک گئے۔ آگے دیکھا تو چاندنی میں وہی پیالہ نما چھوٹی سی وادی نظر پڑی جو ہمیں ٹیلے کی چوٹی سے نظر آئی تھی۔ ڈھلان اتر کر ہم دائیں جانب درختوں کے نیچے آ گئے۔ ان درختوں کے تنے اتنے موٹے تھے کہ وہاں دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ ہم نے آہستہ آہستہ چلتے درختوں کی دیوار کو پار کیا۔ آگے کیا دیکھتے ہیں کہ دائرے کی شکل میں مخروطی چھتوں والی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ جھونپڑیوں کے درمیان الاؤ بجھ چکا ہے۔ اس الاؤ کے اردگرد ساریاں عورتیں اور مرد زمین پر پڑے سو رہے ہیں۔ وہ اس طرح بے سدھ پڑے ہیں کہ لگتا تھا کہ انہوں نے کوئی نشہ وغیرہ کیا ہوا ہے۔ کسی کسی جھونپڑی کے باہر تیل کے چراغ روشن تھے۔ باقی جھونپڑیوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہم خاموشی سے وہیں بیٹھ گئے۔ شیر باز نے کہا۔

"میرا خیال ہے ان میں سے کسی جھونپڑی میں نور بانو قید ہے مگر یہ کیسے پتہ چلے کہ وہ کونسی جھونپڑی میں قید ہے؟"

میں نے کہا۔

"تم یہاں چھپ کر بیٹھو میں جا کر سراغ لگاتا ہوں۔"

شیر باز نے سرگوشی میں کہا۔

"میں تمہیں دیکھ رہا ہوں گا۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوئی تو میں اوپر سے فائرنگ کر کے تمہیں کور دوں گا۔"

میں نے اس کو ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ کوئی خطرہ ہو گا تو میں اسے خود سنبھال لوں گا مگر تم ہرگز ہرگز فائر نہ کرنا۔ اوکے۔"

"اوکے۔"

شیر باز نے آہستہ کہا۔

میں درختوں میں سے نیچے اتر گیا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ جہاں درخت نہیں تھے۔ وہاں ہر شے نظر آتی تھی۔ درختوں کے نیچے ذرا ذرا اندھیرا تھا۔ جھاڑیاں کہیں کہیں تھیں۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا جھک کر جھونپڑیوں کی طرف چلنے لگا۔ شارٹ گن میں نے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ چار ہینڈ گرنیڈ بھی میری پتلون کی جیب میں تھے۔ ایک چاقو بھی تھا۔ یہ ساری چیزیں ہم اپنے پاس رکھ کر رات کو پہرہ دیتے تھے۔ چونکہ آج رات کے بارہ بجے کے بعد مجھے پہرہ دینا تھا اس لئے یہ سارا اسلحہ وغیرہ میرے پاس ہی تھا۔ میں ایک جگہ اندھیرے میں بیٹھ گیا اور وحشی جنگلیوں کی جھونپڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔

سوچنے لگا کہ نور بانو کس جھونپڑی میں ہو سکتی ہے۔ ایک بات واضح تھی کہ جس جھونپڑی میں نور بانو قید ہو گی اس کے باہر ایک یا دو جنگلی پہرہ ضرور دے رہے ہوں گے۔ جھونپڑیاں مجھ سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ میں نے غور

سے دیکھا۔ ان میں سے کسی جھونپڑی کے باہر کوئی جنگلی پہرہ نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنی بائیں جانب چل پڑا۔ میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا۔ اگرچہ الاؤ کے گرد جنگلی مرد اور عورتیں بے سدھ ہو کر سو رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہاں مجھے ایک دو جنگلی حرکت کرتے دور سے نظر آئے تھے۔ ویسے بھی ان لوگوں کے بارے میں گائیڈ نے بتایا تھا کہ انہیں جنگل میں ہونے والی ذرا سی آہٹ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ اسی لئے اس نے ہمیں اونچا بولنے سے منع کیا تھا۔ میں دس بارہ قدم جھک کر چلا ہوں گا کہ ایک طرف دو جھونپڑے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک جھونپڑے کے باہر دو جنگلی کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور اسی جھونپڑے میں نور بانو قید ہے اور یہ جنگلی باہر پہرہ دے رہے ہیں۔ میں ذرا آگے کو کھسک کر بیٹھ گیا اور بڑے غور سے جنگلیوں کو دیکھنے لگا۔ دونوں جنگلی مادر زاد ننگے تھے۔ ان کے پاس نیزے تھے۔ تیر کمان نہیں تھے۔ وہ کسی وقت بیٹھ جاتے کسی وقت کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے کوئی بات کرتے اور کسی وقت اٹھ کر جھونپڑے کے گرد چکر لگاتے اور واپس جھونپڑے کے سامنے کی طرف آ کر بیٹھ جاتے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ ان وحشی لوگوں نے نور بانو کو اسی جھونپڑی میں قید کیا ہوا ہے۔ پہلے میں نے سوچا کہ اوپر جا کر شیر باز کو صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں اور پھر اسے بھی ساتھ لے کر آتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ شیر باز جذبات میں آ کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے اور ہم بھی پھنس جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ہمارے پاس ہینڈ گرنیڈ اور شارٹ گن تھیں۔ مگر یہ اسلحہ کتنی دیر تک ہماری حفاظت کر سکتا تھا اور دستی بموں سے ہم کتنے جنگلی مار سکتے تھے۔ وہ جنگلی اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ خطرہ دیکھ کر بھی ہمارے سامنے آتے جائیں اور مرتے جائیں۔ ان کے پاس ان کا مہلک ترین ہتھیار زہریلے تیر تھے۔ ان تیروں کے پاس عام تیر بھی تھے اور ان کا نشانہ

اندھیرے میں بھی زبردست تھا۔ اندھیرے میں بھی ان کا تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگتا تھا۔ وہ گولیوں کی فائرنگ اور ہینڈ گرنیڈ کے دھماکوں سے ادھر ادھر بکھر کر چھپ جائیں گے اور ہم پر تیروں کی بارش کر دیں گے۔ چنانچہ میں نے شیر باز کو بلانے کا ارادہ ترک کر دیا اور یہی فیصلہ کیا کہ میں اکیلا ہی نور بانو کا کھوج لگاؤں گا۔ کم از کم یہ تو معلوم کر لوں کہ نور بانو اسی جھونپڑے میں ہے۔ اس کے بعد جب کمانڈو ایکشن کا وقت آئے گا تو شیر باز کے ساتھ مل کر اٹیک کریں گے۔

جھونپڑی کے اوپر صرف ایک ہی درخت کا سایہ تھا۔ چنانچہ چاندنی صرف جھونپڑے کے ایک طرف پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف درخت کا سایہ تھا اور وہاں کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ میں نے اسی اندھیرے میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ میرا مقصد جھونپڑے کی دیوار کے پاس جا کر نور بانو کا سراغ لگانا تھا۔ جھونپڑی کی دیوار میں بانس یا درختوں کی شاخیں جوڑ کر بنائی گئی تھیں اور اس میں سے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا تھا۔ اور اندر کی آواز بھی باہر آ سکتی تھی۔ میں نے اس راستے کا تعین کر لیا۔ جہاں سے گذر کر مجھے جھونپڑے تک پہنچنا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ جھونپڑے کے باہر ایک کی بجائے دو جنگلی پہرہ دے رہے تھے۔ ایک ہوتا تو میں اسے آسانی سے قابو کر سکتا تھا۔ اب خطرہ تھا کہ ایک کو قابو کیا تو دوسرا شور مچا دے گا اور وہاں شور مچا تو قبیلے کے سارے جنگلی مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ میں زمین پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ شارٹ گن میں نے اپنی گردن کے پیچھے پشت ڈال دی اور فوجیوں کی طرح کہنیوں کے بل آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے آگے

ا۔

میں اس طرح محتاط ہو کر آگے بڑھ رہا تھا کہ میرے کھسکنے سے گھاس کی
ا میرے نیچے آنے والی سوکھی شاخوں یا پتھروں کی ہلکی سی آواز بھی پیدا نہ ہو۔
یری کمانڈو ٹریننگ میری مدد کر رہی تھی۔ میں درختوں کے سائے میں سے نکل
یا۔ آگے جھونپڑی اور میرے درمیان کوئی درخت نہیں تھا۔ بیس پچیس فٹ کا
صلہ تھا۔ جہاں چاند کی روشنی تھی اور مجھے رینگتے ہوئے بڑی آسانی سے دیکھا جا
لتا تھا۔ میں اوندھے لیٹے لیٹے سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں پہرہ دینے
لے جنگلیوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس وقت دونوں جنگلی جھونپڑے کے
روازے کے آگے ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف
یکھ رہے تھے۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ خدا جانے وہ خاموشی کے ساتھ
ب دوسرے سے کس زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر خاموش تھے تو ایک
سرے کے چہروں کو دیکھ دیکھ کر کیا تلاش کر رہے تھے۔ جنگلی لوگوں کے طور
ریقوں کو ہم شہروں میں رہنے والے کبھی نہیں سمجھ سکتے۔

میں نے سوچا کہ اس وقت موقع ہے۔ دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے
ینگ کر جھونپڑی کے پیچھے آنا چاہئے۔ جھونپڑی کے پیچھے کا آدھا حصہ درخت
، سائے میں تھا۔ وہاں چاندنی نہیں پڑ رہی تھی اور اندھیرا تھا۔ میں نے اللہ کا
لیا اور جس وقت میں نے دیکھا کہ ان دونوں جنگلیوں میں سے کوئی بھی میری
ف نہیں دیکھ رہا تھا میں اٹھ کر جھکے جھکے تیزی سے دوڑ کر جھونپڑی کے پیچھے
ھیرے میں آ کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ میں وہیں ساکت ہو گیا۔ خطرہ تھا کہ ان

دونوں کو میرے دوڑنے کی آواز نہ آگئی ہو مگر ایک تو میرے پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ دوسرے جگہ صاف تھی۔ تیسرے میں پنجوں کے بل دوڑ کر گیا تھا۔ آواز پیدا نہ ہوئی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اٹھ کر جھونپڑی کے پیچھے نہ آیا۔ میں ذرا سا رینگ کر جھونپڑی کی دیوار کے قریب آگیا۔ میں نے کان دیوار کے ساتھ لگا دیا کہ شاید اندر سے کوئی آواز آ رہی ہو مگر اندر گہری خاموشی تھی۔ یہ بات میرے لئے پریشان کن تھی کیونکہ میں زیادہ دیر تک وہاں لیٹے ہوئے نہیں رہ سکتا تھا۔ جنگلیوں میں سے کوئی بھی گشت لگانے کے لئے میرے طرف آ سکتا تھا اور وہاں ہنگامہ مچ سکتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں ہنگامہ سے بچنا تھا اور سارا کام خاموشی سے کرنا تھا۔ ٹارگٹ پر آ کر بغیر کچھ حاصل کئے واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے قدموں کی کی آہٹ سنائی دی۔ میں کھسک کر جھونپڑی کی دیوار سے پرے ہٹ گیا اور شارٹ گن کا رخ اس طرف کر لیا جس طرف سے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ یہ سوائے گشت لگانے والے جنگلی کے دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ جھونپڑی کے جس حصے میں چاندنی تھی میں نے اس طرف سے ایک ننگ دھڑنگ جنگلی کو آتے دیکھا۔ وہ اس طرح جھک کر چل رہا تھا جیسے زمین پر کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ وہ ساتھ ساتھ سونگھ بھی رہا تھا۔ مجھے اس کے ناک کی سوں سوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس جنگلی نے مجھے عجیب مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ میں دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ مجھ پر اس کی نظر نہ پڑے لیکن اس نے میری بو سونگھ لی تھی۔ وہ جنگلی ریچھ کی طرح بو سونگھتا عین میرے سامنے آگیا۔ وہ جھک کر مجھے گھورنے لگا۔ مجھے اس کی لال لال انگارہ ایسی آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسے ایک سیکنڈ کی مہلت دینا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں گن کی نالی اوپر کی جو اس کے سینے کے ساتھ جا کر لگی اور فائر کر دیا۔ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی

اور گولی جنگلی کے دل سے پار ہو کر نکل گئی۔ وہ میرے اوپر گر پڑا۔ میں جلدی سے اس کے نیچے سے نکل آیا اور اندھیرے میں اوندھا لیٹنے کی بجائے اب پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ٹھک کی آواز اس کے ساتھی تک ضرور پہنچ گئی ہوگی اور وہ ادھر آئے گا۔

میرا گمان غلط نہیں تھا۔ مجھے عجیب قسم کی خو خو اور کیچ کیچ کی آواز آئی۔ دوسرا جنگلی اپنے ساتھی کو بلا رہا تھا۔ میں پوری طرح چوکس ہوگیا۔ شارٹ گن کا بٹ میں نے کندھے سے لگا لیا تھا اور انگلی ٹریگر پر پہلا دباؤ ڈال رہی تھی۔ دوسرا جنگلی چاندنی میں مجھے جھونپڑی کی دیوار سے آتا صاف نظر آ سکتا تھا۔ میں نے سانس روک لیا تھا۔ اتنے میں دوسرا جنگلی بھی پہلے جنگلی کی طرح جھک کر کسی جانور کی طرف زمین سونگھتا اور خو خو کرتا نمودار ہوا۔ وہ بھی میری طرف ہی آ رہا تھا۔ جہاں میں اندھیرے میں پوزیشن لے کر بالکل تیار بیٹھا تھا۔ میں صرف اسے زیادہ قریب آنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ یہ جنگلی بھی عجیب طرح اچھل اچھل کر زمین سے دو فٹ اوپر منہ کئے سونگھتا ہوا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں بھی اندھیرے میں تھا اور اس کے ساتھی کی لاش بھی اندھیرے میں پڑی تھی۔ میں اس کے سر کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ میری زد میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر ہل رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا یا اپنے ساتھی کی لاش دیکھ لی تو ایسی چیخ مارے گا کہ سارا جنگل گونج اٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ حلق سے کوئی آواز نکالے مجھے اسے موت کی نیند سلا دینا تھا۔ میں اس کے دل کا نشانہ لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس دوران وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

اس جنگلی نے بھی وہی حرکت کی جس پر میں آج بھی حیران ہوں۔ اس کو اپنی ساتھی کی لاش بھی نظر آ گئی تھی۔ اس نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں جنگلی بلے کی طرف دونوں ہاتھ اور گھٹنے زمیں پر ٹیک کر بیٹھ گیا اور میری طرف

گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے سر کو نشانہ میں لیا اور ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر فائر کر دیا۔ گولی اس کی کھوپڑی کو اڑاتی ہوئی نکل گئی۔ وہ ایک طرف کو گر پڑا۔ میں جلدی سے اٹھا اور جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر اوپر درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے ایک ہی خطرہ تھا کہ شیر باز نے سائیلنسر والے فائر کی آواز ضرور سن لی ہوگی۔ کہیں وہ ادھر سے دو چار فائر نہ کر دے۔ یہ سوچ کر کہ میں خطرے میں ہوں۔ میں نے کوئی خطرہ مول لئے بغیر بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ خطرہ مول لے کر منہ سے بلبل کی خاص آواز بڑے دھیمے سروں میں نکالی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آواز شیر باز خان تک پہنچ جائے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ مجھے دوسرے لمحے ایک انسانی سایہ رینگتا ہوا چاندنی میں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں جھونپڑی کی دیوار سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

شیر باز رینگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے زمین کا چاندنی والا حصہ عبور کیا میں اس کے پاس جا کر لیٹ گیا اور کہا۔

"میں نے دونوں جنگلیوں کو ختم کر دیا ہے۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ہم جھونپڑی میں جائیں گے۔"

اگرچہ جھونپڑی کے باہر اب کوئی جنگلی پہرہ نہیں دے رہا تھا اس کے باوجود ہم بے حد احتیاط سے رینگ رینگ کر کھسکتے جھونپڑی کے دروازے کے پاس آ گئے۔ یہ دروازہ گھاس پھوس کا تھا۔ میں نے ایک نظر اس طرف ڈالی جس طرف الاؤ کے گرد جنگلی مرد اور عورتیں بے سدھ پڑیں تھیں اور جہاں میں نے دو تین جنگلیوں کو ادھر ادھر حرکت کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ دور سے الاؤ کی دھیمی آگ کے گرد لیٹے ہوئے جنگلی سایوں کی طرف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ دروازہ اندر کی طرف کھل گیا۔ ہم دونوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ کسی عورت کی سہمی ہوئی آواز آئی۔ اس نے کشمیری لہجے کی

اردو میں پوچھا۔

"کون ہو؟ کون ہو تم؟"

تب شیر باز خان نے کشمیری میں اسے کہا۔

"نور بانو۔ ہم تمہارے کشمیری حریت پسند بھائی ہیں۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔ جلدی سے ہمارے ساتھ باہر آ جاؤ۔"

نور بانو نے فرط مسرت سے کانپی ہوئی آواز میں کہا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

میں نے اسے سختی سے کہا۔

"خدا کے لئے اونچی آواز میں نہ بولو۔ دروازے کی طرف آؤ۔"

ہم جھونپڑی میں سے اس طرح باہر نکلے کہ نور بانو ہمارے درمیان میں تھی۔ میں آگے آگے تھا اور ہم تینوں جھک جھک کر چل رہے تھے۔ ہم نے شارٹ گنوں کو فائرنگ پوزیشن میں کیا ہوا تھا۔ جنگل کی چاندنی ہماری رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔ یہاں درخت بھی کم تھے۔ چاند اگرچہ آسمان کے اوپر آ کر اب آہستہ آہستہ واپس مغرب کی طرف اتر رہا تھا مگر اس کی چاندنی میں ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ ہمیں صرف ایک خطرہ تھا کہ اگر قبیلے کے جنگلیوں کو نور بانو کے فرار کا علم ہو گیا تو وہ ہجوم کی شکل میں ہم پر نیزوں اور زہریلے تیروں کی بارش کر دیں گے اور نور بانو کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور دوڑ کر خالی میدان کو پار کر گیا جہاں چاندنی کھلی ہوئی تھی۔

نور بانو کو بھی نازک صورت حال کا پورا علم تھا۔ وہ بھی جھکی جھکی دوڑ کر چاندنی والے میدان سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے شیر باز خان بھی آ گیا۔ ہم سامنے والے درختوں کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم کس طرف سے واپس جائیں۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا تھا کہ جنگل میں جہاں جنگلیوں کی جھونپڑیاں ہیں اس کے شمالی ٹیلے کے پیچھے ایک ندی بہتی ہے۔

یہ ندی آگے جاکر ایک بڑی ندی میں جا کر مل جاتی ہے۔ ان دونوں ندیوں کے سنگم پر سرخ چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اگر ہم ان چٹانوں تک کسی طرح پہنچے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے لئے بنگلور پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہاں قریب ہی ایک قصبہ ہے جہاں سے ہمیں بنگلور شہر کے لئے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔

یہ ساری معلومات شیر باز کے ذہن میں بھی تھیں اور ہم نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا تھا کہ ہم نور بانو کو نکال کر شمالی ٹیلے کے عقب میں ندی پر پہنچنے کی کوشش کریں گے لیکن اب ٹیلے کو چاندنی رات میں دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہ جنگلی لوگوں کی بستی کے قریب ہی واقع ہے۔ یعنی اس طرح ہمیں جنگلیوں کی بستی کے قریب سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ درختوں میں آکر میں نے شیر باز سے کہا۔

"کیا ہم سامنے والے ٹیلے کی طرف جائیں گے؟"

وہ بولا۔

"دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ آجاؤ"

اور ہم نے درختوں میں بڑی احتیاط سے ٹیلے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ ابھی تک کسی جنگلی کو نور بانو کے فرار کا اور اپنے ساتھیوں کی موت کا علم نہیں ہوا تھا۔ جس پگ ڈنڈی پر ہم چل رہے تھے وہ آگے جا کر بستی کے قریب ہو رہی تھی۔ ہم رک گئے۔ نور بانو گھبرائی ہوئی تھی۔ مگر اس نے بڑا حوصلہ کیا ہوا تھا۔ شیر باز نے نور بانو سے اردو میں کہا۔

"نور بہن! آگے جنگلیوں کی جھونپڑیاں ہماری بائیں جانب آئیں گی۔ اس وقت بالکل خاموش رہنا۔ قدموں کی آہٹ بھی پیدا نہ ہو۔"

پھر اس نے ہاتھ سے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میرے ایک ہاتھ میں شارٹ گن تھی جس میں میگزین بھرا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں سامنے

آنے والی جھاڑیوں کو بڑے آرام سے پرے ہٹا دیتا تھا۔ میرے پیچھے نور بانو تھی اور اس کے پیچھے شیر باز خان چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی بھری ہوئی سٹارٹ گن تھی۔ وہ دو قدم چلنے کے بعد الٹے قدم چلتے ہوئے پیچھے دیکھ لیتا تھا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا۔ اسی طرح چلتے چلتے ہم جنگلی لوگوں کی بستی کے قریب آ گئے۔ یہاں ہماری ایک جانب اونچے درختوں کی قطار تھی۔ ان درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ آگے جنگلیوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ جھونپڑیوں کے درمیان الاؤ کی آگ بالکل بجھ چکی تھی اور جنگلی مرد اور عورتیں اسی طرح بے سدھ پڑے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ناچ گانے کے وقت انہوں نے بے اندازہ شراب پی تھی۔ پھر بھی ہم وہاں سے جوں کی چال چلتے ہوئے گذرے۔ جب ہم جنگلی لوگوں کی بستی سے دور ہو گئے تو اطمینان کا سانس لیا مگر ابھی ہم خطرے سے دور نہیں تھے۔ یہاں ٹیلے کا دامن شروع ہو جاتا تھا۔ ٹیلے کی ایک جانب چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ دوسری جانب ٹیلے کا سایہ تھا۔ ہم ٹیلے کے سائے میں آ گئے اور ٹیلے کی ڈھلواں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہمیں اس ندی کی تلاش تھی جس کے متعلق ہمارے مسلمان تامل گائیڈ نے بتایا تھا کہ وہ ٹیلے کے پیچھے بہتی ہے۔ ٹیلہ ختم ہو گیا۔

وہاں ڈھلان نیچے اترتی تھی۔ نیچے چاندنی رات میں ہمیں درختوں کے درمیان چمکیلی سڑک سی نظر آئی۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا۔ شیر باز نے آہستہ سے کہا۔

"یہ ندی ہے۔ نیچے آ جاؤ۔ جلدی۔"

نور بانو بھی ہمارے ساتھ تیزی سے ڈھلان اترنے لگی۔ یہاں درخت نہیں تھے مگر اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ہم جھاڑیوں میں سے نکل کر نیچے درختوں کے درمیان آ گئے۔ سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کا پاٹ چوڑا تھا۔ ہم جلدی جلدی چل کر ندی کے کنارے پر آ گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ ہمیں

ندی پار نہیں کرنی تھی بلکہ ندی میں تیر کر آگے جانا تھا اور نور بانو کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ شیر باز نے کہا۔

"ندی کے کنارے کنارے چلتے ہیں۔"

ہم ندی کے کنارے پر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ راستہ بڑا دشوار گذار تھا۔ سرکنڈہ اور کانٹے دار جھاڑیاں قدم قدم پر راستہ روک رہی تھیں۔ پھر بھی ہم آگے بڑھتے گئے۔ میرا خیال ہے چاندنی رات میں ہم بمشکل ایک فرلانگ آگے گئے ہوں گے کہ سامنے ایک اونچا ٹیلا آگیا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور فکر مند بھی ہوئے کہ ندی ٹیلے کے ساتھ گھوم کر دوسری طرف جانے کی بجائی ٹیلے کے نیچے سے ایک سرنگ میں داخل ہو جاتی تھی۔ سرنگ میں داخل ہوتے ہوئے وہاں ایسا شور پیدا ہو رہا تھا جیسے اندر آبشار کی طرح پانی گر رہا ہو۔ چاندنی رات میں ندی کا پانی تیز رفتاری سے ٹیلے کی سرنگ میں داخل ہوتا صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی قدرتی سرنگ تھی۔ آندھیرا پردیش اور کرناٹک میں پہاڑیاں اور ٹیلے مٹی کے نہیں ہوتے بلکہ چٹانی ہوتے ہیں اور وہاں پہاڑیوں اور ٹیلوں میں ایسی قدرتی سرنگیں عام دیکھنے میں آتی ہیں۔ جہاں سے برساتی نالی یا ندیاں گذرتی ہیں۔ شیر باز کہنے لگا۔

"کیا خیال ہے حیدر علی!"

میں ٹیلے کی چڑھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹیلہ بہت بڑی چٹان کی طرح بالکل سیدھا اوپر تک چلا گیا تھا۔ اس پر چڑھ کر ہم دوسری طرف نہیں جا سکتے تھے۔ مجبوراً" ہمیں ندی کے بہاؤ کے ساتھ سرنگ میں سے ہی گذرنا تھا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"ہمیں سرنگ میں سے جانا پڑے گا۔"

شیر باز نے نور بانو سے پوچھا۔

"نور بہن! کیا تم پانی میں اتر کر ہمارے ساتھ پہاڑی سرنگ پار کر سکو

گی؟ ڈر وگی تو نہیں؟ کیونکہ سرنگ کے اندر پانی کا بہاؤ تیز بھی ہو سکتا ہے۔ سرنگ باہر سے تو آدھی خالی نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے اندر جا کر پانی سے اوپر تک بھری ہوئی ہو۔ اس وقت ہمیں سانس روک کر غوطہ لگا کر آگے بڑھنا ہو گا۔"

میں نے شیر باز سے کہا۔

"میرے تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ پہاڑیوں یا ٹیلوں کے اندر جو قدرتی راستے یا سرنگیں بنی ہوتی ہیں ان میں برسات کا یا ندی نالوں کا پانی کبھی چھت تک نہیں آتا۔ کیونکہ پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہے اور دوسری طرف کا خلا پانی کو تیزی سے اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے پانی ایک جگہ رکنے کی بجائے آگے بہتا چلا جاتا ہے۔ عام طور پر اس قسم کی قدرتی سرنگوں کی چھت کافی اونچی ہوتی ہے۔ اس سرنگ کا مجھے پتہ نہیں۔ یہ تو اس میں سے گذرتے وقت ہی معلوم ہو گا۔"

شیر باز نے ایک بار پھر اردگرد ٹیلوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔

"کیا ہم کسی ٹیلے کے راستے آگے نہیں جا سکتے؟"

میں بھی دوسرے ٹیلوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چاند مغربی پہاڑیوں پر جھک آیا تھا اور چاندنی پھیکی پڑی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"اگر ہم ندی پار کر کے دوسرے کنارے پر چلے جائیں تو وہاں سے کوئی راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

ہم نے ندی کے پاٹ کا جائزہ لیا۔ یہ کافی چوڑا تھا۔ ہم تو اسے تیر کر پار کر سکتے تھے مگر نور بانو کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ نور بانو کو ہم اپنے ساتھ تیراتے ہوئے دوسرے کنارے تک لے جائیں گے۔ چونکہ آگے پانی سرنگ میں داخل ہو رہا تھا اس لئے یہاں ندی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ شیر باز نے مشورہ دیا کہ ہمیں تھوڑے پیچھے جا کر ندی میں داخل ہونا چاہئے تاکہ پانی کا بہاؤ

ہمیں اپنے ساتھ بہا کر سرنگ میں نہ لے جائے۔ چنانچہ ہم واپس چل پڑے۔
دس پندرہ قدم گئے ہوں گے کہ جنگل کی رات انسانی چیخوں سے گونج اٹھی اور بانو کی چیخ نکل گئی۔ وہ ڈر کر میرے ساتھ لگ گئی اور رونے لگی۔ یہ آوازیں جنگلی وحشیوں کی تھیں۔ انہیں ہمارے فرار اور اپنے ساتھیوں کی موت کا علم ہوگیا تھا اور اب وہ ہماری بو سونگھتے ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ عجیب قسم کی ڈراؤنی آوازیں نکال رہے تھے اور یہ آوازیں بڑی تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھیں۔ شیر باز نے کہا۔

"حیدر علی! نور بانو کو لے کر ندی پار کرنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔"

جنگلی لوگوں کی چیخ و پکار نے جنگل کی رات پر موت کا سماں طاری کر دیا۔ ہمارے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے نور بانو کا بازو پکڑا اور اسے ساتھ لے کر ندی میں کود گیا۔ ندی میں کودنے کے فوراً بعد مجھے احساس ہوا کہ ندی کے پانی کا بہاؤ بہت تیز ہے اور میں چاہے کتنی تیزی سے کیوں نہ تیروں دوسرے کنارے تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ نور بانو کو میں نے ساتھ لیا ہوا تھا جس کی وجہ سے میں زیادہ تیزی سے تیر بھی نہیں سکتا تھا۔ ندی میں آتے ہی پانی کا تیز بہاؤ مجھے لکڑی کی گیلی کی طرح بہائے ہوئے سرنگ کی طرف لے جانے لگا۔ میں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پانی کی تیز رفتار موجیں مجھے کنارے سے دور لے جا رہی تھیں۔ ندی کے درمیاں میں پانی کا بہاؤ زیادہ تیز تھا۔ میں نے بلند میں شیر باز سے کہا۔

"ندی میں کود جاؤ۔ ہمیں سرنگ میں سے گذرنا پڑے گا؟"

جنگلیوں کی چیخیں اب بالکل قریب پہنچ گئی تھیں۔ میں نے کنارے کی طرف نگاہ ڈالی۔ مجھے شیر باز ندی میں چھلانگ لگاتا نظر آیا۔ تیز رفتار موجیں اسے بھی سرنگ کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ پانی کا بہاؤ مجھے اور نور بانو کو بھی

سرنگ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے دوسری بار کنارے کی طرف نگاہ ڈالی تو مجھے مدھم چاندنی میں جنگلی لوگ نظر آ گئے وہ نیزے لہراتے جھاڑیوں پر سے کودتے چھلانگیں لگاتے ڈراؤنی آوازیں نکالتے ندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شیر باز مجھ سے تھوڑا پیچھے تھا۔ ہم جان توڑ کر دوسرے کنارے کی طرف پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر پانی کا بہاؤ ہمیں سرنگ کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹیلہ مقناطیس کی طرح ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ نور بانو کو میں نے پانی میں تیرتے ہوئے ایک بازو نیچے ڈال کر اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اس کا سر میں پانی میں نہیں جانے دیتا تھا۔ میں صرف ایک بازو سے تیر رہا تھا۔ چنانچہ میں سب سے پہلے پانی کے بہاؤ کے ساتھ سرنگ میں داخل ہوا۔

گڑگڑاہٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میرے پاؤں پتھروں سے ٹکرائے اور پانی کی تیز رفتار چادر نے ہمیں اچھال کر سرنگ کے اندر پھینک دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے نور بانو کو پکڑ رکھا تھا۔ وہاں تیرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پانی طوفانی کی طرح ہمیں آگے ہی آگے دھکیل رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سرنگ پانی سے بھری ہوئی نہیں تھی۔ ہمارے سر بار بار پانی سے باہر آ جاتے تھے۔ میں نے اونچی آواز میں نور بانو سے کہا۔

"گھبرانا نہیں بہن۔ جب پانی سے اوپر آؤ تو لمبے سانس لینا۔"

نور بانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور سر بار بار اوپر کر رہی تھی۔ پانی کے تھپیڑے ہمیں کسی جگہ ٹکنے کی مہلت نہیں دے رہے تھے۔ میری پاؤں نیچے سرنگ کے پتھروں سے ضرور ٹکرا رہے تھے مگر کسی جگہ ٹک نہیں رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چمٹے پلاسٹک کے کھلونوں کی طرح سرنگ کے اندر ندی کے تیز ترین بہاؤ میں آگے ہی آگے ہچکولے کھاتے بہتے چلے جا رہے تھے۔ سرنگ کے اندر پانی کی گڑگڑاہٹ کی آواز بڑی

ڈراؤنی لگ رہی تھی۔ نور بانو مجھ سے بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ شیر باز بھی ہمارے پیچھے آ رہا ہے یا نہیں۔ سرنگ میں ایک تو گھپ اندھیرا تھا دوسرے تیز رفتار اور اچھلتی ہوئی موجیں مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنے دیتی تھیں۔ میں نے سوچا کہیں جنگلی لوگ بھی ہمارے پیچھے سرنگ میں نہ کود گئے ہوں۔ وہ تو بڑے ماہر تیراک ہوں گا۔ اگر وہ سرنگ میں کود گئے ہیں تو ممکن ہی انہوں نے شیر باز کو دبوچ لیا ہو۔ کیونکہ شیر باز ہم سے بہت پیچھے تھا۔ جس وقت میں نے اس کے سر کو پانی میں ڈوبتے ابھرتے دیکھا تھا تو اس وقت جنگلی لوگ کنارے پر آ چکے تھے اور نیزے ہلا ہلا کر شیر باز کے سر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میں یہ سوچ بھی رہا تھا اور پانی کی تیز موجیں میرے ساتھ ساتھ نور بانو کو بھی اچھال اچھال کر نیچے گراتی بہائے لئے جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ پانی کی گڑگڑاہٹ دھیمی پڑنے لگی اور میرے پاؤں بھی سرنگ کی تہہ میں جمنے لگے۔ پانی کا بہاؤ اب تیز نہیں رہا تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے سرنگ میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پانی ہماری گردن تک تھا۔ پانی ہمیں سرنگ میں دوڑاتے ہوئے لئے جارہا تھا۔ جب پانی کا بہاؤ معمول پر آیا تو میں نے دائیں جانب تیر کر سرنگ کی دیوار تک پہنچنے کی کوشش کی۔ سرنگ میں تازہ ہوا موجود تھی۔ نور بانو نے اپنی سر میرے بازو پر ڈال رکھا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں اسے پانی میں کھینچتا ہوا سرنگ کی دیوار کی طرف لے آیا۔ میرا ہاتھ دیوار کے ایک پتھر پر پڑ گیا جو دیوار میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے پتھر

دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اور اسے آواز دی۔ نور بانو بے ہوش نہیں تھی مگر بے حد نڈھال ہو چکی تھی۔ وہ ایک ایسے جان لیوا تجربے سے گذری تھی کہ اس کی وجہ سے وہ حواس باختہ سی ہو رہی تھی۔ بے چاری گھریلو خاتون تھی۔ اس قسم کے حالات سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے میں نے نور بانو کو پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے سرنگ کی دیوار کے پتھر کو پکڑا ہوا تھا۔

پانی کا بہاؤ میرے قدم اکھاڑنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا مگر میں اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک پانی کے بہاؤ کا مقابلہ نہ کر سکوں گا۔ مجھے اصل میں شیر باز خان کی فکر تھی۔ میں اس امید پر کھڑا تھا کہ شاید شیر باز پانی کے بہاؤ پر تیرتا یا لڑھکتا ہوا مجھ تک پہنچ جائے۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں اس کی جگہ جنگلی نہ آ جائیں۔ میری شارٹ گن کندھے سے لٹکی ہوئی تھی اور پانی کا بہاؤ اسے آگے لے جا رہا تھا۔ شارٹ گن سلنگ کے ذریعے میرے کندھے سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے نور بانو سے کہا۔

"نور بہن! پاؤں جمانے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے شیر باز ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔"

نور بانو پر ایسی نقاہت اور خوف طاری تھا کہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں سرنگ کے دہانے کی طرف سے پانی کا ایک تیز و تند ریلا آیا اور سب سے پہلے نور بانو کے پاؤں اکھڑے۔ میں اسے سنبھالنے لگا تو میرے بھی پاؤں اکھڑ گئے اور ہاتھ چھوٹ گیا۔ ہم دونوں ایک بار پھر پانی میں بہنے لگے لیکن اللہ کا اتنا کرم ضرور تھا کہ ہمارے سر گردن سے نیچے تک پانی سے باہر تھے۔ کچھ انداز نہیں تھا کہ سرنگ کی چھت ہمارے سروں سے کتنی اوپر ہے۔ میں نے ایک دو بار ہاتھ بلند کر کے چھت کو چھونے کی کوشش کی مگر میرا ہاتھ چھت سے نہیں ٹکرایا تھا۔ پانی کا ریلا ہم دونوں کو تیزی سے آگے لئے جا رہا تھا۔ یہاں تیرنے کی گنجائش نہیں تھی اور تیرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہمارے پاؤں

سرنگ کی تہہ کے پتھروں سے ٹکراتے اور پانی اوپر اچھال کر آگے لے جاتا۔

خدا جانے یہ سرنگ کہاں تک چلی گئی تھی۔ شاید وہ ایک پہاڑی کے نیچے سے نکل کر دوسری پہاڑی کے نیچے آگئی تھی۔ ہمارے گائیڈ نے ندی کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ آگے ایک موت کی سرنگ بھی آئے گی۔ سرنگ ایک طرف کو گھوم گئی۔ میں اور نور بانو بھی پانی کے ریلے کے ساتھ ہی اس طرف گھوم گئے۔ اچانک پانی کے بہاؤ کی رفتار کم ہو گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد اس طرح بہنے لگا جیسے کھلے میدانوں میں ندی کا پانی بہتا ہے۔ ہمارا پاؤں سرنگ کی تہہ سے لگ جاتے تھے مگر چونکہ پانی ہمارے کندھوں تک تھا اس لئے پانی کے کے دباؤ کی وجہ سے ہم کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ پیچھے سے پانی کا دباؤ ہمیں آگے دھکیل رہا تھا۔ نور بانو نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ سرنگ کب ختم ہوگی؟"

میں نے کہا۔

"اللہ نے چاہا تو جلدی ختم ہو جائے گی۔"

پانی کا بہاؤ اب نارمل ہوگیا تھا اور ہمارے کندھوں سے اتر کر ہماری کمر تک پہنچ گیا تھا۔ اب ہم پانی میں کھڑے ہو سکتے تھے۔ ہم پانی میں ٹانگوں کو حرکت دیتے آگے بڑھنے لگے تھے۔ سرنگ میں ابھی تک گھپ اندھیرا تھا۔ میری آنکھیں اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں جس طرف سرنگ میں پانی جا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سرنگ جہاں ختم ہوگی وہاں اس کے دہانے میں باہر کھلی ہوئی چاندی کی دھیمی روشنی ضرور دکھائی دے گی۔ میری آنکھیں اس روشنی کو دیکھنے کے لئے بے چین تھیں۔

پانی کے بہاؤ کا ست رفتار ہو جانا اس بات کی دلیل تھی کہ آگے کوئی ہموار میدان ہے۔ پانی آگے آبشار بن کر نیچے نہیں گر رہا۔ اگر ایسا بات ہوتی تو پانی کا بہاؤ تیز ہو جاتا۔ یہ بڑی اطمینان بخش بات تھی۔ پریشانی اگر کوئی تھی تو اس

بات کی تھی کہ پیچھے سے شیر باز ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں سرنگ میں اسے آواز بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ جنگلی لوگ بھی ہمارے تعاقب میں سرنگ کے اندر آ گئے ہوں اور میری آواز سن کر ہو سکتا ہے۔ واپس جاتے ہوئے وہیں رک جائیں اور دوبارا ہمارا پیچھا کرنا شروع کر دیں۔ ایک بات ظاہر تھی کہ اگر شیر باز خان سرنگ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے تو پھر وہ آگے جا کر ہم سے ضرور آن ملے گا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ سرنگ آگے جا کر کہاں نکلتی ہے۔ گائیڈ نے کہا تھا کہ ندی آگے جا کر ایک دوسری بڑی ندی میں جہاں گرتی ہے ہمیں وہیں کنارے پر آ جانا ہوگا۔ وہاں قریب ہی کوئی قصبہ ہو گا۔ جہاں سے ہم بنگلور پہنچ سکیں گے۔

کشمیری خاتون نور بانو نے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ ہم سرنگ کے اندر پانی میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ پانی ہمیں آگے ضرور دھکیل رہا تھا مگر اس میں وہ پہلے والا زور نہیں رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ آگے سرنگ کا پانی کسی ایسی جگہ گر رہا ہے جو ندی کی سطح کے برابر ہے۔ نیچی نہیں ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر ندی دوسری بار گھوم گئی۔ ہم بھی اس کے ساتھ گھومے تو مجھے دور سرنگ میں روشنی کا ایک نقطہ سا نظر آیا۔ یہ نقطہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے نقطہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے نور بانو سے کہا۔

"نور بہن! ہم سرنگ سے باہر نکلنے والے ہیں۔"

اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

یہ سرنگ کا دہانہ تھا جہاں سے چاندنی دھندلے سفید غبار کی طرح

سرنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ وہاں سے تازہ ہوا بھی اندر آنے لگی تھی۔ آگے
چونکہ پانی کی سطح ہموار تھی اس لئے پانی کے بہاؤ میں کوئی تیزی رونما نہیں ہوئی
تھی۔ وہ ست رفتاری سے بہہ رہا تھا اور ہمیں چلنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ
رہی تھی۔ پانی کی سطح بھی بلند نہیں تھی۔ وہ ہماری کمر تک ہی تھا۔ سرنگ کے
دہانے کے پاس آ کر میں نے نور بانو سے کہا۔

"ہو سکتا ہے آگے کوئی گہری جھیل ہو۔ اس لئے ہوشیار رہنا اور میری
گردن میں دونوں ہاتھ ڈال دو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں سنبھل سنبھل کر پانی میں قدم آگے بڑھا رہا
تھا۔ سرنگ کے دہانے پر پانی کی رفتار تھوڑی سی تیز ہو گئی تھی۔ میں نے ایک
دیوار کو تھام لیا اور اسے پکڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ باہر مجھے چاندنی رات میں
ایک بہت بڑا تالاب نظر آیا۔ سرنگ کا پانی اسی تالاب میں جا کر مل جاتا تھا۔
میرے قدموں تلے زمین نیچی ہونا شروع ہو گئی۔ پانی کمر سے اوپر سینے تک آ گیا۔
میں نے نور بانو سے کہا۔

"ہوشیار نور بانو۔ ہم تالاب میں اترنے والے ہیں۔"

یہ تالاب نہیں تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی جھیل تھی جس میں
ندی کا پانی سرنگ میں سے ہو کر آتا اور جھیل میں مل جاتا تھا۔ ایک دم سے
میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ نور بانو کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور
وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ ہم سرنگ سے نکل کر جھیل میں آ گئے تھے۔ میں نے
ایک بازو سے نور بانو کو سنبھال رکھا تھا اور دوسرے بازو سے جھیل کے کنارے
کی طرف تیرنے لگا۔

زرد چاند پھیکا سا ہو کر پہاڑیوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ جھیل کے آس پاس
پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر اس کی اداس چاندنی سمٹنے لگی تھی۔ میں آہستہ آہستہ
تیرتے ہوئے کنارے پر آ گیا۔ نور بانو کو بازو سے پکڑ کر کنارے پر کیا اور خود بھی

اس کے پاس ہی سر نیچے ڈال کر بیٹھ گیا۔ سرنگ کے ہمت شکن سفر نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ نور بانو وہیں لیٹ گئی۔ میں نے پوچھا۔

"نور بہن! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

اس نے کھانستے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

وہ بے چاری تو بہت زیادہ تھکن اور تکلیف کے باعث بے جان ہو رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اسے بتایا کہ ہم وحشی لوگوں کے جنگل سے نکل آئے ہیں۔

"یہاں سے ہم ایک قصبے میں جائیں گے اور وہاں ہمیں بنگلور کے واسطے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔"

اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"شیر بھائی ابھی تک کیوں نہیں آیا؟"

میں بھی جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سرنگ کا دہانہ تھا وہ جگہ پھیکی ہوتی ہوئی چاندنی میں مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شیر باز بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس کی فکر لگ گئی۔ خدا نہ کرے کہ وہ جنگلی لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ پھر سوچا کہ شیر باز اتنی آسانی سے ان لوگوں کے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ شارٹ گن سے فائرنگ ضرور کرتا اور مجھے فائرنگ کی سائیلنسر کے باوجود آواز ضرور آ جاتی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس چھ سات ہینڈ گرنیڈ بھی تھے۔ شیر باز خاں ٹرینڈ کمانڈو تھا۔ وہ پانی میں تیرتے ہوئے جیب سے گرنیڈ نکال کر ان کے پن کھول کر پھینک سکتا تھا۔ ایسی صورت میں دستی بموں کے دھماکے ضرور سنائی دیتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شیر باز خان زندہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جنگلیوں کو ندی میں چھلانگیں لگاتے دیکھ کر وہ سرنگ میں آنے کی بجائے ندی کے دوسرے کنارے کی طرف

چلا گیا ہو۔ کیونکہ اتنا میں نے دیکھا تھا کہ جب وحشی جنگلی ندی میں ہمارے پیچھے کودے تھے تو شیر باز خان سرنگ کے دہانے سے کافی دور تھا۔

یہ مجھے اطمینان تھا کہ ہم گندھاری وحشیوں کے جنگل سے نکل آئے ہیں۔ ایک موہوم سا خطرہ موجود تھا کہ کوئی جنگلی اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لینے ہمارے پیچھے نہ لگ گیا ہو۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ ہم وہاں سے بھی آگے نکل جائیں اور ان پہاڑیوں کی دوسری طرف کسی گاؤں یا قصبے میں پہنچنے کی کوشش کریں۔ جہاں ہمارے گائیڈ نے جگہ بتائی تھی کہ یہ ندی دوسری بڑی ندی میں گرتی ہے وہ جگہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ شاید یہ جھیل آگے جا کر کسی بڑی ندی میں مل گئی ہو میں نے نور بانو سے کہا۔

"نور بہن! ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ شیر باز ہو سکتا ہے ہمیں آگے جا کر کہیں مل جائے۔ چلو آگے چلتے ہیں۔"

وہ مصیبت کی ماری کیا کہہ سکتی تھی۔ اٹھ بیٹھی اور میرے ساتھ آہستہ آہستہ چل پڑی۔ میں نے اس دوران اپنی شارٹ گن کو چیک کر لیا تھا اور جیب سے دستی بم نکال کر انہیں بھی تھوڑا بہت خشک کر لیا تھا۔ میرا تھیلا جس میں بسکٹوں کے دو ڈبے اور تھرمس بوتل تھی ندی میں ہی مجھ سے الگ ہو کر کہیں بہہ گیا تھا۔ دستی بم اس لئے بچ گئے تھے کہ رات کو پہرہ دینے سے پہلے میں نے انہیں تھیلے سے نکال کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ چاند غروب ہو گیا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے پونے تین بجا رہی تھیں۔ جھیل کے ساتھ ساتھ درخت اور اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ہم ان سے ہٹ کر چل رہے تھے۔ یہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ چاند کے غروب ہو جانے سے اندھیرا ہو گیا تھا مگر اندھیرے میں مجھے راستے کی گھاس اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے اور عقب کی جانب اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ جو ایک جگہ پہنچ کر ہم سے دور ہو گئے۔ سامنے ایک وسیع

میدان سا تھا۔

پچھلی رات کے اندھیرے اور ستاروں کی چمک میں اس میدان میں کہیں کہیں تاڑ اور ناریل کے درخت سر اوپر آسمان کی طرف اٹھائے ساکت کھڑے تھے۔ آگے چلتے چلتے میں نے میدان کو غور سے دیکھا۔ یہ کوئی کھیت نہیں تھے۔ بالکل بنجر جگہ تھی۔ میں رک گیا۔ نور بانو بھی رک گئی۔ کہنے لگی۔

"یہاں تو کوئی گاؤں نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہی میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ فکر نہ کرو آؤ میرے ساتھ۔"

ہم میدان میں چل پڑے۔ یہ غیر ہموار جگہ تھی۔ خشک سرکنڈوں ایسی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ کہیں کوئی سانپ نہ نکل آئے یا کوئی جنگلی درندہ اچانک حملہ نہ کر دے۔ میں نے شارٹ گن سنبھال لی تھی اور اپنی طرف سے پورا ہوشیار ہو کر نور بانو کو ساتھ لئے چل رہا تھا۔ ہمارے قدم چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکرا رہے تھے۔

دور کسی جگہ پر کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ کوئی ویران جنگل کا علاقہ تھا۔ آبادی وہاں نہیں تھی۔ دوسری بڑی ندی بھی کہیں نہیں تھی۔ جس کے بارے میں گائیڈ نے بتایا تھا کہ اس کے کنارے پر ہمیں گاؤں یا قصبہ ملے گا۔ نور بانو تھک گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور مجھے اس کے لئے رکنا پڑتا تھا۔ میں نے اسے سے پوچھا۔

"نور بہن! زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے تو ہم یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔"

وہ بولی۔

"نہیں نہیں بھائی جان۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

دراصل وہ اس ویرانے میں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے دل میں

وحشی جنگلیوں کا خوف ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اچانک وہاں آ کر حملہ نہ کر دیں۔ وہ ان کے درمیان قید و بند کے کتنے ہی دن گذار چکی تھی۔

آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ان کی پھیکی روشنی میں ہمیں اردگرد کا منظر واضح طور پر تو نہیں مگر بہت حد تک نظر آ رہا تھا اور ہم سرکنڈوں سے بچ کر چل رہے تھے۔ ہم اس بنجر پتھریلے میدان سے نکل آئے۔ آگے پھر درختوں کے جھنڈوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں خود تھک گیا تھا۔ میں نے نور بانو سے کہا۔

"یہاں رات گذارنے کے لئے کوئی جگہ دیکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے ہیں۔ باقی رات آرام کرتے ہیں۔ دن کی روشنی میں دیکھیں گے کہ ہم کہاں پر ہیں اور کس طرف جا سکتے ہیں۔"

نور بانو نے کہا۔

"یہاں جنگلی جانوروں اور سانپوں کا بھی خطرہ ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ خطرہ تو ضرور ہے مگر ہم کوئی محفوظ جگہ تلاش کرتے ہیں۔ میرے ساتھ آ جاؤ۔"

درختوں کے دو چار جھنڈوں میں سے گذرنے کے بعد میری نگاہ بائیں جانب اونچی جگہ پر ایک عمارت پر پڑی۔ پہلے تو مجھے وہ کوئی چٹان لگی۔ ذرا قریب جا کر دیکھا تو وہ کوئی پرانا کھنڈر تھا۔ زیادہ تفصیل سے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کھنڈر کس عمارت کا ہے۔ ایک طرف کو جھکا ہوا چبوترہ تھا۔ چبوترے تک چھ سات سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ اوپر ایک کافی بڑی بارہ دری سی تھی جس پر چھت پڑی ہوئی تھی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر بارہ دری میں آ گئے۔ پتھر کے کچھ ستون گرے پڑے تھے۔ میں نے ایک جگہ زمین صاف کی اور نور بانو سے کہا۔

"تم یہاں لیٹ کر آرام کرو۔ میں پہرہ دیتا ہوں۔ تمہارے لئے آرام

کرنا بہت ضروری ہے۔"

نور بانو ایک جگہ پتھر کے گرے ہوئے ستونوں کے درمیان لیٹ گئی اور میں شارٹ گن لے کر اس کے قریب ہی ایک ستون کے پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ پو پھٹنے کا وقت قریب تھا۔ مجھے شیر باز کی فکر تھی۔ یہ بھی فکر تھی کہ کسی طرف سے کوئی جنگلی درندہ نہ آ جائے۔ اس بات کا ڈر بھی لگا ہوا تھا کہ کوئی جنگلی جو ہمارا پیچھا کرتا آ رہا تھا۔ ہم پر زہریلے تیر نہ پھونکنا شروع کر دے۔ میں بالکل سیدھا ہو کر بیٹھا تھا اور جنگلی قبیلے کا آدمی اس اندھیرے میں بھی مجھے دیکھ سکتا تھا۔ میں ایک گرے ہوئے ستون کے پیچھے مورچہ سا بنا کر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ سامنے بھی دیکھ رہا تھا اور پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ آسمان پر بہت پہلے کی نیلی نیلی پھیکی پھیکی سی روشنی کا غبار مشرقی افق پر ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔

میں نے نور بانو کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ ایک طرف منہ کر کے لیٹی ہوئی تھی اور کوئی حرکت نہیں کر رہی تھی۔ شاید وہ سو گئی تھی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ صبح تک آرام کرے تاکہ اس کے جسم کی توانائی بحال ہو جائے۔ مجھے یہ بھی خیال پریشان کر رہا تھا کہ صبح کہیں سے اور کچھ نہیں تو پینے کو پانی ضرور ملنا چاہئے۔ مگر وہ ایسا ویران اور سنسان جنگل تھا کہ امید نہیں تھی کہ وہاں کہیں سے پانی کا قطرہ بھی مل سکے گا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ صبح کاذب کی جو پھیکی پھیکی روشنی آسمان پر نظر آ رہی تھی وہ بجھ گئی ہے۔ ماحول پر ایک دم اندھیرے کی باریک چادر سی پڑ گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ کالی سیاہ گھٹا ایک طرف سے اڈ کر چلی آ رہی تھی۔ ہم چونکہ بارہ دری کی چھت کے نیچے تھے اس لئے میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ اگر بارش شروع بھی ہو گئی تو میں اور نور بانو اس سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ فضا پر ایک سکوت سا چھا گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے بیدار ہو کر مجھے کسی آنے والے خطرے کا سگنل دے دیا۔

ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا اور ایسا جب بھی ہوتا تھا۔ میں اسی وقت ہوشیار ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی میں ہوشیار ہوگیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ پچھلی رات کے اندھیرے کو کالی کالی اڈتی ہوئی گھٹاؤں نے اور زیادہ تاریک کر دیا تھا۔ میرے سامنے کچھ فاصلے پر بے شمار درختوں کے جھنڈ تھے۔ اس طرف سے مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی لنگور درخت کی ٹہنیوں پر اچھل اچھل کر شور مچا رہا ہو۔ یہ آواز چند سیکنڈ کے بعد غائب ہو گئی۔ اتنے میں بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ لنگور کی آواز ایک بار پھر آئی۔ اس دفعہ ایسی آواز بھی آئی جیسے کوئی بڑا سا پتھر لڑھک کر دوسرے پتھروں سے ٹکرا گیا ہو۔ اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ بادلوں کی گرج بہت دور اوپر آسمان پر سنائی دے رہی تھی۔ مجھے خطرے کا شدید احساس ہونے لگا۔ میں گن لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دائیں بائیں آگے پیچھے

اندھیرے میں گھور کر جائزہ لیا۔ بظاہر وہاں کسی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ مجھے خیال آگیا کہ کہیں کوئی شیر ہماری بو پا کر اس طرف نہ آ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے بندر یا لنگور شیر کو دیکھ کر شور مچانے لگا ہو۔ میں نے جلدی سے نور بانو کو اٹھا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔ لگتا ہے کوئی جنگلی جانور آس پاس پھر رہا ہے؟"

نور بانو ڈر کر میرے پیچھے آ گئی۔ میں نے بارہ دری کی دوسری طرف جھک کر دیکھا۔ اس طرف بھی چبوترے کی سیڑھیاں تھیں۔ آگے اندھیرے میں مجھے وہاں بھی ایک کوٹھڑی سی نظر آئی۔ میں نے نور بانو کو ساتھ لیا اور چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر آگے گیا۔ آگے پتھر کی سلوں سے بنا ہوا ایک راستہ تھا جو اونچی دیواروں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ میں جسے کوٹھڑی سمجھ رہا تھا۔ وہ یہ دو دیواریں تھیں۔ ہم دیواروں کے درمیانی راستے سے گذرتے چلے گئے۔ آگے ایک اونچے ستونوں والا دالان آگیا۔ دالان کے کونے میں ایک محرابی دروازہ تھا۔ دروازے کے اندر گئے تو ایک کھلے کھلے سے کمرے کا احساس ہوا۔ دھندلے اندھیرے میں اس بڑے کمرے میں ٹوٹی ہوئی چھت کے بڑے بڑے پتھر ایک طرف گرے ہوئے تھے۔

میں نور بانو کو لے کر ان بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے آ کر بیٹھ گیا۔ اوپر ٹوٹی ہوئی چھت میں سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ آسمان پر کالی سیاہ گھٹا چھا گئی ہوئی تھی مگر بادل نہیں گرج رہے تھے۔ ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔ نور بانو میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ سو جائے اور کچھ دیر اور آرام کرے۔ اس نے کہا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔ تھوڑی رات باقی رہ گئی ہے میں جاگ کر گذار لوں گی۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے جنگلی جانور کا خیال لگا ہوا تھا۔ اندھیرے میں میری آنکھیں محرابی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ جس کے باہر پتھریلی راہداری تھی۔ راہ داری میں سیاہ گھٹاؤں کے چھا جانے سے

تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر میری چھٹی حس مجھے برابر خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے ماحول کی خاموشی پر کان لگا رکھے تھے۔ اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی پتھروں پر چلتے چلتے اچانک رک گیا ہو۔ یہ آواز راہ داری کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے شارٹ گن کا رخ اس طرف کر لیا اور گھور گھور کر راہداری کے سیاہ اندھیروں کو تکنے لگا۔

اس کے ساتھ ایک دم سے شارٹ گن کے دو فائر ہوئے اور ایک انسانی چیخ بلند ہوئی اور نور بانو کے حلق سے بھی خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ یہ گن کے فائر میں نے نہیں کئے تھے۔ میرے دل میں امید کی کرن سی چمک اٹھی۔ یہ سائی لنسر والی گن کے فائر تھے اور ایسی گن میرے علاوہ اس جنگل میں صرف شیر باز کے پاس ہی تھی۔ میں ہیجانی کیفیت میں راہداری کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک [illegible]ز سنائی دی۔

"حیدر علی! حیدر علی!"

یہ شیر باز کی آواز تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"شیر باز! کیا یہ تم ہو؟"

"ہاں"

میں اٹھ کر راہ داری کی طرف گیا۔ ایک طرف اندھیرے میں سے شیر باز نکل کر سامنے آگیا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی جھک کر دیکھا۔ راہداری کی پتھریلی زمین پر ایک انسان کی ننگ دھڑنگ لاش پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا۔ یہ گندھاری قبیلے کا وحشی جنگلی تھا۔ شیر باز نے مجھ سے پوچھا۔

"نور بانو تمہارے ساتھ ہی ہے ناں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہم اندر بیٹھے تھے۔ میں جاگ کر پہرہ دے رہا تھا۔ مجھے کچھ خطرہ

لگ رہا تھا۔ یہ تو گندھاری وحشی لگتا ہے؟"

شیر باز نے شارٹ گن کاندھے سے لٹکائی اور بولا۔

"اندر چل کر بتاتا ہوں۔"

اس نے نور بانو کو دیکھا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ زندہ سلامت ہو۔"

وہ ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"جب تم لوگ ندی کے بہاؤ کے ساتھ سرنگ میں داخل ہو گئے۔ تو میں تم سے دور تھا۔ اتنے میں وحشی جنگلی لوگ ندی میں کود پڑے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھ پر نیزے اور تیر پھینکنے لگے۔ میں پانی میں غوطہ لگا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں پانی کے اندر ہی اندر سے سرنگ کی طرف نکل جاؤں گا مگر پانی کی موجیں مجھے دوسرے کنارے پر لے گئیں۔ جنگلی لوگ مجھے دوسری طرف تلاش کر رہے تھے۔ میں جلدی سے ندی سے نکل کر درختوں میں ایک طرف بھاگ اٹھا۔ میں بچ تو گیا مگر تم لوگوں سے بچھڑ گیا تھا۔ خدا جانے میں کہاں کہاں سے ہوتا ہوا آخر پہاڑیوں کے حصار سے باہر نکلا تو ایک جگہ سانس لینے کو بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھا اور اندھیرے میں ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا کہ شاید میں سرنگ کی دوسری طرف پہنچ جاؤں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ ندی کے ساتھ سرنگ میں داخل ہو کر اسی طرف نکلے ہو گے اور میرا کسی نہ کسی جگہ رک کر انتظار کرو گے۔ ٹیلے کی دوسری جانب اترا تو ایک جھیل نظر پڑی میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا ایک کھنڈر کے پاس آ کر رک گیا۔ یہاں میں نے ایک ننگ دھڑنگ آدمی کو تیر کمان کاندھے سے لٹکائے نیزہ ہاتھ میں پکڑے جھک کر ایسے چلتے دیکھا جیسے وہ کسی کی بو لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے جنگلی کو پہچان لیا۔ یہ وہی گندھاری وحشی تھا۔ جن کے قبیلے سے ہم نور بانو کو نکال کر لائے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے کسی کو دیکھ لیا ہے اور اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔

قدرتی طور پر یہ تم ہی ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میں اس جنگلی کے پیچھے لگ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی تجربہ کار نگاہ اندھیرے میں تمہیں تلاش کر لے گی۔ یہ جنگلی کھنڈر کے چبوترے سے اتر کر اس طرف آگیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ میں نے اسے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ اندھیرے میں بھی مجھے وہ سائے کی طرف جھک کر کسی کی بو سونگھتا راہداری میں بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارے اور نور بانو کے پیچھے ہی لگا ہوا ہے اور تم دونوں یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔ اس جنگلی نے تمہیں شاید اندھیرے میں بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ رک گیا۔ اس نے زہریلا تیر کمان میں جوڑا اور کمان کو کھینچنے ہی لگا تھا کہ میں نے اس پر دو فائر کر دیئے۔ دو اس لئے کئے کہ اس کے ہاتھوں میں تیر شوٹ کرنے کی سکت بالکل ختم ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلے گی لیکن اس نے ایک چیخ ماری اور گر پڑا۔ وہ مر گیا۔ یہ ہے میری کہانی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ مل گئے ورنہ میں تو سمجھتا تھا کہ اس جنگل میں خدا جانے تم لوگوں سے مل سکوں گا یا نہیں؟"

عین اس وقت بادلوں میں بجلی چمکی اور بادل گرجے۔ شیر باز نے کہا۔

"بارش پھر آ رہی ہے۔ ہمیں اس طرف کونے میں ہو کر بیٹھ جانا چاہئے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں اوپر چھت ٹوٹی ہوئی ہے۔"

ہم اسی وقت اٹھ کر دالان کے کونے میں چھت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ بارش ہونے لگی۔ ہم نے نور بانو کو اپنے قریب ہی تھوڑی جگہ بنا کر سلا دیا اور خود الرٹ ہو کر پہرہ دینے لگے۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر ایک جنگلی شیر باز کا پیچھا کرتا وہاں تک پہنچ سکتا ہے تو دوسرا کوئی جنگلی بھی اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لینے وہاں آ سکتا تھا۔ بارش موسلادھار نہیں تھی۔ مگر بادل بہت گرج رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد صبح کی سفیدی علاقے میں پھیلنے لگی۔ ہم نے دیکھا کے جہاں ہم نے پناہ لے رکھی تھی وہ جگہ کوئی پرانے زمانے کی کسی عمارت

کا کھنڈر تھا۔ نور بانو ابھی تک سو رہی تھی۔ ہم نے اسے سوئے رہنے دیا۔ اسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ شیر باز نے کہا۔

"یہاں سے ہمیں کس طرف جانا چاہیئے؟"

میں نے اسے بتایا کہ گائیڈ کی ہدایات کے مطابق تو ہمیں دو ندیوں کے سنگم پر جانا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

"اب تو ہمیں مغرب کی طرف ہی چلنا چاہیئے۔ کیونکہ بنگلور شہر اسی طرف آئے گا۔"

شیر باز بولا۔

"سب سے پہلے تو نور بانو کے لئے اور اپنے لئے تھوڑا بہت کھانے پینے کا انتظام کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آگے دیہات وغیرہ کی آبادی ضرور ہوگی۔ کچھ نہ کچھ مل ضرور مل جائے گا۔"

دن چڑھ گیا تھا۔ بارش مدھم ہوتے ہوتے رک گئی۔ نور بانو بھی بیدار ہوگئی۔ ہم نے اسے بھی تسلی دی کہ خطرناک جنگل ختم ہو گئے ہیں۔ آگے کوئی نہ کوئی انسانی بستی ضرور ہوگی جہاں سے ہمیں بنگلور کے لئے سواری مل جائے گی۔

وہ صبر شکر کرنے والی عورت تھی۔ خاموشی بیٹھی رہی۔ جب بارش بالکل رک گئی تو ہم کھنڈر سے نکلے اور مغرب کی طرف ایک پگ ڈنڈی پر چل پڑے۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ چلتے رہے۔ جنگلات کا گھنا پن ختم ہوگیا تھا۔ کہیں کہیں کھیت نظر آنے لگے تھے جو انسانی آبادی کی علامت تھے۔ پھر ایک چھوٹا سا گاؤں آیا جس کے مکانوں اور نسواری رنگ کی ٹین کی چھتیں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ گاؤں ہمارے ہاں کے دیہات ایسا نہیں تھا۔ ٹین کی چھتوں والے ٹوٹے پھوٹے مکان تھے جن کے برآمدوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ یہ کالے کالے بچے

تھے جن کے سروں پر بالوں کی بودیاں تھیں اور کمر کے گرد سیاہ دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ دو تین بوڑھی عورتیں صحنوں میں بیٹھی ناریل کی رسیاں بٹ رہی تھیں۔ ایک کمزور سا سیاہ فام بوڑھا قریب ہی بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے حقہ ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہاں سے بنگلور شہر کس طرف ہے۔ آندھیرا پردیش پر چونکہ دکن کے مسلمان نظام کی حکومت رہی تھی۔ اس لئے یہاں پر اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ تامل ناڈو کے لوگوں کی نسبت آندھیرا پردیش کے لوگ ہندی نما اردو بول بھی لیتے تھے اور سمجھ بھی لیتے تھے۔

بوڑھے نے تلیگو لہجے اور شکستہ ہندی نما اردو میں بتایا کہ آگے کرشنا ندی ہے۔ اس ندی کے پار منڈیال گھاٹ نام کا قصبہ ہے۔ وہاں سے ہمیں آگے جانے کے لئے سواری مل جائے گی۔ اس نے بتایا کہ بنگلور شہر وہاں سے سو سوا سو کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم اصل راستے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کیونکہ عالمگیر نے ہمیں بتایا تھا کہ گندھاری قبیلے کے گاؤں والا جنگل بنگلور سے ساٹھ ستر کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دیہاتی عورتیں نور بانو کے سفید رنگ روپ کو حیرانی اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم جنگل میں راستہ بھول گئے تھے اور ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا تو عورتوں نے اس وقت ہمارے لئے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا۔ ہمیں ایک جھونپڑی کے صحن میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ہمارے آگے کیلے کے چوڑے پتوں کا دسترخوان بچھا دیا گیا۔ ہم نے بڑے مزے سے نمکین چاول بینگن کی مرچوں والی سبزی کے ساتھ کھائے۔ پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ جاتی دفعہ ہم نے ان مہمان نواز دیہاتیوں کو کچھ روپے دینے چاہے جو انہوں نے نہ لئے اور کہا کہ مہمانوں کی خاطرداری ہمارا فرض ہے۔ ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ہم ان کو خدا حافظ کہہ کر آگے روانہ ہو گئے۔ ہم نے تھرمس پانی سے بھر لی تھی۔ آگے آبادی شروع

ہونے کی توقع تھی۔ اس لئے راشن پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم کھیتوں میں چلتے گئے۔ اس کے بعد دریا آگیا۔ یہ لوگ دریا کو ندی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن کرشنا دریا زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس علاقے میں کرشنا اور کاویری دو دریا گذرتے ہیں۔ دریا کے کنارے ایک گھاٹ بنا ہوا تھا۔ جہاں سے بڑی کشتی میں مسافروں کو دریا پار کرایا جاتا تھا۔ ہم نے بھی کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کیا۔ دریا کی دوسری طرف کچھ فاصلے پر تاڑی کے چھتریوں والے اونچے اونچے کھمبوں ایسے درختوں کی قطار کے نیچے ایک گاؤں آباد تھا۔ یہ کافی بڑا گاؤں تھا۔ ایک کشتی بان سے پوچھا کہ اس گاؤں کا کیا نام ہے۔ اس نے کہا۔

"اس کا نام منڈیال گھاٹ ہے۔"

ہم ٹھیک راستے پر جا رہے تھے۔ منڈیال گھاٹ سے ہم ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر بیس میل کے فاصلے پر ایک بڑے قصبے میں آ گئے۔ میں اس قصبے کا نام بھول گیا ہوں۔ اتنا یاد ہے کہ وہاں املی کے بڑے بڑے درخت تھے اور گاؤں کے بازار میں تاڑی کی دکانیں بھی تھیں۔ جن کے باہر بیٹھے محنت مزدوری کرنے والے لوگ تاڑی پی رہے تھے اور تلیگو زبان میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ یہاں ایک لاری اڈہ تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہاں سے دو میل کے فاصلے پر ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ جہاں سے بنگلور' احمد آباد' ناگ پور کی طرف گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ ہم ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر سٹیشن پہنچ گئے۔ ان علاقوں میں بیل گاڑیاں بہت چلتی ہیں۔ جو مسافروں کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں لے جاتی ہیں۔ میں نے تو مدراس میں بھی بیل گاڑیاں دیکھی تھیں جن کے آگے دو بیل جتے ہوئے تھے اور چھت سرنگ کی طرف بنی ہوئی تھی۔ میں ایک بار مدراس شہر میں ایسی ہی بیل گاڑی میں بیٹھ کر تاٹپور تک گیا تھا جو مدراس کا دوسرا بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔

بہرحال سٹیشن پر آ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ معلوم ہوا کہ بنگلور

جانے والے گاڑی دوپہر کے بعد ملے گی۔ ہم دوپہر تک چھوٹے سے سٹیشن پر ہی بیٹھے رہے۔ لوگ ہماری شارٹ گنوں کو حیرانی سے دیکھتے۔ ہم نے سٹیشن ماسٹر کو بھی یہی بتایا کہ ہم جنگل میں شکار کھیلنے گئے تھے۔ موسم خراب تھا اس لئے واپس بنگلور جا رہے ہیں۔ وہاں کوئی پولیس کا سپاہی نہیں تھا ورنہ اگر وہ ہم سے شارٹ گنوں کے لائسنس مانگتا تو مشکل پیش آ سکتی تھی۔ کیونکہ ہماری جیبوں میں دستی بم بھی تھے۔ پلیٹ فارم پر ہی ہم نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ ہمارے کپڑوں کی حالت بہت خستہ تھی۔ مگر ہمارے پاس بدلنے کے لئے دوسرے کپڑے نہیں تھے۔ یہی سوچ رکھا تھا کہ بنگلور پہنچنے پر ہی لباس تبدیل کریں گے۔ دوپہر کے بعد بنگلور جانے والی ٹرین آ گئی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ آسمان پر بادل تھے۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ حبس نہیں تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ گاڑی نے ہمیں تین گھنٹے کے سفر کے بعد بنگلور پہنچایا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔

ہم نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا اپنے مجاہد عالمگیر کے مکان پر آ گئے۔ وہ ہمیں مکان پر ہی مل گیا۔ ہمارے ساتھ نور بانو کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ کشمیری لڑکی ہے جس کو جنگلیوں کی ہلاکت خیز قید سے نکالنے ہم گئے تھے۔ میں نے عالمگیر سے کہا۔

"عالمگیر بھائی! ہمارا مشن کامیاب رہا۔ اگرچہ بہت مشکلیں راستے میں آئیں لیکن ہم اپنی بہن نور بانو کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

عالمگیر نے نور بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہماری بہن ہمیں واپس مل گئی۔ تم لوگ ساتھ والے کمرے میں آ جاؤ۔"

اس نے نور بانو سے کہا۔

"نور بہن! اس گھر میں کوئی عورت نہیں ہے لیکن کچھ زنانہ سوتی

ساڑھیاں سامنے والے ٹرنک میں ضرور پڑی ہیں۔ کیا تم ساڑھی باندھ لیتی ہو؟"
نور بانو نے آہستہ سے کہا۔
"کوشش کروں گی۔"
عالمگیر نے کہا۔
"وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ ہم ساتھ والے کمرے میں بیٹھے ہیں۔"
ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ ہم نے عالمگیر کو اپنے مشن کا پوری داستان سنائی اور دستی بم اور شارٹ گنیں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ خدا نے ہمیں اس مشن میں کامیابی عطا کی ہے۔ ورنہ ہمارے زندہ واپس آنے کے امکانات بہت کم تھے۔ عالمگیر نے پوچھا۔
"اب تم لوگوں کا آگے کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے تم لوگ نور بانو کو لے کر سری نگر کس روز روانہ ہونا پسند کرو گے؟"
شیر باز نے کہا۔
"برادر عزیز! ہم ابھی بنگلور میں ہی ٹھہریں گے۔"
عالمگیر نے کچھ تعجب سے پوچھا۔
"کیا کوئی خاص کام ہے یہاں؟"
شیر باز بولا۔
"ہاں بڑا اہم کام ہے۔ ہمیں کرنل واڈیکر سے اپنی کشمیری بہن کے اغوا اور اسے موت کے حوالے کرنے کا بدلہ لینا ہے۔"
شیر باز نے مجھے اس بارہ میں پہلے ہی بتا دیا ہوا تھا۔ عالمگیر ہماری طرف تکنے لگا۔ میں نے کہا۔
"اس ظالم مرہٹہ کرنل سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لئے بغیر ہم یہاں سے واپس نہیں جاسکتے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ نور بانو کو اغوا کروایا بلکہ اسے سری نگر سے نکال کر بنگلور لے آیا اور یہاں اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے ان

وحشی جنگلیوں کے حوالے کر دیا جو لوگ نور بانو کو اپنے دیوتا پر قربان کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک طرح سے تو کرنل واڈیکر نے نور بانو کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔"

میں نے شیر باز خان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر نور بانو کی جان بچانے وحشی جنگلیوں کی بستی میں نہ پہنچتے تو نور بانو کی لاش بھی ہمیں نہ ملتی۔ ہم کرنل واڈیکر سے کشمیر کی بیٹی کی بے عزتی کا انتقام لے کر مقبوضہ بھارتی فوجیوں کی متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر آئندہ کسی بھارتی فوجی نے ایسی حرکت کی تو اس کا انجام بھی ایسا ہی عبرت انگیز ہو گا جیسا کرنل واڈیکر کا ہوا ہے۔"

عالمگیر بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس معاملے میں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ ہمارے جہاد کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کشمیر پر قابض بھارتی فوجیوں کو کان ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ آئندہ ان میں سے کوئی فوجی جوان یا افسر کشمیر کی کسی بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہیں کرے گا۔ یہی ہمارے مقصد ہے۔ یہی ہمارا مشن ہے۔"

شیر باز نے کہا۔

"عالمگیر اس مشن میں بھی ہمارے ساتھ تھا۔"

اس نے پوچھا۔

"نور بانو کو سری نگر اس کے گھر کیسے پہنچایا جائے گا؟ اس کو اس کے گھر پہنچانا بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ کام صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ یہاں کوئی دوسرا آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔"

عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے پاس دو آدمی ایسے ہیں جن پر میں بھروسہ ک
سکتا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ نازک ہے۔ مجھے خود ہی نور بانو کو اس کے سسرا
والوں کے پاس پہنچانا ہوگا۔ تو پھر ایسا ہے کہ یہاں سے ایک ٹرین دلی سے ہو
ہوئی سیدھی امرتسر جاتی ہے۔ یہ بنگلور سے دن کے سوا آٹھ بجے چلتی ہے۔ می
کل ہی نور بانو کو ساتھ لے کر نکل جاؤں گا۔ یہاں ویسے بھی اس کا زیادہ ٹھہ
مناسب نہیں۔"

رات کو ہم لوگ کھانا کھا کر ایسا سوئے کہ دوسرے دن سات بجے عالمگیر نے زبردستی ہمیں جگایا۔ معلوم ہوا کہ نور بانو اور عالمگیر سری نگر جانے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ نور بانو نے سادہ سی سوتی ساڑھی پہن لی تھی۔ عالمگیر کے کہنے پر اس نے ماتھے پر ہندی عورتوں کی طرح بندیا بھی لگا لی تھی۔ عالمگیر کھدر کے کانگریسی کرتے پاجامے میں تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ جموں کشمیر تک کے لئے ایک بے حد محفوظ لباس ہے۔ اگر راستے میں کہیں کوئی خطرے والی صورت پیدا ہو گئی تو میں نے چھوٹا پستول کرتے کے اندر صدری کی جیب میں چھپا کر رکھ لیا ہے۔ لیکن مجھے پوری امید ہے کہ ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوگی۔"

جانے سے پہلے اس نے مجھے اور شیر باز سے کہا۔

"تم لوگ اس دوران میرے جنگل والے ریسٹ ہاؤس میں ہی رہو گے۔ میرا تامل ملازم تمہیں جیپ میں وہاں پہنچا دے گا۔ جب تک میں نور بانو کو اس کے گھر پہنچا کر واپس نہیں آ جاتا تم لوگ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرو گے۔ میں واپس آ کر خود تم سے ٹیلی فون پر رابطہ پیدا کروں گا۔ وہاں تمہیں جس چیز کی ضرورت پڑے عثمان بابا کو کہہ دینا وہ سارا انتظام کر دے گا۔"

ہم عالمگیر کے مکان پر ہی رہے۔ وہ نور بانو کو لے کر رخصت ہونے لگا تو ہم نے نور بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔ اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے ہمارا شکریہ ادا کیا اور عالمگیر کے ساتھ مکان سے نکل گئی۔ باہر عالمگیر کی

جیپ موجود تھی۔ ڈرائیور پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ جیپ نور بانو کو لے بنگلور کے ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوئی تو ہم نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں اس نازک اور اہم ترین مشن میں کامیابی اور کامرانی عطا کی۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈرائیور جیپ لے کر واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ بابو جی بہن جی کو لے کر ٹرین میں بیٹھ گئے تھے اور ٹرین چل پڑی تو میں پلیٹ فارم سے واپس آیا تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہم دوپہر کے بعد ریسٹ ہاؤس روانہ ہوں گے۔ اس کے بعد ہم پھر سو گئے۔ کوئی ایک بجے اٹھے۔ اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ڈرائیور سے کہا۔ کہ ہمیں ریسٹ ہاؤس پہنچا دے۔ ڈرائیور نے جیپ کا تیل پانی چیک کیا اور ہمیں لے کر عالمگیر کے جنگل والے ریسٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہوگیا۔ ریسٹ ہاؤس میں عثمان بابا نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ ہمارا مشن کامیاب رہا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس سے زیادہ ہم نے اسے کچھ نہیں بتایا ہوا تھا کہ ہم ایک خاص مشن پر جا رہے ہیں۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ ہمارا مشن کیا ہے لیکن وہ آدمی عالمگیر کا پرانا ملازم تھا اور پاکستان سے محبت کرتا تھا اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کا زبردست بہی خواہ تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں ہم دونوں یعنی میں اور شیر باز خان اکیلے تھے۔ ہم رات کو خوب گہری نیند سوتے۔ دن کے وقت تھوڑی دیر ٹہلنے کے لئے ریسٹ ہاؤس کے پیچھے کی طرف نکل جاتے۔ شام کی چائے اکٹھے پیتے۔ یہی دعا کرتے کہ عالمگیر نور بانو کو لے کر سری نگر خیریت سے پہنچ گیا ہو۔ وہ ہمیں سری نگر سے فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا بھی نہیں تھا کہ میں فون کروں گا۔ کیونکہ فون راستے میں ڈی ٹیکٹ ہو سکتا تھا۔ شیر باز کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ عالمگیر سری نگر پہنچنے کے بعد فون پر اطلاع ضرور دے گا اور اشاروں میں ہمیں اپنی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کر دے گا۔ وہ ہمارا

پرانا اور تجربہ کار مجاہد ہے۔"

شیر باز کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ تیسرے دن رات کے گیارہ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت ہم جاگ رہے تھے اور کرنل واڈیکر سے انتقام لینے کی سکیم پر غور کر رہے تھے۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی شیر باز نے کہا۔

"یہ عالمگیر کے سوا اور کوئی نہیں۔"

اس نے جلدی سے دوڑ کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے عالمگیر ہی بول رہا تھا۔ میں شیر باز کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کے اثرات تھے۔ فون بند کر کے اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"مبارک ہو حیدر علی! نور بانو اپنے گھر پہنچ گئی ہے۔"

مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں اپنی مہم میں سرخروئی عطا فرمائی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ خبر عالمگیر نے تمہیں کس طرح بتائی؟"

شیر باز میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"عالمگیر نے یہی کہا کہ تم لوگوں نے جو بنگلور کی خاص مٹھائیوں کا تحفہ دیا ہے وہ میں نے شرما جی کے گھر پہنچا دیا ہے۔ وہ شکریہ ادا کر رہے ہیں۔"

ہم دونوں مسکرانے لگے۔ عالمگیر نے خفیہ اشاروں میں بتا دیا تھا کہ نور بانو اس کو اس نے اس کے سسرال والوں کے ہاں پہنچا دیا ہے۔ بنگلور سے سری نگر تک بڑا لمبا سفر تھا۔ عالمگیر کو چار دن لگ گئے۔ چوتھے دن رات کو وہ بنگلور واپس پہنچا اور اس سے اگلے دن صبح ناشتے کے وقت ریسٹ ہاؤس میں ہمارے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے کہ نور بانو خیریت سے گھر پہنچ گئی۔ راستے میں کسی قسم کی پریشانی والی بات نہیں ہوئی۔ اس کے سسرال والے تو خوشی سے کھل اٹھے۔

نور بانو اپنے سسر اور ساس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا کہ وہ اپنے گھر خیریت سے پہنچا دی گئی۔ اب تم بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ یہ تو تم بتا چکے ہو کہ تم مرہٹہ کرنل سے اس بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ اس معاملے میں میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن کرنل واڈیکر ہیڈ کواٹر میں بیٹھا ہے۔ یہ بڑا شہر ہے۔ فوجی کی چھاؤنی بھی ہے۔ تم لوگوں کے راستے میں کئی مشکلات اور رکاوٹیں پیدا ہو سکتیں ہیں۔"

شیر باز خان نے کہا۔

"ہم نے تمام مشکلات اور رکاوٹوں کو سامنے رکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم ہمیں صرف یہ پتہ کرا دو کہ کرنل واڈیکر کے روز کے معمولات کیا ہیں۔ وہ دن کے وقت کس وقت ملٹری ہیڈ کواٹر میں آتا ہے۔ اس کی رہائش کس جگہ پر ہے۔ شام کے وقت وہ تفریح کی غرض سے کہاں جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی بیوی لندن گئی ہوئی ہے۔ وہ اکیلا ہے اور تفریح وغیرہ کے لئے کسی نہ کسی کلب میں ضرور جاتا ہوگا۔ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اس کی رہائش گاہ پر گارڈز کی کیا پوزیشن ہے اور جب وہ گھر سے باہر نکلتا ہے تو کیا اس وقت بھی کوئی فوجی باڈی گارڈ اس کے ساتھ ہوتا ہے یا نہیں۔"

عالمگیر بڑے غور سے شیر باز کی باتیں سن رہا تھا۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ جب شیر باز خان نے اپنی بات ختم کی تو عالمگیر کھڑکی میں سے باہر کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر شیر باز خان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں جانتا ہوں آپ لوگ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ آپ میدان جنگ میں ہیں۔ آپ دشمن کی فوجی کارروائیوں کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے آپ کی سلامتی عزیز ہے اور میں آپ کو دشمن کی سازشوں اور اس کی طاقت کے بارے میں صحیح صورت حال بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

شیر باز خان نے کسی قدر اکتاہٹ سے کہا۔

"عالمگیر! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

دراصل شیر باز خان ایک ہنگامہ پسند کمانڈو تھا اور زیادہ گفتگو کرنے اور سننے کا عادی نہیں تھا۔ عالمگیر بولا۔

"سر! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں انڈیا کی فوجی حکمت عملی اور اس کی طاقت کا مقابلہ آپ مقبوضہ کشمیر سے نہ کریں تو بہتر ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجی خوف زدہ حالت میں ہیں وہ ہر روز کشمیری حریت پسندوں کے ہاتھوں مر رہے ہیں لیکن یہاں انڈین فوج اپنی پوری نفی اور طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں کوئی بھی کمانڈو ایکشن کرتے وقت آپ کو اس پر ایک سو ایک مرتبہ سوچنا پڑے گا۔"

شیر باز خان نے فیصلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"عالمگیر بھائی! آپ ان باتوں کو بھول جائیں۔ مقبوضہ کشمیر میں انڈیا اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ کشمیریوں کو کچلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس میں اسے بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ہم کمانڈوز ہیں۔ ہمارا کام ہی دشمن کے مورچوں میں گھس کر اسے کے اسلحہ کے ذخیروں' گولہ بارود اور جنگی سازو سامان کو بھک سے اڑانا ہے۔ جب ہم دشمن کے مورچوں میں گھس جاتے ہیں تو یہ کبھی نہیں سوچتے کہ دشمن کمزور ہے یا طاقتور ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے صرف اللہ اور رسول کا نام اور اپنا مشن ہوتا ہے جس کے لئے ہم نے جان کی بازی لگائی ہوئی ہوتی ہے۔ تم صرف ہمیں وہ معلومات فراہم کر دو جس کا ذکر میں نے تم سے کیا ہے۔ باقی ہم جانیں ہمارا کام۔ اتنا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم میں سے اگر کوئی بھی دشمن کے ہاتھوں پکڑا گیا تو ہم موت کو خوشی سے گلے لگا لیں گے لیکن تمہارا نام زبان پر نہیں آئے گا۔ اس کے بعد اس موضوع پر کوئی بات کرنا بیکار ہے۔"

"او کے. سر۔" عالمگیر نے کہا۔ "یہ ساری معلومات آپ کو پرسوں اسی

وقت مل جائیں گی۔"

اس کے بعد عالمگیر نے ہم سے پوچھا کہ ہمیں وہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ شیر باز نے کہا۔

"عالمگیر بھائی! ایک سچا کمانڈو تکلیف میں بھی خوش رہنا جانتا ہے۔ ویسے بھی یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

عالمگیر تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اپنی جیپ میں بیٹھ کر ایک دن بعد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ دوسرا دن بھی گذر گیا۔ تیسرے روز عالمگیر دن کے گیارہ بجے آیا۔ وہ حسب معمول اکیلا تھا۔ اس نے جیپ ریسٹ ہاؤس کے سامنے درختوں میں کھڑی کی اور ہمارے پاس آگیا۔ کہنے لگا۔

"آج میں بھی تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

پھر اس نے عثمان بابا کو آواز دے کر کہا کہ وہ جنگل سے تین چار مرغیاں شکار کر کے لے آئے۔ عثمان بابا نے آواز دے کر جواب دیا کہ وہ پہلے ہی تین مرغیاں شکار کر کے لا چکا ہے۔ عالمگیر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"بہت خوب پھر انہیں خوب بھون کر تیار کرنا مجھے یہاں رہ کر تیز مصالحوں کی عادت پڑ گئی ہے۔"

ہم برآمدے میں بیٹھے تھے۔ عثمان بابا کچن میں تھا۔ چونکہ کٹائی کا سیزن شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے درختوں کے نیچے کوئی مزدور بھی نہیں تھا۔ ہم تینوں ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں تنہا تھے۔ شیر باز نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"عالمگیر بھائی! مجھے امید ہے تم ضرور ساری باتیں معلوم کر کے آئے ہو گے۔"

عالمگیر مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عالمگیر کسی مہم پر نکلے اور پھر ناکام واپس

آئے۔"

اس کے بعد عالمگیر نے ہمیں بتایا کہ کرنل واڈیکر صبح نو بجے اپنی فوجی جیپ میں بیٹھ کر ہیڈ کوارٹر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ دو فوجی گارڈ ہوتے ہیں جو جیپ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ واڈیکر خود جیپ چلاتا ہے۔ وہ ایک بجے ملٹری ہیڈ کوارٹر کے میس میں ہی دوپہر کا کھانا کھاتا ہے اور وہیں تھوڑی دیر آرام کرتا ہے اور پھر ٹھیک پانچ بجے ہیڈ کوارٹر سے نکل آتا ہے۔ اگر کوئی ضروری میٹنگ ہو تو وہیں رہ جاتا ہے۔ ہیڈ کوارٹر سے وہ سب سے پہلے اپنے بنگلے پر آتا ہے۔ جو بنگلور چھاؤنی میں ہے۔ اگر شام کو اس کے دوست وغیرہ آ جائیں تو بنگلے پر ہی شراب و کباب کی محفل گرم ہو جاتی ہے۔ اگر دوست وغیرہ نہ آئیں تو وہ اولڈ ہاؤس کلب میں چلا جاتا ہے۔ جہاں آدھی رات کو تھوڑی تھوڑی شراب پیتا اور تاش اور بلیئرڈ وغیرہ سے دل بہلاتا رہتا ہے۔ شیر باز نے پوچھا۔

"کیا اس کی کوئی عورت دوست نہیں ہے؟"

عالمگیر بولا۔

"میں اسی طرف آ رہا تھا۔ کرنل واڈیکر کی ایک عورت سے بڑی دیرینہ دوستی ہے۔ یہ عورت کرسچین ہے اور بیوہ ہے۔ اپنی بوڑھی ماں کے پاس رہتی ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ گھر میں ایک مرد ملازم ہے جو ادھیڑ عمر ہے۔ وہ بھی کرسچین ہے۔ وہ کھانا وغیرہ بھی پکاتا ہے اور رات کو چوکیداری بھی کرتا ہے۔ کرسچین بیوہ عورت کی عمر پینتیس سال کی ہے مگر جسم بڑا دلکش ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ اس کے خاوند نے دو ایک مکان چھوڑے تھے اس کے نام۔ جس کے ماہانہ کرائے پر ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ کرنل واڈیکر نے بھی اس کا مہینہ لگا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کرنل واڈیکر کی شہر میں اور کوئی سوشل لائف نہیں ہے۔ وہ اور کہیں نہیں جاتا۔"

شیر باز نے عالمگیر سے پوچھا۔

"اس کرسچین عورت کا نام کیا ہے اور کرنل واڈیکر اس کے ہاں کس روز اور کس وقت جاتا ہے۔"

عالمگیر نے کہا۔

"ہفتے کی رات کو تو وہ اس کرسچین عورت کے ہاں ضرور جاتا ہے اور کبھی کبھی رات بھی وہیں گذارتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی شام کو چلا جائے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس عورت کا نام میڈم سوزی ہے۔"

شیر باز بولا۔

"عالمگیر بھائی! کیا تمہارا آدمی ہمیں میڈم سوزی کا گھر دکھا سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں! میں واپس جا کر اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں ساتھ لے جا کر مکان دکھا دے گا۔"

"یہ آدمی بھروسے کا ہے کیا؟"

"بالکل میرا خاص آدمی ہے اور کشمیر کا ہی رہنے والا ہے۔ میرے ساتھ ہی بنگلور آیا تھا۔ ویسے تم احتیاطاً" اس سے سامنے زیادہ بات نہ کرنا۔"

عالمگیر چلا گیا۔ تیسرے پہر ایک کھلے رنگ والا تیس بتیس سال کا دراز قد کشمیری آیا۔ یہ عالمگیر کا کشمیری ملازم تھا اور عالمگیر کا خاص بھروسے کا آدمی تھا۔ اس نے آ کر ہمیں سلام کیا اور کہنے لگا۔

"سر! مجھے عالمگیر صاحب نے بھیجا ہے کہ آپ کو میڈم کا گھر دکھا لاؤں۔"

شیر باز نے کہا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"عبداللہ سر۔"

"ٹھیک ہے عبداللہ! تم برآمدے میں تھوڑی دیر بیٹھو ہم ابھی چلتے ہیں۔ تم کیسے آئے ہو؟"

عبداللہ بولا۔

"سر میں بس میں بیٹھ کر آیا ہوں۔ بس سیدھی آتی ہے۔ یہاں سے بھی ہم ایک بس ہی میں جائیں گے جہاں میڈم سوزی کا مکان ہے اس کے بالکل سامنے بس سٹاپ ہے۔"

شیر باز نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔"

ہم ڈرائنگ روم میں آ کر تیار ہونے لگا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"یہ آدمی ٹھیک ہی ناں؟"

شیر باز بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عالمگیر بالکل ٹھیک آدمی ہے اور یہ اس کا خاص بندہ ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی ٹھیک ہوگا۔ ویسے اس کے آگے ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔"

ہم نے پتلون بش شرٹ وغیرہ پہنی اور عبداللہ کے ساتھ ریسٹ ہاؤس سے چل پڑے۔ اس روز بنگلور کا موسم عجیب و غریب تھا۔ آسمان پر کبھی بادل آ جاتے اور کبھی دھوپ نکل آتی تھی۔ حبس اس لئے نہیں تھا کہ ہوا چل رہی تھی۔ بنگلور شہر کے بازار کشادہ اور بارونق تھے۔ فٹ پاتھوں پر درخت تھے۔ ان میں کہیں کہیں صندل کے درخت بھی تھے۔ ایسے بازاروں میں صندل کی خوشبو پھیلی رہتی تھی۔ اونچی اونچی ماڈرن بلڈنگیں تھیں۔ خوبصورت سینما گھر تھے۔ وہ سب کچھ ہی تھا جو کسی بڑے اور ماڈرن شہر میں ہوتا ہے۔ جنگل کے ریسٹ ہاؤس سے نکل کر ہم ایک چھوٹی سی سڑک پر پڑے گئے تھے۔ جس نے ہمیں ایک چوراہے پر پہنچا دیا۔ یہاں سے ہمیں شہر جانے والی بس مل گئی۔ شہر کے بس شاپ پر اتر کر عبداللہ ہمیں دوسرے بس سٹاپ پر لے گیا۔ کہنے لگا۔

"میڈم سوزی کے گھر کی طرف یہاں سے بس جاتی ہے۔"

بنگلور کی بسیں بمبئی کی بسوں کی طرح تھیں۔ دو منزلہ بسیں بھی اہم
تک چل رہی تھیں۔ ایک بس آئی۔ عبداللہ نے اس کا نمبر دیکھا اور کہا۔
"یہی بس ہے۔"
ہم بس میں سوار ہو گئے۔ میں نے عبداللہ سے خاص طور پر کہا۔
"ہمیں میڈم سوزی کے گھر سے ایک سٹاپ پیچھے اترنا ہے۔ یاد رکھنا۔
عبداللہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے سر۔"
بس بنگلور شہر کے مختلف بازاروں میں سے ہوتی ہوئی ایک بڑے خو
نما جدید قسم کے باغ کے قریب سے گذری جس کے اندر پارک بھی تھے ا
ایک جھیل بھی تھی۔ جھیل میں کشتیاں اور موٹر بوٹ چل رہی تھیں۔ بس
کے زیادہ آباد علاقے سے باہر آکر ایک سڑک پر مڑ گئی۔ جس کی دونوں جا
اونچے اونچے درخت تھے۔ ان درختوں میں ناریل کے درخت بھی تھے۔ عبد
نے آہستہ سے میرے طرف جھک کر کہا۔
"سر! ہم تیسرے بس سٹاپ پر اتریں گے۔"
دو سٹاپ چھوڑ کر ہم تیسرے بس سٹاپ پر اتر گئے۔ سڑک پر ٹریفک
ہونے کے برابر تھی۔ ہم تینوں فٹ پاتھ پر سامنے کی جانب چلے جا رہے ت
دونوں جانب پرانی قسم کے کوارٹرز تھے۔ جن کے برآمدوں کے چھجوں پر بوگن
کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے صحن تھے جن میں ناریل اور
نیم کے درخت اگے ہوئے تھے۔ عبداللہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ اس
جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔
"میری دائیں جانب دوسرا کوارٹر میڈم سوزی کا ہے۔"
میں نے اور شیر باز نے تین چار قدم آگے جو کوارٹر تھا اس کو غور
دیکھا۔ کوارٹر میں داخل ہونے کے لئے لکڑی کا ایک تین فٹ اونچا پرانا گیٹ

بند تھا۔ ہم آگے بڑھے۔ میں نے کوارٹر کے سامنے سے گذرتے ہوئے اس کا
رپور جائزہ لیا۔ شیر باز نے بھی اسے نظر بھر کر دیکھا اور ہم آگے نکل گئے۔
گلے بس سٹاپ پر جاکر ہم بینچ پر بیٹھ گئے۔ عبداللہ نے کہا۔

"سر! اگر آپ کہیں تو میں ایک بار پھر آپ کو دکھا دیتا ہوں۔"

شیر باز نے کہا۔

"نہیں عبداللہ! اب دوسری بار دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے
کچھ دیکھنا تھا۔ دیکھ لیا ہے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔"

عبداللہ نے پوچھا۔

"سر! واپس ریسٹ ہاؤس جائیں گے یا۔"

شیر باز نے کہا۔

"ریسٹ ہاؤس نہیں ہم اس وقت عالمگیر صاحب کے مکان پر جائیں
ے۔"

عبداللہ بولا۔

"او کے سر! اگلے چوک میں سے ایک بس عالمگیر صاحب کے مکان کے
ک کی طرف جاتی ہے۔"

ہم عالمگیر کے پاس پہنچ گئے۔ عبداللہ چلا گیا تو عالمگیر نے پوچھا۔

"میڈم کا مکان دیکھ لیا؟"

شیر باز نے کہا۔

"ہاں دیکھ لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ جس سڑک پر میڈم کا مکان ہے اس کا نام
ہے اور اس سے پیچھے جو چوک ہے اس کا نام کیا ہے؟"

عالمگیر نے ہمیں دونوں نام بتا دیئے۔ تیسرا پہر ہوگیا تھا۔ عالمگیر ہمارے
ے چائے بنوا کر لے آیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ عالمگیر نے شیر باز سے کہا۔

"تم نے کیا حکمت عملی سوچی ہے۔"

شیر باز نے کہا۔

"ابھی حتمی طور پر کسی حکمت عملی کا فیصلہ نہیں کیا۔ بس وہ جگہیں دیکھ رہے ہیں جہاں جہاں ہم کمانڈو اٹیک کر سکتے ہیں۔"

کچھ دیر ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے' بعد میں معلوم ہوا کہ کمانڈو شیر باز میڈم سوزی کے ہاں کرنل واڈیکر کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام طے کر چکا تھا مگر اس نے ایک ذمے دار کمانڈو کی ہوش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دل کا راز اور کمانڈو آپریشن کی سکیم عالمگیر سے بھی پوشیدہ رکھی تھی۔ شیر باز نے عالمگیر سے کہا۔

"عالمگیر بھائی! اس مشن کے لئے ہمیں ایک گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔ گاڑی بے شک پرانی ہو مگر اس کا انجن بالکل درست حالت میں ہو اور وقت پر دھوکا نہ دے جائے۔"

عالمگیر کہنے لگا۔

"یہ کام ذرا مشکل ہے۔ اس میں کچھ دیر لگ جائے گی۔ کیونکہ تمہیں ایسی گاڑی ملنی چاہئے جس کی نمبر پلیٹ بنگلور شہر کی نہ ہو۔ اس کی رجسٹریشن کی دوسرے شہر کی ہونی چاہئے۔"

شیر باز نے کہا۔

"یہ بڑا لمبا کام ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ ہم گاڑی کے بغیر ہی کام چلا لیں گے۔ تم ایسا کرو کہ ہمیں جو اسلحہ درکار ہے۔ وہ ہمیں کسی طرح پیدا کر دو۔"

"مجھے بتاؤ تمہیں کیا کیا چاہئے؟"

کمانڈو شیر باز نے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"ہمیں اس مشن کے لئے شارٹ گنوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کی بجائے دو سائیلنسر والے آٹو میٹک پستول مل جائیں تو بہت ہی اچھا ہے۔"

عالمگیر بولا۔

"مل جائیں گے۔ آخر ہم یہاں کس لئے بیٹھے ہیں۔ تم لوگ جو کہو گے میں کہیں نہ کہیں سے پیدا کر دوں گا۔ بتاؤ اور کیا کیا چاہئے۔"

کمانڈو شیر باز کے ذہن میں ساری سکیم' سارا منصوبہ تیار ہو چکا تھا جس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں جانتا تھا۔ سارا منصوبہ اس نے مجھے بعد میں بتایا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے میڈم سوزی کے گھر کا ٹیلی فون نمبر بھی چاہئے۔"

عالمگیر نے کہا۔

"وہ بھی مل جائے گا اور کچھ؟"

کمانڈو شیر باز نے عالمگیر کے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کا کش لگا کر دھواں باہر چھوڑتے ہوئے بولا۔

"ابھی ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد کسی دوسری چیز کی ضرورت پڑی تو میں تمہیں بتا دوں گا۔"

عالمگیر بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ یہ دونوں چیزیں تمہیں کام شام تک ریسٹ ہاؤس میں پہنچ جائیں گی۔"

"میرے بھائی میں نے پہلی بار تمہیں سگریٹ پیتے دیکھا ہے۔"

شیر باز ہنس کر بولا۔

"کمانڈو ہر کام کر لیتا ہے مگر کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔"

شام کو ہمیں عالمگیر کا ڈرائیور جیپ میں جنگل والے ریسٹ ہاؤس چھوڑ گیا۔ رات کو ہم کھانا کھانے کے بعد برآمدے میں بیٹھ گئے۔ تب شیر باز نے بتایا کہ وہ میڈم سوزی کے فرنٹ پر کرنل واڈیکر پر اٹیک کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔

"یہاں ہمیں زیادہ سے زیادہ کرنل واڈیکر کے ایک یا دو فوجی باڈی گارڈز کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمیں یہاں زیادہ آسانی ہوگی۔ اگر کرنل کا میڈم سوزی کے ساتھ عشق معاشقہ نہ چل رہا ہوتا تو ہمیں کوئی دوسری سکیم تیار کرنی پڑتی۔"

میں نے شیر باز سے پوچھا۔

"کیا ہم میڈم سوزی کے گھر پر کرنل واڈیکر کو نشانہ بنائیں گے؟"

شیر باز خان کہنے لگا۔

"ابھی پوری سکیم میرے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ کل اس پر دونوں غور کریں گے۔ ہمیں ایک باقاعدہ پلان تیار کرنا ہوگا۔ پہلے میڈم سوزی کے گھر کے ماحول کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنا ہوگا کہ کرنل واڈیکر جب میڈم کے مکان پر آتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی باڈی گارڈ ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ ساری معلومات ہمیں پہلے فراہم کرنی پڑیں گی اور یہ ہم خود ہی فراہم کریں گے۔ اس کے بعد ان معلومات کی روشنی میں ہم کمانڈو آپریشن کا پلان تیار کریں گے۔"

اس وقت مجھے اپنا دوست سانپ بہت یاد آیا۔ اگر اس وقت وہ میرے پاس ہوتا تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ کرنل واڈیکر سے کشمیر کی بیٹی کی بے عزتی کا بدلہ لے سکتے تھے مگر میرا دوست سانپ مجھ سے جدا ہو چکا تھا۔ خدا جانے وہ مر چکا تھا یا اگر زندہ تھا تو کہاں تھا۔ بہرحال میں اس کی مدد سے بے نیاز ہو گیا ہوا تھا۔ اب ہمیں اپنے زور بازو اور اپنی عقل پر اور اپنے اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے سب کچھ کرنا تھا۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ کرنل واڈیکر ہفتے کی رات کو میڈم سوزی کے ہاں ضرور جاتا ہے۔ ہمیں ہفتے کا انتظار تھا۔ ہفتے کے دن میں دو دن باقی تھے۔ یہ دو دن ہم نے اپنا منصوبہ تیار کرنے میں گذارے۔ عالمگیر نے ہمیں دو آٹو میٹک پستول لا کر دے دیئے تھے۔ ان پستولوں کے آگے بھی سائیلنسر کی نالیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہفتے کی شام کو میں اور کمانڈو شیر باز خان میڈم سوزی کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ موسم ٹھیک تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ ہم بس میں سوار ہو کر میڈم سوزی کی کوٹھی والی سڑک کے سٹاپ پر اتر گئے۔ ابھی شام کا وقت تھا۔ ہم سڑک پر سے اتر کر ایک کچے راستے پر آ گئے جو ان کوٹھیوں کے عقب سے گذرتا تھا۔ یہاں بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔

ہمیں میڈم سوزی کی کوٹھی کا علم تھا۔ اس کی کوٹھی کے پیچھے سے گذرتے ہوئے ہم نے پورا جائزہ لیا۔ کوٹھی کے پچھواڑے سات آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ جو جنگلی بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اندر کی جانب ناریل کے تین درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ جن کی مور چھل ایسی شاخیں دیوار کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ اس طرف کوٹھی کا کوئی چھوٹا دروازہ بھی نہیں تھا۔ ہم آگے نکل گئے۔ سڑک کے آخری سرے پر چائے کی دکان تھی۔ جس کے باہر کچھ گاہک کرسیوں پر اور بینچ پر بیٹھے چائے کافی پی رہے تھے۔ دکان کے اندر تامل اور تیلگو فلمی گانوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک طرف ہو کر خالی

بینچ پر بیٹھ گئے۔ چائے کے گلاس منگوائے اور چائے پینے لگے۔ شیر باز نے کہا۔

"میڈم کی کوٹھی کا پچھلا دروازہ نہیں ہے۔ سات فٹ اونچی دیوار ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں ایمرجنسی کی صورت میں ہمیں یہ دیوار پھاندنی ہوگی۔"

"جلدی میں اتنی اونچی دیوار پھاندنے میں مشکل پیش آ سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن اندر کی جانب ناریل کے تین درخت بھی ہیں۔ ہم ان درختوں کی مدد سے دیوار پر چڑھ سکتے ہیں۔"

شیر باز نے کہا۔

"ہوں ایسا ہو سکتا ہے۔"

ہم خاموشی سے چائے پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اپنی اپنی گھڑی پر نگاہ ڈال لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد رات کا اندھیرا گہرا ہوگیا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں دکان کے سامنے والے حصے کی طرف چلے چلنا چاہئے۔"

شیر باز خان نے ملازم لڑکے کو چائے کے پیسے دیئے اور ہم دونوں اٹھ کر پچھواڑے والی کچی سڑک پر واپس چلنے کے بعد سامنے والی سڑک پر نکل آئے۔ یہ کوٹھیاں ہمارے لاہور یا کراچی شہر کی کوٹھیوں کی طرح نہیں تھیں۔ پرانی پتھریلی دیواروں والی بیرک نما کوٹھیاں تھیں۔ جن کی ڈھلوان چھتوں پر کھپریلیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ کئی چھتوں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہاں زیادہ تر عیسائی لوگ رہتے تھے۔ یہ بات ہمیں کوٹھیوں کے باہر نیم پلیٹیں پڑھ کر معلوم ہوئی۔ میڈم سوزی کی کوٹھی کے سامنے سڑک پار درختوں کی قطار سڑک کے آخری کنارے تک چلی گئی تھی۔ ہم ان درختوں کے پیچھے گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہم

اس طرح بیٹھے تھے جیسے کھلی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیٹھ گئے ہوں۔ ہم اس زاویے پر بیٹھے تھے کہ میڈم سوزی کی کوٹھی کا مین گیٹ ہمیں صاف نظر آتا تھا مگر سڑک پر سے گذرنے والے ہمیں پوری طرح سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں وہاں بیٹھے آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ کرنل واڈیکر کی گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ آج نہ آئے۔"

وہ کہنے لگا۔

"لیکن ہمیں ہر حالت میں اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

مزید پندرہ منٹ گذر گئے۔ سڑک پر درختوں کے نیچے جہاں ہم بیٹھے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ سڑک کی روشنی وہاں نہیں آتی تھی۔ سڑک پر سے پندرہ پندرہ منٹ کے وقفے سے بسیں گذر جاتی تھیں۔ ہمیں دور سے گاڑی کی آواز آئی۔ پھر ایک سیاہ رنگ کی انڈیا کی بنی ہوئی چھوٹی گاڑی میڈم کی کوٹھی کے گیٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کرنل واڈیکر کو دیکھا ہوا تھا۔ کمانڈو شیر باز نے بھی اسے دیکھا ہوا تھا۔ گاڑی میں سے دو فوجی وردی والے سپاہی باہر نکلے۔ ایک نے کوٹھی کا لکڑی کا گیٹ کھول دیا۔ دوسرا گاڑی کے پاس ہی کھڑا رہا۔ ان کے پاس کوئی گن وغیرہ نہیں تھی لیکن ان کی جیبوں میں پستول ضرور تھے۔

گاڑی میڈم سوزی کی کوٹھی کے چھوٹے سے صحن میں داخل ہو کر رک گئی۔ درمیانے قد کا ایک آدمی باہر نکلا۔ وہاں کوٹھی کے برآمدے کے اوپر جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی میں ہم نے کرنل واڈیکر کو پہچان لیا۔ شیر باز نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کرنل واڈیکر ہی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے بھی اسے پہچان لیا ہے۔"

کرنل واڈیکر کوٹھی کے برآمدے میں سے گذر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے دونوں باڈی گارڈ برآمدے کے باہر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑے چاق و چوبند ہو کر کھڑے تھے۔ شیر باز کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کرنل اپنے ساتھ دو باڈی گارڈ لے کر یہاں آتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے اب ہمارا یہاں بیٹھے رہنا بیکار ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

ہم درختوں کے نیچے سے گذر کر سڑک کے بس سٹاپ پر آ گئے۔ بس میں سوار ہو کر بڑے چوک میں اتر گئے۔ وہاں سے پیدل ہی عالمگیر کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔ شیر باز نے عالمگیر کو بتایا کہ ہم نے میڈم کی کوٹھی میں کرنل واڈیکر کو آتے دیکھ لیا ہے اور اس کے ساتھ دو باڈی گارڈ تھے۔ عالمگیر کہنے لگا۔

"وہ ہمیشہ باڈی گارڈ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اسے ڈر لگا رہتا ہے کہ کشمیری حریت پسند اس سے نور بانو کا بدلہ لینے وہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔"

شیر باز خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ رات دس بجے عالمگیر کا ڈرائیور ہمیں جنگل والے ریسٹ ہاؤس پر چھوڑ گیا۔ میں نے شیر باز خان سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم اگلے ہفتے اٹیک کریں گے؟"

وہ بولا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ہفتے کی رات کو کرنل واڈیکر سوزی کے گھر ضرور آتا ہے۔"

میں نے کہا۔

ہمیں میڈم کی کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر اندر جانا ہوگا۔"

ا ہی کرنا ہوگا۔"

اس موضوع پر ہم پہلے بھی کافی سوچ بچار کر چکے تھے۔ دوسرا کوئی ن کار ... تھا کہ جس پر عمل کیا جاتا۔ میڈم سوزی کے مکان پر کرنل واڈیکر ہمارے لئے بڑا آسان ٹارگٹ تھا۔ ہمیں صرف اس کے دو باڈی گارڈز سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ اس میں یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی کہ دونوں باڈی گارڈ کوٹھی کے صدر دروازے والے صحن میں ہوتے تھے۔ کوٹھی کا عقبی حصہ محفوظ اور خالی تھا۔ ہم یہاں سے کوٹھی میں داخل ہو سکتے تھے۔ میڈم سوزی کا جو اکلوتا ملازم اور اس کی بوڑھی ماں تھی اس کو ہم آسانی سے گن پوائنٹ پر قابو کر سکتے تھے۔ ہمارے لئے ہفتہ گذارنا مشکل تھا۔ ہم بالکل تیار تھے۔ ٹارگٹ ہمارے سامنے تھا لیکن ہمیں سات دن انتظار کرنا تھا۔ یہ ہماری مجبوری تھی۔ عالمگیر ہمیں ملنے تقریباً" روز شام کو آجاتا تھا۔ اس نے ہمیں منع کر رکھا تھا کہ ہفتے کی رات کے سوا ہم بنگلور شہر کا بالکل رخ نہ کریں۔

لیکن ہم جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں چوتھے روز ہی تنگ آ گئے۔ کچھ ہم اس خیال سے قدرتی طور پر لاپروا سے ہو گئے تھے کہ یہ علاقہ مقبوضہ کشمیر کے علاقے سے بہت دور تھا اور یہاں ہمیں کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ کم از کم ہم اسی طرح سوچتے تھے جو کہ غلط بات تھی۔ ہمیں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے تھا۔ کیونکہ جب آدمی دشمن کے گھر میں بیٹھا ہو تو اسے کسی حالت میں بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہیۓ۔ چنانچہ ہم چوتھے روز خود ہی دوپہر کے بعد شہر کی طرف چل پڑے۔ شیر باز کا ارادہ کوئی انگریزی فلم دیکھنے کا تھا۔ میں بھی شہر میں پڑے پڑے بور ہو گیا تھا۔ سوچا فلم ہی دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک سینما ہاؤس آتے جاتے دیکھا ہوا تھا۔ ہم اسی سینما ہاؤس میں آ گئے۔ کوئی ایکشن فلم لگی ہوئی تھی۔ ہم نے گیلری کے ٹکٹ لئے اور سینما میں آکر بیٹھ گئے۔ فلم شروع ہو چکی

تھی۔ ہم نے بھنے ہوئے نمکین چنوں کے دو لفافے باہر سے خرید لئے تھے۔ چنے کھاتے رہے اور فلم دیکھتے رہے۔ انٹرول کے وقت میں اٹھ کر سینما ہاؤس کی لابی کے ساتھ باتھ روم میں گیا۔ باتھ روم سے باہر نکلا تو گیلری کی سیڑھیاں اترتی ہوئی ایک ساڑھی پوش نوجوان عورت مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے انگریزی میں اس سے معذرت کی۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے نکل گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ جیسے وہ جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ خاص ٹائپ کی عورت ہوگی۔ نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے یہ عورتیں اس قسم کے حربے استعمال کرتی ہیں۔

میں نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہ دی - اوپر گیلری میں آکر شیر باز ے پاس بیٹھ گیا اس کو یہ واقعہ بتایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہنس کر مجھ پر ایک دو فقرے چست کرے گا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ میں بھی الرٹ ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟"

کمانڈو شیر باز بولا۔

"ہمیں ابھی یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ آجاؤ۔"

ہم گیلری سے اتر کر لابی میں آئے تو شیر باز خان نے وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ میں خاموش تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ ہم سینما ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہو گئی ہے شیر باز خان؟"

ہم سینما ہاؤس کے گیٹ کے ایک طرف اندھیرے میں کھڑے تھے۔ وہ کہنے لگا۔

"مجھے لگتا ہے ہم سی آئی ڈی کی نظروں میں آ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

وہ بولا۔

"وہ عورت تم سے یونہی نہیں ٹکرائی تھی۔"

شیر باز خان کی یہ منطق میرے سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن بہرحال اس کے ساتھ مجھے بھی محتاط رہنا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایسی بات ہے تو عالمگیر کے ہاں چلے چلتے ہیں۔"

وہ کہنے لگا۔

"نہیں وہاں جانا مناسب نہیں - ہمیں یہاں سے واپس ریسٹ ہاؤس چلنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"اس طرح تو ہم بنگلور کی خفیہ پولیس والوں کو اپنا ٹھکانہ دکھا دیں گے۔ ظاہر ہے اگر تمہارا قیافہ درست ہے اور ہمارے پیچھے سیکریٹ پولیس کا کوئی آدمی لگ گیا ہے تو وہ ریسٹ ہاؤس تک ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔"

شیر باز بولا۔

"میں یہی چاہتا ہوں۔ یہاں ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن ریسٹ ہاؤس والے جنگل میں ہم اسے ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔"

کمانڈو شیر باز کا خیال مجھے بڑا درست محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔

"تو پھر ہمیں یہیں سے ٹیکسی پکڑنی چاہئے۔ خفیہ پولیس والا ہمارا تعاقب ضرور کرے گا۔"

اس نے کہا۔

"نہیں ہم یہاں سے موٹر رکشا لیں گے۔ اس طرح خفیہ پولیس والے کو ہمارا پیچھا کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی اور ہم اسے جنگل میں ٹھکانے لگا لیں گے۔"

ہم نے وہاں سے رکشا لے لیا۔ رکشا چلنے لگا تو شیر باز خان اور میں ہم دونوں باہر بازار کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے لگے۔ وہاں بظاہر ہمیں کوئی سیکریٹ سروس کا آدمی دکھائی نہ دیا۔ بڑے چوک میں آ کر ہم نے رکشا چھوڑ دیا اور ٹیکسی لے لی۔ ٹیکسی نے ہمیں ریسٹ ہاؤس پہنچا دیا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"تمہارا اندازہ غلط نکلا دوست۔ وہ عورت سی آئی ڈی والوں کی ایجنٹ نہیں تھی۔ ہمارے پیچھے کوئی سیکریٹ سروس کا آدمی ہمارا تعاقب کرتا یہاں تک نہیں آیا۔"

رات کو ہم جلدی سو گئے۔ میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر اور شیر باز بیڈ روم میں سویا۔ نہ جانے رات کتنی گذر چکی تھی کہ ایک کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں میں نے زیرو بلب والا ٹیبل لیمپ جلا رکھا تھا۔ میں نے نیند بھری آنکھوں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ کمرہ خالی تھا۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی شے نیچے لکڑی کے فرش پر گری ہو۔ میں نے خیال کیا کہ باہر برآمدے میں کوئی جنگلی بلی آ گئی ہو گی۔ رات کو کوئی نہ کوئی جنگلی بلی یا گیدڑ کچن اور برآمدے میں ضرور آ جاتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں وہی آواز پھر آئی۔ اب میں نے آواز کو پوری طرح سنا تھا۔

یہ آواز برآمدے سے نہیں بلکہ ریسٹ ہاؤس کے پیچھے سے آئی تھی۔ میں نے جلدی سے آٹومیٹک پستول سرہانے کے نیچے سے نکالا اور پچھلا دروازہ کھول کر ریسٹ ہاؤس کے عقبی برآمدے میں آگیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ہم لوگ اندھیرے میں اتنا ضرور دیکھ لیتے تھے کہ ہمیں پتہ چل جاتا تھا کہ آگے کیا ہے۔ اندھیرے میں درختوں کے جھرمٹ خاموش کھڑے تھے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ میں کچھ دیر بالکل ساکت ہو کر کھڑا چاروں طرف اندھیرے میں غور سے دیکھتا رہا۔ مجھے وہاں کوئی انسان یا جانور نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کوئی جنگلی بلی ہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں آ کر میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگائی اور صوفے پر لیٹ گیا۔ نیند غائب ہو گئی تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ میں کہاں سے کیا مشن لے کر چلا تھا اور کہاں آگیا ہوں۔ لاہور میں میرا بٹ صاحب اور ملک صاحب سے بھی ایک مدت سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔

ایک بات کی مجھے خوشی تھی کہ میں کشمیر کی جنگ آزادی میں برابر شریک تھا اور مجاہدین کے ساتھ مل کر اس زندہ تحریک کے لئے جتنا کچھ کر سکتا تھا کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیند نے میری آنکھیں بند کر دیں۔ صبح دیر تک سویا رہا۔ بیدار ہوا تو دن کے دس بج چکے تھے۔ شیر باز خان ابھی تک سو رہا تھا۔ عثمان بابا نے مجھے برآمدے میں بیٹھے دیکھا تو میرے لئے چائے لے آیا۔ کہنے لگا۔

"رات جب آپ لوگ سو گئے تھے تو ایک آدمی نے آ کر آپ کے

بارے میں پوچھا تھا۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔

"کون تھا وہ اس نے کیا پوچھا تھا؟"

عثمان بابا بولا۔

"کوئی مزدور قسم کا آدمی لگتا تھا جو جنگلوں میں ٹھیکیداروں کے ساتھ کٹائی کا کام کرتے ہیں۔ کہہ رہا تھا کہ مجھے کام کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میں تو ٹھیکیدار نہیں ہوں۔ اسے اگر پوچھنا تھا تو عالمگیر کا پوچھنا چاہئے تھا۔"

عثمان بابا نے کہا۔

"میں نے اس آدمی کو یہی کہہ کر بھیج دیا تھا کہ سیٹھ عالمگیر سے جا کر ملو۔ وہی تمہیں کام دے سکتا ہے اور وہ چلا گیا تھا۔"

اتنے میں شیر باز بھی منہ ہاتھ دھو کر وہاں آگیا۔ میں نے اسے ایک اجنبی کے رات کو آنے کے بارے میں بتایا تو اس کا چہرہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

"اسے کس نے بتایا کہ ہم لوگ یہاں پر ہیں اور ہم اسے کام دلا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ یہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ کیونکہ عثمان بابا نے بتایا ہے کہ وہ ہمارے بارے میں بھی کرید رہا تھا۔"

کمانڈو شیر باز نے ہاتھ کو آہستہ سے جھٹک کر کہا۔

"دیکھا جائے گا۔"

عثمان بابا اس کے لئے چائے لے کر آیا تو کمانڈو شیر باز نے اسے کہا۔

"عثمان بابا! اگر اب کوئی آدمی آ کر ہمارا پوچھے تو اسے اپنے پاس بٹھانا
ار ہم اگر سو بھی رہے ہوں تو آ کر جگا دینا۔ سمجھ گئے ناں۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

دوپہر کے تین بجے عالمگیر بھائی آ گیا۔ ہم نے اسے یہ بات بتائی تو وہ کچھ
وچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے تم لوگوں کو جگہ بدل دینی چاہئے۔ شام کو میرا ڈرائیور
آ کر تمہیں اس جنگل میں دوسری جگہ لے جائے گا۔ وہ شہر کی حدود کے قریب
ی ہے اور یہاں سے زیادہ محفوظ ہے۔"

ہم نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ شیر باز نے تب اسے بتا دیا کہ ہمارا ارادہ
س ہفتے کی رات کو کرنل واڈیکر پر حملہ کرنے کا ہے۔ اب اسے بتا دینا ضروری
و گیا تھا۔ وہ بولا۔

"ہفتہ تو پرسوں ہے۔ اس لحاظ سے تو تمہیں یہ جگہ ضرور بدل لینی
ہئے مگر تم یہ کام سوچ سمجھ کر کرنا اور اگر تم نے اس حملے میں کرنل واڈیکر کو
ک کر دیا تو نہ میرے پاس آنا' نہ اس ریسٹ ہاؤس کا رخ کرنا۔ میں تمہیں
س نئی جگہ پر بھجوا رہا ہوں وہیں چھپے رہنا۔ میں خود صورت حال کا جائزہ لینے
ے بعد تم سے وہیں آ کر مل لوں گا۔"

ہمارے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی کر عالمگیر چلا گیا۔ شام ابھی پوری
رح نہیں چھائی تھی کہ عالمگیر کا خاص ڈرائیور جیپ لے کر آ گیا۔ ہم نے اپنا
یلا جس میں ہماری ضروری چیزیں اور کچھ کپڑے تھے۔ جی جیپ میں ڈالے اور
ئے ٹھکانے کی طرف چل دیئے یہ نئی جگہ اسی جنگل میں ریسٹ ہاؤس سے شہر کی
نب کوئی تین میل آگے ایک ٹیلے کے دامن میں تھی۔ لگتا تھا کہ کبھی وہاں
ڑی کا کوئلہ بنانے کا بھٹہ ہوا کرتا تھا۔ زمین کے اندر دو تین بھٹیوں کے آثار
ی رہ گئے تھے۔ یہاں کیکر اور نیم کے درختوں کے پیچھے پتھروں کی دیواروں اور

چھپریل کی چھت والا ایک کیبن بنا ہوا تھا۔ جو ویران پڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایک باورچی خانہ تھا۔ ڈرائیور کہنے لگا۔

"سر! میں صبح کھانے پینے کا سارا راشن لے کر آ جاؤں گا۔ پیچھے ایک ندی بہتی ہے۔ اس کا پانی میٹھا ہے۔ آپ اسے پی سکتے ہیں۔"

کیبن میں ایک ہی کمرہ تھا۔ فرش لکڑی کا تھا۔ جو شکستہ ہو رہا تھا۔ بانس کی دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر مچھر دانیاں لگانے والے ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ لوہے کی دو کرسیاں کیبن کا جو چھوٹا سا برآمدہ تھا وہاں پڑی تھیں۔

میں نے شیر باز سے کہا۔

"یہاں ریسٹ ہاؤس والا آرام تو نہیں ہے۔ لیکن ہم محفوظ ہو جائیں گے۔"

ڈرائیور ہمارے لئے بریانی کے دو پارسل اور بوتل میں گرم چائے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس علاقے میں بریانی کے پیکٹ کو جو ہوٹل والے پیک کر کے دیتے ہیں۔ پارسل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہم نے رات کو کیبن میں لالٹین روشن کر دی۔ ڈرائیور چلا گیا تھا۔ ہم برآمدے میں لوہے کی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ کیبن کا دروازہ ہم نے بند کر رکھا تھا تاکہ اندر جلتی ہوئی لالٹین کی روشنی ہم پر نہ پڑے۔ یہاں بھی ریسٹ ہاؤس والی خاموشی تھی۔ کسی کسی درخت پر کسی کسی پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ عالمگیر کے ڈرائیور نے کہا تھا کہ وہاں سے شہر صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر ہم شہر جانا چاہیں تو کس طرف سے جانا ہوگا اور کس جگہ ہمیں عالمگیر کے گھر کے سامنے سے گذرنے والی بس ملے گی۔ اگرچہ اب ہمیں عالمگیر کے گھر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے روز جمعہ تھا۔ اس سے اگلے روز ہفتے کا دن تھا اور ہفتے کی رات کو ہم نے کرنل واڈیکر سے انتقام لینا تھا۔

عالمگیر نے ہمیں خاص طور ہدایت کی تھی کہ حملے کے بعد جو بھی

صورت حال بنے ہم اس کے مکان پر ہرگز نہ آئیں۔ دوسرے ہفتے کا دن
تیاریوں ریہرسل میں گذر گیا۔ ہم نے اپنے کمانڈو آپریشن کی ایک ایک تفصیل
طے کر لی تھی اور کئی بار ریہرسل بھی کر چکے تھے۔ ہم نے کرنل واڈیکر پر کس
طرح حملہ کرنا تھا؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس ایکشن کو آپ آگے چل
کر خود ہی پڑھ لیں گے۔ اس مشن میں کامیابی کا پچاس فیصد امکان تھا۔ بہت
ممکن تھا کہ ہم میڈم سوزی کی کوٹھی میں گھس کر عین اس وقت کرنل واڈیکر کو
موت کے گھاٹ اتار دیں جب وہ رنگ رلیاں منا رہا ہو اور ایسا بھی ممکن ہے کہ
کرنل واڈیکر عین وقت پر ہوشیار ہو جائے اور باڈی گارڈز کو آواز دے دے
اور باڈی گارڈز اندر آتے ہی ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں کیونکہ آخر وہ
بھارت کی ریگولر آرمی کا کمیشنڈ آفیسر تھا۔ کوئی اناڑی آدمی نہیں تھا۔ عالمگیر کی
رپورٹ کے مطابق وہ شراب بھی زیادہ نہیں پیتا تھا کہ ہم اسے مدہوشی میں
دبوچ لیں۔ رپورٹ کے مطابق وہ دو تین پیگ سے زیادہ نہیں پیتا تھا اور ایک
پرانے شرابی کے لئے دو تین پیگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ پوری طرح
ہوش میں ہوتا ہے۔

یہ تمام خدشے اور امکانات اور تفصیلات ہمارے سامنے تھیں اور ہم
ان کی روشنی میں آگے بڑھنا چاہتے تھے بلکہ بڑھ رہے تھے۔ شام کے وقت ہم
نے اپنے آٹو میٹک پستول کھول کر صاف کئے۔ ان کو اچھی طرح سے چیک کیا۔ دو
دو میگزین الگ جیب میں رکھ لئے۔ ہمیں ہینڈ گرنیڈوں کی ضرورت نہیں تھی۔
البتہ ہم نے ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو ضرور رکھ لیا تھا۔ ہم عام قسم کی سوتی بش
شرٹوں اور ٹھنڈی پتلونوں میں ہی تھے۔ ہمارا کوئی کمانڈوز والا لباس نہیں تھا۔
اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ یہ کوئی پیچیدہ اور بڑا کمانڈو آپریشن نہیں
تھا۔ ایک کوٹھی میں گھس کر ایک آدمی کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ صرف اتنی
احتیاط کرنی تھی کہ ہم وہاں سے بچ کر نکل آئیں۔

شام کا اندھیرا ہوتے ہی ہم اپنے نئے ٹھکانے سے نکل پڑے۔ عالمگیر کے ڈرائیور نے ہمیں جو راستہ بتایا تھا اسی راستے سے گذر کر ہم بڑی جلدی بنگلور شہر کی باہر کی آبادیوں میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے ایک بس پکڑی اور شہر کے اس علاقے میں آ کر بس سٹاپ پر اتر گئے۔ جہاں سے میڈم سوزی کی کوٹھی تک بمشکل پانچ منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ ہم ان سڑکوں سے واقف ہو گئے تھے۔ چوک میں ایک سڑک میں اندر جا کر ایک سینما گھر تھا۔ جس میں تامل اور تلیگو فلمیں چلتی تھیں۔ ہم نے پروگرام بنا رکھا تھا کہ اس سینما ہاؤس میں رات کا پہلا حصہ گذاریں گے۔ چنانچہ سینما ہاؤس کے ہال میں ٹکٹ لے کر بیٹھ گئے۔ بڑا گنجان اور گندا سینما ہال تھا۔ اگرچہ ہم فسٹ کلاس میں بیٹھے تھے مگر کرسیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں تو وقت گذارنا تھا۔ فلم تلیگو زبان میں تھی جس کے مکالمے ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہے تھے۔ ہم بس فلم کے سین اور ڈانس شوق سے دیکھتے رہے۔ ہمارے پاس بھرے ہوئے آٹو میٹک پستول اور بڑے چاقو تھے۔ خطرہ تھا کہ کوئی پولیس والا محض شک کی بناء پر ہماری تلاشی نہ لے لے۔ ہمیں یہ شبہ بھی پڑ چکا تھا کہ شاید بنگلور کی خفیہ پولیس ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم بڑے چوکس ہو کر بیٹھے تھے۔ فلم بھی دیکھ رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد سینما ہال میں نظریں گھما کر جائزہ بھی لے لیتے تھے۔ ہمیں ہر شے نارمل لگ رہی تھی۔

سینما ہال میں کوئی پولیس کا سپاہی نہیں تھا۔ ہم نے سینما ہاؤس میں داخل ہوتے وقت یہ بھی تسلی کر لی تھی کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ فلم ختم ہوئی تو ہم وہاں سے نکل آئے۔ دوسرے بازار میں آ کر ہم ایک چائے کی دکان میں بیٹھ گئے۔ وہاں کافی بھی ملتی تھی۔ ہم نے کافی منگوا لی۔ ہم دراصل مزید کچھ وقت گذارنا چاہتے تھے تاکہ میڈم سوزی کے ہاں رات گہری ہو گئی ہو تو پہنچیں۔ ہمیں یقین تھا کہ ہفتے کی رات ہے' کرنل واڈیکر وہاں ضرور آیا ہو گا۔ ہم نے

اسی امید پر سارا منصوبہ بنایا تھا۔ جب رات کے ساڑھے دس بج گئے تو ہم چائے کی دکان سے نکل کر پیدل ہی میڈم سوزی کی کوٹھی کی طرف چل پڑے۔ میڈم سوزی کی کوٹھی والی سڑک پر آکر ہم سامنے والے فٹ پاتھ پر ہو گئے۔ یہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوٹھیوں کے پورچوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ ہم جب میڈم سوزی کی کوٹھی کے سامنے پہنچے تو ہماری نظریں کوٹھی کے صحن کی طرف اٹھ گئیں۔ صحن میں کرنل واڈیکر کی کار کھڑی تھی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ دونوں باڈی گارڈ فوجی وردی میں برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہم وہاں رکے بغیر آگے نکل گئے۔ میں نے کمانڈو شیر باز سے کہا۔

"جب ہم چائے کی دکان سے باہر نکلے تھے تو ایک آدمی سگریٹ پان کی دکان کی سامنے کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے میرا خیال ہے کہ میری طرف گھور کر دیکھا تھا۔"

کمانڈو شیر باز نے کہا۔

"تم نے اس وقت مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہم ٹارگٹ پر پہنچ چکے ہیں۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہمیں ہر حالت میں یہ ٹارگٹ مارنا ہے۔"

ہم اپنے ساتھ نائیلون کی ایک باریک رسی کا گچھا بھی لے گئے تھے۔ جو میری جیب میں تھا۔ اس رسی کے سرے پر لوہے کا ایک ہک لگا ہوا تھا۔ یہ ہک کمانڈو شیر باز نے خود لگایا تھا۔ اس رسی کے ذریعے ہمیں میڈم سوزی کی کوٹھی کی پچھلی دیوار پار کرنی تھی۔ سڑک کے آخری کنارے پر جا کر ہم بائیں جانب اس کچے راستے کی طرف مڑ گئے جو کوٹھیوں کے پچھواڑوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ کوٹھیوں کے عقبی صحنوں اور برآمدوں کی روشنی وہاں تک پہنچتے پہنچتے بہت مدہم ہو جاتی تھی۔ کمانڈو شیر باز نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے جیب سے نائیلون کی رسی کا گچھا نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور اس کے آگے

سے نکل کر کوٹھیوں کی عقبی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
کمانڈو شیر باز میرے پیچھے تھا۔
وہ بھی دیواروں کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ تین چار کوٹھیاں چھوڑ کر میڈم سوزی کی کوٹھی کی دیوار آ گئی۔ کمانڈو شیر باز منصوبے کے مطابق دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آٹومیٹک پستول اس کے ہاتھ تھا۔ میرا پستول میری جیب میں تھا۔ میں نے دیوار سے دو قدم پیچھے ہٹ کر نائیلون کی رسی کا ہک والا سرا گھما کر اوپر ناریل کے درخت کی طرف اچھال دیا۔ لوہے کی ہک ناریل کے درخت کے جھاڑ میں جا کر پھنس گیا۔ میں نے اسے تین چار مرتبہ زور زور سے اپنی طرف کھینچا۔ جب دیکھا کہ ہک پکی طرح پھنس گیا ہے تو میں دیوار کے ساتھ آ گیا اور کمانڈو شیر باز کو اشارہ کیا۔ اس نے رسی میرے ہاتھ سے لی اور دیکھتے دیکھتے پھرتی سے دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے میں بھی رسی کے ذریعے دیوار پر قدم رکھتا اوپر چڑھ گیا۔ دیوار کی منڈیر پر اندر لگی بیل کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دیوار کی منڈیر پر اوندھے لیٹ گئے اور کوٹھی کے اندر پچھلے صحن کا جائزہ لینے لگے۔ اس صحن میں کوئی بتی نہیں تھی۔ صرف کمرے میں بتی روشن تھی۔ جس کے روشندانوں میں سے پھیکی پھیکی روشنی باہر صحن اور برآمدے میں پڑ رہی تھی۔
میں نیچے اترنے لگا تو کمانڈو شیر باز نے مجھے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔
میں نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی میں پوچھا۔
اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔
"پچھلے ہفتے اس طرف والے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ آج کیوں بجھی ہوئی ہے؟"
میں نے کہا۔
"ہو سکتا ہے بلب فیوز ہو گیا ہو۔"

اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ کمانڈو شیر باز نیچے اترتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا ہے۔ نائیلون کی رسی میں نے باہر سے اوپر کھینچ کر کوٹھی کی دیوار کے اندر ڈال دی تھی۔ اب ہمیں اس رسی کے سہارے نیچے اترنا اور کمانڈو آپریشن مکمل کرنے کے بعد اسی رسی کی مدد سے دیوار پر چڑھ کر وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ میں نے کمانڈو شیر باز کو آہستہ سے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ بولا۔

"صورت حال کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔"

ہم اندھیرے میں چھپکلیوں کی طرح کوٹھی کی اونچی دیوار کی منڈیر پر الٹے لیٹے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر کمانڈو شیر باز نے نیچے اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رسی کی مدد سے نیچے اترا اور نیچے اترتے ہی ناریل کے درخت کے ساتھ لگ کر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں بھی رسی کو پکڑ کر نیچے اتر گیا۔ ہم دونوں تین چار سیکنڈ اندھیرے میں چپ چاپ بیٹھے گھور گھور کر کوٹھی کے برآمدے کی طرف دیکھتے رہے۔ جہاں کمرے کے روشندانوں میں سے دھندلی روشنی پڑ رہی تھی۔ ہم اٹھ کر دبے پاؤں ر آمدے کی طرف بڑھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ہم نے کان لگا کر سننے کی وشش کی۔ دوسری طرف کمرے میں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کمانڈو بر باز نے ہاتھ سے کمرے کی طرف اشارہ کیا کہ ہم اندر جائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کو دو انگلیوں کے دباؤ سے اندر کو ھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ مجھے خیال ضرور آیا کہ رات کے وقت اس کمرے کا ،وازہ کھلا کیوں رکھا گیا ہے۔ اندر سے اس کو چٹخنی کیوں نہیں لگائی گئی۔ دل ں طرح طرح کے وسوسے اور شبے پیدا ہونے لگے تھے مگر ان کی طرف دھیان ینے کا وقت گذر چکا تھا۔ ہم ایکشن شروع کر چکے تھے۔ اب ٹارگٹ مارے بغیر

ہم واپس نہیں جا سکتے تھے۔ ہم تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ یہ بیڈ روم تھا مگر سنگل بیڈ روم تھا۔ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دو چار آرام دہ کرسیاں اور ایک تپائی تھی۔ جس پر گلدان پڑا تھا۔ کارنس پر بھی گلدان سجا ہوا تھا۔ دیوار کی صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ دوسرے کمرے سے ہمیں ایک مرد اور عورت کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز آئی۔ کمانڈو شیر باز نے میرے طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ کرنل واڈیکر اپنی محبوبہ کے پاس موجود ہے۔ اس نے آٹو میٹک پستول کو ایک نظر دیکھا۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے بیڈ روم کے اس دروازے کی طرف بڑھا جس کے پیچھے سے عورت اور مرد کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دروازہ بھاری لکڑی کا تھا اور اس میں کوئی درز یا سوراخ نہیں تھا کہ جس سے ہم دوسری طرف دیکھ سکتے۔ میں نے دروازے پر انگلی رکھ کر کمانڈو شیر باز کو ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ اگر دروازہ دوسری طرف سے بند نہیں تو میں اسے کھول دوں گا۔ کمانڈو شیر باز نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا۔

میں نے دروازے کے ایک پٹ کو ذرا سا دھکیلا۔ حیرانی کی بات تھی کہ یہ دروازہ بھی کھلا تھا۔ میرے دل نے کہا۔

"حیدر علی! اندر مت جاؤ۔"

یہ ایک اشارہ تھا' ایک آواز سی تھی جس کی سرگوشی میں نے برابر سنی۔ میں دروازہ کھولتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ کمانڈو شیر باز نے دھڑاک سے دروازہ کھول دیا اور پستول کی نالی آگے کرتے ہوئے کہا۔

"اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔"

میں بھی پستول تان کر کمرے میں گھس گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر ہم دم بخود سے ہو کر رہ گئے۔ کمرے میں ایک سکھ سردار جی ایک عورت کے پاس

بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس پڑے تھے۔ کرنل واڈیکر وہاں نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ کمانڈو شیر باز نے سردار جی پر پستول تان لی اور گرج کر پوچھا۔

"کرنل واڈیکر کہاں ہے۔ جلدی بولو نہیں تو شوٹ کر دوں گا۔"

سکھ سردار جی اور عورت نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ گھبرائے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ بات میرے لئے انتہائی حیران کن تھی۔ سکھ سردار نے بڑے آرام سے کہا۔

"کرنل صاحب ابھی آ جاتے ہیں۔"

اچانک پیچھے سے چار پانچ آدمی ہم پر اس طرح گر پڑے جس طرح کوئی مٹی کا تودا گرتا ہے۔ ہمیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر انہوں نے ہمیں قابو کر لیا اور دو آدمیوں نے ہماری گردنوں کے ساتھ سٹین گنوں کی نالیاں لگا دیں۔ یہ سب کے سب سویلین کپڑوں میں تھے مگر ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ٹرینڈ کمانڈو ہیں۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہوگیا۔ یہ لوگ اسی دروازے سے اندر گھس آئے تھے۔ جس دروازے سے ہم داخل ہو کر بیڈ روم میں آئے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پہلے سے ہمارا انتظار کر رہے تھے اور ہمیں خاص طور پر تیار کئے گئے جال میں پھنسایا گیا ہے۔ یہ سارے فوجی کمانڈو مسلح تھے۔ انہوں نے ہمارے آٹو میٹک پستول اپنے قبضے میں کر لئے تھے اور بڑی تیزی سے ہمارے ہاتھ ہماری پیٹھ پر رسیوں سے باندھ دیئے تھے۔ اس دوران سکھ سردار جی اور عورت وہاں سے چلے گئے تھے۔

ہمیں صوفوں کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے حملہ آوروں کو غور سے دیکھا۔ وہ کل پانچ آدمی تھی ان کے جسم مضبوط تھے۔ پتلون اور بش شرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے تین کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ دو کے پاس ریوالور تھے۔ یہ لوگ شکل ہی سے فوجی کمانڈو لگ رہے تھے۔ اتنے میں دروازے سے کرنل واڈیکر نمودار ہوا۔ ہم نے اسے صاف پہچان لیا۔ اس نے ہمیں ایک نظر دیکھا۔ پھر قریب آکر گھورتے ہوئے بولا۔

"تو تم لوگ کشمیری کمانڈو ہو اور سری نگر سے مجھے قتل کرنے اور کشمیری لڑکی کو نکالنے آئے ہو۔ یہ تمہارا کیا خیال تھا کہ کرنل واڈیکر کوئی رکشا ڈرائیور ہے جسے تم آسانی سے ہلاک کر دو گے۔ مجھے تو اسی روز پتہ چل گیا تھا۔ جب تم بنگلور شہر میں داخل ہوئے تھے۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ ان کو لے جاؤ۔ فوجی کمانڈو ہمیں

دھکیلتے ہوئے بیڈ روم میں سے دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں وہی خوش شکل عورت جو یقیناً" میڈم سوزی تھی اپنے ادھیڑ عمر ملازم اور ایک بوڑھی عورت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ عورت میڈم سوزی کی ماں ہی ہو سکتی تھی۔ باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک کرنل واڈیکر کی گاڑی تھی اور دوسری فوجی گاڑی تھی۔ ہمیں اس فوجی گاڑی میں ان پانچوں فوجی کمانڈوں کے بیچ میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑی ویگن ٹائپ کی تھی۔ جو اسی وقت میڈم سوزی کی کوٹھی سے نکل کر کسی نامعلوم مقام کی طرف چل پڑی۔

ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ صورت حال ایک دم اتنی پلٹ جائے گی۔ ہم سے دو غلطیاں ہو گئی تھیں۔ پہلی غلطی مجھ سے ہوئی تھی کہ میں نے سینما ہاؤس سے نکلنے کے بعد ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ میرا پیچھا کر رہا ہے اور مجھے اس نے گھور کر بھی دیکھا ہے اور پھر ایک عورت گیلری میں سیڑھیاں اترتے ہوئے جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی بھی تھی لیکن میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی اور کمانڈو شیر باز کو تفصیل سے نہ بتایا۔ اگر بتایا تو اس وقت جب پانی سر سے گذر چکا تھا اور ہم عین کمانڈو ایکشن میں سے گذر رہے تھے۔ کمانڈو شیر باز خان سے یہ غلطی ہو گئی تھی کہ جب ہم میڈم سوزی کے بیڈم روم میں دروازہ کھول کر گھسے تھے اور ہم نے پستول تان کر سکھ سردار جی اور عورت کو ہینڈز اپ کرایا تھا تو ہم دونوں کا رخ سردار جی کی طرف تھا۔ میں اتنا تجربہ کار کمانڈو نہیں تھا۔ میرے مقابلے میں شیر باز خان زیادہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اسے چاہئے تھا کہ مجھے ہدایت کرتا کہ میں اپنے پستول کا رخ اس دروازے کی طرف رکھوں جس دروازے سے ہم اندر گھسے تھے تاکہ اگر پیچھے سے دشمن حملہ کرتا تو وہ اس پر فائرنگ کر سکتا۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم دونوں کا رخ سکھ سردار اور عورت کی طرف تھا اور پیچھے سے دروازہ کھلا تھا اور مورچہ خالی تھا۔ چنانچہ کرنل واڈیکر کے فوجی کمانڈو کو پوزیشین بالکل خالی مل گئی اور انہوں نے گھس کر ہمیں

آسانی سے دبوچ لیا۔

یہ ہمیں پکڑنے کے لئے ایک جال بچھایا گیا تھا۔ کوٹھی کے عقبی برآمدے کی بتی بھی بجھا دی گئی تھی تاکہ ہم آسانی اور بے فکری سے کمرے میں داخل ہو جائیں۔ سکھ سردار جی اور میڈم سوزی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اونچی آواز میں ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں۔ جس سے ہمیں یقین ہو جائے کہ کرنل واڈیکر اندر داد عیش دے رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے بیڈ روم کے دروازے کو چٹخنی بھی نہیں لگائی گئی تھی۔ بہرحال ہم پھنس گئے تھے اور ہمیں پکڑ لیا گیا تھا۔

ہمیں پکڑا بھی ریگولر آرمی نے تھا۔ یعنی بھارت کی باقاعدہ فوج کے کمانڈوز ہمیں پکڑ کر لئے جا رہے تھے۔ یہ کوئی عام پولیس نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے۔ فوجی گاڑی میں بتی روشن تھی۔ سویلین لباس والے بھارتی فوجی کمانڈو ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے ہمیں مکے بھی مارے تھے اور اپنی زبان میں برا بھلا بھی کہا۔ ہم خاموش تھے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ گاڑی میں بٹھانے سے پہلے ہماری تلاشی لے کر ہماری پتلون کی جیبوں میں سے فالتو میگزین اور بڑی کمانی دار کمانڈو چاقو انہوں نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ یہ چاقو اور آدھی رات کو اٹیک کرنے کا انداز واضح کر رہا تھا کہ ہم کشمیری کمانڈوز ہیں۔ ہماری گھڑیاں بھی انہوں نے اتار لی تھیں۔ ہمارے پاس جو نقدی تھی۔ وہ بھی انہوں نے نکال لی تھی۔ ہماری گرفتاری میں دو عوامل نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ ہمارے چہرے سامنے کی طرف تھے۔ ہم میں سے کسی ایک نے بھی ایسی پوزیشن نہیں لی تھی کہ وہ پیچھے دیکھ رہا ہوتا۔ دوسرے ہم پر پیچھے سے اچانک حملہ کیا گیا تھا۔ حملہ بھی اس طرح کیا گیا کہ چھ سات آدمی ایک دم سے ہمارے اوپر گرے اور انہوں نے اپنے ساتھ ہمیں بھی نیچے گرا دیا لیکن گراتے

وقت اس بات کا انہوں نے خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ ہماری پستول سے گولی نہ چل سکے۔ اگر چلے تو اوپر چھت کو لگے چنانچہ میں اور شیر باز کو جس فوجی کمانڈو نے دبوچا تھا اس نے سب سے پہلے ہمارے پستول والے ہاتھوں کو نیچے زور سے ہاتھ مار کر ہمارے پستول اوپر کو اچھال دیئے تھے۔

ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا جو ہمارے ساتھ ہوگیا تھا۔ میں اپنی اس غیر متوقع گرفتاری پر سخت پشیمان بھی تھا اور پریشان بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شیر باز کی بھی ذہنی حالت ایسی ہی تھی۔ اگرچہ ہم نے کشمیری خاتون کو بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیا تھا مگر کرنل واڈیکر سے ہم اپنی بے عزتی کا بدلہ نہیں لے سکے تھے بلکہ الٹا خود پکڑے گئے تھے۔ کرنل واڈیکر کے انداز گفتگو سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوا تھا کہ اسے نور بانو کے فرار کا علم ہوگیا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ نور بانو کا ہم سراغ نہیں لگا سکے اور اسے جنگلی لوگوں نے اپنے دیوتا پر قربان کرکے ہلاک کر دیا ہوگا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ نور بانو کے فرار ہونے کی خبر جنگلی لوگ کرنل واڈیکر کو کہاں دیتے۔ وہ تو شاید کرنل واڈیکر کو جانتے بھی نہیں تھے۔ نور بانو خدا جانے کس آدمی کے ذریعے جنگلیوں تک پہنچائی گئی تھی۔

فوجی گاڑی خدا جانے کس طرف چلی جا رہی تھی۔ ہمیں صرف گاڑی کی ونڈ سکرین کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں کبھی کبھی شہر کی روشنیوں کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہمیں محسوس ہوا کہ گاڑی چڑھائی چڑھ رہی ہے۔ پھر اترائی اترنے لگی۔ ہم پہاڑی علاقے میں سے گذر رہے تھے۔ ونڈ سکرین پر کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق فوجی گاڑی کوئی ایک گھنٹے تک کبھی ہموار اور کبھی اونچی نیچی جگہوں پر سفر کرتی رہی۔ پھر ایک طرف کو مڑی اور ایسی آواز آئی جیسے گاڑی کی اونچی چھت کے نیچے سے گذر رہے ہیں۔ یہ کوئی چھتی ہوئی لمبی راہداری تھی یا ڈیوڑھی تھی۔ گاڑی ایک طرف گھوم کر کھڑی ہو گئی۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ ہمیں

گاڑی میں سے نکال کر کچھ دور تک لے جایا گیا۔ ایک آدمی نے میرا بازو پکڑ لیا تھا۔ آگے سیڑھیاں آگئیں جو اوپر کو جاتی تھیں۔ میں گننے لگا۔ یہ گیارہ سیڑھیاں تھیں۔ آگے ہموار جگہ آ گئی۔ آگے پھر سیڑھیاں آگئیں مگر یہ سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔ یہ بھی گیارہ سیڑھیاں تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیں بنگلور شہر سے دور کسی پرانے قلعے میں لایا گیا ہے۔

سیڑھیاں ختم ہوئیں تو دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ دروازہ لوہے کا ہے۔ یہاں میری آنکھوں پر سے پٹی کھول دی گئی۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈو شیر باز بھی میرے ساتھ ہی ہوگا۔ جب میری آنکھوں کی پٹی کھلی تو میں نے دیکھا کہ میں اکیلا تھا۔ کمانڈو شیر باز میرے ساتھ نہیں تھا۔ مجھے ایک اندھیرے اور سیلن زدہ کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ پہلے تو مجھے سوائے اندھیرے کے وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب میں نے آنکھوں کو ہاتھوں سے آہستہ آہستہ مل کر غور سے دیکھا تو اندھیرے میں مجھے زمین پر بادامی رنگ کے کمبل سے بچھے ہوئے نظر آئے۔ قریب جا کر انہیں چھوا تو وہ کمبل نہیں تھے بلکہ سوکھی ہوئی خشک گھاس تھی۔ میرے لئے وہاں گھاس کا بستر پہلے سے لگا ہوا تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دیوار بڑی سخت تھی۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ یہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں والی دیوار تھی جیسی کہ پرانے زمانے کی قلعوں کی دیواریں بنائی جاتی تھیں۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ مجھے اور شیر باز کو بنگلور کے کسی پرانے قلعے کے تہہ خانے میں بند کر دیا گیا ہے لیکن شیر باز کو کسی دوسرے تہہ خانے میں بند کیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ قلعہ انڈین آرمی کی رجمنٹ کا گیریژن ہو یا یہاں ملٹری پولیس کا کیمپ ہو جہاں اس علاقے میں پکڑے جانے والے مشتبہ لوگوں' حکومت کے مخالفوں اور دوسرے ملک کے جاسوسوں کو لا کر ان کو اذیتیں دے کر ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہو۔

"تہہ خانے میں کہیں کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے اوپر

تک دیکھا وہاں کوئی روشندان نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی روشندان ہو مگر اندھیرے میں مجھے نظر نہ آ رہا تھا۔ فضا مرطوب اور حبس آلود تھی۔ عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مچھر بھی تھے۔ میں اندھیرے میں سوکھی گھاس پر بیٹھا شیر باز کے متعلق سوچنے لگا کہ وہ کس تہہ خانے میں ہوگا۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوتا تو ہم ایک دوسرے سے باتیں کر کے کچھ غم ہلکا کر سکتے تھے اور وہاں سے فرار کی کوئی سکیم بھی سوچ سکتے تھے لیکن یہ لوگ ہم دونوں کو ایک جگہ اکٹھا نہیں رکھ سکتے تھے۔ اندھیرے میں مچھروں سے جنگ کرتے کرتے خدا جانے رات کے کس لمحے میں مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔"

لوہے کے دروازے کی چرچراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ دو باوردی فوجی اندر آئے اور مجھے اپنے ساتھ وہاں سے نکال کر ایک اور تہہ خانے میں لے گئے۔ جہاں دو فوجی افسر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک پائپ پی رہا تھا۔ مجھے ان کے سامنے ننگے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ دونوں فوجی گہرے سانولے رنگ کے تھے اور مرہٹہ لگتے تھے۔ ان میں سے جو پائپ پی رہا تھا اس کی عمر زیادہ تھی۔ دوسرا فوجی جوان تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ان مراحل سے میں پہلے بھی گذر چکا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کشمیری حریت پسند مجاہد ہوں۔ میرا ساتھی بھی کشمیری مجاہد ہے۔ ہم اپنی کشمیری بہن کے اغوا اور اسے ہلاک کرنے کا بدلہ لینے یہاں آئے تھے۔ اور کرنل واڈیکر کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ جس نے ہماری بہن کو سری نگر سے اغوا کیا اور بعد میں جب کہ ہمیں یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ہماری بہن کو کرنل واڈیکر کے حکم سے مار دیا گیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ شیر باز نے بھی یہی بیان دیا ہوگا۔ کیونکہ وہ یہ کسی صورت میں بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ نور بانو کو ہم نے فرار کروا دیا ہے اور وہ زندہ ہے۔

فوجی افسروں نے ایک فوجی کو اشارہ کیا۔ اس نے مجھ پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ میں فرش پر گر پڑا۔ وہ مجھے لاتوں سے مارنے لگا۔ بہرحال اس

اذیت خانے میں ٹارچر اور حیوانی اذیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس دوران مجھے شیر باز کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اگر اس قلعے میں بند ہے تو کس تہہ خانے میں ہے۔ یا اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ لے جایا گیا ہے۔ مجھ ہر روز ٹارچر کیا جاتا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ کشمیری مجاہدوں کو خاص طور کمانڈوز کو کیسی کیسی غیر انسانی اذیتیں دیتے ہیں۔ ان کا کام ہر طرح سے مجھے اذیتیں دینا اور مجھ سے یہ پوچھنا تھا کہ میرے دوسرے کشمیری ساتھی بنگلور میں کہاں کہاں پر ہیں اور میرا کام ان کی ہر قسم کی اذیت کو برداشت کرنا اور اپنی زبان کو بند رکھنا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اپنے ساتھی عالمگیر کا نام لیتا ہے یا ان لوگوں کو عالمگیر کے مکان اور ریسٹ ہاؤس کے بارے میں کچھ بتاتا ان کی مار کھا رہا تھا۔ ہر قسم کی اذیت برداشت کر رہا تھا۔ جب اذیت میری برداشت سے باہر ہو جاتی تھی تو مجھے غش آجاتا تھا مگر جو پہلے دن انہیں بیان دیا تھا اس پر قائم تھا۔ مجھ سے عالمگیر کے ریسٹ ہاؤس کے بارے میں پوچھا گیا تھا کہ وہاں کیسے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ ہم جنگل میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک ریسٹ ہاؤس دکھائی دیا۔ اس کے چوکیدار سے اجازت لے کر رات کی رات وہاں ٹھہر گئے اور صبح وہاں سے چل دیئے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ریسٹ ہاؤس کا مالک کون ہے یا اس کا نام کیا ہے۔

فوجی افسر بدل بدل کر آتے رہے اور مجھے نئی نئی اذیتیں دیتے رہے لیکن میں اپنے بیان پر قائم رہا کہ ہم کشمیری مجاہد ہیں۔ اپنی بہن کے اغوا کا بدلہ لینے یہاں آئے تھے۔ کرنل واڈیکر کو قتل کرنا چاہتے تھے اور یہاں ہمارا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ رات کو ہم جنگل میں جا کر سو جاتے تھے۔ دن کے وقت

کرنل واڈیکر کی تلاش میں لگے رہتے تھے۔ آخر ہمیں سراغ ملا کہ وہ ایک عورت سوزی کے گھر پر ہفتے کی رات کو ضرور آتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے سوزی کے گھر پر قتل کرنے کی سکیم تیار کر لی۔ افسوس کہ ہمارا پلان ناکام ہوگیا۔ جب مجھے وہاں اذیتیں برداشت کرتے کرتے ایک ہفتہ گذر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ بھی میری طرف سے مایوس ہو گئے ہیں اور انہیں یقین ہوگیا ہے کہ میں نے جتنا کچھ انہیں بتایا ہے اس سے آگے انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔

یہ فوجی افسر آپس میں انگریزی میں بھی بات کرتے تھے۔ میں نے ان پر یہ ظاہر کیا تھا کہ ان پڑھ کشمیری مجاہد ہوں مگر انگریزی میں وہ جو بات کرتے تھے میں اسے سمجھ جاتا تھا۔ کیونکہ میں انگریزی روانی سے بول بھی لیتا تھا اور سمجھ بھی لیتا تھا۔ میں اس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ انہیں میرے پچھلے ریکارڈ کا ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا۔ ورنہ خدا جانے وہ میرا کیا حشر کرتے۔ کم از اتنی جلدی مجھے ہلاک کر دینے کا فیصلہ نہ کرتے۔ جی ہاں! انہوں نے مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ بات بوڑھے فوجی افسر نے پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے جوان ساتھی سے کہی تھی۔ اس نے انگریزی میں اسے کہا تھا کہ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اسے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہئے۔ یہ ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ بھارتی آرمی انٹیلی جینس کے لوگ بڑی جلدی تنگ آ جاتے تھے۔ ان میں زیادہ صبر کرنے کا مادہ نہیں تھا۔ اگر پکڑا ہوا جاسوس دو چار دن کی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بھی انہیں کچھ نہیں بتاتا تھا تو فوجی افسر یا مایوس ہو کر یا غصے میں آکر اسے شوٹ کر دیتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی بیزار ہو کر یا غصے میں آکر ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ مجھے گولی مار کر ہلاک کرنا چاہتے تھے یا پھانسی لگانا چاہتے تھے۔ کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ بھارتی فوجی غیر ملکی جاسوسوں پر اپنی گولی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔

جوان فوجی نے او کے کہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب یہ لوگ مجھے ٹھکانے لگانے والے تھے۔ اس لمحے تو میں بڑا پریشان ہوگیا۔

میرے لئے وہاں سے فرار ہونا بھی تقریباً" ناممکن تھا۔ میں ان کے قبضے میں تھا۔ وہ بھارتی فوجی تھے۔ ہمارے دشمن تھے۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے موت کی نیند سلا سکتے تھے۔ موت مجھے سامنے نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال اپنی مرحوم بیوی عائشہ کی طرف چلا گیا۔ اس کا معصوم محبت بھرا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ مجھے واقعی اپنی بنگالی بیوی سے بڑا پیار تھا۔ پھر لاہور والے ملک صاحب اور بٹ صاحب کا خیال آگیا۔ یہ سوچ کر دل کو بڑا دکھ ہوا کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی کہ ان کا ایک ساتھی، پاکستان سے محبت کرنے والا شخص دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہوگیا ہے۔ مجھے کمانڈو شیر باز خان کا خیال بھی آیا۔ اگر وہ اسی قلعے میں قید تھا تو اس سے بھی پوچھ گچھ ہوئی ہوگی۔ اس نے بھی اپنی زبان بند رکھی ہوگی۔ انڈین ملٹری انٹیلی جنس کو کچھ نہیں بتایا گیا ہوگا اور اسے بھی ہلاک کرنے کا فیصلہ ہوگیا ہوگا۔

ایک دن گذر گیا۔ کوئی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے نہ آیا۔ مجھ پر کسی قسم کا تشدد بھی نہیں کیا گیا۔ کھانے کو ایک وقت ہی وہی دال روٹی اور پانی دیا گیا۔ دوسرا دن بھی گذر گیا۔ میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں نے مجھے ہلاک کرنے کا ارادہ کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا ہو۔ تیسرے دن شام کے وقت وہی بوڑھا فوجی اور جوان فوجی افسر میرے تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک دبلا پتلا کالے رنگ کا آدمی بھی تھا جو اپنے لباس اور شکل صورت سے محنت مزدوری کرکے روزی کمانے والا لگتا تھا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ مزدور ان سے ذرا ہٹ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ بوڑھے فوجی افسر نے پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"میں تمہیں ایک آخری موقع دینا چاہتا ہوں۔ تم کس کے ہاتھ ٹھہرے

ہوئے تھے اور بنگلور میں تمہاری ساتھی جاسوس اور کمانڈو کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں تو تمہاری جان بخشی کر دی جائے گی کیونکہ ہم تمہاری موت کا سامان ساتھ لے کر آئے ہیں۔"

میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ یہ لوگ اپنے ساتھ میری موت کا کس قسم کا سامان لے کر آئے ہیں۔ میں نے بوڑھے آدمی کی طرف دیکھا۔ جو تھیلا پاس ہی رکھے زمین پر بیٹھا تھا۔ کیا یہ کوئی قصاب ہے جو بکرے کی طرف طرح مجھے ذبح کرے گا؟ کیا یہ جلاد ہے جو میری گردن میں پھندا ڈال کر مجھے پھانسی پر چڑھائے گا؟ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ میں نے بوڑھے فوجی سے کہا۔

"بنگلور میں ہمارا کوئی ساتھی کمانڈو نہیں ہے۔ ہم بنگلور میں کسی کے پاس نہیں ٹھہرے تھے۔ ہم جنگل میں چھپ کر رات گزارتے تھے۔"

بوڑھے فوجی نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم مرنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے ہم تمہاری خواہش ابھی پوری کر دیتے ہیں۔"

تب جوان فوجی نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تم کیوں ناحق اپنی جان گنواتے ہو۔ تمہارے ساتھی کمانڈو نے تو ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اگر اس نے سب کچھ بتا دیا ہے تو پھر آپ لوگ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

بوڑھے فوجی نے جواب دیا۔

"اس لئے کہ ہمیں تمہارے ساتھی پر اعتبار نہیں ہے۔ ہم تمہیں معقول آدمی سمجھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وہ خود جھوٹ بول رہے تھے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کمانڈو شیر باز انہیں کچھ بتاتا۔ شیر باز ایک بہادر کشمیری کمانڈو تھا۔ وہ موت کو گلے لگا سکتا تھا مگر دشمن کے تشدد سے گھبرا کر اپنے ساتھیوں کے نام پتے نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے انہیں کہا۔

"میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ ہمارا اور کوئی ساتھی یہاں نہیں ہے۔ ہم دونوں سری نگر سے اکیلے یہاں آئے تھے۔ ہماری آمد کا مقصد کرنا واڈیکر سے انتقام لینا اور اسے قتل کرنا تھا۔ اس کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔"

بوڑھے فوجی نے جوان فوجی سے انگریزی میں کہا۔

"میرا خیال ہے اب کسی قسم کی گنجائش باقی نہیں رہی۔"

جوان فوجی کندھے ہلاتے ہوئے انگریزی میں کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے سر! اس آدمی سے کہیں کہ اپنا کام شروع کر دے۔"

بوڑھے فوجی نے مزدور ٹائپ بوڑھے آدمی کو اشارہ کیا اور خود دونوں فوجی کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ بوڑھا آدمی اٹھا اور دو تین قدم چل کر میرے بالکل پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے تھیلا کھولا۔ تھیلے میں سے ایک ٹین کی ڈبی نکالی۔ ڈبی کے اوپر تین چار سوراخ تھے۔ ڈبی بڑے سائز کی تھی۔ ڈبی اس نے زمین پر رکھ دی اور فوجی افسروں کی طرف دیکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا۔ تہہ خانے کے دروازے پر دو گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ جوان فوجی نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ دونوں میں سے ایک گارڈ تیز قدم اٹھاتا قریب آیا اور سلیوٹ کر کے کھڑا ہو گیا۔ جوان فوجی افسر نے اسے حکم دیا۔

"اس کو پیچھے سے آ کر پکڑے رکھو۔"

فوجی میرے پیچھے آیا۔ اس نے میرے بازو پیچھے کر کے مجھے اس طرح سے جکڑ لیا کہ میں نہ اٹھ سکتا تھا نہ بازو ہلا سکتا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ بوڑھا

کسی تیز دھار چاقو سے میری شہ رگ کاٹ ڈالے گا۔ اتنے میں اس نے ٹین کی
ڈبی کا ڈھکن کھول کر ایک پھونک ماری اور ڈبی میں سے پھنکار کی آواز آئی اور
ایک چھوٹے سانپ نے گردن باہر نکال کر میری طرف دیکھا۔

میرے خدا! میں تو حیران ہو کر رہ گیا۔ اگر میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا رہی تھیں تو یہ میرا دوست سانپ تھا۔ سانپ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بوڑھا آدمی اس کے سر پر بار بار کپڑا رکھ کر اٹھا لیتا تھا۔ سانپ اس کی طرف منہ کرکے دو تین بار پھنکارا اور پھر میری طرف اپنی سرخ نگینے ایسی آنکھوں سے تکنے لگا۔ تہہ خانے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی سانپ پر پڑ رہی تھی۔ میں سانپ کو اور سانپ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران بوڑھا آدمی جو سپیرا ہی ہو سکتا تھا۔ سانپ نے میری طرف دیکھتے دیکھتے آہستہ سے دو بار سر کو جھکایا تو خوشی سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

یہ میرا دوست سانپ ہی تھا۔ یہ لوگ مجھے سانپ سے ڈسوا کر مارنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ایک سپیرے کو ساتھ لائے تھے۔ بوڑھے سپیرے نے سانپ کو گردن سے پکڑ لیا تھا۔ جوان فوجی افسر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اب بھی وقت ہے۔ تمہاری موت تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ سپیرے کا کہنا ہے کہ یہ سانپ اتنا زہریلا ہے کہ اس کے ڈستے ہی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تمہارے دماغ کے تمام خلیے پھٹ جائیں گے۔ میں تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں۔ اگر اب بھی تم ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دو تو ہم تمہاری جان بخشی کر دیں گے۔"

میں تو پہلے ہی مرنے کے لئے تیار تھا۔ اب میں نے اپنے دوست سانپ کو پہچان لیا تھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ اب تو مجھے کوئی ڈر خوف نہیں

رہا تھا۔ میں نے گردن اونچی کر کے کہا۔

"مرنا قبول ہے مگر اپنے ساتھیوں کے نام پتے نہیں بتاؤں گا۔"

فوجی افسر نے سپیرے کو اشارہ کیا۔ مجھے پیچھے سے فوجی جوان نے جکڑ رکھا تھا۔ سپیرا میرے دوست سانپ کو لے کر میری طرف بڑھا۔ مجھے خیال آیا کہ میرا دوست سانپ کہیں مجھے ڈس ہی تو نہیں دے گا؟ وہ کیا کرے گا؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ سپیرے نے سانپ کا منہ میری گردن کے ساتھ لگا دیا۔ سانپ نے منہ کھول کر میری گردن کا گوشت اپنے منہ میں لیا اور مجھے ڈس دیا۔ میں نے اپنی گردن پر سانپ کے دانتوں کی چبھن باقاعدہ محسوس کی۔ میرے خدا۔ اس نے تو مجھے ڈس دیا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ مجھے اپنا جسم بے حس ہوتا محسوس ہوا۔ پھر مجھے اپنے جسم کا بالکل احساس نہ رہا لیکن میں ہوش میں تھا۔ عجیب بات ہو گئی تھی۔ میں ہوش میں تھا۔ میری آنکھوں کی بینائی قائم تھی۔ میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ مگر میرا جسم بالکل بے حس تھا۔ نہ میں ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا نہ اپنی آنکھوں کے ڈیلے دائیں اور بائیں اوپر نیچے گھما سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں میں سانپ کے زہر سے پتھر تو نہیں بن گیا۔ اس خیال سے میرا دماغ مارے خوف کے سن ہو گیا۔ میں ہاتھ ہلا کر اپنا جسم نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے جسم کو حرکت دے کر بھی یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں میں پتھر کا تو نہیں بن گیا میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں مگر میں دونوں فوجی افسروں کو اور بوڑھے سپیرے کو اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔

دونوں فوجی افسر اپنی کرسیوں سے اٹھ کر قریب آ گئے تھے۔ وہ مجھے جھک کر غور سے دیکھ رہے تھے۔ سپیرے نے کہا۔

"صاب! یہ مر گیا ہے۔ یہ بڑا خطرناک سانپ ہے۔ اس کا ڈسا کوئی نہیں بچتا۔"

فوجی افسر نے اشارہ کیا۔ جس فوجی نے مجھے بازوؤں سے پیچھے سے پکڑ

رکھا تھا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں دائیں جانب گر پڑا۔ ان کے حساب میں واقعی مرچکا تھا۔ میں جس زاویے سے گرا تھا اسی زاویے پر پڑا تھا۔ میں ہل نہیں سکتا تھا۔ مگر دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

جوان فوجی افسر نے سپیرے اور فوجی گارڈ کو وہاں سے چلے جانے کے لئے کہا۔ سپیرے نے سانپ کو ڈبی میں بند کر کے تھیلے میں ڈالا اور باہر نکل گیا۔ فوجی گارڈ بھی تیز تیز قدم اٹھاتا دروازے پر دوسرے گارڈ کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ اب دونوں فوجی افسر میری "لاش" کے قریب کھڑے ایک دوسرے سے اردو ہندی میں باتیں کرنے لگے۔ بوڑھے فوجی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ لاش کو قلعے کے پیچھے زمین کھود کر دبا دینا چاہئے۔"

جوان افسر بولا۔

"سر! زمین پتھریلی ہے۔ گڑھا آسانی سے نہیں کھودا جائے گا۔"

بوڑھے فوجی نے پھر کہا۔

"تو پھر لاش کو جنگل میں پھینک آؤ۔"

جوان فوجی کہنے لگا۔

"سر! اگر ہم اس کشمیری کمانڈو کی موت کو صیغہ راز میں رکھنا چاہتے ہیں تو میری تجویز یہ ہے کہ اسے جنگل میں لے جا کر آگ لگا دیتے ہیں۔ لاش جل کر راکھ ہو جائے گی۔"

"ہاں۔ یہ خیال اچھا ہے۔"

بوڑھے فوجی نے کہا۔ پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور کہا۔

"تم گارڈز کو ساتھ لے جاؤ اور قلعے کے پیچھے جو گھاٹی ہے۔ اس میں لاش کو جلا دو۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ لاش رات بھر جلتی رہے گی اور صبح راکھ بن گئی ہوگی۔"

میں یہ سن رہا تھا اور میرے رونگٹے تو کھڑے نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ میرا جسم بے حس ہو چکا تھا۔ لیکن میرا دماغ ضرور بار بار خوف کے مارے سن ہو رہا تھا۔ اگر یہ لوگ میری لاش کو واقعی آگ لگا دیتے ہیں تو میں تو جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔ مجھے تو کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔ ایک امید تھی کہ شاید میرا دوست سانپ مجھے بچانے کا کوئی جتن کرے مگر وہ تو خود سپیرے کی قید میں تھا۔ یا اللہ تو ہی میری مدد کر۔

بوڑھے فوجی کے اشارے پر دونوں فوجی گارڈ آگے بڑھے۔ انہوں نے میری لاش کو اٹھایا اور ڈولی ڈنڈا کرکے اس تہہ خانے سے نکال کر دوسرے چھوٹے سے کمرے میں لے آئے۔ یہاں دو تین تین سٹریچر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک سٹریچر پر ڈال دیا۔ بوڑھا فوجی افسر چلا گیا تھا۔ جوان فوجی افسر ساتھ آیا تھا۔ اس نے گارڈز کو کہا۔

"لاش کو تھیلے میں بند کر دو۔"

ایک فوجی سنتری سیاہ کپڑے کا بنا ہوا لمبا سا تھیلا کہیں سے نکال کر لے آیا۔ دونوں فوجیوں نے مل کر سٹریچر پر لیٹے لیٹے مجھے تھیلے میں بند کر دیا۔

"اسے اٹھا کر آفیسرز میس والے چھوٹے دروازے سے نکال کر قلعے کے پیچھے جو گھاٹی ہے وہاں لے چلو۔ جلدی کرو۔"

مجھے ایک سنتری نے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتنا مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میرے دوست سانپ نے میرے جسم میں پورا زہر داخل نہیں کیا۔ صرف اتنا زہر داخل کیا ہے جس سے میں بے حس ہو گیا ہوں۔ بے ہوش بھی نہیں ہوا۔ سوال یہ تھا کہ سانپ کا مجھے بے حس کرنے سے کیا مقصد تھا؟ کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ جب یہ لوگ میری لاش جنگل میں پھینک دیں گے تو کچھ دیر بعد خود بخود ہوش میں آ جاؤں گا اور پھر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کیونکہ وہ خود تو میری مدد کو آ نہیں سکتا تھا۔ سپیرے

نے اسے بند کر رکھا تھا۔

سنتری مجھے کاندھے پر ڈالے لئے جا رہا تھا۔ کبھی وہ سیڑھیاں چڑھتا۔ کبھی نیچے اترتا۔ میرے سر کی جانب سے تھیلے کا منہ پوری طرح بند نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے زمین پر روشنی سی نظر آئی۔ پھر یہ روشنی غائب ہو گئی۔ دو فوجیوں کی دور سے باتیں کرنے کی آواز آئی جو آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ سنتری اترائی اترنے لگا۔ شاید وہ اس گھاٹی میں اتر رہا تھا جہاں میری "لاش" کو آگ لگائی جانے والا تھی۔ سانپ کے زہر سے تو میں بچ گیا تھا لیکن آگے سے بچتا نظر نہیں آتا تھا۔ میری "لاش" کے تھیلے کو ایک جگہ گرا دیا گیا۔ میں زمین پر گرا لیکن مجھے ذرا بھی محسوس نہ ہوا کہ زمین نرم ہے یا سخت۔ اس سے مجھے یہ تسلی ضرور ہو گئی کہ میرا جسم پتھر نہیں ہوا۔ ورنہ میری دوست سانپ جس کو ڈستا تھا۔ اس کا جسم پتھر بن جاتا تھا۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زمین پر ایک رخ کو بے حس پڑا تھا۔ مجھے جوان فوجی افسر کی آواز آئی۔

"درختوں کی موٹی موٹی شاخیں کاٹ کر لاش کے اوپر ڈال دو۔ اس کی چتا بنا دو تاکہ یہ پوری طرح سے صبح تک جل کر راکھ ہو جائے۔"

میں اسی طرح پڑا رہا۔ مجھے درختوں کی ٹہنیاں کھینچ کر توڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر میرے اوپر درختوں کے ٹہن گرنے لگے۔ مجھے صرف ان موٹی ٹہنیوں کا دباؤ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں اور موٹی ٹہنیاں بار بار مجھ پر گر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ ان لوگوں نے میری "لاش" کے اوپر لکڑیوں کا انبار لگا دیا ہے۔

اب واقعی موت میرے سامنے آ گئی تھی۔ اب مجھے سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا آخری وقت آگیا اور خدا نے میری موت کا یہی وقت مقرر کیا تھا اور مجھے اسی طرح مرنا تھا۔ میں آنکھ کے پپوٹے بھی نہیں ہلا سکتا تھا ورنہ میں اپنی آنکھیں

ضرور بند کرلیتا۔ مجھے فوجی جوان کی آواز سنائی دی۔

"چتا کو آگ لگا دو۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے لکڑیوں اور خشک پتوں کے جلنے کی بو محسوس ہوئی۔ میری چتا نے آگ پکڑ لی تھی۔ اب صرف آگ کو میری لاش تک پہنچنا باقی تھا۔ میری چتا کے پاس تین آدمی تھے۔ جو مجھے نظر تو نہیں آتے تھے مگر ان کی آوازیں میں سن رہا تھا۔ وہ شاید اس وقت تک وہاں کھڑے رہنا چاہتے تھے۔ جب تک کہ میری لاش کے اوپر رکھی ہوئی لکڑیاں پوری طرح آگ نہیں پکڑ لیتیں۔ اچانک ان کی باتیں کرنے کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

میں سمجھ گیا کہ وہ لکڑیوں کو آگ لگا کر چلے گئے ہیں۔ میری "لاش" کپڑے کے تھیلے میں بند تھی۔ چونکہ میرے جسم کو کچھ احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مجھے گرمی بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن میری ناک میں دھواں گھسنے لگا تھا۔ میرا سانس اتنی آہستگی سے چل رہا تھا کہ صرف ڈاکٹر ہی پتہ چلا سکتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک طرح سے موت کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ اطمینان ضرور تھا کہ چونکہ میرا جسم بے حس ہو چکا ہے۔ اس لئے مجھے جلنے کی تکلیف نہیں ہوگی لیکن میرا ذہن زندہ تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ آگ جب میرے سارے جسم کو جلا کر میرے دماغ تک پہنچے گی تو مجھے بے حد تکلیف اور اذیت سے گذرنا پڑے گا۔ میں چاہتا تھا کہ چیخ مار کر کسی کو مدد کے لئے پکاروں مگر میری آواز بند تھی۔

اب مجھے لکڑیوں کے چٹخنے کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی تھی۔ انہوں نے میرے پاؤں کی طرف سے آگ لگائی تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ لکڑیوں کو کتنی آگ لگ چکی ہے اور آگ کہاں تک پہنچی ہے؟ میں آنکھیں بھی بند نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایسے بے جان پتھر کی طرح آہستہ آہستہ آگ پکڑتی چتا پر پڑا تھا

جس کے اندر کسی نے انسانی دماغ فٹ کر دیا ہو۔ وہ دماغ سوچ رہا ہو اور موت کو قریب آتے محسوس کر رہا ہو۔

درد اور کرب سے گذرتے ہوئے
میں نے دیکھا ہے خود کو مرتے ہوئے

آج بھی جب میں اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت کا تصور کرتا ہوں تو دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ خدا دشمن پر بھی وہ وقت نہ لائے۔

عین اس وقت مجھے ایک بڑی مانوس آواز سنائی دی۔ پہلی بار آواز سنی تو مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے اسے اپنا وہم ہی سمجھا۔ لیکن جب دوسری اور تیسری بار وہی آواز بلند ہوئی اور آواز بڑے قریب آ گئی تو میرا دل زور زور دے دھڑکنے لگا۔ یہ خوشی کی دھڑکن تھی۔ کیونکہ یہ آواز میرے دوست سانپ کی پھنکار تھی۔ تیسری پھنکار کے ساتھ ہی مجھے اپنی آنکھوں کے آگے سے کوئی شے رینگ کر گذرتی نظر آئی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ میرا دوست سانپ ہی تھا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے سے گذر گیا تھا۔ لکڑیوں کو لگی ہوئی آگے کی عجیب سی آواز بلند ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ میرا دوست سانپ کہاں چلا گیا۔ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ مجھے یہاں سے کیسے نکالے گا؟ وہ میری کس طرح مدد کرے گا؟

ایک دم سے مجھے اپنے جسم کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا ہلایا۔ وہ ہلنے لگا۔ پھر دوسرے پاؤں کا انگوٹھا بھی میرے ہلانے پر ہلنے لگا۔ پھر میں نے ہاتھ ہلایا۔ میرے ہاتھ میں بھی زندگی کی طاقت واپس آنے لگی تھی۔ میں اپنی آنکھوں کو بھی حرکت دے سکتا تھا۔ میں نے آنکھوں کے ڈیلوں کو ہلا کر اپنی ٹھوڑی کی طرف دیکھا۔ تھیلے کے اندر اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن اب چونکہ میرے جسم میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ اس لئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دوست سانپ میری گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے اور اس

نے اپنا منہ اس جگہ پر رکھا ہوا ہے۔ جہاں سپیرے نے مجھے اسی سانپ سے ڈسوایا تھا۔

دس پندرہ سیکنڈ کے اندر اندر میرے جسم کی ساری توانائی واپس آ گئی۔ میں نے پوری طاقت سے بازو تھیلے سے باہر نکال کر اپنے آپ کو لکڑیوں کے انبار سے باہر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرے اوپر ان کم بختوں نے کافی لکڑیاں ڈال دی تھیں۔ میں سخت گھبرا گیا تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر اپنے اوپر لدی ہوئی درخت کی شاخوں کو پرے ہٹایا اور بڑی شکل سے لکڑیوں کی چتا سے چوہے کی طرح رینگ کر باہر گر پڑا۔ باہر گرتے ہی بس اٹھا اور دوڑ کر چھ سات قدم آگے جا کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا کہ لکڑیوں کے آدھے انبار میں سے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔ میں نے اپنا پاؤں اور ٹانگوں پر ہاتھ پھیرا۔ میرے پاؤں اور ٹانگیں اگرچہ تھیلے میں ھیں مگر وہ گرم ہو چکی تھیں۔

لکڑیوں کے انبار سے جو شعلے اٹھ رہے تھے۔ میں نے ان کی روشنی ں چتا کے پاس ہی تین انسانوں کو زمین پر پڑے دیکھا۔ میں اٹھ کر ان کے ریب گیا۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ ان میں سے ایک جوان فوجی افسر تھا اور دو جی سپاہی تھی جو مجھے اٹھا کر یہاں آگ میں جلانے کے لئے لائے تھے۔

میں نے انہیں باری باری چھو کر دیکھا۔ ان کے جسم پتھر بن چکے تھے۔ ، مردہ تھے۔ میں سمجھ گیا کہ پاس لکڑیوں کے انبار میں آنے سے پہلے میرے ست سانپ نے ان دشمنوں کو پوری طاقت سے ڈس کر ان کا کام تمام کر دیا ا۔ میں نے اپنے دوست سانپ کو آواز دی۔

"میرے دوست! تم کہاں ہو؟ میں تمہارا بے حد شکر گذار ہوں۔"

سانپ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ چتا کے شعلوں کی وہاں کافی روشنی ہو ی تھی۔ یہ جگہ پہاڑی کی گھاٹی میں نیچے اتر کر آتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر

اپنے دوست سانپ کو آواز دی۔ میرے تیسری بار پکارنے پر سانپ نے ہلکی سی پھنکار میں جواب دیا۔ پھر ایک طرف جھاڑیوں میں سے میرا وہی پرانا دوست سانپ نکل کر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور گردن اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

”دوست! تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ اگر اس وقت اللہ کے حکم سے میری مدد کو نہ آتے تو میرا زندہ بچنا محال تھا۔“

یہ بھی خدا کی عجیب قدرت تھی کہ میرے دوست سانپ کو جس سپیرے نے پکڑا تھا۔ بنگلور کے فوجی قلعے کے افسر اسی سپیرے کو مجھے سانپ سے ڈسوانے کے لئے لے کر آ گئے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مسبب الاسباب ہے - جب وہ اپنے بندے پر مہربان ہوتا ہے تو برے حالات میں بھی ایسے سبب پیدا کر دیتا ہے کہ طوفان میں پھنسی ہوئی کشتی کنارے پر آن لگتی ہے اور کسی کو یقین نہیں آتا کہ ایسا معجزہ بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اگر فرض کر لیا کہ فوجی افسر کسی دوسرے سپیرے کو لے آتے اور وہ مجھے اپنے سانپ سے ڈسواتا تو میں تو مارا گیا تھا۔ مگر قدرت نے ایسا سبب پیدا کیا کہ وہی سپیرا آیا جس کے پاس میرا دوست سانپ تھا اور پھر میرا دوست سانپ اتنا ذہین تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی عقل عطا کر دی تھی کہ اسے حکم دیا کہ تمہارے دوست حیدر علی کو دشمنوں نے لکڑیوں کے انبار کے نیچے دبا کر آگ لگا دی ہے۔ سپیرے کی قید سے نکل بھاگو اور اپنے دوست کی مدد کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرا دوست سانپ کس طرح سپیرے کی قید سے نکل کر مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ سانپ مجھے یہ ساری باتیں نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے سانپ کو بڑے پیار سے اٹھا لیا اور اس کے سر پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

”اب تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے۔“

میں نے دیکھا کہ اس کے جواب میں سانپ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ پہلے میں کبھی اس سے اس قسم کی بات کرتا تھا تو وہ ضرور سر ہلا کر مجھے جواب دیتا تھا۔ وہ کچھ خاموش بھی تھا۔ یعنی اپنے سر کو کوئی زیادہ حرکت نہیں دیتا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی کے دباؤ میں ہے۔ کچھ مجبور سا ہے۔ بہرحال میں نے اسے اپنی میلی کچیلی پتلون کی جیب میں رکھنے کی بجائے اپنی بش شرٹ کی جیب میں رکھ لیا جو اتنے دن میرے ساتھ اذیتیں اٹھا اٹھا کر جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اب مجھے وہاں سے بھاگنے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ میں جل کر مرا نہیں تھا بلکہ وہاں ایک فوجی افسر اور دو بھارتی فوجی جوانوں کی لاشیں بھی پڑی تھیں۔ میرا وہاں سے بھاگ جانا ضروری تھا۔

میں گھاٹی میں مشرق کی طرف اترنے لگا۔ گھاٹی تھوڑا نیچے اترنے کے بعد ایک طرف کو گھوم گئی تھی۔ یہ دو پہاڑی ٹیلوں کی دیواروں کے درمیان ایک کھڈ کی طرح تھی جو کشادہ تھی اور جس کی دونوں طرف جھاڑیاں اور اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ زمین پتھریلی اور اونچی نیچی تھی۔ میں اس کمزور حالت میں بھی جتنی تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا۔ کچھ دور تک لکڑیوں کی آگ کے شعلوں کی روشنی میری راہ نمائی کرتی رہی۔ پھر یہ روشنی پیچھے رہ گئی اور میں اندھیرے میں آگیا۔ یہ شروع رات کا وقت تھا۔ رات ابھی اتنی زیادہ نہیں گذری تھی۔ میں گھاٹی میں چلتا گیا۔ ایک جگہ چڑھائی آ گئی۔ یہاں گھاٹی ختم ہو جاتی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ سامنے دور روشنیوں کی قطار جھلملا رہی تھی۔ یہ کوئی سڑک ہی ہو سکتی تھی۔ پیچھے دیکھا تو پہاڑی کے اوپر بھی جگہ جگہ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ وہ فوجی قلعہ تھا جہاں سے میں جان بچا کر بھاگا جا رہا تھا۔ سوال یہ تھا؟ کہ میں کہاں جا رہا تھا؟ مجھے کہاں جانا چاہئے تھا؟ میں کمانڈو شیر باز کا پتہ لگائے بغیر کشمیر کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر وہ ابھی تک اس منحوس قلعے میں بھارتی قیدوبند کی صعوبتیں اٹھا رہا تھا تو میرا فرض تھا کہ میں اسے وہاں سے نکالوں۔

اپنے مجاہد عالمگیر کے مکان پر جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بھارت کی ملٹری انٹیلی جنس اتنی احمق نہیں تھی۔ وہ ہمارا پیچھا کرتی ہوئی جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ ریسٹ ہاؤس عالمگیر کا ہے۔ ہو سکتا ہے ملٹری پولیس نے عالمگیر کو بھی حراست میں لے کر اس سے پوچھ گچھ کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ثبوت نہ ملنے اور عالمگیر کے پرانے شہری ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا گیا ہو لیکن یہ طے شدہ امر تھا کہ عالمگیر کی نگرانی ضرور ہو رہی ہوگی۔ انٹیلی جنس کے آدمی کسی نہ کسی بھیس میں عالمگیر کے مکان اور اس کے جنگل والے ریسٹ ہاؤس کے گرد ضرور منڈلا رہے ہوں گے۔ ایسی صورت حال میں میرا عالمگیر کے مکان یا اس کے ریسٹ ہاؤس میں کھلے بندوں جانا اپنے آپ کو اور عالمگیر کو انتہائی مصیبت میں ڈالنے کے برابر تھا۔ رات کی تاریکی میں دور نظر آنے والی رشنیوں کی طرف جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے کہاں جانا چاہئے۔

سب سے پہلے مجھے چھپنے کے لئے کوئی محفوظ ٹھکانہ چاہئے تھا۔ بنگلور میں سوائے عالمگیر کے میرا اور کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ عالمگیر ہی مجھے کوئی محفوظ ٹھکانہ بتا سکتا تھا اور عالمگیر ہی شیر باز خان کا سراغ لگا کر مجھے بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں پر ہے اور کس حال میں ہے۔ اس واسطے میرا عالمگیر سے رابطہ پیدا کرنا اشد ضروری تھی۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں کسی طرح جنگل والے ریسٹ

ہاؤس کے آس پاس کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں اور ریسٹ ہاؤس کے عثمان بابا سے ملنے کی کوشش کروں۔ کیونکہ عثمان بابا کے ذریعے ہی میں عالمگیر سے ملاقات کر سکتا تھا۔ میں نے جنگل والے ریسٹ ہاؤس کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا دوست سانپ میری جیب میں تھا۔ میں بنگلور شہر سے کافی دور تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح سے ہوا کہ جس فوجی گاڑی میں ملٹری کے جوان مجھے گرفتار کر کے لائے تھے وہ بنگلور شہر سے نکلنے کے بعد دیر تک سفر کرتی رہی تھی۔ میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں تھا کہ میں سڑک پر کوئی لاری یا بس پکڑ کر شہر تک جا سکتا۔ یہی کچھ سوچتے اور چلتے چلتے میں اسی سڑک پر آگیا۔ جس کے کھمبوں کی روشنیاں میں نے دور سے دیکھی تھیں۔ مجھے اس طرف سے اطمینان تھا کہ فوج میرا پیچھا نہیں کر رہی ہوگی۔ کیونکہ وہ تو اپنی طرف سے مجھ آگ میں جلا کر ختم کر چکے تھے۔ البتہ ایک بات ضرور تھی کہ صبح جب انہیں گھاٹی میں ایک فوجی افسر اور دو فوجی جوانوں کی لاشیں ملیں گی تو فوج کو ضرور شک پڑ جائے گا کہ کہیں میں ان فوجیوں کو ہلاک کر کے فرار تو نہیں ہو گیا۔ بوڑھا فوجی جس کے حکم پر مجھے سپرد آتش کیا گیا تھا۔ جلی ہوئی لکڑیوں کے انبار کی راکھ ضرور دیکھے گا۔ جب اسے وہاں میری ہڈیاں اور کھوپڑی وغیرہ نہیں ملے گی تو اسے یقین ہو جائے گا کہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور جاتے جاتے اس کے ایک فوجی افسر اور دو جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار گیا ہوں۔ اس کے بعد فوجی جوان اور ملٹری انٹیلی جنس میری تلاش میں نکل پڑیں گے۔ وہ شہر کی ناکہ بندی کر دیں گے اور عالمگیر کے مکان کی نگرانی بھی زیادہ سخت کر دی جائے گی مگر میرے خیال کے مطابق بھارتی فوجیوں کی لاشوں کا راز دن کے وقت ہی کھل سکتا تھا لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بوڑھا فوجی افسر یہ معلوم کرنے واردات کی جگہ پر خود چل کر آ جائے کہ اس کا ساتھی جوان افسر ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر میری تلاش میں فوج اور پولیس کو رات ہی شہر کو کھنگالنا شروع کر دے گی۔

اس اعتبار سے مجھے جتنی جلدی ہو سکے ریسٹ ہاؤس کے جنگل میں پہنچ کر کسی جگہ چھپ جانا چاہئے۔

میں جس سڑک پر نکل آیا تھا وہ پکی تھی مگر اتنی بڑی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ قصبوں کو جانے والی سڑک ہے ۔ میں نے اپنا رخ شہر کی طرف کر لیا کیونکہ شہر میں ہی ایک ایسا چوک تھا جس کی مجھے شناخت تھی اور جہاں سے عالمگیر کے جنگل والے ریسٹ ہاؤس کو راستہ جاتا تھا۔ یہ چوک ریلوے سٹیشن سے کوئی دو ایک فرلانگ پہلے آتا تھا۔ پہلے سے کسی گاڑی کی روشنی سڑک پر پڑی ، میں سڑک سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کوئی بس ہے یا موٹر کار ہے کیونکہ ہیڈ لائیٹس کی روشنیاں بڑی تیز تھیں ، میں نے اسے ہاتھ دیا مگر گاڑی تیزی سے گزر گئی۔ وہ موٹر کار تھی۔ کار کا ڈرائیور بھی سچا تھا۔ رات کو اکثر راہ زنی کی وارداتیں ہوتیں تھیں ، وہ کسی اجنبی کو لفٹ دے کر خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں سڑک پر آگے کو چل پڑا۔ کچھ دور مجھے سرخ بتی نظر آئی۔ یہ سرخ بتی کسی گاڑی کی معلوم ہوتی تھی۔ ذرا آگے گیا تو دیکھا کہ ایک پرانی سی موٹر کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ ایک آدمی بونٹ اٹھائے انجن کو ٹھیک کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ میں اس کے پاس گیا تو اس نے بونٹ گرایا اور مجھے دیکھا۔ یہ ایک ہٹا کٹا مضبوط آدمی تھا۔ شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔ میں کھمبے کی بتی کی روشنی میں کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"اگر تم آگے جا رہے ہوں تو مجھے سٹیشن تک لفٹ دے دو - بڑی مہربانی ہو گی"

اس آدمی نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"تم کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو - مجھے تو تم چور لگتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں چور نہیں ہوں - شریف آدمی ہوں - پیچھے ایک فیکٹری میں کام

کرتا ہوں۔ آخری بس نکل گئی تھی۔ سٹیشن سے ذرا پہلے میرا کوارٹر ہے۔ لفٹ دے دو تو مہربانی ہو گی۔"

وہ دو قدم چل کر میرے بالکل سامنے آ گیا۔ کہنے لگا۔

"ذرا اپنی تلاشی تو دو۔ کوئی مال وال بھی ہے یا نہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے میری بش شرٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس جیب میں میرا دوست سانپ تھا۔ جیسے ہی اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا سانپ پھنکار کر اس کی کلائی سے لپٹ گیا۔ اس آدمی کے حلق سے ڈراؤنی چیخ نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کو زور سے جھٹکا۔ سانپ اس کی کلائی سے اچھل کر اس کی گردن کے ساتھ لپٹ گیا اور اپنا منہ کھول کر اس کے منہ کے پاس لا کر زور زور سے پھنکارنے لگا۔ وہ آدمی تھر تھر کانپنے لگا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"بھگوان کے لیے اپنے سانپ کو اتارو۔ تم جہاں کہو گے میں وہاں پہنچا دوں گا۔"

میں نے سوچا کہ اب اس کے ساتھ بیٹھ کر جانا ٹھیک نہیں۔ یہ گواہ بن جائے گا اور پولیس کو بتا دے گا کہ اس قسم کے کپڑوں والا آدمی مجھے ملا تھا اور فلاں جگہ اتر گیا تھا۔ میں بڑی آسانی سے اسے کہہ سکتا تھا کہ اسی طرح بیٹھ کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی چلاؤ اور مجھے سٹیشن تک لے چلو مگر اس طرح سے وہ گواہ بن جاتا تھا۔ میں نے سانپ سے کہا۔

"میرے دوست! اگر تم میری زبان پہلے کی طرح سمجھ رہے ہو تو اس شخص کو کچھ دیر کے لیے بے ہوش کر دو۔"

اتنا سن کر میرے دوست سانپ نے اس آدمی کی گردن پر ڈس لیا۔ وہ آدمی دھڑام سے گر پڑا۔ سانپ اس کی گردن سے اتر کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ بے ہوش آدمی کو گھسیٹ کر سڑک کے

کنارے درختوں کے نیچے اندھیرے میں ایک طرف ڈال دیا۔ خود گاڑی میں بیٹھ کر انجن سٹارٹ کیا۔ انجن سٹارٹ ہو گیا۔ میں نے گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا۔ کافی دیر تک گاڑی غیر آباد علاقے میں سے گزرتی رہی پھر دونوں جانب آبادیوں کی روشنیاں شروع ہو گئیں۔ میں نے ایک جگہ کچھ دکانوں کے پاس گاڑی روک کر معلوم کیا کہ سٹیشن کو کون سی سڑک جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ میں جس سڑک پر جا رہا ہوں یہ سیدھی ریلوے سٹیشن کو جاتی ہے۔ میں گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد مجھے دور سے ریلوے سٹیشن کی روشنیاں دکھائی دیں۔ میں نے سڑک کے آس پاس کی کوٹھیوں اور کارخانوں کی چمنیوں کو پہچان لیا تھا۔ آخر مجھے وہ سڑک نظر آ گئی جو بڑی سڑک میں سے نکل کر جنگل کی طرف جاتی تھی۔ میں نے گاڑی کو اس سڑک پر ڈال دیا۔ یہ سڑک چھوٹی تھی۔ اور اس پر روشنی نہیں تھی۔ میں رات کی تاریکی میں موٹر کار آہستہ آہستہ چلاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ پکی سڑک ختم ہو گئی تھی اور پتھریلا راستہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ اونچا نیچا راستہ تھا۔ میں نے اس راستے کو بھی پہچان لیا۔ یہ عالمگیر کے ریسٹ ہاؤس والے جنگل کو جانے والا شارٹ کٹ راستہ تھا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس بجھا دی تھیں اور چھوٹی بتیاں روشن کی ہوئی تھیں۔ گاڑی جنگل میں سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف بڑا تالاب آیا جس میں اترنے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں خوش ہو گیا۔ اسی تالاب کی دوسری جانب سنبل اور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے درمیان عالمگیر ریسٹ ہاؤس تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ موٹر کار کو تالاب میں ڈبو دینا چاہئے کیونکہ اگر میں نے اسے جنگل میں یونہی چھوڑ دیا تو پولیس اسے تلاش کر لے گی اور سمجھ جائے گی کہ میں ریسٹ ہاؤس میں آیا تھا۔ پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے مجھے اسی میں واپس جانا پڑے۔ چنانچہ میں نے کار کو اپنے پاس ہی رکھا اور تالاب کے

دوسرے کنارے درختوں کے نیچے اندھیرے میں گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور پیدل ہی ریسٹ ہاؤس کی طرف چلنے لگا۔ جنگل میں رات کا اندھیرا بڑا گہرا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ میں بڑا محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ رات کے وقت ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کی بتی بجھا دی جاتی تھی۔ اس کی عالمگیر نے خاص طور پر عثمان بابا اور دوسرے نوکروں کو ہدایت کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے مجھے ریسٹ ہاؤس نظر نہ آیا مگر میں اندازے سے چلا جا رہا تھا۔ جب اندھیرے میں درختوں کے درمیان ریسٹ ہاؤس کی عمارت کا سیاہ ہیولا سا ابھرا تو میں رک گیا۔ دائیں بائیں، آمنے سامنے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ کان لگا کر خاموشی کو سنا کہ کسی طرف سے کوئی آواز تو نہیں آرہی۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں رات کے وقت سیکریٹ پولیس کا کوئی آدمی چھپ کر نگرانی تو نہیں کر رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں ہے تو میں ریسٹ ہاؤس کے صدر دروازے کی طرف جانے کی بجائے کچن کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عثمان بابا رات کو کچن میں ہی سوتا ہے۔ میں اوپر سے ہو کر جا رہا تھا اور اس طرح قدم اٹھا کر رکھ رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ نہ پیدا ہو۔ کیونکہ وہاں گھاس سوکھی تھی۔ درختوں کے نیچے ہونے کی وجہ سے وہاں شبنم نہیں گرتی تھی۔

میں دبے پاؤں چلتا کچن کی پچھلی دیوار کے پاس آگیا۔ کچن میں بھی اندھیرا تھا، میں کچن کے دروازے کی طرف آیا تو دیکھا کہ باہر چارپائی پر عثمان بابا گہری نیند سو رہا تھا۔ وہاں بھی بتی نہیں جل رہی تھی۔ میں کچھ دیر وہاں اندھیرے میں کھڑا ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر میں نے عثمان بابا کا شانہ ہلا کر اسے جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا۔

"بابا! میں ہوں حیدر علی۔"

وہ بولا۔ "اس وقت؟ خیریت تو ہے؟"

میں نے کہا۔ "باورچی خانے میں آ جاؤ اور اونچی مت بولنا۔"

ہم باورچی خانے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ہمیں اندھیرے میں ایک دوسرے کے چہرے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میرے اور کمانڈو شیر باز کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے یہ بھی نہ بتایا کہ میں کس طرح فوجی کیمپ سے بھاگ کر آ رہا ہوں۔ سانپ میری جیب میں ہی تھا اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنا سر جیب سے باہر نہیں نکالا تھا۔ میرا دوست سانپ بڑا وضع دار اور ادب و آداب والا تھا۔ میں نے عثمان بابا سے کہا۔

"بات یہ ہے کہ یہاں کی خفیہ پولیس ہمارے پیچھے کچھ زیادہ ہی پڑ گئی ہے۔ اس وجہ سے میں نے کمانڈو شیر باز کو دوسری جگہ پر چھپا دیا ہے۔ میں خود اس لیے رات کی تاریکی میں یہاں آیا ہوں کہ خفیہ والوں کو خبر نہ ہو سکے۔"

عثمان بابا کو جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ہمارے بارے میں اتنا معلوم تھا کہ ہم کشمیری مجاہد ہیں اور نور بانو کو دشمنوں کی قید سے نکالنے کے مشن پر آئے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نور بانو کو ہم نے اس کے گھر سرینگر پہنچا دیا ہے مگر اب ہم کسی دوسرے مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم کیا کر رہے تھے، اس کی ہلکی سی بھنک بھی ہم نے عثمان بابا کو نہیں پڑنے دی تھی۔ یہ راز داری بہت ضروری تھی۔ میں نے عثمان بابا سے کہا۔

"میں عالمگیر کے مکان پر بھی اسی لیے نہیں گیا کہ کہیں خفیہ پولیس کو اس پر بھی شک پڑ جائے۔ میری عالمگیر سے ملاقات بہت ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح عالمگیر سے رابطہ پیدا کر کے اسے بتاؤ کہ میں یہاں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"

عثمان بابا کہنے لگا۔

"آپ اسے فون کیوں نہیں کر دیتے۔ ریسٹ ہاؤس میں فون موجود ہے۔"

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہاں کا فون خفیہ پولیس چیک کر رہی ہو۔ یرے فون کرنے سے پولیس کو پتہ چل جائے گا کہ میں یہاں پر ہوں اور عالمگیر سے میرا باقاعدہ رابطہ ہے -<

عثمان بابا کی سمجھ میں بات آگئی - کہنے لگا۔

”تو پھر میں ایسا کرتا ہوں جناب کہ صبح صبح شہر چلا جاتا ہوں۔ عالمگیر ماحب سے مل کر انہیں بتا دوں گا کہ آپ یہاں پر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔

” تمہیں بہت محتاط ہو کر جانا ہو گا۔“

وہ بولا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب۔ میں تو ہفتے میں ایک بار سودا لف خریدنے کے لیے شہر جاتا ہی رہتا ہوں۔ پھر بھی میں ہوشیار ہو کر جاؤں ۔“

میں نے کہا۔ ”اب سوال یہ ہے کہ میں یہاں کہاں چھپ سکتا ہوں - یسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

عثمان بابا کچھ دیر غور کرتا رہا پھر بولا۔

”ہمارے کوئلے کے جو بھٹے ویران پڑے ہیں آپ وہاں رہ سکتے ہیں۔ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے اور قریب ہی چھوٹی نہر بھی بہتی ہے ال آپ کو پانی وغیرہ کی آسانی رہے گی۔ باقی ناشتہ وغیرہ میں آپ کو کسی نہ کسی رح پہنچا دیا کروں گا۔ آپ اس وقت تو کچن میں ہی سو جائیں۔ صبح منہ ھیرے میں آپ کو اٹھا دوں گا۔“

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے“۔

ریسٹ ہاؤس کا کچن چھوٹا نہیں تھا۔ اس کا فرش پکا تھا۔ عثمان بابا نے رسے بانس کی چھوٹی چارپائی لا کر کچن میں ڈال دی۔ میں اس پر پڑ گیا۔ عثمان

بابا کچن کا دروازہ بند کر کے باہر والی چارپائی پر سو گیا۔ سانپ اس وقت بھی م
جیب میں تھا۔ میں نے سونے سے پہلے اسے کہہ دیا تھا کہ میں سونے لگا ہوں
میری جیب میں ہی سو جانا - اگر کہیں جانا ہو تو چلے جانا اور اس کے بعد میری ج
میں واپس آ جانا۔

صبح کی اذان کے وقت عثمان بابا نے مجھے جگا دیا اور کہنے لگا۔

"میں نماز پڑھ کر شہر چلا جاؤں گا۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں کو.
کے بھٹوں پر لئے چلتا ہوں۔ تم میرے آنے تک وہیں بیٹھنا"۔

یہ کہہ کر وہ کچن سے باہر نکل گیا۔ میں نے چارپائی پر سے اٹھتے ہی س
سے پہلے اپنی جیب میں دیکھا۔ میرا دوست سانپ جیب میں ہی تھا۔ میں عثمان
کے ساتھ چل پڑا۔ بھٹے وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہ تین چار بھٹے تھے
زمین کے اندر گول گول گڑھے بنے ہوئے تھے جن کے اوپر گنبد بنائے گئے تھے
اوپر چھوٹی چمنیاں لگی تھیں۔ ان میں ایک طرف تازہ ہوا کے لیے سوراخ ۔
ہوئے تھے۔ میں ایک بھٹے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ یہ کافی بڑا بھٹہ تھا۔ اندر سورا
میں سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ ٹھنڈی جگہ تھی۔ عثمان بابا کہنے لگا۔

"میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں - دن کے وقت اگر باہر نکلنا ہو تو زیادہ آ.
مت جانا"۔

عثمان بابا چلا گیا۔ ابھی جنگل میں رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے
بھی نیند آ رہی تھی۔ میں بھٹے کے اندر تازہ ہوا والے سوراخ کے پاس زمین
لیٹ کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو سوراخ میں سے دن کی روشنی اندر آ رہ
تھی۔ بھٹے سے باہر نکلا۔ درختوں پر کچھ پرندے بول رہے تھے۔ دن کافی چڑھ '
تھا۔ درختوں کے اوپر آسمان بالکل صاف نظر آ رہا تھا دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ میں
نیچے تھوڑی سی اترائی اترا تو سامنے چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے جیب
میں سے سانپ کو بڑے پیار سے نکال کر گھاس پر رکھ دیا اور کہا۔

"میرے دوست! اگر تمہیں نہانا ہو تو تم بھی ندی میں نہا لو۔ میں تو نہانے لگا ہوں"۔

میں ندی میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ نہانے کے بعد میرا دکھتا ہوا بدن زیادہ دکھنے لگا۔ یہ جسم بھارتی فوجیوں کی بڑی مار برداشت کر چکا تھا۔ میں نے پتلون اور پھٹی پرانی بش شرٹ پہنی اور بھٹے کے اندر جانے کی بجائے ذرا دور ہٹ کر ایک جگہ جھاڑیوں میں جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ پانی میں نے ندی پر پی لیا تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میں ریسٹ ہاؤس کے کچن میں جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ملٹری پولیس کو اب تک اپنے فوجیوں کی لاشیں مل چکی ہوں گی اور بوڑھے فوجی افسر نے میری چتا کی راکھ کرید کر دیکھ لیا ہو گا کہ وہاں میری ایک بھی ہڈی نہیں ہے اور اسے یقین ہو گیا ہو گا کہ میں تینوں فوجیوں کو ہلاک کرنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ چنانچہ اس وقت ملٹری پولیس اور سول پولیس شہر میں جگہ جگہ مجھے تلاش کرتی پھر رہی ہو گی اور عین ممکن تھا کہ وہ اس ریسٹ ہاؤس کی طرف بھی آتے۔

اسی وجہ سے میں ریسٹ ہاؤس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے مجھے ریسٹ ہاؤس اور کچن کی پچھلی دیوار اور صحن نظر آ رہا تھا۔ سانپ میری جیب سے باہر نکل آیا تھا۔ شاید وہ جنگل کی سیر کرنے جانا چاہتا تھا۔ وہ میری ہتھیلی سے بار بار نیچے پھسل آتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"دوست! اگر تیرا دل سیر کرنے کو چاہتا ہے تو بے شک جنگل میں سیر کرنے چلا جا مگر زیادہ دور نہ جانا اور زیادہ دیر نہ لگانا، اسی جگہ واپس آ جانا"۔

میں نے اسے گھاس پر رکھ دیا۔ سانپ تیزی سے رینگتا درختوں کی طرف چلا گیا۔ اتنے میں مجھے جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میرے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شاید عالمگیر خود جیپ لے کر آ گیا تھا۔ وہاں سے مجھے ریسٹ ہاؤس کا سامنے والا حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیپ سامنے والے حصے میں ہی آ کر

کھڑی ہو گئی تھی۔ اور اس کا انجن بند ہو گیا تھا۔ میرے دل میں آیا کہ میں اٹھ کر ریسٹ ہاؤس کی طرف جاؤں لیکن پھر احتیاط کے خیال سے وہیں بیٹھا رہا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ڈھلان کے اوپر عالمگیر نمودار ہوا۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر تیزی سے ڈھلان اتر کر بھٹوں کی طرف آ گیا۔ وہ بھٹوں کو دیکھنے لگا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی خفیہ پولیس والا تو نہیں لگا ہوا۔ جب وہاں کوئی اجنبی مجھے نظر نہ آیا تو میں نے عالمگیر کو آواز دی۔

وہ میرے پاس آ گیا۔

کہنے لگا۔

"پولیس تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ شیر باز کہاں ہے۔ ہوا کیا تھا؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے ساری داستان سنا دی۔ کہنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک سانپ نے تمہاری مدد کی ہو۔ سانپ تمہاری مدد کیسے کر سکتا ہے۔ وہ تو انسان کا دشمن ہے"۔

میں نے کہا۔

"اب وہ جنگل میں سیر کرنے گیا ہوا ہے۔ ابھی آئے گا تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میرا کتنا قابل اعتماد دوست ہے"۔

وہ بولا۔

"تمہیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ یہ جگہ یقینی طور پر خفیہ پولیس کی نگاہ میں ہے۔ پولیس میرے پاس بھی آئی تھی۔ اگر میں یہاں کا پرانا سوشل ورکر نہ ہوتا اور میں نے اپنی ایک سماجی حیثیت نہ بنائی ہوتی اور سرکاری افسروں سے تعلقات نہ بنا کر رکھے ہوتے تو میں اس وقت جیل میں بند ہوتا"۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا پولیس کو پتہ چل گیا ہے کہ تمہارا ہم لوگوں سے رابطہ ہے"۔

عالمگیر کہنے لگا۔

"تم ان باتوں کو چھوڑو - میں نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں رفع دفع کرا لیا ہے مگر پولیس تمہیں اور شیر باز کو شکاری کتوں کی طرح تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ میں اس وقت بھی بڑا لمبا چکر کاٹ کر ایک دوسرے راستے سے یہاں آیا ہوں اور زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا"۔

میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا ساتھی کمانڈو شیر باز کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ مجھے یقینی رپورٹ ملنی چاہئے کہ وہ کس جگہ پر ہے تاکہ میں اس کو وہاں سے فرار کرانے کی کوئی سکیم بنا سکوں"۔

عالمگیر کہنے لگا۔

سب سے پہلے تو تم یہاں سے نکل چلو۔

میں نے کہا۔

"یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟"

عالمگیر کہنے لگا۔

"جہاں میں تمہیں لے جاؤں - بہرحال یہاں سے فوراً" نکل چلو"۔

میں نے کہا۔

"مجھے اپنے سانپ دوست کا انتظار کرنا ہو گا"۔

عالمگیر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کر دی ہو۔ کہنے لگا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ اٹھو میرے ساتھ آؤ۔ سانپ کو چھوڑو۔ اپنی جان بچانے کی کوشش کرو کیونکہ اس بار تم پکڑے گئے تو دشمن تمہیں چتا میں جلانے کی حماقت نہیں کرے گا بلکہ تم اسی وقت شوٹ کر دئیے جاؤ گے"۔

میں نے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔ میں سانپ کو آواز دیتا ہوں"۔

وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہونٹوں کو سکیڑ کر ایک خاص طریقے سے سیٹی کی آواز نکالی۔ یہ آواز میں نے آدھے سیکنڈ کے وقفے سے تین بار نکالی اور جدھر سانپ گیا تھا اس طرف دیکھنے لگا۔ عالمگیر بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں میرا دوست سانپ مجھے نظر آگیا۔ وہ بڑی تیزی سے رینگتا ہوا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ عالمگیر نے چھوٹے سے بھورے رنگ کے سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کے پرے جا کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

"عالمگیر بھائی! گھبراؤ نہیں۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا"۔

مگر عالمگیر ڈر کے مارے میرے قریب نہیں آتا تھا۔ میں نے اس کے سامنے سانپ کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور عالمگیر سے کہا۔

اب چلو کہاں چلنا ہے۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جنگل میں وہاں سے اندر کی جانب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر لے گیا۔ وہاں زنگ آلود سیاہ چٹانوں کے درمیان ایک جھونپڑا نما لکڑی کا بوسیدہ کیبن بنا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

یہاں ہم کبھی تیار کیا ہوا کچا کوئلہ سٹور کیا کرتے تھے۔ جب سے میں نے کوئلے کا کام چھوڑا ہے یہاں کوئی نہیں آتا۔ سٹور خالی پڑا ہے تم یہاں رہنا۔ عثمان بابا تمہیں آ کر کھانا وغیرہ دے جایا کرے گا۔ اس دوران میں اپنے خفیہ طریقے سے شیر باز کا پتہ چلاتا ہوں۔ میں تمہارے لیے شہر سے کچھ کپڑے اور کھانے کو بھی لاتا تھا جو جیپ میں ہی پڑا ہے۔ عثمان بابا تمہیں دے جائے گا۔

اب میں چلتا ہوں۔ خبردار یہاں سے ادھر ادھر مت جانا اور ہوشیار رہنا۔

عالمگیر چلا گیا۔ میں بوسیدہ کیبن میں آ کر بیٹھ گیا۔ کونے میں ابھی تک

لوئلے کی کچھ بوریاں پڑی تھیں۔ لکڑی کا فرش گندا ہو رہا تھا۔ میں نے ایک
لرف سے تھوڑا سا صاف کیا اور کیبن کے دروازے میں ایک طرف ہو کر باہر
ل طرف دیکھا۔ باہر جنگل ہی جنگل تھا۔ چٹانیں تھیں، جھاڑیاں تھیں اور اونچے
ونچے درخت تھے۔ میں نے سانپ کو جیب سے نکال کر کہا۔

”میرے دوست، مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے لیے دودھ کا انتظام
میں کر سکا۔ عثمان بابا آئے گا تو اس سے کہہ کر تمہارے لیے دودھ منگوا لوں
ا“۔

کوئی دس پندرہ منٹ بعد عثمان بابا درختوں میں سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ میں تھیلا پکڑا ہوا تھا۔ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ تھیلے میں میرے لئے کیلے کے پتوں میں لپٹی ہوئی بریانی تھی۔ تھرمس بوتل پانی سے بھری ہوئی تھی۔ نسواری رنگ کی ایک بش شرٹ اور اسی رنگ کی ایک پرانی سی ٹھنڈی پتلون تھی۔ میں نے سب سے پہلے پرانے پھٹے ہوئے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہنے۔ کھانا کھایا۔ پانی پیا اور عثمان بابا سے کہا۔

"بابا! مجھے ایک بوتل دودھ بھر کر لا دو۔"

وہ بولا۔

"دودھ کا کیا کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"بس دودھ پینے کو جی چاہتا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔

"اچھی بات ہے۔ میں تھوڑی دیر میں چکر لگاؤں گا تو لیتا آؤں گا۔"

عثمان بابا چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دودھ کی بوتل لے کر آیا اور کہنے لگا۔

"اب میں رات کو تھوڑا بہت کھانا لے کر آؤں گا۔ یہ کچھ موم بتیاں اور ماچس ہے۔ رات کو ضرورت کے وقت روشن کر لیں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے سانپ کو کپ میں ڈال کر دودھ پلایا۔

سانپ دودھ پی کر میری جیب میں واپس جانے کی بجائے وہیں کونے میں مزے سے بیٹھ گیا۔ اسی طرح شام ہو گئی۔ جنگل میں اندھیرا اترنے لگا۔ درختوں پر بسیرا کرتے پرندے شور مچانے لگے۔ جیسے جیسے شام گہری ہوتی گئی پرندوں کا شور کم ہوتا گیا۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو جنگل پر خاموشی کا راج ہو گیا۔ جنگل کی اس خاموشی کا میں عادی ہو چکا تھا۔ عثمان بابا میرے لئے کھانا لے کر آ گیا۔ میں نے عالمگیر کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگا۔

"صاحب دوبارا نہیں آئے۔ ان کا کوئی فون بھی نہیں آیا۔"

میں نے پوچھا۔

"کوئی اجنبی آدمی تو تمہیں ادھر ادھر پھرتا نظر نہیں آیا؟"

عثمان بابا نے کہا۔

"میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ یہاں تو کوئی نہیں آیا؟ یہاں بھی بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیا۔"

عثمان بابا صبح صبح میرے لئے چائے اور ناشتہ لانے کا کہہ کر تھرمس بوتل لے کر چلا گیا۔ پانی سے بھری ہوئی بڑی تھرمس وہ دن کے وقت ہی میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اب جنگل کی رات پھر میرے سامنے تھی۔ مچھروں نے حملہ شروع کر دیا تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ کل کی رات بھی جنگل میں کسی شیر چیتے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ میں آگ روشن نہیں کر سکتا تھا۔ دھونی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ تاکہ مچھروں سے کچھ بچاؤ ہو جائے۔ کیبن کے اندر گرمی تھی اور مچھر بہت زیادہ تھے۔ کیبن کے باہر بھی مچھر تھے مگر گرمی نہیں تھی۔ میں کیبن کے باہر ایک طرف ہو کر لکڑی کے تختے پر لیٹ گیا۔ یہ تختہ کسی کمرے کا اکھڑا ہوا دروازہ تھا۔ نہ جانے رات کے کس لمحے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھا تو سپیدہ سحری نمودار ہو چکا تھا۔ درختوں پر پرندے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے گیت گا رہے تھے۔ میرے بدن کی دردیں اب ٹھیک ہو گئی تھیں۔

میں نے اپنے دوست سانپ کو دودھ پلایا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں عثمان بابا میرے لئے ناشتہ اور چائے لے کر آگیا۔ کہنے لگا۔

"میں آپ کے لئے ناشتہ بنا رہا تھا کہ صاحب کا ٹیلی فون آگیا۔"

"عالمگیر بھائی کا فون تھا؟"

مین نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں! کہہ رہے تھے کہ حیدر علی کو کہہ دینا کہ میں آج شام اندھیرا ہونے کے بعد کسی وقت آؤں گا۔"

میں خوش ہوا۔ مجھے یقین تھا عالمگیر نے شیر باز کا ضرور کچھ نہ کچھ سراغ لگا لیا ہوگا۔ میرا دن کیبن کے اندر بیٹھے اور کسی وقت باہر نکل کر درختوں کے نیچے ٹہلتے گذر گیا۔ شام کا وقت آیا۔ مجھے عالمگیر کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہوگیا تو عالمگیر بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"یہاں کوئی مشکوک آدمی تو تمہیں نظر نہیں آیا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ دو دن سے سوائے عثمان بابا کے اور کسی انسان کی شکل تک نہیں دیکھی۔ تم بتاؤ بھائی شیر باز کا کچھ پتہ چلا؟"

عالمگیر میرے پاس ہی کیبن کے اندر بیٹھ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"شیر باز کو ملٹری انٹیلی جنس والے تمہارے فرار کے بعد بنگلور کے تاریخی قلعے والے کیمپ سے نکال کر منڈھیل چھاؤنی لے گئے ہیں۔"

"یہ منڈھیل چھاؤنی کہاں ہے؟"

میں نے پوچھا۔

نگیر بولا۔

"یہ چھاؤنی چھتری والی پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں یہاں انگریزی فوج رہا کرتی تھی۔ آج کل یہاں پر گولہ بارود اور دوسرے

جنگی ساز و سامان کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ جس کی حفاظت کے لئے فوج کی ایک پلاٹون ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہاں حکومت کے مخالف سیاسی قیدیوں کو بھی قید میں رکھا جاتا ہے۔ یہاں پر ٹارچ سیل بھی ہیں جہاں ان سیاسی قیدیوں کو مختلف اذیتیں دے کر ان سے حسب منشا بیان لکھوائے جاتے ہیں۔ چھاؤنی کا یہ چھوٹا سا ٹیلہ دریائے کرشنا کے کنارے پر ہے اور یہاں سے جنوب کی طرف اس کا فاصلہ پچاس ساٹھ کلو میٹر ہے لیکن جنگل جنگل اگر جائیں تو آدھا فاصلہ رہ جاتا ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ عالمگیر کہنے لگا۔

"تم ضرور شیر باز کو وہاں سے نکالنے کے بارے میں سوچ رہے ہو گے مگر اس خیال کو بھول جاؤ کیونکہ چھتری والی چھاؤنی میں جو کوئی ایک بار لایا جاتا ہے تو پھر اس کی لاش بھی باہر نہیں نکلتی۔ دوسرے وہاں سیکورٹی کا انتظام اتنا سخت ہے کہ کوئی چڑیا بھی فوج کی اجازت کے بغیر چھاؤنی کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتی۔" میں نے عالمگیر کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"عالمگیر بھائی! کیا تم مجھے یہ پتہ کروا کر بتا سکتے ہو کہ چھتری والی چھاؤنی میں شیر باز کو کس جگہ پر قید میں رکھا گیا ہے؟"

عالمگیر کو بڑا تعجب ہوا کہ میں نے اس کے انتباہ پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگا۔

"اس کے لئے تو اپنے کسی خاص جاسوس کو وہاں بھیجنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"وہ کتنا وقت لگائے گا۔ کیونکہ میں شیر باز کو وہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکال لانا چاہتا ہوں۔ کوئی پتہ نہیں بھارتی فوجی اسے بھی کب موت کی نیند سلا دیں۔"

عالمگیر نے فوراً" میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ دس پندرہ سیکنڈ خاموش

بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تم مجھے دو دن کی مہلت دے دو۔ میرا خیال ہے ان دو دونوں میں اپ
آدمی یہ سراغ بھی لگا لے گا۔"

میں نے کہا۔

"خدا کرے ان دو دنوں میں شیر باز خان کو کچھ نہ ہو لیکن عالمگیر بھائی
اس سے زیادہ دیر نہیں لگنی چاہئے۔"

عالمگیر چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے دو دن گذارنے قیامت بن گئے۔ یہ
بڑی غنیمت کی بات تھی کہ اس دوران وہاں کوئی خفیہ پولیس والا نہ آیا اور میں
محفوظ رہا۔ عثمان بابا مجھے برابر منہ اندھیرے اور شام کے وقت کھانا وغیرہ پہنچاتا
رہا۔ میرے دوست سانپ کے واسطے دودھ بھی ملتا رہا۔ آخر کسی نہ کسی طرح دو
دن گذر گئے۔ تیسرے دن عثمان بابا ناشتہ لے کر آیا تو اس نے خوشخبری دی کہ
عالمگیر بھائی آج شام کو آ رہا ہے۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ شام
ذرا گہری ہوئی تو عالمگیر درختوں میں سے گذر کر کیبن کی طرف آتا نظر پڑا۔ میں
کیبن کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ اس کے آتے ہی میں نے پوچھا۔

"کچھ کامیابی ہوئی؟"

عالمگیر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہاں جو اپنے آدمی کام کر رہے ہیں وہ بڑے جانباز ہیں اور اپنی جان
خطرے میں ڈال کر بھی راز معلوم کرکے لے آتے ہیں۔"

"پھر کیا پتہ چلا؟"

"پتہ یہ چلا ہے۔" عالمگیر نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کہ چھتری والی
چھاؤنی کے ٹیلے کے اوپر ساتھ ساتھ تین کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان کوٹھڑیوں
میں سے ایک کوٹھڑی میں کمانڈو شیر باز قید ہے۔"

"وہاں سیکورٹی کی کیا پوزیشن ہے؟"

میرے سوال پر عالمگیر کہنے لگا۔

"بھائی فوجی چھاؤنیوں میں ویسے بھی سیکورٹی بڑی سخت ہوتی ہے اور یہ تو ایسی چھاؤنی ہے کہ جہاں بھارتی حکومت اپنے خطرناک سیاسی قیدیوں اور جاسوسوں کو قیدی بنا کر رکھتی ہے۔ یہاں تو سیکورٹی بہت ہی زیادہ سخت ہوگی۔ ویسے جتنا کچھ ہمارا جاسوس معلوم کر سکا ہے۔ اس کی روشنی میں معلوم ہوا ہے کہ ٹیلے پر واقع چھاؤنی کی طرف کسی سویلین کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی مقامی گجریا سبزی فروش سبزی وغیرہ لے کر اوپر نہیں جا سکتا۔ وہاں پر مقیم فوجیوں کے لئے راشن فوجی ٹرک لے کر آتا ہے۔ چھاؤنی کے گرد پتھر کی مضبوط چار دیواری اوپر تک گئی ہوئی ہے۔ چاروں کونوں پر چار اونچے واچ ٹاور بنے ہوئے ہیں۔ جہاں سے ہر وقت سرچ لائیٹ کی روشنیاں دیواروں پر پڑتی رہتی ہیں۔ یہ روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ اگر دیوار پر کوئی مکھی بھی بیٹھے تو واچ ٹاور کے گارڈز کو نظر آ جاتی ہے۔ جس طرح قیدیوں کی کوٹھڑیاں ہیں ان کی پچھلی دیوار ٹیلے سے نیچے گھاٹی تک بالکل سیدھی چٹان کی طرح چلی آتی ہے۔ یعنی کوئی اگر چاہے تو رسی کی مدد سے بھی اوپر نہیں چڑھ سکتا۔ اگر چڑھنے کی کوشش بھی کرے تو واچ ٹاور کے سنتری اسے سرچ لائٹ کی روشنی میں بڑی آسانی سے یکھ لیں گے اور مشین گن کے ایک ہی برسٹ سے اس کا کام تمام کر دیں گے۔"

عالمگیر مجھے بڑی مایوس کن باتیں سنا رہا تھا مگر میرا خدا جانتا ہے کہ میں یوس نہیں تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے ایک تو دا پر ہمیشہ بھروسہ رہا ہے کہ اگر آدمی کی نیت نیک ہے۔ اس کی عقل ٹھکانے ہے اور اس کا مشن محب الوطنی کا مشن ہے اور اس کے ارادے مضبوط ہیں تو ر اس کی کامیابی یقینی ہے۔ اس وقت بھی جب ہمارا مجاہد ساتھی عالمگیر مجھے تری والی چھاؤنی کی ناقابل شکست سیکورٹی کا حال سنا رہا تھا تو میرا دل مجھے کہہ

رہا تھا کہ حیدر علی اپنے دل کو مضبوط رکھو اور اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔ دشمن
چاہے چھاؤنی میں توپیں لگا دے تم اپنے غازی ساتھی شیر باز کو نکالنے میں ضرور
کامیاب ہو جاؤ گے۔

میں نے عالمگیر سے پوچھا کہ ٹیلے کے پیچھے جو دریا بہتا ہے وہ ٹیلے سے
کتنے فاصلے پر ہے۔ اس کے جواب میں عالمگیر بولا۔

"دریا ٹیلے کے جنوب مشرقی سمت بالکل ساتھ ہی بہتا ہے۔ ٹیلے کی
ڈھلان اور دریا کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہے۔ جہاں جنگلی جھاڑیاں اور سر
کنڈے ہیں۔"

میں نے اپنے آپ کو اس مشن کے لئے تیار تو کر لیا تھا مگر مجھے اپنی اس
کمزوری کا احساس تھا کہ منڈھیل چھاؤنی کا علاقہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ مجھے
وہاں کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جس کو میں اپنا خفیہ ٹھکانہ بنا کر چھاؤنی والے
ٹیلے کا سروے کر سکوں۔ اس کے علاوہ مجھے وہاں کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی
جو خاص بھروسے کا آدمی ہو اور مشن میں مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ
مجھے فراہم کر سکے۔ میں تو وہاں کسی کو جانتا نہیں تھا اور میرا مشن انتہائی خفیہ اور
خطرناک تھا۔ میں اس بارے میں خود کسی اجنبی شخص کو اعتماد میں نہیں لے سکتا
تھا۔ جب میں نے اپنی اس تشویش کا عالمگیر سے اظہار کیا تو وہ کہنے لگا۔

"مجھے پہلے ہی سے اس حقیقت کا احساس تھا کہ اکیلے اس مشن میں
تمہیں بہت سی مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ بہت سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس
کا حل میں نے تلاش کر رکھا ہے۔"

اس نے بتایا کہ بنگلور سے ایک آدمی میرے ساتھ منڈھیل چھاؤنی
جائے گا جو مجھے وہاں منڈھیل قصبے کے ایک آدمی سے ملائے گا۔ وہ آدمی بھی اپنا
خاص مجاہد اور تحریک آزادی کشمیر کے لئے وہاں بیٹھا خاموشی سے اپنا کام کر رہا
ہے۔ وہ مجاہدین کو منڈھیل چھاؤنی سے کشمیر کے بھارتی فوجی یونٹوں کو سپلائی کئے

جانے والے اسلحہ سے باخبر رکھتا ہے۔ یہ سن کر مجھے کافی حد تک اطمینان ہوا۔ عالمگیر کہنے لگا۔

"تمہیں اس مشن کے لئے جس قسم کے اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔ منڈھیل چھاؤنی والا اپنا مجاہد تمہیں وہ اسلحہ مہیا کر دے گا۔"

میں نے اس آدمی کے بارے میں جب عالمگیر سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ چھاؤنی کے قصبے میں کیا کام کرتا ہے تو اس نے مجھے اس کا نام بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہاں کیا کام کرتا ہے۔ میں آپ کو اپنے اس مجاہد کا اصلی نام نہیں بتاؤں گا۔ یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ وہاں کس قسم کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ صرف اتنا بتاؤں گا کہ وہ منڈھیل چھاؤنی والے ٹیلے کے قریب جو انڈین آرمی ایوایشن کا کیمپ بنا ہوا تھا وہاں وہ گراؤنڈ شاف میں مکینک کا کام کرتا تھا۔ اس کا فرضی نام بشیربٹ رکھ لیں۔ عالمگیر نے بتایا کہ بشیربٹ کا تعلق وادی کشمیر سے ہے مگر اس کے آباؤاجداد سو سال پہلے کشمیر سے نکل کر حیدر آباد دکن میں آباد ہو گئے تھے۔ بشیربٹ تامل اور تلیگو دونوں زبانیں روانی سے بول لیتا تھا۔ ایسا آدمی میرے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے عالمگیر سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں کل صبح یہاں سے منڈھیل چھاؤنی کی طرف چل پڑوں گا۔

عالمگیر کہنے لگا۔

"نہیں تم کل صبح نہیں جا سکو گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنا جو خاص آدمی تمہارے ساتھ بھیجنا ہوگا۔ جو منڈھیل چھاؤنی تک تمہاری راہ نمائی کرے گا اور تمہیں بشیربٹ سے ملوائے گا اس سے میری ملاقات کل دوپہر کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ اب پروگرام یوں بنے گا کہ میں کل شام کو اپنے خاص آدمی کو تمہارے پاس یہاں بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں رات کو یا صبح صبح منہ اندھیرے

یہاں سے لے کر نکل جائے گا۔ وہ منڈ ھیل چھاؤنی والے جنگل کے مختصر راستے سے واقف ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں جنگل کا یہ سفر پیدل چل کر طے کرنا ہوگا۔"

پھر کچھ دیر باتیں کرنے اور مجھے منڈ ھیل چھاؤنی کے بارے میں بعض ضروری باتیں بتانے کے بعد عالمگیر چلا گیا۔ دوسرے روز شام سے ذرا پہلے عالمگیر کا خاص آدمی جس کو میں مجاہد کے نام سے ہی پکاروں گا میرے پاس جنگل میں پہنچ گیا۔ مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا۔ میرے پاس کیبن کے اندر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ منڈ ھیل چھاؤنی کس وقت جانے کا پروگرام ہے۔ مجاہد بولا۔

"ہم منہ اندھیرے نکلیں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں ہم دن کے وقت وہاں پہنچیں۔"

میں نے کہا۔

"جنگل میں سے وہاں تک کتنا فاصلہ ہوگا؟"

وہ بولا۔

"بیس کلومیٹر ہے۔ اگر ہمیں دریا میں کوئی کشتی مل گئی تو یہ فاصلہ اس سے بھی آدھا ہو سکتا ہے۔ بہرحال ہم اگر منہ اندھیرے روانہ ہوئے تو کل دوپہر تک یا دوپہر کے بعد منڈ ھیل چھاؤنی کے قصبے میں پہنچ جائیں گے۔"

جس طرح مجاہد نے کہا ویسے ہی ہمارا پروگرام طے ہوگیا۔ رات ہم نے وہیں گذاری۔ صبح نماز کے وقت عثمان بابا ہمارے لئے ناشتہ اور چائے لے کر آگیا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ چائے کی ایک ایک پیالی پی اور اور اللہ کا نام لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

مجاہد مجھے جنگل کے کنارے کنارے لے کر چل رہا تھا۔ یہاں جنگل اتنا گنجان نہیں تھا۔ زیرہ برساتی نالے اور گھاٹیاں بھی نہیں تھیں۔ راستے میں جنگلی دیہاتیوں کے جھونپڑوں کے قریب سے بھی گذرے۔ سورج نکل آیا تھا۔ گرمی

اور حبس ہو رہا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے تاکہ جلدی نہ تھک جائیں۔ کیونکہ سفر لمبا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ایک کھلی پتھریلی جگہ پر آ گئے۔ ہمارے ایک جانب چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ پھیلا تھا اور دوسری جانب گھنے جنگل کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم تھوڑا بہت کھانا ساتھ لائے تھے۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ مجاہد کہنے لگا۔

"ان ٹیلوں کے پیچھے دریا بہتا ہے۔ یہ دریا زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ٹیلوں میں سے گذرنے کی وجہ سے اس کا پاٹ چھوٹا ہے مگر پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ اگر وہاں ہمیں کوئی ادھر ادھر پڑی ہوئی چھوٹی کشتی مل گئی تو ہم زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں منڈھیل چھاؤنی کے قصبے کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم دریا کی سمت چل پڑے۔ دو تین ٹیلوں میں سے گذرنے کے بعد ہم دریا پر پہنچ گئے۔ دریا کا پاٹ واقعی چھوٹا تھا مگر پانی تیزی سے بہہ رہا تھا کیونکہ یہ دریا ٹیلوں کے درمیان سے ادھر ادھر گھومتا ہوا بہہ رہا تھا۔ مجاہد ایک جگہ کھڑا بڑے غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں کوئی کشتی وغیرہ دکھائی نہیں دے رہی۔ ہمیں دریا کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔"

ہم دریا کے کنارے سرکنڈوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے آگے
۔۔۔۔ ہم ایک ٹیلے کے نشیب میں سے گذر کر باہر آئے تو میرا ساتھ
مجاہد رک گیا۔ وہ ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اس طرف دیکھا تو وہا
کچھ فاصلے پر تاڑی کے درختوں کے نیچے جھونپڑیاں نظر آئیں۔ مجاہد کہنے لگا۔
"یہ ماہی گیروں کے جھونپڑے ہیں۔ آگے ہمیں کوئی نہ کوئی کشتی ضرو
مل جائے گی۔ آ جاؤ۔"
ہم کنارے کنارے چل پڑے۔ ذرا آگے گئے تو وہاں چھوٹی چھوٹی
کشتیاں کھڑی تھیں۔ مجاہد نے مجھے ہدایت کی کہ کشتیوں کے قریب سے خاموش
سے گذر جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہاں کوئی ماہر گیر نہیں تھا۔ کچھ دور جا
مجاہد زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی وہیں سرکنڈو
کے پیچھے بیٹھ گیا۔ مجاہد جیسے گھات لگا کر بیٹھا تھا اور اس طرف دیکھ رہا تھا جد
ماہی گیروں کی کشتیاں تھیں۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہاں آس پاس کوئی آد
نہیں ہے تو بولا۔
"تم اسی جگہ بیٹھے رہو۔ میں کشتی لے کر آتا ہوں۔ جب میں کشتی ۔
کر آؤں تو تم بالکل تیار رہنا اور جتنی جلدی ہو سکے کشتی میں سوار ہو جانا۔"
وہ اٹھ کر چل دیا۔ میں اسے کشتیوں کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔
جھک کر چل رہا تھا۔ سب سے آخر میں جو کشتی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر ب
گیا۔ پھر جلدی سے اٹھا۔ کشتی کا لنگر کھولا۔ اسے دریا میں دھکیلا۔ اس ن

چھلانگ لگائی اور چپو چلاتا میرے طرف بڑھنے لگا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کنارے پر آیا اور کشتی کو دیکھنے لگا۔ دریا کا پانی تیز تھا۔ کشتی بڑی تیزی سے میری طرف آ رہی تھی۔ مگر وہ کنارے سے پندرہ بیس فٹ دور تھی۔ کشتی قریب آئی تو مجاہد نے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں دریا میں کود گیا اور کشتی کی طرف تیرنے لگا۔ کشتی رک نہیں سکتی تھی۔ میں تیز تیز تیر رہا تھا۔ مجاہد نے پانی میں چپو میری طرف بڑھایا۔ چپو میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی ڈونگا سی تھی مگر بڑی پختہ تھی۔ مجاہد چپو چلاتے ہوئے کشتی کو وسط میں لے آیا۔ ہنس کر بولا۔

"ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پیچھے کوئی نہیں آیا۔ یہ لوگ بڑے تجربہ کار تیراک اور کشتی دان ہوتے ہیں۔"

میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ابھی تک ہمارے پیچھے کوئی ماہی گیر نہیں آیا تھا۔ دریا کا بہاؤ ہمیں ٹیلے کی دوسری طرف لے گیا۔ یہاں پانی کی لہریں بڑی تیز رفتار تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ہم تین چار ٹیلوں کے درمیان سے گذر گئے۔ جب ٹیلے ختم ہو گئے تو دریا تھوڑے کھلے میدان میں آگیا تھا۔ میں نے بھی ایک چپو پکڑ لیا۔ کشتی اچھی خاصی رفتار سے آگے بہتی چلی جا رہی تھی۔ مجاہد بولا۔

"اب ہم انشاء اللہ ایک گھنٹے میں اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

دور سے ہمیں ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ مجاہد نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"یہ منڈھیل چھاؤنی کے ٹیلے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹیلے کے اوپر منڈھیل چھاؤنی ہے اور اس کے پیچھے منڈھیل کا قصبہ ہے۔ جو اس چھاؤنی کی وجہ سے آباد ہوگیا ہے۔ اچھا خاصہ قصبہ ہے۔ وہاں ایک سینما ہاؤس بھی ہے۔"

کشتی پہاڑیوں کی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے قریب جاکر دریا دائیں جانب کو مڑ گیا۔ مجاہد نے کہا۔

"وہ اوپر چھتری والی عمارت دیکھ رہے ہو؟"

میں نے پہاڑی ٹیلے پر نگاہ ڈالی۔ ٹیلے کی چوٹی پر عمارت نظر آ رہی تھی جس کے اوپر چھوٹی سی چھتری نظر آ رہی تھی۔ مجاہد بولا۔

"یہ منڈھیل چھاؤنی کی بیرکیں ہیں۔ یہاں فوج کا کیمپ ہے۔"

مجاہد کو معلوم نہیں تھا کہ وہاں انڈین آرمی کا گولہ بارود کا ذخیرہ بھی سٹور کیا ہوا ہے۔ اور اسلحہ کے سٹور بھی ہیں اور تین ایسی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن میں سے ایک کوٹھڑی میں کمانڈو شیر باز قید ہے۔ میں نے دیکھا کہ چھاؤنی کی عمارت کی پچھلی دیوار بالکل چٹان کی طرف نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھی۔ وہاں سے اوپر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ کم از کم میں وہاں سے اوپر نہیں جا سکتا تھا اور مجھے سیدھی چڑھائی چڑھنے کا تجربہ تھا۔ بیرکوں کے اوپر مجھے تین طرف بنے ہوئے واچ ٹاور بھی نظر آ رہے تھے چوتھا واچ ٹاور عمارت کی دوسری طرف تھا۔

ہماری کشتی وہاں سے آگے گزر گئی۔ آگے کچھ فاصلے پر ایک گھاٹ آ گیا۔ جہاں پہلے سے دو تین بڑی کشتیاں کھڑی تھیں۔ یہاں سے مسافر اور دیہاتی لوگ دریا پار کرتے تھے۔ ہم نے کشتی کو کنارے پر لگایا۔ اسے اوپر کھینچ کر ایک طرف کر دیا اور ایک پگ ڈنڈی پر قصبے کی طرف چل پڑے۔ مجاہد نے کہا۔

"اسی قصبے میں اپنا خاص اعتماد والا آدمی بشیر بٹ رہتا ہے۔ اس کا مکان قصبے کے دوسرے کنارے پر ہے۔"

ہم قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ خاصا بڑا قصبہ تھا۔ جس طرح مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کے مکان ہوتے ہیں ویسے ہی ڈھلانی چھتوں والے پتھر اور اینٹوں کی دیواروں والے مکان تھے۔ جھونپڑے بھی تھے۔ کہیں کہیں دو منزلہ عمارتیں بھی تھیں۔ بازار تنگ تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ بازار میں سے بیل گاڑیاں اور مال مویشی گذر رہے تھے۔ لوگوں کا لباس دیہاتی ٹائپ کا تھا۔ کالے اور گہرے سانولے رنگ کے مرد اور عورتیں تھیں۔ عورتیں سرخ اور نیلی ساڑھیوں میں

تھیں۔ اکثر عورتیں اور مرد پاؤں سے ننگے تھے۔ چائے کی اور سگریٹوں کی دکانیں بھی تھیں۔ موٹر رکشا نہیں تھے۔ ان کی بجائے مریل گھوڑوں والے ٹانگے اور آگے چل رہے تھے۔ مجاہد مجھے بشیر بٹ کے گھر لے گیا۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اس کے نوکر نے مجاہد کو پہچان کر اس کو سلام کیا اور حال چال پوچھا۔ مجاہد نے پوچھا کہ بشیر کہاں ہے۔ نوکر نے بتایا کہ وہ کیمپ سے ابھی نہیں آئے۔ تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ اس نے بیٹھک کھول دی۔ ہمارے لئے چائے بنا کر لے آیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ایک کھلتے ہوئے رنگ والا دراز قد جوان بیٹھک میں داخل ہوا۔ مجاہد سے بغل گیر ہو کر اس سے حال چال پوچھا۔ مجاہد نے اس سے میرا تعارف کرایا اور کہا۔

"عالمگیر نے انہیں تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

بشیر بٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے ناں؟ ویسے عالمگیر نے بھیجا ہے تو خیریت نہیں ہوگی۔"

اور وہ دونوں ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ بشیر بٹ میری طرف متوجہ ہوا۔ کہنے لگا۔

"حیدر صاحب! فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں مجاہد کے سامنے اپنے مشن کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مجاہد سے کہا۔

"مجاہد بھائی! میں تنہائی میں بشیر صاحب سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مجاہد ہمارے کام سے بخوبی واقف تھا اور اسے اس کا احساس تھا کہ ہمارے کام میں انتہائی رازداری سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو اپنے قریبی ساتھی سے بھی بعض راز ایک خاص وقت تک پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھا اور بولا۔

"تم لوگ آرام سے باتیں کرو۔ میں اتنی دیر میں قصبے کی سیر کر آتا

ہوں۔"

مجاہد کے جانے کے بعد میں نے بشیر بٹ سے کہا۔

"بشیر صاحب! بات یہ ہے کہ ......"

اور میں نے عالمگیر کی ہدایت کے مطابق بشیر بٹ کو اپنے مشن کی پوری تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ وہ بڑی توجہ سے میری گفتگو سنتا رہا۔ میں کوئی پانچ منٹ تک اسے تمام واقعات کی تفصیل بیان کرتا رہا۔ جب میں خاموش ہوگیا تو بشیر بٹ کہنے لگا۔

"حیدر علی صاحب! اگرچہ آپ کا یہ مشن بڑا مشکل مشن ہے لیکن میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا اور اپنے محب الوطن کمانڈو شیر باز خان کو منڈھیل چھاؤنی سے فرار کرانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔"

میں نے مشن کی کچھ مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اسے بتایا کہ میں نے چھاؤنی کو دور سے دیکھا ہے۔ وہ ٹیلے کی چوٹی پر ہے اور اس کی دیواریں چٹانوں کی طرح بالکل سیدھی ہیں جن پر بڑے سے بڑا کوہ پیما بھی اتنی آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔ بشیر بٹ بولا۔

"اس پر چڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹیلے کی فوجی کوٹھڑیوں تک پہنچنے کی اور بھی کئی ترکیبیں ہو سکتی ہیں۔"

"مثلاً"

بشیر بٹ نے کہا۔

"ابھی آپ آرام کریں۔ رات کو بات کریں گے۔"

ویسے بھی سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملازم نے آکر پوچھا۔

"سر! آج کھانے پر کیا پکاؤں؟"

بشیر بٹ بولا۔

"ہمارے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ بریانی وغیرہ پکاؤ اور دو مرغ روسٹ

کر لو۔"

معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ ہے جس کو
ہ ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال مجھے اس کی مدد چاہئے تھی۔ کیونکہ وہ
نڈین آرمی ایوی ایشن کے گراؤنڈ سٹاف میں تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کے
بیں (BASE) سے آرمی ہیلی کاپٹر شام کو کچھ سپلائی وغیرہ کا سامان لے کر ٹیلے
الی بیرکوں کو جاتے ہیں۔

شام میں نے بشیر بٹ کے مکان پر ہی گذار دی۔ وہ باہر گیا ہوا تھا۔
ات کے پہلے پہر آیا۔ ہم نے بیٹھک میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے
کے بعد کافی پی۔ اس وقت ہم دونوں اکیلے تھے۔ نوکر برتن وغیرہ اٹھا کر جا چکا
ا۔ بیٹھک میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ پنکھا چل رہا تھا۔ بیٹھک کی
ھڑکیاں بند تھیں۔ بشیر بٹ نے اٹھ کر دروازہ تھوڑا سا کھول دیا تاکہ اگر کوئی
ہاں آئے تو وہ نظر آ جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اُس کے ذہن میں شیر باز
مان کو ٹیلے کی فوجی چھاؤنی سے نکالنے کی کونسی سکیم ہے۔ کہنے لگا۔

"چھاؤنی میں چار بیرکیں ہیں۔ اوپر تین کوٹھڑیاں ہیں۔ بیرکوں میں
رہٹہ رجمنٹ کے فوجی رہتے ہیں۔ ان کی نفری سوا سو جوانوں پر مشتمل ہے۔
ن میں فوجی افسر بھی ہیں۔ فوجی افسر الگ کوارٹروں میں رہتے ہیں مگر انہیں اپنی
ملی وہاں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"میں نے دیکھا ہے کہ جن کوٹھڑیوں میں سے ایک کوٹھڑی میں میری
طلاع کے مطابق رکھا گیا ہے وہاں تک پچھلی دیوار کے ذریعے نہیں پہنچا جا سکتا۔
یونکہ دیوار بالکل سیدھی ہے اور بہت اونچی ہے۔ دوسرے اوپر دونوں جانب
اچ ٹاور والے گارڈز کی نظر پڑتی ہے اور رات کے وقت سرچ لائٹ کی روشنی
ھی پڑتی ہے۔"

بشیر بٹ میری طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں اسے موقع دیتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ بشیر بٹ نے کہا۔

"حیدر بھائی! تم ان فوجی بیرکوں پر کمانڈو اٹیک کرو گے۔ کیا تم ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں نے کمانڈو کی ابتدائی تربیت حاصل کی ہوئی ہے۔"

وہ بولا۔

"تمہیں اس سے زیادہ اپنا جوہر دکھانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ کیونکہ تم اکیلے نہیں ہو گے۔ تمہارے ساتھ پانچ جوانوں کا کمانڈو بریگیڈ بھی ہو گا۔"

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے کہا۔

"پانچ جوانوں کا بریگیڈ؟ یہ لوگ کون ہیں؟"

بشیر بٹ بولا۔

"تمہیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری اطلاع کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ پانچ جوان ٹرینڈ کمانڈو ہیں۔ مسلمان مجاہد ہیں۔ ان کا تعلق دکن کے مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم سے ہے جو یہاں کے مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور بھارتی حکومت کی مسلم کش کارروائیوں کا خفیہ طور پر مقابلہ کرتی ہے۔"

میں خاموشی سے بشیر بٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اس تنظیم کے سارے رضا کار کمانڈو ہیں۔ میں شام کو تمہیں یہاں بٹھا کر ان سے ملنے گیا تھا۔ وہ تمہاری مدد کو دل و جان سے تیار ہو گئے ہیں۔"

مجھے کافی اطمینان ہو گیا کہ اب میں شیر باز کو دشمن کی قید سے نکال کر لے جا سکوں گا۔ میں نے بشیر بٹ سے پوچھا کہ ان مجاہدوں سے کہاں ملاقات

ہو گی۔ کیا وہ رات کو یہاں آئیں گے۔

بشیر بٹ بولا۔

"نہیں۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے بلکہ ہمیں ان کے پاس جانا ہو گا۔"

"وہ رہتے کہاں ہیں؟"

بشیر بٹ نے کہا۔

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ لیکن ان کا ایک خفیہ ٹھکانہ ہے۔ تم ان سے اسی خفیہ ٹھکانے پر ہی ملو گے۔"

"یہ ملاقات کب ہو گی؟"

"ابھی آدھ گھنٹے کے بعد ہم یہاں سے نکل پڑیں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ ٹھیک آدھا گھنٹہ گذرا تو بشیر بٹ مجھے ساتھ لے کر مکان سے نکل آیا۔ اس کی پرانی جیپ باہر کھڑی تھی۔ ہم جیپ میں سوار ہو گئے۔ بشیر بٹ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیپ قصبہ منڈھیل کے نیم روشن بازاروں سے نکل کر ایسے علاقے کی طرف آ گئی جہاں دور دور تک رات کی تاریکی تھی۔ کہیں کوئی بتی جھلملاتی ہوئی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے جن کی دھندلی روشنی میں دور پہاڑیوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ بشیر بٹ جیپ کو بڑی مہارت سے چلا رہا تھا۔ راستہ کہیں ہموار تھا اور کہیں پتھروں پر جیپ ہچکولے کھانے لگتی۔ ایک جگہ کچا راستہ نیچے گھاٹی میں اتر گیا۔ یہاں اونچے اونچے درخت تھے۔ ان کے درمیان جیپ ایک طرف رک گئی۔ سامنے درختوں کے پیچھے مجھے یک کیبن سا نظر آیا۔ یہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ بشیر بٹ میری آگے آگے چلتا اس کیبن کے پاس آ کر بولا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔"

کیبن ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس علاقے میں

اسی قسم کے کیبن یا جھونپڑی یا دیہاتی مکان ہوتے ہیں۔ دیواریں پتھر جوڑ کر بنائی جاتی ہیں۔ اوپر کھپریل کی ڈھلوان چھت ڈال دی جاتی ہے۔ باہر ایک برآمدہ ہوتا ہے اور بس۔ بشیر بٹ نے برآمدے میں جاکر دروازے پر آہستہ سے تین بار دستک دی۔ میں نے ایک انسانی سایہ دیکھا جو کیبن کی ایک طرف سے نکل کر تیزی سے بشیر بٹ کے پاس آگیا اور مجھے ایسے لگا جیسے اس سائے نے بشیر بٹ کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لے لیا تھا۔ بشیر بٹ کی گھٹی ہوئی آواز آئی۔ اس نے اپنا اصلی نام بتایا تو انسانی سایہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور جدھر سے آیا تھا اس طرح اندھیرے میں غائب ہوگیا اور بشیر بٹ اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ میں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑا تھا کہ کسی نے اچانک پیچھے سے میری گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لیا۔ میں نے جلدی سے کہا کہ میں بشیر بٹ کے ساتھ آیا ہوں اور میرا نام حیدر علی ہے۔ انسانی سائے نے مجھے اسی وقت چھوڑ دیا اور یہ شخص بھی اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

عین اسی وقت کیبن کا دروازہ کھلا۔ اندر سے موم بتی کی مدھم روشنی باہر آرہی تھی۔ بشیر بٹ باہر نکلا۔ اس نے مجھے بلایا۔ میں آگے بڑھا اور بشیر بٹ کے ساتھ کیبن میں داخل ہوگیا۔ اسی روشنی میں مجھے پانچ آدمی زمین پر بچھی ہوئی ناریل کی صف پر بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے اپنے چہروں اور سروں پر اس طرح کپڑا لپیٹ رکھا تھا کہ ان کی صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ جو چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں بشیر بٹ کے پاس ہی صف پر بیٹھا تھا۔ بشیر نے میرا ان سب سے تعارف کرایا اور کہا۔

"حیدر علی جس مشن پر یہاں آیا ہے۔ اس کے متعلق میں آپ سب مجاہدوں کو تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اب آپ خود حیدر علی سے بات کر لیں۔ میں واپس جاتا ہوں اور صبح منہ اندھیرے آؤں گا۔"

اس سے پہلے کہ میں بشیر کو کچھ کہتا وہ کیبن سے باہر نکل گیا تھا۔ ان

پانچ مجاہدوں میں سے ایک نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے پانچوں مجاہد جو باقاعدہ تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ میری طرف اپنی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ان میں سے ایک کمانڈو میرے بالکل سامنے صف پر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"کمانڈو شیر باز تمہاری اطلاع کے مطابق چھاؤنی کی بیرکوں میں کس جگہ پر قید ہے؟"

میں نے کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق کمانڈو شیر باز کسی بیرک میں نہیں بلکہ اوپر جو تین کوٹھڑیاں ہیں ان میں سے کسی کوٹھڑی میں قید ہے۔"

اس کمانڈو نے اپنے ساتھیوں کو ایک نظر دیکھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تمہیں اس مشن پر ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔ کیونکہ شیر باز خان کی شناخت تم ہی کرو گے۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔"

"کیا تم ٹرینڈ کمانڈو ہو؟"

"تھوڑی سی ٹریننگ ضرور لے رکھی ہے۔"

وہ آدمی جو ان پانچ کمانڈوز کا لیڈر معلوم ہوتا تھا بولا۔

"تھوڑی سی ٹریننگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر تمہارا ہمارے ساتھ جانا بھی ضروری ہے۔ ٹھیک ہے تم ہماری حفاظت میں رہو گے اور کمانڈو شیر باز کی شناخت کراؤ گے۔"

میں نے سوال کیا۔

"ہم چھاؤنی کے ٹارگٹ پر کس طرح سے جائیں گے؟"

لیڈر بولا۔

"یہ تمہیں کمانڈو ایکشن شروع کرنے سے تھوڑی دیر پہلے خودبخود معلوم ہو جائے گا۔ تم یہاں آرام کرو۔ صبح بشیر بھائی آ کر تمہیں واپس لے جائے گا۔ ہمیں جس رات اٹیک کرنا ہو گا تمہیں صبح اطلاع مل جائے گی۔"

اس کے ساتھ ہی پانچوں کمانڈو اٹھے اور ایک دوسرے کے پیچھے کیبن سے باہر نکل گئے۔ میں صف پر اکیلا رہ گیا۔ کونے میں موم بتی جل رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سو جاؤں یا بیٹھا رہوں۔ دروازہ اندر سے بند کروں یا نہ کروں۔ میں اٹھ کر دروازے کو چٹخنی لگانے لگا تو کسی نے باہر سے دھیمی آواز میں کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم موم بتی بجھا کر سو جاؤ۔"

معلوم ہوا کہ کچھ کمانڈو باہر پہرے پر موجود تھے۔ میں نے موم بتی بجھائی اور صف پر کچھ دیر گھٹنوں کو بازوؤں کے شکنجے میں لئے بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ لوگ بڑے زبردست اور جانباز قسم کے مسلمان مجاہد لگتے ہیں۔ خدا جانے انہوں نے کہاں سے کمانڈو ٹریننگ لی ہو گی کیونکہ بھارت میں مسلمانوں کی تنظیموں کی خفیہ پولیس باقاعدہ نگرانی کرتی تھی۔ اس کے بعد میں صف پر لیٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کس وقت مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لیا۔

منہ اندھیرے ایک شخص نے آ کر مجھے جگا دیا۔ میں کلمہ شریف پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک دراز قد جوان کھڑا تھا جس کے چہرے پر کپڑا لپٹا ہوا تھا اور مجھے صرف اس کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے کندھے پر سٹین گن لٹکی ہوئی تھی۔ ان لوگوں میں آ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شیر باز خان کو ہم نکال لائیں گے لیکن پھر خیال آتا کہ منڈھیل چھاؤنی کے ٹیلے پر تو انڈین آرمی کا پورا بریگیڈ بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پاس ہر قسم کا بے پناہ اسلحہ ہے ہم وہاں پہنچیں گے کیسے اور پھر وہاں سے شیر باز خان کو لے کر نکلیں گے کس

طرح؟ کبھی خیال آتا کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے اور کبھی خیال آتا کہ اس کمانڈو ایکشن میں ہم سارے مارے جائیں گے۔ ہمارا مقابلہ انڈین آرمی کے پورے بریگیڈ سے تھا جو ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھا۔

مجھے ان میں سے کسی کا نام معلوم نہیں تھا۔ کسی نے تعارف کے وقت اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں انہیں سیاہ پوش کمانڈوز کہوں گا۔ کیونکہ ان لوگوں نے کالے کپڑے سے اپنا منہ سر چھپایا ہوا تھا۔ جو سیاہ پوش کمانڈو مجھے جگانے آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم ادھر بیٹھے گا ابھی۔"

وہ باہر چلا گیا۔ میں صف پر بیٹھا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد مجھے باہر جیپ کے انجن کی کھڑکھڑ کرتی آواز آئی۔ یہ بشیر بٹ کی جیپ ہی ہو سکتی تھی۔ جیپ رک گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بشیر بٹ کیبن میں آگیا۔ کہنے لگا۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔"

ہم باہر نکل کر خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ چل پڑی۔ درختوں کے جھنڈ میں سے نکلنے کے بعد میں نے بشیر سے پوچھا۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

وہ بولا۔

"واپس گھر جا رہے ہیں۔ رات تمہاری کمانڈو مجاہدوں سے کیا بات ہوئی؟"

میں نے جو بات ہوئی تھی بتا دی اور کہا کہ اب مجھے ان کی طرف سے اطلاع کا انتظار رہے گا کہ وہ کس رات اس مشن پر روانہ ہو رہے ہیں۔ بشیر بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ یہ اطلاع مجھے پہنچا دی جائے گی۔"

میں نے بشیر بٹ سے کہا۔

"انہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔ پلان کیا ہے؟ میں نے پوچھا تھا۔ ان کے لیڈر نے کہا کہ یہ تمہیں وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔"

بشیر کہنے لگا۔

"اس نے ٹھیک کہا ہے۔ اپنے پلان کا انہوں نے میرے ساتھ بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ لوگ بڑے باعمل اور پراسرار ہیں۔ اپنے فیصلے سے کسی کو آگاہ نہیں کرتے۔ پکا ہاتھ ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد یا خود نہیں یا دوسرا نہیں۔"

میں نے بشیر سے کہا۔

"مجھے تو یہ بڑے پراسرار لوگ لگتے ہیں۔"

بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ آسمانوں سے اترے ہوئے فرشتے ہیں جو صرف اسلام کی سربلندی کے لئے کام کر رہے ہیں۔"

میں نے بشیر بٹ سے ان لوگوں کے نام پوچھے تو اس نے کہا۔

"انہوں نے مجھے منع کیا ہوا ہے کہ میں کسی کو ان کے نام نہ بتاؤں۔"

یہ لوگ میرے لئے اور بھی پراسرار ہوتے گئے لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ بھارت میں جہاں مسلمانوں کے جائز حقوق کو بھی پامال کیا جارہا تھا وہاں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جو مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے برسرپیکار ہیں اور گمنامی اور بے غرضی سے کام کر رہے ہیں۔

وہ دن اور دوسرا دن میں نے اپنے مجاہد بشیر بٹ کے مکان پر ہی گذارا۔ تیسرے دن ان پراسرار کمانڈوز کا پیغام آگیا کہ حیدر علی کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ جو آدمی یہ پیغام لے کر آیا تھا۔ میں اسی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی مگر روشنی ارغوانی رنگ کی ہونے لگی تھی۔ جو آدمی مجھے لینے آیا تھا وہ ایک

پرانی جیپ میں بیٹھ کر آیا تھا۔ ہماری جیپ شہر سے نکل کر اسی جنگل کی طرف جا رہی تھی جہاں بشیر مجھے لے گیا تھا۔ یہ آدمی بھی پراسرار تھا۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہیں کی تھی - میں نے جنگل کی بات کی تو خاموش رہا۔ اس کا نام پوچھا تو خاموش رہا۔ اس علاقے کے موسم کی بات کی تو بھی خاموش رہا۔ اس لئے میں بھی خاموش ہوگیا۔

بہرحال میں پانچ پراسرار کمانڈوز کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ یہ ٹھکانہ کہا تھا۔ یہ پہلے والی جگہ نہیں تھی۔ کوئی اور جگہ تھی جہاں ایک بڑے گیراج کے نیچے ایک تہہ خانہ تھا۔ گیراج میں جیپ کھڑی تھی۔ تہہ خانے میں پنکھا چل رہا تھا۔ ایک بلب روشن تھا۔ انہوں نے اپنے منہ اور سر سیاہ بڑے رومالوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھی۔ ان کے درمیان ایک نقشہ رکھا ہوا تھا جس کو وہ غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیڈر نے میرے طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ اور پھر ہاتھ سے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلے سے اپنے ساتھیوں کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں یہاں سے ٹیک آف کرنا ہوگا۔ نمبر تین اور نمبر پانچ' پانچ منٹ پہلے یہاں آکر ہیلی کاپٹر قبضے میں کریں گے۔ اس جگہ جہاں میں نے نشان لگایا ہے۔ چھاؤنی کی خاردار باڑھ لگی ہوئی ہے۔ میں نمبر دو اور نمبر چار اور ہمارا ساتھی حیدر علی اسی جگہ چھپے ہوئے ہوں گے۔ ہیلی کاپٹر اپنے قبضے میں کرنے کے بعد نمبر تین اور نمبر پانچ ہمیں سگنل دیں گے۔ ہم دوڑ کر ھیلی کاپٹر میں بیٹھ جائیں گے اور ھیلی کاپٹر اپنے ٹارگٹ کی طرف پرواز کر جائے گا۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟؟"

لیڈر نے چاروں کمانڈوز کی طرف دیکھا۔ چاروں کمانڈوز نے نفی میں سر ہلائے۔ جس کا مطلب تھا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کے دل میں کوئی سوال نہیں تھا۔ تب لیڈر نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”حیدر علی! منڈھیل چھاؤنی کے بیس کیمپ سے آرمی ایوی ایشن کا ہیلی کاپٹر آج رات معمول کی پرواز پر سپلائی لے کر ٹیلے کی بیرکوں میں جائے گا۔ ہم اس ہیلی کاپٹر پر اٹیک کر کے اسے ہائی جیک کریں گے اور اس میں بیٹھ کر اپنے ٹارگٹ تک پہنچیں گے۔ کوئی اعتراض؟ کوئی سوال؟“

میں نے کہا۔

”نہیں سر! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے دل میں کوئی سوال نہیں۔“

”او کے۔“

لیڈر کمانڈو نے چٹکی بجائی اور اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”چیک کرو۔“

باقی چاروں سیاہ پوش کمانڈوز اپنی اپنی کلائیوں پر بندھی ہوئی گھڑیوں کو دیکھنے لگے۔ انہوں نے لیڈر کی گھڑی سے اپنی گھڑیاں ملا لیں۔ میں نے بھی اپنی گھڑی جو مجھے بشیر بٹ نے دی تھی ملا دی۔ کمانڈو لیڈر نے کہا۔

”ہم آج رات کے دو بجے کمانڈو اٹیک کریں گے۔ تیاریاں شروع کر دو۔“

چاروں پراسرار کمانڈوز نے دیوار میں لگی ہوئی ایک الماری کھول کر اس میں سے اسلحہ نکال کر چیک کرنا شروع کر دیا۔ میں کمانڈو لیڈر کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنی سٹین گن کو کھول کر صاف کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”تم سٹین گن تو ضرور چلا لیتے ہو گے۔“

میں نے کہا۔

”جی ہاں! میں نے اس کی ٹریننگ لی ہوئی ہے۔“

لیڈر نے کہا۔

”او کے۔“

ایک سٹین گن مجھے بھی دے دی گئی۔ ان تمام سٹین گنوں پر فولاد کے سائی لنسر چڑھے ہوئے تھے۔ میں کپڑے سے اسے صاف کرنے لگا۔

رات کا کھانا ان سیاہ پوش کمانڈوز نے شام کو ہی کھا لیا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ ہی تھوڑا بہت کھا لیا۔ اس کے بعد لیڈر کمانڈو نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہم پچھلی رات ٹھیک ڈیڑھ بجے اٹھیں گے۔"

بلب بجھا دیا گیا۔ وہ لوگ وہیں لیٹ گئے۔ میں بھی لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی مگر وہاں ایک دم اتنی خاموشی چھا گئی کہ تھوڑی دیر بعد مجھے بھی نیند آ گئی۔ رات کے ٹھیک ڈیڑھ بجے ایک آدمی نے ہمیں جگا دیا۔ لیڈر کمانڈو نے اٹھتے ہی کہا۔

"اٹھو اٹھو' تیاری تیاری۔ ایمونشن چیک اپ۔"

بلب روشن ہو گیا تھا۔ سب نے سٹین گنوں میں میگزین بھرا۔ فالتو میگزین کی بیلٹ گلے میں لٹکائی۔ سب کو چھ چھ ہینڈ گرنیڈ دے دیئے گئے۔ ایک ایک کمانڈو چاقو دے دیا گیا۔ سب کے سروں پر سیاہ رومال بندھے تھے۔ میرے سر پر بھی سیاہ رومال اسطرح باندھ دیا گیا تھا کہ صرف میری آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ لیڈر نے سٹین گن والا ہاتھ بلند کیا اور کہا۔

"اللہ اکبر۔"

میں نے اور باقی چاروں کمانڈوز نے اس کے ساتھی ہی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ لیڈر نے کہا۔

"بزن۔"

اور چاروں سیاہ پوش کمانڈو دوڑتے ہوئے دروازے سے نکل گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی نکل گیا۔ سب سے آخر میں لیڈر باہر آیا۔ باہر رات تاریک تھی۔ اس اندھیرے میں ہماری جیپ درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ سب جیپ میں اچھل اچھل کر سوار ہو گئے جیپ تیزی سے جنگل میں ایک طرف روانہ ہو گئی۔ جیپ چاروں طرف سے ترپال کی چھت اور دیواروں سے ڈھلکی ہوئی تھی۔ لیڈر کمانڈو خود جیپ چلا رہا تھا۔ اندھیرے میں جیپ خدا جانے کیسے کیسے تنگ و تاریک جھاڑ جھنکاڑ اور سرکنڈوں میں سے ہوتی ہوئی ایک جگہ رک گئی۔ ہم سب جیپ سے اتر آئے۔ کمانڈو لیڈر ایک طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے برابر کھڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان سے روشنی کے دو چار نقطے جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔ لیڈر کمانڈو نے آہستہ سے آواز دی۔

"نمبر تین - نمبر چار۔"

دو سیاہ پوش کمانڈو ایک دم سامنے آ گئے۔ لیڈر نے کہا۔

"گو۔"

دونوں کمانڈو درختوں کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ ہم سب خاموش تھے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب کی نظریں ان درختوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ جن کے درمیان روشنی جھلملاتی نظر آ رہی تھی۔ دونوں کمانڈوز کو گئے ہوئے جب پندرہ منٹ گذر گئے تو لیڈر بولا۔

"کوئی ایمرجینسی پیدا نہ ہو گئی ہو۔"

نمبر پانچ کمانڈو نے کہا۔

"سر! ہم اٹیک کریں گے۔"

لیڈر بولا۔

"ابھی نہیں۔"

اتنے میں دور سے کسی پرندے کے دو بار بولنے کی آواز آئی۔ لیڈر کمانڈو نے فوراً کہا۔

"گو گو۔"

وہ درختوں کی طرف دوڑا۔ اس کے پیچھے نمبر دو کمانڈر ۔ نمبر پانچ اور میں بھی سٹین گنیں پکڑے دوڑ پڑے۔ ہم جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں سے بھاگتے ہوئے نکل گئے۔ آگے خار دار تار کی دیوار آ گئی۔ کمانڈو نمبر ایک نے جیپ سے پلاس نکال کر جلدی جلدی خار دار تار کو ایک جگہ سے کاٹ کر وہاں شگاف ڈال دیا۔ ہم چاروں کمانڈوز اس شگاف میں سے گذر گئے۔ میں سمجھ گیا کہ ہم آرمی ایوی ایشن کے بیس کیمپ میں آ گئے ہیں۔ اس حدود میں داخل ہوتے ہی لیڈر کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ ہم جھک کر ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں آس پاس کچھ فاصلے پر ہینگر سے بنے ہوئے تھے جن کے اونچے دروازوں کے اوپر بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ ایک طرف مجھے ایک ھیلی کاپٹر کھڑا نظر آیا۔ ہم اس کی طرف بڑھنے لگے۔ ہیلی کاپٹر سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر لیڈر نے اشارے سے ہمیں روک دیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیڈر کمانڈو نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کسی پرندے کی باریک سی آواز نکالی۔ اس کے جواب میں جہاں ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ اس طرف سے بھی ویسی ہی آواز بلند ہوئی۔ لیڈر نے جھک کر کہا۔

"گو گو۔"

اور ہم سب جھک جھک کر دوڑتے ہوئے ھیلی کاپٹر کے پاس آ گئے۔ ھیلی کاپٹر کے پیچھے سے دو آدمی تیزی سے نکل کر سامنے آ گئے۔ یہ ہمارے سیاہ پوش کمانڈو نمبر تین اور کمانڈو نمبر پانچ تھے۔ جنہوں نے ھیلی کاپٹر کو اپنے قبضے میں کر لیا ہوا تھا۔ یہ مال بردار سپلائی لے جانے والا بڑا ھیلی کاپٹر تھا۔ ہم سب اس میں گھس گئے۔ لیڈر پائیلٹ کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس نے اشارے سے

اپنی ساتھی والی سیٹ پر بٹھا لیا۔ ھیلی کاپٹر کا انجن غراہٹ کے ساتھ سٹارٹ ہوا اور اس کے ساتھی ہی اس کے بڑے بڑے پنکھے گردش کرنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہوتا گیا۔ ہیلی کاپٹر میں داخل ہوتے ہوئے مجھے اندھیرے میں تین چار آدمی زمین پر پڑے ہوئے نظر آئے تھے۔ جب ھیلی کاپٹر نے فضا میں اوپر جاکر ایک طرف غوطہ لگایا اور اپنا رخ ٹیلے والی فوجی بیرکوں کی طرف کر لیا تو میں نے لیڈر سے پوچھا۔

"نیچے کون لوگ پڑے تھے؟"

لیڈر نے ھیلی کاپٹر کے شور میں چیخ کر کہا۔

"یہ وہ فوجی تھے جن کی جگہ پر ہم بیٹھے ہیں۔ وہ سپلائی لے کر جانے والے تھے۔"

ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ لیڈر نے دو سیاہ پوش کمانڈوز کو جو پہلے بھیجا تھا انہوں نے ھیلی کاپٹر کے عملے کو ہلاک کر کے ھیلی کاپٹر پر قبضہ کر لیا تھا اور اب ان کی جگہ ہم لوگ اپنے ٹارگٹ کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ ٹیلے کی بیرکوں کی روشنی قریب آ رہی تھی۔

ھیلی کاپٹر نے ٹارگٹ پر پہنچ کر بیرکوں کا ایک چکر لگایا اور پھر آہستہ آہستہ ھیلی پیڈ پر اتر گیا۔ لیڈر نے ھیڈ فون پر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ٹارگٹ پر فوراً" پہنچنا ہے گو۔"

اس کے ساتھ ہی ہم بھی سٹین گنیں لے کر چھلانگیں لگا کر نیچے اتر گئے۔ ھیلی کاپٹر کے پنکھے ابھی چل رہے تھے۔ ہم جھک کر ہیلی کاپٹر کے پیڈز کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ تین فوجی ایک بیرک میں سے نکل کر ہماری طرف آئے۔ ان میں سے ایک نے کسی کو پکار کر کہا۔

"حوالدار مرلی۔ ارے میرے لئے سگریٹ لائے ہو کیا؟"

دوسرے نے کہا۔

"پہلے سپلائی تو نیچے اتارو۔"

یہ تینوں بارودی فوجی تھی۔ ہمارے سیاہ پوش کمانڈو ابھی تک ہیلی کاپٹر کے اندر ہی تھی۔ دو فوجی ہیلی کاپٹر کے دروازے میں سے اندر داخل ہو گئے۔

"تم لوگ اندر سو گئے ہو کیا؟ سپلائی کیوں نہیں اتارتے۔"

مجھے ٹھک ٹھک کی دو آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی تیسری آواز بھی آئی۔ پہلے دو فائر کی آوازیں اندر سے آئی تھیں اور ہمارے کمانڈوز نے ہیلی کاپٹر میں داخل ہونے والے مرہٹہ رجمنٹ کے دونوں فوجیوں کو گرا لیا تھا۔ تیسرا فائر اس فوجی پر ہوا تھا جو باہر کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ میں نے اوٹ میں سے اسے بھی گرتے دیکھا۔ لیڈر نے کہا۔

"گو۔"

ہیلی کاپٹر میں سے چاروں سیاہ پوش کمانڈوز چھلانگیں لگا کر نیچے کود پڑے۔ میں اور لیڈر سامنے والی بیرکوں کی مغربی دیوار کی طرف مڑے۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ باقی چاروں کمانڈوز ذرا پھیل کر دوڑ رہے تھے۔ وہاں بیرکوں میں جو فوجی سو رہے تھے وہ تو سو رہے تھے۔ جو گارڈز پہرے پر تھے انہوں نے اس طرف اس لئے توجہ نہیں دی تھی کہ انہیں معلوم تھا کہ آج ہیلی کاپٹر سپلائی لے کر آ رہا ہے۔ جن جوانوں نے سپلائی وصول کرنی تھیں ان میں سے دو کی لاشیں ہیلی کاپٹر کے اندر پڑی تھیں اور ایک کی لاش ہیلی کاپٹر کے باہر زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ میں اور لیڈر آگے آگے تھے۔ ہمارے لباس سیاہ تھا جس کی وجہ سے اندھیرے میں ہم نظر نہیں آ رہے تھے۔

ہم بیرکوں کے پہلو میں سے گذر کر اوپر کوٹھڑیوں پر جانے کے لئے بنی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ایک سنتری وہاں گارڈ ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے آواز دے کر پوچھا۔

"صوبیدار جی۔ سپلائی آ گئی؟"

اس کے جواب میں ہمارے ایک کمانڈو نے اسے پیچھے سے دبوچ کر اتنی تیزی سے اس کی گردن پر چاقو پھیرا کہ اس سنتری کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی شہ رگ کٹ چکی ہے۔ کمانڈو کبھی گردن نہیں کاٹتا۔ گردن اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نہیں کٹتی۔ وہ صرف شہ رگ یا اس کے ساتھ والی بڑی رگ کاٹتا ہے جس سے سانس اور خون کی آمدورفت بند ہو جاتی ہے۔ لیڈر کمانڈو تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اوپر آگیا۔ اوپر تین کوٹھڑیاں نظر آئیں۔ ان کے بلب روشن تھے۔ ایک فوجی سنتری پہرے پر موجود تھا۔ ہم دونوں وہیں زمین پر آخری سیڑھی کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ باقی چاروں کمانڈوز میں سے دو کمانڈوز کوٹھڑیوں کی دائیں جانب اور دو کمانڈوز اندھیرے میں کوٹھڑیوں کی بائیں جانب رینگتے ہوئے چلے گئے۔

وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہماری نظریں پہرہ دیتے سنتری پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کو ہمیں نہیں مارنا تھا۔ اس کو ہلاک کرنے کی ڈیوٹی ہمارے ان ساتھی کمانڈوز میں سے کسی کی تھی۔ جو کوٹھڑیوں کی طرف رینگتے ہوئے گئے تھے۔ اور اب ہمیں نظر نہیں آرہے تھے۔ سنتری پہلے کوٹھڑیوں کے آگے ٹہل رہا تھا۔ پھر وہ ایک کوٹھڑی کے آگے جا کر رک گیا۔ اس کا منہ ہماری طرف تھا۔ میں نے ایک انسانی سایہ اس کے پیچھے دیکھا۔ یہ سایہ ہمارا ساتھی کمانڈو تھا جو سلوموشن میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک یہ سایہ فوجی گارڈ پر جھپٹا اور دوسرے لمحے فوجی گارڈ زمین پر گر پڑا۔ لیڈر نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"گو۔"

اور ہم دونوں کوٹھڑیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ اسی دوران ہمارے ساتھی چاروں سیاہ پوش کمانڈوز نے کوٹھڑی کے سامنے پھیل کر پوزیشنیں سنبھال لیں کہ اگر کوئی ایمرجینسی پیدا ہو گئی تو اسے سنبھال سکیں۔ لیڈر مجھے لے کر پہلے کوٹھڑی کے پاس آگیا۔ اس نے سٹین گن کی نالی تالے میں ڈال کر اسے توڑ

دیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ پاؤں سے کھولا۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ اسی طرح دوسری کوٹھڑی کا تالا توڑ کر دیکھا۔ دوسری بھی خالی تھی۔ لیڈر نے اندھیرے میں اپنی چمکیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تمہاری رپورٹ غلط تو نہیں۔"

وہ تیسری کوٹھڑی کی طرف لپک کر گیا اور اس کا بھی تالا توڑ کر دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جبکہ پہلی دونوں کوٹھڑیوں میں کمزور روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ لیڈر نے کہا۔

"یہ بھی خالی ہے۔ رپورٹ غلط تھی۔ یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے بے اختیار ہو کر شیر باز خان کو آہستہ سے آواز دی۔

"شیر باز خان۔ شیر باز خان۔"

اندھیرے میں ایک کمزور سی آواز نے جواب دیا۔

"حیدر علی! میں یہاں پڑا ہوں۔"

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آوازیں پہچان لی تھیں۔ لیڈر کمانڈو جلدی سے کوٹھڑی میں گھس گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ شیر باز خان نے دوبارہ آواز دی تو ہم اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ فرش پر نڈھال پڑا تھا۔ لیڈر نے کہا۔

"ہمارے ساتھ چلو۔"

شیر باز بولا۔

"میری ٹانگ پر زخم ہے۔"

لیڈر نے کہا۔

"اٹھ کر چلنے کی کوشش کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں نے اندھیرے میں شیر باز کو سہارا دے کر اٹھایا۔ مجھے اس کی ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا اوپر کپڑا بندھا ہوا نظر آیا۔ میں سہارا دے کر اسے کوٹھڑی سے باہر لے آیا۔ لیڈر سیڑھیوں کے پاس اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ اس نے بازو سے

مجھے اشارہ کیا کہ جلدی کرو۔ شیر باز خان میں بھی صورت حال کو دیکھ کر جیسے نئی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ لنگڑا کر لیکن میرے سہارے تیز تیز چلنے لگا۔

لیڈر کمانڈو نے اپنے چاروں ساتھی کمانڈوز کی طرف دیکھ کر بازو کو نیم دائرے میں گردش دی اور ایک طرف سے شیر باز کو سہارا دیا۔ ہم نے شیر باز خان کو بازوؤں سے اٹھا لیا اور سیڑھیاں اتر کر بیرکوں کی دیوار کی طرف بڑھے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے چاروں کمانڈوز ساتھی ہمارے دائیں بائیں پہلوؤں سے نکل کر پھیل کر جھک کر دوڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہیلی کاپٹر نہیں اڑا سکتا تھا۔ وہ اپنے لیڈر کے انتظار میں تھے۔ ہم شیر باز خان کو اٹھا کر تقریباً" دوڑتے ہوئے جیسے ہی ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچے سامنے والے بیرک سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔

"کون ہو؟"

ہمارے ایک کمانڈو سے غلطی ہو گئی۔ اس نے بیرک کے باہر کھڑے یک فوجی کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اس پر فائر کر دیا۔ اگرچہ فائر کا دھماکہ نہیں ہوا ؑا مگر فوجی کو بھی گولی نہیں لگی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"سیکورٹی الرٹ!"

اس کے ساتھ ہی کونے والے واچ ٹاور کی سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ ہ سرچ لائیٹ ہماری اطلاع کے مطابق رات ایک بجے کے بعد بند ہو جاتی تھی ور اس کی جگہ دوسری مچان والی سرچ لائٹ روشن ہو جاتی تھی۔ جو یہاں سے افی فاصلے پر تھی اور اس کا گول دائرہ یہاں تک نہیں آتا تھا۔ جیسے ہی سرچ ئیٹ روشن ہوئی لیڈر نے چلا کر کہا۔

"چاپر کے اندر۔ چاپر کے اندر گو۔"

چاروں کمانڈوز نے شیر باز خان کو اٹھا کر ہیلی کاپٹر میں ڈالا اور خود بھی ور گھس گئے۔ لیڈر اور میں اس دوران کاک پٹ میں بیٹھ گئے تھے اور انجن

سٹارٹ ہو چکا تھا۔ پنکھوں نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔ اچانک ہم پر مشین گن کا فائر آنے لگا۔ بیرکوں کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ واچ ٹاور سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں ہیلی کاپٹر سے ٹکرانے لگیں۔ مصیبت یہ تھی کہ جب تک پنکھوں کی گردش ایک خاص رفتار نہیں پکڑ لیتی تھی ہم ہیلی کاپٹر کو اوپر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ کمانڈوز نے بھی ہیلی کاپٹر کے دروازے میں جوابی فائرنگ شروع کر دی مگر یہ لوگ اندھیرے میں اندھے ٹارگٹ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ اتنے میں سرچ لائٹ کی روشنی کا گول دائرہ ہیلی کاپٹر پر پڑا۔ ساتھ ہی ہم پر بارش کی طرح مشین گن کی فائرنگ شروع ہو گئی۔

لیڈر نے سٹک کر کھینچ لیا۔ ہیلی کاپٹر اوپر کو اٹھا۔ لیڈر بڑا ماہر پائیلٹ لگتا تھا۔ اس نے برستی گولیوں کی پروا کیے بغیر ہیلی کاپٹر کو بلند ہوتے ہی غوطے میں ڈال دیا اور دائیں طرف جھکا کر ٹیلے سے نیچے دریا کی طرف لے آیا۔ ٹیلے پر بیک وقت تین چار روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ ساری فضا روشن ہو گئی۔ اس روشنی میں ہمارا ہیلی کاپٹر دشمن کے لئے بڑا آسان ٹارگٹ بن گیا۔ دھماکے کی آواز آئی۔ لیڈر نے چلا کر کہا۔

"ہم پر راکٹ فائر ہوا ہے۔"

میرے خدا۔ راکٹ کا گولہ شوں کی آواز کے ساتھ ہیلی کاپٹر کے بالکل قریب سے ہو کر گزر گیا۔ لیڈر نے ہیلی کاپٹر کو دائیں بائیں لہرانا شروع کیا۔ وہ اسے لہراتے ہوئے، کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف لے جاتا اور اسے آگے بھی بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر کو ٹیلے سے بہت نیچے دریا کی سطح پر لے آیا۔ مجھے رات کی تاریکی میں دریا کا پانی نظر آنے لگا۔ پیراشوٹوں والے روشنی راؤنڈز بجھ کر دریا میں گر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اور روشنی راؤنڈز فائر ہوئے۔ وہاں دن کی روشنی ہو گئی۔ ہم پر مشین گن کی فائرنگ کے علاوہ راکٹ لانچروں کے راکٹ بھی فائر ہونے لگے۔ مگر اتنی دیر میں ہم دشمن کی رینج سے

باہر نکل گئے تھے۔

اچانک ایک دھماکہ ہوا اور ہیلی کاپٹر کو اتنی زور سے دھچکا لگا کہ جیسے کسی دیو نے اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیچے دریا کی طرف گرنے لگا۔ لیڈر نے چلاتے ہوئے کہا۔

"دریا میں کود جاؤ۔"

ٹیلے والی چھاؤنی کی طرف سے فائر کیا گیا گولہ ہیلی کاپٹر کے پروں کو اڑاتا ہوا نکل گیا تھا۔ یہ سب کچھ ایک یا دو سیکنڈ میں ہو گیا۔ ہم نے سیٹ بیلٹیں نہیں باندھیں ہوئی تھیں۔ دریا اوپر کو آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نیچے جا رہا تھا۔ ہم کھڑکی میں سے دریا میں کود گئے ہیلی کاپٹر ایک دھماکے سے دریا میں گر گیا۔ اندھیرے میں ہم نے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف تیرتے ہوئے گردن پیچھے موڑ کر دیکھا۔ ہمیں دریا کی سطح پر کچھ آدمیوں کے سر نظر آئے۔ چاروں کمانڈوز اور شیر باز خان بھی دریا میں چھلانگیں لگا چکے تھے۔ دریا کی لہریں وہاں بڑی تیز رفتار تھیں۔ ہم تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پر آ گئے جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں دریا ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر گذرتا تھا۔ ہمارے دوسرے کمانڈو ساتھی بھی دریا سے نکل آئے تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں شیر باز خان کو بازوؤں سے پکڑ کر چلاتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ لیڈر نے شیر باز خان سے کہا۔

"جوان تم ٹھیک ہو؟"

شیر باز بولا۔

"بالکل ٹھیک ہوں سر! ٹانگ پر زخم ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہم دور دریا کے دوسرے کنارے والے ٹیلے کی طرف اوپر دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے اب مشین گن کا فائر آنا بند ہو گیا تھا۔ دریا میں ٹیلے سے تھوڑی دور تک سرچ لائٹ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ لیڈر نے کہا۔

"انہیں یقین ہوگیا ہے انہوں نے ہیلی کاپٹر مار گرایا ہے۔ ان کے پاس یہاں کوئی دوسرا ہیلی کاپٹر نہیں ہے ورنہ ہمارا بچ نکلنا مشکل ہو جاتا۔"

میں نے لیڈر سے پوچھا کہ اب ہمیں کس طرف جانا چاہئے۔ لیڈر نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہمیں معلوم ہے کس طرف جانا ہے۔"

پھر اس نے اپنے چاروں سیاہ پوش کمانڈوز سے پوچھا کہ وہ سب ٹھیک ہیں۔ ہر ایک نے باری باری کہا۔

"سب ٹھیک ہے سر!"

لیڈر اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے۔ ہمیں ان پہاڑیوں سے نکل جانا چاہئے۔"

رات کے اندھیرے میں ہم ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ لیڈر کمانڈو ہماری راہ نمائی کر رہا تھا۔ میں شیر باز کو سہارا دے کر اپنے ساتھ چلا رہا تھا۔ چاروں کمانڈو ڈھلان پر پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شیر باز خان نے مجھ سے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہمارے مجاہد بھائی ہیں۔ ابھی خاموش رہو۔ پھر بات کریں گے۔"

لیڈر کمانڈو مجھ سے چار پانچ قدم آگے چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ اس نے ہماری آواز سنی تو بولا۔

"بول چال بند۔"

ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اس کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد ہم دوسری طرف اترنے لگے۔ پچھلی رات کی تاریکی میں سامنے ایک غیر ہموار میدان کا منظر تھا۔ جس میں تاڑی کے بہت درخت تھے۔ ان کی چھتریاں اوپر ستاروں تک پہنچتی

معلوم ہو رہی تھیں۔ لیڈر کمانڈو ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ باقی چاروں کمانڈو اب ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شیر باز خان لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ہماری رفتار سست تھی۔ وہاں تیز رفتاری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ہم چھاؤنی کے علاقے سے بہت دور نکل آئے تھے۔ مرہٹہ رجمنٹ کے سپاہی ہمارا تعاقب کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لئے کہ ان کے پاس نہ کوئی دوسرا ہیلی کاپٹر تھا نہ موٹر بوٹ تھی۔ اتنا ضرور خطرہ تھا کہ شیر باز کے فرار کی اطلاع چھاؤنی سے کیمپ میں دے دی گئی ہوگی اور کیمپ میں سے کوئی پلاٹون ہماری تلاش میں نکل سکتی تھی۔ لیکن ہم دریا کی دوسری جانب آ گئے ہوئے تھے۔

لیڈر کمانڈو ہمیں گائیڈ کرتا ایک ٹیلے کے پیچھے سے گذرتا ہوا دوبارا دریا پر لے آیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھاٹ تھا۔ جہاں ایک بڑی کشتی کنارے پر بندھی ہوئی تھی۔ اس میں دو لمبے بانس رکھے تھے جسے ڈانڈ کہتے ہیں۔ اس کشتی میں ملاح دن کے وقت مسافروں کو دریا پار کراتا ہوگا۔ لیڈر نے ہمیں حکم دیا کہ جلدی سے کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ جب ہم کشتی میں بیٹھ گئے تو ایک طرف سے لیڈر نے اور دوسرے طرف سے ایک سیاہ پوش کمانڈو نے ڈانڈ سنبھال کر دریا میں ڈال دیا اور اس کے زور سے کشتی کو دریا کی طرف دھکیلا۔ کشتی بڑی تھی۔ وہ کنارے سے ہٹنے لگے - دریا کی لہریں بھی ہماری مدد کر رہی تھیں۔ کشتی دریا کے وسط میں آ گئی۔ یہاں یہ ڈانڈ کی مدد سے کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف لے جانے لگے۔ کوئی آدھ گھنٹے کی جد و جہد کے بعد کشتی دریا کے دوسرے کنارے سے جا لگی۔ لیڈر نے مجھ سے پوچھا۔

"شیرباز کا کیا حال ہے؟"

شیرباز نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"شاباش! ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچنے والے ہیں۔ وہاں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

ہم چھاؤنی سے بہت دور آ چکے تھے۔ یہاں سے ہم ایک جنگل میں داخل ہو گئے۔ لیڈر کمانڈو نے جنگل میں داخل ہوتے ہی ہمیں رکنے کو کہا اور

خود فضا سونگھنے لگا۔ پھر اپنے ساتھی کمانڈوز کو مخاطب کر کے کہا۔

"شیر کی بو دور دور نہیں ہے۔ اگر کہیں سے شیر نکل آیا تو اس پر ساری سٹین گنوں کا فائر کیا جائے گا۔"

جنگل سنسان اور تاریک تھا۔ لیڈر نے شیر باز سے کہا۔

"ہم جنگل کے کنارے کنارے جائیں گے۔ یہاں شیر کا خطرہ نہیں ہے۔"

ہم ایک ڈیڑھ گھنٹہ جنگل میں چلتے رہے۔ آسمان پر پو پھٹنے لگی تھی۔ ہم یک گھاٹی میں سے گذرے تو آگے تالاب تھا۔ تالاب کا ستاروں اور پو پھٹنے کی یلی دھندلی روشنی میں دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ لیڈر نے مجھ سے کہا۔

"یہ بہت پرانا تالاب ہے کہتے ہیں اس کی تہہ سمندر کی تہہ سے ملی وئی ہے۔ اس کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔"

یہاں ہم نے شپ شپ کی آواز سنی۔ لیڈر نے دونوں بازو پھیلا کر ہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ چاروں کمانڈوز وہیں بیٹھ گئے۔ میں اور شیر باز بھی بیٹھ ئے۔ لیڈر کھڑا رہا۔ وہ اس طرف دیکھ رہا تھا جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ روہ بھی ہماری پاس بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا۔

"تالاب کے دوسرے کنارے پر شیر پانی پی رہا ہے۔"

شیر باز خان نے کہا۔

"ہم اس پر ایک ساتھ فائر کریں گے۔"

لیڈر کمانڈو نے کہا۔

"شیر نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔ پھر ہم اس پر فائر کس لئے کریں۔ ہم وشی سے دوسری طرف سے ہو کر آگے نکل جائیں گے۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم وہاں سے واپس مڑے اور دس پندرہ قدم پیچھے ر دوسری طرف درختوں کے نیچے ہو کر آگے چل پڑے۔ شیر باز خان سے

اب چلا نہیں جاتا تھا۔ اس کی ٹانگ کا زخم زیادہ درد کرنے لگا تھا مگر یہ اس کی ہمت اور جذبہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ آسمان پر صبح کی پہلی سفیدی ابھرنے لگی تھی کہ لیڈر ہمیں لے کر ایک گھاٹی میں اتر گیا۔ اس گھاٹی میں ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔ ہمیں اسی غار میں آنا تھا۔ غار میں پہلے سے تین کمانڈوز موجود تھا۔ غار کافی کشادہ تھا۔ اس کے اندر ایک کھلے دالان میں بانس کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور لالٹین جل رہی تھیں۔ ہم نے شیر باز کو ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کی ران پر سے کپڑا کھول کر دیکھا۔ وہاں زخم اتنا گہرا نہیں تھا مگر وہ خراب ہوگیا تھا اور اسی وجہ سے درد کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔

شیر باز کا زخم صاف کرکے اس پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی گئی۔ اسے قہوہ بنا کر پلایا گیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ غار کے باہر روٹیاں پکنے لگی تھیں۔ گھی میں تلی ہوئی روٹیوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ ساتھ حلوہ بھی بنایا جا رہا تھا۔ ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ لیڈر نے شیر باز سے کہا۔

"دوست! اب تم سو جاؤ۔ نیند لینے سے تمہارا درد کم ہوجائے گا۔"

شیر باز آرام سے لیٹ گیا۔ لیڈر کمانڈو مجھے غار کے دہانے پر لے آیا۔ یہاں نیچے گھاٹی کی تہہ میں ندی بہہ رہی تھی۔ ہم پتھروں کے درمیان بیٹھ گئے۔ لیڈر کمانڈو نے مجھ سے کہا۔

"اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر لیا ہے تم اس وقت تک یہاں ٹھہرو جب تک کہ شیر باز خان چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ میرے دو آدمی تم لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے یہاں موجود رہیں گے۔ یہاں سارا راشن پانی موجود ہے۔ مجھے بتا کہ تم لوگ آگے کہاں جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہماری منزل تو سری نگر ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہاں سے سر

نگر کافی دور ہے اور کوئی سیدھا راستہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے ہم پہلے بنگلور اپنے دوست عالمگیر کے پاس جائیں گے۔ وہاں سے سری نگر کی طرف نکل جائیں گے۔"

لیڈر کمانڈو نے کہا۔

"فوج اور پولیس تمہاری تلاش میں وہاں موجود ہوگی۔ یقینی بات ہے کہ عالمگیر کی بھی خفیہ پولیس نگرانی کر رہی ہوگی۔ اس لئے تمہارا بنگلور جانا مناسب نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر یہاں سے تو کوئی ریل گاڑی وغیرہ جاتی دکھائی نہیں دیتی۔"

لیڈر نے ہنس کر کہا۔

"تم حیدر آباد دکن کے جنگلوں میں ہو۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے شہر ہیں۔ جہاں ریلوے سٹیشن بھی ہیں۔ ہم تمہیں ایک ایسی ریل گاڑی میں سوار کرا دیں گے جو تمہیں یہاں سے سیدھی دلی لے جائے گی۔ اس کے آگے تو تم خود چلے جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"اگر ایسا ہو جائے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

لیڈر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہو جائے گا۔ اب تم بھی اندر جا کر آرام کرو۔ میں شام کو آ کر بتاؤں گا کہ آگے کا پروگرام کس طرح بنے گا۔ اوکے۔"

"اوکے۔"

میں غار کے اندر دالان میں چلا آیا۔ وہاں دیکھا کہ شیر باز خاں گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے نیند کی اشد ضرورت تھی۔ انڈین ملٹری انٹیلی جینس نے نہ جانے اسے کیسی کیسی درندہ صفت اذیتیں دی تھیں۔ میں بھی ایک چارپائی پر پڑ

گیا۔ مجھے بھی نیند آ گئی تھی۔ سارا دن ہم دونوں سوئے رہے۔ شام کے وقت ہمیں ایک کمانڈو نے اٹھایا اور کہا۔

"لیڈر آیا ہے۔"

لیڈر کمانڈو غار کے دالان میں داخل ہوا۔ اس کے سر پر سیاہ رومال نہیں تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی شرعی ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ ماتھے پر محراب تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے شیر باز سے ہاتھ ملایا۔

"کہو دوست! اب کیا حال ہے؟"

شیر باز نے کہا۔

"درد میں کافی افاقہ ہے۔"

لیڈر کمانڈو نے اپنے آدمی سے کہا۔

"رات کو زخم پر دوبارا مرہم لگا کر پٹی باندھ دینا۔"

پھر شیر باز سے کہنے لگا۔

"انشاالله! تم دو ایک دن میں چل پھر سکو گے۔"

میں نے شیر باز کو ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیڈر کمانڈو نے خود ہی اسے ساری بات بیان کر دی اور کہا کہ ہم لوگوں کا بنگلور جانا خطرناک ہوگا۔ ہمیں یہیں سے سری نگر روانہ ہو جانا چاہئے۔ شیر باز نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"لیڈر کا خیال بالکل صحیح ہے۔ بنگلور میں پولیس اور فوج ہماری' خاص طور پر تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہوگی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم یہیں سے آگے نکل جائیں۔"

شیر باز خان نے لیڈر سے پوچھا۔

"یہاں سے قریبی شہر کونسا ہے؟"

لیڈر نے کہا۔

"یہاں سے قریبی شہر کولار ہے۔ ہمارا آدمی تم دونوں کو کولار کے ریلوے سٹیشن سے حیدر آباد جانے والی گاڑی میں بٹھا دے گا۔ حیدر آباد سے تم ناگ پور والی ٹرین پکڑو گے۔ وہاں تم کو دلی ایکسپریس مل جائے گی جو ہوشنگ آباد بھوپال چھاؤنی سے ہوتی ہوئی تمہیں دلی پہنچا دے گی۔ آگے کا راستہ تمہیں معلوم ہی ہے۔"

یہی پروگرام طے ہوگیا۔ اب ہمیں انتظار تھا کہ شیر باز کی ٹانگ کا زخم ذرا اچھا ہو تو وہاں سے روانہ ہو جائیں۔ اس وقت مجھے اپنے دوست سانپ کا خیال آیا۔ یہ سانپ عالمگیر کے جنگل والے خفیہ ٹھکانے میں تھا۔ میں وہاں جا نہیں سکتا تھا۔ دوسرے دن لیڈر نے آ کر ہمیں بتایا کہ منڈھیل چھاؤنی سے شیر باز کے فرار کے بعد بنگلور اور آس پاس کے قصبوں اور دیہات میں پولیس اسے تلاش کرتی پھرتی ہے۔ کہنے لگا۔

"ہو سکتا ہے کہ خفیہ پولیس کولار میں بھی پہنچ گئی ہو۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی کچھ دن یہیں رکے رہنا چاہئے۔ ذرا حالات نارمل ہوں تو پھر چلے جانا۔"

تجویز بڑی معقول تھی۔ ہم لیڈر کمانڈو کی خفیہ کمیں گاہ میں پورے دس دن تک چھپے رہے۔ اس دوران شیر باز کا زخم بالکل ٹھیک ہوگیا تھا۔ وہ آسانی سے چل پھر لیتا تھا۔ گیارویں دن لیڈر نے ہمیں تیاری کا آرڈر دے دیا۔

"کولار تک تمہیں خچروں پر بیٹھ کر جانا ہوگا۔ ہمارا آدمی تمہارے ساتھ ہوگا۔ صبح چلو گے تو شروع رات کولار پہنچ جاؤ گے۔ حیدر آباد کے لئے وہاں سے تمہیں رات کے گیارہ بجے پسنجر ٹرین مل جائے گی۔ تم کل منہ اندھیرے یہاں سے چل پڑو گے۔"

ہمیں تیاریاں کونسی کرنی تھیں۔ کپڑے ہم نے دوسرے پہن لئے تھے یعنی بش شرٹ اور پتلون اور نئے ربڑ کے جوتے۔۔ لیڈر نے ہمیں چمڑے کی دو

جیکٹیں دے دیں اور کہا۔

"آگے پنجاب میں سردی ہوگی۔ یہ جیکٹیں وہاں جا کر پہن لینا۔"

لیڈر نے ہمیں انڈین کرنسی میں اتنے پیسے دے دیئے جو سری نگر تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ تھے۔ اسلحہ ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے صرف اتنا کیا کہ ایک ایک چاقو اپنے پاس رکھ لیا کہ راستہ لمبا ہے۔ سفر طویل ہے اور دشمن کے پیٹ میں سے گذر کر سری نگر تک پہنچنا ہے۔ راستے میں کچھ ہو سکتا ہے۔ اس رات کھانا کھا کر میں اور شیر باز جلدی سو گئے۔ پچھلے پہر چار بجے ہمیں لیڈر نے جگا دیا کہنے لگا۔

"منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ تمہیں ساتھ لے جانے والا آدمی آگیا ہے۔"

ہم نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور لیڈر کے ساتھ ٹیلے کی دوسری طرف آ گئے جہاں پچھلے پہر کے اندھیرے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے پاس تین خچر کھڑے تھے۔ لیڈر ہم سے باری باری گلے ملا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ کہنے لگا۔

"ہم نے جو کچھ کیا ہے۔ اللہ اور اس کے دین اسلام کے لئے کیا ہے۔ اس میں شکریہ کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔"

وہ ہمیں اپنے آدمی یعنی ہمارے گائیڈ کے حوالے کر کے چلا گیا۔ ہم خچروں پر بیٹھ گئے اور کولار کی جانب ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ یہ سفر بھی دشوار گذار جنگل کا سفر تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ جب ہم کولار کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ہمارا گائیڈ ہمیں یہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ یہاں سے ہمیں حیدر آباد (دکن) کو جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سری نگر کا ہمارا یہ لمبا سفر ہے اور ہمیں تین چار دن لگ جائیں گے۔ شیر باز خان میرے ساتھی ہی پلیٹ فارم پر بیٹھا تھا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد گاڑی آئی مسافروں سے

بھری ہوئی تھی۔ ہم الگ الگ ڈبوں میں سوار ہوئے۔ ہم نے ہمیشہ اسی حکمت عملی پر عمل کیا تھا۔ تاکہ اگر ایک پکڑا جائے تو دوسرا اس کی مدد کر سکے۔ یہ پیسنجر گاڑی تھی۔ اس نے ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد حیدر آبا پہنچا دیا۔ یہاں سے ہم ناگ پور والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ ناگ پور روانہ ہونے سے پہلے ہم نے حیدر آباد کے سٹیشن پر ہی تھوڑا بہت کھا لیا تھا۔ ناگ پور تک کا سفر بھی بڑا لمبا تھا۔ آخر ناگ پور بھی آگیا۔ ہم بڑے مطمئن تھے کہ خطرے کی حدود سے دور نکل آئے ہیں۔

ناگ پور سے ہمیں سیدھی دلی جانے والی گاڑی مل گئی۔ شمالی بھارت میں داخل ہونے کے بعد سردی شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے جیکٹ پہن لئے تھے۔ دلی تک بالکل خیریت رہی۔ اس کے بعد ہمیں مشرقی پنجاب میں داخل ہونا تھا۔ یہاں خطرہ ضرور تھا لیکن یہ خیال بھی تھا کہ ہم نے آندھرا پردیش میں واردات کی ہے۔ یہاں کی پولیس کا اسے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ مگر یہ ہماری خوش فہمی تھی۔ منڈھیل چھاؤنی سے شیر باز خان کے فرار کے بعد پنجاب کی پولیس کو اطلاع کر دی گئی تھی کہ کچھ خطرناک کشمیری کمانڈوز فوجی جوانوں کو ہلاک کر کے اپنے ساتھی کو چھڑا کر فرار ہو گئے ہیں۔ وہ جموں کشمیر کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کو پکڑا جائے۔ چنانچہ مشرقی پنجاب کی پولیس چوکس ہو گئی تھی اور اس کی سی آئی ڈی نے لدھیانہ ، جالندھر اور جموں توی کے علاقے کو اپنی خفیہ نگرانی میں لے لیا تھا۔ ہماری گرفتاری کے لیے جو جال بچھایا گیا تھا ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم تو اپنی طرف سے بڑے مطمئن اور خوش تھے کہ جائے واردات سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ ہم دلی سے ٹرین میں سوار ہو کر جالندھر کی طرف جا رہے تھے۔ چونکہ خطرے کا احساس کم ہو گیا تھا اس لیے ہم ایک ہی ڈبے میں سوار تھے۔

میرٹھ گزر گیا۔ انبالہ گزر گیا۔ ٹرین لدھیانے کے سٹیشن پر پہنچی تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس نے کھیس کی بکل ماری ہوئی تھی اور ڈبے میں

جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ وہ مسافروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پہلے میں سمجھا کہ یہ کوئی مسافر ہو گا جو ڈبے میں بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھ رہا ہے لیکن جب اس کی نظر مجھ پر آکر رک گئی اور وہ مسلسل ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے شیر باز خان کھڑکی میں سے لائن کی دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے خبردار نہ کیا۔ کھیس کی بکل والے آدمی نے چند سیکنڈ مجھے اور شیر باز خان کو گھور کر دیکھا اور پھر آگے نکل گیا۔ میں نے شیر باز سے کہا۔

"شیر خان۔ لگتا ہے سی آئی ڈی نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا ہے۔"

پھر میں نے اسے کھیس کی بکل والے آدمی کے بارے میں بتایا۔ وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ کوئی مسافر ہو"

میں نے کہا "میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ ہمیں یہاں اتر جانا چاہیے۔"

شیر باز کہنے لگا۔

"یہاں اتر گئے تو پولیس ہمیں بڑی آسانی سے پکڑ لے گی۔ اب بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکل جائیں"۔

اسی وقت ٹرین چل پڑی۔ ہم پلیٹ فارم کو دیکھتے رہے۔ ٹرین آگے جا رہی تھی۔ پلیٹ فارم پیچھے جا رہا تھا۔ کچھ مسافر اور ریلوے کے آدمی نظر آتے مگر ان میں وہ کھیس کی بکل والا آدمی نہیں تھا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ کوئی مسافر ہی ہو اور جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہو اور اس نے یونہی مجھے گھور کر دیکھ لیا ہو۔ ٹرین نے لدھیانہ سٹیشن سے نکلتے ہی سپیڈ پکڑ لی۔ یہ کوئی ایکسپریس ٹرین تھی۔ ایک سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ میں ڈبے سے پلیٹ فارم پر آکر یونہی ٹہلنے لگا۔ اصل میں میری نظریں کھیس کی بکل والے آدمی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ انجن نے سیٹی دی۔ میں ڈبے میں آکر شیر باز

کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اسے کہا کہ میرا خیال ہے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم منزل کے قریب پہنچ کر لاپروا سے ہو گئے تھے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ منزل کے قریب پہنچ کر ہمیں زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔

آگے جالندھر کا سٹیشن تھا۔

میرا دل تھوڑا تھوڑا خطرہ برابر محسوس کر رہا تھا۔ جالندھر شہر کے مضافات اور کارخانے شروع ہو گئے - شیر باز کھڑکی سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ میں کھڑکی میں سے آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر کچھ آدمیوں کی ریلوے لائن کے پاس نقل و حرکت نظر آئی۔ میں یہی سمجھا کہ ریلوے کے مزدور ہیں جو لائن وغیرہ کی مرمت کر رہے ہوں گے۔ ٹرین ان کے قریب پہنچی تو میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ وہ مزدور نہیں لگ رہے تھے۔ ان میں تین چار آدمی پولیس کی وردی میں تھے۔ میں نے شیر باز خان کا بازو ہلا کر کہا۔

"کچھ گڑبڑ ہے"۔

اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ اب ہمیں پولیس کے بہت سے سپاہی نظر نظر آئے وہ سب مسلح تھے۔ پیچھے درختوں میں پولیس کی گاڑیاں بھی تھیں۔ میں اٹھ کر ڈبے کی دوسری طرف کھڑکی کے پاس گیا اور باہر دیکھا۔ اس طرف بھی پولیس ہی پولیس نظر آ رہی تھی۔ میں نے شیر باز کے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔

"ہماری مخبری ہو گئی ہے۔ پولیس ہمیں پکڑنے کے لیے کھڑی ہے۔"

شیر باز خان نے آہستہ سے کہا۔

یہاں کی پولیس کو ہمارا حلیہ معلوم نہیں ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ دوسرے مسافروں کے ساتھ خاموشی سے بیٹھے رہو۔ صرف اپنے چاقو پھینک

دیتے ہیں۔

اس کی بات بڑی حد تک درست تھی۔ کیونکہ آندھرا پردیش کی ملٹری پولیس کے پاس میری اور شیر باز خان کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ ملٹری پولیس نے دلی کی پولیس کو اور دلی کی پولیس نے مشرقی پنجاب کی پولیس کو شیر باز خان کا حلیہ ضرور بتا دیا ہوگا جس میں آندھرا پردیش سے دلی اور دلی سے جالندھر تک آتے آتے کافی تبدیلی رونما ہو چکی ہو گی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر صرف حلیئے کی شناخت سے یہاں کی پولیس شیر باز خان کو گرفتار کرنا چاہتی ہے تو وہ اسے نہیں پہچان سکے گی۔

ٹرین رک گئی۔ ٹرین کے رکتے ہی دونوں طرف پولیس کے سپاہی ہر ڈبے میں داخل ہو گئے۔ ہم نے انہیں ہر ڈبے میں تیزی سے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ہم بھاگ نہیں سکتے تھے۔ اگر بھاگتے تو پولیس ہمیں آسانی سے قابو کر سکتی تھی۔ ایک پولیس کی نفری بہت تھی دوسرے وہ مسلح تھی۔ اس سے پہلے ہم نے اپنی جیبوں سے کمانڈو چاقو نکال کر بڑی ہوشیاری سے مسافروں کے سامان کے پیچھے پھینک دیے تھے۔ ہمارے ڈبے میں چار سکھ سپاہی داخل ہوئے تھے۔ دو سپاہی ڈبے کے دونوں دروازوں میں رائفلیں تھام کر کھڑے ہو گئے اور دو سپاہی مسافروں سے پوچھ گچھ۔ کرنے لگے۔ ان میں سے ہماری طرف والا سکھ سپاہی ہمارے پاس بھی آ گیا۔ اس نے پہلے مجھے غور سے دیکھا اور پنجابی میں پوچھا کہ میرا نام کیا ہے اور کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے ایک فرضی بیان دل میں سوچ لیا تھا وہی دہرا دیا۔ میں نے اپنا نام بھی ہندوانہ بتایا۔ اس کے بعد سکھ سپاہی شیر باز خان کی طرف متوجہ ہوا۔

”کون ہو بھئی تم۔ کیا نام ہے تمہارا“۔

سکھ سپاہی نے پنجابی میں پوچھا تھا۔ شیر باز خان نے بہت بڑی حماقت کی کہ پنجابی میں ہی جواب دیا کہ میرا نام مدن لال ہے اور میں جموں جا رہا ہوں۔

جہاں میری سٹیشنری کی دکان ہے۔ اس کا لہجہ نہ تو پنجابی تھا اور نہ ہی ڈوگری تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ایک خالص سرینگر کا کشمیری پنجابی میں بات کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ سکھ سپاہی نے شیر خان سے کہا۔

"نیچے اتر آؤ"۔

اب مجھ سے اضطراری کیفیت میں ایک حماقت ہو گئی کہ میں نے شیر باز خان کو بچانے کے لیے کہہ دیا۔

"سردار جی' یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے جموں میں اس کی دکان دیکھی ہے"۔

سکھ سپاہی نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"تم بھی نیچے اتر آؤ"۔

سپاہی ہمیں ڈبے سے اتار کر لائن کے ایک طرف لے آئے جہاں پہلے سے دو آدمی انہوں نے حراست میں لے کر بٹھائے ہوئے تھے۔ ہمیں بھی ان کے پاس بٹھا دیا۔ ایک سپاہی وہاں ہماری رکھوالی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ باقی تین سپاہی جن میں ایک حوالدار تھا دوسرے ڈبوں کی طرف چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ ابھی وہ صرف مشکوک لوگوں کو گھیر رہے ہیں۔ ہماری انہوں نے ابھی تلاشی بھی نہیں لی تھی۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی۔ ورنہ اگر وہ ہماری تلاشی لیتے تو یقیناً" ہماری پتلونیں بھی اتروا کر دیکھتے کہ ہم ہندو ہیں یا مسلمان۔ شاید یہ کام وہ تھانے میں جا کر سر انجام دینا چاہتے تھے۔ ٹرین کے دوسرے ڈبوں کو بھی کھنگالا جا رہا تھا۔ پولیس ہم سے زیادہ آگے تھی۔ جو دو آدمی پہلے سے وہاں بیٹھے تھے وہ کوئی جرائم پیشہ لگتے تھے۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ شیر باز خان نے میری طرف دیکھا - میں نے سکھ سپاہی کی طرف دیکھا جو وہاں کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہ جگہ تھوڑی اونچی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ پیچھے نشیب میں کچی پگ ڈنڈی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا

گڈا جسے پنجاب میں گڈ کہتے ہیں چلا آ رہا تھا۔ گڈے پر نیچے سے لے کر اوپر تک گنے کی بھریاں لدی ہوئی تھیں۔ گڈے کے آگے بیل جتے ہوئے تھے جس کی گاوری پر ایک سکھ بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔

میرے ذہن میں فرار کی ایک ترکیب آ گئی۔

میں نے شیر باز خان کے کان کے پاس منہ لے جا کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں فرار ہو رہا ہوں"۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں قریب آتی گڈ کی طرف اشارہ کیا۔ شیر باز نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہا ہو، اتنی پولیس کے ہوتے ہوئے یہ غلطی نہ کرنا۔ مارے جاؤ گے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سکھ سپاہی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے تین قدم آگے رائفل کاندھے سے لگائے اس طرح کھڑا تھا کہ اس کا منہ ریل گاڑی کی طرف تھا جو ٹرین کے ڈبوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ سکھ سپاہی کو کیا معلوم تھا کہ ہم کون ہیں۔ ابھی تو ہم مشتبہ لوگ ہی تھے۔ اتنی دیر میں کماد کی بھریوں سے لدی ہوئی گڈ ہمارے قریب آ گئی تھی۔ ہم اونچی جگہ پر تھے اور گڈ کو دوسری جانب نشیب میں ہمارے قریب سے اس طرح گزرنا تھا کہ اس کی اوپر والی کماد کی بھریوں کو بالکل ہمارے برابر سے گزرنا تھا۔

میں گڈے پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ سکھ سپاہی کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس کو ہماری طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ پولیس کی پوری پلٹن کے ہوتے ہوئے ہم لوگ اب کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ میں نے شیر باز خان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ میں تو جاتا ہوں۔ جو ہو گا اللہ مالک ہے۔ تم کو موقع ملے تو تم بھی فرار ہو جانا۔ جیسے ہی گڈا میرے برابر سے گزرا۔ میں نے آخری بار سکھ سپاہی کی طرف دیکھا جو میری طرف پشت

کئے کھڑا تھا اور بڑی خاموشی اور آواز پیدا کئے بغیر اپنے آپ کو گڈے پر لدے ہوئے کماد پر گرا دیا۔ کماد کی بھریوں پر گرنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ کماد کی بھریاں بغیر کسی ترتیب کے لدی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان اور ارد گرد تھوڑی تھوڑی خالی جگہیں بنی ہوئی تھیں۔ میں گڈے پر گرتے ہی بھریوں کے درمیان ایک خالی جگہ میں گھس کر اوندھا ہو گیا اور اسی جگہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ کوئی دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ گڈے کا مالک ہے جو کماد کی بھریوں پر سو رہا ہے۔ گڈا ایک گڑھے میں ذرا سا اچھلا تو میں کماد کی بھریوں میں مزید نیچے گھس گیا۔

میں سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا کہ باہر کی صورت حال کیا ہے۔ باہر کی خاموشی اور معمول کی آوازیں مجھے بتا رہی تھیں کہ میرے فرار کا وہاں کسی کو علم نہیں ہوا۔ ورنہ پولیس ایک سیکنڈ میں گڈے کو روک کر مجھے پکڑ سکتی تھی۔ گڈا روں روں کی آواز نکالتا کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ میں نے کماد کی بھریوں کے اندر گھسڑ مسڑ کر کے اتنی جگہ بنا لی تھی کہ باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر پولیس ہیلی کاپٹر لے کر آ جاتی تو اوپر سے مجھے دیکھ سکتی تھی۔ میں اور شیر باز خان ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے۔ کمانڈو جب ایکشن کے دوران ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کرتے پھر انہیں حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے اور اپنی اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے اکیلے ہی اپنے کیمپ تک پہنچنا ہوتا ہے۔ پہنچ گئے تو سب اچھا ہے نہ پہنچے تو اللہ بیلی!

کماد کا گڈا بہت آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس پر کئی من بلکہ کئی ٹن وزن لدا ہوا تھا۔ پیچھے سے مجھے آدمیوں کے اونچا بولنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آئیں۔ پولیس کو میرے فرار کا پتہ چل گیا تھا۔ میں ابھی اس ٹرین سے زیادہ دور نہیں تھا جس پر پولیس نے مجھے اور شیر باز خان کو پکڑنے کے لیے چھاپہ مارا تھا۔ مگر مجھے ایک فائدہ ضرور تھا کہ میں جہاں چھپا ہوا تھا وہاں کسی کو شک و شبہ نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں سر باہر نکال کر دیکھنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دونوں جانب کماد کی بھریاں ہی بھریاں تھیں۔ گنوں میں سے باہر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ گڈا ایک طرف مڑ گیا ہے۔ سکھ گڈے والا بیلوں کو ہانکتے ہوئے کبھی ان کو گالیاں دیتا اور کبھی چمکارنے لگتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کماد سے بھرا ہوا یہ گڈا کسی شوگر مل کی طرف جا رہا ہے۔ اگر تو یہ شوگر مل جالندھر شہر میں واقع تھی تو میں ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے کی طرف جا رہا تھا اور اگر یہ گڈا کماد لے کر کسی قصبے میں لگی ہوئی شوگر مل کی طرف جا رہا تھا تو وہاں میرے لیے اتنا خطرہ نہیں تھا۔

•

سپاہیوں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ دھیمی ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گڈا کسی دوسری سڑک پر دور نکل آیا تھا۔ یہ سڑک ہموار تھی اور اس پر زیادہ ہچکولے نہیں لگ رہے تھے۔ مجھے ریل کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ اس کے بعد انجن چھک چھک کرتے چل پڑا۔ ٹرین گزرنے لگی۔ آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ

میں ریلوے لائن سے دور ہو گیا ہوں۔ آہستہ آہستہ ریل گاڑی کی آواز دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اب میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ میں گڈے سے نکلنا چاہتا تھا مگر سب سے پہلے میں دیکھنا چاہتا تھا کہ علاقہ شہر کا ہے یا دیہاتی علاقہ ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے گنوں کی بھریوں مین سے سر باہر نکال کر جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ جالندھر شہر کے مکان پیچھے رہ گئے تھے اور جس طرف گڈا جا رہا تھا ادھر کھیت ہی کھیت تھے۔ گڈا ان کھیتوں کے درمیان چھوٹے سے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا جس کی دونوں جانب کہیں کہیں ٹاہلی درخت تھے۔ میرا اصل روٹ جالندھر سے آگے ہوشیار پور کھٹوعہ تھا اور جموں توی تھا مگر یہ سارا علاقہ میرے لیے بے حد خطرناک بن چکا تھا۔ اس سارے روٹ کو جموں تک پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو گا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں فرار ہونے کے بعد اسی راستے سے سری نگر جاؤں گا۔ چنانچہ میں اس طرف سے سری نگر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر امرتسر سے سری نگر جاتا ہوں تب بھی بٹالہ گورداسپور کے بعد مجھے کھٹوعہ سے ہو کر جموں توی پہنچنا پڑتا تھا اور وہاں سے میرے پکڑے جانے کا سو فیصد امکان تھا۔

گڈا چلا جا رہا تھا اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے خطرے کے علاقے سے دور ہو جانا چاہئے اور امرتسر پہنچ کر کسی جگہ روپوش ہو کر اگلا پروگرام بنانا چاہئے۔

میرے اندازے کے مطابق پولیس کی ساری توجہ جالندھر ہوشیار پور کھٹوعہ روٹ پر تھی۔ امرتسر کی طرف پولیس کا خیال نہیں گیا ہو گا۔ سکھ سپاہی نے ریل کے ڈبے سے نکالنے کے بعد میری تلاشی نہیں لی تھی۔ شیر باز خان کی بھی تلاشی نہیں لی تھی۔ پولیس اس وقت افراتفری کی حالت میں تھی۔ وہ مشتبہ افراد کو پکڑنے میں لگی ہوئی تھی اور پکڑنے کے بعد تھانے لے جا کر باقی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے کماد میں بھریوں میں لیٹے لیٹے اپنی

جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ میری جیب میں نوٹ موجود تھے۔
گولکنڈہ (دکن) کے جانباز مجاہدوں نے ہمیں کافی پیسے دے دیئے تھے۔ میں امرتسر
کے کسی اونچے درجے کے ہوٹل میں ٹھہر سکتا تھا۔ اونچے درجے کے ہوٹل میں
پکڑے جانے اور سی آئی ڈی کا خطرہ چھوٹے ہوٹلوں کی نسبت کم ہوتا ہے۔

میں نے امرتسر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اب میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی سڑک آجائے جس پر لاریاں وغیرہ چل
رہی ہوں تو گڈے سے اتر جاؤں اور مناسب موقع دیکھ کے امرتسر جانے والی
کسی لاری میں بیٹھ جاؤں۔ میرا خیال تھا اور کسی حد تک یہ خیال درست بھی تھا
کہ جالندھر پولیس کی ساری توجہ جالندھر کٹھوعہ روٹ کی طرف ہو گی۔ گڈا
کھیتوں میں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ جس زاویے پر جا رہا تھا اس سے میں
نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ گڈے کا رخ ہوشیار پور کی طرف نہیں ہے بلکہ امرتسر
کرتار پور کی طرف ہے۔ یہ روٹ میرا جانا پہچانا تھا۔ میں تھوڑی دیر بعد
کماد کی بھریوں میں سے سر نکال کر دیکھ لیتا تھا۔ ایک بار باہر دیکھا تو بائیں طرف
درختوں کی قطار دور تک جاتی نظر آئی۔ یہ کوئی بڑی سڑک بھی ہو سکتی تھی۔
گڈا اسی طرف جا رہا تھا۔ شاید گڈے کو بھی اسی بڑی سڑک پر جانا تھا۔ دن کی
روشنی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے جیکٹ کے
بٹن بند کر رکھے تھے اور مردے کی طرح کماد میں پڑا تھا تو مجھے سڑک پر سے
گزرتی کسی بس کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو گڈا سڑک
والے درختوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مجھے یہاں اتر جانا چاہئے تھا۔ میں نے آس
پاس کے کھیتوں میں نگاہ ڈالی۔ قریب کوئی نہیں تھا۔ دور دور کھیتوں میں کچھ سکھ
کسان کام کر رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو گنے کی بھریوں میں سے نکالا اور
جانور کی طرح گھٹنوں کے بل چلتا گڈے کے پیچھے آیا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔
خدا کا شکر ہے کہ مجھے زیادہ چوٹ نہیں لگی کیونکہ گڈے پر لدا کماد کافی اونچا

تھا۔ زمین پر گرتے ہی میں جلدی سے اٹھا اور گڈے سے دور رہ کر سڑک کی طرف چلنے لگا۔ میں نے سڑک کو پہچان لیا۔ یہ جالندھر سے امرتسر جانے والی جی ٹی روڈ تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی بس لاری اور ٹرک گزر جاتا تھا۔ میں جالندھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے میرا جالندھر سے آنے والی کسی لاری یا بس میں سوار ہونا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ پولیس سڑک پر کسی جگہ چیکنگ کر رہی ہو۔ میں نے سوچا کہ مجھے کم از کم کرتار پور تک یکے پر سفر کرنا چاہیے۔ سڑک سے ہٹ کر کچا راستہ تھا۔ جس پر یکے گاؤں کی سواریاں لے کر چلتے تھے۔

میں سڑک چھوڑ کر اس کچے راستے پر آ گیا۔

پیچھے سے ایک یکہ آ رہا تھا۔ سواریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگلے گاؤں جا رہا تھا۔ سکھ کوچوان نے مجھے جگہ نکال کر یکے پر بٹھا لیا۔ اس یکے پر بیٹھ کر میں اگلے گاؤں پہنچا۔ وہاں سے دوسرے یکے پر بیٹھ گیا اور اس سے اگلے گاؤں جا پہنچا۔ دوسرے گاؤں سے مجھے ایک خستہ حال لاری مل گئی جو کرتار پور تک جاتی تھی۔ سارے مسافر دیہاتی سکھ تھے۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ لاری گرد اڑاتی شور مچاتی کچے راستے کے گڑھوں پر اچھلتی معمولی رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ میں اس میں محفوظ تھا۔ ہم جی ٹی روڈ سے بہت دور ہٹ کر جا رہے تھے۔ راستے میں کئی گاؤں آئے۔ ہر جگہ سے سکھ ڈرائیور سواریاں بٹھاتا چلا گیا۔ لاری کی چھت پر بھی مسافر چڑھے ہوئے تھے۔ کافی دیر بعد لاری کرتار پور پہنچی۔ امرتسر جالندھر کے درمیان یہ ایک بڑا قصبہ ہے۔ اب تو ترقی کر کے یہ چھوٹا سا شہر بن گیا ہے۔ اس کا ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ کرتار پور سے میں نے ریل گاڑی پکڑی اور امرتسر آ گیا۔ راستے میں کوئی پولیس والا دکھائی نہ دیا۔ میں نے ڈبے میں سوار ہو کر ایک ایک مسافر کا بڑے غور سے جائزہ لیا۔ ان میں کوئی سی آئی ڈی کا آدمی بھی نہیں لگتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور آپ کو یاد ہو

گا کہ امرتسر میں ہمارا ایک کشمیری مجاہد جہاد کشمیر کے لیے خفیہ طور پر کام کر رہا تھا مگر جب میں اس کے مکان پر پکڑا گیا تھا تو پولیس نے اسے بھی حراست میں لے لیا تھا۔ امرتسر میں اس وقت پہنچا جب دن غروب ہو چکا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ اپنے کشمیری مجاہد نے ایک بار امرتسر شہر سے باہر ایک بستی میں مجھے اپنے ایک ساتھی مجاہد سے ملایا تھا۔ میں نے روپوشی کی ایک رات اس کے مکان پر گزاری تھی۔ میں نے سوچا کہ ہوٹل میں ٹھہرنے سے بہتر ہے کہ میں دوسرے مجاہد کے پاس چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے مجھے میرے کشمیر پہنچانے میں میری مدد کر سکے۔

سٹیشن سے باہر نکلنے کی بجائے میں لائنوں لائن شریف پورے کی طرف چل پڑا۔ تقسیم سے پہلے شریف پورہ مسلمانوں کی بستی تھی مگر اب وہاں سکھ آباد تھے اور انہوں نے اس کا نام سنگھ پورہ رکھ دیا تھا۔ مجھے شریف پورے سے بھی آگے جانا تھا۔ سردیوں کی شام کی آمد آمد تھی۔ شہر کے مکانوں پر دھند چھانے لگی تھی۔ میں جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کئے ریلوئے لائن کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کہ میں ریلوے لائن پر کہاں تک چلتا گیا۔ جگہ میری جانی پہچانی تھی۔ ایک جگہ میں ریلوے لائن سے اتر کر میدان سے گزرنے لگا۔ یہاں بھی دھند چھائی تھی۔ کچھ دور آبادی کے مکانوں میں اور کہیں کہیں روشنیاں ہو گئی تھیں۔ میں اپنے ساتھی مجاہد کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ اشارے سے اوپر جانے کو کہا اور دروازے کی ایک طرف ہو گیا۔ اوپر والے کمرے میں چارپائی پر بستر بچھا ہوا تھا۔ لحاف بھی پڑا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے آتے ہی پہلا سوال یہی پوچھا کہ مجھے وہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں۔

میں نے کہا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ تمہاری گلی بالکل خالی تھی اور میرے پیچھے بھی کوئی نہیں لگا ہوا''۔

وہ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو"۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں ساری داستان بیان کر دی۔ وہ کہنے لگا۔

"پہلے کچھ کھا پی لو"۔

وہ باورچی خانے میں گیا اور میرے لیے پلیٹ میں چاول اور گونگلو گوشت ڈال کر لے آیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے کشمیری قہوہ بنایا، ہم قہوہ پینے لگے۔ میں نے کہا۔

"خفیہ پولیس میری تلاش میں ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ امرتسر سے لے کر جموں تک ان کے آدمی میری تلاش میں ہوں گے لیکن میرا سری نگر جہاد کشمیر کے محاذ پر پہنچنا بہت ضروری ہے"۔

مجاہد نے پوچھا۔

"کیا تم واپس پاکستان نہیں جانا چاہتے"؟

میں نے کہا۔

میں جہاد کشمیر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ میں اپنے کشمیری بھائیوں کے شانہ بہ شانہ دشمن کے خلاف اس وقت تک جہاد کرنا چاہتا ہوں جب تک کہ کشمیر آزاد نہیں ہو جاتا۔

وہ بولا۔

"ماشاءاللہ ماشاءاللہ"۔

خاموشی سے قہوے کے ایک دو گھونٹ پینے کے بعد اسنے پیالی رکھ دی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"سری نگر جانے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تم ریل گاڑی سے جاؤ یا بس میں بیٹھ کر سفر کرو۔ دونوں صورتوں میں تمہارے پکڑے جانے کے ننانوے فی صد امکانات ہیں۔ تمہارے لیے کوئی تیسرا طریقہ سوچنا پڑے گا"۔

وہ کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ جب کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو کہنے لگا۔

"تم آرام کرو۔ کل اس پر غور کریں گے۔"

رات میں بڑے سکون کے ساتھ گہری نیند سویا۔ دوسرے روز میں نے اپنے مجاہد کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد وہ مجھے کمرے میں ہی رہنے کی ہدایت کر کے مکان کو باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ دو تین گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"ایک امید پیدا ہوئی ہے"۔

"کیا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

مجاہد میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"امرتسر کے سیتلا مندر سے ہندو یاتریوں کا ایک قافلہ ماتا شیراں والی کی زیارت کرنے جموں جا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوؤں کے رسم و رواج کو خوب جانتے ہو اور دو ایک بار سادھو کا بھیس بھی بدل چکے ہو۔ تمہارے جموں پہنچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم ماتا شیرانوالی کے سادھو بن کر اس ٹولی میں شامل ہو جاؤ۔ اس میں صرف تمہاری ہوشیاری اور تجربہ کاری کی ضرورت ہو گی کہ تم اپنے آپ کو کس طرح چھپاتے ہو۔ بس تمہارا یہاں سے نکلنے کا ایک یہی چانس ہے"۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یاتریوں کا قافلہ کب روانہ ہو گا۔ مجاہد نے کہا۔

"میرا خیال ہے پرسوں روانہ ہو گا۔ ویسے میں آج شام تک پتہ کرا لوں گا کہ ان لوگوں کا پکا پروگرام کس روز کا ہے لیکن تمہیں اپنا حلیہ پورا سادھوؤں والا بنانا ہو گا"۔

میں نے کہا۔

"وہ میں بنا لوں گا۔ تم مجھے میری ضرورت کی دو چار چیزیں لا دینا۔ یہ ڈاڑھی بال میں یہیں مونڈ لوں گا"۔

وہ بولا۔

"میں تمہیں تمہاری ضرورت کی ہر شے مہیا کروں گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو"۔

میں سارا دن مجاہد کے مکان کی بیٹھک میں بند رہا۔ وہ دوپہر کے بعد چلا گیا۔ شام کو واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"یاتریوں کا قافلہ کل صبح منہ اندھیرے سیتلا مندر سے روانہ ہونے والا ہے۔ تمہیں آج رات پوری تیاری کر لینی چاہئے"۔

میں نے کہا۔

"میں ابھی تیاری شروع کر دیتا ہوں"۔

میں نے غسل خانے میں جا کر داڑھی مونچھوں کو پہلے قینچی سے کاٹا پھر صابن لگا کر پوری شیو کر ڈالی۔ سر کے بال پٹوں کی شکل میں تھے۔ وہ میں نے رہنے دیئے۔ مجاہد اسی وقت بازار چلا گیا۔ اور میرے لیے بازار مائی سیواں سے گلے میں ڈالنے کے لیے منکوں کے تین چار ہار اور کیسری رنگ کا دس بارہ گز کپڑا لے آیا۔ ہم نے کپڑے کو پھاڑ کر اس کی ایک دھوتی تیار کی۔ وہ میرے لیے ایک چھوٹا ترشول بھی لفافے میں چھپا کر لے آیا تھا۔ میں جب کیسری رنگ کا چولا اور دھوتی پہن کر گلے میں منکوں کی مالا ڈال کر سر پر کیسری رومال باندھ کر اور ماتھے پر ماتا شیراں والی پجاریوں کی تین سرخ لکیریں ڈال کر تیار ہو گیا تو

مجاہد نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا۔

"تم بالکل ماتا شیرانوالی کے پجاری لگتے ہو"۔

میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ میں نے کپڑے میں ڈال کر چولے کے اندر کمر کے ساتھ لپیٹ لی۔ مجاہد نے کہا۔

"اب تم آرام کرو۔ میں صبح منہ اندھیرے تمہیں جگا دوں گا۔ یاتری سیتلا مندر سے پورے چار بجے روانہ ہوں گے۔ میں تمہیں تین بجے جگا دوں گا"۔

مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی تھوڑا بہت سو گیا۔ پورے تین بجے مجاہد نے مجھے جگا دیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر ماتھے پر سرخ رنگ کی لکیریں دوبارہ ڈالیں۔ سادھوؤں کے بھیس میں پہلے ہی سے تھے۔ میرے پاؤں میں جوگر شوز تھے۔ وہ میں نے وہیں اتار دیے کیونکہ میں روائتی سادھوؤں کی طرح ننگے پاؤں یاترا کرنے جانا چاہتا تھا۔

مجاہد نے مجھ سے مصافحہ کیا اور کہا۔

تمہیں سیتلا مندر کا پتہ ہی ہے کہ وہ کہاں ہے بس وہاں پہنچ جاؤ اور یاتریوں کے قافلے میں شامل ہو جاؤ۔ خدا تمہارا محافظ و مددگار ہو۔

میں اپنے مجاہد سے رخصت ہو کر بستی کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا جی ٹی روڈ پر آ گیا۔ سردی کافی پڑ رہی تھی۔ بھورے رنگ کا میلا سا کمبل اپنے مجاہد نے مجھے دے دیا تھا جسے میں نے اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ سردیوں کی رات کا پچھلا پہر تھا۔ کہرا پھیلا ہوا تھا۔ جی ٹی روڈ خالی پڑی تھی۔ میں نے سیڑھیوں والے پل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ سیتلا مندر ہاتھی دروازے کے باہر ریلوے کے ریگو برج سے پہلے آتا تھا۔ ریگو برج گول باغ کے عقب میں تھا۔ سیڑھیوں والے پل کے پاس مجھے ایک رکشہ مل گیا۔ جو سٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ترشول اٹھا کر بلند آواز میں بڑے رعب سے کہا۔

"ہم ماتا شیرانوالی کی یاترا کو جاتے ہیں۔ ہمیں سیتلا مندر پہنچا دو۔ تمہارا بڑا پن ہو گا"۔

ضعیف الاعتقاد ہندو رکشا ڈرائیور نے بڑے ادب سے مجھے بٹھا لیا اور سیتلا مندر پہنچا دیا۔ سیتلا مندر میں خوب روشنی تھی۔

سنکھ بج رہے تھے۔ ٹل کھڑک رہے تھے۔ ایک طرف یاتریوں کا قافلہ آگ کا الاؤ روشن کئے بیٹھا تھا۔ ان میں سادھو لوگ بھی تھے۔ اور عام شہری بھی تھے۔ عام شہریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں سکھ بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ماتا شیرانوالی کے شردھالو تھے۔ انہوں نے بندھے ہوئے بستر اور دوسرا سامان بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں جے ماتا شیرانوالی کا نعرہ لگا کر الاؤ کے گرد بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ یہ قافلہ تین ٹرکوں میں بیٹھ کر جا رہا ہے۔ قافلے میں ہندو سکھ عورتیں بھی تھی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ کہ سارے یاتری ٹرکوں میں سوار ہو گئے۔ میں بھی ایک ٹرک میں بیٹھ گیا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جے ماتا شیرانوالی کا نعرہ لگا دیتا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ دوسرا کوئی سادھو نعرہ نہیں لگا رہا تو میں بھی خاموش ہو گیا۔ ٹرک چل پڑے۔ یہ اتنا لمبا سفر نہیں تھا۔ امرتسر سے ہمیں وایا قادیاں ' بٹالہ اور گورداسپور جموں کے علاقے میں داخل ہونا تھا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں پولیس کا کوئی سپاہی نہیں تھا۔ سی آئی ڈی والا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی سی آئی ڈی کا آدمی ساتھ تھا تو مجھے اس سے ہوشیار رہنا تھا۔ بہرحال میں پوری طرح سے چوکنا تھا۔

ٹرک میں سوار یاتری اس وقت تک ماتا شیرانوالی کے بھجن گاتے رہے جب تک کہ قافلہ امرتسر شہر کے باہر نکل کر بٹالہ ہوشیار پور جانے والی سڑک پر نہیں آ گیا۔ پچھلی رات کے اندھیرے میں مجھے یاتریوں کے چہرے صاف دکھائی نہیں دیے تھے۔ جب سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو میں نے اپنے ٹرک میں سوار یاتری مردوں کا جائزہ لیا۔ سب عام شہری تھے۔ زیادہ تر ادھیڑ عمر

تھے۔ ان میں سے ایک آدمی مجھے تھوڑا سا مشکوک نظر آیا۔ یہ بھی ادھیڑ عمر کا ہندو تھا۔ سر پر اونی ٹوپی کانوں تک پہن رکھی تھی۔ وہ کمبل کی بکل مارے ٹرک کے کونے میں بیٹھا یاتریوں کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی گہری نظروں سے مجھے اس پر شک پڑ گیا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں دوسری طرف تکنے لگا۔ میں نے جے ماتا شیرانوالی کا ہلکا سا نعرہ لگایا۔ اور کنکھیوں سے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ برابر مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ خفیہ کا آدمی ہے اور اس کے پاس پستول ضرور ہو گا جو اس نے اپنی صدری وغیرہ کی جیب میں چھپا لیا ہو گا۔ یہ ایک مصیبت میرے ساتھ لگ گئی تھی مگر میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بڑے سکون کے ساتھ ماتا شیرانوالی کا بھجن گنگنانے لگا اور سر کو بار بار ہلانے لگا۔ ہمارے ٹرک بٹالہ پہنچ کر رک گئے۔ یاتریوں کے قافلے کے لیڈر نے اعلان کیا کہ یہاں ڈھابے میں یاتری تھوڑا بھوجن پانی کریں گے جہاں ٹرک کھڑے تھے وہاں قریب ہی ایک ڈھابہ تھا جس کے کانسی کے بڑے گول پتیلے چمک رہے تھے۔ پھلکے پکائے جا رہے تھے۔ ایک پتیلے میں چائے پک رہی تھی۔ سب یاتری وہاں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ میں بھی ایک طرف بنچ پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی کمبل کی بکل والا آدمی بھی اسی بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب ہو کر بیٹھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"مہاراج! آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے اس کی طرف جلالی نظروں سے دیکھا اور بارعب آواز میں کہا۔

"سادھو سنیاسیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ہم آکاش پر اڑتے رہتے

ہیں۔ ماتا نے بلایا ہم آ گئے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

اس آدمی کے چہرے پر میری رعب دار آواز کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ کوئی عام یاتری نہیں ہے بلکہ خفیہ پولیس ہی کا آدمی ہے۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ یاد نہیں آ رہا"۔

میں نے ترشول ہوا میں لہراتے ہوئے سنسکرت کے دو چار اشلوک جو اب مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے بولے اور کہا۔

"ہم انتریامی ہیں - ہم ہر جگہ ہوتے ہیں"۔

خفیہ پولیس والے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ست بچن مہاراج، ست بچن"۔

یعنی آپ نے جو کہا بالکل ٹھیک کہا۔ بالکل سچ ہے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے چوکنا نہیں کرنا چاہتا اور یہ احساس نہیں دلانا چاہتا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے کہ میں سادھو کے بھیس میں کوئی اور ہی آدمی ہوں۔ اتنے میں ایک سادھو بابا میرے لئے پوریاں روٹی اور بھاجی لے کر آگیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ بھوجن نہیں کریں گے؟ یہ لیجیے۔ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔"

"جے ماتا شیرانوالی کی۔"

اور میں نے اس سے ڈونا لے لیا اور کھانے لگا۔ اس دوران میں نے بڑی چالاکی سے ایک طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ خفیہ پولیس والا آدمی ڈھابے کے باہر بینچ پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ مجھے اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ یہ بلا میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا اگر اس نے کوئی کارروائی کی تو

جموں پہنچ کر ہی کرے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد یاتریوں کا قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ ٹرکوں پر کیسری رنگ کے جھنڈے اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ آگے ہوشیار پور کا مشہور شہر تھا۔ یہاں سے جموں کا نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں بھی ٹرک رک گئے۔ یاتریوں نے چائے وغیرہ پی۔ جس طرح خفیہ پولیس والے نے مجھے اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا اسی طرح میں بھی تھوڑی دیر کے بعد کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ زیادہ خطرہ یہی تھا کہ وہ پولیس کو اطلاع نہ کر دے۔ مگر وہاں ابھی تک مجھے کوئی پولیس کا سپاہی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ سردی زیادہ ہو گئی تھی اور سرد یخ ہوا چلنے لگی تھی۔ کسی پولیس والے کو کیا پڑی تھی کہ وہ یاتریوں کے قافلے کو آ کر دیکھتا۔ میں بڑا چوکس تھا اور یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں سی آئی ڈی والا کسی سے بات کر کے پولیس کو تو نہیں بلا رہا۔ ابھی تک ایسی کوئی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص جموں پہنچ کر مجھے پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جس طرح وہ میری نگرانی کر رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے فرار ہونے کا موقع نہیں دے گا۔ اس کے پاس پستول بھی ضرور تھا۔ ہوشیار پور سے یاتریوں کا قافلہ چلا تو پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ آگے جموں کا پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ یہاں بادل چھا رہے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ مجھے سادھوؤں والے ٹھنڈے اور ناکافی لباس میں سردی لگنے لگی۔ میں نے کمبل لپیٹ لیا۔ دن ڈھلنے لگا تھا۔ جموں پہنچتے ہی سورج غروب ہو گیا۔ سی آئی ڈی والا اب شاید جان بوجھ کر میرے ٹرک میں نہیں بیٹھا تھا۔ وہ مجھ سے اگلے ٹرک میں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس پر کوئی شبہ ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پنجرے کے عین قریب پہنچ کر پرندہ ڈر کر اڑ جائے۔ میں اس کی حکمت عملی کو خوب سمجھتا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر میرا شبہ درست نکلا اور یہ واقعی خفیہ پولیس کا آدمی ہے تو

میں اسے اپنے اوپر ہاتھ ڈالنے کا موقع ہی نہیں دوں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک دھڑکا مجھے بھی ضرور لگا ہوا تھا کہ آخر دشمن ملک میں ہوں۔ یہاں پولیس ان کی ہے۔ فوج ان کی ہے۔ عوام ان کے ہیں۔ کہیں میں مارا نہ جاؤں۔

جموں کے مضافات میں پہنچنے کے بعد یاتریوں کا جوش و خروش بڑھ گیا تھا۔ وہ جے ماتا شیرانوالی کے نعرے لگا رہے تھے۔ بھجن گا رہے تھے۔ ٹرکوں پر دھمال ڈال رہے تھے۔ عجیب بات ہے اس دوران خفیہ پولیس والے نے جو اگلے ٹرک میں بیٹھا تھا میری طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی اس بے نیازی سے مجھے خیال آنے لگا کہ میں نے خوامخواہ اس آدمی پر شک کیا ہے۔ یہ سی آئی ڈی کا آدمی نہیں ہے بلکہ عام یاتری ہے۔ ٹرک جموں شہر میں داخل ہو کر دریائے توی کے پل کے قریب ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سب یاتریوں کے ساتھ میں بھی نیچے اتر آیا۔ شام ہو رہی تھی۔ یاتری ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ یہاں ان لوگوں نے کوئی ضروری مذہبی رسم ادا کرنی تھی۔ میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر میں نے دیکھا کہ مجھ سے بیس بائیس قدموں کے فاصلے پر وہی خفیہ پولیس کا آدمی ایک درخت کے نیچے کھڑا سگریٹ پیتے ہوئے ایک آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔

باتیں کرتے ہوئے اس نے دو تین بار میری طرف اس طرح دیکھا کہ جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میں کہیں فرار تو نہیں ہو گیا۔ اب میرے فرار ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ آدمی میرے اردگرد کوئی جال بن رہا ہے۔ میں نے جے ماتا کا نعرہ لگایا، ترشول فضا میں لہرایا اور دھمال ڈالتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ میں دریا کے کنارے جو لکڑی کے کھوکھے بنے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے سے ہو کر دھمال ڈالتا جا رہا تھا۔ میں بازار میں سے گزر گیا۔ آگے کھوکھوں کی دکانیں نہیں تھیں۔ ایک جانب لاریوں کا اڈا تھا۔ دوسری طرف دریا تھا جو نشیب میں بہہ رہا تھا۔ اس سے آگے دریا کا دوسرا پل تھا۔ میرا

پروگرام یہ تھا کہ دریا کے پل پر سے گزر کر میں دریا کی دوسری جانب والی گنجان آبادی میں غائب ہو جاؤں گا۔ جیسے ہی میں پل کی طرف چلا مجھے سامنے سے آدمیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں کہا۔

"یہیں ٹھہر جا نقلی سادھو۔"

میں نے اس طرف دیکھا تو جس کا شک تھا وہی ہوا تھا۔ خفیہ پولیس والا اپنے ساتھ چھ سات پولیس کے سپاہی لے کر سامنے کی جانب سے میری طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ رہا تھا۔ سپاہیوں کے پاس رائفلیں دیکھ کر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ یہ میرا آخری فیصلہ تھا اور فیصلے پر مجھے فوراً عمل بھی کرنا تھا۔

میں نے کمبل اور ترشول ایک طرف پھینکا اور اور دوڑ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میرے خدا! دریا میں گرتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میں پگھلی ہوئی برف کے سمندر میں گر پڑا ہوں۔ دریا میں گرتے ہی میرا جسم سن ہو گیا۔ میرے اوپر رائفلوں کے تین چار فائر ہوئے۔ گولیاں میرے ارد گرد پانی میں گریں۔ میں نے غوطہ لگا لیا۔ پانی کا ریلا مجھے بہاتا ہوا آگے لے گیا۔ میں پانی کے اندر تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا مگر پانی کا بہاؤ میرے ہاتھ پاؤں مارنے کی رفتار سے زیادہ تیز تھا۔ پانی کا بہاؤ میری مدد کر رہا تھا۔ پانی کے اندر سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ میں جتنا سانس روک سکتا تھا، روک کر آگے نکل رہا تھا۔ مجھے فائرنگ کی آواز برابر آ رہی تھی۔ میں نے کمانڈو کی ابتدائی ٹریننگ کے دوران سانس کو زیادہ سے زیادہ روکے رکھنے کی بہت مشق کی تھی۔ چنانچہ جب

میں نے اپنا سر پانی سے باہر نکال کر پیچھے دیکھا تو دریا کے پل کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ میرے اتنا آگے نکل آنے میں دریا کے تیز ریلے کا زیادہ ہاتھ تھا۔

اب میں نے تیز تیز تیرنا شروع کر دیا تھا۔

دریا کے کنارے اونچے تھے۔ یہاں دریا ایک بڑی نہر کی طرح تھا۔ مگر چونکہ پہاڑی علاقہ تھا، اس لیے دریا آگے جا کر ایک طرف کو تیزی سے گھوم گیا۔ میں بھی دریا کی لہروں کے ساتھ اس طرف گھوم گیا اور دیوانہ وار تیرتا چلا گیا۔ رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے نے بھی میری مدد کی اور مجھے بہت جلد میرے دشمنوں کی نگاہوں سے چھپا لیا۔ میرا جسم سرد ہو کر سن ہوتا جا رہا تھا مگر میں ہاتھ پاؤں چلاتا جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ پولیس میرے پیچھے دریا کا پل پار کر کے دوسرے کنارے پر آ جائے گی۔ میں دوسرے کنارے کو بھی دیکھتا جا رہا تھا جہاں اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں دریا میں زیادہ دیر تک نہیں تیر سکتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ دریا کا پانی میرے جسم کو سن کر رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ دریا شہر میں سے گزر رہا تھا۔ پولیس بڑی آسانی سے دوسرے کنارے پر آ کر مجھ پر فائرنگ کر سکتی تھی اور مجھے دریا میں ہی ہلاک کر سکتی تھی۔ میں وہاں سے نکلنے کا کوئی تیسرا طریقہ سوچ رہا تھا۔

بہت جلد مجھے تیسرا راستہ نظر آ گیا۔

ایک جگہ بہت بڑا پائپ دریا کے کنارے سے آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اس میں سے پانی گر رہا تھا۔ یہ پانی شاید اوپر کسی برساتی نالے میں سے آ رہا تھا۔ میں تیرتا ہوا پائپ کے پاس آ گیا۔ پائپ کا قطر کافی کشادہ تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے پائپ کے کنارے کو پکڑ لیا پھر زور لگا کر ایک ٹانگ پائپ کے اندر ڈالی اور اس میں چڑھ گیا۔ پائپ کے اندر آتے ہی میں پائپ میں آگے کی طرف جھک کر دوڑ پڑا۔ پائپ کے اندر میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا مگر جھک کر دوڑ سکتا تھا۔ پانی میرے ٹخنوں تک تھا۔ پائپ میں گھپ اندھیرے کی وجہ سے میں دوڑنے کی

بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ پائپ کی فضا میں عجیب قسم کی گیس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے پاؤں کیچڑ میں بھی دھنسنے لگے تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ پائپ مجھے کہاں لے جائے گا۔ یہ کسی پہاڑی علاقے میں بھی نکل سکتا تھا اور یہ کسی تھانے یا جیل کے اندر بھی نکل سکتا تھا۔ گیس کی بو کی وجہ سے لمبے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے سانس لینے لگا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ میں پائپ کی محرابی دیوار کو تھام کر اندھیرے میں چل رہا تھا۔

پہلے تو پائپ بالکل سیدھا چلا گیا تھا پھر وہ بائیں جانب کو مڑ گیا۔ گیس کی بو زیادہ تیز ہونے لگی۔ اب میں گھبرا گیا کہ کہیں دم گھٹنے سے میری موت واقع نہ ہو جائے۔ پائپ کا فرش اونچا ہو رہا تھا۔ جیسے چڑھائی چڑھ رہا ہو۔ مجھے اوپر چلنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ میرے پاؤں پانی کے اندر جمے ہوئے کیچڑ میں بار بار پھسل رہے تھے۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف ہاتھوں سے پائپ کی دیوار کو پکڑ کر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک میرا ہاتھ لوہے کی مڑی ہوئی سلاخ پر پڑا میں وہیں رک گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا۔ یہ سلاخ پائپ کی دیوار میں سے نکل کر ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ اوپر کیے۔ اوپر بھی اسی طرح کی آہنی سلاخ دیوار میں سے نکل کر ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ اس کے اوپر بھی ایسی ہی سلاخیں دیوار میں سے نکلی ہوئی تھیں۔ میں فوراً سمجھ گیا یہاں سے ضرور اوپر کوئی راستہ جاتا تھا اور یہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں سی بنا دی گئی تھیں۔ یقیناً اس کے اوپر اس گٹر کا منہ تھا۔ میں لوہے کی سلاخوں کو پکڑ کر دیوار پر چڑھنے لگا۔ دس پندرہ سیڑھیاں اوپر جانے کے بعد میرا ہاتھ گٹر کے ڈھکن سے ٹکرایا۔ میں نے کندھے ڈھکن کے ساتھ جوڑ کر پورا زور لگا کر اسے اوپر سے اٹھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تین چار منٹ کی کوشش کے بعد ڈھکن میں چرچراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اوپر کو اٹھ گیا۔ اوپر اٹھتے ہی باہر سے تازہ سرد ہوا اندر آنے لگی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو ڈھکن

کے نیچے رکھ کر اسے زور سے ایک طرف ہٹایا۔ ڈھکن ایک طرف کو سرک گیا۔
میں نے سر باہر نکالا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ ڈھکن کسی سڑک کے
درمیان نہ کھلتا ہو اور کوئی ٹرک میرے سر کو کچلتا ہوا نہ گزر جائے۔ لیکن یہ
سڑک نہیں تھی بلکہ پہاڑی ٹیلے کی ڈھلان تھی جہاں اوپر سے یہ نالہ نیچے آ رہا تھا
اور اس جگہ چبوترے پر نالے کا ڈھکن بنا دیا ہوا تھا۔ میں گٹر سے باہر نکل آیا۔
میرے جسم پر سوائے سادھوؤں والے چولے اور دھوتی کے اور کچھ بھی نہیں
تھا۔ پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ سرد رات کی تاریکی
چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ ایک بھی تارا دکھائی
نہیں دیتا تھا۔ میں سردی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس سردی اور بھیگے ہوئے
کپڑوں میں وہاں سے نکلنا تھا۔ نیچے جموں شہر کی روشنیاں ستاروں کی طرح جگ
مگ جھلملا رہی تھیں۔ اوپر ٹیلے کی چوٹی رات کی دھندلی روشنی میں خاکہ سا
دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ٹیلے کی چڑھائی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اس خیال
سے کہ میں اس طرح جموں شہر کی پہاڑیوں کی دوسری جانب کشمیر کی سائیڈ پر نکل
جاؤں گا۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

جب میں نے ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر نیچے جھانک کر دیکھا تو مجھے دور
پہاڑی نشیب میں ایک جگہ روشنی ٹمٹاتی نظر آئی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اس
طرف چل پڑا۔ پاؤں میں جوتا نہ ہونے کی وجہ سے پہاڑی ڈھلان کے پتھروں پ
چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے دھوتی کو پھاڑ کر اسے دونوں پاؤں پر باندھ لیا۔
کوئی دو گھنٹے میں میں اس ٹمٹاتی ہوئی روشنی کے قریب پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا س
چھ سات گھروں والا پہاڑی گاؤں تھا جس کی ایک جانب ایک دروازے کے باہ
لالٹین روشن تھی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مسج
کا صحن سرد رات میں خالی پڑا تھا۔ پیچھے ایک کوٹھڑی تھی جس کا دروازہ بند تھا

سردی اور تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے کوٹھڑی کا بند دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "مولوی صاحب، مسافر ہوں - راستہ بھول گیا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک باریش بزرگ میرے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"تم سادھو ہو؟"

میں نے کہا۔ "مولوی صاحب اندر آنے کی اجازت دیں - پھر سب کچھ بتا دوں گا۔"

انہوں نے مجھے اندر بٹھایا۔ دروازہ بند کر لیا۔ کوٹھڑی کی گرم فضا میں لالٹین روشن تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اسے اپنے بارے میں حقیقت حال بتانی چاہئے یا نہیں۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ میری مخبری کر دے۔ پہلے تو میں نے یہی کہا کہ ماتا شیرانوالی کی یاترا کو آیا تھا، پہاڑیوں میں راستہ بھول گیا ہوں۔ مولوی صاحب مجھے تیز نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"سادھو لوگ شہروں میں راستہ بھول سکتے ہیں مگر پہاڑوں میں کبھی راستہ نہیں بھولتے۔ مجھے سچ سچ بتا دو تم کون ہو۔ کیا تم کشمیری مجاہد ہو؟"

مجھے بتانا نہیں چاہئے تھا لیکن مجھ پر سخت نقاہت طاری تھی۔ میں نے کہہ دیا۔

"جی ہاں۔ میں کشمیری مجاہد ہوں"

اور پھر اپنی مختصر سی روداد سنا ڈالی۔ مولوی صاحب کشمیری حریت پسند مجاہدوں کے سچے ہمدرد تھے۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھے پتیلی میں سے گرم گرم کشمیری چائے نکال کر پلائی۔ گرم چائے پیتے ہی میرے مردہ بدن میں جیسے نئی زندگی آ گئی۔ اس کے بعد ان مولوی صاحب نے مجھے تین

دن اپنے پاس ایک خاص جگہ پر چھپائے رکھا۔ مجھے دوسرے کپڑے پہننے کو دیے ۔ میرے لیے کہیں سے چمڑے کے جوتے بھی لے آئے۔ چوتھے روز انہوں نے مجھے ایک آدمی کے حوالے کر دیا۔ جس نے مجھے دو دن پہاڑی علاقے میں سفر کے بعد کشمیر کی وادی میں پہنچا دیا۔ ایک ہفتے کے بعد شیر باز خان بھی پولیس کی حراست سے فرار ہو کر میرے پاس پہنچ گیا۔ اس سے اگلی رات کو ہم اپنے دوسرے کشمیری مجاہدوں کے ہمراہ رات کی تاریکی میں بھارتی فوجی کیمپ پر کمانڈو اٹیک کرنے جا رہے تھے۔ کشمیر پر زبردستی قبضہ کرنے والی بھارتی فوج کے خلاف کشمیریوں پر ان کے ظلم و ستم کے خلاف ہماری جنگ جاری تھی۔ ہمارا جہاد جاری تھا۔

تمت بالخیر